

جس شخص کا یہ خیال ہے......

خداغفار [illegible] رہے اور بندہ گناہ گار اور غلط کار ۔ اسکی رحمت سارے گناہوں کو دھوڈالتی ہے خدا نکتہ نواز ہے ، ایک ہی نکتہ پر بیڑا پار کردیتا ہے ۔ نماز ، روزہ ، حج ، زکوٰۃ سب ظاہری چیزیں ہیں ۔ اصل چیز عشق رسول ہے اور عاشقِ رسُولؐ پر جہنم حرام ، حقیقت اور طریقت کے بغیر شریعت کی تکمیل نہیں ہوتی اور حقیقت کے بعد شریعت کی ضرورت نہیں رہتی ۔ شریعت اہل ظواہر کا طریقہ ہے اور طریقت صرف اہلِ دل کیلئے مخصوص [illegible] انے نیک انسانوں کو بخشا تو یہ اس کا کوئی کمال نہ ہوا اس کی بخشش تو ہے ہی گناہ گاروں کے لئے ۔ کیا یہ بات قابلِ فخر نہیں کہ نیک لوگ اپنی نیکیوں کی بدولت نجات پائیں گے ۔ مگر گناہگاروں کو خدا کی رحمت سے رستگاری ہوگی ۔ خدا کی نظر اعمال پر نہیں بلکہ دلوں پر رہتی ہے اور اہلِ دل ہی خدا کے منظور نظر ہوتے ہیں ۔ خدا کی خوشنودی اسے حاصل ہوتی ہے جو اس کی جناب میں توبہ و استغفار کا تحفہ پیش کرتا ہے اور توبہ وہی کریگا جو گناہ گار ہوگا ۔ اہلِ دل کا مذہب اہلِ شریعت سے جدا ہوتا ہے اور اہلِ دل پر ہی انا الحق کا راز کھلتا ہے ۔

.... وہ خدا سے بہت دُور ہے ۔

جس شخص کا یہ خیال ہے......

مسلمانوں سے اب کچھ نہیں ہوسکتا ۔ قدرت کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ ذلیل و خوار ہوکر رہیں اور اُن پیشگوئیوں کے مصداق بنیں جو ان کے حق میں بزرگوں نے کی ہیں ۔ البتہ اگر کچھ ہوگا تو حضرت امام مہدی علیہ السلام سے ہوگا اور وہی آکر مسلمانوں کی تنظیم کرینگے اور ان ہی کی فوج سے مسلمانوں کو فتح حاصل ہوگی ۔ ہمیں دعا کرنی چاہیئے کہ حضرت امام مہدیؑ کا ظہور ہو اور مسلمانوں کو ان کے سایہ میں پناہ ملے ۔ اب مسلمانوں کے لئے کوئی پناہ گاہ نہیں سوائے حضرت مہدیؑ کی پناہ گاہ کے ۔ جب ان کا ظہور ہوگا تو مسلمانوں میں خود بخود زندگی کی روح جلوہ گر ہو جائے گی اور انکے بگڑے ہوئے سارے کام سدھر جائیں گے ۔ اگر آج ہم کچھ کریں بھی تو بیکار ہے ۔ کیونکہ خدا نہیں چاہتا کہ امام مہدیؑ کی شان گھٹے اور بزرگوں کا یہ مقولہ کہ " مردے از غیب بیروں آید و کارے بکند " غلط ثابت ہو ۔

.... وہ حقیقت سے بہت دُور ہے ۔

(بشکریہ نوائے حرم)

پاکیزہ اور صالح ادب کا علمبردار

مشیر

ٹیلی فون نمبر ۲۳۹۲

فہرست ——— فروری ۵۷ء

مرتبہ :
عبدالعزیز بیگ (؟)

جلد ۵ ؛
شمارہ ۲ ؛

بدل اشتراک :- پاکستان سالانہ تین روپے
فی پرچہ ۴ آنے
بھارت سالانہ ساڑھے چار روپے
فی پرچہ آٹھ آنے

سخنے چند

- حادثہ روح فرسا
- حقیقت پسندی
- مصر کی نجیب حکومت اور اخوان المسلمین

حادثہ روح فرسا

...سنہ ۱۹۵۷ء منگل کا روز پاکستان کی آج تک کی تاریخ میں بڑا ہی منحوس دن تھا۔ اس دن صبح پانچ بجکر تیس منٹ پر جمپیر سے چند میل
...ی آنے والی "پاکستان میل" کا ایک تیل لے جانے والی گاڑی سے اچانک تصادم ہوگیا ۔ تیل لے جانے والی گاڑی کا ایک پٹرول سے
...ے اتر کر کراچی آنے والی ریل کی پٹری پر جاگرا ۔ اور یہ اس وقت ہوا جبکہ پاکستان میل کے اس جگہ سے گزرنے میں صرف چند منٹ باقی
...یل فی گھنٹہ کی رفتار سے آئی اور اس کی پٹری پر گرے ہوئے پٹرول سے بھرے ہوئے ڈبہ سے ٹکرائی اور میل کا انجن پٹری سے اتر گیا ۔ اور
...ند ڈبے پچک گئے ۔ اگر صورتِ حال یہاں تک ہی رہتی تو شاید یہ حادثہ کسی بڑی نوعیت کا حادثہ نہ ہوتا ۔ مگر پٹرول سے بھرے ہوئے
...نے اور پٹرول کے آگ پکڑ جانے نے اس حادثہ کو بڑا المناک بنا دیا ۔ میل کے پہلے پانچ چھ ڈبوں کے مسافروں کے جلکر خاکِ سیاہ ہوجانے
...ن ہوا وہ بے حد روح فرسا ہے اس حادثہ کی جو غمناک تفصیلات اس وقت تک شائع ہو چکی ہیں وہ اس قدر مہیب ، دردناک او
...ں پڑھکر دل پاش پاش ہوجاتا ہے ۔ میل کے چھ ڈبوں کا پٹرول کی آگ سے اس طرح جل جانا کہ ان میں سفر کرنے والے اور سہمے ... وقت
...وئے ہوئے مسافر بچوں ، عورتوں اور مردوں کے زندہ جسموں کا سوکھی ہوئی لکڑیوں کی طرح جلکر خاکِ سیاہ ہوجانا یہ ایسا حادثہ نہیں
...نہ لفظوں کا جامہ پہنایا جاسکے ۔ آج ہم صرف جلی ہوئی ہڈیاں ، جھلسے ہوئے جسم اور تباہ شدہ ڈبوں کے ڈھانچوں کے ڈھیر دیکھ سکتے ہیں ا
...واندوہ اور روداد خونیں جنکی تفصیلات ان زندہ انسانوں کے ساتھ ہی اس قیامت خیز آگ کی نذر ہوگئیں ۔ ہم نہ دیکھ سکتے ہیں ۔ نہ
...کے ان جہنمی شعلوں میں گھر کر زندہ انسانوں کی جلتی ہوئی بے حس روحوں نے کیا محسوس کیا ہوگا ؟ اس کا تصور بھی لرزہ بر اندام کرنے کے
اس حادثہ کا المناک ترین پہلو ہے ۔

...نوعیت اور واقعات کو پڑھ کر یہ کہنا کہ اسے کسی انسانی تدبیر سے روکا جاسکتا تھا ۔ ایک غلط خیال ہے ۔ حادثہ کی جو چشم دید تفصیلات
...ن سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حادثہ تھا اور قدرت کی طرف سے تھا جس کے لئے کوئی پیش بندی ملازمین ذریعہ سے ممکن العمل نہ تھی ۔
...ثہ کے شکار ہونے والے شہید بچوں ، عورتوں اور مردوں کی روحوں کو اللہ تعالے اپنے جوار رحمت میں جگہ دے ۔ ان کے متعلقین جو اپنے ان
...تجہیز و تکفین تک کا موقع حاصل نہ کرسکے اپنے غم میں پوری قوم کی ہمدردی کے مستحق ہیں ۔ لفظی ہمدردیاں خواہ وہ کتنی ہی پرسوز
...کے زخم خوردہ دلوں کی تسلی کے لئے ناکافی ہیں ۔ اللہ تعالے ہی انکے دلوں کو صبر جمیل عطا فرمائے ۔
...ے حکام اور حکومت کا فرض صرف یہی نہیں کہ اس خونیں حادثہ کی تحقیقات کرائے ۔ بلکہ اسکا فرض یہ بھی ہے کہ اس حادثہ سے نقصان
...رسیدوں کو فیاضی سے پورا معاوضہ ادا کیا کرے ۔

...قیقت پسندی

...د ونوں ماہ سے بھارت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اور ان کی سرکردگی میں انڈین نیشنل کانگرس اور بھارت کے ہندو عوا
...مریکہ کے ساتھ حبشیہ امدادی اور دفاعی معاہدے پر جو دیوانہ وار شور وغل اور پروپیگنڈہ کا طوفان بے تمیزی اٹھا رکھا ہے وہ مصدوم
...میں بلکہ قابل مذمت بھی ہے ۔ ہر ملک کے سنجیدہ اور سمجھدار افراد یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ماضی اس ... ملک کا اسلام دشمن ...

پاکستان کے مادی طور پر مضبوط ہو جانے کے دور کے احتمال پر اس قدر چراغ پا کیوں ہو رہا ہے ۔ دیوانے پن کا جواب دیوانے پن سے دینا حماقت ہے اس لئے ہم پاکستانی اپنے ان جنونی ہمسایوں کے اس دیوانے پن کو حقارت کی بجائے حیرت سے دیکھ رہے ہیں ۔ ویسے تو ہمارا گزشتہ صد سا تجربہ جو ہمیں اس ہندو قوم کے ساتھ ایک ملک کے شہری بن کر رہنے کی وجہ سے حاصل ہوا اس امر کا شاہد ہے کہ کٹر ہندو ذہنیت باوجود قدیم فلسفہ اور علم سائنس کی فراوانی کے مالک ہونے کے مذہبی توہم پرستی اور فرقہ وارانہ تنگ نظری کی سطح سے کبھی بھی بلند نہیں ہو سکی ۔ جہالت اور تعصب نے کبھی بھی انہیں فراخدلی سے اس کا موقع نہیں دیا ۔ کہ وہ اسلام، اس کے مقتضیات اور مسلمانوں کو سمجھنے کی کوشش کریں ۔ مسلما یا مسلمان قوم کی فلاح و بہبودی انہیں کبھی بھی ایک آنکھ نہیں بھائی ۔ متحدہ ہندوستان میں جب کبھی بھی مسلمانوں نے انفرادی یا من حیث ا ترقی کرنے یا قومی فلاح و بہبودی کے مواقع حاصل کرنے چاہے تو کسی نہ کسی رنگ میں یہ ہندو مذہبی جنون ان کے آڑے آیا ۔ اور ملک کے بٹوارے ک بھی وجہ یہی تھی ۔ آزادی مل جانے کے بعد ہمارا خیال یہ تھا (اور یہ خام خیالی تھی) کہ شاید صبح آزادی کی درخشانی و تابانی ہمارے ان بھائیو کے قلوب کو مذہبی توہم پرستی اور فرقہ وارانہ تنگ نظری کے اندھیروں سے نکال کر رواداری، انصاف پسندی، خدا خوفی اور فراخدلی کے نور منور کر دے ۔ مگر "بسا آرزو کہ خاک شدہ" صدہا سال سے پتھر کے مجسموں، درختوں، دریاؤں، گئو ماتاؤں، بندروں اور سانپوں کی پ میں روحانیت تلاش کرنے والی یہ قدیم ذہنیت نہ بدل سکی ۔ آزادی کے چھ سال گزر جانے کے بعد آج بھی یہ ذہنیت اسی طرح آشکار ہے جیسے آج سے سو سال پہلے تھی ۔ آج سیاسی قوت حاصل ہو جانے کے بعد یہ ذہنیت اور بھی دلیر اور بیباک ہو گئی ہے اس بےپناہ سیاسی قوت کے نیچے پسے ہوئے بھارت کے مسلمان اس کی زندہ مثال ہیں ۔ آج بھی بھارت کے وزیر داخلہ ڈاکٹر کیلاش ناتھ کاٹجو علی گڑھ جا کر وہاں کے مسلمانوں کو کھلے یہ کہنے میں ذرہ بھر جھجک محسوس نہیں کرتے کہ — "بدمعاشو اگر تم سیدھی طرح بھارت میں نہیں رہو گے تو تمہیں لاتیں مار کر ملک سے باہر نک دیا جائے گا —"

بھارت کی کٹر تنگ نظر ذہنیت جو کچھ بھارت کی مسلم اقلیت سے کرنا چاہتی ہے وہی کچھ بھارت حکومت کی ہندو ذہنیت پاکستان کے ساتھ روا ر چاہتی ہے بھارت کی کٹر ٹائپ قدامت پسندی اپنے گرو پنڈت جواہر لال نہرو کی نہروانہ سرکردگی میں چاہتی ہے ۔ کہ پاکستان اور اس کے مسلم کو بھی اسی طرح ڈانٹ ڈپٹ کر رکھا جائے ۔ اور ہماری نکیل ہر وقت ان کے ہاتھ میں رہے ۔ وہ چاہتے ہیں کہ پاکستانی "بکرا" ہر وقت بھارتی "بھ سے دبکا اور سہما رہے ۔ انہیں یہ تصور بھی گوارا نہیں کہ کبھی پاکستان بھی ایک مضبوط اور طاقتور ملک بن جائے تا کہ وہ اسے ڈرا دھمکا کر ہضم نہ کر یہی وجہ ہے کہ آج کل بھارت میں دیوانگی کا ایک طوفان بےتمیزی کبھی پاکستان کو ڈرا اور دھمکا رہا ہے اور کبھی امریکہ کو گیدڑ بھبکیاں دے رہا ایک طرف تو پاکستان کو یہ کہہ کر کہ — "خبردار! اگر تم نے امریکہ سے کسی قسم کی فوجی مدد لی تو تمام روابط و تعلقات منقطع ہو جائیں گے، کشمیر اور باہمی تنازعات پر گفتگو قطعی بند کر دی جائے گی" ڈرایا اور دھمکایا جا رہا ہے اور دوسری طرف امریکہ کو یہ بھبکی دے کر کہ — "خبردار! اگر پاکستان کی کسی قسم کی مدد کی تو اس علاقے کی طاقت کا توازن درہم برہم ہو جائے گا" مرعوب کیا جا رہا ہے ۔ جب پنڈت جواہر لال نہ پاکستان کے مادی طور پر طاقتور ہو جانے کے احتمال پر یہ اندیشہ ظاہر کرتے ہیں کہ جنوب مشرقی ایشیا میں "طاقت کا توازن" درہم بر جائے گا تو اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی قدیم ہندوانہ تنگ نظر اور خود غرضانہ ذہنیت کا مظاہرہ کر رہے ہیں، کیونکہ اس اور نظریہ کے مطابق وہ چاہتے ہیں کہ اس علاقہ میں فوجی طاقت اور سیاسی برتری صرف ان ہی کے ملک کو حاصل رہے اور ان کی یہ قدیم .... ذہنیت اتنی طاقتور رہے کہ ایشیائی مسلمان اور دوسری ایشیائی قومیں ہر وقت اس کی دست نگر رہیں ۔ تا کہ اس علاقے میں وہ اپنی من ما ہندوانیوں کو جس کی ایک گھناؤنی مثال "کشمیر پر جارحانہ قبضہ" ہے عملی جامہ پہنا سکیں اور انہیں برقرار رکھ سکیں

بھارت سے آمدہ تازہ ترین اطلاعات مظہر ہیں کہ دہلی کے اس مہا پرش اور ہندو سلطنت کی وسعت کے خواب دیکھنے والے پنڈت

بر بڑے صریحہ جائے وزیراعظم مسٹر محمد علی کی پاکستان کے خلاف اس معاہدانہ پروپیگنڈہ سے باز رہنے کی مخلصانہ اپیلوں کو مسترد کر دیا ہے۔
پانی (مشرقی بنگال) میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سالانہ اجلاس کے خطبہ صدارت میں انھوں نے پھر شدت کے ساتھ ایسے خیالات کا
ظہار کر پاکستان کے داخلی معاملات میں ٹانگ اڑانے کی کوشش کی ہے جن کا اعادہ وہ پہلے بھی بار بار کر چکے ہیں اور جن سے بھارت کے
ات کے صفحات کئی ماہ سے سیاہ کئے جا رہے ہیں۔ ان کے اس پاگل پن پر کسی قسم کی تنقید اور تبصرہ لاحاصل ہے۔ کیونکہ ..... ان
لاقوامی شیخی خوروں کی آنکھیں حقائق کی روشنی دیکھنے اور کان دلائل کی معقولیت کو سننے سے عاری ہیں۔ اور نہ ہی ان کی قدیم اسلام دشمنی
ت کبھی انہیں پاکستان اور اس کے لوگوں کی طرف کوئی معقول رویہ اختیار کرنے کی صلاحیت پیدا ہونے دے گی۔ مگر جو چیز ہماری سمجھ میں نہیں
، وہ ہماری قیادت کی وہ خوش اعتقادی ہے جس کے تحت وہ باوجود بھارت کے لیڈروں کے اس معاندانہ رویہ کے اس خوش فہمی میں
ہے کہ بھارت کے ساتھ ہمارے تمام باہمی تنازعات بڑی خوش اسلوبی سے تسلی بخش طور پر طے ہو جائیں گے۔ یہ خیال کرنا کہ کشمیر کا تنازعہ اس
سل مکدر فضا میں خوش اسلوبی سے طے ہو سکتا ہے حقیقت بینی کے منافی ہے۔ نہ ہی پاکستان کے "ایشیا کے وزرائے اعظم کی کانفرنس" میں
یت کا کوئی افادی پہلو ہماری سمجھ میں آسکتا ہے۔ لنکا کے وزیر اعظم سر کوٹلا والا نے جو اس کانفرنس کے محرک ہیں باسیا ایک "ایشیائی بلاک" اور
"تیسری طاقت" کے بنانے کا خیال ظاہر فرمایا ہے اس خیال کے کچھ تقاضے ایسے ہیں جو پاکستان کے حق میں کبھی بھی مفید نہیں ہو سکتے۔ اول تو
ئی" بلاک" بنانے کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس کی قیادت بھارت کے ہاتھ میں ہو۔ اور اس صورت کو قبول کر لینا کبھی بھی پاکستان کے حق میں مفید
نہیں ہو سکتا یہ اس لئے نہیں کہ اس وقت پاکستان اور بھارت کے تعلقات خوشگوار نہیں ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ نظریاتی طور پر پاکستان کی اسلامی
ت کا ایک ہندو مشرک قوم کی قیادت کو تسلیم کر لینا اس کی نظریاتی موت ہوگی۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے خواہ کس قدر بھی ناخوشگوار کیوں نہ
لہ یہ صورت حال کسی حالت اور کسی وقت بھی پاکستان کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ بحیثیت ملت اسلامیہ پاکستان کے لئے جغرافیائی
د کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ اسلام بین الاقوامی نظریات زندگی کا حامل ہے وہ جغرافیائی حدود میں جکڑا نہیں جا سکتا۔ پاکستان کی ملت اسلامیہ
لئے ایشیا اور اس کی جغرافیائی حدود کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ یہ جغرافیائی حدود ان فرقوں اور قوموں کے لئے تو کوئی دلچسپی رکھ سکتی ہیں۔ جو محدود
پرستی اور قومی حدود سے بالاتر ہو کر سوچنے کے عادی نہیں ہیں۔ پاکستان اور اس کے لوگوں کے لئے ان حد بندیوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے
لئے ہماری قیادت کو ڈپلومیسی کی بجائے حقیقت پسندی سے کام لینا چاہیئے۔ بے مقصد تماشاؤں پر وقت، روپیہ اور صلاحیتیں ضائع کرنا
مندی نہیں۔

● مصر کی نجیب حکومت اور اخوان المسلمین :

۱۲ اور ۱۳ جنوری کی درمیانی رات سے اخوان المسلمین کے لئے آزمائش وابتلاء کا دوسرا دور شروع ہوا ہے (پہلا دور شاہ فاروق کی
ی حکومت کے زمانہ میں آیا تھا۔) اس رات مصر کی انقلابی کونسل نے سارے مصر میں اخوان المسلمین کے سینکڑوں قائدین اور ممبروں کو اچانک گرفتار
اور اس جماعت کو ممنوع قرار دینے اور اس کے مرکزوں اور املاک پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنے اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا...
ت کے خلاف الزام یہ ہے کہ وہ انگریزوں کے ساتھ مل کر نجیب حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کر رہی تھی —— اگر الزام اس نوعیت کا ہوتا کہ
ن المسلمین سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لئے نجیب حکومت کا تختہ الٹنا چاہتی تھی تو بات سمجھ میں آنے والی ہوتی مگر اخوان المسلمین کے خلاف
یز کے ساتھ ساز باز کر کے مصر کی قومی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کا الزام کچھ ناقابل فہم سی بات ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اخوان المسلمین
لی طور پر ابتدا ہی سے برطانوی استعمار پرستی کی سخت مخالف رہی ہے بلکہ فاروقی شہنشاہیت کے دور میں جو تشدد اور ظلم اس جماعت
پر کیا گیا وہ برطانیہ کے اشارے اور برطانوی استعمار کی مخالفت کی وجہ ہی سے روا سمجھا گیا تھا۔ پھر جب جنرل نجیب اور اس کے فوجی ساتھیوں

نے شاہ فاروق (جو برطانوی استعمار پرستی کا سب سے بڑا آلہ کار تھا) کی حکومت کا تختہ الٹا تو اخوان المسلمین نے اس فوجی انقلاب کی کافی حما[یت کی] کیونکہ نجیب خود ایک مذہبی آدمی تھے اور انفرادی زندگی میں ان کی مذہبیت خاصی نمایاں تھی۔ اس لئے انھوں نے اپنی حکومت کو بنانے کی خاصی کوشش کی۔ انھوں نے مساوات، سادگی اور خدمت کے اسلامی اصولوں کو خاص طور پر اپنایا۔ اور وہ اخلاقی اور سماجی کاموں میں اصلاحات کو اختیار کرتے رہے۔ یہی وجہ تھی کہ اخوان المسلمین نے جنرل نجیب کے لائے ہوئے فوجی انقلاب کا نہایت خندہ پیشانی سے استقبال کیا اس سے یہ توقع قائم کی کہ وہ اپنے مخلصانہ اسلامی جذبہ کے تحت ان تمام باتوں کو آہستہ آہستہ ختم کر دیگی جنکا تعلق دنیا پرستی کے نظریات سے ہے یا جو اور محض خود غرضی اور انسان کی خواہش پرستی سے پیدا ہوتی ہیں۔ اخوان المسلمین کا یہ خیال بھی تھا کہ نجیب حکومت مغرب کے الحادی نظریات کو جو نے مذہب اور سیاست کو ایک دوسرے سے الگ کرکے آزاد مسلم دنیا کو اپنا غلام بنا رکھا ہے اور سیاست میں مغربی اصولوں کو رائج کرکے ذہنی کی خود داری اور خودی کو ملیامیٹ کر دیا ہے مصر کی سرزمین سے نیست و نابود کر دے گی۔ اس لئے اخوان المسلمین کی پالیسی فوجی حکومت کے خیر خواہی اور خیر سگالی کی پالیسی تھی۔ وہ نجیب کی حکومت کے ساتھ مشترک امور میں تعاون بھی کرتی رہی اور اسے اسلامی خطوط پر چلنے کے مشورے بھی رہی اور پچھلے دنوں حکومت اور اخوان المسلمین میں سمجھوتا بھی ہو گیا تھا اور دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اب یکایک مصر کی نجیب حکومت نے اخوان کے خلاف جو قدم اٹھایا ہے اور جس الزام کی آڑ لے کر اٹھایا ہے وہ خلاف توقع بھی ہے اور ناقابل فہم بھی، دراصل حالات وہ نہیں تھے جو انھیں ظاہر صورت نظر آتے رہے۔ نجیب کی حکومت اپنی انفرادی مذہبیت کے باوجود اپنے مزاج کے لحاظ سے لادین اور قوم پرست تھی ہے اور در پردہ وہ اسلام عرب قومیت کی ہی داعی رہی۔ مگر چونکہ انقلاب کے وقت ملک میں اخوان المسلمین کی ہمہ گیر اسلامی تحریک اپنی مقبولیت کے ساتھ موجود تھی۔ اور نجیب کو شروع شروع میں اس مقبول عام مذہبی جماعت کی تائید کی۔ اس لئے ضرورت تھی کہ انقلاب صرف فوجی حمایت سے لایا گیا تھا اور اسے رائے عامہ کی تائید نہیں تھی۔ اسلئے عام سیاسی جماعتوں کو سختی اور قوت کے ساتھ کچل دینے کے باوجود اخوان المسلمین کو ایک مذہبی جماعت کی حیثیت سے برقرار رہنے د[یا] تاکہ اسکی مدد سے انقلابی حکومت محدود مذہبی جامہ اوڑھ کر عوام میں مقبولیت حاصل کرے اور حقیقت یہ ہے کہ نجیب کی حکومت نے جو بعد میں مقبولیت [حاصل کی] وہ بڑی حد تک اخوان المسلمین ہی کی تائید کی وجہ سے تھی مگر افسوس ہے کہ جب اس فوجی حکومت نے اپنی جڑیں مضبوط کر لیں تو اقتدار کے نشے [میں] ڈوبی ہوئی اس محدود مذہبیت نے جو دراصل اندر سے مغرب پرست رہی تھی مگر اپنے ظاہر کو نیم مذہبی ملمع سازی کے ذریعہ جاذب بنائے ہو[ئے تھی] اس بات کو گوارا نہ کیا کہ اب کوئی ایسی مقبول جماعت جو پوری زندگی کو اسلام کے تابع رکھنے اور سوسائٹی سے مذہب کو سیاست سے الگ [کرنے] کے تضاد اور انتشار کو مٹانے کا نصب العین رکھتی ہے اس کے مدمقابل رہے۔ چنانچہ وہ موقع ملتے ہی مذہب کے ہمہ گیر تصور پر اپنی پوری [قوت] کے ساتھ ٹوٹ پڑی۔ نجیب حکومت نے اخوان المسلمین کے خلاف جو بدترین قدم اٹھایا ہے وہ اسی نظریاتی کشمکش کا نتیجہ ہے کہ آیا سیاست [مذہب] کے پیچھے چلنا چاہیے یا اسلام کو سیاست کے پیچھے ——— مصر حکومت کے اس اقدام سے یہ بات بھی بڑی اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ تنگ نظری [اور] حقیقی دینداری کے خلاف کہاں تک جا سکتی ہے۔ حکومت مصر کا یہ پروپیگنڈہ بالکل غلط ہے کہ اخوان نے انگریز کے ساتھ سازباز کی تھی ا[خوان کے] لیڈر حسن الہضیبی نے اس الزام کی سختی کے ساتھ تردید کی ہے انھوں نے صاف طور پر کہا ہے کہ "ہم نجیب حکومت سے کہیں زیادہ برطانوی استعمار کے مخالف ہیں ——"

ان تمام جماعتوں کے لئے جو اسلامی ممالک بلکہ ساری دنیا میں اسلامی انقلاب کے لئے جدوجہد کر رہی ہیں مصر حکومت کے اخوان [کے خلاف اس] اقدام میں ایک بہت بڑا سبق ہے۔ قوم پرست حکومتیں خواہ وہ ظاہر اطوار پر اپنی ملکی اور بین الاقوامی سیاسیات میں اسلام کو کتنی ہی اہمیت [دے رہی] ہوں۔ اپنے فطری مزاج کے لحاظ سے اسلام کے ہمہ گیر تصور حیات اور اسلام کے فکری انقلاب کی داعی جماعتوں کو اپنے ا[ندر بر]داشت نہیں کر سکتیں۔ یہ حکومتیں اپنی داخلہ اور خارجہ پالیسیوں کی تراش خراش اور ان کو مرتب کرنے میں ایسے رخنے ضرور رکھ[تی ہیں جن] کے ذریعے اسلام پسند عناصر پر کسی خاص وقت اور کسی خاص انداز میں کاری ضرب لگائی جا سکے۔

ماہنامہ مشیر کی اشاعتِ خاص

عام رسائل کی طرح مشیر نے بھی اپنی اشاعتِ خاص کے لئے بڑے اہتمام کی کوشش کی تھی اور اکتوبر سنہ ۵۳ء کے شمارے میں تو یہاں تک اعلان لہ اس میں مختلف ملکوں کے ادیبوں کی تخلیقات نظر آئیں گی مگر ہم جانتے تھے کہ یہ کام اس قدر آسان نہیں جس قدر اسے سمجھ لیا گیا تھا۔ غیر زبانوں کے ل تخلیقات کا پورا پورا جائزہ لینا اور پھر اپنے فکری معیار کے مطابق ان کے تراجم کا ایک منفرد انتخاب پیش کرنا یہ کام بظاہر آسان سہی مگر انتہائی دشوار کے لئے صرف مدیرانِ رسائل کے ذوق کی پاکیزگی اور بلندی کافی نہیں ہوتی بلکہ ایسے قلمکاروں کے تعاون کی بھی ضرورت پڑتی ہے جو غیر معمولی کاوش و پہچان بین کا جذبہ اپنے اندر رکھتے ہوں اور ساتھ ہی ساتھ صالح اور غیر صالح فکری رجحانات کا پورا پورا اندازہ بھی لگا سکتے ہوں۔ اس طرح کا کام لئے ان دونوں خصوصیات کا ہونا لازمی ہے اگر ان میں سے کوئی خصوصیت بھی قلمکار کے اندر نہیں پائی جاتی تو یہ کام نہ صرف ہمارے نقطۂ نظر سے ادھورا ہو کر رہ جائے گا بلکہ اس طرح کا جو بھی انتخاب ہم پیش کریں گے وہ دوسروں کے لئے گہرے تاثر کے بجائے باعثِ تضحیک بن کر رہ جائے گا۔

ان دونوں خصوصیات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جب ہم مشیر کی اس اشاعتِ خاص کی طرف توجہ کرتے ہیں تو ہمیں یقیناً ایک حد تک مایوسی ہوتی ہے عتِ خاص کو اگر صرف افسانہ نمبر کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ اس میں سوائے افسانوں کے اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ حالانکہ اس کے دامن کو ڈرامے، شاعری اور مضامین ہر صنفِ ادب کے نمونوں سے مزین ہونا چاہئے تھا اور اسی وقت یہ انتخاب دنیا کے مختلف ادیبوں کے صالح افکار کی ا صحیح ثبوت دے سکتا تھا مگر ایسا نہ ہو سکا چند افسانوں کا ایک مجموعہ ہے اور وہ بھی زیادہ تر ٹالسٹائی کے افسانوں پر مشتمل ہے۔ اگر واقعی جاتی تو ہر ملک اور ہر زبان کے ادیبوں، شاعروں اور نقادوں میں سے ایسے افراد کی ایک کثیر تعداد ہمیں مل سکتی تھی جنھوں نے انسانیت کی اعلیٰ نمائندگی میں بڑے نمایاں کارنامے انجام دیئے ہیں لیکن اپنے قلمکاروں کی سہل پسندی کو کیا کہا جائے۔ ان کی نظرِ انتخاب لے دے کر حرفِ ٹالسٹائی ے دوسرے افسانہ نگاروں ہی پر جم کر رہ گئی۔ اس کی وجہ سے ایک طرف تو بڑی بے کیفی سے یکسانیت شروع سے آخر تک پیدا ہو گئی۔ اور ف یہ خیال ستانے لگتا ہے اگر صرف چند افسانہ نگاروں کی تخلیقات ہی سے ہمیں روشناس کرانا تھا تو پھر انھیں افسانہ نگاروں کے یہاں اس دوسرے افسانے ہمیں مل سکتے تھے جو مقصدی ہونے کے ساتھ ساتھ فن اور ٹکنک کی حیثیت سے بھی نسبتاً زیادہ پختگی کے حامل تھے۔ بہرحال بہ عرض کر چکا ہوں کہ ان نقائص کی ذمہ داری زیادہ تر ہمارے لکھنے والوں ہی پر عائد ہوتی ہے۔ ان افسانوی تخلیقات میں کچھ افسانے طبع زاد دہ بھی اس قدر روکھے، پھیکے اور بے جان محسوس ہوتے ہیں۔ تقریباً نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اگر ابن فرید اور منظر حسین نے اس طرف توجہ کی بڑی حد تک پوری کی جا سکتی تھی۔

نظموں اور غزلوں کے انتخاب میں بھی اگرچہ زیادہ بلندیٔ ذوق کی جھلک نہیں ملتی تاہم جو کچھ بھی پیش کیا گیا ہے خاصا ہے۔ نعیم صدیقی، انور صدیقی آد کی تخلیقات ان فن کاروں کی شعوری پختگی اور غیر معمولی شاعرانہ صلاحیتوں کے بڑے کامیاب نمونے پیش کرتی ہیں

ان کوتاہیوں کی طرف اوپر اشارے کئے گئے ہیں ان کے باوجود ادارہ مشیر کی یہ نئی پیشکش قابلِ قدر اور ایسے وقت میں جب کہ محمود فاروقی ے سبکدوش ہو چکے ہوں اور خاص نمبر کی تیاریوں کی کاوشیں عبدالغفور بیگ کے کندھوں پر آ گئی ہوں یہ واقعی بڑی ہمت کا کام تھا!!

جمیل احمد فاروقی

ہڈسن ڈبلیو ایچ •

اَدَب کی اخلاقی ذمّہ داریاں

یکہ ہمیں پوراحق پہنچتا ہے کہ ہم انسانوی ادب ([illegible]) کے کسی بھی شعبے کے متعلق رائے قائم کرتے وقت اخلاقی قدر کے مسئلہ کو بھی اس میں شامل کریں ــــ اور یہ کہ جب تک یہ مسئلہ طے نہ ہو، یہ حتمی بات لیے ہے ہماری رائے نامکمل رہے گی۔ اس مسئلہ کے متعلق میرے ذہن میں شک وشبہ کا شائبہ تک موجود نہیں۔

شاعری کو تنقید حیات بتاتے وقت شاید نگلس سائمنڈز نے لکھا تھا" اگر ادب کی تاریخ میں ـــ اس کے آغاز سے لیکر ہمارے زمانے تک، کوئی بات لازمی طور پر موجود ہے تو وہ یہ حقیقت ہے کہ انسانیت کے جذبۂ تحفظ خویش نے ہر اس فن کو ٹھکرایا ہے جو اس کی ذہنی نشوونما اور اس کی اخلاقی بقا کے لئے کچھ پیش نہیں کرتا۔ ان خیالات کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر جو اس کی اپنی ترقی کے لئے سمِ قاتل کا حکم رکھتے ہیں نادیر سلامت نہیں رہ سکتا۔

ہر وہ فن جو حقیقی عظمت کا طالب ہو، لازماً اخلاق پر در ہونا.. چاہیئے اسے لازمی طور پر برتاؤ کے ان اصولوں اور احساس کے اس لہجہ سے ہم آہنگ ہونا چاہیئے جو مہذب انسانیت کے تحفظ اور مضبوطی کے لیے ضروری ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ فن کار کو شعوری طور پر معلم یا اخلاقیات کا منہ زور مبلغ ہونا چاہیئے۔ نہیں! آرٹ اور اخلاق کے مقاصد الگ ہیں۔ اخلاق تجزیہ کرتا ہے اور تعلیم دیتا ہے۔ جب کہ آرٹ انتشار ختم کرنا اور انبساط کا باعث بنتا ہے۔ لیکن چونکہ جملہ فنون خیالات اور احساسات سے ترکیب پاتے ہیں۔ اس لئے اس سے نکلتا ہے کہ عظیم آرٹ وہ ہے جس کا خمیر احساسات اور خیالات کی مکمل ترکیب سے ... شاعر فطرت انسانی کو بحیثیت مجموعی جتنا مکمل دیکھے گا۔ اور اس ... میں زندگی ـــ پیچیدہ اور مکمل زندگی جتنی مکمل ہوگی اتنا ہی وہ عظیم شاعر ہوگا۔ آج وحشت کے دور سے لیکر موجودہ تہذیب تک نسل انسانی کا ایک پیہم جدوجہد نظر آتی ہے کہ انسان کے اخلاقی وقار برقرار رکھا جائے اور اسے ترقی دی جائے۔ یہ صرف اخلاقی اقدار کے اور نشوونما وارتقا کی بدولت ہے کہ ہم پیش قدمی کر رہے ہیں۔ ہمارے قویٰ کا ایک مکمل کل میں ہونا اخلاقی ہم آہنگی ہے۔ پس وہ فن کار جو عظمت کے آرزومند ہیں نہ اخلاقیات سے بے نیاز ہو سکتے ہیں نہ ان کے مخالف

ان قابل قدر خیالات کا نثری افسانہ کے سوال سے خصوصاً انطباق ہوتا ہے۔ ناول یا تخیلی ادب کے کسی دوسرے شعبے کے بارے میں یہ اکثر کہا جاتا ہے کہ فن کو بحیثیت فن کے اخلاق سے کوئی واسطہ اس کا جواب یہ ہے کہ جن معنی میں جناب سائمنڈس اخلاقیات کو لیتے ہیں جو معنی اس لفظ سے اس ساری بحث میں لئے گئے ہیں اور اس کا دائرہ بھی زندگی پر ہوتا ہے اس لئے فن زندگی کی ذمہ داریوں سے کنارہ کرے ـــ یہ ممکن نہیں! یہ حد درجہ کی بیہودگی ہوگی اگر ہم کہیں کے فن کار ـــ کی لائن کوئی بھی کیوں نہ ہو، اخلاق کے مرغزار سے الگ بھی رہ سکتا۔ یقیناً ہم یہ بات ایک ناول نویس کے متعلق بھی کہہ سکتے ہیں کیوں وہ زندگی بحث کرتا ہے اس لئے اسے زندگی میں پیش آنے والے اخلاقی حقائق مسائل سے بھی بحث کرنا ہوگی اور یہ اس سے نتیجہ نکلتا ہے۔۔۔۔ کے فلسفہ کی روح اور رجحان پر مبنی ہوگی اور اسکی پیشکش کی عظمت کا ایک بڑی حد تک اسی پر ہوگا

An introduction to the study of literature

البلاغ مئی ۱۹۶۷ء

راج اور سماج

انسانیت ہے شعلۂ لرزاں نہ پوچھئے
نظم جہاں ہے زلف پریشاں نہ پوچھئے
انسان پر حکومتِ انساں نہ پوچھئے

یہ جنگ باہمی یہ تعصب یہ لوٹ مار
یہ عصمتوں کی چیخ یہ اخلاق کی پکار
تاریکیٔ ہوس ہے پرافشاں نہ پوچھئے

الحاد و جہل و نفس پرستی کی دھوم ہے
انساں کی بے نگاہی و پستی کی دھوم ہے
کس شان سے ہے رقص میں شیطاں نہ پوچھئے

وحشت فشاں مہیب اندھیروں کی جیت ہے
سانپوں کا ہے ہجوم سپیروں کی جیت ہے
امن و سکوں ہے بے سر و ساماں نہ پوچھئے

باطل کی جیت حق و صداقت کی ہار ہے
ہمدردی و خلوص و مروّت کی ہار ہے
کانٹوں میں پھنس گیا ہے گلستاں نہ پوچھئے

اللہ کی بھی یاد، بتوں سے بھی واسطہ
اک پاؤں سوئے کعبہ ہے، اک سوئے بتکدہ
کس حال میں ہو آج مسلماں نہ پوچھئے

وہ قوم کھو رہی ہے خود اپنا ہی اب بھرم
سونپی گئی تھی جس کو نگہبانیٔ حرم!
ہے تار تار دامنِ ایماں نہ پوچھئے

ہے تذکرہ ترقیٔ اقوامِ غرب کا!
حیراں ہوں میں نگاہِ مسلماں کو کیا ہوا
رکھا ہوا ہے طاق پہ قرآں نہ پوچھئے

(حیات لکھنوی)

ہریم بخاری •

سچّی کہانی

ڈائننگ روم کی فضا کچھ افسردہ سی تھی انور آہستہ آہستہ کچھ
رہا تھا ربیعہ سن رہی تھی مگر نہایت بے دلی کے ساتھ اور شاید
سے کچھ بھی نہ سنا ہو اس کے ہاتھ میں السٹریٹڈ ویکلی کا تازہ پرچہ
تھا ورق الٹتی جاتی تھی کبھی کوئی تصویر دیکھ لی۔ کبھی کہیں سے دو چار
سطریں پڑھ لیں پھر ورق الٹ دیا انور ہر لمحہ افسردہ تر ہوتا جا رہا تھا۔۔ وہ
یکایک خاموش ہو گیا۔ ربیعہ کچھ پڑھ رہی تھی۔

چپ کیوں ہو گئے آپ؟ اس نے اخبار سے نظر اٹھاتے
ہوئے کہا مجھے دیواروں سے کچھ نہیں کہنا ہے، انور نے طنز کیساتھ
جواب دیا۔ خوب! تو گویا میں دیوار ہوں۔ ربیعہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔
ربیعہ میں مانتا ہوں کہ تم ذہین ہو۔ مگر دوسروں کو بیوقوف بنانے کی...
کوشش کرنا ذہانت کا کوئی اچھا مصرف نہیں ہے۔

یا اللہ آپ تو خواہ مخواہ برا مان گئے۔ میں نے کچھ کہا بھی ہو۔

دیکھو ربیعہ میں بار بار تمہیں تکلیف دینے نہیں آؤں گا۔ مگر یہ
نا ممکن ہے کہ جو کچھ مجھے کہنا ہے تم اسے صرف ایک بار توجہ کیساتھ سن لو۔
اس کا نتیجہ میں پہلے سے جانتا ہوں مگر اتمام حجت ضروری ہے۔

میں پوری توجہ کے ساتھ سن رہی ہوں۔ آپ فرمایئے ربیعہ
نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

انور۔۔۔ چند لمحے خاموش رہا جیسے کچھ سوچ رہا ہو پھر اس نے
نہایت پست آواز میں کہنا شروع کیا۔

خدا شاہد ہے ربیعہ! اب تو یہ حالت ہے کہ بیان کر دوں تو
شاید تمہیں یقین نہ آئے افسانوں میں اس قسم کی باتیں بہت پڑھیں مگر کبھی
ان کا اثر نہ ہوا ہمیشہ یہی سمجھا کہ غالباً بات کہنے کا یہ بھی ایک
طرز بیان کا ایک اسلوب ہے اور سچ پوچھو تو یقین آنے کی...
بھی تمہیں بھوک اور نیند انسانی فطرت کے تقاضے ہیں اور ان کی

تسکین پر زندگی کا انحصار ہے مگر کیا تمہیں یقین آئے گا کہ پچھلے مہینے میں
کتنی ہی راتیں ایسی بھی گذریں کہ آدھی آدھی رات تک نیند نہ آئی۔ کروٹیں بدلتے
بدلتے، کبھی کبھی رات کے دو اور تین بھی بج گئے اور پچھلی رات تو قیامت
کی رات تھی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئی دل کی بے چینی اور جسم کی
ماندگی میں تمہیں کیوں کر سمجھاؤں۔

پچھلے دو ہفتوں سے کھانے پینے کی جو صورت ہے خود میرے لئے
باعث حیرت ہے ناشتا کیا کیا نہ کیا۔ کسی دن دوپہر کا کھانا غائب، کبھی
رات کو بھی یوں ہی سو رہے۔ کھانے کو جی ہی نہ چاہا۔ غرض اسی طرح وقت
گذر رہا ہے اور کچھ معلوم نہیں اس کا انجام کیا ہوگا روحانی کوفت اب
میرے جسم کو بھی کھا رہی ہے اور بالکل ممکن ہے کہ.....

آپ کو کسی اچھے ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہیئے ربیعہ نے دخل دیتے
ہوئے کہا۔

تمہارے مشورہ کا شکریہ مگر اس کا علاج کہ ڈاکٹر نے نوش حیات کے
بدلے مجھے صرف زہر قاتل دینے کا تہیہ کر لیا ہے اور....

یہ محض آپ کا خیال ہے؟ ربیعہ نے پھر انور کا قطع کلام کرتے
ہوئے کہا

ڈاکٹر کڑوی دوا اس لیئے ہرگز نہیں دیتا کہ اسے مریض سے کوئی
دشمنی ہوتی ہے بلکہ وہ اسکی صحت اور بہبودی چاہتا ہے تلخ دوا ہی نہیں
بلکہ کبھی کبھی اسے نشتر سے بھی کام لینا پڑتا ہے نشتر کی اذیت خواہ کتنی ہی
زیادہ کیوں نہ ہو مگر ڈاکٹر کی نیت پر شبہ کوئی نہیں کرتا۔

ربیعہ! میں اس وقت تم سے بحث کرنے نہیں آیا ہوں جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں
خدا کے لیئے کہہ لینے دو اور مجھ پر تھوڑا سا جبر کر کے اسے سن بھی لو۔

اچھا اب نہ بولوں گی آپ کہیئے۔

کیا کہوں اور کیا نہ کہوں۔ پہلے میرے چند سوالوں کا جواب دیجیئے

رضیہ نے جب تم سے پوچھا تھا کہ ربیعہ کیا تم بھی انور کو چاہتی ہو تو
ہاں تھا کہ چاہت کا حال تو مجھے معلوم نہیں مگر میں ان کے جذبات
م ضرور کرتی ہوں تمہارے اس جواب کو اعترافِ محبت تو نہیں بلکہ
ن ان لفظوں کے آخر کچھ معنی تو ہیں۔ معلوم نہیں تمہارا قول درست
ہارا موجودہ طرزِ عمل۔ کیا آج بھی تم میرے جذبات کا احترام کرتی ہو
کرتی ہوں اور اس سے زیادہ جتنا آپ سمجھتے ہیں ربیعہ نے
کے ساتھ کہا۔

ربیعہ تمہاری باتیں میرے لئے معمہ ہیں تم نے اکثر اپنی...
میں بیٹھ کر میری ذہانت کی تعریف کی ہے اور مجھے تمہاری اس پیشین
بھی علم ہے کہ انور بی اے میں ساری یونیورسٹی میں فرسٹ آئے گا
ناق سے تمہاری وہ پیشین گوئی پوری بھی ہو گئی۔ لیکن میں سوچتا ہوں
تی میں ایک ذہین آدمی ہوں تو پھر تمہاری باتیں میری سمجھ میں کیوں
ن؟ خیر میں نہایت صفائی کے ساتھ چند باتیں تم سے کہنا چاہتا
، مجھے امید ہے کہ تم بھی اور کسی مصلحت کا لحاظ کئے بغیر اتنی ہی
کے ساتھ جواب دو گی۔

اپنے منہ سے اپنے متعلق کچھ کہنا خود ستائی سمجھی جاتی ہے۔ مگر بیان واقعہ
دستائی نہیں سمجھتا اور امید ہے کہ تم بھی نہ سمجھو گی خصوصاً ایسی
، کہ ہم دو کے سوا کوئی تیسرا درمیان میں نہیں شرافت نسبی پر
ں ہرگز نہیں لیکن دنیا کے رسمی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو
ن ان خاندانوں میں ایک ہے جو ان اطراف میں معزز اور شریف
تے ہیں کیا تم اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہو۔

"بیشک"

تمہیں معلوم ہے کہ پچھلے مہینے تمہارے ابا جان نے والد صاحب
ے عمائدین شہر کو اتنی دھوم دھام کا ڈنر کیوں دیا تھا؟
معلوم ہے اس امر پر اظہارِ مسرت کے لئے کہ آپ کے والد
شنر ہو گئے یہ ضرور ہے کہ وہ ۶ مہینے کے بعد ریٹائرڈ ہو جائیں
ہ یہ اعزاز کتنوں کو نصیب ہوتا ہے۔
کمشنر کا بیٹا ہونا غالباً تمہارے نزدیک کوئی بری بات نہیں
"ہرگز نہیں"

میرے اخلاق و اطوار میں کوئی ایسی بات نظر آتی ہے جو تمہارے
نقطۂ نظر سے قابلِ اعتراض ہو۔
نہیں میں نے تو ہمیشہ آپ کے پاکیزہ اخلاق کی ستائش کی ہے
یونیورسٹی میں ہاکی کا ایک اچھا کھلاڑی اور فٹ بال ٹیم کا کپتان ہونا غالباً
جسمانی صحت کا ایک معقول سرٹیفکیٹ ہے۔
"یقیناً"

اپنی شکل و صورت کا ذکر مجھے زیب نہیں دیتا لیکن جہاں تک میرا
خیال ہے میری صورت اگر اچھی نہیں تو کچھ ایسی بری بھی نہیں تمہارا کیا
خیال ہے۔
کالج کی لڑکیوں میں جن کی شکل و صورت کا اکثر چرچا رہتا ہے اسکی
خوب روئی کے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔
چلو! اب مجھے بناؤ نہیں۔ کالج کی دوسری لڑکیوں کی رائے سے
مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں فقط تمہاری رائے جاننا چاہتا ہوں
مگر میری رائے تو آپ بہت پہلے سے جانتے ہیں ربیعہ نے...
دوسری طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔
اچھا صرف اتنا بتا دو کہ تمہیں میری صورت سے وحشت تو نہیں ہوتی
بعض اوقات آپ خواہ مخواہ ستانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔
جہاں تک میں اندازہ کر سکتا ہوں تمہاری گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ بظاہر
میرے اندر ایسی کوئی بری بات نہیں جس کی بناء پر تم مجھے ہمیشہ کے لئے
اپنے رنج و راحت کا شریک بنانا پسند نہ کرو پھر کیا سبب ہے کہ میری حالت
کو اچھی طرح جانتے ہوئے، سمجھتے ہوئے، کل کے خط میں تم نے مجھے صاف
جواب دیدیا اور پھر اس کی کوئی وجہ بھی بیان نہیں کی۔
ربیعہ سنبھل کر بیٹھ گئی اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر سنجیدہ ہو گیا اس
نے دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا۔
میرا خیال تھا کہ آپ میرے انکار کی وجہ سمجھ گئے ہوں گے۔
مگر جذبات کے طوفان میں انسان نہ کچھ دیکھ سکتا ہے نہ سن سکتا ہے
نہ سمجھ سکتا ہے میں نہیں چاہتی تھی کہ اپنی زبان سے اس تلخ
حقیقت کا اظہار کروں جو میری اور آپ کی دائمی وابستگی میں حائل
ہے مگر آپ مجبور کرتے ہیں تو مجھے بھی صاف صاف کہنا پڑے

جذبات کے ریلے میں بہہ جانے والی میرے سامنے ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے یعنی آئندہ زندگی۔ میرا سارا مستقبل۔ شادی کوئی ہنسی [illegible] نہیں۔ عمر بھر کا مشغلہ نہیں۔ میرا آج کا فیصلہ مجھے زندگی بھر کے لئے خوشحال یا بدحال بنا سکتا ہے۔

میری صاف گوئی سے آپ آزردہ نہ ہوں یہی تمام خوبیوں کے باوجود [illegible] ذاتی طور پر آپ کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتے آپ دوسروں کے دست نگر ہیں۔ آپ کے والد صاحب ایک معزز جاگیردار ہیں ان کے پاس دولت بھی [illegible] دولت کے آپ تنہا وارث نہیں ماشاءاللہ چار بھائی اور دو بہنیں اور [illegible] آپ کا شریک ہیں ذرا سوچئے تو آپ کا حصہ اس دولت میں کتنا ہوتا ہے۔ کل [illegible] کیا ہو جائیں گے اس کا حال کسی کو معلوم نہیں شاید بہت کچھ ہو جائیں۔ شاید کچھ بھی نہیں۔ [illegible] کا تمام دنیا ہے فقط امیدوں کے آسرے پر میں اپنی ساری زندگی کی بازی نہیں لگا سکتی ایسی شادی کسی طرح سٹے سے کم نہیں اور سٹہ کھیلنے والوں کو میں نے ہمیشہ تباہ و برباد ہوتے ہی دیکھا ہے۔

پھر میرے حالات اور افتادِ طبع سے بھی آپ واقف ہیں میں نے آنکھ کھول کر عیش و عشرت اور آرام و راحت کے سوا کچھ نہیں دیکھا اسی کی میں خوگر ہوں۔ ذرا سی تکلیف برداشت کرنا بھی میرے لئے دشوار ہے سیر و تفریح۔ پکنک، کلب، پارٹیاں جلسے میرے شب و روز کے مشغلے ہیں۔ بہت سے نوکر چاکر ہوتے ہیں موٹریں ہیں۔ گھوڑے ہیں بہترین اور لذیذ کھانے ہیں تفریح کے سامان ہیں میرے لئے یہ سب لوازمِ زندگی ہیں۔ اپریل کا مہینہ آیا اور پہاڑ پر چلے گئے۔ [illegible] کشمیر کبھی دارجلنگ کبھی شملہ کبھی مسوری گرمیاں وہاں گذاریں [illegible] کلکتہ کی سیر کبھی بمبئی ہو آئے غرض اسی طرح وقت گذارا [illegible] ایک عذاب بن جائے [illegible] موجودہ حالات کو دیکھئے میرے مطالبات کی اس طویل فہرست پر نظر ڈالئے اور ٹھنڈے دل سے سوچئے کہ ایسی شادی کا انجام سوائے ظلم کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ صرف دولت سے شادی کرنا چاہتی [illegible]"

[illegible] نے طنز کے ساتھ کہا۔

[illegible] مگر میرا مطلب صرف اس قدر ہے کہ انسانی [illegible] دولت بھی ایک لازمی چیز ہے مگر میں کسی ایسے شخص کو بھی اپنا شریکِ زندگی بنانے کے لئے کبھی تیار نہیں ہو سکتی جس کے پاس دولت کے سوا اور کچھ نہ ہو، دولت کے سوا اچھی صورت، اچھی سیرت، مکمل صحت، بھرپور جوانی، شگفتہ مزاجی، اعلیٰ تعلیم اور کم سے کم متوسط درجہ کی ذہانت اس شخص کی لازمی صفات ہیں جنہیں میں اپنا شریکِ حیات بنانا پسند کروں گی۔

"اور بالفرض ایسا آدمی نہ مل سکے تو؟"

"تو پھر ازدواجی زندگی سے تنہائی کی زندگی بہتر ہے۔"

"ربیعہ تم فطرت کے تقاضوں سے واقف نہیں ہو تنہائی کی زندگی۔ زندگی ہی نہیں ہوتی ہے مگر اس کا احساس انسان کو اس وقت ہوتا ہے جب پانی سر سے گذر جاتا ہے اور سوائے پچھتانے کے وہ کچھ نہیں کر سکتا تنہائی کے عذاب سے نجات پانے کے لئے انسان اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے مگر اس وقت اس کا سب کچھ بھی کوئی قیمت نہیں رکھتا۔"

"شاید آپ کا خیال صحیح ہو۔ مگر میں نے مغل شہزادیوں کے حالات پڑھے ہیں وہ مغل شہزادیاں جو زندگی بھر کنواری رہیں میں ایسی مشنری کی یورپین خواتین سے بھی ملی ہوں جنہوں نے ساری عمر تجرد میں گذار دی میں ایسی کئی استانیوں سے واقف ہوں جن کے سر سپید ہو گئے اور جنہوں نے کبھی شادی نہیں کی اور پھر ان سے کبھی کوئی ایسی لغزش بھی سرزد نہیں ہوئی جس کی بنا پر انہیں اخلاقی مجرم قرار دیا جا سکے اس لئے میں سمجھتی ہوں کہ فطرت کے جن تقاضوں کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے ان کی اہمیت اتنی نہیں جتنی آپ سمجھتے ہیں یقیناً انہیں مغلوب کیا جا سکتا ہے اور ان کی خاطر اپنے سارے نظامِ زندگی کو بدل ڈالنا اور عیش و راحت کو ٹھکرا کر تکلیف و مصائب پر اپنی جان پر لینا نہ صرف ناعاقبت اندیشی بلکہ خدا کی ناشکری بھی ہے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو کاش تمہیں کسی سے محبت ہوتی اس وقت شاید تمہاری منطق کا انداز کچھ اور ہوتا۔"

"مجھے افسوس ہے کہ جذبات کے جوش میں آپ نے محبت کی نوعیت کو سمجھنے اور اس کے نتائج پر غور کرنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ محبت کی شادیاں میں نے دیکھی ہیں اور ان کے نتائج سے بھی واقف ہوں محبت کا جذبہ کتنا ہی قوی کیوں نہ ہو مستقل چیز نہیں ہر جذبے کی طرح محبت [illegible]

ہیں یہ بھی دیکھا پڑھا جاتا ہے اور اکثر تماشہ بھی ہو جاتا ہے چند بھینے اور شادہ و نادر چند سال سے زیادہ اسکی عمر نہیں ہوتی۔ اسکے بعد جب زندگی کی چند۔۔ تلخ حقیقتوں سے سابقہ پڑتا ہے اور آپس میں ناخوشگواریاں پیدا ہوتی ہیں تو محبت کسی کی مدد کو نہیں آتی محبت اور صرف محبت تمام مادی و جسمانی ضرورتوں کی کفیل نہیں ہو سکتی اس کے لیئے دولت اور صرف دولت کی ضرورت ہے میرا خیال ہے کہ میں نے نہایت صفائی کے ساتھ اپنے خیالات آپ کے سامنے پیش کر دیئے مجھے امید ہے کہ آپ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں گے اور میرے خلوص اور صداقت پر کبھی شک نہ کریں گے۔

ربیعہ خاموش ہو گئی اور انور بالکل ساکت و صامت بیٹھا ہوا تھا کئی منٹ تک ڈرائنگ روم میں بالکل سناٹا رہا۔ آخر انور نے پہلو بدلا اور نہایت پست و حزیں آواز میں بولا۔

ربیعہ قدرت نے تمہیں ایک ہیرے کے مانند بنایا ہے بہت قیمتی بلکہ انمول ہیرا۔ مگر قدرت کی ستم ظریفی دیکھو کہ اس کی تابانی سے جب میری آنکھیں بالکل خیرہ ہو گئیں اور اسے پالینے کے سوا دنیا میں اب اور کوئی آرزو نہیں تو مجھے بتایا جاتا ہے کہ ہیرے تاج میں لگتے ہیں امیروں کا زیور بنتے ہیں ہر کس و ناکس کے لیئے نہیں ہوتے ہاں اس ہیرے کی درخشندگی و تابانی دوسروں کے لیئے ہے اور اس کی ہلاکت آفرینی میرے لیئے سنا تھا کہ ہیرے کی کنی ستم قاتل ہوتی ہے مگر یہ خبر نہ تھی کہ میرا حصہ فقط زہر رہ گیا۔ اچھا ربیعہ خدا حافظ۔ غالباً یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ خدا کرے اپنی آرزو کے مطابق کسی تاج کی زینت ہو۔

وہ کھڑا ہو گیا ربیعہ پر ایک حسرت بھری نظر ڈالی اور کمرے سے نکل گیا ربیعہ کی گذشتہ شب بخیر، غالباً اس نے نہیں سنی۔

ربیعہ کے ساتھ اس آخری ملاقات کے بعد انور علیگڈھ چلا گیا یونیورسٹی میں آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان کی تیاری کرنے لگا اسکی غیر معمولی ذہانت، قابلیت اور پھر مسلسل محنت کا نتیجہ اس کی نمایاں کامیابی کی شکل میں ظاہر ہوا اور وہ ٹریننگ کے لیئے ولایت چلا گیا اور واپس [illegible]

کا بڑا ارمان تھا بہت دور دور سے لڑکی کی تلاش ہو رہی تھی ایسی لڑکی جو ہر طرح انور کی رفیق حیات بننے کی صلاحیت رکھتی ہو۔

ربیعہ کی شادی ابتک نہیں ہوئی تھی اور نہ انور کے دل سے اس کا خیال دور ہوا تھا مگر اس نے قطعی فیصلہ کر لیا تھا کہ ربیعہ سے شادی ہرگز نہ کرے گا ربیعہ نے اسکی محبت کو ٹھکرا دیا تھا صرف اسلیئے کہ اس کے پاس دولت کی کمی تھی اس کا خیال تھا کہ جس عورت کی محبت صرف دولت سے خریدی جا سکتی ہے اس سے زیادہ خطرناک انسان دنیا میں اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

انور کے بڑے بھائی اختر اودھ میں کہیں ڈپٹی کلکٹر تھے ان کی شادی بھی اسی سال ہوئی تھی اور ربیعہ کی سہیلی رضیہ جو انور کی ہم سبق بھی رہ چکی تھی اب انور کی بھابی جان تھی مگر انور ہمیشہ رضیہ ہی کہہ کر خطاب کرتا تھا دسمبر کا مہینہ تھا اختر ایک مہینہ کی چھٹی لے کر گھر آئے ہوئے تھے رضیہ بھی ساتھ تھیں بڑے دن کی تعطیل میں انور بھی گھر آیا کئی دن خوب چہل پہل رہی اب تک جن لڑکیوں کا پتہ چلا تھا ان کے متعلق انور کی والدہ نے انور سے گفتگو کی مگر ابھی کوئی بات طے نہیں پائی تھی کہ ایک دن تنہائی میں رضیہ اور انور کے درمیان باتوں ہی باتوں میں ربیعہ کا ذکر آگیا۔ ربیعہ کا نام سنتے ہی انور کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ اس نے رضیہ سے کہا۔

کیا اب تک ربیعہ کو کوئی دولت والا نہیں ملا۔

پیام تو کئی جگہ سے آئے مگر اس نے منظور ہی نہیں کیا۔

شاید اس کی دولت ربیعہ کی نظر میں نہیں جچی ؟

یہ بات نہیں۔

تو پھر کیا۔

اس نے کہا کہ محبت کے بغیر شادی کرنا ایسا ہی ہے جیسے انسان کسی یتیم خانے کا آنریری سکریٹری ہو جائے اور مجھ میں کسی کار خیر کی اتنی صلاحیت نہیں ؟

خوب۔ محبت اور شادی کا یہ نیا فلسفہ ربیعہ نے کب سے سیکھا۔

کیا تمہیں یقین ہے [illegible] کہتی ہے۔

[illegible]

نہیں اس کے خیالات تو جو پہلے تھے وہی آج بھی ہیں؟
یہ کیونکر ممکن ہے پہلے وہ دولت کی خواہشمند تھی اب محبت کی دلدادہ

منشہ—

خیالات کا یہ اختلاف محض ظاہری ہے تمہارے ولایت جانے کے
چند روز پہلے ایک مرتبہ اس موضوع پر ہمارے درمیان مفصل گفتگو ہوئی تھی میں
نے کہا ربیعہ۔ میں نہ کہتی تھی کہ انور ایک نہ دن کسی ممتاز حیثیت کا مالک ہو گا
تم نے بڑی غلطی کی کہ اس کی محبت کو ٹھکرا دیا۔ اس نے کہا رضیہ تم نہیں
جانتیں کہ انور کو آئی سی۔ ایس کس نے بنایا۔ میں انکار نہ کرتی تو شاید انور آئی
سی۔ ایس کبھی نہ بنتے۔ میں جانتی ہوں کہ محبت بے پناہ طاقت ہے میں
یہ بھی جانتی ہوں کہ محبت کی ناکامی جذبۂ انتقام کو مشتعل کر دیتی ہے یہ
انسانی فطرت ہے یہ تو ممکن تھا کہ انور آئی سی۔ ایس کے امتحان میں شریک
ہوتے لیکن ضروری نہیں کہ وہ کامیاب بھی ہو جائے میرے انکار نے ان
کے جذبات میں آگ لگا دی مجھ سے انتقام لینے کی صرف ایک ہی
صورت تھی یعنی وہ کوئی ایسا کارنمایاں کر کے دکھائیں کہ مجھے اپنی غلطی
کا احساس ہو جائے اور میں ان کی برتری تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاؤں
انھوں نے ایسا ہی کیا۔ محنت کی لگاتار محنت کی رات دن ایک کر دیے
اور بالآخر کامیاب ہوئے ہی میں چاہتی تھی اور اسی لیے یہ سب جتن
کئے تھے میری آرزو تھی کہ میرا رفیق زندگی سوسائٹی میں ایک نمایاں
حیثیت کا مالک ہو۔ تم تو جانتی ہو۔ انور کے سوا کبھی کوئی میرے جذبات
کی دنیا میں داخل نہیں ہو سکا۔ مگر میں نے اس حقیقت کو ایک
حد تک تم سے بھی چھپایا۔ مقصود صرف اتنا تھا کہ انور اپنی..
فطری صلاحیتوں سے پورا پورا کام لیکر دنیا میں کوئی مقام حاصل
کر سکیں غالباً اب تم اندازہ کر سکو گی کہ انور کے آئی سی۔ ایس ہونے
میں میری تدبیر کو کس حد تک دخل ہے میں نے۔ مگر ربیعہ انور کے
ساتھ شادی کرنے سے انکار کرتے وقت تم نے یہ سوچا کہ
ایک بار قطعی انکار کر کے پھر اقرار کی کیا صورت ہو گی اس نے کہا۔
ہاں مجھ سے چوک ہوئی اس وقت اس بات کا خیال ہی نہ آیا سوچا تھا
کہ خود بخود کوئی صورت نکل آئے گی مگر قدرت کو شاید یہی منظور تھا
کہ ہم دونوں کبھی ایک دوسرے کو اپنا نہ بنا سکیں میں نے کہا اگر تم

اجازت دو میں انور سے تحریک کروں۔ اس نے کہا رضیہ مر جانا
قبول ہے اور التجا کی ذلت گوارا نہیں مجھے اپنی عزت، محبت سے کہیں
زیادہ پیاری ہے محبت کو عزت پر قربان کر سکتی ہوں لیکن محبت کی
خاطر کسی کی نظروں میں سبک ہونا کسی طرح برداشت نہیں کر سکتی،
تم جانتے ہو۔ وہ بلا کی خوددار لڑکی ہے خیر اس وقت تو بات ٹل گئی
مگر تمہارے ولایت سے آنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ تمہا[رے]
کے باوجود تمہارے دل سے اس کا خیال اب تک نہیں نکلا اور خو[د]
اس کی بھی یہی کیفیت دیکھی تو ایک دن میں نے پھر اس ذکر کو چھیڑ[ا]
وہ یکایک مجھ سے چمٹ کر رونے لگی۔ اس نے کہا رضیہ اب اس
کو چھوڑ ہی دو تو بہتر ہے میں تہیہ کر چکی ہوں کہ ساری زندگی اسی ط[رح]
گزار دوں گی۔ کسی دوسرے سے شادی کرنے کا سوال ہی پید[ا]
نہیں ہوتا۔ اور اگر خود بھی خواستگار ہوں تو میں انکار کر دوں اور و[جہ]
اس کی یہ ہے کہ میں انور کی اس بات کا اچھی طرح یقین دلا چکی ہوں کہ م[جھے]
ان سے محبت نہیں اور ان سے زیادہ میں دولت کو چاہتی ہوں اب
آج میں ان سے شادی کرنے پر تیار ہو جاؤں تو ان کی نظر میں میر[ی]
وقعت کیا ہو گی۔؟ یقیناً وہی سمجھیں گے کہ آئی سی۔ ایس نے م[جھے]
کو خرید لیا۔ مگر ربیعہ اتنی ارزاں نہیں ہے میں کسی طرح بھی اس
کو ثابت نہیں کر سکتی کہ میں نے ہمیشہ ان سے محبت کی اور آج
میری زندگی کی خوشگوار ساعتیں وہی ہوتی ہیں جب میں ان کے
[خیال] میں کھوئی ہوئی ہوتی ہوں۔ رضیہ میری قیمت صرف محبت
ہے اور اب وہ مجھے کسی طرح نہیں مل سکتی۔ انور سے مجھے کوئی شکا[یت]
نہیں۔ قصور خود میرا ہے اور سچ پوچھو تو میرا بھی نہیں۔ قسمت کا ہے
میں نے کہا۔ ربیعہ تم خواہ مخواہ ضد کر رہی ہو میں تمہیں یقین دلاتی
کہ اس بے تعلقی اور کشیدگی کے باوجود انور آج بھی تمہیں اتنا ہی [چاہتا]
ہے جتنا کبھی پہلے چاہتا تھا اس نے کہا یقین دلانے کی ضر[ورت]
نہیں مجھے خود معلوم ہے میرا دل گواہی دیتا ہے اور میری آج کی [بات]
لکھ رکھو کہ کسی دوسری لڑکی سے شادی کے بعد بھی وہ نا[...]
در د ربیعہ کو اپنے دل سے نہ بھلا سکیں گے اس کے بعد بہت دیر تک
ہوتی رہیں مگر وہ کسی طرح آمادہ نہ ہوئی کہ میں تمہارے اور اس کے

صفائی کی کوشش کروں گا

انور یہ تمام تفصیلات سن کر تڑپ اٹھا اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ عالم خیال میں ربیعہ اس کے سامنے کھڑی تھی اپنی تمام رعنائیوں اور دلربائیوں کے ساتھ اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہی تھی۔

بیوفا کون ہے۔ بتلائیے نا۔ آپ کہ ہم ؟۔

ایک ہی لمحے میں اس کے دل سے ربیعہ کی تمام شکایتیں دور ہو چکی تھیں ایک ہی لمحے میں اس کے دل کی تمام گنجائش، ربیعہ کی محبت سے پہلے کی طرح معمور ہو چکی تھیں اس لئے بیتاب ہو کر کہا۔

رضیہ! کیا اب کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔

رضیہ نے کہا۔

کیا بتاؤں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا ربیعہ میں جہاں اور ہزاروں خوبیاں ہیں وہاں وہ بلا کی خود دار بھی ہے اور بدقسمتی سے بے انتہا ضدی بھی ایک بار وہ منہ سے نہیں کہدے تو پھر ہاں کہلوانا نا ممکن ہے مگر وہاں ایک بات ہے اگر اس کا سامنا ہو جائے اور گفتگو کا موقع ملے تو بہت ممکن ہے کہ وہ متاثر ہو جائے اور اس کامیابی کی کوئی صورت نکل آئے اس لیئے کہ محبت کا سیل جب امنڈتا ہے تو مضبوط سے مضبوط عقیدے اور پختہ سے پختہ ارادے اسکے سامنے تنکوں کی طرح بہتے جاتے ہیں آج ہی بلکہ اسی وقت میرے ساتھ چلو۔ دیکھیں قدرت کو کیا منظور ہے۔

انور نے کہا

لیکن اگر اس نے میرے سے ملنے ہی سے انکار کر دیا تو۔

نہیں ایسا نہیں ہو سکتا خصوصاً ایسی حالت میں کہ تم میرے ساتھ جاؤ گے

آدھ گھنٹہ کے اندر انور، رضیہ اور ربیعہ اسی ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے جہاں ۳ سال قبل ربیعہ اور انور کی آخری ملاقات ہوئی تھی احوال پرسی اور چند رسمی باتوں کے بعد رضیہ یہ کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی کہ

ذرا میں آئی ذرا خالہ جان (ربیعہ کی والدہ) کے پاس ہو آؤں

اب ڈرائنگ روم میں صرف ربیعہ اور ربیعہ اور انور تھے۔ وہ ایک دوسرے کے مقابل کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے دونوں خاموش تھے اسی طرح کئی منٹ گذر گئے دونوں کے دل زور زور سے دھڑک رہے تھے آخر انور نے ہمت کر کے طلسم خاموشی کو توڑا۔ اس نے کہا۔

تین سال کے اندر آپ میں ذرا بھی تغیر نہیں ہوا

ہوا کیوں نہیں پہلے "تم" تھی اب "آپ" ہوں۔

انور مسکرایا۔ ربیعہ کے ہونٹوں پر بھی ہلکا سا تبسم نمودار ہوا پھر کوئی دو منٹ تک دونوں خاموش رہے اس مرتبہ ربیعہ نے ابتدا کی ۔

آپ تو تین سال میں بہت بدل گئے ہیں!

مگر دیکھنے والے تو کہتے ہیں کہ میں بھی نہیں بدلا۔

دیکھنے والوں کی نظر سطح سے نیچے نہیں جاتی۔

آپ کا خیال ہے کہ میں بدل گیا۔

یقیناً

اس کا ثبوت ؟

دو برس کے بعد آپ ولایت سے واپس آئے مگر یہاں آنے کی .. زحمت گوارا نہ کی۔ ابا جان اور امی جان آپ کو یاد کر رہے ہیں۔

اور اس بنا پر آپ کہتی ہیں کہ میں بدل گیا۔

ظاہر ہے ۔

مگر نہ آنے کی وجہ کچھ اور بھی تو ہو سکتی ہے۔

کوئی راز کی بات نہ ہو تو فرمایئے ۔

بات تو راز ہی کی ہے مگر کہے بغیر چارہ بھی نہیں دراصل میں نہیں چاہتا تھا کہ آپ سے سامنا ہو۔

اللہ اکبر! اتنی نفرت تو پھر اب کیوں زحمت کی آپ نے ؟

مجبور ہو کر

کس نے مجبور کیا آپ کو ؟

دل نے

اور آج تک یہ دل کہاں تھا

ربیعہ آج تک میں ایک سخت غلط فہمی میں مبتلا تھا رضیہ نے آج میری آنکھیں کھول دیں تمہارے اس کے درمیان میرے متعلق دکھاوا تھا

جو گفتگو ہوئی تھی وہ سب اس نے مجھ کو سنائی اور میرا خیال ہے کہ
زندگی میں اپنی کسی غلطی پر ندامت کا اتنا شدید احساس مجھے پہلے کبھی
نہیں ہوا تھا۔

رضیہ نے سب کچھ آپ سے کہہ دیا۔ ربیعہ نے گھبرا کر پوچھا

ہاں سب کچھ

مجھے اس سے امید نہ تھی۔

رضیہ نے مجھے یہ بھی بتایا کہ آپ اس بارے میں کیا فیصلہ
کر چکی ہیں۔ مگر وہ فیصلہ یکطرفہ ہے اسلیئے قابل قبول نہیں۔

خوب، تو آپ مجھے آئی۔ سی۔ ایس کی قیمت پر خریدنے آئے
ہیں۔

ربیعہ! تم کیسی باتیں کرتی ہو۔ میں تمہیں کیا خریدوں گا۔ میں
تو خود تمہارے ہاتھ بک چکا ہوں۔

مگر میرا فیصلہ تو آپ کو معلوم ہے اور میرے لیئے اس میں
کسی رد و بدل کا امکان نہیں۔

خیر میں تمہیں مجبور نہیں کر سکتا۔ لیکن اس صورت میں
تمہارا عطیہ بھی تمہیں کو مبارک ہو۔

میں سمجھی نہیں آپ کا مطلب۔ ربیعہ نے حیران ہو کر پوچھا

میرا مطلب یہ ہے کہ درحقیقت یہ آئی سی ایس کا عہدہ
مجھے تمہاری محبت اور حسن تدبر کی وجہ سے نصیب ہوا ہے اب اگر
تمہاری نظر میں یہ اتنا ہی ذلیل ہے تو میری نظر میں بھی اسکی کوئی قیمت
نہیں اگر تم اپنی بیجا ضد چھوڑنے کے لیئے تیار نہیں ہو تو میں بھی آج
ہی استعفیٰ بھیج دوں گا۔

ربیعہ سخت کشمکش و پیچ میں مبتلا ہو گئی یہ بات اس کے وہم و
گمان میں بھی نہ تھی کہ گفتگو اس نقطہ پر پہنچ کر ختم ہو گی وہ حیران تھی
کہ کیا کہے اور کیا کرے انور کے مزاج سے وہ اچھی طرح واقف تھی اسے
یقین تھا کہ انور نے جو کچھ کہا ہے وہی کرے گا چاہے ادھر کی دنیا
ادھر ہو جائے انور کی اسی طرح بنی ہوئی زندگی کو اس طرح تباہ کرنے
کے لیئے وہ ہرگز تیار نہ تھی وہ سخت پریشان ہو گئی اور گھبرا کر چھت کی
طرف دیکھنے لگی اور تین منٹ تک خاموش رہی۔ انور یکایک اٹھ کھڑا ہوا

اس نے نہایت مغموم لہجے میں کہا۔

اچھا تو اب میں چلتا ہوں۔ خدا حافظ۔

اور وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ ربیعہ جلدی سے کھڑی
ہو گئی اور اس نے انور کو پکارا۔

سنیئے تو

انور پلٹا۔ دونوں ہاتھ پس پشت رکھ کے ربیعہ کے مقابل کھڑا
ہو گیا اور کہا۔ فرمایئے۔

آپ استعفیٰ نہیں بھیجیں گے۔

کیوں

اسلیئے کہ آپ کے بقول وہ میری چیز ہے اور میں اسے کھونا
نہیں چاہتی

تو آپ اسے قبول کرنے کے لیئے تیار ہیں۔

ربیعہ نے سر جھکا کر کہا۔ ہاں

انور کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں رخسار تمتما گئے
میں دل کی حرکت اور رگوں میں خون کی رفتار تیز ہو گئی اس نے
آگے بڑھ کے دونوں ہاتھ ربیعہ کے کاندھوں پر رکھ دیئے ربیعہ
جسم میں ایک کپکپی سی محسوس ہوئی اس نے جرأت کر کے داہنا
ربیعہ کی ٹھوڑی کے نیچے رکھ کے اس کا جھکا ہوا سر اوپر کو اٹھا دیا
بے اختیار اسکے لبوں پر مہر محبت ثبت کر دی ربیعہ کی آنکھیں بند
ہو گئیں اس کا بند بند کانپ اٹھا انور بھی سراپا ارتعاش بن گیا دونوں کے
لیئے زندگی میں یہ پہلا لذت آفریں تجربہ تھا۔

جلد انور اور ربیعہ کی شادی ہو گئی۔

حسن، جوانی، تندرستی، دولت، محبت اور اطمینان
مسرت کے اجزائے ترکیبی ہیں مگر ان سب کا اجتماع شاذ و نادر
کہیں دیکھنے میں آیا ہے اور یہ سب چیزیں بیک وقت کسی کو مل
جائیں تو پھر دنیا ہی اس کیلیئے بہشت جاوداں ہے انور اور ربیعہ ان
نصیب ہستیوں میں سے تھے جو دنیا میں رہ کر فردوس مسرت
جی بھر کے بہرہ اندوز ہوتے تھے زندگی کی ہر ساعت خوشی کا

پیغام نے کراچی بھی شادمانیاں اور کامرانیاں قدم قدم پر ان کا استقبال کرتی تھیں دعوتیں۔ جلسے۔ پارٹیاں، سینما۔ گھوڑ دوڑ، پکنک، بوٹنگ سواری، سیر و شکار غرض تفریحات کا ایک دور تھا جو کہیں تمام نہ ہوتا تھا۔ اطمینان اور فارغ البالی نے ربیعہ کے حسن عالم آشوب کو اور بھی نکھار دیا تھا انور بھی نہایت خوبرو جوان اور دلچسپ انسان تھا سوسائٹی میں اس خوش نصیب جوڑے کی بہت مانگ تھی۔ کوئی صحبت ان کے بغیر مکمل نہ ہوتی تھی غرض عیش و نشاط کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جو تشنۂ تکمیل رہ گیا ہو کوئی آرزو ایسی نہ تھی جو پوری نہ ہوئی ہو وقت کا تیز پر طائر سرعت کے ساتھ اڑا چلا جا رہا تھا دیکھتے دیکھتے ایک سال نکل گیا۔

ربیعہ کو گھوڑے کی سواری کا بہت شوق تھا اکثر وہ اور انور صبح سویرے ہی سیر کو نکل جاتے۔ گھوڑے کنوتیاں ملائے قدم قدم چلتے۔ یہ دونوں باتیں کرتے جاتے۔ گل ہائے بہار کی طرح شگفتہ و شاداب چہرے، تندرست جوانیاں، ارمانوں سے بھرے دل، ہنستے بولتے، گنگناتے چلے جاتے کبھی گھوڑوں کو ذرا تیز کر دیتے، تھوڑی سی دوڑ ہو جاتی۔ ربیعہ کا گھوڑا عموماً آگے نکل جاتا۔ گھوڑا بھی اچھا سوار بھی اچھا۔ پھر حریف خود ہارنے پر آمادہ جیت کیوں نہ ہوتی۔

ایک دن واپس آ رہے تھے کہ پیچھے سے ایک ملٹری ٹرک نے زور سے ہارن بجایا دونوں گھوڑے لسکے عادی تھے۔ مگر خدا جانے کیوں ہارن کی آواز سن کر انور کا گھوڑا بھڑکا۔ انور باگ ڈھیلی چھوڑے بے فکری سے بیٹھا تھا۔ اچانک گھوڑا بھڑکا آسن اکھڑ گیا رکاب میں سے پاؤں نکل گئے اور وہ دھم سے زمین پر آ رہا ربیعہ بدحواس ہو گئی۔ ملٹری والوں نے ٹرک روک لیا۔ سب لوگ انور کی طرف دوڑے اس کے گھٹنے میں سخت چوٹ آئی تھی پاؤں سیدھا نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی ٹرک میں ڈال کر ہسپتال پہونچایا گیا پہلے معائنہ ہوا پھر ایکس رے۔ معلوم ہوا کہ گھٹنے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ گھر میں ایک ماتم بپا ہو گیا۔ ربیعہ نے روتے روتے اپنا برا حال کر ڈالا۔ شہر بھر کو اس حادثہ کا قلق تھا۔

علاج شروع ہوا بہتر سے بہتر ڈاکٹر، ہوشیار سے ہوشیار نرسیں قیمتی سے قیمتی دوائیں۔ زیادہ سے زیادہ توجہ اور احتیاط۔ مگر تیمارداری میں دنوں سے ہفتے اور ہفتوں سے مہینے ہو گئے لیکن مرض اور تکلیف میں کوئی کمی نہ ہوئی انور کے والد بالآخر انور کو ہسپتال سے گھر لے آئے اور گھر ہی پر علاج جاری رہا۔ ہڈی تو ٹھیک سے نہ جڑی۔ مگر زخم ناسور بن گیا۔ ڈاکٹروں نے کہا۔ اگر ٹانگ نہ کاٹی گئی تو جان کا خطرہ ہے انور اپاہج ہو کر جینے سے موت کو بدرجہا بہتر سمجھتا تھا۔ مگر ماں باپ کی محبت نے گوارا نہ کیا کہ ان کے گھر کا سب سے زیادہ روشن چراغ اس طرح بجھ جائے ناچار ٹانگ کاٹی گئی۔ اس صدمے سے اس کی صحت اور بھی خراب ہو گئی اور اب وہ مستقل طور پر صاحب فراش ہو گیا۔ ایک مضغۂ گوشت کی طرح پلنگ پر پڑا رہتا۔

ہسپتال میں ربیعہ نے انور کی بڑی خدمت کی رات دن ایک کر دیئے ہر وقت پلنگ کے پاس کرسی ڈالے بیٹھی رہتی۔ تیمارداری میں نرسوں کو مات کر دیا کبھی کبھی ساری رات بیٹھ کر گذار دیتی کبھی کبھی دو دو وقت کھانا نہ کھایا دیکھنے والے اس کی شوہر پرستی پر عش عش کرتے تھے ہسپتال سے جب انور گھر آیا۔ اس وقت بھی اس کا یہی معمول رہا خدمت کرتی، تسلی دیتی دل بہلاتی، ہمت بندھاتی۔ کتابیں اور اخبار پڑھ کر سناتی

غرض اسی طرح وقت گذر رہا تھا کہ انور کی ٹانگ کاٹی گئی اور اس دن کے بعد سے ربیعہ کے رویہ میں ایک نمایاں تبدیلی ہو گئی رفتہ رفتہ اس نے انور کے پاس بیٹھنا کم کر دیا۔ مگر عموماً گھر ہی پر رہتی تھی آہستہ آہستہ دن کا زیادہ وقت باہر گذرنے لگا۔ شام کو ٹینس کھیلنے کے لیئے جانا ضروری تھا پھر شام کو بھی واپسی دیر سے ہونے لگی اکثر کھانے کا وقت بھی گذر جاتا۔ انور اکیلا پڑا گھنٹوں اس کا انتظار کرتا لیکن وہ کبھی وہ اسکے پاس آتی اور کبھی نہ آتی ــــ اور آتی بھی تو تھوڑی دیر بیٹھ کر اور رسمی احوال پرسی کر کے چلی جاتی۔ انور کی حالت قابل رحم تھی بے بس مجبور انسان کسی پر اس کا زور نہ تھا۔ جی بھر آتا اور رو لیتا تھا اور خدا سے موت کی دعا کرتا۔ مگر موت کی دعا بھی ہمیشہ قبول نہیں ہوتی۔ ربیعہ کے دل میں اس کے لیئے محبت تو کیا اب رحم کا سرمایہ بھی ختم ہو چکا تھا۔

ایک دن رات کو ربیعہ کی واپسی میں بہت دیر ہو گئی اس کا انتظار کرتے کرتے انور کی آنکھ لگ گئی سویا تو کسی دوسری دنیا میں تھا

[illegible]

دیکھا کہ ربیعہ اور ایک جوان جو خالباً کوئی فوجی افسر تھا۔ ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے آہستہ آہستہ باتیں کرتے ندی کے کنارے کنارے خراماں خراماں چلے جا رہے ہیں انور اس منظر کی تاب نہ لاسکا۔ تڑپ کر آنکھ کھل گئی اور بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ اتنے میں کمرے کا دروازہ کھلا۔ ربیعہ داخل ہوئی ایک نوجوان فوجی افسر اس کے ساتھ تھا بیٹی کو دیکھ کر انور نے جلدی سے آنسو خشک کئے۔

ربیعہ نے کہا۔

آپ ہی ہیں میجر خالد، جن کا میں نے اس دن آپ سے ذکر کیا آپ کے والد صاحب ابا جان کے کلاس فیلو تھے۔ کسی سرکاری کام سے آپ پرسوں ایرو پلین سے ولایت جا رہے ہیں اگر میں جانا چاہوں تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں اور خرچ بھی کچھ نہ ہوگا۔ ایک مہینے میں ہم لوگ واپس آجائیں گے ایک جگہ پڑے پڑے میں بھی گھبرا گئی ہوں تبدیلی آب و ہوا بھی ہو جائیگی اور مفت میں لندن کی سیر بھی کر لوں گی

"میجر خالد نے کہا۔ مسز انور میں مسز انور کو ہر طرح آرام پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ انھیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔ آپ بالکل مطمئن رہیں۔"

انور یاس و حسرت کی تصویر بنا خاموشی کے ساتھ یہ باتیں سن رہا تھا اسے خاموش دیکھکر ربیعہ نے کہا تو پھر اجازت ہے نا۔

انور جیسے خواب سے چونک پڑا۔ وہ سنبھلا اور نہایت اطمینان کے ساتھ اس نے کہا بڑی خوشی سے

انور کا یہ جواب ربیعہ کی توقع کے خلاف اور آرزو کے عین مطابق تھا وہ مسرور بھی ہوئی اور حیران بھی۔ میجر خالد گڈ نائٹ کہہ کے رخصت ہوئے۔

ربیعہ بیٹھ گئی اور اس نے ایک مدت کے بعد آج انور کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر دبایا اور کہا۔ کتنے مہربان ہیں آپ؟ انور نے ایک سرد آہ کھینچی اور زبان سے کچھ نہ کہا، اسکی آنکھیں پھر ایک بار نمناک ہو گئیں۔

رضیہ ان دنوں وہیں تھی دوسرے دن ربیعہ نے اسے بتایا کہ میں کل ایروپلین سے لندن جا رہی ہوں۔

رضیہ مبہوت ہو کر رہ گئی تھوڑے سے توقف کے بعد اس نے پوچھا

کس کے ساتھ

ربیعہ نے کہا۔ میجر خالد کے ساتھ۔

کون ہیں میجر خالد؟

ابا جان کے ایک دوست کے بیٹے۔

تم سے کہاں کی جان پہچان ہے۔؟

اتفاقاً کلب میں ہو گئی۔

کب

کوئی ایک مہینہ ہوا

اور اب تم ان کے ساتھ ولایت جا رہی ہو۔

ہاں۔

غصے کے مارے رضیہ کا خون کھول رہا تھا اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اس نے نہایت تلخ لہجہ میں کہا۔

ربیعہ تمہیں شرم نہیں آتی کہ تم ایک شریف خاندان کی بیٹی اور ایک شریف خاندان کی بہو ہو کر ننگ و ناموس میں اس طرح آگ لگا رہی ہو۔ للہ کچھ سوچو کہ یہ تم کیا رہی ہو؟ یہ کیا قیامت ہے کیسا اندھیر ہے؟ کچھ خدا کا خوف کرو، کچھ دنیا کی حیا کرو، جان قربان کرنے والے شوہر سے یہ بے وفائی۔ ایسی دغا۔ کیا ہوئے وہ تمہارے محبت کے دعوے۔ ہائے افسوس انور کی زندگی میں۔۔۔۔۔؟

رضیہ یہیں تک کہنے پائی تھی کہ ربیعہ طیش میں آکر بولی

بس رضیہ بس۔ خدا کا خوف اور دنیا کی حیا بہت ہو چکی کاش تم مجھے ایک انسان سمجھو۔ گوشت پوست سے بنا ہوا انسان۔ سینے میں دھڑکتا ہوا دل رکھنے والا انسان۔ میں بھی آخر انسان ہوں میں بھی آخر آدمی ہوں پتھر کی سنگین مجسمہ نہیں لوہے کی مشین نہیں۔ میں نے کسی کے ساتھ بے وفائی نہیں کی۔ کسی کے ساتھ دغا نہیں کی میں نے جس انور سے محبت کی اور شادی کی تھی وہ ایک خوبرو جوان تھا تندرست و توانا دولت و اعزاز کا مالک، قدرت نے اسے مجھ سے چھین لیا اور اب وہ دنیا میں موجود نہیں جس انور کا تم ذکر رہی ہو وہ ایک کمزور، بیمار، کریہہ المنظر [illegible] [illegible]

منظر علیمی

"تضمین بر غزل حضرت ماہر القادری"

مطربوں پر جن کے لطف عام ہیں　　جو فدائے ساقیٔ گلفام ہیں
ہر طرح کے جن کو عیش و آرام ہیں　　"جن کی صبح و شام غرق جام ہیں"
"خیر سے وہ عاشقِ اسلام ہیں"

فصلِ گل بھی باعثِ نازش نہیں　　آشیانوں میں بھی آسائش نہیں
یہ کوئی حکمت نہیں دانش نہیں　　"زاغ و کرگس پر کوئی بندش نہیں"
"اور شاہیں ہیں کہ زیرِ دام ہیں"

پستیوں پر آج نازل ہے عروج　　قسمتِ ہر اہلِ باطل ہے عروج
کس قدر نخوت کا حامل ہے عروج　　"کتنے فرعونوں کو حاصل ہے عروج"
"کتنے چنگیز اب بھی خوں آشام ہیں"

بن گئے ہیں آج بت زہریلے ناگ　　ہر زباں پر بت پرستی کا ہے راگ
اور لگا رکھی ہے نمرودوں نے آگ　　"جاگ اے ایمانِ ابراہیم جاگ"
"ہر طرف اصنام ہی اصنام ہیں"

قیصر و کسریٰ کے جو دل میں رہے　　اور تھے جو چشم خاقاں میں بچے
مفلسوں کے غم کدوں سے کچھ پرے　　"قصر و ایواں میں جو دفنائے گئے"
"آج وہ اسرار طشت از بام ہیں"

یا نہیں وہ عالم صبر و رضا　　یا نہیں دل میں وہ اخلاص و وفا
یا پہونچ سکتی نہیں میری دعا　　"یا وہ بت سچ مچ کا پتھر بن گیا"
"یا ابھی تک میرے نالے خام ہیں"

ظلم و طغیاں میں الامان الاغلبیں　　آسماں سے بڑھ کے ہی تیری زمیں
ایسی نا انصافیاں بھی ہیں کہیں　　"ناخدا سے کوئی کچھ کہتا نہیں"
"موج و کشتی ہی فقط بدنام ہیں"

ہوشیار اے عزم بیباک و بلند　　جاگ اے طبع غیور و ارجمند
ہمتوں کی ڈال تاروں پر کمند　　"اچھل جا اے خوئے ہنگامہ پسند"
"میرے دل کی دھڑکنیں بے نام ہیں"

تاج الدین احمد تاجؔ منگری

پچیسواں (۲۵) گھنٹہ

ریجنسی محل میں پورے تین گھنٹے سے ہنگری کی مجلس وزراء کا خفیہ اجلاس جاری تھا۔ گو اجلاس قریب الاختتام تھا لیکن وزیر خارجہ نے پھر کھڑے ہو کر کہا

"پچاس ہزار مزدوروں کا مسئلہ اب تک حل نہیں ہو سکا۔! حالانکہ یہی مسئلہ اس وقت سب سے زیادہ اہم ہے"

"مسئلہ طے ہو چکا ہے!" وزیر اعظم نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "ہم ایک متفقہ فیصلہ پر پہنچ چکے ہیں"

وزیروں نے چلنے کی تیاری میں اپنے اپنے چرمی بیگ ہاتھوں میں اٹھا لئے، لیکن وزیر خارجہ ان باتوں کی طرف توجہ کئے بغیر اپنی بات کہتا گیا

"ہمیں کسی نہ کسی مرحلے میں جھکنا ہو گا یہ ایک قطعی بات ہے ہم میں اور جرمنوں میں جو فرق ہے وہ بہرحال قائم رہے گا۔ ہم جرمنوں کی برابری نہیں کر سکتے۔ یہ حقیقت خواہ کتنی ہی تلخ سہی، لیکن ہے ایک ناقابل انکار حقیقت، کہ جرمن پارلیمنٹ کی نظروں میں ہنگری کی حیثیت ایک ماتحت کی سی ہے نہ کہ ہمسر اور رفیق کی، ہمارے لئے دوسرا طریقہ کار صرف یہی ہے کہ ہم ہنگری پر جرمنی کا عسکری اقتدار و تسلط تسلیم کریں، اور یہ سب سے زیادہ ذلت کی بات ہوگی ـــ پہلے تو ہم سے تین لاکھ مزدور مانگے گئے تھے ایک طویل گفت و شنید کے بعد اب یہ تعداد گھٹ کر پچاس ہزار طے ہوئی ہے۔ ان پچاس ہزار مزدوروں کی فراہمی جس صورت سے بھی ممکن ہو ہمارے لئے ناگزیر ہے"

"ہماری حکومت ہنگری کے ایک بھی باشندے کو بیگار میں دینے کے لئے تیار نہیں ہے" وزیر اعظم نے پرجوش آواز سے کہا۔

"ہمیں یہ بات بھولنی نہیں چاہیئے کہ جرمنوں کے مطالبے کے پیچھے ان کی دھمکی بھی ہے" وزیر خارجہ نے کہا "یہ مطالبہ ان کے آخری مطالبے کی شکل میں آیا ہے۔ ان کو صنعتوں کی ترقی کے لئے مزدوروں کی اشد ضرورت ہے اگر ہم کم سے کم پچاس ہزار مزدور بھی اس وقت ان کو فراہم نہ کر سکے تو اس کا ہولناک نتیجہ ہمارے سامنے آ سکتا ہے۔ مجھے اطلاع دی گئی ہے کہ اگر یہ مطالبہ نامنظور کیا گیا تو ہنگری پر فوراً فوجی اقتدار قائم کر دیا جائے گا۔ میرا فرض کہ میں ان نازک حالات سے آپ حضرات کو اچھی طرح آگاہ کر دوں اگر آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں تو یاد رکھئے کہ اس کے نتائج کی تمام تر ذمہ داری آپ حضرات پر ہوگی"

"ممکن ہو تو کوئی سمجھوتہ کر لیا جائے" ایک وزیر بولا

"اگر ہمیں جرمنی میں ہنگری کا ایک آدمی بھی غلام بنا کر بھیجنا پڑا تو اس سے چاہے بحالت موجودہ ہمارے سر سے جرمنی کے فوجی تسلط کی بلا ٹل جائے گی۔ لیکن تاریخ ہمارے اس جرم کو کبھی معاف نہیں کرے گی اور ہماری آئندہ نسلیں بھی ہمیشہ اس قوم فروشی کے لئے ہم پر لعنت بھیجتی رہیں گی" وزیر اعظم نے کہا "ہمارا جواب قطعی انکار ہونا چاہئے اس معاملے میں سمجھوتہ نہیں ہو سکتا"

"ہم ایسے پچاس ہزار مزدوروں کو جرمنی بھیج سکتے ہیں جو ہنگری کے شہری نہیں ہیں" وزیر داخلہ نے کہا "ہمارے ہاں تین لاکھ سے زائد غیر ملکی قیدی موجود ہیں۔ اس موقع پر انہیں کیوں نہ بھیجدیا جائے؟"

"مجھے مسئلے کے اس حل پر اعتراض ہے ـــ" وزیر ... نے کہا ـــ "اس سے معاملہ سلجھنے کی بجائے اس میں نئی نئی

پیدا ہو جائیں گی۔ سیاسی قیدیوں اور نظر بندوں کے بارے میں جو بین الاقوامی قانون ہے یہ تجویز اس کے سراسر منافی ہے ہم دوسرے ممالک کو اپنا دشمن نہیں بنا سکتے۔ اگر ہم مسئلے کے اس حل کو منظور کر لیں تو ہنگری کے تاج پر بدنامی کا ایک دائمی داغ لگ جائے گا اس کے علاوہ ہمیں اپنے بے شمار نئے دشمنوں کے ابھر آنے کا اندیشہ ہے۔"

لیکن آدھے گھنٹے کی بحث و تمحیص کے بعد مسئلے کا ایک حل نکل ہی آیا۔ قرار داد یہ پاس ہوئی کہ ایسے پچاس ہزار مزدور جرمنی بھیج دیئے جائیں، جو ہنگری کے شہری نہ ہوں اور جن کی شہریت و قومیت نسبتاً غیر متعین ہو۔ وزیر داخلہ نے یہ کام اپنے ذمے لیا کہ وہ ان مزدوروں کی قومیت پر کچھ ایسا پردہ ڈال دے گا کہ یہ جاننا مشکل ہو جائے گا کہ کون مزدور کس غیر ملکی طاقت سے وابستہ ہے۔

"اس طرح ہم اپنے "مگیار خون" کا تحفظ کر لیں گے۔" وزیر داخلہ نے کہا۔ "اور تاریخ نگار ہم پر یہ الزام بھی نہیں لگا سکتا کہ ہم نے ہنگری کے عوام کو غلام بنایا۔ نیز آنے والی نسلیں بھی ہمارے مقصد کی اہمیت اور پاکیزگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کے حصول کے ذرائع کا کچھ خیال نہ کریں گی ......"

کاؤنٹ بارتھولی ہنگری کے محکمہ نشر و اشاعت کا افسر اعلیٰ تھا۔ وہ اپنے آفس میں گیا اور اپنے سکریٹری کو بلوایا۔ مجلس وزراء کے خفیہ اجلاس کے فیصلے کے بارے میں وہ ایک سرکاری اعلانیہ لکھوا دینا چاہتا تھا۔ وہ اپنے دل میں سوچنے لگا ـــ "جس انسان کو عزت نفس کے ساتھ جینے کے حق سے محروم کر دیا جاتا ہے وہ غلام ہے۔ لیکن جو کوئی بھی اپنی خودی کا تحفظ کرنا چاہے وہ گویا اپنی ہلاکت کے محضر نامے پر اپنے ہاتھوں دستخط کرتا ہے۔ ہمارا سماج آدمی کو اس کی شخصی خودداری کے تحفظ و بقا کا موقع نہیں دیتا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیئے کہ اسے جینے کی آزادی سے محروم کر دیتا ہے۔ اگر وہ غلام بن کر زندہ رہنا گوارا کرتا ہے جبھی اسے زندہ رہنے کی اجازت ملتی ہے۔ لیکن یہ حالات بہت دنوں تک قائم نہیں رہ سکتے۔ وہ [illegible] وزیر اعظم سے لیکر سڑک صاف کرنے والے بھنگی تک ـــ ہر شخص غلام ہے یقیناً تباہی کے غار کے دہانے پر پہنچ چکا ہے اور جس قدر جلد وہ غار کی گہرائیوں میں کھو جائے۔ تو انسانیت کے لئے اتنا ہی اچھا ہے۔"

"جناب کیا آپ نے کچھ فرمایا ہے؟" سکریٹری نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں!" کاؤنٹ نے کہا۔ "اچھا آؤ یہ لکھ لیں۔"

سرکاری اعلانیہ:۔

کل مجلس وزراء کے خصوصی اجلاس میں یہ طے ہوا ہے کہ ہنگری کے ان مزدوروں کو جو خاص خاص صنعتوں میں مہارت و دستگاہ حاصل کرنے کے لئے جرمنی جانا چاہیں، پاسپورٹ اور سفر کی ضروری سہولتیں مہیا کی جائیں گی۔ ابھی صرف پچاس ہزار مزدور ان سہولتوں سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔"

سکریٹری اٹھ کھڑا ہوا۔ کاؤنٹ نے کہا

"یہ اعلانیہ تمام اخبارات کے ہاں اس ہدایت کے ساتھ بھیجو کہ پہلے صفحے پر جلی حرفوں میں شائع کیا جائے۔"

کاؤنٹ بارتھولی نے اس شام کو اپنے بیٹے کے ساتھ کھانا کھایا وہی اس کا پرائیوٹ سکریٹری بھی تھا۔ کافی کا گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے کاؤنٹ نے اپنے بیٹے سے سوال کیا۔

"ہنگری کے مزدوروں کو جرمنی بھیجنے کے معاملے میں تمہاری کیا رائے ہے؟"

"یہ تو اوّل درجے کی سیاسی حکمت عملی ہے۔ جرمنی کو ہنگری کے مزدور نذر چڑھانے کی بجائے ہم جیلوں اور کیمپوں سے چند ہزار غیر ملکی لوگوں کو جوڑ بٹور کر بھیجے دے رہے ہیں۔ جرمنی کی آنکھوں میں کس صفائی سے دھول جھونکی گئی ہے۔ واقعی تدبر اسی کا نام ہے۔"

"کیا تم جانتے ہو کہ ان مزدوروں کے عوض ہمیں جرمنی سے کوئی صلہ بھی ملے گا؟" کاؤنٹ نے پوچھا۔ "یا واضح لفظوں میں یہ کہ کیا ہمیں ان پچاس ہزار انسانوں کی کوئی قیمت بھی وصول ہونے والی ہے؟"

"کیا [illegible]"

"کیا آپ کا خیال ہے کہ ہم بغیر کسی عوض ہی کے اتنے مزدور جرمنی کی بھینٹ چڑھا دیں گے؟"

"کیا تم کو اس میں اپنی کوئی ذلت محسوس نہیں ہوتی کہ آج تمہارے باپ نے انسانوں کی اس تجارت میں اشتراک وتعاون کیا ہے؟ اس طرح کا لین دین اخلاقی انحطاط کی آخری سرحد ہے" کاؤنٹ نے کہا

"والد صاحب! آپ بھی عجیب آدمی ہیں!" لیوسین نے کہا۔ "کیا یہی وجہ تو نہیں ہے جو آپ آج شام بہت افسردہ نظر آ رہے ہیں؟"

"سوال سے پیچھا نہ چھڑاؤ" کاؤنٹ نے کہا۔ "تم یہ تسلیم کرتے ہو یا نہیں کہ میں آج انسانی تجارت میں لگا ہوا ہوں!"

"اوہ — اگر آپ اس معاملے کو اس زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں تو بلاشبہ آپ انسانی تجارت میں لگے ہوئے ہیں۔ لیکن آپ کا مطلب کیا ہے؟"

"کیا اس معاملے کی بناء پر تمہیں کوئی اضطراب محسوس نہیں ہوتا؟"

"میں اتنا بیوقوف تو نہیں ہوں کہ اس معمولی سی بات سے اضطراب محسوس کروں!" لیوسین نے کہا — "مجھے تو یقین ہے کہ جس بات سے آپ اتنے غمگین نظر آ رہے ہیں وہ اس کے علاوہ کوئی اور بات ہوگی کیونکہ یہ مسئلہ تو اتنا معمولی ہے کہ اپنے دماغ پر ایک لمحہ کے لئے بھی اس کا بار محسوس کرنا فضول ہے۔ ہم نے جو کچھ کیا ہے اگر یہ نہ کرتے تو ظاہر ہے کہ ہنگری کے خاص شہریوں کو بھیجنے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا پھر کیا وہ طریقہ کار بھی کچھ کم معیوب ہوتا؟"

"میں تسلیم کرتا ہوں کہ قومیت کے نقطۂ نظر سے وہ بات زیادہ معیوب ہوتی" کاؤنٹ نے کہا .... "لیکن انسانیت کے نقطۂ نظر سے ان دونوں باتوں میں کوئی فرق نہیں ہے واقعہ تو یہ ہے کہ آج ہم نے جرمنوں کے ہاتھ انسان فروخت کئے ہیں!"

"والد صاحب یہ تو ایک ناگزیر سیاسی ضرورت تھی۔ اس کے بغیر کام بھی کیسے چل سکتا تھا؟"

"کئی صدیوں پہلے یورپ نے بردہ فروشی کی قبیح رسم کو ختم کیا تھا۔ سب سے آخری بار جو غلام فروخت کئے گئے وہ امریکہ کے ہنگرو تھے آج ساری دنیا میں انسانوں کی تجارت خلاف قانون ہے۔ غلامی کی رسم کا خاتمہ ہماری تہذیب کی عظیم الشان اور ممتاز فتح ہے۔ ہماری درسگاہوں کے نصاب تعلیم میں اس موضوع کی واضح تفصیلات موجود ہیں اور اب ہم نے گھڑی کی سوئی کو ایک بار پھر پیچھے کی طرف گھما دیا ہے ہم انسانوں کو مال تجارت کی طرح فروخت کر رہے ہیں۔ ہم نے بیسویں صدی میں بیٹھے بیٹھے قبل مسیح کی صدیوں کی طرف اچانک چھلانگ لگائی ہے اور اس جست میں ہم درمیان کے "عہد بیداری" اور "دور وسطیٰ" کو بھی پار کر گئے ہیں"

"والد صاحب! آدمی کو ایسی تنک طبیعت نہیں رکھنی چاہیے" لیوسین نے کہا۔ "آخر جرمنی میں بھیجکر کوئی ان کے ہاتھ پیر تو باندھا نہیں دے گا یہ لوگ وہاں صرف کام ہی کرنے کی غرض سے تو جا رہے ہیں"

"یہ صحیح ہے، لیکن ان کو جو زنجیروں میں مقید نہ کیا جائے گا وہ صرف اس لئے کہ ان کے بھاگنے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ آج کا سماج اپنے غلاموں کو قبضے میں رکھنے کے ایسے ایسے طریقے جانتا ہے جن کا یونانیوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ میری مراد محض مشین گنوں اور برقی تار کے شکنجوں ہی سے نہیں ہے بلکہ جدید مشینی تہذیب کے تمام وسائل و ذرائع سے ہے۔ مثلاً راشن کارڈ۔ ہوٹل میں رہنے کے لائسنس، ٹرین میں سفر کرنے کے پاسپورٹ، بازار میں نقل وحرکت کرنے پر عائد کردہ پابندیاں اور نقل م پر لگی ہوئی قدغنیں! یونان اور مصر نے بھی اپنے غلاموں کو زنجیروں میں جکڑ نہ رکھا ہوتا اگر ان کے پاس بھی اپنے غلاموں کو قبضے میں رکھنے کے ویسے وسائل و ذرائع موجود ہوتے جو تہذیب جدید کے پاس ہیں۔ غلامی کی میں زمانہ قدیم سے لیکر اب تک کوئی فرق واقع نہیں ہوا ہے"

"بہرحال میرے نزدیک یہ مسئلہ اتنی عمیق فکر و کاوش کا مستحق نہیں ہے" لیوسین نے کہا۔ "ہمارا اس معاملے میں اختیار ہی کیا۔ یورپ کے تقریباً ہر ملک نے جرمنی کے ہاتھ غلام فروخت کئے ہیں یوگوسلاویہ، فرانس، اٹلی اور ناروے کس کا دامن اس دھبے سے ہے؟ انفرادی حیثیت سے ہم زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے ہیں حکومت سے علیحدہ ہو جائیں اور جرمنی کے خلاف اس بنا پر احتجاج کہ وہ غلاموں کو خریدنے کا روادار کرتا ہے اور دوسرے ملکوں کو فروشی پر مجبور کرتا ہے۔ لیکن جو لوگ ہماری جگہ پر برسر اقتدار آئیں

کیا وہ جرمنی کو غلام بنانے سے باز رہیں گے؟ ظاہر ہے کہ یہ سلسلہ بہرحال اسی طرح جاری رہے گا۔ اگر بالفرض ہم جرمن پارلیمنٹ کو تباہ کر ڈالیں۔ جب بھی انسان فروشی کا خاتمہ نہیں ہو سکتا، جرمنوں کے مقام پر روسی آجائیں گے اور آپ بخوبی جانتے ہیں کہ روس آج دنیا میں غلامی کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ سوویٹ یونین میں ہر آدمی ریاست کی مسلمہ جائداد ہے۔"

"تو کیا اس صورت حال سے تم اپنے اندر کوئی اضطراب و خلش محسوس نہیں کرتے!" کاونٹ نے پوچھا

"بالکل نہیں!"

"یہ میرے لئے اور زیادہ المناک سانحہ ہے۔" کاونٹ نے کہا "اس کا تو یہ مطلب نکلا کہ تمہارے دل میں انسانیت کی کوئی قدر و منزلت نہیں ہے حالانکہ تم خود بھی اسی انسانیت کے ایک فرد یعنی انسان ہو کیا واقعی خود تمہاری نظروں میں تمہارا وجود کسی وقار و احترام کا مستحق نہیں ہے۔"

"میں تو ہر آدمی کی قیمت کے اعتبار سے اس کے وقار و احترام کو تسلیم کرتا ہوں مجھے یقین ہے کہ میرے اس نظریہ کے ظاہر کرنے پر آپ مجھے گالی نہیں دیں گے!"

"جس طرح تم ایک موٹر کی مالیت اور قیمت کے لحاظ سے اسے قابل قدر سمجھتے ہو ٹھیک اسی طرح ایک انسان کو بھی قیمت کی ترازو پر تولنے کے بعد اس کی عزت کرو گے!"

"اس میں حرج ہی کیا ہے؟" لیوسین نے کہا

"لیکن کیا تم ایک انسان کا بحیثیت انسان احترام نہیں کرتے اس کی حقیقی انسانی قیمت کے اعتبار سے۔"

"کیوں نہیں کرتا — اگر مجھ سے کسی کو کوئی اذیت پہنچ جاتی ہے تو اس کے لئے مجھے افسوس ہوتا ہی ہے۔" لیوسین نے کہا

"لیکن یہ تو کوئی خاص بات نہیں ہے اگر تم ایک کتے کو بھی تکلیف پہنچاؤ گے تو اس کے لئے بھی تمہیں افسوس ہوگا جس طرح تم ایک جانور کا لحاظ کرتے ہو اسی طرح تم نے ایک انسان کا بھی لحاظ کیا تو پھر انسان کی خصوصیت ہی کیا رہی؟ میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم ایک انسان کی صرف بحیثیت انسان قدر کرتے ہو یا نہیں؟ اس انسان کی جو بجائے خود اپنی ایک قیمت رکھتا ہے اور جو اپنی جگہ ایک بے مثل تخلیق ہو اگرچہ وہ اپنے مصرف کے اعتبار سے کوئی قیمت نہیں رکھتا اور ایک ذی حیات کی حیثیت سے وہ تمہارے اندر جذبۂ مہربانی پیدا کراتا ہے اور نہ احساس محبت!"

"میں نے اس موضوع پر کبھی اس طرح غور نہیں کیا ہے میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں ایک انسان کی اجتماعی کے لحاظ سے ایک ذی حیات ہونے کی بنا پر اس کا احترام کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ہر شخص اس مسئلے کو میرے ہی زاویۂ نظر سے دیکھتا اور اس پر غور کرتا ہے۔"

"لیوسین! کیا تمہیں یقین ہے کہ آج کا ہر انسان واقعی تمہارے ہی زاویۂ نظر سے اس مسئلے کو دیکھتا اور اس پر غور کرتا ہے؟"

"یقیناً!" لیوسین نے جواب دیا....."یہی تو آج کا مسلمہ منطقی نظریہ ہے انسان سماجی قیمت کی ایک وحدت ہے اور بس اس کے علاوہ سب کچھ نرے مفروضات ہیں!"

"یہ تو بڑی ہولناک صورت حال ہے۔"

"میں تو اس میں ہولناکی کی کوئی بات نہیں دیکھتا!"

"لیوسین! سنو — ہماری تہذیب نے خودکشی کر لی ہے۔ ہماری تہذیب میں خصوصی اوصاف تین تھے۔ ایک وصف تو تھا حسن و جمال سے محبت و عقیدت کا، یہ یونانیوں کا عطیہ تھا، دوسرا وصف تھا۔ قانون پسندی، یہ روم والوں کی دین تھی۔ تیسرا وصف تھا انسان کا عزت و احترام، اور یہ وصف بہت عرصہ بعد بڑی مصیبتیں جھیل کر عیسائیت سے سیکھا گیا تھا۔ ہماری مغربی تہذیب نے حسن، قانون اور انسان انہی تین چیزوں کی قدر و عزت کرنے کے طفیل اتنا عروج و کمال حاصل کیا تھا۔ افسوس کہ اب اس نے اپنی وراثت کے سب سے اہم عنصر سے ہاتھ دھو لیا ہے وہ عنصر یہ ہے انسان کی قدر و محبت اور اس کا وقار و احترام انسان کی محبت اور اس کے وقار و احترام سے بیگانہ ہو جانے کے بعد کسی تہذیب کو زندہ رہنے کا نہ حق ہے نہ قدرت اسے زندہ چھوڑ سکتی ہے مغربی تہذیب کا بھی خاتمہ ہو ہی جانا چاہیے تھا اور وہ ہو کر رہا...!"

"تاریخ کا مطالعہ تو بتاتا ہے کہ ماضی بعید کا انسان اس سے بھی

دور وہ تاریک دور دوں سے گزر چکا ہے؛ یوسین نے کہا "انسان کو زمانۂ قدیم میں عوامی مقامات اور مذہبی قربان گاہوں پر زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ چرخیوں پر کھینچ کر اس کے جسم کے پرخچے اڑا دیئے جاتے تھے وہ ایک بے جان چیز کی طرح بیجا اور استعمال کیا جاتا تھا۔ ہمیں اپنے ہی دور کے اعمال و افعال پر اس قدر سخت احتساب کرنے کا کیا حق ہے؟"

"بہت ٹھیک!" کاونٹ نے کہا۔ "اس تاریک عہد میں انسان کے وقار و خودی کی بے حرمتی کی جاتی تھی۔ اس سے نفرت و حقارت کا سلوک روا رکھا جاتا تھا بربریت کی انتہا یہ تھی کہ انسانی قربانی کے جشن منائے جاتے تھے لیکن ہم نے تو وحشت و بربریت پر فتح حاصل کر لی تھی۔ ہم نے ابھی انسان کا سچا احترام کرنا شروع ہی کیا تھا۔ ہم ابھی ایک عصرِ نو میں داخل ہی ہو رہے تھے کہ اچانک اس مشینی تہذیب نے ہماری صدیوں کی کمائی کو غارت کر ڈالا۔ آج انسان انسانیت کے بلند مرتبے سے گر کر محض سماجی استعمال کا ایک سامان بن چکا ہے ——

کیا ہم چلیں؟ — دیر ہو رہی ہے!"

یوسین نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔

"اوہ! یہ تو بند ہو گئی ہے"، اس نے کہا۔ "والد صاحب آپ بتا سکتے ہیں کہ اس وقت کیا بجا ہے؟"

"یہ پچیسواں گھنٹہ ہے!"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا" یوسین نے کہا

"میں جانتا ہوں، تم ہی نہیں شاید کوئی بھی میرا مطلب نہیں سمجھنا چاہتا۔ اس وقت یہ پچیسواں گھنٹہ ہے، مغربی تہذیب کی خودکشی کا!"

(نوشتہ: سی ورجل گھیرتیو)

کوثر نیازی ●

وارداتِ زنداں

زندگی مطلعِ انوار نظر آتی ہے
مہرباں پھر نگۂ یار نظر آتی ہے

تیرے بیمار کی حالت بھی عجب ہے اسکو
ہر دوا موجبِ آزار نظر آتی ہے

حد سے پا نہ سکے آج تلک اسکا سراغ
منزلِ عشق سرِ دار نظر آتی ہے

زندگی میں یہ گزاری ہے کچھ ایسے ڈھب سے
ایک اک سانس گنہگار نظر آتی ہے

آ ہی اے عشق کہ سلجھائیں مسائل اپنے
عقلِ ناداں تو لاچار نظر آتی ہے۔

وہ مقامات ہیں اس میں کہ محبت کوثر
نور ہو کے بھی مجھے نار نظر آتی ہے

فیروز نظر

غزل

پئیں "خونِ غریباں" بندہ پرور ہم نہ کہتے تھے
چلائیں ناتواں سینوں پہ خنجر ہم نہ کہتے تھے

نگاہیں پھیر لیں گے وہ بھی اکدن تیری جانب
بدل جائیں گے اے دل ان کے تیور ہم نہ کہتے تھے

اک ایسا بھی مقام آتا ہے، راہِ زندگانی میں
جب انساں موت کا ہوتا ہے خوگر ہم نہ کہتے تھے

نظر اب سر پکڑ کے رو رہے ہیں قافلے والے
لباسِ راہزن پہنے ہے رہبر ہم نہ کہتے تھے

(غیر مطبوعہ)

عاصی کرنالی

نشتر

(غزلِ مسلسل)

رُوحِ منظر نہ بنے، جانِ بہاراں نہ بنے
لوگ کانٹوں سے گزر کر بھی گلستاں نہ بنے

انقلابات نے بھی رُوح نہ پھونکی ہم میں
ہم سمندر میں بھی ہنگامۂ طوفاں نہ بنے

چونکتا ہی نہیں انسان کا خوابیدہ ضمیر
وہ بھی نشتر ہیں کہ مضرابِ رگِ جاں نہ بنے

ہوئے پُورے نہ بہاروں کے تقاضے ہم سے
ہم گریباں تو بنے، چاکِ گریباں نہ بنے

نعمتِ درد سے محروم رہا گوشۂ دل
بن گئے لوگ فرشتے، مگر انساں نہ بنے

ایسے کتنے ہی گریباں ہیں جو فصلِ گل میں
چاک ہو کر بھی ترا گوشۂ داماں نہ بنے

واقعاتِ غمِ دنیا سے بصیرت نہ ملی
یہ شرارے بھی چراغِ دلِ انساں نہ بنے

ہمیں فرصت ہی نہ دی نالۂ دل نے عاصیؔ
کسی محفل میں بھی ہم سازِ غزلخواں نہ بنے

(ہمایوں)

ترجمہ انوار الحق •

"پھر ترا راہگذر یاد آیا"

اس دن معمول سے کچھ زیادہ ہی گرمی تھی۔ وہ اپنے پرائیویٹ سٹنگ روم میں دیوان پر لیٹی تھی۔ روشندانوں پر سیاہ پردے چڑھوا کر اس نے کمرے میں اندھیرا کر رکھا تھا۔ ویسے بھی یہ کمرہ گھر کے دوسرے کمروں کے مقابلے میں زیادہ ٹھنڈا تھا۔ اس نے میز پر سے چاندی کا سگرٹ کیس اٹھا کر گولڈ ٹپ کا سگرٹ نکالا۔ پھر اپنے بیگ میں سے سگرٹ لائٹر نکال کر اسے سلگایا۔ کہنیوں کے بل کشن پر لیٹ گئی۔ اور سگرٹ کے کش لیتے ہوئے کچھ سوچنے لگی۔ صبح سے فضا پر کچھ نامعلوم سی اداسی چھا رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا دل کوئی چٹکیوں میں مسل رہا ہو۔ شاید گرمی کی وجہ سے ایسا تھا یا شاید اسلیئے کہ آج صبح وہ بہت سویرے ہی بیدار ہو گئی تھی۔ کیونکہ اجمل کو صبح ۵ بجے اپنے منسٹر سے اسٹیشن پر ملنا تھا اور اسلیئے دونوں نے بہت صبح ہی ناشتہ کر لیا تھا۔ اور اب وہ کچھ بھوک بھی محسوس کر رہی تھی اس نے اٹھ کر ملازم کے لیئے گھنٹی بجائی اور اسے کولڈ کافی اور کچھ... بسکٹ لانے کے لیئے کہا۔ ملازم کافی لے آیا اور وہ دیوان پر تکیوں کے سہارے بیٹھ کر کافی پینے لگی۔ وہ اپنے خیالات سے چونک اٹھی اور اٹھ کر فون سننے کے لیئے چلی گئی۔

"ہیلو......" اس نے ریسیور اٹھایا۔

"کیا کر رہی ہو جانم؟" یہ اجمل کی آواز تھی۔ "کولڈ کافی پی رہی ہوں" اس نے کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے جواب دیا۔

"آہا...... کتنی خوش قسمت ہو ٹھنڈے کمرے میں بیٹھی کافی پی رہی ہو۔ ادھر صبح سے فائلوں اور گرمی نے پاگل کر رکھا ہے۔" اجمل بولا۔

"اجمل آج ذرا جلدی آجانا" اس نے نرم لہجے میں کہا

"کیوں ڈارلنگ کوئی خاص بات ہے؟"

"بھوک لگ رہی ہے ذرا کھانا جلدی کھائیں گے۔"

"اوکے جانم۔ لیکن تمہیں ایک خبر سنانی تھی۔ وسیم اور عشرت آج اسٹیشن پر مل گئے۔ وسیم کا تبادلہ یہاں کا ہو گیا ہے۔ جب تک انھیں گھر نہیں ملتا وہ دونوں ہوٹل میں ٹھہریں گے۔ میں نے... آج رات کے کھانے کے لیئے ان سے کہہ دیا۔ ٹھیک ہے نا؟"

وسیم کا نام سنتے ہی اسے اپنا سر گھومتا ہوا معلوم ہوا، اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی گولی سنسناتی ہوئی۔ اس کے کان کے قریب سے نکل گئی ہو۔ اور اس کی سرخ رنگت پر ایک دم زردی چھا گئی۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ اجمل اس سے ٹیلیفون پر بات کر رہا تھا ورنہ نہ معلوم وہ اس فوری تبدیلی کا کیا مطلب لیتا۔ لیکن اس نے فوراً اپنے آپ کو سنبھال کر جواب دیا۔

"اوہ، اجمل، کیا سچ کہہ رہے ہو۔ اب تو یہاں خوب رونق ہو جائے گی۔ رات کا کھانا تیار ہوگا۔ تم فکر نہ کرو۔"

"خدا حافظ سوئیٹ ہارٹ، میں ساڑھے بارہ بجے پہنچ جاؤنگا۔"

"خدا حافظ" اور اس نے ریسیور رکھدیا۔

وہ کمرے میں واپس آگئی۔ کافی کا گلاس میز پر رکھدیا اور بے جان سی ہو کر دیوان پر گر پڑی۔

آج کئی سال کے بعد جب کہ اس کی زندگی میں ایک سکون اور ٹھہراؤ سا پیدا ہو چلا تھا یہ وسیم پھر اس میں پتھراؤ کرنے کیلیئے کہاں سے آگیا۔ وسیم جسے اپنی شادی سے قبل اسے دیوانہ وار چاہا تھا جس کے خیال میں کئی راتیں اس نے آنکھوں میں گذار دیں جس کا تصور اسکی زندگی کا بہترین سرمایہ تھا اور یہ جان سکنے کے لیئے کہ وہ اسے چاہتا ہے یا نہیں، وہ کتنی بیقرار رہی مگر کبھی نہ جان سکی۔ وسیم اس میں دلچسپی لینے کے باوجود کبھی اس سے اظہار محبت نہ کیا

اس کے صحیح احساسات کو بھی نہ پہچان سکی۔

وہ آج سے قریباً آٹھ سال قبل پہلی دفعہ اسے ملی۔ جیمخانہ میں اس روز کوئی خاص تقریب تھی جس کے سلسلے میں وہ ابھی اپنی امی اور ابا کے ساتھ مدعو تھی۔ بڑے کمروں میں بینڈ بج رہا تھا۔ عذرا، منظور اور شمی وغیرہ ایک طرف بیٹھے رمی کھیل رہے تھے۔ وہ بھی ان میں شامل ہو کر رمی کھیلنے لگی۔

وہیں پہلی دفعہ اس نے وسیم کو دیکھا۔ نہایت ہنس مکھ شریر اور ڈیشنگ قسم کا لڑکا تھا۔ کھیلتے کھیلتے عرفان صاحب کہنے لگے۔

"بھئی مجھے کھانسی نے بہت ستا رکھا ہے۔ کیا کروں؟"

"واہ اس کا تو بہت آسان علاج ہے۔" وسیم نے چہک کر کہا۔

"کیا علاج ہے؟" عرفان صاحب نے کارڈز نیچے رکھ کر نہایت دلچسپی سے پوچھا۔

"جب کھانسی آئے کھانس لیا کیجئے۔" وسیم نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

عرفان صاحب نے کارڈز اٹھا لیے اور زیر لب ایک گالی بکی، باقی سب ہنسنے لگے۔

اس نے نظریں اٹھا کر وسیم کی طرف دیکھا۔ عین اسی وقت وسیم نے بھی اس کی طرف دیکھا اور وہ فوراً نظریں جھکا کر تاش کھیلنے میں مصروف ہو گئی۔

کھانے کے بعد بینڈ نے سامبا شروع کر دیا اور بہت سے جوڑے اٹھ کر ناچنے لگے۔ وہ اطمینان سے امی کے پاس بیٹھی اورنج کرش پی رہی تھی۔ امی ایک بہت بڑے بزنس مین سے باتوں میں مشغول تھیں جو کورے کی درآمد برآمد کے سلسلے میں بہت سے انکشافات فرما رہے تھے۔ وسیم اسکے قریب آکر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔

"اگر کورے کی درآمد برآمد سے گھبرا گئی ہوں تو چلیئے ذرا ادھر چل کر ٹہلیں۔"

پھر وہ بے تکلفی سے مسکرانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت کی وہی تیز چمک تھی۔ اس نے اورنج کرش کا گلاس میز پر رکھ دیا اور کھڑی ہو گئی۔ وہ اسے باغ میں آئرس کی کیاریوں کی طرف لے گیا۔

"یہ آئرس دیکھئے۔ انہیں یہاں اگانے کے لئے کلب کے مالیوں کو بہت محنت کرنا پڑی۔"

وہ جھک کر آئرس کے پھولوں کو دیکھنے لگی۔ کاسنی اور سفید رنگ کے بے انتہا خوبصورت پھول۔ وہ ازل سے پھولوں کی شیدائی تھی۔ آئرس کے پھول دیکھ کر مسحور سی ہو گئی۔ اس نے اپنی نازک سی ناک کاسنی رنگ کے پھولوں سے لگا دی۔ ہلکی ہلکی بے انتہا رومانی خوشبو تھی۔ پھر وہ دیر تک پھولوں کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ اور اسے یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ وسیم بھی پھولوں میں بہت دلچسپی لیتا تھا اور باغبانی کے متعلق اس کی معلومات بہت وسیع تھی۔

اس تقریب کے کوئی چار پانچ ماہ بعد وہ اسے عذرا کے ہاں ایک پہاڑی مقام پر ملی۔ دو تین روز کی لگاتار بارش کے بعد اس دن بہت سردی تھی۔ ڈرائنگ روم میں وہ سب آتشدان کے قریب بیٹھے تھے جس میں لکڑیاں چٹخ چٹخ کر جل رہی تھیں۔ وہ کافی پی رہے تھے اور چیز ٹوسٹ کھا رہے تھے۔

وہ اسے دیکھ کر فوراً کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔

"کیا ہم پچھلے سال جیمخانہ میں نہیں ملے تھے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی پیشانی پر گری ہوئی بالوں کی لٹ کو سر کے ایک جھٹکے سے اوپر کیا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ بہت اچھا معلوم ہوا۔

"جی ہاں۔ اور ہم بہت دیر تک پھولوں کے متعلق باتیں بھی کرتے رہے تھے۔" اس نے جواب دیا۔

اس نے اپنی کرسی اسے پیش کر دی۔ وہ شکریہ کہہ کر بیٹھ گئی اور وہ دوسری کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب لے آیا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔

عذرا کہنے لگی۔

"نفیسہ، چلو ہم سب اکٹھے مل کر کسی دن پکنک پر چلیں۔ کیوں وسیم چلو گے؟"

دونوں نے کہا ضرور پکنک پر چلنا چاہیئے۔ عذرا پکنک کا پروگرام بنانے لگی۔ اور وہ دیر تک آتشدان کے قریب بیٹھے باتیں

گئے اور پکنک کے کھانے کا مینو بناتے رہے وہ گھر واپس آنے کے بعد جب اپنے پلنگ پر لیٹ گئی۔ تو اس نے محسوس کیا کہ وسیم اسکے خیالوں پہ چھایا جا رہا ہے۔ اسکی آنکھوں میں شرارت کی چمک اسے یاد آگئی۔ اس نے ایک انگڑائی لی تکیے پر سر رکھا اور وسیم کے خوابوں میں کھو گئی۔

پکنک والے دن وہ وقت مقررہ پر عذرا کے ہاں پہنچ گئی۔ اس نے پکنک کیلئے کافی لوگ اکٹھے کر رکھے تھے۔ وہاں وہ عشرت سے بھی ملی۔ نہایت الٹرا موڈرن قسم کی لڑکی تھی۔ اس نے گہرے سبز رنگ کی سلیکس اور بھاری چیک کا ہاف کوٹ پہن رکھا تھا۔ ہاتھ میں بلیک اینڈ وائٹ سگرٹوں کا ڈبہ تھامے تھی۔

جب وہ سب کاروں میں لد کر پکنک کے مقام پر پہنچے تو وہ۔۔ مسحور سی ہو گئی۔ چاروں طرف پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک حسین وادی تھی اور درمیان میں ایک شفاف چشمہ پہاڑوں سے سر ٹپکتا ہوا بہہ رہا تھا۔ اونچے اونچے پائن کے درخت چاروں طرف خاموش کھڑے تھے۔ اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس وادی اور شفاف چشمے کی پاسبانی کر رہے ہوں۔ تمام وادی پر ایک سحر انگیز کیف چھا رہا تھا بچے انتہا سے زیادہ خوش تھے اور چاروں طرف کود پھلانگ رہے تھے۔ ملازموں نے ایک طرف قالین بچھا دیئے اور سب بیٹھ کر رمی کھیلنے لگے۔ مگر وسیم انکے ساتھ کھیلنے لگا۔ پھر وہ مڑ کر عشرت سے کہنے لگا۔

”عشی، اس پہاڑ کے پچھلی طرف سے دریائے جہلم نظر آتا ہے تو وہاں چلیں۔ یہ تاش واش چھوڑو۔ یہاں گھومنے پھرنے کے ہیں یا تاش کھیلنے۔؟“

”او، کے“ عشرت نے جواب دیا۔ اور تاش کے پتے پھینک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے کنکھیوں سے وسیم کی طرف دیکھا وہ عشرت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسکے چہرے پر ایک قابل رشک شگفتگی تھی۔ پھر وسیم اور عشرت دونوں پہاڑ کی دوسری طرف چلے گئے وہ انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی اسکے دل کو ایک نامعلوم سا صدمہ ہوا۔ اب اس کا تاش کھیلنے کو مطلق دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ اٹھ کر قالین کے دوسرے سرے پر چلی گئی۔ اور تکیئے کے سہارے لیٹ کر ”لائف“ پڑھنے لگی۔ اس کی نظریں تو کتاب کے الفاظ پر تھیں مگر۔۔۔ خیالات کہیں اور پریشان تھے۔ پھر وہ اپنے دل کو سمجھانے لگی کہ اگر وسیم کو اس کا خیال نہیں تو وہ کیوں اس میں دلچسپی لیتی ہے اور اس کے متعلق سوچتی رہتی ہے۔ اس نے چاہا کہ وسیم کا خیال اپنے دل سے نکال دے مگر ایسا نہ کر سکی۔ وسیم اس کی رگ رگ میں سما چکا تھا۔ وہ بے چین سی ہو کر اٹھ بیٹھی اور چشمے کے کنارے ٹہلنے لگی۔ اسکی بیتاب نظریں بار بار اس پہاڑ کی طرف اٹھتیں جس کے پیچھے وسیم اور عشرت دریائے جہلم ڈھونڈ رہے تھے۔ ان کو گئے کوئی ایک گھنٹہ ہو گیا تھا۔ نہ معلوم وہ ابھی تک واپس کیوں نہ آئے تھے۔ ایک ایک لمحہ اسکے دل و دماغ پر ایک بوجھ سا بن کر چھا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے عشرت اور وسیم کو آتے دیکھا۔ وسیم نے کوٹ اتار کر کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ اور عشرت اس کے بازو کا سہارا لیئے آ رہی تھی۔ بالوں کی ایک شوخ لٹ وسیم کی پیشانی پر بکھر گئی تھی۔

اسکے دل پر ایک چوٹ سی لگی اور وہ پھر قالین پر بیٹھ کر بظاہر ”لائف“ پڑھنے میں مشغول ہو گئی۔

عذرا تاش کے پتوں پر نظریں جمائے بولی۔

”دیکھ آئیں دریائے جہلم عشی ؟“

”جہلم مائی فٹ“ عشرت نے ناراض ہوتے ہوئے کہا ”لیکن تھکا دیا ہمیں۔ ایک گھنٹہ کھنڈوں اور پہاڑوں میں خراب ہوتے پھرے اور وہاں سوائے سیاہ ننگے پہاڑوں کے کچھ بھی نظر نہیں آیا“

یہ کہہ کر عشرت نے ایک سگرٹ سلگایا اور قالین پر کشن کے سہارے لیٹ گئی۔ وسیم ہنسنے لگا۔ بالوں کی ایک پریشان لٹ پھر اس کی پیشانی پر کھیلنے لگی اور اس نے سر کی ایک جنبش سے اسے اوپر کر دیا، پھر وہ اس سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

”آؤ نفیسہ، اس بائیں طرف والے پہاڑ کے پیچھے دریائے جہلم ڈھونڈیں۔ پچھلے سال تو یہیں کہیں تھا۔ نہ معلوم اس سال کدھر چلا گیا۔“

سب ہنسنے لگے۔

اس نے ایک لمحہ کیلئے کچھ سوچا اور پھر جواب دیا۔

"جی، نہیں، ہمیں اپنی ٹانگیں توڑنے کی ضرورت نہیں"

وسیم نے پہلے مسز لیسور کر اس کی طرف دیکھا اور پھر نہایت بے تکلفی سے اسکے قریب آکر بیٹھ گیا۔ اور اس کے ہاتھ سے لائف چھینتے ہوئے بولا۔

"کون سا اتنا اہم آرٹیکل پڑھا جا رہا ہے۔ ذرہ ہم بھی دیکھیں پڑھتے پڑھتے اس نے نہایت میٹھی نظروں سے نفیسہ کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔

تاش سے فارغ ہو کر عذرا نے دستر خوان بچھوایا اور سب کھانا کھانے لگے۔ کھانے کے بعد ریکارڈوں کی موسیقی کے ساتھ ایک کھیل کھیلا گیا۔ کھیل کے اختتام پر وسیم ہار گیا۔ اور اسے سزا ملی کی جو سب سے زیادہ ہر دلعزیز ہستی ہے اسکے سامنے جھکو، جو سب سے زیادہ خوبصورت ہے۔ اسکے سامنے گھٹنے کے بل بیٹھ جاؤ۔ اور جسے تم سب سے زیادہ پسند کرتے ہو اسکے ہاتھ چوم لو"

وسیم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے عشرت کی طرف دیکھا اور شرارت سے بائیں آنکھ کا کونہ دبایا۔ پھر اس کے سامنے جا کر جھک گیا اب دوسری شرط پوری کرنا تھی۔ اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ کیونکہ اب وسیم اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں شرارت کی تیز چمک۔ پھر وہ آگے بڑھا اور اس کے سامنے آکر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ سب نے تالیاں بجانی شروع کریں وہ شرم سے سرخ ہو گئی۔ لیکن ساتھ ہی اس کا دل مسرت کے شدید احساس سے ناچ اٹھا، پھر وہ کھڑا ہو کے کہنے لگا۔

"بھئی تیسری شرط ابھی ملتوی کرنی پڑے گی۔ کیونکہ میں ابھی فیصلہ نہیں کر سکا"

تالیوں اور سیٹیوں کے شور میں سب ہی چیخنے لگے۔

"نہیں نہیں تیسری شرط بھی پوری کرنی پڑیگی۔

وسیم نے چاروں طرف دیکھا۔ سب لڑکیوں پر اپنی میٹھی مسکراہٹیں بکھیر دیں اور پھر بولا۔

"نہیں صاحب ابھی میں فیصلہ نہیں کر سکتا۔ یہ شرط کسی اور موقع پر پوری کی جائیگی۔"

اس نے اطمینان کا سانس لیا اور اس کے بعد دوسرے کھیل شروع ہو گئے۔

شام کو خاصا اندھیرا ہونے پر جب وہ گھر لوٹی تو تکان سے چور ہو رہی تھی۔ وہاں ہنسی ہنسی میں اتنا زیادہ کھا لیا تھا کہ رات کے کھانے کو مطلق جی نہ چاہتا تھا۔ اس نے اپنے کمرے میں آکر شب خوابی کے کپڑے پہنے اور دیوان پر لیٹ گئی۔ اچانک وسیم کا مسکراتا ہوا چہرہ اس کے تصورات پر چھا گیا۔ اس کی شفاف پیشانی پر اسکے سیاہ بالوں کی لٹ کھیل رہی تھی۔

"وسیم" اس نے آہستہ سے زیر لب کہا۔ "مجھے تم سے محبت ہے، لازوال محبت میرے محبوب! تم میری رگ رگ میں سما چکے ہو میں آج تک محبت کے مفہوم اور جذبے سے قطعی ناواقف تھی آج اپنی روح کی تمام گہرائیوں سے تمہیں چاہتی ہوں۔ وسیم کیا تم میرے بن سکو گے"۔

پھر وہ اپنی آواز سے جیسے خود ہی چونک اٹھی۔ کمرے میں تیز روشنی کا بلب روشن تھا۔ اس نے اٹھ کر روشنی گل کر دی اور۔۔ پلنگ پر لیٹ کر سو گئی۔

پکنک کے کوئی ایک ہفتہ بعد اس کی سالگرہ تھی۔ اس کے امی ابا نے کافی لوگوں کو مدعو کر رکھا تھا۔ اس نے وسیم کو بھی دعوت نامہ بھیجا۔ اس دن وہ سنہری ستاروں کے بلاؤز اور سفید شیفون کی ساڑی میں بہت خوبصورت اور دلکش لگ رہی تھی۔ اسکے سیاہ بالوں میں کان کے قریب دو سفید منگی پھول دمک رہے تھے اس نے کسی کو نہیں بتایا تھا کہ یہ اس کی سالگرہ کی تقریب کی دعوت تھی کیوں کہ وہ تحفوں سے بہت گھبراتی تھی۔ سالگرہ کے کیک پر اٹھارہ موم بتیاں روشن کر کے جب سب نے "ہیپی برتھ ڈے ٹو یو"

(Happy Birthday to You)

گانا شروع کیا تو وسیم اسکے قریب آکر کھڑا ہو گیا اور جھک کر کہنے لگا

"نفیسہ! تم نے ہمیں کیوں نہ بتایا کہ یہ تمہاری سالگرہ کی دعوت تھی؟"

وہ جواب میں مسکرانے لگی۔

چائے کے بعد وسیم فوراً ہی معذرت کر کے چلا گیا۔ اسکے جانے کے بعد بہت ہی دلچسپ کھیل کھیلے گئے۔ اور جیتنے والوں میں انعام تقسیم کئے گئے۔ مگر وسیم کی غیر موجودگی سے اس کے دل و دماغ پر ایک بے پناہ اداسی چھا رہی تھی۔ جب سب مہمان رخصت ہو گئے تو وہ باہر برآمدے میں آ گئی اور سنگ مرمر کے ستون کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی اُس نے اوپر دیکھا۔ آسمان ستاروں سے بھرا ہوا تھا فضا پر ایک پر کیف مدہوشی سی چھائی ہوئی تھی۔ پائن کے اونچے اونچے درختوں کے پتوں میں سے ٹھنڈی اور ہلکی ہلکی ہوا سرسرا رہی تھی۔ برآمدے میں بڑے سے گملے میں ایک اکیلا ڈیلیا کا پھول سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور وہ سوچنے لگی کہ وسیم اتنی جلدی کیوں چلا گیا۔ اسے کوئی ضروری کام بھی تو نہیں تھا۔ اس خوشی کی تقریب میں وہ آدھے گھنٹے سے بھی زیادہ نہ ٹھہرا۔ کاش وسیم کے دل کی گہرائیوں میں اتر سکتی اور یہ جان سکتی کہ وہ بھی اسے چاہتا ہے یا نہیں۔ اور وہ کتنی ہی دیر تک یوں ہی ستون کے سہارے کھڑی سوچتی رہی۔

برآمدے میں ہلکے سے قدموں کی چاپ سنائی دی لیکن وہ اسی طرح ستون سے لگی کھڑی رہی۔ پھر اسکے کانوں میں ایک... بھاری آواز آئی۔

"سوئٹ سیونٹین (Sweet Seventeen)

اس نے پلٹ کر دیکھا۔

وسیم کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"آپ کب آئے" اس نے خوشی اور حیرت کے ملے جلے جذبے سے کہا۔

"یہ لیجئے" اس نے ایک پیکٹ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

اس نے پیکٹ لیا اور بولی۔

"یہ کیا ہے؟"

"آپ کے لئے ایک تحفہ"

"اوہو...... جبھی اتنی جلدی اٹھ کر چلے گئے تھے" اُس نے جیسے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

پھر وہ پیکٹ کو کھولتے ہوئے بولی۔

"دیکھئے، یہ آپ کی زیادتی ہے"

پیکٹ میں سفید نگینوں کا ایک بے حد خوب صورت چھوٹا سا ہینڈ بیگ نکلا، اس نے ممنون نگاہوں سے وسیم کی طرف دیکھا، فرطِ جذبات سے وہ شکریہ بھی نہ کہہ سکی۔

رات وہ دیر تک جاگتی رہی۔ وہ ہینڈ بیگ اسکے تکیے کے قریب پڑا تھا۔ اس نے اسے اٹھا کر اپنے رخسار سے بھینچ لیا اور سرگوشیوں میں کہنے لگی۔ "وسیم مجھے تمہارے تحائف وغیرہ کچھ نہیں چاہئیں۔۔ صرف ایک دفعہ میرے کانوں میں یہ کہہ دو "نفیسہ، میں تمھیں چاہتا ہوں"۔ پھر میں دنیا کی تمام نعمتیں پا لوں گی۔ میں صرف تمہاری محبت چاہتی ہوں۔ یہ لازوال نعمت پا کر دنیا میں مجھے اور کسی شے کی تمنا نہ رہے گی۔ وسیم........ میرے وسیم!"........ اور وہ اسی طرح وسیم کے تصورات میں کھوئی ہوئی سو گئی۔

پھر کچھ عرصہ کے بعد اس نے محسوس کیا کہ وسیم عشرت میں بہت دلچسپی لیتا ہے، عشرت جو ایک نہایت الٹرا موڈرن قسم کی لڑکی تھی۔ ہر وقت سلیکس پہنے رہتی۔ شیپ ہرڈز سیرینیڈ، گنگنایا کرتی، اور بات بات پر مائی فٹ، ڈیم اٹ، باشٹ اور ریڈیکولس فرمایا کرتی، پرانے خیالات کے لوگوں پر ہنستی، ہر بات پر شانے سکیڑتی، اور ہمیشہ منہ سے ایک لمبی سیٹی بجا کر حیرت کا اظہار کیا کرتی۔ عذرا اسلئے اسے ایک دفعہ بتا کر وسیم اور عشرت کا رومان قریباً ایک سال سے چل رہا ہے مگر اسے یقین نہ آیا۔ اور یہ تلخ حقیقت اس پر اس پکنک پر ظاہر ہوئی جو عشرت نے ٹیبل ٹینس میں کپ جیتنے کی خوشی میں دی۔ عشرت نے بہت سے دوستوں کو اُس وادی میں پکنک پر مدعو کیا۔ چائے سے پہلے عشرت نے گرامون پر ریکارڈ بجانے شروع کر دیئے۔ باقی سب ایک بہت انٹلیکچوئل قسم کا کھیل کھیل رہے تھے۔ موسیقی کے شور سے

بابا بھول جاتے۔ وسیم نے چلا کر کہا۔

"عشی بند کرو گراموفون کو"

"نہیں بند کریں گے" عشرت نے جواب دیا۔

"ٹھہرو میں خود آکر بند کرتا ہوں"

یہ کہکر وسیم اٹھ کر گراموفون کے قریب آگیا۔ اور عشی کا ہاتھ پکڑ کر گراموفون سے ہٹانا چاہا۔

"اوہ، چھوڑو میرا ہاتھ" عشرت نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

" اب تو یہ ہاتھ میں تمام عمر نہ چھوڑوں گا" وسیم نے آہستہ سے جواب دیا۔

وہ بھی قریب ہی کھڑی سن رہی تھی۔ اچانک دو بڑے بڑے آنسو اسکی پلکوں میں تیرنے لگے لیکن اس نے فوراً سنبھل کر پلکوں کو جھکاتے ہوئے ان آنسوؤں کو پی لیا۔ چائے کے ساتھ وہ مطلق کچھ نہ کھا سکی، اسکے چہرے پر زردی چھا رہی تھی۔ عذرا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

"کیسی طبیعت ہے نفیسہ پیاری...... کیسی زردی ہو رہی ہو"

"سر میں شدید درد ہے عذرا" پھر وہ عشرت.. کی طرف مخاطب ہو کر بولی "عشی اگر برا نہ مانو تو میں جلدی چلی جاؤں سر میں ناقابل برداشت درد ہے"

عشرت اپنا ہینڈ بیگ کھول کر ساریڈون ڈھونڈنے لگی، پھر ایک ٹکیہ اسے دیتے ہوئے بولی، "یہ ایک ٹکیہ چائے کے ساتھ کھاؤ ڈارلنگ، ابھی ٹھیک ہو جاؤ گی"

"نہیں اب میں جاؤں گی" اس نے جواب دیا "سردی بھی محسوس ہو رہی ہے، کہیں بخار نہ ہو جائے"

وسیم اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا کہ وہ خود اسے گھر پہنچا کر آئے گا۔ کار میں وہ وسیم کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا سر سیٹ کی پشت سے لگا دیا۔ اور آنکھیں بند کر لیں تھوڑی دور جا کر وسیم نے آہستہ سے پکارا۔

"نفیسہ"

اس نے آنکھیں کھول کر اسکی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک گہرے درد کی جھلک تھی۔

"کیسی طبیعت ہے اب؟" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

لیکن وہ تو کچھ اور ہی چاہتی تھی، وہ چاہتی تھی کہ وہ اس کے کانوں میں آہستہ سے گنگنائے،

"نفیسہ میں تم سے محبت کرتا ہوں، تمہیں اپنے دل کی تمام گہرائیوں سے چاہتا ہوں۔ وہ جو کچھ تم نے ابھی سنا تھا۔ وہ تو جھوٹ تھا۔ ایک شرارت تھی۔ محض تمہیں چڑانے کے لئے۔ ورنہ تم ہی تو ہو جو شب و روز میرے خیالوں اور تصوّرات پر چھائی رہتی ہو۔ بولو تم بھی مجھے چاہتی ہو یا نہیں؟"

اور وہ جواب دیتی:۔

"وسیم، میرے اپنے وسیم۔ میں تمہیں دیوانہ وار چاہتی ہوں تمہاری پرستش کرتی ہوں، تم میری زندگی ہو، تم میری روح ہو۔ تم میرے سب کچھ ہو"

کاش ایسا ہو سکتا۔

مگر ایسا نہ ہوا۔

وہ اسے گھر پہنچا کر چلا گیا۔

وہ اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر گر گئی۔ آنسوؤں کا ایک سیلاب اسکی لمبی لمبی پلکوں کے حصار کو توڑتا ہوا بہہ نکلا۔

"وسیم میرا نہیں، وہ عشرت کا ہے۔ خوش نصیب عشرت کا" اس نے زیر لب کہا اور ہچکیاں لیتے ہوئے تکیے میں منہ چھپا لیا۔

قریباً دو ماہ بعد وسیم اور عشرت کی شادی ہو گئی اور وہ اپنا.... ہنی مون منانے کے لیئے سوئٹزرلینڈ چلے گئے۔ دن گزرتے گئے اور وقت اور زمانہ نے اسکے گھائل دل پر مرہم رکھنے کی کوشش کی اور اس کی اداس اور بے کیف زندگی میں اجمل نے جھانکا۔

بڑی بڑی دلکش آنکھوں والا اجمل جس کے لیئے بہت سی لڑکیاں کریزی (crazy) تھیں۔ مگر وہ صرف اسے چاہتا

اس نے اپنی اداسیوں اور ویرانیوں سے قرار پانے کے لیے اجمل سے شادی کر لی۔ شادی کے بعد اجمل کی لا انتہا محبت اور دلداری نے اسے وسیم بھلا دیا۔ اس کی مضطرب اور بیقرار زندگی میں ٹھہراؤ اور سکون پیدا ہو گیا۔ اور اس کی بھٹکتی ہوئی روح کو طمانیت مل گئی۔

لیکن آج یہ کیا ہوا۔؟

وسیم پھر آ رہا ہے۔ وسیم جسے کبھی اس نے دیوانہ وار چاہا تھا اور جسے بھلانے کی کوشش میں وہ قریباً قریباً کامیاب ہو چکی تھی۔ آج اس کی آمد کی خبر نے اس سکون کو پھر درہم برہم کر دیا اسکے دل میں.. دبی ہوئی چنگاری پھر سلگ اٹھی۔ جو اس کے صبر و سکون کو خاک سیاہ کرنے پر تل گئی تھی۔ وہ کیسے وسیم سے ملے گی۔ کہیں وہ اسے دیکھ کر پھر اپنا صبر و قرار نہ کھو بیٹھے۔ اپنے ہوش و حواس نہ گم کر دے۔

اس نے نڈھال ہو کر بے کسی سے اپنا سر کشن پر رکھ دیا۔

اور کتنی ہی دیر تک یونہی بے حس و حرکت پڑی رہی۔

پورٹیکو میں کار کے ہارن کی آواز آئی۔ اجمل آفس سے واپس آ گیا تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوا۔ تو اسے دیوان پر بے حس و حرکت پڑا دیکھ کر گھبرا گیا اور پاس آ کر پکارا

"نفیسہ"

اس نے کھوئی ہوئی نظروں سے اجمل کی طرف دیکھا اور پھر ایک دم اٹھ کر اسکے سینے سے لپٹ گئی۔

"اجمل مجھے تم سے محبت ہے۔ میں تمھیں دیوانہ وار چاہتی ہوں۔ تمہاری پرستش کرتی ہوں۔ تم میری زندگی ہو۔ میری روح ہو مجھے تم سے کوئی نہیں چھین سکتا، میں تمہاری ہوں، اجمل، صرف تمہاری" یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اجمل نے حیرت و تعجب سے اس کی طرف دیکھا اور پھر اسکے سر کو اپنے رخسار سے لگا کر بھینچ لیا۔

(بشکریہ ساقی)

انور صدیقی

"پابندی"

پھانسیوں کے مہیب جھولوں سے میرے ہمدم شکستگی کیا
ہمارے خوں کے ہر ایک قطرے سے کتنے گلزار کھل رہے ہیں
وہ جن میں جوشِ عمل کے شعلے بجھے ہوئے تھے ہی مدتوں سے
نئے حوادث کے تند جھونکوں سے وہ گلے آج مل رہے ہیں

آج مشرق کی وادیوں میں نئے ترانے ہیں رقص فرما
کہ آج کوہ و دمن میں اسکے حیات افزا شعاعیں جاگیں
ہمارے اسلام نے اڑائے نئی سحر کے سپیں پھریرے
کہ ظلمتِ شب کے دیوتاؤں نے صبحِ نو کی قبائیں پہنیں

ہمارے ہر نقشِ پا سے ہمدم نئے عزائم کے غنچے پھوٹے
جدھر گئے قافلے ہمارے وہ بستیاں جگمگا اٹھی ہیں
وہ شاہراہیں جو تیرگی کے سیاہ غاروں میں ڈھل چکی تھیں
ہماری مشعل کی زندگی بیز روشنی میں چمک اٹھی ہیں

چمن کی ہر ہر کلی پہ پہرے بٹھا تو سکتے ہو پھر بھی لیکن
نسیم صبحِ بہار کو تم اسیرِ زنداں نہ کر سکو گے
ہر اک موجِ نحیف کو تم ہزار طوقِ گراں پنہاؤ ں
عظیم تر سیلِ حق پرستی کو پا بہ جولاں نہ کر سکو گے

ہمارے قدموں کو بیڑیوں میں جکڑ لو زنداں کے پاسبانو!
ہمارے اِن قافلوں کی رفتار سُست ہو جائے، غیر ممکن
"متاعِ لوح و قلم" کو لُوٹو، کہ ہونٹوں پر قفل ہی لگا دو
نظامِ حق کا مطالبہ اس طرح سے رک جائے غیر ممکن

تمہاری زنجیر اُونگھتی ہی، تمہارے زنداں شکستہ تر ہیں
جو قافلہ بڑھ رہا ہے پیہم، بھلا وہ اِن سب سے کیا رکے گا
نظامِ حق کی ابھرتی کرنوں کو تم گرفتار کر سکو گے
وہ تیز طوفاں جو اٹھ چکا ہے حقیر تنکوں سے کیا رکے گا

سید ابوالخیر کشفی

ادب نوازئ اہلِ ادب

آج میں جو کچھ لکھ رہا ہوں اگر آپ اسے مضمون کہنے پر مصر ہیں تو مضمون میری ذہنی پیداوار نہیں۔ یہ میری تخلیق نہیں، میں محض نقل کر رہا ہوں۔ میری حیثیت راوی کی سی ہے اور میں انتہائی ثقہ راوی کے فرائض انجام دوں گا۔ تحریف و اضافہ ویسے بھی مجھے پسند نہیں۔

اب غلطی مجھے اپنے پیشہ ورانہ ذکر سے بات شروع کرنی ہے۔ میں ایک مقامی کالج میں اردو پڑھاتا ہوں ——— ظاہر ہے کہ طالب علموں سے میرا تعلق ہے۔ ان کے تعلق سے میں پرچے بھی بناتا ہوں انہیں جانچتا بھی ہوں ——— اور یہ سب طالب علم ادب کے طالب علم ہیں ——— پچھلے دنوں طلبا کی کاپیاں دیکھتے ہوئے مجھ پر عجیب و غریب تاریخی اور ادبی انکشافات ہوئے۔ ہر انکشاف اپنے ساتھ گہری مسرت لیکر آتا ہے۔ اور میں اپنی اس مسرت میں آپ کو اپنے ساتھ شریک کرنا چاہتا ہوں میں نے امتحانات کی ان کاپیوں سے چند اقتباسات کرے تھے یہی اقتباسات پیش کر رہا ہوں

مزاح اور طنز کے عناصر تو جیسے ہمارے رسالوں سے ختم ہوتے جارہے ہیں ——— "پطرس" تو اقوام متحدہ کے ہوگئے۔ کنہیا لال کپور شرارتی زیادہ ہوگئے اور طنز نگار کم، فرحت اللہ بیگ نہ جانے کتنے دن ہوئے اللہ کو پیارے ہوگئے ——— مجھ میں خود تو یہ صلاحیت نہیں کہ اس خلا کو پر کر سکوں لیکن ان اقتباسات میں آپ کے لئے مسکراہٹ بھی ہے، قہقہے بھی اور عبرت بھی۔ اور شاید اس طرح "شب" کے خاص نمبر کے مضامین میں تنوع پیدا ہو جائے ———

مجھے یاد ہے کہ تقسیم سے پہلے ساقی کے سالنامہ میں ڈاکٹر عندلیب شادانی نے بھی ہائی اسکول کے طلبا کے جوابات شائع کئے تھے .... جن کے بعض فقرے بہت دلچسپ تھے، جیسے "غزل وہ ہوتی ہے جسے عاشق معشوق گاتے ہیں" اور آج آپ ذرا کالج کے طلبا کی علمی تحقیق کا نمونہ دیکھئے

مرزا غالب کے متعلق تنقید کرتے ہوئے ایک صاحب علم فضل انکشاف کرتے ہیں :-

"آپ کا نام مرزا اسد اللہ خاں تھا اور شاعری میں ڈاکٹر اقبال تخلص فرماتے تھے۔ سنہ ۱۷۹۰ء میں پیدا ہوئے اور قیام پاکستان سے دو سال قبل انتقال کیا۔ قائد اعظم کے بہت دوست تھے شاہی مسجد میں دفن کئے گئے ——— اور ابتک وہیں دفن ہیں"۔ پطرس اپنی زبان کے جادو سے روزمرہ کے واقعات میں مزاحیہ روح پیدا کردیتے ہیں لیکن شاید "ابتک" کا یہ استعمال ان کے بھی بس کی بات نہ تھا۔

میر کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک صاحب ارشاد فرماتے ہیں :-

"۔ میر صاحب کے کلام میں بے حد درد و غم بھرا ہوا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے بڑے بھائی محمد حسین آزاد نے ان پر بڑے مظالم کئے تھے۔ آبحیات میں یہی لکھا ہوا ہے"

میر صاحب کے بارے میں ایک اور تنقید ملاحظہ ہو ———

یہ تنقید ایک ایسے طالب علم نے جو درسی کتابیں پڑھنے کی جگہ صرف "شاہراہ" اور "سویرا" پڑھتا رہتا ہے اور اردو کے ایک شاعر کا عزیز ہے جو مشہور زیادہ ہیں اور اچھے کم۔

"میر صاحب کی خارجی شاعری کے ہر موڑ میں داخلی جھلک موجود ہے۔ میر صاحب جس زمانے میں شاعری کرتے تھے اس وقت اودھ داخلی بحران آیا ہوا تھا اسی لئے نطشے نے کہا تھا کہ انتشار ہی سے ناچتا ہوا ستارہ جنم لیتا ہے"

اگر تنقید کا یہی انداز جاری رہا تو اس طالب علم کا کوئی تنقیدی مضمون آپ جلد ہی کسی ترقی پسند رسالہ میں پڑھیں گے آپ ممتاز حسین ڈاکٹر علیم، سردار جعفری اور احتشام کو الگ کر دیجئے تو دوسرے ترقی پسند نقاد بھی اسی طرح اصطلاحات کا استعمال کرتے ہیں۔

تنقید کے نمونے آپ دیکھ چکے، اب ذرا اشعار کی تشریح اور مطلب سنئے ——— میر انیس کا ایک مطلب لکھنے کے لئے دیا گیا تھا حضرت قاسم رجز پڑھتے ہوئے یزیدی فوج سے کہتے ہیں ؎

جان دو دل زہرہ کے عبث درپئے جاں ہو
کس سمت کو بہکے ہوئے پھرتے ہو کہاں ہو
افسوس کہ جو مصحف ناطق کی زباں ہو
سب پانی پئیں اور وہی تشنہ دہاں ہو
ہیں سینکڑوں تیغیں علم اک جان کی خاطر
دنیا میں یہی ہوتی ہے مہمان کی خاطر

کچھ طالب علموں نے پورے بند کا مطلب ایک ساتھ لکھا ہے لیکن زیادہ کاپیوں میں ان اشعار کا مطلب الگ الگ لکھا گیا تھا۔

ایک صاحب نے پہلے شعر کا مطلب یوں لکھا کہ ———

حضرت فاطمہ میدان جنگ میں تشریف لے آئیں اور حضرت حسین سے کہنے لگیں کہ یہاں تم لڑنے کیوں آئے ہو اور اپنی جان کے کیوں دشمن ہو رہے ہو حضرت امام حسین وہ آدمی تھے جو تین دن پیاسے رہ کر کربلا میں انتقال فرما گئے

آخری شعر کا مطلب لکھتے ہوئے ایک صاحب زادے نے یوں داستان سرائی کی۔

"شاعر اپنے معشوق صاحب کے یہاں گیا۔ معشوق اپنی پلکیں اٹھا کر شاعر کی طرف دیکھنے لگا۔ پلکیں تلوار کی طرح ہوتی ہیں اور اسی لئے شاعر نے معشوق سے کہا کہ اے عورت تو اپنی پلکیں نیچی کر لے کیا دنیا میں مہمان کی یوں ہی خاطر ہوتی ہے؟"

اب ذرا دوسرے شعر کا مطلب سنئے:۔

شاعر حافظ تھا اس نے روزہ رکھا ہوا تھا، وہ بے روزہ داروں کی "محفل" میں پھنس گیا۔ حافظ صاحب کے سامنے وہ سب لوگ لیمن، سوڈا، شربت اور پانی پینے لگے انہیں جو سلام ہوا اور انھوں نے یہ شعر کہا ؎

افسوس کہ جو مصحف ناطق کی زباں ہو
سب پانی پئیں اور وہی تشنہ دہاں ہو

مومن کا یہ شعر بھی مطلب لکھنے کے لئے دیا گیا تھا ؎

ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہونگے
نیم بسمل کئی ہونگے، کئی بے جاں ہونگے

ایک طالب علم نے ممتحن کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا ———

"جناب ممتحن صاحب آپ اگر اس شعر کی سچائی دیکھنا چاہتے ہو تو کسی شام کلفٹن یا الفنسٹن اسٹریٹ تشریف لے جائیے۔ جہاں لڑکیوں کی نگاہوں کے ساتھ ہزاروں دل تڑپ جاتے ہیں اور بقول شاعر ؎

اس دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے کوئی ادھر گرا کوئی ادھر گرا

مجھے یہ مطلب کافی پسند آیا، یہاں مسخرے پن، مزاح نہیں، کی ایک دانستہ کوشش نظر آتی ہے، ویسے ممکن ہے حسن ظن ہو۔

"شبخون" کی لفظی تشریح کرتے ہوئے ایک طالب علم نے لکھا ——— "شبخون وہ گھوڑا تھا جس پر سوار ہو کر حضرت امام حسین کربلا تشریف لے گئے تھے۔

ان چند اقتباسات سے آپ کو ہمارے طالب علموں کی نئی پود کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ پاکستان کے پایہ تخت میں کالجوں کی کچھ عجیب حالت ہے۔ طالب علم دفتروں میں کام کرتے ہیں۔ ہر مہینے اپنی فیس خود آکر نہیں دیتے بلکہ کسی کے ذریعہ بھیج دیتے ہیں۔ کالج کے آخر میں رول نمبر لے لیتے ہیں اور امتحان میں بیٹھ جاتے ہیں ——— کالج کی حاضری دیدیتے ہیں، یہ کالج کہاں تجارت کے اڈے اور دکانیں اور پاکستان کے ادبی، تمدنی اور ثقافتی مستقبل کے متعلق کچھ سوچتے ہوئے بھی مجھے کچھ وحشت ہوتی ہے۔

(لیشکر پہ شرب)

حامی کرنالی

اور پتلون جیت گئی

اسے خدا نے عزت بھی دی، دولت بھی اور شہرت بھی۔ اس
احسان یہ کیا تھا کہ ادب کی نعمت سے بھی نوازا تھا۔ وہ ماں باپ کی
آنکھوں کا نور اور کلیجے کی ٹھنڈک تھا۔ ماں باپ اسکے نازک احساسات
کی قدر کرتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ہمارا ہونہار بیٹا اپنی مرضی سے
شادی کرے۔ انھوں نے شریف کو اپنی رفیقۂ حیات کے انتخاب کی اجازت
دے دی تھی خود وہ بھی اسلام اور احکام خداوندی کا پابند ہونے کے باوجود
اس قدر روشن خیال ضرور تھا کہ اپنی جنسی زندگی کے بارے میں مکھی پر مکھی مارنے
کا ہرگز قائل نہ تھا۔ وہ ہرگز اپنے کسی عزیز کو اپنا یہ حق نہیں دے
سکتا تھا کہ وہ اندھے کی لاٹھی بنے۔ اور آخر کار اسے کنوئیں میں دھکیل دیا
جائے۔ اسکے ذہن میں اپنے فطری مذہب کا مقدس اور روشن پہلو تھا
وہ خانقاہیت اور "دقیانوسیت" کو اسلام نہیں سمجھتا تھا۔ اور نہ ہی وہ اس
معاملے میں انتہا پسند واقع ہوا تھا۔ کہ ہوا کی لہر اور سیلاب کے بہاؤ میں بہتا
چلا جائے۔ وہ اعتدال پسندی کا دوسرا نام اسلام سمجھتا تھا۔ اور اسے
یقین تھا کہ اسلام اسے خاص حدود اور خاص آداب کا پابند کر کے بیوی کے
انتخاب کی آزادی بخشتا ہے۔

شریف خیالات کے اعتبار سے ادبی۔ غیر سیاسی اور ایک
صاف مذہبی شخص تھا۔ اس کا ادب معیاری تھا۔ ملک کے رسائل و اخبار
اسکے رشحات قلم سے مستفید ہوتے تھے۔ اسکی اصلاحی تعمیری شاعری میں
انفرادیت تھی۔ اور وہ ادبی دنیا کا ایک محبوب شاعر تھا۔

عہد حاضر کی سیاست سے وہ الگ تھلگ رہتا تھا۔ وہ اس
غلاظت سے اپنے دامن کو بچا کر رکھنے میں عافیت خیال کرتا تھا۔ وہ سچ بھی
یہ سمجھتا تھا کہ موجودہ دور کی سیاست دین سے جدا ہو کر "چنگیزی"
بن گئی ہے۔ بے دینی۔ خود غرضی اور فریب کے

مذہب سے اسے اتنا تعلق بہرحال تھا کہ وہ اسلامی معاشرت
اور تہذیب کا دلدادہ تھا۔ خدا اور رسول کے احکام کو فلاح دینوی اور
نجات اخروی کا موجب سمجھتا تھا۔ اسلام کے سادہ اصولوں نے جس
پاک اور بے داغ معاشرت کو ترتیب دیا ہے اسے قبول کر کے اور جس
ماحول کی تخلیق کی ہے اس میں رہ ..... کر مطمئن تھا۔ تہذیب حاضر نے
انسان کی روح اور جسم، ظاہر اور باطن، دل اور دماغ میں جو تغیرات
برپا کئے ہیں شریف ان سے کنارہ کش تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اپنی تہذیب
بہرحال غیر ملکی معاشرت سے عمدہ اور بہت عمدہ ہے اور پھر
اس میں جو خیر و برکت ہے وہ اس میں کہاں۔

اسے ایک روز ایک خط موصول ہوا۔ کسی نجمہ نامی لڑکی نے
لکھا تھا "آپ کی وہ غزل جو رگ دنشتر کے عنوان سے ہمایوں میں
شامل ہوئی ہے، کتنی عمدہ ہے۔ مبارک باد قبول کیجئے۔ آپ کی۔
خیر اندیش نجمہ"

اور نجمہ کے بعد سیالکوٹ کا لفظ تحریر تھا۔ دو سطریں شریف
کے لیئے کوئی اہمیت نہ رکھتی تھیں۔ وہ شہرت کے اس مقام پر
تھا جہاں اس قسم کی تعریفیں ایک "تکلف" اور "رسم" سے زیادہ حیثیت
نہیں رکھتیں۔ اخلاقی طور پر اس نے یہ ضرور محسوس کیا کہ شکر گذاری کے خیال
سے ایک خط اس لڑکی کو لکھ دے لیکن خط میں پتہ مذکور نہ تھا۔ ہفتہ بھر
کے بعد یہ بات شریف کے ذہن میں بھی نہ رہی۔ لیکن ایک دن پھر ایک خط ملا
اگر آپ نے "شہید ملت" کی وفات سے متاثر ہو کر کوئی نظم کہی ہو تو براہ
مہربانی مجھے ارسال کر دیجئے۔ اب کی بار "نجمہ" کے بعد "ہاشمی منزل .....
سیالکوٹ" کے الفاظ درج تھے۔ شریف نے چند اشعار کہہ رکھے تھے۔ ایک
نقل ان اشعار کی نجمہ کے نام ارسال کر دی اور یہ بھی لکھ دیا کہ آپ نے
پہلے خط میں جو مبارکباد مجھے دی گئی تھی۔ اس پر میں آپ کا شکر گذار ہوں

یہ سب آپ کا خلوص ہے کہ مجھے اس قابل سمجھا۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔

اس خط کا جواب جلدی آگیا۔ اس دفعہ پورا ایک صفحہ بھرا ہوا تھا۔ کچھ نظم کی تعریف بھی کچھ خط کا جواب الجواب۔ آخر میں لکھا تھا کہ مسز شریف کو میرا سلام پہنچا دیں۔

شریف اس خط کا جواب نہ دیتا۔ لیکن آخری فقرے نے اسے جواب لکھنے کیلئے مجبور کر دیا۔ شریف کے پاس "مسز شریف" تھی کہاں جو اسے سلام پہنچاتا۔ نجمہ کو اسکی غلط فہمی پر متوجہ کرنے کے خیال سے اس نے ایک خط پھر اسے لکھ دیا۔

یہ خط و کتابت شریف کی ایک روز مرہ کی مصروفیت تھی گویا یہ اسکی زندگی کا جزو ہے۔ ممکن ہے پہلے پہل وہ خط لکھنے میں دلچسپی لیتا ہو لیکن اب تو یہ ایک دستور بن چکا تھا۔ ایک عادت، ایک روز کا کام جو عادتاً نبھانا پڑتا ہے۔ نجمہ کے خطوط کا جواب بھی وہ اسی انداز میں لکھتا تھا۔ ابھی نجمہ کے خط کا کوئی حرف اسکے خیالات کے ساکن سمندر میں کوئی لہر پیدا نہیں کر سکا تھا۔ وہ صرف یہ سمجھتا کہ یہ ایک عقیدت مند لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ اسکے عقیدتمندوں کی فہرست میں ایک فرد کا اضافہ ہو گیا۔ اور بس۔ البتہ مسز شریف کو جس کا ابھی کوئی وجود نہ تھا سلام پہنچانے کا جو لطیفہ نجمہ کی طرف سے غیر ارادی ہو گیا تھا اس سے شریف کو ایک لمحہ کے لیئے خیال گذرا کہ ممکن ہے نجمہ کے یہ الفاظ کسی وقت وہ کنکریاں بن جائیں جنہیں وہ سمندر میں پھینک کر اسکی سطح کو متلاطم کر دے۔ یہ خیال بھی شریف کے ذہن میں صرف اتنی دیر کے لیئے ٹھہرا جتنی دیر کے لیئے ایک بلبلا سطح آب پر ابھرتا ہے اور پھر جلدی ہی ایک ہوا کا کوئی تیز جھونکا اسے مٹا دیتا ہے۔

یہ سلسلہ بڑھتا گیا۔ ایک بار ایک افسانہ "نئی کروٹ" کے عنوان سے اسکے پاس اصلاح کیلئے آیا۔ ایک بار ایک مضمون بعنوان "منزل تجھے بلا رہی ہے" اور ایک دفعہ ایک نظم جس میں ایک ٹوٹے ہوئے تارے کو پیغام تابندگی دیا گیا تھا۔ شریف نے ان سب کی اصلاح کی۔ وہ نجمہ کے ادب اور شاعری میں بلندی اور روانی پاتا تھا۔ اسے اصلاح دیتے وقت یہ محسوس ہوا جیسے اسکی اپنی زندگی نئی کروٹ لینا چاہتی ہے جیسے وہ ایک راہی ہے۔ منزل اسے اپنی طرف بلا رہی ہے اور جیسے وہ ایک ٹوٹا ہوا ستارہ ہے۔ نجمہ نے زندگی کا نور عطا کر کے کائنات کے افق پر تابندہ کرنے والی ہے۔

اب بیگانگی اور تکلف کے وہ پردے حائل نہیں رہے تھے... جو ابتدا میں ہو سکتے ہیں۔ خط و کتابت نے کچھ بے تکلفی اور قرابت ذہنی کی فضا پیدا کر دی تھی۔ ایک خط میں نجمہ نے استفسار کیا کہ آخر ایک ایسے باکمال ادیب اور شاعر کا گھر "مسز شریف" کے وجود سے ابتک کیوں خالی ہے۔ اس نے جواباً لکھ دیا۔ کہ ابھی تک میں اپنی مرضی اور مزاج کے تقاضوں کے مطابق کسی شریک حیات کا انتخاب نہیں کر سکا ہوں۔ اس کا جواب وہ پی سی گئی۔ گول مول انداز میں صرف یہ لکھا کہ آپ کی اس جستجو میں میری دعائیں آپ کے شامل حال ہیں۔

ایک دن شریف "نجمہ" کے دلچسپ موضوع پر کچھ دیر واقعات کا جائزہ لیتا رہا۔ آخر اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ والدین سے یہ صورت حال بیان کر دی جائے تاکہ وہ نجمہ کے گھر والوں سے نامہ و پیام شروع کر سکیں۔ شریف کے والد صاحب نے نجمہ کے والد صاحب سے سلسلہ شروع کر دیا اور بہت جلد انھیں لکھ دیا کہ میری خواہش ہے عزیز شریف کو آپکی فرزندی میں دیدیں۔ ادھر سے جواب آیا کہ ہم خوش نصیب ہوں گے اگر ایسا ہونہار اور باکمال لڑکا ہمیں مل جائے۔ لیکن نجمہ کچھ آزاد خیال اور نئے زمانے کی لڑکی ہے ہم نے اسے چھیڑا تھا وہ کہتی ہے کہ میں شروع میں ان امیدوار صاحب سے چند ضروری باتوں پر تبادلہ خیالات کرنا چاہتی ہوں اگر شریف صاحب زحمت فرمائیں اور تشریف لائیں تو باعث مسرت ہوگا۔

ان فقروں کا مطلب سوچ کر شریف کے گھر والوں نے اسے وہاں بھیجنے پر اظہار رضامندی کیا۔ اور ایک دن روانگی کا مقرر ہو گیا۔ وہ دن بھی آگیا اور شریف سیالکوٹ کی طرف عازم ہوا اسکے ذہن میں خیالات کا تیز رفتار سلسلہ اس طرح قائم تھا جس طرح ریل کے ڈبے اسکے دماغ کی سطح پر تصورات کی ایک آہنی پٹڑی بچھی ہوئی تھی جس پر سے اسکی جنسی زندگی کی ریل گذر رہی تھی۔ [illegible] کے بنگلے میں نجمہ کا ایک خیالی پیکر تراش رہا تھا [illegible] نظم "پھول" کی طرح لطیف نازک اور خوبصورت تھا۔ وہ اسکی آزاد خیالی کے متعلق سوچ رہا تھا کہ اس کا رخ کس طرف ہے اس منزل کی طرف جو سفر انسانیت کا مقصود

ہے یا اس کی بکھری ہوئی گذرگاہوں کی طرف جس کی کوئی منزل نہیں۔ اسکے ذہن میں یہ سوال تھا کہ جو آسمان کے مسکراتے ہوئے ستاروں کی طرح بلند ہے یا شہاب ثاقب کے بکھرتے ہوئے شراروں کی طرح پست وہ کائنات کی فضاؤں میں رقص کرتا ہوا نور ہے یا زندگی کی خلاؤں میں بھٹکتا ہوا اندھیرا۔

جب وہ خیالات کے طویل خواب سے چونکا تو وہ ہاشمی منزل کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ اور پروفیسر ہاشمی بڑی گرمجوشی کے ساتھ اس سے مصافحہ فرما رہے تھے۔ تم ایک تعمیری شاعر ہو۔ تمہارے دل میں ملت کا درد ہے۔ تمہارے نغموں میں قوم کی دھمک ہے تمہارے سینے میں وطن کی آرزو دل بن کر دھڑکتی ہے۔ پاکستان کو تم جیسے نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ شریف تم ایک شاعر اور ادیب ہی نہیں ایک انسان ہو انسان۔ میری بچی یقیناً تم سے ملاقات کرکے خوش ہوگی۔ وہ تمہیں اپنے سے... مصروف گفتگو پا کر خود کو خوش نصیب محسوس کریگی میری بی۔ اے پاس بچی اپنے معزز مہمان کا پرتپاک خیر مقدم کریگی۔

شریف نے پروفیسر صاحب کے ساتھ کھانا کھایا پھر سفر کی تکان کو دور کرنے کیلئے سو گیا۔ جب وہ بیدار ہوا تو شام کے تین بج چکے تھے۔ اس نے ہاتھ منہ دھویا۔ نیا لباس پہنا۔ سیاہ اچکن اور سفید شلوار اسکے بدن پر کھلتی تھی۔ اور پھر قراقلی ٹوپی نے اسکے مردانہ حسن کو بڑھا دیا تھا۔ شریف ویسے ہی ایک خوبصورت نوجوان تھا اس لباس نے اسے اور بھی "فتنہ گر" بنا دیا تھا اور پھر نجمہ سے ملاقات کی مسرت آمیز آمد نے اسکے سرخ و سپید رخساروں میں رنگینی پیدا کر دی تھی۔

ادھر سے تشریف لائیے۔ ایک ملازم نے کہا۔ وہ سامنے کمرے میں صاحبزادی صاحبہ آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ وہ دھڑکتے دل اور پرشوق نگاہوں کے ساتھ ادھر چلا۔ دروازے کا کواڑ کھلا تھا اس نے اندر قدم رکھا۔ نجمہ ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اسکے سامنے ابراہیم جلیس کی ایک کتاب کھلی ہوئی تھی۔ جلد کے ایک کونے سے کتاب کا نام "جیل کی راتیں" دکھائی دے رہا تھا۔

اس نے سلام کیا اور سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ آپ "جیل کی راتیں" پڑھ رہی ہیں؟ میں نے مسکراتے ہوئے سوال کیا

"جی ہاں! ہماری زندگی کو اس عنوان سے بڑی مناسبت ہے" نجمہ نے کہا۔

شریف نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔ محترمہ یہ جواب آج سے چھ سال پہلے موزوں تھا۔ اب تو ہماری زندگی نئی کروٹ لے چکی ہے۔

نجمہ لاجواب سی ہو گئی۔ اس نے کتاب بند کر دی اور بات کا موضوع بدل دیا۔

"میں آپ کی شاعری سے متاثر ہوں۔ آپ واقعی قوم کی سچی خدمت کر رہے ہیں"

"آپ کا شکریہ! مجھے اس خدمت پر کوئی فخر نہیں۔ میں اسے اپنا فرض سمجھتا ہوں"

شریف نے شکریہ کا لفظ کہتے ہوئے ایک سرسری نظر سے نجمہ کو دیکھا۔ پندرہ سولہ سال کی لڑکی۔ چہرہ مہرہ متناسب دلآویز جسم نازک اور ریشمی۔ زلف کی ایک لٹ کشادہ پیشانی پر لام نستعلیق بنا رہی تھی۔ لباس انگریزی وضع قطع میں ڈھلا ہوا۔ غازہ بہار عارض اور سرخی یاقوت لب!

"میں شادی کے مسئلے پر آپ سے تبادلۂ خیالات کرنا چاہتا ہوں" شریف نے کہا "آپ جانتی ہیں ہمارے والدین نے اسی مقصد کیلئے اس ملاقات کا موقعہ فراہم کیا ہے"

"آپ اس لباس کو بہت پسند کرتے ہیں؟" نجمہ نے ناگہانی سوال اس سے کیا۔

"جی ہاں! مجھے یہ لباس بہت مرغوب ہے۔ یہ ہم مشرقی لباس ہے۔ خوبصورت لباس!"

"میں نہیں سمجھی اس میں خوبصورتی کیا ہے؟ اچکن گھٹنوں تک لٹکی ہوئی۔ شلوار کا جھول کا جھول لپٹا ہوا۔ ٹوپی کنپٹی تک آئی ہوئی یہ لباس بالکل معمولی معلوم ہوتا ہے"

"محترمہ! معمولی تو نہیں۔ اس اچکن کا کپڑا میں نے چار روپے گز لیا تھا۔ یہ شلوار میں ہزار کے لٹھے کی ہے۔ اور یہ قراقلی ٹوپی پچاس روپے کو خریدی ہے"

باقی صفحہ ۹۳ پر

نعیم صدیقی

ایک سوال، چار جواب!

تاریخ نے پوچھا اے لوگو! یہ دنیا کس کی دنیا ہے؟
شاہی نے کہا ——— یہ میری ہے

اور دنیا نے یہ مان لیا
پھر تخت بچھے، ایوان سجے، گھڑیال بجے، دربار لگے
تلوار چلی اور خون بہے، انسان لڑے انسان مرے
دنیا نے بالآخر شاہی کو
پہچان لیا، پہچان لیا
تاریخ نے پوچھا پھر، لوگو! یہ دنیا کس کی دنیا ہے؟
دولت نے کہا ——— یہ میری ہے
اور دنیا نے یہ مان لیا
پھر بنک کھلے، بازار سجے، بازار سجے، بیوپار بڑھے
انسان لٹے، انسان بکے، آرام اڑے، سب چیخ اٹھے
دنیا نے بالآخر دولت کو
پہچان لیا، پہچانا!

شاہی نے پوچھا پھر، لوگو! یہ دنیا کس کی دنیا ہے؟
محنت نے کہا ———— یہ میری ہے

اور دنیا نے یہ مان لیا
پھر روح دبی، پھر پیٹ بڑھے، افکار سڑے، کردار گرے
ایمان لٹے، اخلاق جلے، انسان نرے حیوان بنے
دنیا نے بالآخر محنت کو

پہچان لیا پہچان لیا
تاریخ نے پوچھا پھر، لوگو! یہ دنیا کس کی دنیا ہے
مومن نے کہا ———— اللہ کی ہے

اور دنیا نے یہ مان لیا
ب نظر کی صبح ہوئی، اک نور کی لے سی پھوٹ بہی
ایک خودی کی آنکھ کھلی، فطرت کی صدا پھر گونج اٹھی
دنیا نے بالآخر آقا کو!
پہچان لیا پہچان لیا

(بشکریہ منتخب نظمیں)

سیدہ بانو •

انشاء اللہ

روشنی نے بیزاری سے ٹخنوں پہ لپٹے ہوئے جوتے کے تسمے کھولے اور اپنے ننگے پیر فرش پر رکھ دیئے۔ فرش کی اینٹوں کی ٹھنڈک سے اسکے تلوؤں کی جلن آہستہ آہستہ کم ہونے لگی۔ ابھی ابھی وہ ایک شادی کی محفل سے آئی تھی۔ اس چلچلاتی دھوپ میں دن کے پورے ایک بجے کوئی چھ فرلانگ کا راستہ اس نے پیدل طے کیا تھا۔ کولتار کی تپتی ہوئی سڑک پر اس کے پیر جھلس کر رہ گئے تھے۔

یہ گرمیوں کی دوپہر جب چیل بھی انڈا چھوڑ دیتی ہے شادی کی محفلوں اور ہنگاموں کے لیئے بھی کتنا ناموزوں وقت ہے۔ غالباً لوگوں کے ذہن سے موزوں اور غیر موزوں کا سوال ہی نکل چکا ہے۔ روشنی نے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس منگا کر پیا۔ اور بچا ہوا پانی اپنے پیروں پہ انڈیل دیا جو پیروں سے پھسل کر زمین پر بہہ گیا۔ اس نے گیلی جگہ پیر ٹکا دیئے اور اسی طرح پلنگ پر لیٹ گئی۔ آج اسے اپنے کمرے کا ٹھنڈا اندھیرا اور پنکھے کی ہلکی ہلکی ہوا بہترین نعمتیں معلوم ہو رہی تھیں۔ اسے اتنی سستی محسوس ہو رہی تھی کہ اپنی قیمتی ریشمی ساری تبدیل کرنے کو بھی جی نہ چاہا۔ ہوا بار بار ساری کے دامن میں بھر جاتی اور اسے غبارے کی طرح پھلا دیتی۔ پھر وہ ریشم خالی ہو کر اس کی پنڈلیوں سے لپٹ جاتا۔ روشنی کو اس کھیل میں وہی لطف آنے لگا جو بچوں کو غبارے میں ہوا بھرنے اور نکالنے میں آیا کرتا ہے۔

جب تھکاوٹ ذرا کم ہوئی تو اس نے اٹھ کر ٹھنڈے پانی سے غسل کیا اور ہلکے پھلکے کپڑے پہن کر اسی اندھیرے کمرے میں آ کر پنکھے کے نیچے لیٹ گئی۔ آہستہ آہستہ شادی کے گھر کا نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا اور وہ اطمینان سے ایک ایک منظر دیکھنے لگی۔ سب سے پہلے تو اسے دلہن کی سج دھج اور انداز انجانے سے معلوم ہوئے اپنے زمانے کی دلہنیں۔ شرمائی، لجائی، سمٹی گھٹنوں میں سر جھکائے بیٹھی ہوتی تھیں اور چہرے پر شرم و حیا کا وہ روپ ہوتا تھا جو آجکل کے غازے اور سرخیوں کی تہیں [illegible]

بھی نہیں دے سکتیں۔ لیکن یہ دلہن تو ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے سسرال والوں سے برسوں کی راہ و رسم ہو۔ گھونگھٹ اٹھا۔ نگاہوں کا جھکاؤ اٹھا چکے سے حیا بھی کھسک گئی۔ اور یہ تو تعلیم، روشن خیالی اور ترقی کی دلیل ہے۔

اس خیال کے آتے ہی روشن آرا نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ وہ بھی تو تعلیم یافتہ روشن خیال ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ ترقی حاصل کرنا چاہتی ہے اگر انجمن تھوڑا سا اور اس کا ہم خیال ہوتا تو وہ کب کی برقعہ پوشی کی لعنت سے نجات حاصل کر لیتی۔ آج کل برقعہ پوشی پردہ داری کی دلیل نہیں رہی برقعہ تو صرف رسماً اوڑھا جاتا ہے۔ باپ بھائیوں کے لحاظ سے یا کینہ پروری کی انگشت نمائی کے خوف سے۔ وہ [illegible] کے ماں باپ کیسے بزرگ صورت انسان ہیں جن کے چہروں سے نیکی کا نور برستا دکھائی دیتا ہے۔ گھر سے برقعہ پہن کر نکلتی ہے اور مینا بازار میں پہنچ کر آئے ہوئے اعلیٰ افسروں کو اپنے ہاتھ سے چائے کی پیالی پیش کرتی۔ ان کی خاطر تواضع کرتے ہوئے اسے ذرا جھجک اور تامل نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ اپنی لطیفوں اور مسکراہٹوں کی دلفریبی بھی چائے کی پیالی میں گھول دیتی ہے اور میں دور کھڑی اس کی کرسی پر پڑے برقعہ کو حسرت سے تکتے رہ گئی تھی اگر میں مجبوراً برقعہ پہنتی ہوں تو مجبوراً اس کا احترام بھی کرتی ہوں چاہے محض انجمن کو خوش کرنے کیلئے ہی سہی۔

اور وہ جو اس روز یوم صحت منایا گیا تھا۔ خاصی تعداد میں عورتیں شریک ہوئی تھیں اور اچانک اسٹیج پر ڈاکٹر صاحب نے قبضہ کر لیا۔ لڑکیاں کھسر پھسر کرنے لگیں کہ یہ کیوں آیا ہے چند عورتیں بڑبڑائیں بھی کہ عورتوں کے جلسے میں مرد کا کیا کام۔ مگر وہاں سے ہٹ جانے کی ایک کو بھی توفیق نہیں ہوئی۔

میں نے ذکیہ سے پوچھا کہ "تم ہمیشہ اسلامی تہذیب کے متعلق اچھے خیالات کا اظہار کیا کرتی ہو، پھر وہ پسند کرتی ہو برقعہ پہنتی ہو،

"ایک غیر مرد کو کیسے گوارا کر لیا؟"

میرے اس براہ راست سوال سے وہ ایکدم گھبرا گئی۔ اسکی آنکھوں کی عجیب کیفیت ہو گئی جیسے دو بطخیں تالاب میں تیرتی پر پھڑپھڑا کر منڈلا رہی ہوں۔ مجھے پر لطف آیا: "میری نیک اور معصوم ذکیہ تم کیوں گھبرائیں پہ ڈالوا کی منت کی بے ضرر سی پیروی بھی آخر دور حاضر کی عورتیں اس... سلطنت کی پیروی سے کیوں محروم رہیں۔"

اب روشنی کو دھان پان کامنی سی نوری یاد آئی جو گریجویٹ تھی۔ اور قومی خدمت اور پیٹ بھرنے کے شوق میں ملازمت کر بیٹھی تھی جہاں نظر کرم کی امیدیں کلرک ہر وقت خوشامدیں کرتے تھے۔ جہاں اس افسر کے بیٹے اپسلے کا پہلا عشق تھا جس نے اس کی زندگی تلخ کر دی تھی جب وہ کسی مرغے کی طرح سرخ ٹائی لگائے پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس کے گرد گھومتا تھا اور چپکے سے اس کے کان میں کہتا تھا کہ "آہ نوری تم میرے خوابوں کی تعبیر ہو" جیسے اس کھونٹ نے آج سے پہلے کبھی خواب ہی نہ دیکھا ہو جس کی تعبیر نکالنی سی ہوتی۔ نوری گھٹتی تھی مگر منہ سے ان نہ کہہ سکتی تھی کہ کہیں صاحب ناراض ہو جائیں گی۔ ملازمت میں گڑبڑ ہو جائے گی۔ اپنے ڈر سے ماں باپ کو آگاہ نہ کرتی تھی کہ ان کی برسوں کی ملی ہوئی شرافت کو ٹھیس لگے گی۔ اور میرے سامنے اسکی آنکھیں ساون بھادوں کی جھڑیاں لگا دیتی تھیں کہ وہ کہاں جائے کیا کرے، وہ کہتی کہ مر ہی جاؤں تو اچھا ہے کہ اس عذاب سے چھوٹوں۔ وہ پاگل الھڑ لڑکی یہ نہیں سمجھتی کہ مر کر وہ اس عذاب سے تنہا نجات پا لے گی مگر وہ ہزاروں قمریاں جو اس کی طرح ان دلدلوں میں پھنسی ہوئی ہیں ان کی نجات کیا.. صورت ہے کیا وہ سب مر جائیں۔ یا اسی دلدل کی کیچڑ کو اپنے چہرے کا غازہ سمجھ کر سرخرو بن جائیں۔

اُف خدایا یہ گرمی۔ کہیں ٹھنڈک نہیں۔ یہ الجھے ہوئے گرم گرم خیالات مجھے تو ابھی پاگل بنائے دے رہے ہیں۔ میری عزیز روشنی تم کب سے فلسفی ہو گئی ہو، یہ دنیا ہے معلوم نہیں یہاں رات دن کیا کیا ہوتا رہتا ہے تمہیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ تم دوسروں کے غم اور دکھ کہاں تک سمیٹو گی۔ تم تو ابھی شادی کی خوشی کی محفل سے آئی ہو اس لیے تمہیں بھی خوش ہونا چاہیے۔ لیکن خوشی کسے کہتے ہیں۔ کوئی کیسے خوش ہو سکتا ہے اور رہ سکتا ہے۔ یا تو وہ بالکل اور نا واقف ہو یا خود غرض ہو اپنے آپ میں مگن۔ ورنہ یہ غم اور دکھ جو لوگوں کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ دیکھنے والے کے کلیجہ کو برما ہی دیتے ہیں۔ پھر خدا کی ٹیسیں اور لہریں اٹھتی ہی رہتی ہیں اور اس کی صبح و شام کو غمگین بنا دیتی ہیں۔

روشنی فلسفی نہ سہی انسان تو ہے۔ وہ نہ جانور ہے نہ خود غرض۔ آج یہ کسک سکینہ کی باتوں نے کچھ شدید کر دی۔ وہ کسی اور سے باتیں کر رہی تھی اور روشنی سن رہی تھی۔ روشنی کی حساس طبیعت جانے کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ اسے اپنی جنس کی بے چارگی کا ہمیشہ سے اندازہ تھا۔ مگر وہ اس خیال سے خوش تھی کہ پاکستان قائم ہونے کے بعد عورت کی.. حالت بہت سدھر گئی ہے۔ وہ اب آزاد ہے۔ تعلیم، ملازمت، روشن خیالی اپنی پسند کی شادی۔ پردے سے نجات، یہ سب نعمتیں اسے حاصل ہونی شروع ہو گئی ہیں وہ اپنی مرضی سے جہاں چاہے جا سکتی ہے... ہر سیر و تفریح میں حصہ لے سکتی ہے۔ سینما، مینا بازار، ناچ رنگ، مشاعرے سب اس کے لیے بھی ہیں۔ وہ بھی مشاعروں میں کلام سنا کر داد لے سکتی ہے پہلے ناچ دیکھ لینا بھی گناہ سے کم نہ تھا اب وہ خود ناچ کر سینکڑوں دلوں کی دھڑکنیں بن سکتی ہے۔ پردہ؟ غلامی کی یادگار تقریباً اٹھ چکا ہے ورنہ اس کی وقعت اٹھ جانے میں تو بالکل کلام نہیں کیا۔ یہ سب ترقی کی طرف قدم ہیں۔ یہ تذکرے آتے ہی اس کی گردن فخر و غرور سے تن جایا کرتی تھی۔

پہلے وہ ایک بھولی بھالی لڑکی تھی۔ اس کے والدین ایک.. بہترین ادیب اور شاعر تھے۔ وہ ابھی دھن میں اقبال کے لگائے ہوئے درخت کو سینچ رہے تھے، وہ ہمیشہ شاعر کی زبان میں اسلام کا پیغام قوم کو پہنچاتے رہتے تھے، مگر انہوں نے کبھی اپنی بیاض سے اوپر نظر اٹھا کر نہ دیکھا اپنی لڑکیوں کو کسی خاص پیغام کی تربیت نہ دی۔ حالانکہ وہ بھی اللہ کا ایک پیغام بن سکتی تھیں۔ ان کے ذریعہ قوم کو بہت کچھ مل سکتا تھا ان کا چشمہ بیاض کی تحریروں پر جھکا رہتا تھا۔ کلام کی باریکیاں پرکھتا تھا مگر اس نے لڑکیوں کی طبیعت اور فطرت کو نہیں جانچا کہ ان کے ذہنوں میں کون سے نظریئے پرورش پا رہے

وہ کہاں تک اسلام کے مطابق ہیں۔ وہ کس قدر اقبال کی باتوں کی پیروی کی ہمت رکھتی ہیں —— وہ اسی طرح چلتی بڑھتی سیانی ہوگئی۔ اور ایک [illegible] دن ایسا آیا کہ اجمل بیاہ کر اسے گھر لے گیا۔ شادی سے اس میں حقیقت پسندی آگئی۔ اگر کوئی مسئلہ کھل کر اس کے سامنے آجاتا تو وہ اس کی حقیقت پالیتی تھی۔

سکینہ کہہ رہی تھی "ان پانچ سالوں میں عورتوں کے حالات پہلے سے بہت بگڑ گئے ہیں۔ اس ترقی، روشن خیالی اور بے پردگی نے ان کو کچھ بھی سکھ اور سکون نہیں بخشا۔ اب نئے نئے روگ لگ گئے ہیں اس نئے چلن نے ان کی زندگی کو زیادہ تلخ اور زہریلا بنادیا ہے۔ کم از کم پہلے دلوں میں ان کے لئے عزت ہوتی تھی۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ.. پرائی عورتوں کا نام تو لے لے۔ بے پردگی نے ان کے نام کو عوامی ملکیت بنادیا ہے۔

" ابھی جب سے پاکستان بنا ہے اتنی بے حیائی پھیل گئی ہے کہ دیکھ دیکھ کر طبیعت حیران ہوتی ہے۔ ماں کا ادب نہیں رہا۔ خاوند کی شرم نہیں رہی۔ بچوں کی محبت نہیں رہی۔ بچوں کو کمرے میں بند کر کنڈی میں تالے ڈال سینما چل دیتی ہیں۔ پیچھے پیچھے رو رو کر ہلکان ہوں یا تڑپ تڑپ کر مر جائیں کچھ پرواہ نہیں۔

یہ سن کر میرے کان کھڑے ہوئے تھے۔ مجھے معصوم بچے بہت اچھے لگتے ہیں۔ میرا سب سے پسندیدہ منظر یہ ہے کہ ایک ننھا منا ماں کی گود میں ہو۔ بچوں کے ساتھ ماں کا یہ سلوک سن کر میرا جی لرزنے لگا۔ کیا یہ وہی تفریحی حق تھا جس کی طلبگار عورتیں تھیں جسے پاکر اب یہ کچھ ہونے لگا ہے۔ پہلے تو ایسی باتیں سننے میں نہ آیا کرتی تھیں۔ کیا یہ سچ ہے کہ ان پانچ سالوں میں عورتوں نے کھویا سب کچھ ہے اور پایا بہت کم ہے۔ کیا جہالت کے ساتھ محبت بھی دفن ہوگئی۔

باہر سڑک پر لو کے بگولے اٹھ رہے تھے۔ جن میں تنکے، پتے، خاک کے ذرے ناچ رہے تھے۔ کوئی تند جھونکا روشندان اور کھڑکیوں سے گزر کے روشی کے نازک جسم کو جھلستا ہوا نکل جاتا۔ اس کے حلق میں کانٹے تھے، ایک نہ بجھنے والی تشنگی تھی۔ اس کے دل میں ایک نہ دکھائی دینے والی انگیٹھی سی سلگ رہی تھی جس کے شعلوں نے اس کے تمام جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہیں سے اچانک گرج کی آواز سنے۔ بجلی چمکے۔ گھٹائیں گھر گھر آئیں رحمت اور نور کی ٹھنڈی پھواروں کی جھڑی لگ جائے۔ اس کے تن من کی جلن دھل جائے۔ تنکے، پتے، خاک کے ذرے سب بہہ جائیں۔

روشی بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہی۔ مگر انھیں بھول بھلیوں میں بھٹکتی رہی۔ انھیں تانوں بانوں میں الجھتی رہی۔ لے دے کے ایک آواز سنائی دی۔ جیسے چپکے چپکے کوئی سرگوشیاں کر رہا ہے... تمہاری زندگی کی پُرسکون جھیل میں یہ لہریں اٹھ رہی ہیں۔ یہ تلاطم یہ اضطراب کیسا! یہ جھیل تو وہ ہے جس کی سطح پر ہمیشہ کنول ہی کھلتے ہیں۔ وہ کنول کیا ہوئے؟ وہ میٹھی خوشبو والے نیلوفر کہاں چھپ گئے۔؟ آج اس... خاموش چپ چاپ جھیل کی تہوں سے یہ طوفان کیوں ابل رہا ہے؟ اور تم گھبرا رہی ہو میری عزیز روشن آرا! گھبراؤ نہیں، زندگی خواب نہیں —— پھولوں کی ڈالی نہیں، خوشیوں کا جھولا نہیں۔ مخمل کا فرش نہیں۔ ایک نہ ایک دن زندگی کے رخ سے نقاب الٹتا ہے۔ تم اس کے دکھ، درد، کانٹے زہر، تلخیاں، دلدلیں، کیچڑ، غار اور ڈرؤنے عفریت دیکھ کر آنکھیں بند کرنا چاہتی ہو۔ تم سمجھتی تھیں، یہاں پھول ہی پھول ہوتے ہیں! آنکھیں بند کرنے سے کام نہ چلے گا آنکھیں کھولو۔ تمہیں تو حقیقت پسندی کا دعویٰ ہے اب اس کا ثبوت دینا ہوگا۔ ہمت ہے تو کچھ کرو کانٹوں میں ہاتھ دو تلخیوں کو شہد بنادو۔ دلدلوں کو صاف کر دو۔ کیچڑ کی جگہ باغ لگادو۔ عفریتوں کو غاروں میں دھکیل کر منہ پر سلیں جمادو۔

اس نے اپنے ہاتھوں انگلیوں اور کلائیوں کو غور سے دیکھا اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ قریب ہی کپڑے میں لپٹی ہوئی برف پڑی تھی۔ اس نے برف کچل کر کٹوری میں بھر لی۔ اور ایک ایک ڈلی منہ میں ڈال کر چوستے چوستے بھیگے ہوئے کپڑے پر دونوں پیر جمادیئے۔ اس ٹھنڈک سے اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ گرمی کی یہ لمبی دوپہر کاٹے نہیں کٹتی آج نیند بھی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کا دماغ سوچتے سوچتے شل ہوگیا تھا۔ خیالات تھے کہ پھر اس کو گھیر لیتے تھے۔ پاکستانی عورت کا اصل رنگ روپ اس پر ظاہر ہو رہا تھا۔ کن راہوں پر اس نے ترقی کی ہے اور کن راہوں میں وہ بھٹکی ہے۔ زندگی کی حقیقتوں پر سے اٹھتا

پر مقاصد و پیر لبادے اتر رہے تھے۔ اس دلیل میں وزن باقی نہ رہا تھا کہ ایک جگہ خرابی کا مطلب یہ نہیں کہ سب جگہ خرابی موجود ہے۔ کہیں دکھوں ایک زبردست غلطی سرزد ہو چکی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جگہ جگہ خرابی پیدا ہو رہی ہے۔ اتنی تعلیم و ترقی اور روشن خیالی کے باوجود عورت دکھی ہے۔ اس کی زندگی میں اطمینان نہیں۔ نہ ماں باپ کے گھر رہتے ہوئے نہ شوہر کے گھر جا کر۔ اس پوچھو تو یہ بے حجابی بھی اسکے لیے سکھ کا پیغام نہ لائی۔ سدا بہار وادیاں پژمردہ ہو گئیں چمن اجڑ گیا۔

نور تم گریجویٹ ہو کر بھی روتی ہو تمہاری طرح اس بیٹے کا سہم کا بوس بن کر چھایا ہوا ہے۔ رفعت تم ملازمت میں ترقی پانے کے لیے افسروں کو ہنس ہنس کر چائے کی پیالیاں پیش کرتی ہو۔ تمہاری بہن نزہت نے کچھ اس قسم کے فائدے حاصل کرنے کے لئے اپنے جسم تک کو غلامی میں دیدیا ہے۔ شہناز نے اپنی سہیلی کے گھر رہنے کو اپنے شوہر کے گھر رہنے پر ترجیح دی اور خاوند کی محبت کو ٹھکرا دیا جس کے چرچے شہر کی گلی گلی پہنچ چکے ہیں۔ کتنی لڑکیاں سول میرج کے خواب دیکھ دیکھ کر زندگی شروع کرتی ہیں اور خاوند کو اپنے معیار کا نہ پا کر ان کے طلسم محل خاک کا ڈھیر بن جاتے ہیں۔ بچکے سے دو زندگیاں برباد ہو جاتی ہیں اور کراچی جہاں مخلوط تعلیم کا رواج ہے، وہاں میری آنکھوں کے سامنے پروفیسر قمر الزماں کی بہن جو چھٹی ساتویں میں پڑھتی تھی۔ دن دہاڑے کسی کے ساتھ چل دیتی ہے اور قمر الزماں کا چہرہ فق ہو جاتا ہے۔ وہ طرح طرح کی تاویلیں کرتی ہے اور باپ دل بہلاتا ہے۔ مگر اس خرابی پر اس کی اور اس کی کیا ہے کسی کی نظر نہیں جاتی۔

یہ ہے آزادی کی دوڑ کا وہ مقام جو پاکستانی عورت نے ابھی تک حاصل کیا ہے۔ وہ پاکستان جس کا نام لیتے ہی رحمتوں اور برکتوں کے خواب نظر آنے لگتے تھے۔ وہ پاکستان جو اسلام کے نام پر لیا گیا تھا۔ جہاں اسلامی تہذیب رائج کرنے کے ارادے تھے۔ جہاں اسلامی قوانین کی حکمرانی کا یقین تھا۔ جہاں قرارداد مقاصد پاس ہوئی جس میں ہر شہری کو اسلام کے مطابق زندگی گزارنے کی ضمانت تھی۔ اس مقدس سرزمین میں عورت کا یہ حشر ہے آج بھی اس کی آنکھ میں آنسو ہیں۔ آج بھی اس کی زندگی سے چین اور اطمینان مفقود ہے۔ اس کی عزت بڑی نہیں گھٹی ہے۔ وہ ترقی نہیں کر رہی اس کی راہ میں گڑھے کھودے جا رہے ہیں۔ اس کے خیالات روشن نہیں ہوئے وہ پہلے سے بھی زیادہ اندھیروں میں بھٹک رہی ہے۔ اقتصادی خود مختاری کے پردے میں غلامی کی زنجیروں میں اضافہ ہوا ہے اس نے مہذب ترقی یافتہ قوموں کی صف میں شامل ہونے کے لئے چند قدم ضرور بڑھائے ہیں۔ لیکن ان قدموں نے بڑھ کر اس کے اخلاق میں ایسا خلا پیدا کر دیا ہے جس کا پُر ہونا مشکل ہو گیا ہے۔

مجھے یاد ہے جب یہ بے حجابی کی تحریک چلی تھی تو کس طرح عورتوں نے اپنے آپ کو دھوکے اور تسلیاں دی تھیں کہ چہرہ کھولنا قرآن سے ثابت ہے۔ سادہ کپڑوں میں باہر جائیں گے زینت چھپا کر۔ آج ان کا قرآن کہاں ہے۔ چہرہ چھوڑ بازو اور سینہ بھی کھل گیا ہے۔ زینت کے وہ وہ مظاہرے ہوتے ہیں کہ نظریں پھسلتی ہیں۔ اخلاق لڑکھڑا جاتا ہے

روشی کی کنپٹی کی رگیں پھڑکنے لگیں اس نے دونوں ہتھیلیوں میں سر دبا لیا۔ اجمل میں تمہاری شکر گزار ہوں۔ اگر تم سہارا نہ دیتے تو میں بھی ترقی کا لیبل لگانے کی دھن میں جانے گراوٹ کے کسی گڑھے میں ہوتی شکر ہے یہ حدیں نے پار نہیں کی ورنہ قدم واپس لوٹنے مشکل ہوتے میرا بھی یہی خیال تھا کہ پاکستان کی سرزمین پر قدم دھرتے ہی ہم اسلام کے سایہ میں آ جائیں گے حقوق اور آزادیاں مل جائیں گی۔ عورتیں صدیوں سے پستی میں گری ہوئی ہیں وہ ابھریں گی۔ بگڑے حالات سدھر جائیں گے۔ مگر جانے کہاں گڑبڑ ہوئی۔ توازن بگڑ گیا حق اور آزادی کے مفہوم بدل گئے۔ برتن ماں کا کام کرنا ناحق ہو گیا بے راہ روی آزادی ٹھہری۔ سب سے بڑا کمال یہ مانا گیا کہ گھروں کو ترک کر دیا جائے۔ سمجھ میں یہی آتا ہے کہ سب سے زیادہ بس اس بے بے حجابی کی تحریک نے کھولا ہے جس نے عورت کو عورت نہیں رہنے دیا

مجھے یقین ہے جلدی یا بدیر سب چونکیں گی۔ میں خوش ہوں بہت خوش، میں ترقی کے اعلیٰ زینوں پر نہ چڑھ سکی۔ کیا ہوا۔ مانا کہ میں نے نرسنگ ٹریننگ حاصل نہیں کی۔ سلامیوں میں شامل نہیں ہو سکی۔ لیکن میری نسائیت تو گم نہ ہوئی۔ مخلوط تعلیم سے دامن تو بچ گیا۔ ملازمت کے بکھیڑوں میں پھنس کر غیروں کی غلامی سے تو بچ گئی۔ مخلوط سوسائٹی کے زہریلے پنجے تو مجھ تک نہیں پہنچ سکے۔ یہ صرف خدا کی مہربانی

(باقی صفحہ [illegible] پر دیکھئے)

اختر صہبائی

سُرودِ نو

بدلا ہے چمن، تو بھی نوا اپنی بدل دے
مستانِ مئے و نغمہ کو پیغامِ عمل دے

یہ تیری ہوس، دشمنِ دل، دشمنِ دیں ہے
یہ سانپ ہے، ممکن ہو تو سر اسکا کچل دے

سینچے گا نہ جبتک تُو اسے اپنے لہو سے
ممکن ہی نہیں نخلِ تمنّا ترا پھل دے

تقدیرِ الٰہی نہ ٹلی ہے، نہ ٹلے گی
رُخ اپنے ہی دریائے تمنّا کا بدل دے

حاصل ہو ترے دل کو جب آگاہیِ اسرار
جس راہ پہ دل ڈالے، اسی راہ پہ چل دے

بن مردِ عمل، پھر خدا مردِ عمل بن
پھر شوق سے ایک ایک کو تعلیمِ عمل دے

اے مردِ خدا! تیغِ خدا دستِ خدا بن
پھر لشکرِ ابلیس کو پیغامِ اجل دے

اے حامیٔ حق تیری حمایت پہ خدا ہے
باطل سے ہراساں نہ ہو باطل کو مسل دے

(ہمایوں)

ادیب واثقی

ریاستیں

سفید فام خداؤں کی کہنہ تخلیقات
ہوا و حرص کی یہ یادگار تصویریں
ملوکیت کے خزانوں کی مستقل میراث
نظامِ جبر کی بخشی ہوئی یہ جاگیریں
یہ اُونچے در و بام اور یہ محرابیں
یہ والیانِ ریاست کی عظمتوں کے نقیب
یہ چھوٹے چھوٹے وطن کی زمین کے ٹکڑے
حضور شاہ کی دیرینہ رفعتوں کے نقیب
لُٹی لُٹی سی سرائیں یہ سُونے سُونے دیار
یہ ایک طبقۂ مخصوص کا "مذاقِ سلیم"
یہ سامراج کی فیاضیوں کے نوحہ کناں
یہ جور و مہر و سخاوت کے حادثاتِ عظیم
یہ چھوٹے چھوٹے وطن کی زمین کے ٹکڑے
جہاں رواجِ کہن قہقہے لگاتے ہیں
متاعِ عظمتِ کردار کا تو رونا کیا
جہاں خدا کو بھی انسان پیچ کھاتے ہیں
قدم قدم پہ ہیں حد بندیوں کے کہنہ اصول
قدم قدم پہ ہے تخریبِ ابنِ آدم میں
مدبرانِ وطن! زندگی ہے اب بھی اسیر
ہزاروں سال کی تفریق کے جہنم میں

قدرت اللہ شہاب

حقیقت سے مجاز تک

اگر آپ ترقی اور اعلیٰ درجات کے طالب ہیں تو آپ کو ضلع جھنگ کی زیارت کے لئے ضرور جانا چاہیئے یہاں آپ راہ سلوک کا سفر منزل بمنزل مقام بمقام نہایت بے تکانی سے طے کر سکتے ہیں

جھنگ پہنچتے ہی آپ کا خیر مقدم ایک سادہ سی قبر کرتی ہے جس کے کتبے پر یہ تحریر ہے کہ یہ مزار شریف حضرت میاں رانجھا رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت مائی ہیر صاحبہ کا ہے جنہوں نے عشق حقیقی کی آگ جلا کر بنی نوع انسان کی روح کو گرمایا۔ اب وارث شاہ اپنی شاعری کی ترنگ میں جو جی چاہے لکھ ڈالے۔ لیکن اس قبر کا کتبہ بڑی شدت سے اعلان کرتا ہے کہ خبردار، یہ اولیا اللہ کا مرقد ہے اور جو مجاور یہاں بیٹھتا ہے وہ بھی بڑی عقیدت سے آپ کو جوتے اتارنے فاتحہ کہنے اور منت ماننے کے آداب سکھاتا ہے اور جھنگ گھیانہ کے گلی کوچوں میں بسنے والے بے شمار محبت نواز جوڑے شہادت دیتے ہیں کہ اس مزار کا قرب زندگی کے بہت سے عقدوں کا حل فراہم کر دیتا ہے

اگر آپ جھنگ سے اٹھارہ انیس میل شمال کی طرف جائیں تو آپ کی دوسری منزل کھیوا پڑے گی۔ یہ صاحبان کا گاؤں تھا۔ جہاں مرزا طویل مسافتیں گھوڑے پر طے کر کے اس سے ملنے آیا کرتا تھا مرزا صاحباں کے قصے پر بھی بہ خود غلط شاعروں نے رومانی رنگ چڑھا رکھے ہیں لیکن اگر آپ اس گاؤں کے بڑے بوڑھوں سے اس قصے کی بابت کوئی بات ذرا بے احتیاطی سے پوچھ بیٹھیں گے تو وہ آپ کو بڑی غضبناک نگاہوں سے گھوریں گے اور آپ کی جہالت اور گمراہی پر لاحول پڑھتے ہوئے آپ کو ایک پرانی اور بوسیدہ سی مسجد میں لے جائیں گے۔ تاکہ آپ نماز دوگانہ ادا کر کے اپنے باطن کی طہارت کریں۔ یہ مسجد بی بی صاحباں کی مسجد ہے اور گاؤں والے بڑی عقیدت مندی سے آپ کو بتائیں گے کہ اس مسجد میں بی بی صاحباں دن رات نوافل ادا کیا کرتی تھیں۔ حتیٰ کہ ان کا نام اللہ کے منتخب شہیدوں میں درج ہو گیا۔ چنانچہ آج بھی بہت سی نیک بیبیاں اغوا ہونے سے پہلے یا اغوا ہونے کے بعد اس تاریخی مسجد میں برکت حاصل کرنے کے لئے آیا کرتی ہیں بلکہ اگر کوئی عورت اس مسجد میں سربسجود نظر آئے تو بلا تردد یہ قیاس کر لیا جاتا ہے کہ یہ بی بی صاحباں کی طرح عشق مجازی سے عشق حقیقی کی طرف ترقی پذیر ہے۔

بی بی صاحباں پر جو درجۂ ولایت نازل ہوا۔ اس کی روئیداد بھی اہل قلب و نظر کے لئے بڑی کرامت والی چیز ہے کہتے ہیں کہ ایک بزرگ کی دختر نیک اختر گھر سے فرار ہو گئیں تھیں۔ وہ اس کی تلاش میں گھومتے گھامتے کھیوا آ پہنچے یہاں پر سرِ راہ صاحبان کی ماں سے ملاقات ہو گئی بزرگ نے اس سے اپنی بیٹی کی نسبت دریافت کیا صاحبان کی ماں نے جواب دیا کہ میں آوارہ چھوکریوں کا حساب کتاب نہیں رکھا کرتی اس لئے مجھے تمہاری دختر فرخندہ بخت کی بابت کچھ معلوم نہیں۔ اس پر بزرگ جلال میں آگئے اور حالت جذب میں انہوں نے بددعا دی کہ جا تیری بیٹی بھی تیرا نام روشن کرے گی۔ کچھ عرصے کے بعد صاحبان پیدا ہوئی اور جیسا کہ تاریخ شاہد ہے اس نے اپنی ماں کا تو نہیں بلکہ اپنا نام خوب روشن کیا اور اس روشنی کا نور آج تک مغویہ عورتوں کے لئے مشعل راہ کا کام دے رہا ہے۔

غالباً چناب کے پانی ہی میں کچھ کرامات ہے کہ اس کے کنارے جس کسی نے عشق کیا وہ بے تکلف درجۂ ولایت تک پہنچ گیا ہیر رانجھا اور مرزا صاحبان کی تو پرانی باتیں ہیں۔ لیکن آج بھی اس دریا کے کنارے ایک جگہ ایسی ہے جہاں عشق و محبت کی آمیزش سے کشف و کرامات تصوف اور معرفت کے بہت سے عقدے حل کئے جاتے ہیں یہاں پر ایک پیر تھے جن کے نام کے ساتھ فخر سالکان، رہنمائے عاشقاں، محبوبِ ... کی قسم کے کوئی گز بھر القاب اور خطابات لگا کرتے تھے اگریز ...

القاب کو کسی تختی پر لکھا جائے تو اس کی صورت ایک کتبے کی طرح جاتی ہے جو مقدس مزاروں کے سرہانے آویزاں کیا جاتا ہے..... صاحب پکی سڑکوں پر شاندار کار استعمال کیا کرتے تھے۔ کچی سڑکوں لئے اسٹیشن ویگن تھی۔ اس کے علاوہ دس بارہ اعلےٰ قسم کے گھوڑے ے جن پر وہ خود کبھی سوار نہ ہوئے تھے تین ساڑھے تین درجن نسلی تے تھے۔ جن کی خدمت کے لئے بہت سے خادم مامور تھے۔ کبوتروں بی شوق تھا اور گاہے گاہے بٹیروں کی پالی سے بھی جی بہلایا کرتے تھے

درگاہ شریف پر درویشانہ ٹھاٹھ تھے لیکن مریدوں کی سہولت لئے برامر مجبوری پنجاب اور سندھ کے متعدد شہروں میں جدید طرز کوٹھیاں بنوا رکھی تھیں۔ گدی کے نام پر بہت سی آراضی وقف تھی۔ رسال بھر میں عقیدت مندوں سے بہت سا نذرانہ بھی آجاتا تھا فیائے کرام کا مسلک ہے کہ دنیاوی مال ومتاع راہِ سلوک کا ہزن ہوتا ہے چنانچہ ایمان کی سلامتی کے لئے پیر صاحب اپنی ساری مدنی بڑی باضابطگی سے ٹھکانے لگاتے رہتے تھے۔ گرمیوں میں مری شہ، ایبٹ آباد اور سردیوں میں لاہور، پشاور اور کراچی کے شہروں میں پہنچایا جاتا تھا۔ عرس شریف کے موقعے پر گاؤں والے روحانی ب حاصل کرتے تھے۔ اور اس طرح پیر صاحب سارا سال اپنے یدان باصفا کی خاطر بڑے بڑے دینی اور دنیاوی مجاہدوں میں طاف دیچاں رہتے تھے

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ عرس شریف کا آخری روز تھا۔ محفل اع کے لئے دھوم دھام کا اہتمام تھا۔ گدی کے بائیں طرف افسروں شستیں تھیں۔ دائیں طرف پیر بھائی رؤسا اور سیاست زدہ اصحاب ریف فرما تھے۔ عین سامنے درویشوں کا گروہ تھا۔ جن پر قوالی کے ت یکے بعد دیگرے حال طاری ہونے والا تھا۔ وجدان کی سہولت لئے لاہور سے طریقت پسند لڑکوں کی ایک پارٹی بھی آئی ہوئی تھی ۔ وہ باریک ململ کے کرتے اور ترچھی ٹوپیاں پہنے بڑے ادب سے زانو بیٹھے تھے ان سب کے درمیان قوالوں کا ساز وسامان ا۔ اور پیچھے حدِ نگاہ تک زائرین کا اجتماع تھا۔ یہ عقیدت مند ر دراز مقامات سے آئے ہوئے تھے ان کے پاس نہ سواری کے لئے موٹریں تھیں نہ گھوڑے، اور پالکیاں تھیں لیکن ہر سال روحانیت کی کشش سفر وسیلۂ ظفر کی ہر دشواری و صعوبت کے باوجود یہاں کھینچ لاتی تھی۔ شاید یہ لوگ اپنے ہل کا بیل فروخت کر کے یہاں آئے تھے شاید انھوں نے اپنی بیویوں کے زیور یا اپنی بیٹیوں کے جہیز رہن رکھ کر نذرانے کا انتظام کیا تھا۔ شاید یہ جب واپس لوٹیں گے تو انھیں کئی کئی مہینے فاقہ سے گزارنے پڑیں گے۔ کیونکہ انکی گندم کے فالتو ذخیرے پیر صاحب کے لنگر کی بھینٹ چڑھ رہے تھے

قوالوں نے بڑی خوش مستی کے ساتھ ہارمونیم کی تان چھیڑی.... درویشوں کے سر جھومنے لگے طریقت پسند لڑکے چٹکیاں بجا بجا کر بیٹھے بیٹھے بڑی ادا سے کمریں مٹکانے لگے۔ پیر صاحب کا مورچھل طرہ بھی جنبش میں آیا جیسے بین کی آواز پر سانپ کا پھن لہرا رہا ہو۔ گلاب پاش تیزی سے گردش کرنے لگے انگیٹھیوں میں عود وعنبر اور لوبان سلگنے لگا اور اس سوندے سوندے ماحول میں بھاگیشری کے سُر میں قوالوں نے جامی کی غزل شروع کی۔ ایک ایک بول ایک ایک تال پر درویش بے تحاشا پھڑکنے لگیں۔ پیر صاحب زور زور سے اپنی رانوں پر ہاتھ مارتے تھے۔ افسر لوگ اپنے وقار کی بندشوں کی وجہ سے کبھی کبھی محض سر ہلا دیتے تھے سیاست زدہ اصحاب اس سے بھی زیادہ وقار کے مدنظر سر کی جگہ چوری چوری پاؤں ہلاتے تھے۔ عقیدت مندوں کا ہجوم جو اکثر فارسی سے بے بہرہ تھا نہ سر ہلاتا تھا نہ پاؤں لیکن پیر بھائی درویش اور طریقت پسند لڑکے آپے سے باہر ہو رہے تھے وہ بے اختیار گردنیں مٹکاتے تھے۔ سجدوں میں گرتے تھے اور گھٹنوں کے بل کھڑے ہو ہو کر راگنیوں کی تان پر جھومتے تھے۔ اور پھر یکایک کئی درویش ہو حق کا نعرہ لگا کر میدان میں کود پڑے ایک صاحب اپنی سفید داڑھی کو مٹھیوں میں پکڑ کر ناچنے لگے دو درویش ایک دوسرے کے گلے سے لپٹے رموز بیخودی فاش کرنے لگے ساری مجلس مؤدبانہ کھڑی ہو گئی۔ اور عقیدت مند جھک جھک کر نذرانے پیش کرنے لگے پیر صاحب انھیں ہاتھ سے چھو چھو کر قوالوں کے حوالے کرتے جاتے تھے۔ ایک طالب علم نے اپنا فونٹین پین پیش کیا کیونکہ اس کی جیب کے پیسے ختم ہو گئے تھے۔ ایک کسان نے جو کے ستوؤں کی پوٹلی نذر کی

جسے وہ غالباً زادراہ کے طور پر اپنے ساتھ لایا تھا۔

جمال کے بعد حافظ خسرو اقبال کی قوالی ہوئی۔ اقبال کی قوالی پر پیر صاحب کو بھی وجد آگیا اور جب وہ فارغ ہو کر بیٹھے تو ان کے چہرے پر جلال اور سر پر جمال تھا۔ دراصل سر پر اصل مقام پگڑی کا ہے لیکن اس وقت پیر صاحب کے سر پر صرف جمال ہی جمال تھا کیونکہ ان کی پگڑی کو بھی ابھی ایک خادم بڑے ادب سے اٹھائے باریک چقوں کے پیچھے لے گیا تھا۔ جہاں بہت سی عقیدت مند عورتیں رحمت خداوندی کے انتظار میں ہمہ تن گوش بیٹھی تھیں۔ خادم پگڑی اٹھائے جمیلہ کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ جمیلہ کی ماں اسے پہلی بار عرس شریف میں لائی تھی۔ تاکہ اللہ تعالےٰ کے حضور میں جمیلہ کی شادی کے لئے دعا کرے پگڑی کو دیکھ کر جمیلہ رونے لگی۔ لیکن اس کی ماں نے اسے جھڑک دیا۔ جمیلہ بیٹی اللہ کے دربار میں رو کر نافرمانی نہیں کیا کرتے۔ اس مقدس پگڑی ہی میں اولیائے کرام کی وراثت محفوظ ہے اس پگڑی کے ساتھ بزرگی اور عظمت اور معرفت کی روایات صادقہ وابستہ ہیں اس پگڑی کے سہارے پیروں کی پشت ہائے پشت عرش عظیم کے میناروں پر چڑھتی رہی ہیں۔ اس پگڑی کی سلوٹوں سے فیض کے چشمے بہتے آئے ہیں صدیوں سے بندگان خاص و عام کو یہ پگڑی انوار تجلیات سے سرفراز کرتی رہی ہے یہ بڑی مرادوں والی پگڑی ہے۔ اس پر ایجاب و قبول کے سب دروازے وا ہیں، یہ پگڑی خدا کی بارگاہ سے بھی خالی نہیں لوٹتی، تو اللہ کا نام لے کر بےرغبتی نہ کر رغبت اس پگڑی کے پیچھے پیچھے چلی جا ورنہ بزرگوں کی روح خفا ہو جائے گی۔ اور اگر بزرگوں کی روح خفا ہو گئی تو ہماری سرسبز کھیتیاں اجڑ جائیں گی ہمارے جھونپڑوں کو آگ لگ جائے گی۔ ہمارے والانوں میں ہتھکڑیاں جھنجھنانے لگیں گی۔

دوسری عقیدتمند عورتوں نے بھی حسب توفیق جمیلہ کی ماں کی تائید کی جمیلہ روتے روتے اٹھی آگے آگے دستار فضیلت مآب تھی۔ اور پیچھے پیچھے جمیلہ، خادم نے پگڑی کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ پکڑا ہوا تھا۔ تاکہ ان معصوم جوانیوں کو ٹھیس نہ لگ جائے جو اس پگڑی کی ایک ایک سلوٹ میں سالہا سال سے مدفون ہوتی چلی آئی ہیں ×

(بہ شکریہ ادب لطیف)

اسدؔ ملتانی

فیضِ جبرئیل

یہ بات وہ ہے جسے حاجتِ دلیل نہیں
کہ عشق جہدِ مسلسل ہے قال و قیل نہیں

فضائے شوق میں پرواز ہے بہت مشکل
نشانِ جادہ نہیں کوئی سنگِ میل نہیں

عطا ہے اپنی اگر ہم نہ کرسکیں حاصل!
خدائے پاک! تری نعمتیں قلیل نہیں

جو کم نگاہ خود اپنی نظر سے گر جائے!
جہاں میں اس سے زیادہ کوئی ذلیل نہیں

نوں کو ناز ہو اس پر کہ وہ تو ہیں موجود
ر اُن کو توڑنے والا کوئی خلیل نہیں

رہے جو غیر کی محتاج کیا وہ آزادی
غلام ہے وہ تمدن جو خود کفیل نہیں

رکھ صداقتِ دیں کی اساس منطق پر!
رنہ کفر کے دعوے بھی بے دلیل نہیں

اسدؔ ہے خوب یہ پاپائے رُوم کا کہنا!
کہ ریڈیو بھی بجز فیضِ جبرئیل نہیں

عبدالغفار تبسمؔ

سخنِ مجرمانہ؟

اللہ کا قانون زمانے میں چلا دو
انسان کو انسان کی غلامی سے چھڑا

ہاں چھوڑ کے مذہب کو سیاست کے کرم پر
تم عظمتِ اسلاف کو مٹی میں ملا

کیوں پست ہو اک بارِ گراں ہو کے ڈٹے
جینا ہو تو جینے کی ہوس دل سے مٹا

ہر رسم و رہِ دینِ محمدؐ سے شناسا
دلدادۂ افرنگ کو وہ راہ دکھا

ذروں کی حقیقت سے ہوں آگاہ ستارے
شاہی کو فقیری کے مقامات دکھا

اقرار ہے حق گوئی کا مجھ کو اے تبسمؔ
یہ بات اگر جرم ہے اچھا ہو سزا دو

تاج الدین احمد

اپنے ساقی سے[1]

...ں کے تجدید خرابات کا نام اے ساقی! شیخ و صوفی پہ ہی کیوں نیند حرام اے ساقی
...نکلتے ہیں جو پیغام ترا دنیا کو ہم پہ برہم ہیں فقیہانِ کرام اے ساقی
...ام حق معتقدیوں کو تو گوارا ہے مگر اسکی تلخی سے تڑپتے ہیں امام اے ساقی
...شغلہ اس کا ہے تحقیر ترے رندوں کی شیخ کو اور بتا دے کوئی کام اے ساقی
...نورش مفتی و ملا کی مجھے کیا پرواہ لے چکا ہاتھ میں جب میں ترا جام اے ساقی
...اب میخانے سے اٹھا ہے مرے دل کا خمیر کیسے میں چھوڑ دوں شغل مئے و جام اے ساقی
...نشے دل سے ہو گوارا جسے باطل کا نظام دور سے ایسے تقدس کو سلام اے ساقی

کھل چکے ہیں مرے ادراک پہ اسرار جہاں
ایک جام اور فقط ایک ہی جام اے ساقی

[1] تحریک اسلامی کے مقدس مخالفین کی ریشہ دوانیوں سے متاثر ہو کر — جو اب بھی جا بجا جاری ہیں

قیصر قیصری

غزل

ہم بہاروں کے گیت گاتے ہیں
خارزاروں کے دل بڑھاتے ہیں

تیری نظروں میں ڈوبنے والے
غم کے طوفاں میں سر اٹھاتے ہیں

امن کی بھیک مانگنے والے
آستینوں میں کیا چھپاتے ہیں!

ایک سجدے سے بھاگ کر اے دوست
آستاں کتنے چومے جاتے ہیں

تم چمن زاد ہو قیام کرو!
ہم تو یونہی چمن تک آتے ہیں

صبح کی بات چھیڑیے قیصر!
شب کے افسانے کیا سناتے ہیں

میری کولیکشن
عنبر نظامی

"بادشاہ کا انتقال ہوگیا - بادشاہ زندہ باد"

وہ ایک آراستہ و پیراستہ کمرہ میں موت و زیست کی کشمکش میں گرفتار اپنی (زند)گی کے آخری سانس لے رہا تھا وہ بادشاہ تھا ایک جلیل القدر اور انصاف پسند (باد)شاہ مگر موت کسی کو نہیں چھوڑتی بادشاہ ہو یا فقیر۔ کمرہ میں لوگوں کی آمد و رفت (اور) سرگوشیوں کی بنا پر ایک ہلکا سا شور اٹھ رہا تھا۔ جو روح فرسا بھی تھا (اور) گراں بھی۔ آہ جس بادشاہ کے کمرہ میں کوئی پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا آج ایک گذ(ر) عام بنا ہوا تھا۔ ڈاکٹروں کو استعجاب تھا کہ یہ کیا بات ہے آج بادشاہ کو یہ شور و (غل) ناگوار نہیں گزر رہا۔ کیا اسکی قوت سماعت جواب دے چکی ہے یا اس کی ملکہ (کی) سسکیوں نے اسے عالم بے خودی میں پہنچا رکھا ہے۔

"جس کمرہ میں ہر وقت وہ پڑے رہتے تھے اور روشنی چھن چھن کر (دا)خل ہوتی تھی آج وہیں اضطراب پریشانی اور افراتفری کے عالم میں پردے (ہ)ٹے ہوئے تھے اور روشنی کمرہ میں آکر اس کی بے نور آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر رہی (تھ)ی کسی کو احساس نہ تھا کہ جب معمول پردوں کو گرا دے ڈاکٹر متعجب تھے کہ آج (ا)سے اسکی بھی پرواہ نہ تھی۔ کیا اس کی قوت باصرہ جواب دے چکی ہے۔

اسی عالم میں اسے لیٹے ہوئے کچھ لمحے گذر گئے۔ دفعتاً اس کے ہاتھ (میں) جنبش ہوئی اور بستر پر کچھ اس طرح اس کا ہاتھ پھرنے لگا گویا وہ کسی چیز کی تلاش میں ہے یا پھر تاسف میں ہے۔ اس کی ملکہ نے محبت و گرمجوشی کے ساتھ بڑھی ہوئی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا لیا مگر اسے اس کا احساس بھی نہ ہوا۔ رفتہ رفتہ اسکی بے نور آنکھوں سے رہی سہی روشنی بھی زائل ہوگئی۔ اور کھلی آنکھیں اب مندنے لگیں۔ منہ بند ہوگیا اور پھر دفعتاً حرکت قلب بند ہوگئی۔ وہ جو اپنا ہو کر بھی رک رہا تھا۔ اب بجھ چکا تھا۔ وہ کشمکش زیست سے آزاد ہو چکا تھا۔ لوگ چہ میگوئیاں کرنے لگے۔

چہرہ کیسا ڈوبا ہے" ایسا معلوم ہوتا ہے گویا آرام کی نیند سو رہا ہے" جنتی تھا۔

بادشاہ جب پھر عالم ہوش میں آیا اور اس نے آنکھیں کھولیں تو اپنے چاروں طرف سکوت طاری دیکھا۔ ایک عجیب راحت زا سکون چاروں طرف تاریکی کا عالم تھا مگر پرسکون۔ اس نے اپنی حالت کا جائزہ لیا اور اپنے آپ کو اطمینان و سکون کے ایک بے پایاں سمندر میں پایا جیسے وہ جنت (کی) راحت پذیر ہے۔ کمرہ پھولوں سے لدا ہوا تھا۔ رات کی خنک ہوا پھولوں (سے) مل کر عجیب لطافت پیدا کر رہی تھی۔ اس کے سرہانے اگر کی بتیاں سلگ (رہی تھیں)

....

(ا)تھیں اس کے اوپر ایک مخملی لحاف پڑا ہوا تھا۔ صرف اس کا چہرہ اور سر کھلا ہوا تھا۔ اس کے قریب ہی چار پانچ محافظ گہری نیند میں غرق پڑے تھے۔

اسے اپنی تنہائی اور اس وقت کی بیکسی پر افسوس ہوا مگر افسوس کچھ زیادہ عرصہ نہ رہا سسکیوں کی گھڑیاں نے گیارہ بجا کر اسے ایک دم چونکا دیا۔ وہ اٹھ بیٹھ گیا۔ اور کچھ سوچ کر مسکرا پڑا۔

اسے خیال آیا کہ جب وہ موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھا تو اس نے طاقت مجتمع کر کے اس مالک حقیقی سے جس کے قبضہ قدرت میں اس کی جان (ہے) التجا کی تھی کہ وہ اسے نامناسب وقت میں جب کہ اسے کئی ادھورے کام انجام دینے ہیں اس دنیا سے نہ اٹھائے ورنہ اس کا مشن پورا نہ ہو سکے گا۔ اس (کی) دنیا کو اس کی سخت ضرورت ہے لہٰذا اس کی زندگی واپس پھیر دی جائے۔ مالک حقیقی نے اس کی التجا سن لی تھی اور اس نے اپنی التجا کا جواب ان الفاظ میں سنا تھا۔

"ہم تم کو تمہارے مرنے کے بعد صرف ایک گھنٹہ مہلت دیں گے اسی (وقفہ) میں اگر تم نے یہ ثابت کر دیا کہ تین شخص بھی تمہاری زندگی کے خواہاں ہیں تو تم کو از سر نو زندگی دیدی جائے گی"

یہی وہ وقت تھا جب کہ مرنے کے بعد

[illegible] سانسیں ہیں سے کچھ وقت اس نے غور و فکر میں گذار دیا۔

وہ ایک بادشاہ تھا۔ اس نے اپنی رعایا کے لئے دن رات کام کیا تھا۔ وہ کسی سے فرحت اور ہراساں نہ تھا۔ وہ دوبارہ زندگی پا کر بہت زیادہ خوشی محسوس کر رہا تھا۔ اور اب اسے حقیقی معنوں میں زندگی کی قدر و قیمت محسوس ہو رہی تھی۔ قدرت نے اسے دوبارہ زندگی دے کر اس کے ساتھ احسان کیا تھا۔ حقیقتاً اسے زندگی کی چند ساعتوں پر [illegible] تھیں تھی مگر [illegible] کام [illegible] کے وقت سے متفکر اور پریشان کر رہے تھے وہ بستر سے اٹھا۔ اور [illegible] پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے باہر نکلا۔ باہر کی فضا دیکھ کر اسے محسوس ہوا کہ جیسے بہت کچھ تبدیلی رونما ہو گئی ۔۔۔؟ اچانک ایک خیال نے اسے چونکا دیا شاید دوبارہ زندگی حاصل کر کے بہت تھوڑی سی چیز حاصل کی ہے کہ اس میں شک نہیں کہ یہ میری بڑی خواہش تھی۔ مگر کیا یہ خود غرضی پر مبنی نہیں تھی دنیا میں مجھ سے زیادہ قابل آدمی ہیں۔ دنیا بہت وسیع ہے اس کے [illegible] تصورات سے بھی وسیع۔ پھر اس نے اس قسم کی خواہش کیوں کی کیا اس کے نہ ہونے سے دنیا کے کام بند ہو جاتے۔ اسے اپنے ملک اپنے مکان سے بہت محبت تھی اور رات وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ جیسے یہ سب چیزیں اس کے ساتھ ہی ختم ہو جائیں گی مگر اب اسے مشاہدہ ہوا کہ یہ ابھی تک قائم رہیں۔

دروازے کے باہر وہ ایک لمحہ پہلے جھجکا۔ اور سوچنے لگا کہ وہ پہلے کہاں جائے۔ ملکہ کے پاس! نہیں! اس کے پاس نہیں۔ اس کے پاس [illegible] جب ایک مرتبہ اور اسے اپنے بازوؤں میں گرم جوشی کے ساتھ لے سکوں گا اور اسکی آنکھوں میں خوشی کے آنسو لے آؤں گا۔ صرف ایک گھنٹہ کی بات ہے پھر مجھے دائمی زندگی مل جائے گی۔ بارہ بجے تک دوبارہ زندگی حاصل ہو جائیگی اور پھر یہ سب باتیں خواب و خیال ہو کر رہ جائیں گی۔ لہٰذا اب ان باتوں پر کیا غور کرنا۔

"لیکن۔ لیکن یہ زندگی کہاں تک۔ آخر یہ موت پھر آئیگی پھر کیوں اس سے مفر کیا جائے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ بستر کی طرف پلٹا۔

"لیکن میں نے کوئی کام خوف و ہراس سے ترک نہیں کیا مجھے [illegible] ہے۔ وہ سوچنے لگا۔ دفعتاً اسے اپنے معاہدہ کا خیال [illegible]۔ اس کا شہر چاندنی رات میں اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔

"تین کیا معنی تقریباً میں تین ہزار آدمی ایسے پا سکتا ہوں جو مجھ سے محبت کرتا ہے اور میرے لئے مخلص ہیں۔ کیا میرے محبوبوں کی کمی ہے۔ نہیں۔ ہر گز نہیں۔

اسی خیال نے اسے دوبارہ باہر نکلنے پر مجبور کیا۔ اور گیٹ سے باہر نکلتے ہی اس نے دیکھا کہ ایک بچی سیڑھیوں پر پڑی بلک بلک کر رو رہی ہے۔ محافظ گشت لگاتے لگاتے اس کے پاس پہنچا۔ اور بولا۔

"کیا بات ہے میری بچی۔ تو کون ہے اور کیوں رو رہی ہے؟"

میرے والدین محل میں گئے ہیں۔ بادشاہ کی وفات کی وجہ سے وہ ابھی تک نہیں لوٹے۔ انتظار کرتے کرتے میں تھک چکی ہوں اور اب بھوک سے بے چین ہوں۔ اس وقت میرے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ میری گڑیاں بھی بھوک کی وجہ سے مر گئیں۔ کاش بادشاہ دوبارہ زندہ ہو جاتے تاکہ میرے والدین محل سے جلد میرے پاس واپس آجائیں۔ اور مجھے تسکین دیں۔ بچی کہتے کہتے اور بلک بلک کر رونے لگی۔

بادشاہ نے سوچا میری رعایا میں یہ پہلی بچی ہے جو میری زندگی کی خواہشمند ہے۔

وہ خود لا ولد تھا اسکی خواہش ہوئی کہ وہ بچی کی غمخواری کرے مگر اس کے پاس وقت تھوڑا تھا اور کام بہت۔ وہ بہ مجبوری آگے بڑھا۔ اب اس کا رخ اپنے ایک نہایت عزیز اور جگری دوست کے گھر کی طرف تھا اس کا دوست اسے پا کر کتنا خوش اور متعجب ہوگا۔ اس نے سوچا

غریب امیاس! میرے لئے کتنا رنجیدہ ہوگا۔ خدا نہ کرے اگر مجھے اس کا صدمہ اٹھانا پڑتا تو پھر میرے دل کی کیفیت کیا ہوتی۔ شکر ہے اس نے مجھے زندگی میں داغ مفارقت نہ دیا ورنہ میں اسکی وفات کا صدمہ برداشت نہ کر سکتا۔ بادشاہ ان ہی خیالات میں غرق چلا جا رہا تھا یہاں تک اس کے دوست کا مکان آ گیا۔

وہ مکان کے صحن میں داخل ہوا۔ چراغ کی آمد و رفت دیکھ کر وہ متعجب بھی ہوا اور متفکر بھی۔ یہ کیا روشنی کیوں لائی اور لیجائی جا رہی ہے آخر یہ کیا بات ہے۔ ارے یہ کیا سامنے گھوڑوں پر زین کسی جا رہی ہے کیا امیاس کہیں جا رہا ہے۔ آخر کیوں ایک عجیب بے چینی سی مکان میں پائی

۔ مگر ان باتوں کے باوجود اس کا دوست اسے کہیں نظر نہ آیا۔ اس
پہاڑ کر دیکھا مگر بے سود۔ وہ آگے بڑھا۔ ہال میں پہنچا۔ اسکا
بال یہی تھا۔ یکے بعد دیگرے اس نے کئی کمرے چھان مارے مگر
ست کہیں نہ تھا۔ اسے کہیں پرائیوٹ کمرہ میں نہ ہو، وہ پرائیوٹ
یا۔ اس نے اس کمرہ میں اپنے دوست کی صحبت میں بہترین لمحات
تھے۔ گزشتہ خیالات نے آگھیرا۔ مگر یہ کیا اس کا دوست یہاں
رہ کی ترتیب و نشست و برخاست ابتری سے محسوس ہوتا تھا
ں ابھی اٹھ کر کہیں گیا ہے۔ کتابیں اور کاغذ بکھرے پڑے تھے۔
چند ٹکڑے ٹوٹے ہوئے فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔

وہ اور آگے بڑھا۔ سامنے ایک چھوٹی سی تصویر زمین پر
اس نے اسے اٹھالیا۔ یہ خود اسکی اپنی تصویر تھی۔ اس کا فریم کہنے
ٹوٹ چکا تھا۔ یہ کانچ اس کے آئینہ کے تھے۔ اس نے تصویر کو
دوبارہ زمین پر پٹک دیا۔ کچھ اس طرح جیسے تصویر گرم ہے اور
یں چنگ لگ گئی ہو۔

آتشدان میں آگ جل رہی تھی۔ چند کاغذ اس میں جل رہے تھے
یہ کاغذ نصف جل چکا تھا مگر نصف جلنے کو باقی تھا۔ اس نے
آگ میں سے نکالا اور کاغذ کی آگ بجھاتے ہوئے نصف حصہ کو
سکا اپنا خط تھا جو اس نے سب سے آخری دفعہ اپنے دوست کو
ا اور جس میں اس نے اپنی آئندہ اسکیموں اور اصلاحات کا
ا تھا۔ لیکن اسے جلایا کیوں جا رہا ہے۔ پھر جانے کس خیال
سے اس نے یہ نصف خط بھی آگ میں ڈال دیا۔ دفعتاً دو متحرک
دکھائی دیتے۔ ان میں سے ایک عورت تھی اور ایک مرد۔ مرد
یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کہیں بہت دور سے آرہے ہیں۔ اس نے
سکے تھے جن میں پیوند لگی ہوئی تھی۔

امیاس کہاں ہے! ۔ میں نے عورت سے پوچھا۔
نے حکمراں کے حضور نذر عقیدت پیش کرنے گیا ہے۔ عورت
یا۔ شاید تم کو علم نہیں کہ نئے بادشاہ میں اور مرحوم بادشاہ میں کوئی
نہیں ہے۔ دونوں کے مزاج اور عادات میں بہت فرق ہے اور
غیر مشترک تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ بادشاہ مرحوم بادشاہ

کو بنظر حقارت دیکھتا ہے۔ امیاس مرحوم بادشاہ کا منظور نظر رہا ہے
ممکن ہے کہ یہ تعلق خاطر نئے حکمراں کو گراں گزرے۔ گو امیاس بغیر کسی
جھجک اور شک و شبہ کے یاد کرا سکتا ہے کہ مرحوم بادشاہ کی عام اصلاحات
اور امور سب بے وقوفی پر محمول تھے اور امیاس کی ناپسند۔ مگر پھر بھی ہم
تذبذب میں ہیں۔ اسی بنا پر امیاس بادشاہ کی وفات بغیر بھولے کر نئے
حکمراں کی خوشنودی مزاج حاصل کرنے اس کے دربار میں چلا گیا ہے لیکن
کو اپنی آئندہ زندگی کا خیال ہے۔ اسلئے ہم جذباتی دور میں ہیں۔ پیچھا اور
امیاس نے اولیں فرصت میں نئے حکمراں کے دربار میں جگہ حاصل کرنے
کی سعی شروع کر دی ہے۔ اسی وجہ سے میں چاہتی ہوں کہ اسکے تمام خیر
خواہوں کو جلد از جلد دربار میں بھیجدوں تاکہ وہ بادشاہ پر اپنا رنگ جما سکے۔

" بالکل ٹھیک ہے " مرد بولا جس کو بادشاہ نے اب پہچان لیا تھا
کہ وہ اسکے سفراء میں سے ایک سفیر تھا۔ " میں جلد از جلد دربار میں پہنچوں گا
اور امیاس کی تقلید کروں گا۔ اور ساتھ ہی اس کی خیر خواہی بادشاہ پر واضح
کرنے کی کوشش کروں گا۔ مرحوم بادشاہ کچھ صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔
اس نے مجھے بھی مجبور کیا تھا کہ میں دشمن ملک سے صلح کی سعی کروں جبکہ
یہ صلح ملک و قوم کے لئے مضر ہوتی۔ مگر موجودہ بادشاہ بغیر جنگ کئے
نہ ملنے گا جو میری مرضی کے مطابق ہے۔ اسی جنگ سے مزید ترقیوں کے
امکانات ہو جائیں گے۔ فوج سے بڑے بڑے عہدے مل جائیں گے۔ مرحوم
بادشاہ اگر چند دن اور زندہ رہ جاتا تو ترقی کے امکانات بالکل ختم ہو جاتے۔

بادشاہ اس سے زیادہ اپنی بیزاری نہ سن سکا۔ اس نے دوبارہ
کمرہ چھوڑ دیا۔ مجھے اپنی رعایا کے پاس جانا چاہیئے جن کیلئے میں نے دن
رات کام کیا ہے۔ وہ میری پالیسی پر مطمئن ہونگے اور موجودہ بادشاہ سے
نالاں اس لئے کہ میری دی ہوئی دعائیں اب ختم کر دی جائیں گی۔

اسی اثنا میں پندرہ منٹ گذر گئے اور گھڑیال نے اس کی
معلومات میں اضافہ کر کے اسے اور مستعد کر دیا

اسے اپنی رعایا کی معمولی سے معمولی جائے رہائش اور گذرگاہوں
تک کا علم تھا۔ چونکہ وہ عام طور سے بھیس بدل کر اپنی رعایا کے حالات معلوم
کرنے چھوٹی بڑی جگہ جایا کرتا تھا۔ سے گندگی جس سے کہ گھن آتا تھا
مگر وہ یہ سب کچھ خوشدلی کے ساتھ برداشت کیا کرتا تھا کہ

یہ جادو یا ہتھکنڈا ہی سمجھا کہ گندی آبادیوں میں سے لگتا تھا۔ حالانکہ اس کا علم آبادی کے رہنے والوں کا تھا اور نہ اس کے محل کے رفیقوں کو۔

اب پھر وہ وہیں جا رہا تھا۔ وہ یہ سوچ کر مسکرایا کہ اب بخلاف کا کچھ نہیں کر سکتا۔ آبادی میں مکانات کا وہی معمول تھا۔ گندگی باسی اور بجائے کی سی بو ہر طرف ہو رہی تھی۔ ستے رات گئے باوجود لوگوں کی ٹولیاں ادھر ادھر سڑکوں پر کھڑی تھیں۔ اور اس کی موت اور کل کے تجہیز و تکفین کے متعلق تذکرے ہو رہے تھے۔

قریب ہی ایک اوباش اور گندے قسم کے ریسٹورنٹ میں چار پانچ آدمی بیٹھے ہوئے پی رہے تھے وہ وہاں ہی پہنچ گیا اور ان آدمیوں کی گفتگو سننے لگا۔

بادشاہ مرگیا ! مرجانے دو سالے کو۔ ان میں سے ایک بولا جیسے بادشاہ بڑا ہی جانتا تھا اور جس کی وہ کئی دفعہ امداد بھی کر چکا تھا۔" اور یہ بھی کوئی بادشاہ تھا۔ سالا ضرورت سے زیادہ ایک پیسہ بھی نہ خرچ کرتا تھا تجارت کی بھی لٹیا ڈبو دی۔ ہر قسم کی پابندیاں لگاتا تھا۔ تاکہ چور بازاری نہ ہو سکے۔ پاگل کہیں کا۔ مگر یار سنتے ہیں نیا حکمران بہت اچھا آدمی ہے ہمیں آزاد رعایتیں دے گا۔

ہاں بھئی ہاں ! وہ تو یار مان نہ مان میں تیرا مہمان کی قسم کا سا انسان تھا۔ خواہ مخواہ دوسروں کی معقولات میں دخل دیتا تھا۔ ہر وقت سالا صاف ستھرے مکان۔ آسائش و آرام ہی کی چیزوں کیلئے زور دیتا رہتا تھا۔ کوئی اس مسخرے سے پوچھے کہ بھئی تو اپنے مکان میں خوش صاف ستھرا رکھ بھلا ہمارا دماغ کیوں چاٹتا ہے۔ ہم صاف رہیں ستھرے ہیں گندے ہیں تو کون بھلا۔ واہ واہ ! دوسرے نے جھومتے ہوئے کہا۔

اسے گولی مارو ان بادشاہوں کو۔ آخر ان کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اگر ضرورت ہی تو پھر ان کو آدمیت سکھاؤ۔ تیسرے نے ترنگ میں آکر کہا۔

مزید اری دیکھو۔ سالے کو خبط تھا کہ بڑی بڑی سزائیں منسوخ کر دو۔ اور اس قسم کا قانون بنانا چاہتا تھا۔ کوئی پوچھے سے سزائیں منسوخ کر کے کیا قتل عام۔ چوری چکاری کی کھلے عام اجازت دینا چاہتا ہے۔ تصویر کا دوسرا رخ دیکھو تو خود سالا جیلوں میں قیدیوں سے بے انتہا

محنت و مشقت لیتا تھا اسے یاد وہ بڑا پالیسی باز تھا۔ ان کو جیسے سے وہ ہمیں موہ لینا چاہتا تھا۔ چوتھا بولا جس کی تصدیق باقیوں نے

اسی اثنا میں پندرہ منٹ پھر گذر گئے۔ بادشاہ ان کی گالیوں کے سلسلے سے اکتا گیا۔ وہ جلدی سے جیل کی طرف گیا۔ وہ وقت خوش تھا کہ اس نے بڑی سزاؤں کی منسوخی کا قانون نافذ نہیں۔ وہ پھانسی پانے والے قیدیوں کا صحیح جائزہ لے سکتا تھا۔ لہذا فوراً اسی حصہ میں گیا جہاں پھانسی پانے والے مقتول تھے۔ ایک کوٹھڑی میں ایک زرد رو شخص گھٹنوں پر جھکا کچھ لکھ رہا تھا۔ بادشاہ اسے ایک مرتبہ بھی دیکھ چکا تھا۔ دفعتاً جیلر مع بادشاہ کے ایک مشیر کے ساتھ کوٹھڑی میں داخل ہوا۔ قیدی نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ اور کہا۔

" آگئے تم لوگ۔ میری سزائے موت کا حکم سنانے۔ مجھے دیدی جائیگی۔" قیدی پر ایک کمزوری سی غالب ہونے لگی لیکن پھر وہ اور بولا۔ مگر کل پر منحصر کیا۔ میں ہر وقت تیار ہوں۔ موت سے نہیں مگر میرا ایک کام کر دو۔ یہ خط میری بیوی تک پہنچا دو۔ میں مشکور رہوں گا

" بادشاہ کا انتقال ہو گیا ہے" مشیر نے رنجیدہ لہجہ میں تمہارے لئے یہ خبر خوشی کا باعث ہو سکتی ہے تم مرحوم کے گناہ گار موجودہ بادشاہ نیک ہے اور کسی اور خیالات کا حامل ہے۔ ممکن ہے سزا میں تاخیر ہو جائے۔ یا موت کی سزا بدل دی جائے۔ اور کیا تعجب کہ تم رہا ہی کر دیئے جاؤ۔"

" مرگیا" قیدی نے اضطراری لہجہ میں پوچھا۔

ہاں۔ مشیر نے کچھ ایسے لہجہ میں کہا جیسے اس نے عوام کی نمائندگی کا فرض انجام دیا۔ قیدی یہ سنتے ہی کھڑا ہو گیا اور دست تاسف ملنے لگا۔ اور پھر نہایت غمگین لہجہ میں بولا۔

" جناب۔ میں اسکی عزت کرتا ہوں۔ وہ ہمارا بادشاہ جرح کے باوجود اس کا سلوک منصفانہ اور ہمدردانہ تھا۔ مجھے افسوس اس کی جوان بیوی کو اسکا داغ مفارقت اٹھانا پڑ رہا ہے۔ کاش میں جی جائے "

یہ کہتے کہتے قیدی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

بادشاہ بہت متاثر ہوا۔ معینہ وقت کا تیسرا حصہ

ھا ہر نکلا اور ایک طرف کو راہی ہوا - وہ سوچ رہا تھا۔ اس
کی یہ نسبت اسکے دشمن کو اس کی وفات کا بہت قلق ہے جن
کرتا تھا - افسوس وہ سب خود غرض اور مطلبی نکلے جن کو
ن سمجھا - اس نے اس کی وفات پر اظہار ہمدردی کیا کاش
ہا اور وہ اس دشمن کی زندگی بچانے کے لئے اپنی زندگی قربان
- وہ آج کوشاں تھا کہ رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے وہ سب
مگر آج اسے معلوم ہوا کہ اس کی تمام منبک کوششیں ان لوگوں
ریب معلوم ہوتی تھیں - یہ لوگ گندگی میں رہنے کے عادی
ندگی ہی میں پڑا رہنے دیا جائے -

ہ اس بھری دنیا میں جہاں اسے توقع تھی کہ اس کے طرف دار
وں کی تعداد میں ہونگے صرف دو انسان ملے - ایک معصوم
اور ایک اس کا دشمن قیدی - اسکی آنکھوں سے خود فریبی کا پردہ
بہتر ہے اب بلے چوں چرا اپنی زندگی قدرت کے حوالے کر دے
ضرورت نہیں - وہ اپنی موت پر قدرت کو ناممکن کے ملنے
لباب معلوم ہوا کہ اسے فریب سے نجات دلا کر اس کے ساتھ
لیا تھا -

چاند پر بادل چھا گئے - سردی بڑھتی گئی - اسکے دل و دماغ
بت تھی - اسی پر تنہائی اور مہیب تنہائی - اس کا دل ڈوبا
اسے کوئی حقیقی غمخوار نہ مل سکا - اس کی خوش فہمی کو کتنی زبردست
دی تھی - بہتر یہ ہے کہ اب میں چپ چاپ بستر پر جا لیٹوں -
ترک کر دوں - معینہ وقت کا کافی حصہ گزر چکا ہے - تھوڑے
اب کیا کر سکتا ہوں اسی ادھیڑ بن میں اس نے اپنے آپ کو
کمرہ کے سامنے کھڑا پایا -

کیا میں اندر جاؤں - میری رفیقہ حیات مجھے چاہتی ہے مگر شاید
سر اب ہو - نہیں مجھے اندر نہیں جانا چاہیئے - میں اپنے نیک
ح نہیں کرانا چاہتا - مگر .... میں نے آج تک
ت و حرارت سے ترک نہیں کیا - مجھے اندر جانا چاہیئے -

اس کی بیوی آتشداں کے قریب بیٹھی ہوئی تھی - اسکے
کے کاندھوں پر بکھرے ہوئے تھے اور اس کا چہرہ ان بالوں
میں چھپا ہوا تھا - ایسا معلوم ہوتا کہ ایک سیاہ جالی کا نقاب چہرہ پر پڑا ہے
وہ متفکر تھی - اس کی اس حالت نے بادشاہ کو بہت متاثر کیا - اور وہ
خود کو ملامت کرنے لگا میں خواہ مخواہ اس عفت مآب کو شک و شبہ سے دیکھ
رہا تھا

وہ اسکی دی ہوئی انگوٹھی پہنے ہوئے تھی جس کا ہیرا جگمگ
جگمگ کر رہا تھا - کمرہ میں اس کے علاوہ تاریکی کا راج تھا -

اسکی خواہش ہوئی کہ وہ اسے تسلی تشفی دے اسکی غمخواری کرے
نہ آخر یہ اکیلی کیوں ہے - اس کی لونڈیاں اور باندیاں گئیں - اسکو غم کھانے
کیلئے اکیلا کیوں چھوڑ دیا گیا - اسکے صدمے کیلئے اس کا شریک ہونا چاہئے
تھا - وہ اتنی کھوئی ہوئی کیوں ہیں جیسے کچھ پوچھ رہی ہو - یا کسی کی منتظر ہو
شاید وہ میری منتظر ہے وہ شاید مجھے آواز دینا چاہتی ہے مگر وہ خاموش
ہے بالکل خاموش !

اچانک ایک ہلکی سی آہٹ ہوئی جس نے اسے چونکا دیا دیوار
میں سے ایک خفیہ دروازہ نمودار ہوا - یہ کیا - اس دروازے کا علم سوائے
اس کے اور ملکہ کے کسی کو نہ تھا - پھر یہ کیا بھید ہے - دیکھتے ہی دیکھتے
دروازہ میں سے ایک آدمی باہر آیا -

ملکہ نے ہونٹوں پر انگلیاں رکھ کے اسے رازداری کی تلقین
کی اور نہایت آہستہ سے کہا - تم آگئے - میں بہت منتظر رہی - اب میں
بہت خوش ہوں - آہ وہ بھی کیا وقت تھا جب میں مرنے والے کا ہاتھ
تھامے بیٹھی تھی مجھے مجبوراً دنیا دکھاوے کو یہ کرنا پڑ رہا تھا - ورنہ
میں حقیقتاً اس وقت بہت خائف تھی - مجھے خدشہ تھا کہیں وہ بھوت
بن کر مجھے نہ چمٹ جائے مگر شکر ہے کہ وہ چلا گیا ایسی جگہ جہاں سے اب کبھی نہ آئے
گا - اب وہ ہمارے راج میں خلل انداز نہ ہوگا - ہم سکون کے ساتھ زندگی گزاریں
گے ــــــــ اس نے اپنی انگلی سے انگوٹھی اتاری اور اسکو بوسہ دیتے ہوئے
انداز معشوقانہ کیساتھ مرد کی طرف بڑھا دی -

محافظ جب بیدار ہوئے تو ان ہوں نے دیکھا کہ بادشاہ اپنی جگہ پر بدستور
لیٹا ہے - وہ اپنی غفلت پر بہت شرمندہ ہوئے مگر یکایک بادشاہ کے چہرے کے نور کیلئے
اسکے خدوخال میں نمایاں فرق ہو گیا موت کے وقت اور اسکے بعد جو سکون و اطمینان
اسکے چہرہ پر تھا وہ غائب ہو چکا تھا اب اسکے چہرہ پر مہیب کیفیت چھائی ہوئی تھی -
ملکہ بادشاہ کو اب دیکھ کر بہت غمگین ہو گی - بہتر ہے کہ بادشاہ کی لاش ملکہ کو اب نہ دکھائی جائے - محافظوں نے آپس میں مشورہ کیا ـــــــ

ارشد عظمی •

کشتی ڈال کے طوفانوں میں اشک بہانا ہے لاحاصل — ہمت ہے درکار ذراسی۔ دیکھ، نظر آتا ہے ساحل
حیلہ بہانہ کرنے والے دیکھے ہم نے ٹھوکر کھاتے — جس راہی کی نیک ہو نیت پالیتا ہے اپنی منزل
معرکے ہم نے اکثر دیکھے ہار عدو کی جیت ہماری — آج ہمیں اس معرکے میں بھی فتح و نصرت ہوگی حاصل
چھوڑ دے یہ دورنگی چالیں یک رنگ ہو کر دیکھ نظارا — خالق اور مخلوق میں کیونکر ہو سکتے ہیں پردے حائل

بزم طرب میں جھومنے والو عشرت کا منہ چومنے والو
آتے ہیں وہ حق کے سپاہی برہم کردینگے جو محفل

مشتاق راہی •

"چڑھتے سورج کی کرن"

ہائے وہ مکے کی گلیاں نجد کی وہ سرزمیں — ہے کہاں وہ ماہِ کامل چشمۂ نورِ یقیں؟
کیا ہوئے اسلام کے حیدر علیؓ کے جانشیں — پاسبانِ کیش و ملت عاشقانِ حق دیں

عظمتِ رفتہ پہ رنگِ نو چڑھانا ہے مجھے
نغمۂ توحید دنیا کو سنانا ہے مجھے

ہوگیا ہے سرد اکثر نوجوانوں کا لہو! — نہ وہ پہلی سی تمنا نہ وہ ذوقِ جستجو
نغمۂ عیش و طرب ہے، اور شورِ ہاؤ ہو — آگئی ہے راس شاید انکو بزمِ رنگ و بو

از سرِ نو عشق سے سینوں کو گرمائینگے ہم
قوم کے غم میں تڑپنا سب کو سکھلائینگے ہم

گلستاں ہے ویراں ویراں ہر قدم پر حزن و یاس — غنچہ غنچہ محوِ گریاں، ڈالی ڈالی ہے اداس
چھن چکا کلیوں کا جوبن، نہ ہی پھولوں میں ہے باس — طائرانِ خوش گلو پہ طاری ہے خوف و ہراس

آرہا ہے وقت گلشن میں بہاریں آئینگی
بلبلیں ڈالی پہ ڈالی نغمہ نغمہ گائیں گی

عصرِ حاضر میں نہیں ہے آدمیت کا وقار — مفلسی کا جھٹکوں پہ ہے یہاں دار و مدار
دربدر کی ٹھوکریں ہیں جیب و دامن تار تار — زندگانی سے گریزاں لمحہ لمحہ — بار بار

چڑھتے سورج کی کرن پیغام تازہ لائیگی
زندگانی عسرت و افلاس کی کٹ جائیگی

ساغر ہوشیارپوری

"چاند ستارے اپنے ہیں"

چمن برباد ہوا ، کلیوں کی ہنسی چھینی بھی گئی
ں نہ ہو ، پھر ہمت کر ، پرکیف نظارے اپنے ہیں

ں کی دل میں آگ لگا ، آداب محبت اسکو سکھا
یں کسی کی اشک بہا ، پلکوں پہ شرارے اپنے ہیں

بھی نئی ، شوخی بھی نئی ، انداز نئے ، پیغام نئے
سے نکل کر شکل دکھا ، رنگین سہارے اپنے ہیں

ں چٹک پھولوں کی مہک کانٹوں کی کسک بلبل کی چہک
ں صدا سوسن کی ادا ، نرگس کے اشارے اپنے ہیں

تصور رہنے دے ، رفعت کی تمنّا پیدا کر
وسحر ، یہ شمس وقمر ، یہ چاند ستارے اپنے ہیں

پیچ وخم ہیں کیا ، یہ شورِ تلاطم کچھ بھی نہیں
لڑا دے طوفاں سے ، خاموش کنارے اپنے ہیں

ں شان وشوکت سے مرعوب نہ ہو محکوم نہ بن
لم ، یہ جاہ وحشم ، یہ محل منارے اپنے ہیں

کے پھندے ٹوٹ گئے ، ارباب جفا کا دور گیا
نا ہرگز دل نہ دکھا ، تقدیر کے مارے اپنے ہیں

ندا صدیقی

"مناجات"

آجکل اس سرزمین پر کیوں اُداسی چھائی ہے
اتنی رنگینی پہ بھی ساری فضا مرجھائی ہے
جسکی بھی دیکھو نظر ہے جستجو کرتی ہوئی
کپکپاتی ۔ ڈگمگاتی ۔ سسکیاں بھرتی ہوئی

کیوں وطن کے سارے ارباب وطن خاموش ہیں
کیوں ہیں سناٹے میں صحرا کیوں چمن خاموش ہیں
سوچ ہی میں تھا کہ دل کی دھڑکنوں نے دی صدا
اپنے رہبر کی جدائی سے ہے یہ محشر بپا

ایسا رہبر جس کا ثانی دوسرا دیکھا نہیں
مرد حق ۔ حق آشنا اسکے سوا جچتا نہیں
جنگ باطل سے رہی ہر لمحہ اسکی عمر بھر
مغربی پیکار کے آگے رہا سینہ سپر

وہ بھلا دستور پر خاموش رہتا کیوں بھلا
جذبۂ اسلام دل میں اسکے کروٹیں لینے لگا
سنّت وقرآں کی رو سے کچھ بنا کے زاویے
رہ کے حدِ شرع میں کچھ مشورے اس نے دیئے

اس خطائے بے خطا پر پا رہا ہے وہ سزا
حق پرستوں کو دیا مطلب پرستوں نے صلا
کچھ بھی ہو اب حق پرست ایک انچ ہٹ سکتے نہیں
ان گھٹاؤں سے اجالے انکے گھٹ سکتے نہیں

حشر میں جب حق کے آگے حق و باطل آئے گا
حق پرستوں کو ستانے کا مزا مل جائے گا
ہے ضرورت قوم کو اس محفل بے نور میں
چار دروازہ نہ رہ جائے کہیں دستور میں

یا اللہ العالمین یہ ہے ندا کی التجا
فضل سے اپنے اسیروں کو تو جلدی کر رہا

مسعود جاوید •

کوثر نیازی ـــــ ایک خاکہ

اس خطا پر ملی سزائے قفس
کیوں بہاروں کے گیت گائے ہیں

جب میری نظر سے یہ شعر گزرا تو ذہن میں وہ پگڈنڈی کسی سیمابی تمثیل کی طرح چمکنے لگی جس پر چل کر ایک الھڑ، جواں سال شاعر، پنجاب کے کھلے میدانوں سے، زنداں کی تنگ و تاریک فضا تک پہنچا..... تھل، جہاں مستی، پنوں کی تلاش میں ماری ماری پھرتی رہی اور بالآخر ریت کے تودوں میں دب کر داستانِ محبت میں ایک اور باب کا اضافہ کر گئی، اسی تھل کے ایک کنارے پر میں ایک تجرباتی زیر تعمیر سڑک کے سائنسی پہلو کی نگرانی کر رہا تھا ـــ کہ ایک اور میرے ملاقات ہوئی، دو چار باتوں کے بعد ہی بغیر کسی رسمی تعارف کے اور میر کے گھنی سیاہ چمکدار داڑھی سے ڈھکے ہوئے چہرے پر شگفتگی کی لہر سی دوڑ گئی۔ اور میں سمجھ گیا کہ ان کی اور میری فکر ایک سی ہے۔ اس کے بعد اور میر نے بتایا کہ میانوالی میں اسلامی تحریک ابھی ابتدائی منزل سے گزر رہی ہے۔ اس تحریک کے کارکن ابھی منظم نہیں ہیں۔ لیکن وہ منظم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اس کے لئے گلزار احمد صاحب کی خدمات حاصل کی جانے والی ہیں۔ کچھ ہی دن بعد گلزار احمد صاحب بھیرہ سے تشریف لائے۔ انھوں نے آنے کے بعد میانوالی کی ایک مسجد میں اطرافِ اکناف کے اسلام پسند عناصر کو جمع کیا ـــ اس اجتماع میں سفید شلوار اور قمیص میں ملبوس، سولہ، سترہ سال کا ایک نوجوان بھی شامل تھا سرو قامت، مضبوط، سجیلا، سرخ و سپید، قبول صورت، ابھی مسیں پوری طرح بھیگی نہیں تھیں ـــ سبزہ خط دودِ شمع کشتہ کی طرح، عارض پر دھیرے دھیرے پاؤں آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا، میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں غضب کی چمک ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ جھجک کے شائبے بھی ہیں۔ جیسے بچپن اور جوانی دست و گریباں ہوں جب

میں نے اس جلسہ میں یونہی حلقہ ادب اسلامی کا تذکرہ کیا تو سبھی نے تائید کی مگر اس پر رانجھا قسم کے نوجوان نے شرمگیں انداز میں میری سب سے زیادہ ہمت بندھائی۔ اس سے مجھے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کچھ زیادہ دقت پیش نہ آئی کہ یہ بھی نگار ادب کا دلدادہ ہے مجھے یہ جوڑا بہت بھایا۔

بعد میں سرمد مظاہری نے بتایا کہ کوثر نیازی ایک خوش گو اور خوش آواز شاعر ہیں، اس سے میرے دل میں حلقہ ادب کے قیام کی آرزو اور بھی تیز ہو گئی۔ ایک دن میں اور سرمد مظاہری تانگے کر کوثر نیازی کے گاؤں موسیٰ خیل پہنچے۔ موسیٰ خیل کی فضا کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہاں رہ کر تو آدمی خواہ مخواہ بھی شاعر ہو جاتا ہو گا۔ پکی سڑک کے ساتھ ساتھ ایک نالہ، نالہ کی دوسری طرف دامنِ کہسار میں مٹی کے گھروں کا ایک چھوٹا سا گاؤں، جس کے چاروں طرف گیہوں اور چنے کے سبز لہلہاتے کھیت، جب میں نے اس ماحول کی تعریف کی تو سرمد مظاہری نے بتایا..... تلوک چند محروم اور ان کے بیٹے جگن ناتھ آزاد بھی ایسے ہی ماحول کی پیداوار ہیں۔ موسیٰ خیل سے کچھ دور ایک قصبہ عیسیٰ خیل ہے، ان شاعروں کا مرز بوم ہے۔

اس دن کوثر نیازی سے کھل کر گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ انھوں نے ہماری تواضع ابلے ہوئے انڈوں اور چار سے سردی کا موسم اور اس قدر گرم چیزیں لطف دے گئیں! کوثر نیازی اشعار میں زبان و فن کی لغزشوں کے باوجود ایک شگفتہ زندگی دھڑکنیں اور کسی پہاڑی ندی کا سا جوش تھا۔ مجھے سب سے زیا

ں اس بات سے ہوئی کہ ان کے انداز میں دوشیزگی ہے۔ اس اچھوتے پن
ھ کر مجھے محسوس ہوا کہ ان کی شاعری کا مستقبل تابناک ہو سکتا ہے۔
۔ اس نئے پن کی وجہ ایک بلند مقصد کی لگن ہے جو بہت کم شاعروں
پائی جاتی ہے۔ ان کے اشعار اور گفتگو سے اندازہ ہوا کہ 'کل'
کو سنوار لینے کی آرزو ان میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے اسی آرزو
ں نے انھیں اس اٹھتی جوانی میں تحریکِ اسلامی سے وابستہ کر دیا ہے

دینِ اسلام کو اس دیس میں لانے کیلئے
ولولے روح کو سیماب بنا دیتے ہیں (کوثر)

اس ملاقات کے کچھ ہی دن بعد میانوالی میں حلقۂ ادبِ اسلامی
م ہو گیا۔ ہر پندرھویں روز ٹاؤن ہال میں میانوالی کے نوجوان دلدادگان
ب جمع ہونے لگے۔ کوثر نیازی ناظم کے فرائض انجام دینے کے لئے
ھڑکی آگ سینہ میں دبائے چبھتی ہوئی سردیوں میں سویرے چاد
ٹے بائیسکل پر بارہ میل کا سفر کر کے میانوالی آتے رہے اور اس طرح
ر نیازی کی فکر ڈھلتی گئی۔ اور ان میں فن کا شعور بیدار ہوتا گیا

ایک دفعہ طے پایا کہ ایک ادبی محفل موسیٰ خیل کے کوہساروں
ں منعقد ہونی چاہیئے۔ موسیٰ خیل کے پہاڑوں میں ایک قدرتی ہی
ریح گاہ ہے۔ بل کھاتی ہوئی پہاڑی کے درمیان میں ایک بل کھاتا
ا چشمہ بہتا ہے یہ چشمہ پہاڑ کے قلب میں داخل ہوتے پر ہی دکھائی
یتا ہے۔ کیونکہ اس کے دونوں طرف چٹانوں کی بلند دیواریں کھڑی
ں ان پہاڑوں سے بے شمار سوتے پھوٹتے ہیں جو جمع ہو کر چشمہ رواں
صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ سوتے اپنے ساتھ گندھک کے مرکبات
تیز چبھتی ہوئی بو لاتے ہیں۔ اور فضا میں بکھیر دیتے ہیں۔ اس چشمہ رواں
روک کر ایک جھیل سی بنا دی گئی ہے۔ اسی جھیل کے سنگ بستہ بند
محفلِ مشاعرہ منعقد ہوئی۔ مجھے آج تک شام کے جھٹپٹے میں جھیل
ے اس سنگ بستہ بند پر کوثر نیازی کا لہک لہک کر نظمیں سنانا
ہیں بھولتا۔

میانوالی میں میری یہ آخری محفل تھی اس کے بعد مجبوراً مجھے
یانوالی کو خیرباد کہہ کر لاہور چلے آنا پڑا۔ اس تمام رفاقت کے
دوران میں کوثر نیازی کے فن اور فکر میں جو تدریجی نکھار آتا گیا' اسے

دیکھنے کا موقع ملا۔ ایک بات جو مجھے بغیر کسی شک کے محسوس ہوئی
وہ یہ کہ ان میں بے انتہا تخلیقی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ اور اس کے
ساتھ ساتھ اپنے ماحول سے غربت' بے کسی' بیماری اور ظلم کو مٹانے
کی آرزو'

نظامِ کہنہ کی قدروں کا خاتمہ سمجھو
ہمارے ہاتھ میں تیشے بھی ہیں قلم بھی ہیں
(کوثر)

ابھی تک وہ اتنے اچھے نہیں تھے

ان کی شاعری میں ان کے مزاج کی طرح الھڑپن پایا جاتا تھا بعض اوقات
مجھے یہ چیز بے طرح کھلتی تھی اور میں ان کی توجہ بے تکلفی کے ساتھ اس
طرف منعطف کرا دیتا۔ کیونکہ میں اس بات کو کبھی گوارا نہیں کر سکتا
کہ کوئی شخص ادب کا نام لے کر ادب کا منہ چڑائے۔ بعد میں مجھے
پھر خیال ہوتا کہ کہیں میں کوثر نیازی کے ساتھ زیادتی تو نہیں کر رہا
ہوں۔ ان کی ابھی عمر ہی کیا ہے۔ اور پھر ایک پٹھان زادے کو شاعری
سے کیا واسطہ؟ اردو زبان اور شاعری کی روایات سے انہیں کیا
تعلق؟ لیکن وہ خندہ پیشانی سے میری تنقید برداشت کر لیتے۔ اور
کبھی کبھی بچوں کی طرح اپنے صحیح ہونے پر اصرار بھی کرتے

میرے لاہور چلے آنے کے بعد کوثر نیازی نے لکھا کہ میانوالی
کا حلقۂ ادبِ اسلامی آہستہ آہستہ کمھلا کر مرجھا گیا۔ اور پھر اسی زمانے
کی بات ہے کہ انھیں یومِ پاکستان کے کسی مشاعرہ میں شرکت کے لئے
ڈیرہ اسماعیل خاں بلایا گیا۔ وہاں انھوں نے صبحِ آزادی کو شب
گزیدہ قرار دیا اس موضوع پر اپنی پرجوش نظموں اور خوش الحانی
سے مشاعرہ میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی۔ انہیں بار بار
پڑھوایا گیا۔ یہ بات اقتدار کے ماتھے پر بل لائے بغیر نہ رہ سکی انھیں
بچہ سمجھ کر دھمکایا گیا کہ وہ اس قسم کی باغیانہ نظمیں نہ لکھیں۔ اس
کے بعد انھیں اپنے گاؤں کے مکتب سے علیحدہ کر دیا گیا۔ جہاں وہ
وقت گزارنے کے لئے تدریس کا کام کر رہے تھے غالباً اسی موقع پر
انھوں نے کہا تھا۔ ؎ مجھ کو منظور ہے افلاس میں جاں دے دینا
ابنِ آدم کی رداؤں کا مگر میں شاہی!

اس کے بعد وہ سخت تنہائی محسوس کرنے لگے ــــ اور ایک دن اچانک لاہور چلے گئے ۔ مجھے یہ سن کر تعجب ہوا کہ وہ پہلی مرتبہ لاہور گئے ہیں ۔ مودودی صاحب اور نعیم صاحب سے مل کر انتہائی خوش نظر آتے تھے ۔ موسیٰ خیل واپس جانے کے بعد انھوں نے لکھا کہ ان کے لئے اب

صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

اس لئے وہ کراچی جا رہے ہیں ...... لیکن شاید انھیں کراچی کی فضا پسند نہ آئی ۔ میانوالی کے کھلے میدان، کہسار اور ریگزار انھیں یہاں کیونکر رہنے دیتے چنانچہ وہ جماعت کے سالانہ اجتماع کے بعد گلزار احمد صاحب کے ساتھ واپس میانوالی آ گئے ۔

پنجاب میں انتخابات کی آمد آمد تھی پنجاب کے میدان تحریکِ اسلامی کے کارکنوں کو بادیہ پیمائی کی دعوت دے رہے تھے ۔ کوثر نیازی سے کیسے نچلا بیٹھا جا سکتا تھا ۔ انہوں نے قریہ قریہ پھر کر اپنی نظموں کے ذریعہ اسلامی قدروں کو پھیلانے کی کوشش کی ۔ انسانیت کے دشمنوں کو اور ابھارا ، بیکسی کے احساس کو اور بیدار کیا ۔ اور موجودہ دوان آمادہ نظام کی بیدردی کے ساتھ دھجیاں بکھیریں ۔

انتخابی کشمکش کے خاتمہ پر ان کی فعالیت انہیں لاہور کھینچ لائی اور وہ ادارہ کوثر میں شامل ہو گئے ، میں اس زمانہ میں راولپنڈی میں تھا ۔ انھوں نے اپنے نئے صحافتی عزائم اور امنگوں سے مجھے مطلع کیا ۔ انہیں میں نے اپنے قلمی تعاون کا یقین دلایا لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ ان کی شعریت کہیں آباد شاہ پوری کی ہی شاعری کی طرح اخبار کے پلندوں میں نہ دب کر رہ جائے چنانچہ میں نے کوثر کے لئے جو مضمون " اردو کے موجودہ اسلام پسند شعراء پر ایک نظر " لکھا تو اس میں اس خدشہ کو ظاہر کیا ہے ۔ لیکن کوثر نیازی لب کوثر زیادہ دن ٹھیر نہ سکے اور " چراغ راہ " کی لَو کو اونچا کرنے کے لئے نعیم صاحب کی رفاقت اختیار کر لی ۔ اس زمانہ میں انھوں نے بعض اچھی نظمیں اور غزلیں لکھی ہیں ۔ " مقبرے " اسی زمانہ کی نظم ہے یہ اس لحاظ سے بہتر ہے کہ اس میں کوثر نیازی کا ذہن نکھر آیا ہے ۔ ؎

میں نے تو عہد کیا ہے کہ ہر اک باطل سے
زیست کے آخری لمحے میں بھی لڑنا ہے مجھے
اور اسلام کو دنیا میں نگینے کی طرح
زندگانی کے ہر اک فعل میں جڑنا ہے مجھے
اپنے اس عہد کے ہوتے ہوئے کیسے دیکھوں
یہ غریبوں کی تمناؤں کے خوش رنگ مزار
عہد شاہی کے مظالم کے یہ عینی شاہد
پادشاہوں کی رعونت کے مثالی شاہکار

("مقبرے" کے دو بند)

لیکن اس سارے عرصہ میں کوثر نیازی نے نظم میں کو[ئی] قابل لحاظ ترقی نہیں کی ۔ ان میں ابھی تک وہی الھڑپن پایا [جاتا] ہے ۔ وہ کسی نہ کسی طرح جوش و جذبہ کو اپنے عزائم سے ہم آہ[نگ] کر کے نظم میں سمو دیتے ہیں ۔ اس کی نوک پلک سدھارنے کی زیادہ کوشش نہیں کرتے ۔ لیکن ان کی غزل میں روز بروز [گہرائی] اور گہرائی پیدا ہوتی گئی ۔ غزل میں انھوں نے غیر معمولی ترقی کا [ثبوت] دیا ہے اب مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے اگرچہ یہ ان کے سا[تھ] زیادتی ہوگی کہ وہ صرف غزل کے لئے موزوں ہیں ۔

میرے راولپنڈی کے قیام کے دوران میں میرے د[ل کی] دھڑکنیں ایک اور دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو گئی تھیں [۔] اس کی خبر کوثر صاحب کو بھی ہو گئی تھی اسی زمانے میں جب "چرا[غ راہ]" میں ان کی غزل کا یہ شعر پڑھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ میر[ے] سامنے کھڑے مسکرا رہے ہیں ۔ شعر یہ ہے ۔

عشق میں پار اترنے کی امیدیں باطل !
یہ وہ دریا ہے کہ جس کا نہیں ساحل اے دوست

...... اسی غزل کے یہ دو شعر بھی خوب ہیں ؎

ہر وہ لمحہ ہے مرا کفر میں شامل اے دوست
دل تری یاد سے جس میں رہا غافل اے دوست
بڑھ گئی اور بھی مجبوریٔ قلب مضطر
خوب ہے تیری توجہ کا یہ حاصل اے دوست

یہ اشعار اور "چراغ راہ" کی اشاعت خاص کی غزل کے
بار سے

ساقیا، چھیڑ نہ آغازِ وفا کی باتیں
مجھ کو بیتے ہوئے ایّام کی یاد آتی ہے
ہم نشینو، مجھے بتلاؤ یہ آزار ہے کیا
ہر گھڑی ایک حسیں نام کی یاد آتی ہے

سے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کوثر صاحب بھی کسی آگ میں جل
ہیں۔ اس دھیمی دھیمی آگ کی لپٹیں کبھی کبھی ان کے خطوط میں
دس ہوتی تھیں۔

اسی زمانہ میں کوثر صاحب نے لکھا کہ وہ اسلامی شاعروں
ب کلام کا مجموعہ شاعروں کی مختصر سوانح کے ساتھ "ادارہ
راہ" کے توسط سے شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ انھوں
سے بھی منظومات اور حالاتِ زندگی طلب کیں۔ اس زمانہ
ں کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے ایک تازہ نظم کہی تھی۔ اسے
بدیا، کوثر صاحب نے لکھا کہ یہ نظم انھیں ذاتی طور پر بے حد پسند
ہ اس کو انتخاب میں شامل نہیں کر سکتے کیونکہ اس میں کوئی
سلامی نہیں ہے۔ مجھے جب ان کا یہ خط ملا تو سخت غصہ آیا
نے ارادہ کیا کہ ذرا کوثر صاحب کو اسلامی ادب کا مفہوم
ؤں۔ چنانچہ ایک تفصیلی خط لکھا۔ پہلے تو میں نے ان سے دریافت
وہ "اسلامی ادب" کا انتخاب شائع کر رہے ہیں یا "ادبِ
اسلامی" کا انتخاب؟ اور پھر یہ کہ ان کے ہاں ادبِ اسلامی
ر کیا ہے؟ جو اشعار میں نے اسلامی ادب کے تصوّر کی
ت میں اس وقت نقل کئے تھے ان میں میر کا یہ شعر بھی تھا

پتہ پتہ، بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

لکھا تھا کہ میں اس شعر کو اسلامی سمجھتا ہوں۔ لیکن وہ اس بحث
یل نہیں ہوئے میرے اس تفصیلی خط کے جواب میں انھوں
کہ وہ میری نظم کو غیر اسلامی تو نہیں سمجھتے۔ لیکن اس میں
بت نہیں ہے، اس لئے شامل نہیں کر سکتے۔ بجائے اس

نظم کے انھوں نے میری مطبوعہ غزلوں میں سے کوئی اور غزل منتخب
کر لی ہے۔ لیکن میری خلش دور نہیں ہوئی۔ ارادہ تھا کہ ان سے
دوبدو گفتگو کروں۔ انہیں کئی دفعہ راولپنڈی آنے کی دعوت بھی
دی۔ لیکن وہ اپنی مصروفیت کے باعث نہ آسکے کیونکہ وہ اس وقت
میں ضلع شیخوپورہ کی جماعت کے ناظم کے فرائض انجام دے رہے
تھے۔ اسی زمانہ میں عبدالقادر حسن صاحب بھی دارالعروبہ کی فضا
سے گھبرا کر لاہور آگئے تھے۔ وہ بھی مجھے بار بار لاہور آنے کی
دعوت دے رہے تھے۔ میں لاہور جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ
اچانک مجھے راولپنڈی سے کراچی منتقل ہونا پڑا۔ کراچی آتے ہوئے
لاہور میں دو تین دن مقیم رہا۔ عبدالقادر حسن صاحب اور میں مل
کر کوثر صاحب کے لئے گوالمنڈی گئے۔ ان سے مل کر خوشی بھی ہوئی
اور تعجب بھی...... تعجب اس لئے کہ وہ اب بالکل بدل گئے تھے
چہرہ پر گھنی سیاہ داڑھی اگ آئی تھی، آنکھوں پر چشمہ لگا ہوا
تھا، سیاہ شیروانی زیب تن کئے ہوئے تھے۔ ان میں اب وہ ہی
اطریق نہیں رہا تھا اور نہ آنکھوں میں جھجک کے شائبے تھے۔ رسمی
گفتگو کے بعد جب میں نے اسلامی ادب کا قصہ چھیڑا تو کہنے لگے۔
"میں اور آپ اتنے دن ساتھ ساتھ کام کرتے رہے ہیں لیکن
اب تک آپ مجھے سمجھے نہیں حالانکہ اسلامی ادب کا تصوّر میرے
ہاں بھی وہی ہے جو آپ کے ہاں ہے۔ لیکن کلام کے انتخاب کا
مسئلہ اس سے مختلف ہے کیونکہ اس میں اور کی مرضی بھی تو شامل
ہے!"

اس وضاحت کے بعد اس مسئلہ پر بحث کی گنجائش ہی
نہیں رہی۔ پھر چار کی بھاپ میں دل کی باتیں ہونے لگیں۔ انھوں نے
بتایا کہ وہ عنقریب ازدواجی رشتہ میں منسلک ہو رہے ہیں۔ ان
کا خیال تھا کہ زلف وشرہ کے سایوں میں راہِ جنوں طے کرنا آسان
ہو جائے گا۔ اگرچہ مجھے اس سے اتفاق نہیں تھا۔ اور مجھے اس
وقت خیال بھی ہوا کہ ان سے کہہ دوں کہ وہ شادی نہ کریں....
کیونکہ کسی تحریک کے کارکن کو اس قدر جلد شادی نہیں کرنا
چاہیئے۔ موجودہ حالات میں شادی سے فعالیت میں کمی ناگزیر

ہے لیکن اس خیال سے کہ وہ دل شکستہ نہ ہوں کچھ نہیں کہا،
البتہ بعد میں عبدالقادر حسن صاحب سے اس موضوع پر گفتگو رہی۔
میرے لاہور کے قیام کے دوران میں احباب نے دو محفلیں منعقد
کیں ایک کا اہتمام عبدالقادر حسن صاحب نے بیڈن روڈ کی ایک
ہوٹل میں کیا تھا اور دوسری کا انتظام مصطفیٰ صادق صاحب نے
جماعت اسلامی لاہور کے دفتر میں ـــ ان دونوں محفلوں میں
کوثر صاحب کا کلام سننے کا موقع ملا ـــ ان کا یہ شعر کئی دن
تک میں گنگناتا رہا۔ ـ

ان کی زلفیں بکھری ہوں گی
اے لوگو، یہ رات نہیں ہے

اسی محفل میں اصرار پر مجھے یہ شعر سنانا پڑا تھا ـ

مترنم، حسین، سیمابی
دھانی آنچل ہے یا پھریرا ہے

اس شعر کو میری ایک اور غزل کے شعر

سبز پرچم کے تلے پاک زمین کے اوپر
آہ بت خانے کی تعمیر میں کیسے دیکھوں

سے ملا کر احباب نے سبز پرچم کو دھانی آنچل کے مترادف قرار
دینے کی شوخیانہ سعی کی تھی۔

میرے کراچی آنے کے بعد پنجاب میں فصلِ گل آئی ... اور
فصلِ گل کے ساتھ ساتھ پنجاب خونِ شہیداں سے لالہ زار ہو گیا۔
کوثر نیازی صاحب اپنے بیسیوں رفیقوں کے ساتھ زنداں کے حوالے
کر دئے گئے۔ لیکن مجھے اس خبر سے کچھ زیادہ افسوس نہیں ہوا ....
کیونکہ کوثر صاحب کے اس شعر سے مجھے بھی اتفاق ہے۔ ـ

وہ قید جو رہِ حق میں کسی کو آ جائے
وہ قید اصلِ حریت ہے قید و بند نہیں

لیکن جب عبدالقادر حسن صاحب کراچی آئے تو انھوں نے بتایا
کہ کوثر صاحب کی شادی ہو چکی تھی اور اس کے ایک ہفتہ بعد ہی
جدائی کے صدمے سہنے کے لئے وہ سلاخوں کے پیچھے کر دئے گئے
ہیں ـــ میرے دل پر ایک چوٹ سی لگی .... لیکن میں نے شیخ
عبدالقادر حسن صاحب سے کہا۔
"اچھا ہے شاعری میں اور نکھار آئے گا۔"
مگر اب میں سوچتا ہوں کہ اس آشفتہ سری کا کیا ہو گا

جب کسی نے مجھے پکارا ہے
میں یہ سمجھا کہ آپ آئے ہیں

اعتذار

ایک نظم بعنوان "قائدِ اعظم کے حضور میں"
خدمت کی تھی جس کا ایک مصرع شاید یہ بھی ہو
"مثلِ نجمِ سحر انساں کی جبیں دمکے گی"
مجھے ایک دوست نے بتایا کہ یہ مصرع کسی اور شاعر کا ہے۔لہٰذا
اسے اس طرح تبدیل کر دیں عین نوازش ہو گی۔
"غم کے مارے ہوئے انساں کی جبیں دمکے گی"
قارئین حضرات تصحیح فرما لیں۔

رحمٰن شاد

ضروری گذارش

خریداران رسالہ "مشیر" کی خدمت میں
التماس ہے کہ خط و کتابت کرتے وقت اپنا
خریداری نمبر لکھنا نہ بھولیں، تاکہ تعمیلِ
ارشاد میں تاخیر کا امکان نہ ہو۔

"منیجر رسالہ مشیر"

سچی کہانی بقیہ ص۱۵

جو خود دوسروں کا محتاج ہے تم دونوں کو ایک سبق دیا ہے سمجھائی
ہے یہ کہا اور تیزی کے ساتھ رضیہ کے کمرے سے نکل گئی رضیہ
سکتہ اور حیرت و استعجاب کے طوفان میں ڈوبی ہوئی خاموش بیٹھی
بیٹھی رہ گئی۔

دوسرے دن جس وقت ربیعہ ایروپلین میں سوار ہو رہی تھی
کے ایک ملازم نے ایک سربمہر لفافہ لاکر اسے دیا ربیعہ نے اسے اپنی
کی جیب میں رکھ لیا۔ چند منٹ میں ایروپلین روانہ ہو گیا اب
میجر خالد شانہ سے شانہ ملائے۔ زمین سے ہزاروں فٹ
سینکڑوں میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بسیط میں اُڑے جا رہے
ربیعہ نے جیب سے وہ لفافہ نکالا۔ کھول کر ایک نظر ڈالی مسکرائی
کاغذ خالد کی طرف بڑھا دیا۔ خالد نے پڑھا اور فرطِ مسرت سے
بے ہو کر بے اختیار چلا اٹھا۔
He is a wonderful fellow
ایک عجیب و غریب انسان ہے" یہ کاغذ ربیعہ کا طلاق نامہ تھا۔
(بشکریہ جامِ نو)

پتلون جیت گئی بقیہ ص۳۸
" یہ تو ٹھیک ہے" نجمہ بولی "لیکن اس میں انسان "ملا" معلوم ہوتا

" آخر آپ کون سا لباس خوشنما خیال کرتی ہیں"
" انگریزی کٹنگ کا کوٹ اور سلوٹوں پتلون - اور یہ وہ لباس
ہیں سے مرد خوشنما اور حسین معلوم ہوتا ہے انگریزوں کو دیکھیے پتلون میں
س قدر چھیلے اور بانکے معلوم ہوتے ہیں"
"لیکن محترمہ انگریز تو مر چکا"
"اسے مرنے دیجیے۔ اس کی یہ حسین یادگار تو زندہ ہے"
"لیکن میں تو شادی کے مسئلہ پر آپ سے تبادلۂ خیالات کے لیے
حاضر ہوا ہوں"
"لیکن کیا آپ پتلون نہیں پہن سکتے میں اپنے رفیقِ حیات کو بالکل
انگریز دیکھنا چاہتی ہوں"
" نجمہ صاحبہ میں مجبور ہوں۔ میں اپنے ملکی لباس پر اتنا ہی فخر کرتا ہوں
جتنا انگریز اپنے ملکی لباس پر۔ میرے نزدیک یہ اچکن اور یہ شلوار میری مشرقی
معاشرت کا ایک خوبصورت جزو ہے"
" تو پھر معاف کیجیے شریف صاحب! آپ کا وقت ضائع ہوا۔
میں آپ سے شادی کے موضوع پر گفت و شنید کیلئے تیار نہیں ہوں" چھ
مہینے کے بعد نجمہ کی شادی ایک کوٹ پتلون والے بابو سے ہو گئی۔ اور
نتیجہ یہ نکلا کہ پتلون جیت گئی اور انسان ہار گیا۔
(بشکریہ حرم)

انشاء اللہ بقیہ ص۴۲
تھی کہ میرا چہرہ کسی کے ذوقِ جمال کی تسکین کا باعث نہیں بنا میرے
گھنگھروؤں کی صدا کسی کے کانوں سے نہیں ٹکرائی۔ میں کتنی خوش قسمت
ہوں، نہ مجھے جہالت کی حقارت سے پالا پڑا، نہ نئے تقاضے میری
نسائیت کو ذلیل کر سکے۔ مجھے وہ اطمینان حاصل ہے جو آج کل بہت
کم کو میسر ہے۔
میں خوش ہوں، میری روح خوش ہے۔ میرا ضمیر مطمئن
ہے۔ میرے گرد و پیش میں سکون ہے میں اپنے آپ میں سرخرو ہوں
اور اسی طرح اپنے رب کے حضور میں سرخرو حاضر ہوں گی انشاء اللہ
(بشکریہ چراغِ راہ)

ادب کو
شریفانہ زندگی کا آئینہ دار
بنائیے فحاشی ہماری معاشرت
کا فطری جزو نہیں ہے!

حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی کے سرپرستوں اور کرمفرماؤں سے

گزشتہ پانچ سال سے یہ ہماری انتہائی کوشش رہی ہے کہ مفردات اور دوسری خام اشیار کی قیمتو
مسلسل اضافہ کے باوجود ہم اپنی دواؤں کی قیمتوں میں کوئی اضافہ نہ کریں اور ہمارے کرم فرما شاہد ہیں کہ گز
دو تین سال کے تجارتی عدم توازن اور اس سے پیداشدہ خام اشیار اور مفردات کی گرانی بھی ہمارے ا
کو متزلزل نہ کر سکی، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ یونانی ادویہ کا استعمال زیادہ تر اوسط طبقہ کے لوگ اور غریب ع
کرتے ہیں اور اس کساد بازاری کے زمانہ میں اس طبقہ کے کندھوں پر طبّی امداد کے سلسلے میں کسی مزید بوجھ کا
مناسب نہ ہوگا، گزشتہ پانچ سال سے ہم اسی اصول اور طریق کار پر عمل کرتے رہے ہیں۔ مگر سال رواں میں
مفردات اور خام اشیار کی نایابی اور ان کی اچانک اور غیر معمولی گرانی نے ہمارے لئے ایسی شدید اور ناقابل
مشکلات اور تکالیف پیدا کر دی ہیں کہ ہم اپنی دواؤں کی قیمتوں پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ ہم اپنی دوا
میں جو اضافہ کر رہے ہیں ہمیں اس کا بیحد افسوس اور رنج ہے ہم چاہتے تھے کہ حاذق دواخانہ اپنی سابقہ روایات
مطابق اس باب میں بھی ممتاز رہتا لیکن اس دور کے حالات نے ہمیں اپنی دواؤں کی قیمتوں میں اضافہ کر
مجبور کر دیا ہے اس لئے ہم اپنے کرمفرماؤں اور سرپرستوں سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ قیمتوں میں اس عارضی او
اضافے کو بخوشی برداشت کر لیں گے جس وقت تجارتی حالات سازگار ہو گئے ہم اس وقت اپنی قیمتوں کو اسی
پر لے آئیں گے جو گزشتہ پانچ سال سے ہم قائم رکھے ہوئے تھے۔ حاذق دواخانہ کی عارضی فہرست حسب ذیل
اس سے پہلے کی شائع شدہ فہرستیں اور قیمتیں منسوخ سمجھی جائیں ×

مینیجر حاذق دواخانہ بندر روڈ کر

سلورین پلز (حب خاص)

ائے رئیسہ کی جملہ کمزوریوں کے لئے مجرب دوا ہے یہ گولیاں
نظام کے ہر نقص کو درست کرنے میں بیحد مفید اور زود اثر ثابت
ہیں کثرت جماع سے پیدا شدہ عصبی کمزوریوں کو رفع کرنے میں
لرہیں۔ ایسے حضرات جن کو وقت پر شرمندگی اٹھانی پڑتی تھی ان
کے شرمندۂ احسان ہیں۔ بعد از مباشرت دودھ کے ہمراہ ایک
ولی کا استعمال خرچ شدہ قوت کو بحال کر دیتا ہے ہر عمر اور ہر موسم
ابل استعمال ہے ؕ

ت: چالیس گولی برائے بیس یوم، پانچ روپے دس آنے



ہضمی

یہ ایک مسلم امر ہے کہ جسم انسانی کی صحت کا دار و مدار زیادہ تر
معدہ کے فعل ہضم کی درستی پر ہے۔ بقول شاعر ؎

الٰہی زمن معدہ من مرنجان — دگر ہرچہ رنجید، رنجیدہ باشد

یہ اکسیری دوا پیٹ کے درد، قبض، ضعف ہضم، تخمہ، متلی اور
اپھارہ کے لئے بیحد مفید ہے سچی بھوک لگاتی ہے ہر گھر میں اس کا موجود
رہنا رحمت ثابت ہوگا ؕ

قیمت: دو اونس شیشی، ایک روپیہ آٹھ آنے



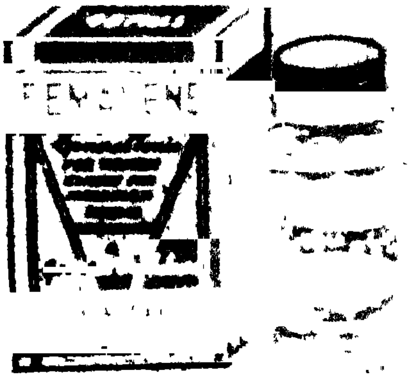


ذق نروائن پلز (حب خاص)

نرل ٹانک ہے جو عصبی اور دل و دماغ کی کمزوریوں کا مجرب علاج
یہ گولیاں دماغی کام کرنیوالے حضرات یعنی وکیل بیرسٹر، پروفیسر اور
علم اصحاب کے واسطے آب حیات کا کام دیتی ہیں اور جسم انسانی کی
عصبی کمزوریوں کو بحال کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں، دواخانہ
کے خاص مجربات میں سے ہیں ؕ

قیمت: ۴۰ گولی برائے ۲۰ یوم چار روپے بارہ آنے

فیمیلن (نسائی خاص)



یہ گولیاں عورتوں کی جملہ پوشیدہ شکایتوں کو دور کرتی ہیں کہ سیلان ماہواری کی بیقاعدگی اور اسی قسم کی دوسری زنانہ شکایتوں سے پیدا شدہ جملہ نقائص کو دور کرنے میں لاثانی ہیں۔ استقرار حمل میں مدد دیتی ہیں گویا عورتوں کے لئے ایک جنرل ٹانک ہے جس کا متواتر استعمال عورتوں کے نظام عصبی کو درست کرتا ہے جن عورتوں کو اسقاط حمل کی بار بار شکایت ہوتی ہو ان کے لئے بے حد مفید ہیں

قیمت: مکمل کورس ۴۰ گولی برائے ۲۰ یوم، تین روپے چھ آنے

چسٹاکیئر

یہ دوا پرانی کھانسی اور پھیپھڑوں کے جملہ امراض کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے پھیپھڑوں کو طاقت دیتی ہے، زکام، نزلہ اور کھانسی کے مریضوں کے لئے بیحد مفید ہے پھیپھڑوں سے خون آنا، ابتدائی سل اور بلغمی کھانسی کے واسطے نہایت مجرب دوا ہے۔ جن خاندانوں میں مرض سل موروثی ہو انکے نوجوانوں کے لئے اس دوا کا مستقل استعمال ان کو اس موذی مرض سے محفوظ رکھتا ہے ۔

قیمت ۴ اونس برائے ۲۰ یوم تین روپے

حاذق ہسٹریا پلز



یہ گولیاں خالص وکمیاب جڑی بوٹیوں سے جدید طبی اصولوں پر تیار کی ہوئی ہیں عورتوں کی مشہور بیماری ہسٹریا (اختناق الرحم) بچوں کی مرگی (ام الصبیان) کیلئے لاثانی دوا ہے اسکے علاوہ عام کمزوری، سوء ہضم، اختلاج قلب (دل کی دھڑکن) کیلئے بھی بہت مفید ہے دواخانہ ہذا کی ایسی بے نظیر ترکیب ہے جس پر طب یونانی جتنا بھی فخر کرے بجا ہے ۔ قیمت: ۴۰ گولی پانچ روپے پانچ آنے

برنین ـــــــ دماغی

دماغی کام کرنے والوں کے لئے بیحد مفید ہے دماغ کو روشن اور شگفتہ کرتی ہے قوت حافظہ کو تقویت پہنچاتی ہے مفرح اور مقوی ہے، بڑھاپے میں صحت کا سہارا ہے × قیمت ۱۴ اونس برائے ۲۰ یوم چار روپے ۲ آنے

حاذق ہیر ٹانک آئیل

جدید ترین کیمیاوی اصولوں پر سو فیصدی نباتاتی تیلوں سے تیار شدہ اور روزمرہ کے استعمال کے لئے یہ ایک بہترین ہیر آئل ہے۔ یہ سر کے گرتے بالوں کو روکتا اور ان کو لمبا اور چمکدار بناتا ہے بالوں کو قبل از وقت سفید ہونے سے روکتا ہے دماغی کمزوری کا موثر علاج ہے بالوں اور دماغ سے متعلقہ جملہ شکایات کے رفع کرنے کے لئے ایک نایاب تحفہ ہے بازاری خوشبودار تیلوں کی جگہ اس کا مستقل استعمال اکثر دماغ اور سر کے امراض سے محفوظ رکھتا ہے × قیمت : فی شیشی چار اونس ایک روپیہ بارہ آنے

طلا پاک (مقوی ممسک)

دواخانہ ہذا کا انمول اور خاص تحفہ ہے یہ حیرت انگیز، جادو اثر اور کامیاب طلاء ہے جس کا استعمال نہایت سہل اور قطعی بے ضرر و خوشگوار ہے اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ استعمال کے بعد رگوں اور پٹھوں میں جذب ہو کر ایک نئی زندگی پیدا کر دیتا ہے چونکہ جدید کیمیاوی طریقوں پر بنایا گیا ہے اس لئے کسی پٹی یا بندش کی ضرورت نہیں، پورے کورس کا استعمال خفیہ رگوں اور پٹھوں کی جملہ خرابیوں کو مکمل طور پر دور کر کے وہ خاص قوت پیدا کر دیتا ہے جو مرد کو مرد بنانے کے لئے ضروری ہے سرعت کے مریضوں کے لئے اس کا استعمال مستقل فائدہ دیتا ہے سلوائن طلا زروائن پلز کے ہمراہ اس کا استعمال کرنے پر سہاگہ کا کام دیتا ہے × قیمت مکمل کورس برائے ایک ماہ پانچ روپے، نصف کورس ۱۵ یوم کیلئے دو روپے بارہ آنے

حاذق کورس

نشاط زندگی یا لطف شباب، جوانی کی امنگیں یا مسرت کی لہریں جسم انسانی کی ایک ہی کیفیت کے چند مختلف نام ہیں یہ کیفیت بدن میں اس وقت پائی جاتی ہے جب جوہر انسانی جسے عرف عام میں طاقت مردمی کہتے ہیں جسم انسانی میں اس خاص درجہ معیار تک موجود ہو جو حیات انسانی کے لئے ضروری ہے جسم انسانی میں اس قدرتی جوہر کی بدرجہ اتم موجودگی ہی کا نام صحت، شباب، جوانی اور مسرت ہے یہی قدرت کی سب سے بڑی نعمت ہے اس جوہر کی کمی خواہ وہ کسی وجہ سے ہو زندگی کی سب سے بڑی کمی ہے اور آدمی کی پژمردگی، مردہ دلی اور پست ہمتی کا سب سے بڑا سبب ہے یہ کمی زندگی کی ساری دلچسپیوں کو بیکار کر دیتی ہے ...... اس کمی کو پورا کرنے اور برقرار رکھنے کے لئے طب یونانی کی لاثانی ادویہ ناز بجا ہو "حاذق" عالی جناب امام طب حکیم سید نذر احمد صاحب سرپرست حاذق دواخانہ کراچی کے ۳۷ سالہ تجربہ کا ایک جواہر ریزہ ہے جس کا بے حد مفید ہونا مسلمہ امر ہے یہ دوا ایک مہینہ کا مکمل کورس ہے جو کہ داخلی اور خارجی استعمال کے لئے تین مختلف ادویہ پر مشتمل ہے اور ایسے لوگوں کے لئے جو جوانی کی غلط کاریوں کی وجہ سے قبل از وقت جوہر مردمی کھو بیٹھے ہوں آب حیات ہے اور عمر رسیدگی کی وجہ سے کمزوری محسوس کرنیوالوں کیلئے مجرب اور آزمودہ علاج ہے × قیمت مکمل کورس برائے ایک ماہ پندرہ روپے، نصف کورس برائے پندرہ یوم آٹھ روپے

جاری کردہ: حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی نمبر ا

فہرست دیگر یونانی مرکّبات

مندرجہ فہرست مرکبات اپنے اصلی نسخوں کے مطابق نہایت صاف ستھرے اور تازہ مفردات سے جدید طبی اصو[لوں] پر تجربہ کار دوا سازوں کی زیر نگرانی تیار ہوتے ہیں۔ طبیب اور عطار حضرات اگر مرکبات زیادہ مقدار میں منگائیں تو ان کو کاروباری رعایت دی جائے گی ۔ (منیجر حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی)

اطریفل دماغی دائمی نزلہ، زکام، قبض اور نئے یا پرانے درد سر کے لئے بے حد مفید ہے خوراک ۶ ماشہ سے ایک تولہ تک حسب ضرورت رات کو سوتے وقت نیم گرم پانی کے ساتھ کھائیں فی تولہ تین آنے

اطریفل سطوخودوس دماغ اور معدے کو فضلات سے پاک کرتا ہے درد سر اور نزلہ کے لئے مفید ہے۔ خوراک ۹ ماشہ شب کو تازہ پانی کے ہمراہ استعمال کریں۔ فی تولہ تین آنے

جوارش انارین مقوی معدہ اور جگر ہے بھوک لگاتی ہے حرارت کو تسکین دیتی ہے۔ قے اور متلی کو روکتی ہے خوراک چھ ماشہ صبح کو تازہ پانی کے ہمراہ استعمال کریں فی تولہ چار آنے

جوارش آملہ جگر اور معدہ کو قوت دیتی ہے اختلاج قلب کے لئے مفید ہے خوراک چھ ماشہ صبح یا شام پانی کے ہمراہ استعمال کریں فی تولہ چار آنے

جوارش جالینوس مقوی معدہ ہے خوراک کو ہضم کرکے خوب بھوک لگاتی ہے۔ کمزور آنتوں کو قوت دیتی ہے ریاح کو خارج کرتی ہے، گندہ دہنی اور پیشاب کی زیادتی کو روکتی ہے بالوں کو قبل از وقت سفید ہونے سے بچاتی ہے خوراک سات ماشہ غذا کے بعد تازہ پانی کے ہمراہ استعمال کریں فی تولہ چار آنے

جوارش زرعونی ذیابیطس، گردوں کی کمزوری، پیشاب کی زیادتی کے لئے مفید ہے خوراک چھ ماشہ پانی کے ہمراہ کھائیں، فی تولہ چار آنے

جوارش شاہی اختلاج قلب، ضعف معدہ و جگر [کے لئے] مفید ہے خوراک تین تین ماشہ صبح [و شام] پانی کے ہمراہ استعمال کریں فی تولہ چار آنے

جوارش عود شیریں بھوک کی کمی، متلی اور ہضم کی کمزوری کے لئے مفید ہے خوراک چھ ماشہ پانی کے ہمراہ استعمال کریں فی تولہ تین آنے

جوارش کمونی بدہضمی، اسہال کثرت ریاح اور بھوک کے لئے مفید ہے خوراک چھ ماشہ سے تولہ تک نیم گرم پانی کے ہمراہ استعمال کریں فی تولہ تین آنے

جوارش مصطگی معدے کی کمزوری، دست، پیشاب [کی زیادتی] اور رال بہنے کے لئے مفید ہے۔ خو[راک چھ] ماشہ تازہ پانی کے ہمراہ کھائیں فی تولہ چار آنے

جوہر منقے پرانے سوزاک، آتشک، گٹھیا اور پھوڑوں کے لئے مفید ہے خوراک دو چاول منقے میں پانی کے گھونٹ سے نگل لیا کریں۔ فی ماشہ ڈیڑھ روپیہ

جواہر مہرہ اعضائے رئیسہ کی کمزوری، گھبراہٹ [اور] بیماری کے بعد کا ضعف دور کرنے کیلئے خطرناک موقعہ پر قوت قائم رکھنے کیلئے عالم نزع میں کچھ دیر کے لئے [زندہ] رکھنے کیلئے اکسیر چیز ہے خوراک دو چاول سے ایک رتی تک معتدل تین ماشہ میں ملا کر استعمال کریں فی ماشہ چار روپے

حب تنکار دائمی قبض اور معدے کی گرانی کے لئے [مفید] ہے خوراک تین گولی رات کو نیم گرم پانی [سے] استعمال کریں فی درجن تین آنے

...سرخ بواسیر — بواسیر کے خون کو روکنے کے لئے مفید ہے دو یا تین گولی صبح شام ...ے پانی یا تازہ پانی سے استعمال کریں فی درجن چھ آنے

...پیچش — ہر قسم کی پیچش کے لئے اکسیری دوا ہے آنتیں صاف کرنے کے بعد ایک ایک گولی صبح و شام ...لاب کے ہمراہ استعمال کریں۔ فی گولی آٹھ آنے

...جدوار — یہ گولیاں امساک اور قوت باہ کیلئے عجیب الاثر ہیں پرانی کھانسی اور نزلہ کو دور کرتی ہیں۔ ...کی عادت ترک کرنے کیلئے ان کا استعمال مفید ہے خوراک ایک ...ب کو دودھ کے ہمراہ استعمال کریں فی گولی تین آنے

...جواہر — اعضائے رئیسہ دل و دماغ اور جگر کی کمزوری کے لئے مخصوص چیز ہے۔ بیماری کے بعد کے ضعف کا چند یومیہ استعمال رفع کر دیتا ہے۔ خوراک ایک گولی صبح ایک ...ام خمیرہ گاؤزبان جواہر والے میں یا پانی کے ہمراہ استعمال ...فی گولی تین آنے

...سرفہ — بچوں اور بڑوں کی بلغمی کھانسی، دائمی نزلہ، گلے کی خراش کے لئے مفید ہے ایک ایک گولی صبح و ...نہ میں رکھکر لعاب چوستے رہیں۔ فی درجن چار آنے

...سورنجان — کمزوری، جوڑوں کے درد، دائمی قبض کے لئے مفید ہیں دو یا تین گولیاں شب کو ...پانی کے ہمراہ استعمال کریں۔ فی درجن چھ آنے

...عنبر مومیائی — قوت مردمی کے لئے بھروسہ کی چیز ہے ہزار ہا ضعف باہ کے مریض اس سے ...اٹھا چکے ہیں دو گولیاں شب کو دودھ کے ساتھ استعمال کریں ...تین روپے

...کبد — قبض، جگر کی کمزوری، ضعف ہضم، کثرت ریاح کے لئے مفید ہیں دو تین گولیاں غذا کے بعد ...م وقت استعمال کریں۔ فی درجن تین آنے

...کتھ — آتشک، فساد خون، پھوڑے پھنسیوں اور دیگر سوداوی بیماریوں کے لئے مفید ہیں خوراک ایک گولی منہ میں رکھکر نگل لیا کریں۔ فی درجن بارہ آنے

خمیرہ ابریشم حکیم ارشد والا — مقوی اعضائے رئیسہ ہے۔ خفقان، وحشت، مالیخولیا کے لئے مفید ہے تین ماشہ سے چھ ماشہ تک استعمال کریں فی تولہ ڈیڑھ روپیہ

خمیرہ گاؤزبان عنبری جواہر والا — دل و دماغ کی کمزوری صرع یعنی مرگی اور فاسد خیالات کے لئے بیحد مفید ہے۔ تین ماشہ سے چھ ماشہ تک استعمال کریں۔ فی تولہ دس آنے

خمیرہ مروارید — خفقان گھبراہٹ، میعادی بخار، موتی جھرہ کے لئے مفید ہے تین تین ماشہ صبح و شام استعمال کریں فی تولہ دس آنے

دوائے پتھری — گردہ اور مثانہ کی پتھری کیلئے بہترین دوا ہے ایک ایک رتی صبح و شام شربت بزوری کے ہمراہ استعمال کریں۔ فی ماشہ ایک روپیہ

دوائے ڈپٹی صاحب — رقت، جریان، کمر کے درد کے لئے مفید ہے ایک رتی مکھن میں ملاکر استعمال کریں فی ماشہ آٹھ آنے

دوار الشفار — جنون، مالیخولیا، مرگی، ہسٹریا کے لئے مفید ہے خون کے دباؤ کو کم کرتی ہے خوراک دو دو قرص صبح و شام پانی کے ہمراہ استعمال کریں چالیس قرص پانچ روپے

دوائے کالی کھانسی — بچوں اور بڑوں کی کالی کھانسی کیلئے جس میں عموماً بچوں کو کھانستے کھانستے قے ہو جاتی ہے بہت مفید ہے ایک رتی سے ایک ماشہ تک عمر کے مطابق شہد میں ملاکر استعمال کریں فی تولہ ڈیڑھ روپیہ

دوار المسک معتدل جواہر والی — جگر، معدہ اور دل کی طاقت کے لئے مخصوص دوا ہے بلغمی امراض، فالج، لقوہ وغیرہ کے لئے مفید ہے۔ تین تین ماشہ صبح شام استعمال کریں فی تولہ دس آنے

روغن سماعت کشا بہرے پن کے لئے خواہ کسی وجہ سے ہو مفید ہے، چند قطرے نیم گرم رات کو کان میں ٹپکائیں۔ فی تولہ آٹھ آنے

روغن کلاں فالج، لقوہ، جوڑوں کے درد اور پٹھوں کی دوسری بیماریوں کے لئے مفید ہے نیم گرم مالش کریں۔ فی تولہ آٹھ آنے

سفوف ارسطو پرانے جریان، ابتدائے سوزاک، پیشاب کی جلن کیلئے مفید ہے تین تین ماشہ صبح و شام دودھ کی لسی کے ہمراہ استعمال کریں فی تولہ آٹھ آنے

سفوف الاملاح درد شکم، کثرت ریاح اور بدہضمی کے لئے مفید ہے۔ چار رتی جوارش کمونی میں ملاکر استعمال کریں۔ فی تولہ ڈیڑھ روپیہ

سفوف طحال تلی کے بڑھ جانے اور تلی کی سختی اور ورم کے لئے مفید ہے دو دو ماشہ غذا کے بعد تازہ پانی سے استعمال کریں۔ فی تولہ چار آنے

سفوف نمک سلیمانی درد شکم و ضعف معدہ کیلئے مفید ہے دو دو ماشہ غذا کے بعد استعمال کریں فی تولہ چار آنے

سفوف برص سفید داغوں (برص)، اور چھیپ نیز دیگر جلدی بیماریوں کے لئے مفید ہے چھ ماشہ گرم پانی میں بھگو کر صبح دلال پی لیا کریں اور پھوک سرکہ میں پیس کر لگائیں.... فی تولہ آٹھ آنے

سفوف نزلہ مرکب نزلہ زکام کھانسی درد سر اور بخار کے لئے مفید ہے ایک ماشہ سے دو ماشہ تک صبح شام نیم گرم پانی کیساتھ استعمال کریں فی تولہ بارہ آنے

سفوف سرخ ابتدائے سوزاک، پیشاب کی جلن اور خون آنے کو مفید ہے تین تین ماشہ صبح اور شام تازہ پانی کے ساتھ استعمال کریں، فی تولہ آٹھ آنے

سفوف برگ حنا گیلی تر ہو یا خشک دونوں کے لئے مفید ہے مکھن یا کھوپرے کے تیل میں ملاکر جہاں

خارش ہوتی ہو، جلد پر دن میں دو تین بار ملیں فی تولہ

سنون سرخ مسوڑھوں سے خون آنے، دانت... مفید ہے غذا کے بعد اور شب کو... مل لیا کریں۔ اور تھوڑی دیر کلی نہ کریں فی تولہ آٹھ آنے

سنون جدید دانتوں کے درد اور ہلنے کے لئے... صبح شام ملکر رال ٹپکاتے رہا کریں...

شربت فولاد جگر کی کمزوری، خون کی کمی... چھ چھ ماشہ غذا کے بعد... فی شیشی دس تولہ دو روپے آٹھ آنے

عرق سوزاک نئے اور پرانے ہر قسم کے سوزاک کی جلن اور خون آنے کو مفید... تولہ صبح و شام پانی میں ملاکر استعمال کریں فی شیشی دس تولہ...

قرص ملین درد سر، دائمی قبض، بھوک کی کمی میں ایک یا دو قرص شب کو نیم گرم... استعمال کریں۔ فی درجن پندرہ آنے

کشتہ خبث الحدید معدہ اور جگر کے بلغمی رطوبات کو... خوراک دو چاول سے ایک رتی تک جوارش جالینوس میں... کریں۔ فی تولہ دو روپیہ

کشتہ زمرد ذیابیطس، پیشاب کی کثرت... کی کمزوری، ضعف قلب، پرا... مفید ہے دو چاول سے ایک رتی تک جوارش زرعونی یا... میں ملاکر استعمال کریں فی تولہ بارہ روپے

کشتہ قلعی جریان، پرانے سوزاک، سرعت... کے لئے مفید ہے ایک رتی سے... مکھن میں ملاکر استعمال کریں فی تولہ دو روپے

کشتہ مرجان سادہ نزلہ، زکام، ضعف... مفید ہے ایک رتی... استعمال کریں۔ فی تولہ تین روپے

رجان جواہر والا | دماغ اور اعصاب کی کمزوری دھڑکن، نزلہ دائمی کے لئے
دو چاول سے ایک رتی تک خمیرہ گاؤ زبان جواہر والا یا کھن
تعمال کریں۔ فی تولہ بارہ روپے

لالہ خورد | دق اور دوسرے پرانے بخاروں کے لئے مفید ہے۔ اعضائے رئیسہ
اور جگر کو قوت دیتا ہے۔ بلغمی بیماریوں فالج، لقوہ، رعشہ
ر کرتا ہے خوراک دو چاول سے چار چاول تک خمیرہ مروارید
ک میں ملا کر استعمال کریں فی ماشہ دس روپے

فولاد | جگر کی کمزوری دور کرتا ہے خون پیدا کرتا ہے دو چاول سے ایک رتی تک جوارش جالینوس
ک میں ملا کر استعمال کریں۔ فی تولہ بارہ روپے

برک کلاں | سل دمہ اور پرانی کھانسی کے لئے مفید ہے دو چاول سے ایک رتی تک شہد
ستاں میں ملا کر استعمال کریں فی تولہ چار روپے

امیراں | دھند، جالا، رو ہوں کے لئے مفید ہے بینائی کو تیز کرتا ہے۔ شب کو سوتے وقت
ن ماشہ ڈیڑھ روپیہ

کبیر | دل و دماغ اعصاب کی قوت کے لئے مفید ہے باہ بڑھاتا ہے گردوں کو طاقت دیتا ہے۔
ی پیدائش زیادہ کرتا ہے تین ماشہ سے چھ ماشہ تک صبح شام
ہمراہ استعمال کریں۔ فی تولہ بارہ آنے

معتدل | بلغمی کھانسی، نزلہ، سینے کے درد کے لئے مفید ہے دو تولہ پانی میں جوش دے کر
۔ فی تولہ دو آنے

اذراقی | فالج، لقوہ، رعشہ کمر اور جوڑوں کے درد کے لئے مفید ہے بلغمی امراض کو دور
قوی باہ ہے ایک ماشہ سے دو ماشہ تک نیمگرم پانی کے ساتھ
کے بعد استعمال کریں۔ فی تولہ آٹھ آنے

معجون پوست سنگدانہ | ضعف معدہ اور امعاء کی وجہ سے دست آنے
کے لئے مفید ہے تین تین ماشہ صبح شام استعمال کریں فی تولہ چھ آنے

معجون حمل عنبری | سیلان الرحم، کمر کے درد، کمزوری کے لئے مفید ہے۔ جن عورتوں کو
بار بار اسقاط حمل ہوتا ہو یا بچہ ام الصبیان میں ضائع ہوتا ہو اس کے
استعمال سے حمل محفوظ رہتا ہے اور بچہ تندرست پیدا ہوتا ہے خوراک
تین تین ماشہ صبح شام اسقاط کے لئے تیسرے مہینے سے ساتویں مہینے
تک مسلسل استعمال کریں فی تولہ بارہ آنے

معجون دبیدالورد | جگر کی کمزوری، ورم استسقاء کے لئے مفید ہے۔ چھ چھ ماشہ صبح و شام
استعمال کریں۔ فی تولہ چار آنے

معجون سورنجان | کمر کے درد، جوڑوں کے درد، دائمی قبض کے لئے مفید ہے خون کے دباؤ کو کم
کرتی ہے۔ خوراک چھ ماشہ سے ایک تولہ تک شب کو نیمگرم پانی کے
ساتھ استعمال کریں۔ فی تولہ تین آنے

معجون فلاسفہ | کمر کے درد، پیشاب کی زیادتی، قوت مردمی کی کمزوری کے لئے مفید ہے خوراک
چھ ماشہ سے ایک تولہ تک دودھ یا پانی کے ہمراہ استعمال کریں۔
فی تولہ پانچ آنے

معجون عشبہ | فساد خون، پھوڑے پھنسیوں کیلئے مفید ہے خوراک چھ ماشہ سے ایک تولہ تک
نیمگرم پانی کے ساتھ استعمال کریں فی تولہ چار آنے

معجون مقوی ممسک | امساک اور قوت باہ کے لئے عجیب و غریب ہے ایک ماشہ
سے تین ماشہ تک دودھ کے ہمراہ استعمال کریں فی تولہ چھ روپے

مفرح اعظم | خفقان، گھبراہٹ، کمزوری دل و دماغ کے لئے مفید ہے بھوک بڑھاتی ہے۔ وبائی
امراض کے زمانہ میں اس کا استعمال حفظ ماتقدم کیلئے بہتر ہوتا ہے

کریں۔ فی تولہ بارہ روپے

ماء اللحم حاذقی خاص الخاص طب یونانی مایہ ناز مقوی مفرح چیز ہے۔ دوا اور غذا دونوں فوائد کی حامل ہے۔ خون کی کمی، پٹھوں کی کمزوری، ضعف قلب و دماغ، جگر کے فعل کی سستی، بھوک نہ لگنے کے لئے اکسیر چیز ہے۔ مردانہ قوت کے ضعف کو جلد دور کرتا ہے چند روزہ استعمال تازہ اور صاف خون کثرت سے پیدا کرتا ہے چہرہ پر شباب کی سی تر و تازگی پیدا ہو جاتی ہے پانچ پانچ تولہ صبح و شام نیم گرم پانی کے ساتھ اور حسب ضرورت پیا کریں۔ فی بوتل چھ روپے

نوشدار و لولوی جگر اور معدہ کے لئے مفید ہے۔ مقوی قلب ہے ہضم میں مدد دیتی ہے خون تین تین ماشہ صبح و شام استعمال کریں۔ فی تولہ ایک روپیہ

... تین تین ماشہ صبح و شام پانی کیساتھ استعمال کریں۔ فی تولہ ایک روپیہ

سفوف مصفی جدید پھوڑے پھنسی خارش کے لئے بیحد مفید ہے۔ خون صاف کرتی ہے بہترین مصفی خون ہے ایک ایک ماشہ صبح و شام نیم گرم پانی کے ساتھ استعمال کریں فی تولہ چار آنے

مرہم حاذقی پھوڑے پھنسی، خارش و دیگر جلدی امراض کے لئے مجرب اور مفید دوا ہے ہر قسم کی خشک اور تر کھجلی جلد دور ہو جاتی ہے۔ دن میں دو بار مل لیا کریں فی شیشی ایک روپیہ

مالتی بسنت معدہ اور آنتوں کی کمزوری کے سبب دست آنے اور پرانی پیچش کے لئے مخصوص دوا ہے دو چاول سے ایک رتی تک معجون پوست سنگدانہ یا دہی میں ملا کر استعمال


Asmar
The Tonic Fruit Drink
REFRESHING
INVIGORATING
Excellent
with
SODA WATER
OR HOT OR
COLD WATER
IDEAL FRUIT TONIC
Asmar
REFRESHING & INVIGORATING
DELICIOUS
(NON ALCOHOLIC)
DILUTE TO TASTE WITH SODA
WATER OR COLD OR HOT WATER
HAZIQ DAWAKHANA
ALWAYS DRINK
Asmar
اثمار
پھلوں کا
فرحت بخش اور مقوی
شربت۔ سوڈا واٹر یا ٹھنڈے
پانی میں استعمال کیجئے
حاذق دواخانہ۔ بندر روڈ کراچی
HAZIQ DAWAKHANA KARACHI

Monthly "MUSHIR" Karachi.

مفرح فولادی

خون دماغ رگ پٹھے اور ہاضمہ کیلئے بہترین مقوی

7 FEB

"مفرح فولادی" صحیح معنوں میں قوت بخش اور صحت قائم رکھنے والی دوا ہے۔ جس کے استعمال سے تمام اعضاء رگ و پٹھے مضبوط ہو جاتے ہیں اور بدن میں نیا خون پیدا ہوتا ہے۔

"مفرح فولادی" کا استعمال جسم انسانی میں وہ ضروری اجزا پہونچاتا ہے جو صحت کیلئے ضروری ہیں اور جنکے بغیر تندرستی قائم نہیں رہ سکتی اور نہ انسان کافی محنت اور مشقت کر سکتا ہے۔

"مفرح فولادی" کا استعمال خون پیدا کرتا ہے رگ پٹھوں اور ہڈیوں کو مضبوط بناتا ہے اور جسم انسانی میں نئی روح پیدا کرتا ہے۔

مفرح فولادی" مندرجہ ذیل حالتوں میں نہایت مفید اور مجرب ثابت ہوئی ہے:- کمی خون ۔کمزوری سستی۔ غشی۔ سر کا چکرانا۔ فساد خون۔ نزلہ زکام۔ ضعف معدہ۔ کمی خوراک زچگی کی کمزوری۔ رگوں کی کمزوری۔ دل کی گھبراہٹ۔ رعشہ۔ نیند کا نہ آنا اور بیماری کے بعد کی کمزوری کے دور کرنے کیلئے مفید ہے۔ مفرح فولادی کے ان فوائد کو دیکھتے ہوئے آجکل محنتی اور دماغی کام کرنیوالے اسکو برابر استعمال کر کے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

"مفرح فولادی" شربت کی صورت میں خوش ذائقہ مرکب ہے جو علاوہ قوت دینے اور [illegible] کے اگر کھانا کھانے سے آدھ گھنٹہ پہلے کھایا جاوے تو خوب بھوک لگتی ہے اور کھانا شکم سیر کھایا جاتا ہے اور اگر کھانے کے بعد [illegible] تو کھانا خوب ہضم ہو کر جزو بدن بنجاتا ہے، خوراک:- کھانے کا ایک چمچہ دن میں تین یا چار دفعہ استعمال کریں چودہ برس کم عمر کے بچوں کیلئے نصف مقدار اور سات برس سے کم کیلئے چوتھائی مقدار

[illegible] بندر روڈ، کراچی نمبر ۱ پاکستان

قیمت فی شیشی -/۱۲/۲



اسلامی قانون کے تین ستون!

کسی ملک میں اسلامی قانون جاری ہونے کے لئے ضروری ہے کہ قانون کے ماہر تین باتوں کو ملحوظ رکھیں۔ اوّل روح دوم حکمت سوم غایت ۔ روح یا اسپرٹ کا مطلب یہ ہے کہ جن اُمور میں اسلام نے سکوت کیا ہو۔ ان کی تشکیل اور ترتیب اس طریقہ سے عمل میں آئے کہ اس کا انسانی فطرت سے تصادم نہ ہو بلکہ وہ فطرت اور نفسیات کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوں اور جو جسمانی طبائع کا عکس ہوں۔ حکمت سے مُراد ہو کہ ان میں زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے کی پُوری صلاحیت ہو اور وہ ہر دور کا آسانی سے ساتھ دے سکیں۔ کیونکہ جو قانون وقت کی دھاروں کا ساتھ نہ دے گا وہ انسانی معاشرہ پر اثرانداز نہ ہو سکے گا۔ اور زمانہ کی روح اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دے گی۔ غایت کا مطلب یہ ہو کہ کوئی قانون بے نتیجہ نہ ہو اور اسے عمل میں لانے سے کوئی چیز مانع نہ ہو سکے۔ بالفاظ دیگر قانون کو ایسا ہونا چاہیئے جو مقصد کی طرف رہنمائی کرے اور قانون برائے قانون کی حد تک محدود نہ ہو، کیونکہ قانون ایک ذریعہ ہے مقصد نہیں ہے۔ لہٰذا قانون کو مقصدی ہونا چاہیئے جو نظامِ حیات کو بھی مقصدی بنا دے!

جس قانون میں یہ تینوں باتیں ہوں گی وہ اسلامی روح کا حامل ہوگا اور ہم اسے عالمگیر اور آفاقی قرار دے سکیں گے۔ (بشکریہ ندائے حرم)

پاکیزہ اور صالح ادب کا علمبردار

مشیر

ٹیلی فون ۷۹۲۳

فہرست ـــــــ مارچ ۵۷ء

بدل اشتراک :- پاکستان ، سالانہ ، تین روپے
فی پرچہ چھ آنے
بھارت ، سالانہ ، ساڑھے چار روپے
فی پرچہ ، آٹھ آنے

جلد :- ۵
شمارہ :- ۳

مرتبہ :- عبدالغفور بیگ

کاتب : عابد سعیدہ

طابع و ناشر : عبدالغفور بیگ ۔ مطبوعہ مشہور پریس کراچی ۔ مقام اشاعت : بندر روڈ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

6 MAR 195

اگر قائدِ اعظم زندہ ہوتے!

پاکستان کی سرکاری زبان کے متعلق قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح نے فرمایا تھا کہ اگر پاکستان کی کوئی سرکاری زبان ہوسکتی ہے تو وہ اردو ہوگی۔ ان کا یہ
تنا واضح اور صاف تھا کہ اس کے متعلق دو رائے نہیں ہوسکتیں۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ پاکستان کے دونوں خطوں کو جن کے درمیان ہزاروں میل کا فا
متحد رکھنے کے لئے کسی ایک ہی زبان کو سرکاری زبان کی حیثیت دیدینا نہایت مفید ثابت ہوگا۔ اور یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ملک کے تمام
ں مختلف زبانوں میں سے اگر سرکاری زبان کی حیثیت دیے جانے کی مستحق کوئی زبان ہوسکتی ہے تو وہ اردو ہی ہے۔ اس کے باوجود مشرقی پاکستان سے
ٹھائی گئی ہے کہ اردو کے ساتھ ساتھ بنگالی کو بھی سرکاری زبان کی حیثیت دیکر ملک کے لئے دو سرکاری زبانیں مقرر کی جائیں۔ ہمارے وزیر اعظم مسٹر محمد علی
شرقی پاکستان کے اس مطالبہ کی پرزور حمایت کی ہے۔ مگر مغربی پاکستان کی طرف سے اس مطالبہ کی بڑی شدت کے ساتھ مخالفت کی جارہی ہے۔ مغربی
ی طرف سے کہا جا رہا ہے کہ اگر قائد اعظم زندہ ہوتے تو وہ اپنے اعلان پر ثابت قدمی سے جمے رہتے۔ اور صرف اردو ہی کو پاکستان کی سرکاری زبان ہونے
صل ہوتا۔ یہ بالکل صحیح ہے مگر ہم نہایت ادب سے پوچھتے ہیں کہ قائد اعظم کی وفات کے بعد پاکستان میں جو جو انقلابات رونما ہوئے ہیں۔ اور جن جن
رجحانات نے پرورش پائی ہے اگر قائد اعظم زندہ ہوتے تو یہ سب کچھ رونما ہوسکتا تھا؟ کیا قائد اعظم کی موجودگی میں قائد ملت لیاقت علی خاں یوں سرِ
اجلاس میں شہید کر دیئے جاتے تو باوجود سرکاری کمیشنوں اور سرکاری انکوائریوں کے انعقاد کے ان کو شہید کرانے والے مجرموں کا کوئی سراغ نہ ملتا؟ کیا
ظم کی زندگی میں کسی مرکزی وزارت کا محض شخصی مفاد کی خاطر بہ یک بینی و دوگوش برطرف ہوجانے کا احتمال تھا۔ کیا ہمارے موجودہ وزیر اعظم مسٹر محمد علی
نان کا وزیر اعظم بن جانے کے کہیں ذرہ برابر بھی امکانات تھے؟ کیا اگر اس وقت قائد اعظم زندہ ہوتے تو وہ لوگ جو کبھی بھی قائد اعظم کی زندگی میں ان کے
ثابت نہ ہوسکے۔ آج مرکزی اور صوبائی وزارتوں کی گدیوں پر تشریف فرما نظر آتے؟ کیا جمہوریت پسند قائد اعظم کی زندگی میں پولیس افسروں اور آئی،
یس کے عہدیداروں کو گورنری اور وزارت عظمٰی کے عہدے سونپے جانے کا کوئی احتمال تھا؟ اگر قائد اعظم زندہ ہوتے تو کیا چند اقتدار پرست ختم نبوت
متبرک تحریک کو اپنے سیاسی مفاد کی خاطر استعمال کرکے ملک میں اتنا بڑا انتشار پیدا کرا سکتے تھے جو گذشتہ سال پیدا کیا گیا تھا؟ اور کیا اس کے نتیجہ کے طور
بل لا ر نافذ کرکے اس بربریت کو روا رکھا جاسکتا تھا جو اس کے دوران میں اہل پنجاب اور خاص کر لاہور کے شہریوں کے ساتھ روا رکھی گئی تھی؟ اور کیا
ل لا رکی آڑ لیکر جس طرح پنجاب میں مخالف سیاسی جماعتوں اور ان کے قائدین کو کچلا گیا ہے قائد اعظم کے زندہ ہوتے ہوئے آمرانہ طور پر اس طرح کچلا جا
تھا؟ کیا قائد اعظم کے زندہ ہوتے ہوتے رائے عامہ کے اس قدر دباؤ کے باوجود پنجاب کے ہزاروں افراد اور علمائے دین مارشل لا کی عدالتوں کی سزا اور
نٹی ایکٹ کی وجہ سے جیل کی کال کوٹھڑیوں میں مقید رہ سکتے تھے؟ اور کیا انہیں اعلٰے۔۔۔۔ عدالتوں میں براہ راست اپیل کرنے کے حق سے محروم رکھا
رکھا جاسکتا تھا؟ بڑے تلخ سوالات ہیں یہ —— اور شاید ان کی تلخی ہمارے بعض دوستوں کو ناگوار گزرے۔ مگر ہیں ٹھنڈے دل کے ساتھ غور طلب ا
دراصل قائد اعظم کی ذات پاکستان کے لئے ایک ایسے محور کی حیثیت رکھتی تھی جس کے آزادمنش واختیین بظاہر تو اس کے ساتھ بڑی عقیدت رکھتے ہوں
تحت الشعور میں اپنی آزاد منشی اور اس کی املاک کے من مانے تصرف میں اسے حائل پاتے ہوں اور اس کے وفات پاتے ہی وہ بظاہر تو بڑی رنجیدگی کا اظہار

کریں۔ مشرقی بنگال میں اطمینان کا سانس لیں۔ کہ اب موروثی املاک کے حصے بخرے کر کے آزادی سے اسے صرف کرنے کے مواقع حاصل ہوں گے ـــــ

قائد اعظم کی وفات کے بعد ملک کی سیاسی زندگی کے دریا میں اس کے جانشینوں نے جو آمریت کا شگاف پیدا کر دیا تھا۔ اگر بروقت اس کی روک تھام کسی ذریعے سے کر دی جاتی تو گذشتہ پانچ سال میں جن مصائب اور مشکلات کا سامنا عوام کو کرنا پڑا ہے نہ کرنا پڑتا۔ اور نہ ہی آج سرکاری زبان کے مسئلہ کو ایجیٹیشن سٹنٹ کے طور پر اردو کے مقابلے میں بنگالی کو سرکاری زبان بنانے کا نعرہ بلند کرنے کی جرأت ہوتی۔ آج جب سیاسی زندگی ہر طرح کے اندیشوں کی وجہ سے بالکل غیر اطمینان بخش اور بے یقینی سی ہو گئی ہے تو حفظ ما تقدم کے طور پر بنگال کے مسلمانوں نے بھی اردو کے ساتھ ساتھ بنگالی کو بھی سرکاری زبان تسلیم کرانے کی مہم شروع کر دی ہے جس کا ساتھ محض اپنے سیاسی تحفظ کے لئے ہمارے بنگالی وزیر اعظم کو بھی دینا پڑ رہا ہے۔ اگر آج ملک کی سیاسی راہ نمائی اور اقتدار کی باگ ڈور کسی ایسے شخص یا گروہ کے ہاتھوں۔۔۔ ہوتی جن کی امانت و دیانت اور سیاسی ایمانداری اور سوجھ بوجھ پر ملک کے دونوں حصوں کے عوام کو پورا پورا بھروسا اور اعتماد ہوتا تو ہمارا خیال ہے سرکاری زبان کے مسئلہ پر کسی اختلاف رائے کے نمودار ہونے کا کوئی امکان نہ ہوتا۔

پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے گذشتہ اجلاس کے موقع پر ہمیں چند سنجیدہ اور سمجھدار بنگالی اراکین اسمبلی سے زبان کے مسئلہ پر تبادلۂ خیالات کرنے کا موقع ملا۔ اور اس مسئلہ پر گفتگو کے دوران میں جو چیز بڑی شدت کے ساتھ ابھر کر سامنے آئی وہ یہی اندیشہ تھا کہ ملک کی سیاست اور برسر اقتدار سیاست دانوں کے موجودہ رجحانات کے پیش نظر اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ اگر صرف اردو ہی کو سرکاری زبان قرار دے دیا گیا تو بنگال کے مسلمانوں کو جو اردو سے قطعاً نابلد ہیں ملک کی سیاسی زندگی سے پھینک باہر نکال دیا جائے گا۔ وہ اس زبان سے نابلد ہونے کی وجہ سے سرکاری ملازمتوں سے محروم کر دیے جائیں گے اور ملک کی سیاسی زندگی میں حصہ لینے سے محروم کر دئے جائیں گے۔ اگر جذبات سے الگ ہو کر ملک کی گذشتہ پانچ سالہ سیاسی فضا کو پیش نظر رکھ کر سوچا جائے تو یہ اندیشے بے بنیاد نہیں ہیں۔ ہمارے سیاست دانوں نے گذشتہ چند سالوں میں اپنی نجی اور سیاسی زندگیوں میں جس طرح عملی طور پر صوبائی تعصب کو ہوا دی ہے۔ اس کے نتیجے کے طور پر بھی ان اندیشوں کا پیدا ہونا ضروری تھا۔ ہمارے اکثر قائدین نے اپنی خود غرضانہ پالیسیوں کی وجہ سے وہ اعتماد جو قائد اعظم کی زندگی میں پاکستان کے مختلف صوبوں کے باشندوں کو باہم حاصل تھا درہم برہم کر دیا ہے۔ اب اس باہمی منافرت کو اس طرح حل نہیں کیا جا سکتا کہ ایک طرف اگر مشرقی پاکستان سے بنگالی کو سرکاری زبان تسلیم کرانے کے حق میں نعرے بلند کئے جائیں تو دوسری طرف مغربی پاکستان سے بنگالی کے خلاف اور اردو کے حق میں شور و غوغا بپا کیا جائے۔ جب تک اس اختلاف کی اصل بنیاد کو جڑوں سے اکھاڑا نہ جائے گا۔ اس نوعیت کے ہزاروں اختلافات سیاسی زندگی میں قدم قدم پر ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ پاکستان کی ترقی اور فلاح و بہبودی میں حائل ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔

جب تک ایسے خود غرض اور نااہل افراد کے ہاتھوں سے جو قائد اعظم کی وفات کے بعد اپنی چالاکیوں اور سیاسی چال بازیوں کے ذریعہ اقتدار کی کرسیوں پر قابض ہو گئے ہیں اقتدار کی باگ ڈور نہ چھین لی جائے اور ان کی جگہ دیانت دار اور قابل بھروسا افراد کے ہاتھوں ملک کے اقتدار کی باگ ڈور نہ دیدی جائے ملک میں اعتماد اور بھروسہ پیدا ہونا مشکل ہے۔ اور ملک کے سیاسی مسائل سلجھنے کی بجائے اور الجھتے جائیں گے۔ انتشار بڑھے گا، مشکلات بڑھیں گے۔ اور عوام کے مصائب میں اضافہ ہوگا۔ اس کا واحد حل اب یہی رہ گیا ہے کہ ملک کے دستور کو جلد از جلد اسلامی اقدار پر مرتب کرانے کی مہم کو تیز تر کر دیا جائے۔ دستور کے مرتب ہونے کے بعد اس کے مطابق سارے ملک میں نئے سرے سے انتخابات کرائے جائیں جن میں ایسے افراد کو برسر اقتدار لانے کی کوشش کی جائے جو صرف سیاسی سوجھ بوجھ ہی نہ رکھتے ہوں بلکہ ایماندار اور قابل اعتماد بھی ہوں۔ اس وقت اگر جزوی باتوں پر اسی طرح ملک کے دونوں حصے لڑتے جھگڑتے رہے تو انتشار اور بڑھے گا جو ملک و ملت کے لئے کسی طرح بھی مفید ثابت نہ ہوگا ـــــ وما علینا الا البلاغ +

نعیم صدیقی

ہمیں کیسا ادب مطلوب ہے

ہم ایک ایسی قوم ہیں جو اپنی زندگی کی تعمیر نو کا کام شروع کر رہی ہے
ہ تعمیر ریاست اور ایک زیر تشکیل معاشرہ ہیں اس حالت میں...
سامنے جتنی اہمیت کے ساتھ یہ سوال آگیا ہے کہ ہم اپنی سیاسی...
پنے معاشی، اقتصادی نظام، اپنے قانون اور اپنی تعلیم کو کن مقاصد
ادوں پر استوار کریں؛ اتنی ہی اہمیت کے ساتھ یہ مسئلہ بھی ہمارے
نا چاہیئے کہ ہم اپنے ادب، اپنے لٹریچر یا اپنے جہان فکر و تخیل اور اپنی
عر و افسانہ کو کس نقشے پر تعمیر کریں، ادب اگر زندگی ہی کا ایک لازمہ
وہ زندگی کے ہنگاموں میں کوئی بڑا پارٹ ادا کرنے والی طاقت ہے
معاشرہ کو متاثر کرتا ہے تو یہ حماقت ہوگی کہ ہم اپنے ادب کی تعمیر کے
طرح کاوش نہ کریں جس طرح ہم سیاسی اور معاشی نظم کے بارے
تے ہیں۔

ادب کا پارٹ زندگی میں!

سوال یہ ہے کہ ادب ہماری زندگی، تہذیبی و سماجی زندگی میں کیا پارٹ
؟ زندگی کو ادب کی ضرورت کیا ہے؟ ادب کس تقاضے کو پورا کرنے
یں آیا ہے؟ آیا ادب کسی قوم کی دولت میں اضافہ کرتا ہے؟ اس کی
ت کو بڑھاتا ہے؟ اس کے بین الاقوامی وقار کو مضبوط کرتا ہے؟ ــــ وہ
ہے؟

وہ ان سب خدمات سے بڑی ایک خدمت انجام دیتا ہے۔
یہ ایک حقیقت ہے کہ انسانی زندگی میں جتنی مختلف طاقتیں پائی جاتی
ں سب سے بڑی اور زور دار طاقت خیال کی طاقت ہے خیالات ہی
اصل سرمایۂ حیات ہوتے ہیں۔ خیالات کے سوتے اگر جاری
زندگی پیہم ارتقا کرتی چلی جاتی ہے خیالات جب سڑ جاتے ہیں تو
دگی جذام میں مبتلا ہو جاتی ہے اور خیالات جب بوسیدہ ہو جاتے
گی پر فالج گر جاتا ہے۔ خیالات میں جب کوئی قوم مفلس ہو جاتی

ہے تو اسے معاشی خزانے بھی خوش حال نہیں بنا سکتے۔ اور خیالات کے محاذ
پر جس معاشرے نے شکست کھائی ہو اسے پھر عساکر اور اسلحہ فاتح نہیں بنا سکتے
اور جو ملک افلاس تخیل کی وجہ سے دوسروں سے افکار کی بھیک مانگنے پر
اتر آئے، پھر کسی بازار سے اس کے لیے حقیقی استقلال خرید کر نہیں دیا جا سکتا۔

دنیا میں انسان نے جتنی تمدن گری کی ہے، جتنی ایجادات
کی ہیں، جتنی سیاسی نظمیں پیدا کی ہیں، پیداآوری کے جتنے اسباب فراہم
کیے ہیں ترقی کے جو ذرائع و وسائل حاصل کیے ہیں، جتنی جنگیں لڑی ہیں جتنے
انقلاب اٹھائے ہیں۔ ان کے پیچھے خیال ہی تھا جو شعبدے دکھا رہا ہے۔
ہندوستان اور چین میں، مصر اور دمشق میں، بابل اور نینوا میں، ایران اور عرب میں
یونان اور روما میں، اور آج یورپ اور امریکہ اور روس میں انسانی تہذیب نے
جو جو بھی قدم جادۂ ارتقا پر بڑھایا ہے، خیال ہی کی کمان میں بڑھایا ہے۔ جب
ایک ترقی کرتی ہوئی قوم کے خیالات کی قوت جواب دیتی ہیں تو آگے بڑھتے...
بڑھتے رک جاتی ہے، اس پر بڑھاپا طاری ہو جاتا ہے اور بالآخر اس کی تہذیبی
موت واقع ہو جاتی ہے، اور اس طرح جب ایک مردہ قوم کے اندر خیال کروٹ
لیتا ہے اور اس میں بالیدگی آنے لگتی ہے تو وہ قوم اپنی پچھلی صفوں سے اٹھ کر
آگے آجاتی ہے، وہ قبر سے نکلتی ہے اور کشمکش ارتقا کے دنگل میں برابر نظر آتی
ہے۔ ہماری پوری تاریخ درحقیقت ہمارے خیالات کی بنائی ہوئی ہے۔

ادب خیال انگیز اور خیالات افروز قوت ہے۔ وہ معاشرے کی
کھیتی میں خیالات کے بیج ڈالتا ہے اور پھر ان کی آبیاری کرتا ہے، وہ خیال کے
جمود کو توڑتا ہے اور حرکت پیدا کرتا ہے۔ وحی الٰہی کے بعد اگر کوئی دوسرا ذریعہ
انسانیت کو خیالات سے مالامال رکھنے کا ہے تو وہ ادب ہے، ادب خیالات
کو ابھارتا ہے؛ اچھے خیالات کو بھی ابھارتا ہے، برے خیالات کو بھی ابھارتا ہے
وہ پرانے خیالات کو بھی زندہ رکھتا ہے اور نئے خیالات کو بھی زندہ رکھتا ہے
اور نئے خیالات کی تخلیق بھی کرتا ہے، پھر وہ متضاد خیالات کو ٹکراتا ہے

تحواد پیدا کرتا ہے اور ان کی زندگی پر اثر انداز ہونے والی قوت میں بدلتا ہے

ادب کا دوسرا کام انسانی جذبات کو متحرک کرنا ہے ہمارے جذبات ہماری اجتماعی زندگی میں وہی پارٹ ادا کرتے ہیں جو مشینری کے لیے اسٹیم اور برقی قوت کا ہے۔ یہ ہماری ساری سرگرمیوں کے اندر قوتِ محرکہ...... MOTIVE FORCE کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ جس معاشرے کے افراد کے جذبات میں جمود آجائے اس کے حوصلوں پر اوس پڑ جاتی ہے۔ جذبات اگر سرد پڑ جائیں تو پھر زندگی کے خون کو گرم کرنے والی اور کوئی طاقت نہیں ہے۔ ایک قوم جذبات کی ضرورت مند جتنی کہ میدانِ جنگ میں ہوتی ہے اتنی ہی اپنی اسمبلیوں، دفتروں، کارخانوں، کھیتوں اور منڈیوں میں بھی ہوتی ہے۔ کوئی قربانی اگر ایک معاشرہ افراد کر لے سکتا ہے، کوئی ڈسپلن اگر وہ ان پر عائد کر سکتا ہے، کوئی تعاون اگر ان سے وہ حاصل کر سکتا ہے، کوئی اپیل اگر ان کے لیے موثر بنا سکتا ہے تو محض اچھے جذبات کی موجودگی میں بنا سکتا ہے جس قوم کے جذبات میں سستی آگئی ہو، اس کے افراد کو دشمن کی گولیوں کے سامنے کھڑا کرنا تو کجا ان کو سبھی بھیڑ بھڑ سے کی جگہ پر لگانے پر بھی آمادہ نہیں کیا جا سکتا۔

اور ادب جذبات کو تحریک دلانے میں اوّل درجے کی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ انسانی جذبات کو حساس بناتا ہے، ان میں اکساہٹ پیدا کرتا ہے اور ان کے لیے ظہور کے راستے بناتا ہے بے جا نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ ادب کا مزاج استدلالی نہیں، جذباتی ہوتا ہے اس کا ضمیر جذباتیت سے اٹھتا ہے۔ اگر اسے استدلال بھی کرنا ہوتا ہے تو وہ جذبات ہی کے پیرائے میں کرتا ہے چنانچہ غیر حساس اور غیر جذباتی لوگ کبھی ادیب نہیں بن سکے ادب کی دنیا میں داخلہ کا پاسپورٹ بھی فطرت اس شخص کو دیتی ہے جو حساس جذبات سے آراستہ ہو۔ ادیب اور ادب کا بنیادی فرض یہ ہے کہ وہ انسانیت کو جذبہ ہائے بلند سے مالامال کرے۔

تیسرا کام جو زندگی کے لیے ادب کرتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ اس کی شاہراہِ ارتقاء کے دونوں کناروں پر اخلاقی قدروں کے چراغ روشن کرتا ہے۔ اخلاقی قدروں کے یہ چراغ اگر کسی معاشرہ میں گل ہو جائیں تو پھر سارے آسمانی چاند سورج اور ستارے مل کر بھی دل و دماغ کی ظلمتوں کا ازالہ نہیں کر سکتے۔ انسان کی اجتماعی زندگی کا ایوان آفتاب و ماہتاب کی شعاعوں سے روشن نہیں ہوتا بلکہ وہ اعلیٰ اخلاقی قدروں سے روشن ہوتا ہے اخلاقی قدریں زندگی کے تن بدن میں ہارمون پیدا کرنے والے غدود کی حیثیت سے کام کرتی ہیں، یہ غدود اگر ناکارہ ہو جائیں تو پھر زندگی کی ساری ہم... ختم ہو جاتی ہے۔ یہ اخلاقی قدریں سماج کے لیے گویا زندگی افروز چراغ ہیں

وہ ادب ہی ہے جو اخلاقی قدروں کے چراغ جلاتا ہے اور چراغوں میں ہزاروں ادیب اپنے قطرہ ہائے خونِ جگر نچوڑتے رہتے ہیں ان چراغوں کو جلائے رکھیں۔

اب یہ واضح ہو گیا ہے کہ ادب انسانی خیالات، جذبات اور قدروں کو زندہ رکھنے اور بنانے بگاڑنے والی عظیم الشان طاقت ہے۔

کیا ایسی طاقت کو بغیر کسی منصوبے کے اس کے حال پر چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ جیسے چاہے ارتقا کرے اور جو شکل چاہے اختیار کرے یقیناً نہیں! کیونکہ ادب خیالات، جذبات اور اخلاقی قدروں کے بنانے میں جتنا بڑا پارٹ ادا کر سکتا ہے، اتنا ہی بڑا پارٹ وہ ان کو تباہ کرنے میں بھی ادا کر سکتا ہے۔ لہٰذا ایک زندہ اور حساس قوم کیلئے ناگزیر ہے کہ وہ اپنے ادب کے بارے میں سوچے۔ اس کے لیے کوئی منصوبۂ تعمیر پیش نظر رکھے اور اس کیلئے ارتقا تجویز کرے۔

کسی ادب کی قدر و قیمت کا اصل پیمانہ ہی یہ ہے کہ وہ کس قدر خیال آفریں ہے۔ وہ افکار کو کتنی بالیدگی دیتا ہے، وہ تخیل کیلئے کس قدر محرک بنتا ہے ——— اور پھر وہ اعلیٰ اور پاکیزہ انسانی جذبات کو کتنی شدت سے متحرک کرتا ہے، اور انسانیت کی بنیادی اخلاقی قدروں کی آبیاری کا فن ادا کرتا ہے یا نہیں!

ادب کی تین شاہراہیں

اگر دنیا بھر کے سرمایۂ ادب کو زمان و مکاں کی لکیروں سے بے نیاز کر کے سامنے رکھیں تو ہم اس کا ایک طائرانہ جائزہ لیتے ہوئے دیکھیں گے کہ تین بڑی شاہراہیں ہیں جن پر انسانی ادب کے قافلے حرکت کرتے آتے ہیں۔ ان شاہراہوں کے ساتھ کچھ پگڈنڈیاں بھی ہیں، لیکن وہ مستقل حیثیت نہیں رکھتیں بنیادی طور پر ادب کے اسکول تین ہیں:

ایک اسکول لذتیت کا اسکول ہے۔ یہ خیالات سے کھیلا

بات انسانی کو ذریعہ تفریح بناتا ہے۔ یہ رومانس کے غبارے اڑا تفریح کا سامان پیدا کرتا ہے، یہ جمالیت کا پرستار ہے اس کو زندگی صلاح و فساد سے کوئی واسطہ نہیں، اس کو خیر و شر کی کشمکش سے کوئی نہیں بلکہ الٹا وہ اسی کشمکش سے انسان کو فرار سکھاتا ہے اور اسکے خیالات کا ایک قہوہ خانہ، جذبات کا ایک سرکس اور شعر و افسانہ کا کلب مہیا کرتا ہے جہاں لوگ زندگی سے بھاگ کر تھوڑی دیر تصور ں کئے بیٹھے رہتے ہیں۔ لذتیت پسند ادب ایک مداری کی طرح ح طرح کے شعبدے دکھا کر تماشائیوں کے دل بہلاتا ہے

ادب کے ایک اسکول نے نوع انسانی کے لئے ذہنی ایو م پہنچانے کی خدمت انجام دی ہے۔

دوسرا اسکول زندگی کی مصوری کا اسکول ہے اس سکول ز دیک ادیب کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ وہ زندگی کو جوں کا توں ں کے سامنے پیش کر دے اور اصلاح و تغیر کا علمبردار بننے اور معاشرے ی رہنمائی دینے کی ذمہ داری قبول نہ کرے۔ اس کا فن ایک کیمرہ ہونا ے جو زندگی کی تصاویر ہر پہلو سے لے کر انسان کے سامنے رکھتا ے۔ پھر یہ کام خود انسان کا کام ہے کہ ان تصاویر کو دیکھ کر وہ کوئی رائے ئم کرے، غلط اور صحیح کا احساس کرے اور کسی تغیر کا ارادہ کرے۔

ادب کا یہ اسکول زندگی کے سامنے ایک آئینہ رکھ دینے سے زیادہ نہیں کر سکتا!

تیسرا اسکول مقصدی ادب کا ہے، جسے ہم تعمیری ادب بھی کہہ سکتے ہیں فلاحی ادب بھی!

اس کا طریق کار یہ ہے کہ ادب میں زندگی کی عکاسی اس طرح جانی چاہئے کہ جو کچھ ہے وہ سامنے آکر خود ہی اشارہ کر دے کہ "ہونا کیا چاہئے"۔ دوسرے لفظوں میں وہ "حاضر" کے کمزور پہلوؤں کو نمایاں کیا جائے اور "مطلوب" کی طرف رہنمائی کرے، وہ "غلط" کا غلط ہونا دکھا دے اور اس کے ذریعہ "صحیح" کی طرف متوجہ بھی کر دے۔

صرف ایسا ہی ادب زندگی کے سفر ارتقاء کا ہمسفر بن سکتا ور اس میں چونکہ ادیب کے سامنے کچھ اصول و مقاصد ہوتے ہیں کچھ اقدار و پیمانے ہوتے ہیں، اس لئے ہم اسے مقصدی ادب قرار دیتے ہیں۔ مقصدی ادب زندگی کی انگلی تھام کر چلتا ہے اور اسے سیدھا منزل ترقی کی طرف لئے لئے آگے بڑھتا ہے۔

ہماری ضرورت نہ لذتیت پسند اسکول سے پوری ہوتی ہے۔ نہ فوٹو گرافر اسکول سے، بلکہ ہمیں اپنے آپ کو بنانے کیلئے مقصدی ادب کی ضرورت ہے۔

مقصدی ادب کا ایک لازمہ

مقصدی ادب کوئی بھی ہو، اپنے پیچھے ایک آئیڈیالوجی رکھتا ہے۔ زندگی کا ایک مستقل نظریہ، انسان کا ایک تصور، تاریخ کا ایک فلسفہ خیر و شر کا ایک پیمانہ وہ اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ درحقیقت وہ آئیڈیالوجی ہی اسے مقصدی ادب بناتی ہے۔ بغیر ایک خاص آئیڈیالوجی کے کبھی کوئی مقصدی ادب پایا نہیں گیا۔

اب اگر ہم یہ چاہیں کہ ہمارا ادب مقصدی ادب ہو تو ہمیں اس بات کا بھی فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ نظریہ حیات کونسا ہوگا جس پر ہم اپنے ادب کو استوار کریں۔

بنیادی طور پر نظریات دو ہی ہیں جو ہماری دنیائے خیال پر حکمران رہے ہیں اور جن کے سانچے میں تمدن و سیاست کے اصول ڈھلتے رہے ہیں۔

ایک نظریہ یہ ہے کہ ہمارے گرد پھیلی ہوئی کائنات اپنے پیچھے کوئی ارادہ، کوئی شعور، کوئی منصوبہ اور کوئی اقتدار نہیں رکھتی۔ یہ کائنات مادے کا ایک ظہور ہے اور اس میں جو کچھ ہو رہا ہے ایک حادثے کے طور پر ہو رہا ہے۔ یہاں زندگی بھی مادے کے ایک تقاضے کی حیثیت سے خود بخود نمودار ہوگئی ہے۔ اس زندگی نے جس طرح اور بہت سے پیکر اختیار کئے ہیں۔ ایک پیکر وہ بھی اختیار کر لیا ہے جس نے انسان کا نام پایا۔ انسان کا مقصد زندگی اپنی خواہشات کی تکمیل سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

دوسرا نظریہ ہے کہ کائنات ایک ارادے اور ایک شعور کا کرشمہ ہے۔ اس کے پیچھے ایک حکمت اور ایک منصوبہ کام کر رہا ہے۔ یہ اپنے رب اور اپنے اللہ کے اقتدار میں کسی ہوئی منظم طریق سے ارتقاء کر رہی ہے۔ زندگی ایک شرارہ ہے جو اس کائنات کے رب اور اس کی طرف سے جب مادے کو ودیعت کیا جاتا ہے تو اس میں ایسی صلاحیتیں ہم

آلے ہیں جو ماتے کے اپنے خواص نہیں ہیں۔ انسان محض ایک ترقی یافتہ حیوان نہیں ہے۔ بلکہ اس پر اخلاقی حسن اور خیر و شر کی تمیز کا انعام کر کے اسے اس کے خالق نے اپنی خلافت و نیابت کیلئے مامور کر دیا ہے اب اس کا مقصد وجود رب کائنات اور رب انسان کی رضا کے مطابق زندگی کی تعمیر کرنا ہے اور یہ اس کیلئے پوری طرح ذمہ دار اور جواب دہ ہے۔

پہلا نظریہ الحاد کا نظریہ ہے کہ جس کی بنیادوں پر آج کا پورا دور تہذیب تعمیر کیا گیا ہے اور دنیا بھر کے ادب کی رگوں میں یہی نظریہ سرایت کئے ہوئے ہے۔ لیکن جس طرح اس نظریہ پر کھڑی ہونے والی تہذیب دنیا کے لئے موجب فساد بنی ہوئی ہے۔ اس طرح نظریہ کا حامل ادب بھی انسانی خیالات و جذبات کے بگاڑ اور اخلاقی قدروں کی پامالی کا ذریعہ بن کر کام کر رہا ہے۔

دوسرا نظریہ اسلام کا نظریہ ہے اور آج یہ نظریہ اگر ہماری انفرادی زندگیوں سے آگے نکل کر ایک سماجی حیثیت اور ایک ریاستی... نظام کی بنیاد بننے والا ہے تو ناگزیر ہے کہ یہی نظریہ ہمارے آئندہ ادب کی رگوں کا خون بھی بنے۔

یہ واضح ہے کہ ایک نظریہ حیات کو ادب کی بنیاد بنانے کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ ادیب اس پر وعظ کہیں۔ بلکہ مدعا یہ ہوتا ہے کہ زندگی کو دیکھنے اور دکھانے کے لیے ان کا نقطۂ نظر ایسا ہوگا جو اس نظریہ حیات کا قدرتی لازمہ ہو۔

اسلامی نظریہ حیات جہاں ہمارے "حال" کے لیے زندگی افروز نظریہ ہے، وہاں یہ ہمیں اپنے زریں ماضی سے وابستہ رکھ کر ہمیں ایک روشن مستقبل سے مالامال کر سکتا ہے۔

ہماری تہذیبی قدریں

دنیا کا ہر ادب اپنا چند کچھ خاص تہذیبی قدروں کے گرد بنتا ہے۔ اور یہ تہذیبی قدریں لازماً اس نظریہ حیات کے مطابق ہونی چاہئیں جن کو کسی ادب کے فن کار اپنا زاویۂ نظر بنا کر سوچتے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ نظریہ حیات کسی اور طرح کا ہو اور ادب تہذیبی قدریں کسی اور طرح کی اختیار کر لے۔ اب اگر ہم اپنے مطلوبہ ادب کیلئے اسلامی نظریہ حیات کو بنیاد بنائیں تو ناگزیر ہے کہ ہم تہذیبی قدریں بھی اسی کے مزاج کے مطابق اختیار کریں۔

اب میں بتاتا ہوں کہ اسلامی تہذیب کی بنیادی قدریں جن کو ہمارے مطلوبہ ادب میں جذب ہونا چاہئے۔

۱۔ اسلامی تہذیب کی اولین قدر "توحید" ہے۔ یعنی یہ انسانیت کے لیے معبود، حاکم، قانون ساز اور سرچشمہ، ہدایت صرف ہے۔ وہی مقتدر اعلیٰ ہے، وہی ایک ہے جس کے سامنے جھکا جا سکتا ایک حقیقت کو ماننے سے یہ خود بخود لازم آ جاتا ہے کہ انسان اور ہر ایک غلامی، عبدیت اور اطاعت سے آزاد ہو جائے۔

اسلام "ایک خدا" کو اس طرح منواتا ہے کہ ہر دوسرے سے چاہے وہ کسی ایک فرد کی خدائی ہو، یا ایک خاندان اور طبقہ کی بادشاہت کی خدائی ہو یا جمہور یا قوم کی، وہ مذہبی خدائی ہو یا معاشرتی سیاسی، آدمی آزاد ہو جاتا ہے۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

یہاں نظریہ توحید ایک کلامی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ یہ ایک تمدنی مسلک ہے۔ اس سے انسان پر حقیقی اور مکمل آزادی کے در کھلتے ہیں۔ اس لیے یہ ہمارے نظام زندگی کی بنیادی تہذیبی قدر اسلامی معاشرے میں پروان چڑھنے والے ادب کا فرض یہ ہے کہ وہ پر اس حقیقی آزادی کے دروازے کھولے جو صرف توحید کی کنجی ہیں۔

۲۔ اسلامی تہذیب کی دوسری قدر وحدت انسانی ہے اور انسان کے درمیان امتیاز کی جتنی لکیریں بھی آج تک کھینچی گئی وطنیت کی ہوں یا نسلیت کی، قومیت کی ہوں یا طبقات کی، ان اسلامی نظریہ حیات توڑ دیتا ہے۔ تمام مصنوعی تقسیموں کو اسلا عصبیتیں قرار دیتا ہے اور ان کے خلاف لڑتا ہے۔ اس کے نز کوئی تقسیم قابل تسلیم ہے تو وہ حق اور باطل کی تقسیم ہے۔ وہ ایک تقسیم کے سوا اور کسی کا روادار نہیں۔ پس ہمیں جو ادب مطلوب ہے ہو چاہئے کہ انسان کو تمام مصنوعی تقسیموں اور تفریقوں سے آز

۳۔ اسلامی تہذیب کی تیسری قدر یہ ہے کہ وہ فرد کو

اکائی کی حیثیت سے پورے احترام کا حق سمجھتی ہے۔ اور وہ سماج کو ایسے نقشہ پر اٹھاتی ہے کہ جس میں فرد اپنی صلاحیتوں کو بہتر طریق پر پوری نشو و نما دے سکے اور اس نشو و نما میں کوئی چیز اس کے لیے رکاوٹ زوالی نہ ہو۔ چنانچہ وہ فرد پر جتنی پابندیاں بھی عائد کرتی ہے اس لئے تی ہے کہ دوسرے افراد کی صحیح نشو و نما میں رکاوٹیں پیدا کرنے والے س ظہور نہ کر سکیں۔ اسلام نے فرد کو معاشرے کا ایک بے جان پرزہ کے نہیں چھوڑ دیا ہے، بلکہ اس کو حساس، ذی ارادہ اور خودی سے ستہ وجود کی حیثیت سے لیا ہے۔

ہمارے لئے ساز گار ادب وہی ہو سکتا ہے جو فرد کی اس یت کا احساس رکھتا ہو جو اسلام نے اسے دی ہے۔

۴۔ ایک تہذیب کی نوعیت کا دار و مدار جن چیزوں پر ہے ان میں ے ایک یہ ہے کہ وہ عورت کو اپنے نظام میں کیا مقام دیتی ہے دنیا میں جس ہذیب نے عورت کو اس کے صحیح مقام سے آگے یا پیچھے ہٹا دیا ہے وہ فساد سے کبھی بچ نہیں سکی۔ چنانچہ قدیم دور کی وہ تہذیبیں جنہوں نے عورت کو نسانیت کے مرتبے سے گرا کر بھیڑ بکریوں میں بدل دیا تھا جس طرح ... مفاسد سے بھر گئی تھیں۔ اسی طرح وہ جدید تہذیبیں بھی فتنہ میں مبتلا ہو گئی ہیں جنہوں نے عورت کو وقار سے ہٹا کر اور گھر سے نکال کر مرد کی ہوس کا کھلونا بنا دیا ہے۔

بخلاف اس کے ہماری تہذیب کی قدروں میں سے ایک اہم قدر نسائیت کو اس کے نطری مقام عدل پر رکھنا ہے اسلام میں عورت کو گھر کی سلطنت کا انچارج اور نئی نسلوں کے چمن زار کا باغبان بنایا گیا ہے۔ یہاں اسے انسان گری کے آرٹ کیلئے مخصوص کیا گیا ہے۔

ہمارا مستقبل کا ادب وہی ہو سکتا ہے کہ جو عورت کو ٹھیک اس مقام پر رکھے جس پر فطرت نے اسے رکھا ہے۔ آج جو ادب عورت کو سامان تفریح بنا بنا کر شعر و افسانہ میں لا رہا ہے ہمارا معاشرہ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

یہ ہیں ہماری بنیادی تہذیبی قدریں کہ جن سے بے نیاز ہو کر ارتقا کرنے والا ادب ہمارا ادب نہیں ہو سکتا اور ایسا ادب ایک اسلامی سماج کی آبیاری میں کوئی حصہ نہیں لے سکتا ہمیں کل کے ادب کا چشمہ ان بنیادی قدروں کے گرد دینا ہے۔

۵۔ ہماری تہذیب کی پانچویں بنیادی قدر حق کے احترام اور ظلم کے استیصال کا جذبہ ہے۔ ہر انسان دوسرے کے مقابلے میں کچھ فطری حقوق رکھتا ہے۔ اس کی زندگی محترم ہے، اس کی آبرو محترم ہے، اس کی ملکیت کا حق محترم ہے، اس کا احساس خودی محترم ہے۔ وہ اس کا حق دار ہے کہ دوسروں کے ساتھ حقوق میں بھی اور فرائض میں بھی برابر سرابر کے مقام پر ہے۔ معاشرے پر اس کے دل و دماغ حقوق بھی واجب ہو جاتے ہیں اور اس کے جسم کے پیٹ کے حقوق بھی، اس کا من بھی کچھ تقاضے رکھتا ہے اور اس کا تن بھی —— اور جب تک ان حقوق اور تقاضوں کا احترام معاشرے میں برقرار رہتا ہے، تہذیب ترقی کرتی ہے، امن پائیدار بنیادوں پر قائم رہتا ہے، انصاف فضا پر چھا جاتا ہے، مسرت و اطمینان کی کرنیں چاروں طرف نور بکھیرتی ہیں اور زندگی اپنے معیار اور اپنے توازن پر برقرار رہتی ہے۔

لیکن جب سماج کا کوئی وحشی عنصر انسان کے کسی حق پر چھاپہ مارتا ہے، سیاسی سازش سے چھاپا مارتا ہے، قانون سازی کے راستے چھاپا مارتا ہے تو سماج کا توازن درہم برہم ہو جاتا ہے۔ فرائض کا زیادہ سے زیادہ بار کمزوروں پر ڈال دیا جاتا ہے اور حقوق ان سے اچک لئے جاتے ہیں، پھول طاقت کے وسیع دامن میں چلے جاتے ہیں اور کانٹے کمزوری کی تقدیر میں لکھ دیئے جاتے ہیں، عوام بوتے ہیں اور خواص کاٹتے ہیں، کچھ اونچے ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور کچھ کو نیچ بنا دیا جاتا ہے —— زندگی کے محدود گوشوں میں بھی اور ہمہ گیر دائروں میں بھی۔

اس حالت کا نام ظلم ہے۔ ظلم احترام حقوق کا خاتمہ کر دیتا ہے ظلم مساوات کی جڑ کاٹ دیتا ہے ظلم انصاف کی بنیادیں ڈھا دیتا ہے، ظلم امن کی جنتوں کو کھنڈروں میں بدل کے رکھ دیتا ہے۔ اس ظلم کی روک تھام کیلئے خدا نے برتر کے انبیا نے انسانی حقوق کو متعین کیا ہے اور سماج اور ریاست اور ہر فرد کا فرض قرار دیا ہے کہ وہ ان حقوق کی نگہبانی کریں۔ ہر انسان کا یہ فطری فریضہ ہے کہ ظلم کے خلاف وہ ساری عمر جنگ آزما رہے وہ زندگی کی قلعے کے دروازے پر کھڑا ہو کر شر کی یورش کے آگے سینہ سپر رہے۔

اگر ادب یاس تہذیبی قدر کو زندہ نہیں رکھتا ہے۔ اگر ادب ایک ایک انسانی حق کی پاسبانی اور ظلم کی ایک ایک شکل کی مدافعت کا جذبہ بیدار نہیں کرتا تو ایسا ادب ہمارے کام کا نہیں ہے۔ ایسے ادب سے ہماری تہذیب کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں۔ ایسا ادب ہمارے اجتماعی مزاج سے میل نہیں کھاتا۔ ایسا ادب ہمارے مستقبل کی تعمیر میں حصہ لینے کے قابل نہیں ہو سکتا۔

ہمیں وہ ادب مطلوب ہے جو قدیم اور جدید کی بحثوں میں پڑنے کے بجائے حق اور ظلم میں تفریق کرنے والا ہو، جو حق کی علمبرداری کا ولولہ دے سکے اور ظلم کے استیصال کی اسپرٹ سے روحِ انسانی کو مالا مال کرے جو زندگی کا تجزیہ کر کے محدود گوشوں میں بھی ظلم کا ہی سرچ لائٹ کے ذریعہ اجاگر کر دے اور وسیع اجتماعی فضاؤں میں بھی ظلم کے ہر پارٹ کی حقیقت واضح کر دے، جو سیاسی ظلم کو بھی نمایاں کرے، معاشی ظلم کو بے نقاب کرے اور معاشرتی ظلم کو بھی انسان کی نگاہوں پر فاش کر دے ——————

اور پھر ظلم کے خلاف معرکہ لڑنے کیلئے جذبۂ تعمیر کو اکسائے۔

انسانیت کا اصل خادم ادب وہی ہے جو انسان کو ظالم قوتوں کے سامنے تن جانے کا درس دیتا ہے اور جو ظلم کے خلاف روحِ بغاوت کو بیدار کرتا ہے۔

ہم ایسے ادب کے ضرورت مند ہیں۔

جوہرِ محرک

اجتماعی زندگی بغیر اسکے ترقی پذیر نہیں رہ سکتی کہ اس کے اندر جو جوہرِ محرک کام کر رہا ہو جو اس کی روحِ عمل کو اکساتا ہے اور مقصدی ادب اس جوہرِ محرک کو زندہ و بیدار رکھتا ہے۔ یہی جوہرِ محرک ہوتا ہے جو انسان کے اندر سے تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارتا ہے، یہ کشمکشِ حیات میں خون کو گرم رکھنے کا وسیلہ بنتا ہے اور تاریخ کے بڑے بڑے معرکے اسی کے بل پر لڑے جاتے ہیں۔ جس ادب میں یہ جوہرِ محرک موجود نہیں ہوتا وہ ایک افیون ہوتا ہے۔ وہ ایک سحر ہوتا ہے۔ وہ ایک قصہ خواب آور ہوتا ہے۔ جس سے زندگی کا خون گرمی حاصل نہیں کر سکتا، لیکن جس ادب میں جوہرِ محرک کارفرما ہوتا ہے وہ [illegible] جبرائیل ہوتا ہے یا بانگِ اسرافیل!

جوہرِ محرک کے طور پر تاریخ انسانی میں کہیں قوم پرستی کو استعمال کیا گیا ہے، کہیں حبِ وطن کو، کہیں نسلی برتری کے احساس کو

لیکن ان کے مقابلے میں ایک اور جوہرِ محرک ایسا بھی ہے جو سب سے زیادہ مؤثر بھی ہے اور ان سب سے زیادہ عقلی بھی اور وہ ہے مقدس فرض پر مامور ہونے کا احساس و شعور!

یعنی جس معاشرے کے اندر اور جس ادب کے اندر یہ تصور ہو کہ ان کی زندگی مقدس فرض ہے، اس کا ایک اونچا نصب العین ہے، یہ احساس و شعور انتہائی زوردار جوہرِ محرک ثابت ہوتا ہے۔

ٹھیک یہی جوہرِ محرک ہے جو اسلام اپنے معاشرے کیلئے اور اس کی ادبی تخلیقات کے لیے بہم پہنچاتا ہے۔ وہ اپنے ماننے والوں میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ:-

ہم ایک ایسے نظامِ زندگی کے مشعل بردار ہیں جو پوری دنیا کے لیے ذریعہ فلاح ہے۔

ہم دنیا میں ظلم، بدی اور جھوٹ کی طاقتوں کے خلاف جنگ لڑنے والے سپاہی ہیں۔

ہم انسانیت کے جوہرِ فکر و عمل کے محافظ ہیں۔

ہم اپنے فریضۂ حیات پر اپنے رب اور اپنے اللہ کی طرف سے مامور ہیں۔ ہم خدا کے نقیب اور اس کے ایجنٹ اور نمائندے ہیں۔ اس سے زیادہ معقول اور اس سے زیادہ زوردار جوہرِ محرک تاریخ انسانی میں اور کوئی نہیں پایا جاتا۔

ہمارا مستقبل کا ادب وہی ہوگا جو اس جوہرِ محرک سے مالا مال ہو اور پورے معاشرے کو اس سے مالا مال کرے۔

ہمیں اپنا ادب خود پیدا کرنا ہے

جس مطلوبہ ادب کا میں تصور دلا رہا ہوں، اسے ہم باہر سے درآمد نہیں کر سکتے، اس کو ہم باہر سے ترجمہ کر کے نہیں اپنا سکتے، اس کو ہم کسی منڈی سے خرید کر نہیں لا سکتے، بلکہ اس کو تو ہمیں خود اپنے اندر سے ابھارنا ہے۔ اس ادب کو حاصل کرنے کیلئے ہمیں اپنی ہی تخلیقی قوتوں پر دارومدار کرنا ہوگا۔ ہمیں اپنے راستے خود بنانے ہیں اور اپنی راہ میں چراغ ہمیں خود جلانے ہیں۔

اب تک ہماری ادبی سرگرمیوں کے پیچھے ایک مغلوب تقلیدی ذہن کارفرما ہے۔ ہم مرعوبانہ طرزِ فکر کے ساتھ بڑی بڑی

ونیاز مند بن کر دیکھتے ہیں در پھر بڑی بڑی سعادت مندی سے ان
ی ادبی تخلیقات کی نقل اتارتے ہیں اور اس کا نام پھر ترقی پسندی رکھتے
ہمارے ادیبوں کے قبلے ان کے اندر نہیں، ان کے باہر واقع ہیں ——
—— چاہے مشرق میں ہوں یا مغرب ہوں، چاہے سرخ

مید!

لیکن یاد رکھئے کہ جن لوگوں کے فکر و ادب کا ان کا اپنا ہی حریم خودی
نہ ہو، جو تقلیدی ذہن رکھتے ہوں جو خیالات باہر سے درآمد کرتے ہوں،
دوسروں کو مرعوبیت سے دیکھیں جن کا اپنا تخلیقی ترجمان سرنگوں پڑا ہو
کاروان حیات کو جادۂ ارتقاء پر نہیں لے جاسکتے۔

پس ہمیں تقلیدی رجحانات کا خاتمہ کرکے اپنے تخلیقی رجحان کو بیدار
کرنا ہے اور باہر کے فکری قبلوں سے بے نیاز ہو کر خود اپنے ہی حریم خودی
کو اپنا قبلہ بنانا ہے اور جس دن یہ تبدیلی پوری طرح واضح ہو جائیگی ہم اپنا
مطلوبہ ادب پیدا کر سکیں گے۔

میں یہ اطلاع دیئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس ادب کی تخلیق
کیلئے ابتدائی کوششیں آپ کے ہاں شروع ہو چکی ہیں اور یہ کوششیں
بڑی حد تک حوصلہ افزا ہیں۔ آہستہ آہستہ ایک نئی ادبی شاہراہ سامنے
آرہی ہے اور اس شاہراہ پر خیالات کے نئے کارواں چلنے لگے ہیں مگر یہ
مہم اپنی تکمیل کے لیئے اس وقت کا انتظار کر رہی ہے جب کہ آپ نئے ارادوں
اور ولولوں کے ساتھ کالجوں سے نکل کر اس مہم میں اپنی محنتیں صرف کریں
گے۔

(بشکریہ چراغ راہ)

اگر یہاں آپ کا نام اور نمبر خریداری درج ہے ——

تو سمجھ لیجئے کہ آپ کی مدت خریداری ماہ مارچ کے شمارہ کے ساتھ ختم ہو گئی۔ لہٰذا جلد از جلد آئندہ سال کے لئے سالانہ چندہ مبلغ تین روپے روانہ فرمائیے اگر
آپ کا چندہ پندرہ مارچ تک وصول نہ ہو سکا تو آپ کو اپریل کا پرچہ تین روپے کے وی۔ پی کی صورت میں بھیجا جائے گا جس کا وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔ اگر کسی وجہ
سے آپ مشیر کا مطالعہ جاری رکھنا پسند نہ فرماتے ہوں تو ادارہ مشیر کو مطلع فرما دیں۔

نمبر خریداری		نام		سکونت
۲۱۰۰	"	حکیم سید ممتاز علی صاحب قادری	"	کھڈر و نواب شاہ سندھ
۲۱۲۱	"	سکریٹری پبلک لائبریری دکی	"	لورالائی بلوچستان
۲۱۲۳	"	جناب محمد اختر صاحب آر، پی، ایف	"	ڈرگ روڈ کراچی
۲۱۲۴	"	جناب ممتاز علی صاحب ملٹری انسٹرکٹر	"	ٹھٹھہ
۲۱۲۵	"	جناب ملک حیات محمد صاحب	"	صدر بازار میانوالی
۲۱۲۸	"	مرزا سوڈا واٹر فیکٹری	"	گوجرخان
۲۱۳۰	"	جناب ظہور الدین صاحب	"	اے۔ بی سینیا لائن کراچی
۲۱۳۵	"	جناب محمد عبدالکریم ہیڈ مولوی	"	موریل گنج کھلنا
۲۱۷۱	"	جناب فیض بخش صاحب دکاندار	"	گوگراں ضلع ملتان

منیجر دفتر رسالہ مشیر بندر روڈ کراچی نمبر

نورِ رسول نوری ۔

"محکمات"

عیشِ باطل سے رہِ حق کا ہر آزار اچھا
مسندِ کفر سے انسان سرِ دار اچھا

وقت پر کام جو آجائے وہ پونجی اچھی
نقدِ جاں پیش جو کر دے وہ خریدار اچھا

ترکِ دنیا کی تمنا ہے تو کر عزمِ جہاد
سرفروشوں کیلئے کوچۂ دلدار اچھا

تازہ رکھنے کی ضرورت ہے یہاں زخموں کو
وصل اچھا ہے محبت میں نہ دیدار اچھا

سب پہ ظاہر تو ہیں عیب و ہنر اسکے اے دوست
شیخِ پُرکار سے یہ رندِ سیہ کار اچھا

جو ندامت سے کبھی اشک بہا لیتا ہو
زاہدِ خشک سے وہ مردِ گنہگار اچھا

آدمیت کے لئے زہر ہو جس کی تخلیق
ایسے صناعِ زیاں کار سے بیکار اچھا

اپنے ماحول پہ بھی جو اثر انداز نہیں
ایسے دیندار سے تو کافرِ ہشیار اچھا

حسنِ اخلاق سے جو رند بنا لیتا ہے
واعظِ ہرزہ سرا سے وہ قدح خوار اچھا

خاکبازی کا سبق ملتا ہو مومن کو جہاں
ایسے حجرے سے کسی شاہ کا دربار اچھا

ہم بھی قائل نہیں سرمایہ پرستی کے مگر
کام آئے جو غریبوں کے وہ زردار اچھا

اُف وہ سجدہ تہہِ خنجر جو ادا ہوتا ہے
حجرۂ زہد سے ہنگامۂ پیکار اچھا

گرچہ سرمایۂ قوت بھی ضروری ہے مگر
سر کٹا دے جو رہِ حق میں وہ نادار اچھا

آدمیت سے ہٹا دے جنھیں عرفاں کی تلاش
ایسے دیوانوں سے انساں کا طلبگار اچھا

جنکو دنیا میں کسی در بھی ملتی نہیں اماں
ان غریبوں کے لئے سایۂ دیوار اچھا

کچھ بھی ہو خرقۂ سالوس کے اندر تو نہیں
محفلِ عشق میں محشر سازیاں کار اچھا

انتظار اعظمی

ابوالاعلیٰ مودودی

(ابوالاعلیٰ مودودی پر میری یہ ایک تاثراتی نظم ہے ممکن ہے آپ کو پسند آئے۔ مدینہ کے ارباب کار کا مشورہ ہے کہ میں آپ کے پرچے کے لئے بھیجوں
شخصیت پرستی اور اعتراف شخصیت میں بڑا فرق ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ زہیر کا کلام اس لئے پسند فرماتے تھے کہ وہ اپنے ممدوح کی انھیں خصوصیات
کا ذکر کرتا جو اس میں پائی جاتیں۔ میں نے بھی ابوالاعلیٰ صاحب کی انھیں خوبیوں کا ذکر کیا ہے جو ان میں واقعتاً ہیں۔ شاعرانہ زبان عام زبان سے
الگ ہوتی ہے اس لئے اس کے طرز ادا کو بھی مختلف ہونا ہی چاہیئے۔ اس نظم میں مبالغہ کہیں سے بھی راہ نہیں پا سکا ہے۔ (انتظار اعظمی)

تیرے نغموں سے ہوئے بیدار مرغانِ چمن — تو نے بخشا لالہ و نسریں کو عرفانِ نمو
چشمِ نرگس کو چمن میں تجھ سے بینائی ملی — تیرے دم سے گلستاں میں ہے مذاقِ رنگ و بو
تو شبِ تاریک میں چمکا مثالِ ماہتاب — فکر روشن ہو ترا، قندیلِ راہ جستجو
تو نے افسردہ دلوں کو دی "نویدِ زندگی" — تو نے دوڑایا رگ مسلم میں خونِ آرزو
کیوں نہ اربابِ چمن تجھ کو کہیں بادِ بہار — تو نے ہی اجڑے چمن کو دی نویدِ رنگ و بو
وادیٔ پرخار سے گزرا ہے تو مثلِ صبا — زندگی تیری سراپا اضطراب و جستجو
جس کو اربابِ سیاست نے کیا ہے تار تار — وہ گریبانِ حیات اب کر رہا ہے تو رفو
کیوں نہ تجھ کو "ساقیٔ خم خانۂ ملت" کہوں — تو نے "صہبائے کہن" سے بھر دیئے جام و سبو

تو شبِ الحاد میں شمعِ رہِ اسلام ہے
کاروانِ حق کو بیداری کا اک پیغام ہے

نعرۂ حق کو دبا سکتے نہیں دار و رسن — تازہ کی ہے تو نے پھر منصور کی رسمِ کہن
سرفروشانِ وفا کا تو ہے میرِ کارواں — آج بھی تازہ ہے تجھ سے سرفروشی کا چلن
اس سے دب سکتے نہیں ہیں گرکبھی مردانِ حق — دورِ نو میں لاکھ ہو ہنگامۂ دار و رسن
تو نے بخشا لالہ و گل کو فروغِ رنگ و بو — تیرے خونِ دل سے ہے خاکِ چمن گل پیرہن
تو نے اندازِ نوا سنجی سکھایا ہے انھیں — کیوں نہ ممنونِ کرم ہوں تیرے مرغانِ چمن

تو نے ملت کو سنایا پھر نوائے جبرئیل
تو نے بخشا کاروانِ حق کو پھر ذوقِ رحیل

(۲۵ دسمبر کو یہ نظم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ادارۂ ادب اسلامی کے جلسے میں پڑھی گئی)

"اسیر اللغات"[1]

جیل ایک مستقل دنیا ہے جس کا ایک مستقل تمدن اور ایک جداگانہ نظام معاشرت ہے۔ اس تمدن و معاشرت نے زبان پر خاص اثر ڈالا ہے چنانچہ عام الفاظ کے کچھ خاص استعمالات پیدا ہو گئے ہیں اور کچھ نئی اصطلاحات بن گئی ہیں۔ الفاظ کے ان خاص استعمالات اور ان اصطلاحات کے بارے میں تحقیقات کرنے پر معلوم ہوا کہ اردو زبان میں لغت کی مستند ترین کتابیں بھی ان سے خالی ہیں۔ اس خلاء کو پر کرنے کے لئے کچھ ارباب تحقیق نے بڑی قربانی دی ہے۔ یہ لوگ بغیر کوئی جرم کئے محض اسی مقصد سے مہینوں کے لئے قید میں رہے ہیں کہ دنیائے زنداں کی آبادی میں گھل مل کر ان کی زبان کی تحقیقات کریں۔ اسی تحقیقات کے نتیجے میں مذکورہ بالا نام سے ایک مستند لغت مرتب ہو رہا ہے۔ اب تک جو کام ہو چکا ہے وہ ہم منظر عام پر لاتے ہیں۔ جن محققین نے یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے وہ خوش قسمتی سے اتنے بے لوث واقع ہوئے ہیں کہ اپنے نام تک ظاہر کرنا نہیں چاہتے لہٰذا مجبوراً یہ بدنامی ادارہ مشیر نے اپنے سر لی ہے۔

(ا)

اڈوی میں رکھنا : یہ ایک خاص اصطلاح ہے، قیدیوں یا نظربندوں سے ایک سنگین طرز عمل کے روا رکھنے کے لیے جس شخص کو زیادہ تنگ کرنا ہو اسے چوبیس گھنٹے سے زیادہ کسی ایک کوٹھری میں ٹکنے نہیں دیا جاتا۔ بلکہ ہر روز بستر اٹھوا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاتا ہے۔ اس سلوک کے تحت جو قیدی آجاتا ہے وہ ذہنی سکون سے پوری طرح محروم ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ کسی ایک ماحول کو ساز گار کرے یا کسی ایک جگہ کے ساتھیوں سے راہ و رسم پیدا کر سکے۔ تحریک ختم نبوت کے بعض نمایاں آدمیوں تک کو بھی اس کا تجربہ ہوا جن میں مولانا محمد اسمٰعیل خطیب جامع اہل حدیث (گوجرانوالہ) اور مولانا عبدالواحد خطیب جامع مسجد شیرانوالہ (گوجرانوالہ) شامل ہیں۔

احاطہ : قیدیوں اور نظربندوں کو مختلف وجوہ سے تقسیم کر کے رکھنے کے لئے الگ الگ وارڈز بنائے جاتے ہیں جو چند بیرکوں یا کوٹھڑیوں پر مشتمل ہوتے ہیں، ان کو احاطے کہتے ہیں۔ سنٹرل جیل لاہور احاطہ اول، احاطہ دوم، شاہی وارڈ، احاطہ بی کلاس، دیوان گھر، بیل احاطہ، بدھی بم کیس اور سیاست خانہ اور احاطہ مثلاً پر مشتمل ہے۔

عام قیدیوں کے احاطوں کے گرد بالعموم جنگلہ لگا دیا گیا ہے اور خاص قیدیوں، بگڑے ہوئے قیدیوں، دیوانے قیدیوں کے وارڈز اونچی دیواروں سے محدود کئے گئے ہیں۔

---

[1] یہ ترکیب مقلوب ہے، جیسے کریم اللغات، نور اللغات، فیروز اللغات وغیرہ۔

ب

: جیل کے اندرونی دفتر کے پاس ایک مینار پر خطرے کا الارم کرنے کے لئے گھنٹہ آویزاں ہے۔ اگر جیل میں خودکشی یا دنگے فساد یا آتشزنی یا فرار کا کوئی واقعہ ہو جائے تو چیف وارڈر یہ گھنٹہ بجاتا ہے اس گھنٹے کے بجنے پر افسران اور تمام وارڈر بھاگے بھاگے موقع پر پہنچتے ہیں۔

و : مراد ہے میڈیکل آفیسر بڑے ڈاکٹر کو جیل میں "ایم، او" ہی کہا جاتا ہے۔ جیل کے ایم، او کے بڑے اختیارات ہوتے ہیں۔ اور قیدیوں کے نفع نقصان میں اسے نمایاں دخل ہوتا ہے مثلاً مشقت مقرر کرتے وقت قیدی کے بارے میں ڈاکٹر کی رپورٹ کا لحاظ رکھنا قانوناً ضروری ہے وہ جس قیدی کو چاہے ہسپتال میں داخل کر سکتا ہے۔ اگر قیدی کسی دوسرے جیل کو منتقل کئے جا رہے ہوں تو کسی قیدی کو اگر ڈاکٹر ہسپتال میں داخل کر لے تو پھر اسے نہیں لے جایا جا سکتا۔ ڈاکٹر کی رپورٹ پر ناقابل علاج اور قریب المرگ قیدیوں کے کیس ایک بورڈ میں پیش ہوتے ہیں اور بورڈ کی منظوری پر قبل از وقت رہائی عمل میں آ سکتی ہے۔ ڈاکٹر جس کو چاہے ایکسرے، دانتوں یا آنکھوں کے معائنے یا آپریشن کے لئے سول ہسپتالوں میں بھجوا سکتا ہے۔ ڈاکٹر کسی کے لئے دودھ یا کوئی اور بہتر پرہیزی غذا لگوا سکتا ہے ان اختیارات کی وجہ سے جیل کے ڈاکٹر کے لئے موجودہ فاسد نظام ناجائز کمائی کے بہت سے دروازے کھول دیتا ہے۔ یہ اہمیت ہے "ایم، او" کی!

ایم، او صاحب کی ڈیوٹی تو صرف جیل کے اندر کام کرنے والے عملے اور قیدیوں تک محدود ہے لیکن عملاً اسے جیل خانے کے وزیر اور آئی جی تک کی خدمت کرنی پڑتی ہے چنانچہ ہوتا یہی ہے کہ اصل ڈیوٹی یہ بن جاتی ہے اور بیچارے قیدیوں کے حصے میں ایم، او کی بچی کھچی توجہ اور ہسپتال کی بچی کھچی دوائیں ہی رہ جاتی ہیں۔

(ب)

ی : جیل کی اصطلاح میں بدمعاشی ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جو قواعد کے خلاف ہو۔ مثلاً افیون چرس، بھنگ بدمعاشی ہے۔ سگریٹ بدمعاشی نہیں، لیکن دیا سلائی بدمعاشی ہے۔ کاغذ، قلم، دوات، روپیہ پیسہ بدمعاشی ہے۔ بغیر سنسر کے کوئی خط یا کتاب یا رسالہ پاس ہو تو بدمعاشی ہے۔ کیل، رسی یا بوتل کا وجود بدمعاشی ہے۔ اس سے محاورے یہ بنتے ہیں۔

—— فلاں شخص کے پاس بدمعاشی ہے

—— وہ بدمعاشی رکھتا ہے

—— بدمعاشی پکڑی گئی

دغہ : (ملاحظہ ہو! "داروغہ")

: ہسپتال سے روزانہ گشت کے لئے دو ایک چھوٹے ڈاکٹر نکلتے ہیں۔ دو مشقتی ساتھ ساتھ دواؤں کا بوجھل صندوق ڈنڈا ڈولی کے ہلو سے اٹھائے پھرتے ہیں۔ "بکسا آگیا" —— "بکسا نہیں آیا" —— "بکسا چلا گیا" کا استعمال اسی "تابوت سکینہ" کے لئے ہوتا ہے۔

: سنٹرل جیل لاہور کی ڈیوڑھی کے دروازے کے باہر ایک درخت سے جیل کا گھنٹہ لٹکا ہوا ہے۔ جو ساعت بہ ساعت بجتا ہے۔ اس درخت کے پاس بگل بجانے والا موجود رہتا ہے بگل صبح و شام قیدیوں کی گنتی ہو جانے پر بجتا ہے۔ یہ "بہت اچھا" کا بگل کہلاتا ہے۔ اور وارڈروں کی ڈیوٹیوں کے بدلنے کے اوقات پر بجتا ہے۔ نیز جب سپرنٹنڈنٹ صاحب ڈیوڑھی میں آتے ہیں یا روانہ ہوتے ہیں تو اس وقت بھی بجتا ہے۔

" : یہ سنٹرل جیل لاہور کے ایک خاص احاطے کا نام ہے۔ یہ تاریخی احاطہ جو بیس کوٹھڑیوں اور ایک کارخانے پر مشتمل ہے، پہلے پہل بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ یہ "بم کیس" کے ملزمین سے منسوب ہو کر بم کیس احاطہ کہلانے لگا ہے۔ تحریک ختم نبوت کے سلسلے کے نظر بند اسی میں رہے ہیں۔ اب بھی یہ ان ہی کے زیر استعمال ہے۔

بند کرنا :۔ دوپہر کو تین گھنٹے کے لئے اور رات کو پانچ بجے شام سے لے کر فجر تک قیدی اور حوالاتی اور کلاس III کے نظر بند کوٹھڑیوں اور بیرکوں
کر دیئے جاتے ہیں۔ "بند کر دو" ـــ "بند ہو جاؤ" ـــ کا استعمال اس معنی میں عام ہے۔

بول دینا :۔ یہ گویا شاہی محاورہ ہے۔ جب کوئی قیدی یا نمبردار کسی افسر کے سامنے جا کر کسی کی شکایت کرتا ہے یا بیان دیتا ہے تو کہتے ہیں
"فلاں نے جا کر بول دیا ہے کہ ......"

بھنگی راج :۔ ہمارے احاطے کے بیت الخلاء میں صبح ایک مرتبہ بھنگی تفصیلی صفائی کرتا تھا۔ اس وقت اگر کوئی ضرورت سے آتا تو اسے دیر تک
پڑتا، اور ہمارا ایک بھنگی ایسا تھا کہ وہ جب لوگوں کو بحالت مجبوری لوٹے رکھ کر "کیو" لگائے دیکھ لیتا تو کام کو اور لمبا کر دیتا۔ صاف محسو
تھا کہ اس وقت لوگوں کی رگِ جاں اس کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے اسی اختیار کو "بھنگی راج" کی اصطلاح سے موسوم کیا گیا۔

بی کلاس :۔ قیدیوں کی جو درجہ بندی کی جاتی ہے اس کے تحت متوسط درجہ ہے۔ خوش حال اخلاقی قیدی اس درجے کو حاصل کرنے کے لئے
بھی چڑھاتے ہیں۔ اس درجے میں کھانا اچھا ملتا ہے۔ فرنیچر ملتا ہے اور کچھ اور مراعات ملتی ہیں۔ مگر اخلاقی قیدیوں کے مقابلے میں سیاسی
کے لئے یہ درجہ ختم کر کے اب فوجی گورنمنٹ نے جو کلاس II بنا دی ہے اس میں فرنیچر وغیرہ نہیں دیا جاتا۔

بی کلاسیا :۔ وہ قیدی یا نظر بند جسے بی کلاس ملی ہو۔

(پ)

پترا چلنا :۔ جیل کے بیرونی احاطے کے ساتھ ساتھ اندر کی طرف ہر چند گز کے فاصلے پر پہرہ دار ڈیوٹی دیتے ہیں اس نظام کو باقاعدہ رکھنے کے
سے ایک لوہے کی تختی دست بدست گھومتی ہوئی پھر ڈیوڑھی میں پہنچ جاتی ہے۔ اس تختی کو پترا کہتے ہیں اور اسکے گھومنے کے عمل کو "پترا

پرچہ آنا :۔ رہائی، ملاقات اور عدالت میں پیشی کی اطلاع کے لئے نمبردار یا منشی ناموں کی جو فہرست لاتے ہیں۔ وہ بڑی اہمیت رکھتی
ہے دیکھ کر لوگ منتظر ہو جاتے ہیں کہ "پرچہ آ رہا ہے"

پریڈ جیل کے مختلف حصوں میں ہفتے کے دنوں کو تقسیم کر کے سپرنٹنڈنٹ اور دوسرے افسر دورہ کرتے ہیں۔ دورے کے دن کو پریڈ
جاتا ہے۔ دورہ بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے کیا جاتا ہے۔ افسر جلوس میں نمبرداروں اور وارڈوں کا ایک لشکر لئے جب ہزاروں بے بس ا
کی بے بسی کا تماشا کرنے نکلتا ہے۔ تو تھوڑی دیر کے لئے دماغ خدائی کی فضاؤں میں پرواز کرنے لگتا ہے۔ سنٹرل جیل میں ہما
وارڈوں کے لئے منگل کا دن مقرر تھا۔ بس اس دن قیدی، مشقتی اور حوالاتی صفائی اور لیپا پوتی میں خوب اچھی طرح استعمال
ہیں....
قیدی اور حوالاتی اپنا سارا سرکاری سامان مثلاً گھڑے، پیالے، پیتل کی رکابیاں، بالٹیاں، کمبل بیرک یا کوٹھڑی کے
ہیں۔ خود ان کو یا تو قطار میں کھڑا کیا جاتا ہے یا اندر بند کر دیا جاتا ہے۔ اسے "پریڈ لگانا" کہتے ہیں اور افسر کے معائنہ کو "پریڈ
مثلاً "صاحب بہادر پریڈ دیکھنے گئے ہیں"۔ جب یہ سارا مرحلہ ہو چکتا ہے تو کہتے ہیں کہ "پریڈ ہو گئی"؟

پنجہ :۔ پنجہ مشقت کرنے والے ایک گروپ کو کہتے ہیں۔ ابتداءً چار مشقتی اور ان کے ایک نگران نمبردار سے پنجہ بنتا تھا۔ اب یہ لفظ
بن گیا ہے۔ اس لئے کسی گروپ کی تعداد چاہے کچھ ہو اسے "پنجہ" ہی کہتے ہیں۔ مثلاً دھوبیوں کا پنجہ، نائیوں کا پنجہ، باہر کا پنجہ (ج
کام کرنے کے لئے جیل سے باہر جاتا ہے)، وغیرہ!

پوچا :۔ جیل کے تمام احاطوں اور تمام سڑکوں اور راستوں کو روزانہ گندی حوضیوں کے پانی سے قیدیوں اور حوالاتیوں کے ہاتھوں
جاتا ہے۔ اور مفت کی انسانی محنت کے لئے جیل میں سب سے بڑا قیمتی مصرف یہی ہے۔ "پوچا کرنا اور پوچا پھیرنا" عام محاورہ

نا :۔ نمبردار کو نمبرداری کی علامت کے طور پر جیل کی طرف سے ایک پٹی ملتی ہے۔ اور جب نمبرداری چھن جاتی ہے تو پٹی واپس لے لی جاتی ہے۔ اسی سے محاورہ بن گیا ہے کہ "فلاں کی پٹی اتر گئی"۔

نا :۔ کسی شکایت یا کوتاہ کاری یا غلطی کی وجہ سے نمبردار یا عام قیدی کو جب کسی افسر کی طرف سے طلب کیا جاتا ہے تو اسے "پیشی" کہتے ہیں۔ قیدی کے لئے پیشی بڑی خوفناک چیز ہے۔ "پیشی ہو گئی" یا "پیشی کرا دی" وغیرہ مروّج محاورے ہیں۔

لا :۔ قیدی نمبردار کو پہلے اسٹیج میں عام قیدی کے سے خانہ دار کپڑے ملتے ہیں۔ پھر کالی پگڑی اور کالی شلوار کی وردی ملتی ہے۔ اور قید کی ایک خاص مدت اچھی طرح گزار دینے پر پیلی پگڑی اور پیلی شلوار کی وردی دی جاتی ہے۔ یہ نمبردار کی ترقی کا آخری درجہ ہے جسے پیلی وردی مل جائے۔ اسے "پیلی والا" کہتے ہیں۔

ا" :۔ مراد ہے "پرائیوٹ پرسن"۔ یعنی وہ محدود رقم جو قیدی یا نظربند کے نام پر جیل کے دفتر میں جمع کرائی جائے اور جس میں سے وہ جیل کے نظام کی معرفت دودھ، سگریٹ یا دوسری ضرورت کی چیزیں خرید سکے

(ت)

:۔ مونج کا ۶ x ۲ فٹ ٹاٹ جو قیدی کو نیچے بچھانے کے لئے ملتا ہے۔

:۔ نئے قیدی، حوالاتی یا نظربند کے داخلے پر ڈیوڑھی میں تلاشی لی جاتی ہے اس کے علاوہ چونکہ ممنوعہ اشیاء کی ناجائز درآمد ہوتی رہتی ہے اس لئے وقتاً فوقتاً جیل کے اندر بارکوں اور کوٹھڑیوں کی تلاشی کبھی خود جیل کا عملہ لیتا ہے کبھی آئی۔جی کے دفتر کے لوگ! دو مرتبہ ہماری تلاشی لی گئی۔ اکتوبر، نومبر میں موجودہ آئی۔جی صاحب نے بڑی سخت گیری سے پے درپے تلاشیاں لی ہیں۔

:۔ سیفٹی ایکٹ کے سیاسی نظربندوں کی قید قیدِ بے میعاد ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر چھ مہینے کے خاتمے پر مزید توسیع کی جا سکتی ہے۔ اور کی جاتی رہی ہے۔ جیل کے اندر ہی وارنٹ افسر جا کر حکمنامے پر دستخط لے لیتا ہے جس کی میعاد بھی ختم ہونے کو آجاتی ہے وہ ہفتہ عشرہ پہلے سے امید و وہم میں مبتلا ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ اگر ایک خاص لمحہ تک رہائی کا حکم نہ ملے تو پھر وہ توسیع کے حکم کا منتظر ہو جاتا ہے ایسے میں جونہی وارنٹ افسر نمودار ہوتا ہے تو نعرہ بلند ہوتا ہے۔ "آگیا!" ــــ لیکن کون آگیا؟ اس ہلاکو پر کرنے کے لئے "توسیعا" کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ مراد ہے "توسیع کا حکم لانے والا!"

(ٹ)

:۔ ہر قیدی کے لئے ایک خاص فارم چارٹ کی شکل میں مرتب کیا جاتا ہے جس پر اس کی سزا، مشقت، ملاقاتیں، معافی وغیرہ درج ہوتی ہے۔ اسے ٹکٹ کہتے ہیں۔ یہ قیدی کے پاس رہتا ہے۔ ہم نظربندوں کے بھی ٹکٹ تھے جو ہماری کوٹھڑیوں کے آگے لٹکے رہتے تھے ان ٹکٹوں میں ایک خانہ اس جرم اور دفعہ کا بھی ہوتا ہے جس کے تحت سزا دی گئی ہو۔ اس خانے میں دفعہ ۳ سیفٹی ایکٹ لکھا گیا تھا۔

(ج)

:۔ جیل کی اصطلاح میں قیدی کو جوان کہتے ہیں۔ مثلاً سیاست خانے کے دور میں رات کو ڈیوٹی والے نمبردار ایک ایک کوٹھڑی کے سامنے آکر بار بار پوچھتے تھے۔ "کتنے جوان؟" اور ہم جواب میں کہتے تھے "تین جوان!" (ایک کوٹھڑی میں تین آدمی ہوتے تھے)

بریڈ :۔ (ملاحظہ ہو: کٹ پریڈ!)

ٹ :۔ خبریں جیل میں کچھ تو خودرَو ہوتی ہیں جو غیر معمولی رعایت کے کھاد کے زور سے قیاس آرائی کے تخم سے پھوٹتی ہیں۔ اور کچھ واقعی خبریں مبالغے کے کیمیاوی عمل سے گزر کر اصل سے سَو گنا بڑی اور وزن دار ہو جاتی ہیں۔ اور کچھ "بلی کے خواب" کی قسم کی ہوتی ہیں۔

[illegible] ان خبروں کی نوعیت کو واضح کرنے کے لئے "جیل گزٹ" کی اصطلاح ایجاد کی گئی ہے۔ "جیل گزٹ" ایک ایسا اخبار ہے جو قلم کاغذ اور پریس کے بغیر روزانہ کئی کئی ایڈیشن نکالتا ہے۔ اور مفت تقسیم ہوتا ہے۔

(چ)

چالان آنا، چالان جانا :- قیدیوں کے گروپ وقتاً فوقتاً ایک جیل سے دوسرے جیل کو بھیجے جاتے رہتے ہیں۔ اسی کو چالان آنا اور چالان جانا [کہتے ہیں۔]

چپاڈر :- ملتان جیل میں چیف وارڈ کو قیدی "چپاڈر" کہتے ہیں۔ اب یہ اصطلاح سنٹرل جیل لاہور میں بھی آپہنچی ہے۔

چکر :- مختلف بڑے بڑے احاطوں کو ایک دائرے کی صورت میں بنایا جاتا ہے اور ہر دائرے کے مرکز میں کھلی جگہ ایک دفتر ہوتا [ہے۔] مرکزی حصے کو چکر کہتے ہیں۔

چکر منشی :- ہر چکر کے دفتر میں ایک دو قیدی بطور کلرک کام کرتے ہیں، یہ چکر منشی کہلاتے ہیں۔

چکیاں :- وہ کوٹھڑیاں جن میں قیدیوں کو قید تنہائی میں رکھا جاتا ہے۔

چکی بند کرنا :- مراد ہے قید تنہائی (چوبیس گھنٹے کی بندش) کی سزا دینا۔ جیل کا سپرنٹنڈنٹ جیل کے نظم و نسق کی خلاف ورزی پر [زیادہ سے زیادہ] چودہ روز کے لئے قیدی کو چکی بند کرسکتا ہے۔

"چل بھائی" :- جیل کے احاطے کی دیوار کے پہرے دار رات بھر باہم ایک دوسرے کو پکارتے ہیں۔ ایک کہتا ہے "چل بھائی" دوسر[ا کہتا ہے] "سب اچھا!"

چھبیس نمبر :- یہ اس سالن کا اصطلاحی نام ہے جو گھاس پات کو ابال کر ایک سبز مرکب کی صورت میں ساگ کے نام سے سی کلاس [کے قیدیوں] اور نظربندوں کو دیا جاتا ہے۔

چھوٹا داروغہ :- ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل!

چیف وارڈ :- وارڈوں کا سب سے بڑا افسر!

(ح)

حوالاتی :- وہ زیرِ حراست قیدی جس کا مقدمہ زیرِ سماعت ہو اور جسے ابھی سزا نہ ملی ہو۔

(خ)

خبر :- جیل کی دنیا میں "خبر" کا اطلاق صرف ایسی باتوں پر ہوتا ہے جو قیدیوں بلکہ بالخصوص نظربندوں کے لئے رہائی کا [باعث ہوں۔] دوسرے نمبر پر توسیع کی اطلاع بھی خبر شمار ہوتی ہے اس کے علاوہ "خبر" کوئی چیز ہے تو صرف وہ اطلاعات جو جیل کے [اندرونی] واقعات سے متعلق ہوں۔

ختم نبوت والے :- پنجاب کی اضطرابات کے سلسلے میں جن لوگوں کی گرفتاری یا نظربندی عمل میں آئی ہے یا جن کو سزا دی گئی ہے ان کو عام [قیدیوں سے] ممیز کرنے کے لئے "ختم نبوت والے" کی اصطلاح وجود میں آئی ہے۔

خطرہ کا الارم :- (ملاحظہ ہو: الارم)

(د)

داروغہ :- سپرنٹنڈنٹ جیل

دال :- وہ کالے خاکستری رنگ کا مرکب جسے دال کا نام دے کر سی کلاس کے قیدیوں اور نظربندوں کو کھلایا جاتا ہے۔

میں اس کا مقام اتنا نمایاں ہے کہ "جیل کی دال کھانا" تقریباً محاورہ بن گیا ہے۔

:۔ ڈیوڑھی کے دروازے کا وہ نگران جو گن گن کر آنے والوں کو داخل اور خارج کرتا ہے۔ نیز ڈیوڑھی میں تلاشی لیتا ہے۔

والے :۔ مراد ہے۔ نظر بند جو سیفٹی ایکٹ کی دفعہ ۳ کے تحت گرفتار کیے گئے ہوں۔

:۔ سی کلاس کے قیدیوں، نظر بندوں اور حوالاتیوں کو صبح کے ناشتہ میں ہفتے میں تین روز گندم کے ابلے ہوئے دانوں میں گڑ ملا کر دیا جاتا ہے۔ یہ دلیہ کہلاتا ہے۔ یہ ایک نعمت غیر مترقبہ کی سی قدر قیمت رکھتا ہے

رکنا :۔ کبھی کبھی بیرکوں اور کوٹھڑیوں میں چونے کے پانی میں دسی ڈی ملا کر چھڑکی جاتی ہے۔ اس عمل کو دوائی چھڑکنا کہتے ہیں

:۔ جو قیدی دوسری مرتبہ سزا پا کر جیل آتا ہے۔ اسے "دوبارہ" (اسم صفت) کہتے ہیں۔ اور وہ قیدیوں میں فاروڈ پوزیشن رکھتا ہے۔ اس واحد کی جمع ہے "دوبارے!"

(ڈ)

:۔ آزاد دنیا اور جیل کی دنیا کا عالم برزخ، جو سپرنٹنڈنٹ، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اور ماتحت افسروں اور کلرکوں کے دفاتر پر مشتمل ہوتا ہے۔

(ر)

آنا :۔ رہائی کا جب حکم یا بلاوا آتا ہے تو کہتے ہیں۔ "رہائی آگئی!"

(س)

اچھا" :۔ شام کی گنتی کے بعد جب سارے انتظامات مکمل کر کے چیف وارڈ تک پہنچا دیئے جاتے ہیں اور بیرکوں اور کوٹھڑیوں کی کنجیاں ڈیوڑھی میں جمع ہو جاتی ہیں تو اصطلاحاً کہا جاتا ہے کہ "سب اچھا ہو گیا" یا "سب اچھا کر دیا"۔ اس کے بعد پھر ایک بگل ہوتا ہے اسے "سب اچھا" کا بگل کہتے ہیں جیل کے احاطے کی دیوار کے پہرے دار رات بھر باہم اگر آوازیں دیتے ہیں تو ایک کہتا ہے "چل بھائی" دوسرا جواب دیتا ہے "سب اچھا!"

جیل نیوز سروس :۔ خبر رسانی کا یہ وہ پراسرار نظام ہے جو سیاسی قیدیوں اور نظر بندوں میں عموماً اور جماعتِ اسلامی سے تعلق رکھنے والے محبوسین میں خصوصاً کام کرتا ہے۔ اس کو "س، ج" نیوز سروس بھی کہتے ہیں۔

ر :۔ نظر بندوں کی آنے جانے والی ڈاک کی جانچ پڑتال کا نظم جو سی، آئی، ڈی کے تحت ہے۔ یہ نظم اتنا شاندار ہے کہ کتنے ہی خطوط سرے سے غائب ہوتے رہے اور کئی دو دو ماہ بعد ملے۔ مثلاً بعض قیدیوں کے عزیزوں نے عید الفطر کے لئے جو عید کارڈ بھیجے وہ عید الضحےٰ پر نظر بندوں کو ملے۔

ل کرنا :۔ پریڈ کے دن جب سپرنٹنڈنٹ یا ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ معائنے پر آتا ہے تو وہ قیدیوں اور نظر بندوں کو اذن دیتا ہے کہ کوئی مطالبہ یا شکایت ہو تو پیش کرو۔ اس کے لئے اصطلاح مقرر ہے۔ "سوال کرنا" یہ اصطلاح جس ذہنی فضا میں بنی ہے — وہ درحقیقت جیل کے افسروں کی شانِ خداوندی اور قیدیوں کے مقامِ بندگی سے ترکیب پاتی ہے قیدی کو اپنے خداوندوں کے حضور سوالی بننا پڑتا ہے۔

ست خانہ :۔ سنٹرل جیل لاہور کا وہ عذاب خانہ جو نظم و نسق کو توڑنے والے قیدیوں کی تادیب کے لئے مخصوص کیا گیا ہے اس کی کوٹھڑیاں کچی، تنگ، بوسیدہ، نیچی چھتوں کی اور تاریک ہیں۔ اور ان کا رخ ایسا رکھا گیا ہے کہ گرمیوں میں دھوپ تو لگ سکتی ہے۔ لیکن

ہوا کا گذر نہیں ہو سکتا۔ اور سردیوں میں خوب ٹھنڈی رہتی ہیں۔ ۸ × ۱۰ فٹ کی ان کوٹھڑیوں میں جو صرف سوا دو فٹ چوڑا ایک دروازہ رکھتی ہیں۔ تحریک ختم نبوت کے نظر بندوں کو بسا اوقات سات سات کی تعداد میں بھی اپریل مئی میں بند رکھا گیا ہے۔ سیاست خانے میں جیل کے بدترین ختامی نمبردار مقرر تھے جن کی ہیبت ناک شکلیں اور لمبی لمبی ٹیڑھی ٹیڑھی مونچھیں اور جن کی بدسیرتی قابل فراموش چیزیں ہیں۔ اس حصے پر مذکورہ بالا دور میں جو سنگدل ہیڈ وارڈر صاحب مقرر تھے ان کا نام عام لوگوں نے تو بہت ہی گھٹیا رکھا تھا۔ لیکن مہذب لوگ بھی مجبور تھے کہ ان کو قانونی شاہ کے نام سے اسم با مسمیٰ بنا دیں۔ ان کی قانونیت نے انسانیت کی بنیادی قدروں تک کو پامال رکھا ہے۔

سیٹی دینا :۔ نمبردار کو ایک سیٹی ملتی ہے۔ اگر قیدی باہم لڑنے یا نمبردار سے کوئی تصادم کر بیٹھیں تو وہ سیٹی بجاتا ہے۔ اس پر فوراً الارم ہو جاتا ہے۔ الارم پر گارد آتی ہے اور اگر پوری بیرک یا احاطے کے لوگوں کو بلا تحقیق پہلے تو ڈنڈوں سے خوب پیٹتی ہے۔ پٹائی کے بعد پھر واقعہ کی چھان بین کی جاتی ہے اور قصور وار اور بے قصور کی تحقیق ہوتی ہے۔ "سیٹی دے دی" ــــ "سیٹی ہو جائے گی" ــــ "سیٹی بجا دوں گا" وغیرہ محاورے رائج ہیں۔

"سی" کلاس :۔ قیدیوں اور سیاسی نظر بندوں کا وہ عام درجہ جس میں غذا، لباس اور رہن سہن ہمارے ملک کے بھکاریوں کے درجے کا ہوتا ہے نظر بندوں کے لئے اس کلاس کا نیا نام کلاس III ہے اور یہ وہ معزز کلاس ہے جس میں مولانا مودودی جیسی نمایاں ہستیاں بھی رہ چکی ہیں۔

سی کلاسیا :۔ سی کلاس کے قیدی یا نظر بند کو "سی کلاسیا" کہا جاتا ہے۔ اس کی جمع ہے۔ "سی کلاسیئے"!

(ص)

صاحب بہادر :۔ سپرنٹنڈنٹ جیل کو صاحب بہادر بھی کہا جاتا ہے۔ انگریزی راج جا چکا۔ مگر قوم کو ابھی تک صاحب بہادروں سے نجات نہیں ملی۔

(ک)

"کالی والا" :۔ اخلاقی قیدی جب نمبردار رہ کر ایک خاص مدت گزار لیتا ہے تو اس کے مرتبے میں ترقی دے کر کالی پگڑی اور کالی شلوار کی وردی دی جاتی ہے۔ اس صورت میں وہ "کالی والا" کہلاتا ہے۔

کلاس I :۔ نظر بندوں کی نئی درجہ بندی کے لحاظ سے وہ کلاس جو پہلے اے کلاس کہلاتی تھی۔ اس کلاس میں تحریک ختم نبوت کے نظر بندوں میں سے صرف دو اصحاب کو لیا گیا ہے۔ ایک شیخ حسام الدین، دوسرے صاحبزادہ فیض الحسن!

کلاس II :۔ نظر بندوں کی بی کلاس کو توڑ کر نون گورنمنٹ نے اس کی جگہ یہ نئی کلاس بنا دی ہے۔ اس میں غذا بی کلاس کی اور رہن سہن سی کلاس کا ہے۔ یعنی سیاسی نظر بند کی کلاس II اخلاقی قیدی کی بی کلاس سے بہت فروتر ہے۔ جماعت اسلامی، مجلس احرار اور دوسرے غیر جماعتی نظر بندوں میں سے نمایاں ترین افراد تک کو اسی کلاس سے نوازا گیا ہے۔

کلاس III :۔ نظر بندوں کی یہ کلاس اخلاقی قیدیوں کی سی کلاس کے برابر ہے۔ اور اس کلاس میں ختم نبوت کی تحریک کے نظر بندوں کی اکثریت کو رکھا ہے اور ممتاز اور نمایاں افراد تک اس سے فیض یاب ہوتے رہے ہیں اور ہو رہے ہیں۔

کوٹ موکا :۔ کوٹ قلعے کی فصیل کو کہتے ہیں اور موکا دراصل "موقع" کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ مراد ہے حفاظتی اہمیت رکھنے والا موقع! یہ اصطلاحی نام ہے جیل کی چار دیواری کا! جن لوگوں کی ڈیوٹی جیل کی فصیل پر لگتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "کوٹ موکا پر ڈیوٹی ہے"۔

:- جب کسی قاتل کو پھانسی کی سزا سنا دی جاتی ہے تو اسے پھانسی کی کوٹھڑی میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ اس حالت کو یوں کہتے ہیں کہ "فلاں کو کوٹھی لگ گیا ہے" یا "فلاں کی کوٹھی لگ گئی!"

:- جب کسی پھانسی والے کی پھانسی کی سزا بحال رہے۔ یا سزا قید میں بدل جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ "فلاں کی کوٹھی ٹوٹ گئی!"

:- قیدی سے بعض قصور یا گستاخیاں یا افسروں کو ناراض کرنے والی کچھ حرکات ہو جاتی ہیں تو بیسا اوقات اس پر ضابطے کی کارروائی کرنے کے بجائے یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ نمبرداروں کا ایک گروپ قیدی کو پکڑ کر زمین پر پٹخ دیتا ہے اور پھر جوتوں سے، پیٹیوں سے، لاتوں اور مکوں سے اندھا دھند اس کی پٹائی کرتا ہے۔ اسے کٹ پریڈ کہتے ہیں۔

(گ)

:- صبح و شام دو مرتبہ پورے جیل کے قیدیوں کی گنتی ہوتی ہے۔ اس سے حسب ذیل محاورے بنتے ہیں :-
(۱) گنتی بند ہو گئی۔ یعنی گنتی کر کے قیدیوں کو بیرکوں اور کوٹھڑیوں میں مقفل کر دیا گیا ہے۔
(۲) گنتی کھل گئی۔ یعنی گنتی کرنے کے بعد قیدیوں کو بیرکوں اور کوٹھڑیوں سے نکال دیا گیا ہے۔
(۳) گنتی اٹھا دو۔ یعنی گننے کے لئے قیدیوں کو جگا کر کھڑا کر دو۔ (یہ اس لئے کہ کوئی بستر پر پڑے پڑے مر نہ گیا ہو، یا کمبل یا چادر کے نیچے اپنے بجائے کپڑوں اور سامان وغیرہ کا ڈھیر لگا کر فرار نہ ہو گیا ہو۔)

:- پہرہ داروں اور وارڈروں کے کام کی نگرانی کے لئے وارڈروں کا ایک خاص دستہ دن رات ایک خاص قسم کی گھڑی لٹکائے گشت کرتا رہتا ہے اور اس گھڑی کو چلتا رکھنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ جیل کے مختلف حصوں میں خاص نمبروں کی جو چابیاں مستقلاً لٹکائی رکھی جاتی ہیں۔ ان سے اس میں کوک بھری جاتی رہے۔ ورنہ گھڑی رک جاتی ہے اور بتا دیتی ہے کہ گشت کرنے والے وارڈر نے کوتاہی کی ہے۔ گھڑی گشت کے بعد ڈیوڑھی میں پیش کی جاتی ہے۔ اس سسٹم کو گھڑی گشت کہتے ہیں۔

:- جیل کے اندر سارے چکروں کے ذیلی دفاتر کو مربوط رکھنے والا مرکزی دفتر جو براہ راست ڈیوڑھی کے تابع ہوتا ہے اور جس کا انچارج چیف وارڈر ہوتا ہے چونکہ خطرے کی گھنٹی اسی دفتر کے ساتھ ہوتی ہے اس لئے اسے گھنٹی گھر کہتے ہیں۔

(ل)

:- یہ صحیح معنوں میں ایک انسانی پنجرہ ہے۔ ایک چبوترے کو چاروں طرف سے جنگلا لگا دیا گیا ہے۔ اوپر ٹین کی چھت ہے اس میں "دہ یارے" اور "سہ بارے" جن کو باہر منتقل کیا جانا ہوتا ہے عارضی طور پر رکھے جاتے ہیں۔ گرمیوں میں لُو اور دھوپ اور سردیوں میں ٹھنڈی ہوا نیز بارش اور آندھی کے مقابلے میں اس پنجرے کے اسیروں کے لئے کوئی پناہ نہیں ہوتی۔

(م)

:- مراد ہے وہ تمام لوگ جو مارشل لا کے تحت گرفتار کئے گئے تھے۔

:- سزا یافتہ قیدیوں کا وہ مقررشدہ بدنی محنت کا کام جو "زیادہ محنت کم حاصل" کے اصول پر اس اہتمام کے ساتھ لیا جاتا ہے کہ اس میں سزا اور تذلیل کا پہلو بھی کارفرما ہے۔ جو قیدی اس آزمائش میں ڈالا جاتا ہے۔ اسے مشقتی کہتے ہیں۔

:- ایک غیر سرکاری اور غیر منظم محکمہ جو خدمتِ خلق کا ذات رکھنے والے آنریری کارکنوں کے بل پر چلتا ہے اور جس کا مقصود یہ ہے کہ خبروں کو ایسی شکل دے اور ضرورت ہو تو ایسی خبریں گھڑتا رہے جس سے قیدیوں، بالخصوص سیاسی نظر بندوں کو رہائی کے خواب دیکھنے میں آسانی ہو۔ ختم نبوت کی تحریک کے تحت جب جیل میں سیاسی لوگوں کی آبادی زیادہ بڑھ گئی تو اس محکمہ میں خاص توسیع کی گئی۔

محکمہ طفل تسلیات عام :- حب جبرول کو خوش آئند بنانے کے لئے محکمہ تسلیات عام کو مناسب مواد نہیں ملتا۔ اور اس کا کام ٹھنڈا پڑجاتا ہے تو پھر کھل کھلی مضحکہ انگیز قیاس آرائیوں سے جو دوسرا محکمہ خلاء کو پر کرتا ہے وہ اس نام سے موسوم ہے۔ اس محکمے کا شاہکار یہ تھا کہ ـــــ شاہ عبدالاحد (مسجد مائی لاڈو والے) نے ایک مرتبہ کئی سال پہلے کے اخبار سفینہ کی ایک خبر لوگوں کو دکھائی۔ جس کی رو سے مرکزی وزارت میں ادل بدل ہونے والا تھا۔ اور پھر یہ خبر پھیل گئی کہ ظفر اللہ خاں کو نکالا جا رہا ہے۔

معافی :- قیدی کو برائے قواعد نظم و نسق کی پابندی کرنے کی صورت میں ہر سہ ماہی پر عموماً اور کسی خاص کارنامے پر خصوصاً قید کے چند دن معاف کئے جاتے ہیں۔ اسے معافی کہتے ہیں۔ محاورہ یہ ہے کہ فلاں کو پندرہ دن کی معافی مل گئی۔ اس کے برعکس جو قیدی غلطی کرے۔ یا نظم کو توڑے یا کام میں کوتاہی دکھلائے یا افسر کو ناراض کردے۔ اسے معافی سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اسے کہتے ہیں کہ "معافی کٹ گئی" یا "معافی کاٹ لی گئی!"

ملاقات آنا :- قیدی یا نظر بند سے ہر پندرہ دن میں اس کے اعزہ ملاقات کر سکتے ہیں۔ جب کسی کے عزیز ڈیوڑھی میں درخواست داخل کرتے ہیں۔ اور اسے اطلاع دی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ "فلاں کی ملاقات آئی!" قیدی کی ملاقات ہوتی ہے تو جیل کے عملے کا کوئی رکن نگرانی کرتا ہے اور نظر بند کی ملاقات ہو تو سی۔ آئی۔ ڈی کی طرف سے نگرانی ہوتی ہے۔ اس کا اہتمام کرنے کے لئے جیل کے افسروں میں "ملاقاتیں کرانا" کا محاورہ رائج ہے۔

"موبل آئل" :- جیل کی دال (سی کلاس) اپنے رنگ اور شکل وصورت کے لحاظ سے اس نام سے موسوم ہو گئی ہے۔

مولوی :- تحریک ختم نبوت کے تحت جو لوگ قید و بند میں ڈالے گئے ہیں وہ "مولوی" کے نام سے موسوم ہیں۔ چنانچہ مولانا احمد علی ہوں یا ماسٹر تاج الدین انصاری، مسلم لیگی ہوں یا غنڈے سب کے سب مولوی شمار ہوتے ہیں۔ مثلاً گنتی کے وقت حساب یوں پکارا جاتا ہے... "پچاس مولوی ـــ چھ مشقتی!"

(ن)

نظر بند :- سیاسی قیدی جو بغیر کسی ثبوتِ جرم کے جیل میں لا رکھا گیا ہو۔

نفری :- قیدیوں کی کل تعداد کو نفری کہا جاتا ہے۔ مثلاً کہیں گے کہ "سنٹرل جیل میں کل نفری اتنی ہے!"

نمبردار :- لمبی قید والے قاتلوں اور ڈاکوؤں کو قابو میں رکھنے کے لئے انھیں عام قیدیوں پر فوقیت دینے کے لئے نمبرداری کا خاص منصب پیدا کیا گیا ہے۔ نمبردار کچھ تو لیڈری جماعت کے لئے اور کچھ خاص مراعات سے فائدہ اٹھانے کے لئے افسروں کا آلہ کار بنتا ہے۔ اور عام قیدیوں پر دھونس جمائے رکھتا ہے۔

"نواں" :- یہ لفظ "نیا" کا پنجابی ترجمہ ہے۔ پہلی مرتبہ کے سزا یافتہ قیدی کو "نواں" کہتے ہیں۔

(و)

وارث :- قیدی یا نظر بند کے ملاقاتیوں کو "وارث" کے لفظ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ڈیوڑھی سے دربان ملاقات کے لئے جب بلاوا دیتا ہے تو کہتا ہے کہ "فلاں ولد فلاں کے وارث آ جائیں!" یعنی جیسے وہ مر گیا ہے اور یہ اس کے وارث ہیں۔

وارڈر :- جیل کی عام نگرانی اور پہرے کے ذمہ دار عملے کا عام سپاہی وارڈر کہلاتا ہے۔ عام سپاہیوں پر ہر حلقہ میں ہیڈ وارڈر مقرر ہوتا ہے۔ ہیڈ وارڈروں سے اوپر جیل بھر میں ایک چیف ہیڈ وارڈر نگراں ہوتا ہے۔

(باقی صـ۴۸ـ پر دیکھئے)

انور صدیقی

عزم

ایک شاعر سوچتا ہے

میرے یہ گیت بہاروں کے پیامی بنکر
اپنے اُجڑے ہوئے گلشن کی فضا بدلیں گے
جن کی بیکار قیادت نے ہمیں لُوٹ لیا
اپنے اس دیش کے وہ راہنما بدلیں گے

وہ قیادت جو اندھیروں کے اُڑائے پرچم
اہلِ خورشید اسے کیسے گوارا کرلیں؟
غلبۂ حق کے لئے خون بہایا ہم نے
کیسے بندوں کی خدائی کو گوارا کرلیں؟

حق کی تحریک تو پابندِ سلاسل ہی سہی
اپنے سینوں میں ہیں ایمان کے شرارے رقصاں
دُور وہ دیکھ کہ زنداں کی سلاخیں ٹوٹیں
عظمتِ حق کا امڈنے لگا اک سیلِ رواں!

میرے گیتوں کو تو زنجیر نہ پہنا سکتے ہیں
رقص کرتی ہوئی کرنوں کو گرفتار کریں
چند بیمار سی موجوں کو اگر روک لیا!
اِن امڈتے ہوئے دھاروں سے تو پیکار کریں

ساتھیو! ظلمتِ شب اور بڑھے گی لیکن
ہم کو ہر راہ پہ اک شمع جلانی ہوگی
جس سے ظلمت کے خداؤں کے جلیں گے شہپر
ہم کو وہ صبح بہرحال ہی لانی ہوگی

افسر سلیم •

بھکاری

"ساڑھے تیرہ آنے ———"

ہوٹل بوائے کی گرجتی ہوئی آواز کے ساتھ اس نے پتلون کی جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکالا اور سیٹھ کے حوالے کر دیا لیکن سیٹھ نے اُسے بقایا واپس کیا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اور جب وہ ہوٹل کی سیڑھیاں اترنے لگا تو اس نے محسوس کیا کہ اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اور وہ جیسے کیلوں کے لاتعداد چھلکوں پہ سے پھسلا جا رہا ہے۔ ڈگمگاتے ہوئے قدموں کو اس نے فٹ پاتھ پر کسی قدر سنبھالا اور اپنے بدن کا تمام بوجھ ایک پاؤں پر ڈال کر بجلی کے کھمبے کے سہارے کھڑا ہو گیا ———

گرما کی شام بہت سہانی تھی۔ وہ پہلے بھی سہانی تھی۔ اب بھی سہانی اور شاید برسوں سہانی رہے۔ مگر اس کی نظروں میں ایک تاریک رات تیر رہی تھی۔ دو معصوم بھائی تین بہنوں اور ماں کو وہ گاؤں میں چھوڑ آیا تھا کہ کام ملتے ہی سب کو شہر لائے گا۔ چلتے وقت اس کی ماں نے اپنا آخری زیور صرافے کی نذر کر کے ڈیڑھ سو روپے حاصل کئے تھے اور یہی پونجی اب تک اس کا سہارا تھی۔ گیارہ سال کی محنت کے بعد حاصل کی ہوئی سند اس کی جیب میں پڑی اونگھ رہی تھی۔ اس نے اس سند کو بھکاریوں کے کاسے کی طرح کئی حکام کے سامنے بڑھایا تھا۔ مگر ملازمت کی بھیک کے لئے یہ کاسہ ہر جگہ تنگ تھا۔ گاؤں واپس جانے کا کرایہ تین روپے اور کچھ آنے ہوتا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اب اس کو لوٹ جانا چاہیئے ورنہ کرایہ کی رقم بھی ہوٹلوں کی نذر ہو جائے گی ——— لیکن گاؤں جا کر وہ کیا کرے گا۔ ماں کو کیا کہے گا۔ معصوم بہنوں کے آنسو کس طرح خشک کرے گا؟ پیٹ کی آگ کیونکر بجھائے گا ——— اس کے ذہن میں خیالات کی ریل دوڑ رہی تھی ——— اچانک اس نے محسوس کیا کہ اس کا وہ پیر جو بدن کا تمام بوجھ سہارے ہوئے تھا۔ گھٹنے کے نیچے سے ٹوٹ گیا ہے اور وہ منہ کے بل گرا چاہتا ہے ——— اس نے بدن کا بوجھ دوسرے پیر پہ لے کر پہلے کو زور سے جھٹکا دیا اور اس کے تمام بدن میں چیونٹیاں سی دوڑ گئیں ——— اس نے ایک جھرجھری سی لی ———

"کام کیوں نہیں کرتے ———" اس کے بالکل قریب سے آواز آئی ——— "جوان ہو کر محنت سے جی کیوں چراتے ہو ———"

اور اس نے منہ پھیر کر دیکھا کہ ایک موٹا تازہ وردی والا ایک بھکاری کو حقارت آمیز نظروں سے دیکھ رہا ہے ———

"حضور کام ملتا کہاں ہے ———" بھکاری نے کہا ....

"کام بہت ملتا ہے ——— مگر تم کو عادت جو بھیک مانگنے کی پڑی ہے۔ حرام خوری کا چسکا جو لگ گیا ———"

وردی والا بھکاری کو جھڑک کر چلا گیا ——— اور اس نے اپنے آپ سے پوچھا ——— "کام کیوں نہیں کرتے ———"

پھر اس نے بازوؤں پر نظر ڈالی اور زیر لب بڑبڑایا "جوان ہو کر محنت سے جی کیوں چراتے ہو" اور اسے محسوس ہوا کہ محنت کے نام سے اس کے بازو کانپ اٹھے۔ کاغذ پر قلم چلانے کی گیارہ سالہ عادت انھیں محنت کے لئے بیکار بنا چکی تھی۔ اسے اپنی تعلیم اور تعلیمی زندگی سے نفرت ہونے لگی۔ زندگی کی گیارہ بہاروں کے یونہی بیت جانے پر اس نے سرد آہ بھری اور دو قدم آگے بڑھ کر کھڑا ہو گیا۔

"جمہوریت ——— شام و سحر ——— انقلاب ——— الانصاف ———" ایک دس سالہ اخبار فروش اس کے سامنے سے گزرا۔ اس نے کمسن محنت کش کو غور سے دیکھا اور وہ اس کے قریب آ گیا

"کیا چاہیئے۔ بابو جی ———"

"ایک انقلاب ——— اپنی زندگی کے لئے"

"دو آنے ———" لڑکے نے جلدی سے اخبار نکالا ———

پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالے کچھ سوچ رہا تھا ——

"جلدی کیجئے بابو جی —— مجھے بہت سے اخبار بیچنا ہیں"

نوعمر لڑکا بڑبڑایا مگر وہ سوچتا ہی رہا اور لڑکا چلا گیا ——

چلا گیا —— اس نے انقلاب نہیں خریدا مگر تب بھی اس کی زندگی

کوئی انقلاب خود بخود چلا آیا —— جیسے اس کی زندگی ایک ہیجان

سے کو چھو کر تیزی سے حرکت میں آ گئی اور اس کے تمام بدن میں خون

نے لگا —— وہ لپک کر اخبار والے کے ساتھ ہو لیا ——

"روز کتنے اخبار فروخت کر دیتے ہو ——"

"یہی کوئی سو دو سو ——"

"کس قدر کما لیتے ہو ——"

"کوئی دو تین روپیہ ——"

"آ ہو ——!"

اور اس کے تاریک تصورات میں برق سی کوند گئی ——

دوسرے روز صبح اس نے چار روپے کے اخبار خریدے اور ریلوے

ن کے باہر کھڑا ہو گیا —— کارخانے کے ملازموں کو لے جانے

کل کا وقت ہو گیا تھا —— اور ہزاروں آدمی ہاتھ میں

چھوٹی تھیلیاں لئے جا رہے تھے —— بھیک منگوں کی ٹولیاں

رہی تھیں —— پھیلے ہوئے ہاتھ جھٹک کے جا رہے تھے۔ مگر لوگوں

پھیلانے کی عادت سی ہو گئی تھی۔

"الانصاف اور جمہوریت" کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں ——

ہاتھ میں [illegible] کا بنڈل لئے خاموشی سے سفید پوش بابوؤں کو

رہا تھا —— انہیں دیکھ کر اس کے دل میں آپ ہی آپ نفرت کا جذبہ

ابھرنے لگا تھا —— اس کی آواز گلے میں اٹک رہی تھی۔

دم گھٹا جا رہا تھا —— اچانک شام کا وردی والا اس کے قریب

ہوا "اور کام کیوں نہیں کرتے" کی زبردست آواز فضا سے ایک ہاتھ

اسے دھکیل دیا —— اس کے تمام بدن میں چیونٹیاں سی

—— اور "انقلاب" کی صدا سے اس نے فضا کا سینہ

—— جیسے دق کا کوئی مریض بڑی دیر کی کوشش کے بعد بہت سا

بلغم تھوک دے ——

اس کے بعد وہ ہر بابو کے سامنے "انقلاب" بڑھا رہا تھا ——

اور اس کی زندگی ایک نئے موڑ پر آ کر اپنا رخ بدل رہی تھی —— شام

کو اس کی جیب میں اپنی محنت کے کمائے ہوئے چند سکے تھے اس کے

اختیار میں اس کے اپنے قہقہے تھے۔ اور تصور میں ماں کا مسکراتا ہوا چہرہ

ناچ رہا تھا —— وہ "لطیف ریستوران" کے باہر بگنرا کے پل

پر جانے والی بس کے انتظار میں کھڑا تھا —— سامنے بیروزگاری

کے دفتر پر (Employment Exchange)

ایمپلائے منٹ ایکسچینج کا بورڈ لگا تھا اور اس بورڈ کے نیچے سے بہت سے

نوجوان ہاتھ میں ڈگریوں کا پلندہ لئے چلے آ رہے تھے —— ان کی

آنکھیں نم تھیں —— چہرے اداس اور لب خاموش تھے! اس نے

بہت غور سے ان مرجھائے ہوئے چہروں کو دیکھا اور محسوس کیا کہ خاموش

ہونٹ اچانک متحرک ہو گئے —— کام ملتا کہاں ہے ——

اور وہ زیر لب بڑبڑایا —— کام بہت ملتا ہے۔ مگر تم کو عادت

جو بھیک مانگنے کی پڑی ہے۔ سرکاری دروازوں پر جھولیاں پھیلا نے

کا درس جو لیتے رہے ہو —— ضمیر جو بھکاریوں کا سا رکھتے ہو،

—— بھکاری —— اور بھکاریوں کا ایک گروہ اس

کے سامنے سر تسلیم خم کئے گزر گیا —— اس نے اس گروہ کو نفرت

بھری نظروں سے دیکھا اور منہ پھیر لیا ——

بگنرا کے پل جانے والی بس آ گئی —— وہ بس میں

سوار ہو گیا بس کنڈکٹر اس کے قریب آیا۔ مگر ایک سرسری نظر ڈالتے

ہوئے گزر گیا۔ وہ کچھ دیر دوانی ہاتھ میں لئے اس کے واپس آنے کا

انتظار کرتا رہا، مگر دوسری بار بھی کنڈکٹر نے بے اعتنائی برتی ——

اس نے ٹکٹ کے لئے اصرار کرو" کی ہدایت پڑھی۔ اور کنڈکٹر کو آواز

دی۔ مگر اب وہ کسی عورت سے باتوں میں مشغول ہو گیا تھا ——

کچھ دیر بعد بگنرا کا پل آ گیا —— اس نے کنڈکٹر کے کاندھے پر

ہاتھ رکھ کر اسے مخاطب کیا اور کنڈکٹر اسے کنکھیوں سے دیکھنے لگا

—— اس نے ٹکٹ کہہ کر اس کے ہاتھ پر دوانی رکھ دی ——

کنڈکٹر کی تشکر آمیز نظروں میں مسکراہٹ جیسے کسی فقیر کے کاسے میں پیسہ

بیٹھا ہو ـــــ اس کے ہونٹوں پر ایک نفرت آمیز ہنسی ابھر کر آئی ـــــ بھکاری ـــــ بھکاری کہیں کا ـ"

اور وہ بس سے نیچے اتر گیا ـــــ

انگریز کاری گروں کے ہاتھ کا بنایا ہوا برگنز کا خوبصورت پل شہر کے متوالا تلے کی گنگا کی چھپی سیاہ رات میں ایک فاحشہ کی طرح جگمگا رہا تھا ـــــ برقی قمقمیاں اس کے جسم پر پھولوں کی طرح جھلک رہی تھیں ـــــ اور ان قمقموں کے نیچے اس کا سایہ کبھی پھیلتا اور کبھی کم ہوتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا ـــــ وہ سوچ رہا تھا اس معرکے پر کتنے بھکاری بستے ہیں

نفیس کپڑوں میں ملبوس کوئی سیٹھ جی کا سب سے بہترین ... سے تین آنے کے لئے کوئی سوکھا ہاتھ پھیلا رہا ہے ـــــ کسی کا ریشمی آنچل جھول رہا ہے اور کسی کی شرابی آنکھیں کشکول ـــــ قدم قدم پر بھکاری ہیں، قدم قدم پر فریب ـــــ اور ان بھکاریوں سے بچتا ہوا اس کا ہر قدم سنبھل سنبھل کر اٹھ رہا تھا ـــــ

ـــــ کہ بابو جی ـــــ آگ کہہ کر اچانک ایک وردی والے نے ان قدموں کو روک دیا ـــــ اس نے جلتی ہوئی بیڑی کا آخری ٹکڑا وردی والے کے حوالے کیا اور پھر بے اعتنائی سے قدم قدم بڑھانے لگا۔ وردی والے کے سینے پر پیتل کے پانچ انگریزی ہندسے (۵۲۴۹۱) بڑے فخر سے چمک رہے تھے مگر اس کی بے پرواہ رفتار میں کوئی فرق نہ آیا ـــــ وردی والا سینے پر ہاتھ پھیر کر زور سے کھنکارا مگر اس بے وقت کی شہنائی پر اس نے کان نہ دھرے ـــــ وہ کچھ آگے بڑھا اور پل کی منڈیر پر کہنیاں ٹکائے گنگا پر پھیلے ہوئے قمقموں کے جال میں الجھ گیا ـــــ

جوں جوں رات تاریک ہوتی گئی قمقمیاں اور روشن نا معلوم ہونے لگیں ـــــ راستہ کہنے جنگل سا مدھم پڑتا گیا ـــــ

اور خاموشی سے اس کے خیالات میں ہزاروں سیپ چلا ... ـــــ کسی کمہار کو [illegible] وردی والا [illegible] گر [illegible] ـــــ [illegible] ایک ـــــ [illegible] کتنی مشکل سے حاصل ہوتا ہے۔ کتنے ضمیر فروشوں کو صاحب

مرزا جی، منشی جی اور پنڈت جی کے خطابات سے گھلنا ہوتا ہے تب کہیں شام و سحر کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے کتنی سسکیاں بک جاتی ہیں جب ایک کہکشاں کی نیت آتی ہے کتنی عرق ریزی کا کھیل ہوتی ہے تب کہیں پیٹ کے دیوتا کو آرتی میسر آتی ہے اور یہ کالج کے نکھٹو نوابوں کے صاحب زادے کس بیدردی سے دولت کو لٹا دیتے ہیں باپ کے پسینہ کو کس بے فکری سے چھوڑ رہے ہیں کہ بہتے گٹر کے پانی کی طرح ہر کس و ناکس میں بانٹ دیتے ہیں۔ کاش انہیں کوئی سمجھائے کہ روپیہ کتنی مشکل سے حاصل ہوتا ہے

وہ سوچ رہا تھا اور وردی والا بار بار اسے قریب سے دیکھتا ہوا گشت لگا رہا تھا ـــــ رات کی تاریکی کے ساتھ اس کے خیالات بھی پھیل رہے تھے ـــــ زندگی اور زندگی کی دشواریوں کے خطوط اس کے ذہن میں ابھر رہے تھے۔ ٹیڑھے میڑھے خطوط بن رہے تھے بگڑ رہے تھے ـــــ اور وہ وہ ان خطوط سے دنیا کا حسین خاکہ بنانے میں منہمک تھا ـــــ لیکن اچانک کسی کی نرم و گرم انگلیوں نے اس خاکہ کو مٹا دیا۔ کسی کے ملائم ہاتھ اس کی پیٹھ کو چھو گئے اور وہ چونک پڑا ـــــ اس نے منہ پھیر کر دیکھا۔ ایک جوان عورت پھٹی ہوئی ساری میں اپنے شباب کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں التجا تھی مگر چہرے پر تمکنت ـــــ اس کے بال الجھے ہوئے تھے مگر مانگ سیدھی تھی ـــــ اس نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور عورت کے ہونٹ کچھ کہنے پر مائل ہوئے مگر اس وقت وردی والا جوتے پھٹکارتے ہوئے آ پہنچا۔ اور غرایا

حرام زادی اتنی رات گئے کیا لینے نکلی ہے۔ بھاگ یہاں سے ـــــ

اور وہ چلی گئی۔ وردی والا بھی بڑبڑاتے ہوا آگے بڑھ گیا ـــــ رات کو بھی چین نہیں لینے دیتے کمبخت ـــــ ہزار دفعہ کو جیل میں ٹھونس دو۔ مگر باز نہیں آتے اپنی حرکتوں سے ـــــ"

وہ وردی والے کو بہت دیر تک دیکھتا رہا ـــــ جب وہ نظروں سے نکل گیا تو عورت پھر اس کے پاس آئی۔

"کیا چاہیئے ـــــ؟" اس نے پوچھا

"کچھ نہیں ـــــ"

"پھر چکی کیوں کاٹ رہی ہو"
"میرے ساتھ چلو بابو جی"
"کہاں"
تاریکی میں"
"کیوں؟"
"اس لئے کہ میں بھوکی ہوں مجھے روٹی چاہیئے"
"روٹی چاہیئے تو پیسہ مانگو" اس نے جلدی سے
ایک روپیہ کا نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا
"یونہی نہیں بابو جی"
"کیوں؟"
"اس لئے کہ میں بھکارن نہیں ہوں"
"بھکارن نہیں ہو" اس نے سب کچھ
سمجھتے ہوئے بھی پوچھا "پھر"
"ہاں میں بھکارن نہیں ہوں"
"میں اپنے ضمیر کا سودا چکاتی ہوں اور قیمت لیتی ہوں"
وہ عورت کی اس بیباک گوئی پر گھبرایا اور جلدی سے بولا۔
"تو پھر میں تمہیں کچھ نہیں دے سکتا"
"کیوں؟"
"کیونکہ میں ضمیر فروش نہیں ہوں" پسینہ
بہاتا ہوں۔ روپیہ کماتا ہوں حلال کی روزی کماتا
ہوں۔ اس لئے حرام پر نیت نہیں رکھتا"
"تو پھر معاف کر دیا بابو" عورت چل
گئی اور وہ مجبوراً دیکھتا رہا اس کے بال
الجھے ہوئے تھے مگر مانگ سیدھی وہ دیر تک
اُسے دیکھتا رہا پھر وہ کہیں تاریکی میں ڈوب گئی
وہ بھی کچھ دیر وہاں کھڑا رہا۔ اور پھر اسی طرف
چل پڑا پل کے آخری سرے پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ ایک پل
کے تاریک سایہ میں سے وہی عورت بڑبڑاتی ہوئی نکل رہی ہے
مجھے بدمعاش کہنے والا خود بدمعاش ہے
حرام خور کہیں کا
اور اس نے آگے بڑھ کر دیکھا کہ پیپل کی چھاؤں میں
وہی موٹا تازہ وردی والا اپنے بدن کا جوڑ جوڑ توڑ رہا ہے
اس نے بیڑی جلانے کے بہانے
دیا سلائی کھینچی اور وردی والے بیلٹ پر
پانچ پیتلیوں کی بجائے پانچ حروف ابھر آئے
"پ۔ ک۔ ا۔ ر۔ ی"
(بشکریہ معیار)

ایک گزارش

ادارہ مشیر اپنے قلمی معاونین کی خدمت میں گزارش کرتا ہے کہ
اپنی نگارشات روانہ فرماتے وقت ان پر اپنا صحیح نام اور مکمل پتہ
ضرور درج فرمائیں۔ مصنف کے نام اور مکمل پتے کے بغیر کوئی نگارش
قابل اشاعت نہ ہوگی۔
مدیر ماہنامہ مشیر، بندر روڈ کراچی نمبر ا

راغب مرادآبادی

عروجِ آدمِ خاکی

بگوشِ ہوش جو کوئی سُنے تو اے راغب
ہر ایک ذرّہ سُناتا ہے زندگی کا پیام
یہ موجِ برق، یہ نورِ سحر، یہ رنگِ شفق
خدا گواہ ازل سے ہیں آدمی کے غلام
مآلِ خندۂ گل، زندگی سے محرومی
سرورِ بادۂ عیش و طرب ہے غم انجام
حیات و موت کو تو مطمحِ نظر نہ بنا
بہت بلند ہے اے غافل آدمی کا مقام
فسردہ گام ابھی آمادۂ سفر ہیں تو کیا
قریبِ منزلِ مقصد ہیں تند و تیز خرام
تجھے خبر بھی ہے اے خوگرِ نشاطِ جہاں
"عروجِ آدمِ خاکی کے منتظر ہیں تمام"
"یہ کہکشاں، یہ ستارے، یہ نیلگوں افلاک"
(اقبال)

رعنا ظفر

خیالِ خام

دل میں بُت، لب پر خدا کا نام ہے
یہ بھی شانِ خدمتِ اسلام ہے
مسکرانا ___ بیکسوں کے حال پر
بندہ پرور! آپ ہی کا کام ہے
حسرتِ منزل ہے باقی آج بھی
عشرتِ منزل خیالِ خام ہے
چاہتے ہیں اور کیا اہلِ وطن
مفلسی، بے چارگی تک عام ہے
ہم کو اُن سے ہے اُمیدِ التفات
جن کو اپنے کام ہی سے کام ہے
کہہ رہا تھا ایک دیوانہ یہ کل!
صبحِ آزادی حریفِ شام ہے
زندگی وقفِ غم و آلام تھی
زندگی وقفِ غم و آلام ہے
درسِ بیداری تھا خونیں انقلاب
یہ تو اے رعنا خیالِ خام ہے

ہاشم میرزا

"بھولا بادشاہ"

بادل امڈے چلے آرہے تھے ۔ یخ بستہ ہوا کے جھونکے خون
منجمد کر رہے تھے ۔ ٹھٹھرے ہوئے راہگیر بادلوں کو گھرائی ہوئی
نظروں سے دیکھکر تیز تیز قدم اٹھاتے دکان کے آگے سے گذر رہے
تھے ۔ بارش کے خیال سے میں نے بھی سامان باہر نہ نکالا تھا میرا
ساتھی یوسف بالو ہے کی کڑاہی میں جس میں دیکھنے کی خاطر پانی بھرا
جاتا تھا ۔ کوئلے سلگا رہا تھا ۔ اور جیجا مجھی گرفت پا ہاتھ سے اپنا سامان ..
سمیٹ کر دکان کے اندر آگیا تھا ۔ بغلوں میں ہاتھ دبائے گھڑی ساز کا لڑکا
بھی کڑاہی کے پاس آکر بیٹھ گیا ۔ اور دہکتے ہوئے کوئلوں پر ہاتھ
رکھ کر کھلنے لگا ۔ جیجا بولا " بادل برس جائیں تو اچھا ہے ۔ خشک
سردی سے کئی بیماریاں پیدا ہو گئی ہیں " یوسف نے اسکی بات کی اہمیت
کو کم کرنے کی خاطر کہا " کل شام کو کباب کھالئے تھے ۔ اور پانی پینے کو
نہ ملا تو کیسا گلا جم گئی تھی ۔ اسی وجہ سے رات بھر کھانستا رہا ہوں ۔ اور
بادل نہ بھی برسیں تو بہتر ہے " ۔ جیجا اسے ترچھی نظر سے گھور کر بولا " بارش
ضرور ہو ۔ میرا بچہ خشک سردی کی وجہ سے بیمار پڑا ہے " ۔ یوسف
نے اپنے جذبات کی تڑپ کو اس پر واضح کرنے کی خاطر کہا " جیجا تمہیں
خشک سردی کی بدولت پھیلی ہوئی بیماریوں کا غم کھائے جا رہا ہے لیکن
بارش کے بعد جو خطرناک بیماریاں پھیلیں گی اس پر بھی کچھ غور کیا ہے میرے
محلے میں ایسے کئی خاندان ہیں جن کے پاس لحاف نہیں ہیں ۔ اور فٹ پاتھ
کے باسیوں اور جھونپڑیوں کے مسکینوں کا حال تو ان سے بھی بدتر
ہے " جیجے نے کوئی جواب نہ دیا تھا ۔ اسکی نظریں دہکتے ہوئے کوئلوں
پر جمی ہوئی تھیں ۔ اور اس کا ذہن نہ جانے کہاں کہیں پل چل چکی تھی ۔
میں تو ان مسکین لوگوں میں سے تھا ۔ جو پہاڑ جیسی مجبوریوں کے پر اسرار
راستوں میں دبی دبی سسکیوں سے انتشار پھیلانے کی کوشش کرتے تھے
اور گرم پیچھے نہ ہونے کی وجہ سے جن کے سینے کے ساتھ لگے ہوئے

گھٹنے یوں جڑ کر رہ جاتے ہیں ۔ جیسے انہیں کبھی شکنجے میں کس دیا گیا ہو ۔
اچانک ٹین کے چھپر پر یوں بوندیں پڑنے لگیں ۔ جیسے کوئی اناڑی ستار
کے تاروں کو چھیڑ رہا ہو ۔ میں نے باہر کی طرف دیکھا ۔ بارش شروع ہو گئی
تھی ۔ سڑک کے سرمئی سینے پر نچلے طبقہ کی بڑھتی ہوئی پریشانیوں کی طرح
داغ پھیلتے جا رہے تھے ۔ اور ایک ادھیڑ عمر کا آدمی پھٹا پرانا کمبل اوڑھے
فٹ پاتھ پر کھڑا بڑے مطمئن انداز میں دکان کے آگے لٹکے ہوئے بورڈ کی
طرف دیکھ رہا تھا ۔ مجھے وہ آدمی کوئی پاگل نظر آیا ۔ جو اتنی ٹھنڈ میں بارش میں
بھیگنے سے لطف اندوز ہو رہا تھا ۔ وہ اونچی آواز میں بورڈ کے حروف پڑھنے
لگا ۔ " بیمار سائیکلوں کا ہسپتال ۔ پروپرائٹر مستری رحمت اللہ "
وہ مسکرانے لگا ۔ اور پھر میری طرف دیکھ کر پوچھا " یہاں بیمار انسانیت
کا بھی علاج ہوتا ہے " اسکے اس عجیب سوال سے میرا ذہن چکرا
گیا ۔ جیجا اور یوسف بھی اسکی طرف دیکھنے لگے تھے ۔ یوسف نے ہمدردی کے
شدید جذبے کے تحت کہا " سائیں جی ۔ اندر آجائیے " جیجا ایک طرف
کھسک کر اسکے لئے جگہ بنانے لگا ۔ اس آدمی نے قہقہہ لگایا ۔ اور پھر ایک
دم سنجیدہ ہو کر بولا " اندر آجاؤں ؟ کیوں ؟ بھولے بادشاہ ہو ۔ یہ
بارش میرا کیا بگاڑ سکتی ہے ۔ میرے پاس اب رہا ہی کیا ہے جو بگڑ جائے
گا " جیجا کسی خیال کے اثر سے کانپ رہا تھا ۔ میں اسکے متعلق ابھی سوچنے
ہی لگا تھا ۔ کہ وہ دکان کے اندر داخل ہوتے ہوئے بولا " آپ بھی کیا یاد
کریں گے ۔ بھولے بادشاہ ہوں ۔ جو کسی کا دل دکھانا نہیں چاہتے "
کڑاہی کے پاس بیٹھ کر وہ سردی کی وجہ سے خوں خوں کرنے لگا ۔ اور
کوئلوں پر ہاتھ پھیلا دیئے ۔ ایک بار تو اسکے دانت بھی بجنے لگے تھے میری
حیرانی بڑھ گئی تھی ۔ باہر بارش میں بھیگتے ہوئے تو وہ ٹھنڈ سے بے نیاز ..
بورڈ کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ اور آگ کے قریب بیٹھ کر وہ یوں سردی محسوس
کرنے لگا تھا جیسے اس کا بس چلے ۔ تو انگاروں کو اپنی آغوش میں لے لے ..

بکھیر دے۔ یوسف نے پوچھا: "سائیں جی۔ کہاں سے آ رہے ہیں — اور کہاں جانے کا ارادہ ہے!" وہ مگر ہاتھ اپنے چہرے پر پھیر کر بولا "جہاں سے آ رہا ہوں وہاں کا نقش تو مٹ چکا ہے اب اسکے متعلق بتانے سے فائدہ! — اور منزل کا ابھی تک سراغ نہیں ملا۔ اسلئے راستے کے پیچ وخم میں ہی الجھا ہوا ہوں — ہر موڑ پر چمکتی ہوئی برچھیاں جنہیں منزل سمجھ کر میں مسرور ہوتا ہوں۔ نہ جانے کہاں غائب ہو جاتی ہیں۔ اور یہ اندھیاروں کے بھیڑیئے اپنی وحشی قہقہوں سے مجھے پھر بھٹکنے پر مجبور کر دیتے ہیں — " — اسکے متعلق میں نے جو نظریہ قائم کیا تھا۔ اس کے کھوکھلے پن کا مجھے احساس ہونے لگا تھا وہ پاگل نہیں تھا۔ جیسے نے میرے کان میں آہستہ سے کہا "کوئی پہنچا ہوا ملنگ ہے" میں ہنس پڑا۔

اس ہنسی سے نہ تو کسی کی تضحیک مقصود تھی اور نہ ہی جیسے کی بات پر بھرپور بے یقینی کا اظہار تھا۔ پھر بھی نہ جانے میں کیوں ہنس پڑا تھا۔ اس آدمی نے بھی میری ہنسی کا ساتھ دیا اور ٹھنڈا سانس کھینچ کر بولا "بھولے بادشاہو! — ہم زندگی کو مزے سے دھوکے دے رہے ہیں۔ جب بھی پنجرے کی تیلیاں زندگی توڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو زندگی کے گرد تنے ہوئے فریبوں کے سب جال ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور بھیگی ہوئی آنکھوں سے دنیا کی رونقوں رنگینیوں کو الوداع کہتے ہوئے ہم گڑگڑاتے ہیں۔ کاش ایک لمحہ اور مل جانے۔ صرف ایک لمحہ۔ تاکہ اندھیروں کی اصلیت جان کر ہم روشنی کی چند کرنیں سمیٹ سکیں مگر اڑنے والے پنچھی کو بھلا کون روک سکتا ہے" خاموش ہو کر اس نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا۔ اور رنج بھرا کر کونلوں کی ملکہ جلانے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ہمارے دلوں کے [illegible] میں حسین اور رنگین موتیوں پر سے ریشمی پردے سرکا کر کہہ رہا ہے — " [illegible] کی تہوں میں سورج کرنیں چھپے ہوئے ہیں۔ انکو پکڑو گے تو ہاتھ جل جائے گا اور سرسراتے ہوئے ریشمی پردوں کے پیچھے مرمریں مورتیوں کے لبوں پر دلفریب اور گہری ہنسی کھنڈی ہوئی ہے ان کے سامنے جھکو گے۔ تو یہ ہنسی زہریلے ناگ کی طرح تمہاری روح کو ڈس لے گی۔ اور اندھیروں کا زہر تمہاری زندگی کو ختم کر دے گا — " میں لرز اٹھا۔ میں کیا سوچنے لگا تھا۔ میں کیوں سوچنے لگا تھا؟ میں نے سہمی ہوئی نظروں سے یوں اسکی طرف دیکھا۔ جیسے کسی بچے کے ہاتھ سے جگنو بوٹی نوچ کر لے جاؤ

اسکی شخصیت میرے لیے بہت پر اسرار بنتی جا رہی تھی۔ اسکی موجودگی میں خاموشی بہت تلخ اور اذیت ناک بن گئی تھی۔ میں نے سوچا اور جھجک کر پیچھے اور یوسف کی طرف دیکھا۔ وہ نظریں جھکائے عقیدت مندوں کی مانند بیٹھے ہوئے تھے۔ اور باہر بارش ہو رہی تھی۔ اور سفیدے کے درخت پر ایک بھیگا ہوا کوا پتوں میں چھپنے کی ناکام کوشش میں لگا ہوا تھا۔ اور بجلی کے تاروں پر بوندیں جھلملا کر ٹوٹی ہوئی مالا کے موتیوں کی مانند نیچے گر رہی تھیں۔ جیسے نے سر اٹھا کر رقت انگیز لہجے میں کہا "سائیں جی۔ میرا بچہ سخت بیمار ہے۔ اسکی صحت یابی کی دعا کیجیے —" وہ آدمی کھلکھلا کر ہنس پڑا "میں دعا کروں! — بھولے بادشاہوں۔ اس غریب سے مذاق کرنے میں آپکو کیا حاصل ہوگا" — اور پھر یکدم اسکی بڑھی ہوئی داڑھی میں بے چینی اور کرب کی پرچھائیاں سرسرانے لگیں۔ اسکے چہرے کی طرف دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اسکے دل کو مٹھی میں لیکر زور سے بھینچ رہا ہو۔ وہ سسکتی ہوئی گھبراہٹ آمیز آواز میں بولا "آپکا بچہ بیمار ہے۔ اور میری بچی کی حالت تشویشناک ہے۔ بشیر ڈاکٹر کو بلانے گیا ہوا ہے۔ ڈاکٹر سکندر علی کو اب آ جانا چاہیئے تھا۔ نہ جانے نوکر ابھی تک واپس کیوں نہیں آیا۔ کہیں ڈاکٹر کی کار راستے میں خراب نہ ہو گئی ہو۔ حشمت بیٹا ذرا باہر جا کر دیکھو۔ کیا بات ہوئی ہے — میری بچی بہت سخت بیمار ہے —" وہ آدمی بچوں کی مانند سسک سسک کر بھرنے لگا۔ میرا دبا ہوا خیال ابھر آیا۔ وہ بالکل پاگل دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ چاروں طرف نظریں گھمائیں۔ اور باہر کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے بولا "بھولے بادشاہو! — میں نے خواہ مخواہ آپکا وقت ضائع کیا ہے۔ نہ جانے آپ مجھے کیا سمجھ رہے ہونگے" بارش میں بھیگتا ہوا دائیں طرف مڑ گیا۔ اور میں سوچنے لگا۔ "اگر یہ پاگل نہیں۔ تو بہروپ بھر رکھا ہے۔ اور اگر یہ بھی نہیں۔ تو پھر خفیہ پولیس سے اس کا ضرور کوئی تعلق ہوگا۔" — میں نے آہستہ سے جیسے سے کہا "کمال کا آدمی تھا۔ یوں دکان میں داخل ہوا تھا جیسے پتے بھرے ماحول میں ٹھنڈی پون کا جھونکا لہرا جائے۔ اور یوں چلا گیا ہے جیسے [illegible] چکر کاٹ کر ویرانے میں گم ہو جائے —" — یوسف کو اسکے یار آواز دی تھی۔ وہ اٹھ کر چلا گیا۔ اور جیسا کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا

روئی وہ جیسے بہت سے بچھڑ گیا تھا۔ پانی سے بھری ہوئی کٹوری میں ڈوب کر پھر دیکھ رہا تھا۔ اور میں گاہک کو کرایے پر سائیکل دے کر رجسٹر میں درج کر رہا تھا۔ سر جھکائے ہوئے میں نے اس کے سلام کا جواب دیا۔ کھنکھار کر بولا "بھولے بادشاہو! ہم فقیروں سے ناراضگی اچھی نہیں" میں چونک کر میں نے سر اٹھایا۔ اس کے چہرے پر ایک معصوم ہنسی پھیلی ہوئی تھی۔ "معاف کرنا سائیں جی۔ میں کام میں مشغول تھا۔ اس لئے نہ دیکھ سکا" میں نے اسٹول پیش کرتے ہوئے کہا۔ اور پھر بیٹے کا نشان لگیا وہ سے بہت یاد کرتا تھا۔ میں نے بیٹے کو آواز دی۔ وہ سامنے دکان پر بیٹھا الف کے ... کر رہا تھا۔ بیٹا اس آدمی کو دیکھ کر اپنا کام بھول گیا بھاگ کر آیا۔ اور اس کا ہاتھ تھام کر بڑی عقیدت مندی سے اسے آنکھوں سے لگانے لگا۔ اسے اسٹول پر بٹھا کر ہم دونوں تختے پر بیٹھ گئے۔ بیٹا شکایت کرنے لگا "سائیں جی۔ آپ نے تو ہمیں بالکل بھلا دیا ہے۔ مستری صاحب سے پوچھئے۔ اللہ پاک کی قسم میں ہر وقت آپ کو یاد کرتا رہتا ہوں" ۔ وہ منہ بنا کر بولا ۔ "عجیب بات ہے ۔ مجھ میں بھلا کونسی خوبی ہے جو کوئی مجھے یاد رکھے۔ یاد رکھنے والے کو آپ بھلائے بیٹھے ہیں ۔ اور فریبوں کے جال میں پھنسے ان بتوں کے نام کے چراغ جلا رہے ہیں۔ جو کچھ بھی اختیار نہیں رکھتے" بیٹا اس کی بات کا مفہوم نہ سمجھ سکا تھا۔ وہ ہاتھ باندھ کر بولا "سائیں جی آپ نے ضرور دعا کی ہو گی۔ جبھی تو میرا ابا صحت یاب ہو گیا ہے نا۔ آپ جیسے ... بزرگوں کو کون فراموش کر سکتا ہے" بیٹا کسی دوری خیال کے اثر سے اٹھ کر چلا گیا۔ وہ آدمی ہنس کر بولا ۔ "لوگ مجھے پاگل سمجھتے ہیں لیکن مجھ جیسے پاگلوں کے علاج کے متعلق کوئی غور نہیں کرتا۔ بھولے بادشاہو۔ جب پنچھی پنجرے کی تیلیاں توڑ دے گا۔ تو پھر پتہ چلے گا۔ ش ۔۔۔ بھولے.. بادشاہو۔ اس کا تکیہ کلام بن گیا تھا۔ میں نے سوچا۔ کیوں نا اسے اسی نام سے پکارا جائے۔ بیٹا واپس آ گیا۔ اس کے ساتھ ہوٹل کا نوکر چائے کی کیتلی اٹھائے ہوئے تھا۔ چائے بنا کر اس نے پیالی بھولے بادشاہ کی طرف بڑھائی۔ لیکن اس نے پیالی پکڑنے سے انکار کر دیا۔ بیٹے نے عاجزانہ لہجہ میں کہا "سائیں جی میں غریب آدمی ہوں۔ آپ کی کچھ خدمت نہیں کر سکتا۔ آپ انکار نہ کریں۔ میرا دل ٹوٹ جائیگا" بھولے بادشاہ نے چبھتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اور بھاری آواز میں بولا۔"

"اگر آپ مجھے مجبور کریں گے۔ تو میرا دل ٹوٹ جائیگا" بیٹے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ بھولا بادشاہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے نرم لہجے میں کہا "بڑے ضدی ہیں آپ۔ اچھا ایک شرط پر چائے پی لیتا ہوں ۔۔۔" "وہ کیا؟" بیٹا آنسوؤں میں ہنسی کی کرنیں گھولتے ہوئے ایکدم بول پڑا۔ بھولے بادشاہ نے پیالی پکڑ کر کہا "چائے پی کر بتاؤں گا۔" چائے پی کر پیالی تشتری میں رکھتے ہوئے بیٹے سے پوچھا "آپ نے کتنے روپے اب تک کمایا ہے؟" بیٹا جیب میں ہاتھ ڈال کر ریزگاری گننے لگا۔ اور حساب لگا کر بولا "ابھی تک ایک روپیہ پورا نہیں ہوا ہے" بھولا بادشاہ کچھ کہنے ہی والا تھا۔ کہ ہوٹل کا نوکر سامنے سے گزرا۔ بھولے بادشاہ نے اسے برتن اٹھا لے جانے کے لئے کہا۔ اور جیب میں سے ہاتھ باہر نکال کر پھرتی سے پیالی میں روپیہ رکھ دیا۔ "یہ کیا؟" بیٹے کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ بھولا بادشاہ مطمئن لہجہ میں بولا "یہی میری شرط تھی۔ ابھی تک آپ نے ایک روپیہ بھی نہیں کمایا۔ آپ کے بیوی بچے شام کی روٹی کے لئے آپ کی راہ تک رہے ہوں گے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ میں ان کی روٹی چھین کر بھوکے پیٹوں کی بددعاؤں کا عذاب مول لے لوں" ۔ وہ کسی خیال کے تحت کھڑا ہو گیا۔ ایک فیشن ایبل سائیکل سوار کو نظر بھر کر دیکھا کہ پیچھے لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا۔ جیسے اٹھتے ہوئے بولا "اللہ والوں کے کیسے نعاں ہوتے ہیں۔"

— "لیکن میرے شکوک مٹ نہ سکے۔ میں ابھی اسی سوچ میں تھا۔ کہ وہ خفیہ پولیس کا آدمی ہے۔ ان دنوں سائیکلوں کی چوری کی کئی وارداتیں ہوئی تھیں۔ اور میرا خیال تھا کہ چوروں کا سراغ لگانے کی خاطر بھولا بادشاہ میری دکان پر آیا ہے اور اپنی بزرگی کا رعب جما کر مجھے کسی مقدمے میں پھنسانا چاہتا ہے ۔۔۔ دوسرے دن صبح میں دکان کا دروازہ کھول ہی رہا تھا۔ کہ وہ آ گیا۔ اسے دیکھ کر مجھے الجھن سی ہونے لگی۔ بددلی سے میں نے اس کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ اور دکان میں سے اسٹول نکال کر باہر رکھ دیا۔ وہ اسٹول پر بیٹھ کر بولا "بات یہ تھی.. مجھے خیال گزرا تھا کہ کہیں آپ نے میرے متعلق غلط نظریہ قائم کر لیا ہو۔ مجھے خدشہ پیدا ہو گیا۔ کہ میرے شکوک صحیح ہوں گے ... مجھے تبلیغ کرنے آیا ہے۔ کہ میں اس کی اصلیت کا راز کہیں فاش نہ کر دوں

مجھے خاموش دیکھ کر اس نے کہا "اس سائیکل سوار لڑکی کا تعاقب کرنے میں میری نیت بالکل صاف تھی۔ اور اب بھی وہ میری نظروں میں بیٹی کے برابر ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ اسے دیکھ کر ایک دم ہی میرے سامنے رقصاں ہو گیا تھا۔ آپ محبوب الٰہی کو جانتے ہونگے۔ وہ خود کو شہر کا بہت بڑا رئیس سمجھتا ہے۔" میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اور مجھے اپنے شکوک کی بے شرمی پر غصہ آگیا کہ خواہ مخواہ اسے دیکھ کر بیزاری محسوس کرنے لگا تھا۔

طلیا دکان پر آگیا اور سامان باہر نکالنے لگا۔ چند منٹ خاموش رہ کر بھولا بادشاہ بولا۔ "اتنے بڑے شہر میں رئیسوں کی کمی نہیں۔ میں نے اسے پہلے نہ دیکھا تھا۔ البتہ میرا خیال تھا۔ کہ آزادی کے بعد اس نے خوب ہاتھ رنگے ہونگے۔ لیکن اس کا پتہ معلوم تھا۔ اس دارالخلافہ میں۔ جہاں ہر ہوش مند انسان بھی حواس کھو بیٹھتے ہیں۔ اور جگری دوستوں کو قریب سے دیکھ کر بھی نہیں پہچان سکتے۔ وہاں پر مجھ جیسا پاگل انسان کیسے اس کا سراغ لگا سکتا تھا۔ سائیکل سوار لڑکی کو دیکھ کر کل مجھے اچانک... محبوب الٰہی یاد آگیا تھا۔ اور میرا دل پکار اٹھا تھا۔ کہ وہ لڑکی محبوب الٰہی کی بیٹی کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ لڑکی مجھے اپنے قریب دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔ میں نے اسے اطمینان دلایا۔ اور اپنے شکوک رفع کرنا چاہے لڑکی پہلے تو میرا نام سن کر چونک پڑی۔ اور پھر بڑے غور سے میرا جائزہ لیکر حیرت و خوشی کے ملے جلے لہجہ میں بولی "چچا جان۔ آپ! اس حالت میں" میں مسکرا پڑا۔ اس نادان لڑکی کو میں کیا بتا سکتا تھا۔ وہ مجھے زبردستی اپنے ساتھ کوٹھی میں لے گئی۔ بڑی خوبصورت کوٹھی میں وہ رہتے ہیں۔ کسی بہت بڑے سیٹھ کی کوٹھی ہوگی۔ زیبائش کا سامان بہت قیمتی اور نفیس ہے۔ ایک کمرے میں اسکی چھوٹی بہن وائلن بجا رہی تھی۔ اور تین لڑکے صوفوں پر بیٹھے یوں پیاسی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ جیسے وہ ٹھنڈے میٹھے شربت کی بوتل ہو۔ اور وہ منتظر ہوں کہ کب انہیں اجازت ملے۔ اور کب وہ اپنی ہوس کے گلاسوں میں شربت انڈیل کر بوتل خالی کر دیں غصہ سے میرا خون کھولنے لگا۔ بڑی لڑکی نسیم مجھے اپنے ساتھ دوسرے کمرے میں لے گئی۔ میری ذہنی کائنات میں زلزلہ آگیا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے ان دو نوں لڑکیوں نے کبھی یوں اپنی نسوانیت کو مجروح نہ کیا تھا۔ نسیم بڑی لڑکی کی سہیلی تھی۔ اور چھوٹی لڑکی شمیم بھی اپنی باجی کے ساتھ ہمارے

ہاں آیا کرتی تھی۔ ان کی سیرت کے متعلق میں نے کبھی کوئی بری [illegible] تھی۔ سب محلے والوں کا خیال تھا کہ وہ اپنے مکار باپ کی [illegible] الٹی اور نمبر کا ٹھگ اور دھوکے باز تھا۔ کوئی بھی اس پر اعتبار [illegible] پھر بھی وہ یوں اپنی مکاریوں کے جال پھیلاتا تھا۔ کہ بھلے [illegible] اسکے جال میں پھنس جاتے تھے۔ مجھ سے بھی اس نے سو روپے [illegible] ادھار لیے کا نام نہ لیتا تھا۔ وہی محبوب الٰہی اب ایسی کوٹھی میں [illegible] کئے ہوئے ہے۔ اور اسکی بیٹیاں جن کی شادی کی ابتدائی بات [illegible] نہیں ہوئی۔ اپنی اجلی سیرتوں کو داغدار بنا رہی ہیں ——— لئے جانے کی خاطر باہر نکلی۔ اور میں وہاں سے بھاگ آ[illegible] کا خیال آگیا تھا۔ آہ میری بچی ——— " اسکی آنکھوں [illegible] گئے۔ اور آواز بھاری ہوگئی۔ "شام کو میں ایک بڑے ہوٹل [illegible] سے گذر رہا تھا۔ کہ میرے قریب ہی کار کی بریکیں چلچلائیں [illegible] ایک طرف ہو گیا۔ اور چمکیلی کار کو گھورنے لگا۔ کار میں سے [illegible] اسکے ساتھ ایک بہت ہی حسین لڑکی تھی۔ وہ شمیم کی عمر کی [illegible] ریشمی لباس اور میک اپ دیکھ کر میں چکرا سا گیا۔ محبوب الٰہی [illegible] ڈالے ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ اور میں دیکھتا ہی رہ گیا۔ مجھے [illegible] کہ میں اسے اپنا نام ہی بتا سکوں۔ میرے پاؤں زمین پر جم گئے [illegible] آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ میں وہیں پر اسکے باہر نکلنے کا انتظار [illegible] بتانا چاہتا تھا۔ کہ آگ اور خون کے سمندر کو عبور کر کے ہم [illegible] آئے ہیں کہ ظلمتوں کے مہیب قہقہوں کو اپنے مستقبل [illegible] ہم نے اس خطۂ پاک کو اسلئے حاصل نہیں کیا ہے۔ کہ انسانیت [illegible] ہوئی محرابوں کی تعمیر کی بجائے اسکے آخری نشان کو بھی مٹا [illegible] بہت دیر کے بعد باہر نکلا۔ میں اونگھ رہا تھا۔ میں بلکہ ہم چونک [illegible] تھا۔ کار اسٹارٹ کرنے ہی والا تھا۔ کہ میں نے کھڑکی [illegible] کہا: "محبوب الٰہی ابھی تک تم نے اپنی فریبی زندگی کو نہیں [illegible] بیٹیوں کا کچھ خیال کر۔ جب تمہی پنجرے کی تیلیاں ——— پورا ابھی نہ کر پایا تھا۔ کہ اس نے زور سے میری ناک پر مکا جڑ [illegible] ناک سے خون بہنے لگا تھا۔ اور وہ مکار بھگا کر لے گیا [illegible] رات درد کی وجہ سے نیند بھی نہیں آ سکی ——— میں

نظر ڈالی۔ اس کی ناک سوجی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں نیند کی پرچھائیاں بھی ہوئی تھیں۔ پھر اسانس بھر کر بولا۔ "بھولے بادشاہو! انسان اپنے صحیح مقام سے کتنا نیچے گر چکا ہے۔ اگر یہ اب بھی نہ سنبھلا۔ تو حیوانیت کے قہقہے کائنات پر قابض ہو جائیں گے ——" —— یہ کہتے کے آنے سے پہلے ہی وہ اٹھ کر چلا گیا۔ اب میرا جی چاہنے لگا تھا کہ وہ میرے پاس بیٹھا اپنی حقیقت پسندانہ باتوں سے میرے دل پر جمی ہوئی کالک کو کھرچتا رہے۔ ایک ہفتہ گذر گیا۔ مگر اس نے دکان کا کوئی چکر نہ لگایا۔ میں بے چینی محسوس کرنے لگا تھا۔ کہ کہیں وہ کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو گیا ہو۔ ایک شام کو گھر کی طرف جاتے ہوئے میں نے اسے بس اسٹینڈ پر کھڑے دیکھ لیا وہ ایک آدمی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ میرے سلام کا خندہ پیشانی سے جواب دے کر وہ دوسرے آدمی سے میرا تعارف کرانے لگا۔ "بشیر یہ مستری صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں۔ میرے ساتھ بڑی خوش خلقی سے پیش آتے ہیں۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "بھولے بادشاہو۔ کئی دفعہ ملنے کو جی چاہا لیکن مجھے تمہارے دوست بیچے سے ڈر لگتا ہے، مجھے دیکھ کر وہ اپنے بس میں نہیں رہتا۔" نئی آبادی کی طرف جانے والی بس آگئی۔ اور وہ بشیر کے ساتھ اس میں سوار ہو گیا۔ اسے صحیح سلامت دیکھ کر مجھے از حد خوشی ہوئی تھی۔ اس سرسری ملاقات کے بعد وہ مجھے پھر کبھی نہ مل سکا۔ اسے بہت تلاش کیا لیکن اس کا کوئی سراغ نہ مل سکا ایک دن اچانک میں نے بشیر کو دکان کے آگے سے گذرتے دیکھا۔ میرا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ میں نے اسے آواز دی۔ اس نے گھوم کر دیکھا اور میرے ہاتھ کے اشارے پر وہ دکان کی طرف آگیا۔ قریب آ کر اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ میں نے بھولے بادشاہ کی خیریت کے متعلق دریافت کیا۔ اور بشیر کے چہرے پر غم کے گہرے سائے پھیل گئے۔ اسٹول پر بیٹھ کر اس نے رندھے ہوئے لہجہ میں کہا۔ "بھولا بادشاہ اب اس دنیا میں نہیں رہا —" "کیا کہا؟" میرے سر پر جیسے کوئی بھاری پتھر گر پڑا ہے۔ "سچ کہہ رہا ہوں بھائی صاحب۔" بشیر کے حلق سے بڑی مشکل سے الفاظ نکلے تھے۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ بشیر آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ "لوگ انہیں پاگل سمجھتے تھے۔ نفرت سے پیش آتے تھے۔ اور بعض نے تو ان کی

سر بازار بے عزتی بھی کی تھی۔ لیکن انھیں لوگوں کے اس سلوک پر مطلق ملال نہ ہوا تھا۔ وہ بڑے مستقل مزاج آدمی تھے۔ میں بہت عرصہ ان کے پاس ملازم رہا ہوں۔ اور اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ کتنی عزت کے مالک تھے۔" بشیر کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی تھی۔ خاموش ہو کر اس نے اپنے الم ناک جذبات پر قابو پانے کی کوشش کی۔ اور پھر ٹوٹا ہوا سانس بھر کر بولا۔ "فسادات سے پہلے ان کا اپنا مکان تھا۔ پر رونق بازار میں دکان تھی۔ تعلیم سے فارغ ہو کر انھوں نے نوکری پر کاروبار کو ترجیح دی تھی۔ ایک لڑکی عزت کے سوا ان کی کوئی اولاد نہ تھی۔ بیوی کی وفات کے بعد انھوں نے اس جذبے کے تحت دوسری شادی نہ کی تھی کہ کہیں عزت کسی مصیبت میں مبتلا نہ ہو جائے۔ وہ جوان ہو گئی تھی اسکی شادی کے لئے کئی جگہوں سے پیغام آئے تھے۔ اور ابھی وہ کوئی فیصلہ نہ کر پائے تھے کہ آگ اور خون کے بپھرے ہوئے طوفان نے بے بس زندگیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ عزت اور وہ میرے ساتھ شہر سے باہر کیمپ میں آگئے تھے۔ چند زیورات اور کچھ روپے کے سوا وہ اور کچھ بھی اپنے ساتھ نہ لا سکے تھے۔ رات تاریک اور ڈراؤنی تھی۔ اچانک کیمپ پر حملہ ہو گیا۔ چیخوں اور کراہوں سے فضا بوجھل ہو گئی۔ لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ جس طرف کسی کا منہ اٹھا اسی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ دونوں مجھ سے بچھڑ گئے۔ سامان کا سوٹ کیس میرے پاس رہ گیا تھا۔ صبح سویرے ہی میں انھیں تلاش کرنے لگا۔ عزت کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔ اور بھولے بادشاہ مجھے زخمی حالت میں مل گئے۔ ان کے زخم زیادہ خطرناک تھے۔ مجھے دیکھ کر ان کی ڈھارس بندھی۔ ہم دونوں تمام دن کیمپ میں عزت کو تلاش کرتے رہے تھے۔ انھیں عزت کے کھو جانے کا انتہائی صدمہ ہوا تھا کئی بار انہیں غش آگیا تھا۔ زندگی موت کی دہلیز پر کھڑی کانپ رہی تھی اور میں اس ماحول سے جلد از جلد کسی پر امن جگہ پر پہنچ جانا چاہتا تھا لیکن وہ اب وہاں سے ہلنے کا نام نہ لیتے تھے۔ رات کو وہ اپنا دماغی توازن کھو چکے تھے۔ دوسرے دن میں نے بڑی مشکل سے انھیں اسی حالت میں اسپیشل ٹرین پر سوار کرا لیا۔ انہیں کچھ ہوش نہ تھا کہ میں انھیں کہاں لئے جا رہا ہوں۔ یہاں پہنچ کر بھی میں نے عزت کو بہت تلاش کیا۔ کیمپ کا کونہ کونہ چھان مارا —— لیکن نہ جانے وہ کن ظالموں کے پنجے میں دبوچی

بھاگ گئی تھی۔ ان کے زیورات اور روپے میرے پاس محفوظ تھے۔ میں ایک امانت سمجھ کر ان کی حفاظت کر رہا تھا اگر کوئی اور موقع ہوتا تو غلط میرا دل مجھے خیانت کرنے پر آمادہ کر لیتا۔ لیکن اب تو میں زندگی اور موت کی کشمکش میں بری طرح جھنجھوڑا گیا تھا۔ دولت مندوں کو ایک ایک پیسے کے لئے ترستا دیکھ چکا تھا۔ اور دولت کے غرور سے اکڑی ہوئی گردنیں میرے سامنے ٹوٹی ہوئی ڈالی کی مانند جھکی ہوئی تھیں۔ اسلئے میں کسی بدخیال کو دل میں جھانکنے تک کی اجازت بھی نہ دے سکتا تھا۔ میں انھیں کسی طرح خوش رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن ان کے گھاؤ میرے ہر بہلاوے پر اور زیادہ پھیل جاتے تھے۔ اور ان کی قسمیں میری روح میں کانٹے چبھو دیتی تھیں۔ مجھے روٹی حاصل کرنے کی خاطر نوکری کرنی پڑی۔ وہ اب گھر پر اکیلے رہتے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ کچھ سنبھلنے لگے۔ اب ان کی باتوں میں ماضی کی بجائے مستقبل کے فکر کی جھلک ہوتی تھی۔ وہ فلسفیوں کے سے انداز میں زندگی کی بے ترتیبی سے الجھی ہوئی گرہوں کو سلجھانے کی اسکیمیں سوچا کرتے تھے۔ بعض دفعہ وہ ایسی حکیمانہ باتیں کیا کرتے تھے کہ مجھ جیسا۔۔ معمولی سمجھ کا آدمی ان کے مفہوم کو پا ہی نہ سکتا تھا۔ اب وہ اکیلے دن بھر شہر میں گھومنے لگے تھے۔ ایک تو انھیں عزت کی تلاش تھی۔ اور دوسرے وہ اس پاکیزہ زندگی کی علامات دیکھنا چاہتے تھے جس کے حصول کی خاطر انھیں بے گھر ہونا پڑا تھا۔ شہر میں ان کے کئی واقف کار بستے تھے۔ اور وہ تقریباً ہر ایک سے مل چکے تھے۔ اور ان سے دریافت کر چکے تھے۔ کہ جن اصولوں کی خاطر یہ خطہ حاصل کیا گیا تھا۔ وہ اصول آخر کیوں نہیں آ... مگر ان کے احباب کی اکثریت تو ماضی کے ہولناک طوفان کی خو... کو بھلا کر انتشار کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ کسی کے پا[س] سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ انھیں پاگل سمجھنے لگے تھے۔ لیکن ... سچائی نے انھیں خوف زدہ کر دیا تھا۔ کہ کہیں ان کی فریب کا... ستون ڈھے نہ جائیں۔ اور میرا یقین ہے۔ کہ ان ہی نے بھولے بادشاہ کی زندگی کو مٹانے کی سازش کی تھی۔ ایک... جب وہ گھر میں داخل ہوئے۔ تو ان کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ ... کا رنگ بگڑا ہوا تھا۔ وہ گر پڑے۔ میں پریشان ہو گیا۔ ا... پر لٹا دیا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر تڑپنے لگے۔ وہ کچھ کہنا چاہتے ... زبان کوئی لفظ ادا کرنے سے معذور تھی۔ اور چند منٹوں میں ... دنیا سے دور چلے گئے۔ ان کا سوٹ کیس ابھی تک میرے پا[س] محفوظ پڑا ہے۔ اور عزت کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں م[لا]۔

بشیر خاموش ہو گیا۔ اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے بھولا ... سامنے کہہ رہا ہو۔ "انسان اپنے صحیح مقام سے بہت ... اگر یہ اب بھی نہ سنبھلا۔ تو حیوانیت کے قہقہے کائنات ... ہو جائیں گے ——"

عابد لکھیانوی بی اے •

رات گزرنے والی ہے

اب گردشِ ساغر تھام! کہ رات گزرنے والی ہے — اب توڑ دے اپنے جام! کہ ساقی رات گزرنے والی ہے
اب نورِ سحر تاریکی کو پیغام اجل دینے کو ہے — اب لے اللہ کا نام! کہ ساقی رات گزرنے والی ہے
یہ وقت نہیں بے ہوشی کا، مدہوشی کا، کم کوشی کا — اب کرنا ہے کچھ کام! کہ ساقی رات گزرنے والی ہے
یہ ساز طرب، یہ لہو و لعب، یہ مستی شب بے معنی ہے — لے ہوش و خرد سے کام! کہ ساقی رات گزرنے والی ہے
مخمور نہ کر مقہور نہ کر، دے مدہوشوں بے ہوشوں کو — بیداری کا پیغام! کہ ساقی رات گزرنے والی ہے
یوں "نشہ" پلا کے مستوں کو مدہوش نہ کر بے ہوش نہ کر — لے گرتوں کو اب تھام! کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

نعیم صدیقی

اس بارگاہِ ناز کو منزل بنا کے چل — آنکھوں میں انکا جلوۂ رنگیں بسا کے چل
ہر پھول آستیں میں ہے کانٹا لئے ہوئے — اس باغِ پُر بہار میں دامن بچا کے چل
اس دیس میں ظہورِ خودی پھر نہیں روا — گر سر کٹا سکے تو یہاں سر اٹھا کے چل
اک لغزشِ نگاہ میں ہے غارتِ حیات — فتنوں بھری فضا میں نگاہیں جھکا کے چل
گر حریت کے گیت ہی گانے کا ہے جنوں — زنجیرِ قید اپنے لئے خود اٹھا کے چل

پیشِ نظر ہے اگر حقیقت کی جستجو
بتخانۂ خیال کو ٹھوکر لگا کے چل

(وسط اگست۔ سنٹرل جیل، لاہور)

طالب حجازی

ترے نام کے ہم فدائی رہے ہیں
حصولِ رضا کیلئے جی رہے ہیں
ضلالت مٹے ہو ترا دین قائم
اسی سعی میں ہم الٰہی رہے ہیں
وہ کیا لائیں خاطر میں دار و رسن کو
مئے عشق جو کہ پی رہے ہیں
نصیحت تری ناصحا! جس لئے تھی
اب اس دور سے ہم گزر ہی رہے ہیں
سلام انکی خوش فہمیوں کو ہے طالب
[illegible]

صدیقہ نسیم

تاریکیاں

اختری شمیمہ کو بڑی اشتیاق کی نظروں سے دیکھ رہی تھی !!
ویسے تو شمیمہ ہر لباس میں خوبصورت نظر آتی تھی۔ نکھرا نکھرا رنگ، چاند کی طرح چمکتا ہوا گول گول چہرہ، اپنی گہرائیوں میں ہلکی شربتی جھلک لیئے ہوئے صاف وشفاف روشن، بادامی آنکھیں، گلاب کی پنکھڑیوں جیسے نازک اور گلابی گلابی رخسار، بدخشانی لعلوں کی طرح پتلے پتلے نازک سرخ لب سر پر لہراتے ہوئے گھنگریالے بال، مگر آج —
آج تو شمیمہ کے قدرتی حسن کو چار چاند لگے ہوئے تھے۔ سرخ ساٹن کے غرارے پر ریشمی فاختائی رنگ کی قمیص اور سیاہ چمکدار گھنگریالے بالوں میں سرخ ساٹن کی ربن نے تو اس کے حسن کو اور بھی نکھار رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آج اختری مبہوت کھڑی اس کے حسن سے پوری طرح سیر یاب ہونے کے لئے اسے گھور رہی تھی۔

شمیمہ کی نازک کلائیوں میں پڑی ہوئی کانچ کی چوڑیوں کی جھنکار بڑی دلکش معلوم ہو رہی تھی۔

"ہلکے سرخ رنگ کے کانچ کی چوڑیاں اس کی نازک و سفید کلائیوں میں بڑی بھلی معلوم ہو رہی ہیں" اختری نے دل ہی دل میں سوچا۔ اور چاہا کہ بڑھکر اس کی چوڑیوں بھری خوبصورت کلائی کو اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اس نے قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ شمیمہ کی ماں کی خلاف توقع کرخت آواز نے اسے چوکنا کر دیا..... اور اس کے قدم وہیں گڑے کے گڑے رہ گئے۔

"میلے ہاتھوں سے میری بچی کے کپڑے گندے نہ کرنا" شمیمہ کی ماں چلائی۔ "جاؤ باہر جا کے کھیلو"

شمیمہ کی ماں کی اس سرد مہری سے اختری کچھ ٹھٹھری، کچھ سکڑی۔ مگر وہ وہیں کھڑی رہی اور وہیں سے شمیمہ کو ایک عجیب معصومانہ انداز میں پرشوق نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ شمیمہ کے سرخ غرارے، فاختائی قمیص، بالوں میں سرخ ربن اور ہلکے سرخ رنگ کی چوڑیوں نے اسے مجبور کر رکھا تھا۔

"مگر شمیمہ بھی آج خاموش ہے" اس نے سوچا..... "ہر روز ساتھ کھیلنے والی شمیمہ — نہ کوئی آؤ بھگت نہ ہمدردی — گنگ کیوں ہو گئی؟ کیا شمیمہ بھی نئے کپڑے پہن کر اپنے حسن پر مغرور ہو گئی ہے؟" شمیمہ کی اس بے التفاتی سے اسے اور بھی دکھ ہوا۔

اختری کی ماں کچھ عرصہ پہلے اس محلہ میں آکر آباد ہوئی تھی اس عرصہ میں گو اس نے نوکری تلاش کرنے میں سر توڑ کوشش کی مگر تاحال وہ کوئی معقول نوکری تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ ایک ہی محلہ میں رہنے سے اختری اور شمیمہ آپس میں کچھ گھل مل گئی تھیں۔ اور اکثر مل کر کھیلا کرتی تھیں۔ ویسے تو جب سے وہ اور اس کی ماں اس محلہ میں آکر آباد ہوئی تھیں وہ بڑی خاموش اور اداس زندگی گذار رہی تھیں۔ مگر جس حقارت اور سرد مہری کا سلوک آج شمیمہ کی ماں اور شمیمہ کی طرف سے اس کے ساتھ ہوا اس کا تجربہ اس سے پہلے اسے کبھی نہ ہوا تھا۔ جب وہ واپس گھر اپنی ماں کے پاس آئی۔ تو اس کا دل شمیمہ کی ماں اور شمیمہ کے سلوک سے بے حد دکھ محسوس کر رہا تھا

"امّی! شمیمہ کو اس کی ماں نے بڑے اچھے اچھے نئے کپڑے پہنائے ہیں" اس نے آنسوؤں سے تقریباً تقریباً لبریز آنکھوں کے ساتھ اپنی ماں سے کہا — "اور امی! وہ ہلکے سرخ رنگ کی کانچ کی نئی چوڑیاں تو شمیمہ کی کلائیوں میں بڑی خوبصورت معلوم ہوتی ہیں۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ سرکس دیکھنے جا رہی ہے" اختری نے ایک ہی سانس میں اپنی سب خواہشوں کو ماں کے سامنے اگل دیا۔ "شمیمہ کی امی اسے کتنے اچھے اچھے کپڑے پہننے کو دیتی ہے۔ تم کیوں مجھے نئے کپڑے نہیں سلا دیتی ہو۔ تم نے تو کبھی مجھے چوڑیاں بھی نہیں

نچ چھ سال پیشتر جب میں چھوٹی سی تھی۔ تو مجھے کتنے
ے اور رنگ برنگ کے چمکدار کپڑے پہنایا کرتی تھیں
ب ذرا ذرا — اور اب جب میں سیانی ہوگئی
مجھے کچھ بھی تو نہیں لے دیتیں۔ میرے سب میلے کچیلے پھٹے
...... ایک جوڑا بھی اچھا نہیں ہے۔ کل ہی تو تم نے
گیارہ سال کی ہوگئی ہوں — امی! اب تو میں
وں نا؟ اگر تم مجھے اچھے اچھے کپڑے سلا دو تو میں
ہونے دوں گی۔ انھیں بڑا سنبھال کے رکھوں گی!
امی! اگر تم ابھی نئے کپڑے نہ بھی سلواؤ تو مجھے
رت چوڑیاں ضرور لے دینا۔ مجھے کانچ کی چوڑیاں
ہیں جب میں پہنوں گی تو دیکھنا میری کلائیوں میں کیسی
ں گی"

ی باتونی ہو رہی تھی اور غموں کی ماری اس کی قبل از وقت
یاس اور حسرت بھری نظروں سے اپنی معصوم اور الھڑ
تھی بھینچے کی آرزوؤں کا خون — اس سے نہ

اچھی بیٹی ....!" ماں نے ممتا کے جوش میں آئے
پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں ضرور خوبصورت
لے دوں گی۔ سچ مچ آجکل میں ہی لے دوں گی....
ہے کہ پانچ چھ سال پیشتر میں تمہیں اچھے اچھے کپڑے اور
پہنایا کرتی تھی۔ مگر — تب پاکستان نہیں بنا
تمہارا باپ اور میری خوشیاں، میری آرزوئیں،
خدا کا دیا سب کچھ تھا، ضرورت سے کچھ زیادہ
ی کے اس زمانہ میں تیرے سائے چاہ خوشی سے
اب — اپنا سب کچھ قربان کرکے پاکستان حاصل
تیرا باپ ..... اپنی دولت — کیا کچھ قربان نہیں
..... ساری خوشیاں، ساری تمنائیں اپنے
کئے ہوئے ہوں اب وہ خوشحالی و شادمانی کا زمانہ
ں — اچھا کل کہیں نہ کہیں کام پر جاؤں گی —

اللہ سے امید ہے کام مل جائے گا تو ضرور تیرے واسطے بڑی
اچھی چوڑیاں لاؤں گی ..... بڑی اچھی ..... کوئی غم نہ کر —"
بے بس ممتا ٹھنڈی پڑ گئی مگر اختری — سب کی اختری
پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"نہیں نہیں امی ہرگز نہیں!" وہ جذبات سے مغلوب
پر درد لہجہ میں چلائی — "میں نے تمہیں بڑا دکھ دیا ہے۔ مجھے افسوس
ہے، مجھے کچھ نہیں چاہئے میں اسی حال میں خوش ہوں مجھے اب
چوڑیاں نہیں چاہئیں" اس کا سارا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔۔
"نہیں امی میں سمجھ گئی! میرے اندر کی کوئی چیز مجھے کہہ رہی ہے
میں اب سب کی ہوگئی ہوں نا، مجھے اب چوڑیوں سے نفرت ہو
گئی ہے۔ نہیں مری اچھی امی! مجھے معاف کردو۔ مجھے چوڑیاں
نہیں چاہئیں، مجھے کچھ بھی تو نہیں چاہیئے"
اختری غمخواری کے انداز میں اپنے ماں کے گلے میں باہیں
ڈال کر لپٹ گئی۔

"اچھا میری بچی!" فرط غم سے نڈھال ماں نے اختری کی
پیشانی کو چوم کر اور اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے اس کو تسلی دی
"جس طرح تیری خوشی!" — "اچھا! دیکھ میں ابھی کام
کی تلاش میں باہر جاتی ہوں تم اچھی بیٹی بن کر گھر میں بیٹھنا۔ میں جلد
ہی واپس آجاؤں گی روز کی طرح!" اس کی ماں کام کی تلاش میں
باہر نکل گئی۔

تنہا اور شکستہ دل اختری سنسان گھر میں اداس دل کے
ساتھ سارا دن اپنی ماں کا انتظار کرتی رہی یہاں تک کہ شام کی
بڑھتی ہوئی تاریکیوں نے گلی کوچوں اور گھر کو اور بھی تاریک کر دیا
مگر اس کی ماں نہ آئی۔ اسے ابھی تک کوئی کام نہ مل سکا تھا۔ وہ
کام کی تلاش میں ابھی تک سرگرداں تھی۔ سورج کے ساتھ ساتھ
اس کا دل بھی ڈوبا جا رہا تھا۔ اختری گھر میں اس کا انتظار کر رہی
ہوگی۔ چھوٹی سی اندھیری کوٹھڑی میں اس کا ننھا سا معصوم دل دھڑ
رہا ہوگا۔ اس کے نئے چوڑیاں؟ — یا اللہ تو کہاں ہے؟
مجھ عاجز کی سن — اتنی مزدوری دلا دے کہ میں اپنی اکلوتی

معصوم بچی کی دلی خواہش کو پورا کر سکوں ...... میری بچی ...... اپنے شفیق باپ کی لاڈلی نشانی ...... باپ ...... جس نے حق و صداقت کی خاطر اپنی جان اپنے ملک ...... پاکستان کے خاطر قربان کر دی مگر مجھ جیسوں بچی کے ایسے سہاگ کہاں ...... میری بچی میں تو تیرے کوئی چاؤ بھی پورے نہ کر سکی ......"

دکھوں بھرے بے آس دل اور جسمانی تھکاوٹ سے چُور وہ سارا دن ماری ماری گلی کوچوں اور سڑکوں کی خاک چھانتی پھری۔ مگر کوئی مزدوری نہ ملی۔ وہ مایوسی سے نڈھال بوجھل قدموں کے ساتھ واپس لوٹنے والی ہی تھی کہ سامنے گلی میں باجوں کی آواز نے اس کے دل میں امید کی ایک معصوم سی جھلک پیدا کر دی۔

"کہیں شادی ہے ؟" اس نے سوچا ...... شادی والے گھروں میں تو بہت کام ہوتے ہیں اور نوکر، نوکرانیوں کی اکثر ضرورت پڑتی ہے۔ شاید مجھے بھی کوئی کام مل جائے ...... امید کی جھلک سے اس کے تھکے ماندے بدن میں پھر تھوڑی سی طاقت پیدا ہو گئی۔ یاس و امید کے ملے جلے احساسات کے ساتھ وہ اس طرف ہو لی ...... ڈرتے ڈرتے وہ اس مکان کے اندر گئی۔ جس کے صحن سے باتوں کی آواز آ رہی تھی سامنے کے کمرے میں ایک ادھیڑ عمر کی موٹی سی عورت پلنگ پر سیٹھانیوں کی طرح بیٹھی تھی۔

"کیا ہے ...... ؟ کیا ہے ؟" اسے دیکھتے ہی سیٹھانی جی زور سے چلائیں ...... "یہاں خیرات نہیں بٹ رہی ہے۔ تم جیسی ہٹی کٹیوں کو بھیک مانگتے شرم بھی نہیں آتی، کہیں مزدوری کیوں نہیں کرتی ہو، حلال کی کمانے کو تو دل نہیں چاہتا نا ......"

"میں بھکارن نہیں ہوں بہن" اس نے فرطِ ندامت سے پانی پانی ہوتے ہوئے کہا۔ "میں تو کام ہی کی تلاش میں ادھر آئی ہوں۔ باجے بج رہے ہیں میں نے سوچا کہ شادی ہے۔ شادی والے گھروں میں تو بیشمار کام نکلتے ہیں میں نے سمجھا کہ مجھے بھی مزدوری مل جائے گی اس لئے ادھر چلی آئی۔ اگر کچھ کام ہو تو بندی خدمت کے لئے حاضر ہے۔ کوئی بھی کام ہو میں کر لوں گی" اس نے نہایت سماجت اور عاجزی سے کہا۔

"اللہ کے فضل سے شادی بھی جلدی ہی ہو گی۔ خیر سے آج تو میرے لڑکے کی سالگرہ ہے" موٹی بیگم اترائی۔ "اچھا دیکھو! یہ سارے برتن، دیگچیاں اور پلیٹیں مانجھنے کی ہیں اور یہ سب کپڑے دھونے کے ہیں اگر تم دونوں کام پورے کر دو تو تمہیں سوا روپیہ دونگی" موٹی سیٹھانی کے موٹے موٹے ہونٹ مسلسل ہلے۔

جب اختری کی ماں کی برتنوں کے ڈھیر اور میلے کچیلے کپڑوں کے پلندے پر نظر پڑی تو اس کے بدن میں سنسناہٹ کی لہر دوڑ گئی۔ اور اسے بڑی مایوسی ہوئی مگر جب اس نے سنا کہ مزدوری پورا ایک روپیہ اور چار آنے ملے گی تو اس کی مایوسی، اطمینان اور خوشی میں تبدیل ہو گئی۔ سوا روپیہ میں تو وہ اپنی بچی کے لئے اچھی چوڑیاں خرید سکے گی اس نے خوشی خوشی کام شروع کر دیا۔ مگر جوں جوں وہ برتن دھوتی گئی اور برتن آتے گئے۔ مہمان یکے بعد دیگرے آ رہے تھے اور جھوٹے برتنوں کی آمد کا سلسلہ شیطان کی آنت کی دراز ہو رہا تھا حتیٰ کہ رات کے دس بج گئے۔ اب اسے کپڑے دھونے تھے ...... جب وہ کپڑے دھو کر فارغ ہوئی تو دوسرے کمرے سے گھڑیال میں بارہ بجنے کی آواز سنائی دی۔ اس کا بدن تھکن سے چور چور ہو رہا تھا۔

"بیگم صاحبہ! اب آپ کا کام ختم ہو گیا ہے، اب مجھے چھٹی دیجئے۔ میری چھوٹی بچی گھر میں اکیلی میرا انتظار کرتے کرتے گھبرا رہی ہو گی" اختری کی ماں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا

"ابھی کہاں چلی ...... ابھی تو سارا کام پڑا ہے اور بی بی جی اٹھ کھڑی ہوئیں ...... بڑی آئی لاڈلی بیٹی کی لاڈلی ماں ...... مجھے کیا تمہاری بیٹی ہے کہ نہیں ...... مجھے تو اپنے کام سے مطلب ہے۔ کیا میں تمہیں معقول مزدوری نہیں دے رہی ہوں ؟ مگر تم لوگوں کو تو حلال کی کر کے کھانی آتی ہی نہیں ...... ہم اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی کے پیسے یوں ہی نہیں پھینک دیتے پھر تم ہڈ حرام لوگوں کو، ...... کپڑے دھل گئے ہیں تو ان کو رسیوں پر ڈالو، اور برتن سب شلفوں پر لگاؤ۔ پھر مہمانوں کے لئے بستر وغیرہ لگانا اس کے بعد چلی جانا ... اس سے پہلے نہ جانے دوں گی"

پانچ چھ گھنٹوں کی مسلسل مشقت سے چُور بیٹی کے فکر میں گھل

نے بادل ناخواستہ یہ نئے کام بھی نمٹائے۔ جب موٹی
۔۔۔ ردپیہ اور چار آنے کی ریزگاری اس کی ہتھیلی پر دھری
ان کا سانس لیا اور اس کی ساری تھکن مدھم پڑ گئی اور
ں کی مسلسل اور سخت مشقت کی کوفت کافور ہو گئی۔۔۔
ے باہر نکل کر وہ جلدی جلدی قدم اٹھاتی ہوئی اپنے گھر

ہی جا کر اختری کے لئے اچھی اچھی چوڑیاں خرید کر لاؤں
ہی دل میں طے کر لیا۔۔۔ "غریب بچی کے اس عمر میں
پڑے ہونے ہی چاہئیں۔ وہ اکیلی اندھیری کوٹھڑی میں
ے ڈر رہی ہو گی مجھے کوس رہی ہو گی، مگر خیر کل صبح
کی رنگ برنگی چوڑیاں لا کر دوں گی تو خوش ہو جائے
جائے گی، تو میں اس سے کہوں گی کہ میری ننھی منی
پڑے بھی سلا دوں گی اور پھر۔۔۔۔"
چھنالا ۔۔۔!" ایک کرخت مردانہ آواز نے اس کے
یکدم مسمار کر دیا۔
رات گئے کہاں آوارہ گردی کر رہی ہے؟" یہ پولیس مین
"تم چھنالوں کو آدھی رات گئے بھی چین نہیں ہے!
ارہ گردی نہیں چھوڑتیں۔۔۔ اچھا چلو میرے ساتھ تھانے
ں کی، دیوار کے ساتھ مار کر تیرا سر پھوڑ دوں گا۔"
ھیا نزدیک آئی اور گلی کے لیمپ کی روشنی میں اس
کے خد و خال واضح ہوئے تو قانون کے اس مقدس
آنکھوں کی چمک مدھم پڑ گئی۔
جی! میں ایسی نہیں ہوں جیسا آپ نے خیال کیا ہے"
نہایت عاجزی سے کہا۔۔۔ "میں تو ایک شریف عورت
مزدوری کر کے اپنے گھر کو لوٹ رہی ہوں جس گھر میں
گرہ تھی میں تو وہاں سے دن بھر برتن مانجھنے اور کپڑے
دری لیکر واپس آ رہی ہوں، مہربانی کر کے جمعدار جی
بجئے۔ وہاں میری چھوٹی معصوم بچی میرے جلدی نہ
ود فکر میں پاگل ہو رہی ہوگی۔ کیونکہ میں نے اس سے

کہا تھا کہ میں شام تک واپس آجاؤں گی۔ کل اس کے لئے چوڑیاں بھی
خریدنی ہیں۔۔۔ مگر آپ میرا راستہ کیوں روکے کھڑے ہیں۔۔۔ مجھے
گھر جانے دیجئے نا۔۔۔۔۔ سچ سچ میں ایسی عورت نہیں ہوں جیسا کہ
آپ کا خیال ہے۔ مہربانی کر کے مجھ پر رحم کھائیے۔۔۔ مجھے جانے
دیجئے۔۔۔۔ مجھے۔۔۔۔"

"بکو مت۔۔۔۔ بوڑھی چھنالہ۔۔۔ چپکے سے چلو میرے ساتھ
تمہارے لئے اسی میں عافیت ہے۔۔۔۔" پولیس مین نے حقارت سے
دانت پیستے ہوئے کہا

"خدارا۔۔۔۔ خدارا۔۔۔۔۔ للہ مجھ پر رحم کرو جمعدار جی!" بڑھیا
نے پولیس مین کے قدموں پر جھکتے ہوئے التجا کی ۔۔۔ "میں آپ کی
بڑی احسان مند ہوں گی۔ آپ کی مہربانی کا بدلہ چکانے کے لئے میرے
پاس سوائے مزدوری کے اس سوا روپیہ کے اور کچھ نہیں۔ خدا کے
واسطے مجھے گھر جانے دو۔"

"اچھا بڑھیا" سپاہی نے اس کے نزدیک آ کر آہستہ آواز
میں کہا۔ "مگر اس میں سے آدھے پیسے میرے ہیں۔ میں تو سارے
پیسے لے سکتا ہوں مگر میں تمہیں رعایت کرتا ہوں کہ صرف آدھے
پیسے ہی لیتا ہوں تمہیں میرا مشکور ہونا چاہئے ٹھیک ہے نا؟" اس نے
بڑھیا کے ہاتھ سے سارے پیسے چھین لئے۔ ان کو گنا اور آدھے اپنی جیب
میں ڈالتے ہوئے باقی بڑھیا کے ہاتھ پر رکھ دیئے

"اب چپکے سے اپنا راستہ پکڑ!" اس نے آہستہ سے کہا۔ "اور ادھر
ادھر مت دیکھنا اور نہ ہی کوئی شور و غل کرنے کی جرأت کرنا ورنہ میں آ کر
تمہارا سر توڑ دوں گا۔" ۔۔۔۔ اس خاموش ظلم سے اسکے دل میں آہوں
اور بد دعاؤں کا ایک ایسا طوفان عظیم اٹھا جو الفاظ کا جامہ پہننے سے قاصر رہا
بڑھیا نے باقی پیسے اپنی جیب میں رکھے اور اپنے گھر کی طرف آہستہ آہستہ چل دی شدت
غم کے بوجھ سے اسکے دل و دماغ کچھ نہ سوچ سکتے تھے۔ وہ المناک آواز میں آہستہ
آہستہ بڑبڑاتی جا رہی تھی۔ یا اللہ۔۔۔۔ وہ چوڑیاں۔۔۔ کیا میں کبھی بھی اپنی بچی کے
لئے نہ خرید سکوں گی؟ میری بچی۔۔۔ میری غریب بچی۔۔۔ او خدایا، او خدایا۔"
اور اس کی یہ دردناک آہیں پاکستان کی تاریک فضاؤں میں تحلیل ہو کر رہ گئیں آہ
تاریکیاں *

(انگریزی سے ترجمہ از پاکستان ریویو)

مرزا عباس دانش چاکنی •

○

جو سوزِ غم سے دل کو چراغاں نہ کر سکے
وہ بزمِ زندگی کو فروزاں نہ کر سکے

تر دامنی سے پاکیٔ داماں نہ کر سکے
ہم اشکِ انفعال کو طوفاں نہ کر سکے

سوزِ دل و جگر سے چراغاں نہ کر سکے
ہم کوئی روشنی شبِ ہجراں نہ کر سکے

ہر پردۂ نگاہ میں پنہاں تھے سو حجاب
نظارۂ حقیقتِ عریاں نہ کر سکے

مختار وہ کہ موت پہ بھی بس نہ چل سکا
مجبور یہ کہ زیست کا ساماں نہ کر سکے

دو ہچکیوں میں ختم تھا افسانۂ حیات
ہم اور شرحِ حالِ پریشاں نہ کر سکے

گزری خزاں تو کیا، چمن اب تک اداس ہے
ہم خونِ دل بھی نذرِ گلستاں نہ کر سکے

دانشؔ رہِ وفا میں ہیں آشفتہ سر وہ لوگ
جو تیرِ غم کو جزوِ رگِ جاں نہ کر سکے

نیر سعیدی •

○

ہزار رنج و مصائب سے ہم نہ گھبرائے
کبھی کبھی مگر آنکھوں میں اشک بھر آئے

وہ غم نصیب ہوں جس کو خوشی نہ راس آئے
کشا کشِ غمِ دوراں سے جو نہ گھبرائے

غمِ جنوں سہی معمورِ دل مرا جب تک
مسرتوں کی کوئی داستاں نہ دہرائے

مجھے تو خود نہیں معلوم کیا بتاؤں تمہیں
کہ آج کیوں مری آنکھوں میں اشک بھر آئے

کوئی تو چیز مری زندگی میں شامل ہو
خوشی ملے نہ ملے غم ہی راس آ جائے

غمِ حبیب، غمِ زندگی، غمِ دوراں!
ہزار غم ہیں کہاں تک کوئی نہ گھبرائے

تمہیں کہو اسے جینے کی آرزو کیا ہو
وہ بد نصیب جسے زندگی نہ راس آئے

خرد بھٹکتی رہی راہ میں خدا شاہد!
جنوں کے قافلے منزل پہ ہو کے لوٹ آئے

غم و الم کی کوئی انتہا بھی ہے نیرؔ
غم و الم سے کہاں تک کوئی نہ گھبرائے

ل ہاشمی •

سحر سے پہلے

شرق کے پہاڑوں کے سر ہلکی سفیدی میں ملبوس ہونے
بہتا ہوا اور مدھم سروں میں خدا کی تعریف و توصیف کے
ں جھینگے لگاتار گالے گا رہے تھے۔ پرندے ایک جیسی بھری
تیرنے لگے تھے آبادی کے قریب چند درختوں کے درمیان
ند درخت سے یکے بعد دیگرے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ ہوتی
س طرح ہوا میں ایک ہچکولا سا کھاتے ہوئے مختلف طرفوں
تے جیسے وہ انگڑائی لیکر سوچتے ہوں۔ انھیں کہاں جانا ہے
اپنی منزل کی طرف رخ اختیار کر رہے تھے۔

یک اسی درخت کے نیچے ایک بوسیدہ اور پرانی جھونپڑی
پڑا رہتا تھا۔ بالکل اسی طرح سوکھا اور بےدم جیسے اس
لے پتے بےدم ہوکر اسکی جھونپڑی کے چھپر اور آنگن میں ادھر
سے بکھرے پڑے رہتے تھے صحن کے ایک طرف جہاں
لکے مسلسل تھپیڑے کھاتے ہوئے اکٹھے ہو جاتے۔۔
سکی ٹوٹی ہوئی چارپائی بچھی رہتی جس کے بارے میں وہ۔۔
نور لگاہوں کو پھاڑ کر کسی طرف گھورتے ہوئے کہتا رہتا
ں بہن سکھاتی ہے۔

ج کافی دیر ہوگئی وہ اٹھا نہیں تھا۔ ورنہ صبح ہی اٹھکر
قریب ہرے بھرے جنگل میں نکل جاتا تھا۔ اور معمولی
بعد گھر کے دروازے پر آکر اپنی چاند سی بیٹی "میراں" سے
ہماری رسی اور ٹوکری تو اٹھا دینا۔"
د میراں مسکراتی ہوا انگڑائیاں لیتی ہوئی اٹھتی رسی لپیٹ
ڈالتی اور ٹوکری اپنے بابا کے سر پر رکھ دیتی۔ لیکن
ی سے نیند میں کروٹیں لے رہا تھا نہ جانے کیوں۔ آج
ز اچھا نہ رہتا ان خشک ہڈیوں میں آرام کی سکت کہاں

تھی اور یوں بھی ہر وقت فکرمند رہنے کی وجہ سے کبھی پوری نیند نہ لے سکا تھا میراں بھی آج سوتی رہی کہ بابا جنگل سے واپس آکر اسے خود ہی جگا دیگا مگر صبح ہو چکی اتنی دیر ہوگئی بابا اٹھا ہی نہیں تھا۔ دھوپ درخت کے۔۔ آدھے حصہ پر آچکی تھی میراں نیند سے تھک کر خود ہی اٹھ بیٹھی کہ بابا ابھی تک نہیں اٹھے وہ آگے بڑھی دبے دبے قدموں سے بابا کی چارپائی کے قریب پہنچکر جھکی "ہائے" بابا کا چہرہ تو بالکل مردوں جیسا تھا تمام جسم اس طرح پیلا تھا جیسے موت کے مقناطیسی ہاتھوں نے اس کا تمام خون چوس لیا ہو۔ وہ ایکدم ڈر گئی کلیجہ جیسے دہل گیا ہو اسکے۔ ہونٹ پھڑپھڑا گئے اور آنکھوں میں آنسوؤں کا ہلکا سا بادل چھا گیا۔ بابا ہر صبح کو بھوکا جاتا ہے کبھی ناشتے کے لئے چنے بھی نصیب نہیں ہوتے "خدایا ہماری مصیبتوں کو آسان کردے" ان ہڈیوں میں جن کا گودا خشک ہو چکا ہے فاقہ کرنے اور مزدوری کی طاقت کہاں سے آئے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اپنا ہاتھ بابا کے ماتھے کی طرف بڑھایا اور بابا نے اک دم کراہتے ہوئے کروٹ لی اور اس نے جھجک کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ کچھ دیر دل پکڑ کر سوچتی رہی پھر آنکھیں ملتے ہوئے چلی۔ سلور کا پرانا پیالہ اٹھا کر پڑوسن کے یہاں چلی گئی۔ پڑوسن پیڑھی پر بیٹھی موٹی دہی بلو رہی تھی۔ میراں کے ہاتھ میں پیالہ دیکھکر ماتھے پر تیوریاں آگئیں طنزیہ بولی۔ آؤ کیسے آئیں میراں صبح صبح۔

اور میراں کو جیسے بجلی نے دھکا مار دیا ہو۔ پڑوسن کے چہرے پر شکنیں دیکھکر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے سمندر کی پرشور ابھرتی ہوئی موجیں اسے فنا کردیں گی۔ جی جی میں جی ذرا بابا کے لئے تھوڑا سا چھاچھ لینے آئی تھی۔

پڑوسن قدرے ترش لہجہ میں بولی: آئے ہائے ابھی تو میں نے دہی بلویا بھی نہیں کہ طلبگار پیدا ہوگئے کیا خوب! میراں

شرمندہ سی ہو کر واپس لوٹی۔

دیور بولا۔ بھابی تم مذاق اس قسم کا کرتی ہو کہ ہر آدمی سچ ہی سمجھے انسان کا دل ہر وقت خوش نہیں ہوتا بلاکر چھاچھ دیدو۔!

بھابی تنک کر بولی۔ ادہو تو میں نے کب انکار کر دیا تھا؟ واپس چلدیں لو بہن یہ لو۔ بھائی دیو سلامت رہیں اس بستی میں کسی کو کوئی تکلیف یا شکایت نہیں رہیگی۔

میراں بڑے ہی پُردرد لہجہ میں بولی۔ ہم غریبوں سے تو بھابی کا دل بہلتا ہے بھلا اور ہے ہی کون جس سے یہ مذاق کریں۔

پڑوسن نرم ہو کر بولی نہ بہن تم تو جانتی ہی ہو کہ میں مذاق کرتی رہتی ہوں تم ایک دن کیا روزآنہ چھاچھ لیجایا کرو ہمارے یہاں گھاٹا نہیں آئیگا۔ لاؤ پیالہ۔ میری باتوں کا برا نہ مانا کرو۔

میراں نے ایک ٹھنڈی سانس لی مسکرائی اور چھاچھ لیکر چلی آئی۔ چارپائی خالی تھی۔ بابا جاچکا تھا وہ رنجیدہ سی ہو کر رہ گئی۔ چھاچھ کا پیالہ ڈھک کر گھڑونچی پر رکھدیا۔ اور منہ دھونے کے لئے اپنی اوڑھنی کو ایک طرف سنوارنے لگی۔ ہاتھ لگ گیا تو میل سے گلی ہوئی اوڑھنی کا زخم چر گیا وہ بہت دکھ سے جھنجلائی پہلے ہی کیا کم روزن تھے جو کمبخت اور بھی پھٹ گئی اس نے غصہ میں آکر یونہی منہ پر دو چار چلو ڈال کر اسی میلی کچیلی اوڑھنی سے پانی خشک کر دیا۔ چھپر کے نیچے دیکھتے ہوئے۔ ارے یہ رحمو ابھی تک نہیں اٹھا۔ اورحمو۔ ارے رحمو۔ اٹھ تو۔

اور رحمو آنکھیں ملتا اور نہ جانے کیا کیا ممناتا اٹھ بیٹھا رحمو کی نگاہیں گھڑونچی پر رکھے ہوئے چھاچھ کے پیالہ پر جم گئیں میراں کی زبان دانتوں تلے دب گئی اور وہ فوراً بولی ارے رحمو تو ابھی سو جا جب اچھی طرح صبح ہو جائیگی میں تجھے اٹھاؤنگی شاباش سو جا۔ سو جا میرے بھیا۔

رحمو بھی بلا کا چالاک تھا نیند میں بولا۔ میں سوجاتا ہوں مگر میرے لئے بھی رکھ لینا۔

بابا کے کھنکارنے کی آواز آئی۔ میراں بھاگ کر دروازے پر پہنچی۔ بابا جنگل کی طرف سے آرہا تھا وہ مسکرا پڑی اس نے جلدی سے چھاچھ میں تھوڑا پانی ملا دیا۔ آج بابا کو خوب پیٹ بھر کر ناشتہ کرادوں گی۔ بابا حسب معمول دروازے پر آکر رکا اور روزآنہ کی طرح اپنی نحیف آواز میں بولا۔ بیٹا ہماری ٹوکری اور رسی اٹھا دینا چاند! لیکن میراں بجائے رسی ٹوکری کے اسکی امید کے خلاف کچھ لئے آرہی تھی بابا کی بھویں یکبارگی اوپر اٹھیں۔ وہ مسکرا کر بولا۔ ارے آج میراں چاند کیا لا رہا ہے۔

میراں بڑی فخریہ خوشی سے بولی۔ لو بابا یہ چھاچھ لائی ہوں پی لو۔ روزآنہ بھوکے جاتے ہو آج خوب پیٹ بھر کر پی لو۔ بابا کی.... آنکھیں خوشی سے چمک گئیں جبیں پر پڑی ہوئی شکنیں کئی بار مسرت میں تنیں اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پیالہ لیا ہونٹوں کے قریب لاتے لاتے رک گیا۔ یہ تو بہت ہے تھوڑا سا تو لے لے۔

میراں نے پیار سے کہا۔ نہیں تم پی لو۔ بابا تمام دن... دھوپ میں پھرو گے۔!

بابا نے منت کی۔ ارے بیٹا۔ تھوڑا سا تو لے لے اور.. چھوٹے بھائی کو بھی دیدے۔

میراں کھسیا کر بولی۔ بابا کیوں بلا وجہ شور کرتے ہو تمہارے لئے لائی ہوں تم پی لو ہم دونوں انتظام کر لیں گے۔ بابا پر ایک قسم کا رعب ساطاری ہو گیا۔ اس نے بلا ارادہ دو چار گھونٹ پیئے اور پیالہ واپس کر دیا۔ لے چاند اب تم دونوں پی لینا۔ اور اسکے بعد وہ خود ہی اندر آیا۔ رسی ٹوکری اٹھائی۔ ہنکار کر میراں سے بولا۔ آج کمر میں جیسے پٹی سی بندھ گئی ہو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پھر سے طاقت آگئی۔ میرا دل آج بیٹھا جا رہا تھا اب سنبھل گیا۔ خدا تجھے چین نصیب کرے

میراں ابھی تک دروازے پر کھڑی تھی بابا قریب سے گذر رہا۔ میراں نے بڑی ہمت کرکے نہایت آہستگی سے کہا۔ بابا.......

بابا خود ہی ذرتا ہوا تا جا رہا تھا ایک دم چونک کر بولا۔ ہاں بیٹا۔

میراں بھی سہم گئی۔ کچھ نہیں بابا جاؤ۔!

بابا نے میراں کے چہرے پر اپنی نیلی آنکھیں گاڑتے ہوئے کہا۔ کہدے بیٹا...... میں جانتا ہوں تو کئی دن سے مجھے اپنی پھٹی ہوئی اوڑھنی دکھا رہی ہے یہی بات ہے نا۔؟

میراں نے جھکی جھکی آنکھوں سے بابا کی طرف دیکھتے ہوئے

ہائے پاس اتنے پیسے کہاں ہوں گے۔ بابا بڑے...
مسکرایا اور ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ ارے چاند۔
العالمین پہ ہے اور آج ان کا خیال ہے کہ تیرے لیئے
یں گے۔
ر بابا چلا گیا۔ میراں دروازے پر کھوئی کھوئی سی کھڑی
آواز دے کر چونکا دیا۔ آیا آٹا۔
میراں نے غصہ میں آکر ساری چھاج اسکے آگے..
لے ظالم۔
شہر میں داخل ہوا آج اسکے قدم تیزی سے اٹھ رہے
خوش نظر آتا تھا۔ سبزی منڈی کے قریب آکر ٹوکری
سے جمالیا اور بے پناہ ہجوم میں آدمیوں سے ٹکراتا اور
بڑھ رہا تھا جیسے دریا کی پرشور لہروں میں کوئی تنکا
ہو نہ جانے کیا کیا سوچتا اور امیدوں کے نقشے..
کہیں سے آواز آئی "اے ٹوکری والے"
نے مضطرب ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ بھیڑ کو چیر کر باہر
ا۔ جب وہ ہار کر اپنی نگاہیں پھیرنے والا تھا اس نے
ے سے پرے دیکھا۔ کمزور سا ٹوکری والا سامان سر پر رکھے
کوشش کر رہا تھا۔ بابا پھر تیز قدم ہجوم میں کھو گیا۔
اسے کافی وقت لگا تھا۔ دھوپ بہت پھیل گئی تھی اور
اش میں اسے چند گھنٹے گذر چکے تھے بلا کی گرمی پڑنے لگی
اپنی دھن میں ادھر ادھر آجاتا جاتا دکانوں پر ضروریات
خرید و فروخت تیز تر ہو رہی تھی بابا کے دیکھتے ہی دیکھتے
لے سامان پہنچا کر واپس آ چکے تھے اور اسے کسی نے پوچھا
دہ شدت انہماک سے کسی آواز کی تلاش میں تھا کبھی دکانوں
م میں گھس جاتا۔ کبھی سڑک کے درمیان بڑی سستی
پھرتا ہوا آگے بڑھتا۔ ایک آواز آئی۔ "کوئی مزدور ہے"
نے تڑپ کر ادھر ادھر دیکھا۔ ایک نوجوان کھڑا ہوا
رہا تھا۔ بابا بڑی خوشی سے آگے بڑھا چلا کر بولا آیا حضور
یا"

کمزور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چند آدمیوں کو دھکیل کر وہاں
پہنچ کر بولا۔ جی میں آ گیا۔ ہاں سر پہ رکھوا دیجئے نوجوان نے سامان
سر پہ رکھوا دیا۔ بابا بھیڑ سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے کئی بار لڑکھڑایا
اسکے قدم کانپنے لگے بوجھ زیادہ تھا۔ نوجوان نے پریشان ہو کر کہا۔
ابھی چھوڑ بابا تو معاف کر۔
بابا نے خوشامد کی۔ بابو میں لے چلوں گا۔ جلدی جلدی
چل سکتا ہوں آپ چلئے۔
لیکن نوجوان نے بغیر کچھ سنے ہوئے اس سے سامان چھین لیا
اسکے سر سے جب سامان کا بوجھ اترا تو اسے لگا ایک چکر سا آ گیا آنکھوں
میں اندھیرا ہونے لگا۔ جب اس نے آنکھیں مل کر آہستہ آہستہ
کھولیں تو نوجوان جا چکا تھا۔ ٹوکری خالی پڑی ہوئی تھی اس نے
ٹوکری کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور موری کے اوپر سائے میں بیٹھ کر کچھ
سوچنے لگا۔ بارہ بج چکے تھے۔ گرمی حد درجہ پر تھی وہ دم لیکر پھر اٹھا
موری میں پیاز کی چند گٹھیاں پڑی تھیں نہ جانے کیا سوچ کر اس
نے جیب میں رکھ لیں اور پھر انتہائی مستعدی اور چستی سے اپنی ٹوکری
اٹھا کر چلنے لگا۔ اپنی گردن کو بار بار تیزی سے گھماتا۔ آنکھیں پھیرتا۔
اور اپنے نحیف قدموں کو ایسے جما کر رکھتا جیسے بہت ہی چست طاقتور
اور چالاک آدمی ہے۔ چہرے پر ہلکی سی مسرت اور پسینے کی چھوٹی
چھوٹی بوندیں نظر آ رہی تھیں۔ اس نے بمشکل بازار کا ایک چکر لگایا
تھا مگر مزدوری نہیں ملی تھی وہ کچھ مایوس سا ہو گیا۔ آسمان کی طرف
بے کسی سے دیکھا اف مالک تھوڑی سی طاقت دیدے کہ بوجھ اٹھا۔
سکوں نگاہیں نیچی کر کے وہ ایسے مسکرایا جیسے اسے سچ مچ طاقت مل گئی
ہے اور پھرتی سے ہجوم کو چیرتا ہوا آگے بڑھا بازار کے آخیر کونے پر ایک
سگار پینے والا بابو شاید اسے بڑی دیر سے دیکھ رہا تھا آواز دے
کر بولا۔ یہ سامان لے چلو بابا نے بڑی ہمت سے سامان اپنی ٹوکری
میں رکھا اور سر پر اٹھوا کر بابو کے پیچھے مڑ لیا۔ بابو بڑی گہری
تشویش سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسکی نگاہیں کبھی اسکی دبی دبی مردہ
سی آنکھوں پر پڑتیں کبھی وہ اسکے چہرے پر آئی ہوئی بیشمار جھریوں
کو دیکھتا لگا ہے بابا کے لرزتے قدم پھٹا ہوا لباس کالے کپڑے

کی بیننامی جیب میں پہنونہ اسے کچھ سوچنے پر مجبور کررہی تھی۔

بازار سے نکل کر جب کچی سڑک پر وہ آیا تو اسکے ننگے پاؤں تلوؤں کی گرم پگھلی ہوئی سڑک سے جھلنے لگے۔ بابا نے کئی بار پاؤں کی انگلیوں کو سکوڑ کر جلن سے پاؤں کو بچانیکی کوشش کی مگر وہ کانپنے لگا۔ وہ کوشاں تھا کہ بابو اسکی نقاہت پریشانی اور اضطراب کو نہ دیکھ سکے مگر بابو کی نگاہیں تو اسکے جسم کے ہر حصہ سے چپک سی گئی تھیں وہ اور بھی گھبرا گیا۔ اسکے چہرے سے لاتعداد پسینے کی بوندیں ٹپکنے لگیں۔

بابو لیکا یک بولا ٹھہرو۔

بابا کا منہ اس طرح پھٹ گیا جیسے وہ بڑی ہی عاجزی سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔

بابو کچھ مسکرایا۔ اور اس نے تانگہ والے کو آواز دی تانگہ آگیا۔ بابو برابر مسکرا رہا تھا۔ بابا کی طرف دیکھکر بولا۔ یہ سامان اس تانگہ میں رکھدو۔

بابا کے حلق میں جیسے گٹھلی اٹک گئی ہو۔ غم نے اس کا گلا دبا دیا تھا وہ بمشکل اٹک اٹک کر بولا۔ بابو۔ با۔ بابوجی...... یہ یہ سامان میں ہی لے چلوں گا۔ میں...... خود لے چلوں گا۔

بابو ہنس کر بولا تم ڈرو مت تمہاری مزدوری تمہیں ملے گی۔ سامان رکھکر تم خود بھی تانگہ میں بیٹھ جاؤ۔

بابا اپنے کانپتے قدموں سے تانگہ میں ڈرتے ڈرتے بیٹھ گیا وہ سوچ رہا تھا شاید بابو مذاق کر رہا ہے کوشش کے باوجود وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ تانگہ بابو کے مکان پر رکا۔ سامان بابو نے خود اٹھا کر اپنے گھر میں رکھ لیا بابا تانگہ سے اترا مایوسی میں سوچ رہا تھا مزدوری۔ تانگہ کے کرایہ میں صرف ہوگئی۔ اور۔ اور کچھ نہیں وہ جھنجھلا کر اپنے نحیف ہاتھوں سے نوکری کے چبوترے کو توڑتا ہوا واپس مڑا کہ بابو نے بلا کر کہا "یہ لو پانچ روپے کا نوٹ"

بابا حیرت میں تھا۔ اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ آنکھوں سے دو چار آنسو بھی نکل پڑے۔ کیوں مذاق کرتے ہو بابو۔ بابو سنجیدگی سے بولا میں کسی دل جلے سے مذاق نہیں کرتا۔ یہ تمہاری مزدوری ہے لے لو"

بابا نے ڈرتے ڈرتے نوٹ لے لیا اور ایک خوفزدہ تیزی سے گھومتا ہوا سبزی منڈی کی بھیڑ عبور کرکے کپڑے کی دکانوں کے درمیان کھویا کھویا پھرنے لگا۔

(بشکریہ کوثر)

جماعت اسلامی کی تائید میں

تین اہم کتابیں

فتوی دیوبند کا تحقیقی جائزہ

دیوبند کے صدر مفتی کے فتوی کا جس پر بیس سے زائد علماء دیوبند کے دستخط ہیں مسکت ومدلل جواب حجم ۱۲۸ صفحات قیمت سوا روپیہ

"کشف حقیقت" کا تحقیقی جائزہ

مفتی ناظم مظاہر العلوم سہارنپور کا فتوی کشف حقیقت جماعت اسلامی کیخلاف سب سے زیادہ گمراہ کن فتوی ہے یہ کتاب اس فتوی کا مدلل ومکمل رد جواب ہے ضخامت ۱۲۸ صفحات قیمت سوا روپیہ

"نور توحید" کا تحقیقی جائزہ

حلقہ اہل حدیث کی طرف سے بھی جماعت اسلامی پر طرح طرح کے بے بنیاد الزامات والہامات لگائے جاتے رہتے ہیں۔ اس کتاب میں ان تمام الہامات وبہتانات کا رد کیا گیا ہے۔ مختصر ہونے کے باوجود اپنے مقصد میں نہایت جامع اور کامیاب کتاب ہے۔ قیمت چھ آنے

جماعت کے مسلک ومقصد کی تائید میں دیوبندی اور اہلحدیث دونوں مسلک کے مستند اور مسلم الثبوت اکابر کے اقوال وفتاوی نے تینوں کتابوں کی اہمیت کو مخالفین کے لئے ناقابل انکار بنا دیا ہے۔

مکتبہ تحفظ اردو، رام نگر، بنارس (بھارت)

نوٹ:۔ پاکستانی حضرات شیخ قمرالدین مکتبہ تعمیر انسانیت کچری روڈ موچی دروازہ لاہور کے پتے پر کتابوں کی قیمت اور ۱۲ر محصول ڈاک کیلئے بھیجکر تحفظ اردو کو مطلع فرمائیں انکو کتابیں بھیجدی جائیں گی۔

ساغر ہوشیارپوری

پجارن

مانگتی ہے اس سے جس کا اڑ گیا رنگ شباب　　مانگتی ہے اس سے جسکے جھڑ چکے ہیں برگ و بار
مانگتی ہے اس سے جس کا بانکپن چھنیا گیا　　مانگتی ہے اس سے جس پر چھا گیا گرد و غبار
مانگتی ہے اس سے جو محکوم بھی، مجبور بھی ا　　مانگتی ہے اس سے جو خود ہے سراپا انکسار

اے پجارن کب تلک یہ نالۂ پُر احتیاج
کر نہیں سکتا یہ "پیپل" تیرے زخموں کا علاج

التجا اس سے کہ جس کی جھک گئی غم سے کمر　　التجا اس سے ہزاروں جس نے دیکھے انقلاب
التجا اس سے کہ جس کی آنکھ پرنم ہی رہی　　التجا اس سے کہ جس پر بادِ صرصر کا عتاب
التجا اس سے کہ جس کو کھا گئی فصلِ خزاں　　التجا اس سے کہ جس کا چھن گیا فطری شباب

اے پجارن کب تلک یہ نالۂ پُر احتیاج
کر نہیں سکتا یہ "پیپل" تیرے زخموں کا علاج

سجدہ اسکو جو سراسر بے کس و مجبور ہے　　سجدہ اسکو جو بنا سکتا نہیں تقدیر بھی
سجدہ اسکو جو اندھیں تاریکیوں میں گھر گیا　　سجدہ اسکو جس کی قسمت میں نہیں تنویر بھی
سجدہ اس کو جو نہیں سنتا حدیثِ دلگداز　　سجدہ اسکو جس کی آہوں میں نہیں تاثیر بھی

اے پجارن کب تلک یہ نالۂ پُر احتیاج
کر نہیں سکتا یہ "پیپل" تیرے زخموں کا علاج

مانگ اس خالق سے جس کا فیض خاص و عام پر　　مانگ اس کی ذات سے جو ہے محیطِ بیکراں
مانگ اس ذاتِ مقدس سے کہ جس کا احترام　　کر رہا ہے جھک کے ہر دم عالمِ کون و مکاں
مانگ اس سے جو غریبوں مفلسوں کا ہے خدا　　مانگ اس سے جو نحیفوں بیکسوں کا رازداں

اے پجارن کب تلک یہ نالۂ پُر احتیاج
کر نہیں سکتا یہ "پیپل" تیرے زخموں کا علاج

میاں نورالقادر ●

وہ جس کی یاد....

مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہیں جب ہائی سکول کی پڑھائی کے آخری دن تھے اور ہمارے انگریزی کے لکچروں کے سلسلہ میں سب سے پہلا لکچر ہونے والا تھا ہم سب نئے استاد کی آمد کا نہایت اشتیاق سے انتظار کر رہے تھے۔ ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ دروازے میں سے ایک طویل قامت کا آدمی داخل ہوا شکل وشباہت سے وہ کوئی نمایاں شخصیت کا آدمی نظر نہ آتا تھا عمر قریباً چالیس سال ہوگی۔ اس نے شرمیلے انداز سے سب کو سلام کیا۔ اس کی آواز میں ایک حیرت انگیز معززانہ سنجیدگی پوشیدہ تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ چند نوعمر طالب علموں کی بجائے سپریم کورٹ سے مخاطب ہو رہا ہے۔ اس نے نہایت متانت سے اپنا نام تختہ سیاہ پر لکھا ـــ ولمر ٹی، ہٹون! اور سنجیدگی سے اپنی میز کے سامنے آ بیٹھا۔ اپنی ایک ٹانگ کو ذرا سا پھیلا دیا۔ اور اپنا ہاتھ آہستہ سے گھٹنے پر رکھ دیا۔

"معزز دوستو!" اس نے بولنا شروع کیا۔ "ہم آج یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ یہ آپ کا اختتامی دور ہے اس میں آپ کے انگریزی کے لکچر جاری رہیں گے۔ میرا خیال ہے کہ ہماری یہ مجالس کافی دلچسپ رہیں گی اور ہم ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھ لیں گے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے اب ہم صحافت کے متعلق کچھ سیکھنے کی کوشش کریں گے۔ اور اس بات کا بھی انتظام کرنا ہوگا کہ آپ کے سکول کا ہفتہ وار اخبار بھی اچھی طرح چل سکے۔ اور سب سے زیادہ اہم چیز یہ ہے کہ ہم کوشش کریں گے کہ فن ادب کی رعنائی اور پاکیزگی کو محسوس کریں اور اس سے مسرت حاصل کریں ہو سکتا ہے۔ کہ ہم میں سے واقعتاً کوئی ادب کا پروانہ بن جائے اور لکھنے سے دلچسپی لینے لگ جائے۔ اگر اس قسم کے کچھ صاحبان پیدا ہو گئے تو مجھے یقین ہے اور میں جرأت سے یہ کہتا ہوں کہ وہ دوسروں کی نسبت زیادہ شاندار، پاکیزہ اور پر مسرت زندگی گزاریں گے اور ان کی یہ زندگی اوروں کی گزشتہ زندگی سے نسبتاً زیادہ خوبصورت ہوگی۔"

وہ ایک خاص انداز سے بول رہے تھے بغیر کسی جھجک کے، ان کی آواز میں ایک پیغام تھا دوستی کا، محبت کا اور میرے دل میں جوش، خروش اور عزم کے عجیب و غریب احساس ہو گئے۔

اس دن کے بعد ان کا جوش و خروش روز بروز بڑھتا گیا بعینہ یہی احساسات ہم میں بھی پراسرار تیزی سے سرایت کر گئے۔ وہ "کیٹس" (Keats) کی کوئی نظم پڑھ لیتے اور کہتے ...." آیئے دیکھتے ہیں کہ ہم اکٹھے مل کر اسے زیادہ بہتر طریق سے پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ چلیئے آزما لیتے ہیں ......" اور اچانک فضا میں ایک لہر پیدا ہو جاتی۔ نغموں کا ایک طوفان بپا ہو جاتا، خیالات کا ایک خوبصورت سماں بندھ جاتا۔ اور اچانک ہمیں محسوس ہوتا کہ یہ نظم اس سے بہتر طریق سے نہیں پڑھی جا سکتی تھی ـــ ان طریقوں سے انھوں نے ہم میں زبان و ادب کی رعنائی اور شناسا ہونے کا جذبہ پیدا کر دیا۔

جماعت میں بٹھلاتے وقت وہ خفیف سا تکلف کرتے نظم و ضبط کی تلقین کی کبھی بھی نوبت نہ آئی۔ ان کا سلوک اتنا شریفانہ تھا کہ بجز اسی طرح شرافت سے پیش آنے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ وہ ہمارے ساتھ بڑوں کا سا سلوک کرتے ہم سے کوئی بچوں جیسی حرکت سرزد نہ ہو سکی۔ اس کے علاوہ اس کا ثبوت دینے کے لئے وقت بھی تو نہ ملتا تھا کیونکہ مباحثہ اور کام انتہائی دلچسپ انداز سے جاری رہتی تھی۔ اور ہم از حد محظوظ ہوتے ہم ایک دوسرے کے سامنے اپنا نقطہ نظر اور اپنا خیال

ں کرتے ہم اس طریق سے اپنے سبق کا جائزہ لیتے جیسے ایک معصوم بچہ اپنے
؛ اور خوبصورت کھلونے کا لیا کرتا ہے وہ اسے ادھر ادھر الٹتا پلٹتا ہے۔
ے ہاتھ میں گھماتا ہے اس کے نیچے تجسس اور حیرانگی کے ملے جلے جذبات سے
یتا ہے۔ اس کی شکل معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے رنگوں
ے لطف اٹھاتا ہے ــــ یہی حال ہمارا تھا

"دیکھئے مجھ سے اختلاف کرنے میں کبھی ڈر محسوس نہ کریں" وہ ہمیشہ
تے۔ "اسی سے تو پتہ چلتا ہے کہ آپ اپنے طور پر غور و فکر کر رہے ہیں۔ یہی وہ
ز ہے جس کے لئے آپ یہاں اکٹھے ہوتے ہیں"

اس قسم کی پرجوش باتیں سن کر ہم میں ایک اعتماد پیدا ہو گیا تھا
ر ہم اسی کو انصاف سمجھ لیتے کہ ہمیں زیادہ سے زیادہ توجہ اس طرف
نی چاہیئے اور ہم نے ایسا ہی کیا۔

مسٹر سٹون بھدا لکھنے اور ناہموار قسم کی بول چال سے بڑا خوف
ماتے تھے مجھے یاد ہے ایک مرتبہ ایک کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے
ھا۔ "سترہ سال کی کمسنی میں وہ ......"

جب انھوں نے یہ پڑھا تو ایک تلخ اور تیز نوٹ میری کاپی پر لکھ
یا۔ لکھا تھا۔

"سترہ سال کی کمسنی ایک زمانے میں اچھا محاورہ تھا لیکن اب
ایک پرانی جراب کی طرح ہے۔ نئے سکوں کو سانچوں میں ڈھلنے۔ نئے
کے تمہارے اپنے ہی ہوں"

مسٹر سٹون نے ہمیں وہ خوبصورت ترین تحفہ عطا کیا جو ایک استاد
زیادہ سے زیادہ کسی کو دے سکتا ہے اور یہ تھا "سیکھنے اور سمجھنے کا ذوق"
وہ ایک عجیب انداز سے کسی کہانی کا حصہ بتاتے یا کسی افسانے کا کوئی
ردار یا ادر کوئی نیا خیال بیان کرنے لگ جاتے اور جب ہم سب حیرت سے
ہمہ تن گوش ہوتے تو اچانک بول اٹھتے۔

"میرا خیال ہے آپ صاحبان اس چیز کو پڑھ چکے ہیں؟"

اور جب ہم نفی میں سر ہلا دیتے تو وہ مسکراتے ہوئے کتاب کا نام
بورڈ پر لکھ دیتے تھے۔ اور ہمیں مخاطب ہو کر کہتے

"یہ اور اس قسم کی چند اور خوبصورت کتابیں میں پڑھ چکا ہوں لیکن
میں سوچتا ہوں۔ کاش میں نے ان کتابوں کو نہ پڑھا ہوتا۔ اب خوبصورتی
اور مسرت کے کئی دروازے مجھ پر بند ہو چکے ہیں۔ لیکن آپ کے لئے تو یہ سب
دروازے ابھی کھلے ہیں"

وہ اس بات پر بڑا یقین رکھتے تھے کہ جماعت کے باہر وسیع مطالعہ
کرنا چاہیئے۔ ایک مرتبہ انھوں نے کہا۔

"اگر میں اپنی ساری نصیحت ایک فقرے میں سمونا چاہوں تو وہ یہی
ہو سکتا ہے کہ "ہرجائی" بن جاؤ۔ ہر لائبریری میں آپ وہ تمام خوبصورت
ترین چیزیں پائیں گے۔ جو تمام عہدوں میں کسی نے لکھیں، سوچیں، محسوس
کیں یا کہیں! انھیں چکھیئے۔ ان کا مزہ لیجیئے۔ اکثر کتابوں میں جھانک کر دیکھئے
تھوڑا ادھر سے تھوڑا ادھر سے، اس طرح ایک وسیع میدان قائم کیجیے پھر
ان کتابوں کو گھر لیجائیے اور پڑھیئے جو آپ کے لئے دلچسپی کے لحاظ سے زیادہ
موزوں ہوں۔ یہ کیسا رہے گا کہ آپ اپنے آپ کو کسی دوسری صدی یا ملک
میں چلتا پھرتا دیکھیں۔ یہ ممکن ہے چلئے آپ کو فرانس لے چلیں۔ یہ سمجھئے کہ
انقلاب فرانس کا زمانہ ہے!"

وہ ایک لمحے کے لئے رکے اور پھر آہستہ سے بورڈ پر لکھ دیا۔

"دو شہروں کی کہانی ــــ چارلس ڈکنز!"

"اور کیسا لطف رہے گا کہ آپ چودھویں صدی کی لڑائیوں میں حصہ
لیں؟" ــ اور انھوں نے لکھ دیا ــ "سفید مجلس ــ ڈائیل"

"یا چلئے چند لمحوں کے لئے روم کی عظیم الشان سلطنت میں رہیئے" اور
لکھ دیا ــ "بین ہر ــ ویلیس!" انھوں نے چاک نیچے رکھ دیا۔

"دیکھئے ہر وہ آدمی جو سوانح پڑھا کرتا ہے ایسا آدمی ہے جو آنکھوں
پر پٹی باندھ کر نہیں چلتا۔!"

دن گزرتے گئے اور اچانک اس دور کی میعاد ختم ہو گئی۔ نتیجہ
نکلنے سے پہلے صبح کو اچانک متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ مسٹر سٹون کو
آج شام "ادبی الوداع" کہی جائے گی۔ یہ ایسی الوداعی پارٹی ہو گی جس
میں ایسی نظمیں اور گیت ہوں گے۔ جو ہم خود آپس میں مل کر جوڑیں گے میرے
دوست برنی سلیم نے ایک نظم لکھنی شروع کی۔ عنوان تھا "الوداع"
ہم نے اپنے دماغوں پر زور دیا اور ہر ایک نے اپنی اپنی مرضی سے اشعار
بنا کر اس میں داخل کر دیئے۔ اس کے بعد اچانک ہربیلین نے یہ
تجویز پیش کی کہ ایک "پیروڈی" بھی ہونی چاہیئے۔ اس پر ہم نے گل برٹ

اور سلوین کی نظم "یہ مجلس خوشی کی مجلس نہیں" پر دھا ذا بول دیا اور ہم نے تبدیل کر کے اسے بنا دیا۔

"یہ چاہے ملک کی علاوہ اعلیٰ مجلس خوشی کی مجلس نہیں!"

جب ہم نے یہ پیروڈی لکھ ڈالی تو لاری ہینڈ نے اسے اپنی عجیب غریب اور کسی قدر بھدی آواز میں اونچے سروں سے گایا۔ اس پر ہم سب نے تالیاں بجائیں۔

اس شام مسٹر سٹون آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کمرہ نمبر ۳۱۸ میں داخل ہوئے۔ ہم نے انھیں پہلی قطار کی ایک نشست پر بٹھا دیا۔ شاید آپ کو بھی وہ پرانی قسم کے ڈیسک یاد ہوں گے جن کے ساتھ ایک نشست لگی ہوتی تھی اور جس کا اوپر کا حصہ ڈھلوان کی طرح ہوتا تھا۔ مسٹر سٹون اس نشست پر خاموشی سے بیٹھ گئے۔ انھوں نے اپنی لمبی ٹانگیں دونوں طرف لکڑی کے اوپر پھیلا دیں۔ وہ اس انتظار میں تھے کہ اب کیا ہونے والا ہے ایک لڑکا استاد کی کرسی پر بیٹھا تھا اس نے اچانک تقریر شروع کی اور ہم سب اس کے گرد اگرد جمع ہو گئے۔ مسٹر سٹون کے لب بند تھے وہ خاموشی سے بیٹھے تھے آخر میں آہستہ سے پہلے دائیں طرف مڑے اور پھر بائیں طرف' اور باری باری ہم میں سے ہر ایک کو غور سے دیکھتے رہے۔ ہمیں ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس نظارے اور اس کے کرداروں کو تصویر کی طرح ذہن میں منقش کر رہے ہیں۔

جب ہم پیروڈی کے آخری حصہ کو گا رہے تھے۔ اس وقت ہم نے انکی آنکھوں میں جھلمل جھلمل کرتے ہوئے آنسو دیکھے جو ان کے لمبے رخساروں پر سے لڑھکتے ہوئے ان کے کپڑوں پر آ گرے۔ انھوں نے انھیں صاف نہ کیا صرف ایک دو مرتبہ آنکھیں ذرا سختی سے جھپکا لیں۔ ہم نے زیادہ زور سے گانا شروع کیا تاکہ انھیں محسوس ہو کہ ان کے یہ آنسو ہمیں نظر نہیں آئے۔ جب ہم خاتمے کے قریب پہنچے تو ہر ایک کا گلا مارے غم کے اٹکا جاتا تھا اور مزید گانا مشکل ہو گیا تھا۔

مسٹر سٹون اچانک اٹھے۔ انھوں نے رومال نکال کر ناک اور چہرے کو صاف کیا۔

"لڑکو!" انھوں نے بولنا شروع کیا۔ لیکن کسی نے بھی اس محسوس نہ کیا کہ آج وہ انھیں "دوستو" کی بجائے "لڑکو" سے مخاطب کر رہے ہیں۔ "میں غم کو بیان کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا۔ لیکن میں کہنا چاہتا ہوں کہ آپ نے مجھے وہ کچھ "دیا" ہے۔ جسے میں بھلا نہ سکوں گا" تھوڑے وقفہ کے بعد انھوں نے ایک فطری معلم جیسی معززانہ انداز میں فرمایا۔

"یہی زندگی کا ایک قیمتی راز ہے — "دینا" — اور میں یہ قیمتی راز آپ کو "دے" جاؤں۔ ہم حقیقتاً خوش صرف اس وقت ہوتے ہیں جب ہم کوئی چیز "دیتے" ہیں۔ وہ ادیب جو بڑے ادیب ہوئے ہیں اس لئے ہیں کہ انھوں نے ہمیں دیانتداری سے کچھ دیا" اسی لئے تو وہ "بڑے" ہیں ہم بڑے اور چھوٹے اسی نسبت سے ہوتے ہیں جس نسبت سے ہمارا "دینے والا" ہاتھ بڑا یا چھوٹا ہوتا ہے۔"

وہ چپ ہو گئے۔ باری باری ہر ایک سے ہاتھ ملایا۔ ان کے آخری الفاظ یہ تھے۔

"بعض اوقات میں سوچتا ہوں کہ پڑھا کر روزی کمانے میں کتنا کچھ مل جاتا ہے۔"

جب انھوں نے دیکھا کہ لڑکے برابر انتہائی عزت کی نظر سے ان کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے ہیں تو مسکراتے ہوئے یہ اضافہ کیا

"لیکن اگر اس کے بدلے میں روئے زمین کی سلطنت بھی مجھے دے تو بھی میں اسے نہ چھوڑوں۔"

ولبر سٹون جو کمرہ نمبر ۳۱۸ میں ڈیسکوں کے سامنے کھڑے ہو کر ہمیں ادب سے پڑھایا کرتے تھے اب تک ہمارے دلوں میں بسے ہوئے ہیں اور ہماری دنیا ان کی شاندار زندگی سے منور ہے۔ (ترجمہ، راز ہنری)

بقیہ صفحہ ۲۲

(ک)

چیف وارڈ ۔ (دیکھو "وارڈر")

ہیرا پھیری کرنا ۔ افسروں، وارڈروں اور نمبرداروں سے مل ملا کر خلاف ضابطہ کہیں آنا جانا یا ملاقات کرنا یا کوئی چیز حاصل کرنا یا پاس رکھنا "ہیرا پھیری" کہلاتا ہے۔

ہیلتھ منسٹر ۔ یہ لفظ خاص طور پر بھنگی کے عہدہ کے لئے ایجاد کیا گیا تھا جیسا کہ دربار اکبری میں بیت الخلاء کو صحت خانہ کا نام

نیرو ظفر •

ت آنکھوں میں ہم نے کاٹی ہے
ند تارو ——— گواہ رہنا تم

آج بھی سوگوار ہیں — کلیاں!
اے بہارو ——— گواہ رہنا تم

کتنے لٹتے ہیں قافلے دن رات
رہگذارو ——— گواہ رہنا تم!

لوگ کس طرح جی رہے ہیں یہاں
بے سہارو گواہ رہنا تم!

ناخدا نے ہمیں ڈبویا ہے
اے کنارو ——— گواہ رہنا تم

زندگی سے الجھ رہا ہے نظر
غم گسارو — گواہ رہنا تم!

مشتاق راہی •

نوائے سرمدی

محافظ دین و مذہب کا مسلماں، ہو تو سکتا ہے
محمدؐ کی شریعت کا نگہباں، ہو تو سکتا ہے
عقابی روح پھر بیدار ہو سکتی ہے سینے میں
تخیل اوج و رفعت کا، نمایاں ہو تو سکتا ہے
گھٹائیں رنج و غم کی چھا رہی ہیں آج ذہنوں پر
شبِ تاریک میں لیکن چراغاں، ہو تو سکتا ہے
کوئی چاہے، تو مل سکتی ہے اس کو عظمتِ رفتہ
عمل سے ذرّہ بھی لعلِ بدخشاں ہو تو سکتا ہے
نہ جانے طائرانِ خوش گلو خاموش سے کیوں ہیں؟
بہارِ گل ہے، ہر طائر غزل خواں ہو تو سکتا ہے
مسلط ہے دلوں پر اب تلک تہذیبِ افرنگی
بتانِ عصر سے انساں گریزاں، ہو تو سکتا ہے
کہاں تک قافلے والے چلیں گے خارزاروں میں
رہِ وحدت کا ہر کانٹا گلستاں، ہو تو سکتا ہے

بیکل یزدانی ●

اعلان

نمودِ جلوۂ یزداں کو روکنے آئے ۔۔۔ فریبِ کفر! مسلماں کو روکنے آئے
نظر ملائے اور اک ذرّہ مہرِ تاباں سے ۔۔۔ مجالِ قطرہ، کہ طوفاں کو روکنے آئے
مجالِ ظلمت، جہلِ خرد، ارے توبہ ۔۔۔ جلالِ شعلۂ عرفاں کو روکنے آئے
جسے سلیقہ نہیں کوئی دلنوازی کا! ۔۔۔ وہ جاں نوازیٔ رحمٰن کو روکنے آئے
ہلاکِ ظلمتِ مغرب! خرابِ حسنِ فرنگ ۔۔۔ آئینِ دولتِ قرآں کو روکنے آئے

وہ اور ہوں گے جنھیں انقلاب ٹھیرا دے
ہمارے عزمِ فراواں کو روکنے آئے؟

قیودِ تازہ پہ ہے نازِ محتسب کو مگر ۔۔۔ خیالِ قیدیٔ زنداں کو روکنے آئے
فضا میں گونجتا پھرتا ہے نغمۂ زنجیر ۔۔۔ مناظرِ پسِ زنداں کو روکنے آئے
ہر ایک ساعتِ فردا ہی جس سے وابستہ ۔۔۔ اس ایک طاقتِ امکاں کو روکنے آئے

چمن میں سبزۂ خوابیدہ جاگ اٹھا ہے
خزاں! نزولِ بہاراں کو روکنے آئے

صنم کدے میں کوئی جاکے کردے اعلان ۔۔۔ حرم کدے کے نگہباں کو روکنے آئے
ہوائے ظلم و تشدّد، سحابِ گرد و ستم ۔۔۔ طلوعِ مہرِ درخشاں کو روکنے آئے
کوئی پیام یہ دے، دامنِ زلیخا کو ۔۔۔ کہ آئے اور مہِ کنعاں کو روکنے آئے
محال ہے کہ یہ وقتی تسلّی بے سود ۔۔۔ نوائے سازِ پریشاں کو روکنے آئے

حوادثات میں ہے تازہ زندگی بیکل
کوئی نہ حادثۂ جاں کو روکنے آئے!

منور سلطانہ

فلمی چاند

اکرام صاحب : کوئی تیس برس کے قریب عمر ہے لاہور میں وسیع پیمانے پر تجارتی کاروبار کرتے ہیں
شاہین : ان کی بیوی، عمر بائیس سال
نشاط : اکرام صاحب کی بہن
چاندبے بی : ان کا بچہ، عمر ایک سال
ڈاکٹر حسن علی : اکرام صاحب کے والد، جو پشاور کے کسی گاؤں میں رہتے ہیں
کلو : اکرام صاحب کا ملازم

پہلا سین

ایک وسیع کمرہ جس میں ایک عمدہ دری بچھی ہوئی ہے اور اس کے اوپر ایرانی قالین، مشرقی اور مغربی اطراف میں دو صوفہ سیٹ پڑے ہوئے ہیں ان کے قریب تین تین میزیں پڑی ہوئی ہیں دو دو چھوٹی اور ایک ایک بڑی، شمال کی طرف انگیٹھی ہے جس کے اوپر نہایت نفیس گلدان رکھے ہوئے ہیں جن میں تازہ گلدستے پڑے ہوئے ہیں۔ ان کی لطیف خوشبو کمرے میں پھیلی ہوئی ہے۔ انگیٹھی کے قریب ایک میز جس پر ہلکے آسمانی رنگ کا میزپوش پڑا ہوا ہے۔ اس پر نہایت دل آویز ریڈیو رکھا ہوا ہے۔ آج اتوار کے باعث فرمائشی پروگرام نشر ہو رہا ہے جنوبی طرف دروازہ ہے جو اس وقت کھلا ہے۔ کمرہ بے حد صاف ہے جو مکین کی نفاست پسندی کا بین ثبوت ہے۔ کمرے کے وسط میں دو گاؤ تکیئے پڑے ہوئے ہیں۔ سردی پورے جوش پر ہے آسمان پر گہرے سیاہ بادل چھائے ہوئے ہیں۔ اکرام صاحب کمبل لپیٹے ریڈیو کے قریب گاؤ تکیئے کے سہارے لیٹے ہوئے گانا سننے میں محو ہیں۔ ریڈیو پر سہگل کے گانے کا ایک پرانا ریکارڈ بج رہا ہے۔ اکرام صاحب بھی سہگل کی آواز کے ساتھ اپنی آواز ملا کر دھیمے سروں میں گا رہے ہیں ان سے کچھ فاصلے پر شاہین اپنے خوبصورت چاندبے بی کو بے بی ڈول کی پیاری رنگ کی برسی، جرابیں اور ٹوپی پہنا رہی ہے۔ چاندبے بی ہنس ہنس کر یہ لباس پہن رہا ہے شاید وہ اس طرح اپنی امی کا شکریہ ادا کر رہا ہے وہ اس لباس میں بہت ہی پیارا معلوم ہو رہا ہے۔ گانا ختم ہو گیا ہے اکرام صاحب اس طرف دیکھتے ہیں وہ کچھ دیر دیکھتے رہتے ہیں پھر شاہین کو پکارتے ہیں۔

اکرام صاحب :۔ "شاہین...... شاہین!"

لیکن شاہین اپنے کام میں اس قدر منہمک ہے کہ وہ آواز نہیں سنتی وہ اب چاندبے بی کی آنکھوں میں سرمہ لگانے میں مصروف ہے۔ وہ دوبارہ آواز دیتے ہیں۔

اکرام صاحب :۔ "شاہین!"

شاہین :۔ (چونکتی ہے) "جی!"

اکرام صاحب :۔ "چاندبے بی کو میرے پاس لاؤ!"

شاہین :۔ "بہت خوب!"

وہ اسے ہلکے نیلے رنگ کے بے بی کمبل میں لپیٹتی ہے۔ اور اس کے رخساروں پر بوسے دیتی ہوئی اکرام صاحب کی گود میں ڈال دیتی ہے۔ چاندبے بی نہایت شریرانہ انداز میں ان کے سر کے بال پکڑ کر کھینچتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ مسکراتا بھی جاتا ہے۔

اکرام صاحب :- اے ...... ارے ... میرے بال تو چھوڑو۔ پھر اس کے
ہاتھوں سے اپنے بال چھڑا کر اسے پیار کرنے لگتے ہیں۔

اکرام صاحب :- شاہین ! ہمارا بے بی کتنا خوبصورت ہے (شاہین مسکراتی
ہے) دیکھو تا اس کی آنکھیں چشم آہو کو بھی مات کر رہی ہیں
کتنی حسین ہیں اور پھر یہ گھنگریالے بال کس قدر دلکش ہیں۔
کل جب میں اسے باہر سیر کرانے کے لئے لے گیا تو میرا دوست
ریاض اسے دیکھ کر کہنے لگا۔ ارے یار اس حسین و دلکش
تصویر کو چھپا کر رکھا کرو جو شاعر کے تخیل سے بھی بڑھ کر حسین
ہے خصوصاً اس کے بالوں کو تو ہرگز ننگا نہ رکھا کرو......
ہاں ہاں شاہین ذرا دودھ لاؤنا ... میرے خیال میں
دودھ بھی چاند بے بی کے چہرے کی رنگت کے سامنے پھیکا
پڑ جائے اور ......

شاہین :- (قطع کلام کرتے ہوئے) چھوڑیئے میرے چاند کو، آپ تو
اسے نظر لگا دیں گے (یہ کہتے کہتے وہ چاند کو پکڑنے کی کوشش
کرتی ہے)

اکرام صاحب :- اوں ہوں، پرے ہٹو ... میں ہرگز چاند تمہارے حوالے
نہیں کروں گا۔ (یہ کہتے کہتے وہ اسے کمبل میں لپیٹ لیتے
ہیں، ہوا کی تیزی کے باعث شاہین کھڑکیاں بند کرنے
لگتی ہے)

اکرام صاحب :- جانتی ہو شاہین ! میں اپنے لخت جگر کو کیا دیکھنا چاہتا
ہوں۔؟

شاہین :- میں نے علم نجوم کا دعویٰ کب کیا ہے؟ اس نے زیر لب تبسم
سے کہا، اس کی اس بات پر اکرام صاحب خوب ہنستے ہیں۔
چاند بے بی بھی انہیں دیکھ کر ہنسنے لگتا ہے۔

اکرام صاحب :- خوب، تو سنو، میں اپنی آنکھوں کے نور، دل کے سرور کو
فلم ایکٹر دیکھنا چاہتا ہوں۔ (یہ کہتے ہوئے وہ شاہین کی
طرف غور سے دیکھتے ہیں) وہ حیران رہ جاتی ہے ......
ارے تم حیران ہو گئیں؟ اس میں حیرانگی کی کون سی بات
ہے۔ اس زمانے میں اس سے بڑھ کر اور کوئی قابل فخر بات
نہیں ہو سکتی (چاند بے بی کو اچھالتے ہیں) میرا
بیٹا فلمی چاند بن کر چمکے گا۔ میری زندگی کا وہ
پر لطف ہوگا جب چاند کے فلمی گانے کے ریکارڈ
ہوں گے ..... دنیا سن رہی ہوگی ... ہا ہا ہا
کا وہ دور بہترین دور ہوگا ... اور ... اور

شاہین :- (قطع کلام کرتے ہوئے) اکرام صاحب ... آ
آپ کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔ آج آپ کیسی باتیں کر

اکرام صاحب :- غالباً تم یہ سمجھ رہی ہوگی کہ میں مذاق کر رہا ہوں
ہوش و حواس کھو بیٹھا ہوں۔ بخدا ان دونوں
بھی بات نہیں ہے۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں سچ ک
یہ میری دلی تمنا ہے۔

شاہین :- واہ خوب فرمایا، یہ آپ کی دلی تمنا ہے تو میری
تمنا نہیں۔ کیا میں اس کی ماں نہیں ہوا
دل کی گہرائیوں میں بھی جھانکنے کی کوشش کر
اس میں کس قسم کی تمنا پرورش پا رہی ہے

اکرام صاحب :- اچھا تو ناراض کیوں ہو گئیں۔ کہو ... کہو تم
دیکھنا چاہتی ہو۔ (ہمہ تن گوش ہو جاتے ہیں)

شاہین :- (پر وقار لہجے میں) خوب اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ
کے ٹکڑے کو اسلامی چاند دیکھنا چاہتی ہوں

اکرام صاحب :- کیا کہا اسلامی چاند ...... ہا ہا ہا ہا ......
اسلامی چاند ..... ہا ہا ہا ہا ... ہو ہو ہو ہو ..
..... چاند ..... (شاہین بالکل سنجیدہ رہتی
چاند بے بی حیرت سے والدین کی طرف تکتا
کے قہقہوں سے کمرہ گونج رہا ہے۔ (پھر کہتے ہ
زمانہ بدل گیا، زمانے کی قدریں بدل گئیں
ایک ایک چیز بدل گئی، دنیا تو بہت آگے
افسوس تم حال کی طرف سے آنکھیں بند کر
ماضی کی دنیا میں کھو کر رہ گئی ہو
براہ کرم ....

ساحل کے سے جھروکے سے آواز دے مجھ کو
دنیا کو ....

شاہین :۔ ٹھہرئیے جناب! آپ اپنی شعرخوانی کو ذرا بند کیجئے افسوس کہ حقائق کی طرف سے آنکھیں موندے ہوئے ہیں۔ اس وقت دنیائے اسلام پر باطل کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا ہے دنیا اس تاریکی کے باعث تباہی کے گڑھے میں گر رہی ہے ۔۔ امن و امان مفقود ہو چکا ہے آپ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچئے ایسے وقت میں فلمی چاند کی ضرورت ہے جو اس تاریکی میں اضافہ کر دے۔ یا اسلامی چاند کی جس کی ضیا پاش کرنوں سے یہ کفر کی سیاہی دور ہو جائے۔ بقول کسے

دیکھو! پھر تاریکی چھائی جا رہی ہے کائنات
جس کو تم سمجھا ہے روشن دن حقیقت میں ہے رات

اکرام صاحب :۔ آج مجھے تمہاری باتوں پر سخت تعجب ہو رہا ہے میں تو تمہارے فیشن کو دیکھ کر تمہیں اپٹوڈیٹ سمجھتا تھا میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ دین کے معاملے میں تمہارے خیالات اتنے شدید ہیں۔

شاہین :۔ میری زینت و آرائش خالص آپ کے لئے ہے میرا دل و دماغ اسلامی ہے کیا آپ نے مجھے کبھی کسی اور کے سامنے زینت سے جاتے دیکھا؟

اکرام صاحب :۔ (قدرے متکرانہ لہجے میں) تو کیا چاند لے بی کے لئے فی الواقع تمہارے یہی ارادے ہیں؟

شاہین :۔ ہاں بالکل یہی ہیں۔ اس وقت دنیا کو پھر امام زبیرؓ، امام سیدؓ اور امام شبیرؓ کی ضرورت ہے۔ یعنی بقول کسے

پھر زمین کربلا ہے منتظر شبیر کی
پھر پیاسوں کیلئے ہے آب فرات
تا کہ پھر حق چل جائے [illegible]
[illegible]

اکرام صاحب :۔ ([illegible])

کیا کہا؟ تم اسے شبیرؓ دیکھنے کی متمنی ہو؟

شاہین :۔ جی ہاں میں نے اسی نیت سے جنا ہے میں اس کی بدولت اسلام کی زندگی چاہتی ہوں۔ (اکرام صاحب سکتے میں رہ جاتے ہیں کمرے میں ایک لمحے کے لئے گہری خاموشی طاری ہو جاتی ہے پھر غصے سے اونچے اونچے سروں میں بولنے لگتے ہیں۔

اکرام صاحب :۔ ناممکن ...... ناممکن ..... ظالم تم میری تمناؤں کے مرکز کو شبیرؓ نہیں بنا سکتیں ..... کان کھول کر سن لو کہ اسلامی چاند نہیں بنا سکتیں ..... تم کیسی بیدرد ماں ہو .. میں نے آج تک تم جیسی ماں نہیں دیکھی ..... میری زندگی میں ایسا ہونا ناممکن ہے .... ناممکن .....

شاہین! خوب اچھی طرح سمجھ لو۔ اچھی طرح جان لو۔ یہ فلمی چاند بنے گا ..... فلمی .... (یہ کہتے ہوئے وہ شدت جذبات سے مغلوب ہو کر چاند لے بی کو لے کر دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ شاہین کی آنکھیں پرنم ہو جاتی ہیں اور وہ گنگنانے لگتی ہے۔

ان کو یہ ضد کہ مسلط رہے چمن پہ خزاں
مجھ کو یہ ضد کہ بہاروں کو لا کے چھوڑوں گی
ان کو یہ ضد ہے کہ قائم رہے تسلط بوم
میرا یہ عزم کہ ہزاروں کو لا کے چھوڑوں گی

دوسرا سین

دوپہر کا وقت ہے دھوپ کھلی ہوئی ہے۔ اکرام صاحب اور شاہین لان میں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں وسط میں ایک گول میز پڑی ہوئی ہے یہ دونوں باتوں میں مصروف ہیں۔ اتنے میں ماما کھانا لا کر میز پر چن دیتی ہے چاروں طرف دلفریب رنگا رنگ کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ میز کے وسط میں ایک پھولوں کا گلدستہ رکھا ہوا ہے جن کی مہک سے دل و دماغ معطر ہوئے جاتے ہیں۔ وہ خاموشی سے کھانا کھانے میں مصروف ہو جاتے ہیں ———

اتنے میں کلو (ملازم) سامنے کی روشوں پر چاند لے بی کو اس کی پہلی گاڑی میں بٹھائے ان کی طرف آتا ہے۔

اکرام صاحب :۔ ارے کلو! چاند بی بی کو جا کر ابھی اچھے اچھے کپڑے پہناؤ۔
کلو ملازم :۔ بہت اچھا حضور (جاتا ہے)
شاہین :۔ آج کیا کوئی خاص بات ہے؟
اکرام صاحب :۔ (معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ) ہاں!
شاہین :۔ کیا؟
اکرام صاحب :۔ جانے دو کیا کرنا ہے تم کو سن کر خواہ تمہاری ملامت کو ٹھیس لگے گی۔ اس بچے کے معاملے میں میرے اور تمہارے راستے الگ الگ ہیں۔
شاہین :۔ یہ تو میں جان چکی ہوں۔ لیکن آخر کچھ معلوم تو ہو... بات کیا ہے؟
اکرام صاحب :۔ تم مصر ہو تو سنو، ایک فلم کمپنی کے ڈائرکٹر میرے دوست ہیں۔ کل انھوں نے چاند بی بی کو دیکھا۔ کہنے لگے کہ بھئی! اس سے بڑھکر میں نے آج تک کوئی حسین بچہ نہیں دیکھا ہم ایک نئی فلم تیار کر رہے ہیں۔ اس میں ایک بچے کی بھی ضرورت ہے۔ کیا خوب ہو۔ اگر اس میں آپ کے بچے کی بھی بگڑی بن جائے۔ (بات کرتے کرتے وہ شاہین کے چہرے کا بغور مطالعہ کرتے ہیں۔ شاہین کا رنگ ایک لمحے کے لئے متغیر ہوتا ہے لیکن جلد ہی وہ اپنی طبیعت پر قابو پا لیتی ہے)
شاہین :۔ (ایک پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے) ہاں ہاں آگے کہیئے
اکرام صاحب :۔ (سلسلۂ گفتگو جاری کرتے ہوئے) اندھے کو کیا چاہیئے دو آنکھیں، میں نے فوراً ہاں کر دی۔ یہ ابھی سے مدھوبالا کی طرح مشہور ہو جائے تو پھر میری خوش نصیبی کے کیا کہنے کاش اس سلسلے میں تم میری ہم خیال ہوتیں!
اتنے میں ڈائرکٹر کی آمد کی اطلاع ملتی ہے شاہین اٹھ کر اندر چلی جاتی ہے ڈائرکٹر صاحب آتے ہیں اکرام صاحب فوراً اٹھ کر مصافحہ کرتے ہیں اور انھیں کرسی پیش کرتے ہیں
ڈائرکٹر :۔ میرے دوست! معاف کرنا، بیٹھنے کے لئے میرے پاس وقت نہیں ہے آپ جلدی سے چاند بی بی کو لائیے۔
اکرام صاحب :۔ برادرم! بیٹھئے تو سہی، یہ سگرٹ نوش فرمایئے۔

(سگرٹ کی ڈبیہ پیش کرتے ہیں، ڈائرکٹر شکریہ کے ساتھ سگرٹ اٹھا لیتے ہیں۔)
ڈائرکٹر :۔ اچھا اب جلدی کیجئے!
اکرام صاحب :۔ بہت خوب میں ابھی لیکر آتا ہوں (جاتے ہیں۔ سامنے برآمدے میں شاہین چاند بی بی کو ... وہ ہلکے آسمانی رنگ کے لباس میں بہت ... رہا ہے۔ اکرام صاحب شکریہ کہکر چاند ... لیتے ہیں۔ تو ان کی نگاہ شاہین کے چہرے ... جو اس وقت حسرت و یاس کی مکمل تصویر ...
اکرام صاحب :۔ شاہین یہ کیا؟
اس کے جواب میں شاہین کی آنکھوں میں ... آجاتے ہیں۔
اکرام صاحب :۔ ہائیں! یہ آنسو کیسے؟
شاہین :۔ یہ آنسو نہیں میری تمناؤں کا خون ہے
اکرام صاحب :۔ افسوس میرے نصیب! (وہ ایک گہرا ... ڈائرکٹر کے پاس آجاتے ہیں۔)

تیسرا اسین

(کئی روز بعد)

اکرام صاحب صبح کے وقت لان میں ایک ... ہیں۔ قریب ہی شاہین کسی رسالے کے مط... ہے وہ چاکلیٹی رنگ کی گرم شال اوڑھے ... کی ہلکی ہلکی دھوپ اس وقت بہت ہی بھل... ہے شبنم کے ننھے ننھے قطرے دھوپ میں ... ہی دلفریب معلوم ہو رہے ہیں اکرام صاحب ... کے ان دلکش مناظر سے لطف اندوز ... شاہین کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش ...
اکرام صاحب :۔ شاہین! کیا پڑھ رہی ہو؟
شاہین :۔ ایک خوش نصیب خاتون کی داستان ... جو لکھتی ہے کہ میرے خاوند نے میرے ...

کیا۔ میری ہر خواہش کی تکمیل کی۔ وہ کون سی آرزو تھی۔ جسے ......

صاحب :۔ (بات کاٹ کر) اچھا تو تمہارا مطلب یہ ہے کہ تمہیں ایک برا خاوند ملا۔

ین :۔ نہیں نہیں میرا یہ مطلب نہیں میں تو جو کچھ پڑھ رہی ہوں وہ آپ کو سنا رہی ہوں۔ آپ برے ہیں؟ توبہ، توبہ! آپ ہر لحاظ سے اچھے ہیں لیکن ......

(خاموش ہو جاتی ہے)

صاحب :۔ کہو کہو، خاموش کیوں ہو گئیں؟ ہاں ہاں لیکن ....

ین :۔ لیکن آپ میری ایک تمنا کا بیدردی سے خون کر رہے ہیں۔ نہ معلوم آپ اس معاملے میں اس قدر ظالم کیوں بنے ہوئے ہیں۔

صاحب :۔ تم کبھی میرے جذبات کا بھی خیال رکھا کرو۔ میں اس معاملے میں مجبور ہوں۔

ہین :۔ یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ آپ ہر لحاظ سے اچھے ہیں۔ سوائے اس ایک بات کے!

صاحب :۔ (کچھ دیر خاموش رہتے ہیں پھر سلسلۂ گفتگو شروع کرتے ہیں) کاش تم میری بہن نشاط کی طرح ہوتیں کس قدر عقلمند ہے وہ، زمانے کی رفتار کے ساتھ اسے چلنا خوب آتا ہے مجھے اپنی بہن پر فخر ہے۔ اباجان کی مخالفت کے باوجود وہ کالج میں داخل ہو گئی۔ یہ اس کی بلند ہمتی کا روشن ثبوت ہے۔

ہین :۔ تعلیم حاصل کرنا بجائے خود ایک زریں مقصد ہے۔ اس سے کسے انکار ہے لیکن اس کالج کا ماحول اخلاقی اعتبار سے نہایت پست ہے۔ اسی لئے چچا جان مخالف تھے۔ پھر وہ گاؤں میں رہتے ہیں۔ اور نشاط ہوسٹل میں رہتی ہے۔ مجھے تو خود بھی یہ پسند نہیں۔ خواہ آپ مجھے دقیانوسی کے کتنے ہی طعنے کیوں نہ دیں۔

م صاحب :۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ اباجان تمہیں مجھ سے زیادہ کیوں عزیز رکھتے ہیں۔ پہلے میں سمجھتا تھا۔ کہ شاید تم ان کی اکلوتی بھتیجی ہو تبھی وہ تم سے غیر معمولی انس رکھتے ہیں۔ اب معلوم ہوا کہ یہ ہم خیالی کا بھی باعث ہے۔

شاہین :۔ خیر کچھ ہو، لیکن یہ ایک حقیقت ہے۔ جسے کسی طرح جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

اکرام صاحب :۔ خواہ ماحول کتنا ہی خراب کیوں نہ ہو۔ لیکن جب کوئی خود اچھا رہنا چاہے تو ماحول اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا مجھے اپنی بہن پر مکمل اعتماد ہے۔ میں تمہیں بھی اس کی طرح کا دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں آج صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ مجھے تمہارے یہ خیالات بالکل پسند نہیں ہیں تمہیں بدلنا ہوگا ضرور بدلنا ہوگا۔ میں نشاط کو یہاں چھٹیوں میں بلانے والا ہوں۔ شاید تم اس سے کچھ اثر لے سکو۔

شاہین کی متانت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ وہ مسکرا کر کہتی ہے۔ ؎

شاہین :۔ زمانے کی فطرت میں تغیر ہی تغیر ہے،
مگر میں کیا کروں مجھ کو بدل جانا نہیں آتا

اکرام صاحب کچھ کہنا ہی چاہتے ہیں کہ ہاکر آتا ہے اور اخبار پھینک کر چلا جاتا ہے۔ وہ اخبار دیکھنے لگتے ہیں۔ شاہین اپنی جگہ سے اٹھ کر جاوید کے پاس جا کھڑی ہوتی ہے۔ وہ کھلونوں سے کھیل رہا ہوتا ہے۔ یک لخت اکرام صاحب ایک چیخ کے ساتھ بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ شاہین گھبرا کر اس طرف جاتی ہے۔ کلو اور ماما بھی بھاگ کر آتے ہیں۔ اکرام صاحب بری طرح بے ہوش ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں برف کی مانند سرد ہو جاتے ہیں۔ کلو بھاگ کر ڈاکٹر کو لینے جاتا ہے۔ شاہین سخت حیران و پریشان نظر آتی ہے وہ ماما کی مدد سے بمشکل انھیں اٹھا کر چارپائی پر لٹا دیتی ہے اور پھر اخبار دیکھنے لگتی ہے۔ صفحۂ اول پر جلی حروف میں تحریر تھا۔

"ڈاکٹر حسن علی کیلئے نئی تہذیب کا عمل انکی موت کا باعث بن گیا"

واقعات یوں بیان کئے جاتے ہیں کہ ڈاکٹر حسن علی جو کہ پشاور شہر سے چار پانچ کوس پرے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ ان کی لڑکی نشاط پشاور کے کسی کالج میں زیر تعلیم تھی۔ چند روز ہوئے اس نے اپنی کسی سہیلی کے

بیٹھانے پر کسی فرم کمپنی میں ملازمت کر لی ہے آج ڈاکٹر صاحب کو جب یہ
رسوا کن خبر ملی۔ تو پہلے تو ان پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اور اس کے چند ہی گھنٹوں
کے بعد وہ حرکت قلب بند ہو جانے سے وفات پا گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ
رَاجِعُون ۔ مرحوم بڑی ہی خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ نہایت شریف النفس
انسان تھے انھوں نے اپنی زندگی میں لاکھوں مریضوں کا مفت علاج
کیا۔ اور......

وہ آگے کچھ نہ پڑھ سکی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امنڈ پڑا۔ قریب تھا کہ وہ بھی غش کھا کر گر پڑتی۔ کہ اس نے بمشکل اپنے تئیں سنبھالا۔ کلو ڈاکٹر کی آمد کی اطلاع دیتا ہے۔ وہ جلدی سے برآمدے میں چلی گئی۔ تقریباً نصف گھنٹہ بعد اکرام صاحب بمشکل ہوش میں آتے ہیں۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد شاہین آتی ہے۔ مجسم واندوہ کا مرقع، اکرام صاحب اسے دیکھ کر بے اختیار رونے لگتے ہیں۔ شاہین کی آنکھیں بھی ساون اور بھادوں کا منظر پیش کرنے لگتی ہیں۔

اکرام صاحب: (روتے ہوئے)
بن جائیں میرے ...شک ہی ... کاش تبا...
مجھ سے نہ کبھی بچھائے گی خود اپنی ...
ہائے میرے ابا جان میری غلطیوں کا شکار ...
نشاط! یہ تو نے کیا...... (وہ فوراً قلم سے ان ...
ہو جاتی ہے کچھ دیر سسکیاں لینے کے بعد) ...
لیا۔ شاہین تم حق پر ہو...... مجھے غلطی چا...
میرے بیٹے کو اسلامی چاند بنا دو.... اسلام...
کی روشن و تابناک کرنیں اس گندے تاریک...
صاف اور روشن کر دیں...... جس میں مے...
غیور انسانوں کی عزت ان بتوں کی بھینٹ...
شاہین.... ہائے میرے ابا جان......
(آواز سسکیوں میں ڈو...

؟
مستقبل کے معمار کون ہیں؟

پاکستان کے باشعور نوجوان!

اور ـــــ پندرہ روزہ

STUDENTS' VOICE

کیا ہے؟

انہی جیالے اسلام پسند نوجوانوں کی پرعزم آواز!

قیمت فی پرچہ دو آنے

سالانہ زرِ تعاون ۱۰ دو روپیہ آٹھ آنے

نمونہ کی کاپی ـــــ دو آنے کے ٹکٹ بھیج کر

دفتر اسٹوڈنٹس وائس، ۲۳ اسٹریچن روڈ، کرا...

طلب فرمائیں

سعیدہ سلطانہ نکہت

بی مُلّانی

زاہدہ کی تبدیلی ہم تمام لڑکیاں بری طرح محسوس کر رہی تھیں۔ جانے اس کو دن بدن کون سی فکر کھائے جا رہی تھی۔ گھنٹوں سی گہری فکر میں کھوئی رہتی۔ اور تو اور غضب یہ کہ اس نے تمام دلچسپیوں میں حصہ لینا یک لخت ترک کر دیا تھا۔ سینما تو اس کی تمام دلچسپیوں کا مرکز تھا۔ لیکن اس سے بڑھکر اس کی تبدیلی کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ جب ہم نے اپنی منتظمہ سے بہانہ بنا کر سینما کا دلچسپ پروگرام بنایا تو اس نے خلاف توقع نہ صرف انکار کر کے بلکہ ہمیں بھی جانے سے روک کر ہمارے جذبات کو سخت ٹھیس پہنچائی۔

گو زاہدہ میری عزیز سہیلی تھی۔ مگر میں یا اور لڑکیاں یہ کس طرح برداشت کر سکتی تھیں کہ وہ ہماری دلچسپیوں میں حصہ لینے کی بجائے التزام کو رد کرے۔ اور اسی طرح ہمیں بھی بی ملانی بنانے کی کوشش کرتے ——— ہونہہ ؟

اب تو اس نے ہماری محفلوں میں بھی آنا ترک کر دیا تھا۔

اور ہماری محفل جو کبھی اسکے گانوں اور قہقہوں سے گونجا کرتی تھیں اسکے کمرے کی بجائے نسیمہ کے کمروں میں جمنے لگیں۔

اور وہ زاہدہ جس کے بغیر اس محفل میں جان نہ رہی تھی کبھی کبھار اس طرف آنکلتی۔ جی جل ہی تو جاتا یہ دیکھکر وہ بجائے اس میں حصہ لینے کے بڑے بوڑھوں کی طرح نصیحتوں کے طومار باندھ دیتی اور ایسی باتوں سے ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتی۔ جی تو یہی چاہتا تھا کہ اس کو جھنجھوڑ کر اس تلخ خواب سے چونکا دوں۔ زاہدہ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے۔ ہوش میں آؤ۔ یہ نماز یہ روزہ یہ واعظ تمہیں زیب نہیں دیتا۔ یہ تو صرف بوڑھوں کی باتیں ہیں اس عمر میں تمہیں یہ باتیں زیب نہیں دیتیں۔ لیکن جانے کیا بات تھی۔ یا اس کی آنکھوں کی ملائمیت یا صداقت ہی تھی جو مجھے ہر مرتبہ ایسا کرنے سے روک دیتی۔ اور میں اپنی آنکھیں پھیر لیتی کہیں یہ آنکھیں ہم کو بھی نہ ڈبو دیں ———

آجکل ہماری سرگرمیاں اور تفریحی پروگرام ایک خاص وقت تک کے لئے ملتوی کر دیئے گئے تھے۔ نہ اب وہ قہقہے تھے نہ وہ سیر امتحان میں صرف دو ماہ باقی تھے۔ سوائے ان کے جنہوں نے سال کو قیمتی سمجھا اور محنت کی باقی سب کو برابر یہ فکر کھائے جا رہی تھی۔ سارا سال تفریحوں میں گذار دیا۔ اب سال بھر کی کمی صرف دو ماہ میں کس طرح پوری ہو جائیگی۔ کاش وقت اس قدر جلد نہ گزرتا۔

مگر یہ کب کسی کا انتظار کرتا ہے۔

میں نے کتابیں کھولیں۔ لیکن حرف جیسے میرا منہ چڑانے لگے۔ ذہن گویا کام ہی نہیں کر رہا تھا۔

کاش ——— میں وقت کو قیمتی سمجھکر امتحان سے قبل ہی تیاری کر لیتی۔ زاہدہ کتنی خوش نصیب ہے۔

اسکو گویا امتحان کی فکر ہی نہیں۔ آہ میں اسکی معیت ترک نہ کرتی۔

اور دوسرے دن میرے قدم بے خیالی میں زاہدہ کے کمرے کی طرف اٹھنے لگے۔ وہ موجود نہ تھی۔

میز پر مختلف رسالے اور کتابیں اس بات کا ثبوت دے رہی تھیں وہ زیادہ وقت مطالعہ میں گذارا کرتی ہے۔

یہ دیکھکر تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی وہ زاہدہ جو فلمی رسائل بڑے شوق سے پڑھا کرتی تھی۔ فلم ایکٹرسوں کی تصاویر بڑے شوق سے میز پر سجایا کرتی تھی اب اسکی میز پر اس قسم کے رسالے "مشیرہ المحسنات، فاران" وغیرہ پڑے تھے۔ ایک کتاب کو یونہی میں نے الٹ پلٹ کر پڑھنا شروع کیا "مسلمان نسل کی وجہ سے مسلمان نہیں

ہوتا۔ بلکہ اسلام لانے سے مسلمان بنتا ہے" یہ بات ہی میرے لئے حیرت و تعجب کا باعث تھی۔ میرا اشتیاق اور بڑھا اور کتابیں شروع سے آخر تک پڑھ ڈالی۔ اور میں نے سوچا۔

کیا واقعی ہم صرف نام کے مسلمان ہیں۔ ہاں واقعی مسلمانوں جیسی ہم میں کیا بات ہے۔ نماز جو مومن کی پہچان ہے ہمیں بھول کر بھی یاد نہ آتی

آہ ——— صرف مسلمان کا لیبل ہی ہماری پیشانی پر چپکا ہوا ہے۔

آج زاہدہ کی وہ تمام باتیں جن پر ہم بی ملانی کہہ کر چڑایا کرتے تھے۔ تمام حقیقت بن کر میرے سامنے آگئیں۔ اور میں نے سوچا۔ کاش ———

کیا سوچ رہی ہو فہمی۔ زاہدہ نے پیچھے سے میری آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا

زاہدہ میں نے اسکے ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔ بتاؤ میں امتحان میں کس طرح کامیاب ہو سکتی ہوں؟

فہمی کاش تم کو اس عارضی امتحان کی بجائے [اصلی امتحان] کی فکر ہوتی۔

نہیں مجھے اب اس امتحان کی فکر نہیں میں [نے اس کے] ساتھ کہا مجھے ڈر ہے زاہدہ مجھے اس امتحان میں [کامیاب ہونے کے لئے ساتھ کی ضرورت] پڑے میں تمہارے ساتھ ہوں

پھر فہمی اس نے مجھے گلے سے لگاتے ہو[ئے کہا ہم] ایک دوسرے کی ساتھی ہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت [ہمیں اپنے] مقصد سے نہیں ہٹا سکتی ———

اب ہم دونوں کو لڑکیاں لاکھ " بی ملا[نی" کہیں] لیکن باطل کے مقابلہ میں حق کا ساتھ دینے کی خاط[ر یہ لقب ہمیں] بہت محبوب ہے۔ یہ لقب ہمیں ہمارے مقصد [سے] بھی نہیں ہٹا سکتا۔ ——— ×

اعلان

کنیڈا کی میگل یونیورسٹی (MCGILL UNIVERSITY) دیگر علماء اسلام کے علاوہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی اسلامی تصنیفات اور دینی ذخیرہ پر علمی تحقیق (RESEARCH WORK) کر رہی ہے۔ اس سلسلہ میں یونیورسٹی ماہنامہ "ترجمان القرآن" کی جلدوں سے بھی استفادہ کرنا چاہتی ہے۔ جس کے لئے مذکورہ پرچہ کی پوری فائل کی ضرورت ظاہر کی گئی ہے۔

لہذا ایسے تمام حضرات سے جو "ترجمان القرآن" کے پچھلے تمام شمارے یا بعض شماروں کو فارغ کر سکیں یا فروخت کرنا چاہیں۔ التماس ہے کہ وہ مجھے.. اطلاع فرمائیں کہ ان کے پاس کونسی جلد کے کون کون سے پرچے ایسے ہیں جو وہ فارغ کر سکتے ہیں۔

"ناظم ادارہ"
(ماہنامہ چراغِ راہ کراچی)

عارف سہارنی

بدل گیا

رنگِ بہارِ لالہ و ریحاں بدل گیا
وہ کیا گئے کہ سارا گلستاں بدل گیا

نغمہ سرا طیور سے کے وہ چہچہے کہاں
ذوقِ نگاہِ صبحِ درخشاں بدل گیا

سب مست ہیں کسی کو کسی کی خبر نہیں
ہر دل صنم پرست ہے ایماں بدل گیا

ہر رہگذر اُداس ہے ویران منزلیں
ہے زرد رشکِ چہرۂ تاباں بدل گیا

گلشن میں انعقادِ قیامت ہے ہر طرف
ذوقِ قیامِ فصلِ بہاراں بدل گیا

ہے تشنہ کام عندلیبِ سوگوار پھول
جوشِ بہار، ابرِ خراماں بدل گیا

خوابِ گراں سا بن گیا ہر لمحہ حیات
وہ قہقہے تبسمِ یاراں بدل گیا

اب کون ہے جو آ کے کرے پرسشِ احوال
وہ انتظارِ دیدۂ حیراں بدل گیا

بزمِ جہاں میں پہلی سی مے نوشیاں کہاں
شوقِ گناہ و جذبۂ عصیاں بدل گیا

عارف حیات رہ گئی اک تہمتِ حیات!
حیرت! کہ آج سیرتِ انساں بدل گیا

(تصرف کے ساتھ)

○

اقتدار کے نام

افتخار اعظمی

چال افرنگ کی سیکھی ہے کہاں سے تم نے
جو بھی "حق بات" کہے اس کو گرفتار کرو
وادیٔ غرب سے جو فتنۂ افرنگ اٹھے
حق کی آواز دبا کر اسے بیدار کرو
خوب اندازِ محبت" یہ نکالا تم نے
خاطرِ دوست نہیں، خاطرِ اغیار کرو

(۱۵ نومبر ۲ ۵ ء کو انجمن تعمیر پسند مصنفین بمبئی کے ایک جلسہ میں یہ قطعہ پڑھا گیا)

عابد انبالوی ●

"دارورسن"

مصیبتوں میں مسرتوں میں جہاں کی طرزِ کہن وہی ہے
زمانہ بدلا مگر یہ کیف و نشاط کی انجمن وہی ہے

گلوں نے کیا کیا نہ رنگ بدلے نہ پر عنادل کے ڈھنگ بدلے
چمن کبھی کا بدل چکا ہے مگر نظامِ چمن وہی ہے

متاعِ گلشن کو لوٹتا ہے خزاں کا قزاق گرچہ پیہم
شگفتگی پر مگر بہارِ بنفشہ و نسترن وہی ہے

جہاں میں اٹھ رہا ہے مدت سے شورِ بیداریٔ قیامت
بتائے کوئی یہ ماجرا کیا کہ خوابِ اہلِ وطن وہی ہے

نہ بدلا اہلِ نظر کا شیوہ، صدا اناالحق کی اٹھ رہی ہے
اگرچہ بزمِ جہاں میں آج بھی سزائے دارورسن وہی ہے

ہزار کی روشنی نے کوشش مٹائے ظلمت کی شوخیوں کو
مگر عروسِ شبِ الم کا ابھی تلک بانکپن وہی ہے

ابوسالک اکرام [illegible]

کایا پلٹ

صبح جب وہ نیند سے بیدار ہوا۔ تو سب سے پہلے اسکے ذہن میں یال پیدا ہوا۔ وہ یہ تھا۔ کہ آج میری دوسری زندگی کا پہلا دن ہے ت کو جب اسکے سینے میں اچانک درد ہونے لگا تھا۔ تو اسکے لئے نس لینا محال ہو گیا تھا۔ درد کی شدت اور چبھن سے اسکے پھیپھڑے چلنے سے انکار کر رہے تھے۔ اسے ایسے محسوس ہوتا تھا۔ جیسے ہوا اس حلق سے نیچے اترنا بند کر دیگی۔ فوری طبی امداد کا ایسے وقت میں حاصل نا مشکل تھا۔ بیوی نے گرم گھی سے سینے پر مالش کر کے روئی باندھ ی تھی۔ جس سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ کی تکلیف کے بعد افاقہ ہو گیا تھا وہ روئی کو سینے سے ہٹانے لگا۔ ساتھ ہی اسکے ذہن میں اس خیال نے روٹ لی۔ کہ اگر رات کو تکلیف زیادہ ہو جاتی۔ تو کیا ہوتا۔ اس نے رجھری لی۔ اور فوراً ہی کسی خیال کے زیر اثر وہ چارپائی سے اٹھ بیٹھا ہ دیر سے اٹھنے کا عادی تھا حتی کہ صبح کی چائے بھی بستر میں پیا کرتا ھا۔ بیدار ہوتے ہی سگرٹ کے کش لگانا اسکے معمول میں داخل تھا گرٹ اور دیا سلائی اسکے سرہانے پڑی رہتی تھیں۔ لیکن آج اس کا ہاتھ معمول کے مطابق سرہانے کی طرف نہ بڑھا۔ وہ اٹھکر ادھر ادھر سی چیز کو تلاش کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں اس نے ایک کونے سے رن کی کھال کو ڈھونڈ نکالا۔ جسے اس نے کئی سال ہوئے تبرک کے طور پر خرید رکھا تھا۔ اس نے وضو کیا۔ اور کمرے کے ایک طرف نماز ادا کرنے میں مشغول ہو گیا۔ آج اسے نماز میں جو لذت حاصل ہو ں سے پہلے وہ اس سے آشنا نہ تھا۔ ویسے عیدین کی نماز وہ ضرور پڑھا کرتا تھا۔ اور شاید کبھی کبھار جمعہ کی نماز میں شرکت کر لیتا ہو۔ لیکن آج کی نماز اس نے کسی نئے جذبے کے ماتحت ادا کی تھی۔ وہ تھوڑی دیر تک جائے نماز ہی پر بیٹھا رہا۔ اور نہ جانے کن خیالات میں گھر رہا س کا سلسلہ خیالات اس وقت منقطع ہوا جب معمول کے مطابق

صبح سویرے حجام نے آکر دروازے پر دستک دی۔ وہ بڑبڑا کر اٹھا اور دروازے پر جا کر حجام سے کہنے لگا۔ آج میں "شیو" نہیں بنواؤنگا حجام کو پہلے تو اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ لیکن جب اس نے پھر یہ سنا کہ "جاؤ۔ کھڑے کیوں ہو۔ اب آئندہ کیلئے شیو بنانے میرے۔۔ مکان پر آنے کی تکلیف نہ کیا کرنا" تو اسے یقین آیا۔ کہ وہ شخص جس نے شیو کرانے میں ایک دن کا بھی ناغہ نہیں کیا تھا۔ آج اس سے ہمیشہ کے لئے انکار کر رہا ہے۔ اسکے چہرے کی متانت اور وقار نے حجام کو مزید کچھ پوچھنے سے باز رکھا۔ اور اسی کے ساتھ وہ دروازہ بند کر کے اندر آ چکا تھا۔ بیوی نے آکر دریافت کیا۔ آج آپ چائے نہیں پئیں گے۔ کتنی دیر سے پڑی ہے۔ ٹھنڈی ہو جائیگی۔ تو وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ کہ تھوڑی دیر کے بعد پیونگا۔ مجھے ذرا اکیلا پڑا رہنے دو۔ بیوی اپنے عزیز شوہر کی تبدیلی مزاج پر حیران ہو کر چلی گئی اور اس کا دماغ پھر طرح طرح کے خیالات کا آماجگاہ بن گیا! اس کی پچھلی زندگی کے تمام واقعات فلم کی طرح پردہ دماغ پر چھا رہے تھے۔ اور وہ ہر واقعے سے ایک نیا اثر قبول کر رہا تھا۔ آٹھ بجے کے قریب وہ دماغ میں ایک نیا فیصلہ کر کے اٹھا۔ اور کھانا کھا کر حسب معمول دفتر چلا گیا۔ چند دن تک۔۔۔ کلرکوں نے اسکی ہیئت کذائی کو حیرت سے دیکھا۔ اور اسکی حجام کے استرے سے محفوظ "ڈاڑھی" کو موضوع سخن بنا لیا۔ وہ ان کی کسی بات کی طرف توجہ دیئے بغیر سیدھا اپنی میز پر جا کر کام کرنے لگا۔ ساتھی اسکی خاموشی کو دیکھکر متعجب ہوئے۔ وہ محفل کی جان تھا۔ کمرہ میں آتے ہی فضا اسکے۔۔۔ قہقہوں سے گونج اٹھتی تھی۔ اسکی باتوں میں شہد کی مٹھاس تھی۔ وہ کھویا کھویا سا بیٹھا کام کرتا رہا۔ ظہر کا وقت ہوا۔ وہ چپکے سے قریبی مسجد میں فریضہ نماز ادا کر آیا۔ واپس آیا۔ تو پھر ہی سے چند خواتیں

صاحب سے منظوری حاصل کرنے کیلئے پیش کر دیں۔ اور ساتھ ہی حسب معمول کان میں کچھ کہنے کی کوشش کی۔ وہ سنی ان سنی کر کے بہ دقت تمام ایک ایک کر کے غور سے پڑھنے لگا۔ چپراسی کو یہ بات توقع کے خلاف معلوم ہوئی۔ اور اس نے ایک دو بار کچھ کہنے کی جرأت کی۔ لیکن اسکے تیور دیکھ کر بار بار خاموش رہا۔ وہ چپراسی کا "مشورہ" لئے بغیر ان پر مناسب نوٹ لکھنے لگا۔ اسکی آنکھوں کی غیر معمولی چمک نے چپراسی کو خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ چپراسی چلا گیا۔ اور وہ حسب سابق کام میں مصروف ہو گیا وقت گذرتا گیا۔ اس نے دفتر بند ہونے کے آخری منٹ تک پوری دیانتداری اور انہماک سے کام کیا۔ اسے معلوم ہوا۔ کہ آج اس نے بہت زیادہ کام ختم کر لیا ہے۔ اتنا کام وہ شاید عام حالات میں تین دن میں کرتا۔ دفتر بند ہوا۔ تو وہ سائیکل لے کر گھر کی طرف روانہ ہوا۔ آج اسکی جیبیں معمول کیمطابق بھاری نہیں تھیں۔ ان میں اتنی ہی رقم تھی۔۔ جتنی وہ گھر سے لیکر چلا تھا۔ گھر پہنچنے سے پہلے رستے میں شہر کی بڑی مسجد میں اس نے عصر کی نماز ادا کی۔ اس نے ایک طرف دیوار پر قرآن پاک کی ایک آیت لکھی دیکھی جس کا ترجمہ یوں کیا گیا تھا "نماز فحش کاموں بے حیائیوں اور برائیوں سے بچاتی ہے"۔ وہ سوچنے لگا۔ اگر یہ صحیح ہے۔ اور کوئی وجہ نہیں۔ کہ فرمان ربانی صحیح نہ ہو۔ تو آخر لوگ.. نمازیں پڑھ کر بھی کیوں برائیاں کرتے ہیں۔ کیا قرآنی فیصلے کیمطابق ان کی نمازیں بے معنی ہیں۔ یہی وہ سوچتا ہوا گھر کے قریب پہنچ گیا دفعتاً اسے خیال آیا۔ کہ آج وہ خالی ہاتھ گھر جا رہا ہے۔ راستے سے بچوں کیلئے کوئی مٹھائی یا پھل وغیرہ نہیں خریدا۔ اور آج وہ خریدتا بھی کیسے۔ جبکہ اسکی جیب آج "دست غیب" کی کرم فرمائیوں سے خالی تھی۔ شیطان نے اسے اس نئی کروٹ پر ٹوکا۔ اور بچوں کو پھل اور مٹھائیاں کھانے چھینتے اور پھینکنے اسکی چشم تصور کے سامنے لا کھڑا کیا۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ گھبرا گیا لیکن جلدی اسنے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اور تیز قدم اٹھاتا ہوا مکان میں جا داخل ہوا۔ بچے حسب معمول اسکے گرد جمع ہو گئے۔ لیکن اسے خالی ہاتھ دیکھکر مایوس ہو گئے۔ دن گذرتا گیا۔ شام کو وہ اذان کی پہلی آواز کے ساتھ مسجد میں تھا۔ عشا کی نماز ادا کر کے جب وہ سونے کی تیاری

کرنے لگا۔ تو بیوی نے پوچھا۔ آپ تو ایک ہی دن میں ... گئے ہیں۔ اتنی جلدی کایا پلٹ ہوتے تو آج تک نہیں د... اس نے ملائمت سے جواب دیا۔ آج تک نہیں دیکھا تھا۔ ت... لیا نا۔ شکر ہے۔ میری آنکھیں جلدی کھل گئیں ورنہ نہ جانے ک... کتنے انبار لیکر اللہ کے دربار میں حاضر ہوتا۔ بیوی ایک دیند... سے تعلق رکھتی تھی۔ کہنے لگی۔ میں آپ کو زندگی کی اس نئی کرو... دیتی ہوں۔ میرے دل و دماغ میں نیکی اور شرافت کے جو... کی صحبت میں رہ کر دب گئے تھے۔ پھر سے اجاگر ہو گئے ہ... کو اپنے ارادے میں استقامت عطا فرمائے۔ چند دن تک ... ہیجانی کیفیت طاری رہی۔ اسکے بعد وہ پہلے سے زیادہ منکس... الطبع اور ملنسار ہو گیا۔ جو کوئی اس سے ملتا۔ اسکی شرافت... تعریف کرتا۔ اسکا چہرہ "سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود" ک... تھا۔●

حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی کے سرپرستوں اور کرمفرماؤں سے

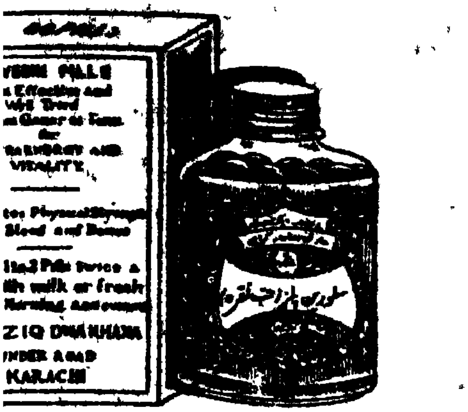
گزشتہ پانچ سال سے یہ ہماری انتہائی کوشش رہی ہے کہ مفردات اور دوسری خام اشیاء کی قیمتوں میں مسلسل اضافہ کے باوجود ہم اپنی دواؤں کی قیمتوں میں کوئی اضافہ نہ کریں اور ہمارے کرم فرما شاہد ہیں کہ گزشتہ دو تین سال کے تجارتی عدم توازن اور اس سے پیدا شدہ خام اشیاء اور مفردات کی گرانی بھی ہمارے اس ارادہ کو متزلزل نہ کر سکی۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ یونانی ادویہ کا استعمال زیادہ تر اوسط طبقہ کے لوگ اور غریب عوام ہی کرتے ہیں اور اس کساد بازاری کے زمانہ میں اس طبقہ کے کندھوں پر طبی امداد کے سلسلے میں کسی مزید بوجھ کا اضافہ مناسب نہ ہوگا۔ گزشتہ پانچ سال سے ہم اسی اصول اور طریق کار پر عمل کرتے رہے ہیں۔ مگر سالِ رواں میں اہم مفردات اور خام اشیاء کی نایابی اور ان کی اچانک اور غیر معمولی گرانی نے ہمارے لئے ایسی شدید اور ناقابل برداشت مشکلات اور تکالیف پیدا کر دی ہیں کہ ہم اپنی دواؤں کی قیمتوں پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ ہم اپنی دواؤں میں جو اضافہ کر رہے ہیں ہمیں اس کا بیحد افسوس اور رنج ہے ہم چاہتے تھے کہ حاذق دواخانہ اپنی سابقہ روایات کے مطابق اس باب میں بھی ممتاز رہتا لیکن اس دور کے حالات نے ہمیں اپنی دواؤں کی قیمتوں میں اضافہ کرنے پر مجبور کر دیا ہے اس لئے ہم اپنے کرمفرماؤں اور سرپرستوں سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ قیمتوں میں اس عارضی اور مجبوری اضافے کو بخوشی برداشت کر لیں گے جس وقت تجارتی حالات سازگار ہو گئے ہم اس وقت اپنی قیمتوں کو اسی معیار پر لے آئیں گے۔ جو گزشتہ پانچ سال سے ہم قائم رکھے ہوئے تھے!

حاذق دواخانہ کی عارضی فہرست حسب ذیل ہے اس سے پہلے کی شائع شدہ فہرستیں اور قیمتیں منسوخ سمجھی جائیں۔

منیجر حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی

سلورین پلز (حب خاص)

اعضائے رئیسہ کی جملہ کمزوریوں کے لئے مجرب دوا ہے یہ گولیاں عصبی نظام کے ہر نقص کو درست کرنے میں بیحد مفید اور زود اثر ثابت ہو چکی ہیں کثرت جماع سے پیدا شدہ عصبی کمزوریوں کو رفع کرنے میں بے نظیر ہیں۔ ایسے حضرات جن کو وقت پر شرمندگی اٹھانی پڑتی تھی۔ ان گولیوں کے شرمندۂ احسان ہیں۔ بعد از مباشرت دودھ کے ہمراہ ایک یا دو گولی کا استعمال خرچ شدہ قوت کو بحال کر دیتا ہے ہر عمر اور ہر موسم میں قابل استعمال ہے۔ قیمت ۴۰ گولی برائے ۲۰ یوم پانچ روپے دس آنے



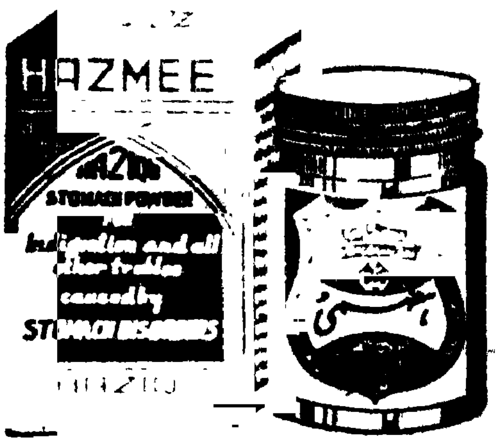
ہضمی

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ جسم انسانی کی صحت کا دارومدار معدہ کے فعل ہضم کی درستی پر ہے۔ بقول شاعر

الٰہی زمن معدہ من مرنجان دگر ہر چہ رنجید رنجید

یہ اکسیری دوا پیٹ کے درد، قبض، ضعف ہضم، تخمہ اپھارہ کے لئے بیحد مفید ہے سچی بھوک لگاتی ہے ہر گھر میں اس کا رہنا رحمت ثابت ہوگا۔

قیمت دو اونس شیشی، ایک روپیہ

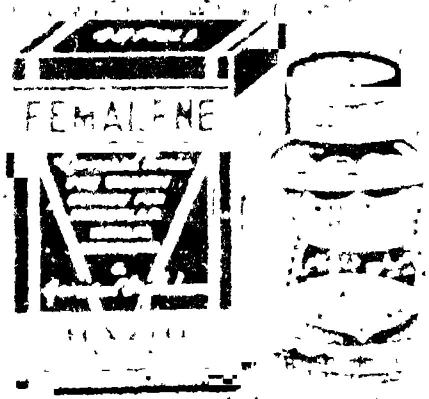


حاذق نروائن پلز حب خاص

ایک جنرل ٹانک ہے جو عصبی اور دل و دماغ کی کمزوریوں کا مجرب علاج ہے یہ گولیاں دماغی کام کرنیوالے حضرات یعنی وکیل، بیرسٹر پروفیسر اور طالب علم صاحبان کے واسطے آب حیات کا کام دیتی ہیں اور جسم انسانی کی جملہ عصبی کمزوریوں کو بحال کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ دواخانہ ہذا کے خاص مجربات میں سے ہیں۔

قیمت ۴۰ گولی ۲۰ یوم چار روپے بارہ آنے





فیمیلن

نسائی خاص

یہ گولیاں عورتوں کی جملہ پوشیدہ شکایتوں کو دور کرنے میں اکسیر ہیں سیلان ماہواری کی بیقاعدگی اور اسی قسم کی دوسری زنانہ شکایتوں سے پیدا شدہ جملہ نقائص کو دور کرنے میں لاثانی ہیں استقرار حمل کو مدد دیتی ہیں گویا عورتوں کے لئے ایک جنرل ٹانک ہے جسکا متواتر استعمال عورتوں کے نظام عصبی کو درست کرتا ہے جن عورتوں کو اسقاط حمل کی بار بار شکایت ہوتی ہو ان کے لئے بے حد مفید ہیں۔

قیمت مکمل کورس ۴۰ گولی برائے ۲۰ یوم تین روپے چھ آنے

چسٹاکیئر

یہ دوا پرانی کھانسی اور پھیپھڑوں کے جملہ امراض کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے، پھیپھڑوں کو طاقت دیتی ہے، زکام، نزلہ اور کھانسی کے مریضوں کے لئے بیحد مفید ہے۔ پھیپھڑوں سے خون آنا، ابتدائی سل اور بلغمی کھانسی کے واسطے نہایت مجرب دوا ہے جن خاندانوں میں مرض سل موروثی ہو، ان کے نوجوانوں کے لئے اس دوا کا مستقل استعمال ان کو اس موذی مرض سے محفوظ رکھتا ہے ×

قیمت ۴ اونس برائے ۲۰ یوم تین روپے



حاذق ہسٹریا پلز

یہ گولیاں خالص و کمیاب جڑی بوٹیوں سے جدید طبی اصول پر تیار کی ہوئی ہیں۔ عورتوں کی مشہور بیماری ہسٹریا (اختناق الرحم) بچوں کی مرگی (ام الصبیان) کیلئے لاثانی دوا ہے اسکے علاوہ عام کمزوری ضعف ہضم اختلاج قلب (دل کی دھڑکن) کیلئے بھی بہت مفید ہے یہ دوا نفاد اپنی اک ایسی بے نظیر ترتیب ہے جس پر طب یونانی جس قدر بھی فخر کرے بجا ہے ×

قیمت فی شیشی ۴۰ گولی پانچ روپے پانچ آنے

برہمن — دماغی

دماغی کام کرنے والوں کے لئے بیحد مفید ہے دماغ کو روشن اور شگفتہ کرتی ہے قوت حافظہ کو بے حد مفرح اور مقوی قلب ہے۔ بڑھاپے میں صحت کا سہارا ہے × قیمت ۴ اونس برائے ۲ روپیہ

حاذق ہیر ٹانک (آئیل)

جدید ترین کیمیاوی اصولوں پر سونفیصدی نباتاتی تیلوں سے تیار شدہ اور سر کے استعمال کیلئے ایک بہترین ہیر آئیل ہے یہ سر کے گرتے بالوں کو روکتا، وبالوں کو لمبا اور سیاہ بنانے اور سفید ہونے سے روکتا ہے دماغی کمزوری کا موثر علاج ہے۔ بالوں اور دماغ سے متعلقہ جملہ شکایات کے رفع کرنے کیلئے ایک لاجواب تحفہ ہے خوشبودار تیلوں کی جگہ اس کا مستقل استعمال اکثر دماغ اور سر کے امراض سے محفوظ رکھتا ہے × قیمت فی شیشی چار اونس ایک روپیہ بارہ آنہ

طلا پاک (مقوی مسک)

دواخانہ ہذا کا انمول اور خاص تحفہ ہے یہ حیرت انگیز جادو اثر اور کامیاب طلا ہے جس کا استعمال سہل اور قطعی بے ضرر وخوش کن ہے اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ استعمال کے بعد لگن اور چھوڑ کر ایک نئی زندگی پیدا کر دیتا ہے چونکہ جدید کیمیاوی طریقوں پر بنایا گیا ہے اس لئے کسی پٹی یا بندش کی ضرورت نہیں۔ پورے کورس کا استعمال پٹھوں کی جملہ خرابیوں کو مکمل طور پر دور کر کے وہ خاص قوت پیدا کر دیتا ہے جو مرد کو مرد بنانے کے لئے ضروری ہے۔ سرعت کے مریضوں کو اس کا استعمال مستقل فائدہ دیتا ہے۔ سلورین بڑیا نروائن بلز کے ہمراہ اس کا استعمال سونے پر سہاگہ کا کام دیتا ہے ×

قیمت: مکمل کورس (ایک ماہ کے لئے) پانچ روپے × نصف کورس (پندرہ یوم کے لئے) دو روپے بارہ آنے

حاذق کورس!

نشاط زندگی یا لطف شباب، جوانی کی امنگیں یا مسرت کی لہریں، جسم انسانی کی ایک ہی کیفیت کے چند مختلف نام ہیں۔ یہ کیفیت بدن میں اس وقت پائی جاتی ہے جب جوہر انسانی جسے عرف عام میں طاقت مردمی کہتے ہیں۔ جسم انسانی میں اس خاص درجہ معیار تک موجود ہو جو حیات انسانی کے لئے ضروری ہے جسم انسانی میں اس قدرتی جوہر کی بدرجۂ اتم موجودگی ہی کا نام صحت، شباب، جوانی اور مسرت ہے یہی قدرت کی سب سے بڑی نعمت ہے اس جوہر کی کمی خواہ وہ کسی وجہ سے ہو زندگی کی سب سے بڑی کمی ہے اور آدمی کی پژمردگی، مردہ دلی اور پست ہمتی کا سب سے بڑا سبب ہے یہ کمی زندگی کی ساری دلچسپیوں کو بیکار کر دیتی ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کیلئے طب یونانی کی لاثانی اور مایۂ ناز ایجاد "حاذق" عالیجناب حکیم محمد نذیر احمد صاحب سرپرست حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی کے ۲۷ سالہ تجربہ کا ایک جواہر ریزہ ہے جسکا تیر بہدف ہونا مسلمہ امر ہے یہ دوا ایک مہینہ کا مکمل کورس ہے جو کہ داخلی اور خارجی استعمال کے لئے تین مختلف ادویہ پر مشتمل ہے اور ایسے لوگوں کے لئے جو جوانی کی غلط کاریوں کی وجہ سے قبل از وقت جوہر مردمی کھو بیٹھے ہوں آب حیات ہے اور عمر رسیدگی کی وجہ سے کمزوری محسوس کرنیوالوں کیلئے مجرب اور آزمودہ علاج ہے

قیمت: مکمل کورس برائے ایک ماہ پندرہ روپے

قیمت: نصف کورس برائے پندرہ یوم آٹھ روپے

فہرست دیگر یونانی مرکبات

مندرجہ فہرست مرکبات اپنے اصلی نسخوں کے مطابق نہایت صاف ستھرے اور تازہ مفردات سے جدید طبی اصولوں پر تجربہ کار دوا سازوں کی
زانی تیار ہوتے ہیں۔ طبیب اور عطار حضرات اگر مرکبات زیادہ مقدار میں منگائیں تو ان کو واجبی کاروباری رعایت دی جائے گی ؛

منیجر حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی

لفل زمانی — دائمی نزلہ، زکام، قبض اور نئے یا پرانے درد سر کے لئے بے حد مفید ہے۔ خوراک چھ ماشہ سے ، تولہ تک حسب ضرورت رات کو سوتے وقت نیم گرم پانی کے ساتھ ں۔ فی تولہ تین آنے

لفل اسطوخودوس — دماغ اور معدے کو فضلات سے پاک کرتا ہے درد سر اور نزلہ کے بید مفید ہے خوراک نو ماشہ شب کو تازہ پانی کے ہمراہ استعمال ں فی تولہ تین آنے

ارش انارین — مقوی معدہ اور جگر ہے۔ بھوک لگاتی ہے حرارت کو تسکین دیتی ہے قے اور متلی کو بھی ی ہے خوراک چھ ماشہ صبح کو تازہ پانی کے ہمراہ استعمال کریں۔ فی ہ چار آنے

ارش آملہ — جگر اور معدہ کو قوت دیتی ہے اختلاج قلب کے لیئے مفید ہے چھ ماشہ صبح یا شام کو ی کے ہمراہ استعمال کریں فی تولہ چار آنے

ارش جالینوس — مقوی معدہ ہے خوراک کو ہضم کر کے خوب بھوک لگاتی ہے کمزور آنتوں کو قوت ی ہے ریاح کو خارج کرتی ہے۔ گردہ کی اور پیشاب کی زیادتی کو لتی ہے بالوں کو قبل از وقت سفید ہونے سے بچاتی ہے خوراک سات ماشہ زا سے پہلے یا بعد تازہ پانی کے ہمراہ استعمال کریں فی تولہ چار آنے

ارش زرعونی — ذیابیطس، گردوں کی کمزوری، پیشاب کی زیادتی کے لئے مفید ہے۔ خوراک چھ ماشہ ی کے ہمراہ کھائیں فی تولہ چار آنے

جوارش شاہی — اختلاج قلب، ضعف معدہ و جگر کے لئے مفید ہے خوراک تین تین ماشہ صبح شام پانی کے ہمراہ استعمال کریں فی تولہ چار آنے

جوارش عود شیریں — بھوک کی کمی، متلی اور ہضم کی کمزوری کے لئے مفید ہے خوراک چھ ماشہ صبح پانی کے ہمراہ استعمال کریں۔ فی تولہ تین آنے

جوارش کمونی — بدہضمی، اسہال، کثرت ریاح اور بھوک کی کمی کے لئے مفید ہے خوراک چھ ماشہ سے ایک تولہ تک نیم گرم پانی کے ہمراہ استعمال کریں۔ فی تولہ تین آنے

جوارش مصطگی — معدے کی کمزوری، دست، پیشاب کی زیادتی اور رال بہنے کے لئے مفید ہے۔ خوراک چھ ماشہ پانی کے ہمراہ استعمال کریں فی تولہ چار آنے

جوہر منقے — پرانے سوزاک، آتشک گٹھیا اور پھوڑے پھنسی کے لئے مفید ہے خوراک دو چاول منقے میں لپیٹ کر پانی کے گھونٹ سے نگل لیا کریں۔ فی ماشہ ڈیڑھ روپیہ

جواہر مہرہ — اعضائے رئیسہ کی کمزوری، گھبراہٹ، لمبی بیماری کے بعد کا ضعف دور کرنے کے لئے ، [illegible] آپریشن کے موقع پر قوت قائم رکھنے کے لئے عالم نزع میں کچھ دیر کے لئے قوت بحال کرنے کیلئے اکسیر چیز ہے خوراک دو چاول سے ایک رتی تک دوا یا مشک معتدل تین ماشہ میں ملا کر استعمال کریں۔ فی ماشہ چار روپے

حب تنکار — دائمی قبض اور معدے کی گرانی کے لئے مفید ہے خوراک تین گولی رات کو نیم گرم پانی کے ہمراہ استعمال کریں۔ فی درجن تین آنے

حب سرخ بواسیر بواسیر کے خون کو روکنے کے لئے مفید ہے دو یا تین گولی صبح شام دہی کے پانی یا تازہ پانی سے استعمال کریں۔ فی درجن چھ آنے

حب پیچش ہر قسم کی پیچش کے لئے اکسیری دوا ہے آنتیں صاف کرنے کے بعد ایک گولی صبح ایک گولی شام گو گلاب یا پانی کے ساتھ استعمال کریں فی گولی آٹھ آنے

حب جدوار یہ گولیاں امساک اور قوت کے لئے عجیب الاثر ہیں پرانی کھانسی اور نزلہ کو دور کرتی ہیں اور افیون کی عادت ترک کرنے کے لئے ان کا استعمال مفید ہے خوراک ایک گولی بوقت شب دودھ کے ہمراہ استعمال کریں فی گولی تین آنے

حب جواہر اعضائے رئیسہ، دل و دماغ اور جگر کی کمزوری کے لئے مخصوص چیز ہے بیماری کے بعد کے ضعف کو ان کا چند یوم استعمال رفع کر دیتا ہے۔ خوراک ایک گولی صبح ایک شام کو خمیرہ گاؤزبان جواہر والے میں یا پانی کے ہمراہ استعمال کریں فی درجن دو روپے چار آنے

حب سرفہ بچوں اور بڑوں کی بلغمی کھانسی، دائمی نزلہ گلے کی خراش کے لئے مفید ہے ایک گولی صبح ایک شام کو منہ میں رکھکر لعاب چوستے رہیں۔ فی درجن چار آنے

حب سورنجان کمزوری، جوڑوں کے درد، دائمی قبض کے لئے مفید ہیں دو یا تین گولیاں شب کو نیم گرم پانی کے ساتھ استعمال کریں۔ فی درجن چھ آنے

حب عنبر مومیائی قوت مردمی کے لئے بھروسہ کی چیز ہے ہزار ہا ضعف باہ کے مریض اس سے فائدہ اٹھا چکے ہیں۔ دو گولیاں شب کو دودھ کے ساتھ استعمال کریں فی درجن تین روپے

حب کبد قبض، جگر کی کمزوری، ضعف ہضم، کثرت ریاح کے لئے مفید ہیں۔ دو تین گولیاں غذا کے بعد دونوں وقت استعمال کریں۔ فی درجن تین آنے

حب کتھ آتشک، فساد خون، پھوڑے پھنسیوں اور دیگر سوداوی

بیماریوں کے لئے مفید ہیں۔ خوراک ایک گولی منہ میں رکھ کر گھونٹ گھونٹ سے نگل لیا کریں۔ فی درجن بارہ آنے

خمیرہ ابریشم حکیم ارشد والا مقوی اعضائے خفقان، وحشت کیلئے مفید ہے تین ماشہ سے چھ ماشہ تک استعمال کریں فی تولہ ڈیڑھ

خمیرہ گاؤزبان عنبری جواہر والا دل و کمزوری اور فاسد خیالات کے لئے مفید ہے۔ تین ماشہ سے چھ استعمال کریں فی تولہ دس آنے

خمیرہ مروارید خفقان، گھبراہٹ، میعادی بخار کے لئے مفید ہے تین تین ماشہ ہ استعمال کریں فی تولہ دس آنے

دوائے پتھری گردہ اور مثانہ کی پتھری کے لئے ہے ایک رتی صبح ایک رتی شام کے ہمراہ استعمال کریں۔ فی ماشہ ایک روپیہ

دوائے ڈپٹی صاحبؒ رقت، جریان کے لئے مفید ہے مکھن میں ملا کر استعمال کریں فی ماشہ آٹھ آنے

دوار الشفاء جنون، مالیخولیا، مرگی، ہسٹریا کے خون کے دباؤ کو کم کرتی ہے خوراک دو قرص شام پانی کے ہمراہ استعمال کریں چالیس قرص پانچ روپے

دوائے کالی کھانسی بچوں اور بڑوں کی کالی کھانسی کیلئے جس میں عموماً بچوں کو قے ہو جاتی ہے بہت مفید چیز ہے ایک رتی سے ایک ماشہ تک مطابق شہد میں ملا کر استعمال کریں۔ فی تولہ ڈیڑھ روپیہ

دوار المسک معتدل جواہر والی حکیم ... کی خاص مخصوص دوا ہے۔ بلغمی امراض فالج، لقوہ وغیرہ کے لئے تین تین ماشہ صبح شام استعمال کریں فی تولہ دس آنے

روغن سماعت کشا — بہرے پن کے لئے خواہ کسی وجہ سے ہو مفید ہے چند قطرے نیم گرم رات کو کان میں [ٹپ]کائیں فی تولہ آٹھ آنے

[رو]غن کلاں — فالج، لقوہ، جوڑوں کے درد اور پٹھوں کی دوسری بیماریوں کے لئے مفید ہے نیم گرم [م]الش کریں۔ فی تولہ آٹھ آنے

[س]فوف ارسطو — پرانے جریان، ابتدائی سوزاک، پیشاب کی جلن کے لئے مفید ہے۔ تین ماشہ صبح تین [ما]شہ شام دودھ کی لسی کے ہمراہ استعمال کریں فی تولہ آٹھ آنے

[س]فوف الاملاح — درد شکم، کثرت ریاح اور بدہضمی کیلئے مفید ہے چار چار رتی جوارش کمونی میں [ملا]کر استعمال کریں۔ فی تولہ ڈیڑھ روپیہ

[س]فوف طحال — تلی کے بڑھ جانے اور تلی کی سختی اور ورم کے لئے مفید ہے دو دو ماشہ غذا کے بعد تازہ [پ]انی سے استعمال کریں فی تولہ چار آنے

[س]فوف نمک سلیمانی — درد شکم اور ضعف معدہ کے لئے مفید ہے دو دو ماشہ غذا کے بعد استعمال کریں۔ فی [تو]لہ چار آنے

[س]فوف برص — سفید داغوں (برص) اور چنبل نیز دیگر جلدی بیماریوں کیلئے مفید ہے چھ ماشہ گرم پانی میں بھگو کر [صبح] زلال پی لیا کریں اور پھوک سرکہ میں پیس کر لگائیں فی تولہ آٹھ آنے

[س]فوف نزلہ مرکب — نزلہ، زکام، کھانسی، درد سر اور بخار کے لئے مفید ہے ایک ماشہ سے دو ماشہ [تک] صبح شام نیم گرم پانی کے ساتھ استعمال کریں فی تولہ بارہ آنے

[س]فوف سرخ — ابتدائی سوزاک، پیشاب کی جلن اور خون آنے کو مفید ہے۔ تین تین ماشہ صبح اور شام تازہ [پ]انی کے ساتھ استعمال کریں فی تولہ آٹھ آنے

[س]فوف برگ حنا — کھجلی تر ہو یا خشک دونوں کے لئے مفید ہے مکھن یا کھوپرے کے تیل میں ملا کر جہاں خارش ہوتی ہو جلد پر دن میں دو تین بار ملیں فی تولہ آٹھ آنے

سنون سرخ — مسوڑھوں سے خون آنے، دانت ہلنے کیلئے مفید ہے غذا کے بعد اور شب کو سوتے وقت مل لیا کریں۔ اور تھوڑی دیر کلی نہ کریں فی تولہ آٹھ آنے

سنون جدید — دانتوں کے درد اور ہلنے کے لئے مفید ہے۔ صبح شام مل کر رال ٹپکاتے رہا کریں فی تولہ آٹھ آنے

شربت فولاد — جگر کی کمزوری، خون کی کمی کے لئے مفید ہے چھ چھ ماشہ غذا کے بعد استعمال کریں۔ فی شیشی دس تولہ ڈھائی روپے

عرق سوزاک — نئے اور پرانے ہر قسم کے سوزاک، پیشاب کی جلن اور خون آنے کو مفید ہے ایک ایک تولہ صبح و شام پانی میں ملا کر استعمال کریں فی شیشی دس تولہ ڈھائی روپے

قرص ملین — درد سر، دائمی قبض، بھوک کی کمی کے لئے مفید ہیں ایک یا دو قرص شب کو گرم پانی کے ہمراہ استعمال کریں فی درجن چودہ آنے

کشتہ خبث الحدید — معدہ اور جگر کے لئے مفید ہے بلغمی رطوبات کو خشک کر دیتا ہے۔ خوراک دو چاول سے ایک رتی تک جوارش جالینوس میں استعمال کریں فی تولہ دو روپیہ

کشتہ زمرد — ذیابیطس، پیشاب کی کثرت، گردہ اور مثانہ کی کمزوری، ضعف قلب، پرانی کھانسی کے لئے مفید ہے دو چاول سے ایک رتی تک جوارش زرعونی یا خمیرہ مروارید میں استعمال کریں۔ فی تولہ بارہ روپے

کشتہ قلعی — جریان، پرانے سوزاک، سرعت، احتلام کیلئے مفید ہے۔ ایک رتی سے دو رتی تک مکھن میں ملا کر استعمال کریں۔ فی تولہ دو روپے

کشتہ مرجان سادہ — نزلہ، زکام، ضعف دماغ کے لئے مفید ہے۔ ایک رتی مکھن میں ملا کر استعمال کریں۔ فی تولہ تین روپے

کشتہ مرجان جواہر والا

دماغ اور اعصاب کی کمزوری، دھڑکن، نزلہ پانی کے لئے مفید ہے۔ دو چاول سے ایک رتی تک خمیرہ گاؤزبان جواہر والا یا مکھن میں ملا کر استعمال کریں۔ فی تولہ بارہ روپے

کشتہ طلاء خورد

دق اور دوسرے پرانے بخاروں کے لئے مفید ہے۔ اعضائے رئیسہ دل و دماغ اور جگر کو قوت دیتا ہے۔ بلغمی بیماریاں، فالج، لقوہ، رعشہ وغیرہ کو دور کرتا ہے خوراک دو چاول سے چار چاول تک خمیرہ مروارید یا دواء المسک میں ملا کر استعمال کریں۔ فی ماشہ دس روپے

کشتہ فولاد

جگر کی کمزوری دور کرتا ہے۔ خون پیدا کرتا ہے دو چاول سے ایک رتی تک جوارش جالینوس یا دواء المسک میں ملا کر استعمال کریں۔ فی تولہ بارہ روپے

کشتہ ابرک کلاں

سل دمہ اور پرانی کھانسی کے لئے مفید ہے دو چاول سے ایک رتی تک شہد یا لعوق سپستاں میں ملا کر استعمال کریں۔ فی تولہ چار روپے

کحل ماہیراں

دھند، جالا، رطوبت کے لئے مفید ہے بینائی کو تیز کرتا ہے۔ شب کو سوتے وقت لگائیں تین ماشہ ڈیڑھ روپیہ

لبوب کبیر

دل و دماغ اعصاب کی قوت کے لئے مفید ہے باہ بڑھاتا ہے گردوں کو طاقت دیتا ہے مادہ منویہ کی پیدائش زیادہ کرتا ہے تین ماشہ سے چھ ماشہ تک صبح شام دودھ کے ساتھ استعمال کریں۔ فی تولہ بارہ آنے

لعوق معتدل

بلغمی کھانسی، نزلہ، سینے کے درد کیلئے مفید ہے دو تولہ پانی میں جوش دے کر پی لیا کریں فی تولہ دو آنے

معجون اذراقی

فالج، لقوہ، رعشہ، کمر اور جوڑوں کے درد کے لئے مفید ہے بلغمی امراض کو دور کرتی ہے مقوی باہ ہے ایک ماشہ سے دو ماشہ تک نیم گرم پانی کے ہمراہ صبح ناشتہ کے بعد استعمال کریں فی تولہ آٹھ آنے

معجون پوست سنگدانہ

ضعف معدہ اور … کی وجہ سے … کے لئے مفید ہے تین تین ماشہ صبح شام استعمال کریں۔ فی تولہ چھ آنے

معجون حمل عنبری

سیلان الرحم، کمر کے درد، کمزوری کے لئے مفید ہے جن عورتوں کو اسقاطِ حمل ہوتا ہو۔ یا بچے ام الصبیان میں ضائع ہوتا ہو اس کے حمل محفوظ رہتا ہے اور بچہ تندرست پیدا ہوتا ہے خوراک تین ماشہ تین ماشہ شام اسقاط کے لئے تیسرے مہینے سے ساتویں مہینے استعمال کریں۔ فی تولہ بارہ آنے

معجون دبید الورد

جگر کی کمزوری، ورم استسقاء … مفید ہے چھ ماشہ صبح چھ ماشہ … استعمال کریں فی تولہ چار آنے

معجون سورنجان

کمر کے درد، جوڑوں کے … قبض کے لئے مفید ہے۔ … درد کو کم کرتی ہے خوراک چھ ماشہ سے ایک تولہ تک شب کو نیم گرم … کے ہمراہ استعمال کریں فی تولہ تین آنے

معجون فلاسفہ

کمر کے درد، پیشاب کی زیادتی مردمی کی کمزوری کے لئے مفید … چھ ماشہ سے ایک تولہ تک دودھ یا پانی کے ساتھ استعمال کر… تولہ پانچ آنے

معجون عشبہ

فساد خون، پھوڑے پھنسیوں کے … ہے خوراک چھ ماشہ سے ایک تولہ … پانی کے ساتھ استعمال کریں۔ فی تولہ چار آنے

معجون مقوی ممسک

امساک اور قوت … عجیب و غریب ہے ایک … تین ماشہ تک دودھ کے ہمراہ استعمال کریں۔ فی تولہ چھ روپے

مفرح اعظم

خفقان، گھبراہٹ، دل و دماغ کی کمزوری … مفید ہے، بھوک بڑھاتی ہے۔ وبائی … کے زمانہ میں اس کا استعمال حفظ ما تقدم کے لئے بہتر ہوتا ہے

افاداتِ مسیح الملک

مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب مرحوم کا مکمل

دستور العلاج

جس میں سر سے پاؤں تک کثیر الوقوع بیماریوں کا بیان معہ تشخیص اور علاج حکایات کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔

قابلِ قدر اور مفید کتاب ہے۔

قیمت:۔ تین روپے آٹھ آنے

حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی سے طلب فرمائیں!

میرا پیغام ـــــ اپنی بہنوں کے نام

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تندرستی اور بیماری ہر فرد و بشر کے ساتھ ساتھ ہے۔ جب کبھی آپ بیمار ہوں اور آپ کو کسی دواخانہ کی طرف رجوع کرنا پڑے تو قدرتی طور پر آپ کے ذہن میں یہ سوالات پیدا ہوں گے۔

(۱) کیا دواخانہ جس کی طرف آپ رجوع کررہی ہیں قابلِ اعتماد ہے محض اشتہاری تو نہیں اور کیا وہ اپنے مرکبات اور مجربات میں قیمتی ادویہ نسخوں کے مطابق ڈال رہا ہے تاکہ ان پر بھروسہ کیا جا سکے؟

(۲) کیا تجربہ کار اور صحیح طبیب ہمارے مرض پر غور کرکے ہمارے مرض کے لئے صحیح دوا تجویز کررہے ہیں؟

جہاں تک "حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی نمبرا" کا تعلق ہے مجھے فخر ہے کہ وہ اس معیار پر بفضلہ تعالیٰ پورا اتر رہا ہے عالی جناب امام طب حکیم سید نذیر احمد صاحب دہلوی کی سرپرستی ہی اس دواخانہ کی بہترین ضامن ہے۔ حکیم صاحب موصوف کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں آپ فن طبابت میں ۴۷ سالہ تجربہ رکھتے ہیں آپ کی زندگی کے قیمتی آٹھ سال مسلسل طور پر جناب مسیح الملک حافظ اجمل خاں صاحب مرحوم و مغفور کے طبیب پیشی کی حیثیت سے ان کے ساتھ سفر و حضر میں کٹے، آپ ہندوستانی دواخانہ دہلی کے مسلسل چھ سال تک ہر شعبہ کے نگراں رہے "کتاب حاذق"، "افادات مسیح الملک" اور "مطب کلاں" آپ کی وہ مایۂ ناز تالیفات ہیں۔ جن پر طب یونانی ہمیشہ فخر کرے گی اس کے علاوہ آپ یونانی طبیہ کالج دہلی کے اعلیٰ کلاسوں کے پروفیسر رہ چکے ہیں اور آپ کی طبی خدمات کے اعتراف میں یونانی طبیہ کالج کی سلور جوبلی کے اہم موقعہ پر مارچ سنہ ۴۷ء میں مہتمان کالج نے آپ کو امام الطب کی ڈگری سے سرفراز فرمایا۔ این سعادت بزور بازو نیست!

چونکہ حکیم صاحب بہ نفس نفیس حاذق دواخانہ کے جملہ امور کے نگراں ہیں اور مطب کے علاوہ اپنا تمام وقت اور توجہ دواخانہ کی درستی اور اصلاح میں صرف کرتے ہیں اس لئے ان کے موجودہ اور ان کی نگرانی میں تیار کرائے ہوئے اس دواخانہ کے مرکبات اور مجربات آپ کی صحت کے بہترین محافظ ہیں۔ اگر آپ کو اپنے عزیزوں ملنے والوں یا اپنے بچوں کے لئے کسی مرکب یا مفرد دوائی کی ضرورت ہو یا کوئی طبی مشورہ درکار ہو تو آپ بلا تکلف اپنا حال لکھ کر اور اسے لفافہ میں بند کرکے مجھے بھیج دیں۔ لفافہ پر حاذق دواخانہ کراچی کا "طبیبہ شعبۂ زنانہ" لکھ دیجئے۔ آپ کا خط سوائے میرے اور کوئی نہیں کھول سکتا۔ میں آپ کے خط کو اچھی طرح پڑھ کر اور حکیم صاحب سے مشورہ کرکے آپ کے لئے مناسب دوائی بھجوا دوں گی یا اس کے متعلق آپ کو اطلاع دے دوں گی۔ اگر ذاتی مشورہ لینا ہو تو صبح نو بجے سے بارہ بجے تک دواخانہ میں تشریف لائیں۔ میں وہاں موجود ہوں گی پردے کا بہترین انتظام ہے۔ میری وساطت سے حکیم صاحب سے بہترین اور سچا مشورہ ملے گا۔

حاذق دواخانہ کے اعلیٰ انتظامات سے جہاں اب تک میری بے شمار بہنیں فائدہ حاصل کرچکی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ کو بھی اپنی صحت کے بارے میں سچا اور مناسب مشورہ ملے گا۔ آپ کی خادمہ

طبیبہ شعبۂ زنانہ

حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی


Asmar
The TONIC FRUIT DRINK
REFRESHING
INVIGORATING
Excellent
with
SODA WATER
OR HOT OR
COLD WATER
IDEAL FRUIT TONIC
REFRESHING & INVIGORATING
DELICIOUS
(NON-ALCOHOLIC)
HAZIQ DAWAKHANA
ALWAYS DRINK
Asmar
اثمار
پھلوں کا
فرحت بخش اور مقوی
شربت۔ سوڈا واٹر یا ٹھنڈے
پانی میں استعمال کیجئے
حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی
HAZIQ DAWAKHANA KARACHI

Monthly "MUSHIR" Karachi

Title Printed at Royal Printing Press, Karachi.

مشیر

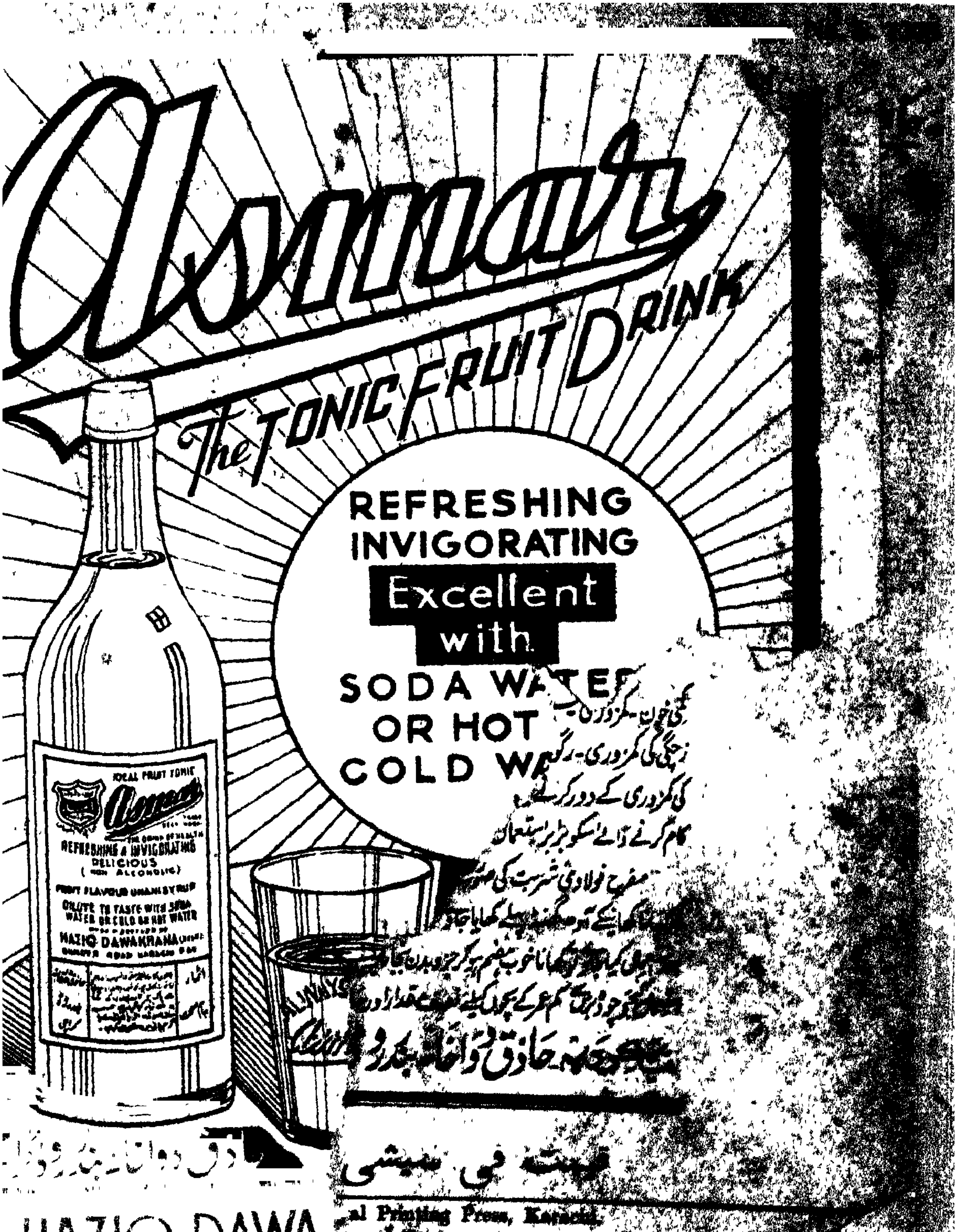
کراچی

5(4)

یں گے شگوفے
ب گلزار کریں گے

یا گے
ہنے والے ہیں ترے اے غم دوراں
سے لگائیں گے تجھے پیار کریں گے

(حمایت اسلام)


Asmar
The Tonic Fruit Drink
REFRESHING
INVIGORATING
Excellent
with
SODA WATER
OR HOT
COLD W
HAZIQ DAWA
al Printing Press, Karachi.

سیف الدین سیف

یوسفِ زنداں

حق بات تہِ تیغ و سرِ دار کریں گے
یہ جرم جو زندہ ہیں تو سو بار کریں گے

تم عشق پہ الزام لگاؤ گے جنوں کا!
ہم حسن کو رسوا سرِ بازار کریں گے

کیوں گوشۂ زنداں کی ہوا بھا گئی ہم کو
اک روز ہم اس بات کا اظہار کریں گے

اک روز اسی شاخ سے پھوٹیں گے شگوفے
اے خاکِ چمن ہم تجھے گلزار کریں گے

ہم مہر بلب رہ کے بھی زندانِ بلا میں!
ہر سنگ کو آمادۂ گفتار کریں گے

ہم چاہنے والے ہیں ترے اے غمِ دوراں
سینے سے لگائیں گے تجھے پیار کریں گے

(حمایت اسلام)

پاکیزہ اور صالح ادب کا علمبردار

مشیر

جلد ، ۵
شمارہ ، ۴

ٹیلی فون ۱۲۳

فہرست —— اپریل ۵۴ء

مرتبہ :-
خلیل الغفور بیگ

بدل اشتراک : پاکستان فی پرچہ چھ آنے + سالانہ تین روپے
بھارت فی پرچہ آٹھ آنے + سالانہ ساڑھے چار روپے

طابع و ناشر خلیل الغفور بیگ مطبع مشہور پریس کراچی، مقام اشاعت - بندر روڈ کراچی نمبر ا (م)

(کتبہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امریکی فوجی امداد اور پاکستان

فروری ۱۹۵۴ء کے شمارے میں ہم نے پاکستان کو امریکہ کی مبینہ فوجی امداد کی گفت و شنید پر بھارت کے معاندانہ اور مخالفانہ پروپیگنڈے کی سخت مذمت کی تھی اس سے ہمارا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ چونکہ اس فوجی معاہدہ کی مخالفت بھارت کی طرف سے ہو رہی ہے اس لئے ضرور اسکی حمایت کی جانی چاہیے اس وقت چونکہ گفت و شنید مبہم صورت میں تھی اس لئے ہم اس کے حسن و قبح پر کوئی سیر حاصل تبصرہ نہ کرسکے اس وقت جو کچھ مقصود تھا وہ صرف بھارت کے اس غیر معقول رویّہ کی مذمت تھی جو وہ اختیار کئے ہوئے تھا۔ اب چونکہ صورت حال بالکل واضح ہوچکی ہے اور معاملات طے ہوچکے ہیں۔ پاکستان نے رسمی طور پر فوجی امداد حاصل کرنے کے لئے درخواست دے دی ہے اور امریکہ اسے منظور کرچکا ہے اب ضرورت ہے کہ اسکی حمایت یا مخالفت جو کچھ بھی کی جائے وہ اس کے فوائد و نقصانات کے اعتبار سے کی جائے اور معقول دلائل کے ساتھ کی جائے۔

یہ حقیقت ناقابل تردید ہے کہ اس وقت دنیا دو بلاکوں میں منقسم ہے۔ اینگلو امریکی سرمایہ دارانہ بلاک اور روس و چین کا کمیونسٹ بلاک۔ یہ دونوں بلاک اپنے نظریاتی اختلافات کی وجہ سے ایک دوسرے کے سخت حریف ہیں۔ اول الذکر مذہب کا محدود تصور اور دین کو دنیا سے الگ سمجھنے والا سرمایہ دارانہ نظریات کا حامل ہے اور موخر الذکر ملحدانہ نظریات رکھنے والا۔ مذہب کو افیون سمجھنے والا۔ خدا اور وحی و الہام کے تصور سے یکسر خالی بلکہ اس کا سخت مخالف مادہ پرستانہ نظریات کا حامل اشتراکی بلاک ہے۔ ان دونوں بلاکوں میں اپنے نظریاتی اختلاف اور ایک دوسرے کی ضد ہونے کی وجہ سے کسی مستقل مصالحت کی کوئی گنجائش نہیں۔ ان میں سے اگر کوئی بلاک یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نظریاتی تضاد کے باوجود دونوں بلاک باہم مفاہمت کے ساتھ رہ سکتے ہیں تو وہ اپنے اس دعویٰ سے نہ صرف دوسروں کو بلکہ اپنے آپ کو بھی دھوکہ دے رہا ہے۔ ناگزیر ہے کہ مناسب وقت پر ان دونوں بلاکوں کی نظریاتی کشمکش ساری دنیا کو کسی بہت بڑے ہولناک بلکہ تباہ کن تصادم سے دوچار کردے اور یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ دونوں بلاک اس ہونیوالے تصادم کے لئے بڑی تیز رفتاری کے ساتھ شد و مد سے تیاریاں کررہے ہیں۔ چند چھوٹے چھوٹے ممالک کو چھوڑ کر اس وقت دنیا کی ساری بڑی بڑی طاقتیں دونوں میں سے کسی ایک بلاک کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ایک طرف روس اور چین اپنے اشتراکی بلاک کی سربراہی کررہے ہیں تو دوسری طرف امریکہ اور برطانیہ اپنے اینگلو امریکی بلاک کی سرپرستی کررہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے اور کمزور ممالک خصوصاً ایشیائی ممالک کے لئے ان حریف بلاکوں میں سے کسی ایک کے ساتھ شرکت اختیار کرنا بڑا کٹھن کام ہوگیا ہے کیونکہ ایک بلاک کے کسی ایک ملک کے ساتھ دوستانہ تعلق قائم کرنا دوسرے بلاک کے ساتھ وابستہ ممالک سے دشمنی مول لینے کے مترادف ہے اس لئے وہ چھوٹے چھوٹے کمزور ممالک جو نہیں چاہتے کہ ان دونوں حریف بلاکوں کے درمیان مستقبل میں ہونے والے کسی خوفناک تصادم میں شریک ہو کر اپنے وجود کو خطرے میں ڈالیں سخت کشمکش و تذبذب میں مبتلا ہیں۔

مگر یہ تلخ حقیقت بھی اپنی جگہ پر اٹل ہے کہ دنیا کے تمام ممالک خواہ وہ بڑے ہوں یا چھوٹے انکے لئے ان دونوں بلاکوں میں سے کسی ایک میں شرکت ناگزیر ہے یہ ناممکن ہوگا کہ جب یہ دونوں بلاک اپنی اپنی قسمت آزمائی کے لئے میدان کارزار میں اتریں تو کوئی ملک ایک تماشائی کی حیثیت سے اپنی غیر جانبداری کا مظاہرہ کرتا رہے۔ آج بین الاقوامی حالات کے پیش نظر یہ خیال ایک بہت بڑی اعتقادی خوش فہمی ہے کہ جب یہ دونوں حریف بلاک برسر پیکار ہوں گے تو کوئی ملک دونوں حریفوں میں سے کسی ایک کا ساتھ دینے کی بجائے صرف غیر جانبدار رہ کر اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکے گا قطع نظر

کش مکش میں ... کے ایک کنارے اس امید اور انتظار میں کھڑے رہنا کہ فریقین میں سے جو بھی فاتح ہوگا اسی کی خوشامد اور چاپلوسی کی جائے گی یہ شیوہ کے موافق نہیں بلکہ منافقت ہے۔ نظریاتی کش مکش کے دور حاضرہ میں غیر جانبداری کارگر حربہ ثابت نہ ہو سکے گی۔ بظاہر آجکل میں لفظ "غیر جانبداری" بڑی شان استغنا کا حامل تصور کیا جاتا ہے۔ مگر حقیقت میں "غیر جانبداری" ڈپلومیٹک نام ہے کم ہمتی اور بزدلی سے "جانبداری" نام ہے ذہنی انتشار کی وجہ سے قوت فیصلہ کے فقدان کا۔ نظریاتی جدوجہد کے دور میں غیر جانبداری کا منافقانہ جامہ صرف وہی ملک پہن سکتا ہے جو بیک وقت اپنا دست سوال امریکی امداد کے حصول کے لئے بھی پھیلائے رکھنا چاہے اور دوسرے ہاتھ سے اشتراکی بلاک سے لینے میں بھی عار محسوس نہ کرے۔ یہ منافقانہ طرز عمل کسی باوقار ملک کے شایان شان نہیں ہو سکتا۔

ان حالات کے پیش نظر تمام چھوٹے چھوٹے مشرقی ممالک کے لئے غیر جانبدار رہنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر ان ممالک میں غیر جانبدار رہنے کی کوشش کرتا ہے یا غیر جانبدار رہنے کا دعوی دار ہے۔ تو سمجھ لینا چاہیے کہ یا تو وہ بزدل ہونیکے ساتھ ساتھ احمق بھی ہے کیونکہ اسے کسی نہ کسی بلاک میں اپنی مرضی سے یا اپنی مرضی کے خلاف شامل ہونا ہی پڑیگا۔ مگر "بعد از خرابیٔ بسیار" کچھ کرنا دانائی نہیں نادانی ہوگی۔ یا پھر وہ منافق ہے اور ابن الوقتی اور منافقت کی قدر و قیمت جو کچھ بھی ہو سکتی ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ ایسے ممالک جو اپنا کوئی مخصوص نظام حیات یا دین کے نظام تمدن کی اساس ملحدانہ یا مشرکانہ نظریات پر ہے انکے لئے کسی ایسی تحریک کا ساتھ دینے میں جسکی بنیاد بھی ملحدانہ یا مادہ پرستی پر قائم ہوں کوئی امر مانع نہیں ہو سکتا۔ مگر پاکستان یا مشرق کے دیگر اسلامی ممالک کے لئے اسلام کو قربان کئے بغیر کسی ایسے بلاک کے ساتھ جو نظریاتی طور پر مذہب اور اسکی اخلاقی اقدار کا نہ صرف مخالف ہی ہو بلکہ انہیں نوع انسانی کے لئے افیون سمجھتا ہو صرف محال ہی نہیں بلکہ غیر ... ایک ملحدانہ اور مادہ پرست تحریک مذہب اور خدا پرستی کے رجحانات کی بنیادوں کو جڑ سے اکھاڑنے کے لئے میدان عمل میں سرگرم عمل ہو تو پاکستان کے دیگر اسلامی ممالک کسی صورت میں بھی اس کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے۔ یہ نظریاتی اختلاف کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے۔ پاکستان اور ممالک کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ اینگلو امریکی بلاک کا ساتھ دیں۔ اس حقیقت سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں کہ مسیحی دنیا ہر حالت میں بہ نسبت ... کے اسلام کے قریب تر ہے اگر کمیونسٹ تحریک دنیا پر غالب آگئی تو اسلام تو ایک طرف کسی معمولی مذہبی تحریک کے لئے بھی اس دنیا میں پنپنے نہ ہوگی۔ اس میں شک نہیں کہ امریکہ کے ساتھ پاکستان کے فوجی معاہدے نے ہمیں اینگلو امریکن بلاک میں شامل کر کے علی الاعلان کمیونسٹ مد مقابل لا کھڑا کیا ہے۔ اور ہمارا یہ اعلانیہ الحاق بے شمار خطرات اور اندیشوں کا حامل بھی ہے مگر زندہ رہنے کے لئے خطرات اور اندیشوں کو مول ... ہے اگر ہم کمیونسٹ بلاک کیساتھ ملحق ہوتے تو یہ اندیشے اور خطرات اس سے کئی گناہ زیادہ ہوتے۔ دنیائے اسلام ہمیشہ باطل کی مشرکانہ اور ... سے برسر پیکار رہی ہے اور آج بھی دنیائے اسلام کو ثابت کرنا ہوگا کہ باطل کی مشرکانہ اور ملحدانہ قوتوں سے نبرد آزما ہونے میں وہ دوسری خدا ... سے کسی طرح پیچھے نہیں ہے بلکہ دوسری خدا پرست قوموں سے کہیں زیادہ دنیائے اسلام کا یہ فرض ہے کہ وہ آگے بڑھ کر ایک بے خدا ... کو دنیا پر چھا جانے سے روکے۔ یہی وجوہات ہیں جنکی بنا پر ہم پاکستان کے امریکہ کے ساتھ فوجی معاہدہ کا خیر مقدم کرتے ہیں اور عوام نے بھی کا پرجوش خیر مقدم کیا ہے۔

اس معاہدے کی کچھ مخالفت بھی ہوئی ہے۔ مخالفت زیادہ تر تین اطراف سے ہوئی ہے ایک تو کمیونسٹ گروپ کی طرف سے۔ دوسرے ... کی طرف سے اور تیسری پاکستان کی برسر اقتدار پارٹی کے اس مخالف گروپ کی طرف سے جو دور اندیش کم اور حصول اقتدار کی ہوس زیادہ ... جسے پاکستان سے زیادہ اپنے مفاد پیارے ہیں۔ کمیونسٹ گروپ کی مخالفت سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ اشتراکی روس کے ساتھ انکی ... کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اس معاہدے کی مخالفت کریں۔ مگر اس کے ساتھ ایمانداری کا تقاضا یہ بھی ہے کہ وہ اعلانیہ کمیونسٹ بنکر انکی حمایت ... اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اسکی مخالفت کرنا انکے مسلک کے شایان شان نہیں ہے۔

بھارت کی مخالفت بھی جائز ہو گی جو اس لئے پاکستان کو کمزور پا کر اس کے ایک ضروری حصے (کشمیر) پر غاصبانہ قبضہ جما رکھا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ ستان اتنا طاقتور ہو جائے کہ اسے جمعیت و ہتھیارے کشمیر کے اس پاکستانی علاقے سے دستبردار ہونا پڑے۔

حزب اختلاف کے وہ لوگ جو اس معاہدے کی مخالفت محض اس لئے کر رہے ہیں کہ برسر اقتدار پارٹی کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کے لئے ایک حربہ ہے۔ وہ پاکستان کے نادان دوست ہی نہیں بلکہ خود اپنی ذات کے بھی دشمن ہیں انہیں معلوم نہیں کہ قیادت میں رد و بدل کی جنگ ر حال میں ہوتی رہے گی اگر انہیں مستقبل میں یہ جنگ جیتنے کا موقع مل گیا تو ایک کمزور پاکستان کا اقتدار حاصل کرنے کی بجائے ایک طاقتور پاکستان کا تدار حاصل کرنا یقیناً بہت بہتر ہو گا۔ ہمیں اپنی خانگی اختلاف کی لڑائی میں ملک کی بین الاقوامی پوزیشن کو داؤ پر نہ لگانا چاہئے۔ بیرونی دنیا سے ہمارے ں کے تعلقات ملک کے خارجی تعلقات ہیں کسی ایک پارٹی کے تعلقات نہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو دیانتداری سے اس معاہدے میں کچھ رات اور اندیشے محسوس کرتے ہیں انکا اختلاف اس معاہدے سے نہیں بلکہ اس اندیشے سے ہے کہ کہیں یہ فوجی امداد ایسی پابندیوں کی حامل نہ ہو جن سے ملک کی آزادی اور سالمیت پر حرف آئے اور قدرتی طور پر ہمارے نئے نئے آزاد شدہ ملک کے سنجیدہ افراد کے لئے ایسے معاہدات کی وجہ سے ملک کی آزادی پر آنچ آ جانے کے اندیشے حق بجانب ہیں۔ مگر اب جبکہ یہ وضاحت کر دی گئی ہے کہ اس امداد کے ساتھ کوئی ایسی شرائط وابستہ نہیں ہیں جن سے ملک کی آزادی اور سالمیت کو معمولی سے خطرے کا بھی احتمال ہو تو ایسے اندیشے رفع ہو جانے چاہئیں۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ پاکستان کوئی پہلا ملک نہیں ہے جس نے ایسا معاہدہ کیا ہو کم و بیش دنیا کے چھوٹے بڑے بیسیوں آزاد و خود مختار ممالک ہیں جنہوں نے امریکہ کے ساتھ اس قسم کے معاہدے کئے ہیں۔ اور انکی شرائط بھی وہی ہیں جو ہماری ہیں اس لئے اگر امریکہ خلوص دل کے ساتھ چاہتا ہے کہ کمیونزم کو ساری دنیا پر پھیلنے سے روکنے کے لئے اسکا ساتھ دیا جائے تو ہمیں یہ زیب نہیں دیتا کہ اس کے خلوص پر بلا وجہ شبہ کریں۔ پھر ہمارے ملک کی آزادی اور سالمیت میں دخل انداز ہونے کی وہ یقین دہانیاں ہیں جو امریکہ کی طرف سے دلائی گئی ہیں جن پر فی الحال اعتبار نہ کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ہمیں اس امریکی امداد کی خوشی میں بالکل غافل ہو جانا چاہئے۔ ہمیں ہر وقت ہشیار رہنا ہو گا کہ کبھی ان وعدوں کی خلاف ورزی سے ملک کی آزادی اور سالمیت کو خطرہ پیدا نہ ہو۔ اس امداد سے ملک کو بے شمار فوائد حاصل ہو سکتے ہیں ملک کے دفاعی استحکامات کو مضبوط کیا جا سکتا ہے ملک کو صنعتی ترقی دی جا سکتی ہے عوام کی عام بدحالی اور بیروزگاری کو دور کیا جا سکتا ہے اور ملک میں عام خوشحالی پیدا کر کے عوام کو مطمئن کیا جا سکتا ہے مگر اس کا بہت کچھ دارو مدار برسر اقتدار طبقے کے طرز عمل پر ہے۔ اگر انہوں نے عقلمندی دور اندیشی اور دیانتداری سے اس امداد کو استعمال کیا تو ملک و قوم دونوں کے لئے فائدہ مند ہو گی۔ انکی ذرا سی غفلت اور نااہلی اور بددیانتی سے یہ امداد ملک کے لئے نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتی ہے جس کا عوام کے سنجیدہ طبقے کو ہر وقت خیال رکھنا ہو گا تاکہ برسر اقتدار طبقہ اس امداد کو غلط طریقے سے استعمال کرنے کی کوشش نہ کرے۔ اس امدادی معاہدے کی وجہ سے ہماری قیادت کے کندھوں پر جن ذمہ داریوں کا اضافہ ہوا ہے اگر اسے پوری طرح محسوس نہ کیا گیا تو اس امداد سے ملک کو وہ فائدہ نہ پہنچ سکے گا جسکی توقع کی جا رہی ہے۔

ایک خطرہ البتہ ایسا ہے جسکی طرف خاص طور پر عوام کو پوری توجہ دینے کی ضرورت ہے یہ خطرہ بڑا خطرناک قسم کا ہے اس خطرے سے بچنے کے لئے عوام کو بڑی جد و جہد کرنی پڑے گی۔ خطرہ یہ ہے کہ امریکہ کی اس فوجی امداد کے ساتھ ساتھ کہیں ملک میں 'امریکنیت' بھی درآمد ہونی شروع نہ ہو جائے۔ کچھ زیادہ خطرہ اس سے نہیں کہ ہمارے امریکن دوست اپنی 'امریکنیت' ہمارے ملک میں درآمد کرنے کے بڑے مشتاق ہیں۔ بلکہ سب سے بڑا خطرہ ہمیں ملک کے ان بے شمار پڑھے لکھے نوجوانوں سے ہے جو اس 'امریکنیت' کو اپنانے کے لئے ہمہ تن اشتیاق [illegible] ہیں جن کا عملی مظاہرہ 'انقلاب پوش نوجوانوں' کی صورت میں ہونا شروع ہو گیا ہے ہمارا خیال ہے کہ امریکہ سے فوجی امداد حاصل کر لینے میں اتنا خطرہ شاید نہیں ہے جتنا کہ مغربی تہذیب کے یہاں درآمد ہو کر مستقل اڈے جما لینے میں ہے اسلئے عوام کو چاہئے اس رجحان کی پوری شدت کیساتھ مذمت کریں

اور آرٹ کے نام پر کسی فحش اور حیا سوز تہذیب کو جو اسلام اور مشرقی معاشرت کے لئے زہر قاتل کی حیثیت رکھتی ہے یہاں فروغ دینا
ایک مریضانہ ہمارے وزرائے عظم اور گورنر تک کیوں نہ کرتے پھریں۔ اس معاملے میں ہمیں عہدوں اور رتبوں کا لحاظ کئے بغیر یہ واضح کر
جو اس قسم کی تہذیب کے دلدادہ ہیں وہ شوق سے امریکہ یا پیرس ہجرت کر کے جا سکتے ہیں انکے اس رجحان کو یہاں پنپنے نہ دیا جائیگا اس
کو پوری منظم جدوجہد کرنی ہوگی۔ آرٹ کی آڑ میں ملک میں بے حیائی اور فحاشی کو فروغ دینے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

اس کے علاوہ ایک اور بات بھی قابل غور ہے۔ گزشتہ چھ سال سے ہمارے راہنما اسلام کے نام کو بہت اچھالتے رہے ہم
ہر غریب پر اسلام کا نام انکا اوڑھنا بچھونا رہا ہے مگر انکی نجی زندگیوں سے اسلام کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔ قول و فعل کا تضاد ا
ہے جس کا حل دنیا کی بڑی سے بڑی مادی طاقت بھی نہیں بن سکتی عمل کے غیر اسلامی جامے پہن کر جب ہمارے لیڈر اسلام۔ اسلام
ہیں تو دشمن تو رہے ایک طرف ہمارے سنجیدہ دوست بھی ہماری اس بوالعجبی پر ہنسے بغیر نہیں رہ سکتے جب ہم ایک خدا
کے علمبردار بنکر ایک بے خدا تحریک کے مدمقابل کھڑے ہوئے ہیں تو ہمیں قول و فعل کے اس تضاد کو بھی دور کرنا ہوگا۔ ورنہ کمیونزم
کو قول و عمل کے اس تضاد کے ساتھ شکست دینے کی توقع رکھنا خام خیالی ہے۔ قول و فعل کا یہ تضاد خدا کے فضل سے صرف ہمارے
محدود نہیں ہے۔ ہمارا سارا معاشرہ اس مرض میں مبتلا ہے۔ ہمارے عوام۔ ہمارے خواص۔ ہمارے تاجر۔ ہمارے کارخانہ دار۔ ہمارے
صناع۔ ہمارے عمال۔ ہمارے امیر۔ ہمارے غریب۔ ہماری صحافت۔ ہمارا ادب۔ ہماری سیاست۔ ہماری زندگی میں معاشرت
جہاں یہ تضاد نمایاں طور پر مسلط نہیں ہے۔ نظریاتی کش مکش میں شریک ہونے سے پہلے ہمیں پوری زندگی میں اسلام کے ان نظریات
کو نافذ کرنا ہوگا جنکی ہم تبلیغ کرتے ہیں اور جنکے تحفظ کے لئے ہم اس کش مکش میں عملی طور پر شریک ہوئے ہیں۔

اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہماری غیر اسلامی قومی زندگی نے ہمارے معاشرہ میں عدم مساوات کی ایک وسیع خلیج حائل
ایک طرف خواص ہیں جنھیں اپنی امارت کے تحفظ اور عیش و عشرت کے سوا اور کوئی کام نہیں۔ دوسری طرف وہ غریب عوام ہیں جنھیں
حاصل کرنے کے لئے دن بھر در در کی ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں جنکی پیشانی کا پسینہ بہہ کر پاؤں تک آجانے کے بعد بھی پیٹ بھر روٹی اور
کپڑا نصیب نہیں ہوتا ایسے بھی ہیں جو دن بھر گلی کوچوں میں بھیک مانگتے پھرتے ہیں اور رات کو فٹ پاتھوں پر سو کر گزارہ کرتے ہیں
بھی ہیں جنھیں بھوک اور بیماری نے موت و زیست کے دوراہے پر کھڑا کر رکھا ہے۔ متوسط اور غریب طبقہ کے عوام مرد، عورتیں بچے
رسول اور قرآن کی حقانیت پر پورا پورا ایمان رکھتے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ اس پر بھی انکا پختہ ایمان ہے کہ ہمارا صاحب اقتدار امیر
طبقہ اسلام کے جذبہ اخوت و مساوات سے قطعاً عاری ہے گزشتہ چھ سالہ زندگی کے عملی تجربہ نے انہیں یقین دلا دیا ہے کہ ہمارے مترفہ
لوگ اپنے عیش و عشرت میں اس قدر غرق ہو چکے ہیں کہ انہیں اپنے مجبور اور لاچار غریب مسلمان بھائیوں کا قطعاً کوئی خیال نہیں۔ معاشی
زندگی میں اس غیر اسلامی عدم مساوات نے عوام کے دلوں میں امیر اور اہل منصب طبقہ کے خلاف ایک شدید نفرت و حقارت کا جذبہ پیدا
کے قوم کے اتحاد و یکجہتی کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور یہ جذبہ نفرت و حقارت دن بدن زندگی کی ہر مصیبت اور تکلیف کے ساتھ ساتھ
دلوں میں شدید گہرا اور تیز ہوتا جا رہا ہے دولت کے انباروں پر بیٹھ کر اسلامی اخوت۔ اسلامی مساوات۔ اسلامی عدل و انصاف
نعرے لگانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ مگر جب آپ اپنے بھوک سے بلکتے۔ بدن سے ننگے۔ تعلیم سے محروم۔ بجھی بجھی آنکھوں والے بچوں کو
سے دیکھ رہے ہوں اس وقت خدا اور رسول کو بھی یاد رکھنا بڑا صبر آزما ہوتا ہے۔ ہمارا اسلام اسلام کے بلند بانگ نعرے لگا
تقاضوں سے بے نیاز ہو کر نقاب پوش ناچوں جیسی تقاریب میں مدغم ہو کر غریب عوام کو نظر انداز کر دینا جس قدر اسلام کے
کر رہا ہے شاید کمیونزم براہ راست اس کا دسواں حصہ بھی سرانجام نہیں دے سکتا۔ اس تلخ حقیقت کو جس قدر جلد سمجھ لیا جائے

ں کا خطرہ اس قدر شدید نہیں جس قدر ہمارے عوام کی بدحالی بے اعتمادی اور بے دلی سے اندرونی خطرہ لاحق ہے۔ اگر ہم نے عوام کی بحالی
روزگاری کو دور نہ کیا تو امریکی امداد خواہ وہ کسی نوعیت کی ہو سود مند ثابت نہ ہوگی۔ ہمارے صاحب اختیار سیاستدانوں کو ٹھنڈے
ٹے دل سے سوچنا چاہیئے کہ اگر عوام خوشحال اور مطمئن نہ ہوئے تو پھر امریکہ سے آئے ہوئے ہوائی جہاز۔ توپیں اور بندوقیں کس کو
نے کے لئے استعمال ہونگی اور انہیں کون استعمال کریگا۔

O

یانی اور فحش ادب پر احتساب

اس دردناک حقیقت کا اعتراف تقریباً تقریباً ہر اہل فکر و نظر کو ہے کہ گذشتہ چھ سال سے بڑھتی ہوئی عریاں
نویسی اور فحش نگاری نے ملک کی ادبی فضا کو اس قدر مکدر کر دیا ہے اور ملک کے پڑھے لکھے نوجوان طبقہ کی اکثریت
بی ذوق کو اس قدر پست پراگندہ اور لذت پرست کر دیا ہے کہ وہ معیاری، تعمیری اور اخلاقی ادب کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کے روادار نہیں۔ اثاث وکوز
جنسی، اور نفسیاتی موضوعات کے پردے میں لاکھوں کتب و رسائل ہر مہینے چھپتے، فروخت ہوتے اور خریدے جاتے ہیں۔ کتب فروشوں کی دکانیں ایسی کتابوں
ں اور افسانوں سے اور اخبار فروشوں کے اسٹال ایسے ماہناموں اور ہفت روزوں سے بھرے ہوتے ہیں جو مخرب اخلاق اور عریاں ادب سے بھرپور ہیں۔
رت اس امر کی تھی کہ ملک کی ادبی فضا کو اس گندگی سے پاک کرنے کے لئے حکومت کوئی سخت اقدام کرے۔

چنانچہ انجمن ادبی رسائل پاکستان کو وجود میں لانے کے محرکات میں علاوہ اور مقاصد کے ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ عریانی اور فحش نگاری کے خلاف آواز
کر کے حکومت کی توجہ مخرب اخلاق ادب پر احتساب کی طرف مبذول کرائی جائے۔ یہی وجہ تھی کہ انجمن کو فلمی اور جنسی رسائل کی ممبری سے مبرا رکھا گیا تھا۔ اور اس
مقصد کی وضاحت انجمن کے افتتاحیہ اجلاس منعقدہ لاہور میں جناب حامد علی خاں صاحب مدیر الحمرا نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں جسے ہم اپنی کسی گذشتہ اشاعت
شائع کر چکے ہیں۔ بڑی خوش اسلوبی سے کر دی تھی۔ اور یہ امر باعث مسرت تھا کہ نظامت کراچی نے اپنی فرض شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے پہلی مرتبہ عریانی اور
نگاری کے انسداد کے لئے چند جرائد اور ناشران کتب کے خلاف مقدمات دائر کئے۔ مگر یہ بات بڑی ہی قابل افسوس ہے کہ بجائے اس کے کہ کراچی ایڈمنسٹریشن کے
حسن اقدام پر اس کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لئے اس کی پرزور تائید کی جاتی ہمارے بعض معاصر دانستہ یا نادانستہ طور پر اس احتساب کی مخالفت کر رہے ہیں اور عجیب
یب و غریب رنگ میں اس پر نکتہ چینی کر رہے ہیں۔ سب سے پہلے اور سب سے زیادہ قابل مذمت انجمن ادبی رسائل پاکستان کے چند ممتاز عہدیداروں کی یہ
ت ہے کہ انھوں نے انجمن ہذا کا ایک غیر آئینی[1] اور غیر نمائندہ اجلاس میں نظامت کراچی کے اس اقدام کے خلاف ریزولیوشن پاس کرا کر عریانی و فحاشی کی دانستہ حمایت
ہر انجمن کے سر پر باندھنے کی قبیح اور نازیبا حرکت کی۔ انجمن کے چند عہدیدار غالباً اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ غیر آئینی اجلاس میں غیر آئینی اکثریت کے بل بوتے
جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ حالانکہ انھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ خدا کے فضل سے انجمن اب ایک رجسٹرڈ باڈی ہے۔ اور مخصوص قواعد و ضوابط رکھتی ہے۔ جن کی خلاف ورزی
وہ نام نہاد اکثریت کے بل بوتے پر ہی کیوں نہ ہو۔ قانونی عدالت میں چیلنج کی جا سکتی ہے قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی تو کوئی بڑے سے بڑا عہدیدار بھی کر سکتا ہے اور
ن اکثریت کا بل بوتہ!

نظامت کراچی کے عریانی و فحش نگاری پر احتساب کے خلاف تین حلقوں سے آواز اٹھائی گئی ہے۔ ایک حلقہ ان معاصرین کا ہے جن کے خلاف مقدمات دائر
کئے گئے ہیں دوسرا حلقہ کمیونسٹ حضرات کا ہے۔ تیسرا حلقہ ان معاصرین کا ہے جو ادب کی پاکیزہ، تعمیری اور اخلاقی اقدار کے حامی بھی ہیں اور خود اپنے جرائد و رسائل کو

---

[1] راقم الحروف خود انجمن ہذا کا ایک عہدیدار (خازن) ہونے کی حیثیت سے اس اجلاس کے غیر آئینی اور غیر نمائندہ ہونے کا پورا ثبوت رکھتا ہے۔ اور انجمن کے
چند خود غرض عہدیداروں کی اس حرکت پر اظہار ندامت کرتا ہے۔ اگر ضرورت ہوئی تو انجمن کے ان عہدیداروں کی غیر آئینی اور من مانی کاروائیوں پر روشنی ڈالی
جائے گی۔

غرب اخلاق ادب کی اڑ لگنے سے پاک ہی رکھتے ہیں۔ مگر یا آزادی پا جذبی میں شک ہونے کی وجہ سے چپ۔ و یا وہ جذبہ ہمدردی کے تحت کچھ نہ کہا اور کم میں کچھ نہیں ہوئے یا رواداری کے غلط جذبے کے تحت "پاسبان اللہ اللہ یا برہمن رام رام" کے اصول کے قائل ہیں۔ اس لئے ان حضرات نے جس نہ ملال کے ساتھ کہا ہے وہ بڑی حد تک جری ہے۔

پہلے حلقے میں دو قسم کے افراد ہیں ایک وہ جو عریاں نویس اور فحش نگاری کو مستقل طور پر اپنا پیشہ بنا چکے ہیں اور یہی ان کا ذریعہ معاش بھی ہے کہ معاشرے کا اہل ذوق اس صنف ادب کی اچھی قیمت دیتا ہے اور جلدی دیتا ہے ان کے ادب پر احتساب گویا ان کے پیٹ پر احتساب ہے۔ اس احتجاج ایک فطری تقاضا ہے۔ یہ امر بات ہے کہ اگر یہ حضرات ذرا سنجیدگی سے سوچیں اور ادب پر کرم فرمائی کریں تو اپنی صلاحیتوں کو کسی اور معقول پیشے کی کے حلال روزی بھی کما سکتے ہیں۔ اس گروہ کے احتجاج کو نہ تو کوئی وزن دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسے درخور اعتنا سمجھنا چاہیئے

اس حلقے کا دوسرا گروہ ان ادبا اور مصنفین حضرات کا ہے جن کی ادبی شخصیت اور امانت نظر مسلم ہے۔ اور ان کی گذشتہ ادبی تخلیقات اس سے پاک اور پاکیزہ اور معیاری ادب کی علمبردار رہی ہیں۔ مگر جب انھوں نے دیکھا کہ ہماری ادبی مارکیٹ کے ذوق عریانی و لذت پسندی کی وجہ سے ان صحت مند ادبی نگارشوں کی قدر و قیمت نہیں رہی۔ تو انھوں نے بھی اپنی طعن قدامت پسندانہ روش کو نام نہاد "ترقی پسندانہ" جلا دینے کے لئے اور نگارشات کو جاذب نظر اور رنگین بنانے کے لئے قدرے عریانی کی چاشنی دینی ضروری سمجھی۔ حتیٰ کہ ادب کے ان بزرگ رہنماؤں کی پوزیشن بڑی ہی تا

دوسرا حلقہ ہمارے اشتراکیت کے علمبردار معاصرین کا ہے۔ یہ حلقہ اپنے مخصوص عقائد اور اقتضائے طبع اور اشتراکی تکنیک کی وجہ سے عریاں ادب ویسے ہی خلاف ہے۔ اس لئے اگر "افکار" کے بہاں تازہ کے قلمکار جناب عقیل احمد خاں صاحب یہ لکھیں کہ "عریانی اگر ادب میں اس طرح آئے کہ اس اور سماج کی تشریح غیر ممکن ہو تو قابل اعتراض نہیں"؛ تو حق بجانب ہیں کیونکہ اس سے ان کا مقصد حل ہوتا ہے۔ اگر معاصر امروز میں احتساب کے خلاف لکھے اور حرف حکایت میں اس احتساب کا مضحکہ اڑائے تو سمجھ لیجیئے وہ اپنے فرائض منصبی کو پوری دیانت داری سے ادا کر رہا ہے۔ کیونکہ یہ ان کی معا کمیونسٹ حضرات نے یہ محسوس کر لیا ہے کہ پاکستان کے مسلمانوں کی کٹر مذہبی ذہنیت اشتراکی نظریات کی تبلیغ کو براہ راست قبول نہیں کر سکتی منظریات کی حامل تحریک کی تبلیغ کے ردعمل کے طور پر پاکستان کے مسلمانوں میں اشتراکیت کے خلاف ایک شدید جذبہ نفرت و حقارت ابھرتا ہے۔ ا لئے اب اپنا تکنیک بدل لیا ہے۔ اب وہ پاکستان میں اشتراکی اصولوں کی تبلیغ براہ راست کرنے کی جرأت نہیں کرتے۔ اب انھوں نے سلبی پہلو اخ وہ ہر اس چیز کی حمایت یا مخالفت کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ جو اشتراکی دنیا کی حمایت یا مخالفت کر رہی ہو۔ وہ روس یا چین کی حمایت میں اب کھلا نہیں کرتے۔ بلکہ صرف امریکہ اور برطانیہ کی مخالفت میں ایڑی اور چوٹی کا ذاجب و نا واجب زور لگاتے اور ان کے خلاف جا و بے جا پروپیگنڈہ کر کرتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں۔ یہی دو ملک اشتراکیت کے پھیلنے اور پھلنے پھولنے میں بُری طرح حائل ہیں۔ اگر کوئی ملک امریکہ سے دوستانہ معا معاہدے خواہ اس ملک کو کتنا ہی بڑا فائدہ کیوں نہ حاصل ہوتا ہو۔ یہ ضرور اس کی مخالفت کریں گے اگر پاکستان امریکہ سے فوجی امداد حاصل کرکے اپنے د کر سکتا ہو۔ مگر ان کی بلا سے وہ ضرور اس کی مخالفت کریں گے۔ چونکہ ادب میں فحاشی اور عریانی سے عوام کا اخلاق بگڑتا ہے معاشرہ میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ علامات کسی ملک میں اشتراکیت کے نفوذ کے لئے زمین ہموار کرتی ہیں۔ اس لئے اصولاً وہ فحاشی و عریانی کی ہر رنگ میں گے۔ اس لئے ان حضرات کا ادب میں فحاشی اور عریانی کی حمایت اور اس پر احتساب کے خلاف احتجاج اشتراکی اصولوں کے عین مطابق ہے اسلئے حق بجا

تیسرے حلقے کا اس احتساب کے خلاف بغیر سوچے سمجھے کچھ لکھنا البتہ قابل افسوس بھی ہے اور قابل غور بھی۔ ان حضرات میں سے اکثر نے یہ دریافت حکومت کی احتسابی کارروائی کے خلاف کچھ لکھنے سے پہلے آپ نے ان مضامین یا اقتباسات کو جن پر احتساب کیا گیا ہے اپنی نظروں سے پڑھ کر محسوس کیا ہے قابل گرفت تھا۔ اور تاثر کی ترجمانی کرنا زیادتی تھی؟ تو جواب ملا کہ نہیں ہم نے تو محض اس اصول کے تحت لکھ دیا ہے کہ معمولی کلرکوں اور مجسٹریٹوں کو یہ حق نہیں ہونا چاہئے کہ عریاں یا غیر عریاں پر حکم بن کر بیٹھیں۔ ایک صاحب فرمانے لگے۔ امریکہ اور یورپ کے بے شمار عریاں اور فحش جرائد رسائل اور کتب ہزاروں

کراچی

ہے ہیں۔ ان پر کوئی احتساب نہیں کرتا۔ مگر قریب پاکستانی ادیبوں کو عریاں نویسی اور فحش نگاری کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ ایک صاحب فرماتے ہیں کہ چونکہ سارے
ج پر فحش پسندی چھائی ہوئی ہے۔ اس لئے صرف ادبی کتابوں اور رسائل پر قدغن لگا کر فحش نگاری کا استیصال نہیں ہوسکتا۔ ایک اور دوست ہیں جن کی
م پسندی اظہر من الشمس ہے۔ انہوں نے نہایت فلسفیانہ انداز میں فرمایا کہ چونکہ مختلف ادوار اور مختلف عہدوں میں ثقافتی اور اخلاقی اقدار کی قیمت اور اطلاقات
لتے رہتے ہیں۔ اس لئے فحش کے تعینات میں بھی فرق آتا رہتا ہے۔ اور جب یہ حضرت اسلامی نظریات اور اخلاقی اقدار کی عالم گیریت اور آفاقیت پر قلم اٹھاتے ہیں
بڑے بڑے جید اہل قلم حضرات کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ مگر ان کا فلسفہ اسلام کی عالم گیر اور آفاقی اخلاقی اقدار کو ادب میں عریانیت پر منطبق ہونے کی اجازت
ں دیتا۔

مندرجہ بالا دلائل کے معمولی سے تجزیہ پر ان کا بودا پن عیاں ہے۔ کسی کام کو جانچے بغیر اس کے کرنے والے پر یہ حکم لگانا کہ وہ اس کا اہل نہیں اور اسے یہ کام
ے کی اجازت نہیں دی جاسکتی بڑی ہی بودی سی دلیل ہے۔ ہاں اگر کسی کام کا پورا جائزہ لینے کے بعد یہ معلوم کر لیا جائے کہ اس میں یہ خامیاں رہ گئی ہیں یا یہ کام یہاں
ٹھیک طور پر نہیں ہوا۔ اس نقص سے کرنے والے کی نااہلی کا ثبوت ملتا ہے۔ تو یہ حکم لگا دینے کے لئے کہ اس کام کے کرنے والا اس کا اہل نہیں ہے کچھ جواز سمجھ میں آسکتا
۔ کاش وہ لوگ تھوڑی سی زحمت گوارا کر کے ان تحریروں کو جن پر کلرکوں اور مجسٹریٹوں نے احتساب کیا ہے پڑھ لیتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ کیسے کیسے مستند ادبا، اہل
ا اور خداوندان کاروان ہائے ادب کے دامن عریاں نویسی کے دھبوں سے آلودہ ہیں۔ حالات کا پورا جائزہ لئے بغیر محض اس لئے کہ کچھ بڑی بڑی ادبی شخصیتیں بھی زیر
ساب آگئی ہیں۔ یہ حکم لگانا کہ احتساب کنندہ حتروہ نااہل ہیں کچھ وزنی دلیل نہیں ہے۔ بعض معاصرین سے جو اس احتساب کے خلاف نا دانستہ طور پر پروپیگنڈہ میں
مصروف ہیں عرض کیا گیا کہ کیا آپ ان افسانوں یا تحریروں کو اپنے رسائل میں شائع کرنے کے لئے تیار ہیں تو وہ بغلیں جھانکنے لگے۔ آخر جس تحریر کو وہ اپنے جرائد میں
ئع کر کے اپنے قارئین کی تنقید کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس کے غیر عریاں ہونے کی حمایت کس بل بوتے پر کرتے ہیں۔

یہ دلیل کہ چونکہ امریکہ اور یورپ سے آئے ہوئے فحش عریاں لٹریچر پر احتساب نہیں ہوتا اس لئے پاکستان کے ادیبوں کی فحش نگاری بھی قابل مواخذہ قرار نہیں
ی جاسکتی۔ کوئی دلیل نہیں بلکہ عذر گناہ بدتر از گناہ ہے۔ کون کہتا ہے کہ باہر سے آئے ہوئے گندے اور مخرب اخلاق ادب پر محاسبہ نہ ہو۔ اس پر بھی ضرور کڑا
اسبہ ہونا چاہئے۔ مگر پہلے اپنے گھر کی صفائی تو ہو لینے دیجئے۔ اپنا گھر صاف ہو گا تو باہر کے دوستوں سے بھی کہا جا سکتا ہے۔ کہ ہمارے گھر کا ماحول بڑا صاف ستھرا اور
کیزہ ہے اور ہمارا ماحول ایسے گندے ادب اور لٹریچر کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ تو بات کہنے کی ہو گی اور معقول بھی ــــ جب اپنا گھر ہی طرح طرح کی آلودگیوں سے بھرا ہوا ہو
باہر کے دوستوں کو یہ کہنے پر کہ اپنا گندا مال لے جائیے یہی سننا پڑیگا۔ کہ اپنی آنکھ کا شہتیر بھی نظر نہیں آتا اور دوسروں کی آنکھ کے تنکے تک گوارا نہیں۔ صفائی
پہلے اپنے گھر سے ہی شروع ہوتی ہے۔ اپنا گھر صاف ہو گا تو غیر خود بخود شرمندہ ہو کر اپنا گندا مال اٹھا لے جائیں گے۔ پھر سماج میں فحش پسندی آخر چھائی کس وجہ
ہے۔ کیا فحش پسندی کے سماج پر چھائے جانے کی وجوہات میں سے ایک وجہ ادبی عریانی نہیں ہے۔ سماج کی فحش پسندی تو نتیجہ ہے چند ترغیبات کا جس میں
ے ایک ادبی عریانی بھی ہے پیدا شدہ نتائج کو مٹانے کے لئے ان ترغیبات کا قلع قمع کرنا ہو گا۔ جن سے وہ پیدا ہوئے ہیں۔ فحش پسندی تو سماج کے دل و دماغ کی کیفیت
نام ہے کیا عوام کو ڈنڈے مار مار کر ان کے دل و دماغ سے فحش پسندی کو نکالا جائے یا فحش پسندی کی کیفیت پیدا کرنے والی متعدد وجوہ میں سے ایک وجہ عریاں کتابوں
ور فحش ادب کو سماج سے ہٹا دیا جائے۔ صورت حال کی اصلاح کے لئے کونسا عمل مقدم ہے؟ جس وقت سمجھ دار انسانوں سے اس قسم کے دلائل سننے میں آتے ہیں تو بڑا
فسوس ہوتا ہے۔ ثقافتی اور اخلاقی اقدار کا مختلف ادوار میں بدلتے رہنے والا فلسفہ بھی کچھ وزن نہیں رکھتا۔ ہم جس اسلام پر ایمان رکھتے ہیں اسکے اخلاقی اقدار تو آج
سلام نے ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے متعین کر دئے ہوئے ہیں۔ ان کے بدلنے کا کہاں سوال پیدا ہوتا ہے۔ اسی کسوٹی پر جانچئے اور دیکھئے کون کون سی تحریر عریاں ہے
اور کونسی نہیں۔ جب زندگی کے ہر شعبے میں ہمارا کسوٹی اسلام ہی ہے تو پھر ادب کو اس سے مبرا کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ اسلام کی کونسی قسم ہے جس کے
تحت ہماری اخلاقی اقدار مختلف کسوٹیوں پر جانچی جائے گی۔ دراصل آج ہماری زندگی میں یکسانیت نہ ہونے کی وجہ ہی سے انتشار پھیلا ہوا ہے۔ کیونکہ ہم نے زندگی
کے مختلف شعبوں کے لئے مختلف کسوٹیاں بنا رکھی ہیں وحدت وجود کی قائل امت آج کئی وحدتوں میں بٹی ہوئی ہے۔

ہمارے [illegible] ادب کی تعمیری اور اخلاقی اقدار کے ساعی ہیں یہ ان کی شایانِ شان تھا کہ وہ دانستہ طور پر ایسے عظیم پروپیگنڈہ کا شکار [illegible] اصلاح [illegible] کی بنیادوں کو عریانی اور فحش نگاری کے گندے پانی سے سیراب کر کے اسے کھوکھلا کرنے میں مشغول ہے۔ عریاں ادب پر احتساب کے مدیر [illegible] کے لئے ضروری تھا کیونکہ وہ اس جرم میں جرمانہ کی سزا بھگت چکے ہیں۔ اگر مدیر جنسیات و نفسیات اس پر چراغ پا ہوں تو بات سمجھ میں [illegible] پہلے بھی جرمانہ کی سزا بھگت چکے ہیں۔ اور کچھ اور مقدمات میں ماخوذ ہیں۔ اور یہ اسی طرح انجمن ادبی رسائل پاکستان کے جنرل سکریٹری [illegible] صاحب [illegible] مدیر ساقی جنہیں اردو ادب کے تیس سالہ خادم ہونے کا شرف حاصل ہے اگر اس احتساب پر تلملا جائیں تو وہ بھی قابلِ رحم ہیں کیونکہ [illegible] دو دو مقدمات میں ماخوذ ہیں مگر ان معاصرین کو جو دیانتداری سے ادب کی اخلاقی اقدار کے قائل ہیں انھیں اس مزموم پروپیگنڈہ کا شکار ہونے سے پہلے اس کے سیاق و سباق پر غور کر لینا چاہیے تھا۔

شاہد احمد صاحب دہلوی مدیر ساقی کا ذکر خیر آگیا ہے۔ تو ضمناً یہ عرض کئے بغیر نہیں رہا جاتا کہ جنوری ۶۲ء کے مشیر میں راقم الحروف نے رسائل پاکستان کے اس احتساب کے خلاف ریزولیشن پاس کرنے پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا تو شاہد احمد صاحب کی رگ حمیت پھڑک اٹھی۔ انہوں نے ساقی ۶۲ء کے سالنامہ میں اپنے ایک حواری اسلم فرخی کے نام سے اپنے نام ایک کھلی چٹھی شائع کر دی جس میں یہ ظاہر کرنے کی ناکام کوشش فرمائی ہے کہ جن کا تعلق اردو ادب سے تیس سال سے ہے ان پر کوئی مقدمہ عریانی اور فحاشی کا نہیں دائر ہوا۔ اور یہ کہ "کتیاں" کے عنوان سے کوئی افسانہ [illegible] میں نہیں شائع ہوا۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ "کتیاں" کے عنوان سے ایک افسانہ اگر سالنامہ میں نہیں تو ان کے اکتوبر ۶۲ء کے شمارہ کے کتابی ایڈیشن پر شائع ہو چکا ہے اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اس افسانہ کی بنا پر اور ایک اور عریاں تحریر کی وجہ سے ان پر ایک نہیں دو مقدمے دائر ہو چکے ہیں۔ یہ کھلی چٹھی شائع کر کے کس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی تھی۔ اپنی یا اپنے قارئین کی ——— اب پھر حال ہی میں اسلم فرخی کے نام سے فروری ۶۳ء کے شمارہ میں انھوں نے خود اپنی قلم مبارک سے ادب میں فحاشی پر اظہار خیال فرمایا ہے۔ یہ ضروری تو نہیں کہ ہم ان کے اظہار کردہ خیالات سے پوری طرح متفق ہوں مگر ایک بات میں ہم ان سے سو فیصدی متفق ہیں یعنی یقیناً جماعت اسلامی کو ہمارے ادب پر احتساب کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ بھلا یہ [illegible] کے ضوابط ملا قسم کے لوگ قدیم اور جدید ادب کو جانچنے کی صلاحیت اور قابلیت کہاں رکھتے ہیں۔ بھلا جواہر پارے کہیں ایلوا [illegible] جاتے ہیں۔ کبھی نہیں شاہد صاحب ایسا کبھی نہ ہونے دیا جائے گا۔ اطمینان رکھئے۔ مگر ساتھ یہ بھی یاد رکھئے کہ ادب کے احتساب کی اجارہ داری میں طبلہ سارنگی داب کر اکسپریس پر کلب بجانے کی منڈلیاں منعقد کرنے والے ادیب نما قوالوں کو بھی نہیں دی جاسکتی۔ اس کا احتساب قانون کرے گی۔

ہم نظامت کراچی کو عموماً اور جناب منذر محمد صاحب فاروقی ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کراچی اور ان کے پریس برانچ کو خصوصاً مستحق سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اس ادبی غنڈہ گردی کو سماج کے اخلاقی ضوابط کا پابند کرنے کا تہیہ کر لیا ہے اور اردو ادب اور اظہار فحاشی اور عریانی کی حرکت بندش سے پرے بھی ایک بہت بڑا جہاد ہے جو معاشرے کی اصلاح کی خاطر وہ کر رہے ہیں۔ انھیں چند مفاد پرست افراد کے پروپیگنڈہ سے [illegible] چاہیئے۔ سماج کا سنجیدہ اور فہمیدہ طبقہ ان کے ساتھ ہے اور پوری طرح ان کے ساتھ ہے ؛

اسیرانِ مارشل لاء اور ہماری مسلم لیگی قیادت

پاکستان کی مختصر سی زندگی کے گزشتہ سات سالوں کا تو کوئی بھی سنجیدہ اور سمجھدار شہری ایسا نہ ہوگا جو یہاں کی [illegible] کے اس مختصر سے دورانِ حکومت میں اسکے کثیر التعداد کارہائے نمایاں سے نالاں اور اس کا شاکی نہ ہو۔ آج جبکہ ہماری یہ مسلم لیگی قیادت [illegible] اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے اپنا اعتماد کھو چکی ہے اور ملک کے نصف حصہ یعنی مشرقی پاکستان سے بھی طرح [illegible] [illegible] کی یاد تازہ کرکے اس کی شرمندگی اور احساس ندامت میں کچھ اور اضافہ کریں [illegible]

ورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہماری اس قیادت کی طویل فہرست میں سب سے بڑا گناہ اس کا عوامی مطالبات سے مجرمانہ چشم پوشی اور
جمہوریت کش پالیسی رہی ہے۔

عوامی مطالبات کی طویل فہرست میں جسے ہماری لیگی قیادت نے درخور اعتنا نہیں سمجھا ایک مطالبہ اسیران مارشل لاء کی غیر مشروط رہائی
ہے۔ یہ مطالبہ اتنا ہمہ گیر، غیر جانبدار اور معقولیت پر مبنی ہے کہ کوئی بھی جمہوریت پسند قیادت اسے رد نہیں کر سکتی۔ آئینی حدود کے اندر وہ کو
طریقہ رہ گیا ہے جس کے ذریعہ عوام کا یہ ہمہ گیر مطالبہ برسراقتدار گروہ تک نہ پہنچایا گیا ہو۔ عوام کا وہ کونسا طبقہ ہے جس نے اس مطالبہ کی
اور غیر مشروط حمایت نہ کی ہو بالکل اسی طرح وہ کونسا گروہ ہے جس نے اس عوامی مطالبہ کی مخالفت میں ذرا سی آواز بھی بلند کی ہو۔ اس مطالبہ
ی ہمہ گیر اور معقول ہونے میں ذرا سا شک و شبہ بھی نہیں ہو سکتا مگر پھر بھی ہماری لیگی قیادت کی رگِ جمہوریت میں معمولی سی جنبش بھی
ہوئی۔ تمام جمہوریت پسند اور متمدن ممالک کا یہ دستور اور قاعدہ ہے کہ امن و امان قائم کرنے کے لئے کبھی ہنگامی اور ناگزیر حالات کے تحت مارشل
شل لاء نافذ کرنا پڑے تو امن و امان کے بحال ہونے کے فوراً بعد مارشل لاء کو مع اسکے تمام مقتضیات کے ختم کر دیا جاتا ہے۔ مارشل لاء کے
دی ہوئی سزائیں منسوخ کر دی جاتی ہیں۔ ضبط شدہ جائیدادیں واپس کر دی جاتی ہیں اور تمام شہری حقوق بحال کر دیئے جاتے ہیں کیونکہ مارشل لاء
ت گیر نظام کا مقصد امن و امان بحال کرنا ہوتا ہے نہ کہ عوام سے انتقام لینا۔ مارشل لاء کے قوانین ملک کے عام عدل و انصاف کے قوانین
ت تر ہوتے ہیں جو مارشل لاء انتظامیہ ہنگامی حالات کے تحت خود مرتب کرتی ہے اور ان کی سزائیں بھی ملک کے عام قوانین سے سخت تر ہوتی
مارشل لاء میں اکثر سخت ترین سزائیں ان معمولی معمولی فروگزاشتوں کی بناء پر دی جاتی ہیں جو ملک کے عدل و انصاف کے عام قوانین
ت جرم ہی قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ اور حقیقت بھی اس کی شاہد ہے کہ گزشتہ سال لاہور میں مارشل لاء کے دوران میں معمولی معمولی فروگزاشتوں
ی ایسی سخت سزائیں دی گئی تھیں کہ عدل و انصاف کے عام قوانین کے تحت ان کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ پھر لاہور میں مارشل لاء
رنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی تھی کہ تحریک ختم نبوت کے نتیجے کے طور پر قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کرنے والوں میں سے اکثر حلقوں
ر آئینی اور متشددانہ رویہ اختیار کر کے شہر کے عام نظم و نسق کو تہہ و بالا کر دیا تھا جسے برقرار رکھنے یا بحال کرنے میں سول حکام ناکام ہو گئے تھے
ل لاء نافذ کرنے کا اصل جواز شہر کے عام نظم و نسق کا تہہ و بالا ہو جانا اور سول حکام کا اسے بحال کرنے میں ناکامی تھی نہ کہ "تحریک ختم نبوت" اور
دیانیوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ"۔ اگر تحریک ختم نبوت اور اس کا یہ مطالبہ "غیر آئینی اور متشددانہ صورت اختیار نہ کرتا تو ظاہر ہے کہ
ل لاء کے نفاذ کے لئے کوئی جواز نہ تھا۔ ختم نبوت کی تحریک اب بھی موجود ہے اور قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کے مطالبے سے عوام اب بھی دستبردار
ں ہوئے اور اس وقت تک دستبردار نہیں ہوں گے جب تک کہ اس کا کوئی صحیح اور تسلی بخش حل تلاش نہیں کر لیا جاتا۔ ان باتوں سے منطقی طور پر
نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ مارشل لاء کا نفاذ محض اس بحرانی صورت حال کو برقرار کرنا تھا یہ کوئی انتقامی کارروائی نہ تھی جس کے لوازمات نتائج اور
نیات کو آرڈیننسوں اور ایکٹوں کے ذریعہ مارشل لاء کے ختم ہونے کے بعد بھی قائم اور برقرار رکھا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ بین الاقوامی دستور
رواج کے مطابق مارشل لاء ختم کرنے کے ساتھ ساتھ اسکے تمام مقتضیات لوازمات اور نتائج کو بھی ختم کر دیا جاتا ہے۔ مگر ہماری تمام [illegible]
جیسے رو بہ زوال ہماری مسلم لیگی قیادت کا باوا آدم ہی نرالا ہے اس نے مارشل لاء کے اختتام پذیر ہونے پر اس کے تمام مقتضیات کو ختم کرنے کی
ے انڈمنٹی آرڈیننس کے ذریعہ نہ صرف انہیں بحال رکھا بلکہ مارشل لاء کے سزا یافتگان کے عام شہری اور آئینی حقوق سلب کر کے انہیں ملک کی
عدالتوں میں اپیلیں کرنے کے حق سے بھی محروم کر دیا۔ اس آرڈیننس کے غیر منصفانہ ہونے پر جو ملک گیر احتجاج ہوا وہ ہماری اس قیادت
آنکھیں کھولنے کے لئے کافی تھا جب انڈمنٹی آرڈیننس کو ایکٹ کی شکل دینے کے لئے پاکستان کی پارلیمنٹ کے گزشتہ اجلاس میں بل پیش
ملک کے گوشے گوشے سے اس بات کا مطالبہ کیا گیا کہ مارشل لاء کے سزا یافتگان کو اگر غیر مشروط طور پر رہا کرنے میں ہماری قیادت مذبذب تھی

ہے تو کم از کم انہیں اپیل کے حق سے محروم نہ کیا جائے۔ ملک کے متعدد اخبارات نے اس جائز مطالبہ کی تائید میں اداریئے لکھے۔ عوام نے جلسہ قرار دادیں پیش کیں۔ بار ایسوسی ایشنوں کی طرف سے اس سلسلے میں میمورنڈم بھیجے گئے لیکن سب بے سود۔ ہماری قیادت نے اپنا من مانا قانون پاس ملک کی عدالت عالیہ کا یہ حق تسلیم نہ کیا گیا کہ براہ راست ان سے اپیل کی جائے بلکہ صرف یہ ترمیم کردی گئی کہ اپیل عدلیہ کی بجائے انتظامیہ ہی اور کسی ایک جج سے مشورہ حاصل کرکے فیصلہ کرے۔ اس ترمیم کے ذریعہ اسیران مارشل لاء کو جس طرح اپیل کا حق دیا گیا ہے وہ انصاف کا منہ چڑا رہا ہے۔ اس سے یہ حقیقت نمایاں ہوگئی ہے کہ ہماری قیادت کھلے کھلے انصاف کا مقابلہ کرنے سے کتراتی ہے۔ کیونکہ جب اپیل عدالت عالیہ کی بجائے انتظامیہ کو بھیجی جائے اور اس عدالتی معاملہ میں فیصلہ کرنے کے اختیارات انتظامیہ کو حاصل ہوں۔ اور عدلیہ کی حیثیت محض مشیر کی ہو تو یہ انصاف کے نام کی ایک بدترین تضحیک بن جاتی ہے جو کسی متمدن، مہذب اور جمہوریت پسند ملک میں نظر نہیں آتی۔ یہ غیر معقول مثال قائم کرنے کے جواز میں اس وقت پیش کی گئی تھی وہ خود اس فعل سے بھی زیادہ غیر معقول ہے۔ کہا گیا تھا کہ اپیل کا حق دینے سے فوج کے وقار کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اصول تسلیم کر لیا جائے کہ اپیل کا حق دینے سے اقتدار کے وقار کو صدمہ پہنچتا ہے تو پھر سرے سے قانون میں اپیل کے حق کے لئے ہی کوئی جواز نہیں رہ ہائی کورٹ میں اپیل کرنے سے ماتحت عدالتوں کے وقار کو اور سپریم کورٹ میں اپیل کا حق دینے سے ہائی کورٹ کے وقار کو صدمہ پہنچتا ہے۔ جو میں فوج کے وقار کو صدمہ پہنچنے سے روکنے والے اس عذر نے فوج کے وقار کو جس قدر صدمہ پہنچایا ہے شاید اسیران مارشل لاء کو غیر مشروط رہا کر دینے یا انہیں ہائی کورٹ میں اپیل کا حق دینے سے اس قدر صدمہ نہ پہنچتا۔ ہماری فوج — جو ابھی تک عوام کے دلوں میں اپنا وقار اور بیٹھے ہوئے ہے —— کے ساتھ ہماری مسلم لیگی قیادت کا یہ سلوک ایک ایسے نادان دوست کے سلوک کے مترادف ہے جو اپنے گناہوں کو اپنے محسن سے ڈھانپنے کی کوشش کرے۔

گزشتہ سات سال ہماری لیگی قیادت جس طرح عوامی مطالبات کو نظر انداز کرکے رائے عامہ کی تحقیر و تذلیل کرتی رہی ہے یہ اور انتہائی افسوسناک مثال ہے۔ ہماری رائے میں عوام اسیران مارشل لاء کی غیر مشروط رہائی یا کم از کم انہیں براہ راست اعلیٰ عدالتوں کا حق دلوانے کے مطالبہ میں حق بجانب ہیں اور اس معقول مطالبہ کو رد کرنا جمہوریت کے اعلیٰ اصولوں کے سخت منافی ہے۔ اب جبکہ مسلم لیگی مسند اقتدار کے پائے جو ہیں اپنی سات سالہ بدعنوانیوں کے منطقی نتائج کے تصور سے تھرتھرا رہے ہیں بلکہ عملی طور پر ملک کے نصف حصہ کی یہ بساط الٹی بھی جا چکی ہے اور اپنی بے بسی پر ندامت کے آنسو بہا رہی ہے۔ ہمارے لیگی قائدین کو ٹھنڈے دل سے حالات کا اپنی گزشتہ بدعنوانیوں کی جس قدر جلدی ہوسکے تلافی کرنی چاہیئے۔ اسکی پہلی عملی صورت یہ ہے کہ اسیران مارشل لاء کو فوراً غیر مشروط طور پر اس عمل سے وہ اپنا بہت کچھ کھویا ہوا وقار بحال کرسکتی ہے ورنہ کم از کم اب جبکہ پاکستان اسمبلی کا اجلاس ہو رہا ہے اسے فوراً اسمبلی سے کرالینا چاہیئے جس سے ان اسیران کو براہ راست اعلیٰ عدالتوں میں اپیل کرنے کا حق مل جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہماری مسلم لیگی کو وہ ملک کا دستور جلد از جلد اسلامی اصولوں کے مطابق مرتب کرکے سارے ملک میں عام انتخابات کے لئے راستہ صاف کرے۔ اس کی مہم کو محض التوا میں ڈال کر بھی ہماری قیادت نے اپنے وقار کو جس قدر صدمہ پہنچایا ہے۔ اسکی تلافی کی واحد صورت صرف یہی ہے

عبدالغفور بیگ

۲۰ مارچ سنہ ۱۹۵۴ء

نعیم صدیقی

ادب اور فحاشی

جس طرح بچے ایک خاص عمر میں اپنے فضلات سے ، اور کبھی اپنے اعضائے لیں کر اور کبھی گندی باتیں کر کے حظ حاصل کرتے ہیں اسی طرح وہ ادیب جو نیت رکھتے ہیں اور تہذیب و اخلاق کے تقاضوں کو پوری طرح جذب نہیں وتے ، اپنی نگارشات میں اس مکروہ عنصر کو داخل کر کے ایک خاص حظ رتے ہیں جس پر عریانی یا فحاشی کا اطلاق ہوتا ہے ۔ یہ عجیب حال ہے کہ ن ادیبوں میں زعم یہ پایا جاتا ہے کہ وہ معاشرے کے ذہنی رہنما ہیں ۔ اور طرف اس طبقے کو جتنی بھرتی ملتی ہے بالعموم ایسے نفسیاتی مریضوں کے حلقے ہے جو فکر اور اخلاق کے لحاظ سے خود کبھی فطری اعتدال کی حالت پر نہیں ہوتے ن نفسیات پر عمر بھر میں ایک ثانیہ کے لئے قابو پا سکتے ہیں ۔ اس طرح کے نہ صرف عریانی و فحاشی کا عنصر ادب میں داخل کرتے ہوئے خود اس سے حظ کرتے اور اپنے گھٹیا مگر ناکام جذبات کی تسکین کا سامان کرتے ہیں بلکہ بیشتر ری طور پر اور ایک حد تک شعوری طور پر عوام کے ادنیٰ جذبات سے ناجائز ٹھا کر اپنے لئے شہرت اور مالی مفاد کی مارکیٹ پیدا کرتے ہیں ۔ جس محرک ۔ آپ دیکھتے ہیں کہ صابن تک کے اشتہار میں مشتہر ایک نہ ایک پیکر جمال کی ٹ پیدا کرنے والی تصویر کا ہونا ضروری قرار دیتا ہے اور جس مقصد کیلئے لے سرورق پر فلمی چہروں کی جلوہ فرمائی لازم ہو گئی ہے ، ٹھیک وہی محرک ر بہت سے ادیبوں کے ذہن میں اپنا اڈا جما لیتا ہے اور اس کے زیر اثر شاعر کی شاعری اور ایک افسانہ نگار کی کہانی قبول عام حاصل کرتی ہے ۔ ایسے زدہ ذہنیت رکھنے والے ادیب ایک طرف اپنی کمزوریوں پر قابو پانے کے ے ان کے بالکل بس میں چلے جاتے ہیں ۔ دوسری طرف عوام کو ان کی کمزوریوں پانے کی جدوجہد کرنے کے بجائے الٹا ان کی کمزوریوں سے ناجائز فائدہ تے ہیں ۔ ان کی حیثیت بالکل اس حلوائی اور اس کبابی کی سی ہے جو عوام کے چٹخارے کے لئے شوخ ذائقے اور تیز مسالے فراہم کرتا ہے ۔ لیکن عوام کی ں کو تباہ کر کے اپنے دام کھرے کرتا ہے ۔

حقیقت نگاری کی آڑ

اس طرح کے نفسیاتی مریض ادب میں فحاشی و عریانی کے عنصر کے لئے جگہ نکالتے ہوئے جو سند جواز سامنے لاتے ہیں وہ یہ دعویٰ ہے کہ اصلاح کے لئے حقیقت نگاری اور واقعیت بیانی ضروری ہے ۔ لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ اس طرح کی حقیقت نگاری اور واقعیت بیانی جو فحاشی و عریانی کی نوعیت رکھتی ہے اس سے خود حقیقت اور واقعیت کو بیان کرنے والوں کی کتنی ایک اصلاح ہوتی ہے ۔ اور اس نے عوام کے کردار کو بلند کرنے اور ان کی نفسیاتی بیماریوں کو دور کرنے میں کیا کرشمہ دکھایا ہے ۔ کیا حق یہ نہیں کہ فحش نگار اور عریاں نویس ادیب کی حقیقت نگاری اور واقعیت بیانی خود اس کے لئے بھی اور اس کے پڑھنے والوں کے لئے بھی ایک ایسے ذہنی استلذاذ کا موجب ہوتی ہے جو بگاڑ کو اور بڑھاتا ہے ۔ کیا دنیا بھر کا تجربہ اس پر گواہ نہیں ہے کہ جنسی معاملات میں اگر بڑی نیک نیتی سے اصلاح چاہنے والے کسی مذہبی واعظ نے بھی ذرا کھل کر بات کی ہے تو اس کا وعظ بھی الٹا موجب استلذاذ بن کر وجہ فساد ثابت ہوا ہے ؟ جنسی جذبہ اتنا زیادہ حساس جذبہ ہے کہ اس کے لئے کوئی مکالمہ ، کوئی منظر یا کوئی تصویر یا کوئی غیر محتاط بیان ایک مرتبہ وجہ تحریک ہو جائے تو پھر یہ ذہن پر اس طرح چھا جاتا ہے کہ فکر و شعور کی سنجیدہ قوتیں ٹھنڈے طریق سے اپنا وظیفہ انجام دینے کے قابل ہی نہیں رہتیں ۔ میں اپنی تائید میں ڈاکٹر الفریڈ سی کنزے (Alfred C. Kinsey) کو پیش کروں گا جس نے امریکہ کی پوری سوسائٹی کے جنسی بگاڑ کا جائزہ لینے کے بعد اپنی تفصیلی رپورٹ کتابی صورت میں شائع کی ہے اور اس میں بیان کیا ہے کہ جنسی بدکاریوں کو فروغ دینے میں بڑا حصہ ان کتابوں اور خطابات کا ہے جن کا مقصد درحقیقت ان کا سد باب تھا (کیونکہ وہ انداز بیان کی بے احتیاطی رکھتی تھیں)

ایک مغالطے کی تصحیح ۔ یہ بات بالاتر ہے کہ ایک ادیب یا شاعر اگر عورت کے جسم کی مکمل تصویر کشی کرے یا اپنے یا کسی افسانوی کردار کے جنسی استلذاذ کا سماں باندھ دے اور جس چیز کو اسلام میں زنا اور مبادیات زنا میں شمار کیا گیا

لے سکر [illegible] کے لئے واقعیت بیانی اور حقیقت نگاری سے سوسائٹی
پر کیا [illegible] اثر مرتب ہو سکتا ہے؟

پھر سوال یہ بھی ہے کہ کیا عام زندگی میں وہ حقیقت اور وہ واقعہ اس عریانی کے ساتھ پایا جاتا ہے جسے ادیب اپنی نگارشات میں عریانی کے ساتھ پیش کر رہا ہے جو چیز پردے کے پیچھے واقع ہو سکتی ہے اس کے لئے سوسائٹی نے عالم واقعہ میں اگر پردے کی ضرورت سمجھی ہے تو سوسائٹی اس کے بیان و اظہار میں بھی تو پردہ کا تقاضہ کرتی ہے۔ ہم حقیقت نگاروں سے دریافت کرتے ہیں کہ انسان نے جن حقیقی ضرورت کے لئے بیت الخلاء کی دیواریں کھڑی کر دی ہیں کیا ادیب کے لئے حقیقت نگاری کی [illegible] بنا پر یہ جائز ہوگا کہ اس حقیقی ضرورت کو امر واقعہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنی نگارشات میں جوں کا توں کھول کر رکھ دے۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ بہت سی حرکات ایسی ہیں جنہیں ہر فرد [illegible] کرتا ہے لیکن کوئی ان کو سر بازار نہیں کرتا۔ اسی طرح کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ بہت سے امور ایسے ہیں کہ وہ زندگی کا ایک لازمی تقاضہ ہوتے ہیں لیکن ان کو کوئی بھی کھلے کھلے الفاظ میں بیان کرنا پسند نہیں کرتا؟ پھر کیا یہ بھی واقعہ نہیں ہے کہ بہت سے خیالات و جذبات اور حسیات ایسے بھی نفسِ انسانی میں ہمہ وقت پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کا اظہار اور بیان ہمیشہ یا کم سے کم بالعموم شرافت اور انسانیت کی سطح سے فروتر سمجھا گیا ہے؟ پھر کیا یہ بھی واقعہ نہیں کہ بہت سے الفاظ ایسے ہیں کہ جن کو کوئی شریف اور مہذب لکھا پڑھا آدمی زبان پر بھی نہیں لاتا ۔۔۔؟

آخر کوئی چیز تو ہے جو ہر حقیقت اور ہر واقعہ کو جوں کا توں بیان کر دینے اور اس کے لئے ہر قسم کا انداز بیان اور ہر قسم کے الفاظ اختیار کر لینے میں مانع ہوتی ہے۔ اگر یہ چیز بجائے خود ایک حقیقت اور ایک واقعہ ہے تو حقیقت نگار اور واقعیت بیان ادیبوں کو اسے بھی تو اپنانا چاہئے۔ لیکن ہمارے فساد زدہ ذہن رکھنے والے ادیب اس فطری حقیقت اور اس اخلاقی واقعہ سے بے بہرہ ہیں؟

فطری حقیقت

آئیے! اب ہم اس چیز پر غور کریں کہ وہ فطری حقیقت کون سی ہے جو انسان کو بعض فطری ضروریات کے پورا کرنے کے لئے پس پردہ لے جاتی ہے وہ کون سی طاقت ہے جو زندگی کے بہت سے وظائف اور اس کے تقاضوں کو برسر عام بیان کرنے میں مانع ہوتی ہے؟ وہ کیا داعیہ ہے جو ہماری گفتگو کے دوران ہم [illegible] یہ چاہتا ہے کہ شریفانہ اور سنجیدہ مہذبانہ کلام کی حد سے نکل کر [illegible] ہیں اور اس سے آگے بازاری پن، فحش پن، یا عریانی کا میدان شروع ہو جاتا ہے؟

کہا جاتا ہے کہ یہ سوسائٹی کے محض رسم و رواج ہیں جو بعض [illegible] پیدا کر دیتے ہیں۔ لیکن سوچنا تو یہ ہے کہ خود سوسائٹی نے رسم و رواج، [illegible] اور آداب مجلس میں اولاً اس طرح کے تصورات کو داخل کرنے والی طا[illegible] داعیہ ہے؛ وہ فطرت انسانی کے اندر ہے یا باہر سے اس پر مسلط ہو گئی؟

ہمارا جواب یہ ہے کہ وہ طاقت اور وہ داعیہ فطرتِ انسانی [illegible] ہے۔ اور اسے ہم "حیا" کے نام سے جانتے ہیں۔ حیا ہی وہ عامل ہے جو [illegible] عین فطری اور جائز تقاضوں میں سے بعض کے لئے پردہ داری کو ضرور[illegible] ہے۔ اور نگارش اور کلام کے میدان میں سنجیدہ، شریفانہ اور مہذبا[illegible] عریاں نگاری اور فحش بیانی سے الگ کرنے کے لئے کسی نہ کسی مقام پر [illegible] ہے۔ نہ کوئی فرد کبھی حیا کے تقاضوں سے بالکل آزاد ہو سکتا ہے، نہ کو[illegible] معاشرہ اس کی مداخلتوں سے بالکل بے نیاز رہ سکتا ہے۔ فرق صرف [illegible] مختلف افراد اور معاشرے اس لکیر کو کچھ آگے یا پیچھے کھینچتے ہیں۔ یہ لکیر [illegible] سوسائٹی میں کہیں نہ کہیں ضرور کھنچی ہوئی ملتی ہے۔ چنانچہ ہر ملک کے [illegible] فحاشی و عریانی کے سد باب کے لئے قوانین موجود ہیں۔

جذبۂ حیا کی معاشرتی اہمیت

جذبۂ حیا درحقیقت قومی اخلاق کا اسا[illegible] کی اصل قوت اسی جذبہ سے بنتی ہے۔ کسی غلط حرکت، کسی بے حیا اقدا[illegible] لغو گوئی کے راستے میں یہی جذبۂ حیا ہے جو روک بنتا ہے۔ یہی ہے جو [illegible] تامل پیدا کرتا ہے، ٹھٹک پیدا کرتا ہے، احساس ذمہ داری کو [illegible] اخلاقی تقاضوں کا لحاظ پیدا کرتا ہے، سوسائٹی کی اعلیٰ قدروں کا احتر[illegible] یعنی "حیا" کا میدان عمل صرف جنسی تقاضوں کا دائرہ ہی نہیں بلکہ [illegible] زندگی میں اس کا دخل ہے۔ یہ نام ہے اس روک کا جو فطرتاً ہر انسان [illegible] ظلم اور تہذیب سے گری ہوئی حرکات کے لئے کسی نہ کسی درجے میں پا[illegible] چنانچہ اسلامی نظام فکر اسی لئے حیا کو ایمان کا ایک اہم شعبہ قرار دیتا ہے۔

اب اگر کچھ ادیب حقیقت نگاری اور واقعیت بیانی کے نا[illegible] عریانی کا عنصر ادب میں داخل کر رہے ہیں تو وہ صرف تنہا ادب ہی کے لئے اشد[illegible] بلکہ جذبۂ حیا کو کمزور کرنے کی وجہ سے پورے نظام اخلاق کے لئے تباہ کن [illegible] جب ادب میں فحاشی و عریانی آئے گی تو معاشرے کی اخلاقی قدریں کمز[illegible]

۔ اور عوام کا معیارِ اخلاق مجروح کرتا ہے
ش نگاری و عریاں بیانی کا مسئلہ ایک ادبی مسئلہ ہی نہیں بلکہ ایک
لہ ہے ۔ قوم کا ہر فرد خواہ وہ ادیب ہے کہ وہ اخلاق و عادت کے معیار کو
، اور جسے مزید بلند کرنے کے لئے محنت کی ضرورت ہے ، فحش
نے سے بچائے ۔

حیا

لیکن دنیا بھر کے فحش نگاروں اور عریاں نویسوں نے حیا کے تقاضوں کے خلاف ہمیشہ اپنا یہی پہلو پیش کیا ہے کہ فحاشی ہمارے اوپر صحیح نہیں ہے ، ہم تو اصلاح و تعمیر کے لئے یہ کام کر رہے ہیں ۔ اختلافات الگ ہے تو یہ جھک ہمارے مقابلے میں جو تصورِ حیا پیش کیا ہے وہی غلط ہے ۔ یہ لوگ حیا کو ایک قدامت کے نام سے بیان کرتے ، تقاضوں کو انسانی حیثیت دیگران سے فرار کا راستہ بتلاتے ہیں چنانچہ ے افسانے اور کتابیں لکھنے والے ترقی پسندوں ہی کا نہیں ، ت تک کا کہیں ہی ہے

ت تصورِ حیا کے فرق اور حیا کے تقاضوں کے اختلافات پر آ گئی ہے ۔ فیصلہ ہو نہیں سکتا جب تک کہ ایک مشترک و متفقہ معیار سامنے

تے ہیں کہ ہر سوسائٹی کی ایک اجتماعی فضا ہوتی ہے اور اس کا اجتماعی در بے کی تمیز اور سنجیدگی و بازاریت اور تہذیب و بدتمیزی اور شرافت رتا ہے اگر اور کوئی متفق علیہ معیار موجود نہ ہو تو اجتماعی احساس ہی معیار ہوتا ہے ۔ اس اجتماعی احساس کے لحاظ سے ہماری قوم بحیثیت مجموعی اور ” واقعیت بیانی “ پر راضی نہیں ہے جیسے گنتی کے چند لکھنے والے اس کے سرخیل رہے ہیں ، اور جن کے ذریعے وہ قومی مزاج کو حیا کے موجودہ معیار سے نیچے گرا دینے کے لئے ایک خطرناک پارٹ ادا کر رہے ہیں ۔

لیکن محض اپنی سوسائٹی کے احساس کا معیار ــ جبکہ خود سوسائٹی بھی معیاری حالت سے نیچے گر چکی ہے ــ ہمارے لئے آخری سند نہیں ہے ہمارے پاس آخری سند اسلامی نظامِ فکر ہے ــ ایک ملک جس کا دستور اسلامی فکر کی بنیادوں پر استوار کیا جا رہا ہے اور جس کے دستور ہی میں یہ بات طے کی جا رہی ہے کہ خود معاشرے کو اسلامی بنیادوں پر استوار کیا جائے گا ، اس میں خود اسلام ہی سب سے بڑا حج ہو سکتا ہے نہ پیش نظر رکھنے کا ۔

اور اسلام کا حال یہ ہے کہ وہ زنا کو اس کی ہر شکل میں ختم کرنے کے لئے مبادیاتِ زنا کو ، اور اس سے بھی آگے بڑھ کر محرکاتِ زنا کو ختم کرنا چاہتا ہے ، اور عصمتِ فکر و نظر کی فضا قائم کرنا چاہتا ہے اس لئے قطع نظر اس سے کہ کوئی تحریر یا نگارش اس کے لکھنے والے کے ذہن کے لحاظ سے کیسا ہی شاندار مقصد رکھتی ہو مگر وہ اپنے اندر ترغیبِ زنا یا تحریکِ زنا یا فکر و نظر کی عصمت کی خرابی کا کوئی پہلو بھی رکھتی ہو تو وہ فحاشی و عریانی میں داخل ہے ۔ ایسے قتیل سے بیلا ادب مالامال ہو گا وہ اسلامی نظامِ فکر کے لحاظ سے ایک جرم ہے !

جنسی معاملات و مسائل چونکہ زندگی کے مسائل ہیں اس لئے ان سے کوئی نظامِ زندگی بے نیاز نہیں رہ سکتا ۔ چنانچہ اسلام نے جنسی اور معاشرتی معاملات

دلیل کے طور پر تو نہیں ، لیکن بحث سے قریبی تعلق رکھنے کی وجہ اس امر واقعہ کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ خود برطانیہ جیسے جدید ترقی یافتہ جنسی معاملات ادبی اظہارِ خیال کے لحاظ سے پیش پیش ملک میں جرائد کی فحش تحریروں اور عریاں تصویروں کا تنازع زیرِ بحث ہے ۔ اکتوبر ، دسمبر ۱۹۵۳ء میں لندن کے [illegible] یہ بحث خوب گرم رہی ہے ۔ بحث کا آغاز اس سے ہوا کہ ایک طرف تو برطانیہ کی پولیس کونسل نے جرائد و اخبارات کی طرف سے عوام کے جنسی جذبے سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے یہ بتایا کہ ملک کی روش عوام کے اخلاق کے لئے تباہ کن ہے ۔ دوسری طرف جسٹس [illegible] SC [illegible] نے اس پر افسوس کیا ہے ۔ جو نامعقول قسم کی بیکاری اور خصوصاً طبقہ ذکور میں عدم شرافت کی اشاعت کا ثبوت دیتے ہیں ۔ اس پر جسٹس [illegible] خطاط کا ایک قابلِ قدر خطبہ اور مواد قابلِ مذمت ہے ، تیسری طرف ہوم سکریٹری نے فرمایا کہ اور گھریلو زندگی میں اخلاق و شرافت کے معیار کو بلند کرنے کی تحریک کی نہایت ضرورت ہے ۔

س بحث کے دوران میں [illegible] نے جرائد اور ادب کے فحش پہلو پر گفتگو کی ہے اور بری بداخلاقی و فحاشی کی مذمت کی ہے ۔ [illegible] گیا ہے ہم اس سلسلے کو اس مختصر سی [illegible] ختم کرتے ہیں ۔

کر دو چیز ہے لیکن ایسی احتیاط کے ساتھ کہ خود وہ احتیاط ان معاملات میں گفتگو کرنے کے لئے ایک ذریعۂ ہدایت بن گئی ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اور اپنے معاشرے میں آنحضرت صلعم نے روزمرہ کے جنسی اور معاشرتی مسائل میں اسلامی فلسفہ کو بھی بیان کیا ہے، اخلاقی ہدایات بھی بتائی ہیں۔ اور قانون کو بھی متعین کیا ہے لیکن لحاظ یہ رکھا ہے کہ بات ضرورت کی حد سے آگے نہ بڑھنے پائے۔ ایسے سیاق و سباق میں ہو اور مخاطب میں ایسے جذبات ابھار کر چھیڑی جائے کہ وہ اصل فائدہ اٹھانے کے بجائے الٹا غلط سمت میں بہک نہ جائے اور صراحت کے بجائے کنایہ و استعارہ سے کام لیا جائے یہ وہ اصول کلام ہیں جو جنسی بحثوں کے لئے شرافت اور سنجیدگی اور حیا کی حد مقرر کر دیتی ہیں۔ ان حدود سے آگے فحش گوئی اور عریاں نگاری کی سرزمین واقع ہے لیکن ہمارے حقیقت نگار حضرات اول تو خالص تفریح کے میدان میں کھڑے ہوتے ہیں پھر اس تفریح کی فضا میں جنسی امور کو ناگزیر ضرورت کی حد تک نہیں چھیڑتے بلکہ لذتیت انہیں دور دور تک گھماتی پھرتی ہے پھر کنایہ و استعارہ کی حدود میں وہ قلم کی جولانیوں کو محدود نہیں رکھ سکتے بلکہ صراحت و تفصیل کے آخری سرے تک پہنچتے ہیں ان حلقوں میں باہم دگر مسابقت ہی اسی پر ہوتی ہے کہ کون آخری سے آخری مقام چھو کر آتا ہے۔

اخلاق عامہ کے خلاف اعلان جنگ

لیکن ان چند حقیقت نگاروں کے بارے میں کیا کیا جائے جو اسلام کے تصور حیا کو قبول کرتے ہیں۔ نہ کم سے کم اس پر تیار ہیں کہ موجودہ سوسائٹی کے اجتماعی احساس ہی کو معیار فیصلہ تسلیم کریں۔ درحقیقت ان کے لئے صحیح راہ عمل خالص جمہوری نقطۂ نظر سے یہ ہے کہ پہلے یہ ملک کی اکثریت کے پسندیدہ دستوری تصورات اس کے قوانین و رسوم، اس کے مذہبی تصور حیا اور اس کی اخلاقی روایات کے خلاف اپنی فکر کو استدلال سے منظر عام پر لا کر رائے عام کو ہموار کریں اور پھر جب رائے عام ان کے دلائل سے مفتوح ہو جائے تو دستور، قانون، رسوم اور مذہبی تصورات سب کو بدل کر وہ حقیقت نگاری کے نام سے فحش نگاری کرتے رہیں لیکن جس چیز کو نہ ملک کا اجتماعی احساس پسند کرتا ہے۔ نہ جس کے لئے موجودہ قانون ہی تیار ہے اور نہ جسے اس ملک کی رائے عام آئندہ کے منصوبوں میں جذب ہے۔ اس چیز کو محض اظہار خیال کی آزادی کے ناجائز استعمال کے ذریعے مسلط کرنا گویا اخلاق عامہ کے خلاف اعلان جنگ۔ going war against public Morality)

اس کا واحد توڑ

ایک گروہ جب دستور، قانون، مذہب، اخ اجتماعی احساس سے بے نیاز ہو کر ایک خطرناک مہم کر بیٹھے جو ہر لحاظ سے اجتماعی فلاح و بہبود کے لئے ضرر رساں ہو تو پھر ہر سچے فرض ہو جاتا ہے کہ وہ جس جس میدان میں اس مہم کی مدافعت کر سکتا ہے کر۔ اہل قلم کا ایک گروہ فحش نگاری کر کے حیا کے تقاضوں کو کمزور کرتا ہے تو تمام حیا کا فرض ہو جاتا ہے کہ میدان ادب میں ایسے مریضانہ رجحانات کو شکست دی پوری قوت صرف کریں اور رائے عام کو ایسے فتنہ سے خبردار رکھیں۔ وہ عام شہ تعاون کرتے ہوئے قانون کو گندی نگارشات کے خلاف حرکت دلانے کیلئے اس مقصد کے لئے اسے مضبوط تر اور مکمل تر بنانے کے لئے بھی جد و جہد کریں

حساس اور شرافت پسند اسلامی مزاج رکھنے والے ادیبوں کا آج سے پہلے کئی گنا بڑھ گیا ہے کیونکہ اگر یہاں ایک اسلامی دستور کے تحت ایک معاشرہ کی تعمیر کی جاتی ہے تو اس کیلئے اولین مطلوب ایک پاکیزہ فکری دا ہے۔ ایک ایسا ماحول جس کی فطرت اپنے اندر اسلامی اخلاق کو نقصان پہن طرز فکر، ادب، فن اور اسالیب کو گوارا کرنے پر تیار نہ ہو۔

افسوسناک

ہمیں یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ کراچی کے ایڈمنسٹریشن مرتبہ عریانی و فحاشی کے انسداد کے لئے چند جرائد کیخلا دائر کئے ہیں لیکن اس اقدام پر ایڈمنسٹریشن کے ہاتھ مضبوط کرنے کے بجا انجمن ادبی رسائل پاکستان آڑے آگئی ہے۔ یہ واقعہ افسوسناک ہے۔ او افسوسناک اس وجہ سے ہے کہ اس انجمن کی مجلس عاملہ نے اپنے مقاصد حدود کو بالکل توڑتے ہوئے اپنے اجلاس منعقدہ ۲۷ دسمبر سنہ ۵۳ء آفس کراچی) میں مولانا عبدالمجید سالک[1] کی زیر صدارت ایک قرارداد

---

[1] اس اجلاس کی صدارت مولانا رازق الخیری مدیر عصمت کر رہے تھے۔ مولانا عبدالمجید سالک صاحب محض بلائے گئے تھے اس اجلاس میں کہ وہ ڈاکٹر صاحب کی جگہ ماہنامہ پنجابی لاہور کی نمائندگی کریں گے حالانکہ ماہنامہ پنجابی سرے سے انجمن ادبی رسائل کا قانونی ممبر ہی نہیں!

(مدیر ماہنامہ تشیر کراچی)

ی

ون کے عمل اور فہم ایک سطرح کی معاندانہ کر کے پاس کروائی جس میں کہا گیا
شن کے اس رویہ پر تشویش کا اظہار کیا گیا تھا کہ وہ فحش نگاری اور عریانی
م میں جرائد پر مقدمے چلائے ۔

یہ بھی کیا عجیب انجمن ہوگی جس کے اجلاس لاہور میں مدیر الحمراء نے خطبہ
لیہ میں تو یہ پالیسی بیان فرمائی کہ قوم کے نوجوانوں کو فحاشی و عریانی ہی کی
ی ترغیبات کے اغوا سے محفوظ رکھنے کی تدابیر اختیار کی جائیں اور اسی پالیسی
ے جن جرائد پر عریانی و فحاشی اور لغویات کی اشاعت کا ذرا سا بھی شبہ
ہیں رکنیت میں لینے سے انکار کر دیا گیا ، لیکن دوسری طرف یہی انجمن
و عریانی اور خرافات پیش کرنے والوں کے دفاع کی پوزیشن سنبھال رہی ہے
اس افسوسناک واقعہ کی طرف اشارہ کرنا اس لئے ضروری ہوا کہ
را بھی ان مقاصد کی وجہ سے جو سب کے متفق علیہ تھے اس انجمن کا رکن ہے
سکتا ہے کہ ریزولیوشن کے سلسلے میں کسی غلط فہمی کی وجہ سے ہمیں بھی اس
ہ داری میں شریک گردانا جائے ۔ ہم اس ریزولیوشن کے حق میں نہیں ہیں
اچھا ہو کہ انجمن اس ریزولیوشن سے ہاتھ اٹھالے اور اپنی سرگرمیاں
ر دو تک محدود رکھے ۔۔۔ !!

(بشکریہ چراغ راہ)

مشیر انکم ٹیکس سیلز ٹیکس اور حساب و کتاب

معنف : مرزا محمد امین بیگ

سارے پاکستان میں اپنی قسم کی سب سے پہلی اور لاجواب کتاب ہے اس کی ایک جلد ہر تاجر ہر کارخانہ دار اور ہر کمرشل اکاؤنٹنٹ کے پاس ضرور ہونی چاہئے کیونکہ یہ حساب و کتاب کو قانون انکم ٹیکس کی روشنی میں رکھنے کا طریقہ بتاتی ہے اور قانون انکم ٹیکس و سیلز ٹیکس کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے ۔ اخراجات قابل مجرائی اور ناقابل مجرائی کون سے ہیں انکم ٹیکس و سیلز ٹیکس کیا ہے اور کن حالات میں لگتا ہے اور قانونی طور پر آپ کن مراعات کے حقدار ہیں کن چیزوں پر پابندی اور ان پر عمل کرنے سے آپ کو کیا فائدہ اور کن کی روگردانی قانونی سزا اور جرمانہ کے تحت آتی ہے ۔ قانون شراکت داری کیا ہے فرم کی رجسٹریشن کیسے ہوتی ہے غرضیکہ اس کتاب کی موجودگی میں ہر تاجر ہر کارخانہ دار اور اکاؤنٹنٹ اپنے حساب کو تسلی بخش طریقہ پر محکمہ انکم ٹیکس میں خود پیش کر سکتا ہے اور پیروی کر سکتا ہے یہ کتاب مخلص اور مفید اکاؤنٹنٹ اور وکیل کا کام دیتی ہے ۔ قیمت ۔ مجلد چھ روپے

ملنے کا پتہ :- ماب انڈسٹریز ایبٹ روڈ ۔ سیالکوٹ شہر

ہضمی

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ جسم انسانی کی صحت کا دار و مدار زیادہ تر معدہ کے فعل ہضم کی درستی پر ہے ۔ بقول شاعر ؎

الٰہی زمن معدہ من مرنجان — دگر ہر چہ رنجید ، رنجید خواہ شد

یہ اکسیری دوا پیٹ کے درد ، قبض ، ضعف ہضم ، تخمہ ، متلی اور اپھارہ کے لئے بے حد مفید ہے ۔ سچی بھوک لگاتی ہے ۔ ہر گھر میں اس کا موجود رہنا رحمت ثابت ہوگا ۔

قیمت دو اونس شیشی ۔۔۔ ایک روپیہ آٹھ آنے



ملنے کا پتہ :- حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی نمبر ۱

عامی کرنالی

تحریک

گردوں سے گزر، چاند ستاروں سے گزر جا
منزل پہ پہنچ، راہ گزاروں سے گزر جا

تو روح ہے، عشرت کے مزاروں سے گزر جا
تو رفعتِ کونین ہو، غاروں سے گزر جا

وہ طور کے ان چند مناظر میں نہیں ہے
خاشاک سے، شعلوں سے، شراروں سے گزر جا

نغمہ نہ ہو مطرب کے اشاروں پہ نہ کر رقص
فریاد بن اور ساز کے تاروں سے گزر جا

بچتا ہے سوکھے ہوئے کانٹوں میں بھی اک رُخ
آسودہ و شاداب بہاروں سے گزر جا

اس شاہدِ مستور کا رجحان ہی کچھ اور
اب حسن و محبت کے اشاروں سے گزر جا

سیلاب کا رُخ کر کے بتوفیقِ عزائم
حالات کے بہتے ہوئے دھاروں سے گزر جا

پانی ہے تو دریا کے نشیبوں میں ٹھہرو
طوفاں ہے تو دریا کے کناروں سے گزر جا

ہونے دے اگر دور رہے وہ جلوہ گہِ ناز
اے دوست! فقط چند نظاروں سے گزر جا

اثر لکھنوی

منزل کا اعتبار بڑھاتے چلے چلو
کانٹے رہِ طلب سے ہٹاتے چلے چلو

ذرّوں کو آفتاب بناتے چلے چلو
دیدہ وری کی شان دکھاتے چلے چلو

ہر منظرِ حیات کو مانندِ صبحِ نَو!
اک پیکرِ جمیل بناتے چلے چلو

مانا نصیب سو گئے، بیدار تم تو ہو
سوتے ہوئے نصیب جگاتے چلے چلو

لغزش بھی ہو قدم کو، تو مستانہ وار ہو
اتنا تو کیفِ زیست بڑھاتے چلے چلو

دانشوروں میں کفر نہیں اسکے ماسوا
آپس کا اختلاف مٹاتے چلے چلو

کانٹوں کو روندتے ہوئے شعلوں سے کھیلتے
ہر ہر قدم پہ دھوم مچاتے چلے چلو

نیرنگِ ہست و بود فریبِ نظر سہی!
بے حد حسیں فریب ہے، کھاتے چلے چلو

زندانِ ماؤمن میں بہت رہ چکے اسیر
اب قید، ماؤمن کی اٹھاتے چلے چلو

مکر و دغا کے دام بچھاتے ہیں اور لوگ
تم پھول نیکیوں کے لٹاتے چلے چلو

تعمیرِ عصرِ نو کی تمہیں میں ہے اہلیت
قول و عمل سے اپنے جتاتے چلے چلو

ہے شرطِ احتیاط یہی خار ہو کہ گل
دامن کو غیرِ حق سے بچاتے چلے چلو

بجھتے ہوئے چراغ بھی ہیں کام کے اثرؔ
شمعیں نئی انھیں سے جلاتے چلے چلو

افسانہ

آرٹ؟

(تعارف و معذرت کے ساتھ)

سفر حیات کی طویل تاریخ میں پانچ سال کی حقیقت ہی کیا ہے۔ لیکن ایک فرد کی زندگی میں پانچ سال بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ہم امیدوں کے سہارے جیتے ہیں۔ مستقبل سے بہت کم مایوس ہوتے ہیں۔ جب ایک سپنا ٹوٹ جاتا ہے تو اس کی تلافی نئے سپنے تعمیر کر لیتے ہیں۔ جب ٹھوکر لگتی ہے ذہن کو دھچکا محسوس ہوتا ہے تو ماضی کے آئینے کو احتیاط سے نکالتے ہیں اس کے گرد و غبار کو دور کرتے ہیں اور مستقبل کی جھلکیاں اس میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں ــــ زندگی اسی طرح امیدوں اور آرزوؤں کے سہارے گزر جاتی ہے ــــ مگر ماضی کے بیش قیمت تجربوں سے کوئی عبرت حاصل نہیں کرتے ــــ

پانچ سال ــــ کوئی بڑی مدت نہیں، مگر اس ہر لمحہ تغیر پذیر دنیا میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں ــــ اب بھی کبھی کبھی وہ دن یاد آجاتے ہیں جب آج سے پانچ سال پہلے ہم دونوں ایک چھوٹے سے ہائی اسکول میں مدرس تھے عثمان ہیڈ ماسٹر تھا اور میں اسسٹنٹ ٹیچر ــــ!

عثمان مجھ سے کوئی دس برس بڑا ہوگا مگر عام طور پر اس کے تعلقات اپنے ماتحتوں سے مشفقانہ نہیں بلکہ دوستانہ تھے۔ اسکول کی فضا بڑی خوشگوار تھی اور اس کی بنیاد میں عثمان کی شخصیت کا بڑا دخل تھا۔ تمام معاملات نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ باہمی صلاح و مشورے سے طے ہوجاتے تھے۔ زندگی بڑے سکون سے گزر رہی تھی کہ ایک حادثہ ہوگیا ــــ اچانک ــــ غیر متوقع طور پر ــــ ملک تقسیم ہوگیا۔

تقسیم کے بعد سے لے کر آج تک ــــ جب انسانوں کے دل بدلے اور انسانوں پر کیا گزری ــــ ایک طویل داستان ہے۔ بہت کچھ بیت گئی اور بہت کچھ بیت رہی ہے ــــ اس المیہ کا میری کہانی سے صرف اتنا تعلق ہے کہ عثمان آج کل کراچی میں ایک سامان فروخت کرنے والی انگریزی فرم میں کلرک ہے اور میں ایک اسکول میں صبح ساڑھے آٹھ بجے سے شام کے چار بجے تک گھستا اور پڑھاتا رہتا ہوں ــــ

انسان فطرتاً ماضی پرست ہوتا ہے ہم ماضی سے کتنا ہی اپنا دامن بچا کر اس کی طرف سے منہ موڑ لیں، مگر وہ پھر بھی کبھی کبھی تمام خوشگوار و ناخوشگوار واقعات کا بھیس بدل کر ذہن کے کسی چور دروازے سے داخل ہو کر ہمارے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے ــــ "کہیئے مزاج تو اچھے ہیں" ــــ اور آپ یقین کریں کہ پھر تمام ناخوشگوار یادیں بھی خوشگوار معلوم ہونے لگتی ہیں۔

پانچ سال قبل ــــ کیسی گزرتی تھی ــــ یہ خوشگوار یادیں اب بھی کبھی کبھی ستاتی ہیں ــــ یہ پانچ سال کیسے گزرے، یہ نہ پوچھئے ــــ ایک دن کراچی کی گلی کوچوں کا چکر لگا لیجئے ــــ پھر یہ سوال آپ کے ذہن میں کبھی نہ ابھرے گا۔

یہاں آنے پر روزی حاصل کرنے میں ہمیں زیادہ دقت نہیں ہوئی اس زمانے میں ملازمتوں کا اتنا قحط نہیں تھا جتنا کہ آج کل ــــ! مگر مکان کے ملنے نے بہت دنوں تک گلی کوچوں کی خاک چھنوائی۔ آخر دو سال بعد میرے ایک دوست نے پگڑی دے کر ایک چھوٹا سا فلیٹ حاصل کر لیا۔ اور میں آج بھی اس کے ساتھ رہتا ہوں۔

عثمان ایک مدت تک کئی کیمپوں میں فٹ بال کی طرح لڑھکتا رہا جھونپڑیوں میں بڑی کس مپرسی کی زندگی گزاری۔ جگہ جگہ مارا مارا پھرا۔ آخر دو سال تک دوڑ دھوپ کے بعد ایک دوست کی سفارش سے بہار کالونی میں ایک نیم تعمیر شدہ کوارٹر حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس میں صرف ایک کمرہ اور ایک صحن ہے۔ بجلی اور روشنی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ــــ اور کرایہ ماہوار پچیس روپیہ!

ابتدا میں ہماری ملاقات ہر دوسرے تیسرے دن ہو جاتی تھی مگر بعد میں ہم اپنی ذاتی الجھنوں میں کچھ اس قدر پھنستے چلے گئے کہ اب تو کئی کئی ماہ گزر جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی خیریت معلوم نہیں ہوتی۔

کل ایک عجیب واقعہ پیش آیا ــــ

کوئی ساڑھے تین بجے کا عمل ہوگا۔ [illegible]

ں ہے۔ میں چار بجے سے پہلے ہی فارغ ہو جانا چاہتا تھا کہ اطلاع ملی
باہر میرے منتظر ہیں۔ اتنے تنگ وقت میں جب کہ آفس بند ہونے میں
نٹ باقی ہوں کسی ملاقاتی کا آنا بہت کھلتا ہے۔ بڑی کوفت ہوئی
چتا ہوا اٹھا کہ اللہ کے بندے کو آنا ہی تھا تو آدھ گھنٹے بعد آتا۔ جب
ام سے فارغ ہو جاتا۔ باہر آ کر دیکھا تو "ماسٹر عثمان ——!
یں حیرت زدہ رہ گیا آپ یقین کریں کہ میں نے عثمان کو کبھی ایسی حالت
ھا تھا۔ بلکہ میں تو اسے دیکھ کر رشک کیا کرتا تھا کہ ایک یہ بھی گوشت و
ہوا انسان ہے گلی گلی کی خاک چھانی —— جھونپڑی جھونپڑی مارا مارا
ں کی بیماری میں بے حد مقروض ہو گیا مگر کبھی پیشانی پر بل نہ آیا۔
—— بال پریشان تھے۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی آنکھوں سے بےبسی کی پیاس
چکن کے بٹن کھلے ہوئے تھے وہ انتہائی پریشان اور حواس باختہ
ے کھڑا تھا۔ میں ابھی کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ اس نے رازدارانہ انداز

تہارا آفس کب بند ہوتا ہے؟"
بوں ——؟ خیریت تو ہے؟ —— چار بجے —— آخر بات کیا
ے گھبراتے ہوئے جو دریافت کیا۔
یں وکٹوریہ ہوٹل میں تمہارا انتظار کرتا ہوں —— آفس ختم ہوتے
پاس آؤ ——" پھر اس کے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آئی ——
خیریت ہے ——! یہ کہتے ہوئے وہ سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا
ب مجھ سے کیا خاک کام ہو سکتا تھا۔ دماغ پر ایک بوجھ رکھا ہوا تھا ——
اللہ کے بندے نے کیا کر ڈالا ہے ویسے عثمان سے کسی ناشائستہ حرکت کی
نہیں سکتی تھی جو شخص چھوٹی موٹی رقم دے کر مکان حاصل کرنے کو بھی غیر
سمجھتا ہو۔ وہ کب قانون شکنی کی جرأت کر سکتا ہے مگر اس کی موجودہ
میرے لئے پریشان کن تھی —— اور پھر یہ کراچی ہے۔ یہاں کوئی
رسان حال نہیں۔ نہ معلوم کب کون سی مصیبت نازل ہو جائے۔
چار بجتے ہی میں نے وکٹوریہ ہوٹل کا رخ کیا۔ وہاں دوسرا ہی منظر نظر
ی حیران کن —— عثمان صاحب ایک کرسی پر نہایت اطمینان سے
بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ جناب ایک پیالی چائے چڑھا چکے تھے اب دوسری
ہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے چائے لانے کا آرڈر دیا۔ میں نے سوچا کہ
اس شخص کا دماغ تو نہیں چل گیا

"عجیب بہروپیا ہو یار تم! میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا "خواہ مخواہ
ڈرا دیا —— یہ کیا صورت بنائی ہے —— میں سمجھا کہ نہ معلوم تم پر
کون سی مصیبت ٹوٹ پڑی ہے —— اور جناب —— نہایت فرصت
سے بیٹھے چائے اڑا رہے ہیں......"

"بھئی —— بات یہ ہے ——" وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگا ——
"مصیبت تو ہے —— اور سخت مصیبت ہے —— مگر پھر کیا کریں ——
کیا ہنسیں بھی نہیں ——؟ ارے میاں —— یہ ہمارا ہی دل گردہ ہے کہ
پانچ برس کراچی میں کاٹ کر بھی مسکراتے ہیں ——" وہ ہنسنے لگا

"آخر قصہ کیا ہے ——؟ تمہیں میں نے ایسا پریشان کبھی نہیں
دیکھا ——"

"قصہ وصہ کیا ہوتا —— کچھ بھی نہیں —— اچھا تم چائے پیو ——
باتیں تو ہوتی رہیں گی ——!"

"دیکھو عثمان ——!" میں نے سنجیدگی سے کہا —— "تمہیں مجھ سے
تکلف کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم ایک دوسرے کی حالت سے خوب واقف ہیں
آخر معلوم تو ہو کہ بات کیا ہے؟"

"معلوم نہیں تم کیا سمجھ رہے ہو؟" اس نے ہنستے ہوئے کہا "کوئی
خاص بات نہیں —— میں تو تم سے صرف مشورہ کرنا چاہتا ہوں ——!"

"کس سلسلے میں ——؟"

"کل ایک صاحب سے میری لڑائی ہو گئی ہے۔!" وہ مسکرانے لگا

"واقعی ——؟ یا مذاق کر رہے ہو ——؟" میں بھی ہنسنے لگا

"بھئی دیکھو —— اب میری عمر چالیس کے لگ بھگ ہے ——"
وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگا —— "اور لوگ اب بھی چیلنج دیتے ہیں —— یہ عمر
بھی کوئی لڑنے بھڑنے کی ہے ——؟ ایک زمانہ ہوا —— اور تم تو واقف ہو
کہ بچپن میں مجھے کشتی کا بے حد شوق تھا۔ ایک مدت گزر گئی اب تو میں لڑائی جھگڑے
سے کوسوں دور بھاگتا ہوں —— اور جب پختہ عمر کے لوگوں کو لڑتے جھگڑتے
دیکھتا ہوں تو حیرت بھی ہوتی ہے اور ایک طرح کی شرم بھی محسوس ہوتی ہے کہ یہ
لوگ کیسے لڑ لیتے ہیں ——!" وہ چائے پینے لگا

"خیر یہ سب تو ہوا ——!" میں نے پوچھا "مگر یہ قصہ کیا ہے؟"

"تم مجھے کیا جانتے ہو ——؟" اس نے چائے کی پیالی رکھتے ہوئے
[illegible] سے پوچھا۔
"کون ہے ——؟"
"وہی —— جو کسی زمانے میں اپنے ہاں انسپکٹر تھا اب سنا ہے کہ یہاں
کا سپرنٹنڈنٹ ہو گیا ہے ——"
"ہاں ——! جانتا ہوں اور شاید وہ بھی پہچان لے —— عرصہ ہو گیا
اور یہاں تو کبھی ملاقات ہی نہیں ہوئی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا
"ہاں ٹھیک ہے ——؟" وہ ہنستے ہوئے کہنے لگا —— "میں بھی
پولیس والوں کی دوستی کا قائل نہیں ہوں —— مگر کیا کیا جائے مجبوری ہے!"
"آخر بات کیا ہے ——؟"
وہ مزے لے کر چائے پی رہا تھا۔ اب نہ وہ پریشانی تھی نہ سراسیمگی
اطمینان سے بیٹھا باتیں بنا رہا تھا۔
"بات یہ ہے —— تم نے میرا مکان تو دیکھا ہی ہے۔ ہمارے پڑوس
میں ایک پنجابی صاحب رہتے تھے۔ نہایت شریف اور نیک آدمی تھے۔ تم تو ان
سے مل چکے ہو۔ ہمارا ان کا بڑا بھائی چارہ تھا۔ بڑی اچھی زندگی گزر رہی تھی اچھے
پڑوس سے تو انسان کی عمر بڑھ جاتی ہے۔ انھوں نے ناظم آباد میں مکان بنوا لیا ہے
اب وہ وہاں چلے گئے ہیں۔ ان کے مکان میں ایک نئے صاحب تشریف لائے ہیں۔
خدا ان سے بچائے —— سارے ہمسایوں کی زندگی عذاب میں ڈال رکھی ہے
عجیب آدمی ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ پہلے دن تو سب سے بڑی خندہ پیشانی سے
ملا۔ بے تکلف ہونے کی کوشش کی مگر چند ہی دنوں بعد رنگ ڈھنگ ظاہر ہونے
لگے۔ ادھیڑ عمر کا آدمی ہے قمر الدین نام بتاتا ہے۔ دلی کے اطراف کا رہنے والا ہے
امپورٹ ایکسپورٹ کا بورڈ بھی مکان میں لگا رکھا ہے۔ گھر میں بیوی اور دو جوان
لڑکیاں ہیں —— مگر مجھے تو سب فراڈ نظر آتا ہے —— تم ہی سوچو ——
کیا کوئی ماں اپنی لڑکیوں کو یوں خطاب کر سکتی ہے —— "اری او زہرہ —— وہ
آ کر کب سے بیٹھے ہیں نا —— اور ابھی تیرا سنگار بھی نہیں ہوا —— اری گلشن!
تیری گھڑی تو نکالنا ——؟ رات بھر طبلہ ٹھنکتا ہے —— ہارمونیم بجتا ہے،
گانا ہوتا ہے —— ہنسی —— ٹھٹھول —— قہقہے —— بس ایک قیامت ہو
تو بتایا جاتا ہے کہ کل ہمارے پڑوس میں —— راتوں کی نیند حرام کر دی ہے
[illegible] —— اور بھی لوگ ہیں۔ دو دو تین تین سال سے رہتے

ہیں۔ یہ تماشہ کبھی نہیں دیکھا۔ ہر گھر میں بہو بیٹیاں ہیں —— آخر یہ
برداشت کیا جائے؟ —— دوسرے تیسرے دن کوئی
ٹیکسی لے کر آ جاتے ہیں اور صاحبزادیاں بن سنور کر بھڑکیلے لباس میں رنگ
لگائے ہوئے سیر کرنے جاتی ہیں۔ کبھی چند نیوی کے نوجوان آ جاتے ہیں۔
ہمارے ہی محلے کے کچھ شہدے اور بدمعاش جمع ہو جاتے ہیں اور گانا بجانا
جاتا ہے۔
آخر تنگ آ کر ایک مرتبہ میں نے ہمت کر کے اس سے گفتگو کی
وہ ایک دم بپھر گیا —— "صاحب —— یہ میرا مکان ہے۔
میں اس کا کرایہ دیتا ہوں —— میری لڑکیاں گانا سیکھتی ہیں
سیکھتی ہیں —— یہ آرٹ ہے، رقص و سرود —— فنون لطیفہ
پاکستان کی اسلامی ثقافت کا اہم جزو ہیں —— آپ دخل دینے
ہوتے ہیں —— پاکستان میں ملاؤں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔
لڑکیاں اپوا کی رکن ہیں —— بے پردہ پھرتی ہیں —— تو آپ کیوں
میرے ہاں میرے دوست احباب آ کر بیٹھتے ہیں —— محفل رقص
گرم ہوتی ہے —— آپ کو کیا حق پہنچتا ہے کہ میرے خانگی معاملات
دخل اندازی کریں —— اگر آپ کو ناگوار گزرتا ہے تو آپ جائیں
آسمانی جنت میں —— ہم تو اپنی جنت یہیں بنائیں گے ——
میں ہی بنائیں گے۔"
اب تم ہی بتاؤ نیاز ——! میں اس کا کیا جواب دیتا ——
دوسرے پڑوسیوں سے مشورہ کیا۔ سب کی رائے سے ایک رپورٹ پولیس
گئی مگر اس نے حلقے کے انسپکٹر اور سپاہیوں کو ملا رکھا ہے۔ وہ خود
شریک بزم ہوتے ہیں۔ نتیجہ کچھ نہ نکلا —— آخرکار ہم لوگوں نے مالک
شکایت کی مگر اس نے بھی معذوری ظاہر کر دی —— "آج کل حکومت
ایسے ہیں کہ کسی کو بھی اس کے مکان سے نہیں نکالا جا سکتا ہے ——!"
اس نے محلے کے چند لوگوں کو بھی ملا رکھا ہے وہ ٹھیکیدار جو
میونسپل کمشنر بھی بن گیا ہے اس کا بڑا طرفدار ہے اس کی لڑکیوں کے
کا بڑا مداح ہے۔ دونوں وقت ان کے گھر کے چکر کاٹا کرتا ہے۔
آج کل تو وہ اور تو دوسرا ہو گیا ہے۔ کسی کو تعلق ہی نہیں
کی لڑکیاں تو راہ گیروں پر فقرے چست کرتی ہیں۔ وہ صاحب [illegible]

ی

ہے ان لوگوں نے ——— آخر تم ہی بتاؤ میں کیا کرتا؟"

اس نے اور چائے کا آرڈر دیا۔ سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے کہنے

—

دکل شام مغرب سے پہلے ہی کا تماشہ شروع ہو گیا۔ وہ دونوں تیوری والے
ئے تھے۔ والدہ کی تمادہ نہ ہو سکی۔ آخر غصے میں آ کر انھوں نے دروازے پر
سخت باتیں کہہ ڈالیں۔ بس پھر غضب ہو گیا۔ وہ دلال جسے قمرالدین
ی بتاتا ہے۔ گالیاں دیتی ہوئی والدہ سے لڑنے ہمارے دروازے پر آ
لڑکیاں بھی آستینیں چڑھا کر نکل آئیں ——— ہم خون پی جائیں گے ———
اے تم نے ہمیں ——— کوئی ایسے ویسے ہیں ——— ہم اونچا کی رکن ہیں ———
دوں کی محفلوں میں شریک ہوتی ہیں ——— ہم آرٹسٹ ہیں ——— فلاں فلاں
ہمارے عزیز ہیں ——— وہ گالیاں دے رہی تھیں ——— خرافات بک رہی
ہمارے گھر کی عورتوں نے ایسے ہنگامے کب دیکھے تھے وہ دروازہ بند
ڈے رہیں...... میں جب آٹھ بجے گھر واپس آیا تو والدہ نے سارا قصہ سنایا
ں ——— عثمان! اب تم کوئی دوسرا مکان تلاش کرو ——— اب یہاں
دں کا گزارہ نہیں ہو سکتا ——— اتنے میں باہر سے قمرالدین نے مجھے پکارا
روکتی رہیں۔ مگر میں باہر نکل آیا ——— یقین کرو نیاز ——— میں قطعی
بگڑنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ذرا اتنی جلدی مجھے غصہ آتا ہے۔ میں چاہتا
سمجھا بجھا کر معاملہ رفع دفع کر دیا جائے ——— میں باہر نکلا ——— قمرالدین
دیکھتے ہی کہا ——— ابے وہاں کیا تنخے جیسا پردے سے لگا کھڑا ہے ———
ئے اتر ——— !"

بس ایک آگ ہی تو لگ گئی۔ پھر کیا ہوا کچھ نہ پوچھو۔ تم نے قمرالدین کو
دیکھا ——— ؟ ——— کافی لحیم شحیم آدمی ہے ——— میں نے سیڑھیوں سے
ہی ایک زوردار چانٹا رسید کیا۔ ایک لمحے کے لئے حضرت کو تارے دکھائی
گئے۔ لیکن وہ فوراً مجھ سے لپٹ پڑا۔ میں نے جو زور سے دھکا دیا تو حضرت
کی سیڑھیوں پر جا کر گرے۔ وہ دیکھنے میں کا ہٹا کٹا ہے ——— اور بھئی!
یہ عقیدہ ہے کہ لڑنے جھگڑنے کے لئے بھی کسی اخلاقی جواز کی ضرورت ہے۔ اگر
پر ہو تو یہی چیز تم میں جرأت اور طاقت پیدا کر دیتی ہے وہ سیڑھیوں سے
پھر میری طرف جھپٹا ——— ایک شور مچ گیا۔ لوگ گھروں سے نکل آئے وہ
ں تیوری والے بھی باہر نکلے۔ عورتیں بھی چیخ و پکار کرنے لگیں۔ میں نہیں

جانتا کہ پھر کیا کیا ہوا۔ لیکن یہ آوازیں میں نے ضرور سنیں۔ کوئی چلا رہا تھا ———
"...... پستول کہاں ہے؟ پستول کہاں ہے؟" ——— خدا ہی خود آ رہا تھا۔ ایکا یک
میں نے قمرالدین کو کنارے کی موری میں دے مارا ——— ایک تیوری والا پستول
لئے ہوئے آگے بڑھا ——— "شوٹ کر دوں گا ———!" مگر مجھ پر تو اس وقت
جنون سوار تھا میں نے جھپٹ کر اس کے ہاتھوں سے پستول چھین کر دور پھینک دیا
اور دو گھونسے رسید کئے ——— ایک بھیڑ لگ گئی بلکہ سارا محلہ امڈ آیا۔ عورتیں
الگ چیخ و پکار کر رہی تھیں۔ اس کے دونوں ہمدرد سپاہی بھی آ گئے تھے۔ اور
قانون بگھار رہے تھے ——— مگر وہاں تو ایک ہنگامہ برپا تھا۔ طرح طرح کی
آوازیں آ رہی تھیں۔ جتنے منہ اتنی باتیں ———

"یہ رنڈیاں ہیں ——— رنڈیاں!"

"یہ لڑکیاں راہ چلنے والوں کو چھیڑتی ہیں۔ نظر بازی کرتی ہیں!"

"یہاں محلے بھر کے غنڈے جمع ہوتے ہیں"

"کل میں یہاں سے گذر رہا تھا تو اس کی ایک لڑکی مجھے دیکھ کر مسکرائی۔
انگڑائی لی ——— اور گانے لگی ——— انکھیاں ملا کے جیا برما کے
چلے نہیں جانا......!"

"یہ حرامی دلال ہے ان لڑکیوں کی کمائی کھاتا ہے"

ان بدمعاشوں نے سارا محلہ گندا کر دیا ہے، شریفوں کا چلنا پھرنا مشکل
ہو گیا ہے!"

"نکالو ان کمینوں کو یہاں سے!"

"یہ چکلہ ہمارے محلے میں نہیں رہ سکتا"

"فیصلہ تو کل ہی ہو جاتا۔ مگر ان کے پرستار بچانے والے بھی تو ہیں
لوگوں نے سارا معاملہ محلے کے بڑے بوڑھوں کے سامنے رکھ دیا ہے۔ آج شام
فیصلہ ہو جائے گا ———!"

عثمان چائے کا گھونٹ لے کر سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے کہنے لگا۔

"وہ بدمعاش تو اور بھی اکڑتے۔ کیونکہ ان کے ہمدرد سپاہی اور محلے کے
غنڈے بھی جمع ہو گئے تھے۔ مگر پستول کا معاملہ ایسا درمیان میں آ پھنسا تھا کہ
اب ان کی زبان بھی دکھلتی تھی۔ جانے وہ پستول چوری کا ہے یا کیا قصہ ہے۔ تیوری
والے نے میرے پیر پکڑ لئے کہ میں وہ پستول واپس دلا دوں۔

اس نے ایک پیالی چائے اور بنائی اور سگریٹ پیتے ہوئے کہنے لگا

"مجھے انسان کی ازلی نیکی پر یقین کامل ہے۔ فیصلہ ہمارے ہی حق میں ہوگا
محلے والے سب ہمیں یہاں جمع ہو گئے ہیں۔ سوائے ٹھیکیدار صاحب اور چند
مشٹنڈوں کے سارا محلہ ان کے خلاف ہے۔ بہرحال میں چاہتا ہوں کہ پولیس
کی مداخلت سے بچنے کے لئے یہ ساری باتیں حمید صاحب کے کان میں بھی ڈال
دی جائیں۔ وہاں کے انسپکٹر سے مجھے بڑا خطرہ ہے کوئی نیا فتنہ نہ کھڑا کر دے!"

وہ اطمینان سے چائے پی رہا تھا۔ پانچ بج چکے تھے —

"شام کا تازہ پرچہ —" ایک چھوکرا چلاتا ہوا ہماری ٹیبل کے قریب
آیا — "بابوجی! ایک آنہ میں کراچی کی تازہ خبریں پڑھیئے" میں نے ایک آنہ
دے کر شام کا تازہ پرچہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

"ہاں! میں تمہیں یہ بتانا بھول ہی گیا —" وہ ہنستے ہوئے کہنے
لگا — "وہ پستول بالکل خالی تھا — ورنہ شاید تم مجھے آج یہاں نہ پاتے!"
"تو گویا برخوردار سوکھی دھونس جما رہے تھے —؟" میں نے ہنستے
ہوئے کہا — اور پرچہ کی سرخیاں پڑھنے لگا — عثمان نے بھی اپنی نظریں
اخبار پر گاڑ دیں —

نقاب پوش ناچ کی مخالفت کرنے والے ملاؤں کو ناچ منعقد کرنے والے آرٹسٹوں کا دندان شکن جواب

"....... رقص و سرود اسلامی ثقافت کا ایک اہم جزو ہے
اس آرٹ کے احیا کے بغیر پاکستان ترقی نہیں کر سکتا —
فنونِ لطیفہ کی مخالفت کرنے والے ملاؤں کے لئے پاکستان میں
کوئی جگہ نہیں ہے — پاکستان کی ثقافتی ترقی میں حائل
ہونے کی کسی کو اجازت نہیں دی جائے گی۔ وزیر اعظم اور گورنر
تک اس کے سرپرست ہیں۔ احمقوں کی خیالی جنت میں بسنے
والے ملاؤں کو چاہیئے کہ وہ اپنی آسمانی جنت کو ہجرت کر
جائیں۔ ہم پاکستان کو ہی اپنی جنت بنائیں گے اور ..."

اچانک میری نظر جو عثمان کے چہرے پر پڑی تو میں حیرت زدہ رہ گیا
اس کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھوں سے وحشت برس رہی تھی۔ اس کا سارا
جسم غصے سے کانپ رہا تھا۔ چائے کی پیالی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر
پڑی۔ اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ وہ کانپتا ہوا کھڑا ہو گیا

"چلو — نیازی! — فوراً چلو —!" وہ میرا ہاتھ
کھینچتے ہوئے کہنے لگا — "ابھی انسان کی ازلی نیکی سے میرا اعتما
ہے فیصلہ ہمارے ہی حق میں ہوگا — مگر صداقت کے لئے بھی جنگ
ورنہ لوگ جھوٹ کو بھی سچ سمجھنے لگتے ہیں — چلو — فوراً چلو
"مگر یہ کیا وحشت ہے؟ کہاں چلو؟" میں نے گھبرا کر پوچھا

"پڑھا نہیں تم نے؟ — پڑھو وہ کیا لکھ رہا ہے —
اخبار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا — "ناچ گانا، رقص و
ثقافت کا بڑا اہم جزو ہیں اس آرٹ کے احیا کے بغیر پاکستان ترقی
اس کو ہمارے سب بڑے بڑوں کی سرپرستی حاصل ہے۔ اس کی
والوں کے لئے پاکستان میں کوئی جگہ نہیں۔ یہ آرٹ ہے، فن ہے۔ ا
کرنے والے پاکستان سے چلے جائیں ......؟"

وہ غصے سے کہنے لگا

"نیازی —! قسم ہے پیدا کرنے والے کی — یہی الفا
بھی مجھ سے کہے تھے.....؟"

میرا سر چکرا گیا — میں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔
لگا آج تک مسلمانوں نے جس کو "کنجر خانے" کا نام دیا ہوا تھا ا
کے نام نہاد نام سے پاکستانی ثقافت کا جزو بنتا جا رہا ہے اور اسے
دیگر ہمارے وزیر اعظم اور گورنر اس کی سرپرستی فرماتے ہیں۔ فحاشی ا
کو فروغ دینے کے لئے آرٹ کے مقدس نام کی یہ آڑ — آہ "آرٹ

(بشکریہ شاہراہ)

بعصدیقی

غزل

رف ایک شکایت ہی نہیں کوئی گلا اور — کہنے کو کہا اور تو کرنے کو کیا اور!

اپنے خداوند سے بچھڑا ہوا بندہ — پوجا کے لئے روز بناتا ہے خدا اور!

ں دور میں جو عشق کرے سوچ لے پہلے — یہ اور زمانہ ہے، زمانے کی ہوا اور!

گی ہوئی پلکیں ہوں تو پھیلا ہوا دامن — مائل بہ کرم وہ ہوں تو پھر چاہیے کیا اور!

م ہی سمجھتے ہیں خطا ہم سے ہوئی کیا — ہیں دار و رسن ہیچ کہ ہے اس کی سزا اور!

ب منزل جاناں کے کٹھن موڑ ہیں آگے — اب راہنما اور! حُدی اور! دِرا اور!

یاد! ترے دام کو پہچان گئے صید — اب دام بچھا اور کوئی، دانہ گرا اور!

ناؤ نہ تم عام حسینوں کی ادائیں — اسلوب ستم اور کوئی طرز جفا اور!

رہ غم جاناں کا طبیبوں سے نہ ہوگا — کہتے ہیں کہ اس درد کی ہے کوئی دوا اور!

شن کی فضاؤں میں بھی کر دیکھیں اڑانیں — یاں کنج قفس میں ہے پھڑکنے کا مزا اور!

ہوتا ہے کبھی یوں بھی محبت کے جہاں میں

کرتے ہیں خطا اور تو ہوتی ہے عطا اور!

(چراغ راہ)

شوکت تھانوی

دیمک

ہوجاتا تھا ہے جس دیمک کا میں ذکر کر رہا ہوں اس نے کتابوں کے صفحات میں جگہ جگہ خود میرا کلیجہ چھلنی کر دیا ہے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ دیمک کی اس قسم سے میں کتابیں کیونکر محفوظ کروں۔ صاحب اگر یہ بھی وہی دیمک ہوتی جو عام طور پر کتابوں کو لگ جایا کرتی ہے تو میں بھی کولتار سے کتابوں کی الماری پُتوا دیتا، نیم کی پتیاں الماری کے تختوں پر بچھا کر ان پر کتابیں رکھنا شروع کر دیتا۔ کتابوں کو ہر مہینے دھوپ دکھا دیا کرتا۔ مختصر یہ کہ بیشمار ترکیبیں ہیں کتابوں کو دیمک سے بچانے کی، مگر اس آدم دیمک کا کوئی علاج سمجھ میں نہیں آتا۔ جو میرا کتب خانہ چاٹے جا رہی ہے اور جو علاج سمجھ میں آتا ہے اس کا نتیجہ خود اپنے حق میں کچھ زیادہ مفید نہیں ہے۔ اور اندیشہ ہے پھانسی پا جانے کا۔ ورنہ حبس دوام میں تو کوئی شک ہی نہیں۔

کبوتر بازی کا مجھ کو شوق نہیں، بٹیر بازی میں نہیں کرتا، مرغ میں نہیں لڑاتا، گھوڑ دوڑ کی مجھ کو لت نہیں، اگر لے دے کر کوئی شوق ہے تو کتابوں کا۔ اپنی کمائی کا بیشتر حصہ کتابیں خریدنے پر صرف کرتا ہوں۔ بیوی سے رنجش مول لیتا ہوں مگر ان کے لئے بنارسی ساڑی یا طلائی جھمکے لانے کی جگہ بھی کتابیں ہی خرید لاتا ہوں۔ بچے سمجھتے ہیں کہ ان کی قسمت میں باپ کی محبت اور شفقت ہے ہی نہیں، اس لئے کہ میں ان کے لئے کھلونے اور بسکٹوں کے ڈبے تو جب لاؤں کہ کتب فروشوں کی دوکانوں پر کتابیں میسر نہ آئیں۔ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو تنخواہ لے کر سیدھا کتب فروشوں کی دوکانوں پر پہنچ جاتا ہوں اور گھر کے خرچ سے جس قدر زائد رقم ہوتی ہے اس کی کتابیں خرید کر گھر آجاتا ہوں، بیوی کے طعنے سنتا ہوں بچوں کی مایوس نگاہیں دیکھتا ہوں مگر عشق میں تو یہی کچھ ہوتا ہے اور مجھ کو اگر کتابوں سے عشق ہے تو یہ باتیں برداشت ہی کرنا پڑتی ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ خدا کے فضل و کرم سے میرے کتب خانہ میں اس وقت دو ڈھائی ہزار کتابیں موجود ہیں اور میری سب سے بڑی دولت بلکہ میری زندگی کی کمائی یہی کتابیں ہیں۔ کیوں صاحب یہ کتابیں مجھ کو جان سے زیادہ عزیز نہ ہوں تو کیا ہوں۔ وہ کتابیں جنکو میری بیوی اپنی سوکن سمجھتی ہیں جن کو میرے بچے سوتیلی ماں کا درجہ دیں۔

مگر خدا کے لئے بتائیے میں اپنی ان ہی عزیز از جان کتابوں کو دیمک کی اس قسم سے کیسے بچاؤں جس نے زندگی وبال کر رکھی ہے۔ صاحب کوئی ایسا ویسا آدمی ہوتا تو ٹال بھی دوں۔ والد مرحوم کے دوست، ہر اعتبار سے نہایت شفیق بزرگ ویسے بھی نہایت سنجیدہ آدمی! مگر میر صاحب جان کے گاہک اس لئے بن گئے ہیں کہ از راہ حماقت ان کو غریب خانہ کے قریب ہی کرایہ کا مکان دلوا دیا ہے۔ بس جناب جب دیکھئے یہ بزرگ محترم دھرے ہوئے ہیں۔ صاحب اگر وہ پان کھائیں، سگریٹیں پھونکیں، چائے پئیں تو کون کافر ان کی شکایت کرے۔ سعادت کا تقاضا یہی ہے کہ جب وہ تشریف لائیں۔ مجھ کو دیدہ و دل فرش راہ کرنا ہے جو بخوشی میں کرتا ہوں ہر چند کہ ان کے تشریف لا کر واپس جانے کے بعد مجھ قالین پر برش کرانا پڑتا ہے تاکہ ان کے نعلین کے ساتھ آئی ہوئی کیچڑ صاف ہو اور ان کے پھیلائے ہوئے چلغوزوں کے چھلکے صاف ہو سکیں۔ مگر مجھ کو یہ سب گوارا ہے۔ البتہ اب میں ان کی تشریف آوری سے محض اس لئے کانپنے لگا ہوں کہ ان کو مجھ سے زیادہ میرے کتب خانے سے دلچسپی ہو گئی ہے اور وہ میری کتابوں کے لاگو ہو گئے ہیں۔ جب دیکھئے بھتیجے کا گھر سمجھ کر "السلام علیکم" کا بم رسید کرتے ہوئے تشریف لے آئیں گے اور آتے ہی اس کتاب کی داد دیں گے جو کل لے گئے تھے۔ کہ "بیٹے وہ جو کل میں لے گیا تھا ناول، بھئی وہ تو نہایت فحش نکلا کیا تمہاری کم بخت نے قضا کرائی اور رات کو تین بجے تک اس نامراد کو پڑھنا بھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فجر کے لئے بھی آنکھ نہ کھل سکی مگر لاحول ولا قوۃ کس قدر بیہودہ کتاب تھی وہ! آج اس کو تمہاری چچی پڑھ رہی ہیں میں نے کہہ دیا ہے کہ بچوں کی نظر اس پر ہرگز نہ پڑے۔ ذرا الماری تو کھولو شاید میرے مطلب کی کوئی چیز مل جائے" اور یہ کہتے ہوئے خود الماری پر حملہ کریں گے۔ کتابوں کی تمام ترتیب گڑبڑ کر دیں گے کچھ کتابیں نکال نکال کر غلط جگہ رکھیں گے کچھ غلط جگہ بھی نہ رکھیں گے بلکہ کسی صوفے پر، کسی کرسی پر یا کسی مونڈھے پر اچھال دیں گے بچیاں ہی ان کے لکڑے ادھر ادھر اچھالتے رہیں گے۔ مجھے یاں کے لئے انتخاب کریں گے اور

ہیں کتابیں لگی دوسری الماری کو کیا تیسنگی دو کان بنا لائیں گے
تابیں نکال کر پہلے تو کسی صفحے پر کالا ان بیگڑ کر ادھر ادھر سے دیکھیں
بعد نہایت بے تکلفی سے اٹھ کر چلتے چلتے کہیں گے کہ "بیٹے یہ تین
بار اہوں، پڑھ کر لوٹا دوں گا۔ اور ہاں وہ کل والی کتاب جو نہایت
انشاءاللہ کل آجائے گی۔"

یہ تکلفی ان کو کیسے رہتے؟ والد صاحب کے ملنے والے، اور
کی تجہیز و تکفین کے منتظم ٹھہرے۔ گلے پر لٹکا سانپ ہوئے۔ کتب خانے
کر دل کے خواہ کتنے ہی ٹکڑے ہوں مگر یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ان سے
ل جائیں۔ اب دوسرے دن وہ پھر تشریف لائیں گے متبسم اور
عتی کا نور برساتے ہوئے، ہاتھ میں وہی بیہودہ ناول لئے،
"بیٹے یہ ناول لے آیا ہوں تمہارا، عجیب لطیفہ ہوا اس کا بھی!
پڑھ رہی تھیں کہ میاں شدو کی نظر پڑ گئی اس پر۔" وہ حضرت سے
۔ تمہاری چچی دوڑیں اس کے پیچھے اور کتاب جو چھینی ہے۔ اس کے
س کے چند صفحے میاں شدو کے ہاتھ میں اور چند تمہاری چچی کے ہاتھ
ر ورق تو پھٹ ہی گیا۔ بہر حال اس کو کسی جلد ساز سے ٹھیک کرا

تو چاہا کہ کتاب ان بزرگ محترم کے منہ پر ماری جائے مگر فوراً تصور
حب آگئے کہ افوہ خلف، یہ ارادہ اس کے لئے ہے جو میرا دوست
ہیں بھائی جان کہا کرتا تھا جس نے تیری والدہ کے لئے بارہ بجے رات
کان کھلوا کر کفن مہیا کیا تھا ۔۔۔ نتیجہ یہ کہ خون کے گھونٹ پی کر رہ
حضرت کے جانے کے بعد گوندے کر پھٹے ہوئے صفحات کو نہایت ہی
جوڑ رہے تھے کہ ان بزرگ محترم کے خلف اکبر شدو میاں نازل ہو

او بھائی صاحب! ایسی مزیدار کتابیں آپ اکیلے ہی الگ پڑھتے ہیں
رہ گیا ایک ہی ورق پڑھ کر۔ مگر اماں جان فوراً چھین کر لے
، میں نے دل میں کہا کہ لے جاؤ میں خود بھائی صاحب سے مانگ

میں نے ان حضرت سے صاف کہہ دیا۔
"معاف کیجیے گا میں آپ کو کتاب نہیں دے سکتا اور یہ

بات تو یہ ہے کہ میں کتابیں مانگ کر پڑھنے کا اصولاً قائل بھی نہیں ہوں۔ چچا میاں
بزرگ ہیں، اب ان سے میں کیا کہوں، ورنہ میں تو ان کو بھی خوشی سے کتابیں
نہیں دیتا۔"

وہ حضرت ایسے غیرت دار تھے کہ کتابوں کی الماری کی طرف بڑھتے ہوئے
بولے۔ "آپ نہ دیجئے میں خود لے جاؤں گا۔ کوئی غیر تھوڑی ہے۔ آپ کی چیز
میرے لئے پرائی تھوڑی ہے۔"

مگر میں نے نہایت تلخی سے کہا

"یہ غلط ہے کتابیں تو میں چھونے بھی نہ دوں گا اور نہ آئندہ کتاب
مانگ کر مجھ کو شرمندہ کیجئے۔"

وہ حضرت اپنی بے تکلفی پر پہلے تو کچھ کھسیانی ہنسی ہنسے۔ اس کے بعد
سنجیدگی سے گھورتے رہے مگر جب میرے تیور بدستور رہے تو کہنے لگے۔

"کوئی ہم آپ کی کتاب کھا تھوڑی جاتے ذرا سی کتاب کے لئے آپ نے
ٹکا سا جواب دے دیا۔"

عرض کیا ۔۔۔ "جی ہاں آپ اس کو ٹکا سا جواب ہی سمجھیں بہر حال میں
کتاب تو اب ہرگز نہ دوں گا۔"

وہ حضرت بھولے سوچے تشریف لے گئے اور مجھے آج پہلی مرتبہ اپنی اس
بے مروتی پر کچھ فخر سا محسوس ہوا کہ میں نے جو کچھ کیا ہے بالکل درست کیا۔ مگر تھوڑی
ہی دیر میں میر صاحب قبلہ تینوں کتابیں لئے اپنی نورانی آنکھوں سے شکایت
برساتے تشریف لائے۔ اور کتابیں ایک طرف اچھال کر بولے۔

"سچ ہے بیٹا وہ مروت کا زمانہ گزر چکا جب تمہارے والد مرحوم اور میرے
درمیان کوئی غیرت ہی نہ تھی میں نے ان کے کپڑے پہنے ہیں۔ انہوں نے خدا جنت
نصیب کرے میرے گھر کو ہمیشہ اپنا گھر سمجھا جو چاہا اٹھا لائے۔ مگر تم نے کچھ
سبق دے دیا اور مرنے والے کی روح کو بھی شرمندہ کر دیا۔"

میں واقعی کانپ گیا اور میں نے گھبرا کر جھوٹ بولنا شروع کر دیا۔

"چچا میاں یہ بات نہیں ہے۔ شدو میاں وہی کتاب مانگ رہے تھے
جسے آپ ابھی بتا چکے ہیں اور جسے چچی نے ان کے ہاتھ سے چھین لیا تھا میں کیسے
دیدیتا ان کو وہ کتاب!"

میر صاحب کا رنگ فوراً بدل گیا کہنے لگے۔

"اچھا! یہ بات تھی مجھ کو تم سے یہی امید تھی بیٹا تم نے بہت اچھا کیا کہ

اس کو وہ کتاب پڑھنے کی عمر وہ نامعقول تو کچھ نامعقول باتیں کر رہا تھا کہ گویا تم مجھ کو بھی بادل ناخواستہ کتابیں دیتے ہو مجھے تو یہ سن کر بے حد افسوس ہوا تھا۔

"بھلا کہہ سکتا تھا میں ایسی بات؟" اور میں پھر جھوٹ بول گیا.....

میر صاحب نے مجھ کہہ گئے کہ وہ تینوں کتابیں پھر اٹھا لیں۔ جن کو میں دیکھ رہا تھا کہ ایک کے سرورق پر پان کا بڑا سا دھبہ تھا دوسری کے سرورق پر غالباً تیل کی مالش ہوئی تھی اور تیسری کا سرورق شاید گھر ہی پر بھول آئے تھے۔ مگر میں کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ کہ کہیں والد صاحب کی روح شرمندہ نہ ہو جائے۔ میر صاحب نہ صرف وہ تین کتابیں لے گئے بلکہ دو کتابیں اور بھی لے گئے اور میں کچھ نہ کہہ سکا۔ جاتے جاتے لوٹ کر میر صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ "بیٹے! آئندہ میاں کو تم خود کوئی ایسی کتاب بھیجو جو اس کے پڑھنے کے قابل ہو اور تمہاری چچی نے کہا ہے کہ اگر اسی ناول کی قسم کی کوئی اور کتاب ہو تو ان کے لئے بھیجو۔ معلوم نہیں ان عورتوں کو فحش کتابیں پڑھنے کا کیا شوق ہوتا ہے۔ میں نے تو ان سے کہہ دیا ہے کہ کسی وقت برخوردار کے گھر میں پردہ کرا کے چلی جاؤ، اور اپنے مطلب کی کتابیں چھانٹ لاؤ۔ اس کے پاس کتابوں کی کیا کمی ہے"

میں نے خدا جانے کس طرح ہنس کر کہا

"بے شک، بے شک!"

مگر ان کے جانے کے بعد سے مسلسل اس بات پر غور کر رہا ہوں۔ کہ دیمک کی اس قسم سے اپنی کتابوں کو کیسے بچاؤں؟ ارادہ ہے کہ یا تو مکان کرائے پر اٹھا دوں، مگر مکان بھی تو نہیں ملتے، نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن،

خدا ہی حافظ ہے ان کتابوں کا ×

(بشکریہ حریم)

اگر آپ کا نام اور خریداری نمبر بھی ذیل میں درج ہے —

تو سمجھ لیجئے کہ آپ کی خریداری مدت ماہ اپریل ۵۸ء سے ختم ہے اور نام گشتی رسالہ بھی جاری کیا جا رہا ہے۔ مہربانی فرما کر اپنا سالانہ چندہ بذریعہ منی آرڈر ادا فرما کر شکر گزار فرمائیے۔ یا پھر اپنی خواہش سے مطلع کیجئے۔ اگر آپ نے خاموشی اختیار کی تو ماہ مئی ۵۸ء کا شمارہ بذریعہ وی پی ارسال خدمت کیا جائے گا۔ اور اس کا وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا × منتظر کرم — نیجر مشیر کراچی

نمبر خریداری	نام	سکونت	نمبر خریداری	نام	سکونت
			۱۰۶۵	ایم ایچ خان	جیسو
۱۰۱۹	مخدوم عبدالجبار	ضلع سرگودھا	۱۰۶۶	حکیم غلام محمد	جھانیا
۱۰۲۷	خالد پرویز	حافظ آباد	۱۰۷۰	عبدالعظیم انصاری	نفر
۱۰۳۰	محمد شفیع	گوجرانوالہ	۱۰۷۵	محمد جلیل	غوریوالہ ٹو
۱۰۳۷	عبدالمجید	بابوزئی مردان	۱۰۸۰	ایچ غلام سرور	جھنگ
۱۰۳۸	اختر جہاں بیگم	نواب شاہ سندھ	۲۰۴۹	محمود مصطفیٰ صدیقی	رام پا
۱۰۳۹	حبیب الرحمن	سعید پور	۲۱۲۹	عزیز الرحمن علوی	کراچ
۱۰۴۰	جدید دواخانہ	شاہ پور چاکر	۲۱۳۳	شوکت علی	کوئٹہ
۱۰۴۷	سعید احمد	انکم ٹیکس آفس کراچی	۲۱۳۴	اسماعیل نواب	دارلشیہ
۱۰۴۸	عزیز احمد کیانی	کونسٹریلہ راولپنڈی	۲۱۳۸	ایس اے وہاب	تیلو
۱۰۵۱	عبدالقدیر	اضعربال راولپنڈی	۲۱۳۹	عابد نیازی	لیت
۱۰۵۲	اسیف الدین	کراچی	۲۱۴۴	ناظم جماعت اسلامی	میر پور خا
۱۰۵۸	علی حسین ہاشمی	سندھ	۲۱۹۷	مکتبہ تعمیر انسانیت	لاہو

ب جبالی •

راہ محبت میں سفر کر نہ سکی
مصائب میں گذر کر نہ سکی

عقل ان دیکھے مناظر پہ نظر کر نہ سکی
کم نظر عشق کی راہوں میں سفر کر نہ سکی

کو ہم کیسے کہیں کہ وہ کبھی
سے باہر کی خبر کر نہ سکی

ہی تیرے فکر کی تابانی ابھی رہن ظلام
بخت انساں کی شب تار سحر کر نہ سکی

نظری سے فقط راز الست
کی یہاں کام نظر کر نہ سکی

کیسے مانوں کہ ہے مومن کی نظر تیری نظر
عالم کفر کو جو زیر و زبر ---- کر نہ سکی

شق بازی میں کبھی اپنی طبیعت طالب
ول کر بھی تو سیر نفع و ضرر کر نہ سکی

ہمدم گیاوی •

کہاں پر آگئی تہذیب انساں دیکھتے جاؤ
ہر اک سو قتل و غارت کا ہے طوفاں دیکھتے جاؤ

ادھر عیش و طرب جشن بہاراں دیکھتے جا
ادھر افلاس کے ماروں کو گریاں دیکھتے

بہار آئی مگر گلشن ہے ویراں دیکھتے جاؤ
نظام باغباں نظم گلستاں دیکھتے جاؤ -

قفس کی تیلیوں میں یہاں جکڑی تھی آزا
یہاں حائل ہے قانون گلستاں دیکھتے

خیال دور ماضی پر ہمارا خون دل ہمدم
امنڈتا آرہا ہے زیر مژگاں دیکھتے جاؤ

نقیبِ سحر

کہہ رہا تھا کوئی - ساتھیو، چاندنی
کچھ چراغوں کی ہے - یہ سحر کی کہاں؟
اونچے محلوں کی دیوار پر کچھ دیئے
لے رہے ہیں ابھی آخری ہچکیاں
کاخِ عالی کی شمعوں کا پھینکا ہوا
جھونپڑوں پر ابھی اڑ رہا ہے دھواں
صبح نکلے گی لیکن افق پر ابھی
یہ سحر کے نہیں آگ کے ہیں نشاں

کہہ رہا تھا کوئی ساتھیو! مشعلیں
ہاتھ میں لیکے نکلے ہیں کچھ نوجواں
ان کا نعرہ ہے ہر قصر کو پھونک دو
کاخِ عالی کو کر دو زمیں میں نہاں
خود بناؤ اگر یوں نہ نکلے سحر
آگ اور خون کی گھول دو سرخیاں
ان کا نعرہ ہے ہر چیز کو پھونک دو
پھونک دو ذہن و ادراک و نظمِ جہاں

دل میں انکے خدائی کے ارمان ہیں
اور لب پر مساوات کے ہیں بیاں
ان کے نعرے بھی بخشے ہوئے غیر کے
انکے جذبات بھی غیر کے ترجماں

کہہ رہا تھا کوئی ساتھیو، زندگی
شورو افراط و تفریط میں ہے نہاں
اک طرف کاخِ عالی پہ جلتے دیئے
اک طرف آگ اور خون کی سرخیاں
اک طرف ڈھیر لعل زر و سیم کے
اک طرف سوزِ محرومی سے دل دھواں
اک طرف کھال مزدور کی پیرہن
اک طرف چھوٹی مزدور کو تھپکیاں
اک طرف کھیتوں کا لہو جوے مئے
اک طرف صرف نعرے برائے کساں
اک طرف نام پر حق کے مکر و ریا
اک طرف نام بھی حق کا بارِ گراں

بدگمانی نصیحت پہ بھی
کالیاں، گھڑکیاں، دھمکیاں

کوئی ساتھیو، تم بڑھو
و تفریط کے درمیاں
دگو ہر کے ہیں سب کھوکھلے
جھوٹے سپنوں میں بھی ہیں نہاں
شمعیں ہیں، سورج نہیں
ب ہے صبح کی ضو کہاں؟
تو نکلے گا قرآں سے
ں تو ایماں سے ہونگی عیاں

کوئی، لیکن اے ساتھیو
کسی کو یہ رنگِ بیاں
نے ہونٹ ہی سی دیئے
کوئی ضبط کی داستاں
رکوئی سوئے دار و رسن
پیر میں ڈال کر بیڑیاں
ائی پھر ابن جبروت نے

پھر لیا وقت نے شوق کا امتحاں
شب کے فرزند محلوں میں خوش ہو گئے
رقص کرنے لگیں شب کی تاریکیاں
گویا باقی نہیں اب مؤذن کہیں
گویا سورج نہ نکلے گا اب بے اذاں
ساتھیو اپنی یلغار جاری رہے
یونہی بڑھتا رہے عزم کا کارواں
جبر و الحاد کا آخری وار ہے
ٹوٹنے ہی کو ہے ظلم کا سائباں
اس سے پہلے بھی یہ مرحلے آئے ہیں
اس سے پہلے بھی گزرے ہیں یہ امتحاں
جبر نے آگ پہلے بھی بھڑکائی ہے
عشق شعلوں سے نکلا ہے گلشن بجاں
موت ہر لاکھ حائل ہر اک گام پر
کیا رکا ہے کبھی زیست کا کارواں
شب کی تاریکیاں منہ چھپانے لگیں
آ رہی ہے سحر۔ وہ سحر کی اذاں

نوٹ: خط و کتابت کے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے تاکہ تعمیل ارشاد فوراً کی جا سکے۔

عابدالانصاری •

بہنیں اور بیویاں

میں نے جب کالج کی زندگی میں قدم رکھا تو عجب طرح کا کھلا کھلا ماحول پایا۔ ہر وقت ہنسی، مذاق، تفریح، اپنی مرضی، اپنی رائے۔ جہاں جی چاہے جائیں جہاں جی چاہے آئیں۔ کہاں اسکول کی وہ گھٹی گھٹی فضا۔ اسکول گئے تو وہاں ماسٹروں کے سامنے ہیں۔ گھر آئے تو والد صاحب نگراں۔ کہیں دیر ہو گئی تو سوالات کی بوچھاڑ۔ "کہاں گئے تھے؟" "کیوں گئے تھے" اور آخری بات یہ کہ "بغیر اجازت کیوں گئے تھے؟" اب بھلا کون بتائے کہ اجازت کہیں ملتی بھی ہے۔ رات کو کیا مذاشنڈی کے بہانے سے تو کبھی کبھا سینما مل جاتا۔ اور ہاں جمعرات کو دوستوں کیساتھ گپ بھی لڑا لیتے تھے۔ بات یہ تھی کہ جمعرات کو تبلیغی جماعت کا گشت ہوتا تھا۔ ہم گشت میں شریک ہوتے یا نہ ہوتے مگر امی جان اکثر تعریف کرتی تھیں "ابھی میرے منے کی عمر ہی کیا ہے مگر دیکھو کوئی جمعرات بھلا چھوٹ تو جائے۔ نماز ہی کی نماز قضا ہو جائیگی۔ مگر مجال ہے کہ میرے ظفر کی تبلیغی جماعت کی شرکت قضا ہو جائے۔ ویسے تو اسکے باپ ہی کہیں نہیں آنے جانے دیتے۔ مگر تبلیغ کا معاملہ ہے کہتے ہیں بڑا ہو کر بھی تو آخر اسلام کی خدمت ہی کرے گا۔ ابھی سے نہ عادت پڑی تو اور کب پڑیگی۔"

" میں اپنی تعریفیں سنتا تو بہت خوشی ہوتی مگر کبھی کبھی امی جان حد سے بڑھتیں تو مجھ کو خواہ مخواہ شرمندگی ہونے لگتی تھی۔ اور میں جھنجھلا اٹھتا "امی جان! آپ خواہ مخواہ میرا ثواب ضائع کر رہی ہیں"

" مگر ——— کالج کی بات ہی اور تھی۔ کلاس کا کام کرکے نہ لے جایئے تو استاد نہیں پوچھتے۔ ہوسٹل دیر سے پہونچیں تو چوکیدار کو دکر اندر آجائیں یا پھر دربان سے ذرا اخلاق سے پیش آجائیں تو مجال ہے کہ وارڈن صاحب تک رپورٹ پہونچ لے"

باتیں بھی ایسی کہ شروع ہو جائیں تو ختم نہ ہوں۔ کہاں کے رکھے پھیکے نماز روزہ کے مسائل ——— "بھئی فلاں پکچر میں تو ——— غضب کر دیا" "اور ظالم نے ہیروئن کا انتخاب بھی خوب کیا ہے" "اب سوتے ہیں۔ شاید رات کو ہی خواب میں درشن ہو جائیں" ———

یا پھر ذرا موضوع بدلا تو کالج کی لڑکیوں کا تذکرہ "ذکیہ پھول تو یار کمال بناتی ہیں بالوں میں۔" "ردحی بیگم چہرہ کو تو چشمہ نے خراب کر دیا۔ ورنہ کافیس کٹنگ تھا۔" "اماں! تم بھی کیا باتیں کرتے ہو۔ اسکے چہرہ پر اگر چشمہ بھی سج گیا۔" "ہم کو تو صاحب سوشیلا کا سر پسند ہے" ———

شروع شروع میں تو ان غیر مانوس جملوں سے میں بہت گھبرایا۔ مگر جلد ہی ماحول کو میں یاد رہے مجھے ماحول ساز گار آگیا۔ کچھ نام بھی یاد ہو گئے۔ کچھ لڑکیوں کو گذرتے ہوئے پہچان لیا ——— دو تین سال کے میں ہی ہم کہیں سے کہیں پہونچ گئے ——— زندگی رنی تھی ——— ماحول بدل رہا تھا ——— ہم بھی بدل رہے تھے ——— کالج اب پہلا سا کالج نہ تھا تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔ بہت سے برقع اتر گئے تھے۔ کچھ نئے داخلے بھی ہوئے۔ اگر کبھی اتفاقیہ کوئی لڑکی برقعہ میں نظر بھی آجاتی تو اسکے پیچھے کچھ تیز قسم کے جملے چلتے۔ کچھ ہلکی ہلکی سیٹیاں بجتیں اور پیچھے بھی سنائی دیتے۔ !

ریحانہ! ہمارے کالج کی اچھی خاصی مشہور لڑکی ہے وجہ تو یہ ہے کہ اس کو کالج میں دو تین سال ہو گئے۔ دوسرے انگر اسٹائل کے کٹے ہوئے بالوں نے اس کو دوسری ہندوستانی لڑکی سے کچھ برتر بنا دیا۔ آج دور سے آتی ہوئی نظر آئی تو لڑکوں نے کہا ذرا گیلری میں پھیل کر کھڑے ہو جاؤ ——— ہم نے گھیر لی۔ ریحانہ اسی دلیرانہ انداز سے بڑھتی چلی آئی۔ ایک لڑکا گھبرا کر سے ہٹ گیا اور وہ نکل گئی۔ گیلری میں ایک قہقہہ گونجا۔ خالد بولے دیکھئے صاحب! کمال مسکرائے اور جاتے ہوئے سامنے کی

دیکھ کر بہت تمیز سے کھنکارا۔ اور پھر میری طرف منہ کر کے کہا "اپنی ہی بہنیں ہیں ظفر صاحب ہاں" "اور اپنی ہی بیویاں بھی ہیں" میں نے فی البدیہہ جواب دیا۔ سب ساتھی دوبارہ ہنس پڑے ——— پھر گیلری میں بہت دیر تک تنکے ہوتے رہے۔ بہت سی لڑکیاں گذریں۔ ہم ان کے ستقبال کے لئے نت نئی ترکیبیں سوچتے رہے اور نئے نئے جملے تراشتے رہے۔ ہمارے جملوں کے درمیان سے دختران حوا مارچ کرتی ہوئی آگے بڑھ جاتیں گرا ہوا جوڑ کا اگر کبھی کوئی گھنٹہ خالی ملتا بھی ہے تو اتنی جلدی گذر جاتا ہے۔ ٹن ٹن ٹن کی آواز نے سب کو چونکا دیا اور ہم سب لوگ کلاس میں جا بیٹھے۔

"نیا سال شروع ہو رہا تھا۔ کالج میں عجیب چہل پہل تھی ہر طرف زندگی ہی زندگی تھی۔ خاموش دیواروں میں تین ماہ کی تعطیلات کے بعد پھر قوت گویائی آگئی تھی۔ وہی کمرے جن میں تین ماہ میں مکڑیوں نے ڈیرے ڈال دیئے تھے۔ آدمیوں سے بس گئے۔"

" اس مرتبہ میں خود تو آیا ہی ساتھ ہی اپنی بہن کو بھی لیتا آیا۔ والد صاحب رضیہ کو میٹرک سے آگے تعلیم نہیں دلانا چاہتے تھے مگر میں مصر رہا اور ابا جان کو "تعلیم کے فوائد" اور موجودہ دور میں عورتوں میں تعلیمی ضرورت" کے موضوع پر اکثر سمجھاتا رہا۔ مگر والد صاحب کا ایک ہی جواب تھا کہ تعلیم کتنی بھی اچھی چیز کیوں نہ ہو۔ اگر تربیت نہیں تو سب بیکار ہے۔ بار بار ابا کو سمجھایا کہ ہمارے یہاں لڑکیوں کے بورڈنگ میں پردہ کا بہترین انتظام ہے۔ مجال نہیں کہ کوئی طالب علم اندر جا سکے۔ ملاقات کے بھی اوقات مقرر ہیں۔ پھر ملاقات انہیں لوگوں سے ہو سکتی ہے جو قریبی عزیز ہیں اور جن کے متعلق خود پرنسپل صاحب اجازت دے دیں۔ ابا جان اتنی تقریر سے کچھ نرم ہوئے اور امی جان کو تیار کر ہی لیا تھا۔ وہ بھی بول پڑیں "ہاں —! ہاں! ! میری خود بھی مرضی ہے۔ اچھا ہی ہے دو بول پیٹ میں پڑ جائیں گے۔ تو وقت پر کام آئیں گے"

" رضیہ خاموشی سے سب باتیں سنتی اور خوش ہوتی۔ حقیقت تو یہی ہے کہ میں بھی محض رضیہ کے شوق اور ذہانت ہی کے سبب اسکو کالج لے جانا چاہتا تھا۔ بڑی جد و جہد سے پرانی ذہنیت کو نئے دلائل نے بدل ہی دیا میری بحث امی جان کی سفارش اور رضیہ کی ضد ابا جان پر غالب آگئی بالآخر میں اور رضیہ دونوں کالج پہنچ گئے۔

کالج کی زندگی کے متعلق جتنی باتیں ضروری تھیں وہ سب کی سب میں نے رضیہ کو سمجھا دیں۔ یہ بھی بتا دیا "اگر کوئی شخص فقرہ کسے تو خاموشی سے نکل جانا۔" "کبھی جلسوں اور مشاعروں میں مت جانا" اور ہاں پردہ کا خاص خیال رکھنا۔" "کہیں یہاں کے ماحول کا اثر تم پر بھی پڑ جائے" کچھ تو والد صاحب کی نصیحتوں کے اثر نے کچھ ذاتی مشاہدات نے مجھ کو کچھ نہ کچھ پردہ کا قائل بنا دیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ میں رضیہ کیلئے یہی پسند کرتا تھا کہ برقعہ پہنے۔

ہم سب پھر کالج کی رنگینیوں میں کھو گئے۔ پھر وہی باتیں۔ وہی کہانیاں وہی قصے۔ وہی بہنیں۔ اور وہی بلکے پھلکے جملے

——— تیسرا پیریڈ ختم ہوا۔ اب ہم کو چوتھے پیریڈ میں جانا تھا۔ ہم کلاس سے باہر نکلے ہی تھے کہ ایک کالا برقعہ نظر آیا۔ سب لڑکوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ مسکرائے۔ اور … نے دیکھتے ہی جملہ چست کیا۔ " اے صاحب! ایسی کیا نظر لگ جاتی" یہ خیال طنز بلکے سے غالب کا شعر گنگنا دیا ؎

جب وہ جمالِ دل فروز، صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردہ میں منہ چھپائے کیوں

" برقعہ کچھ اور نزدیک آگیا۔ میں نے دبی زبان سے کہا۔ " اپنی ہی بہنیں ہیں" کمال نے میرے منہ کے پاس منہ لا کر کہا "اور اپنی ہی بیویاں ہیں" میں ہنس پڑا۔ برقعہ میرے پاس سے گذر گیا۔ ہوا نے تھوڑا سا نقاب اڑا دیا۔ اف ! —— رضیہ —— "

" میرے تمام بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میرے دماغ میں ایک بار پھر یہ جملہ گونج گیا " اپنی ہی بہنیں ہیں" "اور اپنی ہی بیویاں ہیں"

" نقاب اڑا تو لڑکوں میں کانا پھوسی ہوئی" "چاند سا نظر آگیا"

اس ہوا کے بھی ہم گنہگاروں پر بڑے احسان ہیں" کمال نے مسکرا کر میری طرف دیکھا پھر ایک با چلتے ہوئے برقعہ کی طرف دیکھا اور پھر وہی جملہ دہرایا "اپنی ہی بیویاں ہیں" پھر تمام لڑکے ہنس پڑے۔ مجھ کو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے میرے منہ پر طمانچہ مار دیا ہو۔ غصہ اور شرم سے میری بری حالت ہو گئی۔ دل چاہا کہ اسی وقت ان لڑکوں کا منہ سیل کر دوں تاکہ آئندہ اس قسم کے جملے نہیں سن سکوں اور نہ کہہ سکیں۔ میں سر جھکائے ہوسٹل کی طرف چل دیا پھر مجھے اپنے پیچھے کچھ جملے سنائی دیئے۔ جب سے دیکھا ہے ظفر صاحب کا منہ

حیرت ...
خواب ہوگیا

... کی کیا ... کیا معلوم کوئی گندا واقعہ کسی سے وابستہ ہو؟ پھر
... بھی چیز ہاتھ نہیں آیا کرتی "
یہ جملے میرے دل و دماغ میں نشتر کی طرح لگے۔ مگر ان کی باتوں
میں بڑی سچائی تھی۔ "جب سے دیکھا ہے ظفر صاحب کا موڈ خراب ہوگیا"
آخر اس میں غلط بھی کیا ہے "کیا معلوم کوئی گندا واقعہ کسی سے وابستہ ہو"
... بھی چیز ہاتھ نہیں آیا کرتی " سچ کہا۔ ہاں! موڈ خراب ہوگیا۔ سچ تو
... گندا واقعہ بھی یاد آگیا ——— جب ایک بار اسکول میں
میں نے سنا۔ اصغر لڑکوں سے کہہ رہا تھا "ظفر کی بہن میری خالہ زاد بہن
کے ساتھ پڑھتی ہے۔ وہ اس کی بہت تعریف کرتی تھی" ایک لڑکے نے
پوچھا "عمر کیا ہوگی؟"
——— ایک ایک جملہ میرے ذہن میں پیوست ہو رہا تھا
اور اس کی چبھن مجھکو بری طرح محسوس ہو رہی تھی۔ "گئی چیز ہاتھ نہیں آیا کرتی"
اور میری خودداری بھی پھر ہاتھ نہیں آسکتی ——— نہیں تو میں تم کو نگاہ اٹھانے
کی بھی مہلت نہ دیتا ——— بیشک! باتیں بالکل صحیح ہیں۔ مگر معنی کا

فرق ہے۔ ان کے لئے ان جملوں میں محض مزاح ہے۔ میرے
لئے ان میں زندگی ہے میرے لئے موت۔ وہ دونوں کے
ان دو جملوں کے۔ وہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ میرے لئے ان ...
پوشیدہ ہیں۔ میں سمجھ سکتا تھا کہ ان کے طنزیہ جملوں کے کیا معنی
دل کی بات سمجھنا چاہتے تھے۔ مگر سمجھ نہیں سکتے تھے۔ میں
بات بخوبی جانتا تھا۔ مگر جاننا نہیں چاہتا تھا ——— میں
نہ تھا۔ کہاں اور کس طرف قدم اٹھ رہے ہیں۔ میرے سامنے
آرہا تھا۔ بار بار رضیہ آرہی تھی۔ بار بار کالے برقعے آرہے تھے
تھیں۔ میرے ذہن کے پردوں میں پھر وہی تلخ جملہ گو...
" اپنی ہی بہنیں ہیں " اور اپنی ہی بیویاں
بہنیں اور بیویاں، بیویاں اور بہنیں، نئی تہ...
نے چار سال میں سیکھا تھا۔ آج اسکو بھلا دینا چاہتا تھا
جملہ پریشان کرجاتا تھا۔
" اپنی ہی بہنیں ہیں ——— اور اپنی ہی بیویاں

اقبال چندری

فاصلے

جب میں اس کے گھر پہلی بار گیا تھا تو وہ مجھ سے ڈر کر اپنی ماں کے پیچھے دبک گیا تھا! پھر اسکی ماں نے اسے اپنی گود میں لیکر مجھے سلام کرنے کو کہا تھا۔ اور اس نے ڈرتے ڈرتے کچھ اس طرح سلام کیا تھا جیسے اس کے سر پر ایک بہت بڑا بوجھ رکھدیا ہو، پھر وہ خود ہی ماں کی گود سے اتر کر گھر میں بھاگ گیا تھا۔

اسکی عمر کوئی پانچ سال کی تھی۔ اور ابھی وہ پوری طرح... لفظوں کو ادا بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے سر پر لمبے لمبے بال تھے جو ہر وقت اس کی پوری پیشانی کو ڈھانپے رہتے تھے۔ اسکی ماں کو بھی اس کے ان سخت بالوں سے شکایت تھی۔ لیکن اس کا خوب صورت چہرہ اس شکایت کو دور کر دیتا تھا۔ اور وہ اسکے بالوں کو پیشانی پر سے ہٹا کر پہلے اسکے رخساروں کو چومتی۔ پھر اسے اپنی آغوش میں لیکر بھینچ لیتی، اسکی اس والہانہ شفقت کو میں زیادہ دلچسپی سے نہیں دیکھتا۔ اور بعض اوقات مجھے پانی کے ایک گلاس کے بہانے اسے اس کی ماں سے جدا کرنا پڑتا۔

پہلے میں اس گھر میں ایک مہمان تھا۔ پھر میری حیثیت ایک استاد کی ہو گئی اور اسکے بعد میں اسکی بیوہ ماں کا شوہر اور اس کا سوتیلا باپ تھا۔ اب وہ مجھ سے بہت زیادہ ڈرتا تھا۔ میں شام کو جب دفتر سے واپس لوٹتا تو وہ کسی گوشے میں بیٹھا اپنی ریل گاڑی چلا رہا ہوتا لیکن۔ میرے قدموں کی آہٹ سنتے ہی وہ اپنے کھلونوں کو ویسے ہی چھوڑ دیتا اور دوڑ کر اپنی ماں سے لپٹ جاتا۔

"کیا ہے کمال" اسکی ماں اسکی حرکت پر کچھ سہم جاتی وہ اپنی ماں کو حیرت سے تکتا رہتا۔ پھر دھیرے سے کہتا۔

"ا——————؟"

اس کی زبان سے یہ لفظ کچھ اس طرح ادا ہوتا جیسے وہ اپنی ماں سے سوال کر رہا ہو۔

میری بیوی میری آمد کی خبر پاتے ہی یکدم وہ اٹھتی اور اسے یونہی مبہوت و پریشان چھوڑ دیتی۔ خدا معلوم وہ کمرے کی چھت میں بڑے بڑے لکڑی کے پایوں پر نظریں جمائے کھڑا رہتا۔ یا کسی گوشے میں تاریک اندھیاروں کو گھورتا رہتا۔ یا پھر اپنی ماں کو میری خدمت میں مصروف دیکھتا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں لیکن اسکی آواز مجھے پھر سنائی نہیں دی۔

شام کھانے کے وقت میں اپنی بیوی سے احتیاطاً پوچھ لیتا "کمال کہاں ہے؟" اور وہ مجھے یونہی بے فکری میں جواب دیدیتی۔ "یہیں کہیں کھیل رہا ہوگا" اور واقعی تھوڑی دیر بعد کمال خاموشی سے کمرہ میں داخل ہوتا اور اپنی ماں سے لگ کر کھڑا ہو جاتا۔ میں اسے سر سے پاؤں تک ایک نظر دیکھتا۔ اسکے بالوں میں گرد بھی ہوئی ہوتی۔ اس کے کپڑوں سے دھول چھٹی ہوتی اور اس کا چہرہ اتنا اداس ہوتا کہ مجھے اپنی بیوی کو اس کی طرف متوجہ کرنا پڑتا۔ میں کہتا "تم کبھی اپنے بیٹے کا بھی خیال کیا کرو۔ دیکھو کس قدر وحشی معلوم ہو رہا ہے جیسے کانوں میں کام کرنے والا مزدور!"

ماں اور بیٹے دونوں خاموشی سے گردن جھکائے میری باتوں کو سنتے اور پھر میں کچھ دیر بعد ان دونوں کو بھول کر اخبار کی بے رنگ خبروں میں گم ہو جاتا۔

لیکن دوسرے دن جب میں دفتر سے لوٹ کر گھر میں داخل ہوتا اور اپنی بیوی کو کمال کے نہلانے دھلانے میں مصروف پاتا تو جانے کیوں مجھے ایک تکلیف سی ہوتی اور میں بغیر کپڑے اتارے کرسی پر دراز ہو جاتا۔

کمال کپڑے بدل کر میرے قریب آتے ہی مجھے سلام کرتا تو میں اپنی اندرونی کشمکش کو دبا کر اسکی پیٹھ تھپکتے ہوئے [illegible]

سات رہنے کی ہمت کرتا۔

بعض اوقات مجھے جانے کیا وحشت ہوتی کہ مجھے کمال کی ہر بات بری معلوم ہونے لگتی۔ وہ جب کبھی بہت خوش ہوتا تو اپنی ماں سے چمٹ جاتا اور اسے اپنے ساتھ کھیلنے پر مجبور کرتا۔ وہ پھر یا تو اسکی ریل گاڑی میں چابی بھرتی یا اس کی فٹ بال کو بار بار اچھال کر اسے واپس اسے کے لئے دوڑاتی۔ یا اس کے ہاتھ میں کرکٹ کا چھوٹا بلّا تھما کر بالنگ کرتی۔ اس کھیل کود میں بعض اوقات وہ دونوں اتنے مگن ہوتے کہ انہیں میرا بھی خیال نہ رہتا۔ میں کچھ ایسی تنہائی محسوس کرتا کہ جیسے میں پھر اسی مقام پر آ گیا ہوں جہاں میں اس نئے رشتے سے پہلے تھا۔ میرا وہ شہر کی گندی آبادی میں ایک محدود کمرہ مجھے پھر اپنے احاطے میں گھسیٹ لیتا۔ میری نظروں کے سامنے وہی دو فرسودہ کلینڈر جن پر گرد کی تہیں جم جم کر گرنے لگی تھیں گھوم جاتے، وہی تاریک گوشہ میرے سامنے بھیانک گول گول دائرے بنانے لگتا جس کو گھورتے گھورتے میرا نوجوان بھائی خودکشی کر گیا تھا اور جس کی مردہ لاش کی پتھرائی ہوئی آنکھیں بھی اسی گوشہ میں گڑ کر رہ گئی تھیں۔

"کمال ـــــــــــــــ" میں زور سے چیخ کر ماں اور بیٹے دونوں کے قہقہے توڑ دیتا۔ میری بیوی میری آنکھوں میں گھورتی اور مجھے غیر معمولی سنجیدہ پا کر سہم جاتی اور کمال اپنی ماں کی ٹانگوں سے چمٹ کر اس طرح کھڑا ہو جاتا جیسے ایک بہت بڑا بھونچال آ گیا ہو جو تمام مکانوں کی دیواروں کو۔۔۔ ایک دھماکے کیساتھ گرا کر اس کے تمام جسم کو پیستا ہوا گذر جائے گا۔

"ابا ـــــــــــــــ؟" وہ پھر ماں کو مجسم سوال بن کر گھورتا۔

اور مجھے ایکدم اپنی وحشیانہ جذباتیت پر غصہ آ جاتا۔ میں اپنے چہرے پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے کہتا "کچھ نہیں کمال، جاؤ کھیلو، اپنی امی کیساتھ کھیلو مجھے جانے کیا ہو گیا تھا۔" پھر خدا معلوم کمال کھیلتا یا خاموش کسی گوشہ میں بیٹھ جاتا۔ مگر میں اسے پھر نہ دیکھتا۔

پھر بہت دنوں میں نے کمال کو اس کی ماں کے ساتھ کھیلتے نہیں دیکھا۔ اس کے تمام کھلونے بھی اس کی ماں نے خانے میں ڈال دیئے تھے۔ اب کمال گھر میں زیادہ تر خاموش رہتا۔ کم از کم میری موجودگی میں اس کے منہ کو کسی قہقہے کی آواز نہ آتی، نہ وہ کسی چیز کیلئے اپنی ماں سے ضد کرتا۔

پھر ایکدن میری بیوی نے شکایت کی کہ کمال باہر بچوں میں کھیلنے لگا ہے۔ پیسے چرا کر بازار کی چیزیں کھاتا ہے۔ میں اسے کیوں کچھ نہیں کہتا۔ میں نے جواب میں صرف "وہ تمہارا بیٹا ہے اور تم ہی اسے درست کر..."

میرے اس جملہ پر میری بیوی کی گردن اس طرح جھک گئی جیسے اسے ایک دم کسی مایوسی نے جکڑ لیا ہو۔ پھر کچھ دیر بعد اس نے مجھے یوں گھورا جیسے وہ میرے دل کی گہرائی چاہتی ہو اور مجھے ایکدم احساس ہوا۔ میرے لہجہ میں ہمدردی کے بجائے ایک تلخی تھی۔ جس سے میری بیوی کو ایک دھچکا لگا۔

مجھے اپنے اس طریق اظہار پر سخت افسوس ہوا۔ میں خاموش ہو جاتا۔ اور بعض اوقات میں اس ناخوشگوار فضا کو دور کرنے کی کوشش میں اپنی بیوی سے کہتا۔

"تم نے کمال کیلئے ایک سوٹ کا کپڑا پسند کیا تھا، آئندہ ماہ دفتر سے لوٹتے وقت اسے لیتا آؤں گا۔ اور ہاں تمہارے بھی تو اب کپڑے نہیں رہے۔ کہیں آنے جانے کے لئے ایک اچھا لباس تو ہونا ہی چاہئے۔ ہم دونوں ساتھ چل کر خود خریدیں گے۔" میری ان باتوں سے میری بیوی کچھ زیادہ خوش نہ ہوتی اور وہ صرف "ہاں" کر کے رہ جاتی۔ مجھے خود بھی ان باتوں کے کھوکھلے پن کا احساس ہوتا اور اس وقت جب میری بیوی شدید فکر کے بوجھ سے سکڑ کر ایک ٹھہراؤ اختیار کر لیتی۔ تو مجھے محسوس ہوتا جیسے میں چوری کرتے کرتے پکڑا گیا ہوں۔ میں اپنی نظریں زمین میں گاڑ کر دل ہی دل میں اعتراف کرتا۔

"مجھے معاف کر دو۔۔۔۔۔۔ بیگم۔۔۔۔۔۔" یہ میری سب سے بڑی شکست ہے"

لیکن میری زبان پر کچھ نہ آتا۔

میں نے اکثر اس الجھن کو دور کرنے کی کوشش کی مگر جس قدر میں اسے سلجھاتا اتنا ہی میں الجھ جاتا۔ مجھے یاد تھا جب اس رشتے سے پہلے میری بیوی نے اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کر مجھ سے پوچھا تھا۔

تم کمال کو ٹھکرا تو نہیں دوگے؟

اور اسکے اس خوف کو انتہائی بے تُکی کا مترادف بتا کر میں نے ایک بڑے ماہر نفسیات کی طرح سوتیلے رشتوں پر ایک لمبا لیکچر دیا تھا جسے سن کر میری بیوی نے خوشی سے دونوں ہاتھ تھام کر سرگوشی کے لہجہ میں کہا تھا:

تمہاری شخصیت کتنی عظیم ہے۔ تم کتنے بڑے آدمی ہو؟

اور اس بات کے دوسرے ہی دن میں کمال کے لیئے بہت سی مٹھائی، چاکلیٹ اور پیپرمنٹ کے پیکٹ اور بہت سے کھلونے لے کر گھر پہنچا تھا، اور میری ہونے والی بیوی مجھے اس طرح دیکھنے لگی تھی جیسے اس کی کھوئی ہوئی چیز اسے پھر مل گئی ہو۔

مجھے شادی سے پہلے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ میں اپنی بیوی اور اسکے بچے کیلئے اتنا تنگ نظر اور تنک مزاج ثابت ہوں گا۔ میں ہمیشہ دفتر سے یہ طے کر کے چلتا کہ آج میں کمال کو جاتے ہی گود میں اٹھا لونگا اور اسے خوب خوب پیار کروں گا مگر گھر پہنچتے ہی مجھے معلوم ہوتا کہ کمال نے میری کسی کتاب پر سیاہی انڈیل دی ہے، یا میرے کسی نامکمل مضمون کے اوراق کو پھاڑ ڈالا ہے، یا میری کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیا ہے یا اس نے میرا قلم بھی کباڑ خانے میں اپنے کھلونوں کے ساتھ چھپا دیا ہے۔ میں سب کچھ میں خاموشی سے دیکھتا لیکن میں کمال کو جب بھی کچھ کہنے کیلئے زبان کھولنا چاہتا مجھے میری بیوی کے وہی الفاظ یاد آجاتے "تمہاری شخصیت کتنی عظیم ہے تم کتنے بڑے آدمی ہو" لیکن میں اب اپنے دل میں خوب سمجھتا تھا کہ میری شخصیت کتنی عظیم تھی۔

ایک دن میں دفتر سے پریشان لوٹا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی مجھے معلوم ہوا کہ کمال نے میرا قلم توڑ دیا ہے۔ میں بے قابو ہو گیا اور کمال کو پکارا لیکن وہ گھر میں نہیں تھا۔ میری بیوی دوڑ کر میرے پاس آئی۔ میں نے اسکے ہاتھ میں ٹوٹا ہوا قلم تھما دیا اور اس نے قلم کی بجائے میرے چہرے کو دیکھا۔ مجھے بے حد غصہ آ رہا تھا۔ ابھی وہ کچھ کہہ بھی نہ پائی تھی کہ کمال باہر سے دوڑتا ہوا آیا اور اپنی ماں کی ٹانگوں سے چمٹ گیا۔

"کمال ــــــــ" میں بے اختیار چیخا۔

میری آواز سنتے ہی وہ اور زیادہ سمٹ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اسے اپنی طرف گھسیٹ کر سخت لہجہ میں پوچھا۔ "میرا قلم کس لئے توڑا؟" اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے اوپر چھت کو گھورتا رہا۔ میرا غصہ تیز ہو گیا۔ اور میں نے ایک زور کا طمانچہ اس کے رخساروں پر جڑ دیا۔

"امی ــــــــ" اس نے ایک چیخ ماری اور اپنے دونوں ہاتھ میری بیوی کی طرف پھیلا دیئے۔ اسکے اس شور پر مجھے اور غصہ آگیا اور اس دن میں نے اسے خوب مارا۔

لیکن اپنی اس حرکت پر مجھے بے حد شرمندگی تھی۔ میں نے اس پورے ہفتہ اپنی بیوی سے کوئی بات نہ کی۔ میں خاموشی سے چوروں کی طرح گھر میں داخل ہوتا اور چپ چاپ ضروریات سے فارغ ہو کر نکل جاتا۔ میری بیوی اکثر میرے سامنے خاموش کھڑی ہو جاتی۔ اس کی آنکھوں میں التجا ہوتی۔ اسکے ہونٹ مرتعش ہوتے اس کا دل دھڑک رہا ہوتا۔ مجھے اپنے مطالعہ میں یہ ہوش بھی نہیں رہتا کہ وہ بہت دیر سے میرے پاس کھڑی ہے!

"تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو؟" میں بوجھل آواز میں یہ لفظ اس طرح کہتا گویا میں اپنی بات کو دہرا رہا ہوں۔ وہ میرے بالکل قریب آجاتی۔ اور میرے بالوں سے کھیلنے لگتی۔ پھر وہ بہت جذباتی ہو جاتی اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگتے۔ پھر وہ آہستہ سے کہتی۔

"کیا میری یہ زندگی بھی مجھ سے چھن جائے گی۔ میرے ذہن میں کیسے کیسے بھیانک خیال آتے ہیں۔ میں اکثر سوچتی ہوں، تم مجھ سے دور ہوتے جا رہے ہو اور میں اکیلی تن تنہا۔ پھر وہی اجاڑ اور ویران زندگی میں سرگرداں، کبھی کبھی جب تم باہر ہوتے ہو تو مجھے اس گھر میں وہی شام کی سی اداسی محسوس ہونے لگتی ہے۔ ہلکی ہلکی چھوں کے ساتھ ایک دہشت ناک آواز۔ پھر ایک ایسی ہلکی چیخ جیسے کسی ظالم نے کسی مسکین کے سینہ میں خنجر پیوست کر دیا ہو اور پھر رات کا

تو خاک ہو جاتا ہی سنتا۔ خدا کے لئے مجھے بتاؤ تم مجھے کیا تو نہ چھوڑ جاؤ گے .... وہ جب بھی اس طرح میرے قریب آکر بیٹھ جاتی کی جیسا کہ یادوں کو دہرانے لگتی۔ میں خاموش آنکھیں بند کئے کرسی پر ایک بے جان انسان کی طرح ساکت و جامد پڑا رہتا۔ وہ میری پیشانی پر جھک جاتی۔ مجھے اسکے تنفس کی گرمی محسوس ہوتی اور یونہی مجھے ایک عجیب بھینی بھینی خوشبو کا احساس ہوتا۔ میں چونک پڑتا جیسے کسی نے مجھے جھنجوڑ دیا ہو۔

"کمال کہاں ہے؟ میں نے اسے آج دیکھا نہیں" میرے اس غیر متوقع سوال پر وہ اپنے ہاتھوں کو میرے بالوں سے یوں کھینچ لیتی جیسے اس نے کسی ناگن کی پھنکار سن لی ہو اور پھر وہ اپنے ہوش و حواس جمع کر کے کہتی۔

"وہ آج جلدی سو گیا۔ میں نے اس غریب کو آج بہت مارا۔"

اور میں اٹھ کر کمال کے قریب جاتا تو وہ نیند میں بھی سسکیاں لے رہا ہوتا۔ میں چاہتا کہ اپنی بیوی سے پوچھوں اس نے آخر کیوں اسے مارا ہے لیکن میرا تجسس کچھ رسمی انداز اختیار کر لیتا اس لئے میں خاموش رہتا اور بستر پر لیٹ جاتا۔

اب کمال روز اپنی ماں کے ہاتھوں پٹ جاتا۔ وہ اب کچھ اتنی تنگ مزاج ہو گئی تھی کہ اسکی ہر غلطی پر اسے تڑ سے ایک طمانچہ جما دیتی اگر وہ بغیر ہاتھ دھوئے کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ یا اس نے فرش پر پانی گرا دیا۔ یا کوئی چینی کا برتن اسکے ہاتھ سے ٹوٹ گیا۔ یا وہ گھر میں دیر سے آیا۔ یا اس نے اپنا سبق نہیں سنایا۔ یا کوئی ایسی ہی معمولی سی بات اسکے لئے آفت جان بن جاتی۔ میں زیادہ تر ماں اور بیٹے کے درمیان خاموش ہی رہتا۔ میرے گھر کے احوال و ظروف میں ایک عجیب سا تاثر تھا، کبھی مکمل خاموشی، جو میری بیوی کے الم ناک آہ و فریاد سے بھی نہیں ٹوٹتی۔ کمال کبھی اگر کسی بات پر چلا اٹھتا تو اس خاموشی کے گراں بار سناٹے میں یوں محسوس ہوتا جیسے کسی شکستہ تاریک محل میں کسی سلطان ابن سلطان کی روح اپنی ویرانی پر قہقہے لگا رہی ہو۔ میں کبھی اگر اپنی بیوی کو مخاطب کرنے کی جرأت محسوس ہوتی تو میری آواز ہونٹوں ہی میں دب کر رہ جاتی اور کبھی کہتے میں کمال یا اپنی بیوی کو زور سے پکارتا تو ہم سب ایک دوسرے کو یوں دیکھتے جیسے ہم سب نے ایک دوسرے کو پہلی بار دیکھا ہو۔ اور کبھی دوست آ جاتا یا میری بیوی کی کوئی ملنے والی آ جاتی تو ہم سب میں اس طرح دلچسپی لیتے جیسے اس نے ہمارے اس رشتہ کی [illegible] دیا ہو۔ اس دن ہم سب خوش ہوتے۔ کمال اگر میرے پاس آتا تو میں اسے پیار کرتا، اس سے مذاق کرتا۔ اسکے بکھرے ہوئے بالوں اور اسکی پیشانی کو چومتا میری اس تبدیلی پر اسے کوئی تعجب نہ [illegible] میں ایک رحم کی درخواست ہوتی۔ لیکن جب ہمارا مہمان چلا [illegible] ایک دوسرے کیلئے اجنبی بن جاتے۔ مجھ پر پھر وہی [illegible] میری بیوی بھی خاموشی سے گھر کے کاموں میں لگ جاتی [illegible] جاتا۔ یا آپ ہی آپ گھر میں کوئی کھیل کھیلتا ہوتا۔ پھر [illegible] ایک عجیب سکون کی جگہ معلوم ہوتا۔ جہاں یوں تو دو ہی کمرے [illegible] محسوس ہوتا جیسے ان دونوں کمروں کے فرش کے نیچے پوشیدہ دروازے بچھے ہوئے ہیں جنہیں میں کبھی بھی کھول کر ایک ایسے [illegible] تک پہونچ جاؤں گا جہاں مسرت و شادمانی ہے اور جو میری منزل ہے، اور ایسے لمحہ جب میری بیوی مجھے پکارتی تو مجھے اسکی [illegible] محسوس ہوتا۔ ایک عجیب سی حلاوت۔ میں انہیں خوابوں [illegible] کے شانوں سے تھام لیتا۔ اسکی نگاہوں میں بلا کی محبت [illegible] چاہتا۔ میں اسے یوں ہی تھامے کھڑا رہا ہوں۔ پھر میں چاہ[illegible] کہہ دوں "مجھے تو سب کچھ یاد ہے جو میں نے اس [illegible] تھا۔ مگر میری زبان نہ جانے کیوں ہونٹوں میں دب کر رہ [illegible] کر اپنی بیوی کے ملبوس میں اپنا چہرہ کو چھپا لیتا۔"

اور وہ خاموش یوں کھڑی رہتی جیسے اس [illegible] لیا ہو۔

لیکن جس دن سے کمال بیمار پڑا تھا ہمارے گھر [illegible] عجیب تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ جیسے جیسے کمال کی حالت [illegible] ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے۔ میں اب دوپہر کو [illegible] کے بجائے گھر ہی پر کھانا کھاتا۔ اپنی بیوی سے کمال کی

جاتا۔ وہ صبح سے شام تک اسکے سرہانے بیٹھی رہتی۔ میں اسکے لئے دوا لاتا۔ اور اس کی حالت سے صبح و شام ڈاکٹر کو آگاہ کرتا رہتا۔ میری بیوی زیادہ تر خاموش ہی رہتی۔ اور اگر کبھی میری طرف دیکھتی تو دیوانوں کی طرح اس کی نظریں مجھ پر جم کر رہ جاتیں اور میں گھبرا کر کچھ دیر کے لئے باہر چلا جاتا۔ پھر کمال پر دورے پڑنے لگے۔ اس دوران میں وہ اپنے ہاتھ پیروں کو مروڑ دیتا اور اس وقت اس کا چہرہ اتنا بھیانک ہو جاتا کہ میں واقعی ڈر جاتا۔ میں ایک مجرم کی طرح اس کے سرہانے کھڑا رہتا۔ بعض اوقات اسکی پیشانی پر ہاتھ پھیرتا۔ کمال کی حالت جب بھی غیر معمولی ہوتی تو میری بیوی اس طرح زرد ہو جاتی گویا اسکے جسم سے تمام خون نچوڑ لیا ہو۔ وہ میری طرف دیکھتی اور میں ڈاکٹر کو بلانے کے لئے دوڑتا

وہ رات بہت بھیانک تھی۔ ہم دونوں کمال کے سرہانے بیٹھے تھے صبح چار بجے کمال کو جو شدید دورہ پڑا۔ میری بیوی سجدے میں گر کر اپنے بیٹے کی زندگی کے لئے خدا سے دعائیں مانگنے لگی۔ میں کمال کو سنبھال رہا تھا اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگے تھے اور اس کا تمام جسم اس طرح بل کھا گیا تھا جیسے لوہے کی ایک لمبی پتی کو مروڑ دیا ہو۔ پھر کمال کی ایک چیخ نکلی میری بیوی دوڑ کر آئی۔ کمال واپس سکون کی حالت میں آ گیا۔

"کمال ...... کمال بیٹا" میری بیوی آہستہ سے پکاری۔ لیکن کمال خاموش تھا۔ "کمال بیٹا۔ دیکھو تمہارے ابا آ گئے" میری بیوی پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ کمال نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھولیں ایک لمحہ مجھے دیکھتا رہا پھر سرگوشی کے سے انداز میں بولا۔

"ابا" ...... وہ اب بھی مجھے گھور رہا تھا۔

"ہاں بیٹا میں آ گیا" میں نے جھک کر اسکی پیشانی کا بوسہ لیا میرا دل ایک غیر معمولی جذبۂ محبت سے بھر آیا تھا اور ہزار ضبط کے باوجود میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔

"ابا" ...... کمال نے ایک بار پھر دہرایا۔

"ہاں بیٹا" میرے لہجے میں اب عاجزی تھی۔

کمال نے آہستہ کروٹ بدلی اور پھر وہ آرام سے سو گیا۔

میں نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش تھی لیکن اسکی آنکھیں ایک حقیقی مسرت کے احساس سے چمکنے لگی تھیں جیسے وہ کہہ رہی ہو۔ "تمہاری شخصیت کتنی عظیم ہے۔ تم کتنے بڑے آدمی ہو؟"

(ختم شد)

اکرام الفت مجوری •

اگر قائد اعظم ہوتے

جہد و تدبیر کے اسباب فراہم ہوتے
یوں نہ گھر گھر میں یہ ہنگامۂ ماتم ہوتے
سر پہ لہرائے ہوئے دین کا پرچم ہوتے
زیرِ سایہ اسی پرچم کے منظم ہوتے
دور صوبائی تعصب سے بہت ہم ہوتے
آج دنیا میں اگر قائد اعظم ہوتے

تھا انگریزوں کے انگریزی بھی ضرورت ہوتی
دور کب کی سرِ مسلم سے یہ لعنت ہوتی
ہر طرف ملک میں اردو کی حکومت ہوتی
اور بنگلہ کو شکایت کی نہ جرأت ہوتی
حوصلے ہوتے نہ بنگلہ کے یہ دم خم ہوتے
آج دنیا میں اگر قائد اعظم ہوتے

اہلِ کشمیر پہ ہوتے نہ شب و روز ستم
اب بھی تاراجِ خزاں رہتا نہ یہ باغِ ارم
یوں جھجکتے نہ ہرگز کبھی ہم رکتے قدم
دیکھتے آج وہاں سبز ہلالی پرچم
غیر ہوتا نہ کہیں آج ہمیں ہم ہوتے
آج دنیا میں اگر قائد اعظم ہوتے

صرف بیجا نہ کبھی ملک کی دولت ہوتی
تم کو ہم سے نہ ہمیں تم سے شکایت ہوتی
یوں نہ اکرام کبھی قوم کی حالت ہوتی
میٹروپول میں ہر روز نہ دعوت ہوتی
تال طبلوں پہ نہ یہ رقص چھما چھم ہوتے
آج دنیا میں اگر قائد اعظم ہوتے

مشتاق راہی •

○

جنونِ عشق میں جیب و گر
غموں کی ضربت کاری سے دا
مئے گلگوں بت سیمیں چھنا چھر
بتاؤ اور بربادی کے کیا آ
نہ رو اپنے مقدر پر گلستاں
کہ پھولوں ہی کے دامن میں
نہ عزت ہے نہ حشمت ہے نہ الفت
کہ ہر اک گام پہ طوفاں سے ہم
کسی کے حالِ دل پر مسکرانا سب کو آتا
بھری محفل میں کتنے ہمنشیں غمخوار ہوتے ہیں

رحمٰن نشاد ●

○

چھوڑ دے ساغر و مینا کے فسانے اے دوست
آج افسانۂ دل دہر سے کہنے دے مجھے!
مجھ پہ اب ڈال نہ مے ریز نگاہیں اپنی
وقت جو کچھ بھی دکھائے وہی سہنے دے مجھے

دیکھ ہر سمت بلاخیز گھٹا چھائی ہے!
کتنے چہرے نظر آتے ہیں امیدوں کے مزار
ان فلک بوس محلات کی دہلیزوں پر
کتنے سینوں میں سلگتا ہے امنگوں کا غبار

دیکھو چاندی کے چمکتے ہوئے سکوں کے عوض
آج مخمور نگاہوں کی ضیا بکتی ہے
عصمتیں چیختی پھرتی ہیں بچاؤ کے لئے
آج بازار میں عورت کی حیا بکتی ہے

اے میرے دوست مزیدار سی لغزش کے سوا
آخر ان مرمریں باہوں کا سہارا کیا ہے
میرے ماحول میں آوازِ فغاں رقصاں ہے
دیکھ اس وقت زمانے کا تقاضا کیا ہے

وقت نے ہم کو پکارا ہے کہ ہم سب مل کر
زندگی بخش روایات نمایاں کر دیں
آؤ ہم وقت کے سینہ میں شرارے بن کر
[illegible] تا فضا [illegible] آغاز کر دیں

خواجہ شورش کاشمیری ●

○

بعد مدت باغ میں بادِ صبا آئی تو ہے
چند کلیوں کے چٹکنے کی صدا آئی تو ہے

تیری کشتی نے تھپیڑے موج کے کھائے بہت
بحر میں بادِ مراد اے ناخدا آئی تو ہے

صبر کر اے قلبِ مضطر آ گئی منزل قریب
زندگی کے غمکدے میں کچھ ضیا آئی تو ہے

تشنگی رندوں کی ساقی اب فرو ہو جائیگی
آسماں پر پھر نظر کالی گھٹا آئی تو ہے

بند تھی مدت سے شورش مہربانوں کی زباں
شکر ہے ان کے لبوں پر بد دعا آئی تو ہے

فضل حق اللہ •

منٹو بھتیجے کے نام "ایک خط"

چچا سام کی ط

بمقام خاص واشنگٹن شہر

از طرف چچا سام بمطالعہ عزیزی سعادت حسن منٹو ساکنہ لاہور پاکستان

برخوردار خوش اطوار۔

السلام علیکم کے بعد واضح ہو کہ یہاں ہر طرح سے خیریت ہے اور خیریت تمہاری خداوند کریم سے نیک مطلوب ہوں۔ صورت احوال یہ ہے کہ تمہارے دونوں خطوط کی سعادت سے آگاہی ہوئی اور دل کو خوشی ہوئی۔ پیشتر اسکے کہ میں مزید کچھ لکھوں پہلے تمہاری حیرت دور کئے دینا چاہتا ہوں کہ یہ خط میں اردو میں کس طرح لکھ رہا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے اردو زبان سیکھ لی ہے اور اب میں اردو پڑھ اور لکھ سکتا ہوں۔ تم پوچھو گے چچا جان یہ کیسے ہوا میں نے اردو زبان کا علم کیسے حاصل کیا؟ تو برخوردار اس کی کہانی اس طرح ہے کہ برخوردار میکارتھی نے مجھے بتایا کہ ایک ایسی عالمگیر زبان بھی ہے جو سرکاری تو کہیں بھی نہیں مگر چالیس کروڑ انسان اسے برِ عظیم پاک و ہند میں سمجھتے ہیں اور اسکے علاوہ بھی اس کی رسائی دور دور تک ہے۔ پھر میں نے سنا کہ آنجہانی ملکہ وکٹوریہ یہ زبان جانتی تھیں اور اس زبان میں اپنا ڈائری لکھتی تھیں تو برخوردار پھر تو گویا میرے سمندِ شوق کو ایک تازیانہ لگا اور مہینوں کا سفر دنوں میں طے ہو گیا۔

تمہارا پہلا خط پچھلے سال جنوری میں ملا تھا اس کے پہنچتے ہی میں نے تمہاری خواہش کے مطابق تمہارے بھائی جان آرسکاٹ کولڈ ویل اور اس جج کو جس نے اسکے مقدمے کا فیصلہ کیا تھا تمہارا سلام پہنچانے کا بندوبست کر دیا۔ اس جج کا نام تو مجھے بھی معلوم نہیں۔ دراصل میں اس معاملے میں زیادہ دلچسپی بھی نہیں رکھتا ہماری مصروفیات اتنی ہوتی ہیں کہ بس کچھ پوچھو ہی نہیں، پچھلے سال تو نالائق —— روزنبرگ میاں بیوی کی وجہ سے ایک مستقل دردِ سر رہی۔ الحمد للہ کہ بھائی جان... میکارتھی کی بدولت یہ شاخسانہ بھی بخیر و عافیت اپنے انجام کو پہنچا۔ خیر تو دراصل میں یہ کہنے والا تھا کہ خط لکھنے میں دیری کیوں ہوئی۔ تمہارے دونوں خطوط لکھنے کا مقصد دیری معلومات کے مطابق یہ ہے ۔۔ معلومات بغیر مجھے ناروا آفس کی بدولت لی ہیں۔ خیر۔ تو خط لکھنے میں دیر اسلئے ہوئی کہ

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا

یعنی خط لکھنے کے لئے میں نے کوئی ضرورت ہی محسوس نہ کی اور تمہیں کوئی وجہ نہ ہو خط لکھنا بہت اچھی بات نہیں ہوتی بقول غالب

تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے

بات دراصل یہ تھی کہ تم نے ایک ترقی پسند اور ناول نگار کو کچھ سوال پوچھے تھے میں نے معلومات حاصل کیں اور بھائی جان سے کیا تو انہوں نے کہا کہ جواب دینے کی چنداں ضرورت نہیں پاکستان بحران کے دور سے گزر رہا ہے اس کا حل سب کو معلوم ہے، پھر اس سال کا قصہ سنایا جس کی پیشری تمہارے یوم آزادی کے مظاہرے (ان دنوں وہ لاہور میں تھی) بھائی جان میکارتھی نے کہا تھا کہ ڈ سالی) بھائی جان جان دیل کو کوس رہی تھی کہ نالائق نے خواہ آزاد کر کے لوگوں کو سر چڑھا لیا ہے، پہلے بھی تو وہاں قحط پڑا حرفِ شکایت تک —— لب پہ نہ لاتے تھے اور نہ ہو جاتے تھے، اب دیکھو چائے کی ایک پیالی پینے بیٹھو تو ہیں۔ بھائی جان میکارتھی نے کہا کہ سعادت حسن منٹو لکھا پڑھا افسانہ نگار بھی ہے تو غریب آدمی، تمہیں معلوم ہوں گے ایک عام آدمی ایسی باتیں کرے تو اسے واہیات کہتے ہیں مگر ایسی باتیں کرے اور اسے چھپوا دے تو اسے ادب کہا جاتا ہے، جاتی ہے اور رسالے والے ان کی تقریر چھاپ کر اتنے فخر کا تو جواب لکھنے کی ضرورت زیادہ محسوس نہ ہوئی۔ یہاں یہ بھی امریکہ تمہیں پسند ہے، بقول تمہارے یہاں کی ہر چیز تم لے پسند کرتے ہو خیال اپنا اپنا پسند اپنی اپنی۔

جب تمہارا دوسرا خط پہنچا تو پاکستان کو تحفہ گندم پیش کرنے کی اسکیم نہ صرف منظور ہو چکی تھی بلکہ اس کی ایک قسط پاکستان کو بھیجی بھی جا چکی تھی اور وہاں پہنچ بھی چکی تھی۔ ہم اسکی پبلسٹی چاہتے تھے، تم پوچھو گے کیوں؟ برخوردار نیکی کر اور دریا میں ڈال کا زمانہ لد گیا اب تو انسان فطرت کے قریب ہو رہا ہے تم کسی کے ساتھ نیکی کرو تو تمہاری خواہش ہوگی کہ وہ کہے "شکریہ" اور تم پھول کر کہنا ذکر کیجیے جیسے تمہیں پہلے ہی نہ ہو — کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں یہ تو میرا فرض تھا تو تمہارا یہ جذبہ بالکل فطری تھا۔ خیر! لیکن اسکے برعکس ہماری خواہش پوری نہ ہوئی یعنی خاطر خواہ پبلسٹی نہ ہوئی، تو ہمیں تشویش پیدا ہوئی۔ بھائی جان بیکار تھے سے مشورہ کیا۔ انھوں نے تمہارا ذکر کیا اور کہا کہ تمہیں خط لکھنا چاہیئے۔ میں نے انکے مشورہ بترمیم قبول کیا کہ دونوں خطوں کا جواب لکھنا چاہیئے۔ امید ہے کہ تم اس تاخیر کو مائنڈ نہیں کرو گے۔

برخوردار میں نے سنا ہے کہ تمہارے ملک کے ادیب بڑے عجیب و غریب ہوتے ہیں یعنی وہ ملاقات کی طرح ادب کی تخلیق کے لئے بھی کوئی نہ کوئی تقریب چاہتے ہیں، چنانچہ تمہارے ایک نقاد کے متعلق میں نے سنا تھا کہ تمہارے ہاں ایک نہر کھدی اور کسی قسم کا ادب تخلیق نہ ہوا تو اس نے چلانا شروع کر دیا "بھائیو اس نادر موقع سے فائدہ اٹھاؤ" چنانچہ تم نے ہی اس پکار کو سنا اور ایک افسانہ لکھا۔ (برخوردار ہاں لیا کیا بات پیدا کی ہے۔ نومولود کا نام یزید رکھا — یہ پانی گھوڑے گا بند نہیں کرے گا۔ واللہ! مزا آگیا، واہ! واہ، واہ! واہ)۔ تو اب برخوردار تمہارے ملک میں ایک بڑا واقعہ پیش آیا ہے۔ اطلاعاً عرض ہے — کیا خیال ہے؟

تم نے اپنے دوسرے خط میں میرے سفارتی دفتر کے کسی نمائندہ کا ذکر کیا تھا جو افسانہ لکھنے کے لئے "پیشگی" روپیہ دے گیا تھا اگر تم نے یہ کہا تھا کہ افسانہ میں اپنی مرضی کے مطابق ہی لکھوں گا۔ برخوردار تمہیں دراصل غلط فہمی ہوئی ہے، ہم تم پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کرتے تم پوچھو گے کیوں؟ تو سنو کہ اس میں بھی راز کی بات ہے، دراصل پروپیگنڈہ دو دھاری تلوار ہوتی ہے اس کی ایک دھار تعریف اور حمایت ہے جب کہ دوسری مذمت اور مخالفت، پہلی کند ہے جب کہ دوسری تیز۔ اب دیکھو اگر تم ایک افسانہ لکھو "[illegible]" عنوان ہو اور تم اس میں [illegible] والے گیہوں [illegible] جنت سے نکل جانے کی نہیں بلکہ اسے جنت میں [illegible] کہ اس نے امریکی گندم کھائی ہے جو [illegible]

نہیں کرتی بلکہ انتشار ترقی ہے کیونکہ وہ دیسی نہیں بدیسی ہے تو اس طرح تمہیں بھی فائدہ ہوگا اور ہمارا بھی بھلا ہوگا۔ اشارہ کافی است!

تمہارے ایک سوال کا جواب تو مل گیا۔ اب باقی سوالات یا استفسارات کا جواب سنتے جاؤ

تم نے پوچھا تھا چچا جان تمہارے ملک میں بھی فحاشی؟ سو برخوردار میں اس کا کیا جواب دوں؟ اگر تمہیں مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو اور سوالات پیدا ہوں گے اور میں چاہتا ہوں کہ تم تاعمر برخوردار ہی رہو، تمہاری خاطر یہ کہتا ہوں کہ اسے ایک مجبوری سمجھ لو، اور [illegible]، کیپولنٹ، کوئی کولاں کورولیا، کشمیر وغیرہ کو بھی مجبوری ہی سمجھ لو۔ آخر بندہ بشر ہے مجبور، مجبور ہے بقول میر ؎

ہم مجبوروں پر یہ ناحق تہمت ہے خود مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

سعادت مند بھتیجے تم نے لکھا ہے کہ تمہارے یہاں کی خانہ ساز شراب بالکل خانہ خراب یعنی زہر ہوتی ہے یعنی نشے کے علاوہ خودکشی کے کام آتی ہے بھتیجے میں نے تو کچھ اور ہی سن رکھا تھا۔ یہ شعر مجھے ابھی تک نہیں بھولا ؎

پروردہ دہقان سبھی لا کے پلا دے
ٹھیکے کی شرابوں سے تسلی نہیں ہوتی

اسکے لئے "رطل گراں" کا لفظ بھی سنا تھا ——

ساقی بیار رطل گراں زاں مے کہ دہقان پروردہ لیکن تم نے پھر اور ہی قصہ [illegible] جلد لکھو کہ "پروردہ دہقان" اور "خانہ ساز" میں کوئی فرق ہوتا ہے کہ نہیں؟ تاکہ میں اپنی اس فرمائش کا ذکر کروں جو اب تک کراچی پہنچ چکی ہوگی۔

اور یہ تم نے لکھا ہے کہ "چچا جان تمہارے ہاں اتنی ننگی ٹانگیں کہاں سے آجاتی ہیں؟" تو برخوردار اس کا جواب بھی چنداں مشکل نہیں بات دراصل یہ ہے کہ بات کچھ بھی نہیں ساری گڑبڑ فاصلہ کی ہے اور اسلئے قصور تمہارا [illegible] یہاں سے ڈاک ایٹ پہنچتی ہے، اطلاعات یوں دیر سے پہنچیں تو قصور تمہارا نہیں اطلاعات کا ہوگا۔ تمہارا یہ سوال [illegible] سوچنے لگا۔ [illegible]

والی اطلاعات کا شکریہ۔ تمہارا یہ انکشاف سن کر ہم بہت خوش ہوئے کہ ننگی ٹانگوں کو مشہور ماں ضرورت نے جنم دیا ہے جس کی آغوش مادریت پر ضرورت نامی دایہ ڈالنے والی ہے اور جو اسے جنم دینے کے بعد مادرانہ شفقت سے پرورش کرتی ہے۔ پبلک کی ایک ضرورت تھی اور پبلک کو معلوم بھی نہ تھا کہ اسے کسی چیز کی ضرورت ہے۔ ماہرین جان گئے کہ پبلک کی ایک ضرورت ہے جسے پورا کر کے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ کل تک جب تک کہ جمہوریت کا نام و نشان نہ تھا یہ ضرورت بادشاہ کو لاحق ہوتی تھی اب پبلک کو لاحق ہو رہی ہے کہ آج کی ضرورت کیا ہے بہرحال اتنی ننگی ٹانگیں پیدا ہو گئیں —————— لیکن برخوردار تم ابھی اس کا "راز" بھی نہیں جان سکتے تو کل جب ہم زندہ مرد عورتیں اور بچے درآمد کریں گے اور وہ اسٹیج پر باقاعدہ رقص ہونگے اور مریں گے تو پھر تم کہیں پاگل نہ ہو جاؤ اس لئے پیشگی سن لو کہ یہ مرد عورتیں اور بچے کارخانوں کے پیدا کردہ ہونگے لہٰذا جس طرح ایک فلم کے ضائع ہو جانے سے چند ڈالروں سے میرا مطلب ہے صرف چند روپوں سے محروم ہوتے ہو اس طرح چند فیکٹری پروڈیوسڈ آدمیوں کے مرنے کا مطلب بھی یہی ہوگا کہ چند ڈالروں کا نقصان ہو گیا اللہ اللہ خیر صلّا۔

اس انکشاف پر تم ہکا بکا رہ جاؤ گے یہ بات بالکل قدرتی ہے کہ تم حیران رہ جاؤ دراصل قصور اس تاخیر کا ہے جو فاصلے کی وجہ سے ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ باتیں تمہیں شاید نصیب نہیں ہو سکیں گی جس طرح تمہارے ابا کو اور شاید تمہیں بھی ابھی تک غالباً ٹیلیویژن دیکھنا نصیب نہیں ہوا ہو گا حالانکہ ہمارے ہاں اب یہ روز مرہ کا معمول ہے چند برس بعد جب میرے بیٹے اس سے اکتا جائیں گے تو پھر یہ تمہارے ملکوں میں بھیج دیے جائیں گے آؤٹ آف فیشن کوٹ پتلونوں کی طرح۔ برخوردار اصل بات یہ ہے کہ میرے بیٹے ذرا شوخ واقع ہوئے ہیں اور کانٹھ کے پکے ہیں۔ جب وہ کسی چیز سے اکتا جاتے ہیں تو دام وصول کرنے کے لئے انہیں تمہارے ہاں دھکیل دیتے ہیں اور آفرین ہے تمہارے تم بھی بڑے برخوردار سعادت مند ہو خندہ پیشانی سے قبول کر لیتے ہو۔ حتیٰ کہ نظام حیات بھی۔ ایمان کی بات ہے کہ ہم اس پبلک سے تنگ آ چکے ہیں اور ہمارے مدبر سوچ رہے ہیں کہ کوئی بہتر نظام بھی ہو سکتا ہے کہ نہیں مگر تمہارا ایک فرد دانشمند یہ دعوےٰ کرتا ہوا نہیں سماتا کہ ہمارا جمہوری نظام سب سے اچھا ہوگا۔ آفرین ہے مگر تمہارے مدبروں پر اور آفرین ہے تمہارے عوام کے جو اس قسم کے مدبروں کے دیوانے ہیں۔

میں نے سنا ہے کہ آج کل تم ہسپتال بھی ہسپتال دماغی امراض کا ہسپتال ہو گا جسے تمہارے ہاں (سنا ہے) پاگل خانہ کہتے تھے لیکن عجیب بات ہے جہاں گھر سے لی ہوئی دو منزلہ عمارت قطع کہ جگت کے طور پر اور جہاں دماغی امراض کا ہسپتال پاگل خانہ کہلاتی ہے۔

آخر میں ایک نصیحت سنو اور اس پر پاکستان میں برخورداری عمل کا کو خط سمجھانا کہ تار اور تھوڑے کو تھوڑا اور زیادہ کو زیادہ جاننا کرنا یہ لکھنے کی ضرورت اسلئے محسوس ہوئی کہ سنا ہے کہ تمہارے کو انہیں یہ نصیحت کی جاتی ہے کہ خط کو تار اور تھوڑے کو زیادہ سمجھنا۔ اس نصیحت پر عمل کیا جائے تو کیا ہو۔ یعنی معمولی سا خط تار بن کر اس کا اختصار کوئی اخباری مضمون بن جائے۔

تم نے پہلے خط کے آخر میں لکھا تھا کہ یہ شیخ اسٹیمپ نہیں پوسٹ نہ کر سکے برخوردار تم غالب کے معتقد ہو اس کی سنت پر کہ چونکہ یک رنگی مقصود ہے اسلئے بے رنگ بھیج رہا ہوں۔ اور یہ مع ترجمہ اور سینہ تمہاری بے شمار تصویروں کے یہاں کے اخبار میں شائع ہوتا اور یوں تمہارے ارمان بھی پورے ہو سکتے۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تمہیں صحت عاجلہ عنایت فرمائے ملت کے کسی کام آسکو۔ تمہاری ملک و ملت کو بڑی ضرورت۔ خدا نے تم اکیلے کیوں گئے مجھ بوڑھے کو کیوں نہ ساتھ لے گئے، میری ضرورت ہے؟ بچوں کو پیار، بڑوں کو سلام۔ تمہارا چچا سام۔

بمقام خاص شہر لاہور۔

مال روڈ، لکشمی مینشنز

پاس سعادت حسن منٹو، کے مشرف باد۔

(بیرنگ ہونے کی بدولت یہ خط واپس کر دیا گیا مگر منٹو استادی یہ کی کہ اس کی ایک نقل رکھ لی، مگر احتیاج بری بلا ہے، میں شامل کی گئی جو ردی بکے اور یوں یہ نادر روزگار دستاویز کے طفیل مجھ تک اور اب بحرمت قارئین مشیر تک پہنچ رہی ہے

افتخار اعظمی

ڈائری

(مسلسل)

میں نے اپنی ڈائری مختلف اوقات میں لکھی ہے اس میں جو واقعات و واردات ہیں، وہ نہایت سچے ہیں، میں جن حالات سے دوچار ہوا اور جن مناظر نے مجھے متاثر کیا، انھیں بلا کم و کاست بیان کرنے ہی پر میں نے اکتفا نہیں کیا بلکہ انھوں نے جس طرح میرے احساس و فکر کو ابھارا، اسے بھی میں نے بیان کرنے کی کوشش کی، ڈائری پہلے بھی لکھی گئی ہے، یادداشتوں میں ادبا نے صرف اپنے نجی حالات ہی نہیں قلمبند کئے ہیں بلکہ سماجی زندگی کے بہت سے گوشوں کو کسی نہ کسی نوع سے سمیٹنے کی کوشش کی ہے، شیخ سعدی کی گلستاں میں آپ بیتی، یادداشت اور سفرنامہ کا ایک ملا جلا رنگ ہمیں ملتا ہے، گورکی کی آپ بیتی میں زندگی کے بہت سے مسائل ہمیں بکھرے نظر آئیں گے، ڈائری بہر نوع ایک نہایت لطیف صنفِ ادب ہے جس کی ڈائری جن کی نگاہوں سے گذری ہے وہ اچھی طرح اس صنفِ ادب کی اہمیت سمجھ سکتے ہیں میں نے اپنی ڈائری میں واقعات و مناظر کی عکاسی کے ساتھ ساتھ اپنے جذبات و احساسات اور افکار و خیالات کو بھی بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ میری ڈائری کے یہ اوراق چونکہ انجمن تعمیر پسند مصنفین (میرٹھ) اور انجمن تعمیر پسند مصنفین (بمبئی) کے مختلف جلسوں میں ارباب ذوق نے پسند کئے اس لئے ارادہ ہوا کہ ڈائری کے جستہ جستہ حصے ناظرینِ "مشیر" کے سامنے کبھی کبھی پیش کروں۔

(افتخار اعظمی)

ایک لمحۂ فکر

رات کے دو بجے ہیں، مالابار ہل[1] کی پرسکون فضا ہے۔ سارا عالم محوِ خواب ہے، میں بھی چاہتا ہوں کہ سو جاؤں لیکن پتہ نہیں کیوں آج نیند مجھ سے روٹھ گئی ہے،... نگاہیں کچھ ڈھونڈ رہی ہیں، دل کسی شے کی تلاش میں ہے لیکن وہ شے کہاں ہے، یہ اسے نہیں معلوم، دلِ بیتاب کو کیسے مناؤں، سمجھ میں نہیں آتا،

گھر کے باہر چمن کی حسن آفرینیاں ہیں۔ "گلزارِ خانۂ چمن" پر چاند اپنے جلوے نثار کر رہا ہے۔ اور ستارے اسکی اس ادائے نوازش پر مسکرا رہے ہیں جو صبا آتی ہے اور سبزہ و گل کو چھیڑ کر چلی جاتی ہے جب دلِ بیتاب کی سیمابی کیفیت زیادہ بڑھی تو میں اپنے کمرے سے نکل کر چمن کی "بزمِ رنگین" میں آیا۔ سوچا کہ شاید ان لطیف جلوؤں سے طبیعت بہل جائے لیکن اسکے برعکس جلوۂ مہتاب نے تو "شوریدگیِ قلب" کچھ اور بڑھا دی، پہلے تو میں اسے نگاہِ شوق سے دیکھتا رہا پھر اس سے مخاطب ہو کر یہ کہا ؎

تو نکلتا ہے تو بڑھ جاتی ہے بیتابی مری
مجھ کو تڑپاتی ہے خود تقدیرِ سیمابی مری
مجھ کو کر دیتا ہے سودائی یہ نظارہ ترا
دیکھتا رہتا ہوں میں روئے جمالِ آرا ترا

"ذوقِ جستجو بھی عجیب چیز ہے حیرانی ذیلے تابی کا یہی سرچشمہ ہے" دلِ بیتاب کی شوریدگی کچھ بے وجہ نہیں ہے۔ وہ کسی شے کی تلاش میں ہے جو اسکی

---

[1] مالابار ہل بمبئی کا نہایت پرسکون حصہ ہے سمندر کے کنارے واقع ہونے کی وجہ سے حسن و دلکشی کا مرقع ہے۔

سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ کسی معصوم فطرت کو پوچھ رہی ہے سبزۂ گل کی حسن آفرینی، ماہتاب کی خوش خرامی اور ستاروں کی جلوہ طرازی اسکے لئے ایک مستقل سوال ہے۔ چمن کی یہ بزم رنگین کس نے سجائی۔ پھولوں کی یہ "رنگینی تبسم" کہاں سے ملی۔ ستاروں میں یہ روشنی کہاں سے آئی۔ چاند نے یہ "طرزِ خوش خرامی" کس سے سیکھا۔ موجِ صبا کو یہ "حسنِ خرام" کس نے عطا کیا۔ شاخوں کو یہ پھولوں کے زیور کس نے پہنائے اور شبنم کو یہ "پاکیٔ طینت" کس نے بخشی۔ کیا یہ چاند کسی "مہرِ درخشاں" کا "فروغِ مستعار" ہے۔ کیا یہ شبنم کسی "چشمۂ ابدی" کا ایک قطرہ ہے۔ کیا یہ ستارے کسی نورِ بسیط کے بکھرے ہوئے جلوے ہیں؟

یہ کس کے روئے انور کا ہے فیضِ پرتو افشانی

کہ پائے جلوہ ہائے تو بتو مہرِ درخشاں نے

بعض اہلِ خرد کہتے ہیں کہ "نہیں۔ کوئی چمن آرائے بزمِ وجود نہیں"۔ کیا میں ان "کج نہادِ عالم" کی بات مان لوں، اگر ان کی یہ بات تسلیم کر لیتا ہوں تو پھر میری حیرانی و آشفتہ سری کا ان کے پاس کیا علاج ہے۔ میری تشنگی بھی بڑھتی... جا رہی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ یہاں کوئی "چشمۂ حیواں" نہیں۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ یہ بزمِ ہستی کس نے سجائی؟ اور انسان اس بزم کا صدر نشین کیوں بنا؟ کیا یہ کارخانۂ ہست و بود کوئی مداری کا کھیل ہے جس کا کوئی حاصل نہیں؟ سیاروں کی گردش، اور ستاروں کا رقص کیا کسی سوچے سمجھے مقصد کے تحت نہیں؟ کیا ہم اپنی تگ و دو کے باوجود آشنائے منزل نہ ہو سکیں گے۔؟

"ارباب خرد" سے یہ باتیں میں پوچھتا ہوں، وہ کہتے ہیں کہ "روشنی عقل کے سایہ میں چلتے رہو، ممکن ہے تمہیں منزل مل جائے"۔ لیکن میں ان سے کہتا ہوں کہ میں نورِ عقل کے سایہ میں کب تک چلوں۔ میں تو چلتے چلتے تھک گیا، پھر بھی منزل تو الگ رہی "نشانِ منزل" بھی مجھے نہ مل سکا۔ عقل و ادراک کے تمام سہاروں نے اس راہ میں جواب دیدیا، "روشنیٔ خرد" تو چند مراحل طے کرانے کے بعد ہی بجھ گئی، اب میرے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ کیا اس اندھیرے میں یونہی ایک گم کردہ راہ کی طرح پھرا کروں یا اس "چشمۂ نور" کی طرف قدم بڑھاؤں جو اس تمادی ظلمت سے بہت ماورا ہے اور جسے لوگ "وحیِ الٰہی" کہتے ہیں۔ ارباب خرد کہتے ہیں کہ وہ "چشمۂ حیواں" نہیں بلکہ ایک سراب ہے، وہاں جانا لا حاصل ہے لیکن اب تو میں ضرور جاؤں گا کیونکہ وہ میرے اضطرابِ قلب کا کوئی علاج نہ کر سکے، میری بے چین طبیعت کو سکون نہ دے سکے اور مجھے معتقدات کا کوئی حل نہ بتا سکے۔ کیا اسکے باوجود میں انکے در پر سرِ تسلیم خم کئے رہوں۔ کہ چشمۂ حیوان نہیں، سراب ہے لیکن میں ان باتوں پر کیسے یقیں کیوں نہ دیکھ لوں، آخر وادیٔ خیال میں کب تک بھٹکتا پھروں۔ بقول حسان بن ثابت "اس پیاسے کی مانند ہے جو چلچلاتی دھوپ کی چوٹی پر حیران و سرگرداں کھڑا ہو لیکن اسے کہیں چشمۂ آب نہ ملے۔" ایسی حالت میں کیوں نہ "فیضانِ سماوی" کے دامن میں

(باقی ۔ ۔)

افتخار اعظمی

ہوائے تُند جو اس طرح گلستاں میں چلے
چراغِ لالہ چمن میں جلے تو کیسے جلے

اُجاڑتے ہیں چمن کو یہ پاسبانِ چمن
خدا کرے کہ اب انکی چمن میں کچھ نہ چلے

یہ رہنما کہیں لُوٹیں نہ رہزنوں کی طرح
چلے جو راہِ طلب میں ذرا سنبھل کے چلے

چمن کے فیض سے محروم ہوں چمن والے
متاعِ لالہ و گل صرف باغباں کو ملے

کہے کوئی اسے آزادیٔ چمن — کیونکر
ہوائے تُند چلے یاں مگر صبا نہ چلے

ہوئی نہ پھر بھی نمودِ رُخِ سحر انور!
ستارے شب کے بھی گو جھلملا کے ڈوب چلے

اعتذار

گزشتہ شمارے میں جناب افتخار اعظمی کی نظم "ابوالاعلیٰ مودودی" کے آخر کے شعر میں ایک غلطی ہو گئی ہے۔ قارئین تصحیح فرمالیں

غلط :- "تونے ملت کو سنایا پھر نوائے جبرئیل"

صحیح :- "تونے ملت کو سنائی پھر نوائے جبرئیل"

——— ایڈیٹر شہید کراچی

رفعت شمیم

قطعات

دُور تک پگڈنڈیوں کی طرح بل کھاتی ہوئی
جا رہی ہے میرے بہکے سے خیالوں کی ڈگر
ڈر ہے خود ہی کھو نہ جاؤں پیچ و خم میں اس کے
کِس قدر دشوار ہے یہ زندگانی کا سفر

وقت کے تیز قدم اور بھی اب تیز ہوئے
ڈگمگاتے ہوئے قدموں کو خبردار کرو
ٹمٹماتی ہوئی شمعوں کا سہارا کب تک
دل کے شعلوں سے شبِ غم کو ضیا بار کرو

ایک کہانی پوری ہوئی

ڈین کے آفس سے باہر نکلتے ہوئے گھنٹے کی ٹن ٹن نے ڈاکٹر زیدی کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ گردن گھما کر اور موٹے فریم کی سیاہ عینک کو ٹھیک کر کے انہوں نے دیکھا گھنٹے میں گیارہ بج رہے تھے مگر بڑی سوئی ابھی تک دس تک کا پہنچی تھی۔ زور سے ہونہہ کہہ کر انہوں نے بیگ اٹھائی اور دروازے سے باہر نکل گئے۔

تین دن سے ان کو ذہنی اطمینان نہیں مل رہا تھا۔ تین دن سے ان کو کھانا ہضم کرنے کے لئے بنگلے کے برآمدے میں ٹہلنا پڑ رہا تھا۔ کیوں کہ تین دن سے ان کو ایک کہانی لکھنے کے لیے کسی واقعہ کسی خیال یا کسی معمولی اشارہ کی ضرورت تھی۔ مگر وہ یونیورسٹی، لکچر روم، گیلری، اور لائبریری سے لیکر اپنے بنگلے تک اس وسیع و عریض ماحول میں کہیں نہیں مل رہا تھا۔ ان کو ایسا لگ رہا تھا کہ ساری کائنات بے جان ہے۔ کہیں کوئی بات کوئی واقعہ نہیں ہو رہا۔ اور اس بے جانی میں بھی کوئی ایسا اشارہ نہیں تھا جس سے کوئی بات یا خیال ذہن میں آجائے۔ اور ایڈیٹر کی تیسری درخواست آچکی تھی وہ کس طرح اتنی بڑی . . فرمائش ٹال دیں۔ مگر آخر کیا کریں انھیں سخت پریشانی تھی یہی وجہ تھی کہ تین دن سے ان کو ذہنی اطمینان نہیں مل رہا تھا اور کھانا ہضم کرنے کے لئے اب انھیں بنگلے کے پیچھے والی اکیلی سڑک پر چہل قدمی کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔

ڈین کے آفس سے ایک قدر تکی ہونہہ کے ساتھ باہر نکل کر انہوں نے رجسٹر اور نوٹس کی چھوٹی مجلد کاپی دوسرے ہاتھ میں لی اور پہلا ہاتھ کوٹ ہٹا کر پینٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ پھر کسی قدر سر جھکا کر گیلری کو طے کرنے لگے کیوں کہ سامنے سے کچھ لڑکے آ رہے تھے۔ "—— ادنہوں" انہوں نے دل میں سوچا "اس میں بھی کوئی آئیڈیا نہیں۔ بھئی حد ہوگئی۔ تین دن سے بس جھک مار رہا ہوں۔ کچھ نہیں ملتا۔

"Not a single idea, what a..."

اور ان کا ذہن کوئی موزوں لفظ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ کچھ چونک سے گئے "عرض ڈاکٹر صاحب" انھوں نے رک کر پیچھے آنے والے کو سامنے آنے کا موقعہ دیا۔ سر ہلا کر سلام لیتے ہوئے انھوں نے نو وارد پر جو یقیناً کوئی لڑکا تھا، نظر ڈالی "—— ادنہوں" ان کے ذہن نے پھر اور دیا بالکل سپاٹ کوئی تاثر، کوئی چیز چہرے پر نہیں۔ یہ آرٹ کا اسٹوڈنٹ بالکل۔ ہر جاتا ہے شاید مجھے۔ ڈاکٹر صاحب کہا ہے نا۔

"کہیے" وہ بولے۔

"ڈاکٹر صاحب۔ معاف کیجیے گا۔ میں آج ہی آیا ہوں آ، حاصل کرنے کا بہت اشتیاق تھا میں نے آپ کی اکثر اسٹوریز پڑھی ہیں میگزین سکشن میں۔ اور . . . ."

"—— ان کے ذہن نے پھر انہیں بتایا۔" لڑکا ہے۔ پڑھتا ہے۔ لیکن میگزین سکشن ہی پڑھتا ہے۔ ورنہ نہیں دیکھے ورنہ ان کی اسٹوریز کا تذکرہ نہ کرتا۔ بولتا بھی ٹھیک طرح ہے یعنی لڑکا باذوق ہے۔"

" ہوں۔ آپ اسٹوڈنٹ ہیں۔" انھوں نے آواز بھاری کرنی چاہی مگر وہ ہو نہ سکی۔

"جی ہاں۔ ڈاکٹر صاحب فرسٹ ایر آرٹس میں۔ بات صاحب کہ میں کچھ مجبوریوں کے سبب . . . ."

ڈاکٹر صاحب یہ سبب سنتے ہوئے چلنے لگے۔ وہ اسٹوڈنٹ ساتھ چلتا رہا۔

"—— یہ چاہتا کیا ہے۔ اسٹوریز کے متعلق تو نہیں" ڈاکٹر زیدی کو خیال آیا۔ انھوں نے ٹھہر کر اسے ٹوکا "دیکھیے کوئی خاص کام ہو تو ——" وہ چاہتے تھے کہ اسٹوڈنٹ کوئی بات چھیڑ سکے۔

"میں ڈاکٹر صاحب۔ جی نہیں۔ میں تو اس وقت صرف نیاز حاصل کرنے
آ رہا تھا۔ ویسے میں چاہتا ہوں کہ آپ کسی وقت چند منٹ عنایت کریں تو
کچھ اسٹوریز کے متعلق۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"دیکھو تاب بات ہوئی ہے" انھوں نے ذرا مطمئن ہو کر اس اسٹوڈنٹ
کو دیکھا۔ اور پھر بولے "اچھا اچھا دوپہر کو لائبریری کے لکچر روم میں ملئے
گا۔ آپ کو زیادہ دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ ہماری رائٹنگ" دوسرے تقریباً سب ہی
میگزین میں چھپا کرتی ہیں۔ وہاں فرصت ہی تو "کچھ بتا دیں گے۔"

"وہ۔ ڈاکٹر صاحب بات دراصل یہ ہے کہ میں۔" وہ ذرا رکا "میں بھی
لکھتا ہوں آپ کو دکھا کر مشورہ لینا ہے۔ بہت آرزو تھی۔ ۔ ۔ ۔"

ڈاکٹر زیدی اب لکچر روم کے دروازے پر کچھ اکتائے ہوئے انداز سے رک
گئے۔ "تو یہ بات ہے" انھوں نے سوچا "یہ کمبخت بھی اب رائٹر بننے کے خواب دیکھنے
لگے ہیں۔"

"ارے صاحب۔ پہلے آپ کچھ پڑھیے۔ پھر لکھنے کی باتیں کیجیے گا جب
تک آپ اچھے رائٹرز کو پڑھیں گے نہیں۔ آپ کچھ نہیں کر سکیں گے" یہ کہہ کر کسی
قدر خفگی کے ساتھ مڑ کر وہ کلاس میں داخل ہو گئے "سٹ ڈاؤن" انھوں نے
کرسی پر بیٹھ کر طائرانہ نظر لڑکوں پر ڈالتے ہوئے کہا۔ اور پھر انھیں اپنی اسٹوری
کے لئے کسی آئیڈیے کی تلاش کا خیال آ گیا۔ "______ کچھ نہیں
... [illegible] کوئی بات ہی نہیں۔ سب چیزیں جیسے بہہ ہی ہیں
بکھر گئے۔ بغیر شور کئے۔ کوئی نئی چیز نہیں۔ کس پر آئیڈیا بنے۔ اتنا سوچ رہا
لیکن کچھ نہیں ہو رہا۔ گھڑی میں گیارہ، مگر بڑی سوئی دس پر ______ اس میں
بھی کچھ نہیں ______ اور یہ لڑکے اسے آسان بات سمجھتے ہیں۔"

لڑکوں کی باتوں کی بھنبھناہٹ سے وہ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور
میز پر رکھی ہوئی کتاب لے کر کھڑے ہو گئے۔

ڈراما کا ڈرامہ آدھا ہو چکا تھا باقی آدھا شروع کر کے وہ اس کی تشریح کرنے
لگے۔ بات بات میں وہ کسی نہ کسی بڑے رائٹر کے طرز تحریر کا فرق سمجھانے کے
لئے ان کے حوالے دیتے۔ ایک تشبیہ کو سمجھاتے ہوئے وہ کچھ رکے تو ایک لڑکے
نے کھڑے ہو کر بڑی شستہ انگریزی میں کہا "ڈاکٹر صاحب یہ [illegible]
آپ کی Last desire میں اس سے بہتر طریقے پر آئی ہے۔"
ڈاکٹر زیدی کو جیسا کہ یاد آیا: Last desire لکھنے کا [illegible]

ڈال گیا۔ وہ لڑکا ان کے چہرے کا تاثر دیکھ کر بولا "اس میں وہ بات نہیں جو
اس جیسی۔"

"یہ ہو سکتا ہے" ڈاکٹر زیدی نے مسرت، ذرا ضبط کر کے کہا۔
"مگر یہ آپ کا اپنا خیال ہو۔ میں اس [illegible] کو اس کی اپنی جگہ خوب
سمجھتا ہوں۔"

"نہیں ڈاکٹر صاحب" دوسری طرف کونے سے ایک دوسرا اسٹوڈنٹ
کھڑا ہوا "میں خود یہی رائے رکھتا ہوں۔ آپ کلاس میں پوچھ کر ہر ایک کی یہی رائے
ہوگی۔"

"______ ارے! ابھی یہ لڑکے باذوق ہوتے جا رہے ہیں یعنی واقعی"
ان کے ذہن نے آخر یہ راز بتا ہی دیا۔

"میں یقین رکھتا ہوں" وہ بولے "یہ ہو سکتا ہے۔ یہ ہو سکتا
ہے۔ وہ ڈرامہ۔ ۔" اور ڈاکٹر صاحب کتاب بند کر کے اس ڈرامہ کی خصوصیات
بتانے لگے۔ اور ان رائٹرز کی تحریروں کا انداز بھی جو ان کی طرح ہی لکھتے
تھے ______ یا ان جیسا لکھنے کی کوشش
کرتے تھے۔

"ٹن" گھنٹہ کی آواز سن کر وہ ڈرامہ کی دنیا سے واپس لوٹ آئے
اور کرسی کے بازو پر سے اٹھ کر نوٹس کی کاپی اور رجسٹر اٹھانا ہی چاہتے تھے
کہ کسی نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب اٹینڈنس" "اوہ" کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ گئے
اور رجسٹر کھول کر حاضری لینے لگے۔ لڑکے اٹینڈنس Attendance [illegible]
اپنے رول نمبر پر حاضری بولتے رہے "تھرٹی فور" کہہ کر ڈاکٹر زیدی نے پین
کی نوک خانہ پر لگائی ہی تھی کہ پریزنٹ سر، کی آواز ان کے کانوں کو کچھ آشنا سی
ہوئی سر اٹھا کر انہوں نے دیکھا۔ یہ وہی لڑکا تھا جو پڑھانے کے دوران میں ان
کی سیلی کی تعریف کر چکا تھا۔ سر پھر جھکا کر انھوں نے خانہ میں پی لکھا اور
دوسرا نمبر بولنے ہی والے تھے کہ پی سے پہلے کے خانہ پر نظر پڑی "اے" اور انھوں
نے دیکھا اس مہینہ میں تقریباً آٹھ دس میٹنگ میں وہ لڑکا غیر حاضر تھا غریب
بے چارہ سال کے آخر میں مصیبت میں پڑ جائیگا۔ امتحان کے وقت کتنی کم حاضری
ہے ابھی سے" ان کا دل ہمدردی کے جذبات سے بھر گیا لہٰذا انھوں نے کئی
اے پی بنا کر دستخط کر دیئے۔

کلاس سے نکل کر انہوں نے گنگناتے ہوئے طلبا کا مسرت بھرا

نظروں سے جائزہ لیا۔ اور طالبات پر نگاہ پڑتے ہی وہ کچھ سوچ کر رہ گئے ـــــــــ کتنے لوگ کتنے اچھے لوگ۔ کتنا مسالہ" انھوں نے سوچا مگر لکھنا بیکار۔ میرے لئے کس قدر بے جان۔ ایک بھی یعنی ایک خیال بھی مجھے ان سے نہ مل سکا۔ ایک چیز بھی میں ان سے نہ پا سکا۔ تین دن سے بالکل آدارہ سا پھر رہا ہوں۔ تین دن سے میرا ذہن منہ کھولے پھر رہا ہے مگر اسے کچھ نہیں ملتا ـــــــــ ہاں۔ مجھے بھی ٹھیک کچھ، کھانا نہیں ملا ہے۔ آج شام کو ٹہلنا ہی پڑے گا پچھلی سڑک پر ۔ لڑکیوں کا ایک جھنڈ پھر گذرا اور ان کے خیالات پھر پراگندہ ہو گئے۔

اور انہیں فکروں میں دن، رفتہ رفتہ اپنے خاتمہ پر آ پہنچا۔

شام کا کھانا کھا کر جب ڈاکٹر زیدی بنگلہ کی پشت والی سڑک پر ٹہلنے نکلے تو فضا ابر آلود تھی اور سورج غروب ہونے کے بعد آسمان پر سیاہی رفتہ رفتہ گہری ہوتی جا رہی تھی۔ بنگلہ سے کافی دور نکل آنے کے بعد جب بجلی کی روشنیاں بہت پیچھے رہ گئیں تو اندھیرے میں ڈاکٹر صاحب کو یہ خیال آیا کہ شاید وہ زیادہ دور نکل آئے ہیں۔ عموماً اس سڑک پر آمد و رفت کم ہوتی تھی پوری سڑک اسی لئے سنسان تھی۔ انھوں نے لوٹنے کی ٹھانی اور مڑ گئے۔ واپسی میں ان کو بار بار یہ احساس ہوتا کہ کوئی ان کے پیچھے آ رہا ہے مگر کافی دور تک کوئی نظر نہ آیا سو وہ بجلی کے کھمبوں کی قطار کے قریب پہونچ ہی رہے تھے کہ پیچھے سے قدموں کی تیز چاپ سنائی دی۔ انھوں نے مڑ کر دیکھا۔ تین آدمی تیز قدموں سے انہیں اپنی طرف آتے نظر آئے۔ وہ نہ معلوم کیوں ٹھہر گئے اور ان کے گزر جانے کا انتظار کرنے لگے مگر ان کے قریب آ کر تینوں ٹھٹک گئے۔

"ڈاکٹر صاحب! آداب عرض ہے" ایک طنزیہ آواز نے انہیں مخاطب کیا۔ انھوں نے وقار برقرار رکھتے ہوئے کہا "آداب عرض ـــــــــ کہئے کیا بات ہے؟"

"جی پہچانا نہیں مجھے۔ میں ہوں آپ کا خادم، پچھلے سال کا آپ کا شاگرد، شاکر" ایک صورت نے آگے بڑھ کر بڑے جوش سے کہا۔

اور ڈاکٹر صاحب اسے پہچان گئے

اسے پچھلے سال سے جانتے تھے مگر وہ انہیں اس زمانہ سے جانتا تھا جب وہ الٰہ آباد یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کر رہے تھے۔ یہ پچھلے سال لکچررشپ

ان کی باتوں سے ڈاکٹر زیدی کو معلوم ہوا تھا۔ وہ تب ہی سے اس سے کچھ خائف سے ہو گئے تھے کہ نہ معلوم الٰہ آباد کا نام لے کر کیا کیا باتیں ان کے متعلق لڑکوں میں پھیلا دے۔ وہ اس معاملہ میں احتیاط بہت پسند کرتے تھے لہذا انھوں نے اس سے کوئی دلچسپی نہ لی اور عام طلبا کی طرح اس سے بھی پیش آتے رہے۔ مگر وہ اپنی فطری ذہانت کے سبب ان کے لئے ہر روز درد سر بنا ہوتا جا رہا تھا۔ شا کے ڈراموں سے لے کر شیلے کی نظموں تک وہ ہر لکچر میں ان سے بحث کرتا تھا اور اس خوبی سے کہ بعض دفعہ ڈاکٹر زیدی کو اپنے مخصوص نقرے "This may be possible" میں پناہ لینی پڑتی۔ اس کی ہر بات ان کو اپنے کچھ راز کھولتی ہوئی محسوس ہوتی۔ اس کی طنز کا ہر وار انہیں صاف اپنے اوپر معلوم ہوتا۔ یہ بہت غنیمت تھا کہ وہ پوئٹری اور ڈرامہ ہی پڑھاتے تھے ورنہ ان کا گزارہ ہونا مشکل ہو جاتا مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے ٹھان لی کہ اسے کم از کم اس یونیورسٹی میں تو نہ رہنے دینگے۔

یونین کی امیدواری میں جب وہ کھڑا ہوا تو اتفاق سے مخالف امیدوار کا کچھ لڑکوں سے جھگڑا ہو گیا جو بات چیت سے شروع ہو کر ایک دوسرے کو لکڑیوں پتھروں اور اینٹوں سے مارنے پر ختم ہوا۔ مخالف امیدوار کے سر میں کچھ ایسے زخم آئے کہ وہ اپنی بینائی کھو بیٹھا۔ اب یونیورسٹی میں کھلبلی مچ گئی اور مجرم لڑکوں کو ڈھونڈا جانے لگا۔ سارے لڑکے جانتے تھے کہ شاکر اس میں شریک نہیں ہے مگر یہ ڈاکٹر زیدی ہی تھے جنھوں نے اپنے لکچرس کے گھنٹوں میں اس بات کا صاف اظہار کیا کہ جھگڑے کا اصل سبب الکشن ہی ہو سکتا ہے۔ اور شاکر۔ اور مخالف امیدوار کا دشمن اس کے مقابل کا امیدوار ہی ہو سکتا ہے۔

جب عام لڑکوں میں یہ بات پھیل گئی تو مجرم لڑکے پہچانے گئے تھے انھوں نے بھی یہی کہنا شروع کر دیا۔

نتیجہ یہ کہ یونیورسٹی اگزیکیوٹیو کی میٹنگ ہوئی اور ڈاکٹر زیدی کے پر زور اصرار پر شاکر کو چھ سال کے لئے اس یونیورسٹی سے نکال دیا گیا اور باقی ساری یونیورسٹیوں میں داخلہ بند کر دیا گیا۔

ڈاکٹر زیدی کو یہ سب آنِ واحد میں یاد آ گیا۔ ان کا ذہن معمول کے خلاف، اسوقت تیز کام کر رہا تھا اور دل بھی خوب زور سے دھڑک رہا تھا ـــــــــ "جا کمبخت" انھوں نے سوچا "خیال ملا بھی تو کس وقت۔ یہ بھی کوئی موقع ہے مگر یہ شاکر ـــــــــ آخر یہ آ کہاں سے گیا۔ یہ پچھلے سال سے تو بالکل غائب

فرراہی سنبھل گئے انہوں نے اردو میں سوچنا چھوڑ کر انگریزی میں سوچنا
شروع کی کہ وہ کچھ چونک کر سنبھل گئے۔ انہوں نے دیکھا
اپنی جیب میں کچھ ٹٹول رہا ہے۔ پستول کا خیال کر کے ان کے
چہرے پر زردی سی آگئی مگر نا معلوم کس طرح کی شرم نے ان کے پیر پکڑ لئے
جیسے نامناسب کام سے باز رکھا۔
ایک دوسرے ساتھی نے بھی ایک ہوش کی حالت میں کچھ کہا
نے کہا " سوچ کیا رہے ہیں ڈاکٹر صاحب۔ جب اس کی زندگی تباہ
کر کے بچتا کیا ہے ہیں! مگر آپ ——— آپ جیسے بے
بتا بھی نہیں سکتے۔ آپ کو تو جب تک عبرتناک سزا نہ دی جائے
چکنے گھڑے کی طرح ہی رہینگے مگر میں بھی دیکھتا ہوں کہ آپ کیسے بچتے
ہیں۔" اس نے جیب میں پڑا ہوا ہاتھ باہر نکالا جس میں ایک
تھی۔

ٹھہر دیار" شاکر نے اسے روک کر کہا اور ڈاکٹر زیدی کو دیکھنے لگا۔
کوئی چارہ نہ دیکھ کر بڑی ہمت کر کے گلا صاف کیا اور بولے "مگر آخر
میں نے جو کچھ کیا وہ معاملات کو سامنے رکھ کر اپنے ضمیر کے . . ."
بے کار ضمیر صمیر کی بات کرتے ہیں۔" شاکر بڑی تلخی سے بات کاٹ
ان کا فیصلہ کرتا ہے جن کے پاس ضمیر ہوتا ہے۔ کیا آپ کو ابھی تک یہ
آپ بڑے اچھے اور باضمیر آدمی ہیں۔ کیا آپ سارے اسٹوڈنٹس کو
حق ہیں سمجھتے ہیں؟ ذرا ایک بار خود تو اپنا کردار دیکھئے ڈاکٹر صاحب
اد پرست، خوشامد پسند ——— جہاں کسی لڑکے نے آپ کی
تعریف کی اور آسمان پر پہونچ گئے، پھول گئے۔ باقی لڑکے سب . . .
اور جاہل ہیں۔ ادھر پڑھا رہے ہیں اور لڑکیاں گیلری سے گذر رہی
گیا نظریں ادھر ہیں اور زبان کچھ سے کچھ کہہ رہی ہے ———
اس طرح شاکر بھی آپ خوش ہیں، کہ ہم بڑے عمدہ کام میں، قوم کی
میں لگے ہوئے ہیں اور خیال یہ ہے کہ خدا کسی لڑکے کی کوئی بات بری
نہ کہ لئے آپ کی نظروں میں کانٹا بن گیا۔ یونیورسٹی کی بھلائی کا
اپنا کینہ نکالتے ہیں ڈاکٹر صاحب اور پھر بھی سب کو اتنا الو سمجھتے ہیں
بات پوچھنے کی ہمت ہی نہیں رکھتا۔
ضمیر ——— مجھے بتائیے کہ میرا کیریئر خراب کر کے آپ اپنے دل کو

آخر کیسے مطمئن کر سکتے ہیں۔ کیا یہی ضمیر ہے؟ لعنت ہے ایسے ضمیر پر"
" ایسا کیا ہے کہ باتیں کرتا ہے۔ یہ لعنت، لعنت سے کچھ کام نہیں چلے
گا ایسوں کا علاج بس یہ ہے کہ ایسے لڑکوں کے گنگ کا ٹیکہ ہمیشہ کے لئے خود ان ہی
کے ماتھے پر لگا دیا جائے۔ ہٹ سامنے سے ——— بے کار وقت ضائع
کرتا ہے۔"
" کیا ہے یہ" شاکر نے اس شیشی کو دیکھ کر پوچھا۔
" تیزاب ہے۔ ابھی ڈاکٹر صاحب کا رہا سہا گھلسا جاتا ہے اس سے"
تیسرا لڑکا ڈاکٹر زیدی کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔
ڈاکٹر زیدی کو کمر میں ٹھنڈی لہر دوڑتی معلوم ہونے لگیں مگر وہ بت
کی مانند بالکل چپ کھڑے رہے شاید ان کو سکتہ ہو گیا تھا۔
شاکر نے اسے روک کر شیشی لے لی اور پھر ڈاکٹر زیدی کی طرف دیکھ کر
کہا " نہیں، ڈاکٹر صاحب۔ شاید آپ اس قابل بھی نہیں۔ مجھے یہ کر کے بھی کچھ
حاصل نہ ہوگا اور شاید آپ لڑکوں کے لئے آئندہ اور بھی سنگدل ہو جائیں۔ کاش تم جانتے
کہ آپ کیا ہیں، کہاں کھڑے ہیں اور آپ کا کام کیا ہے۔ آپ نے کبھی اپنے اصل کام
کا، قوم کی تعمیر کا بھول کر بھی تو خیال نہیں کیا ———"
شاکر نہ معلوم کیا کہتا رہا اور ڈاکٹر صاحب نہ معلوم کیا سنتے رہے پھر آخر میں
اس نے کہا " جانئیے۔ شاید ابھی آپ میں کچھ انسانیت موجود ہو جو اس تجربے سے
جاگ اٹھے جائیے"
یہ کہہ کر اس نے شیشی زمین پر پٹک دی۔ شاکر کے دوست نے جھلایا تو ضرور مگر
کچھ بولا نہیں اور تینوں لوٹ کر ایک طرف چلے گئے۔
ڈاکٹر زیدی شکست خوردہ سپاہی کی طرح جھکے ہوئے اور خوف سے
نڈھال جب پھر کوٹھی کی طرف چلے تو ان کے ذہن نے اچانک پھر کام شروع کر دیا اس
واقعہ کو سوچ کر وہ تو ہیں مگر ان کا دماغ کچھ خوشی سے اچھل پڑا " ——— ارے! یہ تو
آئیڈیل ہے، پورا آئیڈیا!! ایک بہترین اسٹوری کی جان ہے"
مگر پھر ان کا دماغ جیسے دھم سے گر پڑا۔ انہیں مرکزی کردار، سرمایہ
کا سب سے اونچا اور سب سے اہم ہے وہ ذلیل شخص ہوتا اور وہ یہ سوچ کر بے حال ہو
گئے کہ یہ کردار خود ان کا تھا۔

———

ظہور الحق صدیقی

فضائے پاک میں گرد و غبار کے دن ہیں
فروغِ انجمنِ بادہ خوار کے دن ہیں

گلو نہ چھیڑو محبت کے راگ گلشن میں
ابھی کچھ اور غمِ روزگار کے دن ہیں

چمن چمن میں اُڑائی ہے خاک یاروں نے
مگر یہ ضد ہے کہ نقش و نگار کے دن ہیں

نظر فریب بہاروں پہ جھومنے والو!
فریب کھاؤ فریبِ بہار کے دن ہیں

گلوں کے گریۂ پیہم سے رو پڑی شبنم
چمن سے اب تو وداعِ بہار کے دن ہیں

ہزاروں سال سے روتی ہے نرگسِ دلگیر
ہنوز منتِ صبحِ بہار کے دن ہیں

تمہاری طرزِ ادا اور ہی سہی لیکن!
میرے لئے ابھی صبر و قرار کے دن ہیں

لبوں پہ اپنے یہ رقصاں ہیں آجکل نغمے
نظر نظر سے ملاؤ خمار کے دن ہیں!

گلوں کے عزم سے گلچیں کا دل دھڑک تو گیا
مگر عروسِ حنا پر نکھار کے دن ہیں

عجیب رنگ سے بدلا مزاجِ دار و رسن
سنا ہے کنجِ قفس میں بہار کے دن ہیں

اٹھے ہیں خاکِ وطن سے کئی جیالے سپوت
انہی سے دورِ خزاں میں بہار کے دن ہیں

نہ پوچھ حال تلون مزاجیٔ یاراں ——
انہی سے کش مکشِ روزگار کے دن ہیں

ابھی برس کے رہے گی گھٹا جو اٹھی ہے
شراب کہنہ پلاؤ خمار کے دن ہیں

قدم قدم پہ جھکاؤ جبیں چمن والو
یہی آمدِ فصلِ بہار کے دن ہیں

ہماری کاوشِ پیہم سے پھول برسینگے
کہ اس زمیں پہ یہی برگ و بار کے دن ہیں

ہر اک گام پہ سجدے گزارتے جاؤ!
نزولِ رحمتِ پروردگار کے دن ہیں

خزاں نصیب فضاؤں نے لی ہے انگڑائی
کہ پھر تبسمِ لیل و نہار کے دن ہیں

ظہور آپ کو عنوانِ آرزو کی قسم!
یہی تو بخیۂ قلبِ فگار کے دن ہیں

نوآبادی

ے جب پہلی مرتبہ احسن مرحوم کی بیوہ کا ماہانہ وظیفہ مقرر
بارگاہ خداوندی میں سجدہ شکر ادا کیا۔ آج تقریباً چھ سال
ترت نصیب ہوئی تھی۔ مارے خوشی کے اس کی اداس اور
نسوؤں کے چند قطرے نمودار ہوئے۔ جیسے کسی ریگستان میں
ا ہوگئی ہو۔ وہ آج یوں محسوس کر رہا تھا جیسے اس نے ایک
جیں برسوں دیسی اور ولایتی شراب پی گئی ہو آب کوثر سے
بنا دیا ہو جس میں پیاسوں کو ٹھنڈا پانی اور کہنہ مریضوں کو
ئی جاتی ہوں۔

ملے میں پیدا ہوا تھا جس کا طرہ امتیاز افلاس در خودداری
اس کی آنکھیں کھلیں تو اس کے سامنے ایک نہایت بوسیدہ
کا بوڑھا باپ اور وہ خود تھا۔ اس مکان کے بس دو ہی
ب بڑا بھائی تھا جو ویران زندگی سے اکتا کر پردیس چلا گیا
پ اور چھوٹے بھائی سے کوئی لگاؤ باقی نہ رہا تھا۔ اس کا
رں میں سے تھا۔ اسے تعلیم دینے کی ہر ممکن کوشش کی گئی
ہ نہیں کرسکا۔ اس لئے اس کا شمار تعلیم یافتہ لوگوں میں نہیں
باوجود وہ علم ہی کی روٹی کھاتا تھا۔ اسے ایک پرائمری اسکول
ئی تھی اور وہ بڑے ٹھاٹ باٹ سے رہتا تھا۔ سادر خبر واقف
لج کا پرنسپل ہوں۔ میاں باطن کو اکثر و بیشتر لوگ پرنسپل اس
نی وجیہہ و شکیل جوان تھا۔ اور لباس، طرز رہائش، بول
تہذیب کا جیتا جاگتا مرقع تھا۔ باطن ہر تین سال کے بعد
نے سے اسے کوئی سروکار نہیں رہتا۔ مومن کا بوڑھا باپ فاقہ
ن خوددار ایسا تھا کہ نہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلاتا اور نہ کسی کی
کی صحبت یہی کہ وہ پانچ سکھیے زمین تھی جس سے کچھ غلہ نکل آتا

مومن کے باپ ناظر میاں کو کچھ شاعری کا ذوق بھی تھا۔ محلہ والوں نے انھیں تختہ مشق بنالیا تھا۔ کوئی انھیں ملک الشعراء کوئی بلبل ہند اور دکنی شعرا کا سرتاج کہا کرتا تھا۔ وہ بھی تاؤ میں آکر الٹ پٹانگ شاعری کرتے۔ کبھی تو قافیہ ردیف کی پابندی کرتے اور کبھی بلینک ورس لکھتے۔ ایک دفعہ کسی نے ان کی غزل پر ایک مزاحیہ مضمون لکھ کر "مدینہ" میں شائع کرادیا اور ایک اخبار ان کے پاس بھیجدیا۔ ناظر میاں اس اخبار کو لے کر محلوں میں گئے اور کہنے لگے

"دیکھو، بھائیو! میاں باطن کہتے ہیں کہ میرے باپ پاگل ہوگئے ہیں میں کہتا ہوں کہ اتنے بڑے مشہور اخبار "مدینہ" میں آخر یہ غزل کس کے باپ کی چھپی۔ کیا میرے باپ کی غزل پر مضمون شائع ہوا؟" پھر کہنے لگے "آج کل کے چھوکرے بھی بڑے بدتمیز ہیں باپ ہی کو بیوقوف سمجھتے ہیں۔ اکبر نے غلط نہیں کہا ہے کہ ؎

ہم ایسی سب کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کر بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

اس پر لوگ کہتے کہ ——

"ہاں بھائی ناظر! آپ بجا فرماتے ہیں۔ باطن نالائق ہے، بدذوق ہے اس کی باتوں کی پرواہ نہ کیجئے!"

ناظر میاں ہمیشہ مومن کو اپنے ساتھ رکھتے۔ مجلسوں میں بھی وہ ان کے پاس ہی بیٹھتا۔ مومن فاقہ کرتے کرتے ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ لوگ اصرار کرتے کہ مومن کو کسی کے سپرد کردو اس کی تعلیم بھی ہوگی اور کھانے پینے کا بھی آرام ہوگا۔ ناظر میاں کو یہ بات بہت ناگوار گزرتی۔ وہ کہتے۔

"میں غریبی کی بے فکری کو امیری کے تفکرات پر ترجیح دیتا ہوں۔ میں اس کو بہتر سمجھتا ہوں کہ میری زندگی میں مومن فاقہ کرے لیکن کسی کا دست نگر اور احسان مند نہ ہو۔ اگر خدا کو منظور ہوگا تو مومن کی تعلیم کا انتظام خود بخود ہوجائے گا!"

اور مومن اپنے باپ کی زندگی میں تعلیم کی نعمت سے محروم ہی رہا۔ باپ کے

لوگوں نے جو اس کا بنا ہی دیا تھا۔ آخر ایک دن وہ بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے مومن بے یار و مددگار اس دنیا میں رہ گیا۔ وہ سن شعور کو پہنچ چکا تھا۔ اسلئے اس نے اپنے لئے خود راستہ پیدا کیا۔ اس وسیع دنیا میں رزق گوشہ گوشہ میں پھیلا ہے۔ انسان اپنے ہم جنسوں پر رزق کا دروازہ بند کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے لیکن رزق پہنچنے کے بیشمار دروازے ہیں۔ انسان کو اپنے پیدا کرنیوالے کی جانب سے روزی پہنچ ہی جاتی ہے۔

مومن اس دنیا کے اتھاہ سمندر میں اپنی کشتی حیات خود کھینے لگا۔ اس کا ناخدا وہ تھا جو سب کا خالق ہے۔ اس کے ہمت و استقلال نے اس کے لئے نئی نئی راہیں نکالیں۔ اس نے اپنے طبعی رجحان کے مطابق تعلیم حاصل کی جگہ جگہ گھوما پھرا۔ زندگی کی تلخیوں اور شیرینیوں کا مزہ چکھا تلخیوں سے وہ کبھی بھی نہیں گھبرایا وہ تو کانٹوں کو بھی خاطر میں نہیں لایا۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ایک رات وہ اپنے کمرے میں دیر تک مطالعہ کرتا رہا۔ رات کے سناٹے میں کتاب کی ایک ایک بات اسکی آنکھوں کی راہ سے اس کے ذہن میں پہنچ رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ جیسے اس کی لالٹین کی مدھم روشنی تیز ہوتی جا رہی ہے۔ اس کے دل کی آنکھیں کھل رہی ہیں کتاب ختم کرنے کے بعد وہ اٹھ بیٹھا اور دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اس نے سرہانے سے دو تین ضخیم رسالے نکالے اور ورق گردانی کرتا رہا۔ وہ ایک افسانہ کا سرسری مطالعہ کر گیا اور رسالہ کو سامنے میز پر پھینک دیا۔ رسالہ لالٹین سے ٹکرا کر میز سے نیچے گر گیا۔ اس کا ایک صفحہ اس کے سامنے کھلا ہوا تھا۔ اور ایک عورت کی تصویر دھندلی دھندلی سی نظر آ رہی تھی۔ اس نے اٹھا کر دیکھا تو اس عورت کے بالائی ہونٹوں پر روشنائی سے کڑی کڑی مونچھیں بنی تھیں اسے معاً ایک نوجوان لڑکے کا خیال آ گیا جسے رنگین بش شرٹ میں دیکھ کر اسکی آنکھوں نے خطا کیا تھا۔

مومن نے دوسرا رسالہ اٹھایا۔ ایک افسانچہ بہ عنوان "عیش" نظر آیا۔ لکھنے والے کا نام عندلیب چودھری تھا۔

افسانچہ یوں تھا ؎

یہ کہہ رہا تھا وہ سن رہی تھی ـــ "زندگی مختصر ہے اور عیش کیلئے ہے...... چٹاخ...... تو ہو اور میں ہوں اور تنہائی ہو ـــ چٹاخ...... محبت میں گم ہو جانا ہی زندگی ہے ـــ چٹاخ......"

اور ایک نرم و نازک ہتھیلی بجلی کی مانند چمکی ـــ "تڑاق"

یہ گال سہلاتے ہوئے بولا۔

"یہ بھی عیش ہے ڈارلنگ؟"

مومن نے قلم اٹھایا اور حاشیہ پر یوں لکھا ـــ

یہ کہہ رہا تھا وہ سن رہی تھی ـــ "زندگی مختصر ہے اور جہاد کیلئے ہے ـــ سمجھیں...... تو اور میں دونوں اس میں شریک ہوں... سمجھیں۔ نیکیاں پھیلانے کے لئے شہید ہو جانا ہی مقصد حیات ہے... سمجھیں..."

اور ایک باحیا و باوقار حسینہ پر جوش طریقہ سے اٹھی۔

"میں تیار"

یہ خوش ہو کر بولا۔ "یہ بھی جہاد کی ایک قسم ہے رفیقہ!"

مومن نے "عیش" پر تیز قلم چلا دیا اور "جہاد" لکھ دیا۔ اس کے قلم کی نب سے انگاروں کی مانند شعاعیں نکل رہی تھیں۔ مومن اس رات بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔

ایک دن مومن میڈیکل کالج ہوسٹل میں اپنے دوست شکیل کے کمرہ میں بیٹھا تھا۔ سامنے ریک پر ضخیم کتابیں رکھی تھیں۔ دوسری طرف چھوٹی میز پر ایک سفید کھوپڑی رکھی تھی۔ کچھ ہڈیاں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ ایک کونے میں ہڈیاں تسبیح کے دانوں کی مانند پروئی ہوئی ایک کھونٹی سے لٹک رہی تھیں دیوار پر ایک انسان کی تصویر کے ذریعہ اس کے تمام اعضاء کی تشریح کی تھی کھوپڑی کو بغور دیکھ رہا تھا شکیل نے پوچھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟"

مومن نے جواب دیا۔

"کھوپڑی کو دیکھ کر غور کر رہا ہوں کہ اس میں زیادہ عقل تھی یا اس میں۔ جو ان دونوں اس کا مطالعہ کر رہی ہے"

شکیل نے کھسیا کر کہا۔

"ارے میاں ہم تو انسانی کھوپڑیوں کا علاج کرتے ہیں۔ کئی سال تک کی کھال نکالتے ہیں تب کہیں ڈگری ملتی ہے؟"

مومن نے کہا۔

"ہاں یہ تو صحیح ہے تم انسانوں کا علاج کرتے ہو لیکن انسانیت کا نہیں کر سکتے!"

زاق اڑاتے ہوئے کہا۔
انیت کسے کہتے ہیں؟"
ی جو اس زمانہ میں عنقا ہے!" مومن نے کہا
کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت ہے جو مفقود ہے؟" شکیل بولا
ی نسلوں کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت ہے جن کا وجود اس
ن نے کہا ـــ شکیل خاموش ہو گیا۔
ا۔ "دوست! دنیا اس وقت ایک بہت بڑے مرض
یت در بدر ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہے۔ انسان تباہی کی
جا رہا ہے اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ وہی اس کا
ں انسانوں کے اتنے بڑے ہجوم کو اپنی اخلاقی قوت سے موڑ
ہے۔ کام بس یہی کرنے کا ہے!"
ی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔
.. یہ کام ضرور کرنے کا ہے!"
لہ میں رہتا تھا اس کی حالت یہ تھی کہ لوگوں کو اپنے پاس
ن واسطہ نہیں تھا۔ محلہ میں غنڈوں، لفنگوں اور چیدوں
تی جا رہی تھی۔ اعلانیہ جوا اور شراب کی محفلیں جمتی تھیں
حکومت تھی۔ جو لوگ شریف الطبع تھے وہ اپنی عزت بچانے
ہتے تھے۔ شیرا غنڈوں کا سردار تھا۔ مومن سے اس کی اچھی

ہوسٹل سے واپس آ رہا تھا تو راستہ میں شیرا مل گیا۔
ہوئے بولا۔
! آپ بڑے موقع سے مل گئے چلئے ذرا ایک خط لکھ دیجئے گا"
ہے، کس کو لکھواؤ گے؟" مومن نے کہا۔
خیریت ہی ہے۔ شاگرد کو لکھواؤں گا۔ کمبخت اب تک
شیرا نے جواب دیا
پھر شیرا نے خط لکھوایا۔ تھوڑی دیر کے بعد مومن نے پوچھا
یں تجھ کو برا نہیں کہتا۔ لیکن تیرا پیشہ بہت برا ہے۔ کیا تجھے
رتا ہے؟"
ریں جھک گئیں۔ کچھ توقف کے بعد اس نے کہا۔

"بھیا! کیا بتاؤں، پڑھا لکھا نہیں ہوں ورنہ کوئی ملازمت کرتا اور عزت کی زندگی گزارتا!"

مومن نے کہا۔

"نہیں، نہیں پڑھے لکھوں سے تو نسبتاً بہتر ہے، پڑھے لکھوں میں تو ہیر پھیر آ جاتا ہے۔ ان کا دل کبھی صاف نہیں رہتا۔ تو جاہل تو ہے۔ لیکن تیرا دل بہت صاف ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تو نے یہ پیشہ خود اختیار نہیں کیا بلکہ زمانہ نے تجھے مجبور کر دیا تھا۔ تو اگر ٹھان لے تو زمانہ کا رخ تو بھی پھیر سکتا ہے۔"

مومن کے چلے جانے کے بعد شیرا بہت دیر تک سوچتا رہا..... اس کے چیلے یکے بعد دیگرے آتے گئے۔ ایک نے پوچھا۔

"کیوں استاد! آج سست کیوں ہو؟"

"ارے کلوا! آج طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ سب کے کہہ دے کہ کل تک کام بند ہے، اور کل ہی مجھ سے سب آکر ملیں۔" شیرا نے کہا۔

"کیوں کیا بات ہے استاد؟" کلوے نے پوچھا

"بہت بڑا کام ہے کلوے!۔ اور سن لے اگر کل ایک آدمی بھی غیر حاضر ہوا تو اس کی خبر لوں گا۔" شیرا نے کہا۔

"نہیں استاد! ایسا کبھی ہو سکتا ہے؟ ـــ تم سے سب کانپتے ہیں" کلوے نے کہا۔

شیرا نے تمام چیلوں کو واپس جانے کا حکم دیا۔ کمرے سے باہر نکلنے کے بعد وہ آپس میں باتیں کرنے لگے ایک نے پوچھا۔

"آج استاد کو کیا ہوا ہے؟"

دوسرے نے قیاس آرائی کرتے ہوئے جواب دیا۔

"کوئی خطرے کی بات ہوگی!"

تیسرے نے متفکرانہ انداز میں کہا۔

"تب تو دوست اپنا دھندا بھی گیا۔"

چوتھے نے کہا۔

"ایک طرف سے تو اطمینان ہے، ہمارا استاد بڑا پرانا ہے وہ سب کر جاتا ہے۔ اس کی مونچھیں قائم رہیں ہمیں کیا فکر ہے کوئی نہ کوئی معاملہ ہوگا۔"

پہلے نے کہا۔

… دیکھو کیا ہوتا ہے؟
سب چپ چاپ اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔

ادھر کمرے میں کلوا شیرا کا سر دبا رہا تھا۔ شیرا مونچھوں کو اینٹھتا ہوا ایک دم اٹھ بیٹھا اور کہنے لگا۔

"کلوا! کل تک کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ میرے پیشے کو برا کہے۔ بڑے بڑے کروڑپتی بھی مجھ سے ڈرتے رہے اور مجھے کچھ کہنے کی بجائے میری سرپرستی ہی کرتے رہے۔ میں برائی کے راستہ پر اتنی دور نکل گیا تھا کہ کبھی بھی دوسری طرف مڑنے کا خیال بھی نہیں آیا۔ زمانہ نے مجھے اس پیشہ کو اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ لیکن آج مومن بھیا کی ایک بات نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ کیا میں بے بس ہوں اور مجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ زمانہ کو بدل دوں.....؟"

کلوا نے سب کی نمائندگی کرتے ہوئے جواب دیا۔

"استاد! ہم تو برابر تمہارے ساتھ ہیں۔ تم جس لائن میں جاؤ گے ہم تمہارے پیچھے پیچھے رہیں گے۔ باقی رہا اپنا تجربہ تو استاد سچی بات یہ ہے کہ اب اس کام میں جی نہیں لگتا۔ کسی بات کی تکلیف تو نہیں ہے لیکن فلاح نہیں پایا ہم لوگوں نے، ابھی تو جوانی ہے استاد—— ..... بڑھاپے میں کیا ہوگا؟ میں نے ایک استاد کو بڑھاپے کے عالم میں دیکھا ہے۔ ہائے ہائے کیا حالت تھی اس کی.....!" کلوے نے یہ کہتے ہوئے ایک جھرجھری لی۔

مومن کئی دن تک محلے سے غائب رہا۔ واپس آیا تو شیرا کو ایک دکان پر بیٹھا ہوا پایا۔ محلہ میں تبدیلی کے آثار شروع ہو چکے تھے۔ مومن کے یہاں میڈیکل کالج ہوسٹل کے نوجوانوں اور شیرا کے چیلوں کی آمد و رفت رہنے لگی تھی۔

اور دیکھتے ہی دیکھتے بیت المال قائم کیا گیا جو پہلا عملی قدم تھا۔ اس بیت المال سے سب سے پہلے احسن مرحوم کی بیوہ کا ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا۔ شیرا اس کی بڑی سخت نگرانی کرتا۔ اس کا رعب اب دوگنا ہو گیا تھا۔ محلہ میں نئی زندگی پیدا ہو گئی تھی۔ لوگ اب نئے نظر آ رہے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ جیسے شہر کے مشرقی گوشہ میں ایک نو آبادی قائم ہو گئی ہے۔ x

(حلقہ ادب اسلامی ڈھاکہ کے اجتماع منعقدہ ۲۰ فروری سنہ ۵۳ء میں پڑھا گیا)

بقیہ صفحہ ۱۷:-

شاہد:- مگر جاؤ گی کہاں . . . . .
ریحانہ:- کسی راکشس کے پاس
اور ریحانہ اٹھکر چل دیتی ہے
شاہد چیختا ہے ——— بندو——— بندو———
بندو:- جی صاحب
شاہد:- میں راکشس ہو گیا ہوں ——— راکشس ———
اس دنیا میں سب راکشس بستے ہیں ——— اور میں بھی
راکشس ہوں ——— راکشس ———
(ہنستا ہے) دیکھتا کیا ہے ——— باہر جا ——— کہہ
شاہد راکشس ہو گیا ہے
میں راکشس ہو گیا ہوں ——— راکشس ———
——— ایک خوفناک قہقہہ ———
(حلقہ ادب اسلامی سکھر کی ایک نشست گاہ میں پڑھا گیا)

بقیہ صفحہ ۱۶:-

"نہیں! عقل تو نہیں دیکھی جا سکتی" سب نے اپنی ہنسیوں پر قابو پاتے ہوئے ذرا توقف کے ساتھ جواب دیا۔

"دوستو!! یاد رکھو! اس مادی دنیا میں کسی چیز کا نظر نہ آنا اسکے وجود کی نفی کے لئے بڑی مضبوط دلیل ہے"

گھٹی گھٹی ہنسیوں اور دبے دبے قہقہوں کے درمیان ایڈیٹر بڑا کھسیانا نظر آ رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ شیلے کے نیچے سے ریت کھسک رہی ہے! اور ملائکہ کا سید ھا تیلا شیلہ بیٹھا جا رہا ہے۔

سنا ہے۔ کہ کل وہ غریب کاتب کسی دوسرے اخبار کے دفتر میں نوکری کی تلاش کر رہا تھا۔ کیونکہ منہ پھٹ اور گستاخ ہونے کی وجہ سے اسے پہلے ہی کے دفتر سے جواب مل چکا تھا۔ (ماخوذ)

ہوشیار پوری •

ماں

یری ماں — السلام
نے کے بعد
ں غم و آلام میں
کو سناؤں رازداں کوئی نہیں
ب پہ آہیں آرزوؤں کا ہے خون !
ماتیت کی دیوی ماں
وقت پر

ں محبت
مجھے

م و مینا، نغمہ و رقص و سرود
ن کی صداؤں کے سوا کچھ بھی نہیں !
ے تبسم پہ دل و جاں سے فدا
جانب ملتفت کوئی نہیں
ش میں آرام کرنیوالی ماں

وم بیٹا
محبت کے لئے
ا ہے

فیروز نظر •

○

یہ طوفاں میں ٹوٹی ہے کس دل کی آس
پریشاں ہیں موجیں کنارے اداس
ترا غم، تری یاد، تیرا تصور
یہی ہیں مری زندگی کی اساس
پہونچ جائیگا اپنی منزل پہ تو
پہن لے یقین و عمل کا لباس
مرے درد کو لا دوا مت سمجھ!
مرے درد کی ہے دوا تیرے پاس
خوشی تو بڑی چیز ہے دوستو
غم دہر بھی ہم کو آیا نہ راس
تری جستجو کھینچ لائی — کہاں
نہ کوئی مسرت نہ خوف و ہراس

عقیل احمد جعفری •

عہدِ عمرؓ

حضرت عمرؓ کا شمار ان ممتاز اور چیدہ شخصیتوں میں ہے جو قبول اسلام سے پہلے کے خود ایک اہمیت رکھتے تھے اور پھر آپ کا اسلامی جوش اسلام کی تاریخ میں ایک نئے باب کے اضافہ کا سبب بنا اپنے دورِ خلافت میں آپ نے جو غیر معمولی شہرت اور مقبولیت اپنے کردار کی بلندی سے حاصل کی اس کو ایک خاص درجہ حاصل ہے۔ آپ کے سنہرے کارناموں سے... تاریخ کے صفحے پر ہیں۔

آج ہم آپ کے عہد پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آپ میں وہ کیا خصوصیات تھیں جنھوں نے آپ کو یگانۂ روزگار بنا دیا تھا۔

حضرت عمرؓ کی یہ خصوصیت کہ انہوں نے ۱۰۳۶ شہر فتح کئے اور ان کی فتوحات کا سلسلہ تمام علاقہ شام۔ دمشق۔ طبریہ۔ فلسطین عسقلان بعلبک۔ حمص۔ حلب۔ قیصریہ۔ انطاکیہ۔ بیت المقدس اور تمام عراق عرب۔ علاقہ اہواز مصر۔ اسکندریہ اور طرابلس۔ نیز اصفہان طبرستان اور کرمان تا حدود مکران تک پھیل گیا تھا بیشک یہ ایک بڑی اور بہت بڑی خصوصیت تھی لیکن اس سے بھی نمایاں خصوصیت وہ ہے جس کا... اعتراف غیر مسلم مورخین اور ناقدین کو بھی کرنا پڑا ہے

ڈوور لگین لکھتا ہے۔

عمرؓ کی معاشرت ابوبکرؓ سے بھی سادہ اور کم خرچ تھی۔ ان کی خوراک جو کی روٹی اور کھجوریں تھی۔ ان کے پیراہن میں اکثر پیوند لگے رہتے تھے۔

بے شمار خلافت کی آمدنی میں سے وہ اپنے واسطے کچھ نہیں رکھتے تھے انھوں نے شاہی اقتدار کے ساتھ جمہوری مساوات کو عجب طرح سے ملا دیا تھا جب آپ کی وفات ہوئی تو آپ کی جائداد ایک پھٹا لباس اور پانچ دینار تھے۔

ایک اور عیسائی مورخ رقم طراز ہے۔

عمرؓ نہایت درویش طبع۔ سادگی پسند اور حلیم المزاج۔ مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ کے جو کی روٹی اور کھجوریں بے تکلف کھاتے تھے۔ اور اکثر کسی درخت کے نیچے سویا کرتے تھے۔

وہ ایک عظیم الشان سلطنت کے بانی اور مالک تھے مگر ان پر اس اقتدار اور شوکت کا کوئی اثر نہیں تھا۔ وہ تحمل۔ خود... اور عیش و عشرت کو ہمیشہ ناپسند کرتے تھے۔

ارونگ واشنگٹن کا بیان ہے۔

عمرؓ نے یہ تاکیدی حکم جاری کیا تھا کہ جو بچہ یا عورت یا بو... یا راہب قید ہو کر آئے اس کو غلام کے طور پر فروخت... کیا جائے۔

بیت المال کی حفاظت میں وہ ایسے محتاط تھے کہ او... کی نگہداشت خود کرتے تھے۔

ان ذاتی صفات کے علاوہ کچھ صفاتی خصوصیات عمرؓ بھی تاریخ میں یادگار ہیں۔

(۱) سب سے پہلے آپ ہی نے دیوان اور دفتر قائم...

(۲) پہرہ کیلئے چوکیداروں کا تقرر کیا۔

(۳) عدالت کیلئے قاضی مقرر کئے۔

(۴) کوفہ۔ بصرہ۔ الجزیرہ۔ شام۔ مصر اور موصل میں... تعینات کئے۔

(۵) باجماعت نماز تراویح کو رواج دیا۔

حضرت فاروقؓ کا یہ جائزہ نامکمل رہے گا اگر...

...پر بھی ایک نظر ڈالی جائے حضرت عمرؓ کے عہد کی سب سے
...ن جمہوریت مساوات اور رواداری ہے حضرت عمرؓ نے مشورہ
...یہاں تک وسیع کیا تھا کہ غیر مسلموں اور ذمیوں سے بھی مشورہ
...لیا کرتے تھے عراق کے بندوبست میں وہاں کے پارسی رئیسوں
...اور مصر کے انتظام کے سلسلے میں ایک قبطی کو مدینہ بلا کے

...یوں کے گورنر رعایا سے دریافت کر کے مقرر کئے جاتے تھے
...کوئی شکایت ہوتی تھی اور تحقیقات کے بعد شکایت درست
...بلا تکلف معزولی کے احکام جاری کر دیئے جاتے تھے سعد
...فاتح ایران کو کوفہ کی گورنری سے صرف عوام کی شکایت پر الگ

آزادیٔ رائے کا آپ بڑا احترام کرتے تھے۔ لوگ سب کے روبرو
...بر آپ کو ٹوک دیتے تھے آپ نے اپنا درجہ ایک بالکل عام آدمی
...برابر رکھا تھا۔

...رواداری اور انصاف کا یہ عالم تھا کہ جب خیبر سے یہودیوں اور
...عیسائیوں کو ان کی سازشوں کی وجہ سے ملک بدر کیا تو ساتھ
...جائیداد کی پوری قیمت بیت المال سے ادا کر دی اور ایک وقت خاص
...یہ معاف رکھا ——— مسلمانوں کی زکوٰۃ میں سے عیسائیوں
...دیتے رہتے ایک دفعہ ایک بوڑھے عیسائی کو بھیک مانگتے
...ف اسے جزیہ سے مستثنیٰ کر دیا بلکہ بیت المال سے اس کا وظیفہ
...اور پھر اس حکم کو بوڑھے اور ازکار رفتہ عیسائیوں کیلئے عام کر دیا
...حضرت عمرؓ کی جمہوریت نوازی، مساوات پسندی اور رواداری
...بڑا مظہر وہ معاہدہ بیت المقدس ہے جس کا ایک ایک لفظ گو
...عطر میں ملا ہوا اپنی خوشبو سے آج تک مشام کائنات کو
...ہے۔ مسلمان اپنے معاہدوں کے اتنے پابند تھے کہ اگر ایک ماتحت
...ن سے عہد کر لیتا تھا تو وہ پوری حکومت کا عہد نامہ سمجھا جاتا تھا
...ہی اگر کوئی ذمہ داری لے لیتا تو وہ تمام مسلمانوں کی ذمہ
...انی پھر تو خلیفۂ وقت کا معاہدہ تھا اس خلیفہ کا معاہدہ جس نے
...کے گرجا میں بچھی ہوئی جانماز صرف اسلئے اٹھوا دی کہ تقلید میں

مسلمان اس جگہ کو مسجد نہ بنالیں۔

یہ معاہدہ صرف اپنی طلاقت اور جلالت الفاظ ہی کی رو سے نہیں بلکہ اس اعتبار سے بھی کہ اس پر عمل کیا گیا عہد گزشتہ میں بھی کے لیے مشعل راہ رہا ہے، اور آئندہ بھی رہتی دنیا تک تاریخ میں یادگار رہیگا۔

اس معاہدہ میں سچائی کی جو روح ہے وہ مسلمانوں کے جسموں میں کہاں تک سرایت کئے ہوئے تھی اس کا اگر آپ کو اندازہ کرنا ہے تو جنگ یرموک کے سلسلے میں وہ وقت یاد کیجئے جب مسلمان عیسائیوں سے ایک موقع پر شکست کھا گئے تھے اور اس کے بعد جب انہوں نے اپنا مفتوحہ علاقہ خالی کیا تو عیسائی رعایا کو وصول شدہ جزیہ یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ چونکہ یہ حفاظت کا زر معاوضہ تھا اور حفاظت اب ہم نہیں کر سکتے اس لئے روپیہ واپس کرتے ہیں۔

یہی وہ حسن سلوک تھا جسکا اثر تھا کہ مسلمانوں کی اس چند روزہ واپسی پر وہاں کے عیسائی اور یہودی ڈھاڑیں مار مار کے روتے تھے اور دعا کرتے تھے کہ انہیں لوٹ کر آنا نصیب ہو ؎

کبھی ہم نے بھی کی تھی حکمرانی سارے عالم پر
مگر وہ حکمرانی جس کا سکہ جان و دل پر تھا

اسلام کی یہی وہ تعلیم اور اس تعلیم کی یہی وہ تعمیل تھی جس نے دنیا کو ان کے آگے سرنگوں کر دیا تھا اور اسلام کا ہر نام لیوا خلوص و صداقت و جرأت و ہمت کا غیر اسلامی دنیا کیلئے ایک نمونہ بن گیا تھا۔

یہ اگر سچ ہے کہ الناس علیٰ دین ملوکہم تو عہد عمرؓ کی تمام فتوحات سے قطع نظر کیا اور صرف ایک شکست کے موقع کی ایک تصویر ملاحظہ ہو جو یقیناً اس زمانہ کے عوام کی اور پھر ایسے نازک وقت میں استقلال کی ترجمانی کرتا ہے۔

عہد فاروقی میں ایک موقع پر جوش شہادت میں ہوش سے گزر جانے کی وجہ سے مسلمانوں نے بھی شکست کھائی مگر یہ شکست بھی ایسا کردار پیچھے چھوڑ گئی جو بیشمار فتوحات پر بھاری ہے۔

ایرانیوں کے لمبے دو شہیر ہاتھیوں پر بیٹھے بیٹھے لٹکے ہوئے گھنٹوں کی زد میں جب عربوں کے گھوڑے بدکے پیچھے آگئے اور بڑھے

اور بعض کے تو اس وقت ایک افسر اپنے گھوڑے سے کود پڑا اور پیادہ ہاتھیوں کے بیچ کا مقابلہ کرنے لگا جب ایک مہیب ہاتھی نے کچل کر اس کی ... ہڈیاں پسلیاں توڑ دیں تو ایک دوسرے مسلمان نے جھنڈا ہاتھ میں لے لیا اور اسی مہیب ہاتھی پر حملہ آور ہوا اور اسی طرح ہاتھی کے پاؤں کے نیچے کچلا جا کر شہید ہوا۔ مگر مسلمانوں کے عزم و استقلال کی اس ہیبتناک منظر کے باوجود یہ حالت تھی کہ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا سپاہی جھنڈا لیتا اور جان دیتا چلا جاتا تھا یہاں تک کہ سات مجاہد یکے بعد دیگرے اسی ہاتھی کے پاؤں تلے کچلے گئے۔

غرض حضرت عمرؓ کی زندگی اور آپ کا عہد تمام تر قول و فعل اور گفتار و کردار کے اس توازن اور توافق کا ایک مکمل نمونہ ہے جو اسلام کا پہلا اور آخری مدلل پیام تھا۔

حضرت عمرؓ ایک درویش کامل تھے مگر آپ کی درویشی اور بزرگی صرف ذکر و شغل تک محدود نہ تھی۔

آپ ایک بڑے فوجی جرنل تھے مگر اس سے آپ کی قائم اللیل اور صائم النہار ہونے کی صفت میں کوئی فرق نہ پڑ سکا۔ آپ ایک فقیر ایک "امیر" ایک فوجی افسر اور ایک دینی رہبر ہی نہیں مقنن۔ مدبر اور موجد بھی تھے ——— مصر میں آپ کی بنائی ہوئی وہ نہر جس سے بیس برس تک فائدہ اٹھایا گیا اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کے دماغ میں "سوئز کنال" کے فوائد محفوظ تھے۔

آپ کے مزاج کی تیزی مشہور ہے۔ اپنی ہمشیرہ کے اسلام لانے کی خبر پر آپ نے جو شدت ان سے برتی وہ آپ کی زندگی کا مشہور واقعہ ہے لیکن ساتھ ہی مزاج میں اتنی نرمی بھی تھی کہ قرآن شریف کی آیت سن کر آپ پر بے اختیار گریہ طاری ہو گیا۔

یہی وہ واقعہ ہے جس کو ترجمان حقیقت حضرت اقبالؒ نے دختران ملت سے مخاطب ہو کر ان الفاظ میں نظم کیا ہے ؎

نمی دانی کہ سوز قراءت تو
دگرگوں کرد تقدیر عمرؓ را

خیر یہ تو قرآن شریف کا معجزہ تھا۔ آپ تو اتنے رقیق القلب تھے کہ ایک مرتبہ رات کے گشت میں رہ بھی آپ کی ایک خصوصیت تھی جب آپ نے ایک گھر میں بچوں کا رونا سنا اور دریافت ... جب صورت حال معلوم ہوئی تو آپ خود اپنی پیٹھ پر لاد کر بیت المال سے آٹا لائے اور صرف خلاف ہی نہیں بلکہ اپنی اہلیہ کو بھی اپنے ساتھ لا کر دونوں نے مل کر چولھا جلایا اور کھانا پکایا اور جب انہیں کھلا کر مطمئن ہوئے۔

یہ واقعہ آپ کے احساس ذمہ داری کی بھی ایک ادنیٰ مثال ہے۔

مختصر یہ کہ آپ کی زندگی شروع سے آخر تک واقعی

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد

کی صحیح مصداق تھی۔

افسوس ایسی مکمل اور جامع شخصیت کو جس نے اس عرصہ میں اتنا بڑا فائدہ ملت اسلام کو پہنچایا چرخ فلک زیادہ دیر نہ دیکھ سکی اور آخر ایک بد نصیب کے ہاتھوں شہید ہو کر آپ بقا کے مالک بن گئے ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

زندگی کی طرح آپ کی موت کا یہ واقعہ بھی اسلام سے شیفتگی کا ایک عجیب ثبوت ہے۔ اپنے قاتل کا نام دریافت کیا جب آپ کو معلوم ہوا کہ وہ ایک غیر مسلم ہے تو آپ نے حالت نزع میں خدا کا شکر ادا کیا کہ ان کا قاتل مسلمان نہیں ہے۔

اوائل اسلام میں حضرت حمزہؓ اور انحطاط میں حضرت حسینؓ کے درمیان عروج اسلام کے دراصل ... ہیں۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

(بشکریہ ریاض)

خط و کتابت کے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ دیجئے تاکہ تعمیل ارشاد میں تاخیر کا امکان نہ ہو۔ "مدیر"

"زنجیرِ گراں"

رنگ لالے میں، نہ سوسن میں زباں ٹھہری ہے
اپنے گلشن میں اِدھر جب سے خزاں ٹھہری ہے

رات دم توڑ چکی ظلمتِ غم باقی ہے!
جانے تنویرِ سحر آج کہاں ٹھہری ہے

انکو اعزاز؟ کہ ہے جن سے چمن خانہ خراب
اہلِ دل کیلئے زنجیرِ گراں ٹھہری ہے

میرے اشکوں نے جلائے ہیں ستاروں کے دیئے
ظلمتِ غم مری راہوں میں جہاں ٹھہری ہے

سازشِ اہلِ چمن، دام و قفس ہیں لیکن
موجۂ گل جو اُڑی ہے تو کہاں ٹھہری ہے

نہ کھلیں پھول یہ ہے مرضیٔ گلچیں انور
اس کی ہر ایک ادا دشمنِ جاں ٹھہری ہے

عرفان اللہ صدیقی •

یاد

برسات کا موسم تھا۔ کالے کالے بادل آسمان کو گھیرے ہوئے تھے، رات کی تاریکی بڑھتی جارہی تھی۔ ہر سو خاموشی کا عالم تھا۔ کبھی کبھی بادِ نسیم کے جھونکے سلیم کو گدگدا جاتے۔ سلیم بحرِ خیالات میں غرق چپ چاپ بیٹھا تھا۔ اسے آج اپنے وطن کی یاد ستا رہی تھی۔ عزیز و اقارب۔ دوست۔ آشنا۔ ایک ایک کر کے پردۂ ذہن پر آتے۔ اور دل پر ایک چوٹ سی لگتی ــــ جس سے سلیم تلملا اٹھتا۔ اتنے میں کہیں دور درخت سے کوئل کی۔ کوکو کی آواز آئی ــــ سلیم چونک پڑا۔ کیوں کہ اس نے یہ آواز چھ سال کے طویل عرصے کے بعد سنی تھی۔ کوئل نے اپنی دلکش نغمے سے سلیم کو بری طرح مجروح کر دیا ــــ اسکی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ پلکوں سے اشک ٹپکنے لگے۔ سلیم بڑبڑانے لگا۔ ــــ آجا ــــ خوش گلو کوئل ــــ آجا ــــ آ ــــ میرے نزدیک ــــ تجھ سے پیار کی باتیں کروں ــــ تو ہے میرے عزیز دن۔ رشتہ داروں۔ دوستوں میں پرورش پائی ہے۔ سبھی میں۔ جنم لیا۔ وہیں کھیل کود کر پروان چڑھا۔ تو میری ہم وطن ہے۔ تو نے میرے وطن میں آموں کے باغات میں زندگی گذاری۔ میرے وطن کے نیلے اور شفاف آسمان کے نیچے زندگی بسر کی ــــ او سیاہ رنگت والی چڑیا میں تجھ سے محبت کرتا ہوں ــــ آ ــــ نیچے اتر کر میرے پاس بیٹھ جا اور مجھے میرے وطن۔ دوستوں۔ اور میرے رفیقو کا حال سنا ــــ مجھے وہ دلکش.. چھوٹا سا مگر خوبصورت باغیچہ یاد ہے ــــ آم و امرود کے درخت تھے۔ اور امرود کے درختوں کے کنارے گلاب اور بیلا کھلا ہوا تھا۔ اور وہ روش پر بچھا تھا سبزہ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے سبز رنگ کا مخمل بچھا دیا ہو ــــ یاد ہے ــــ مجھے وہ دلہن کی مست کن خوشبو اور تیرا آم کے درخت پر چہکنا۔ اور وہ صاف شفاف پانی سے لبریز ندی "کھو" جو بلور کی مانند چمکتی تھی۔ اور جس کے کنارے بیٹھ کر ــــ میں چاندنی راتوں میں گھنٹوں میں خوشی کے گیت گایا کرتا تھا ــــ وہ "کالاگڑھ" پہاڑ کی بلند اور نوکیلی چوٹیاں جو صبح کے وقت سورج کی زرافشاں کرنوں سے چمک اٹھتی تھیں۔

اور اپنا چھوٹا سا پر رونق گاؤں ــــ سرسوں کے ہرے بھرے کھیت جس پر پیلے پیلے پھول کھلتے تھے ــــ مجھے سب کچھ یاد ہے ــــ اب تک یاد ہے ــــ آ ــــ میرے دل کی دھڑکنیں سن ــــ اور میرے وطن کا حال سنا ــــ میری ہم وطن ــــ مجھے "کھو" ندی کی مدھری لہروں سے عشق ہے ــــ وہ چاندنی راتوں میں میرے دل کی دھڑکنیں سنا کرتی تھی ــــ اور میں گھنٹوں اسکے دل کو موہ لینے والے راگ سنا کرتا تھا ــــ اب بھی وہ مجھے خوابوں میں نظر آجاتی ہے۔ اسکے سیلاب کا منظر اب بھی میری نظروں کے سامنے ہے۔ ندی میں سیلاب آرہا ہے۔ اور سارا گاؤں سیلاب دیکھنے کے لئے امنڈ آیا ہے۔ ندی میں پانی کا سیلاب اور اسکے کنارے میرے دوستوں۔ میرے آشناؤں کا سیلاب۔ کوئل تیری شیریں آواز نے میرے دماغ سے فراموشی کا زنگ بالکل صاف کر دیا ہے۔ اور اب تمام دوستوں کی ــــ سرسبز کھیتوں کی۔ دلکش باغ کی۔ اور ملہری ندی کی تصویر ابھر کر میرے سامنے آگئی۔ اب میں ندی کا صاف شفاف سرد شیریں پانی پی سکوں گا ــــ افسوس میں پردیس کی مصیبتیں جھیل رہا ہوں۔ لہلہاتے ہرے بھرے باغات۔ صاف و شفاف بلور کی مانند چمکتی ہوئی ندی۔ سرسوں کے سرسبز کھیت۔ اور اسکے پیلے پیلے پھولوں سے دور ہوں ــــ اور فرقت کے رنج ــــ اور غربت کی کلفتوں میں اسیر ہوں میری پیاری کوئل ــــ تو نے اتنا لمبا سفر کیسے طے کیا ــــ تو کیوں کر میرے وطن سے یہاں آئی۔ کالاگڑھ کی سرسبز اور بلند نوکیلی پہاڑیاں چھوڑ کر ــــ بالکل خشک اور سخت پتھریلی پہاڑیوں کے وطن میں ــــ تو نے میرے وطن کی سرحدیں کیسے پار کیں ــــ تجھے کسی نے نہ روکا میرے ہم وطنوں نے تجھے کیوں نہ روکا ــــ تجھے یہاں کیوں آنے دیا ــــ اسلئے کہ میرے وطن پہ چھ کے لگ گئے ــــ جیسے۔ وطن کی یاد کو تر و تازہ کرے۔ اے شیریں بیاں کوئل۔ تجھے میرے

نے میرے ہم وطنوں کے لئے کوئی پیغام دیا ہوگا ـــــ سنا مجھے ـــــ اور کیا
ہاں لے دیا ۔ اگر انہوں نے کوئی پیغام نہیں دیا ۔ تو ان سے
پیغام
جاکر میرا سلام کہنا ـــــ آہ میں ان گلاب کے پودوں سے [illegible]
لئے پھندے سے کتنی دور ہوں ـــــ افسوس یہاں میرا کوئی بھی
نہیں ـــــ مر جاؤں گا تو معلوم نہیں قبر کی آغوش میں کیسے پہنچوں گا ـــــ
کون مجھے اٹھا کر لحد میں سلائے گا ـــــ کون مجھے رو دے گا ـــــ ہائے
میری قبر پر کوئی آنسو بہانے والا بھی نہ ہوگا ـــــ اے پیاری کوئل تو میرے
مرقد پر ضرور آئیو ـــــ اور ماتم ـــــ آہ و فغاں ـــــ نالہ و شیون کریو
اور شبنم اشک افشانی کرے گی ۔ سلیم بڑبڑاتے بڑبڑاتے خاموش ہوگیا ـــــ وہ سوچنے
لگا ۔ کہ میں پاکستان کیوں آیا تھا ـــــ ؟ میرا یہاں کون تھا ـــــ ؟
آہ میں نے پاکستان کے لئے اپنا سب کچھ کیوں قربان کر دیا ـــــ اپنے عزیزوں
کو ـــــ دوستوں کو ـــــ کیوں چھوڑ دیا ـــــ ؟ سلیم سنجیدگی سے سوچنے
لگا ۔ اشکوں کا چشمہ خشک ہوگیا ۔ اور وہ خیالات کے گہرے سمندر میں غرق
ہوگیا ۔ سوچنے لگا وہ پاکستان آنے کے وقت اتنا خوش کیوں تھا ۔ تمام رشتہ داروں
آباؤ اجداد کی ہڈیوں ۔ بزرگوں کے مرقد اور خانقاہوں ۔ بلند مینار والی باعظمت
اور تاریخی مساجد ۔ اپنے ماحول ۔ اور اس سرزمین جس کی گود میں پل پل کر جوان ہوا
تھا ۔ غرض کہ وطن کی ہر ہر چیز کو چھوڑنے کیلئے کیوں تیار ہوگیا تھا ۔ صرف پاکستان
جانے کی خوشی میں اس نے اتنی چیزوں کو چھوڑنا کیسے گوارا کر لیا تھا ۔ اور پھر اب وطن
کی فرقت میں کیوں تڑپ رہا ہے ۔ اس نے پہلے کیوں نہ سوچا تھا ۔ وہ ٹھنڈی
آہ بھرتے ہوئے چیخا ـــــ آہ ـــــ میں ہجر و فراق میں یونہی
جلتا رہوں گا ۔ میں ایسے ہی جل جل کر ختم ہو جاؤں گا ـــــ جیسے لکڑی جلتے جلتے
ختم ہو جاتی ہے ـــــ اسی طرح میں بھی کسی دن ـــــ ہجر ـــــ
و فرقت کی آگ میں جل جل کر بالکل راکھ ہو جاؤں گا ۔ میں نے پہلے کیوں
نہ سوچا تھا ۔ سوچتے ۔ سوچتے ۔ اسے یاد آگیا وہ کیوں پاکستان
آیا تھا ۔ جس خوشی سے آیا تھا ۔ سب نے اسے روکا تھا ۔ لیکن اس نے کسی کا
کہنا نہ مانا تھا ـــــ کیوں ـــــ ؟ صرف اسلئے کہ وہ
سمجھتا تھا کہ میں اپنی آنکھ سے وہ نظام سلطنت دیکھ لوں گا ۔ جس کے لئے
میں مسلم لیگ کے جھنڈے تلے اب تک جہاد اور فرنگی سے برسر پیکار رہا تھا ۔
جس کے لئے میں نے [illegible] کا خطاب حاصل کیا تھا جس کے لئے میں نے
مصیبتیں جھیلی ہیں ۔ اور نظام حق کی سواری خراماں خراماں چلی آ رہی ہو ۔ *

گاؤں گاؤں کی خاک چھانی تھی ۔ میں یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ مجھ سے یہاں [illegible]
یہ کوٹھی جو مجھے اپنی آباؤ اجداد سے ورثہ میں ملی تھی ـــــ یہ کھیت ـــــ یہ گاؤں
ـــــ یہ دوست ـــــ یہ آشنا ـــــ یہ بلور کی طرح جگمگاتی ہوئی
ندی غرض کہ یہاں کی ہر چیز چھوٹ جائے گی ـــــ پاکستان آیا تھا ۔ صرف یہ
دیکھنے کہ عمرؓ کی خلافت کیسی ہے ۔ خدا کی بادشاہت میں کیا ہوتا ہے لیکن میں
جب یہاں پہنچا ـــــ تو دیکھا ـــــ نقلی خداؤں کی حکومت ہے
اور عمرؓ کی جگہ امریکہ اور برطانیہ یعنی اس فرنگی جس کے خلاف میں اب تک لڑتا آیا
تھا ـــــ اسی ظالم کے خلیفہ یہاں بھی برسر اقتدار ہیں ۔ میری قربانیاں رائیگاں
گئیں ـــــ لیکن میں اب کیسے واپس جاؤں ۔ اپنے دوستوں کو کیا منہ دکھلاؤں
اپنے آشناؤں سے کیا کہوں ۔ میں نے ہی تو سب سے کہا تھا کہ پاکستان
میں اللہ کی حکومت ہوگی ۔ قرآنی نظام ہوگا ۔ اور ان سے اللہ کی حکومت
اور اسلامی نظام کے نام پر مسلم لیگ کے لئے ووٹ لئے تھے ۔ اب میں ان کو
کیسے منہ دکھلاؤں ۔ امریکہ کی حکومت کو کیسے اللہ کی بادشاہت کہوں ۔ باطل
نظام کو کیسے نظام حق کہوں ۔ ظلمت کو کیسے نور کہہ دوں ۔ اور پھر اب میری
اس عالیشان کوٹھی پر بھی تو ترنگا لہرا دیا ہوگا ۔ اور اس پر شرنارتھیوں کا
قبضہ ہوگا ۔ جائیداد کسٹوڈین کی تحویل میں ہوگی ۔ اب میں کیونکر جا سکتا
ہوں ۔ ” نہ پائے ماندن نہ جائے رفتن “

سوچتے ۔ سوچتے ۔ سلیم یکایک تن کر کھڑا ہوگیا ۔ اسکے چہرے
پر ایک نیا عزم اور ایک نئے ولولے کے آثار جھلکنے لگے ۔ اس نے پکار اور بلند
آواز سے پھر کوئل کو پکارا ـــــ اور کہا ـــــ اے میری پیاری کوئل ۔
جا اب تو جا ـــــ اور کہہ دینا میرے ہم وطنوں سے ـــــ اور پھر
ندی کی سنہری لہروں سے ۔ کہ سلیم ابھی زندہ ہے ۔ اور زندہ رہے گا اس وقت
تک ـــــ جب تک اپنے کئے ہوئے وعدے کو پورا نہ کر دے جب
تک اپنے قول کو سچا کر دکھائے جب تک پاکستان سے نقلی خداؤں کی
حکومت ختم نہ کر دے ۔ اور ـ اور جب تک امریکہ اور برطانیہ کے خلیفہ کی
جگہ خلیفہ رسول اللہ کو نہ بٹھائے ـــــ

عین اس وقت سیاہ بادل پھٹ گئے ۔ اور مہتاب ہنستا ہوا [illegible]
مسرت میں لئے ہوئے پوری تابانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوا ۔ تمام عالم [illegible]
فضا نور سے معمور ہو گئی ۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا ۔ جیسے فرشتے نور کی مشعلیں

جبران
غلام عباس

شیطان کا ساتھی

پرانے زمانے میں ایک نیک اور رحم دل انسان رہتا تھا اسکے پاس اس دنیا میں آرام و آسائش کے لئے کثیر تعداد میں سامان کے علاوہ خدمت کیلئے بہت سے غلام بھی تھے اور غلام اپنے نیک اور رحم دل مالک کے وجود کو اپنے لیے خدا کی خاص عنایت سمجھتے تھے اور کہتے تھے۔

"اس دنیا میں ہمارے مالک سے اچھا کوئی دوسرا نہیں ہے وہ ہمیں اچھا کھلاتا اور پہناتا ہے اور ہماری طاقت کے مطابق کام کرنے کو دیتا ہے۔ وہ بغض سے کام نہیں لیتا اور نہ ہی کسی کو سخت الفاظ سے مخاطب کرتا ہے وہ دوسرے مالکوں کی طرح نہیں ہے جو اپنے غلاموں کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کرتے ہیں، سزا دیتے ہیں خواہ وہ قصوروار ہوں یا نہ ہوں اور کبھی ان سے نرم اور دوستانہ لہجے میں نہیں بولتے وہ ہماری اچھائی چاہتا ہے۔ ہم سے بھلائی کرتا ہے اور ہم سے نرمی اور پدرانہ شفقت سے بولتا ہے۔ ہم اس سے زیادہ اچھی زندگی کی تمنا نہیں کرتے۔"

اس طرح غلام اپنے مالک کی تعریف کرتے اور شیطان کو یہ دیکھ کر سخت اذیت ہوتی کہ غلام، اس طرح اپنے مالک کے ساتھ ہم آہنگی اور محبت سے رہ رہے ہیں ______ اس نے ان میں سے ایک الیب نامی غلام کو اپنے ساتھ ملا کر دوسرے غلاموں کو بہکانے کی سازش کی۔ اور ایک دن جب کہ وہ تمام آرام سے بیٹھے ہوئے اپنے مالک کی اچھائیاں بیان کر رہے تھے تو الیب نے اپنی آواز بلند کی اور کہا "ہر وقت اپنے مالک کی تعریف کرتے رہنا بے وقوفی کی علامت ہے۔ شیطان خود تم سے رحمدلی اور نرمی سے پیش آتا ہے مگر تم اسکے لئے وہی کچھ کرو جو وہ چاہتا ہے۔ ہم اپنے مالک کی اچھی طرح خدمت کرتے ہیں اور اسکی ہر بات پر دھڑ کی بازی لگا دینے کو تیار رہتے ہیں۔ جونہی وہ کسی چیز کے بارے میں سوچتا ہے تو ہم پیش از وقت اسکی خواہشات کا اندازہ لگا کر اس کام کو کر دیتے ہیں اور وہ ہمارے اس رویے پر رحمدل ہونے کے سوا اور کیا کر سکتا ہے؟ ذرا آزمائش کر کے دیکھ لو کیا ہوتا ہے اگر ہم اسکی ہاں میں ہاں ملانے کی بجائے اس کو تھوڑا سا نقصان پہنچائیں

وہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح ہم سے پیش آئے گا اور برائی کا بدلہ برائی سے ہی دے گا جیسا کہ اکثر برے مالک اپنے غلاموں سے کیا کرتے ہیں۔"

دوسرے غلاموں نے الیب کی، اَن کہی ہوئی باتوں سے انکار کرنا شروع کر دیا اور آخر اس سے شرط لگا دی۔ الیب نے اپنے مالک کو ناراض کرنے کے کام کو اپنے ذمے لے لیا اگر وہ اس میں کامیاب نہ ہوا تو اسے چھٹی کے دن پہننے لباس سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ لیکن اگر وہ کامیاب ہوا تو۔ دوسرے غلاموں کو اپنے ملبوسات اسکو دینے پڑیں گے ______ اسکے علاوہ نے اس کو مالک کے عتاب سے محفوظ رکھنے اور جیل کی صورت میں آزاد کرانے بھی وعدہ کر لیا۔ اس شرط کے طے ہو جانے پر الیب دوسرے دن اپنے مالک کو ناراض کرنے پر متفق ہو گیا۔

الیب گڈریا تھا اور اسکے زیر نگرانی بہت سی ایسی قیمتی اور خالص النسل بھیڑیں تھیں جن سے اسکے مالک کو بہت ہی لگاؤ اور انس تھا۔ دوسرے دن جب مالک اپنی قیمتی بھیڑیں دکھلانے کے لیے چند مہمانوں کو باڑے میں لایا تو الیب نے اپنے دوسرے ساتھیوں کو آنکھ ماری جیسا کہ وہ انہیں کہہ رہا ہو کہ۔

"دیکھو۔ اب میں اسے کتنا غصہ دلاؤں گا۔"

تمام غلام اکٹھے ہو گئے اور باڑے کے دروازے سے اندر جھانکنے لگے اور شیطان یہ دیکھنے کے لئے کہ اب اس کا مرید کس طرح اپنا کام سرانجام دے گا نزدیک لگے ہوئے درخت پر چڑھ گیا۔ مالک باڑے میں ادھر سے جاتا اور اپنے مہمانوں کو اپنی بھیڑوں کے چھوٹے چھوٹے خوب صورت بچے دکھاتا پھر اس نے انہیں اپنا سب سے بہترین مینڈھا دکھلانے کا ارادہ کیا۔

"تمام مینڈھے بہت اچھے قیمتی ہیں" اس نے کہا "لیکن میرے ایک انمول مینڈھا ہے جس کی قیمت کے بدلے اگر کوئی مجھے اپنی آنکھوں کی بینائی بھی نکال کر دے تو میں حقارت سے ٹھکرا دوں گا۔"

اجنبیوں کے خوف سے بھیڑیں باڑے میں ادھر سے ادھر بھاگ

ہیں۔ اس سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ بھیڑوں کو کسی طرح ایک نظر بھی نہ دیکھ سکو۔ جونہی بھیڑیں باہر نکلتی ہیں تو الیب انہیں دوبارہ اس طرح ہانکتا ہے جیسا کہ ان کا تعاقب ہو رہا ہو۔ اور وہ بار بار بھاگنے لگ پڑتی ہیں اور آپس میں گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔ مہمان یہ دیکھ سکے کہ الیب کا اصول کیا ہے۔ آخر کار مالک بھیڑوں کے متواتر بھاگنے سے تنگ آ گیا۔ الیب بیاتا ہے دوست تھا۔ اس نے کہا "مہربانی کر کے میرے لئے مجھے میرا پسندیدہ مینڈھا تو پکڑ دو جس کے سینگ آپس میں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے ہیں۔ ذرا سے احتیاط سے پکڑنا اور کچھ دیر پکڑے رکھنا۔"

مالک ابھی یہ جملے ختم کرنے ہی پایا تھا کہ الیب شیر کی طرح بھیڑوں پر جھپٹا اور سرعت کے ساتھ مینڈھے کو پکڑ لیا۔ اون سے مضبوطی سے پکڑتے ہوئے اس نے مینڈھے کی اگلی داہنی ٹانگ ایک ہاتھ سے پکڑ لی اور اپنے مالک کی آنکھوں کے سامنے اسے اوپر اٹھایا اور اس طرح جھٹکا دیا کہ وہ خشک بیل کی طرح ٹوٹ گئی۔ اس نے مینڈھے کی ٹانگ توڑ دی تھی۔ ٹوٹی ہوئی ٹانگ سے فوارے کی طرح خون بہنے لگا۔

الیب نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مینڈھے کی بائیں ٹانگ کو بھی زور سے مروڑتے ہوئے مینڈھے کو دوسری ٹانگ سے بھی لنگڑا کر دیا۔ ——
مہمان اور دوسرے خوف اور حیرانگی سے زور سے چلائے اور درخت پر بیٹھا ہوا شیطان خوشی سے پھولا نہ سما رہا تھا کہ الیب نے اس کے کام کو بہت ہوشیاری سے ادا کر دیا ہے۔ مالک کا چہرہ غصہ سے لال پیلا ہو گیا، ماتھے کی تیوریاں تن گئیں لیکن الیب کو کچھ کہنے کی بجائے اس نے سر جھکا لیا اور منہ سے کچھ بھی نہ کہا۔ مہمان اور غلام خاموشی و حیرانگی کے عالم میں اس بات کے منتظر تھے کہ اب کیا ہو گا۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد مالک نے اپنے آپ کو اس طرح جھنجھوڑا جیسے وہ کوئی بہت بھاری بوجھ اپنے اوپر سے اتار پھینکنے کی سعی کر رہا ہو۔ پھر اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور آسمان کی طرف شکستہ آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ وہ تھوڑی دیر اسی طرح آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ اسی اثنا میں اس کے چہرے سے غصے کی لکیریں غائب ہو گئیں اور الیب کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے اس نے یوں کہنا شروع کیا ——
"او الیب، الیب، تمہارے آقا نے تمہیں غصہ دلا کر تمہیں برا بھلا کہنے کے لئے تمہیں حکم دیا تھا لیکن میرا آقا تمہارے آقا سے بہت زیادہ طاقتور تمہیں سزا دوں گا۔ تم مجھ سے جو کچھ حاصل کرنا اور جو کچھ بھی کرنا چاہتے ہو —— سنو الیب —— میں تم کو سزا نہیں دوں گا بلکہ اگر تم یہاں میرے مہمانوں کے سامنے آزاد ہو جانے کی خواہش رکھتے ہو تو میں تم کو اب اور اسی وقت آزاد کرتا ہوں۔ جاؤ جہاں تمہارا دل چاہے چلے جاؤ اور تم ہی اپنی چھٹی کے دن پہننے والے لباس کو بھی لے جاؤ ——

اور رحمدل مالک اپنے مہمانوں اور دوسرے غلاموں کے ساتھ اپنے مکان میں واپس آ گیا لیکن شیطان دانت پیستے ہوئے دھڑام سے درخت پر سے نیچے گر پڑا اور زمین میں دھنس گیا۔

(بشکریہ ناصح) (ٹالسٹائی کی ایک کہانی)

آپ کا بچہ

○

ظلام سرخ ہمیں اب نہ دے فریب سحر
اٹھ چکی ہے ہر اک سمت اب ہماری نظر
جنوں نے کتنے بسائے ہیں گاؤں کتنے شہر
ہنوز عقل فسوں ساز محو فکر و نظر

اٹھو کہ ڈوب نہ جائے طلسم ظلمت میں
یہ بزم کاہکشاں تابش جبین سحر

حریم زہد میں ہوتا ہے ذکر پیر مغاں
کہیں فریب تو کھاتی نہیں ہے میری نظر

ہزار باد مخالف ہزار دار و رسن
"جنون عشق" جہاں میں قدم اٹھائے جدھر
شرر سے جاگ اٹھے ہیں نگاہ گلچیں میں
کہا تھا میں نے فقط "آج ہی بہار کدھر؟
ہوا ہے جب بھی شکستہ رباب حق شبنم
میری نظر نے بہائے ہیں اشک خون جگر

(ادارہ ادب اسلامی لکھنؤ کے پندرہ روزہ اجلاس میں پڑھی گئی)

ایم جلیل شمس •

تلقین

سرزمین پاک سے لیکر اٹھو عزم جواں
صفحۂ ہستی پہ دہراؤ سلف کی داستاں
اور زمانے سے مٹا دو کفر کا نام و نشاں

نوجوانانِ وطن پرچم کو لہراتے چلو

مثل طوفاں بحر کی تہ سے ابھرنا ہے تمہیں
بربریت کے عناصر کو کچلنا ہے تمہیں
زندگی دوزخ ہے جنت میں بدلنا ہے تمہیں

نوجوانانِ وطن پرچم کو لہراتے چلو

ہر طرف پھیلا ہوا ہے پھر جہاں میں انتشار
ہو رہے ہیں آج انساں ظلم و وحشت کا شکار
بے نواؤں مفلسوں کو ہے تمہارا انتظار

نوجوانانِ وطن پرچم کو لہراتے چلو

سوئے منزل گامزن ہو اور رہو ثابت قدم
لاکھ آجائیں حوادث اپنی ہمت ہو نہ کم
عزم محکم پہ قائم ہو تو پھر کیا رنج و غم

نوجوانانِ وطن پرچم کو لہراتے چلو

ریت کا ٹیلہ

وہ ترقی پسند تحریک کے نظریات کا بڑا پرجوش مبلغ تھا۔ اس کا قلم اسکے دل و دماغ میں جاگزیں کمیونسٹ نظریات کی ترجمانی کا حق گزشتہ دس سال سے پورے صدق کے ساتھ ادا کر رہا تھا۔

اسکی نگارشات پاک و ہند کے ترقی پسند مصنفین کے حلقوں سے اپنا لوہا منوا چکی تھیں اسکے افسانے اسکے شعر۔ اسکی تنقیدیں اور تبصرے ترقی پسند تحریک کی ماہوار سنگ میل کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ آج کل ملک کے سب سے کثیر الاشاعت روزنامہ کا ایڈیٹر تھا۔ اس نے آج تک مسلمان کہلاتے ہوئے بھی کبھی اس بے خدا تحریک سے اپنی والہانہ وابستگی کے تضاد کی اہمیت کو محسوس نہ کیا تھا۔

پچھلے اتوار جب وہ اپنے روزنامہ کے سارے اسٹاف کے ساتھ ساحل سمندر پر پکنک منا رہا تھا۔ تو وہ چلتے چلتے ایک ریت کے ٹیلے پر چڑھ گیا۔

اور سطح سمندر کو چیرنے والے ایک بحری جہاز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کامریڈانہ انداز میں اس نے اپنے ساتھیوں سے دریافت کیا:۔

"رفیقو!! کیا آپ اس جہاز کو زندگی کے بحرِ بےکراں میں تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے دیکھ رہے ہیں؟"

سب ساتھیوں نے ایک زبان ہو کر جواب دیا۔ "ہاں کامریڈ جہاز صاف نظر آ رہا ہے"

اور دور ساحل کے دور مینار بھی جس کا فرض بھٹکے جہازوں کو راہ دکھانا ہے"

ایڈیٹر نے اپنی گردن کو اکڑاتے اور ٹائی کی گرہ کو درست کرتے ہوئے پھر سوال کیا۔ "ہاں وہ بھی صاف نظر آ رہا ہے" سب ساتھیوں نے یکساں جواب دیا۔

پھر اس نے اپنے ہاتھ سے بستی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑے فلسفیانہ انداز میں دریافت کیا۔ "اور وہ دیکھو جا بجا چھوٹے چھوٹے میناروں میں گھرا ہوا مسجد کا گنبد بھی نظر آ رہا ہے۔ جہاں مذہب کی افیون کھلا کر انسانوں کو مدہوش کیا جاتا ہے؟" "ہاں کامریڈ وہ بھی دکھائی دے رہا ہے!" سب ساتھیوں نے ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور کیا اس گنبد کے اوپر آپ کو کہیں "خدا" بھی نظر آتا ہے؟" اس نے بڑے فخر کے ساتھ دریافت کیا۔ . . . . "خدا تو نظر نہیں آتا" سب نے معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

"تو پھر میرے عزیز ساتھیو!!! یاد رکھو! اس مادی دنیا میں کسی چیز کا نظر نہ آنا۔ اسکے وجود کی نفی کے لئے بڑی مضبوط دلیل ہے" اس نے فیصلہ کن اور فاتحانہ انداز میں کہا۔ "ہے اس کا کوئی جواب" . . . . چھوٹی سی سیاہ داڑھی والا دفتر کا غریب کاتب جس پر پابندی کے ساتھ نماز پڑھنے کی وجہ سے لوگ پھبتیاں کسا کرتے تھے۔ تلملا اٹھا۔ وہ ایک شانِ استغنا کے ساتھ آگے بڑھا۔ اور ایڈیٹر سے مخاطب ہو کر بولا!!! "گستاخی معاف۔ اس کا جواب میں دے سکتا ہوں۔"

اور سارے ساتھی اسکی طرف حیرت و استعجاب کی نظروں سے دیکھنے لگے

وہ اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے بولا!!! "ساتھیو . . . جناب ایڈیٹر صاحب ہمارے سامنے کھڑے ہیں۔ آپ ان کو دیکھ رہے ہیں؟"

سب نے جواب دیا۔ "ہاں دیکھ رہے ہیں؟"

پھر اس نے پوچھا!!! "اور ہمارے ایڈیٹر صاحب کی گہرے رنگ کی پتلون جس میں کوئی شکن نہیں ہے۔ اور اس پر سفید قمیص اور سرخ رنگ کی ٹائی بھی آپ صاحبان ضرور دیکھ رہے ہیں"

سب نے متفقہ طور پر جواب دیا۔ "ہاں ہاں! ضرور دیکھ رہے ہیں"

اور پھر اس نے ایڈیٹر صاحب کی سر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"ان کا سر اور اس پر شوخ براؤن رنگ کا فلیٹ ہیٹ بھی آپ کو صاف نظر آ رہا ہوگا"

"بالکل" سب نے مسکراہٹوں کو ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ ان کے سر میں یا اسکے آس پاس کہیں "عقل" نامی کوئی چیز بھی دیکھ رہے ہیں؟"

(باقی صفحہ [illegible] پر دیکھئے)

نجیب صدیقی

آرائش

افراد:-

شاہد • ایک دفتر کا افسر، جذباتی ہے اور نوجوان۔

بندو • شاہد کا نوکر۔

ریحانہ • ایک لڑکی —— سنجیدہ اور ذہین۔

منظر:-

صبح کے آٹھ بجے ہیں۔ سکرٹیریٹ سے ملحق ایک کوارٹر ہے جس میں شاہد رہتا ہے۔ بندو چائے کی تیاری میں مشغول ہے۔ شاہد منہ دھو رہا ہے۔ دروازے پر دستک کی آواز......

کون ہے —— بندو —— بندو ——

جی صاحب:-

دیکھنا دروازے پر کوئی دستک دے رہا ہے —— اور ہاں —— ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ —— میں آتا ہوں ——

:- جی صاحب

دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز —— وقفہ

:- بندو کون تھا

:- جی صاحب میں پہچانتا نہیں

:- تم نے کبھی دیکھا بھی نہیں ہے —— عزیز —— رفیق —— نصیر —— اور ہاں دفتر کا کوئی چپراسی تو نہیں ...

:- نہیں صاحب —— کوئی خاتون ہیں ——

:- ہائیں —— کیا کہا خاتون —— خاتون کو مجھ سے کیا کام

:- جی صاحب

:- بڑبڑاتے ہوئے —— شاید دفتر کی ٹائپسٹ ہو —— مگر بندو —— تم تو اسے جانتے ہو گے۔

:- جی صاحب —— کیسے

شاہد:- وہی مریم —— اختر —— نسرین —— دفتر کی ٹائپسٹ ——

بندو:- مگر صاحب وہ تو کوئی برقع والی ہے ——

شاہد:- (دماغ پر زور دیتے ہوئے) کون ہو سکتی ہے؟ بندو تمہیں دھوکہ تو نہیں ہوا —— کوئی نوکری مانگنے والی عورت تو نہیں —— کہہ دیا ہوتا۔ یہاں زنان خانہ نہیں —— سب مجرد ہی مجرد ہیں ——

بندو:- جی صاحب —— میں نے پوچھا کس سے ملنا چاہتی ہیں

شاہد:- تو جواب کیا دیا تھا ——

بندو:- صاحب آپ ہی کا نام لیا تھا ——

شاہد:- میرا نام

بندو:- جی صاحب

شاہد:- مجھ سے ملنے کوئی خاتون —— بندو میرا کنگھا لانا اور گنگناتا ہے ....

دوسرا منظر:-

ڈرائنگ روم ہے کمرے میں دو طرف کرسیاں بچھی ہیں —— وسط میں ایک گول میز پر پھولوں کی دو گلدستے رکھے ہوئے ہیں۔ دیوار پر کلاک ٹک ٹک بجا رہا ہے —— کمرے میں سناٹا ہے۔ ایک کونے میں ایک کرسی پر ایک عورت بیٹھی ہے —— شاہد کھنکھارتے ہوئے داخل ہوتا ہے ——

شاہد:- (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) فرمائیے! کیا کام ہے؟

—— وقفہ ——

شاہد:- میں آپ ہی سے مخاطب ہوں —— کیا آپ کو مجھ سے کوئی

—— وقفہ ——

شاہد:- (سگریٹ سلگاتے ہوئے) جی —— جناب تو کیا —— آپ مجھ سے ملنا چاہتی ہیں؟ کیا کام ہے؟

— وقفہ —

شاہد۔ آپ بندہ ہی ہیں .... (گھبرا کر) ایسی کیا بات ہے حضور (دیکھیں) کچھ بتائیے تو سہی — بندو — بندو —

بندو:۔ جی صاحب (بندو چائے کی ٹرے میز پر رکھتا ہے)

شاہد۔ کچھ نہیں — تم جاؤ

— وقفہ —

شاہد۔ اچھا تو میں چلتا ہوں — آپ بولتے سے رہیں۔ اور (عورت چہرے سے نقاب الٹ دیتی ہے۔)

شاہد۔ (حیرت سے) ریحانہ تم — ریحانہ۔ میری آنکھیں دھوکہ تو نہیں کھا رہی ہیں — (آنکھوں کو ملتا ہے) ریحانہ تم نے دوسرا جنم تو نہیں لیا — بولو! کیسی ہو — اتنے دنوں تک کہاں تھیں — ہم لوگ تو یقین کر چکے تھے کہ چچا یوسف کے ساتھ تمہیں بھی شہید کر دیا گیا — تو ہماری ریحانہ زندہ ہے۔ آج کا دن کتنا مبارک ہے — اچھا تو اب آنسو پونچھ لو — بندو — بندو —

بندو:۔ جی صاحب — حاضر ہوا —

شاہد:۔ کچھ بسکٹ اسکٹ تو لاؤ۔ خالی چائے لا کر رکھ دی —

بندو:۔ جی صاحب۔ بہت اچھا۔

شاہد:۔ اچھا ریحانہ یہ تو بتاؤ۔ اتنے دنوں تک تم کہاں تھیں۔ اور ہاں تمہیں ہمارا پتہ کس طرح مل گیا — اسے کہتے ہیں دنیا گول ہے — بھائی اصغر محمود بھی تو شہید کر دئے گئے —

ریحانہ۔ میں بدنصیب صرف زندہ بچی ہوں — اور باقی سب — (پھر رونا شروع کر دیتی ہے)

شاہد۔ ارے ریحانہ رو تو نہیں — اس دنیا میں جو چیز پیدا کی گئی ہے وہ ضرور ایک دن مٹ جائے گی — ہم نے تو سب کو صبر کر لیا ہے۔ اور صبر کے علاوہ چارہ ہی کیا تھا — اسی فساد کے دوران میں میرے والدین — باجی — کبیر — لطیف — اور تمہاری [illegible] بھی شہید کر دی گئی — یہ خوب اتفاق ہے — [illegible] تم —

ہم اور تم اس دھرتی پر بوجھ ہیں — اور نہ جانے ہم جیسے کتنے ہیں جن پر یہ عذاب مسلط ہوا ہے — ایک وہ دن تھا جب زندگی کا ہر آنے والا لمحہ مسرت و شادمانی کا پیام لاتا تھا — اور آج زندگی عذاب ہو کر رہ گئی ہے — نہ ختم ہونے والا عذاب — جو روح پر کہر کی طرح ہر وقت چھایا رہتا ہے اور روح گھٹتی رہتی ہے — یہ گھٹن مسلسل چار سال سے ہے۔ کبھی کبھی احباب کے قہقہے کچھ دیر کے لئے اس کہر کو چھانٹ دیتے ہیں۔ مگر جب تنہائی ہوتی ہے پھر ذہن پر وہ بوجھ آن پڑتا ہے — تم نے اس کہر میں روشنی کی ایک لکیر کھینچ دی ہے

ریحانہ:۔ سچ — کیا واقعی تمہیں خوشی ہوئی ہے — (اور پھر سنجیدہ ہو جاتی ہے) — مگر ....

شاہد۔ ایسا ہی سچ جس طرح یہ چاند اور سورج سچ ہیں۔ یہ دن اور رات سچ ہیں یہ موسم کے تغیرات سچ ہیں۔ زندگی کی گاڑی بغیر منزل کے چل رہی تھی تم نے افق امید پر نمودار ہو کر منزل کا احساس دے دیا ہے — شدید احساس — اس سے پہلے بھی جب ہم اور تم ملا کرتے تھے تو یہ احساس جاگتا ہوا نظر آتا تھا۔ اور اس احساس پر ظلم کے نے بڑی بے رحمی سے مٹی ڈال دی تھی — آج تم نے اس مٹی کو کرید کر پھینک دیا ہے — (چائے کی پیالی بڑھاتے ہوئے) چائے تو پیو — زندگی حادثہ ہے — تقسیم ملک سے پہلے ہماری تمہاری ملاقات حادثے سے کم نہ تھی۔ تمہارا بچھڑ جانا حادثہ تھا اور آج تمہارا ملنا بھی حادثے سے کم نہیں اور پھر — (ہنستا ہے) دیکھو ریحانہ تم کتنی دبلی ہو گئی ہو — بالکل ہمارے دفتر کی ٹائپسٹ مریم کی طرح — اور جانتی ہو یہ مریم کون ہے — ہمارے دفتر کی عیسائی ٹائپسٹ — سوکھا ہوا چہرہ پچکے ہوئے گال آنکھیں ہیں کہ اندر [illegible] کے لئے راستہ پا رہی ہیں —

ریحانہ:۔ اور یہاں کوئی نہیں ہے ....

شاہد۔ کیوں نہیں؟ — میں ہوں — بندو ہے — اور کیا چاہیے (ہنستا ہے) ریحانہ میں نے شادی نہیں کی ہے — زندگی بھر کنوارا رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر — اب چھوڑو ان باتوں کو — تم یہ بتاؤ تم اتنی دبلی کیوں ہو گئی۔ ہاں اتنے دنوں تک تھی کہاں —

ریحانہ۔ دیکھ لو سوچ کر ... ہم سب [illegible] ——— جہاں انسانیت
کی بیخ سنائی نہیں دیتی ——— جہاں سب کچھ ہے مگر انسانیت
نہیں۔

شاہد۔ انسانیت تو اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہے۔ ہر شخص خود غرضی کا
جال دیکھ لو ——— ہر شخص چاہتا ہے کہ ہر آنے والے سے چھوٹی اور
بڑی وصولی کی جائے۔ کارکن چاہتے ہیں کہ ہڑتال والی درخواست کیسا تو
سرخ فیتا لوٹ ہی کیا ہوا ہو ——— اور میں ——— بھلا ایسے اصول
میں کیسے بچ سکتا ہوں ——— کوئی نہیں بچ سکتا ———
سب گندے ہیں ——— اس تالاب کی کوئی مچھلی پاک نہیں۔

ریحانہ۔ جب پوری دنیا پر ظالموں کا قبضہ ہے تو پھر عورت تو کمزور پیدا کی گئی
ہے۔

شاہد۔ عورت ہی پر منحصر نہیں ——— غریب عوام بھوکے مر رہے ہیں اور
چند سرمایہ پرست اس دنیا کے نظام پر چھائے ہوئے ہیں۔ ———

ریحانہ۔ صرف سرمایہ پرست ہی نہیں بلکہ چھوٹے سے بڑے سب کے دلوں
سے انسانیت مٹ گئی ہے۔ ہمدردی اور اخلاق کا دور دور تک پتہ نہیں

شاہد۔ غریب عوام اب بھی مخلص ہیں مگر سرمایہ دار . . . .

ریحانہ۔ جس کے پاس جتنی قوت ہے اتنا ہی ظالم ہے ——— سرمایہ دار بڑا ظالم
ہے اور اس سے چھوٹا اس سے کم۔ بہرحال ظلم کہیں کم کہیں زیادہ دونوں
طبقوں میں ہے۔

شاہد۔ دیکھو ریحانہ۔ اس فساد کی جڑ سرمایہ ہے اور سرمایہ جب تک ملک کے
عوام میں مساوی تقسیم نہ کر دیا جائے فساد رک نہیں سکتا . . . . . دنیا
میں جب تک یہ اونچ نیچ باقی ہے صلح کی امید نہیں کی جا سکتی ———

ریحانہ۔ مگر اخلاق کی تقسیم کیسے کی جا سکتی ہے ———

شاہد۔ اخلاق کے بناؤ بگاڑ کا انحصار بھی سرمایہ پر ہے جس کے پاس جتنا زیادہ
سرمایہ ہے اتنا ہی زیادہ بد اخلاق ہے دراصل اس دنیا پر وہی نظام
کامیاب ہو سکتا ہے جو اپنے سرمایہ والانہ جذبہ لے کر اٹھے اور ملک کی دولت
کو مساوی تقسیم کرنے کا اعلان کر سکتا ہو ——— جب تک سطح ہموار
نہیں کی جائے گی نشیب ختم نہیں ہو سکتا ———

ریحانہ۔ میں نے ایسے کتنے لوگوں کو دیکھا ہے جن کی زبانیں ہر وقت سرمایہ
کو کوستی رہتی ہیں لیکن جب ان کے دامن میں اپنی سرمایہ [illegible]
اور کمال یہ ہے کہ اخلاق کے دامن پر بدنما داغ بھی انسانیت
کے لئے باعث ننگ ——— میں یہ نہیں سمجھ سکتی کہ اس دنیا میں
اخلاق اور انسانیت کے بجائے سرمایہ بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے۔

شاہد۔ کیا تمہیں کسی نے دکھ دیا ہے ——— اور ہاں تم نے تو اپنی کہانی
سنائی نہیں ہم لوگ کس سیاسی بحث میں پڑ گئے۔ ———

ریحانہ۔ دکھ ——— (ایک ٹھنڈی سانس بھر کر) دکھ بھری دنیا میں دکھ
کے علاوہ اور کیا مل سکتا ہے میں تو سمجھتی ہوں یہ دنیا انسانوں کی نہیں
راکششوں کی ہے۔ اس مہذب دنیا کا ہر شخص راون ہے اس
کرہ ارض پر چنگیز و ہلاکو بستے ہیں ——— انسان کہاں؟
(اور آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں) (ضبط کر کے) شاہد! تم
میرے ساتھ انسانوں جیسا سلوک کر سکو گے۔

شاہد۔ ریحانہ تم یہ کیا کہہ رہی ہو۔

ریحانہ:۔ ہاں: میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ——— اس دنیا میں جب انسانیت
ہی نہیں تو بھلائی کی توقع کیسے کی جائے۔ ———

شاہد۔ شاید تم مجھے پہچانتی نہیں ہو ——— یا مذاق کر رہی ہو ———

ریحانہ:۔ نہیں نہیں میں مذاق نہیں کر رہی ——— سچ کہہ رہی ہوں۔

شاہد۔ تمہیں وہ دن یاد ہے ——— جب ہم دونوں اسکول جایا
کرتے تھے ہم نے اس وقت بھی ایک عہد کیا تھا ——— اب
عہد جس کو موت بھی نہ توڑ سکتی تھی اور پھر جب بڑے ہوئے تو ہماری
اور تمہاری نظریں اس پہچان کو تازہ کرتی رہتی تھیں ——— کیا یہ
سب کچھ تمہیں یاد نہیں ———

ریحانہ:۔ سب کچھ یاد ہے۔

شاہد۔ پھر یہ الٹے سیدھے سوال کیوں کر رہی ہو ———

ریحانہ:۔ مجھے ڈر لگتا ہے ——— ایسا محسوس ہوتا ہے میں
اندھیرے میں ہوں اور ہر طرف سے خوفناک تاریکیاں میرا منہ چڑا رہی
ہیں۔

شاہد۔ اپنے شاہد سے تمہیں ڈر لگتا ہے ——— کیا میں کچھ بدل گیا ہوں؟

ریحانہ:۔ تم نے نہیں بدلے میں بدل گئی ہوں ——— تم [illegible] [illegible] سے ڈر

لگتا ہے۔

شاہد:۔ ان باتوں سے میرے دل کو صدمہ ہوتا ہے۔ ایسی باتیں نہ کرو ——

ریحانہ:۔ اسی لئے تو کہہ رہی ہوں —— شاید تمہیں میری اصل شکل دیکھنے
کے بعد نفرت پیدا ہو جائے —— اور پھر اس گھٹا ٹوپ اندھیرے
کی ایک کرن بھی تاریکی میں گم ہو جائے۔

شاہد:۔ نفرت نہیں محبت —— لازوال محبت۔ میں کس طرح
تمہیں سمجھاؤں کہ تم مجھے کیا ملیں میری اپنی زندگی مل گئی۔
مجھے سکون ملا —— مجھے قرار ملا —— مجھے بلندی ملی ——
مجھے سب کچھ مل گیا۔

ریحانہ:۔ میں نے دیکھا ہے محبت کو نفرت میں تبدیل ہوتے ہوئے سکون کو
اضطراب میں بدلتے ہوئے، بلندی کو پستی میں گرتے ہوئے، اور یہ
تجربہ میرے قدم ہلا رہا ہے۔ میرے دل کو کھائے جا رہا ہے مجھے یقین
نہیں آتا شاہد! تاریکی میں بھٹکنے والی آنکھیں روشنی میں چکاچوند
ہو جاتی ہیں۔

شاہد:۔ تم ڈرو نہیں! تمہاری یہ بیگانگی اچھی نہیں لگتی —— میں سمجھ گیا
تمہیں جو کچھ صدمہ پہنچا ہے —— اور اسکے باوجود بھی میں
اپنے دل کو تنگ نہیں پاتا —— ریحانہ! اپنے شاہد کو
پہچانو —— محبتیں زمان و مکان کے قیود کو نہیں دیکھا کرتیں وقت
کا کوئی پیمانہ انہیں ناپ نہیں سکتا —— تم زیادہ سے زیادہ یہی
کہہ سکتی ہو کہ تم نے چار سال انتہائی کرب میں گزارے ہیں اپنے دل
دماغ —— ضمیر کے خلاف —— مسلسل چار سال
تک تمہیں ماحول کے گھر رہنا پڑا ہے —— مگر اسکے باوجود
میری اپنی ریحانہ ویسی ہی ہے جیسے اول روز تھی۔ اس دنیا میں..
سارے ڈاکٹرز نہیں انسان بھی بستے ہیں ورنہ یہ دنیا کبھی کی تباہ
ہو چکی ہوتی۔

ریحانہ:۔ کیا تم یہ سب کچھ سچ کہہ رہے ہو۔ . . .

شاہد:۔ یقین کرو —— سچ

ریحانہ:۔ مگر —— میں اس سے بھی زیادہ بری ہوں
شاہد تم نے میری اصل شکل نہیں دیکھی ہے —— میں —— میں

شاہد:۔ کہو کیا کہنا چاہتی ہو ——

ریحانہ:۔ تم سن نہ سکو گے ——

شاہد:۔ کہو تو سہی ——

ریحانہ:۔ میں —— میں —— ماں بننے والی ہوں ——

شاہد:۔ ریحانہ —— یہ تم نے کیا کہا ——

ریحانہ:۔ میں نے کہا نہ تھا تم سن نہ سکو گے —— میں کنواری نہیں
ہوں میرے ساتھ گناہوں کا ایک بڑا بوجھ بھی ہے ——

شاہد:۔ مگر ریحانہ . . . . .

ریحانہ:۔ تم یہی نہ کہنا چاہتے ہو کہ میں سکریٹیریٹ میں ملازم ہوں ——
عزت دار ہوں —— ہمارا حلقہ احباب بیٹھا ہے لوگوں میں ہماری
ناک کٹ جائیگی

شاہد:۔ بس کرو ریحانہ —— تم سب کچھ ہو لیکن مگر . . . .

ریحانہ:۔ میں سب کچھ ہوتی مگر ماں نہ ہوتی تو شاید تم سوسائٹی کی آنکھوں
پر کچھ ستھرے غلاف چڑھا لیتے —— اور اب غلاظت کا ڈھیر سامنے
ہے۔ اسکی عفونت سے تمہارے نتھنے پھولے جا رہے ہیں ——
شاید تمہارا دماغ ماؤف نہ ہو جائے —— میں جانا چاہتی ہوں
—— مگر وہ تمہاری زمان و مکاں کی قید سے بالاتر والی
محبت کا کیا ہوا!

شاہد:۔ (سر پر ہاتھ رکھ کر) میں کچھ جواب دینا نہیں چاہتا ——

ریحانہ:۔ اس دنیا میں سارے ڈاکٹرز نہیں انسان بھی بستے ہیں ورنہ دنیا
کبھی کی تباہ ہو چکی ہوتی۔

شاہد:۔ خدا کے لئے بس کرو . . . . بہت ساری باتیں انسان کے
اپنے بس میں نہیں ——

ریحانہ:۔ ہاں ٹھیک کہتے ہو —— میں نے غلطی کی سچ تو یہ ہے
پیچھا چھوڑا ہے —— میں اچھی طرح سمجھتی تھی کہ تم اس حالت میں
مجھے پناہ دے سکو گے —— مگر نہ جانے کیوں یہ منحوس
قدم تمہاری طرف بڑھ گئے —— میں نے بہت چاہا کہ تنہا جی لوں
کبھی تم سے نہ ملوں —— مجھے جینے کی تمنا ہے۔ اچھا اب
رخصت کی اجازت چاہتی ہوں . . . .

(باقی صفحہ پر)

میرا پیغام اپنی بہنوں کے نام

از طبیبہ حاذق دواخانہ

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ تندرستی اور بیماری ہر فرد و بشر کے ساتھ ساتھ ہے جب کبھی آپ بیمار ہوں اور آپ کو کسی دواخانہ کی طرف رجوع کرنا پڑے تو قدرتی طور پر آپ کے ذہن میں یہ سوالات پیدا ہوں گے:۔

(۱) کیا دواخانہ جس کی طرف آپ رجوع کر رہی ہیں قابلِ اعتماد ہے محض اشتہاری تو نہیں اور کیا وہ اپنے مرکبات اور مجربات بیماری اور اصولوں کے مطابق ڈال رہا ہے؟ تاکہ ان پر بھروسہ کیا جا سکے۔

(۲) کیا تجربہ کار اور صحیح طبیب ہمارے مرض پر غور کر کے ہمارے مرض کے لئے صحیح دوا تجویز کر رہے ہیں؟

جہاں تک حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی ۱ کا تعلق ہے مجھے فخر ہے کہ وہ اس معیار پر بفضلہٖ تعالیٰ پورا اتر رہا ہے۔ عالی جناب امام طب حکیم سید نذر احمد صاحب دہلوی کی سرپرستی ہی اس دواخانہ کی صداقت کی بہترین دلیل ہے حکیم صاحب موصوف کی شخصیت کسی نئے تعارف کی محتاج نہیں آپ فن طبابت میں پینتیس سالہ تجربہ رکھتے ہیں آپ کی زندگی کے قیمتی آٹھ سال مسلسل طور پر جناب مسیح الملک حکیم حافظ اجمل خاں صاحب کے طبیب پیشی کی حیثیت سے انکے ساتھ سفر و حضر میں کٹے، آپ ہندوستانی دواخانہ دہلی کے مسلسل چھ سال تک ہر شعبہ کے نگراں رہے۔ کتاب حاذق اور "افادات مسیح الملک" اور "مطب کلاں" آپ کی وہ مایہ ناز تالیفات ہیں۔ جن پر طب یونانی ہمیشہ فخر کرے گی اس کے علاوہ آپ یونانی طبیہ کالج دہلی کے اعلیٰ کلاسوں کے پروفیسر رہ چکے ہیں اور آپ کی طبی خدمات کے اعتراف میں یونانی طبیہ کالج کی سلور جوبلی کے اہم موقعہ مارچ سنہ ۴۷ء میں مذکورہ کالج نے آپ کو امام طب کی ڈگری سے سرفراز فرمایا —— ایں سعادت بزور بازو نیست!

چونکہ حکیم صاحب بنفس نفیس "حاذق دواخانہ" کے جملہ امور کے نگراں ہیں اور مطب کے علاوہ اپنا تمام وقت اور توجہ دواخانہ کی درستی اور اصلاح میں صرف کرتے ہیں اس لئے انکے مجوزہ اور انکی نگرانی میں تیار کرائے ہوئے اس دواخانہ کے مرکبات اور مجربات آپ کی صحت کے بہترین محافظ ہیں۔ اگر آپ کو اپنے عزیزوں ملنے والوں یا اپنے بچوں کے لئے کسی مرکب یا مفرد دوائی کی ضرورت ہے یا کوئی طبی مشورہ درکار ہو آپ بلا تکلف اپنا حال لکھ کر اور اسے لفافہ میں بند کر کے مجھے بھیج دیں۔ لفافہ پر حاذق دواخانہ کراچی نمبر ۱ کے پتہ کے ساتھ "طبیبہ شعبہ زنانہ" لکھ دیں آپ کا خط سوائے میرے اور کوئی نہیں پڑھ سکتا۔ میں آپ کے خط کو اچھی طرح پڑھ کر اور حکیم صاحب سے مشورہ کر کے آپ کے لئے مناسب دوا بھجوا دوں گی یا اس کے متعلق آپ کو اطلاع دے دوں گی۔ اگر ذاتی مشورہ لینا ہو تو صبح نو بجے سے ایک بجے تک دواخانہ میں تشریف لائیں وہاں موجود رہوں گی پردے کا بہترین انتظام ہے میری وساطت سے حکیم صاحب سے بہترین اور سچا مشورہ مل سکے گا

حاذق دواخانہ کے اعلیٰ انتظامات سے جہاں اب تک میری بے شمار بہنیں فائدہ حاصل کر چکی ہیں مجھے امید ہے کہ آپ کو بھی اپنی صحت کے لئے سچا اور مناسب مشورہ ملے گا۔

آپکی خادمہ، طبیبہ شعبۂ زنانہ

حاذق دواخانہ، بندر روڈ کراچی نمبر ۱

Monthly "MUSHIR" Karachi.

مفرح فولادی

خون دماغ۔ رگ پٹھے اور ہاضمہ کیلئے بہترین مقوی

"مفرح فولادی" صحیح معنوں میں قوت بخش اور صحت قائم رکھنے والی دوا ہے۔ جس کے استعمال سے تھکے ہوئے اعضاء رگ و پٹھے مضبوط ہو جاتے ہیں اور بدن میں نیا خون پیدا ہوتا ہے۔

"مفرح فولادی" کا استعمال جسم انسانی میں وہ ضروری اجزا پہونچاتا ہے جو صحت کیلئے ضروری ہیں اور جنکے بغیر تندرستی قائم نہیں رہ سکتی اور نہ انسان کافی محنت اور مشقت کر سکتا ہے۔

"مفرح فولادی" کا استعمال خون پیدا کرتا ہے رگ پٹھوں اور ہڈیوں کو مضبوط بناتا ہے اور جسم انسانی میں نئی روح پیدا کرتا ہے۔

مفرح فولادی" مندرجہ ذیل حالتوں میں نہایت مفید اور مجرب ثابت ہوتی ہے:۔ کمی خون۔ کمزوری سستی۔ غشی۔ سر کا چکرانا۔ فساد خون۔ نزلہ زکام۔ ضعف معدہ۔ کمی خوراک زچگی کی کمزوری۔ رگوں کی کمزوری۔ دل کی گھبراہٹ۔ رعشہ۔ نیند کا نہ آنا اور بیماری کے بعد کی کمزوری کے دور کرنے کیلئے مفید ہے۔ مفرح فولادی کے ان فوائد کو دیکھتے ہوئے آجکل محنتی اور دماغی کام کرنے والے اسکو برابر استعمال کر کے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

"مفرح فولادی" شربت کی صورت میں خوش ذائقہ مرکب ہے جو علاوہ قوت دینے اور تندرستی کو برقرار رکھنے کے اگر کھانا کھانے کے آدھ گھنٹہ پہلے کھایا جاوے تو خوب بھوک لگتی ہے اور کھانا شکم سیر کھایا جاتا ہے اور اگر کھانے کے بعد استعمال کیا جاوے تو کھانا خوب ہضم ہو کر جزو بدن بنجاتا ہے۔ خوراک:۔ کھانے کا ایک چمچہ دن میں تین یا چار دفعہ استعمال کریں۔ چودہ برس سے کم عمر کے بچوں کیلئے نصف مقدار اور سات برس سے کم کیلئے چوتھائی مقدار

تیار کردہ حاذق دواخانہ بندر روڈ، کراچی نمبر ۱ پاکستان

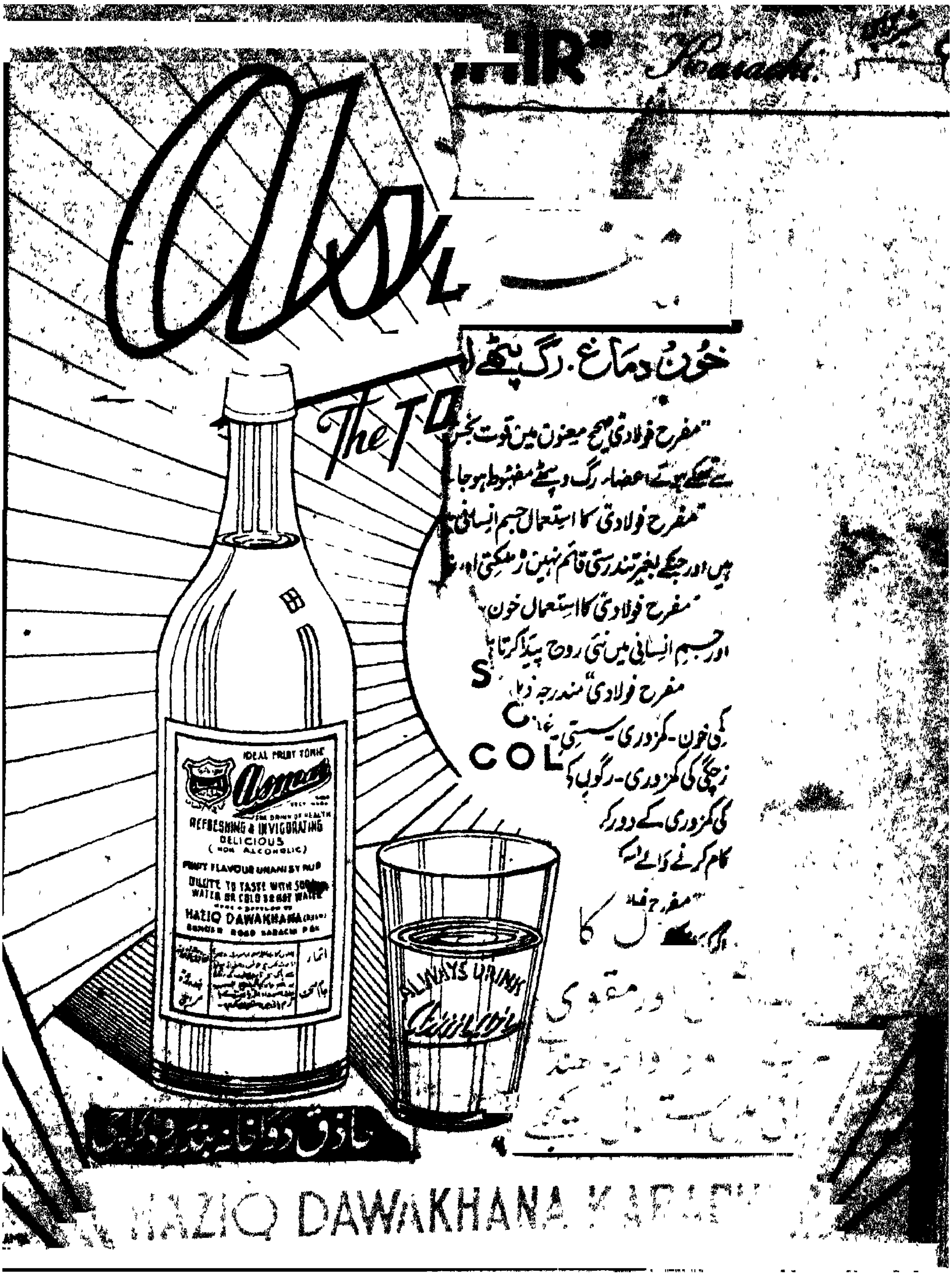
قیمت فی شیشی -/۲/۱۲

- 9 MAY 1954

بند



توپوں کے دہانوں سے بھی ٹکرائیں گے آخر
ہوگا نہ کبھی جذبۂ پُرشوق نظر بند
یوں گوشۂ زندانِ مصیبت میں رہیں گے
معدن میں رہیں جیسے زبس لعل و گہر بند
کافر ہے تو آزاد فضا اس کو میسّر!
مومن ہے تو پھر دشت و جبل کوہ و کمر بند
گھبرائیں گے کیوں بند عقوبت سے بھلا
وہ خود ہی ہوئے جاتے ہیں بے خوف و خطر بند
آجائیں گے ایمان کے ہتھیار سے سج کر
ہوجائیں جو شمشیر دستان تیغ و سپر بند
ں جادۂ پُرشوق میں ہوجاتا ہے اکثر
خود اپنا ہی گھر بند، پسر بند، پدر بند
کیا گلشنِ ہستی کو خزاں نے
برگِ گل تر بند، نمو بند، ثمر بند
مں اُجالا ہی اُجالا
ظلمات میں ہوگا نہ کبھی نورِ قمر بند
نہ رکے گا
[illegible] بھلا کیسے حجابوں سے [illegible] بند
[illegible] ہر بند


خون دماغ. رگ پٹھے
"مفرح فولادی" صحیح معنوں میں قوت بخش
سے تھکے ہوئے اعضاء رگ و پٹھے مضبوط ہوجا
"مفرح فولادی" کا استعمال جسم انسانی
ہیں اور جن کے بغیر تندرستی قائم نہیں رہ سکتی
"مفرح فولادی" کا استعمال خون
اور جسم انسانی میں نئی روح پیدا کرتا ہے
"مفرح فولادی" مندرجہ ذیل
زچگی کی کمزوری - رگوں کی
کی کمزوری کے دور کر
کام کرنے والے
IDEAL FRUIT TONIC
REFRESHING & INVIGORATING
DELICIOUS
(NON ALCOHOLIC)
FRUIT FLAVOUR UNANI SYRUP
HAZIQ DAWAKHANA
ALWAYS DRINK
حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی
HAZIQ DAWAKHANA

- 9 MAY 1954

ابوالبیان حماد

نظر بند

دل بند، دل زار کے ہمراہ جگر بند
لب بند، زباں بند، فغاں بند نظر بند

جاں بند، نفس بند، قلم بند، خبر بند
پا بند، روش بند، ہر اک راہ گذر بند

تم دین کے خدام کو کر دو گے اگر بند
ہو جائے گی پھر یاد رکھو موج ظفر بند

ہاں جسم تو ممکن ہے کہ ہو جائے نظر بند
دیکھیں تو عزائم کو کرے کون مگر بند

کر لو گے رہ حق کے مسافر کو اگر بند
ہو جائیگا کیا اس سے کہیں ذوق سفر بند

وہ دین کیا جس نے در فتنہ و شر بند
اپنوں ہی کے ہاتھوں سے ہوا آج نظر بند

اک بندۂ حق کے لئے بندھن ہیں ہزاروں
یاں بند ہے واں بند، اِدھر اُدھر بند

یوں بند کئے جاتے ہیں زندانِ بلا میں
جس طرح صدف میں کبھی ہو جائے گہر بند

کھلتے ہیں یہ اک چشم زدن غیب سے صد در
مومن پہ جو دنیا کبھی کر دے کوئی در بند

پوشیدہ اسیری میں ہے معراج محبت
ہے نالۂ شبگیر میں جس طرح اثر بند

بن جائے نہ کیوں شعلۂ جوالہ بھڑک کر
ہو جائے کسی وقت جو جھولے سو شرر بند

چھا جائے ہوئے ختن مشک سے لبریز
جب اذن الٰہی سے ہوا خون جگر بند

ہم حرب گہ کار میں تنہا نہ رہینگے
اللہ کے لشکر بھی ہوئے پھر سے کمر بند

توپوں کے دہانوں سے بھی ٹکرائینگے آخر
ہوگا نہ کبھی جذبۂ پُرشوق ظفر بند

یوں گوشۂ زندانِ مصیبت میں رہینگے
معدن میں رہیں جیسے زبس لعل و گہر بند

کافر ہے تو آزاد فضا اس کو میسر
مومن ہے تو پھر دشت و جبل کوہ و کمر بند

گھبرائیں گے کیوں بندِ عقوبت سے مجاہد
وہ خود ہی ہوئے جاتے ہیں بے خوف و خطر بند

آجائیں گے ایمان کے ہتھیار سے سج کر
ہو جائیں جو شمشیر و سناں تیغ و سپر بند

اس جادۂ پُرشوق میں ہو جاتا ہے اکثر
خود اپنا ہی گھر بند، پسر بند، پدر بند

تاراج کیا گلشن ہستی کو خزاں نے
برگ گل تر بند، نمو بند، ثمر بند

پھیلے گا زمانے میں اُجالا ہی اُجالا
ظلمات میں ہوگا نہ کبھی نور قمر بند

اسلام کا سیلاب رُکا ہے نہ رُکے گا
ہو جائے بھلا کیسے حبابوں سے بھنور بند

مٹ جائیگا یا توڑ کے نکلے گا یہ صد شاں
ہوتا ہے قفس میں بھی کہیں شیر ببر بند

بدنام کیا جاتا ہے جو اہلِ ہنر کو
کیا آج زمانے میں ہوئی قدر ہنر بند

پھر طوق کی جھنکار کہیں دور سے آئی
بے کیف ہے نغمہ تر امطرب اے کر بند

حماد لب اب روکو [illegible]
کیا ختم ہوگا نہ یہ سیل غم دیدۂ تر بند

پاکیزہ اور صالح ادب کا علمبردار

مشیر

ٹیلی فون نمبر ۹۲۳

جلد : ۵

شمارہ : ۵

مئی ۵۳ء

سالانہ اشتراک :-

پاکستان : سالانہ : تین روپے

فی پرچہ . چھ آنے

بھارت : سالانہ : ساڑھے چار روپے

فی پرچہ : آٹھ آنے

مرتبہ

عبدالغفور بیگ

طابع و ناشر: عبدالغفور بیگ * مطبوعہ: مشہود پریس کراچی
مقام اشاعت: بندر روڈ کراچی نمبر (۱) * کاتب: عابد سعید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سازش

دروغ برگردنِ راوی۔ یہ خبر اُڑتی اُڑتی سنی ہے کہ ایک بہت بڑی ادبی شخصیت نے اردو ادب اور ادیب دونوں کے خلاف ایک کھلی ہوئی سازش کا انکشاف کر دیا ہے۔ "پہلے تو انھیں مغالطہ ہوا کہ خدانخواستہ اردو ادب "بحیثیت مجموعی" مر چکا ہے اور اسے دفنا دینا ہی مناسب ہے مگر معاً انھوں نے محسوس کیا کہ ادب مرا نہیں بلکہ اس پر صرف سکتہ کا عالم طاری ہے اس لئے ساکت و جامد نظر آرہا ہے اسے پھر ہوش میں لایا جا سکتا ہے اور یہ سب کچھ کیا دھرا ادیبوں اور نقادوں کا ہے۔ ادیب لوگ تو ادب کے بارے میں کچھ سوچتے ہی نہیں جیسا بن پڑتا ہے انٹ سنٹ لکھے چلے جاتے ہیں اور اُوپر سے تنقید انھیں لوریاں دیتی ہے۔ ہمارے ادیبوں اور نقادوں نے پڑھنے والوں کو ایک فریب میں مبتلا کر رکھا ہے اور وہ اپنا فائدہ اسی میں سمجھتے ہیں کہ یہ طلسم ٹوٹنے نہ پائے۔ اسی لئے ہمارے ادب میں ایک ذہنی بے ربطی کا عالم ہے اور ادب کا مستقبل اب ادیبوں کے ہاتھوں سے نکل گیا ہے بس ایک طبقہ پڑھنے والوں کا رہ گیا ہے جو اس ادبی انحطاط کو روک سکتا ہے۔ اردو ادب کو زندہ رکھنے کا فرض اگر کوئی سر انجام دے سکتا ہے تو یہ پڑھنے والے ہیں۔ فرمایا یہ گیا ہے کہ اگر پڑھنے والے واقعی پڑھنا سیکھ لیں اور دماغ سے کام لیں تو انھیں معلوم ہو گا کہ فی الحال ادب کی تخلیق کرنے والے وہی ہیں۔ اگر وہ ہمیں بتا دیں کہ ہمیں بھی اچھے اور بُرے غلط اور صحیح کی تھوڑی بہت تمیز ہے تو وہ ادب اور ادیب دونوں کو راہ راست پر لا سکتے ہیں ادبی انحطاط رک سکتا ہے ادب مرنے سے بچ سکتا ہے۔ اس قسم کی "جھلکیاں" دیکر اب وہ کہتے ہیں کہ میں اردو ادب اور ادیبوں کے خلاف ایک سازش کر رہا ہوں، پڑھنے والوں کی ایک خفیہ جماعت بنا رہا ہوں تاکہ ادیبوں کو راہ راست پر لایا جاسکے"۔

——— حسن عسکری کی یہ سازش والی بات بنی یا نہیں ابھی تک کچھ پتہ نہیں چل سکا وہ اپنی سازش میں کامیاب ہوئے ہوں یا نہ مگر ہم ادب اور ادیبوں کے خلاف ایک گہری سازش ضرور کرنے کی تیاری کر رہے ہیں اور ہماری سازش کی کامیابی کا دار و مدار اس پر ہے کہ پڑھنے والے ہمارا ساتھ کہاں تک دیتے ہیں۔

اردو ادب کی موجودہ حالت کے لئے جتنے نام بھی ترقی پسند ادبا کی طرف سے تجویز کئے گئے ہیں ہمیں ان سے کہاں تک اتفاق ہے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے ادب مر چکا ہے کہ اس پر سکتہ کا عالم طاری ہے۔ ادب میں جمود ہے کہ انحطاط و سطحیت۔ ہو سکتا ہے کہ اردو ادب کے متعلق یہ سب تاویلیں درست ہوں مگر ایک بات ضرور ہے اور وہ یہ کہ آجکل ہمارا اردو ادب ننگا ہو گیا ہے، بے حیا ہو گیا ہے عریاں ہو گیا ہے۔ اردو ادب کی فحاشی اور عریانی تو اب ضرب المثل بنتی جا رہی ہے۔ ہمیں تو ڈر ہے کہ کہیں آگے چل کر ہر فحش گو کو ادیب نہ سمجھا جانے لگے۔ آپ یاد رکھیں کرینگے۔ پچھلے چھ سات ماہ میں کم و بیش چالیس پچاس ادیب فحش نگاری اور عریاں نویسی کے مقدمات میں ماخوذ ہو کر مختلف سزائیں پا چکے ہیں۔ بیسیوں ایسے ہیں جن پر مقدمے دائر ہیں۔ اگر آپ کسی روز کراچی کی مجسٹریٹی میں چلے جائیں تو آپ کو بیسیوں اپٹوڈیٹ فحش نگار برآمدوں میں چکر کاٹتے نظر آئیں گے۔ جو مقدموں کی پیشیاں بھگتنے وہاں جاتے ہیں۔ لطف تو یہ ہے کہ انجمن ادبی رسائل پاکستان جو کھڑی ہی اس لئے کی گئی تھی کہ ہمارے ادب کو عریانی و فحاشی کی تباہ کن ترغیبات سے محفوظ رکھنے کے جتن کرے اس کے صاحب شاہد احمد صاحب دہلوی بھی اسی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں ؎

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

اگر آپ اپنے موجودہ ادب کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ ادبا کے ایک مخصوص گروہ نے دستور، قانون، مذہب، اخلاق اور اجتماعی احساسات

بے حیا زہر کر منظم طور پر ایک خطرناک مہم کا آغاز کر دیا ہے جو ہر لحاظ سے اجتماعی فلاح و بہبود کے لئے ضرر رساں ہے اور اخلاق عالیہ کے خلاف ایک قسم کا اعلان جنگ ہے ——— ہم نے اس منظم سازش کا سراغ پاتے ہی انکی مخالفت میں آواز اٹھائی تھی۔ مگر منظم سازشوں کا مقابلہ جب تک منظم طور پر نہ کیا جائے کارگر نہیں ہوتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس فحش اور حیا سوز تحریک کا مقابلہ منظم ہو کر کیا جائے۔

تعزیرات پاکستان کا باب ۱۴ ان جرائم کے بارے میں ہے جو عوام الناس کی عافیت، امن، آسائش حیا اور عادات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان جرائم میں فحش نگاری دفعہ ۲۹۲ کی زد میں آتی ہے۔ ان جرائم کے لئے ضروری نہیں کہ حکومت ہی احتساب کرے اور مقدمے چلائے۔ ان جرائم کے سرزد ہونے پر پاکستان کا ہر شہری صرف آٹھ آنے کا کورٹ سٹیمپ لگا کر اپنے حلقہ کے مجسٹریٹ کی عدالت میں مقدمہ دائر کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شہری دیکھتا ہے کہ اسکے شہر میں کوئی ایسی تحریر جو فحش اور عریاں ہے کسی کتاب، رسالے، اخبار یا پمفلٹ میں شائع ہوئی ہے تو وہ اپنے حلقہ کے مجسٹریٹ کی عدالت میں آٹھ آنے کا کورٹ سٹیمپ لگا کر اس تحریر کے لکھنے والے چھاپنے والے اور بیچنے والے پر مقدمہ دائر کر سکتا ہے۔ عدالت میں اسے صرف یہ ثابت کرنا ہوتا ہے کہ کتاب یا رسالہ یا اخبار کی تحریر فحش ہے اور اسے بیچا یا فروخت کیا گیا ہے۔ اس قانونی تشریح کے بعد فحش نگاری اور عریاں نویسی کے خلاف ایک منظم مہم اس طرح چلائی جا سکتی ہے کہ پاکستان کے بڑے بڑے ادبی مرکزوں مثلاً کراچی۔ لاہور۔ پشاور۔ ڈھاکہ وغیرہ میں ایسی جماعتیں قائم کر دی جائیں جو اپنے اپنے شہر میں شائع ہونے والی فحش اور عریاں تحریروں پر احتساب کریں اور مقدمات چلائیں یہ کام ایسی انجمنیں بھی اپنے ذمہ لے سکتی ہیں جن کا کام معاشرہ کی اخلاقی اصلاح ہو۔ قانون کی اس تشریح کے بعد بعض اصحاب کا وہ اعتراض بھی رد ہو جاتا ہے جو یہ کہتے تھے کہ حکومت کو قانونی مشیر سے مشورہ لئے بغیر ادب پر احتساب کا حق نہیں پہونچتا ہے جو حق ہر ایک شہری کو پہنچتا ہے اس کے لئے قانونی مشیر کی کیا ضرورت ہے؟ اگر کوئی غلط احتساب کرتا ہے تو اس کا ذمہ دار وہ خود ہوگا خواہ وہ حکومت ہو یا کوئی شہری۔ فیصلہ تو ہر حالت میں عدالت کو کرنا ہے کہ آیا تحریر فحش ہے یا نہیں۔ اس لئے جو کوئی بھی مقدمہ دائر کریگا وہ دیکھ بھال کر کریگا کہ کہیں وہ غلط مقدمہ دائر نہ کر بیٹھے اور الٹا اسے ہرجانہ دینا پڑے۔ اس لئے جو لوگ "قانونی مشیر کی پناہ ڈھونڈ کر احتساب کے خلاف لب کشائی کرتے تھے وہ قانون اور اسکے اطلاقات سے نابلد تھے۔ بعض لوگ شاید یہی سمجھتے ہیں کہ یہ کام صرف حکومت کے فرائض میں داخل ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ حکومت کا کوئی محکمہ اگر از خود یہ فرض ادا کر رہا ہے تو اسے کوئی نہیں روک سکتا اور اگر کوئی شہری اس فرض کو از خود ادا کرنا چاہے تو حکومت بھی اسے نہیں روک سکتی کہ یہ فرض تمہارا نہیں۔ اس معاملے میں بعض معترض حضرات کی غلط فہمی دور ہو جانی چاہیئے۔

حسن عسکری صاحب نے اپنی سازش کو عملی جامہ پہنایا ہو یا نہ ہو مگر ہم اپنی سازش کو عملی جامہ پہنانے کے لئے تمام حساس، شرافت پسند اور اسلامی مزاج رکھنے والے شہریوں اور تمام حیا پسند اہل قلم کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے شہروں میں اس قسم کی جماعتیں قائم کریں۔ معاشرے کے خلاف اس خطرناک مہم کا مقابلہ کرنے کے لئے اگر انہیں کچھ مالی قربانیاں بھی کرنی پڑیں تو ضرور منظم ہو کر میدان عمل میں اتریں تاکہ قانون کو گندی نگارشات کے خلاف حرکت میں لا کر منظم جد و جہد کی جا سکے اور میدان ادب میں ایسے مریضانہ رجحانات کو پوری قوت کے ساتھ شکست دی جا سکے۔ اس کی ضرورت آج پہلے سے کئی گنا زیادہ بڑھ گئی ہے کیونکہ اگر یہاں ایک اسلامی دستور کے تحت ایک اسلامی معاشرہ کی تعمیر کی جانی ہے تو اسکے لئے اولین مطلوب ایک پاکیزہ فکری اور ادبی ماحول ہے۔ ایک ایسا ماحول جس کی فطرت اپنے اندر اسلامی اخلاق کو نقصان پہنچانے والے طرز فکر، ادب، فن اور اسالیب کو گوارا کرنے پر تیار نہ ہو۔

جہاں تک کراچی کا تعلق ہے۔ ہم نے یہاں ایک ایسی جماعت کے قیام کی ابتدا کر دی ہے۔ ہم تمام سچے شہریوں اور ادب کی اخلاقی اور تعمیری اقدار کے حامل ادیبوں کو دعوت تعاون دیتے ہیں۔ اس نیک کام میں انکا تعاون شکریہ کے ساتھ قبول کیا جائیگا۔

(ادارہ شمشیر کراچی)

پرکاش پنڈت •

ادب میں فحاشی

اگر ہم سماج کو ایک بدرو فرض کرلیں جس میں غلاظت ہے۔ اور انتہائی گھناؤنے کیڑے کلبلا رہے ہیں تو سماج کے ایک انجینیئر کی حیثیت سے ادیب کا فرض ہے کہ وہ اس بدرو کی ساخت میں تبدیلی پیدا کرے۔ بطور ڈاکٹر جراثیم کش ادویات کے استعمال سے مہلک کیڑوں کو ہلاک کرے اور بحیثیت محقق اور مصلح گندگی کے بنیادی اسباب ڈھونڈ کر ان کا تدارک کرے۔ نفرت یا عبرت دلانے کے نام پر بعض ادیب بدرو کی غلاظت کو نکال کے سڑک پر پھیلا دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انھوں نے بڑا کام کیا ہے۔

ان کا یہ بڑا کام سماج کشی اور انسان دشمنی ہے۔ دراصل انکی حالت تپدق کے اس مریض کی سی ہے جو ساری دنیا کو اپنے مرض میں مبتلا دیکھنا چاہتا ہے اور خود اس واہمے میں گرفتار ہے کہ وہ صحت مند ہے!

(بشکریہ مشرب)

کوثر نیازی

اہلِ جنوں سے راہگذاروں کی آبرو
ایسے ہے جیسے پھول سے خاروں کی آبرو

اے ابرِ مشکلات! محیطِ حیات ہو
دل میں ہے پھر سے چند سہاروں کی آبرو

دل کا دیا بجھا تو ستارے بھی بجھ گئے
حسنِ نگاہ سے ہے نظاروں کی آبرو

اے تابدار آنسوؤ! کچھ تو رہے خیال
مٹی میں مل رہی ہے ستاروں کی آبرو

اہلِ کمال ہوں کہ خدایانِ روزگار
بھاری ہے سب پہ درد کے ماروں کی آبرو

رکھ لی ہے تُو نے اے نگہِ بے نیازِ عشق
محفل میں ان کے شوخ اشاروں کی آبرو

اے آبلو! بہاؤ بھی تم اس پہ سیلِ اشک
رُلتی ہے دشت دشت میں خاروں کی آبرو

طوفاں کی موج موج ہی ساحل لئے ہوئے
اب غرق ہو رہے گی کناروں کی آبرو

کوثر تُو گلستاں پہ خزاں کا اثر نہ پوچھ
خطرے میں پڑ گئی ہے بہاروں کی آبرو

(سنٹرل جیل لاہور، یکم نومبر ۵۳ء)

خفیل حسین •

تحریک پختونستان

ملک اور دین کے بہی خواہوں کے لئے لمحہ فکریہ

سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں کی جیل سے آزادی کے ساتھ ہی پختونستان کا نعرہ سیاسی فضا میں پھر ابھرنا شروع ہو گیا ہے۔

خان بادشاہ نے اپنے متعدد بیانات اور ملاقاتوں میں پختونستان کو ایک مطالبے کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اور دن بدن موصوف اپنے اس مطالبے کو منوانے بدتر رویہ اختیار کرتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ اپوزیشن کے بعض لیڈروں نے مسلم لیگ کی مخالفت کے جوش میں اس نعرہ کو معصومیت کا سرٹیفکیٹ دیتے ہوئے شروع کر دی ہے۔ اسی طرح ملک کے بعض اخبارات و رسائل بھی یا تو دبی زبان سے یا شرماتے ہوئے اس کی تائید فرما رہے ہیں۔ اور یا کم از کم اس کی کھلم کھلا مدانہ مخالفت سے گریز فرما رہے ہیں۔

خان بادشاہ سے کسی کو ہزار اختلافات ہوں لیکن یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ ان کے منہ سے نکلی ہوئی بات ملک کی سیاسی فضا پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ان کی شخصیت ایک اختیار کر چکی ہے۔ اور چونکہ ان کے سیاسی عقائد و نظریات دنیا بھر کے اخبارات اور راہ نماؤں کی توجہ کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اسلئے ان کی طرف سے کسی مطالبے پر سنجیدگی لئے۔ اور دیکھا جائے کہ اس کو منظور یا مسترد کرنے کی صورت میں ہمارا ملک کن حالات سے دوچار ہو سکتا ہے۔

پختونستان کا نعرہ اس وقت بلند ہوا جب سرحد میں اس مسئلہ پر استصواب رائے کرنے کا فیصلہ ہوا۔ کہ سرحد کو انڈیا میں شامل رہنا چاہیئے۔ یا پاکستان کا ایک حصہ۔ خان برادران اور ان کی قیادت میں سرخ پوش تحریک نے استصواب کے موضوع ہی سے اختلاف کیا اور مطالبہ کیا کہ ان دو متبادل صورتوں کے ساتھ تیسری صورت یہ بھی رکھی جائے کہ یا آزاد پختونستان کی حیثیت سے ایک الگ ملک بنا دیا جائے۔ ان کا یہ مطالبہ نہ تو اس وقت کی حکومت کے لئے قابل قبول تھا اور نہ کسی بڑی سیاسی پارٹی کے لئے۔ چنانچہ خان برادران اور سرخ پوشوں نے استصواب کا مکمل بائیکاٹ کیا ان کے اس بائیکاٹ کے باوجود سرحدی باشندوں کی بڑی اکثریت (غالباً ۹۹ فیصدی) نے سرحد کو پاکستان میں شامل کئے جانے کے حق میں رائے دی۔

تاریخ کا یہ واقعہ اتنا پرانا نہیں کہ ملکی سیاست کے طالب علموں اور ملک کے بہی خواہوں کے ذہنوں سے اتر گیا ہو چنانچہ آج پھر جب خان موصوف کی زبان پر یہ لفظ آتا ہے۔ تو سننے والے کے ذہن میں اس کا وہی مفہوم تازہ ہو جاتا ہے۔ جو آج سے سات سال پہلے پختونستان کے حامیوں کی طرف سے عملاً بتایا گیا تھا۔ یعنی یہ کہ انڈیا کا حصہ ہو نہ پاکستان کا بلکہ ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے "پختونستان" کے نام کے ساتھ دنیا کے نقشہ پر نمودار ہو۔

اگر صرف صوبے کے نام کی تبدیلی کا معاملہ ہوتا تو سرحد کے ریفرنڈم کے بائیکاٹ کے کیا معنی تھے۔ ریفرنڈم صوبہ سرحد کے نام پر نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ اس بات پر کہ یہ علاقہ جو اس وقت شمال مغربی سرحدی صوبہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انڈیا کا حصہ ہو یا پاکستان کا۔ اگر خان برادران کو صرف صوبے کے نام سے اختلاف تھا تو صحیح اور مناسب طریقہ کار یہ تھا کہ ریفرنڈم میں وہ پاکستان سے شمولیت کی حمایت کرتے اور پاکستان میں شمولیت کے بعد شمال مغربی سرحدی صوبے کے لئے جو نام چاہتے مطالبہ کرتے۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا اور دماغ اور آنکھیں رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ وہ کون سے سیاسی نظریات و عقائد تھے جن کی بناء پر انھوں نے ایسا

پھر یہی نہیں کہ ریفرنڈم کے نتیجہ کے ساتھ پختونستان کا مطالبہ اپنی موت آپ مر گیا ہو پاکستان وجود میں آ گیا۔ لیکن پختونستان کا مطالبہ باقی رہا۔ اس مطالبہ کو

پوری پٹھان نسل کا مطالبہ بنانے کی کوشش کی گئی۔ صوبہ سرحد کے آزاد علاقہ میں اس کی پوری پوری تبلیغ ہوئی۔ کابل کی حکومت نے اس کو سہارا دیا اور اپنے کابل کے منبر پر کھلم کھلا اس کی تائید و حمایت کی۔ سات سال کابل ریڈیو اس کا پروپیگنڈا کرتا رہا۔ اور اگرچہ پاکستان میں بسنے والے پٹھانوں نے اس کی کوئی حوصلہ افزا تائید نہ کی لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ مسئلہ حکومت اور عوام پاکستان دونوں کے لئے دردِ سر بنا رہا ہے۔ اور آج یہی مطالبہ جو آج سے پہلے دلی، کابل اور صوبہ سرحد کے ریڈیو اسٹیشن سے اٹھایا جاتا رہا۔ یا القراپی، نجیب اللہ اور حکومت افغانستان کی طرف سے پیش کیا جاتا رہا ہے۔ پاکستان کے ایک فرزند کی زبان سے پیش کیا جا رہا ہے۔ کہ اس کے ساتھ ہم یہ اطمینان دلایا جا رہا ہے۔ کہ اس میں خطرناک بات کوئی نہیں صرف نام کی تبدیلی کا مطالبہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ معاملہ صرف نام کی تبدیلی کا نہیں۔ بلکہ ایک آزاد پختونستان کی تحریک کے نقطۂ آغاز کے لئے پہلے صرف نام کی تبدیلی کا مطالبہ کیا گیا۔ اور رفتہ رفتہ آہستہ آہستہ اس تحریک کے اصل خدوخال نمایاں ہو رہے ہیں۔ میانوالی اور چھچھ کا پنجابی علاقہ اور بلوچستان کے صوبے کو بھی پختونستان میں شامل کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ اور بڑھتی ہوئی صوبائی عصبیتوں کی موجودہ فضا میں یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ کہ اس سے اگلا قدم پختونستان کی داخلی خود مختاری اور مرکز سے زیادہ سے زیادہ بے تعلق کا ہوگا اور پھر آخری قدم اٹھایا جائے گا یعنی پختونستان کو پاکستان سے بالکل ایک الگ قوم اور ایک الگ ملک کی حیثیت سے آزاد اور خود مختار اسٹیٹ قرار دلایا جائیگا۔

پختونستان کا نعرہ صوبہ سرحد کے متبادل لفظ کی حیثیت سے نہیں بلکہ پاکستان کی تحریک کے بالمقابل ایک تحریک کی حیثیت سے بار بار ابھرتا رہا۔ (اگرچہ پاکستان کے پٹھانوں نے کبھی اس کا ساتھ نہیں دیا) تحریک پاکستان کے آغاز اور صوبہ سرحد کے ریفرنڈم سے بھی بہت پہلے اس صوبہ کا نام شمال مغربی سرحدی صوبہ تھا لیکن اس وقت کبھی مطالبہ نہیں کیا گیا۔ بلکہ اس امر کی طرف اشارہ تک نہیں کیا گیا۔ کہ اس صوبہ کا نام پختونستان ہونا چاہیئے۔ حد یہ ہے کہ کئی سال اس صوبہ میں کانگرس وزارت قائم رہی اور صوبہ کی عنان حکومت خان برادران کے ہاتھوں میں رہی مگر اس وقت پٹھانوں کے ان بہی خواہ سیاست دانوں کو یہ خیال تک نہ آیا کہ اس صوبہ میں پختون نام ایک قوم کی بستی ہے۔ جس کے علاقہ کا نام اس کے اپنے نام پر پختونستان ہونا چاہیئے۔

وجہ یہ ہے کہ اس وقت پختونستان کا سٹنٹ کس کے خلاف استعمال کیا جاتا۔ متحدہ ہند کی اکثر صوبائی حکومتیں ہندوؤں کے قبضہ میں تھیں۔ مرکز میں ان کا اقتدار جلد قائم ہو رہا تھا۔ اور اندازہ یہ تھا کہ آزادی متحدہ ہند کو ملے گی نہ کہ تقسیم شدہ ہند کو، اس وقت پختونستان کے نعرے کا مطلب یہ ہوتا کہ پٹھان متحدہ ہند سے الگ ہونا چاہتے ہیں۔ اور یہ چیز خان برادران کو ہرگز ہرگز منظور نہ تھی لیکن جب یہ بات سورج کی طرح واضح ہو گئی کہ ملک کے ٹکڑے ہو رہے ہیں۔ اور خان برادران کا ملک مسلمانوں کے حصے میں آ رہا ہے تو اس وقت انہوں نے پختونستان کا شوشہ کھڑا کر دیا۔ کہ اگر سرحد ہندوستان میں شامل نہیں ہو سکتا تو پاکستان میں بھی شامل نہ ہو۔ بلکہ الگ ایک تیسری خود مختار ریاست کی حیثیت سے عالم وجود میں آجائے۔

جہاں تک صوبے کے نام کی تبدیلی کا تعلق ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شمال مغربی سرحدی صوبہ ایک نامناسب سا نام ہے۔ اسے تبدیل ہونا چاہیئے لیکن اس کا نام آخر پختونستان ہی کیوں ہو؟ کیوں اسے ایک ایسی تحریک سے منسوب کر دیا جائے جس کا مقصد ہی پاکستان کی سالمیت کو ختم کرنا ہو؟ پختونستان کے علاوہ بھی کئی نام رکھے جا سکتے ہیں۔ پھر اسی پر کیوں زور دیا جاتا ہے کہا جاتا ہے کہ پنجابیوں کا ایک صوبہ ہے اور وہ پنجاب ہے۔ سندھیوں کا صوبہ سندھ اور بنگالیوں کا بنگال ہے مگر پختونوں کا کوئی صوبہ نہیں۔ اس لئے اس نام کا بھی ایک صوبہ ہونا چاہیئے۔ یہ دلیل بظاہر بڑی وزنی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اگر اس کا تجزیہ کیا جائے تو اس کا کھوکھلا پن نمایاں ہو جاتا ہے۔ یہ کہنا کہ پنجابیوں کا ایک صوبہ ہے۔ جس کا نام ان کے اپنے نام پر پنجاب ہے۔ حقیقت حال کے بالکل الٹ ہے حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں اصل نام صوبے کا ہے۔ اور اس صوبے کے نام کی نسبت سے اس میں بسنے والے لوگوں کو پنجابی کہا جاتا ہے اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے لاہور میں رہنے والے حضرات کو لاہوری کہا جاتا ہے اور دہلی میں رہنے والے حضرات کو دہلوی، اصل نام لاہوری اور دہلوی نہیں بلکہ لاہور اور دہلی ہے۔ یہی حال سندھ اور بنگال کا ہے۔ وہاں بھی اصل نام صوبے کا ہے۔ اور اس نام کی نسبت سے صوبے میں رہنے والے لوگوں کا نام سندھی اور بنگالی ہو گیا ہے۔ لیکن صوبہ سرحد کے معاملے میں ترتیب بالکل الٹی ہے وہاں پہلے پختون قومیت کے جذبات کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور پھر ان جذبات کی تسکین کے لئے پختونستان کا نقشہ کھڑا کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ صوبوں کا نام کبھی بھی ان میں بسنے والے کسی خاص گروہ (اگرچہ فی الواقع موجود ہو) کے نام پر نہیں رکھا جاتا۔ کیا ایسے نام رکھنے [illegible] بالکل ہی دوسرے

صوبے [illegible] کا نام صوبے کے اہم ترین شہر کے نام پر رکھ دیا جاتا ہے جیسے بمبئی، مدراس، پٹیالہ، بہاولپور، خیرپور، دہلی، کراچی وغیرہ یا صوبہ بنا دیا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ بعض مثالیں ایسی بھی ہیں کہ صوبے کا نام اس کے محل وقوع کی بنا پر رکھا گیا ہے۔ مثلاً اتر پردیش، مدھیہ پردیش، ہماچل پردیش، دکن وغیرہ وغیرہ۔ بلکہ ایسی بھی مثالیں موجود ہیں کہ صوبے کا تو ایک طرف پورے ملک کا نام اس کے محل وقوع کی بنیاد پر رکھا گیا۔ مثلاً جنوبی امریکہ، جنوبی مشرقی افریقہ وغیرہ۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ایک معاملے میں اس خاص نکتہ پر کیوں اصرار کیا جا رہا ہے۔ کہ پختون قبیلے کے نام ہی پر اس صوبے کا نام ہونا چاہیئے کیوں نہ اس کا نام مندرجہ ذیل ناموں میں سے کوئی ایک رکھ دیا جائے۔

(1) سرحد پاکستان اپنے محل وقوع اور پرانے نام کے ساتھ کچھ مناسبت کی وجہ سے۔

(2) پشاور علاقے کے اہم ترین شہر کی بنا پر!

(3) خیبر اہم ترین درے کے نام پر۔

ایسا کوئی نام رکھنے سے ایک تو خان بادشاہ کی تمنا پوری ہو جائے گی بشرطیکہ دیانتداری کے ساتھ وہ صرف اتنا ہی چاہتے ہوں کہ صوبے کا نام تبدیل کیا جائے۔ اور دوسرے نسلی عصبیت کے فتنے سے پاکستان محفوظ رہ سکے گا لیکن اگر خان عبدالغفار خان یہ بھی چاہتے ہیں کہ صوبے کا نام تبدیل ہو اور ساتھ ہی اس پر بھی مصر ہیں کہ نیا نام پختونستان ہونا چاہیئے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ صرف نام کی تبدیلی نہیں چاہتے۔ بلکہ پختونستان کے نام پر ایک نسلی تحریک اٹھانا چاہتے ہیں۔ اور اس کی کامیابی کے لئے پہلا قدم "نام کی تبدیلی" کا اٹھا رہے ہیں۔ اور اگر یہی نام مان لیا گیا تو پختونستان ایک زندہ نسلی تحریک کی حیثیت سے عالم وجود میں آجائے گا۔ اور پھر اس نام کے ایک الگ اور خود مختار ملک کا قائم ہونا چنداں مشکل نہیں رہے گا۔

خان عبدالغفار خان کے نعرہ پختونستان بلند کرنے کا اصل مقصد اور اس کی اہمیت اوپر بیان کی جا چکی ہے۔ اب ذرا اپوزیشن کے دوسرے لیڈروں کے طرز عمل کا جائزہ لیجئے۔ جو محض مسلم لیگ کی دشمنی کی وجہ سے ایک ایسے فتنے کو ہوا دے رہے ہیں۔ جو نہ صرف مسلم لیگ بلکہ پاکستان ہی کو ختم کر کے رکھ دے گا۔

پچھلے دنوں "اپوزیشن" کے سب سے بڑے "عوامی" لیڈر حسین شہید سہروردی نے اپنے ایک بیان میں فرمایا کہ وہ بھی خان عبدالغفار خان کے مطالبہ پختونستان کے ہمنوا ہیں۔ اور جب ان کے اس بیان پر لے دے ہوئی تو انھوں نے یہاں تک تصحیح فرما دی کہ وہ صرف اسے نام کی تبدیلی سمجھتے ہیں۔ اور اس لئے اس میں کوئی خرابی نہیں محسوس کرتے۔ ہاں اگر اس نعرے کا مطلب اس سے کچھ زیادہ ہے تو پھر وہ اس کی حمایت نہیں کریں گے۔

ظاہر ہے کہ سہروردی صاحب نے یا تو پختونستان کے مطالبے کو محض نام کی وجہ کہہ کر ملک کے عوام کو دھوکا دینے کی کوشش کی ہے۔ یا وہ فی الواقع پختونستان کی اصل تحریک سے ناواقف محض ہیں اور نہیں سمجھتے کہ یہ تحریک کن مقاصد کے ساتھ کب وجود میں آئی اور کن کن منازل سے گزرتی رہی ہے۔ اور آئندہ کیسے کیسے فتنے اس تحریک کے بطن سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ ان دونوں باتوں میں سے جو بات بھی صحیح ہو۔ بہرحال اس امر کا ناقابل تردید ثبوت ہے۔ کہ اب ہمارے لیڈر ایک پارٹی کی دشمنی میں اتنے اندھے ہو گئے ہیں کہ اب انھیں ملک کے نفع اور نقصان میں کوئی تمیز نہیں رہی۔ اور چند آدمیوں سے سیاسی انتقام لینے کے جوش میں ایسی ایسی باتیں کرنے لگے ہیں۔ جو ملک وملت کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کا زبردست موجب بن سکتی ہیں۔

یہی حال ملک کے بعض کمانچار اخبارات و جرائد کا ہے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ صرف اپنے پرچوں کی اشاعت کو بڑھانے کی غرض سے کوئی ایڈیٹر پستی کردار کا یہ گھناؤنا مظاہرہ کر سکتا ہے کہ اپنے قلم کو اس تحریک کے تعاون اور تشدد نما کے لئے اٹھائے جو قیام پاکستان کی بنیادی آئیڈیالوجی IDEALOGY کی عین ضد ہو۔ وہ خواہ کچھ بھی ہو۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ ایسا گھناؤنا مظاہرہ پچھلے چند مہینوں سے ہمارے بعض چوٹی کے اخبارات و رسائل کے صفحات میں ہوا ہے۔ اور نسلی اور لسانی عصبیتوں کی بنیاد پر قائم ہونے والی اور بیچنے والی تحریکوں کو بڑی معصومیت کے انداز میں پاکستان کی خیرخواہ تحریکوں کا رنگ دیا گیا ہے۔ اور ان تحریکوں کے علمبرداروں کو ملک کے راہنماؤں کی صف اول میں لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ معلوم نہیں کہ اس کا اصل محرک کیا تھا لیکن یہ ظاہر ہے کہ ہمارے صحافیوں کا یہ حصہ اب پاکستان کی وحدت اور نظریہ پاکستان کے لئے اور اس کی [illegible] زیادہ فکرمند نہیں رہا اور ان کے لئے کوئی پرواہ نہیں۔ اگر ملک چاہے پانچ حصوں یا سات ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے یا اس ملک کا نظام ایسے ہاتھوں میں

چلا جائے جو اس نظریہ ہی کا خاتمہ کر دیں جس کی بنیاد پر پاکستان وجود میں آیا۔

یہ افسوسناک حقیقت اس امر کا شدید تقاضہ کرتی ہے کہ وہ لوگ جو پاکستان کی وحدت اور نظریہ پاکستان (یعنی اسلامی نظام کے قیام) کے بقاء اور استحکام کے حامی ہیں پہلے سے زیادہ سنجیدگی کے ساتھ غور کریں کہ اس تازہ صورت حالات میں ان پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اب تھوڑی بہت امید اگر ہو سکتی ہے۔ تو اسی طبقے سے ہو سکتی ہے جو کم از کم نظریاتی طور پر ابھی گمراہ نہیں ہوا۔ اور اس بات پر ابھی تک یقین رکھتا ہے کہ پاکستان ایک ملک کا نام نہیں ایک تحریک کا نام ہے۔ جو نسل گردی اور لسانی تحریکوں کی عین ضد ہے اور جس کی بنیاد کتاب و سنت کی روشنی میں مرتب ہونے والے آئین کے وعدے پر رکھی گئی تھی۔ یہ اسی طبقے کی ذمہ داری ہے۔ کہ وہ ان تمام تحریکوں کا سر کچلنے کی پوری پوری کوشش کرے جو منفی طور پر تو پاکستان کی وحدت کو پارہ پارہ کر رہی ہیں۔ اور مثبت طور پر ایک ایسے نظام کے لئے راستہ ہموار کر رہی ہیں جس کی نظر میں انسانیت کی سب سے بڑی دشمن وہ برگزیدہ ہستیاں ہیں جنہیں انبیاء و رسل (علیہ السلام) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

اس طبقے کے مختلف عناصر کے لئے اب ناگزیر ہے کہ اپنے مصنوعی اور فروعی اختلافات کو یا تو ختم کر کے یا باقی رکھتے ہوئے اپنے اندر دوسروں کے نظریات کے لئے کم از کم قوت برداشت پیدا کر کے اس عظیم خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک ہو جائیں۔ اور اپنی پوری کوشش اس بات کے لئے کریں کہ یہاں اسلام کا وہ عالمگیر اور حق پسند نظام قائم ہو جو ایک طرف تو پوری ملت اسلامیہ کا ضامن ہو اور دوسری طرف بیرونی دنیا کے لئے امن و آشتی کا زندہ پیغام ہو—!!

(بشکریہ تسنیم)

سید شاہ ضمیر عمادی جعفری

"اک رازِ حسین"

دست قسمت میں وہ قوت ہے نہ تدبیر میں ہے
جس قدر زور مری حسرت تعمیر میں ہے

دل کی بربادی سے قائم ہے نظامِ ہستی
راز کونین نہاں گردش تقدیر میں ہے

بیڑیاں پاؤں سے اپنے تو اتارے پہلے
عقل خود الجھی ہوئی زلف گرہ گیر میں ہے

آپ کو آپ کی رنگین اداؤں کی قسم
کہیئے کس کا یہ لہو آپ کی تصویر میں ہے

ناز لغزش پہ نہ کیوں اپنی کروں اے ساقی
عکس رحمت کا تری ساغر تقصیر میں ہے

عشق دامن کے اڑایا کرے پرزے تا حشر
حسن پوشیدہ ابھی پردۂ تنویر میں ہے!

یاد رہ رہ کے دلاتی ہے کسی کے گیسو
ایک دنیائے محبت مری زنجیر میں ہے

اشک کا پردہ مری آنکھ سے اٹھائیگی اجل
اک حسین راز مرے خواب کی تعبیر میں ہے۔

بیڑیاں ٹوٹیں تو پھر خیر نہیں دنیا کی
شورش حشر نہاں شورشِ زنجیر میں ہے

ہوش والوں کو بھی کر لیتی ہے بے خود ضمیر
سحر رنگین وہ مرے یار کی تصویر میں ہے

اِسلامی ادبؒ

ادب کیا ہے؟

اس سوال کا جواب اگر ادب کے ایک طالب علم کو مل جاتا تو اس کا بہت سا وقت بچ جاتا اور وہ ترقی پسند ادب، رجعت پسند ادب، ادب برائے ادب، ادب برائے زندگی، ادب برائے اسلام، ادب برائے اخلاق، ادب برائے آخرت قسم کی بحثوں سے بچ جاتا لیکن مصیبت یہ ہے کہ ادب کی کوئی واضح تعریف موجود نہیں۔ کوبولڈ نائیٹ نے افسانے کے متعلق کہا تھا کہ افسانہ سائنس نہیں کہ ریاضی کے دو اور دو چار کی طرح اس کی بھی کوئی تعریف کی جاسکے۔ پورے ادب کے متعلق یہی بات کہی جاسکتی ہے۔ ادب کی تعریف ہر بڑے ادیب کے ہاں مختلف (حتی کہ بعض صورتوں میں متضاد) ہے۔ ہڈسن صاحب نے ادب کی تعریف تشخیص کرتے ہوئے لکھا :-

"A piece of literature differs from a specialised treatise on astronomy, political economy, philosophy, or even history, in part because it appeals not to a particular class of readers only, but to men and women as men and women; and in part because while the object of the treatise is simply to impart knowledge, the ideal piece of literature

---

...ther it also imparts knowledge or not, is to yield aesthetic satisfaction by the manner in which it handles its theme."

(An introduction to the study of literature – Hudson)

چاہیئے تو یہ تھا کہ اس تعریف کے بعد ادب کے طالب ہڈسن صاحب دونوں شکر کا کلمہ پڑھتے لیکن ہڈسن صاحب خود اپنی مذکورہ بالا تشریح سے مطمئن نہ ہوئے (مصنف اگر مطمئن نہ ہو تو بے چارہ قاری کیسے مطمئن ہوگا) لکھتے لکھتے انھیں اخلاق کی بھی فکر ہوئی۔ آپ نے جان اینڈ نگٹن سائمنڈ کی ہاں میں ہاں ملائی اور اپنی اسی ... میں فکشن پر بحث کرتے ہوئے ایک ضمنی عنوان ادب اور اخلاق تعلق پر بھی قائم کر دیا چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

"If one thing is proved with certainty by the whole history of literature down to this time, it is that the self-preservative instinct of humanity rejects such art as does not contribute to its intellectual nutrition and moral sustenance. It cannot be made to endure long the

---

(Kobold Knight – A guide to fiction writing.)

contact with ideas that run counter to the principles of its own progress. All art to be truly great must be moralised.—" "Therefore artists who aspire to greatness can neither be adverse nor indifferent to ethics."

اخلاقیات کے بارے میں سیکڈوش ہوئے تو یہ خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں ادیب معلم اخلاق ہی نہ بن جائے چنانچہ مکرر ارشاد ہوا۔

"This does not mean that the artist should be consciously didact or obtrusively ethical. The objects of ethics and art are distinct. The one analyses and instructs; and the other embodies and delights."

ظاہر ہے کہ اس صورت حال میں ادب کے ایک طالب علم کی مشکل حل نہیں ہوتی اور اسے اپنے سوال ——— ادب کیا ہے؟ کا کوئی واضح جواب نہیں ملتا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک نقاد ادب کی تعریف کرتے ہوئے اپنے ذہن میں ایک تذبذب کیوں محسوس کرتا ہے؟ آخر اسے شرح صدر اور اطمینان قلب کیوں حاصل نہیں ہوتا؟ جب وہ کہتا ہے کہ فن پارہ فن برائے فن کی قسم ادب ہے جو انسان کی جبلیات کی تسکین کا باعث ہوتا ہے تو یہ خدشہ کیوں لاحق ہوتا ہے کہ ادیب اخلاق سے آزاد ہو کر اخلاق کا دشمن ہو جائے گا۔ یا پھر جب وہ ایک ادیب کو ... کہتا ہے کہ وہ اخلاق سے بیگانہ یا اسکا دشمن نہ ہو تو اسے ادب کے ... کیوں خدشہ پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت میں وہ ادب نہیں ... بڑھ کے ...

پہنچ جائیگا؟ ان سوالات کا جواب کیا ہے؟ آخر ادب کی ایک مسلّمہ تعریف کیوں نہیں متعین ہو جاتی؟

ادب کی ایک تعریف یہ ہے کہ کلام کا حسن اور تاثیر اسے (کلام کو) ادب بناتا ہے۔ جہاں تک حسن کلام کا تعلق ہے وہ ایک پیکر ظاہری ہی ہے جو محسوس کا مظہر ہے کہ کسی سے مخفی نہیں لیکن تاثیر کا معاملہ مختلف ہے۔ ادب کا ایک قاری ایک وقت کسی ادب پارے کو حسین اور عظیم کہتا ہے اس کے خالق سے عقیدت رکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ اسکی تمام تصانیف پڑھے اور اگر وہ زندہ ہے تو اس کی تازہ ترین تخلیقات کیلئے چشم براہ رہے لیکن ادب کا وہی قاری کسی ذہنی کایا پلٹ کے تحت اپنے محبوب مصنف اور اس کی تخلیقات سے منہ پھیر لیتا ہے اور کہتا ہے بھلے مانس اگر صحافت ہی مقصود تھی تو کسی روزنامہ میں سب ایڈیٹر ہو جاتے ناول لکھنا کیا ضروری تھا؟

یہاں پھر وہ تمام سوالات وارد ہوتے ہیں جو ایک نقاد ادب کے سلسلہ میں وارد ہوئے تھے اسلئے ضروری ہے کہ انکا کوئی واضح اور تسلی بخش جواب دیا جائے۔

اس واضح اور تسلی بخش جواب کے لئے ہمیں سب سے پہلے یہ حقیقت سمجھ لینی چاہیئے کہ زندگی ایک اکائی نہیں ہے زندگی کا رنگ ایک ہی نہیں بلکہ اس کی مثال قوس قزح کی سی ہے یہ سب رنگ ہونے کے باوجود بھی ایک ہی نظر آتی ہے ادب چونکہ زندگی کا ترجمان ہے اس لئے اس میں زندگی کے تمام رنگ نظر آتے ہیں

اور یہی وجہ ہے کہ ادب کی ایک تعریف ممکن ہے نہ صحیح۔ لیکن ادب کے اساتذہ۔ نقاد۔ اور ادب کے قاری۔ ادب کے طالب علم ایک خطرناک غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں، وہ زندگی کی ہر جنبش کو یک رنگ سمجھتے ہیں جس کا نتیجہ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے (اور ہوتا ہے) تفہیم ادب نہیں بس اگر ہم اسلامی ادب کو سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمیں سب سے پہلے اس بنیادی حقیقت کو سمجھنا ہوگا کہ زندگی ایک اکائی نہیں بلکہ بہت سی اکائیوں کے مجموعہ سے بنی ہے اور ادب چونکہ زندگی کا ترجمان ہے یک رنگ نہیں بلکہ اس میں اسی زندگی کا عکس جھلکتا ہے۔ یہاں پھر ایک اور دقت پیش آتی ہے: زندگی کا مفہوم کیسے ...

عام طور پر غلطی کی جاتی ہے۔ دراصل یہ ابہام "حیات" ہے۔ نقادوں اور فسادیوں کے بس کی بات سے بھی نہیں۔ یہ تو دراصل ایک مفکر کا کام ہے (اور صحیح ادیب کو خواہ وہ ادب کی کسی صنف سے بھی تعلق رکھتا ہو، مفکر ہونا چاہیئے جبھی تو وہ ادب کو ایک حکیم کے زاویۂ نگاہ سے سوچ سکے گا) اگر ہم اسلامی ادب کا مفہوم سمجھنا چاہتے ہیں تو بھی ہمیں فکر سے کام لیکر یہ جاننا ہوگا کہ 'زندگی' کا مفہوم کیا ہے؟

'زندگی' سے میرے نزدیک ہر ادیب کی انفرادی اور عملی زندگی مراد ہے۔ ہر انسان کی عملی زندگی اس کائنات کے متعلق شعوری یا غیر شعوری طور پر کوئی نظریہ اختیار کرنے سے وجود میں آتی ہے۔ یعنی ایک شرابی کو — جس کا عمل شراب پینا ہے —— بجائے اس کے ہم اپنے زاویۂ نگاہ سے —— مثال کے طور پر ایک مسلمان کے زاویۂ نگاہ سے —— دیکھیں اور اسے (اپنے زاویۂ نگاہ کے مطابق) فاسق بدکار ٹھہرائیں، ہمیں —— اپنے زاویۂ نگاہ کو بالائے طاق رکھکر یہ سوچنا چاہیئے کہ وہ شخص شراب کیوں پیتا ہے —— اس 'کیوں' کا جواب ہمیں اس صورت میں مل سکتا ہے اگر ہم اس شخص کا اس کائنات کے متعلق شعوری یا غیر شعوری طور پر قبول کیا ہوا نقطۂ نظر نظریۂ حیات معلوم کرلیں۔ جب ہم یہ معلوم کرلیں تو پھر ہمیں وہ طلسمی پنجرہ اور طلسمی پرند نظر آجائیگا جو اس شخص کو شرابی بناتا ہے اور ہم اس طلسمی پرند کا خاتمہ کرکے اسکی "زندگی" کو بدل دیں گے اور "زندگی" بدلنے سے اس کا نقش ادب بھی بدل جائیگا۔

اس دنیا میں مختلف انسانوں کی عملی زندگیوں کے پیچھے عموماً یہ نظریات زندگی ہوتے ہیں:-

(۱) کائنات کے بارے میں یہ نظریہ کہ یہ کائنات آپسے آپ بغیر کسی مقصد اور خالق کے —— وجود میں آئی۔

(۲) کائنات کے بارے میں چند اعتقادات رکھنا جن کا عملی زندگی سے بس چند رسوم کی حد تک تعلق ہو۔

(۳) رہبانیت

(۴) انسانی زندگی کو ظلم سے پاک کرنے کے لئے انسانی فکر کسے تابع کوئی تدبیر سوچنا تاہم کائنات کے بارے میں نظریہ اوّل پر کار بند رہنا۔

(۵) اسلام

آگے بڑھنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کے بارے میں اختیار کردہ ان مختلف نظریات کا ردعمل بیان کردیا جائے جو حضرات اس کائنات کے بارے میں (عموماً غیر شعوری طور پر اور بعض اوقات شعوری طور پر) یہ یقین رکھتے ہوں کہ یہ کائنات آپسے آپ وجود میں آگئی وہ دراصل یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس کائنات کو کسی بزرگ و برتر دانا و بینا ہستی نے نہیں بنایا اور اس نظریہ سے خود بخود یہ بات اخذ ہوتی ہے کہ انسان اس دنیا میں آزاد ہے اسے بھی کائنات کی طرح کسی نے تخلیق نہیں کیا لہٰذا جب اس کا کوئی خالق ہی نہ ہوا تو زندگی اور موت، جزا و سزا وغیرہ کا سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا اور ایک انسان کی زندگی میں اس نظریہ کو قبول کرنے کے بعد اسکا نظریہ 'بابر بعیش کوش' ہوجاتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ تاکہ حیات شراب لذت کا آخری قطرہ نچوڑ لے۔ اس حصول لذت کے لئے اسے فرائض سے بے پرواہ ہونا پڑے تو وہ فرائض سے بے پروا ہوجائیگا۔ اسے ظلم کرنا پڑے تو وہ ظالم ہوجائیگا۔ کیونکہ یہ اصطلاحیں تو وہاں سے آتی ہیں جہاں زندگی کے بارے میں کوئی واضح تصور پایا جاتا ہو۔

اس طبقہ سے تعلق رکھنے والے حضرات تعداد میں بہت ہی کم ہوتے ہیں اور یہی طبقہ —— کثیر تعداد میں دوسرے طبقہ کی شکل اختیار کرلیتا ہے یعنی وہ منافق ہوجاتا ہے اور زندگی میں اس کا مطمع نظر تو حصول لذت ہی ہوتا ہے مگر وہ اپنے دل کو فریب دینے کے لئے یا دنیا کو فریب دینے کیلئے چند مذہبی عقائد —— جو عموماً اسے اپنے والدین سے ورثہ میں ملتے ہیں، اور چند رسوم اختیار کئے رہتا ہے لیکن اگر محض 'مذہبی' بننے سے کام نہ چلے تو یہی لوگ 'ترقی پسند' یعنی طبقہ چہارم میں داخل ہوجاتے ہیں اور انکی رائے منافقت پر جہاں پہلے مسجد اور خانقاہ تصویر حاشیہ تھی اب وہاں "ترقی پسندی" کے گل بوٹے بھی جا شامل ہوتے ہیں۔

تیسرا طبقہ ان دونوں کے ردعمل سے پیدا ہوتا ہے ایک بڑی حد تک اسکا رول منفی ہوتا ہے، اور اس کا غیر فطری ہونا تو ایک امر مسلمہ ہے یہاں بعض اوقات تو غرض کام کرتی ہے لیکن جو لوگ فی الواقع خصوص

اس طبقہ میں شریک ہوتے ہیں انکی گمراہی کا سبب بھی پہلے دو طبقے ہی
لے ہیں۔ پہلے طبقہ کا دل تو بالکل ظاہر ہوتا ہے لیکن طبقہ ثانی کے ہاں
ں کی چال چھپی ہوتی ہے۔ مذہبی رسوم کی پابندی، خیرات، سالانہ نذر
عوام کو تو جھوٹا اطمینان دیدیتی ہے لیکن جو لوگ عام سطح سے بلند ہو کے
سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ اس نفاق کو دیکھکر چیخ اٹھتے
ں۔ آخر یہ کیا مذاق ہے ایک تاجر یا ایک صنعت کار یا ایک زمیندار اپنے
زاقتدار میں لوگوں سے دگنا تگنا منافع لیکر اپنی جھولی بھرتا ہے اور
رات کے دن یا جمعہ کے دن چند فقیروں کو چند پیسے دیکر یا سالانہ
مالی فیصدی دیکر سمجھ لے کہ وہ پاک ہو گیا ہے؟ پھر یہ کیا ستم ہے کہ آدمی
ں بھر سو آستانوں پر جبہ سائی کرتا پھرے مگر سال میں ایک یا اس
زائد مرتبہ مسجد میں حاضر ہو کر یہ خیال کرے کہ وہ ایک خدا کا پرستار
اور ـــــ بت پرست نہیں ہے؟ یہ اور ایسے ہی دوسرے خیالا
لوگوں کی پیدائش کا باعث بنتے ہیں جو اس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں
پھر وہ رہبانیت اختیار کر لیتے ہیں جس کو ہر مذہب میں درجہ کمال سمجھا
ہے جس کا نام کہیں تصوف اور کہیں جوگ ہے۔ صوفی یا جوگی یا رہبان
طبقہ ثانی اور طبقہ اوّل سے متنفر ہو کر وجود میں آتا ہے اس لئے باوجود
لف نام رکھنے کے وہ ایک ہی ہوتا ہے اس لئے کہا گیا ہے کہ صوفی کا
ہب کوئی نہیں ہوتا، درصل اس کا ایک ہی مسلک ہوتا ہے اور اسی
لک کے باعث وہ رواداری بھی ہوتا ہے۔

یہ نظریۂ حیات کوئی فطری نظریہ نہیں جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند
ی تو اپنی گدڑیاں بچا لیتے ہیں مگر ڈوبنے والوں کو بچانے کی جدوجہد
یوالا کوئی نہیں ہوتا اور اس طرح وہ ظلم نہیں مٹنے پاتا جو پہلے طبقہ کے
کے اقدام اور دوسرے طبقہ کے اس مقصد (مگر منافقت کے قیام)
وجہ سے پیدا ہوتا ہے پھر یہ ردعمل کا طریق حیات کوئی واضح نقشہ اپنے
یؤں کے سامنے نہیں رکھتا اس لئے اس کی حیثیت بھول بھلیاں سے
ادہ نہیں ہوتی۔ پہاڑوں میں غاروں اور جنگلوں میں انسان کا جسم اس کا
پا نہیں چھوڑتا اور کہیں لذت دنیا، لذت خورد و نوش نگاہوں کے
امنے آجاتی تو کہیں نفس کا شعلہ بھڑک اٹھتا ہے۔ بعض حضرات اس
قہ کو بھی طبقہ اول سے ملا دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہاں تصور مرد مستقیم

یا خدا کا راستہ نہیں بلکہ ذاتی عظمت ہوتی ہے

چوتھا نظریۂ حیات ان تینوں نظریات کے ردعمل کے طور پر پیدا ہوتا ہے جب ان تینوں نظریات پر عامل حضرات سے زندگی ظلم سے بھر جاتی ہے اور انسان انسان کا گوشت کھا جاتا ہے اور اسکی رگوں پر منہ رکھکر اس کا سارا خون پی جاتا ہے مگر رہتا پھر بھی وہ 'انسان' ـــــ اشرف المخلوقات اور خلیفۃ اللہ فی الارض ہی ہے۔ یہ حالات باغیوں کو جنم دیتے ہیں۔ اور فضا ان باغیوں کی للکار سے گونجتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ "انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر ہر جگہ زنجیریں اسکے پاؤں کو جکڑے ہوئے ہیں" اور پھر انسان کی بہتری کے لئے 'ان کی زندگی سے ظلم کو ناپید کرنے کے لئے فکر پیدا ہوتا ہے۔ فکر ذہنوں کو متاثر کرتا ہے اور پھر فکر امام بنتا ہے اور عمل مقتدی!! لیکن چونکہ ...... یہ نظریۂ حیات بھی محض ردعمل کی پیداوار ہے 'انسان چاہتا ہے کہ وہ انسانی زندگی کو ظلم سے پاک کرے لیکن وہ کسی ایسی روشنی کی تلاش نہیں کرتا جو عملاً ایسا کر سکے وہ اس کائنات کے بارے میں 'خود اپنے بارے میں کوئی غور نہیں کرتا اس لئے وہ انسانوں کو ظلم سے محفوظ رکھنے کے لئے خود سوچتا ہے اور پھر صفحۂ قرطاس پر بہت سی صورتیں آجاتی ہیں لیکن صفحۂ قرطاس صفحۂ قرطاس ہے اور تنقید کے وقت انسان پھر اپنی من مانی کرتا ہے اور نتیجہ یہ کہ جمہوریت، سرمایہ داری، نازیت اور اشتراکیت کوئی بھی زندگی کو ظلم سے پاک نہیں کر پاتی اور اسکی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسان اپنے متعلق اس کائنات کے متعلق جس میں کہ وہ رہتا ہے کبھی غور نہیں کرتا۔ اور اگر کبھی اُسے اس کا موقع ملتا بھی ہے تو معبد اور خانقاہ اسکی گمراہی کا باعث بنتے ہیں کیونکہ یہاں کتاب میں تو بہت کچھ ہوتا ہے مگر عمل میں کچھ نہیں ہوتا "خانقاہ" تو ردعمل کی پیداوار ٹھہرا ایک بھول بھلیاں ہوتی ہے اُسے سمجھنا آسان نہیں ہوتا لیکن 'معبد' کو سمجھنا بھی بہت دشوار ہوتا ہے۔ اسے تو ان لوگوں کے عمل کی بدولت سمجھا جا سکتا تھا جو اس پر عمل پیرا ہوتے کتابوں سے اس کا سمجھنا عام طور پر ممکن نہیں ہوتا حتی کہ انسان غیب پر ایمان لے آئے [1]۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے

[1] اسلام کے علاوہ جملہ مذاہب میں عقائد تک پیچیدہ ہیں لیکن اسلام کے بعض مسائل کو بھی آسان پیچیدہ بنا دیا گیا ہے کہ ایمان بالغیب کے سوا چارہ نظر نہیں آتا [illegible]

[illegible] ہوتا ہے۔

یہ پانچواں طبقہ اس نظریۂ حیات پر عمل پیرا ہوتا ہے جو اسلام کے مطابق ہے۔ اس نظریۂ حیات پر عامل افراد یہ بات سمجھ سوچ کر اور سمجھ کر قبول کرتے ہیں کہ یہ کائنات اور انسان خود کسی حادثے کے نتیجے میں وجود میں نہیں آئے بلکہ انہیں ایک بزرگ و برتر ہستی نے ایک مقصد کے تحت پیدا کیا ہے یہ کائنات اور انسان فانی ہیں باقی نہیں اور یہ کہ اس فانی زندگی کے بعد ایک ایسی زندگی آئے گی جو دائمی ہوگی اور جس میں انسان کو اس کے اعمال کی جزا یا سزا ملے گی۔

یہ طبقہ ایک نابغہ کی بدولت وجود میں آتا ہے یہ نابغہ پہلے خود فکر سے اس کائنات کے بارے میں سوچتا ہے جن صاحبان نے قرآن مجید میں حضرت ابراہیم کی تلاش حق کا واقعہ پڑھا ہوگا انہیں بخوبی علم ہوگا کہ اس نظریہ کا ایک مومن کس طرح غور و فکر کر کے اسے قبول کرتا تھا پھر اسے اس کائنات کا "خالق" صحیح راستہ بتا دیتا تھا۔ یہ نظریہ حیات کوئی نیا نظریۂ حیات نہیں ہوتا بلکہ اس کی روح وہی ہوتی ہے جو پہلے ہوتی تھی۔ حضرت موسیٰ حضرت عیسیٰ حضرت ابراہیم، حضرت محمد صلعم سبھی ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں تھے ایک کے بعد دوسرے۔ حتیٰ کہ آخری کا کام فقط یہ تھا کہ وہ مُردہ کو زندہ کرے اور اس طریق فکر و عمل کی جڑوں کو عمل زندگی سے شاداب کر کے اسے سر سبز کر دے۔ آج بھی اسلام کا احیا یا اسلام اس طرح آ سکتا ہے کہ ایک نابغہ اسے سوچ سمجھ کر قبول کرے اور پھر اپنے فکری چراغ سے اور دیئے جلاتا جائے اور اپنے عمل صالح سے مزید صلحا پیدا کرتا چلا جائے۔

ظلم کو یہی طریق زندگی ختم کر سکتا ہے کیونکہ یہاں کا عنصر جو کچھ مذکور ہے اس کی تنفیذ کے لئے آخرت کی جوابدہی کا احساس اور خدا کے حاضر و ناظر ہونے کا یقین اور پھر اس معاشرہ کا جذبۂ احتساب جو اس نابغہ کی فکر اور عملی زندگی سے پیدا ہوتی ہے اور جسے کوئی خوف۔ موت کے خوف سمیت نہیں ہوتا ــــ کافی ہوتے ہیں۔ ظلم فرد کی زندگی سے مٹ جاتا ہے اور انفرادی زندگی کے بعد اجتماعی زندگی بھی ظلم سے پاک ہو جاتی ہے اور پھر وہ زمانہ آتا ہے جس کے متعلق شاعر نے پیش گوئی کی تھی۔ "اچھا وقت آ رہا ہے۔ اچھا وقت!"

ادب کے سب تعلق کی [illegible] ہیں [illegible] زندگی سے الگ کوئی شے نہیں۔ ادب بھی ان پانچ نظریات حیات کا عکس ہوتا ہے اور عام طور پر ادب بھی انہی پانچ نظریات حیات میں سے ایک کے مطابق ہوتا ہے۔

ادب میں پہلے طبقے سے تعلق رکھنے والے حضرات دو طبقوں میں بٹ جاتے ہیں اول وہ جو ادب کو حصول دنیا ــــ حصول زر کا ذریعہ بناتے ہیں دوم وہ جو ادب کو انسان کے کام و دہن کی لذت کا باعث بنا کر اپنے لئے بقائے دوام کا سامان پیدا کرتے ہیں۔

ادب کو جو لوگ پیشہ کی حیثیت سے اختیار کرتے ہیں ان کے اصول بھی وہی ہوتے ہیں جو تجارت پیشہ اصحاب کے ہونے چاہئیں۔ پیش نظر یہ بات نہیں رہتی کہ کسی ادب کے نتائج قلم عوام پر کیا اثر ڈالتے بلکہ پیش نظر یہ ہوتا ہے کہ کیسا ادب پبلک میں زیادہ سے زیادہ مقبول زیادہ سے زیادہ روپیہ لانے کا باعث ہو سکتا ہے؟ جس طرح روپیہ کے لئے آخر انسانوں میں سے ایک منشیات کا کاروبار سنبھال لیتا ہے یا [illegible] کی تجارت کرتا ہے اور اس بات سے بے فکر ہو جاتا ہے کہ اس کے گاہک اس سودا خرید کر کن کن نقصانات سے دو چار ہوں گے اس طرح ایک ادیب اس بات سے بے نیاز ہوتا ہے کہ اس کے نتائج قلم کا اثر پڑھنے پر کیا پڑے گا۔ چناں چہ یہ حضرات انسانی فطرت کے کمزور پہلو ڈھونڈ کریں گے مثلاً یہ کہ انسان کی ایک کمزوری جنس ہے۔ لہٰذا جنسی لٹریچر میں آئیگا۔ فلمی لٹریچر، بے مقصد لٹریچر، جاسوسی اور تاریخی اور [illegible] دوسرا لٹریچر یا پھر بوقت ضرورت قومی لٹریچر بھی پیدا کیا جائیگا۔ لیکن قومی لٹریچر کا تعلق قوم سے کم اور اس کے [illegible] ظالم حکمران طبقہ [illegible] ہوگا۔

اس طبقے سے تعلق رکھنے والے دوسری قسم کے لوگ جو [illegible] چاہتے ہیں۔ "بقائے دوام" بظاہر ایک [illegible] اصطلاح لگتی [illegible] یعنی انسان کی زندگی بہرحال ایک ختم ہونے والی چیز ہے پھر [illegible] مطلب ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہے؟ [illegible] انسان [illegible] جنگ کرتا اور بظاہر منصور نظر آتا ہے [illegible] اس کی کوشش ہو کہ وہ جسم کے [illegible] بات

حتیٰ عرفانی اور یہ کوشش اس لئے ہے کہ مذہب کے پیش
ان کے تحقیق اگر اس دنیا کی زندگی کے بعد ایک ابدی زندگی کو ماننا ہے یہ اصل جو
ہے۔ ترقی پسند والے تو خیر مذہب کو ڈھکوسلا سمجھتے ہی ہیں لیکن ...
بہ پرست عیسائی جو حیاتِ دین ہونے کا دم بھی بھرتے ہیں۔ ان کے
ی کلاسیکی ادیب پیدا ہوتے ہیں اور اس حیاتِ جاوید کی خاطر یہ
'فن' کو اپنا محور بناتے ہیں اور ہیئت پر اپنی توجہ کے ہر پہلو کو
رتے ہیں اور وہ کوشش کرتے ہیں کہ انکی تخلیقات زندہ و پائندہ
انکے فن میں جو انسان نظر آتے ہیں ان میں زندگی ہوتی ہے اور انہیں
یہ انہیں متعلق دکھایا جاتا ہے تاکہ قاری انہیں اس طبقہ کا سمجھتا ہے اور
سکے کمال فن کی داد دیتا ہے اس ادب کا زندگی سے بس اتنا ہی تعلق
گیا اس کا مجموعی تاثر جو ادب میں درحقیقت سب سے زیادہ اہم ہوتا
یہاں مفقود ہوتا ہے اور قاری اس طبقہ کے ادیبوں کی تخلیقات
نا کھو جاتا ہے کہ اسے اسکے سوا کچھ اور حاصل ہی نہیں ہوتا۔ لیکن
ی ذرا بلند درجے کے ہوتے ہیں ان کے لئے یہ ادب وہ گلدستہ بنکر
تا ہے جس میں ہر شخص کی پسند کا پھول ہوتا ہے اور جس میں ہر شخص کی
کی شراب موجود ہوتی ہے۔ لیکن اس گلدستہ کا مجموعی حیثیت سے
تاثر نہیں ہوتا اور بعض حضرات اس نیرنگیٔ فن کو جمالیاتی حس کی تسکین
دیکر اس مجموعہ کو 'ادب' کہتے ہیں لیکن جلد ہی نہیں انکی بے مقصدیت
ماتی ہے اور وہ مذبذب ہو جاتے ہیں[1]

دوسرے نظریۂ حیات پر عامل ادیب حضرات کے ہاں آپ کو
ادب ملے گا لیکن اس ادب میں کلاسکی ادب کی خصوصیات غالب ہونگی
شخص کی نعت لکھی گئی ہوگی اس سے افلاطونی محبت پیدا کرنا مقصود
۔ اسکی زلفوں کی تعریف، دانتوں کی مدح، رخِ انور کا قصیدہ اور
وہی سلوک کیا جائیگا جو شاعر ایک اچھے معشوق سے کرتا ہے یعنی یہ
میں حقیقت اور افلاطونی محبت پیدا کرتا ہے یعنی اپنی محبوب ہستی

- حیاتِ جاوید کے حصول کا یہ جذبہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی
ہے مثال کے طور پر پاکستان کے رہنے والے ایک شاعر نے بجائے
بن دعوت کی کہ انکی [illegible] کے کلام کیلئے بطور ضمانت [illegible] کی جائے
[illegible] ہے۔

کے خلاف گالی گلوچ دشنام طرازی کو قتل تو کروا دیتا ہے لیکن یہ کہ وہ ان کی
دل جس سے وابستگی رکھتا ہے، کے طریقہ زندگی کے تنقید ادب کے علاوہ
آپ کو یہاں ادب برائے زندگی (یعنی ایسا ادب جو ظلم کے خلاف آواز بلند
کرتا ہو) بھی ملے گا —— مگر شاذ و نادر —— اور یہ بھی منافقت
کی بنا پر ہوگا۔ اب اگر کوئی شخص کسی شاعر کے پورے دیوان کے مقابل میں
اسکی ایک یا دو غزلوں کی بنا پر اسے ترقی پسند تسلیم کرلے تو یہ اسکا حق ہے
اگرچہ اسکے اس حق کو حقیقت سے بہرحال کوئی تعلق نہیں ہوگا۔

تیسرے نظریۂ حیات پر عامل حضرات زندگی کی بے ثباتی کا ذکر
کرینگے۔ انسان کے نفرت کا ذکر کریں گے۔ 'مختلف مذاہب' کی بنا پر جو نفرت
انسانوں کے درمیان ہوتی ہے اسے دور کرکے وحدتِ ادیان کا پرچار
کرینگے۔ ترکِ دنیا کی تعلیم دیں گے اور تلاشِ حق اور عرفانِ حق کا ذکر
کریں گے لیکن چونکہ انہوں نے ایک غیر فطری طریقِ زندگی اختیار کر رکھا
ہوگا اس لئے انکے ہاں زندگی کے لذائذ کا ذکر آئیگا۔ اور ضرور آئے گا
اگرچہ حسرت کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو اور اگرچہ مرید پیر کے شعر کی تاویل
کچھ سے کچھ کیوں نہ کرے۔ مثال کے طور پر اس شعر میں زندگی کی بے
ثباتی اور اسکے لذائذ سے تمتع کو جاری رکھنے کی خواہش دیکھئے ؎

ساقیا! یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

یہ الگ بات ہے کہ مرید ساغر سے مراد ساغرِ معرفت لے لے ا
میر درد صاحب کے اس شعر کی یوں تشریح ہو جائے کہ دنیا تو بے ثبات
نظر آرہی ہے لہٰذا جب تک ذکر ممکن ہو کرلو لیکن ڈاکٹر سید عبداللہ
اُس رستے کا کیا بنے گا کہ خواجہ میر درد کے ہاں پچھلے پہر جانے کا ذکر ملتا ہے
چونکہ یہ گروہ زندگی سے کنارہ کش ہوتا ہے اس لئے اگرچہ
یہاں اگر ہمیں کچھ اچھی صفات ملتی ہیں تو بھی ان کی حیثیت مثبت
نہیں منفی ہوتی ہے 'دستِ طمع کسی مقصد کی خاطر دراز ہوتے
نہیں بچا نظر آتا بلکہ اب وہ اس لئے دراز نہیں ہوتا کہ وہ سرہانے
دھرے دھرے سو گیا ہے۔

چوتھے نظریۂ حیات پر عامل لوگ ان تینوں طبقوں پر تنقید
کرتے ہیں۔ چنانچہ یہاں انسان کی منافقانہ زندگی پر تنقید ملے گی

کے ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوتی سنائی دے گی۔ پھر رہبانیت کے خلاف بھی ہم کچھ نہ کچھ پائیں گے۔ دنیا بھر کے ادب میں "مذہب کیتھولک" بہت کچھ موجود ہے اسکی مدح اور حقیقت کی تصویر موجود ہے، اس کا تاریخ شاہد ہے اور پھر یہاں بھی تنقید کے تیروں سے محفوظ نہیں تاہم بطور مثال کے پیش کیا جا سکتا ہے اور جب تک ظلم موجود رہیگا یہ طبقے باقی رہیں گے یہ احتجاج باقی رہیگا البتہ جب یہ احتجاج مثبت حیثیت اختیار کریگا یعنی احتجاجی حضرات (Protestants) کے ہاتھوں میں علم کار آجائیگی تو ایک مدت تک کے لئے ظلم اب نئے پیکروں میں سر اٹھانا شروع کر دیگا اور ادب بھی اس رفتار سے صدائے احتجاج سے محروم ہوتا جائیگا اور پھر یہی ادب برائے ادب، کلاسیکی ادب اور رہبانی ادب بنتا چلا جائیگا۔ عسکری صاحب نے ایک مرتبہ "ادب برائے ادب" کے عنوان سے ایک مقالہ میں یہ توقع ظاہر کی تھی کہ روس میں اگر کبھی اشتراکیت مکمل صورت میں آگئی تو وہاں کے ادیبوں کو بھی "ادب برائے ادب" کا نظریہ اختیار کرنا پڑے گا۔ اس توقع میں وہ حق بجانب تھے۔

پانچواں نظریہ حیات جن حضرات کی عملی زندگیاں بناتا ہے۔ وہ اپنے پاس زندگی بسر کرنے کے لئے کچھ مثبت اصول رکھتے ہیں اور وہ انہی کی بنا پر اور انہی کو معیار بنا کر ان چاروں طبقوں پر تنقید کرتے ہیں۔ اور وہ جہاں عملی زندگیوں میں ان اصولوں کو چلتا پھرتا دکھاتے ہیں۔ وہاں وہ فکر کو بھی انہی اصولوں کے تابع کر لیتے ہیں۔

پہلے تین طبقوں سے تعلق رکھنے والے حضرات ہمارے ہاں موجود ہیں اور بہت عرصے سے موجود تھے ہمارے قدیم و جدید ادب میں انکا عمل دخل بہت بڑی حد تک ہے۔ انہی طبقات کی نمائندگی حلقہ ارباب ذوق، حلقہ ارباب علم اور ایسی ہی دوسری ادبی انجمنیں کرتی ہیں چوتھے طبقہ کی نمائندگی ہمارے ادب میں زیادہ پرانی نہیں اور نمائندگی وہ ادیب بھی کرتے ہیں جو اس انجمن سے متعلق نہیں جو اس ادب کو پیش کرنے کا دعویٰ کرتی ہے میری مراد انجمن ترقی پسند مصنفین سے ہے۔ اسکے برعکس حلقہ ارباب ذوق سے تعلق رکھنے والے بعض ادیب بعض اوقات (کیونکہ جذباتی حیثیت سے ان کا مزاج ترقی پسندانہ نہیں) ترقی پسند ادب پیش کرتے ہیں مثال کے طور پر جب ہم منٹو کی "پھاڑی کہانی" پڑھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ سماج کے نفاق پر تنقید کرتا ہے۔ مگر منٹو کو اس طبقہ سے منسلک نہیں کیا جا سکتا لیکن انجمن ترقی پسند ایک مخصوص عرصہ تک "ترقی پسند ادب" ضرور پیش کرتی رہی اگر اس نے اپنی روش بدل کر چوتھے طبقہ۔ ترقی پسند طبقہ سے دو اور دوسرے طبقہ سے قریب بلکہ قریب تر کر دیا ہے۔

پانچویں طبقہ سے تعلق رکھنے والے ادیبوں کی ہمارے خو حد تک کمی تھی مگر قحط نہ تھا۔ جوہر، اکبر الہ آبادی اور اقبال اس سا قابل ذکر ہیں اگرچہ ان تینوں حضرات کے ادب پر اسلامی نقط تنقید کی جا سکتی ہے خصوصاً اکبر پر۔ اور اس طبقہ کے وجود ہو یہ ہے کہ اگرچہ من حیث الجماعت اس برعظیم میں "اسلام" . . . . فنا ہوتا گیا اور اسکے ماننے والے روز بروز منافق بنتے گئے لیکن ارضی ایسے نفوس زکیہ کے وجود سے خالی نہ رہا جو اس نفاق کے صدائے احتجاج بلند کرنے اٹھے ہوں۔ اس سلسلہ کی آخری کڑی سید بھائی تھے۔ حتیٰ کہ پھر اسی نظریۂ حیات نے اپنے اظہار کے لئے پیکر تلاش کیا۔ اس برصغیر میں ایک نابغہ پیدا ہوا جس نے اسا اور بوجھ کر قبول کیا اور پھر اپنے فکر و عمل سے اس نے اسلام کو ایک کی صورت دی اسلام جب بھی آتا ہے وہ اپنے اظہار کے لئے اد اظہار بناتا ہے چنانچہ انجیل اور خصوصاً قرآن بطور مثال کے پیش ہیں۔ قرآن کو تو ادبی حیثیت سے ایک معجزہ خیال کیا جاتا ہے برعظیم پاک و ہند میں جب اسلام پیش کیا گیا تو اس کا ذریعہ آ ہی تھا۔ اگرچہ یہ ادب لطیف ادب کی صورت میں نہیں بلکہ نہ کی شکل میں تھا۔ ممکن ہے مولانا مودودی، مولانا امین احسن اصلا نصر اللہ خاں عزیز کو بعض حضرات جذباتی عصبیت کی بنا پر اد مگر ہے یہ حقیقت کہ وہ ادیب ہیں اور بلند پایہ ادیب ہیں۔

لیکن اسلامی تحریک ادب لطیف سے بھی زیادہ محروم نہ ایسے شاعر و ادیب حضرات مل گئے جو اس میدان میں برابر کو چلے آئے۔ اور آج جب اس تحریک کی عمر تیرہ برس ہوتی ہے میں اسلامی ادب کے طلبہ کی تعداد اتنی ہے کہ اسے نظر انداز جا سکتا۔

اس پانچویں طبقہ کے پیش کردہ ادب کو اسلامی ادب کا نام دیا
ا ہے اسکی مثال قرآن ہے (فقہ کی کتب نہیں، کیونکہ فقہ (بمنسخہ
ہ ادب نہیں ہو سکتا اور نہ ہی کوئی معقول انسان کریمنل
پیجر کوڈ وغیرہ میں ادب تلاش کریگا) ——— اور پھر وہ ادب
'اسلامی' فکر کا مظہر ہے۔ نعتیہ یا رہبانی ادب اسلامی ادب نہیں
ا سکتا۔ نہ ہی مسلمانوں کی تاریخ سے متعلق وہ ادب ہے جسے اسلامی کہا
جاتا ہے البتہ ترقی پسند ادب کے وہ حصے جو ظلم کے خلاف اپنے اندر
یند رکھتے ہیں یا جن میں رہبانیت کے خلاف فطرت ہونے پر تنقید
کی گئی ہے اسلامی ادب کے قریب شمار کئے جا سکتے ہیں۔ مگر مکمل طور پر
یں اسلامی ادب نہیں کہا جا سکتا الا یہ کہ صورت حالات بہت ہی
معمولی ہو' مثال کے طور پر منٹو کی 'چھوٹی کہانی' عزیز احمد کے 'تصویر شیخ'
راپندر ناتھ اشک کے 'پرواز' کو لیجئے۔ مجموعی حیثیت سے یہ اسلامی ادب
ے کہلا سکتے ہیں۔ مگر جزوی طور پر ان میں بعض ایسی باتیں پائی جاتی
یں جو قابل اعتراض ہیں ——— مثال کے طور پر فحاشی! اسلامی
ادب جنس کو نظرانداز نہیں کرتا بلکہ جنسی جذبہ کی تسکین کا ایک فطری
طریقہ بتاتا ہے لیکن جب اسلام کی عدم موجودگی میں ناہمواریاں اور
موجود ہو تو یہ اسلامی ادب کے موضوع سے الگ نہیں رہ سکتا مثال
طور پر رہبانیت کو لیجئے۔ اس کے ہاں جذبہ جنس کو جس طرح کچلا جاتا
ہے اور اس کا جو رد عمل ہوتا ہے (یعنی جنس کا شعلہ بھڑکتا ہے) اسکا
ر ——— جیسا کہ اس سے بیشتر کہا گیا ہے دنیا کے ادب میں
موجود ہے اور اس پر تنقید کی گئی ہے۔ 'اسلامی ادب' میں بھی یہ موضوع
جود ہے۔ اناطول فرانس کا 'تائیس'، عزیز احمد کا 'تصویر شیخ' منٹو کا
سوراج کے لئے' اسلامی ادب کے قریب ہیں۔ مجموعی طور پر انہیں اسلامی
ادب پارے کہا جا سکتا ہے مگر جزوی حیثیت سے کچھ اعتراضات بہرحال
رہتے ہیں ——— لیکن جیلانی کا افسانہ 'بلعم بن باعور' جس کا
موضوع بھی جنس ہے قابل اعتراض نہیں کیونکہ ایک اسلامی ادیب بے حد
محتاط ہوتا ہے وہ جنس کا ذکر کرتا ہے مگر احتیاط کے تقاضا کہ ہر قسم کے تقاضے
سے مریض قاری ذہنی لغزشوں سے گمراہ نہ ہو جائیں۔
اسلامی ادب کا موضوع انسان کی پوری زندگی ہے وہ اس پر تنقید
کرتا ہے اور اپنے مثبت فکر کی جھلک دکھاتا ہے۔

اسلامی ادب ایک نعرہ نہیں (یہ اگر بات ہے کہ جس اسلامی ادب کی حسن عسکری صاحب اور اب فراق صاحب نے ذکر کیا ہے وہ ایک نعرہ ہی تھا) یہ ایک حقیقت ہے اور ہمیں اس پر اسی حیثیت سے غور کرنا چاہئے در اصل ادب میں نعروں کی گنجائش ہے ہی نہیں ادیب اگر مفکر ہو تو اسے نعروں سے چھٹکارا مل جاتا ہے۔ ادب زندگی کی پیداوار ہے' زندگی کے کئی رنگ ہیں۔ اگر کوئی ادب پارہ کسی خاص قسم کا ادب پیش کرتا ہے تو کسے جانے کا مستحق نہیں اور نہ ہی اسے بدلنے کا یہ کوئی حکیمانہ طریقہ ہے اسلامی ادب اسلامی زندگی اور اسلامی فکر کا پیدا کردہ ہے اسے نعروں کی ضرورت نہیں اور نہ نعروں کے بل پر ادب پیدا ہی کیا جا سکتا ہے اگر نعروں کے بل پر کوئی ادب پیدا کیا جانا ممکن ہوتا تو آج پاکستانی ادب میں پنجاب کی ... سرحد کی مردان شوگر مل، بنگال کے کرنافلی پیپر مل وغیرہ کے تذکرے ہوتے مگر ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوا اور اسکی وجہ یہی ہے کہ نعروں کے بل پر ادب تخلیق نہیں ہو سکتا۔

—x—

رات

ظلمتِ شب کی مہکتی ہوئی تاریکی میں
میں نے ہنستے ہوئے تاروں کی تمنا کی تھی
دیدۂ دل میں امنگوں کا تلاطم لیکر
میں نے رنگین بہاروں کی تمنا کی تھی

اب بھی بے نور سیاہ رات کے نظاروں میں
میں نے دیکھا ہے امیدوں کے چمن بکتے ہیں
اب بھی مفلس کی جوانی کا لہو بکتا ہے
اب بھی جمہور کی عزت کے کفن بکتے ہیں

★

میں تو اک صبح درخشاں کا تمنائی تھا
مجھ کو معلوم نہ تھا رات امنڈ آئیگی
مفلسی سینۂ ظلمات سے پیدا ہو کر
رات بن جائیگی اس دیس پہ چھا جائیگی

مسکراؤ شب ظلمات میں رونے والو
درد و افلاس کی یہ رات گزر جائیگی
مضمحل رات کی بے رحم سیاہ تاریکی
دور ہو جائے گی جب صبحِ بہار آئیگی

★

ایک جاں سوز سیاہی ہے فضاؤں پہ محیط
جس نے لوگوں کی امنگوں کو کچل ڈالا ہے
موت کے سائے تلے سسکیاں بھرتی ہے حیات
کس نے امید کے پھولوں کو مسل ڈالا ہے

انقلاب آئیگا مشرق کے سکوں زاروں میں
تیرہ و تار فضاؤں میں چراغاں ہوگا
دستِ اسلام میں باطل کا گریباں ہوگا
غم نصیبوں کے غم و درد کا درماں ہوگا

مولانا مودودی کے ہاتھ کی چند تصریحات

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا ہاتھ دیکھنے کا مجھے دو بار اتفاق ہوا۔ پہلی بار جولائی ۱۹۵۱ء میں ———— دوسری یکم مارچ ۱۹۵۳ء کو یعنی تحریک ختم نبوت میں ان کے گرفتار ہونے سے تین ہفتے پہلے ———— اول بار مجھے دس منٹ ہی مل سکے، پہلی بار مولانا کو ہاتھ دکھانے کے لئے آمادہ کر لینا ہی میرے نزدیک بڑا کارنامہ تھا کہ ان کے ہاتھ کا پرنٹ حاصل کرنے کی جرأت نہ ہو سکی اس مطالعہ میں جو کچھ دیکھا جا سکا اس کی روشنی میں کہنے کو تو کافی کچھ کہا گیا تھا تاہم بات یہ ہے کہ جس طرح کا مکمل مطالعہ درحقیقت میں کرنے کا متمنی تھا۔ وہ کیا جا سکا۔ تحقیقی مطالعہ کے لئے بہ فراغت کافی وقت درکار ہے۔ لہٰذا پہلی بار ... کی ملاقات کے بعد میری ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ مولانا کے نیاز پھر حاصل کیے جائیں اور ان سے نقش دست دینے کی پھر درخواست کی جائے۔

فروری ۱۹۵۳ء کے آخری ہفتہ میں لاہور جانے کا اتفاق ہوا۔ تو میں نے وقار حسین صاحب نیوز ایڈیٹر پاکستان ٹائمز سے اس خواہش کا اظہار کیا اور خواہ حالات کا عمدہ جائزہ تصور کیجئے یا پامسٹری کا کمال کہ میں نے یہ بھی عرض کیا کہ ہمیں اس سلسلہ میں جلدی کرنی چاہیئے کہیں مولانا بھی گرفتار نہ کر لئے جائیں۔

وقار صاحب جو اپنی برادرانہ شفقت کی بنا پر میری پامسٹری کی کاوشوں کا ہمیشہ ہمدردانہ جائزہ لیا کرتے ہیں۔ ساتھ چلنے پر فوراً آمادہ ہو گئے اور اس طرح ہاتھ دیکھنے کے سلسلے میں دوسری بار مجھکو مودودی صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا۔

تقریباً دس گیارہ بجے کے دوپہر کا وقت ہو گا کہ میں، وقار صاحب مسٹر ... چوہدری اور مسٹر کریم الٰہی خان، مودودی صاحب کے مکان واقع اچھرہ حاضر ہوئے۔ اطلاع کرائی۔ اب یہاں پھر تعارف کی کوئی آنی لیبی... ضرورت محسوس ہوئی۔ کیونکہ مولانا ایسی صلاحیت کے لوگوں کا حافظہ اتنا کمزور نہیں ہوتا کہ ان سے بار بار اپنا تعارف کرانے کی ضرورت محسوس ہو اور ویسے مجھے ان سے ہاتھ کی ریڈنگ کی اشاعت کے بعد بھی ایک بار ملنے کا اتفاق ہو چکا تھا۔ آپ غالباً اپریل ۱۹۵۲ء میں کیمبل پور جماعت اسلامی کے کارکنوں کے اجتماع کو خطاب کرنے کی غرض سے تشریف لائے تھے کہ میں ان کی قیام گاہ پر حاضر ہوا۔ سعد رہی سے مجھے پہچان لیا اور مولانا امین احسن صاحب اصلاحی سے مخاطب ہو کر فرمایا "مولانا۔ یہ ہیں کیرو آف پاکستان، جنہوں نے میرے ہاتھ کی لکیروں کے بارے میں لکھا تھا۔"

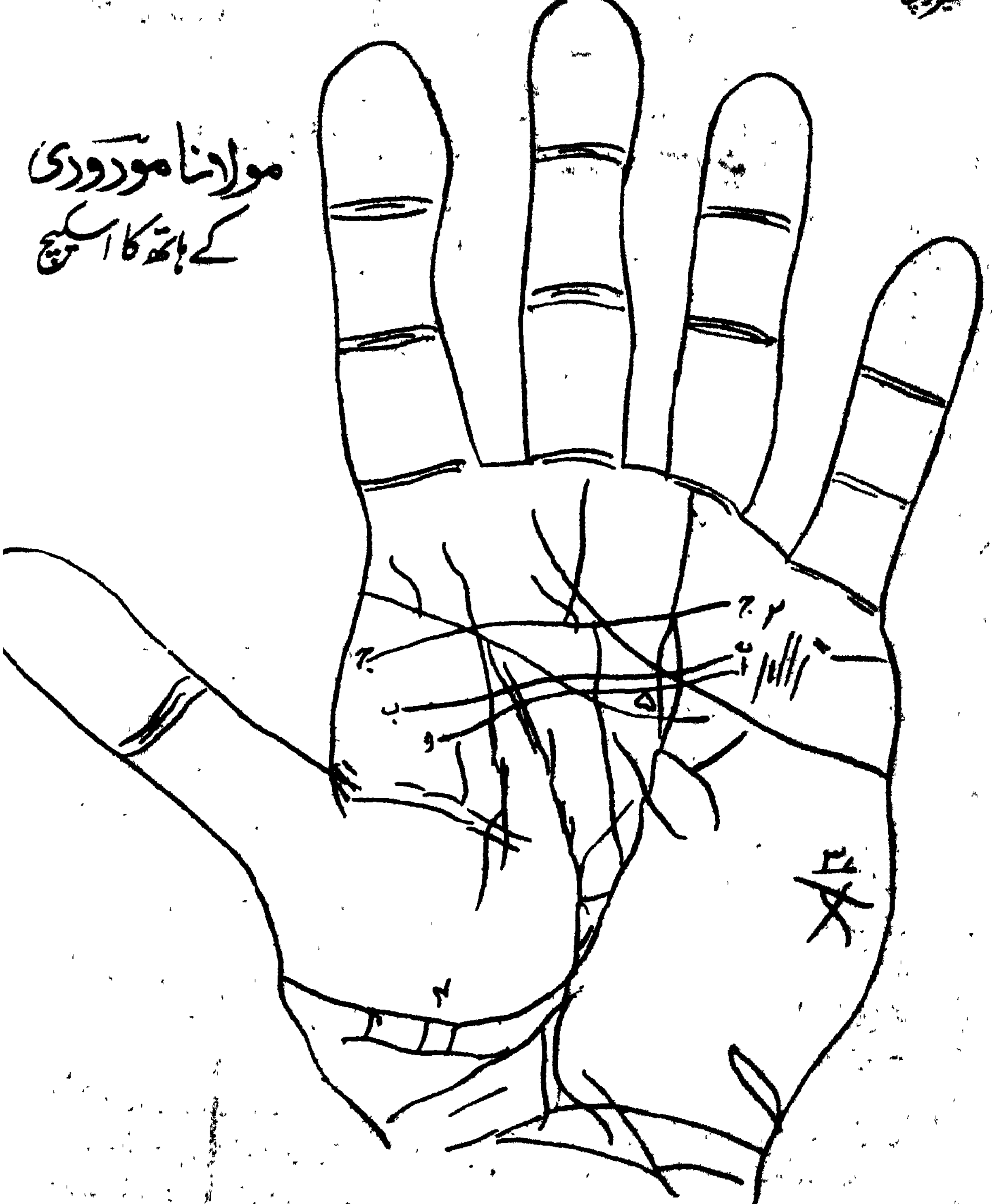
آپ کا قیام کیمبل پور میں نہایت مختصر تھا۔ شائقین ملاقات کی موجودگی میں مجھے اتنی مہلت نہ ملی کہ اس موقعہ پر پرنٹ کے لئے درخواست کر سکتا۔ بہر حال وہ ملاقات بڑے پر سکون ماحول میں ہوئی۔

بات چیت کرتے ہوئے وقار صاحب نے عرض کیا کہ "مولانا یہ ہیں ملک صاحب" اور پھر کچھ وقفہ کے بعد کہا "جب یہ تعارف کرا دیا جائے تو غالباً یہ بتانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ ان کے یہاں آنے کا مقصد کیا ہے یہ اپنے شعبہ کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔"

مولانا میری طرف متوجہ ہوئے تو میں نے عرض کیا کہ جب سے آپ کے ہاتھ کے بارے میں لکھا ہے۔ بہت سے احباب کا اصرار ہے کہ آپ کے ہاتھ کا پرنٹ بھی شائع کیا جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کے ہاتھ کا پرنٹ لے لیا جائے۔ میں نے عظیم انسانوں کے ہاتھوں کے پرنٹس جمع کرنے کی ایک مہم شروع کر رکھی ہے۔ اس میں آپ کے ہاتھ کا پرنٹ ایک قابل قدر اضافہ ہو گا اور اس سے پامسٹری کے طالب علم بہت کچھ سیکھ سکیں گے [illegible]۔

مولانا مودودی نے پہلے تو کچھ تامل کیا۔ لیکن پھر مان لیے سوچا کہ اس سے ایک طالب علم کی حوصلہ افزائی ہوگی خاموش سے ہو گئے۔ وقار صاحب جنہیں مودودی صاحب کی مزاج شناسی میں کافی ملکہ حاصل ہے ...

مولانا مودودی
کے ہاتھ کا اسکیچ



...ادب کا اشتد کیا کر پیش دیجئے۔

اب پہ تمثیلنا بھی اچھا خاصا ایک تناؤ شکار مسائل ہے لیکے انھوں ...لیے شاہ محمد صفا ہاتھوں پر سیاہی آلودہ ...ادہ ڈالنے جاتے ہیں ...ی صاحب کے گرد و پیش میں جس نفاست و پاکیزگی کا دور دورہ تھا اس ...ز نظر اس قسم کی زیادتی ایک ارتکاب گناہ سے یقیناً کم محسوس نہیں ...تی۔ مگر انھوں نے بکمال تحمل و بردباری اسے گوارا کیا۔

...سٹری پر بات چیت کے دوران میں، میں نے مودودی صاحب ...یا کہ ہر شعبہ کے ممتاز نمائندگان کے ہاتھوں کا مسلسل مطالعہ کرنے کے بعد ...ت کا تو میں بڑے شد و مد سے قائل ہو چکا ہوں کہ ہاتھ کی لکیریں ایک فرد ...ا دماغی رجحانات کی عکاس ہیں لیکن یہ بات بھی سراسر غلط نہیں ہے کہ ان ...نی حال و مستقبل کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے۔ پامسٹری کے ساتھ اپنے طویل ...ے دوران میں مجھے وقتاً فوقتاً ایسے مشاہدات بھی ہوتے رہتے ہیں جن سے ...ہوتا ہے کہ ہاتھ کی یہ لکیریں اور علامات انسان کے ماضی حال مستقبل کے ...واقعات و حادثات کی بھی آئینہ دار ہیں۔ جن کا انسانی کردار سے کوئی تعلق ...اور یہ بات مجھے حیرت میں ڈال دیتی ہے اور اکثر سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ ...ری کا قسمت شناسی سے بھی کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے۔

مودودی صاحب نے فرمایا کہ ہاں ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے کچھ اس ...ی گنجائش ان لکیروں وغیرہ میں رکھدی ہو لیکن اس بارے میں کافی احتیاط ...م لینے کی ضرورت ہے۔ مزید فرمایا کہ جس حد تک ہاتھ کی ساخت اور ...ں علامات سے خدا داد صلاحیتوں کے ادراک کا تعلق ہے۔ یہ بات ذہن کو ...یل کرتی ہے۔ مثال کے طور پر انھوں نے بتایا کہ میرے ہاتھ کے بارے ...تے ہوئے آپ نے جو تین (ادبی۔ فکری۔ تنظیمی) صلاحیتوں کی... ...ت کی ہے۔ میں بھی جب اپنے طور پر اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کا تجزیہ ...وں تو مجھے بھی محسوس ہوتا ہے کہ یہ تینوں صلاحیتیں مجھ میں موجود ...

...یک سوال کے جواب میں میں نے مودودی صاحب کو بتایا کہ فنی ...ہ کے نقطہ نگاہ سے پامسٹری بہت مفید خدمات کا انجام دے سکتی ...س کی مدد سے سکولوں اور کالجوں میں تعلیم پانے والی نئی پود کی استعداد ...نلنہ نگاہ پر طالبعلم کو یہ مشورہ دیا جا سکتا ہے کہ فطرت نے اسے

کس پیشہ یا شعبہ حیات میں ترقی کرنے کی صلاحیت عطا کی ہے۔ علاوہ ازیں پامسٹری پولیس شعبہ تحقیق و تفتیش جرائم میں گرانقدر خدمات بجا لا سکتی ہے۔ اس کی مدد سے مجرموں کی شناخت، انکے ذہنی تجزیہ اور ان کے ...وغیرہ کے سلسلے میں نہایت قیمتی انکشافات ہو سکتے ہیں اور اس سلسلے میں میں نے انھیں بتایا کہ انگلینڈ کی مشہور پولیس درسگاہ اسکاٹ لینڈ یارڈ میں جرم رسانی کے ماہرین کو جہاں نفسیات اور دیگر علوم کی تعلیم دی جاتی ہے وہاں پامسٹری کو بھی ایک لازمی علم کی حیثیت سے سکھایا جاتا ہے۔

مولانا کے اس سوال کے جواب میں کہ میں نے آج تک کن کن اہم شخصیتوں کے ہاتھوں کا مطالعہ کیا ہے۔ میں نے بتایا کہ میں نے آج تک سیاسی لیڈروں میں سے قائداعظم۔ مس فاطمہ جناح۔ حسین شہید سہروردی۔ نواب ممدوٹ۔ چوہدری غلام عباس۔ اللہ بخش سومرو۔ لونگو۔ ادیبوں اور صحافیوں میں سے حمید نظامی۔ شورش کاشمیری۔ م۔ ش۔ مولانا ظفر علی خان۔ صوفی غلام تبسم مصطفیٰ۔ احمد ندیم قاسمی۔ منٹو وغیرہ کے ہاتھ دیکھے ہیں۔

اس موقعہ پر مولانا نے خاص طور پر قائداعظم۔ سہروردی صاحب اور مولانا ظفر علی صاحب کے بارے میں دریافت فرمایا کہ ان کے ہاتھوں پر کیسی علامات تھیں۔ اور میرے دلچسپ جواب پر بڑے محظوظ ہوتے رہے اور پھر دفعتاً پوچھا۔ کیا آپ نے علامہ مشرقی صاحب کا بھی ہاتھ دیکھا ہے؟

میں نے عرض کیا کہ میری بیحد خواہش کے باوجود ابھی ان تک رسائی نہیں ہو سکی جب کبھی لاہور آنے کا اتفاق ہوا وہ یا تو بیمار تھے یا باہر ——— البتہ جب کبھی موقعہ ملا ان کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کروں گا۔

پھر کچھ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد مولانا نے اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز میں فرمایا کہ انسانی نفسیات و کردار کا مطالعہ ایک بڑا دلچسپ مطالعہ ہے مجھے بھی اس کا ذوق ہے۔ آپ تو اس کا مطالعہ لوگوں کے ہاتھوں کی لکیروں سے کرتے ہیں۔ مگر میں انکے ہاتھوں کی تحریروں سے کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ ایک شخص کی تحریر، طرز بیان اور مفہوم دونوں کے مطالعے سے نہ صرف اس کی ذہنی صلاحیت بلکہ اخلاقی حیثیت کو بھی ظاہر کرتی ...

ہے اس کے کردار ۔ افعال معاملات و خصائل کی بھی آئینہ دار ہوتی ہے میں نے اکثر سیاسی لیڈروں اور ادیبوں کو شخصی ملاقات کے بغیر محض ان کی تحریروں سے (خواہ وہ خطوط یا ایک پیراگراف ہی کی حد تک کیوں نہ ہو) نہایت صحت کے ساتھ سمجھا ہے اور میرا اندازہ بفضل خدا کبھی غلط ثابت نہیں ہوا مودودی صاحب غالباً انہی دنوں ڈاکٹر غلام جیلانی برق صاحب کی تازہ تصنیف "ایک اسلام" کا مطالعہ فرما رہے تھے، اس لئے بات قدرتی طور پر برق صاحب تک جا پہنچی۔

برق صاحب کے ذکر خیر کے بعد ملک کے صحافیوں کا تذکرہ جو چل نکلا تو مولانا نے فرمایا کبھی اس ملک کے صحافیوں کا بھی جائزہ لیجئے گا۔

میں نے عرض کیا مجھے آج تک صرف پانچ سات صحافیوں کے اتھ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ان میں سے دو تین صحافیوں کے ہاتھ تو فی الواقعی صحافتی عظمت کے آئینہ دار ہیں۔ لیکن ایک صحافی کا ہاتھ زیادہ تر قماربازوں کے ہاتھ سے ملتا جلتا ہے اور جب میں نے مولانا کو ان کا نام بتایا تو وہ مسکرائے اور فرمایا، ہاں اس سے بڑھکر قماربازی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک شخص ہر موقعہ پر قوم کے اعلیٰ مفاد کو داؤں پر لگاتا آیا ہو۔ اختتام گفتگو کے طور پر مولانا نے مجھے مشورہ دیا کہ پاکستان کی اہم شخصیتوں کے ہاتھوں کے مطالعہ کا سلسلہ جو میں نے شروع کر رکھا ہے اسے جاری رہنا چاہئے اس سے فی الواقعہ ان کے سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ اس تمام گفتگو کے دوران میں خاصی ذہنی لذت کے باوجود مجھے شدید طور پر اس بات کا احساس ہوتا رہا کہ ہم مودودی صاحب کا قیمتی وقت نہایت بے دردی سے صرف کر رہے ہیں۔

لاہور کے چند روزہ قیام کے دوران میں مودودی صاحب کے پرنٹس کا مطالعہ نہ کیا جا سکا۔ ادھر "ڈائرکٹ ایکشن" سے حالات دن بدن بگڑتے جا رہے تھے۔ واپسی پر اطمینان کے ساتھ ایک روز جب پرنٹس پر نظر ڈالی تو میں نے محسوس کیا کہ میری ریڈنگ نامکمل تھی۔ بہت سی ایسی علامات نظر آئیں جنہیں پہلی مختصر سی ملاقات میں نوٹ نہ کیا جا سکا۔ مودودی صاحب کے ہاتھ کے بارے میں مجھے جو ہو سکتا تھا تو بتلایا جا سکا کہ ان کی زندگی میں قدرت سے خطرناک تصادم کے امکانات ہیں لیکن وقت کا تعین نہ کیا جا سکا۔ اب جو مودودی صاحب کے ہاتھ کے پرنٹس کو سامنے رکھ کر حساب لگایا تو میں پچاس برس کے لگ بھگ ایک خطرناک علامت کو ... قسمت کی لکیر کو منقطع کرتے ہوئے پایا۔ اس سے جو میں نے نتیجہ نکالا وہ یہ تھا کہ مودودی صاحب کو ان دنوں پھر کسی خطرے کا سامنا ہے۔

چنانچہ مارشل لا کے ایام میں جب مودودی صاحب ابھی گرفتار نہیں ہوئے تھے تو کئی بار خیال آیا کہ انہیں خط لکھ کر اس بارے میں مطلع کیا جائے لیکن پھر اس خوف سے کہ سنسر سے کہیں دوران میں پوسٹ صاحب خواہ مخواہ کہیں دھر نہ لئے جائیں۔ احتیاط برتی۔ اس تمام عرصہ میں میرے کان مودودی صاحب کے بارے میں کسی بری خبر پر برابر لگے رہے۔ بالآخر جب روز ریڈیو پر یہ خبر سنی کہ مودودی صاحب گرفتار کر لئے گئے ہیں تو میرے خبر قطعاً غیر متوقع نہ تھی۔

اس واقعہ کے چند ماہ بعد جب مودودی صاحب کی سزا کی خبر میں نے اخبارات میں پڑھی تو یہ میرے لئے بھی اتنی ہی غیر متوقع تھی کہ دوسروں کے لئے۔ میں نے یہ خبر لائلپور سے لاہور جاتے ہوئے ایک سفر میں پڑھی۔ میرے سامنے فرنٹ سیٹ پر ایک صاحب شکل و صورت سے جماعت اسلامی کے کارکن ہونے کا گمان ہوتا تھا فرما تھے۔ ان کی حرکات و سکنات سے اضطراب و پریشانی کا اظہار میں سمجھا کہ کسی قریبی عزیز کا کوئی صدمہ پیش آیا ہے۔ دریافت کرنے پر کچھ بجائے انھوں نے اخبار اٹھا کر میرے ہاتھ میں دیدیا۔ پہلے صفحہ پر نظر دوڑائی مجھے اپنے رفیق سفر کی پریشانی کا علم ہو گیا اور لوگوں کو معلوم یہ خبر سن کر کیا مگر مجھے تو وہی سوجھا جو سوجھنا چاہئے تھا۔

عرصہ ایک ڈیڑھ سال کا ذکر ہے کہ کیمبل پور سے راولپنڈی سفر کر رہا تھا کہ ایک بچہ سڑک عبور کرتے ہوئے بس سے ٹکر کھا کر گر پڑا اور بیہوش ہو گیا اور لوگ تو اسے پانی پلانے اور ہوش میں لانے کی فکر میں تھے مگر میں اس کے دونوں ہاتھوں کی لکیریں دیکھنے کی فکر میں تھا کہ آیا یہ حادثہ مہلک تو نہیں۔ اگر ہوگا تو وہ کون سی علامت ہے جو ہلاکت ظاہر کرتی ہیں۔

اپنی اس حرکت پر جب کبھی بھی سوچتا ہوں تو بے ساختہ ہنسی آتی ہے۔ مگر نامعلوم یہ تجسس کا جذبہ بھی کیا جذبہ ہے۔ اس لئے تو یہ سن کر افسوس ہوا کہ مودودی صاحب کی سزا

...ساتھیوں کے ہاتھ کی لکیر کا پتہ تفاقاً بے ساختہ بیگ
...تا۔ آہستہ سے بیگ کھولا۔ پڑھنے پر جاتا۔ پہلے کئی ہی علامت کے
...گوشے پر نظر ڈالی۔ کہیں پھانسی کی علامت نظر نہ آئی۔ عمر کی لکیر بھی
...خطعوں اور اشتوں پر سالم تھی۔

...فی سرسری تعارف پر معلوم ہوا کہ جماعت اسلامی لائلپور کے صدر
...عبدالحمید بی۔ ایس۔ سی۔ بی ٹی ہیں سوال کیا کہ آپ سمجھتے ہیں کہ مودودی
...کو پھانسی دیدی جائیگی۔ ان کا جواب مایوس کن تھا۔ میں نے عرض کیا
...کم از کم ایسا نہیں سمجھتا۔ عبدالحمید صاحب نے میرے ایسا سمجھنے کی دلیل
...کی۔ انہیں توقع تھی کہ شاید میں اپنے اس خیال کی تائید میں کوئی سیاسی
...پیش کروں گا۔ لیکن بھلا ایک پامسٹ کو سیاست سے بھلا کیا غرض وہ تو
...فقیر ہے۔ میں نے کہا میری بیڈنگ علم پامسٹری کی رو سے ہے۔ عبدالحمید
...میری اس بات کو کسی منطق کو خالی پانہ سکے۔ اس لئے انہیں کچھ حیرت سی۔
...لیکن میں نے جب انہیں اپنے بارے میں بتایا تو خود پوچھا اچھا آپ نے تو
...کا ہاتھ بھی دیکھا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ جی ہاں۔ لیکن اس میں تو کوئی
...علامت دکھائی نہیں دیتی۔ ویسے اللہ بہتر جانتا ہے۔

لاہور پہونچے تو اس دن ـــــــــ ہر جگہ کا موضوع گفتگو۔
...دی صاحب کی سزا تھی۔ میرا جانا جس جگہ بھی ہوا۔ میری جان پہچان
...لے لوگوں نے مجھ سے یہی سوال کیا۔ سنائیے صاحب آپ نے مودودی
...حب کا ہاتھ بھی دیکھا تھا۔ اس میں کہیں پھانسی وغیرہ کی علامت بھی
...تھی۔ میرا جواب ہر جگہ یہی ہوتا تھا کہ علامت تو کوئی ایسی نہیں لیکن خدا
...جانتا ہے۔

اس روئیداد کے بعد آیئے اب ہم ایک بار ان کے پرنٹ کی...
...میں مودودی صاحب کے ہاتھ کا تجزیہ کریں۔ حسب ذیل علامات نقوش
...قابل غور ہیں۔

۱۔ مریخ تحت الحمل ـــــــــ کسی مخصوص و مقرر ہ
...ل اور ضابطہ کے تحت زندگی بسر کرنے والے آئین پسند اور ضعدار
...ان کی علامت جو سیاست کی طرح مذہبی پابندیوں پر کاربند رہتے اور غیر
...ضروری خیال آرائیوں میں وقت صرف نہیں کرتا۔
۲۔ ... ـــــــــ

مزاج میں شعریت کا فقدان ہونے کے علاوہ مشقت پسند اور محنت
طلب طبیعت کی مظہر!

سیدھی انگلیاں، جن کے جوڑ گٹھیلے اور سرے چپٹے ہیں۔ قوت تنقید
تجزیہ کے ساتھ قوت ایجاد و اختراع۔ جدت طرازی اور صنعت پسندی کی صفات
کی مظہر!

۴۔ دو برابر پوروں میں بٹا ہوا مضبوط انگوٹھا ـــــــــ قوت
منطق۔ قوت فیصلہ۔ اور قوت ارادی میں پہلے پہل ہم آہنگی ایسے لوگوں میں
فیصلہ کر لینے اس پر مضبوطی سے ڈٹ جانے اور متوقع نتائج حاصل کرنے کی
بے اندازہ صلاحیت ہوتی ہے۔

۵۔ دماغی لکیر، اختتام پر تین شاخہ ـــــــــ ایک غیر معمولی
علامت جو بیک وقت تین مختلف قوتوں کے حاملین میں پائی جاتی ہے۔ یہ قوتیں
علمی جنگی اور تنظیمی میدان میں اکثر ظہور پذیر ہوتی ہیں۔

۶۔ دماغی لکیر ـــــــــ مقام آغاز پر خط حیات سے قطعی علیحدہ
کسی مرکز سے وابستہ ہونے یا کسی مقصد کا پابند ہونے کی
علامت، اس کے علاوہ یہ علامت (جیسا کہ دماغی لکیر پر بحث کے مطالعہ سے
واضح ہوگا) ایک آزاد منش اور بے قید طبع کے مقابلہ میں ایک فکر مند محتاط
اور حساس طبع کے انسان کی بھی علامت ہے۔

۷۔ دو شاخہ دل کی لکیر جس کی ایک شاخ کا آغاز پہلی اور دوسری
انگلی سے ہوتا ہے اور دوسری کا آغاز مشتری کے ابھار سے ـــــــــ
ایک غیر جذباتی، معتدل مزاج متوازن طبع انسان، جو اپنے عزائم اور مقاصد کو
حاصل کرنے میں عجلت، جذباتیت بے تدبیری سے کام نہیں لیتا۔ بلکہ ایک سوچی
سمجھی اسکیم کے تحت کام کرتا ہے۔ "اندلوی عشق" میں بے صبری کا مظاہرہ
نہیں کرتا۔

۸۔ دل اور دماغ کی لکیروں کے درمیان مناسب فاصلہ اس بات کا
مظہر ہے کہ دل اور دماغ اپنے اپنے مقام پر مناسب طور پر کام کرتے ہیں اور ایک
دوسرے سے بہت کم الجھتے ہیں۔

۹۔ مریخ مثبت و مریخ منفی کے دونوں ابھار نمایاں شجاعت،
ہمت، جرأت دلیری کے مظہر ـــــــــ یہ صفات خود مودودی صاحب کے ہاتھ
... کے ہاتھ میں پائی جاتی ہیں۔ اس قسم کے لوگ ...

[illegible] کے ساتھ [illegible] ہیں۔

۱۰۔ [illegible] ہوئی لکیریں ——
[illegible]
[illegible]

مگر [illegible] پامسٹری کی رو سے مودودی صاحب
کی [illegible] ہے جو قسمت کے
[illegible] ہیں۔ ان [illegible] کے ترکیبی عناصر کو ہم قطعی طور پر سامنے
رکھتے ہوئے یہ بھی [illegible] کہ مودودی صاحب ایک غیر معمولی
شخصیت و حوصلہ کے انسان ہیں اور [illegible] کے مالک ہیں۔ ایک
[illegible] پیدا کر لیتے ہیں۔ بشرطیکہ ماحول [illegible]
[illegible] ہے۔

لیکن علم پامسٹری صرف صلاحیتوں ہی کا جائزہ نہیں لیتی بلکہ
ان نتائج [illegible] پیدا کرتی ہے جو ایک فرد کے ماحول کے ساتھ [illegible]
آنا ہونے کے بعد ظہور میں آتے ہیں اور جنہیں ہم دوسرے لفظوں میں قسمت
کے نام سے پکار سکتے ہیں۔ اس لئے آئیے ہم مودودی صاحب کے ہاتھ سے
ان [illegible] کریں۔ جو ان نتائج قسمت کو پیش کرتی ہیں۔

مودودی صاحب کے دائیں ہاتھ پر قسمت کی لکیروں کی روئیداد حسب
ذیل ہے۔!

۱۔ قسمت کی لکیر آغاز سے [illegible] واضح اور بعد میں واضح اور روشن
لیکن [illegible] کی لکیر کے ساتھ بگڑی ہوئی —— شروع شروع میں ناموافق..
معاشی ماحول کا سامنا اور پھر ذاتی محنت اور کوشش سے حالات سدھارنے
کی مظہر۔

۲۔ مریخ مثبت کی جانب سے عمر اور قسمت کی لکیروں کو قطع کرتی
ہوئی "مخالف لکیریں"

مخالف عناصر کی جانب سے متعدد پیدا کی گئیں رکاوٹیں جو اگر
عمر اور قسمت کی لکیروں کو کمزور اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیں تو رکاوٹیں تباہ کن
ہوتی ہیں [illegible] رکاوٹوں کو [illegible] کی علامت

[illegible] قسمت [illegible] ذہنی
[illegible]

[illegible] لکیروں کو قطع کرتی ہیں [illegible] مخالف لکیر
تقریباً ۲۸ برس —— ۴۰ برس [illegible] کو قطع
[illegible] اس مقام سے [illegible] جہاں سے "مخالف لکیر"
قسمت کی لکیر کو قطع کرتی ہیں، مخالف عناصر کی طرف سے پیدا کی گئی
رکاوٹیں یہ دل۔ دماغ۔ صحت۔ [illegible] کامیابی پر کسی نہ کسی طرح اثرا
ہیں۔

نوٹ: یہ مخالف لکیر ۲۸ برس کے قریب قسمت کی
جو مقابلتاً مودودی صاحب کی پہلی نظر بندی کی مظہر ہے جو پچاس
قریب [illegible] کرتی ہے مقابلتاً اس موجودہ نظر بندی کی مظہر ہے۔ لیکن
آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ ان پہلی "مخالف لکیروں" سے قسمت عمر۔ دل
کی لکیروں میں نہ تو کوئی ضعف پیدا ہوا ہے اور نہ کوئی شکست ——
جہاں یہ قسمی لکیر کو کاٹتی ہیں۔ وہاں ایک بڑا سا جزیرہ بن جاتا ہے
اندازہ ہوتا ہے کہ یہ "مخالف لکیریں" کامیابی کی راہ میں ضرور حائل ہوئی
بھی جزیرہ ہاتھ کی کسی بھی لکیر پر کسی اچھی علامت کا مظہر تصور نہیں کیا
تیسری مخالف لکیر قسمت کی لکیر کو اس وقت منقطع کرتی ہے۔ جب
دل کی لکیر سے آ کر ملتی ہے۔ یہ کسی تیسری بڑی رکاوٹ کی آئینہ دار ہے
اندازاً تقریباً ۵۶ برس کی عمر کے لگ بھگ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد
دیکھا جا سکتا ہے۔ قسمت کی [illegible] لائن یک لخت ختم ہو جاتی ہے۔ یہ
طور پر بڑا مشکل ہے کہ یہ کیفیت کس واقعہ کی مظہر ہے۔ میرے
ایسی علامت یقیناً خطرناک تصور کی جاتی ہے۔ مگر کچھ فاصلے پر ایک
کی لکیر دل کے ابھار پر دکھائی دیتی۔ [illegible] حالات کا
[illegible] کو علم ہے مگر میری پیشگوئی ہے کہ اگر مودودی صاحب
سے بچ کر عافیت گذر گئے تو دنیا کی کوئی طاقت ایسی نہیں جس کو دوبارہ

مودودی صاحب کے ہاتھ پر چند [illegible] علامات
۱۔ مریخ منفی کے ابھار پر [illegible] ذہنی
کا مظہر [illegible]
۲۔ [illegible] مشتری کے ابھار کی طرف
ہوئی —— [illegible] کی علامت
۳۔ قسمی لکیر [illegible]
[illegible]

[illegible] •

دو راہیں

بحر دنگی کی اس منزل پر پہنچ چکا تھا جب عنقریب اس کا دامن ایک رفیق سے بندھنے والا تھا ——— اس کی آئندہ ساری زندگی کا رفیق جیا اس کے والدین کی پیچھے برپا حسن اور اس کی اتی کی تجسس نگاہیں شمیم اور خالد پر مرکوز ہو گئی تھیں۔

تجمہ کے ذہن میں اس کے سامنے وجود پر صرف دو نقوش ابھر گئے تھے ——— شمیم اور خالد ——— خالد اور شمیم!

شمیم ایک خوش رو، تندرست اور تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ ایم اے کے آخری سال کا طالب علم ایک دولت مند گھرانے کا چشم و چراغ، تہذیب جدید سے متاثر ہونے کے باوجود اس کا کردار کالج کے دوسرے طلباء میں امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ دوسرے مغرب زدہ لڑکوں کی طرح آزادی کے دھارے میں بہا نہیں جا رہا تھا۔

خالد بھی جوان سال تھا لیکن زندگی کی شاہراہ پر پہلے ہی روز گار والدین کا سایہ اٹھ چکا تھا۔ صرف ایک بہن زندہ تھی جس کی ذات میں والدین کی ساری محبتیں اور شفقتیں مرکوز ہو کر رہ گئی تھیں۔ بی اے میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اس کی ذہانت، علمی لیاقت اور محنت کشی اس کے تمام امتحانات کی ضامن تھی۔ اسکول کی زندگی سے کر کالج کی جماعتوں تک یکساں ممتاز حیثیت کا حامل تھا۔ اس کے تعلیمی کیریر سے متاثر ہو کر اہل نظر اس کی قدر کرتے اور [illegible] سے مزین ہونے کے علاوہ ایک بہترین کردار کا حامل تھا۔ یوں تو جدید تہذیب سے متاثر کالج کے نوجوانوں نے اس کے کردار میں کوئی خاص کشش اور جاذبیت دیکھی لیکن ایک [illegible] اور حقیقت تھی کہ اپنے عمدہ اخلاق و کردار کی وجہ سے اس کے تمام [illegible] اس کے گرویدہ تھے۔

اس نے شمیم کو [illegible] دیکھا تو [illegible] لیکن اس کے ذہن کے پردوں [illegible] ——— [illegible] میں اس [illegible] شمیم [illegible] خالد

پھر دونوں ہیولے تیزی سے بنتے اور مٹنے لگے۔ ایک کے بعد دوسرے اسی تیزی کے ساتھ ایک دوسرے سے مل جاتے۔ اور وہ کچھ فیصلہ نہ کر سکی ——— شمیم یا خالد ——— خالد یا شمیم ———!

شمیم کو وہ اپنا رفیق حیات بنا لیتی اس لئے کہ وہ ایک دولت مند باپ کا لڑکا تھا، جدید تہذیب اور اعلیٰ تعلیم کے زیور سے مزین [illegible] لیکن خالد کے کردار میں بھی وہ ایسی جاذبیت محسوس کرتی کہ اسے [illegible] ثانی کی ضرورت محسوس ہوتی۔ وہ بھی ایک تعلیم یافتہ لڑکی تھی لیکن سنجیدہ اور دور اندیش بھی، اس کی یہ خواہش تھی کہ اپنا رفیق حیات [illegible] کو بنائے جس پر وہ پورا پورا اعتماد کر سکے۔ [illegible] اس کی [illegible] پر دیئے۔ شمیم کے کردار میں [illegible] پہلے بھی اس نے دیکھا تھا۔ خالد سے بھی [illegible] بھی ——— خالد ذہین اور خلیق، پاک دامن [illegible] اس نے معتبر اور فرض شناس ہے خالد بھی [illegible] ——— [illegible] وہ خود مطمئن ہو جاتی [illegible]۔

اسی ادھیڑ بن میں اس [illegible] لیکن وہ [illegible] ذکر بھی اور دوسرے [illegible] لیکن ماں کے [illegible] صرف ماں اس کے سامنے [illegible] ماں سے گفتگو کرنے میں شرم [illegible] اور جھجک محسوس کرتے ہوئے جب [illegible] اپنی ذات اور [illegible] ماں سے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

رہی کہ وہ شمیم سے شادی کرے۔ اس نے ماں کو جواب دیا کہ وہ فیصلہ غیر جانب دار ہو کر کرنا چاہتی ہے۔

"میں ایک اچھے انسان کو فرض شناس اور حسب موقع اپنی محبوب اور پسندیدہ چیزوں کو قربان کر کے حق اور فرض کے تقاضے پورا کرنے والا دیکھنا چاہتی ہوں۔ یہ میرے نزدیک اچھے اور قابلِ اعتبار کردار کی بہترین کسوٹی ہے!" مجبے نے اظہار خیال کیا۔

ماں کہنے لگی بیٹی کی دو ٹوک اور مدلل باتوں کو ماننے بغیر کوئی چارہ نہ رہا۔ اس نے بیٹی کے ارادے سے اس کے باپ پروفیسر حامد حسن کو آگاہ کر دیا۔

ماں سے جدا ہو کر جب وہ اپنے کمرے میں پہنچی تو سب سے پہلے اس نے نرم تولیے سے پسینہ پونچھا۔ "اف! برقی پنکھے کی ہوا کے باوجود میں بات کرنے میں پسینے سے کس قدر شرابور ہو گئی ہوں؟" اس نے ہلکے لہجے میں کہا

پروفیسر صاحب اپنے کمرے میں بیٹھے تھے اور سوچ رہے تھے۔ "میری بیٹی کتنی لائق اور دور اندیش ہے!" اور اس پر دل ہی دل میں مسرور ہو رہے تھے اتنے میں وہ قلم کاغذ اٹھا کر لکھنے میں مشغول ہو گئے۔ انھوں نے اگلے روز شام کو شادی کے متعلق اپنی لڑکی سے انٹرویو کے لیے شمیم کو ایک دعوتی رقعہ لکھا اور شادی ہی کے متعلق ایک دعوت نامہ خالد کو بھی لکھا۔ لیکن دونوں کی تحریریں نمایاں فرق تھا۔ خالد کے رقعہ میں انٹرویو کا کوئی ذکر بھی نہ تھا دونوں کو ایک ہی وقت مغرب بعد سات بجے بلایا تھا پھر ایک پوسٹ کارڈ اٹھا کر خالد کے بہنوئی کی طرف سے اس کو ایک خط لکھا کہ تمہاری بہن جو عرصہ سے علیل تھیں۔ ان کی حالت بہت خراب ہو گئی ہے اس لیے جلد یہاں آجاؤ۔ ایک فارم اٹھا کر بالکل ڈاک خانہ والوں کے انداز میں ایک برقیہ شمیم کے نام تحریر کیا کہ تمہاری والدہ کی حالت یک بیک بہت خراب ہو گئی ہے۔ وہ تمہیں یاد کر رہی ہیں جلد سے جلد آنے کی کوشش کرو۔

صبح کا وقت تھا۔ شمیم و خالد دونوں اپنے اپنے مکان پر موجود تھے۔ ملازم دونوں کو دعوتی رقعے دے آیا۔ اس نے ان سے جواب بھی طلب کر لئے — شمیم نے لکھ دیا کہ میں وقت مقررہ پر حاضر ہوں گا۔ خالد نے بھی لکھ دیا انشاء اللہ حاضر خدمت ہوں گا۔ دو گھنٹے بعد پروفیسر صاحب کالج تشریف لے گئے۔ خالد کے نام لکھے ہوئے پوسٹ کارڈ پر وہ جعلی ٹکٹ چسپاں کر کے تھوڑی دیر میں ملازم نے اس کو ... کے ... ڈال دیا۔ ... شمیم کے ملازم کو بلا بھیجا

جب وہ آیا۔ تو اسے شمیم کے نام لکھا ہوا برقیہ دیتے ہوئے یہ سکھایا کہ شمیم آئے تو یہ کاغذ دینا اور اس سے کہنا کہ ڈاکیہ یہ تار دے گیا ہے۔ اگر دریافت کریں کہ اسے کس نے کھول کر نکالا — تو کہنا — "بابو جی ہم سن کر بہت پریشان ہو گئے تھے۔ اور جب یہ معلوم ہوا کہ آپ کے گھر سے تار آیا ہے تو ہم نے پڑوس میں ایک صاحب سے پڑھوا کر سنا۔ بابو جی اس میں لکھا ہے کہ آپ کی امی جان بہت بیمار ہیں اور آپ کو بلایا ہے۔؟"

شمیم کا ملازم بہت ہچکچا رہا تھا۔ کیونکہ وہ ایک دیانت دار تھا۔ اور جھوٹ بول کر اپنے مالک کو پریشان کرنا اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ پروفیسر صاحب نے اسے سمجھایا کہ یہ بات ایک مصلحت کی بنا پر کی جا رہی ہے اس میں شمیم کا نقصان نہیں۔ اور وہ زیادہ دیر پریشان نہ ہوگا۔ جلد اصل حال سے آگاہ کر دیا جائے گا۔ ملازم پروفیسر صاحب سے دلفریب تمام بات سے مطمئن ہو گیا۔ اور چلا گیا۔

خالد جب کالج سے واپس ہوا تو اس کی نگاہ کارڈ پر پڑی۔ فوراً اسے اٹھایا اور پڑھنے لگا۔۔۔۔ خط پڑھ کر وہ مبہوت سا ہو گیا۔ اس کی بہن کا بیمار چہرہ اس کے تصور میں ابھر آیا۔ وہ مضطرب تھا۔ اور ایک کشمکش میں مبتلا تھا۔ ایک شدید الجھن — چالیس روپے۔۔۔۔ فائنل امتحان کی فیس پچیس ہی آخری تاریخ۔۔۔۔ آپا کے پاس چلا جاؤں۔۔۔۔ کانپور تک لمبا سفر۔۔۔۔ امتحان کی فیس۔۔۔۔ اف کیا کروں!"

اسے اپنی بہن بھی بہت عزیز تھی۔ اور اپنی ایک تعلیمی سال کی ... وہ چارپائی پر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ اور کوئی حل تلاش کرنے لگا ... میں اس کے کانوں میں مؤذن کی آواز پہنچی۔ اس نے دیکھا عصر کا وقت تھا۔ لیکن اس کے قدم حرکت میں نہیں آئے۔ آج وہ اپنے کو عصر کی نماز سے محروم ... حق بجانب سمجھ رہا تھا۔ اسے خیال آیا۔ "چلو اللہ میاں سے ہی معافی مانگ لیں گے —؟" لیکن پھر وہ یک بیک اٹھ بیٹھا۔ جیسے اس کے کان میں کسی نے کہا ہو — نماز تو پریشانی کے بجائے طمانیت حاصل کرنے میں بہترین مددگار ہوتی ہے؟ اور وہ مسجد کو چلا گیا۔ نماز کے بعد وہ ... قلب میں ... محسوس کر رہا تھا۔ وہ ... قدم بڑھاتا ہوا آیا۔ اور پھر چارپائی ... خیالات ... زندگی ...

رہے ...... ہماری زندگی ایک امتحان ہے ... آزمائش ..... ! آپا کی
زندگی اس امتحان سے زیادہ قیمتی ہے — !"

یہ فیصلہ تھا۔ اس کا آخری فیصلہ اس کے بعد اس کے لئے ایک مسئلہ یا
بلہ یہ بھی تھا کہ پہلی ٹرین سات بجکر بیس منٹ پر چھوٹتی ہے اور دوسری رات
تین بجے۔ سات ہی بجے پروفیسر صاحب کے وہاں بھی جانا تھا پھر خیالات
تیز رفتار سے آنے لگے۔

"وعدہ خلافی ہوگی ...... ماں سے مل لوں ...... لیکن بہت دیر ہو
جائے گی ...... پھر تین ہی بجے کی گاڑی سے جانا پڑے گا ...... آہ! تاخیر —!
معلوم آپا کی حالت کیسی ہو؟"

اس نے یہ طے کیا کہ پہلی ٹرین سے چلا جاؤں اور پروفیسر صاحب کو
کسی کے ہاتھ ایک خط بھیج دوں۔ میری مجبوریوں کو دیکھتے ہوئے وہ مجھے ضرور معاف
کر دیں گے۔ اور فیس کا بھی تذکرہ کر دوں۔ شاید وہ مجھے اتنے روپے بآسانی قرض
دے دیں گے۔ پروفیسر صاحب بہت نیک آدمی ہیں۔

شمیم جب کالج سے واپس ہوا تو اسے ملازم سے تار ملا۔ تار کی
عبارت پڑھکر وہ بہت گھبرایا۔ اس نے ملازم سے کچھ دریافت بھی نہیں کیا
خود ہی بولا۔

"نذیر! میری امی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ انھوں نے مجھے بلایا
ہے"

نذیر نے اس سے یہ بات سن کر کہا۔

"ہاں! بابو آپ ضرور جائیے۔ بہت جلدی کیجئے۔ کہئے تو میں آپ
کا سامان ٹھیک کر دوں ...؟"

لیکن شمیم نذیر کی باتوں کی طرف متوجہ نہیں رہا۔ وہ کسی دوسرے
خیال میں ڈوبا تھا۔ وہ کالج سے جب چلا تھا۔ تو بہت موڈ میں تھا۔ بلکہ کالج
کے اکثر گھنٹوں میں روز سے زیادہ بشاش تھا۔ وہ آج کے انٹرویو کے متعلق کتنا
مسرور تھا۔ اور کتنے سوال تھے بنا چکا تھا۔ پرچہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اور اس
کے بڑے میٹھے الفاظ [illegible] وہ مجسم ہوتے جاتے تھے۔ کہ جیسے وہ اس
تیار کردہ سوال [illegible] گے ...!

اس کے [illegible] آپا کی [illegible] حالت کا [illegible] کرتے
[illegible]

اس وقت کی معمولی سی کوتاہی ہو سکتا ہے کہ ایک ایسی غلطی کا پیش خیمہ بن
جائے۔ جس کے لئے اسے ساری زندگی افسوس کرنا پڑے۔ اس نے تار کی تحریر
کو دوبارہ پڑھا ...... حروف کی سیاہ لکیریں اس کی بوڑھی ماں کی تصویر میں
تبدیل ہو گئیں۔ پھر اس کے نقوش نمایاں تر ہو گئے۔ وہی کاغذ کا پرزہ اس کے
ہاتھ میں تھا ...... ٹیڑھے میڑھے حروف سے ایک اور ہیولیٰ بن رہا تھا یہ
نجمہ کا تصور تھا۔

کیا اس واقعہ کو ہاتھ سے جانے دوگے؟ پروفیسر حامد حسن کی لڑکی
—— انٹرویو ...؟

اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی یہ باتیں اس کے کان میں پھونک رہا
ہو۔ جیسے سنی ان سنی کر کے وہ سوچنے لگا۔ میں وعدہ کر چکا ہوں۔ ضروری
ہے۔ ماں کی طبیعت کوئی ایسی خراب تو نہیں ہو گئی ہوگی۔ ذرا دیر سے پہنچنے
میں کوئی حرج نہیں ...... ہاں ہاں میں پروفیسر صاحب کے یہاں ضرور
جاؤں گا۔ نجمہ مجسم انتظار بنی میری راہ دیکھتی ہوگی ...... شاید یہ ملاقات
ہماری محبت کا آغاز بنے ...... اگر میں نہ گیا تو وہ بدگمان ہو جائے گی۔
اور یہ میری وجہ سے ہوگا ...... اسے مغموم کر دینا کتنا بڑا ظلم ہوگا۔ نہیں
مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا" اس نے دوسرے دن جانے کا فیصلہ کر لیا۔

پروفیسر صاحب اپنے کارنامے کا نتیجہ معلوم کرنے کے لئے بے چین بیٹھے
انتظار کر رہے تھے۔ ان کو ایک لڑکے نے خالد کا رقعہ لا کر دیا۔ جسے پڑھ کر وہ
انھوں نے نجمہ کو بھیج دیا۔ اسٹیشن پر پروفیسر صاحب کے آدمی موجود تھے۔ نجمہ
نے فون پر ان سے کہہ دیا کہ خالد کو یہ کہہ کر روک لو کہ اس کی بہن کی علالت کا
خط فرضی تھا۔ چند منٹ بعد گھڑیال نے ٹن ٹن سات گھنٹیاں بجائیں ...... اور
گھنٹیوں کے درمیان شمیم کی موٹر سائیکل پھٹپھٹاتی ہوئی پروفیسر کے مکان پر
رکی۔ شمیم بہترین سوٹ میں ملبوس پروفیسر کے سامنے حاضر تھا۔ اس کے ہونٹوں
پر ایک لطیف مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

پروفیسر کے آدمی خالد کو لے کر اس وقت مکان پر پہنچے جب شمیم
وہاں سے جا چکا تھا۔

نجمہ نے خالد کو اپنا رفیق حیات منتخب کر لیا تھا۔

(معیار)

حیدری

طالب حبیبی

عشق و یقین

خرد کی جستجو سے ہوتی ہے آخر خبر پیدا
بہ فیضِ عشق دل میں ہوتا ہے ذوقِ نظر پیدا

تمنائے محبت ہے تو کر سوزِ جگر پیدا
فغانِ نیم شب میں آہِ دل سے کر اثر پیدا

ہو ر درد کے گلشن میں بہارِ تازہ کر پیدا
گلوں میں رنگ کر پیدا چمن میں برگ و بر پیدا

رخِ ملت پہ سرخی زندگی کی پھر جھلکتی ہے
کیا احساسِ عرفاں کس نے ہے "بارِ دگر" پیدا

فرنگی سازشوں کو وہ نگاہیں بھانپ لیتی ہیں
کیا ہے تو نے جن میں اے خدا نورِ بصر پیدا

تجھے محبوبؐ کی امت کی "اسلامی ریاست" میں
فرنگی کی نبوت کر رہی ہے بال و پر پیدا

نبیؐ کا عشق قرآں ہے۔ نبیؐ کا عشق ایماں ہے
اسی سے ہے خبر پیدا۔ اسی سے ہے نظر پیدا

یقین و عشق کی مستی سمجھ میں آ نہیں سکتی!
یہ وہ شے ہے کہ جس کا دل میں ہوتا ہی اثر پیدا

کہیں سے ڈھونڈھ وہ دل جو فدا ہو نامِ حضرتؐ پر
جو کٹ جائے وقارِ مصطفےٰ پر کر وہ سر پیدا

شہیدوں کے لہو کی تابناکی رنگ لائے گی!
جو ملتانیؓ جوانوں کا سا ہو ہم میں جگر پیدا

فرنگی کی خباثت ارضِ پاکستان پر کیوں ہو؟
دیارِ امن میں کیوں ہوں شریر و فتنہ گر پیدا

تسلط کفر کا دنیا کے نقشے سے مٹا دوں گا
مرے سینے میں کر دے اے خدا قلبِ عمرؓ پیدا

کروں گا ختم باطل کی فسوں کاری زمانے سے
اگر ہوں ملتِ اسلامیہ میں حیدر و در پیدا

اندھیرا ظلم کا چھٹ جائے جس کی تابناکی سے
دیارِ پاک میں دینِ نبیؐ کی ہو سحر پیدا

یہ جوشِ و مستی موجوں کی نظر والوں سے کہتی ہے
"خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا"

جو تیری ہی رضا کو مقصدِ ہستی سمجھتے ہیں
الٰہی کر دے ان کی کوششوں میں بر گ و بر پیدا

عطا کر طالبِ کم گو کو مولا تابِ گویائی
بنامِ مصطفےٰ اشعار میں کر دے اثر پیدا

خزاں کے بعد

ریلوے اسٹیشن کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے جلال الدین سوچ رہا تھا: "زندگی جیسے ملی ہے کہیں زیادہ پاکیزہ اور اس سے زیادہ دلکش بن جانا چاہیئے تھا اسے۔ موت سے زیادہ بھیانک اور غلامی سے زیادہ مظلوم بن گئی ہے۔ ایسی زندگی گذارنے سے اب کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ ریلوے لائن قریب ہوتی جا رہی ہے۔ گاڑی آئے گی۔ اور یہ کھولتا ہوا ذہن ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائے گا ——— " ——— کل تمام دن وہ گھر ہی پڑا رہا تھا۔ صبح اسے حرارت محسوس ہوئی تھی۔ اور اپنی نبض ٹٹول کر اسے یقین ہو گیا تھا کہ اسے بخار ہو گیا ہے۔ دوپہر کو اس کا بدن تپنے لگا۔ کمبل کو اچھی طرح لپیٹے گردیپ کر وہ اکڑوں بیٹھا اپنے منہ بسورتے ہوئے لڑکوں کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ فیس ادا نہ کرنے کی وجہ سے جن کا اسکول میں داخلہ بند ہو گیا تھا۔ اور اب گھر میں ہی سسک رہے تھے۔ شام کو تیسرے والے بچے ہی کی کا بخار کم ہو گیا تھا۔ لیکن شدت سے چھپڑ کی طرف دیکھ کر وہ دعا مانگنے لگا تھا کہ بخار تیز ہو جائے۔ اور وہ ایک دم ہی تڑپ کر ٹھنڈا ہو جائے ——— سے اب سپورٹس کے کارخانوں کے دروازوں پر بھٹکتے ہوئے بیماری تنا او کے ذہن کی کوئی امید نہ رہی تھی۔ بہت مدت سے وہ امیدوں کے رنگ محلوں میں اپنے آپ کو بہلا رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ [illegible] کے بعد جب آزادی کی صبح طلوع ہو گی ——— اور دور وہ انقلاب کی طرح [illegible] ہوئی غلامی کے نقوش مٹ جائیں گے۔ تو اس کے دیس کی [illegible] خوشبوؤں سے معمور ہو جائے گی۔ کوئی بھی کسی کا حق نہ مار سکے گا۔ [illegible] سکے گا۔ کارخانے [illegible] کسی کی محتاجی سے آزاد ہو کر محنت مزدوروں کی محنت [illegible] اضافہ کر دیں گے ——— اپنے بچوں کو تعلیم [illegible] دم توڑنا پڑے گا [illegible]

کی حالت خراب ہو رہی تھی ——— رہی سہی دکانیں بھی بند ہو رہی تھیں۔ اور تجارتی پالیسیاں ہونٹوں پہ ناچ ناچ کر کاغذوں کے مزاروں میں دفن ہو جاتی تھیں ——— جلال الدین اب آہستہ آہستہ مایوس ہوتا جا رہا تھا۔ تھوڑا بہت اثاثہ جو اس نے بچا کر رکھا تھا ختم ہو گیا تھا۔ اور بیوی کے زیور بیچنے کی نوبت آ گئی تھی ——— کل کا دن تو اس کے لئے بہت ہی سخت تھا۔ موت کی آوازیں لگاتے ہوئے اس کی بیچ نڈھال ہو گئی تھی۔ اور منشا اپنی لہاسرت بھری نظروں سے اسے تکتا رہا تھا۔ اس کی بیوی نے شام کے وقت پتیل کی چھوٹی سی پرانی پتیلی کے عوض بیچتے ہوئے چنے خریدے تھے۔ اور لڑکوں کی بھوک کچھ مٹا لی گئی تھی۔ کٹورے میں بچے ڈال کر اس نے جلال الدین کو بھی دیئے تھے۔ کٹورا اس کے سرہانے پڑا ہوا تھا۔ لیکن چنے کھانے کو اس کا جی نہ چاہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب خود کو کسی نئی غلط فہمی میں مبتلا کر لینا چاہیئے جیسے کسی اور کے کام تو آ سکتے تھے۔ لیکن اس کی نظروں میں اب ان کی کوئی وقعت نہ رہی تھی۔ بہت رات گئے تک وہ جاگتا رہا۔ اور اس دنیا سے نامعلوم دنیا کے ارادے کے [illegible] تانا بانا بنتا رہا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے [illegible] تھے [illegible] لیتے ہوئے اس کے وجود کھوتے لگے تھے۔ اس کی آنکھ لگ گئی۔ خواب میں بھی وہ خود کو بھوک کی گھناؤنی گرفت میں دیکھنے لگا تھا۔ اس نے تڑپ تڑپ کر خود کو اس گرفت سے آزاد کرنا چاہا۔ اس کے اعضا شل ہو گئے ——— اس کی آنکھیں کھل گئیں [illegible] کی تہہ میں اس کی کرچیاں [illegible] سے آنکھیں کھول دی تھیں ——— [illegible]

حسن کراس نے کمبل میں سے سر باہر نکال کر دیکھا۔ اس کی بیوی دور رکھے
کے قریب بیٹھی وضو کر رہی تھی۔ اور چاندنی اس کے پاس بکھر سی
رہی تھی۔ صبح ہو گئی ہے۔ اور بیوی کی مہک گونج رہی چھت کے ساتھ
گاڑی میں خودکشی نہیں کر سکوں گا۔ اور پھر گھر میں کوئی رستہ بھی تو نہیں ہے ——
تو پھر بھاگ جاؤں —— ہاں یہ ٹھیک ہے۔ لیکن اگر وہاں سے بھی بھگا دیا گیا
تو پھر یہ دکھ بہت اذیت ناک ہو گا —— ۔ اچانک اس کی آنکھوں میں
ریل گاڑی کے پہیے گھومنے لگے۔ اور اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
یہ ٹھیک رہے گا۔ شہر سے باہر پٹڑی پر سر رکھ دینے سے کوئی مداخلت نہیں
کر سکتا۔ ریل گاڑی —— آ ا ا ا —— ہ —— تب اس کے
سینے میں ہی حشر بپا کر رہ گیا —— وہ اپنی بیوی کو اس ارادے سے آگاہ نہ کرنا چاہتا
تھا۔ اسے ڈر تھا کہیں اس کے آنسو اس ارادے کو متزلزل نہ کر دیں —— اور
کہیں وہ پھر سے اس کے تباہ حال کاروبار کی ویرانیوں میں الجھتا اور تڑپنے کی
خواہش نہ کرنے لگے —— کمبل کو زور سے پائنتی کی طرف پھینک کر
وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا —— اس کی بیوی مصلے پر کھڑی ہو گئی تھی ——
جلال دین کی نظر سوئے ہوئے بچوں پر پڑی۔ اور وہ گردن گھما کر باہر کی
طرف دیکھنے لگا —— خوف کی لہر اس کے بدن میں سنسناتی ہوئی گزر
گئی۔ بچوں کو زیادہ دیر تک دیکھتے رہنے سے کہیں میں پھر جینے پر مجبور نہ
ہو جاؤں۔ بچوں کی باتیں تھکے ہوئے انسان کے لئے شیریں نغمے کا کام
دیتی ہیں۔ جن سے وہ اپنی تھکاوٹ کو بھول کر وقت کے سایوں میں ——
مسکراہٹوں کے پھول بکھیرنا شروع کر دیتا ہے۔ بچے بھی کہیں میرے ارد گرد
کھڑے نہ ہو جائیں۔ لیکن —— ان بچوں کی باتوں میں نغمگی کہاں؟
آنسوؤں کے سیلاب میں ڈوبتے بھرتے بھوک کے تقاضوں نے
ان کی میٹھی باتوں کو چھین لیا ہے۔ اور اب تھکے ہوئے انسان کو ماحول کے
زہریلے اثرات سے محفوظ رکھنے کی خاطر ان کے پاس کچھ بھی تو نہیں ہے ——
ان کی باتیں اب میرے جوش کو ٹھنڈا نہیں کر سکتیں —— اس کی
بیوی نے سلام پھیر کر کہا۔ آج مسجد میں نہیں جائیں گے! ——
پھر وہ تسلی کی خاطر جلال دین جھک کر چارپائی سے نیچے اتر آیا تھا۔ اس
کی نگاہوں میں ریل گاڑی کے پہیے گھوم رہے تھے۔ دروازے کے باہر
[illegible] وقت کا تعین [illegible] سوچنے لگا

تھا۔ صبح کے وقت نارووال کی طرف سے ایک گاڑی آتی تو ہے۔
شاید گاڑی ابھی تک نہ آئی ہو —— ہو سکتا ہے گاڑی آ
لیٹ ہو۔ اس کی آنکھوں میں گھومنے والے پہیوں کی رفتار تیز ہو گئی
اور اس کا ذہن تپنے لگا تھا۔ اور اس کا دل دھڑکتے ہوئے کچھ تڑپ
تھا۔ اس کی بیوی ہاتھ باندھے مصلے پر کھڑی تھی۔ اور لڑکے سوئے
تھے۔ جلال دین گلی میں آ گیا۔ آخری دفعہ اس نے بیوی اور لڑکوں
طرف دیکھا بھی نہ تھا۔ اب وہ انہیں دیکھنا بھی نہ چاہتا تھا۔ اسے
اب کوئی تعلق نہ رہا تھا۔ اس نے تمام بندھن توڑ دیئے تھے اور
کے بندھن کو توڑنے کی خاطر۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا جناح پارک کی
بڑھنے لگا تھا۔ اس کی کتاب زندگی کے اوراق پھر سے الٹنے لگا اور وہ
گہرائیوں میں گم شدہ بہاروں کے نقوش تلاش کرنے لگا۔ جو
جھونکے اس کے چہرے کو مس بنا رہے تھے —— اور سنسان بازار کے
اس کی گھسی ہوئی ایڑیوں کی سٹرپ سٹرپ کی آواز بکھر رہی تھی
سرد جھونکوں کی چبھن سے بے نیاز قدم اٹھا رہا تھا۔ اور سٹرپ
آواز اسے پراسرار طور پر متاثر نہ کر سکی تھی۔ ماضی کی گہرائیوں میں گم شدہ
کے کچھ نقوش اسے مل گئے۔ بیوی کے شگفتہ چہرے پر کھیلی ہ
سرد سکی ایک ہرن کر اس کے دل میں اتر گئی۔ اور لڑکوں کی
شرارتوں کے ہیولے اس کے ذہن میں ابھرنے لگے۔ اس کی چال
پڑنے لگی۔ اس کے کانوں میں عجیب سی آوازیں آنے لگیں
کہاں جا رہے ہو؟ تمہاری بیوی تڑپ تڑپ کر بار بار
کھو دے گی۔ تمہارا انتظار اس کی زندگی میں زہر گھول دے گا۔
نہ پا کر اس کی زندگی کے اندھیروں میں ہی بھٹکتی رہے گی —— تمہا
شام کے بعد بھی جب تمہیں واپس گھر آتے نہ دیکھیں گے۔ تو ان
دیوار کو بھی گھلا دیں گے۔ اور —— • —— وہ کیا سوچ
وہ طیش میں آ گیا۔ اور اس کی [illegible]
[illegible] ہونے سے کیا فرق پڑ سکتا ہے۔ [illegible]
ان کے لئے روٹی کا ایک [illegible]
ہی بہتر ہے —— اس نے کتاب [illegible]
میں گم شدہ بہاروں کے [illegible]

ے گئی یا ـــــ اب بنگلہ دھانوں میں زندگی کی گہما گہمی پیدا نہ ہو گی۔ اب شاید پھر مزدوروں اور کاریگروں کے مرجھائے چہروں پر کبھی رونق پیدا نہ ہو سکے گی۔ یہ دنیا اب بڑے لوگوں کے لئے ہی ہے۔ مجھ جیسے بے بس انسان اب اس میں نہیں رہ سکتے۔" وہ اپنے خودکشی کے ارادے کو اور مضبوط بنا رہا تھا ـــــ جناح پارک کے قریب پہنچ کر اس کی آنکھوں میں ایک نئی چمک پیدا ہو گئی تھی۔ اس کا دل اچھلنے لگا تھا۔ اور مشرقی افق سے ابھرتی ہوئی سپیدی میں آؤٹر سگنل کا اکڑا ہوا بازو اسے خوش آمدید کہتا نظر آ رہا تھا۔ شیشم کے درختوں کی قطار کے پیچھے چھپ کر وہ ریلوے لائن کے پاس کھڑا ہو گیا۔ مشرقی افق کی طرف دیکھ کر اس نے وقت کا اندازہ لگایا۔ پھر اس کی نظریں آؤٹر سگنل پر جم کر رہ گئیں ـــــ "گاڑی سنہ جانے کب آئے گی۔ کب سگنل کا بازو جھکے گا۔ اور کب آہنی پہیے اس کی گردن..." وہ لرز اٹھا۔ موت کے قریب پہنچ کر پہلی دفعہ اسے ایک عجیب احساس ہوا تھا۔ جیسے زبردستی کوئی اس کی گردن کو پکڑ کر لائن پر رکھ رہا ہو ـــــ مرنا نہ چاہتا ہو۔ اور موت زبردستی اس کی سانسوں کو توڑ رہی ہو۔ "بزدل" اس کے کانوں میں ایک وحشی قہقہے کی گونج پھیل گئی۔ اور اس نے غصے سے مٹھیاں کس لیں۔ "میں بزدل نہیں ہوں" ـــــ اس نے تصورات کو نوچ کر ذہن سے دور پھینک دیا۔ "میں زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ میرا فیصلہ اٹل ہے۔ میں۔ میں ـــــ لیکن سگنل کا بازو جھک کیوں نہیں رہا۔ انجن کا دھواں بھی تو دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ شاید آج گاڑی لیٹ ہے ـــــ اور ـــــ ہو سکتا ہے میرے یہاں آنے سے پہلے ہی گاڑی نکل چکی ہو ـــــ" اس نے گردن گھما کر اسٹیشن کی طرف دیکھا لیکن اس نے اسٹیشن کو چھپا لیا تھا اور شیشم کے گھنے درخت لال کوٹھی کو چھپائے کھڑے تھے۔ لکڑی کے ایک ناکارہ سلیپر پر بیٹھ کر اس نے گھٹنوں پر تھوڑی رکھ دی۔ اسے محسوس ہونے لگا جیسے کوئی اسے سوئیاں چبھو رہا ہو۔ ٹھنڈک کے باوجود اس کے بدن سے چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں۔ اس کا جی چاہا کہ تیز اوزار سے اپنے بدن کو زور زور سے کھجانے لگے۔ ناخنوں سے کھال کھرچ دے۔ بغلوں اور پیٹ کو زور زور سے کھجانے کے بعد بھی اسے سکون نہ ملا۔ ایک لمحے کو اس نے سگنل سے نظریں ہٹا کر گھبرا کر دیکھنے لگا کیا ہو گیا ہے مجھے۔ ابھی کیوں نہیں آ رہی۔ آنکھیں جل رہی تھیں

تھیں۔ اور اس کی آنکھوں میں چمکیلا پانی تیرنے لگا تھا۔ ہتھیلیوں سے آنکھوں کو مل کر اس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں میں زور سے دبایا۔ اور اس کے سینے میں اذیت ناک جلن پھیل گئی۔ وہ پھر سلیپر پر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں چمکیلا پانی ابھی تک تیر رہا تھا۔ پتھروں کے جھرمٹوں کی طرف دیکھتے ہوئے اسے اپنے لڑکوں کے فاقوں سے بگڑے ہوئے چہرے دکھائی دینے لگے۔ اور پھر اس کی بیوی کا مرجھایا ہوا چہرہ چمکیلے پانی میں سے ابھر آیا۔ اس نے زور سے آنکھیں میچ لیں۔ اس کی پلکیں بھیگ گئی تھیں۔ اور ابھی چینیوں میں ذرا بھی کمی واقع نہ ہوئی تھی ـــــ اپنے قریب ہی گھڑگھڑاہٹ کی آواز سن کر۔ اس نے سر کو زور سے جھٹکا دیا۔ اور بوسیدہ قمیض سے آنسو پونچھ کر سگنل کی طرف دیکھنے لگا۔ گھڑگھڑاہٹ کی آواز اس کے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ کسی نے اس کے قریب کھڑے ہو کر گہرا سانس بھرا۔ اور وہ چونک پڑا۔ اپنے بائیں طرف ایک جانا پہچانا چہرہ نظر آیا۔ اور وہ لرز اٹھا۔ "رشید یہاں کیا لینے آیا ہے؟ کیا یہ بھی میرا ہمسفر ہے؟" اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ رشید نے بھی اسے پہچان لیا تھا۔ "السلام علیکم جلال دین" وہ چاہتا تھا کہ رشید اسے پہچان نہ سکے۔ وہ اس سے دور چلا جائے۔ اور اس کے اعصاب کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑے ـــــ رشید کے سلام کا جواب دینے کی بجائے وہ جناح پارک کے بڑے گیٹ کی طرف دیکھنے لگا۔ "جلال بھائی تم صبح صبح اس طرف کیسے نکل آئے ہو" رشید کے اس سوال سے جلال کو محسوس ہوا جیسے اس پر برف کی ایک بھاری سل گر پڑی ہے ـــــ رشید سے پیچھا چھڑانا اب ناممکن تھا۔ جلال دین نے سنبھلنے کی کوشش کی۔ گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "اور آپ۔ میں نے پہچانا کہ تم جانے کون ہے۔ اور کس کو بلا رہا ہے!" ـــــ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے نقوش کچھ مدھم پڑ گئے تھے۔ رشید اس کے پاس ہی سلیپر پر بیٹھ گیا۔ جلال دین نے سگنل کے کانٹے ہوئے بازو کی طرف دیکھا۔ اور دور تک انجن کے دھوئیں کے کسی آثار کو نہ دیکھ کر اس نے سوچا گاڑی آج ضرور لیٹ ہو گئی۔ اور اب رشید سے پیچھا چھڑا کر وہ سگنل سے کہیں پیچھے چلا جائے گا [illegible] سامنا کرنا پڑے۔ رشید [illegible]

طرف کیسے نکل آئے ہو؟" "کوئی خاص بات نہیں۔ ایسے ہی چلا آیا ہوں" رشید کو کبھی خدشے کا اظہار کرتے دیکھ کر جلال کچھ مطمئن ہو گیا۔ رشید نے پوچھا "ابھی تک کوئی کام ملا ہے۔ یا بیکار ہی ہو۔" "کام؟" جلال دین کا ہو کر بولا "اب قسمت میں کام کہاں۔ اب تو یہ حسرت زندگی میں شاید ہی کبھی پوری ہو سکے۔" رشید کے چھوٹے بھائی حمید کا خیال آگیا۔ جو اس کے ساتھ کارخانے میں کام کرتا تھا۔ اور جس کی وجہ سے رشید سے اس کی جان پہچان ہوئی تھی۔ اس نے پوچھا "حمید کا کیا حال ہے بہت دنوں سے نظر نہیں آیا۔ اور سچی بات تو یہ ہے۔ کہ بیکاری کے چکر میں پھنس کر میں نے اس کے متعلق کسی سے کچھ دریافت بھی نہیں کیا۔" رشید خاموش رہا۔ حمید کے خیال سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور دل میں ایک پھانس سی چبھنے لگی۔ جلال دین نے بڑے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اور غمگین لہجے میں بولا "ہم سب کے دکھ کا مرکز ایک ہی ہے۔ ہم سب ہی بیکاری کے ہاتھوں ستائے ہوئے ہیں۔ بھوک تو ہماری نسلوں کو بھی نگل رہی ہے ___ حمید کہیں باہر تو نہیں چلا گیا۔ وہ غریب بھی میری طرح بیکاری کے غم میں گھل رہا ہوگا" رشید کے ہونٹ کانپنے لگے ___ "حمید اب دنیا سے ہی چلا گیا ہے ___" "آہ۔ کیا کہا؟" جلال دین کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ رشید گلوگیر آواز میں بولا "اس نے خودکشی کر لی ہے۔ زندگی سے بھاگ کر وہ موت کے منہ میں پہنچ چکا ہے۔ لیکن وہاں بھی تو وہ آرام سے نہیں رہ سکتا۔ اپنے بچوں کو بلبلاتا اور تڑپتا چھوڑ کر وہ کہیں پر بھی سکھ حاصل نہیں کر سکتا۔ زندگی سے فرار بہت بڑا جرم ہے اور وہ یقیناً اس جرم کی سزا بھگت رہا ہوگا" ___ جلال دین کو احساس ہو گیا کہ وہ بھی تو خودکشی کرنے کی خاطر ہی اس طرف آیا ہے رشید چند لمحے خاموش رہ کر بولا ___ "جلال۔ تم ہی انصاف کرو۔ کیا اس نے زندگی سے منہ موڑ کر کوئی اچھا کام کیا ہے؟ کیا انسان ناکامیوں سے گھبرا کر خودکشی کرنے کی خاطر ہی تخلیق کیا گیا ہے؟ ___ اگر ایسا ہی ہوتا تو [illegible] خود غرضی اور ظلم کے سہارے دنیا میں [illegible] نظر آتا۔ اپنے بنیادی حقوق حاصل کرنے کی خاطر انسان کبھی ہمت چھوڑ سکتا ___" جلال دین [illegible] یہ کیا بات کر رہا ہے۔ زندگی سے فرار۔ اور

بھلائی خود غرضی اور ظلم کی ٹکر ___ رشید کہے جا رہا تھا "جلال زندگی جدوجہد کا دوسرا نام ہے۔ حرکت کے بغیر برکت نہیں اگر بھیڑیوں کے خونی دانت چمکتے رہیں۔ تو انسانیت کے زخم کبھی نہ بھریں ___ وقتی طور پر خزاں کے بے رحم ہاتھوں سے لٹے ہوئے گلشن کو دیکھ کر بہاروں کی شادابیوں کو فراموش کر دینا۔ بزدلی ہے خزاں کے بعد بہار کا آنا لازمی امر ہے۔ پھر کیوں نہ خزاں کے [illegible] میں بہاروں کے گیت گا کر عالی ہمتی کا ثبوت دیا جائے" ___ جلال دین کو محسوس ہوا تھا جیسے کسی نے اسے زور سے جھنجھوڑ دیا ہو زمین اس کے قدموں سے نکلی جا رہی ہو ___ [illegible] نظریں جھکا لیں ___ رشید اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا "انسان دنیا کے حسن کو نکھارنے کے لئے بھیجا گیا ہے ___ ہمت ہار کر خزاں کے بے رحم حملوں سے پسپا ہو جائیں۔ تو حق کبھی نہ آ سکے آج اگر کارخانے بند ہوئے ہیں تو کیا ہوا۔ ایک نہ ایک دن کھلیں گے ___ خواہ ہزار طوفان اٹھیں ___ لاکھ آندھیاں چلیں کھلنے والے پھول ضرور کھل کر رہیں گے۔" ___ ندامت احساس جلال دین کی شریانوں تک کو جھنجھوڑ گیا تھا۔ رشید نے بھر کر کہا "مجھے ایک دفتر میں چپراسی کی نوکری مل گئی ہے۔ [illegible] اس طرف آجاتا ہوں۔ بچے ہوئے کوئلے چنتا ہوں۔ سعید کا بڑا بازار میں بیچ آتا ہے۔ اس کے بیوی بچوں کا بوجھ بھی اب میرے [illegible] پر آ پڑا ہے۔ لیکن میں ناامید نہیں ہوا۔ نئی بہاروں کے نقوش کی جھلاہٹوں میں ابھر رہے ہیں۔ خزاں کا راج اب زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتا ___ عوام کے مطالبے کو ٹھکرانے کی دنیا میں کسی [illegible] پاس طاقت نہیں ہے ___" جلال دین کا ذہن الجھنوں سے صاف ہو گیا تھا۔ رشید نے زندگی کو اس کے سامنے اور حقیقی رنگ میں پیش کیا تھا۔ اور یہ رنگ اس کے دل کو لگا تھا۔ رشید نے سچ ہی کہا ہے۔ خودکشی۔ مشکلات کا کوئی [illegible] اس طریقے سے تو کوئی مسئلہ سلجھ نہیں سکتا ___ بلکہ انسان [illegible] جدوجہد کو اس سے دھکا لگتا ہے۔ بدحالیوں سے چھٹکارا [illegible] کی خاطر تو صرف اس نئے معاشرے کی ضرورت ہے [illegible] زندگی

ابن محمود ●

ہنسو ہنسو ! ابھی کچھ اور مجھکو رونا ہے
جنونِ شوق میں جاں سے بھی ہاتھ دھونا ہے
حبیبِ وقت کو بیدار گر نہ ہونا ہے
یونہی پھر اُمتِ مرحوم کو تو سونا ہے
عجیب شرط یہ ٹھہری ہے انکو پانے کی
تمام کچھ وہ میسّر ہے جو بھی ، کھونا ہے
طلب نہ گل کی رہی لاگ اب نہ بلبل سے
چمن میں خار و خذف ہی مرا بچھونا ہے
ترے پیام کو شاید ابھی عروج نہیں !
ترے جہاں میں ابھی شر کا ور ٹونا ہے
ہزار چوٹ کھا کر بھی جو مسکرا پائے
رہِ وفا میں اسے سرفراز ہونا ہے
وہ تو شروری سہی ہاں ! وہ خندہ زن ہی سہی
مجھے ادب میں ترا ذکر پھر سمونا ہے !

ابوالمجاہد زاہد ●

پسِ پردۂ بہار !

جمالِ حق ہی نگاہوں میں جلوہ یار نہیں
یہ زندگی ہے تو اس زندگی سے پیار نہیں
شگفتگی گل و غنچہ پہ آشکار نہیں !
کہیں خزاں تو پسِ پردۂ بہار نہیں
وقار وحدتِ آدم پہ گر نہ آنچ آئے
تو پھر وطن کی محبت بھی دل پہ بار نہیں
ہمہ علوم و معارف فریب و ناداں
تری نگاہ اگر ابر من شکار نہیں
جو دیکھئے تو سب انساں کے اختیار میں ہے
جو سوچئے تو کسی پر بھی اختیار نہیں
کبھی ہمیں نے سجایا تھا گلشن عالم
اور آج اپنی نگاہوں پہ بھی نکھار نہیں
شگوفے ایسے کھلائے چمن فروشوں نے
بہار چیخ اٹھی یہ مرا دیار نہیں !
فلاحِ دہر ہے اسلام ہی کے سائے میں
یہ وہ چمن ہے جہاں گل ہی گل ہیں خار نہیں

نعیم صدیقی •

ماڈرن چندہ نائٹ کالج

(بالغ الوؤں میں جہالت پیدا کرنیکا خیراتی مدرسہ)

آج کا سبق ـــ "مالِ مفت"

•

استاد ۔ معاونان ادارہ کے پٹھو! شور بند کرو خاموشی سے اپنی جگہوں پر بیٹھ جاؤ، سبق شروع ہوتا ہے۔

(شاگرد بیٹھ جاتے ہیں)

ایک شاگرد ۔ ہم سب تیار ہو گئے ہیں جناب!

استاد ۔ دو تین لڑکے باہر جا کر دیکھیں رات خوب اچھی طرح تاریک ہے یا نہیں؟ آج کے سبق کے لئے ضروری ہے کہ رات خوب کالی ہو۔ یہ ایک روحانی راز ہے۔

(دو چار شاگرد جاتے ہیں اور تھوڑی دیر میں واپس آتے ہیں)

ایک شاگرد ۔ دیکھ آئے، چاند تارے سب غائب ہیں۔ ظلمت فوق ظلمت کا سماں ہے.....

استاد ۔ ٹھیک ہے، بیٹھ جاؤ

ایک شاگرد ۔ (آخری بنچوں پر سے) جناب! خیال ہے کہ کالج کی بتی ابھی جل رہی ہے۔ کہیں آپ سبق شروع نہ کر بیٹھیں۔

استاد ۔ ہاں بتی بجھا دو!

(ایک شاگرد بتی گل کر دیتا ہے)

استاد ۔ پیارے عزیز شاگردو! اب اپنی آنکھیں بھی اچھی طرح میچ لو، ورنہ سبق سے پورا فائدہ نہ اٹھا سکو گے ـــ اب سبق شروع ہوتا ہے ذرا سوچ کر بتاؤ کہ ہمارے اس خیراتی کالج کو اگر کوئی شخص چند ہزار روپے کا چندہ دے دے تاکہ ہم لڑکوں کے بیٹھنے کے لئے بنچ اور کرسیاں بنوا دے تو اسے تم اچھا کہو گے یا برا؟

ایک شاگرد ۔ صاحب! ہم ہزار مرتبہ اسے اچھا کہیں گے۔ لاکھ دے کوئی، ہم تو اس کے نام کے قصیدے پڑھیں گے اور اخبار اس کی تعریف کے پل باندھ دیں گے۔

دوسرا شاگرد ۔ استاد محترم! کوئی حرج نہ ہو تو ایسے سخی آدمی کا نام بھی بتا

تیسرا شاگرد ۔ بھئی بعض خدا کے بندے اپنا نام بھی نہیں ظاہر کرنا چاہتے

چوتھا شاگرد ۔ دنیا رنگ برنگی ہے ـــ کیوں استاد جی؟ ہے نا!

استاد ۔ خبردار! غیر متعلق باتیں نہ کی جائیں۔ اچھے الوؤں کا کام ضرورت سے زیادہ زبان کا استعمال کیا نہ کہیں۔ تم! یا نہیں؟

ایک شاگرد ۔ جی، بالکل!

استاد ۔ تو پھر سبق سے ہٹ کر باتیں نہ کرو

ایک شاگرد ۔ مگر سبق شروع تو ہو

استاد ۔ سبق تو میں نے شروع کر دیا ہے۔ تم صرف میں پوچھ رہا کہ اگر کوئی آدمی کالج کی امداد کرے تو اس کا احسان ماننا چاہئیے نا.....؟

ایک شاگرد ۔ جی، ضرور ضرور!

استاد ۔ لیکن اگر تم لوگ ایسے آدمی کے بارے میں یہ کہنے لگو کہ دے رہا ہے کہ کالج میں خود اگر بیٹھنے لگے یا کرسیاں اس لئے رہا ہے کہ یہاں اپنی بیٹھک بنا لے تو.....؟

ایک شاگرد ۔ کوئی الو ایسی حماقت نہیں کر سکتا۔

استاد - اچھا بیٹے عزیز پاکستانی لڑکو! اگر دنیا کی کوئی مالدار قوم پاکستان کو روپیہ اور ہتھیار بطور ہدیہ دے تو یہ اچھا ہوگا یا برا؟

شاگرد - بہت ہی اچھا ہوگا ——— مگر ہمیں یہ بھی تو بتلائیے کہ وہ ان لوگوں کی اس نائٹ کالج کو بھی کچھ دے گی یا نہیں؟

استاد - نائٹ کالج کا اللہ مالک ہے۔ وہ تو ہمیں نے صرف مثال دی تھی۔

شاگرد - استاد جی یہ ٹھیک محاورہ نہیں ہے "مثال ماری تھی" کہنا چاہیئے

ایک اور شاگرد - واہ! مثال بھی کوئی لاٹھی ہے کہ ماری جائے

استاد - چپ رہو! غیر متعلق! ——— خبردار!!

شاگرد - جی ہاں! سبق جاری رکھیئے ——— !

استاد - بات یہ ہے کہ امریکہ پاکستان کی ترقی میں مدد دینے کے لئے "مال مفت" پیش کرنا چاہتا ہے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس میں کوئی نہ کوئی بدنیتی چھپی ہوئی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟

شاگرد - یہ تو بڑا نیک نیتی کا کام ہے۔ اور کوئی بدنیتی ہو بھی تو ہمیں تو روپیہ اور اسلحہ سے مطلب ہے، بدنیتی سے کیا واسطہ!

استاد - پاکستان کے کچھ بدخواہ کہتے ہیں کہ اس سے ہماری آزادی کو نقصان پہنچے گا۔

شاگرد - روپیہ اور اسلحہ کے بارے میں آج تک کے سائنٹفک تجربات سے یہ چیز ثابت نہیں ہے کہ آزادی کو کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے

دوسرا شاگرد - ایسے لوگوں کا مطلب یہ ہے کہ امریکہ روپیہ اور اسلحہ دے گا تو اس کے احسان مند ہونے کی وجہ سے دوسری طرف سے ہم بھی تو کچھ باتیں ماننے پر مجبور ہوں گے۔

استاد - شاباش! تم نے بات سمجھ لی مگر اس کا جواب یہ ہے کہ ہم امریکہ کی جو بات ماننا چاہیں گے وہ ہنسی خوشی اپنی آزادی سے مان لیں گے۔ اس میں مجبوری کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

استاد - جی ہاں! آزاد رہنے والے تو حقیقتاً قید اور زنجیروں میں بھی آزاد رہتے ہیں!

دوسرا شاگرد - کچھ کہتے ہیں کہ امریکہ کسی جنگ میں پاکستان کے اڈوں کو استعمال کرے گا۔ اس کا کیا جواب ہے؟

استاد - معقول سوال کیا گیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اصل صورت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اگر کوئی وقت آیا تو ہم اپنی فوجی اڈوں کے لئے امریکی جہازوں اور جانبازوں کو استعمال کریں گے نہ کہ وہ ہمارے اڈے استعمال کریں گے۔ امریکی فوجی قوت ہماری حفاظت میں صرف ہوگی وہی بات کہ "پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے"!

دوسرا شاگرد - یعنی احسان ہم امریکہ پر کریں گے نہ کہ امریکہ ہم پر کرے گا۔

استاد - یقیناً ——— امریکہ سے مالی امداد قبول کر کے ہم اس پر احسان کر رہے ہیں۔

دوسرا شاگرد - وہ کیسے؟

استاد - وہ یوں کہ دنیا کی دولت امریکہ میں سمٹ گئی ہے اور اب امریکہ میں جو مال تیار ہوتا ہے اسے خریدنے کے لئے چھوٹے ملکوں کی گرہ میں کچھ ہے نہیں۔ اب مال کدھر جائے؟ اور کاروبار کی ترقی کیسے جاری رہے؟ ——— وہ اسی طرح جاری رہ سکتی ہے کہ امریکہ اپنے گاہکوں کو پیسے اپنے پاس سے دے کر ان میں خریداری کی قوت قائم رکھے اس لئے امریکہ مجبور ہے کہ اپنے خزانے لٹائے۔ اور یورپ اور ایشیا کی قومیں امریکہ سے بڑی نیکی کریں گی۔ اگر اس کی عنایات کو قبول کر لیں۔

دوسرا شاگرد - بس میں سمجھ گیا استاد صاحب ——— ! ایک بات اور، ایک پڑوسی ملک میں اس معاملے پر اضطراب کیوں پیدا ہے؟

استاد - ایسے ہی جیسے ہمارے نائٹ کالج کو جب کہیں سے خاص امداد ملتی ہے تو دوسرے نجی کالجوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگتی ہیں اور پڑوسیوں میں حسد بھی ہوتی ہے جیسے یہی تعلیمی رقابت ہوتی ہے۔ یہی روپیہ اور اسلحہ پڑوسی ملک کو مل جائے تو وہ فوراً چپ ہو جائے گا۔ بلکہ شور و شر کا مقصد ہی یہ ہے کہ ان کو بھی کچھ مل جائے۔ اور اس سے پہلے بھی بہت کچھ لیا ہے اور آئندہ بھی ملے گا! ہماری طاقت میں اضافہ یا معاہدے سے بیشک... ایک بار اس پر ضرور بگڑے گا۔

شاگرد - تو اس سے ایک متعلق فائدہ بر آمد ہوتا ہے جس معاملے پر پڑوسی بگڑ جائے بہر حال ہمارے لئے موجب خیر و برکت ہونا چاہیئے۔

استاد - جزاک اللہ! میاں! تم کس اچھے ذہین لڑکے نکلے سو ہم خوش ہوئے خدا تمہاری عمر دراز کرے۔

ہم اب تک یہ جانتے ہیں — آج کل ملک میں امریکی امداد کے فوائد اور نقصانات پر تحقیقات ہو رہی ہے نقصانات تو "مال مفت" کے حصول میں کیا نیافت ہوں گے۔ البتہ بہت سے فوائد پایۂ ثبوت کو پہنچ گئے ہیں

ایک شاگرد :- استاد جی! یہ "پایۂ ثبوت" کس شہر میں تعمیر کیا گیا ہے؟ مغل بادشاہوں کی عمارتوں میں اس کا نام تو نہیں پڑھا — کہیں قطب صاحب کی لاٹھ کا دوسرا نام تو نہیں!

دوسرا شاگرد :- استاد جی! ہم نے تو یہ بھی پڑھا ہے "پایۂ تخت" — اور آپ نے بتایا تھا کہ وہ کراچی شہر میں ہے۔ یہ پایۂ ثبوت کیا ہوا؟

استاد :- تم لوگ بڑے گدھے ہو — کسی چیز کے پایۂ ثبوت کو پہنچنے کے معنی ہیں اس کا اچھی طرح ثابت ہو جانا! مثلاً تمہاری باتوں سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ تمہارے دماغوں میں بھس بھرا ہوا ہے!

شاگرد :- جناب والا! ہمارے دماغوں میں بھس کدھر سے بھرا جا سکتا ہے اور کس نے بھرا ہوگا!

استاد :- یہ غیر متعلق بحثیں ہیں — بات کر رہا ہوں امریکی امداد کے فوائد کی!

شاگرد :- فرمائیے، فرمائیے!!

استاد :- ہاں تو پہلا فائدہ اس امداد کا یہ ہے کہ ہمارے تعلقات دنیا کی ایک عظیم طاقت سے ہو جائیں گے، اور یہ عظیم طاقت ہمارے بہت سے بین الاقوامی معاملات کے نمٹانے میں ہمارا ساتھ دے گی۔ بلکہ بعض امور میں تو ہم بالکل فارغ ہو جائیں گے۔ امریکہ ہماری طرف سے بہت سی باتیں از خود کرتا رہے گا۔ اور بہت سے مخالفین کے مقابلے میں ہماری مدافعت کرے گا۔ ہم اطمینان سے اندرون ملک کے تعمیری کام کر سکیں گے۔

شاگرد :- یو۔ این۔ او میں ہمارا پلہ بھاری ہو جائے گا۔

استاد :- بالکل، بالکل! دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ہمارے ہوائی اڈے خوب [illegible] ہو جائیں گے، سڑکیں بنیں گی، پل بنیں گے، چھاؤنیاں بنیں گی۔ اور یہ سب بالکل مفت میں، نہ ہینگ لگے نہ پھٹکری!

شاگرد :- استاد صاحب! کیا سائنس دانوں نے اب ہوائی اڈے سڑکیں پل اور چھاؤنیاں ہینگ اور پھٹکری سے بنانے کی کوئی ترکیب بھی نکالی ہے؟

دوسرا شاگرد :- انسان سب کچھ کر سکتا ہے بابا! اور سائنس کے ذریعے [illegible] ہینگ سے ٹینک اور توپیں بھی بنا سکتا ہے ... اس میں کی کیا بات ہے؟

استاد :- ان باتوں کو امریکی "مال مفت" کے سبق سے کوئی تعلق نہیں

شاگرد :- خود آپ ہی نے تو ہینگ اور پھٹکری کا سوال چھیڑ دیا ہے!

استاد :- اچھا سنو! تیسرا فائدہ یہ ہے کہ امریکی سرمایہ اور اسلحہ کے آنے سے نئے نئے کام نکلیں گے اور بیروزگاری کم ہو جائے گی

شاگرد :- بلکہ سنا تو یہ ہے کہ امریکی ماہرین بھی آئیں گے، تو اگر وہ آئے تو کلرکوں، بیروں، چپراسیوں اور آیاؤں کی بھرتی بھی خوب

استاد :- امریکی تنخواہیں بھی خوب دل کھول کر دیتے ہیں۔ ان سے ایک پٹواری اور پولیس کانسٹبل سے زیادہ کمالے گا۔

شاگرد :- بیروزگاری کا مسئلہ بھی حل ہوا —!

استاد :- چوتھا فائدہ یہ ہے کہ امریکی آئیں گے تو انگریزوں کے جانے سے کلب اور بال روم اجڑ گئے ہیں وہ پھر آباد ہوں گے لیڈیاں پھر سڑکوں پر گھومتی نظر آئیں گی اور قوم نئے کلچر کی تعلیم تیزی سے کرے گی۔ ملا ازم کا فتنہ امریکی تہذیب کی یورش ہوتے ہی سرد

شاگرد :- ہماری اپوا کے مینا بازار کہیں امریکی کلچر کے سامنے سرد

استاد :- جی نہیں گرمی بازار بڑھے گی!

شاگرد :- جناب کیا فرمایا؟ کیا ہمارے بازاروں میں سائنٹفک طریقے سے مزید گرمی پیدا کر دی جائے گی؟ ہمارا ملک تو پہلے ہی گرم ہے، یہاں اگر بازاروں میں مصنوعی گرمی پیدا کر دی گئی تو بازار جل جائے گا؟

استاد :- میرے عزیز! تو یہ محاورہ ہے

دوسرا شاگرد :- مار دیا ان محاوروں نے ...!

استاد :- بیٹھ جاؤ! اب پانچواں فائدہ سنو! وہ یہ ہے کہ روپیہ بھی یہاں لگے گا اور اس کا استعمال بھی فوج کے استعمال ہوگا۔ اس لئے آئندہ جنگ میں امریکہ کا انتظام بھی خود کرے گا

شاگرد :- [illegible]

سرا شاگرد :- امریکہ کے کالجوں میں الفاظ کا اس طرح دوہرا استعمال کرنا اور وہ بھی اس کالی طرح ہیں۔ جبکہ ہم نے آنکھیں بھی بند کر رکھی ہیں ماں "پدلیسٹری" ہے

را شاگرد :- میں اپنے الفاظ واپس لے کر ان کی جگہ "غلامت بعضہا فوق بعض" کے الفاظ پیش کر دیتا ہوں۔

سرا شاگرد :- استاد صاحب! یہاں طلبہ کی اس بولی میں باتیں کرنے کی اجازت نہ ہونی چاہیئے۔ یہ ترقی یا فتہ اور مہذب طلبہ کا ناشائستگی ہے۔

استاد :- بچو! تم لوگ غیر متعلق بحث میں الجھ گئے ____

دوسرا شاگرد :- میں ایک بالکل متعلق بات پوچھتا ہوں۔ کیا اس بات کا اندیشہ نہیں کہ "امریکی امداد" کی وجہ سے اگلی تباہ کن جنگ پاکستان میں لڑی جائے۔ اگر ہمارا دیس میدان جنگ بن گیا تو کیا ہوگا؟

استاد :- میاں تو یہ انسانیت کے لئے ایک اچھی قربانی ہوگی کہ ہم جنگ کے دیوتاؤں کے رقص کے لئے اپنی سرزمین کو پیش کر دیں اور یہیں سارا جھگڑا نمٹ جائے۔ باقی دنیا تو بچ جائے گی۔ کوریا نے اس کی اچھی مثال قائم کر دی ہے۔ لیکن اس قربانی میں ہمارا اپنا فائدہ بھی ہے۔ اس فائدے کے لئے ہم دل سے چاہیں گے کہ جنگ ہمارے میدانوں میں ہو۔ ایک تو افراط آبادی کی مصیبت ختم ہو جائے گی۔ دوسرے جن مہاجرین کی آباد کاری اور بحالی کا کام سالوں کی کاوش کے باوجود سرانجام نہیں پا رہا، ان کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ تیسرے جنگ کے بعد دنیا کی جو تاریخ بنے گی اس میں پاکستان کا نام سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔ اور پھر اس کی ضرورت نہ رہے گی کہ اس کے تعارف کے لئے لٹریچر شائع کرنے پر لاکھوں روپے سالانہ صرف کئے جائیں۔ پاکستان کا نام بچے بچے کی زبان پر ہوگا۔

شاگرد :- استاد صاحب! پھر تو بڑے فائدے ہیں۔ ان فائدوں کو کبھی ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

- :- ماسی لے کے چلی گئی مفت یا قیمت؟

- :- استاد صاحب! مفت کا فائدہ واضح کرنے کے لئے اگر اجازت ہو تو ایک تاریخی مثال بیان کروں۔

استاد :- (غصے سے) ضرور ضرور!

شاگرد :- ایک تھا کابلی پٹھان۔ وہ لاہور میں آیا۔ شہر کی سیر کو نکلا تو ایک حلوائی کی دکان نظر پڑی۔ پٹھان کھڑا ہو کر حیرت سے دیکھنے لگا۔ پھر قریب ہو کر اپنی لاٹھی حلوائی کی آنکھوں کی طرف بڑھائی۔ حلوائی اس بدتمیزی پر چونکا۔ اس نے کہا اندھے ہو؟ دیکھتے نہیں کہ لاٹھی آنکھ میں لگ جائے گی۔ پٹھان نے کہا اندھا میں ہوں یا تم؟ اتنی مٹھائیاں تمہارے سامنے رکھی ہیں۔ اور تم کھاتے نہیں، تمہیں شاید دکھائی ہی نہیں دیتیں۔ حلوائی نے کہا میں نے بیچنے کے لئے رکھی ہیں میں کھاتا نہیں۔ پٹھان نے کہا۔ اچھا تم نہیں کھاتے تو خان کھاتا ہے۔ یہ کہہ کر اطمینان سے مٹھائی کھانے لگا۔ حلوائی نے شور مچایا۔ لوگ جمع ہو گئے اور خان کو پکڑ کر کوتوالی لے گئے۔ کوتوالی میں فریقین نے اپنا اپنا بیان دیا۔ آخر کوتوال نے حکم دیا کہ پٹھان کو گدھے پر سوار کر کے شہر میں پھرایا جائے۔ پٹھان گدھے پر سوار نکلا تو لڑکے آگے پیچھے ساتھ ہو گئے۔ شام کو پٹھان سرائے میں واپس پہنچا۔ چند روز گزار کر جب وہ وطن لوٹا تو کابلیوں نے اس سے پوچھا کہ لاہور دیکھ آئے؟ پٹھان نے جواب دیا کہ لاہور لاہور ہی ہے۔ لوگوں نے پھر پوچھا کہ بتاؤ تو سہی، لاہور کیا ہے؟ پھر اس نے جواب دیا کہ لاہور کی شان یہ ہے کہ مٹھائی مفت، شہر کی سیر کرنے کے لئے سواری مفت اور سواری کے ساتھ جلوس بھی مفت!

(ہنسی اور قہقہے)

استاد :- سنجیدگی، سنجیدگی! ___ نامعقولو! کلاس کا احترام کرو۔ یہ کہانی دلچسپ تو ہے مگر غیر ضروری طور پر بیان کی گئی ہے۔ اس سے سبق کی کوئی مزید وضاحت نہیں ہوئی۔ اس سے تو بہتر تھا کہ وہ فقرہ دوہرا دیتے کہ "شراب مفت قاضی را حلال"۔

دوسرا شاگرد :- استاد صاحب! میں پوچھتا ہوں کہ جب مسئلہ اتنا صاف ہے تو یہ متضاد بیان کیوں شائع ہوتے ہیں؟ کبھی کہا جاتا ہے کہ معاہدہ نہیں ہوا، کبھی کہا جاتا ہے "ہو رہا ہے"۔ ایک طرف اشارہ ہوتا ہے کہ "امداد دینے کا معاملہ زیر بحث ہے" دوسری طرف سننے میں آتا ہے کہ حکومت کی شرائط نہیں دیکھی ہیں ۔۔۔ دوست طاقتوں کو اپنے اڈے استعمال کرنے کی اجازت دیں۔ اس سے

خوش فہمیاں ہوتی ہیں

استاد: میاں! یہ تو نیا نیا سیاست کا ذہن کرکٹ پیچ ہے آخر یہ کھیلنے سے غلط فہمی کا کیا تعلق؟

تیسرا شاگرد: کیا امریکی امداد پر پارلیمنٹ میں بحث ہوگی — اگر ایسا ہو تو ہماری طرف سے اس کے خلاف آپ ایک تقریر ضرور کر دیں

استاد: اچھا اور تو ایسی کئی امور اور معاملات پارلیمنٹ میں جہیں طے کئے جاتے۔ اس کو حکومت ہی خسروان پر اعتماد کرنا پڑتا ہے

چوتھا شاگرد: سچ ہیں اعتماد ہے اتفاق ہے استاد صاحب!

ایک شاگرد: لیکن جو چیز پارلیمنٹ میں زیر بحث نہیں لی جا سکتی اس پر سر عام بیان بازی کا حق کیا معنی دارد؟

استاد: یہ کام جب خسروان خود کرے تو پھر کیا اعتراض؟

وہی شاگرد: اچھا تسلیم لیکن یہ بتائیے کہ ہمارے نائٹ کالج میں اس بحث کا پھیلنا جانا کس طرح جائز ٹھہرتا ہے تو ہمیں کیا حق پہنچتا ہے کہ ہم امریکی امداد کے نفع و نقصان پر بحث کریں۔ آج کا سبق درحقیقت خسروان پر یا ایمان باللہ کے موضوع پر ہونا چاہئے تھا۔ بدقسمتی سے سبق خلاف اصول ہو گیا ہے!

استاد: میرے عزیز شاگرد! اچھی بات یہ ہے کہ مجھ سے غلطی ہوئی میں اپنا سبق واپس لیتا ہوں جلدی اٹھو، بتی جلا دو اور آنکھیں کھولو، اور عبد مرضنا کے پردا کر جاؤ — بس جاتے ہوئے یہ خوشخبری لیتے جاؤ کہ اس سبق کے طفیل انشاءاللہ ہمارا نائٹ کالج منظور شدہ ہو جائے گا اور امریکی امداد کی رقم میں سے ہمیں بھی گرانٹ ملے گی۔

(تمام لوگ خوشی سے لاٹین کو بجھانے لگتے ہیں)

(بشکریہ چراغ راہ)

آلِ کمالات مجوری

تضاد

س طرف کاشانۂ عشرت میں روشن ہیں چراغ
س طرف کٹیا میں جلتے ہیں دلِ سوزاں کے چراغ

اُس طرف کاروں میں پھرتے ہیں بصد جاہ و حشم
اِس طرف فاقوں کے مارے لڑکھڑاتے ہیں قدم

س طرف ہے جلوہ فرما روشنی ہی روشنی
س طرف تاریکیوں میں گم ہے شمعِ زندگی

اُس طرف ہے قصر و ایواں میں وقارِ زندگی
اِس طرف ہر خستہ تن ہے سوگوارِ زندگی

س طرف ساقی ہے پیمانہ ہے دورِ جام ہے
س طرف بھیگی ہوئی پلکوں کا تحفہ عام ہے

اُس طرف یہ فکر قائم کیسے رکھیں شان کو
اِس طرف بھر پیٹ کھانا بھی نہیں انسان کو

س طرف زردار کی قسمت حریر و پرنیاں
س طرف جسمِ مہاجر پر ہزاروں دھجیاں

اُس طرف بے فکر ہیں دل اور سینے بے خراش
اِس طرف ہر آنکھ میں خلطیدہ ہے فکرِ معاش

س طرف عیدوں کی خاطر ہیں صف آرا اہلِ زر
س طرف ہیں نیم جاں انساں بساطِ مرگ پر

اُس طرف نغمے نغمے دل نشیں انداز سے
اِس طرف فریاد کی لے ہچکیوں کے ساز پر

س طرف سردی کی آمد پر چھلکتا جام ہے
س طرف سردی کی آمد موت کا پیغام ہے

الغرض یہ صبحِ آزادی یہ تصویرِ تضاد
زندہ باد اے قومِ پاکستان پائندہ باد

م۔ حنیف

تذکرہ

ایک دفعہ کا ذکر ہے، کہ ایک آدمی جو بالکل آپ کی ہماری طرح تھا، اس کا ایک بیٹا تھا، عبدالکریم یا عبداللطیف جو بھی آپ کی ہماری طرح، تو عبدالکریم یا عبداللطیف اتفاق سے ایسی مہنگائی کے زمانہ میں اپنے ماں اور باپ کے ہاں پیدا ہوا جب دو آنے میں مارچ سونگھنے کو بھی نہیں ملتا تھا، اس کے ماں باپ نے اس طرح اسکے بن بلایا مہمان بن کر آجانے سے بہت بُرا مانا جس سے اس عبدالکریم یا عبداللطیف کو سخت صدمہ ہوا۔ گرچہ کہ وہ ابھی چھوٹا، یعنی بہت ہی چھوٹا تھا جیسے کہ بچوں کو بولنا منع ہے، اس لئے جو ہوا خون کے بجائے دودھ کے گھونٹ پی کر چپ ہو رہا۔ ورنہ اسکے جی میں تو آئی تھی کہ وہ کہہ دے کہ اب بھلا آپ جو میرے آنے پر اس طرح ناک اور بھوں چڑھا رہے ہیں، تو بتائیے، بھلا میرا اس میں کیا قصور ہے، یا تو اس میں آپ کی غلطی ہے، اور یا میرے بنانے والے کی مصلحت، میں نے یہ حرکت نہ تو اس لئے کی کہ اپنے پیدا ہونے کے لئے کوئی تھوڑا ہی پسند کیا تھا پھر بھی وقت کی نزاکت اور آپ کی حالت دیکھتے ہوئے میں اقرار کر سکتا ہوں کہ وہ صرف اپنی پیدائش کے دوسرے سامان کے آنے خرچ سے آپ کو بچا کر دودھ اور دودھ کی سوکھی روٹی کھا کر خدا کا شکر بجا لاؤں، بس، میں آٹھ دن سے کر رہا ہوں، اس سے زیادہ اگر آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں، مگر چونکہ وہ بہت چھوٹا، یعنی واقعی بالکل چھوٹا تھا اور چھوٹے بچوں کو بڑوں کے سامنے منہ نہیں کھولنا چاہئے، اس لئے خاموش رہا۔ اس کے ماں باپ نے بھی کچھ دن بیتنے کے بعد حرف بحرف پڑھانے لکھانے پر ہی قناعت کی، وہ اصل وہ ایسے صرف پڑھا لکھا سکتے تھے کیونکہ کچھ اور کرنا، سنا نہیں آتا تھا اور ان کے ہاں کچھ اور کرنا مناسب ہی خیال کیا جاتا تھا۔ الغرض اپنے ماں اور باپ سے یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ اس کے ماں اور باپ نے اس سے اگلوں کو بتایا تھا کہ انہیں ان کے ماں باپ نے بتایا تھا کہ سینہ بہ سینہ نسل در نسل بعد میں بزرگوں سے سنتے چلے آ رہے تھے، کہ اس خاندان میں ابتدا صرف دو ہی

سیکھنے کی اجازت تھی، ایک زیادہ سے زیادہ کمانا، اور دوسرا کم سے کم خرچ کرنا شروع میں اس خاندان نے اس پہلے فن کو سیکھنے میں اپنے ذوق شوق کا ثبوت دیا۔ کہ پہلے طاق اور پھر شہرۂ آفاق ہو گیا، یہاں تک کہ اس فن کی معراج ان کو حاصل ہو گئی، مگر وہ جو مثال ہے، کہ ہر کمالے را زوالے، تو وہ یہاں بھی صادق آئی، یہ ملی ہوئی بات ہے، کہ مثال ضرور کہیں نہ کہیں صادق آتی ہے اور بعد کے ناخلف جانشینوں کے ہاتھوں اس فنِ شریف کا زوال شروع ہو گیا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی، کہ اس خاندان سے زیادہ نہ کوئی امیر اور نہ بے کار، تب اس گھرانے کے لوگوں کو کچھ ہوش آیا، اور انھوں نے بڑے غور و فکر کے بعد زمانے کے حالات دیکھ کر اپنی پرانی ڈگر کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا، اور جو وہ خاندانی فن سینہ بہ سینہ چلا آ رہا تھا اس میں ذرا تھوڑی سی ترمیم کی، کہ پہلا فن زیادہ سے زیادہ خرچ کرنا، اور دوسرا فن کم سے کم کمانا ہو گیا

پھر تو اس روشن خیالی کے سبب اور کچھ اپنی محنت کی وجہ سے پھر اس خاندان کو عروج نصیب ہوا، (جو ظاہر ہے، کہ مثال کے مطابق آنے والے زوال کی نشانی تھا۔) اور ایک وقت ایسا آیا تھا، کہ پہلا سے کم امیر، اور زیادہ سے بیکار کوئی نہ رہا۔

تو جب ہر دو طرح کے فنون کی اس خاندان کے ہاتھوں اس قدر پلید ہو چکی کہ ترمیم تک نہ ہو سکے، تو یہ گھرانا ان دونوں فنون کے ساتھ کے غار میں چلا گیا .... اور وہاں پڑا پڑا سڑنے کے لیا فن کی مشق کرتا رہا، پہلے وہ زمانہ پر بڑبڑایا، پھر خدا پر، پھر دنیا والوں پر آخر کار کوئی فائدہ نہ دیکھ کر اپنے آپ پر بڑبڑایا، اور بڑبڑاتا چلا گیا۔

عبدالکریم یا عبداللطیف کے ماں باپ جب چھوٹے تھے تو ماں باپ نے انہیں خاندانی فن کی خوب مشق کرائی، اور پھر ورثے کے طور پر انہیں سونپ کر مر گئے، جیسا کہ قاعدہ ہے، جب عبدالکریم پیدا ہوا، ظاہر ہے کہ اب تو اس گھر کو کئی نسلیں اس فن میں ہو گئے تھے

ـ نگی کی خاطر ہیں بڑے بڑے کے سپاہی کرچکے تھے، اپنے تنہا
بیکے جسم چرانے، بلکہ پیوں آنکھ کا ایک ہی بلا ہونے کے سبب وہ اکثر
رانیکھتے، کبھی ایک دوسرے کو دیکھ کر، کبھی ایک دوسرے سے منہ موڑ
، اور کبھی عبدالکریم صرت کو دیکھ کر۔

یہ تھا عبدالکریم صرت، کے ان خاندانی حالات کا معاشی، معاشرتی
تی اور سیاسی جائزہ جن میں وہ اتفاق سے، یا اپنے ماں باپ کی غلطی سے
نے پیدا کرنے والے کی مصلحت سے گھر گیا تھا۔

ایسے گھرانے اور ایسے ماحول میں جب اس نے آنکھیں کھولیں تو
موں کا کمزور ہونا لازمی تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پڑھنے کی عمر تک پہنچتے پہنچتے
، عینک کی ضرورت لاحق ہوگئی، جو اسکے ماں باپ نے پہلے تو گھبراہٹ
دادی، مگر بعد میں بہت پچھتائے، مگر وہ جو مثل ہے، کہ اب پچھتاوے کیا
ت، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت، تو وہ یہاں پھر صادق آئی، ۔ ۔ ۔ ۔

وجہ سے عبدالکریم صرت، کے ماں باپ بہت غمگین ہوگئے، عبدالکریم
ـنے، کو کافی عرصہ تک یہ پتہ نہیں چل سکا، کہ ان کے غمگین ہونے کی وجہ آنکھوں
کمزوری ہے یا عینک کی قیمت، بات یہ ہے کہ وہ ابھی غور و فکر کے
ہی کہاں ہوا تھا۔ کافی عرصہ تک وہ مناسب وقت کی تلاش میں رہا
ایک دن اسے ایک موقع ہاتھ آ ہی گیا، اس نے بڑی توجہ سے غور کرنا
ع کیا، مگر تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا، کہ اس کی نظر دھندلا گئی، اور اسے پھر
نمبر کی عینک کی ضرورت پڑ گئی، مختصر یہ کہ کئی بار غور کرنے، اور عینک
بدلنے کے باوجود وہ اس گتھی کو سلجھا نہ سکا، کہ اس کے ماں باپ
کی آنکھ کی کمزوری غمگین کر رہی یا عینکوں کی قیمت، اسی فکر میں غلطاں
آخر وہ جوانی کی سرحد میں داخل ہوا مگر تب سے کوئی اطلاع نہ ملی، اور نہ
نے اسے ٹوکا، اور وہ بغیر دخول اس طرح پہنچ گیا کہ کسی کو کانوں
خبر نہ ہوئی۔

مگر اسکے ماں باپ ایسے بہرے نہ تھے، وہ برابر اس کی حرکات کا
لگاتے تھے، اور اب حالات دیکھ کر انھیں یہ امید ہو گئی کہ عنقریب
عبدالکریم صرت سب کچھ پا لیں گے چنانچہ اسکی شادی کے
لئے انھوں نے ... [illegible]
... [illegible]

ـے مشورہ کیا کہ آخر عبدالکریم صرت کو کیسے استعمال کیا جائے، مگر انھیں یہ
معلوم نہ تھا کہ صرت، اس کا انتہائی مصروف کام ہیں سے کسی کو
بھی اسکی ترکیب استعمال نہیں معلوم تھی، بہت سے لوگ ... ایک پر
ایک کی زبان دراز ہوتی، یہی پوچھا جاتا تھا، کہ کیا سرچھپانا، سو وہ
اور سرچھوڑنا سب ہی مشکل ہے، جب انھوں نے اس پر غور کیا، تو یہ بھید
کھلا، کہ سرچھپانے کے لیے گھر درکار ہوتا ہے، جو آج کل چراغ لے کر بھی نہیں
ملتا۔ اور اگر غلطی سے مل بھی جاتا ہے، تو اسکے ساتھ دیواریں اور چھت نہیں ملتی
صرف فرش ملتا ہے، اور سرچھپانے کے لیے صرف ایک ہی بہتر اور سیدھا
طریقہ ہے، یعنی کلرک ہو جانا، مگر اس کی امید ہی نہیں کہ وہ نوکری پیشہ ہونے
کے قابل ہو چکے ہیں، اب رہا سرچھوڑنا، تو یہ سب سے آسان اور سہل کام
ہے، ختم بھی جلد ہوتا ہے۔ بس صرف اتنی خرابی ہے، کہ بعض دفعہ کام ختم کرنے
سے پہلے پولیس آتی ہے، اور آدمی وہ دل کی دل ہی میں رہ جاتی ہے، پھر
عدالت اس کام کو خودکشی کا بے ہودہ نام دے کر مقدمہ چلاتی ہے، اور نہ
جانے کیا کیا ہوتا ہے۔

یہ سب سن کر عبدالکریم دیہات اب یقین کے ساتھ کہی جا سکتی
ہے، کہ اس کا نام صرت کے بغیر بس عبدالکریم ہی تھا، کہ ماں باپ پہلے تو
دل شکستہ ہوئے، پھر ان کا دل بالکل ہی ٹوٹ گیا، مگر آخر انھوں نے عبدالکریم
کے سامنے اپنی محنتوں کا پھل رکھ دیا، اور پہلے وہ کے، اور پھر جواب کے طالب
ہوئے۔

عبدالکریم نے غور و فکر کرنے کے لئے تھوڑی مہلت، اور ایک نیا
چشمہ طلب کیا، جو انھیں تو ... کافی عرصے کے سوچ بچار اور بحث ...
کے بعد آخر ایک دن عبدالکریم نے اپنے ماں باپ کو خوشخبری سنائی کہ
وہ سرچھپانے، سر اڑانے یا سرچھوڑنے وغیرہ کی بجائے سر کے استعمال کا ایک
نئی قسم سے آگاہ ہوا ہے جس کا نام ہے سرکھپانا، اور جس کا طریقہ ...
... کہ اس میں ... بہت سے شاعر ... ہو گئے ہیں ...
... کسی ... سرکھپانے میں کوئی کامیاب ... پھر
... عبدالکریم ... عبدالکریم ... ان سب ...
... گیا۔ کیونکہ اوروں کے مقابلے میں اس کا سر کہیں ...
... بہت بلند۔

جب عبدالکریم کے ماں باپ کو لڑکے کی بلندی کے متعلق پورا اطمینان ہو گیا تو انہوں نے اسے گھر سے نکل کر گھومنے پھرنے کی اجازت دے دی۔

مگر ان کو کیا معلوم تھا کہ یہ آزادی کیا رنگ لائے گی اور وہ فکر رہے۔ (جیسا کہ عام دستور ہے) بلکہ وہ صرف ٹیوشن ہی نہیں ایک ٹیوشن بھی ساتھ لائی۔ جو ایک لڑکے کی تھی، جو صورت سے بھی اتنا ہی بے وقوف نظر آتا تھا جتنا کہ وہ تھا (دراصل یہ غبی اور کند ذہن لڑکوں کو پڑھانا جان جوکھوں کا کام ہے) — عبدالکریم یہ سب دیکھ کر اس لڑکے کے ساتھ اس کی بیٹھک میں گیا اور وہاں بیٹھ کر سمجھایا، گھر آکر سب سے یہ خوش خبری سنائی۔ تو اس کے ماں باپ بھی وہاں جا کر شکریہ ادا کرنے کو تیار ہو گئے، مگر عبدالکریم نے انہیں سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا کہ اگر لڑکے کے ماں باپ نے یہ غیر معمولی خوشی بھانپ لی تو ان کو فوراً پتہ چل جائے گا کہ لڑکے کی بے وقوفی کے سبب ہم ٹیوشن کو بہت آسان سمجھتے ہیں، اور وہ پھر ٹیوشن منسوخ کر دیں گے، یہ سن کر اس کے ماں باپ نے دل پر (جو بہت عرصے سے ٹوٹا ہوا تھا) پتھر رکھا اور چپ ہو گئے عبدالکریم دوسرے دن سے اس ٹیوشن پر جانے لگا، اور زندگی بھی بسر ہونے لگی (جیسا کہ معمول ہے)

زندگی یوں ہی بسر ہو جاتی، اور ہر گز بسر ہونے سے نہ رکتی، مگر وہ زندگی ہی کیا جو یوں ہی بسر ہو جائے، اور کسی طوفان سے آشنا نہ ہو چنانچہ عبدالکریم کی زندگی بھی ایک نہیں، بہت سے، بلکہ اس سے بھی بڑے طوفان سے آشنا ہو گئی۔

ہوا یوں کہ ایک روز نیا ٹیوشن ملنے پر عبدالکریم ایک نیا چشمہ لے کر وہاں دو تین ہی دن گیا تھا کہ اسے راستے میں دیوار پر لگی ہوئی ایک بڑی سی تصویر نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا، تصویر ایک بہت خوب صورت عورت کی تھی جو عینک باندھے اس کے چشمے کے شیشے پھاند کر اس سے آنکھیں لڑانے کی کوشش کر رہی تھی، ویسے تو عبدالکریم لڑائی جھگڑے سے بہت دور بھاگتا تھا مگر اس بار وہ بالکل مجبور ہو گیا، بات یہ تھی کہ تصویر اس کا نہ تھا غیر معمولی ... آنکھوں ہی آنکھوں میں اس تصویر سے باتیں کرتا رہا، پھر ٹیوشن کا خیال آنے پر کل آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوا جہاں تک وہ پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا رہا، وہ عورت اسے دیکھتی رہی، وہ مطمئن ہو گیا، دوسرے دن سے اس کا معمول ہو گیا کہ وہ اس تصویر کے پاس پہنچ کر تھوڑی دیر ضرور ٹھہرتا۔

لیکن ایک دن عبدالکریم نے دیکھا کہ تصویر دیوار پر سے غائب ہے اسے بڑی گھبراہٹ ہوئی، دیوار کے پاس جو دروازے میں داخل ... نے سامنے کھڑے ہوئے ایک آدمی سے اس کے متعلق پوچھ گچھ کی، وہ ہنسا (جیسا کہ معمول ہے) پھر بولا وہ اندر چلی گئی ہے۔ عبدالکریم اندر جانے لگا تو اس نے کھڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا، وہاں ٹکٹ لیتا جا... عبدالکریم کھڑکی کی طرف بڑھا، اس پر اس آدمی نے کہا ابھی نہیں تیسرے ... تب اندر جانے دیا جائے گا، عبدالکریم بادل ناخواستہ اس وقت لوٹ آیا، مگر پھر پہنچا، اور کھڑکی سے ٹکٹ لے کر اندر چلا گیا، مگر وہاں پہنچ کر اس نے دیکھا اسے دیکھ کر تو وہ کہیں کا نہ رہا، اور کچھ دن بعد صرف وہیں کا ہو رہا

پھر تو روز جانا اس کا معمول ہو گیا۔ کچھ دن بعد اس طوفان (جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے) ایک دن ابر آئی، اور دور، بلکہ کافی دور تک کو بہا لے گئی۔ ایک دن وہ اسی بلڈنگ میں بیٹھا تھا۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا، وہ خود اور اس کے پاس بیٹھے ہوئے سب لوگ اشتیاق سے وہ دیکھ رہے تھے جسے دیکھنے کے لئے وہ کھڑکی میں پیسے دے کر اندر آئے تھے کہ عبدالکریم سے، کسی نے پیچھے سے کندھا تھپتھپا کر، ماچس ... عبدالکریم نے مڑ کر دیکھا، ایک خوش پوش، خوش باش اور خوش فکر نوجوان یہ دیکھ کر وہ بہت خوفزدہ ہوا اور پھر رنجیدہ ہو کر بولا میرے پاس ماچس نہیں۔ نوجوان نے برابر والے شخص سے مانگی، اس نے دیدی، عبدالکریم یہ دیکھ کر ... لے کر جیسے کیا ہو گا، برابر پیچھے دیکھتا رہا، اس نوجوان نے جیب سے ... کر سگرٹ سلگایا، پھر عبدالکریم کو اس طرح دیکھتا پایا کہ اسے بھی سگرٹ ... عبدالکریم نے ایک سگرٹ نکال لیا اور ڈرتے ڈرتے سلگا کر پینے لگا (لیے ڈر لگنا فطری بات ہے بڑے بڑوں کو لگتا ہے، ہم آپ کیا چیز اور عبدالکریم تو بالکل کوئی چیز ہی نہ تھا) سگرٹ پیتے ہوئے اسے دو... اچھا معلوم ہوا، چنانچہ وہ روز کا ... لگا۔ اور جلد ... طرح کا ... وہ جلد ہی اس سے گھل مل گئے، پھر تو وہ ... وقت

کہ ایک دن وہ تیسری ابر ... جس کا آ چکا ہے پچھلی ہوئی انتظار کر رہی تھی، آئی، اور ایک بار عبدالکریم

ے سے بالکل پاس سے تنگ سمجھا دیا، کچھ دن گذرنے ہوتے کہ اسے گھر کا
نا کچھ بے مزہ، اور سر دکھ پھیکا لگنے لگا، اس نے توجہ دی مگر کچھ نہ ہوا آخر
ن ان اس نے اپنی ماں سے پوچھ ہی لیا، مگر جواب سن کر اسے بہت حیرانی
ی کہ اب دولتے روپے ہی نہیں دیتا کہ اچھا کھا پی سکے۔ اس نے جلدی
ے بینک صاف کی، اور غور کر کے اس نتیجے پر پہونچا کہ جو کچھ آدھے سے زیادہ
ہے اسے اس بلڈنگ میں جانے اور وہاں دھواں پھیلانے کے دیتے
تے ہیں۔ اس لئے اس کے پاس ماں کو دینے کے لئے کچھ نہیں بچتا۔
وڑی دیر مزید غور کر کے اس نے ماں کو اپنا فیصلہ بتا دیا . . . جسے سن کر وہ
ابکا رہ گئی ملتے میں باہر سے عبدالکریم کا باپ گھر میں آیا۔ اور یہ سین دیکھ
پہلے تو بوکھلایا، مگر پھر سنبھل گیا اور عبدالکریم کی ماں سے حال پوچھنے لگا
باوجود کوشش کے وہ کچھ بتا نہ سکی۔ کبھی ہکا رہ جاتی۔ اور کبھی بکا، اور کبھی
رلوں۔ آخر میں وہ رونے لگی، مجبوراً عبدالکریم کے باپ نے عبدالکریم ہی سے
چھا۔ اس نے بڑی ہی نرمی سے سب کیفیت اسے بتا دی مگر پھر سخت رنجیدہ
رکر اس کے باپ نے مغلظات سنکر اسے نالائق، ناخلف، احسان فراموش اور
جانے کیا کیا کہنا شروع کر دیا، وہ گھر سے باہر آیا اور گلی سے نکل کر سڑک پر
چلنے لگا، آہستہ آہستہ بجلیاں روشن ہو گئیں، اور اندھیرا بڑھ گیا، ٹہلتے
ہلتے اس کی نگاہ چوراہے کے گھنٹہ گھر پر پڑی، سوئیوں کو دیکھ کر اسے وقت
ت کا احساس ہوا اور وقت نے اسے کچھ یاد دلا دیا، بے اختیار اس کے قدم
ی بلڈنگ والی سڑک پر تیز تیز بڑھنے لگے۔

اور اسی وقت، اسی لمحہ، دور سمندروں کے بیچ میں، ایک سنسان
علم پر کوئی خوشی کے وحشیانہ قہقہے لگاتا، اچھل کود کرتا ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں
ن جیسے بے شمار، پیمانے صف در صف کھڑے تھے اور ان کے بیچ میں
یک اونچی چٹان پر ان میں کا ایک بڑا بیٹھا تھا۔

" استاد، مسرور ناچتا کودتا آیا تھا، صفوں کے پیچھے سے چلایا اور
چلا گیں مارتا ہوا چٹان کے پاس جا پہونچا۔

" استاد۔ مجھے ..... پھر چلایا۔

"کیوں کیا ہوا، کیا کام پورا ہو گیا؟"

"بالکل استاد، بالکل، اب وہ کبھی ہمارا بھی نہیں ہو سکتا" اور اس
نے خوشی کے مارے ناچتے ہوئے پھر ناچنا شروع کیا، بولو سے ایک نے

لگا" اور سب سے کھڑے ہو"

" بیٹھے رہو" ان کا بڑا بولا" آج کے دن سے زیادہ خوشی اور
کامیابی کا دن ہمارے لئے کوئی نہیں، نمبر تین لاکھ ستاسی ہزار چار سو پچپن
——— "استاد"

" ہمارے اس کارکن کی پوری رپورٹ لے کر ریکارڈ میں داخل
کر دو اور اسے خوشی منانے کی چھٹی دیدو"

"مبارک ہو، استاد کو فتح مبارک ہو! ساری صفوں سے
ایک شور اٹھا۔

" نہیں!" وہ بڑا کھڑا ہو گیا، اور سب طرف سناٹا چھا گیا
" ابھی نہیں! اس وقت تک نہیں جب تک اس جیسا ایک بھی دنیا
پر موجود ہے" اور اس نے ایک سمت اشارہ کیا، اٹھی ہوئی انگلی کے
سرے پر ایک انتہائی تیز اور لمبے ناخون کی نوک کی سیدھ میں دور سے
سینکڑوں ہزاروں میل دور، ایک ملک کے، ایک شہر کے، ایک مکان
کی کھڑکی، سب کو دکھائی دینے لگی، جس کے سامنے بیٹھے ہوئے ایک
شخص کا سایہ گردن جھکائے انہماک سے کچھ لکھ رہا تھا . . .

اور اب رات زیادہ ہو جاتی دیکھ کر اس نے عبدالکریم کا تذکرہ
کافی سمجھا، اور یہ آخری جملہ لکھ کر قلم رکھ دیا،

" تو یہ تھا عبدالکریم نامی ایک شخص کا تذکرہ، جو پہلے پیدا ہوا
(جیسا کہ قاعدہ ہے) پھر بڑا ہو کر سیدھی راہ پر چلنے کی تیاری کے بجائے
صرف چلنے کی تیاری کرتا رہا اور آخر ایک ایسی راہ پر چل پڑا، جو اس کی
پسند کی ہوئی بلڈنگ تک جا کر ختم ہو جاتی ہے جہاں اندھیرا ہے،
آگ ہے، اور دھواں ہے"

(بشکریہ نئی نسلیں)

———×———

خریداران رسالہ شیر کی خدمت میں التماس ہے۔ کہ
خط وکتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں تاکہ
تعمیل ارشاد میں تاخیر کا امکان نہ ہو۔

"مینیجر"

افتخار اعظمی

ڈر رہا ہوں میں کہیں مرجھا نہ جائے ایکدن
خوشنما ہے گو بہت تیری تمنا کا کنول

عشق میں تعبیرِ خوابِ آرزو ممکن نہیں
پھولتی ہے یاں مگر پھلتی نہیں شاخِ امل

پیش آتے ہیں بہت سے پیچ و خم اس راہ میں
وادیٔ الفت میں چل لیکن ذرا تھم تھم کے چل

بت پرستی کی وہی رسمِ کہن موجود ہے!
گو نئے ہیں آج کے آذر، نئے لات و ہبل

صرف باتوں سے نہیں ہوتا جہاں میں انقلاب
چاہیئے اس کے لئے ذوقِ عمل، حسنِ عمل

فائدہ کیا، گر نہ ایمان حقیقت بن سکا!
میں سے مانا، خوب ہو رنگیں خیالوں کا محل

تشنہ تو چاہتا ہے تو مری محفل میں آ
بادۂ نو سے بھری ہے میری مینائے غزل

ظہور الحق صدیقی

آپ نہ لیجئے غیر کا نام　　دیکھئے ہوں گے
آہ الم انگیز ہنسی وہ　　موت کے لب
سارا عالم محوِ طرب ہے　　اپنا عالم غم آ
ٹوٹ گیا جب دل کا ساغر　　کیسی مینا
اجڑے ہوئے اس تنگ محل میں　　کیسی صحرا
بگڑی بگڑی آپ نے لوٹی　　ہو گئے ناحق
ان میخانوں کے ساقی آخر　　پھوڑ دو مینا
انکی آمد سے گلشن میں　　عشق ہے
ڈالی ڈالی جھوم رہی ہے　　شاید ہیں
حق کے لئے اب جان لٹا دو　　پھر یاد گئے
اس ساقی سے بڑھ کے لے لے
بڑی چڑانا اپنا جام

نسیم لیہ

شیشہ و سنگ

ب میں نے کہا آج اپنا بھی بیگانہ ہے بیگانہ سب
نے بولے ہنس ہنس کر — دیوانہ ہے دیوانہ ہے
ر گلستاں کی خاطر کانٹوں نے بڑی قربانی دی
ا سی حقیقت ہے باقی افسانہ ہے افسانہ ہے
تنگ آ کر میخانے کا جب میں نے بھانڈا پھوڑ دیا
ساقی یہ کہہ کر ٹال گیا مستانہ ہے مستانہ ہے
باغ میں مالی کے ہوتے سوتی ہوں بہاریں کا تاراج
باغ کو میں کیوں باغ کہوں ویرانہ ہے ویرانہ ہے
نت و تاج کو کیا سمجھے جو فقر کی شاہی رکھتا ہو
فلس طبع، مزاج مگر شاہانہ ہے شاہانہ ہے

امجد قریشی

خلش دردِ محبت کی صدائیں دیگا
عمر بھر کوئی تیرے غم کو دعائیں دیگا
چشمِ نمناک میں ٹھہرا ہوا غم کا آنسو
مشعلِ مہرِ درخشاں کی شعاعیں دیگا
صرف اک اطلس و کمخواب پہ موقوف نہیں
وقت انسان کو عظمت کی قبائیں دیگا
آج ساحل بھی سفینوں کو ڈبو دیتے ہیں
کل کا طوفان بھی سفینوں کو [illegible] دیگا
آخری وقت میں مایوس وفا کو امجد
اب دعائیں کوئی دیگا کہ دعائیں دیگا

عارف شہابی

جب تک ہوسِ جگر کے یہ آنکھ تر نہیں
اے دوست سیلِ اشک میں کوئی گہر نہیں
راہِ حیات و سفرِ محبت تو ایک ہے
لیکن ہزار حیف کہ دل ہم سفر نہیں
مری نگاہِ ذوق کا شاید قصور ہو
ورنہ کہاں نہیں ہے وہ آخر کدھر نہیں
نورِ جمالِ دوست ہے کثرت میں موجزن
تارے نہیں، ابر نہیں، شمس و قمر نہیں
دل میں خیالِ یار کی قندیل تو جلا
پھر دیکھ شامِ ہجر کب تک سحر نہیں
[illegible]
[illegible] کی خبر نہیں
[illegible]
جن میں [illegible] نظر نہیں
[illegible] ہو سکتے [illegible]
[illegible]

افتخار اعظمی

ڈائری

مسلسل

"ماں" ہفتہ عشرے سے مستقل حرارت اور سرگرانی ہے، طبیعت کی بے چینی کسی طرح کم نہیں ہوتی، آج تو اضطراب کچھ اور بڑھ گیا ہے۔ رات کے دو بج چکے ہیں لیکن ابھی تک مجھے نیند نہیں آئی۔ میرا چھوٹا بھائی پاس ہی سو رہا ہے۔ سوچتا ہوں اسے جگا دوں اور اس سے کہوں بھیا! میرا سر دبا دے شاید اس طرح مجھے نیند آ جائے لیکن پھر خیال آتا ہے کہ اس کی نیند کیوں خراب کروں "شب الم" دراز ہی سہی تو اس کی سحر ہو گی۔

چاند کی روشنی بنگلے کے سامنے کمرے میں آ رہی ہے۔ میں نے سوچا چاند کی حسین مسکراتی کرنوں کو "انیس شب غم" کیوں نہ بنا لوں۔ پلنگ سے اٹھا بنگلے کے قریب آرام کرسی پر جا بیٹھا اور چاند کا رخ سیمیں دیکھنے لگا۔ ٹکٹکی باندھ کر، وہ ماہتاب میں "عکس جمال یار" نظر آتا ہے لیکن مجھے اس پیارے چاند کو دیکھ کر اپنی پیاری ماں یاد آئی جس کی شفقتیں ساون کی نکھری ہوئی چاندنی سے کہیں زیادہ لطیف ہیں اور جس کا سایۂ محبت ابر بہاراں سے کہیں زیادہ خنک ہے۔ وہ ایک شمع نورانی ہے جس نے ہمیشہ میرے سینۂ تارِ غم کو اپنے جلوؤں سے منور کیا۔ میں ایک سوئی ہوئی کلی تھا اس نے موج صبا کی مانند مجھے اپنے دم جاں بخش سے جگایا میرے دل ویران میں اسی نے امید کا چراغ روشن کیا۔ دکھ درد میں وہی میری انیس و مونس ہے جب کبھی میں بیمار پڑا تو وہی میرے لئے ساری رات جاگتی رہی بچپن میں مجھے چوٹ لگ جاتی تو میں روتا ہوا اسی کے پاس آتا۔ مجھے گھر کا کوئی بچہ مارتا تو میں ماں سے مدد کی درخواست کرتا۔ مجھے بچپن کا وہ واقعہ کبھی نہیں بھولتا جب بھیا جان نے کسی شرارت پر پہلی مرتبہ دو طمانچے لگائے تو میری ماں دوڑتی ہوئی مجھے بچانے کے لئے آئی۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے کمرے میں لے گئی، اسے ملال تھا کہ میں باپ کے ہاتھوں کیوں پٹا۔ تربیت اطفال کے سلسلے میں اس کا نظریہ رہا ہے کہ بار بار کی مار سے بچوں کا احساس خودی یا "جذبۂ انا" مردہ ہو جاتا ہے اور اس آہستہ آہستہ وہ بے حیا ہو جاتے ہیں۔ ماں کا ہمیشہ سے یہ تصور ہے کہ بچے "گلشن زیست" کے نہایت نرم و نازک پھول ہیں اور ماں کی باغبان کی ہے، اس کا یہ فرض ہے کہ وہ ان معصوم پھولوں کو باد خزاں کے جھونکوں سے بچائے۔

یورپ کا مشہور ادیب وکٹر ہیگو اپنی بیٹی سے مخاطب ہو کر

"بیٹی! اب نماز کے لئے اٹھو پردۂ شب
گر چکا شفق کے سرخ نقوش مٹ چکے۔
ماہ کامل نے سطح دریا پر اپنے چاندی کے پر
پھیلائے۔ صبا نے اپنے ریشمیں ہاتھوں سے
پھول پتوں پر پڑے ہوئے غبار کو ہٹایا۔

بیٹی! خدا سے اپنی ماں کے لئے رحمت طلب کرو اس نے اپنے خون سے تعمیر کیا۔ اس نے تمہارے لئے کلفتیں اٹھائیں۔ خدا نے خوش نصیبی اور تیرہ بختی کے دو پیالے اس کے سامنے پیش کئے، اس نے تیرہ بختی کا پیالہ ہاتھوں میں لیا اور اس میں جو کچھ تھا اسے پی لیا اس لئے کہ اسے اپنے وجود سے زیادہ تمہارا وجود عزیز تھا۔

ان ماؤں کے لئے بھی دعا کرو جو اپنے بیمار بیٹوں کے پاس ہیں، ان کے دل کانپ رہے ہیں، ان کی آنکھوں میں خوف جھلک رہا ہے اس لئے کہ کہیں ان کے لال اس دنیا سے چل نہ بسیں اور انہیں فرقت کی جانکاہیوں میں تنہا زندگی گزارنی پڑے۔ ماں کے دل پر بیٹے کی مصیبت کا سب سے زیادہ اثر ہوتا ہے وہ سب کچھ برداشت کر سکتی ہے"

(انتظار)

اے ماں آج میں عہد طفلی سے نکل کر شباب کی حدود میں داخل ہو چکا ہوں لیکن پھر بھی میں تیرا سہارا ڈھونڈتا ہوں اور تیرے سایۂ

بھی ماہتاب سے ... بہاں سے کہیں زیادہ خنک ہے۔ تیری
"آفتابِ ماہتاب" سے کہیں زیادہ روشن ہیں۔ تیرے چند میٹھے بول
بلبل کے نغموں سے کہیں زیادہ دلآویز ہیں۔ تیرے عتاب میں بھی
"ادائے نوازش" ہے تو رحمتِ یزداں کا ایک "پرتوِ جمیل" ہے تو
پاک نور ہے۔ ماں! مجھے نہیں معلوم کہ میں تجھے کیوں اس قدر
کرتا ہوں اس لئے کہ تو ملکوتی صفات کا ایک حسین پرتو ہے میں
کو صفاتِ قدسیہ کا مظہر سمجھتا ہوں جب وہ ایک حقیقی ماں کے
تی ہے۔ یہی منشاءِ فطرت ہے اور جو عورت بھی اس مقصدِ فطرت
بل کرتی ہے۔ ایسے میں کیوں نہ "چشم و چراغِ کائنات" کہوں "تصویرِ
ات" میں جواب "رنگ و حسن" ہے وہ یقیناً اس کارِ حسن حسنِ
ستانِ حیات کی وہ شمعِ نورانی ہے جس سے "ظلمت خانہ" دہر میں
تنویرِ انبساط" پھیلی۔
بقولِ اقبال گرچہ وہ ایک مشتِ خاک ہے لیکن اپنی صفاتِ قدسیہ
بدولت عز و شرف میں ثریا سے کہیں بڑھ کر اس کا مقام ہے ؎

شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی درج کا دُرِ مکنوں
مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

ربانی ....

غلام محمد یاور بی۔ اے۔

دلِ پُر درد

مری آہوں کا دھواں عرش تلک پہنچا ہے
مری نظروں سے ستاروں کا جگر جھلسا ہے
میرے نالوں پہ سبھی اہلِ فلک تڑپے ہیں
مری پُر درد صداؤں کو خدا سنتا ہے

مہ و انجم کو رُلا دیتی ہے فریاد مری
ہے فرشتوں کی زباں پر بھی تو رُوداد مری
میں نے تقدیر کے ہاتھوں سے قلم چھینا ہے
خود مشیت بھی بھلا سکتی نہیں یاد مری

مری آباد بہاروں پہ خزاں لانے والو!
مری معصوم اُمنگوں کو رُلانے والو
تم سے پوچھے گا خدا حشر کا دن آنے دو!
نشۂ کبر میں قدرت کو بھلانے والو

یہ امارت کا جہاں سوز فسوں ٹوٹے گا!
جبر کے بند و سلاسل سے بشر چھوٹے گا
ہو گی انساں کو انساں کی حقیقت معلوم
سینۂ دہر سے پھر چشمۂ حق پھوٹے گا!

○

کے گزر بھی گئی مگر اے دوست
بں پھول ترستے رہے ہنسی کیلئے

ابھی نہ چھیڑ تو سازِ حیات اے مطرب
ابھی حیات بھی ہے موت آدمی کیلئے

چھلکتے ہیں دن رات ساغر و مینا
، پہ لوگ ترستے ہیں زندگی کیلئے

ابھی بہار کے لب پر ہے ثبت مہرِ اجل
ابھی ستم ہے چٹکنا ہر اک کلی کے لئے

ملا نہ دہر میں کوئی بھی غمگسار نظر
فریب ہم نے بھی کھائے ہیں دوستی کیلئے

قاسم نوری •

بربطِ احساس

شام سے جل گئے ہیں پروانے
شمع کب تک جلے، خدا جانے

موت کی آرزو میں زندہ ہیں
زندگی کے تھکے ہوئے دیوانے

ہر قدم پر ہزار دیباچے
ہر ڈگر پر ہزار افسانے

صرف آدابِ معصیت سیکھاں
مسکراتے ہیں چند دیوانے

[illegible] راہِ حیات کے [illegible]
کب سے ویران ہیں میخانے

اقبال غیور

میٹروپول میں!

کیا فرمایا؟ . . . وقت گذارنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی — تو پھر آپ میرے ساتھ میٹروپول تک چلے چلئے — جی!... کھانے کے لئے جانے کا اس نے سب انتظام کر لیا ہے — اچھا تو آئیے جی ہاں — یہ کراچی کا سب سے بڑا ہوٹل ہے — اور یہ اس کا سب سے بڑا ہال ہے — یہ میزوں اور کرسیوں کی قطاریں کچھ دیر بعد ہونے والے ڈنر کے لئے لگائی گئی ہیں — جی یہ جو یہاں — دراصل یہاں پر مہمان کی نشست مقرر ہوتی ہے۔ اس لئے اس کے نام کی پرچی کرسی پر لگا دی جاتی ہے — جی ہاں یہ خاص طور پر اس لئے لگائی جاتی ہے کہ کہیں غلطی سے کوئی میاں بیوی برابر کی کرسیوں پر نہ بیٹھ جائیں۔ بھلا سوچئے کتنی بے حیائی کی بات ہے کہ بھری محفل میں میاں اور بیوی برابر برابر بیٹھ جائیں — کم سے کم ہماری معاشرت تو ایسی کی اجازت نہیں دیتی — نشستیں مقرر کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے۔ کہ کہیں دو خواتین ایک جگہ نہ بیٹھ جائیں — دو عورتیں اگر ایک جگہ بیٹھ جائیں تو ایک تو وہ اکثر دوسروں کی برائیاں کرنے لگتی ہیں۔ دوسرے ہر موجود اور غیر موجود شناسا کی چال ڈھال پر تبصرہ کیا کرتی ہیں — اور تیسرے یہ کہ شور بہت مچاتی ہیں — ہاں! اور ایک بات اور ہے۔ یہاں ایک رسم یہ بھی ہے کہ لوگ اپنی بیویوں کو ساتھ نہیں لاتے — یہ رسم اس وقت شروع ہوئی جب ایک دفعہ ایک صاحب ناچ کے لئے ایک صاحبہ کو اپنے ساتھ لے گئے۔ تو ان کے پیچھے ذرا ان کی بیوی نے ہال کی چھت کو سر پر اٹھا لیا — اور دھمکی دی کہ اگر دوبارہ کبھی ایسے واپس نہ کیں — تو وہ آسمان کو بھی اپنے سر پر اٹھا لے گی — ہال کی چھت اٹھ جانے سے بیگمات کی بے پردگی کا خطرہ تھا۔ اور آسمان کے اٹھ جانے سے خطرہ یہ تھا کہ کہیں فرشتوں کی نظر اس ہال میں [illegible] — [illegible] تمام مہمان [illegible] بیٹھ گئے ہیں — وہ صاحب جو ابھی ابھی

اپنی کرسی سے اٹھے ہیں آج کی تقریب کے مہمانِ خصوصی معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے کچھ کہنا شروع کر دیا — وہ سب کو نصیحت کر رہے ہیں۔ کہ انہیں اپنا مذہب اور کلچر کسی حالت میں نہیں چھوڑنا چاہئے کیونکہ یہی ان کی قومی وحدت کی بنیاد ہے — ارے ارے — اس بیرے کو دیکھئے اس نے ابھی ایک دوسرے بیرے کی طرف دیکھ مارا اور دونوں مسکرا دیئے — نہ معلوم اس تقریر میں مسکرانے کے لئے کیا پڑ گیا۔

لیجئے مہمانِ خصوصی کی تقریر ختم ہو گئی — اچھا جب یہ لوگ کھانا کھائیں ہم ایک ایک سگریٹ کیوں نہ پی لیں — آپ تکلف نہ کریں۔ یہ لیجئے سگریٹ۔ البتہ آپ کو ماچس دینی ہو گی — شکریہ — جی؟ . . آپ کا مطلب ہے یہ غیر ممالک کی بیگمات اتنی کیوں ہیں؟ — دراصل بات یہ ہے کہ پاکستان سے جب بھی کوئی محبِ وطن کسی ترقی یافتہ ملک میں جاتا ہے۔ وہاں سے ایک ہی جذبہ لئے ہوئے لوٹتا ہے کہ کاش وہ بھی اپنے وطن کو ایک ایسا ہی متمدن اور مہذب بنا سکے — اسی جذبے کے ماتحت ان میں سے بعض لوگ ترقی یافتہ بیویاں کر لاتے ہیں۔ تاکہ وہ ملک کی عورتوں میں کچھ بیداری پیدا کر سکیں — آج کی تقریب کے بعد ناچ کا انتظام اسی لئے کیا گیا ہے تاکہ ہماری پاکستانی [illegible] نہ جائیں — آنکھ [illegible] انتہا [illegible] کی نشانی ہے — جی ہاں خدا کرے [illegible] ختم ہو گیا ہے — آپ کا مطلب ہے یہ شربت؟ میں بھی سوچ رہا ہوں کہ اس [illegible] یہ لوگ [illegible] شربت سا لا کر کیا پی رہے ہیں — [illegible]

ہے ——— خیر یہیں کیا۔ ہو گی ——— میرا تو خیال ہے کہ
بال ردم کی طرف تک سکتے ہیں۔ کیونکہ کچھ دیر بعد یہ لوگ
پٹ کو سجائیں گے اور پھر ہم وہاں بیٹھنے کے لئے کوئی اچھی
ل سکیں گے ——— آئیے چلیں ——— کیسے بیگم
ئی ——— ! جی ہاں ہم بہت اچھے وقت پر آ گئے کہ
ؤ آنے شروع ہو گئے ہیں ——— ابھی تو یونہی گپ شپ
ہ ——— وہ لیجئے اس پردے کے پیچھے ہلکا ہلکا سا
ہو گیا۔ جی ہاں اس ساز کے سر اسی طرح رفتہ رفتہ اونچے
——— بعض لوگوں نے تو موسیقی کی سر تال پر غور کرنا
کر دیا ہے ——— ارے ! . . . . . اچھا آپ گھبرائیے
ب ناچ باقاعدہ شروع ہو گیا ہے ——— جی ؟ سلنڈر ا !
میں تو ایک خاص فائدہ ہے۔ یہ تو ہماری عورتوں کے لئے
ہے۔ اس سے ان کی جرأت میں اضافہ ہو گا ———
ں تو بودے پن کا ابھی تک یہ حال ہے کہ اگر اس وقت عورتیں
ستان کے کسی عام مرد کو بھی اس ہال میں چھوڑ دیا جائے تو
چلانے لگے ——— جی ہاں جرأت کے بغیر تو انسان سچ
مومن بن ہی نہیں سکتا۔ اقبال کا وہ شعر آپ نے سنا ہے ؟
ا ۔ ؟ کوئی صاحب آپ سے ٹکرا گئے ؟ ؟ ؟ اوہو ! تو اس کیا
ی کونسی بات ہے ——— اچھا تھوڑی دیر تو اور بیٹھئے ———
جانے دیجئے ——— اس وقت تو راستہ ڈھونڈنا
ہو جائے گا ——— اچھا صاحب آپ نہیں مانتے تو پھر
ذرا سنبھل سنبھل کر ——— دیکھئے کہیں گر نہ جائیے آپ
ئیے کبھی ——— کس سے ٹکرا گئے تھے آپ ——— صاحب تھیں
——— ارے وہ بیچاری خود بھی گری پڑی جا رہی تھیں ———
سنبھالا دیا تو دیا پہچانا انہیں ——— کیا ؟ کوئی اور صاحب
انہیں ——— بہت تو خیر ٹھیک ہے . . . . . ہاں
یجئے کہ دروازے تک تو آ ہی گئے ہیں ——— اوہ ! باہر تو
ہے ——— کیا تھا آپ نے ——— طبیعت بگڑ رہی ہے
ؤ ——— لیجئے صاحب ٹیکسی تو اس وقت ہی مل سکی ہو دل ———

ڈھونڈنے آتے ہیں ۔ اور آپ کو اسکے نام سے وحشت ہو رہی ہے
بھی کیا شبہ ہوا تھا آپ کو ؟ ۔ سچ بتائیے وہی صاحبہ وہاں گری پڑی
تھیں . . . . . ؟ کون سے بڑے لیڈر کی . . . ؟

اگر آپ کا نام اور خریداری نمبر بھی ذیل میں درج ہے

تو سمجھ لیجئے کہ آپ کی خریداری مدت ماہ مئی سنہ ۵۲ء سے ختم ہے۔ آپ کے نام گشتی مراسلہ بھی جاری کیا جا رہا ہے۔ مہربانی فرما کر اپنا سالانہ چندہ بذریعہ منی آرڈر روانہ فرما کر شکرگزار فرمائیے یا پھر اپنی خواہش سے مطلع کیجئے اگر آپ نے خاموشی سے کام لیا تو ماہ جون کا شمارہ بذریعہ وی پی ارسال خدمت کیا جائے گا۔ اور اس کا وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔ ——— منتظر کرم منیجر رسالہ مشیر کراچی"

نمبر خریداری	نام	سکونت			
			۱۰۹۵	ایوب علی خاں صاحب	راجن پور
۱۰۵۷	ناظم دارالمطالعہ جماعت اسلامی	گوجرہ	۲۰۰۱	عبدالمتین صاحب	رحیم آباد
۱۰۶۰	سید ابوالخیر صاحب قادری	بہار کالونی کراچی	۲۱۲۶	محمد اشرف الدین	راولپنڈی
۱۰۶۴	ایم محمد دین صاحب پٹواری نہر	جال والہ بہاولپور	۲۱۳۷	چودھری فضل دین	لائل پور
۱۰۶۷	نیاز محمد صاحب	چھوٹا زمیش	۲۱۴۱	فریدہ خاتون	سیہوڑ ریاست
۱۰۷۱	سلطان محمد صاحب رکن جماعت اسلامی	کروڑ ملتان	۲۱۴۲	ملک خدا بخش	تلہ گنگ چکوال
۱۰۷۳	احمد سعید خاں	ملوچ چترال	۲۱۴۳	تاج نعیم	کوئٹہ
۱۰۷۴	عبدالغنی صاحب	گڑھی دوپٹہ	۲۱۴۵	ایم باغ علی	سہجرہ
۱۰۷۶	سید مظفر علی شاہ	لاہور	۲۱۴۷	واحد علی صاحب	اورنگ آباد
۱۰۷۷	باکر شاہ کاظمی	میکلوڈ روڈ کراچی	۲۱۴۸	محمد عارف	راولپنڈی
۱۰۷۸	چودھری عبدالقادر قریشی	کھیالی گوجرانوالہ	۲۱۵۲	ناظم مکتبہ جماعت اسلامی	کانجن
۱۰۷۹	قاضی فیض الحسن صاحب	ملتان روڈ لاہور	۲۱۷۷	اکرام احمد خاں	اعظم گڑھ
۱۰۸۴	انعام اللہ صاحب	بغدادہ (مردان)	۲۱۸۴	محمد یونس صاحب	گوجرانوالہ

کہتا ہوں سچ!

ہم لوگ دو گھنٹوں سے کیرم کھیل رہے تھے۔
میں تھا بھابی جان تھیں، اسلم تھا، اختر آپا تھیں۔ بھابی جان اختر آپا تھیں اور اسلم میرے ساتھ۔
ہماری پارٹی مسلسل تین بازیاں ہار چکی تھی۔ اور اسی لیے تو اختر آپا حد سے زیادہ خوش نظر آ رہی تھیں۔ اور بھابی جان رہ رہ کے ادھر ہی تھیں ——— ذرا کھل گئی ——— یہی ہم عورتیں تم مردوں سے کم ہی کیا حقیقت یہ ہے کہ اگر میرے ساتھ سچ مچ کوئی مرد کھلاڑی ہوتا تو ہم ہرگز تو اسلم کو یوں ہی رکھ لیا تھا۔ بے چارہ دس بارہ سال کا بچہ۔ بلکہ اسلم ہلنے سے تو کہیں اچھا تھا کہ میں سنگل ہینڈ ہی کھیلتا۔
بھابی جان کے لوگوں سے ناک میں دم آ گیا تھا اور اسلم پر میں برافروختہ تھا تک کہ وہ بلا سا گیا تھا اور اس کی صورت بڑی قابلِ رحم نظر آنے .... اور مجھے خود اس پر رحم آنے لگا تھا۔
اختر آپا نے کوئین کیلئے کوشش کی مگر جھجک کو اسلم کو انگلی ہینڈ مل چکا اختر آپا اور بھابی جان کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا لیکن جب اسلم لے سکا تو ان کے چہرے پھر سے دمکنے لگے میرے لیے کوئین کی کوشش [illegible] پھر میں نے کوشش کی اور اب وہ بھابی جان کو اتنا ہینڈ مل گئی کوئین کے علاوہ اپنے تین مہرے اور سے ڈالے اور میں فخر ارادی [illegible] کر دیکھنے لگا اور بھابی جان نے بڑے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ وقت بھابی جان کا اسلم کو پیار کرنا مجھے حد درجہ طنز آمیز محسوس۔

میں سنگل ہینڈ ہی کھیلوں گا۔ میں نے سنتری اور ککر لیتے ہوئے کہا۔ بھابی جان اور اختر آپا نے اچھا دیکھتے ہیں وہ کہتی ہیں ہی مجھے [illegible] اور میں [illegible] اکیلا ہی [illegible] دن [illegible] ختم [illegible] جانتے ہیں

بھابی جان کب تک مجھے چھیڑتی رہیں۔
ٹھیک اس وقت کیرم کے فرسٹ کلاس کھلاڑی انور بھائی کا وارد ہونا میرے لیے بہت زیادہ خوشی کی بات تھی میں اپنی جگہ سے اچھل ہی تو گیا۔ پھر میں نے انور بھائی کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔
آئیے انور بھائی اب ذرا دیکھوں، بہت چہک رہی تھیں بھابی جان۔
لیکن ہمیشہ مسکراتے رہنے والے اور کبھی سر جھکا کے بیٹھنے والے انور بھائی سدا بہ مسکین صورت بنائے۔ بالکل چپ چاپ جیسے آپ نے آئے اور چپ چاپ کرسی پر بیٹھ گئے۔
"تو اب آئے آپ؟ بھابی جان انور بھائی سے بولیں کل تو اپریل فول سے ڈر کر ادھر جھانکے تک نہیں۔"
نہیں بھابی جان، یہ بات نہیں۔ انور بھائی اتنی سنجیدگی سے بولے جیسے وہ اداکاری کر رہے ہوں۔ کیونکہ سنجیدگی تو ان کے حصے میں آئی ہی نہیں تھی
بات کیا ہے؟ بہت اداس اداس سے نظر آ رہے ہو؟ بھابی جان نے پوچھا۔
اور یہی تو اسی وزن دو جب ہے کہ کل میں آیا نہیں۔ انور بھائی نے کہا۔
خیریت تو ہے نصیب دشمناں مزاج تو اچھے ہیں بھابی جان مسکرا کر بولیں۔
ہاں بھابی! انور صاحب کہنے لگے۔ مجھے کچھ کہنا ہے برسوں میں اسی ارادے سے آیا تھا۔ مگر موقع نہیں پا کر میں نے کچھ نہیں کہا۔ لیکن جو کچھ مجھے کہنا ہے وہ بات میرے سینے میں اب زخم کی طرح چبھنے لگا ہے اب بغیر کہے مجھے سکون نصیب نہیں ہو سکتا اور کل کہہ دیتا تو وہ بات یقینی طور پر کچھ ہی دیتا۔ لیکن یقین ہے کہ آپ اسے اپریل فول کا مذاق سمجھیں اسی لیے میں پرسوں کل آیا ہی نہیں۔
کیا بات ہے؟ بھابی جان [illegible]

طرف دیکھا جیسے نظروں سے کچھ کہہ گئے مگر انور بھائی خاموش بیٹھے رہے ان کی خاموشی عجیب سی تھی کہ بھائی جان کے لیے سوالیہ نشان بن گئی ہم لوگ بھی طرح طرح سے سوچنے لگے۔ آخر کار بھائی جان نے وہ سب کہہ ہی دیا

"کوئی تو بات ہے ـــــ" بھائی جان بہت پریشان نظر آنے لگیں تھیں۔

"بھائی جان ـــــ" انور بھائی بہت آہستہ سے بولے ـــ "سہیل بھائی ...... سہیل بھائی نے ...... "انور بھائی پوری بات نہ ہی کہہ سکے۔

سہیل بھائی کا نام سن کر ہم لوگ سب کے سب گھبرا گئے یہاں تک کہ [illegible] ہماری باتوں سے کوئی اثر نہیں لے رہا تھا خاموشی سے انور بھائی کی طرف دیکھ رہے تھے لیکن بھائی جان سب سے زیادہ پریشان سی نظر آنے لگیں ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں پتہ نہیں ان کے دل میں سہیل بھائی کے بارے میں کیسے کیسے خیالات آن کی آن میں جمع ہو گئے ہوں گے۔ پھر بھی [illegible] ضرور تھا کہ خدانخواستہ سہیل بھائی کو کچھ ہوا نہیں ہے کیونکہ [illegible] انور بھائی ان کے پاس سے آئے تھے اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو انور بھائی ضرور بتاتے اور اس کی خاص وجہ یہ بھی کہ انور بھائی اور سہیل بھائی اکٹھے ہی اس [illegible] میں کام کرتے تھے اور ان دونوں میں گہری دوستی تھی کہ انور بھائی بھی ہمارے خاندان کے ایک فرد ہی نظر آتے تھے! اور یہ حالات شک پیدا کر رہے تھے کہ سہیل صاحب کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آیا ہو اور انور بھائی ہمیں نہیں بتا رہے لیکن اس اطمینان کے باوجود حقیقت حال معلوم کرنے کے لیے بہت پریشان تھے۔ اور چند لمحے چپ رہنے کے بعد بھائی جان تو نہ جانے کیا سوچ کر یک لخت بول اٹھیں

"کیا بات ہے انور ـــــ ان کے دشمنوں کو کیا ہوا ہے؟"

"بھائی جان" انور بھائی کہنے لگے۔ "یہ عشق بہت ہی بدتمیز قسم کا مرض ہوتا ہے"

انور بھائی کچھ اس طرح سے ہنس پڑے جیسے وہ کچھ بھی نہ سمجھ پا رہے ہوں اور کچھ بھی نہ سمجھ سکے ہوں کیونکہ جیسے ہی جواب ہو گیا تھا ان کے چہرے کا رنگ بدل تو چکا ہی تھا۔ بہت پھیکا پڑ گیا ـــــ"

"آپ صاف بات کیوں نہیں کہتے؟" اختر آپا ناک بھوں چڑھا کر بولیں اور اختر آپا کے چہرے پر جیسے ناراضی اور فکر جھلکنے لگی تھی انور بھائی بہت غور سے اختر آپا کی طرف دیکھنے لگے اور بات جلدی جلدی کہنے لگے

"بات یہ ہے کہ بہت زمانے سے سہیل بھائی کو ایک لڑکی سے عشق تھا! انہوں نے اس سے شادی کر لی ہے"

"انور ـــــ بھائی جان گر گئیں۔ ہوش کی دوا کرو انور"

"کیا کہہ رہے ہیں انور بھائی؟" اختر آپا نے بھی حد سے زیادہ متحیر ہو کر پوچھا۔

"ٹھیک کہہ رہا ہوں اختر" انور بھائی حد درجہ سنجیدگی سے بولے "سہیل بھائی کی رگ رگ سے واقف ہوں"

بھائی جان یک لخت کمرہ بورڈ کی طرف سے مڑ گئیں اور انور بھائی کا چہرہ خوب غور سے دیکھنے لگیں جیسے وہ ان کے چہرے پر پڑھنا چاہ رہی ہوں کہ ان کے بیان میں کتنی حد تک صداقت ہے اور انور صاحب بدستور حد درجہ مسکین صورت بنائے خاموش سر جھکائے بیٹھے تھے۔ بھائی جان انہیں دیکھتی رہیں مگر وہ ایسے ہی رہے۔ پر انور بھائی کے چہرے میں وہ بجز اس کے کچھ بھی نہ دیکھ سکیں کہ انور بھائی کے دل میں بھائی جان کے لیے سچی ہمدردی ہے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے بھائی جان کی آنکھوں میں آنسو کے چند قطرے ڈھلنے لگے [illegible] انتہائی بے تابی سے گردن جھکا لی لیکن وہ زیادہ دیر تک اس حال میں نہیں رہ سکیں جیسے تڑپ کر بولیں۔

"کیا یہ سچ ہے انور؟"

"سچ کہتا ہوں۔ بالکل سچی بات ہے بھابی ـــــ" انور بھائی سنجیدگی سے کہنے لگے۔ "آپ کی قسم سچی بات ہے بھابی جان!"

اختر آپا اٹھیں اور انور بھائی کے کوچ کے پاس ہی ایک بچھا کر بیٹھ گئیں۔ میں بھی ادھر بیٹھا تھا اور بھائی جان نے جیسے بہت کچھ ہو کر کمرہ بورڈ پر سر دھر دیا۔

"آپ کو کیسے معلوم ہوا۔ انور بھائی؟" اختر آپا نے بڑی تحمل کے انداز میں کہا۔

"یہ بات چھپی ہوئی نہیں ہے اختر" انور بھائی نے کہا۔ "بھائی جان کو سمجھاؤ"

لیکن بھائی جان خود ہی سنبھل گئیں اور انہوں نے بورڈ

ایسا لگا جیسے آنسو کے چند صاف شفاف قطرے موتیوں کی طرح لرز کر رہ گئے ہیں۔ محسوس ہوا کہ بھابی جان کا سارا بدن ہی لرز رہا ہو۔ وہ سنبھل کر بیٹھی رہیں۔ پھر اٹھیں اور بھاری بھاری قدم اٹھاتی انور بھائی کے پاس پہنچ گئیں۔ اور پھر خود ہی سنبھال سی ہو کر کوچ ہی پر بیٹھ گئیں۔ یونہی لیٹی ذرا سی۔ اور ان کی مسکراہٹ ایسی محسوس ہوئی جیسے زہر میں بجھا ہوا تیر۔ عجیب انداز میں بولیں۔

"کیسی ہیں بیگم صاحبہ۔"

"صورت شکل تو بہت اچھی ہے" انور بولے "کافی پڑھی لکھی ہیں خاندان کی لڑکی ہے۔ یہ شادی اس کی پہلی ہی شادی ہے"

"شریف خاندان کی لڑکی!" بھابی جان پھر مسکرائیں اور اب لگا جیسے ان کی مسکراہٹ نے فضا کو پورے طور پر مسموم کر دیا

"جی ہاں ——" اختر آپا نے منہ بچکایا "فلم میں کام کرنے والی اور شریف خاندان!"

"نہیں نہیں" انور بھائی جلدی سے بولے "یہ بات نہیں اختر اس کا فلم سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ بیچاری تو ایک گھر گرہست لڑکی تھی"

"جی ——" بھابی جان نے اس "جی" کو بہت لمبا کھینچا۔

"سچی بات ہے بھابی جان" انور بھائی بولے "وہ شریف خاندان کی ہے اور ایک عرصہ سے بھائی جان سے عشق کر رہی ہے"

"غلط —— بالکل غلط" بھابی جان حد درجہ جذباتی ہو کر کہنے لگیں "انہیں میرے علاوہ کسی سے محبت نہیں" اور ان کے چہرے سے یہ صاف ظاہر ہونے لگا کہ وہ محسوس کر رہی ہیں کہ انہیں ایسی بات کم از کم میری اور انور بھائی کی موجودگی میں ہرگز نہ بولنا چاہئے تھا۔

"ہاں۔ انہیں صرف بھابی جان سے محبت ہے" اختر آپا نے کہی۔

"تو گویا آپ لوگوں کا مطلب ہے کہ میں جھوٹ کہہ رہا ہوں" انور بھائی کسی قدر جھنجلاہٹ سے بولے "میں نے کہہ دیا نا بھابی جان کو اسی لیے تو میں چپ تھا۔ کہ آپ لوگ میری باتوں کو اپریل فول کا مذاق سمجھیں گی"

اختر آپا سناٹے میں آ گئیں۔ اور بھابی جان سے اب ضبط نہ ہو سکا۔ بری طرح [illegible] لگیں کے لب کانپنے لگے آنسو

دیا۔ ان کی آنکھیں اور بھی جھک گئیں اور وہ کوشش سے اٹھیں۔ کچھ لمحوں تک عجیب غریبانہ انداز میں ہم لوگوں کو تکتی رہیں۔ اور پھر پاگلوں کی سی تیزی سے گھر کے اندر بھاگ گئیں۔

اس دن پہلی بار مجھے بھائی جان پر بڑا غصہ آیا۔ آخر یہ کون سا عشق ہوا سراسر بدتمیزی۔ اتنی خوب صورت سمی سی گول پڑھی لکھی بھابی جان کو چھوڑ کر آخر انہیں عشق لڑانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اور پھر عشق تو نامہ و پیام تک محدود رہتا۔ یہ کیا حماقت ہوئی کہ آپ نے شادی بھی کر ڈالی۔ سچی بات ہے میرا جی چاہا کہ اگر بھائی جان اسلم سے ہوتے تو میں اس وقت ان کی اتنی مرمت کرتا کہ سارا عشق ہی ختم ہو جاتا۔ ابھی ابھی کوئی کا چانس خراب کرنے پر مجھے جتنا غصہ اسلم پر آیا تھا۔ اس سے کہیں زیادہ غصہ بھائی جان پر آیا

اختر آپا بھی جیسے جلی بھنی بیٹھی تھیں۔ حد درجہ تیکھا سا انداز میں کہنے لگیں۔

"دیکھئے انور بھائی۔ اگر آپ مذاق کر رہے ہیں تو یہ مذاق ہرگز اچھا نہیں۔ پتہ نہیں کہ بھابی جان کیا کر لیں؟"

"تمہیں تو خواہ مخواہ میری باتیں ہمیشہ مشکوک معلوم ہوتی ہیں" انور بھائی زور سے بولے۔ "میں کہتا ہوں۔ دیکھو۔ میں ثبوت دیتا ہوں"

بجلی کی سی سرعت سے انور بھائی نے اپنی جیب سے نوٹ بک اور فاؤنٹن پن نکال کر اختر آپا کی طرف بڑھایا اس میں لکھا تھا "میں تصدیق کرتا ہوں کہ سہیل بھائی نے ایک شریف خاندان کی شریف خوبصورت تعلیم یافتہ لڑکی سے باضابطہ شادی کر لی ہے۔ اگر یہ بات غلط ثابت ہوئی تو میں کسی قسم کی بھی سزا بھگتنے کے لئے تیار رہوں گا"

اب اختر آپا کافی کھوئی کھوئی سی نظر آنے لگیں۔ اور میرے دماغ میں بھی بے شمار اگر مگر وغیرہ چکر لگانے لگے۔ اگر یہ بات سچ ہی ہے تو پھر بھابی جان کا کیا ہو گا؟ مگر یہ غلط کیسے ہو سکتا ہے۔ جب کہ انور بھائی لکھا پڑھی کے ساتھ اور اتنی دلیری سے بیان کر رہے ہیں؟ لیکن یہ سچ کس طرح ہے۔ جب کہ بھائی جان نے بھابی جان سے اپنی مرضی کی شادی کی ہے... اپنی مرضی کی بھی اور محبت کی بھی —— میں بری طرح الجھنے لگا۔ یہاں تک کہ مجھ سے وہاں پر بیٹھنا تک مشکل ہو گیا۔ اور میں نے جلدی سے اختر آپا سے کہا۔

"بھابی آپا سے بھائی جان کے پاس بیٹھیں"
مگر اُنہوں نے میری بات کی طرف دھیان نہیں دیا۔ انور بھائی سے
بولیں۔
"دیکھئے انور بھائی میں امی جان سے کہنے جا رہی ہوں سب بھی
آپ نہیں جانتے۔ سوچ سمجھ لیجئے۔"
"کیا تماشہ ہے" انور بھائی جھنجھلائے۔ "تم مجھے بالکل بچہ سمجھتی
ہو اختر۔"
اختر آپا ذرا جھینپ سی گئیں۔ اور تیزی سے اٹھ کر بھابی کے
کمرے کی طرف چلی گئیں۔ ان کے ساتھ ہی میں بھی بھابی جان کے کمرے
میں داخل ہو گیا اور انور بھائی میرے ساتھ آئے مگر بھابی جان کے
کمرے میں نہیں گئے بلکہ کمرے کے باہر ہی ایک کرسی پڑی تھی۔ اس پر بیٹھ کر کچھ
سوچنے لگے۔

ہم لوگ اس وقت وہاں چوکڑی جماتے اور ماحول کو دیکھتے رہتے...
لیکن خلافِ معمول ہمیں غیر معمولی طور پر سنجیدہ دیکھ کر امی جان بھی کمرے
میں آ گئیں۔

کمرے کا ماحول اتنا عجیب سا تھا کہ طبیعت اکتا گئی تھی۔
ایک طرف پلنگ پر بھابی جان تکیہ میں چہرہ چھپائے اوندھی پڑی تھیں...
دوسری طرف آپا بہت غور سے انور بھائی کے لکھے ہوئے پرزے کو پڑھ رہی
تھیں۔ تیسری طرف میں تنہا خاموشی سے بھابی جان اور بھائی جان کی
اس بڑی سی تصویر کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ جو تصویر شادی سے پہلے بھائی جان
کے کسی منچلے ساتھی نے چوری چھپے کھینچ لی تھی۔ جس میں بھابی جان اور
بھائی جان کسی بہت ہی اہم پہلو پر باتیں کرتے نظر آتے تھے۔ وہ دونوں
شاید کسی حد تک زیادہ سنجیدہ سماجی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔
کیونکہ وہ اپنے گرد و پیش سے بالکل بے خبر نظر آ رہے تھے۔ اور ہم لوگ بھی
اس وقت گرد و پیش سے قطعی طور پر بے فکر تھے۔ یہاں تک کہ یہ کہنا
ہرگز مبالغہ نہ ہوگا کہ کمرے میں امی جان کے آنے کا ہم میں سے کسی کو بھی علم
نہ ہوا۔ اور پتا نہیں کب تک علم نہ ہوتا۔ لیکن امی جان نے ایک طویل "ہوں"
کی تو ہم لوگ چونکے۔ سب امی جان کی طرف متوجہ ہو گئے۔
"تم لوگ کس سوچ میں ہو۔ کوئی نئی شرارت کی اسکیم پر غور ہو رہا ہے؟"

امی جان نے کہا۔
"نہیں امی" اختر آپا کچھ اس طرح بولیں جیسے اب ضرور رو دیں گی
لیکن وہ روئی نہیں کہنے لگیں۔ "یہ بات نہیں امی جان بلکہ........
بلکہ......" وہ نہ کہہ سکیں۔
"کیا بات ہے" امی جان کو ہماری سنجیدگی اور کمرے کے
گھٹے گھٹے ماحول سے ذرا تشویش ہوئی۔
اختر آپا نے الف سے ی تک سارا قصہ کہہ سنایا۔ امی جان کا
چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ وہ بہت پژمردہ سی نظر آنے لگیں۔ وہ چند لمحوں تک کچھ
سوچتی رہیں پھر انتہائی جذباتی انداز میں کہنے لگیں۔
"نہیں نہیں — یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ سہیل میری کوکھ کو ہرگز
بدنام نہیں کر سکتا۔ وہ شادی شدہ ہو کر کنواروں کی سی حماقتیں نہیں کر سکتا
اور پھر وہ عشق کی فرسودہ اور بیہودہ روایات کا بھی قطعی طور پر قائل نہیں۔
یہ خبر ہرگز درست نہیں ہو سکتی۔ انور نے بے شک ذرا گھٹیا قسم کا مذاق کیا
ہے۔"
بھابی جان بڑی تیزی سے اٹھیں اور دوڑ کر امی جان سے لپٹ
کر بولیں۔
"تو کیا واقعی یہ خبر غلط ہے امی جان؟"
"ہاں بیٹا" امی جان نے بھابی کا سر سہلایا۔ "یہ خبر کبھی
درست نہیں ہو سکتی۔ ہو سکتا ہے انور نے تم سے اس مذاق کا بدلہ لیا ہو
جو پچھلے سال اس سے کیا گیا تھا۔ اور جس کی وجہ سے اسے اپنی محبوبہ کے
لئے رونا پڑا۔"
مجھے یاد آیا کہ واقعی پچھلے سال بھابی جان نے انور بھائی سے ... ا[ک]
معیاری مذاق کیا تھا کہ انہیں ناحق یقین کی حد تک شک ہو گیا تھا کہ
ان کی محبوبہ ثریا کسی اور سے محبت کرنے لگی ہیں اور اس کے لئے انو[ر]
بھائی کی آنکھیں پرنم ہو گئی تھیں۔ اور حقیقت حال سے روشناس ہو[نے]
کے بعد انہوں نے چیلنج کیا تھا کہ وہ بھابی جان سے بھی ایسا ہی مذاق
کریں گے کہ وہ رو دیں۔
"بھابی" اختر آپا بولیں...... "آج پہلی فرصت میں بھی تو انہ[یں]
ایسا یقین ہے کہ وہ سچ کہہ رہے ہیں۔ دیکھئے انہوں نے ایک پرز[ہ]

اختر آپا نے امی جان کی طرف انو بھائی کا دیا ہوا پرزہ بڑھا دیا
بھابی جان نے بھی پڑھا۔ پھر تو پرزہ کر امی جان سنانے میں آ گئیں
امی جان بیتاب سی ہو کر اختر باجی سے لپٹ گئیں۔

"اختر ۔۔۔" بھابی جان چیخیں: "تم نے یہ پرزہ انو سے
بہت بڑا ظلم کیا ہے۔ کم سے کم میں اسی خوش فہمی کے سہارے زندہ رہتی
...نے مذاق کیا ہے۔ مگر اب تو شک و شبہ کی بالکل گنجائش ہی نہیں رہی۔
...انہوں نے کسی سے شادی کر لی ہے"

"اچھا صبر دو ۔۔۔" امی جان بولیں۔ "میں انو سے باتیں کر کے
...ں۔"

"جائیے امی" اختر آپا نے کہا۔ "خدا کیلئے کوئی نیک خبر لے
...امی جان۔"

امی جان انو بھائی سے باتیں کرنے کو چلی گئیں۔ اور بھابی جان
...ل ہو کر کوچ پر دھم سے گر گئیں اور اپنی گردن جھکا ڈالی۔ اختر آپا کچھ دیر تک
...رہیں۔ پھر کہنے لگیں۔

"دیکھئے بھابی جان، اگر خدانخواستہ کچھ ہو ہی چکا ہے تو بھی ہمیں
...غم کرنے سے کچھ فائدہ نہیں، ہمیں کچھ سوچنا چاہیے۔"

"نہیں اختر ۔۔۔" بھابی جان حد درجہ قنوطی انداز میں بولیں
...سوچ کر ہی کیا لینا ہے"

"پاگل نہ بنئے بھابی جان!" اختر آپا نے کہا۔ "خدا کیلئے اتنی
...جذباتی نہ بنئے۔ سب سے پہلے ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ انو بھائی
...بیان میں کون سا سچ ہے۔"

"ان کا بیان غلط نہیں اختر" بھابی جان نے کہا۔

"یہ تو میں بھی سمجھ چکی کہ غلط نہیں ہے۔ مگر اس میں کوئی بہترین
...سر ہی ہوگا۔ کوئی پیچ ہی ہوگا۔ آپ نے تو دیکھا ہی ہے۔ وہ کتنا
...ری مذاق کرتے ہیں" اختر آپا جلدی جلدی کہہ گئیں۔

"میں بالکل خالی الذہن ہوں اختر" بھابی جان نے کہا۔
...ی طور پر کھوکھلا پن محسوس کر رہی ہوں۔ میرا دماغ کچھ کام نہیں کر رہا ہے
...سوچوں۔

بھابی جان کو سہارا دے کر اٹھیں اور پھر پلنگ پر لٹا گئیں۔ اور ہم لوگ سوچنے
لگے۔

کافی دیر تک ہم لوگ کسی نا تجربہ کار رسالہ کی طرح خاموش۔ کبھی
انو بھائی کے دیئے ہوئے پرزے پر غور کرتے رہے کبھی ان کی باتیں سوچتے
رہے۔

یکایک بھابی جان پلنگ سے اٹھ بیٹھیں۔ اور انہوں نے اختر آپا
کے ہاتھ سے انو بھائی کا پرزہ چھیننے کے انداز میں لے لیا۔ اور بڑے غور سے
پڑھنے لگیں۔ پڑھتی رہیں۔ پڑھتی رہیں۔ اور پھر کہنے لگیں
"دیکھو اختر انہوں نے شادی کر لی ہے ۔۔۔ دوسری۔۔
شادی نہیں! بس صرف شادی ۔۔۔" بھابی جان کا چہرہ چمک اٹھا ہم
لوگ بھی اس نقطے پر پہنچ کر بہت خوش ہوئے۔ اور اختر آپا مسکراتی ہوئی۔۔
جلدی سے بولیں۔

"اور بھابی جان وہ لڑکی شریف خاندان کی ہے۔ اس کا علم کو
کوئی تعلق نہیں۔ وہ تعلیم یافتہ ہے۔ اور خوبصورت ہے۔ آپ ہی جیسی خوبصورت
بھابی" اختر آپا نے بھابی جان کو بھینچ لیا۔

"اور بھابی جان" میں نے بھی چیخ کر کہا "اس لڑکی سے بھائی
جان کو ایک عرصے سے عشق تھا۔ کیوں بھابی جان ۔۔۔؟"
بھابی جان نے جھینپ کر گردن نیچی کر ڈالی اور ہم لوگ بے تحاشا
تالیاں بجانے لگے۔

"پہلے ذرا انو بھائی سے خیریت پوچھی جائے" اختر آپا نے کہا
"چلو۔ چلو ۔۔۔" بھابی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ بھابی جان کے چہرے پر وہی
شوخی اور وہی شرارت اللہ دی ہوا لاپرواہ کر آیا تھا۔ البتہ ان کی آنکھیں ابھی تک
بھیگی ہوئی تھیں جس سے بھابی جان کے چہرے پر ایک نئی قسم کی چمک
آ گئی تھی۔

ہم لوگ تیزی سے اٹھے اور لپک لپک کر بڑھتے باہر گئے
باہر امی جان بیٹھی انو بھائی سے باتیں کر رہی تھیں۔ لیکن ان دونوں
کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔ جو بھی اداسی دکھ...
انو بھائی ہمیں اس طرح خوش خوش مسکراتے دیکھ کر بوکھلا سے
گئے۔ بھابی جان بھی شرما کر ... کی طرف چلے گئے

(باقی آئندہ)

شانؔ بھارتی •

قطعات

ہم ہنس کے ہر اک تلخیٔ دوراں کو پئیں گے
ہستی کے ہر اک چاکِ گریباں کو سئیں گے
دنیا میں بہر کیف ہمارا بھی تو حق ہے
ہم بھی اسی دنیا میں بہر حال جئیں گے

آلام کے بادل تو برستے ہی رہیں گے
یہ ناگ تو انسان کو ڈستے ہی رہیں گے
بڑھ جاؤ جو بڑھنے کے ارادے میں کھڑے ہو
یہ کوہ تو ہر عزم پہ ہنستے ہی رہیں گے

کانٹوں پہ گل و لالہ کو جینا ہی پڑے گا
ہنس ہنس کے ہر اک زخم کو سینا ہی پڑے گا
میخانۂ ہستی میں چلے آئے ہو جب تم!
یہ تلخ ہلاہل تمہیں پینا ہی پڑے گا

• آغوش میں کانٹوں کی ہر اک پھول کھلا ہے
قدرت سے نہیں مجھ کو زمانے سے گلا ہے
اے دوست یہ ویرانۂ ایام، یہ وحشت
واماندگیٔ جادۂ ہستی کا صلا ہے

(جھنکار)

نیاز یوسف زئی •

ناچ

اربابِ حل و عقدِ وطن ناچ رہے ہیں
ایوانِ مملکت کے سجن ناچ رہے ہیں

بازوئے گورنر میں ہے یک زوجۂ وزیر
پہلوئے کمشنر میں ہے یک بیگم سفیر
آغوشِ منسٹر میں ہے یک دخترِ امیر
جمہوریت کے نلؔ و دمنؔ ناچ رہے ہیں
اربابِ حل و عقدِ وطن ناچ رہے ہیں

پیانو کے ترنم پہ وہ باہم ہیں تھرکتے
سازوں کے تکلم پہ وہ باہم ہیں مچلتے
محفل کے تبسم پہ وہ باہم ہیں سنبھلتے
سینہ بہ سینہ سیمیں بدن ناچ رہے ہیں
اربابِ حل و عقدِ وطن ناچ رہے ہیں

اے باغباں! یہ کیسا ہے دستورِ گلستاں
ہیں داعیانِ فصلِ گل مقہورِ گلستاں
قمری و عنادل تو ہیں مہجورِ گلستاں
خورد و ملخ، زاغ و زغن ناچ رہے ہیں
اربابِ حل و عقدِ وطن ناچ رہے ہیں

ــــہ نل دمن — ہندوستان کے مشہور و معروف عشقیہ [illegible] فصل گل [illegible] انداز

"پشیمانی"

فرخ ۔ انتہائی جوش و خروش کے ساتھ اپنے دوستوں کے سامنے
اٹھا۔"

" رفیقو میں احتجاج کرتا ہوں۔ ہر اس لعنت کے خلاف احتجاج
جو آج ہماری سوسائٹی پر مسلط ہے۔"

" یہ احتجاج نہ صرف سوسائٹی اور اسکے رسوم و قوانین کے خلاف ہے
شخص کے خلاف ہے۔ ہر اس فرد کے خلاف ہے۔ ہر اُس ذات کے
، جو موجودہ سوسائٹی اور اسکے رسوم و قوانین کے سامنے سر اطاعت
ہے۔ (ان لفظوں پر فرخ نے اپنے سر کو غصہ اور حقارت کے ساتھ
میں ان شیطانی قوتوں کے سامنے سر نہیں جھکا سکتا۔"

" شادی! ...... فرخ نے اشتعال انگیز لہجہ میں اپنی تقریر جاری
ی ...... ہونہہ (منہ چڑا کر) آخ تھو۔ بلا لعنت ...... ۔ے
نت ......"

" اس پر دوستوں میں ایک فرمائشی قہقہہ پڑ گیا" کسی نے کہا فرخ
ں تو سہرا آپ کے رُخ انور پر لہرا رہا ہے۔ ابھی تو آپ شادی کے خلاف
لیجئے۔"

سہرا۔ واقعی سہرا۔ فرخ کے چہرے کی زینت بڑھا رہا تھا۔ سہرا ہی
شادی تقریب عروسی کے تمام لوازمات ـــــــ سر پر دستار
ہی۔ بر میں جامہ دار کی نور ق برق شیروانی۔ ہاتھ میں ریشمی رومال
؛ بڑے ٹھاٹ سے دولہا بنا ہوا تھا۔ ابھی ابھی فرخ کے باپ کے
لیڈ کیٹ۔ بیچا کو لے کے لڑکے کیلئے ایک چاند سی دلہن بیاہ کر لائے
تو دلہن کی رونمائی کی رسم بھی نہ ہوئی تھی۔ ابھی ابھی تک سلامت
بلند تھا کہ فرخ نے اپنے دوستوں کے بیچ میں شادی کے خلاف..
کر دی ـــــــ یہ سہرا نہیں ہے۔ فرخ نے پھولوں کی

لڑی کو مروڑتے ہوئے کہا۔ زنجیر ہے زنجیر ـــــــ جس سے میری گردن
کو کس دیا گیا ہے۔ مجھے اپنے سامنے تماشہ بنا کر بٹھایا گیا ہے۔ ہونہہ۔ دلہن۔
دولہا.....

" کسی نے برابر سے کہا۔" آپ شادی کے اتنے خلاف تھے تو آپ
نے انکار کیوں نہ کر دیا۔"

" انکار کیوں نہ کر دیا۔" تمہارا بھی ٹھیک ہی کہی۔ بڑے بھائی ابا جان کے
پیر تک پکڑے۔ امی کی بیشمار منتیں کیں تمام عزیزوں کے پاؤں پر ٹوپی ڈالی
خاندان والوں کی خوشامدیں کیں سب کو سمجھایا۔ غرض میں بھی جو کچھ کر سکتا تھا
کیا تھا۔ جب بالکل مجبور ہو گیا۔ جب بالکل معذور ہو گیا جب بالکل
عاجز آ گیا۔ جب بالکل پست ہو گیا۔ تو میں نے چپ سادھ لی۔ اور کہہ دیا
سب کو جو تمہارا جی چاہے کرو۔ میں بھی جو مناسب سمجھوں گا کروں گا چنانچہ بھائیوں نے
اپنا راستہ پسند کر لیا ہے۔"

" سب لوگ حیرت سے فرخ کا منہ تکنے لگے اور آپس میں ہلکے ہلکے
سرگوشیاں ہونے لگیں۔ مگر فرخ برابر بڑبڑا تا رہا۔ ادھر گھر میں باجے بج رہے
تھے۔ سہاگ گائے جا رہے تھے۔ ڈومنیاں، اور میراثنیں ٹھیک ٹھیک کر۔
طبلے کی تھاپ۔ اور گھنگرؤں کی جھنکار میں مبارکی کے نغمے الاپ رہی تھیں۔
ہر شخص کے چہرے پر تازگی اور مسرت کے آثار چمک رہے تھے۔ حسنات احمد۔
صاحب ایڈوکیٹ اپنی نشست گاہ میں اپنے احباب سے فرخ کی شادی کی
مبارکباد قبول کر رہے تھے۔ فرخ کی ماں گھر میں مصروف اہتمام تھیں۔
دلہن ایک بے جان سے کمرے میں گویا ابھی بیٹھی تھی۔ محلے والیاں اور کنبہ
کی عورتیں اسے گھیرے ہوئے تھیں دلہن کی رونمائی کی رسم ادا ہو رہی تھی
تھی دلہن کی سہیلیاں چہلیں اور چھیڑ چھاڑ کر رہی تھیں۔ خدا ہی بہتر جانتا
ہے کہ گھونگھٹ کے نیچے اس ننھی نویلی کے ننھے سے دل کا کیا حال تھا ـــــــ
الف ـــــــ .... دو دنیا کی نشست گاہ میں۔

"تمام دوست احباب کھیل کھا پی کر رخصت ہو چکے تھے اور اب فرخ اپنے کمرے میں تنہا رہ گیا تھا۔ دن بھر کی مصروفیت سے تھکا ماندہ، اپنے نئے دولہا پن کی وجہ سے مضطرب تھا۔ پیشانی پر پسینے کی ہلکی ہلکی ننھی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں۔ سہرا۔ جو اس نے کھسکا ہوا فرش پر بے قدری کے ساتھ پڑا ہوا تھا۔ بے سہارا سا ۔۔۔

شادی سے قبل اس نے کیا کیا ارمان تھے۔ کیا کیا تمنائیں تھیں اور آج وہ تمام ارمان اور تمام تمنائیں بیدردی کے ساتھ ٹھکرا دی گئیں تھیں کے ساتھ کچل ڈالی گئیں۔ ایک طوق زبردستی کے ساتھ اسے باندھ دیا گیا۔ اور اب یہ فرخ کی بیچارگی ہے کہ وہ اس زبردستی کے سودے کو خوش دلی کے ساتھ قبول کر لے۔ میں یہ شادی کیسے کر سکتا تھا۔ فرخ نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ میں۔۔ منظور کر سکتا تھا ایک ایسی لڑکی کو جسے میں نے نہیں پسند کیا۔ لیکن اب جبکہ میں ایک صورت کو پسند کر چکا ہوں۔ اب جب کہ ایک لڑکی کو دل دے چکا ہوں تو مجھ سے یہ چاہا جاتا ہے۔ کہ میں اپنی پسندیدہ چیز کو مسترد کر دوں۔ فرخ نے تیزی کے ساتھ اٹھ کر اپنے لکھنے کی میز کی دراز سے ایک خوب صورت فوٹو نکالا اور اس کو اپنے ہاتھ پر رکھ لیا۔ اور پرشوق نگاہوں سے تصویر کے سراپا کا جائزہ لینے لگا۔ جیسے رنگ اور خطوط کے اس دل کش مرقع میں وہ کسی کو تلاش کر رہا ہے کبھی بار بار اس کی مضطرب نگاہیں۔ دروازے کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ جیسے وہ کسی سے خوفزدہ ہے!! ......

فرخ کے کمرے سے باہر وہی پرشور اور پر جوش محفل تھی۔ وہی ہما ہمی اور گہما گہمی تھی۔ لیکن فرخ کو اپنی محویت میں کسی کی خبر نہ تھی۔ گویا اس کا عالم یہ تھا کہ ۔۔۔

ہجوم عام میں بھی۔ میری تنہائی نہیں جاتی

اچانک ایک زنانہ نرم آواز نے اس کا سکون توڑ دیا۔ فرخ ارے بھئی کہاں ہو تم؟

"آیا اندر آجائیے۔" اس نے کسی قدر ناگوارانہ لہجہ میں جواب دیا۔ اور پھرتی کے ساتھ فوٹو کو میز کی دراز میں چھپا دیا۔

"لو جی۔ دولہا میاں۔ یہاں چھپے بیٹھے ہیں اور گھر بھر میں تلاش ہو رہی ہے۔"

"آپا میرے سر میں درد ہے کیا آپ لوگ مجھے اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔ ضرور چھوڑ سکتے ہیں۔ مگر لاحول ولا یہاں نہیں۔ دلہن بیٹھی ہیں!"

اس طنز پر فرخ کو ۔۔۔۔۔ سچ مچ ہنسی آگئی اور اس نے بڑی تلخ پیرایہ میں کہا

"کیا خوب ۔۔۔۔۔ تو گویا زبردستی شادی کی بلا میرے منڈھ کر آپ کو چین نہیں آیا۔ اور اب آپ حضرات یہ بھی چاہتے کہ میں آپ کی بیاہ کرائی ہوئی نئی نویلی البیلی دلہن کی ناز برداری بھی کروں آپا۔ اس قسم کی قسم یہ مجھ سے کبھی نہ ہو گا؟"

"کیسے نہ ہو گا۔ فرخ کی آپا نے سختی کے ساتھ کہنا شروع کیا۔ یہ کہیں سنا گیا ہے کہ دلہن بیاہ کر گھر میں آگئی اور دولہا صاحب ہیں کہ اس کمنوائی لئے پڑے ہیں۔ فرخ خدا کے لئے اب تم بچے نہیں ہو۔ جوان ہو اب اس قسم کی ضدیں تمہیں زیبا نہیں دیتیں۔"

"مگر آپا۔ میں اس دلہن کے پاس جا کر کس طرح خوش ہوں جس سے مجھے شمہ برابر بھی لگاؤ ہے اور نہ واقفیت ۔۔۔ جو میرا خوش قسمتی اس گھر میں اتر آئی ہے جسے فقط آپ۔ امی جان اور ابا جان بیاہ کر لائی ہیں۔ میں تو بیچارہ ناکام گنہگار ہوں۔ ویسے ہی پکڑ لیا گیا ہوں۔ آپ سے کوئی امید نہ کیجئے۔"

"یہ کیا پاگلوں کی سی باتیں کر رہے ہو۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تمام شہر میں ہمارے خاندان کی اور تمام خاندان۔ میں ہماری ناک کٹ جائے کیا میری شادی جو ہوئی تھی تو تمہارے دولہا بھائی نے مجھے پسند کیا تھا۔ اگر وہ بھی تمہاری طرح مچل جاتے کہ میں تو لڑکی کو دیکھ کر شادی کروں گا تو تم اس شرط کو منظور کر لیتے۔ کیا تم اپنی ناکتخدا بہن کو کسی اجنبی کے سامنے یہ کہہ کر پیش کر دیتے کہ لیجئے صاحب پسند کر لیجئے۔ یہ ہے ہماری آپا۔ وہ تو پاگل تھے کہ انہوں نے یہ شرط پیش نہیں کی۔"

"خوب۔ آپا نے غصے سے کتاب بند کر کے کہا۔ تمہارے دولہا بھائی ولایت ..... کے تعلیم یافتہ ہیں۔ تمہاری طرح پاگل نہیں۔ ملک جس نے رد ہیٹ کرا کے بی ۔ اے پاس کیا ہے۔ وقت کے لحاظ اور ستر اٹھو۔ شرم نہیں آتی۔"

خیر۔ آپا مجھے بہت [illegible]
خود بخود [illegible] کی اپنی شرافت ہوتی ہیں۔ اب احمق ہوتا ہے کہ وہ
[illegible] جائیے۔"

"تو اگر۔ تمہیں یہ شادی ناپسند تھی تو تم شادی سے قبل گھر سے بھاگ
[illegible] گئے ہو"

یا خودکشی کیوں نہ کرلی! فرخ نے تیزی کے ساتھ اپنا فقرہ

خیر یہ بھی ہوا ——— اسکی بہن نے اعتراف کیا لیکن آپ دیکھو
[illegible] رشتہ سے تنگ آکر جان بھی کھو دی ہے"

فرخ اب لاجواب ہو گیا تھا۔ واقعی اگر اسے یہ رشتہ ناپسند تھا
[illegible] فرار کیوں نہ ہو گیا۔ جب وہ یہ اچھی طرح محسوس کر چکا تھا کہ لبیبہ
[illegible] کی طرح برحق ہے۔ اب یہ تقریب اٹل ہے۔ یہ اب شادی ہو کر رہے
۔۔۔ اب یہ زنجیر گلے میں پڑنے والی ہے تو وہ فرار کیوں نہ ہو گیا
[illegible] سانی کے ساتھ منہ چھپا کر۔ یا دم دبا کر گھر سے نکل بھاگتا۔ کسی دور
[illegible] پر چلا جاتا۔ شادی خود بخود آپ ٹل جاتی۔ اور جب یہ ہنگامہ فرو ہو جاتا
[illegible] ان کے ساتھ گھر لوٹ آتا اور اپنی دل پسند عورت کو شریک حیات بنا لیتا
[illegible] قدر وضاحت کے ساتھ اسکے ذہن میں آیا کہ فرخ حیران رہ گیا۔ لیکن
[illegible] کی یہ تدبیر اسکی نگاہوں کے سامنے روشنی کے موٹے حرفوں میں

بھاگ چلو"

لجاحت کے ساتھ اس نے اپنی بہن سے کہا۔"
آپا۔ آپ مجھے چند منٹ دیجئے [illegible] کر کے حاضر

شاباش۔ مجھے تم سے یہی امید تھی۔ فرخ کی آپا اطمینان کی [illegible]
[illegible] کے جانے کے بعد اس نے مسرت کا گہرا سانس لیا۔
فرخ نے گویا تصویر ہی [illegible] کہنا شروع کیا۔
[illegible]

وہ مکان لیکن قبل اسکے میں اس گھر کو اور اس گھر کے مکینوں کو ہمیشہ کیلئے
خیرباد کہوں مجھے اس بد نصیب لڑکی سے مل لینا چاہیئے جو میرے اور اپنے
مصائب میں اضافہ کرنے کا باعث ہے۔ میں یہ زیادہ پسند کروں گا کہ وہ مجھے۔۔
ہمیشہ کے لئے گم کر دینے سے قبل ایک مرتبہ میرے خیالات سے واقف ہو جائے
میں اسے جا کر بتلا دینا چاہتا ہوں کہ نیک بخت تو میرے نصیب کی نہیں ہے
میں شادی کا معاہدہ فسخ کر دیتا ہوں اور تو آزاد ہے۔"

ایک منٹ میں اس نے یہ فیصلہ کر لیا اور دوسرے منٹ میں
دولہن کی خوابگاہ کی طرف چل پڑا۔

کمرہ عروسی کے شیشہ بند کیواڑوں کو کھولتے ہی ریشمی پردے کے
پیچھے سے خوشبوؤں کی تیز لپٹیں نسیم صبح کے جھونکے فرحت بخش ہواؤں کی طرح
آئیں اور فرخ کے دل و دماغ کو مسحور کرتی ہوئی گذر گئیں۔ فرخ کو ایسا لگا
ہوا جیسے کسی نادیدہ، پراسرار اور خواب آلود دنیا کے دروازے اسکے لئے کھل
گئے ہیں۔ کمرے کو بڑی صفائی۔ بڑی خوبی۔ بڑی خوش سلیقگی اور بڑے قرینے کے
ساتھ آراستہ کیا گیا تھا۔ دیواروں پر رنگوں پالش تھی۔ خوبصورت قالینوں
کا فرش تھا۔ چھت میں نیلے رنگ کی چھت گیری تھی۔ بیچوں بیچ ایک خوبصورت
فیروزی کنول۔ برقی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ در و دیوار پر جو بیل بوٹے بنے تھے
ان کا سب کے ہار لٹکائے گئے تھے۔ ایک گوشہ میں سنگھار میز تھی۔ جو زمین جال
اور آرائش حسن کے تمام سامانوں سے آراستہ تھی۔ کمرے میں سب سے زیادہ۔۔۔
جاذب توجہ سب سے زیادہ جاذب نظر بلکہ سب سے زیادہ دلچسپ چیز ایک
مسہری تھی۔ نہیں بلکہ وہ خاموش وجود جو مسہری کے اوپر سر جھکائے بیٹھا تھا
اطلس اور ریشم میں ملبوس۔ عطر و خوشبو میں غرق اور رنگ [illegible]

فرخ کمرے میں داخل ہوتے ہی جھجھک کے [illegible] ماحول اسکی
توقعات کے بالکل برعکس تھا۔ [illegible]
[illegible]

ساری کی ساری چیزیں تھیں مگر یہ کیا تو بالکل ہی نئی انوکھی اور نرالی باتیں تھیں
" فرخ نے سوچا کہ تقدیر اس پر بہت نواز رہی ہے لیکن
اسے کیا معلوم کہ آج ہی [illegible] بلکہ اس گھر پر۔ بلکہ اس شہر
پر لعنت بھیج کر [illegible] ایک
عورت کے سر [illegible] گیا ہے۔ اس کی عصمت کو پامال کر ڈالا گیا ہے اور اس کی
تمناؤں کا خون بہایا گیا ہے۔"

" کمرے میں داخل ہو کر فرخ نے آہستہ سے دروازے کی چٹخنی بند
کر دی اور سست قدموں کے ساتھ مسہری کی طرف بڑھا اس وقت چونکہ
ایک بے پایاں طوفان اسکے سینے میں آ ابل پڑا۔ اسے کالج کی وہ رفیقہ یاد آگئی جسے
وہ دل و جان سے چاہتا تھا جس کی محبت اسکے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی۔ اور
جس سے اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ جب بھی ازدواجی زندگی بسر کرنے کا ارادہ کرے
گا۔ تو اسی کو دعوتِ رفاقت دے گا۔ مگر وہ کیا یہ سب کچھ خواب تھا محض ایک
خواب۔ کیا یہ ساری تمنائیں فقط ایک افسانہ تھیں فقط ایک افسانہ۔

اس کا جی چاہا کہ وہ اس کمرے سے بے تحاشا بھاگ جائے مگر اس
سے پہلے [illegible] کیونکہ اسکے ساتھ منصوبوں کے خلاف تھا۔ وہ اپنی
منکوحہ کو طلاق دینے کے ارادے سے کمرے میں داخل ہوا تھا اور جب طلاق کی
کارروائی مکمل ہو جائیگی تو وہ یکایکی اور دو گھڑی یہاں سے رخصت ہو جائے
گا۔ یہ تھا اس کا منصوبہ ———— اور یہ تھا اس کا ارادہ۔

مسہری پہ بیٹھتے ہی۔ نامعلوم جذبات کی ایک رو اسکے بدن میں دوڑ
گئی۔ بڑی جرأت کرکے اس نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ اس عورت کی پشت پر رکھا
جو اسکے قریب گردن جھکائے اور سر نیوڑائے بیٹھی تھی۔ اس نے خدا جانے کتنی
ملائمت کے ساتھ کہا۔

" میں چند ضروری باتیں کرنے کیلئے یہاں آیا ہوں کیا آپ ان
کو [illegible] معاف کیجئے سن سکیں گی۔!"

" جواب ندارد۔ پھر اس نے اپنے فقرے کو دہرایا مگر جب اس
کے لفظوں پر کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ تب اس نے [illegible] اپنے لہجے کو زیادہ نرم
بناتے ہوئے تنبیہ کی۔

" میری گستاخی کو معاف کیجئے۔ اس خاموشی سے ہرگز کام نہیں چلے گا کیونکہ

بے تکلف ہو کر میری گفتگو سنتی ہوں گی۔"

" اس مرتبہ فرخ کے لہجے میں نیاز مندی کم اور الفاظ میں زیادہ
اثر تھا۔ اگرچہ جواب اب بھی نہیں دیا گیا مگر فرخ نے محسوس کیا کہ
کپڑوں کی گٹھری کے اندر کچھ کلبلاہٹ سی ہے۔ گویا اسے یہ بتایا جا رہا ہے
آپ اطمینان رکھئے۔ میں بقید حیات ہوں اور آپ کی تقریر بگوش دل سن رہی
ہوں۔"

" میں آپ کی اس توجہ کا شکر گذار ہوں۔ فرخ نے کہنا شروع کیا
مگر مجھے افسوس کہ میں پہلی رات میں آپ کو خوشخبریاں نہیں بلکہ چند بری خبریں
سنانے آیا ہوں، مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنی تقریر جاری رکھوں۔"

" ایک نہایت رسیلی۔ نہایت شیریں اور نہایت نرم آواز نے کہا
" جی "

اس نرم و موسیقی آمیز آواز نے فرخ پر جادو کا اثر کیا اور چند لمحے
کے لئے تو وہ یہ بھول گیا کہ اسے کیا کہنا ہے؟ بے اختیار اسکے دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی
وہ اس اجنبی اور نادیدہ وجود کو ایک نظر دیکھ لے چنانچہ اس نے کسی قدر [illegible]
لہجہ میں کہا۔

" کیا آپ مجھے اجازت دیں گی کہ میں آپ کا گھونگھٹ الٹ دوں"

" اور ان لفظوں کے ساتھ ہی اس نے ہاتھ بڑھا کر ریشمی دوپٹہ
کھینچ لیا۔ مگر بجلی کی طرح دو خوبصورت نازک اور حنا آلود ہاتھوں نے
[illegible] کو چھپا لیا۔ فرخ نے حیرت سے دیکھا کہ ایک بے حد دل فریب شکل اس کی
کے سامنے ہے۔ جو اگرچہ نازک نازک گورے گورے ہاتھوں میں اوجھل سی
لیکن پیشانی اور ٹھوڑی کا جس قدر حصہ ہاتھوں کی دسترس سے باہر
وہ بھی متحیر کر دینے کیلئے کچھ کم نہیں۔ وہ چمکتی ہوئی پیشانی اور وہ ملائم
وہ چمکیلے بال یہ ساری چیزیں فرخ کیلئے تقریباً نئی تھیں۔ یہ آراستہ و پیراستہ
کمرہ یہ رنگین و نظر نواز ماحول یہ دل فریب و دلکش سامان اور پھر بھی یہ
اسکے چمکیلے بال یہ زرق برق افشاں۔ یہ خوبصورت و حسین چہرہ
حجاب اور یہ جانے کیا کیا۔؟"

" وہ اگرچہ بہت کچھ کہنے آیا تھا مگر اب وہ ایک لفظ بھی ادا
کرنے کے قابل نہ تھا۔ پہلے اسکے دل میں انتقام و نفرت کے شعلے بھڑک رہے تھے
اس نے ایسا محسوس کیا کہ وہ کسی سرچشمہ میں [illegible] باہر نکلا ہے

ذ بیٹھک تی تلذی حسرتیں تکتی رہیں ۔ پہلے بھی آنکھیں یہی بولی کے
سے ہوا ہے تھے ۔ مگر اب ایک عجیب قسم کی کیفیت سرمستی میں لئے کھیال یہی
نا چیلے لگے دماغ میں خوشناک ارادوں کے بجھو سر اٹھاتے تھے مگر اب ...
... تو اب کچھ سوچنے کی طاقت ہی اس سے سلب ہوئی جا رہی تھی ۔ فرخ
دیر لجھائی ہوئی نگاہوں سے بے زبان دلہن کی شرم و حیا کا تماشا دیکھتا رہا ۔
بیٹھے پیارے لہجہ میں کہنے لگا ۔ کیا آپ مجھ سے گھبرا رہی ہیں ؟ جی ..... !
... کیا فرمایا ...... ذرا زور سے بولئے ...... ہیں ؟ ...... نہیں
نہیں ..... ٹھیک ہے ۔ شاباش مجھے یہی امید تھی ...... - -
بہت دیر کی کشمکش اور پیہم التجاؤں مسلسل درخواستوں اور گلا
ں کے بعد دلہن اپنے دولہا سے کسی قدر بے تکلف ہو چلی تھی کم سے کم اتنی بے
تکلف ضرور کہ وہ اسکے بعض سوالات پر مسکرا دیتی تھی ۔ اور بعض باتوں پر شرما کے گردن
لیتی تھی ۔ فرخ کی گستاخیاں اور بے تکلفیاں برابر بڑھ رہی تھیں جب دلہن
نظریں جھکا کر جاب آلود انداز میں کہا " مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی مرضی کے خلاف
... آپ میرے سر منڈھ دی گئیں " ۔ یہی کہنا چاہتی ہیں آپ " فرخ نے فقرہ
کرتے ہوئے کہا ۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں " یقین دلاتا ہوں ....
سے چھوڑیئے ۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ ماشاءاللہ بہت خوب ہیں ۔ کوئی
ان بھی آپ کو مسترد کرنے کی حماقت نہیں کرسکتا " فرخ کی آواز اور اسکے
طے بوکھلاہٹ اور بدحواسی کے آثار پوری طرح نمایاں تھے ......
آپ کے آنے سے قبل میری ایک راز دار سہیلی ..... نے دلہن
کہتے کہتے خاموش سی ہو نے لگی ۔
یہ بتلایا تھا کہ ...... میں اس شادی سے خوش نہیں ہوا
۔ یہی کہنا چاہتی ہیں آپ ؟
" جی ہاں .... " دلہن نے دھیمی آواز میں جواب دیا " میں
کو یقین دلاؤں کہ آپ تک یہ اطلاع پہنچی ہے بلاشبہ اس بارے
کچھ بحث ضرور ہوئی تھی مگر ماشاءاللہ آپ کی ذات سے اس کا کوئی تعلق
تھا ۔ "
" میں نے یہ بھی سنا تھا کہ آپ کسی لڑکی سے محبت کرتے ہیں ۔ "
" ایسا ہی ہوا ..... اس
پر فرخ بے حواس ہو گیا ۔ مگر اس نے آپ کو ... کرتے ہوئے کہا ۔

محبت ہوگئی مگر اس رشتہ سے قبل ایک لڑکی سے ضرور پیدا ہوا
تھا ۔ میں پشیمان ہوں کہ آپ کو میرے متعلق اس قدر خطرناک غلط فہمی
ڈال دیا گیا ہے تو اب صرف آپ سے محبت کرنی چاہیے ۔ اور دیکھئے
شرمائیے نہیں ——— خدا گواہ ہے میں آپ سے محبت کرتا ہوں ۔ "
(بشکریہ شیراز)

——— ✻ ———

ادب کو

شرفائے زندگی کا آئینہ دار رہنے
فحاشی ہماری معاشرت کا
ظہور ——— نہیں ہے !

غمازئ دل

بےچینی واضطراب ! اک نامعلوم خوف وہراس ! الامان ! کس قدر
ناک ۔ لرزہ خیز ۔ آہ ! آہ ! میری طاقت ، میری روح سلب ہوگئی
۔ اوہ ! ـــــــ لیکن ، لیکن کیا تم مجھے پاگل سمجھ گئے ؟ کیوں ؟ میرے
واس زائل نہیں ہوگئے تھے ۔ میرے احساسات مفقود نہیں ہو گئے تھے
بخوبی سمجھ سکتا تھا ۔ سوچ سکتا تھا ۔ دیکھ اور سن سکتا تھا ۔ پاگل
ی جیسے تم ـــــــ کیا اب بھی تمہیں اختلاف ہے ؟ اچھا ! تو میں
پورا واقعہ سناتا ہوں ۔ اور دیکھو میں کس خوش اسلوبی وسکون سے بیان
سکتا ہوں ! ـــــــ

مجھے نہیں معلوم میرے ذہن میں یہ خیال کیسے گھسا ۔ ہاں اتنا جانتا
ہوں کہ صرف اس ایک خیال نے مجھ پر اتنا غلبہ پالیا کہ اک لحہ کو بھی دور ہونے
پاتا تھا ۔ حالانکہ کوئی وجہ نہ تھی ۔ کوئی عداوت نہ تھی ۔ ہم بہترین سلوک
ت سے یکجا ہی رہتے تھے ۔ اس نے کبھی مجھے پریشان وتنگ کرنے کی کوشش
کی اور نہ ہی کبھی وہ میری توہین کا باعث بنا ۔ اس کے پاس کافی دولت تھی
لیکن لالچ نے کبھی بھی مجھے غاصب بننے کے لئے نہ اکسایا یقین مانو ! مجھے
قطعی اس کی مطلق کوئی خواہش نہ تھی ۔ لیکن پھر بھی ـــــــ
نہ جانے کیوں میری نفرت بوڑھے سے بڑھتی چلی گئی ۔ شاید اس کی وجہ
اس کی آنکھ تھی ۔ ہاں ۔ یقیناً یہی وجہ تھی ۔ اس کی ایک آنکھ ـــــــ گدھ کی
آنکھوں سے مشابہ تھی ۔ نیلی وزرد سی آنکھ ـــــــ جھریوں دار باریک
چہرے میں چھپی ہوئی ـــــــ اُف ! جب وہ میری دیکھتا ۔ تو خوف سے میرا
خون منجمد ہو کر رہ جاتا تھا ۔ میرے دل میں اس آنکھ سے چھٹکارا حاصل کرنے
کا خیال پیدا ہوگیا ۔ جو رفتہ رفتہ پختہ ہوتا چلا گیا ـــــــ صرف ایک طریقہ !
میں نے سوچا ۔ میں اسے قتل کر دوں ۔ اور پھر ـــــــ ابدی نجات ۔ !
شاید ۔ اس خیال کی بنا پر تم مجھے پاگل تصور کرنے لگ جاؤ ـــــــ
نہیں ۔ پاگل کچھ نہیں جانتے ۔ کچھ سوچ نہیں سکتے ۔ لیکن تم دیکھ رہے ہو

کہ میں کس قدر ہوش وحواس سے بیان کئے جا رہا ہوں ـــــــ اب
میں نے اس کام کو سرانجام دینے کے لئے کتنی چالاکی ودانائی اور کس قدر
احتیاط وپوشیدگی سے کام لیا ۔

میں نے اپنا رویہ یکلخت بدل لیا ۔ اور وہ پورا ہفتہ جس
میں نے اسے قتل کیا ، اسکے ساتھ پہلے سے بھی کہیں زیادہ ہمدردی وخلوص
برتاؤ کیا ۔ لیکن ہر شب ۔ آدھی رات کے قریب ۔ میں چپ کے
کر اس کے دروازے کی چٹخنی کھول کر آہستہ آہستہ اسے کھول ڈالتا ۔
اپنا سر کا سما بخوبی گذر سکوں ۔ اسکے بعد ایک مدہم کی ہوئی لالٹین
جسے چاروں طرف سے میں نے یوں ڈھک رکھا تھا کہ ـــــــ روشنی
چھوٹی سی کرن بھی نکلنے نہ پاتی تھی ۔ میں سے اپنے سر پر باندھ لیتا
اگر تم دیکھتے کہ میں اس معاملہ میں کس مکاری سے کام لیتا تھا ۔ تو میرا
ہے کہ تم ضرور ہنس پڑتے ۔

بوڑھے کی نیند اچاٹ ہو جانے کے ڈر سے میں ہولے ہولے
حرکت کرتے ہوئے اپنا سر دروازے کے اندر داخل کر دیتا ۔ یہ حرکت
قدر آہستہ ہوتی تھی کہ اپنا سر اس کے اتنا قریب کرنے کے لئے کہ بستر
سوئے کو اچھی طرح دیکھ سکوں ۔ مجھے مکمل ایک گھنٹہ لگ جاتا ـــــــ
پاگل آدمی بھی کبھی اتنا عقلمند ہو سکتا ہے ۔ ؟

میرا سر جب اچھی طرح سے کمرے کے اندر چلا جاتا تو میں
کو ذرا سا کھول دیتا ۔ ہوشیاری سے ۔ بے حد چوکسی سے ۔ بالکل اتنا
کھولتا کہ روشنی کی ایک باریک سی کرن اس گدھ جیسی آنکھ پر پڑے
سات راتیں برابر میں یونہی اسکے پاس جاتا رہا ۔ آدھی رات کو ـــــــ
ہمیشہ اس کی آنکھ کو بند پایا ۔ جس سے میرے اس کام کو سرانجام
ہو جاتا تھا ۔ کیونکہ مجھے شخصیت پہچاننے کا باعث بوڑھا نہیں
۔ اس کی وہ ڈراؤنی آنکھ تھی ۔

مجھے اندیشہ تھا کہیں بوڑھا کسی شبے میں مبتلا ہو جائے چنانچہ
...رتے تھے میں اس کے کمرے میں جا کر نہایت گرم جوشی و خندہ پیشانی
...سے صبح بخیر کہتا۔ اور پھر کافی دیر تک بے خوف و نڈر ہو کر اس سے
...ھر کی بات چیت کرتا رہتا۔

آٹھویں روز۔ میں نے دروازہ کھولنے میں معمول سے بھی
...احتیاط سے کام لیا۔ شاید گھڑی کی منٹ سوئی کی حرکت بھی مجھ
...تیز ہوگی۔ اس رات سے قبل مجھے اپنی اس انتہائی ہوشیاری و
...کی طاقت و صلاحیت کا احساس کبھی نہیں ہوا تھا۔ لہذا یہ سوچ
...مسرت کا اندازہ نہ تھا۔ کہ یہ خود میں تھا۔ جس نے یوں آہستہ آہستہ
...کھولا۔ اور اس بوڑھے کو میری ان پوشیدہ حرکات و خیالات کا خواب
...گمان نہیں ہو سکتا۔ اس خیال پر میں ایسے خوش ہو گیا کہ بے اختیار
...واز میں ہنس پڑا مجھے غالباً اس نے بھی سن لیا تھا کیونکہ اس نے
...دم کروٹ بدل لی۔ جیسے وہ چونک اٹھا ہو۔ شاید تم اب سوچتے
...کہ میں فوراً کمرے سے لوٹ آیا ہوں گا؟ اوہ! نہیں۔ چوروں کے
...اس نے تمام روشندان اور تمام دروازے وغیرہ مضبوطی سے بند
...لیے تھے۔ جن کی بنا پر کمرا اتنا تاریک ہو رہا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی
...شوار تھا۔ مجھے اطمینان تھا کہ وہ کھلے ہوئے دروازے کو نہیں
...سکتا۔ سو میں بالکمال حوصلہ دروازے کو وا کرنے کی کوشش کرتا رہا
میں نے اپنا سر اندر کر لیا تھا اور لالٹین کو حسب معمول کھولنے
...لا تھا کہ اتفاق سے میرا ہاتھ ٹین سے پھسل کر زمین سے جا ٹکرایا۔ بوڑھا
...ہٹ سے اچھل بیٹھا اور لرزتی ہوئی آواز میں چلایا۔ "کون ہے"
...کل ساکت و خاموش کھڑا ہو گیا۔ اور پورا ایک گھنٹہ اپنی جگہ سے ایک
...ں سرکے بغیر گذار دیا۔ اس دوران میں میں نے اسکے دوبارہ لیٹنے کی
...نی۔ شاید وہ کچھ ہڑبڑاہٹ کے کان لگائے خاموش بیٹھا تھا۔
...جیسے میں نے کئی راتیں موت کی گھڑیوں کو محسوس کرتے ہوئے گذار دی
۔ اسی اثنا میں مجھے ایک تڑپتی ہوئی سی آہ سنائی دی۔ مجھے معلوم
...تھا کسی تکلیف یا رنج کی پیداوار نہیں بلکہ انسانی دہشت کی آہ ہے۔ میں
...پہچانتا تھا۔ یہ۔ یہ گھٹی اور دبی ہوئی آواز تھی۔ جو ہر اس دہشت
...سے بلبلے پر روح کی گہرائی سے بلند ہوتی ہے۔ کئی ایک راتیں،

ٹھیک آدھی رات کے وقت، جب ساری دنیا میں مدہوش ہوتی تھی
مضطرب کن دہشت سے ایسی ہی آہیں میرے اپنے سینے سے بھی بلند
ہوئی تھیں جو خوفناک گونج میں دبی ہوئیں۔ میں نے کہا۔ میں اسے اچھی
طرح جانتا تھا۔ اور مجھے معلوم تھا کہ بوڑھا اس وقت کیا محسوس کر رہا تھا
باوجود اس کے کہ میں دل ہی دل میں بہت ہنسا۔ مجھے اس کی حالت پر
رحم بھی آیا۔ وہ اس وقت سے برابر پڑا جاگ رہا تھا جب اس نے ہلکی
سی آواز پیدا ہو جانے پر کروٹ لی تھی۔ اس کا خوف لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جاتا
تھا۔ جیسے وہ واہمہ تصور کرتے ہوئے دور کرنے کی کوشش میں تھا۔
وہ خود کو تسلیاں دے رہا تھا۔ "اونہہ! کچھ نہیں۔ محض ہوا کی سرسراہٹ
ہے۔ کوئی چوہا فرش پر دوڑ رہا ہوگا یا پھر —— یہ فقط جھینگر کی آواز
ہوگی۔" ان قیاس آرائیوں کے باوجود بھی اپنی ناکامی اس پر پوری
طرح روشن تھی۔ کیونکہ موت سرعت کے ساتھ اس کی جانب بڑھ رہی
تھی۔ اور اپنا منحوس سایہ اس پر ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ اور اس تغیر کن
سایہ کے پر ہیبت اثر کی بنا پر ہی وہ ایسا محسوس کر رہا تھا حالانکہ اسے
کچھ دکھا تھا اور نہ سنا۔ پھر بھی اسے کمرے میں میری موجودگی کا احساس ہوتا
تھا۔

یوں کھڑے کھڑے کافی وقت گذر گیا۔ آخر میرے صبر و تحمل کا
پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اور میں نے اسکے دوبارہ لیٹنے کا انتظار کئے بغیر لالٹین
میں شگاف پیدا کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ چنانچہ میں نے اسے کھول دیا ——
کس قدر آہستہ اور چوری چوری۔ تم اس کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔ یہاں تک
کہ مکڑی کے تار کی مانند روشنی کی ایک مدہم سی کرن شگاف سے نکل کر
اس گدھ نما آنکھ پر پڑی۔ وہ کھلی تھی۔ پوری کشادگی سے۔ جونہی
میں نے اسے دیکھا۔ مجھ میں تیزی و تندی پیدا ہو گئی۔ بھیانک نیلی
سی آنکھ۔ مکروہ پردے میں سے جھانکتی ہوئی —— میرا خون و
گوشت تک رگوں اور استخوانوں میں جم کر رہ گیا۔

بوڑھے کی آنکھ کے سوا مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کیونکہ روشنی
کی کرن ٹھیک اسی جگہ پڑ رہی تھی۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں پاگل
نہیں ہو گیا تھا بلکہ میرے حواس میں شدت و تیزی پیدا ہو گئی تھی۔
جسے تم پاگل پن پر محمول کرتے ہو۔ خیر! اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ

کانوں میں ایک مدھم دبی سی آواز تیزی لئے ہوئے سنائی دی — م
بالکل ایسی۔ جیسے گھڑی کو روئی میں دبا دیا جائے تو اس کی مدھم سی ٹک ٹک سنائی دے۔ میں اس آواز سے بخوبی واقف تھا۔ یہ۔ یہ بوڑھے کے دل کی دھڑکن تھی۔ جس نے میرے جوش و خروش کو یوں بڑھا دیا جیسے ڈھول کی آواز سپاہیوں کے جوش کو بڑھاتی ہے لیکن اب بھی میں رکا رہا۔ میں نے خاموشی برقرار رکھی۔ حتیٰ کہ سانس بھی بمشکل لیتا تھا اور میں نے لالٹین کی روشنی کی ننھی سی کرن کو آنکھ پر جمائے رکھنے کی پوری کوشش کی۔ اس دوران میں دل کی وہ منحوس آہنی دھڑکن بڑھتی رہی۔ ہر لحظہ تیز سے تیز — اور تیز۔ یہ نصف رات کا وقت — پرانے تاریک و خاموشی میں گھرا ہوا۔ بوسیدہ مکان، اور یہ عجیب خوفناک آواز میری دہشت میں ناقابل برداشت حد تک اضافہ ہو گیا۔ لیکن اب بھی چند منٹ تک میں باز رہا۔ اور خاموشی کو قائم رکھا۔ مگر دل کی دھڑکن اتنی شدت اختیار کر گئی کہ مجھے اندیشہ ہونے لگا، کہیں دھڑکتے دھڑکتے پھٹ ہی نہ جائے۔ اور اب مجھے ایک نئی فکر و پریشانی نے جکڑ لیا یہ دھڑکن کی آواز کہیں پڑوسیوں کے کانوں تک نہ پہنچ جائے — ؟
اس بوڑھے کا وقت آ پہنچا ہے — میں نے بیتابی سے لالٹین کا ڈھکن ہٹایا۔ ایک دہشتناک چیخ کے ساتھ کمرے میں کود پڑا۔ بوڑھا خوف سے چیخا — لیکن پیشتر اس کے کہ وہ دوسری آواز نکالتا، میں نے اسے بستر سے گھسیٹ کر فرش پر پھینک دیا۔ اور اس کے بھاری پلنگ کو اس کے اوپر کھینچ کر اسے نیچے دبا ڈالا۔ کام کے بخوبی انجام پا جانے پر میں فخر و مسرت سے کھل اٹھا۔ کتنی ہی دیر تک دل مدھم و دبی ہوئی آواز میں دھڑکتا رہا۔ لیکن مجھے اب اس کا کوئی خدشہ نہ تھا۔ یہ آواز کمرے سے باہر نہیں جا سکتی تھی۔ آخر کار آہستہ آہستہ وہ بھی ختم ہو گئی۔ بوڑھا مر گیا تھا۔ میں نے پلنگ کو ہٹا کے سر جھکایا۔ اور لاش کا معائنہ کرنے لگا۔ وہ سرد ہو چکی تھی اور پتھر کی طرح جامد۔ میں نے اس کے دل پر ہاتھ رکھ [illegible] کوئی دھڑکن نہ تھی۔ ہر ایک چیز ساکت تھی۔ اس کی منحوس آنکھ اب کبھی بھی مجھے تکلیف نہ پہنچائے گی —
کتنی [illegible] تھی [illegible] ہیں —

اب بھی [illegible] میں نے لاش
[illegible]

[illegible] ہو جائیں گے —

رات ڈھلتی جا رہی تھی۔ میں تیزی و مستعدی سے کام کو اپنے ٹھکانے تک سنبھالنے لگا۔ سب سے پہلے میں نے لاش کے تمام اعضا سر، بازو، ٹانگیں وغیرہ الگ الگ کر ڈالیں۔ پھر میں نے چوبی فرش کے تین تختے اکھیڑے اور تمام ٹکڑوں کو درزوں تک اس میں چھپا دیا اور تختوں کو دوبارہ اسی جگہ جڑ دیا۔ یہ سب کچھ میں نے اتنی صفائی و احتیاط سے کیا کہ کوئی انسانی آنکھ، حتیٰ کہ بوڑھے کی آنکھ بھی کوئی گڑبڑ نہیں لگا سکتی تھی وہیں مجھے پانی کا بھرا ہوا ایک ٹب مل گیا۔ اور میں نے خون آلودہ ہر چیز دھو ڈالی اب خون کا ایک دھبہ بھی کہیں نظر نہ آتا تھا۔

گھڑیال میں چار بجنے کی آواز آئی، اور میں اپنی اس جانفشاں محنت سے فارغ ہو چکا تھا۔ ابھی تک نصف شب جیسا اندھیرا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بیرونی دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔ اور میں بے خوف و خطر معلوم کرنے چلا گیا۔ کیوں کہ اب بھلا مجھے کس چیز کا ڈر تھا؟

جونہی میں نے دروازہ کھولا۔ پولیس کے تین باوردی آفیسر آگے بڑھے۔ انہوں نے نرمی و ملائمت سے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا۔ "آپ کے پڑوسیوں نے اطلاع پہنچائی ہے کہ دوران شب آپ کے ہاں سے ایک چیخ کی آواز سنائی دی گئی ہے۔ انہیں شک ہے کہ یہاں کسی جرم کا ارتکاب ہو رہا تھا۔ لہٰذا ہمیں معاملہ کی تحقیقات اور تلاشی مکان کے لئے بھیجا گیا ہے۔" میں یہ سن کر مسکرا پڑا۔ اور انہیں شائستگی سے کہا "آپ شوق سے مکان کی تلاشی لے سکتے ہیں۔ جس چیخ کا آپ ذکر کر رہے ہیں وہ میری اپنی ہی تھی، جو ایک بھیانک خواب پر سوتے میں بے اختیار میرے منہ سے نکل گئی تھی۔ بوڑھے کے بارے میں استفسار پر میں نے انہیں بتا دیا کہ وہ شہر سے کہیں باہر گیا ہوا ہے۔ پھر میں انہیں گھر دکھانے کے لئے اندر لے آیا اور انہیں حسب خواہش تلاشی لینے کے لئے کہا۔ آخر میں انہیں بوڑھے کے کمرے میں بھی لے گیا۔ اور وہاں کی ایک ایک چیز دکھا ڈالی۔ اس کا اسباب، اس کا سیف [illegible] ہر ایک چیز محفوظ جوں کی توں پڑی تھی۔ [illegible] اعتماد حاصل کرنے کے جوش میں۔ میں وہیں اسی کمرے میں ان کے بیٹھنے کے لئے کرسیاں اٹھا لایا اور انہیں [illegible] مسرت میں

...ے دلیر اور حوصلہ مند ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی کرسی ٹھیک اسی جگہ
جہاں مقتول کی لاش چھپائی ہوئی تھی۔

پولیس کے افسر میرے فریبانہ طور طریق اور انداز بیان سے دھوکہ ...رانکے تمام شکوک و شبہات دور ہو گئے تھے۔ مجھے ایک عجیب طرح ... اور راحت حاصل تھی۔ وہ بیٹھے بے تکلف عام گفتگو کرتے رہے۔ اور ...دلی سے ان کا جواب دیتا رہا۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد مجھے یوں محسوس ...تا۔ جیسے مجھ پر زردی کمزوری چھاتی جا رہی ہو۔ میں دل ہی دل میں ان کے ...جانے کی دعائیں مانگنے لگا۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ اور کانوں میں ...ی جھنکتی ہوئی آواز گونج رہی تھی۔ وہ بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ...ر زیادہ واضح ہوتی جا رہی تھی۔ اس احساس وہم سے پیچھا چھڑانے ...ں اور بے تکلفی سے باتیں کرنے لگا۔ لیکن آواز کی وسعت اور ...ں کوئی فرق نہ آیا۔ حتی کہ میں جان گیا کہ یہ آواز کانوں کے اندر نہیں ہو رہی۔

بلاشک میرا رنگ بے حد پیلا پڑتا جا رہا تھا۔ لیکن اتنی ہی شدت ...گفتگو تیز، متواتر اور بلند ہوتی گئی۔ آخر میں کر ہی کیا سکتا تھا؟ ...تی گئی، گھٹی گھٹی، تیز در دل آواز بالکل ایسی جیسے گھڑی کو روئی ...جائے اور اسکی دبی دبی سی آواز سنائی دے۔ تاہم پولیس کے ...بی لمبے سننے نہ پائے تھے۔ میں اور جوش اور سرگرمی سے باتیں ...ا۔ یہاں تک کہ ہانپنے لگا۔ آواز بڑھتی رہی۔ میں کرسی سے ...را اور وحشیانہ نقل و حرکت کے ساتھ فضول بحث و مباحثہ کرنے ...ا آواز بڑھتی گئی —— الٰہ! آخر یہ یہاں سے چلے ...یں جاتے؟ میں نے بھاری و تیز قدموں سے ادھر ادھر ٹہلنا ...یا جیسے ان کی تحقیقات اور جائزے نے میرے جوش و تردد کو ...ہو گئے لیکن —— آواز میں اضافہ ہو گیا —— آہ! خدایا ...ں؟ میں دیوانوں کی طرح شور مچانے لگا۔ غصے سے میرے ...جھاگ بہہ نکلے۔ میں نے وہ تختے جن پر ... رگڑنی ...دیں۔ لیکن آواز —— سے بلند ہوتی رہی۔ مسلسل تیز ...تی اور تیز ...

[illegible]

کئے ہوئے تھے۔ کیا یہ ممکن تھا کہ انھوں نے یہ آواز نہ سنی ہو؟ بخدا نہیں، نہیں، انھوں نے سن لی تھی۔ میرا قیاس یہی تھا۔ اور اب بھی میں یہی خیال کرتا ہوں۔

اس جان بلب تکلیف سے ہر دکھ، ہر مصیبت بدرجہا بہتر تھی سب کچھ برداشت کیا جا سکتا تھا لیکن وہ طنز آمیز نگاہیں۔ وہ مضحکہ خیز ان کی وہ مکر و فریب میں بسی ہوئی تلخ مسکراہٹیں زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے۔ جیسے میں چیخ اٹھوں یا —— یا مجھے مر جانا چاہیئے۔

اور اب پھر۔ سنو! وہی آواز تیز، تیز، تیز، اور تیز،

"بدمعاش" میں چلا اٹھا۔ "مت چھپاؤ مجھ سے اب میں اپنا جرم تسلیم کرتا ہوں۔ ان تختوں کو اکھیڑ ڈالو۔ یہاں۔ یہاں یہ ہے اسکے مکروہ دل کی دھڑکن۔"

(ترجمہ —— ایڈگر ایلن پو)

اعتذار

مارچ [illegible] کے شمارے میں ایک افسانہ "تاریکیاں" کے عنوان سے شائع ہوا ہے اس افسانے میں کتابت کی غلطی سے [illegible] کی بجائے "صالحہ سلیم" چھپ گیا ہے اور اس کا ترجمہ "پاکستان ریڈیو" سے نہیں بلکہ "پاکستان ریویو" سے کیا گیا ہے۔

قارئین درست فرمالیں —— (ایڈیٹر)

عذرا جمال سیتاپوری •

جہیز

میری بچی! کس زباں سے الوداع تجھ کو کہوں — منجمد ہوتا چلا جاتا ہے شریانوں میں خوں
تجھ کو راس آئیں نئے ماحول کے شام و سحر — چھا گئی ہے یہ تمنا میرے قلب و روح پر
جس نئی منزل کی جانب تیرے اٹھے ہیں قدم — شرع رہ بن جائیں تیرے حق میں اسکے پیچ و خم
جس نئے گھر میں ہے جانا تجھ کو یہ گھر چھوڑ کر — اپنے سینے سے لگائیں تجھ کو اسکے بام و در
میری بچی! یہ نئی محفل مبارک ہو تجھے — میری بچی! تیرا مستقبل مبارک ہو تجھے
جگمگائے تیری دنیا راحتوں کے نور سے — ہر خوشی قدموں میں کھنچ آئے قریب و دور سے
کوئی عالم ہو، نہ آئے تیری پیشانی پہ بل — کوہساروں کی طرح تیرے عزائم ہوں اٹل
اپنے شوہر کے لئے آفات کے بھونچال میں — تو شریک زندگی بنکر رہے ہر حال میں
میری جانب سے جو یہ سوغات کا نذرانہ ہے — زندگی کے سربسر اسرار کا افسانہ ہے
جس کا ہر مضموں بہر طور حوصلہ افزا ہے — جس کا ہر نقطہ بہر صورت سبق آموز ہے
زندگی میں جب کبھی تجھ پر کڑے دن آئینگے — یہ کڑے ثابت قدم رہنا تجھے بتلائیں گے
تیرا جی تنہائیوں میں جب کبھی گھبرائیگا — گوشواروں کا ترنم دل تیرا بہلائے گا!
الجھنیں پھونکیں گی تجھ پر جب کبھی غم کا فسوں — چوڑیوں کے زمزمے بخشیں گے پیغام سکوں
دفعتاً جب کوئی دشواری تجھے پیش آئے گی — کنگنوں کی ضو فشانی راستہ دکھلائیگی
سر اٹھائیں گے جب کبھی راستے کے تیز خار — ڈالدے گا پاؤں میں زنجیر یہ گردن کا ہار!
دھندلکوں میں جب کبھی کھو جائیگا تیرا دماغ — جگمگائے گا پیشانی کے جھومر کا چراغ
رونما ہوگی جب اندھیاری کسی طوفان کی — آئینہ دکھلائے تابندگی قرآن کی
تو اگر چاہے تو ہر گتھی سلجھتی جائے گی! — زندگی "تدبیر منزل" کی تیرے گن گائیگی

عقل و دل سے جتنی ہم آہنگ ہوتی جائیگی
زندگانی اتنی ہی خوش رنگ ہوتی جائے گی

(جہیز)

احساسِ فرض

ننھی منی ہی تو تھی ۔ سات آٹھ ماہ کی جان ۔ بھلا صفائی د
یں تمیز کیا جانے ۔ امی کی غفلت سے ایک دن بیٹھے بیٹھے پچی
ادر پھر اس میں ہاتھ بھر کر منہ میں ڈال لئے ۔ اماں بی کا جو ادھر
ہوا تو مارے گھبراہٹ کے چلانا شروع کر دیا ۔ سمجھ میں خاک نہ آئے
جائے ۔ سارے گھر میں شور مچ گیا "ننھی نے پچی کھالی" کوئی
سے کوئی تھو تھو کرے ۔ آخر اسے خوب صاف کر کے سینٹ میں
ئی خوشبو دار چیزیں کھلائی گئیں ۔ مگر نفسیاتی اثر کے تحت گھر
ی دن تک اس کے منہ میں سے بو آتی رہی ۔ ۔ ننھی نے گھر والو
بلاہٹ سے خاصہ اثر لیا ۔ چنانچہ دوسری دفعہ اتنی ترقی ہوئی کہ
ں ہاتھ ڈالا لیکن منہ تک لے جا کر چھوڑ دیا ۔ لیکن اب کی بار امی
ہٹ کا یہ نتیجہ نکلا کہ وہ گندگی سے نفرت کرنے لگی ۔ حتی کہ ہر بری
ی" کے نام سے پکارتی ۔

ننھی نے پاؤں پاؤں چلنا شروع کر دیا تھا ۔ اب گھر کی کوئی جگہ
بتر دسے محفوظ نہ تھی ۔ امی اسے دن میں دو تین بار کپڑے
ں لیکن تھوڑی دیر بعد ہی اسکے کیچڑ بھرے کپڑے اس بات
کرتے گویا اسے کبھی صاف نہ کیا گیا ہو ۔ امی نے اسے آہستہ
ی کی زبان میں سمجھانا شروع کر دیا ۔ وہ بار بار نہایت مستقل مزاجی
منہ ہاتھ وغیرہ صاف کرتی رہتیں ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بڑی جلدی یہ
ں کی فطرت کا ایک جزو بن گئی ۔

وں کی تربیت کا مسئلہ نہایت پر پیچ ہے ۔ عقلمند و نیک
پیدائش کے دن ہی سے اس کا اہتمام شروع کر دیتی ہیں جا
ی عمر تک بچے کے دل پر وہ بات نقش ہو جاتی ہے جو آئندہ
لئے بنیاد کا کام دیتی ہے ۔ ننھی بھی بیٹھنے لگی ۔ گھٹنوں اور
ں چلنے آ گئی ۔ امی بھی تربیت کے سلسلے میں پوری طرح اس

تھیں ۔ چنانچہ حساس دماغ محسوس کرتے کہ گھر میں ماں بیٹی کا ایک پر امن
محاذ قائم ہے ۔ جس میں بم بھی چلتے ہیں اور تباہی بھی نہیں ہوتی ۔ گویا ننھی
کی اصلاح بھی ہو رہی ہے ۔ اور طریقہ بھی نہایت صالح ہے ۔ دیکھنے
والے حیران رہ جاتے ہیں کہ ننھی گھر کی کئی چیزیں توڑ پھوڑ دیتی لیکن ماں اف
تک نہ کرتی ۔ کیونکہ اس طرح اس کی فکر و تدبر کی صلاحیتیں ختم ہو جانے کا
اندیشہ تھا ۔ ماں باتوں باتوں میں اسے سمجھایا کرتی ۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں
عام بچے آئے دن نقصان کرتے ہیں ۔ وہاں ننھی سے ایک نقصان ہو جانے
کے بعد اس قسم کی دوسری غلطی تقریباً ناممکن ہو جاتی ۔ ہر بات پر روکنا
جھڑکنا یا مارنا امی کو گوارا نہ تھا ۔ وہ اس سے ہر بات نرمی سے سمجھا کر منوا لیتیں
اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہر معاملے میں اپنا نمونہ پیش کر کے اس سے
تقلید کرواتیں ۔ کوئی ایسی بات منہ سے نہ نکالتیں ۔ جو خود نہ کرتی ہوں ۔
چنانچہ اس تربیت کا اثر یہ ہوا کہ ننھی قبل از وقت ہی بھلائی برائی کے
فرق کو سمجھ گئی ۔ اب وہ بڑی ہو گئی ہے ۔ ماں کی صحیح تربیت کا اثر نکھر
کر اپنا رنگ دکھا رہا ہے ۔ وہ اچھائی برائی ۔ نیکی بدی اور گناہ ثواب میں
صحیح امتیاز رکھنے والی لڑکی ثابت ہوئی ہے عام لڑکیوں سے بالکل مختلف

ایک دن گھر کے سب افراد جمع تھے ۔ باتیں بڑی پر مذاق ہو رہی
تھیں ۔ ننھی حسبِ عادت صرف مسکرا کر رہ جاتی ۔ چھیڑنے کے
کے لئے سب کو اس کے بچپن کا "پچی کھانے" کا واقعہ سنایا ۔ سب اور خود
ننھی بھی سن کر بہت محظوظ ہوئی ۔ سوتے وقت اسے پھر یہی واقعہ یاد آ گیا
سوچتے سوچتے وہ اس نتیجہ پر پہونچی ۔ کہ ایک بے شعور انسان کی غلطی قابل
گرفت نہیں ہوتی ۔ لیکن باشعور انسان کی ہر غلط حرکت قابل ملامت
بن جاتی ہے ۔ سے رہ کر ان لوگوں پر تعجب آ رہا تھا ۔ جو برائی تو برائی اور
غلطی کو غلطی تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں ۔ آگ کو جلانے والی شے سمجھ کر
اس میں ہاتھ نہیں ڈالتے لیکن غلط راستے کو غلط سمجھتے ہوئے اس پر چلتے ہیں

خود بیدبیناز رکھنے کے باوجود ایک دوسرے کے بچے متعارف سمجھے جاتے ہیں۔ اور ہر دوسرے شخص سے بھی یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ بھی ویسا ہی بن کر چلے۔

اس [illegible] معاشرے کی خرابیوں پر چیخ چیخ کر فریاد کرنا چاہتی ہے تو جب سے ہوش سنبھالا تھا وہ ان باتوں کے خلاف اپنی تمام صلاحیتوں کو صرف کرنے کی کوشش کرتی۔ لیکن اس بات کی فکر اس کے لئے ایک جیج تو کا پیغام لائی، وہ جس کی اسے کافی مدت سے تلاش تھی . . . . . . پھر اس نے منظم طور پر کام شروع کر دیا۔

. . . . . اور کچھ عرصہ بعد بارش کی وادی میں چند نوجوان اور تعلیمیافتہ لڑکیوں کا ایک قافلہ داخل ہوا جسے تحفظ محسوس کر رہی تھی۔

بقیہ :- "کہتا ہوں سچ" صفحہ ۵۹

" بیٹے تو سہی ۔۔۔ اوسٹرپیٹے تو " بھائی جان نے پکارا مگر وہ آگے بڑھے جا رہے تھے ، وہ گن گنا رہے تھے ۔۔۔۔

" کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے "

پھر بھی وہ کھسیانے کھسیانے سے محسوس ہوئے اور ہم لوگ ایک ساتھ تالیاں بجانے لگے۔ (جام لا)

بقیہ :- " خزاں کے بعد " صفحہ ۳۴

کی کرسی دولت کے بوجھ سے لچک نہ سکتی ہو ۔۔۔ اور محنت کش طبقے کی جھونپڑیوں پر اپنی اغراض کے محل تعمیر کرنے کی کوئی جرات نہ کر سکتا ہو ۔۔۔ اس معاشرے کو پیدا کرنے کے لئے خودکشی کی نہیں بلکہ پرخلوص جدوجہد کی ضرورت ہے جن کے بے رحم پنجے خود بخود ٹوٹ جائیں " ۔۔۔۔۔

وہ ایکدم کھڑا ہو گیا ۔۔۔۔ آدم بیگ کا کڑا ہوا بازو جھک گیا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ " رشید جیسے بھوکے کو سے بیچ کر گزارہ کر سکتا ہے۔ تو پھر میں سستے روزی کیوں نہیں کر سکتا۔ عوام کی جدوجہد کا ساتھ دینے کے لئے مجھے زندہ رہنا ہو گا۔" ۔۔۔۔۔ اور گاڑی کے آنے سے پہلے اسٹیشن پہنچنے کی خاطر وہ جلدی جلدی قدم بھرنے لگا تھا۔

اسلام پسند شعرا

میرا ارادہ مستقبل قریب میں اسلام پسند شعرا کے کلام کا ایک مجموعہ مع ان کے مختصر حالات کے شائع کرنے کا ہے۔ اسلام پسند شعرا سے گزارش ہے کہ وہ اپنا مختصر انتخاب کلام اور حالات مجھے پتہ ذیل پر جلد از جلد روانہ فرمادیں ۔

اسرار احمد (لکچرار) اسلامیہ کالج۔ گوجرانوالہ

اعتذار

گزشتہ شمارے میں قیصر قیصری کی نظم " نقیب سحر " کی چند غلطیاں رہ گئی ہیں۔ قارئین تصحیح فرمالیں۔ ایڈیٹر

بند نمبر ۳۔ مصرعہ نمبر ۲ :-

غلط :- شور و افراط و تفریط میں ہے

صحیح :- شہر افراط و تفریط میں ہے

بند نمبر ۳۔ مصرعہ نمبر ۹ :-

غلط :- اک طرف کھیتوں کا لہو جو ہے

صحیح :- اک طرف کھیتیوں کا لہو ہے

بند نمبر ۶۔ مصرعہ نمبر ۳ :-

غلط :- جبر والحاد کا آخری وار ہے

صحیح :- جبر الحاد کا آخری وار ہے

ایک گزارش

" مشیر " کے اہل قلم اور ادیب حضرات سے گزارش ہے کہ وہ اپنی نگارشات روانہ فرماتے وقت اپنا پورا نام و پتہ ضرور تحریر فرمائیں۔ بغیر نام و مکمل پتے کے کوئی تحریر قبول نہ ہو گی۔ علاوہ ازیں مسودات کو صاف اور خوشخط بھیجنے کی کوشش فرمائیں۔ (ادارہ)

Monthly "MUSHIR" Karachi



[illegible]

ادارۂ مشیر قارئین مشیر و جمیع مسلمانان پاک و ہند

کیخدمت میں دِلی

عید مُبارک

پیش کرتا ہے!

پاکیزہ اور صالح ادب کا علمبردار

ماہنامہ مُشیر کراچی

ٹیلی فون : ۷۹۲۳

جون ۵۴ء

بدل اشتراک :

پاکستان : سالانہ : تین روپے

فی پرچہ : چھ آنے

بھارت : سالانہ : ساڑھے چار روپے

فی پرچہ : آٹھ آنے

مُرتّبہ

عبد الغفور بیگ

طابع و ناشر عبدالغفور بیگ ۔ مطبوعہ ۔ مشہور پریس کراچی

دفتر اشاعت [illegible] ۔ کاتب : عابد سعید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا مودودی کی رہائی کا مسئلہ

جب مرکزی مجلس قانون ساز نے بدنام زمانہ اینڈمنٹی ایکٹ منظور کیا تھا۔ تو مولانا مودودی نے اس کے تحت وزیر قانون کو اپیل بھیجنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اور اس کے وجوہ بھی پیش کر دئے تھے۔ مولانا نے فرمایا تھا۔

"ہم یہ اصول ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ کہ ایک عدالتی فیصلے کی (اگر واقعی کورٹ مارشل کا فیصلہ ایک عدالتی فیصلہ تھا۔ جیسا کہ اینڈمنٹی ایکٹ میں کہا گیا ہے) اپیل عدالت عالیہ کے بجائے حکومت کے پاس بھیجی جائے۔"

مولانا نے اسے انصاف کے نام سے بے انصافی کی ایک بدترین نظیر قائم کرنا قرار دیا تھا۔ پھر اس کے مفصل دلائل دینے کے بعد مولانا نے فرمایا تھا۔

"اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں سے حکومت سیاسی انتقام لینا چاہتی ہے۔ ان کے مقدمے وہ اپنی منشار کے مطابق بنا کر فیڈرل کورٹ کے جج کے پاس بھیج دے اور اس سے اپنی منشار کے مطابق رائے حاصل کر کے دنیا کو یقین دلانے کی کوشش کرے کہ عدالت عالیہ کے ایک جج نے بھی ان لوگوں کے جرم پر مہر تصدیق ثبت کر دی ـــــ ہمارے لئے یہ ممکن نہیں کہ جانتے بوجھتے اپنے آپ کو اس فریب کا شکار بنوائیں ـــــ"

آج جب کہ ہمارے نمائندہ مقیم کراچی کے بیان کے مطابق مولانا کے معاملے کو فیڈرل کورٹ کے جج کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ تو مولانا کے مذکورہ بالا بڑا وزن محسوس ہوتا ہے۔ لاہور میں وزیر اعلیٰ ملک فیروز خاں نون نے ایک پریس کانفرنس میں انکشاف کیا تھا کہ حکومت نے ان لوگوں کو غیر مشروط نے کا فیصلہ کر دیا ہے۔ جن پر تشدد کا الزام نہیں ہے۔ اور ان میں مولانا مودودی بھی شامل ہیں۔ حقیقت حال کے اعتبار سے ملک صاحب کی یہ صداقت پر مبنی تھی۔ ظاہر ہے کہ مولانا کو جو سزا دی گئی ہے۔ وہ "قادیانی مسئلہ" کی اشاعت کی پاداش میں ہے۔ اور "قادیانی مسئلہ" ایک ایسی تصنیف ہے ہمارے ملک کا کوئی قانون اعتراض نہیں کر سکتا۔ یہاں تک کہ اس پمفلٹ کے چھپنے میں اس کو پریس ایکٹ کے ماتحت بھی قابل اعتراض قرار نہیں اگر پمفلٹ کسی حیثیت سے بھی حکومت کی زد میں آتا۔ تو ممکن نہیں تھا کہ یہ مطبوعہ پمفلٹ پاکستان میں چھپتا اور شائع ہو سکتا۔ حقیقتاً عدالت کے

دوران میں بھی جب کبھی اس پمفلٹ اور اس پر سزائے موت کے دیئے جانے کا تذکرہ آتا تو فاضل جج حیرت و استعجاب سے فرماتے کہ "ایسا ہونا ناممکن ہے"!

اب اگر اس پمفلٹ کو "تشدد پر ابھارنے" کا موجب قرار دیکر فیڈرل کورٹ کے جج کے سامنے مولانا مودودی کے معاملے کو پیش کرنے کا اہتمام فرمایا گیا ہے تو اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ جس شخص نے اس اقدام کا مشورہ دیا ہے۔ اس نے حکومت کے ساتھ خیر خواہی نہیں کی اور ان خدشات کو حق بجانب ثابت کر دیا ہے۔ جو مولانا نے اپیل دائر کرنے کے فیصلے کے سلسلے میں ظاہر کئے تھے۔ کہا جا سکتا ہے کہ معاملہ فیڈرل کورٹ کے جج کے سامنے پیش ہے۔ وہ فیصلہ دے دیگا۔ اگر قادیانی مسئلہ تشدد پر ابھارنے کی زد میں نہیں آتا۔ تو وہ مولانا کی رہائی کی سفارش کر دے گا۔ لیکن ہمیں تو فی نفسہ اس پر اعتراض ہے۔ کہ مولانا کے معاملہ کو "تشدد پر ابھارنے" کے ضمن میں رکھا جائے۔ جب ملک فیروز خان نون کے بیان کے مطابق مولانا کا نام ان ۱۱۵ اسیروں کی فہرست میں تھا۔ جن پر تشدد وغیرہ کا الزام نہیں تھا تو اس کو اس فہرست میں سے نکال کر دوسرے ۲۲ افراد کی فہرست میں کیوں شامل کیا گیا؟

خان افتخار حسین خان صاحب نے جب مسلم لیگ کی مجلس عاملہ میں یہ قرار داد پیش کی تھی۔ کہ جن لوگوں پر تشدد کرنے کا الزام نہیں ہے۔ انکے معاملہ کو فیڈرل کورٹ کے جج کے سامنے پیش نہ کیا جائے۔ تو اس وقت اجلاس کی صدارت مسٹر محمد علی وزیر اعظم کر رہے تھے۔ مسٹر لسے کے بروہی وزیر قانون موجود تھے اور ملک فیروز خان نون بھی تشریف فرما تھے۔ مرکزی وزراء میں سے مسٹر عبد القیوم خان اور مسٹر شعیب قریشی بھی حاضر تھے۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ خان ممدوٹ کی قرار داد رائے عامہ کے مطالبے کو منظور کرنے کے جذبے پر مبنی تھی۔ اور رائے عامہ کا مطالبہ بالاصل مولانا مودودی، مولانا عبد الستار نیازی اور مولانا اختر علی خان وغیرہ کی رہائی کے سلسلے میں تھا۔ اسی ضمن میں دوسرے اسیران مارشل لا آپ سے آپ آتے تھے۔ اگر حکومت کا ارادہ یہ نہیں تھا کہ مولانا مودودی اور دوسرے حضرات کے معاملے کو فیڈرل کورٹ کے جج کے سامنے پیش کئے بغیر رہا کرے تو اس قرار داد کو منظور ہی نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن اس کا بالاتفاق منظور کیا جانا بلا شبہ یہی معنی رکھتا ہے کہ اس وقت مجلس عاملہ لیگ کے ارکان موجود کا یہی فیصلہ تھا۔ اور یہی ارکان حکومت کا ارادہ تھا مگر معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں "بے یقینی" کا دورہ پھر پڑ گیا۔ اور بعض مصلحتیں پھر اس فیصلے کی راہ میں حائل ہو گئیں۔ اور اس کو آخری وقت میں بدل دیا گیا۔ ہم ارباب حکومت کی حقیقی خیر خواہی کے گہرے جذبے کے ساتھ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ان کا یہ طرز عمل ان کو عوام میں محبوب بنانے کا باعث نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس سے اس عام تاثر کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ کہ ہمارے ارباب اختیار کی قوت فیصلہ مفلوج ہو چکی ہے۔ وہ کوئی صحیح فیصلہ کرنے کے اہل نہیں رہے۔ اور اگر مطالبہ عمومی سے مجبور ہو کر وہ کوئی صحیح فیصلہ کر بھی لیں تو اس پر قائم رہنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکے ہیں۔ چنانچہ اسی ایک معاملے میں انھوں نے اتنی قلابازیاں کھائی ہیں کہ دیکھ دیکھ کر ان کی حالت زار پر رحم آتا ہے۔

ہم پھر مرکزی حکومت کے ارکان کو مشورہ دیتے ہیں۔ کہ رہائیوں کے مسئلے کی خوبصورتی کو قائم رکھئے۔ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی، مولانا عبد الستار نیازی، مولانا اختر علی خان، سید نقی علی اور سید خلیل احمد وغیرہ کو بلا تاخیر رہا کیجئے۔ اور پاکستان کے عوام کے اضطراب کو دور کیجئے۔ اسی سے حکومت کا وقار اور اعتماد بحال ہو سکتا ہے۔ اور اسی سے عوام مطمئن ہو سکتے ہیں ——— !!

(بشکریہ تسنیم)

آہ ——— عابد گھیانوی!

قارئین "مشیر" کو معلوم ہوگا کہ جناب عابد گھیانوی صاحب بی۔ اے ادارہ "مشیر" کے پرانے اور بڑے پرخلوص معاون تھے۔ "مشیر" میں آپ کا کلام مسلسل شائع ہوتا رہا ہے۔ آپکے کلام میں پختگی بھی اور خلوص بھی، آپ کا قلم مقدور بھر حق و صداقت کا ساتھ دیتا رہا۔ ان کی آخری نظم "مسلمان" جو ادارہ "مشیر" کو ۱۱ مارچ ۵۴ء کو موصول ہوئی اسی شمارہ میں شائع کی جا رہی ہے۔ اب یہ قلم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو چکا ہے۔ عابد صاحب ۲ اپریل ۵۴ء کو اس دار فانی سے راہ گزار عالم جاودانی ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ——— اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ اور انھیں اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔ ادارہ "مشیر" مرحوم کے پسماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ مرحوم کمرشیل کو اپریٹو بنک لمیٹیڈ میں ملازم تھے۔ اور بہت ہی نیک سیرت نوجوان تھے۔

(ادارہ "مشیر")

سید رمضان ایڈیٹر "المسلمون" قاہرہ

ترکی اور اسکی موجودہ اسلامی تحریکیں

ت ۱۹۵۰ء کی مردم شماری کی رو سے ترکی کی آبادی ۲ کروڑ
،۔اس آبادی کی عظیم اکثریت ترکوں پر مشتمل ہے۔ اور ترک سارے
مسلمان ہیں۔

ِ جائے وقوع کے لحاظ سے ترکی کو نہایت اہم اور ممتاز حیثیت
ں میں چاروں موسم بیک وقت پائے جاتے ہیں۔ اس کا بڑا حصہ
ڑا ہوا ہے۔ جس طرح جسم میں شریانیں پھیلی ہوئی ہیں اسی طرح
اندرونی حصہ میں دریا رواں ہیں۔ پانی کی بڑی بہتات ہے
ی قوم کی فطرت اسلامی ہے۔ اس کے تمام افراد مسلمان ہیں یہاں
ترک خود مسلمان ہی کا ہم معنی بن گیا ہے اور وہاں جو مسلمان
ہ ترک نہیں ہے۔ اس صورت حال پر کسی کو تعجب نہیں۔۔ کرنا
کہ یہ قوم زندگی تمدن اور عزت و شرف سے متعارف ہی
ذریعہ سے ہوئی ہے۔

یخ تیس سال پہلے تک دولتِ عثمانیہ اس دنیا کے ایک
ر پھیلی ہوئی تھی عثمان نے اس کی بنیاد رکھی اور محمد فاتح نے
نبو طبنیادوں پر اسے ایک عظیم الشان سلطنت بنا دیا۔
ے کے تخت پر بہت سے صالح۔ جفاکش اور دیانتدار حکمران
ن تھک کوششوں سے اس حکومت کو سابق اسلامی
سی عظمت حاصل ہوئی اور مسلمان اس کے زیر سایہ بغیر کسی
ِ دخون کے اس اسلامی عدل سے متمتع ہوتے رہے جو اسلام
رثہ ہے۔

پھر آہستہ آہستہ اس میں بھی دلی عہدی کے رواج نے راہ
س چیز کو اسلام سے کچھ تعلق نہیں تھا اسکے بعد خلفا سلطنت کی
ا کی ذمہ داریوں کو چھوڑ کر اپنے عیش و تنعم کے پیچھے پڑ گئے جس کا
انحطاط اور زوال کی شکل میں نمایاں ہونا شروع ہوا اس کر دیکی
سے فائدہ اٹھا کر مغربی قومیں دولتِ عثمانیہ پر چڑھ دوڑیں اور سلطنت ان
کمزوریوں کے سبب سے جو اس کے اندر پیدا ہو چکی تھیں ان مغربی قوموں کے
اقدامات کا توڑ نہ کر سکی۔ بالآخر سلطنت کے حصے بخرے ہو گئے۔ اس کی
وحدت پارہ پارہ ہو گئی اور مخالف قوتوں نے اس کے خلاف نہایت جتھہ بندی
کر لی۔ صیہونی یہودیوں نے اس کے قلب، فلسطین کو تاکا اور سلطان عبدالحمید
سے مطالبہ شروع کر دیا کہ وہ اس حصہ کو ان کے حوالے کر دے۔ وہ انکار کرتا رہا
اور وہ اس کے لئے برابر سازشوں میں لگے رہے۔ روسیوں نے اپنی سرحدوں
سے ملحق علاقوں کو دبا لینے کی تدبیریں شروع کر دیں۔ انگریز اور فرانسیسی زیادہ
ہوشیار اور حوصلہ مند تھے۔ انھوں نے یہودیوں کے ساتھ مل کر اس بات
کے لئے سازشیں شروع کر دیں کہ بغیر کسی جنگ اور خونریزی کے اس عظیم الشان
سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ "فری میسن" تحریک اور صیہونی انجمنوں نے
ہر طرف جال بچھا دئیے اور مسلمان ان کے ہاتھوں میں آلۂ کار بن کر خود اپنی
تباہی کے سامان کرنے لگے۔

بالآخر ہر چیز کو "ترکیانے" کی تحریک وجود میں آئی اور ساری دولت
عثمانیہ کو خالص ترکی قومیت کے رنگ میں رنگ دینے کا غلغلہ بلند ہوا۔
"انجمن اتحاد و ترقی" نے مملکت کی مسلمان رعایا کے ان طبقات کو بھی اس
قومیت کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی جو ترکی نسل سے تعلق رکھتے تھے
اور جو اسلام کے سوا کسی اور رنگ میں رنگے جانے کے لئے ہرگز تیار نہ تھے
اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اپنی یکجہتی کھو کر متصادم گروہوں کے اندر بٹ گئے
اور اسلام کے دشمنوں کے لئے یہ بہت سہل ہو گیا کہ وہ ان کو سستا شکار
دیکھ کر آسانی سے کے ساتھ ہڑپ کر جائیں۔ چنانچہ انھوں نے ترکی کو آپس
میں تقسیم کر لیا۔

موجودہ ترکی۔ آج کل ترکی ایک آزاد اور خود مختار ملک ہے۔ سلطنت مغربی
قوموں کے لئے خوان نعمت نہیں رہا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس تبدیلی کا راز

کیا ہے؟ لیکن اس سوال کے جواب سے پہلے اگر ایک شخص ترکی کے چند مرکزی شہروں پر ایک سرسری نظر بھی ڈالے اور وہاں زندگی کی رفتار کا جائزہ لے تو اس پر یہ حقیقت بالکل واضح ہو جائے گی کہ آج کا ترکی فی الحقیقت ہر پہلو سے آزاد اور خود مختار نہیں ہے اور نہ وہ ہر پہلو سے ترقی کی طرف جا رہا ہے بلکہ بہت سے پہلوؤں سے وہ بڑی تیزی کے ساتھ انحطاط کی طرف جا رہا ہے۔ ان شہروں کی ہر چیز ——— مساجد اور گنتی کے چند اللہ کے مخصوص بندوں کے سوا ——— اس بات کی گواہی دے گی کہ ترکی اسلام سے بہت دور ہو چکا ہے۔ اخلاق تباہ ہو رہا ہے۔ ذہن پراگندہ ہو رہے ہیں اور الحاد کا دور دورہ ہے۔ ایک لادینی حکومت زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے لیے اہل کتاب اور مشرکین سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ تقریباً پوری قوم کی اسلام کی حقیقت سے بے خبر بنا دی گئی ہے۔ اخلاقی اور ذہنی خرابیوں کے ساتھ ساتھ اجتماعی اور جسمانی امراض بھی بڑھتے جا رہے ہیں۔ اور آہستہ آہستہ ترکی میں ایسے بے بنیاد نظریات پرورش پا رہے ہیں جو ایک بڑے خوفناک مستقبل کی خبر دے رہے ہیں۔

انہی فتنوں کے درمیان اناطولیہ کا وہ مجاہد ترک بھی بستا ہے جو اپنی فطرت کے لحاظ سے ایک مجاہد اور غیور مسلمان ہے۔ ان کے اندر بلاشبہ ایسے افراد ہیں جو اپنے عہد ایمان پر پوری مضبوطی کے ساتھ قائم ہیں اور جن کے اندر اسلامی شجاعت اور اعلائے کلمۃ اللہ کا جذبہ اب بھی کروٹ لے رہا ہے۔ اتاترک کے لائے ہوئے انقلاب نے دینی اور اجتماعی نقطہ نظر سے ان پر جو آفتیں ڈھائیں اس کے اثر سے یہ اندر اندر برابر گھل رہے ہیں۔ ان کے اندر مسلمان افراد بھی ہیں اور مسلمان گھرانے بھی ہیں اور درحقیقت ترکی کی قوت کا سرچشمہ یہی لوگ ہیں۔ اناطولیہ کے یہی مجاہد تھے جو ہمیشہ اس حکومت کی پشت پناہ رہے ہیں اور دشمنوں کے تمام حملوں کا پوری بے جگری کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے ہیں۔ تیس سال پہلے جب دشمنوں نے ترکی کے حصے بخرے کر ڈالے تھے تو اتاترک نے انہی لوگوں کے اندر پناہ لی اور پناہ لینے کا مقصد یہ تھا کہ ان لوگوں کو دشمنوں سے جہاد کرنے پر ابھارے۔ اتاترک نے ان لوگوں کی اسلامی غیرت اور مومنانہ ہمت کو ابھارا اور ان سے ان لوگوں کے ایمان کے سامنے اپنے آپ کو ...

... جیسے مذہبی اور خدا ترس مسلمان کی صورت میں پیش کیا جو روزہ اور تمام احکام شرعی کا پابند ہو۔ اس چیز سے متاثر ہو کر اس ... گروہ نے اتاترک کا ساتھ دینے کے لیے کمر ہمت باندھی۔ ا... چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہوئے ... لیے نکل کھڑے ہوئے۔ اور دیکھتے دیکھتے دشمنوں کو اپنے ملک کے ... سے باہر نکال دیا۔

جب دشمن کا قلع قمع ہو گیا اور اتاترک کا اقتدار پوری طرح جم ... نے یکایک اپنے چہرے سے دینداری کی نقاب اتار دی۔ سلطان کا نفر... اسلام دشمنوں سے ملا کے سامنے لادینیت دسیکولرزم کا جو نظریہ پیش ... اس کو اس نے قبول کر لیا۔ پھر یہ چیز اس کے دل و دماغ پر اس طرح ... کہ اس نے دین کے حامیوں اور اسلام کے خدمت گزاروں اور ... قوم کے مخلص خادموں کی بیخ کنی کا ارادہ کر لیا۔ اسلام کے مذکر... نے ظلم و فساد کی کچھ دوسری طاقتوں کے ذریعے سے بھی اتاترک کی ... اور ان لوگوں نے مل ملا کر اس مشہور انقلابی اسکیم بنائی جس کا مق... کہ ہر وہ چیز جو اسلام سے کسی نوعیت کا بھی تعلق رکھتی ہے اس دلیل ... پر ختم کر دی جائے کہ وہ پستی اور جہالت کا سبب ہے۔ اس طرح ا... نے پورے ترکی کو ملحد اور بے دین بنانے کی کوشش کی اور ان سار... کو جن کا اسلام سے تعلق تھا یا تو ان کو ختم کرنے کے درپے ہو گئے ... ان کو مسخ کر کے چھوڑا۔ اذان ترکی بنا دی گئی۔ قرآن ترکی میں کر دیا گیا ... لاطینی اختیار کر لیا گیا۔ ہیٹ پہننا جبری کر دیا گیا۔ مدرسوں کے نصاب تع... کو یک قلم خارج کر دیا گیا۔ جمعہ کی چھٹی اتوار کو کر دی گئی۔ تمام قوانین اور احکا... مستعار لیے گئے اور ان ساری چیزوں میں مغرب کی اندھی تقلید اختیا... کی نکاح اور طلاق اور معاشرت تک کے متعلق مسلمانوں کے شخصی قانون ک... گیا اور قرآن کے صریح احکام تک کے منسوخ کرنے میں تامل نہ کیا گ... مسلمانوں کے شخصی قانون میں یہ مداخلت انگریزوں اور فرانسیسیوں او... قوموں نے بھی نہ کی تھی۔

مجھے اسلامی تحریکات کے بعض کارکنوں نے یہاں تک بتایا ... کے اتاترک ایک مرتبہ سرجوڑ کر اسلام قرآن کو ترکی ... کرنے پر آمادہ ... گیا کی تجویز تھی کہ نصف اشخاص ... کا منگ...

[illegible] ہے کہ ترکی میں [illegible] کے
[illegible] جب تک یہ قرآن موجود ہے [illegible]
[illegible] لوگ غالب اکثریت سے
[illegible] کے بعد اس ملک میں سب تبدیل ہو گئے کہ آئندہ
[illegible] اس طرح کی جائے کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے قرآن کو پارہ پارہ
اس کا طریقہ یہی ہے کہ اس کو بالکل نظر انداز کیا جائے اور زندگی کے
سے اس کو بالکل خارج کر دیا جائے۔

[...]ی تحریکیں حزب الامت — اس پارٹی کا سنگ بنیاد اسوقت
[...]وزی رحمۃ اللہ علیہ نے انقلاب کے بعد پہلی مرتبہ اتاترک کی بدعہدی کا
[...] اور انھوں نے محسوس کیا کہ اتاترک لادینیت اور مخالفت اسلام کی راہ پر
[...] اسوقت نوزی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ عہد کیا کہ وہ اپنی پوری زندگی اپنے
[...] اسلام کو باقی رکھنے کی جدوجہد میں لگا دیں گے اس مقصد کیلئے انھوں
[...] الامت کے نام سے ایک پارٹی بنائی لیکن انقلابی پارٹی نے پوری قوت
[...] حزب الامت کی مخالفت کی اور اسکے اندر اپنے ایسے آدمی شامل کر دیئے
[...] جدوجہد میں لگے رہے کہ یہ پارٹی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔

[...] نورانیت اس راستہ میں ایک دوسرا قدم ایک مشہور کردی عالم نے اٹھا[...]
تحریک نورانیت کے نام سے ایک تحریک چلائی یہ نام ان قرآنی آیات سے ماخوذ
[...] کے مقصد کو ظاہر کرتی ہیں یعنی لوگوں کو تاریکی سے روشنی کی طرف لانا [...]
[...] من الظلمات الی النور۔

[...]ان کردی عالم کا نام سعید نورسی اور لقب بدیع الزماں ہے یہ ترکی کی پہلی
[...] کے جس کی بنیاد اتاترک نے ڈالی تھی۔ لیکن [illegible] ساری انقلابی تحریک
[...] کے آغاز سے شریک [illegible] ان کی وفاداری پر کبھی شبہ نہیں کیا گیا لیکن
[...] مکمل کر دہ اس [illegible] انقلاب کے مخالف ہیں ان کو قید خانہ میں ڈال دیا
[...] طرح کے مظالم توڑے گئے [illegible] کر کے [illegible]
[...] نے ہی کے [illegible] کے اصول مرتب کئے اور جیل سے [illegible] ان کی
[...] شروع کر دی [illegible] ہے اور ان کی تعلیمات میں سے ذیل
[...] اور [illegible] کے ساتھ
[...] ہیں میں اس [illegible] سے خود بخود
[illegible]

کی طرف سے ساٹھ سال سے مبتلا ہو رہا ہے۔ تاہم اس ملک میں اسلام کو بچانے کا
عزم اور ارادہ رکھتے ہیں پچھلے پچاس سال سے یہ تحریک خاموشی کے ساتھ کام کر رہی ہے
اور تقریباً ہر جگہ پہنچ چکی ہے یہاں تک کہ اب کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی آہستہ
آہستہ اپنے قدم جما رہی ہے۔

تحریک اسلامی اور حکومت تحریک نورانیت ترکی کے [illegible] اسلامی
فکر اور مذہبی احساس پیدا کرنے میں بہت بڑی حد تک کامیاب ہوئی ہے اس کا
اثر پچھلے انتخابات میں نمایاں ہوا جب کہ قوم نے ریپبلکن پارٹی کو۔ جو اتاترک کی
پارٹی تھی اور جو تقریباً چوتھائی صدی تک ملک پر حکمران رہ چکی تھی اور جو انقلاب
اسلام اور دین کی مخالفت کرنے میں پوری شہرت حاصل کر چکی تھی اقتدار سے ہٹا دیا
اور اسی کے ساتھ عصمت انونو کی قیادت بھی ختم ہو گئی اور اس کی جگہ ڈیموکریٹک
پارٹی برسر اقتدار آئی جس کے لیڈر جلال بایار ہیں۔ اس پارٹی کی کامیابی کی وجہ
کچھ تو یہ ہے کہ اس کے ان وعدوں کو جو انتخابات سے پہلے اس نے اسلام کو ترکی میں
دوبارہ سربلند کرنے کیلئے کیے تھے۔ لیکن جب اس پارٹی کو اقتدار حاصل ہو گیا تو اس
نے اپنے وعدوں کو پورا کرنے کے بجائے صرف رسمی باتوں سے قوم کو مطمئن کرنا
چاہا (مثلاً عربی میں اذان دینے کی اجازت۔ جمعہ کے روز دس منٹ کے لئے
ریڈیو سے قرآن کی تلاوت، ائمہ اور خطیبوں کی تربیت کے لئے بعض مدارس
قائم کرنے کی اجازت بشرطیکہ ان کے مصارف کے ذمہ دار مسلمان ہوں [illegible]
ان پر حکومت نہیں) اور ابتدائی مدارس میں دینیات کی شد بد کی تعلیم وغیرہ وغیرہ۔
اس پارٹی کی بدعہدی کے سبب سے وہ توقعات جو دینی تحریک کے
خادموں کو انتخابات سے پہلے اس پارٹی سے قائم ہو گئی تھیں وہ یک قلم ختم ہو گئیں
اور انھوں نے یہ ارادہ کیا کہ اپنے پچھلے تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک ایسی
جماعت کی تشکیل کریں جو اس ملک کے اندر اسلامی انقلاب پیدا کرنے کے لئے
موثر کام کر سکے اس کے نتیجہ کے طور پر ایک جماعت رابطۃ المؤمنین الاتراک
کے نام سے ظہور میں آئی اس جماعت نے اس زور شور کے ساتھ کام شروع کیا کہ
ایک ہی ہفتہ کے اندر اندر اس کی اسی سے زیادہ شاخیں قائم ہو گئیں، پروفیسر
ڈاکٹر، انجینیر، وکلا اور اخبار نویسوں کی ایک نہایت اچھی اور منتخب جماعت
اس کے اندر شامل ہو گئی [illegible] کے نام سے ان کا ایک اخبار بھی نکلتا تھا اور
بڑی تیزی کے ساتھ اس کی اشاعت بڑھنے لگی جب یہ جماعت [illegible]
[illegible]

محسوس کیا اور انہوں نے مل کر جماعت رابطہ پر ایک کاری ضرب لگائی اس کی ساری شاخیں بند کر دی گئیں اس کا فنڈ ضبط کر لیا گیا اس کے اخبارات بند کر دیے گئے۔ اس کے لیڈروں کو رجعت پسندی اور انقلاب کے خلاف سازش کرنے کے الزام میں جیلوں میں ٹھونس دیا گیا۔ اور وہ حکومت جو کل تک اسلامی تحریک کی علمبرداری کی مدعی تھی۔ وہ اس بیدردی کے ساتھ اسلامی تحریک سے لڑنے کے لئے آمادہ ہوئی کہ ترکی کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ "رابطہ" کے ارکان و متعلقین کا ہر جگہ تعاقب کیا گیا یہاں تک کہ جس کے اندر ذرا بھی دینداری اور ایمان کی کوئی بو محسوس ہوئی اس کو طرح طرح کے جسمانی اور ذہنی تکلیفوں میں مبتلا کیا گیا پھر حکومت نے آخری دار حمدی فوزی رحمۃ اللہ علیہ کی آئی پارٹی پر کیا جس کا ہم اوپر حزب الامت کے نام سے تعارف کرا چکے ہیں۔

دو نئے قانون اس سال کے اہم واقعات میں سے وہ دو نادر قوانین ہیں جو ترکی حکومت نے اسلامی تحریک کے دبانے کے لئے پاس کئے ہیں اور جن کے خلاف ہر طبقے سے مخالفت اور احتجاج کی صدائیں اٹھی ہیں۔ ان میں سے ایک قانون کا نام "قانون تحفظ اتاترک" ہے اور دوسرے کا نام قانون تحفظ انقلاب۔ ان دونوں قانونوں میں ان لوگوں کے لئے نہایت سخت سزائیں تجویز کی گئیں جو کسی نوعیت سے اتاترک کی تحقیر کا ارتکاب کریں یا اس پر کوئی الزام عائد کریں یا اسکے مجسموں کو نقصان پہنچائیں یا اس کی تصویریں پھاڑیں۔ اس سے مقصد اس قسم کے جوشیلے نوجوانوں کو گرفت میں لینا ہے جنھوں نے اسلام کی حمایت کے جوش میں پچھلے سال اس قسم کی بعض حرکتیں کی تھیں۔ نیز ان لوگوں کو بھی گرفت میں لینا ہے جو اتاترک کے لائے ہوئے انقلاب کی مخالفت کریں یا جوابی انقلاب لانے کی تدبیر کریں۔

میں جب ان دونوں قانونوں پر غور کرتا ہوں تو مجھے صاف نظر آتا ہے کہ حکومت نے یہ قانون پاس کر کے اتاترک کی ہر دلعزیزی کا سارا راز فاش کر دیا ہے۔ باہر کی دنیا اب تک اس غلط فہمی میں تھی کہ اس شخص کو ساری ترکی قوم اپنا پیشوائے اعظم مانتی اور پرستش کرتی ہے۔ مگر اس قانون نے یہ بات کھول دی کہ خود ترکی قوم کے ہاتھوں اس شخص کی عزت کو خطرہ لاحق ہے اور قانون بنا کر اس کی آبرو بچانے کی ضرورت پیش آگئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اتاترک کے پرستار ترکی میں اب صرف وہی لوگ رہ گئے ہیں جو انقلابی پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور خود اخلاقی بے قیدی اور الحاد کے علمبردار ہیں۔ باقی ترک عوام کے جذبات کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ پچھلی تحریکات میں اتاترک کے جتنے تمام ملک میں مجسمے

مقامات پر توڑ دیئے گئے۔ اور جہاں تک اس کی تصویروں کا تعلق ہے ایک تصویروں کے سوا شاید ہی کوئی تصویر پھاڑے جانے سے بچی ہو۔

دوسری حقیقت جو ان تمام واقعات سے ایک صاحب نظر پر عیاں ہوتی ہے یہ ہے کہ انقلابی پارٹی کی ساری مخالف اسلام سرگرمیوں کے باوجود ترکی قوم ابھی تک اسلام اور ایمان سے خالی نہیں ہوئی ہے۔ اور انقلاب کی تیس سالہ حکومت ترکوں کو لادینیت پر جمانے میں بالکل ناکام رہی۔ صورت حال اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے۔ کہ ترکی قوم کے اندر اسلام کی جڑ نہایت گہری اور مضبوط ہے۔ اور یہ جدوجہد جو اس کو اسلام سے ہٹانے کے لئے کی جا رہی ہے۔ اسے اسلام سے ہٹانے کے بجائے اس کے ایمان کی تقویت کا باعث ہوگی اور یہ بے دینی اور اباحیت جو ترکی کے بڑے بڑے شہروں میں پھیل رہی ہے۔ اور یہ انحطاط کے آثار جو بے دین گروہ کے اندر نمایاں ہو رہے ہیں۔ یہ ساری چیزیں انشاء اللہ داعیان اسلام کے مقصد کو تقویت پہنچانے کا ذریعہ بنیں گی۔

ایک اہم ضرورت خلاصہ یہ ہے کہ ترکی میں اسلامی تحریک برابر زور پکڑ رہی ہے اور برابر اسکو نئے نئے انصار و اعوان مل رہے ہیں۔ البتہ ایک بات قابل ذکر ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ تحریک اس دور میں اس بات کی سخت محتاج ہے۔ کہ اسے صحیح سمت میں رہنمائی کرنیوالے ملیں۔ قوم پرستی کا جو شور ترکی میں پھیلایا گیا زور کا تھا۔ کہ اس سے اسلامی تحریک کے بہت سے کارکن بھی متاثر ہو گئے۔ اس کا اثر یہ ہے کہ ان میں سے بعض کے اندر قومیت اور اسلامیت دونوں بیک وقت کام کر رہی ہیں حتیٰ کہ بعض جوشیلے نوجوان جو فی الحقیقت اسلام کا کام کرنا چاہتے ہیں۔ غلط فہمی کے سبب قومیت کے راستوں پر نکل جاتے ہیں اس سے انکی اسلامیت کی شکل بسا اوقات اس قدر بگڑ جاتی ہے کہ اسے پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں ان لوگوں کو صحیح اسلامی فکر سے روشناس کرانے اور اسلام اور غیر اسلام کا فرق سمجھانے کی بڑی ضرورت ہے۔

اس طرح عملی اعتبار سے بھی بہت سی مشکلات انکی راہ میں حائل ہیں ان میں سے کتنوں کو پایا ہے۔ جو عمل کا سچا جوش رکھتے ہیں مگر انکو پتہ نہیں کہ انقلاب لانے کیلئے صحیح طریق کار کیا ہے۔ وہ دعوت کے پھیلانے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے ہیں، لیکن انہیں صحیح طور پر یہ نہیں معلوم کہ سچے مسلم فرد ایک سچے مسلمان خاندان اور ایک سچی اسلامی سوسائٹی

[illegible]

نعیم صدیقی •

چُپ ہی بھلی!

نعیری کا نام محلے بھر میں بچے بچے کی زبان پر ہے، اس کا خیال آتے
ڑکیوں کے ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں۔ ان کے رخسار سرخ ہو جاتے
ں کی کنپٹیاں تپنے لگتی ہیں۔ اور اس کا ذکر چھڑتے ہی بڑی بوڑھیاں
ایسے کتے حرام زادے" کہہ کر ایک گہری تشویش میں غرق ہو جاتی ہیں
ناان سے سرگوشی کرتے ہوئے کہتی ہے کہ نہ جانے کیا ہو!!

نعیری باپ پر گیا ہے! اس کا باپ بھی "کپتا" تھا، اس کا خیال آنے
ی طرح تشویش میں پڑ جاتے تھے اور نہ جانے کیا ہو" کا دھڑکا محلے بھر
تھا۔ نعیری کے باپ نے چونکہ مسلم لیگ کی خدمت کی تھی اس لئے
ے چوہدریوں نے مسلم لیگ کا کونسلر بنوا دیا تھا۔ اس طرح کر ملا نیم چڑھا
دن دو کوئی نہ کوئی واردات کر تا رہتا۔ لیکن کوئی اس پر ہاتھ نہ ڈال
وئی فریاد تک نہ کر سکتا تھا۔ پولس تک اس کے خلاف جنبش نہیں کر سکتی
—— "کپتا" بھی تھا، برادری والا بھی تھا۔ اور مسلم لیگ کا چہیتا
نوں کی پگڑیاں اس نے اچھالیں، کتنے آنچل اس نے نوچ ڈالے
پر اس نے ہاتھ ڈالا، مگر وہ جب تک جیا دندناتا پھرا۔ آخر وہ اپنے
کے ہاتھوں چاقو کھا کر مرا۔

نعیری کی ماں پہلے ہی اپنے گھر کی گندی معاشرتی فضا کی بھینٹ چڑھ چکی
تھی! اور اب باپ بھی بسا اسلے کے دادی رہ گئی تھی جس نے لاڈ
بگاڑنے میں کوئی کسر پہلے ہی نہ چھوڑی تھی، اور اب تو پانی سر سے نکل
پڑنے میں بڑی پکی اور نعیری بازار میں وہ کارشیں تھیں۔ وہیں اور
اسی گندگی سے کے لئے کافی تھی۔ نعیری کا باپ ان پڑھ تھا لیکن وہ
طرح تعلیم دلانے کا شعور رکھتا تھا۔ لیکن پاس کر سکے تو
مدرسے سے پھر بھاگا۔
[illegible]

کسی کے گلے میں مالا ہوتی، کسی کے بنے بڑے تالازی سے ہوتے، کسی کے
مونڈھے پر سنہرے لاکٹ میں تعویذ بندھا ہوتا، کسی کی کلائی پر نام کھدا ہوتا
اور شیر کی تصویر بنی ہوتی، کسی کی مونچھیں ایسی ہوتیں جیسے دو کوے کنوئیں
منڈیر پر بیٹھے ہوں، کسی کے تہمد کا سماں یہ ہوتا کہ اس کے دونوں کونے لٹک کر
دو دو فٹ نیچے تک لٹک رہے ہوتے اور کنارا زمین پر گھسٹتا۔ ——
یہ لوگ اندر اندھیری کوٹھڑی میں گھسے رہتے، وہیں چائے اور کھانا منگاتے
گپیں لڑاتے، قہقہے لگاتے، گراموفون ریکارڈ سنتے، کبھی کبھی ان میں سرگوشیاں
ہوتیں۔ بار ہا وہ جوا کھیلا کرتے تھے، اور کھیلتے کھیلتے ان میں دنگا ہو جاتا تھا لیکن
کوٹھڑی کی کنڈی وہ اندر سے لگا کے بیٹھتے تھے اور نعیری کے لئے یہ سب
کچھ پراسرار تھا۔ اس بچارے کو ادھر پر مارنے کی اجازت ہی نہ تھی لیکن اسی
قدغن کی وجہ سے نعیری کی توجہ چوبیس گھنٹے اسی کوٹھڑی کے اندھیرے میں
بھٹکتی رہتی، وہ جب کبھی پان، چائے یا حقہ کی چلم لے کر اسے جانا پڑتا تو وہ . .
بلب کی روشنی میں ان دہشت ناک اور بیلائی چہروں کو دیکھ کر ہک دھک سے
رہ جاتا!

پیندرہ برس کا بچہ اسی کوٹھڑی میں رہتا تھا چنانچہ نعیری کو کبھی کبھی لکڑیاں
نکالنے کیلئے اندر جانا پڑتا وہ اس کوٹھڑی میں جاتے ہوا ڈرا کرتا تھا۔ لیکن جاتا تھا
وہ جاتا تو ادھر ادھر دیکھے بغیر سیدھا لکڑیوں تک جا پہنچتا۔ وہ آنکھیں مٹکاتے
ہوئے ڈرتا تھا کہ کہیں کوئی موٹی موٹی مونچھوں والا اچھا اسے دبوچ نہ لے اور
کہیں کوئی اجنبی عورت چڑیل بن کر اس کا گلا نہ گھونٹ دے۔ لیکن ایک دن اس
نے پوری فضا کو دیکھ لیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک کونے میں یہ بھی کھڑی چھپا کا
میں بلب کی روشنی میں چمک رہا ہے ساتھ سکھا چھے میں سات پانچ لیا
[illegible]
[illegible]

پنی پیشانی داخل ہوتی اور پھر اسی کوٹھڑی میں گم ہو جاتی۔ ایک آدھ مرتبہ اس طرح کے حادثوں پر نیفری کی نگاہ بھی پڑ گئی اور پھر وہ سوچ میں ڈوبا رہنے لگا ایسے موقعوں پر اسکی ماں کا برا حال ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ جب وہ کوٹھڑی میں بیچنے کے لیے جائے یا کھانا تیار کر رہی ہوتی تھی تو اسکی آنکھیں نم آلود رہتیں، اور وہ بالکل گم سم ہو جاتی۔ وہ پہلے بولا بھی کرتی تھی۔ لیکن بری طرح پٹتی، اور نیفری کیسا منے اس لئے وہ ماریں کھاتی تھیں کہ اونٹ بھی نہ سکے نیفری کی دادی بیچ بچاؤ کے لئے گھٹیا سے تھوڑی بیکتی اٹھتی لیکن گھبراہٹ کے مارے کئی کئی بار گر پڑتی، اور پھر بیٹے کا ہاتھ پکڑتے پکڑتے نیفری کی ماں کے اوپر گر جاتی اور دو چار لاتیں یا سونٹے اسے بھی پڑ جاتے۔ تب جا کر طوفان تھمتا ۔ آخر نیفری کی ماں نے ان تجربوں کے بعد چپ ہی پکڑ لی! ——— اب اسکے ہونٹوں پر آتے والے سارے الفاظ پلکوں کے آنسو بن جاتے تھے لیکن اب نہ آنسوؤں والی پلکیں باقی تھیں، نہ وہ مارنے والے ہاتھ ——— صرف نیفری تھا اور اسکی ایک بہن اور ایک دادی!

نیفری سے مدرسہ پتنگ بازی کی لت نے چھڑایا۔ وہ دن دن بھر کوٹھے پر پتنگ اڑاتا رہتا، اور پیچا لڑا لڑا کر ڈور یں اور پتنگ لوٹتا رہتا۔ کوئی پتنگ محلے کی فضا میں پرسی نہیں کہ نیفری اسکے پیچھے پڑ نہیں گیا۔ ڈور آنا فانا کاٹ کے رکھ دیتا، پتنگ گر پڑتی اور نیفری اپنی فوج کی کمان کرتا ہوا ایک گھر سے دوسرے گھر کی چھت پر کودتا، دیواروں پر چلتا، سیڑھیاں چڑھتا اترتا اپنا شکار لیکر پلٹتا۔ ایسے موقعوں پر بعض اوقات گتھم گتھا ہونے کی ضرورت بھی پیش آتی، اور نیفری اس میں طاق ہو گیا تھا۔ طاق بھی ایسا ہوا کہ محلے کے لڑکوں پر اس کا رعب چھا گیا، نیفری کا نام سنا نہیں کہ حریف بھاگا نہیں۔ نیفری اکیلا ہوتا تو الگ بات تھی، مگر یہاں تو نیفری کے ساتھ دسیوں نیفری اور تھے۔ فوج کی فوج تھی اور وہ اپنی فوج کا نپولین تھا۔ ایک دن نیفری کی پتنگ بھی لوٹ گئی، وہ مع اپنی فوج کے چڑھ دوڑا مگر دشمن کا پلہ بھاری رہا وہ انتقام کی آنچ سے کھول گیا۔ گھر آیا، قلمتراش نیفے میں اٹکایا اور موقع سا ایک، دن لے کر نکل گیا۔ فوج تھی کی اور جس لڑکے نے پتنگ لوٹی تھی اس کے گھر کے سامنے جا مورچہ لگایا۔ وہ لڑکا بے دھیانی میں گھر کے دروازے سے نکلا ہی تھا کہ فوج ٹوٹ پڑی، نیفری نے اسکے کندھوں پر بے تحاشا ڈنڈے برسائے، لڑکا چیخا تو شور سن کر اس کی ماں باہر نکل آئی، فوج بھاگ گئی مگر نیفری اس کی ماں کے آتے پر بھی گتھم گتھا رہا۔ اب اس نے چاقو نکالا تھا اور اسے زخمی کرنے کو تھا لیکن اسکی ماں نے نیفری کو الگ کیا۔ ادھر سے لوگ اکٹھے ہونے لگے۔ نیفری بھاگ گیا۔ شکایت اسکی دادی تک پہنچ گئی۔ دادی سر پیٹ کر رہ گئی۔ وہ کہیں شام کو گھر پلٹا۔ دادی اسکے آگے اس پر برس پڑی لیکن وہ لاٹھی تان کر اسکے سامنے کھڑا ہو گیا۔ خبردار! تو، میں جانوں اور میرا کام جسے بات کرنی ہو مجھ سے کرے، میں اس خود نمٹ لوں گا۔ لاٹھی نہ کام کریگی تو چاقو موجود ہے، چاقو کافی نہ ہوگا برچھی ہے، اور برچھی بیکار نکلے گی تو پستول کی گولی سے کام لوں گا! دادی بھنچ کے رہ گئی، اس پر جیسے ایک کپکپی طاری ہو گئی ہو!

اور اب چرچے ہونے لگے کہ نیفری تو بلا ہے، نیفری تو نہ جانے کیا بنے گا؟ اور یہ چرچے جب نیفری کے کانوں تک پہنچے تو وہ پھول جاتا ——— وہ ماحول میں کتنا ممتاز ہو رہا تھا!

چھت سے پتنگ بازی کرتے ہوئے نیفری آس پاس کے منظر کے کچھ دوسرے پہلوؤں سے بھی آگاہ ہونے لگا تھا وہ چھتوں پر عورتوں اور لڑکیوں کو دھوپ تاپتے یا ہوا کھاتے یا کپڑے پھیلاتے دیکھتا۔ تو اس کا جی چاہتا کہ وہ ان سے بھی کوئی شرارت کر سکے، وہ

وہ چاہتا کہ کاش کہ یہ بھی پتنگ اڑائیں اور یہ ان سے بھی پیچ لڑا کرے، پتنگ نہیں تو اپنے آنچلوں کو ڈور باندھ کر لہرائیں، پھر کبھی وہ کبھی کبھی پتنگ لپیٹ کر رکھ دیتا اور پھر ادھر ادھر دیکھنے لگتا اور دیکھتے دیکھتے کسی منظر پر اس کی نگاہیں رک جاتیں۔ کہیں دو چار عورتیں آپس میں بیٹھی سلائی بنائی کا کام کر رہی ہوتیں، ہاتھ ملاتیں، ہنسی مذاق کرتی بیٹھتیں، ——— اور ان بیچاریوں کو یہ پتہ نہ ہوتا کہ ایک جوان آنکھ دیکھ رہی ہے پھر آہستہ آہستہ نیفری یہ بھی معلوم کرنے لگا کہ یہ گھر فلاں لڑکی کون ہے؟ اسکے برقعہ کا رنگ اور ڈیزائن کیا ہے؟ جو وہ جاننے لگا کہ یہ جمیلہ کا گھر ہے، یہ لڑکی شمشاد کی بڑی بہن ہے جو والی مڈل اسکول کی ہیڈ ماسٹرس ہے، یہ وہ ہے جس کو حلیم نے طلاق دی تھی!

جنگ لوٹنے کیلئے جب وہ اپنی فوج سمیت چھتوں پر دوڑ لگاتا تو حادثات پیش آتے۔ ایکدن وہ بیت الخلاء پر جا چڑھا، اور ... ہائے اکر کے رہ گئی۔ ایکدن وہ ایک صحن میں کود گیا اور وہاں ... بھابی کی اوٹ میں نہا رہی تھی۔ وہ بدک گئی اور اس نے کپڑا لپیٹا۔ ... لیوں کی بوچھاڑ کی کہ توبہ ہی بھلی! نفری بھاگ کے دروازے سے ... ملا سے بری طرح ہنسی آرہی تھی اور وہ دیر تک ہنستا رہا! اپنے یہ ... جب اپنے ساتھیوں کو سناتا تو وہ اپنے اندر نت نئی تحریک محسوس کرتا یوں نفری کے اندر ایک نئی حس اور ایک نئی دلچسپی نے کروٹ لی۔

میلہ سیراغاں ہوا تو نفری وہاں سے ایک نیا فتنہ خرید لایا۔ یہ دوربین اس نے چھت پر کی برساتی کے اندر کھڑے ہوکر کھڑکی کے پٹ اس ... کہ دوربین رکھنے کے لئے فاصلہ ہے۔ وہ سب کچھ دیکھ سکے مگر دیکھنے والا نہ ہو۔ اور اس نے دیکھا کہ سلیمہ اپنے کمرے کے اندر گھوم رہی تھی، وہ اپنے آپ کو غیر آنکھوں کی دسترس سے محفوظ سمجھ ... سلیمہ کے کمرے کی کھڑکی کے ایک کھلے پٹ میں سے نفری اس ... تک رہا تھا جیسے وہ بالکل اسکے پاس کھڑا ہو۔ اس نے بوڑھے بابا کو دیکھا چھت پہ آیا اور بیت الخلاء کے باہر ہی استنجا کرنے ... اس نے دیکھا کہ سامنے کی خالہ آئینہ رکھے بال بنا رہی ہے۔ وہاں سے دیکھتا رہا، دیر تک دیکھتا رہا، اور جیسے بالکل ان میں گم ... آج اسکی آنکھ کو نئی قوت مل گئی تھی، وہ اب مسلح آنکھ تھی، وہ اب ... تھی! ایک نئی دنیا کے دروازے اس پر کھل گئے تھے، سائنس ... بن گئی تھی ——— اور سائنس جب بدکرداری میں معاون بن جاتی ہے تو پھر امن اٹھ جاتا ہے، شرافت کا خون ہو جاتا ...

شرافت کا خون ہوتا رہا، ہر روز ہوتا رہا!

نفری اس فتنے کو اپنے لئے ایکدن بھی خاموش رکھ سکا اور اسے ... سکا، اس نے اپنے ساتھیوں کو بھی اس نئی دنیا کی سیر کرا دی جس ... نے دریافت کیا تھا!

یہ فوج کی فوج دوربین لے محلے کی بہو بیٹیوں کو تاکتی، پہلے کا آتا پتا نکالتی، پھر اسکے نام دھرے جاتے، پھر گلیوں میں ان کا تعاقب چلتا اور اس طرح نفری کی جوانی گل کھلا رہی تھی!

لیکن نفری چاہتا تھا کہ جس دوشیزہ کو اس نے دریافت کیا تھا اسے بھی تو اپنے وجود سے باخبر کیا جائے اور اسے اپنی طرف متوجہ کیا جائے، ایسے دھیان میں کسی کو تاکتے رہنا کیا مردانگی ہوئی چنانچہ ایکدن دوربین سے وہ اور اسکے دو ساتھی انور بزاز کی لڑکی پروین کو تاک رہے تھے جو صبح کے سمے چھت پہ بال بنا رہی تھی ——— یکایک نفری کو ایک شرارت سوجھ گئی، وہ دوڑا دوڑا نیچے گیا اور بڑا سا آئینہ اٹھا لایا جو اسکے باپ کی نشانی تھا۔ اس نے آئینہ کا عکس سیدھا پروین کے چہرے پر ڈالا، اور وہ ایسے بدکی جیسے اسے گولی مار دی گئی ہو، کنگھی اور آئینہ اسکے ہاتھ سے گر پڑے، اور اسے نفری اور اسکے ساتھی ہنستے دکھائی دئے، جو ہاتھ ہلا ہلا کر اشارے بھی کر رہے تھے ——— وہ مارے شرم کے بھاگی اور پھر کبھی کوٹھے پر نہ گئی۔ اب یہ تماشا ہر روز ہونے لگا۔ دوربین سے نشانہ بنایا جاتا، اور آئینہ سے فائر کیا جاتا۔ محلے کی شامت آگئی، اور عورت ذات کے لئے دھوپ لینا ہوا بالکل حرام ہو کے رہ گئی!

مشکل یہ کہ نفری اور اسکی پارٹی چونکہ مسلم لیگ کے کام آئی تھی، اور اسکے باپ کی خدمت کا ریکارڈ بھی بڑا شاندار تھا، پھر برادری کی بڑی طاقت تھی، اسلئے کوئی دم نہ مار سکتا تھا!

ہوتے ہوتے وہ وقت آگیا کہ نفری کے باپ کی تاریک کوٹھڑی اپنے سارے ہی پرانے استعمالات میں آنے لگی اور اس کی تاریکی کی قبر میں ایک ایک کرکے مردہ ہنگامے جی اٹھے: وہاں اسی طرح عجیب وغریب چہرے جمع ہوتے، اسی طرح تاش کھیلی جاتی، اسی طرح جوا ہوتا، اسی طرح قہقہے لگتے، اسی طرح سرگوشیاں ہوتیں، اسی طرح ریڈیو کے گانے گونجتے، اسی طرح دارو کا دور بھی چل جاتا، اور اسی طرح کبھی کبھار کوئی لڑکی رات کی تاریکی میں آتی اور تاریکی میں ہی لوٹ جاتی!

اکرم بوڑھا مہاجر تھا۔ وہ مشرقی پنجاب میں جائداد لٹوا آیا تھا، زمین چھوڑ آیا تھا، اپنے جوان بیٹے کی جان کو بھی لٹا آیا تھا، ——— یہ سب کچھ اس نے اپنی جان بچانے کیلئے گوارا نہیں کیا تھا

اپنی آن بچا سکے تھے گیا تھا!

جب تقسیم ہوئی تو اسکی بیٹی سعادت ہ۱ لڑکی سرحد پر قدم دھر رہی تھی جب بربریت کی لہر پورے علاقے میں پھیل شروع ہوگئی تو اکرم بڑی تشویش میں پڑ گیا۔ اسے زمین مکان اور اسباب کی کوئی فکر نہیں ہوئی تھی اسے اپنی جان کی کوئی فکر نہ تھی وہ اپنے بیوی اور بیٹا اور جوان بیٹی کی طرف سے بھی بےفکر تھا کہ اگر مرے گا تو بہرحال حق وصول کرکے مرے گا اسے ساری کی ساری فکر سعادت کی تھی!

سعادت ایک ایسا خزانہ تھا جو اسکے پاس اللہ کی طرف سے ایک امانت تھی دین کی امانت تھی، پوری تاریخ اسلام کی امانت تھی۔ مسلمان قوم کی امانت تھی، پاکستان کی امانت تھی، خود اپنے خاندان کی امانت تھی اور اس امانت کے بچاؤ کی فکر میں گھلا جا رہا تھا اگر ملک اس طرح اندھیر گردی میں ڈوبا جا رہا تھا تو اس کا کیا بنے گا سب کچھ گئے، زلکھانی، بہار اور شمالی پنجاب میں جو گھناؤنے واقعات ہوئے تھے وہ اسکے سامنے تھے!

ایک دن جب نازک گھڑی تو وہ اچانک رات کی تاریکی میں اپنا سب کچھ جالندھر کی ایک بدنصیب بستی میں چھوڑ چھاڑ کے نکل کھڑے ہوئے، اکرم، اسکی بیوی، اس کا بیٹا اور سعادت، یہ چار جانیں موت کے سمندر میں سے تیرتی ہوئی جالندھر کے کیمپ کی طرف لپک رہی تھیں۔ وہ دم سادھے جا رہے تھے کہ ہر سے کی فصل میں سرسراہٹ ہوئی اور کلیجے دھڑ دھڑ کرنے لگے... نگاہیں کبھی ادھر گھومتیں کبھی ادھر، اور تاریکی کو چیر چیر کر خطرے کو دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اور اچانک پیچھے سے تین سکھ کرپانیں لئے لپکتے نظر آئے۔ اکرم نے "یا اللہ" کہہ کر بیٹے کی طرف دیکھا اور بیٹا بڑا آتا ہوا سکھوں سے گھر گیا۔ پہلے ہی حملے میں اس نے ایک سکھ سے کرپان چھین لی اور وار کھانے کے ساتھ ساتھ وار کرنے لگا۔ اس نے چلا کر کہا، ابا لے جائیے بھاگئے، میں انکے لئے کافی ہوں!

اکرم بیٹے کے لئے دعا کی اور تینوں بھاگ کھڑے ہوئے اور گرتے پڑتے دلوں، پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ کبھی پیچھے دیکھتے کبھی آگے دیکھتے، وہ بڑھتے چلے گئے۔ کبھی اکرم ٹھوکر کھا کے گرتا، کبھی اسکی بیوی گر جاتی اور کبھی سعادت اوندھی آ گرتی...... بدن پانی پانی ہو جاتا، خون پسینہ تھا، مگر کسی کو کچھ پتہ نہ تھا کہ اس کے بدن پر کیا گذر رہی ہے!

اکرم کی بیوی اور سعادت جالندھر کی اس بیچارگی کی طرف لگی رہی، اکرم کے بعد تو یہ ہوا پیچھے کا کیا گزرا اکرم اس سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ چکا تھا!

اکرم نے آدھ گھنٹے تک دشمن کو مصروف رکھا۔ تینوں سکھ اسکے پیچھے پڑ کر رکھا تھا اور وہ اسکے قلاشے میں ہو رہے تھے۔ یاد رہے شیر کی زندگی کے دو سکھ سکھوں پر جھپٹ رہا تھا وہ جب بڑھتا تو دونوں سکھ ہٹ جاتے، پھر بڑھتے، پھر ہٹ جاتے۔ اسی اثنا میں اس نے موقع پا کر کرپان کا ایک وار پیچھے کی طرف جو کیا تو وار کاری پڑا۔ ایک پلٹ کر پہلو میں اترا سکھ کی گرفت ڈھیلی ہوگئی لیکن ٹھیک اسی لمحے سامنے سے ایک کرپان اکرم کے بیٹے کے پیٹ میں پیوست ہوگئی۔ پھر بھی وہ لڑتا رہا اور خون شلکا اسکے ایک ایک حصے سے بہہ رہا تھا۔ یہاں تک وہ گر پڑا اب وہ دو خونامیوں کے قبضے میں اس طرح بےبس پڑا تھا جیسے دو قصابوں کے قبضے میں آئی ہوئی ایک بکری ہو! ——— اور بکری ذبح ہوگئی!

ادھر اکرم اسکی بیوی اور اس کی بیٹی کیمپ میں داخل ہو رہے۔

پاکستان میں آنے کے بعد اکرم کی زندگی کا روشن رخ ہمیشہ کے لئے اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا اور تاریک رخ مستقل طور پر نگاہ کے سامنے تھا۔ سرحد کے اس پار وہ جائداد والا تھا، یہاں وہ کنگال شامل ہوگیا۔ وہاں دوسرے اس کے لئے محنت کرتے تھے اور یہاں ایک اسکول میں دوسروں کے لئے محنت کرکے تین جانوں کو پال رہا تھا۔ اسکے بڑھاپے کے لئے اسلم ایک مضبوط سہارے کی لاٹھی تھا، یہاں آ کر جھکتی ہوئی کمر لاٹھی کے سہارے سے محروم ہوگئی تھی۔ وہاں اسکی برادری تھی لیکن یہاں آ کر آہستہ آہستہ برادری چھٹ گئی اور اکرم کا گھر اکیلا رہ گیا۔ اس نے کبھی رنج نہیں کیا، کبھی ٹھنڈی سانس نہیں بھری——— کیوں کہ وہ سب کچھ دے کر اپنی آن بچا لایا تھا، وہ خود اور اسکے دین اور نام لیواؤں کی قوم کی ایک امانت کو صحیح سلامت لے آیا تھا!

لیکن سعادت نیفری کی عمر کی نذر ہوگئی تھی! نیفری— کہ یہ گھر ایک بوڑھے مہاجر کا گھر ہے جسکی کوئی برادری نہیں ہے، اسے بڑھاپے کی طاقت نہیں ہے، سعادت کا کوئی نوجوان بھائی نہیں۔

ں گھر سے نکلی ہوگی نیفری پوچھیں گے ... بڑھا
ستہ بتا دیا جاتے کے لئے چپت ہوگی ایک آئیے کے
اس پہ ... نگ ہو جاتی!

نیفری کی خوشی کا یہ عالم تھا ... کے سارے سینے میں جا
یہ لوگ عورتوں کو تکتے، کبھی سیٹی بجا دی، کبھی فقرہ کس دیا، کبھی کوئی
اپنے سامنے کبھی ہیر پھیر کرتے میں کسی لڑکی کے پیچھے لے لی کبھی بال
نگا چھا دیا، کبھی زنانہ دریچے میں کاغذ کی گولیاں بنا بنا کے پھینکتے،
، ما رودشا ہے سچائی تو آوارہ لڑکیوں سے چھیڑ خانی ضرور ہوتی۔
ستا گئے ہیں چند لڑکیاں اسٹی جا رہی تھیں تو نیفری اور اسکی پارٹی نے
یا اور لڑکیوں سے خوب خوب چھیڑ کی۔ ان کو دعوت دی گئی کہ آئیے ہم
، کریم کی دعوت دیتے ہیں، اچھا آج نہیں تو پھر کب ملے گا۔
اور یہ ساری جسارت فن اب سعادت پر آزمائی جا رہی تھی! خطوں
کے پرکے پھینکے جاتے، مکان کے سامنے وہ گزرتی رہتی، وہ نکلتی تو
نی سے تعاقب کیا جاتا۔ اسکول سے چھٹی ہوتی تو نیفری چھیڑ چھاڑ
بٹ پر موجود رہتا! غرض سعادت کے لئے نیفری ایک گرداب بلا

لگر سعادت ایک شریف باپ کی بیٹی، ایک بیوہ مرحوم بھائی کی
سادہ لڑکی بیٹی تھی۔ وہ قطرۂ عصمت تاب تھی۔ وہ گندگی کے ان پہلو
ں اور اس نے دل کے دروازے کبھی کسی ناپاک نگاہ کے لیے نہیں
تھے۔ نیفری اس پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس نے دوستوں سے
وہ بنایا کہ سعادت کے ساتھ کچھ زبردستی ہی کرنی پڑے گی۔ ورنہ
ار کو ٹھری تک کبھی نہ آسکے گی۔

وہ ایک بجے کو اپنا منصوبہ لے ہوئے اٹھا، دو تین ساتھیوں کو ساتھ لیا
نظام قائم کر کے گھات لگا کے بیٹھ رہا! کوئی آٹھ بجے کا وقت ہوگا
تھا۔ کچھ دکانیں کھل چکی تھیں، کچھ ابھی بند پڑی تھیں۔ گلی والے
فلمی کلام کی آوازیں لگاتے تھے پھیری لگا کر سبزی ترکاری بیچنے
ی کی ... مشغول کرتے تھے ــــــــ کہ سعادت...
ں میں سے نکل کر گھر سے نکلی!

معمول کے مطابق وہ جا رہی تھی! وہ ضروریات سے فارغ ہو کر
نہائی دھوئی، دھلے ہوئے کپڑے پہنے، نماز ادا کی، قرآن پڑھا، باسی روٹی
چائے کے ساتھ کھائی اور کتابیں ہاتھ میں لے، بر قعہ اوڑھ کر مدرسے روانہ
ہو گئی!

رات کو اس نے حساب کے سوال بڑی دیر تک حل کئے، انگریزی
ترجمہ کی مشق کی، اور فقرے یاد کرتے کرتے سو گئی۔ صبح اٹھی تو رات کے یاد کئے
ہوئے فقرے ذہن میں ابھر رہے تھے، وہ اپنے حافظے کا جائزہ لیتی ہوئی چلی
جا رہی تھی۔ اسکی جیب میں کشیدہ کا نمونہ بھی تھا جو اس نے خاص محنت سے
تیار کیا تھا اور آج اسے بھروسہ تھا کہ کشیدہ کے میدان میں اپنی واحد حریف
کمال بانو کو وہ آج پچھاڑ دے گی۔ بوٹی بڑی نکھر کر آئی تھی اور کوئی ٹانکا ایسا نہ تھا
جو اپنی جگہ پر ٹھیک بیٹھ نہ گیا ہو! رنگ کا انتخاب بجائے خود بہترین تھا۔
وہ اپنے خیالوں میں جا رہی تھی! ــــــــ سامنے بائیں طرف
سے بازار میں ایک گلی آ کر ملتی تھی اور یہ گلی سیدھی نیفری کے گھر کو جاتی تھی۔
اسکے موڑ پر ایک کھمبا تھا کھمبے سے . . . . کوئی سات گز آگے میونسپلٹی کا
نل کا تھا۔ نلکے پر ایک بہشتی مشک بھر رہا تھا۔ دائیں طرف ایک بھنگی بدر
رو میں سے کوڑا نکال نکال کر ایک جگہ ڈال رہا تھا۔ تاکہ پانی کا بہاؤ ٹھیک
رہے! ایک کتیا اس کوڑے کو سونگھ سونگھ کر اپنے لئے رزق تلاش کر رہی تھی!
کھمبے کے ساتھ ہی چوہدری حسان جوتیوں اور کھال چمڑے کی دکان
کھول کر فرش درست کر رہا تھا۔ اس کے ذرے دودھ چائے کی دکان
پر لوگ ناشتہ کر رہے تھے۔ سامنے میاں سراج الدین کی دکان کھل چکی
تھی۔ ذرا ہٹ کر شیخ اسماعیل اور شیخ محمد آصف کی کتابوں کی دکانیں کھل
چکی تھیں۔ یہ سب کچھ معمول کے مطابق تھا!
سعادت اپنے خیالوں میں گم قدم بڑھاتی جا رہی تھی۔ وہ کھمبے
کے پاس پہنچی ہی تھی کہ گلی سے نیفری نکلا اور جیسے منہ بھیڑ ہو گئی۔ نیفری نے
... کر دیا۔

مکرمہ تشریف لے چلتے ہو جی! ــــــــ جہاں غضب
دی ہے سرکار! ــــــــ پر اک گلی سے تو سن جاؤ!
اس گندے معاشرے میں ایک نوجوان اور ایک شریف لڑکی
کی بساط ہی کیا! اسکی آبرو کا پیمانہ کی ایک چوڑی ہوتی ہے۔ سادہ سی چوڑی

نازک ہوتی ہے کہ لفظوں کی چوٹ سے ٹوٹ جاتی ہے۔ یہ ٹوٹ جاتی ہے تو پھر جڑتی نہیں۔ جوڑنے کی کوشش کیجئے تو پھر اور ٹوٹتی ہے !

یہ چوڑی تو جب ہی سلامت رہ سکتی ہے کہ پورا ماحول اس کا رکھوالا ہو ——— اور ماحول اگر زندہ ہوتا تو نیفری کی جرأت پر کپکپا اٹھتا وہ مٹھیاں بھینچ کے اٹھ کھڑا ہوتا، وہ نیفری پر ٹوٹ پڑتا، اسکی آنکھیں نکال لیتا، اس کی زبان گدی سے کھینچ لیتا، اسکے ہاتھ توڑ ڈالتا، اسکے پاؤں... کاٹ دیتا،

مگر ماحول الٹا دبک گیا تھا، اس نے جیسے سانس روک لی ہو، اس نے جیسے آنکھیں بند کر لی ہوں، اس نے جیسے کان لپیٹ لئے ہوں! نہیں نہیں ! ماحول پھٹے دیدوں دیکھ رہا تھا ! کھلے کانوں سے سن رہا تھا ! وہ بالکل سن تھا، اس پر فالج گر گیا تھا ! سقہ مشک کا منہ کلے سے باندھے کھڑا تھا ——— بھنگی نے کوڑا ڈالتے ڈالتے ادھر پلٹ کر دیکھ لیا اور پھر کام میں لگ گیا ——— کتیا بدستور کوڑا سونگھ رہی تھی ——— چوہدری اب گدی پر بیٹھ گیا تھا۔ میاں سراج الدین اپنی دکان کے چبوترے پر تنا کھڑا تھا ——— شیخ امام علی اور شیخ محمد آصف نے کچھ سنا ہی نہیں!

——— اور کھمبا بھی جہاں کا تہاں کھڑا تھا !

ان میں سے کوئی نہیں بولا !

سعادت کی نگاہوں میں اسلم کا سراپا پھر گیا، اس نے محسوس کیا کہ جیسے وہ ایک سکھ کی زد پر آگئی ہے، اور کرپان سے اس نے حملہ کر دیا ہے، اور اب اسلم کا یک کہیں سے آکودے گا اور اس مسلمان سکھ سے گتھ جائے گا اور پھر چلا کر کہے گا "سعادت بھاگ جا، جلدی بھاگ ! میں اس سکھ کے لیئے کافی ہوں !" مگر اسلم ایک ہی تھا جو ایک بار کام آچکا تھا، اب وہ کہاں !

ماحول نے مدافعت کی ساری ذمہ داری سعادت کے اپنے... کندھوں پر ڈال دی تھی ! وہ کمزور تھی مگر مظلومیت کی حس نے اس میں ایک جسارت پیدا کر دی تھی، اس کا خون کھول گیا، اسکے ذہن کی چولیں ہل گئیں، اسکے ہونٹ کپکپا گئے ——— پورا ماحول اسے کہہ رہا تھا کہ "دیکھو سعادت ! بولنا نہیں"! اور کھمبا بھی چیخ رہا تھا کہ "پیاری سعادت ! زبان بتیس دانتوں میں دبا کے رکھ ! شریف بیٹیوں کی زبان بولنے کیلئے نہیں ہوتی ——— مگر سعادت کے کانوں میں ایسی صدائیں صدائیں ہو رہی تھی کہ وہ کچھ نہ سن سکی : اور بے اختیار اسکی زبان سے نکل گیا :-

" جا، گندے ! اپنی ماں اور بہن کو گالی سنا ! کمینے بدمعاش "

یہ آخری ضرب تھی جو کوئی سعادت لگا سکتی تھی اور یہ وہ گہرا گھاؤ تھا جو ایک شریف لڑکی کسی آدمی کے کلیجے کو دے سکتی تھی۔ مگر کا بچہ جب بھیڑیا بن جائے تو ——— !

پاس کے کھمبے نے سعادت کے اس احتجاجی حملہ پر ایک جھرجھری لی" !

اور بھیڑیا جھپٹ پڑا، گالیاں بکتے ہوئے اس نے سعادت کا نوچ کر پرے پھینک دیا ——— اور ایک معصوم چہرہ، شرم اور ندامت نفرت کی سرخی میں رنگا ہوا ماحول سے فریاد کرتا رہ گیا : سعادت نے ... کیا جیسے اسکے کپڑے سر بازار اتار لئے گئے ہیں، جیسے اس کی امی کا جوتا ... گیا ہے، جیسے اسکی باپ کی داڑھی نوچ ڈالی گئی ہے ! ——— زمین و آسمان اسکے سامنے گھوم رہے تھے، اسکی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھی، وہ سنبھل نہ پائی تھی کہ ایک گھونسہ اسکی گردن پر پڑا اور وہ بھنا گئی !

کھمبے نے کپکپا کر کہا "دیکھا سعادت ! میں نہ کہتا تھا کہ نہ بولیو" !

سعادت بھی اب تو پورا ماحول نیفری پر ٹوٹ پڑے گا، اب کوئی بھی اپنی جگہ پر ٹکا نہیں رہ سکتا ! ——— لیکن سقہ اطمینان اپنی آدھی بھری مشک کے پاس کھڑا یہ رومانس دیکھ رہا تھا۔ بھنگی کونے کا ڈھیر لگائے اور بیلچے کے بانس سے ٹیک لگائے ٹک ٹک تماشہ کر رہا تھا۔ ایک بڈی چوڑی ہوئی گھور رہی تھی ——— چوہدری احسان بھی گدی پر بیٹھا اندر زہر رہا تھا ! میاں سراج الدین بھی دکان کے کنارے پر عجبتہ کی طرح کھڑا تھا، شیخ امام علی اور شیخ محمد آصف بھی دور ہی دور سے جھانک رہے تھے ! ——— اور چائے کی دکان پر لوگ مزے سے چائے پی رہے تھے !

مانا کہ یہ لوگ بڑے شریف لوگ تھے ——— چوہدری کا یتیم خانے میں ہر ماہ باقاعدگی سے چندہ دیتا ہے، میاں سراج الدین ہر سال مسجد کی سفیدی اپنی گرہ سے کراتا ہے، شیخ محمد آصف اسلامی لٹریچر کی علمی خدمت کر رہا ہے اور شیخ امام علی نے پوری عمر قرآن کی خدمت میں گزار دی ہے، مگر وہ تو یہاں دکانداری کرنے آئے تھے

ی

ٹانگ اڑانے کے لیے نہیں!

اور سعادت نے بے بس ہو کر اپنی کتابیں نفیری کے منہ پر کھینچ ماریں
نت اس نے سماج کے منہ پر ضرب لگائی تھی ۔ اور وہ اگر ایسا نہ کرتی
کا بدن پھٹ کر ہوا میں تحلیل ہو جاتا۔

نفیری پوری طرح مشتعل ہو گیا تھا، اس نے سعادت کو اٹھا کر ایک
پھیلے ہوئے تختے کے اوپر پٹخ دیا اور لٹا کر اسکے سینے، اسکی گردن اور
دں میں پورے زور سے گھونسے مارے! آخر جوان خون تھا، غیرت
یہ تھا، خاندانی عزت کا خیال تھا، شجاعت کے ارمان تھے، اس کے
کیا کرتا!

وہ سعادت کو بے حال کر کے ہٹا تو سعادت پھر اٹھی اور اسکے پیچھے بھاگی
پنا یومیٹری بکس اٹھا کر پیچھے سے مارا، نفیری پھر پلٹا اور سعادت کے
سے تھپڑ مارے وہ پھر چلائی تو سعادت پھر لپکی، مگر لڑکھڑا کر گری اور بے
لی!

یہ حادثہ ایک لڑکی کے ساتھ پیش نہیں آیا تھا، یہ واردات ایک سعادت
نہیں ہوئی تھی، درحقیقت آج بھرے بازار میں انسانیت کے لتے
تھے، شرافت کا گریبان پھاڑ گیا تھا، عصمت سے کھیلا گیا تھا، نعرہ
تحہ غنڈہ گردی کی گئی تھی، آج اسلام زندہ باد کا منہ نوچا گیا تھا، ...
پرچم کے چاند تارے کو مجروح کیا گیا تھا، قائد اعظم کا مقبرہ اکھیڑ ڈالا گیا تھا
بہرحال میدان نفیری کے ہاتھ رہا!

اب میاں سراج کے مجسمے میں حرکت آگئی تھی ملک چوہدری حیات
جنبش کرنے لگا تھا، باب شیخ امام علی اور شیخ محمد آصف نام کی چیزیں
تی تھیں، اب کئی کھمبے سانس لینے لگے تھے ۔ سعادت کو اٹھا کر دکان کے
یا اور پانی لاکر اسکے منہ سے لگایا گیا۔

سعادت کو اکرم اور اسکی امی سہارا دے کر گھر لائے ۔ وہ ہوش میں آچکی
نہ دیر تک نیم بے ہوشی کی حالت میں رہی ۔ اسی نیم بے ہوشی میں
خواب کا سا سماں دیکھا کہ شہر کے شرفا جائے وقوعہ پر جمع ہو گئے ہیں
ستان بھر کے تھانوں سے گروہ در گروہ منڈی چلی آرہی ہے، وزیر اعظم پنجاب
آگئے ہیں، انتخابات کے لیڈر موجود ہیں، دین کے علما چلے آرہے ہیں
ے گورنر جنرل اپنے بگھی میں سوار ہو کر روانہ ہو گئے ہیں اور ایک تماشا مچ

گیا ہے! اس نے خواب میں دیکھا کہ نفیری ہتھکڑیوں میں جکڑا ہوا لایا گیا ہے،
بازار کے عین بیچ میں عدالت لگ گئی ہے اور قائد اعظم خود مقدمہ سن رہے ہیں۔ وہ
روتے ہوئے بیان دے رہی ہے، اسکے منہ سے بات نہیں نکل رہی، اور ...
قائد اعظم اٹھ اٹھ کر اسے چپکا رہے ہیں، وزیر اعظم پنجاب اسکے سر پر ہاتھ پھیر رہے ہیں
اور پھر اس نے دیکھا کہ مقدمے کی کارروائی آناً فاناً مکمل ہو گئی ہے اور جج اٹھ کر
فیصلہ سناتا ہے۔

اور پھر اسکے سامنے ٹکٹکی لگائی جاتی ہے اور پاکستان کے گورنر جنرل خود
اپنے ہاتھ میں ایک تازیانہ لے کر نفیری کے پیٹھ پر ضرب لگا رہے ہیں ———
ایک ——— دو ——— تین ——— دس گیارہ، بیس ——— اور پھر وہ گن
نہیں سکی۔ گورنر جنرل کا ہاتھ تھک جاتا ہے تو پھر کوڑا وزیر اعظم پنجاب کے ہاتھ میں
نظر آتا ہے ——— پہلے نفیری کی آواز مدھم ہو جاتی ہے، پھر وہ بالکل چپ
ہو جاتا ہے، صرف ہاتھ پاؤں جنبش کرتے رہتے ہیں، پھر یہ جنبش بھی ختم ہو جاتی
ہے، اور نفیری دم توڑ دیتا ہے!

پھر نفیری کو ٹکٹکی پر سے کھولا جاتا ہے اور اسکی لاش ایک گاڑی پر ڈال کر
شہر بھر میں گھمائی جاتی ہے ۔ آگے آگے منادی لاؤڈ اسپیکر سے اعلان کرتا ہے کہ
یہ پاکستان ہے! یہ اسلامی ریاست ہے اس میں غنڈہ گردی کرنے والوں کے
لئے کوئی جگہ نہیں، غنڈوں کا حشر یہاں یہی ہوگا جو نفیری کا ہوا ہے" اور پیچھے ..
پیچھے گاڑی ہے اور اسکے جلوس میں ایک بے پناہ ہجوم صاد کر رہا ہے۔

مگر خواب ہی خواب میں سعادت نے دیکھا کہ منادی کی آواز رک گئی ہے،
سامنے کے سارا ہجوم زندہ انسانوں کے بجائے کٹھ پتلیوں اور سل پتھروں میں
بدل گیا ہے، اور تنہا ایک سعادت اپنی حالت میں برقرار رہ گئی ہے: وہ ...
مبہوت ہو جاتی ہے، اور اچانک دیکھتی ہے، کہ نفیری کی لاش آنکھیں پھاڑے
اور دندیاں نکالے اٹھ کھڑا ہوا ہے اور اسکی طرف لپکا چلا آرہا ہے ۔ وہ چیخنا
چاہتی ہے تو آواز نہیں نکلتی، بھاگنا چاہتی ہے تو قدم حرکت نہیں کرتے ———
اور اس نے آنکھیں کھول دیں ——— "ابا! ابا!

اسکی امی دوڑی دوڑی آئیں ۔ "میری بچی! کیا ہے"

"ابا کہاں ہیں"

"وہ تو باہر بیٹھک میں ہیں!"

"باہر کیوں بیٹھے ہیں، ان کو باہر نہ جانے دو" ———

—— باہر غنڈے ہیں!"

"نہیں! محلے کے لوگ باہر کھڑے ہیں!"

"امی! کیا اس محلے کے لوگوں میں کوئی زندہ ہے بھی!"

"سعادت! یہ کیسی باتیں کر رہی ہو، ابھی تمہاری طبیعت سنبھلی نہیں

شاید!"

"میں پوچھتی ہوں، باہر کون لوگ ہیں؟"

"بڑے بڑے چوہدری اور شیخ اور میاں آ رہے ہیں بچی!"

"غنڈے —— بزدل غنڈے!"

جس معاملے میں انسانیت انصاف نہ کر سکی، وہ اب قانون کے سامنے پیش کر دیا گیا!

اکرم، اسکی بیوی اور سعادت تھانے کو چلے —— جیسے آج وہ ایک مرتبہ پھر جالندھر کی ایک بستی سے کیمپ کی طرف جا رہے تھے! جیسے وہ ہندوستان سے پاکستان کی طرف مارچ کر رہے تھے!

سعادت اور اسکی امی گیٹ کے باہر ایک درخت کیساتھ لگ کر کھڑی ہو گئیں، اور اکرم کچھ جھجکتا ہوا اور فرطِ جذبات سے نڈھال اندر داخل ہوا اور برآمدے میں بیٹھے ہوئے منشی کو سلام کر کے کھڑا ہو گیا۔ وہ اس انتظار میں تھا کہ منشی اب اس سے پوچھے گا کہ تم کون ہو، تم کیسے آئے ہو؟ مگر وہ کھڑا رہا کھڑا رہا، اور کھڑے کھڑے تھک گیا، لیکن اس سے منشی نے کچھ نہ پوچھا! آخر اس نے ہی کڑا کر کے خود ہی عرض کی کہ "جناب مجھے رپٹ لکھانی ہے... میری لڑکی" "بابا شہر، یہاں کوئی تمہارے باپ کے نوکر نہیں بیٹھے ہیں کہ جن کی تنخواہ ملتی ہو، چل راستہ ناپ!" اور بابا مرجھا کر رہ گیا —— آہ!

نیفری ہر جگہ موجود تھا! لیکن اکرم اصل بات کو سمجھ گیا، اُس نے پانچ روپے کا نوٹ گرہ سے نکالا اور آگے بڑھ کر منشی جی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اب منشی ہمہ تن توجہ تھا۔ اس نے چوکیدار کو پکارا کہ بڑے میاں کے لئے جلد کرسی لاؤ۔ اب اکرم نے اپنے اندر پوری جرأت محسوس کی اور اپنا دکھڑا سنا دیا، منشی اسے اندر سب انسپکٹر صاحب کے سامنے لے گیا۔ یہ سب انسپکٹر بھی اگرچہ سب انسپکٹر ہی تھا، لیکن جب اس نے پوری داستان سنی تو اسکے ضمیر کے اندر جیسے شریفانہ جذبے کے ساتھ تحقیقات کا ارادہ کیا۔ سعادت کو بھی بلایا گیا اور اس کا بیان لیا گیا، پھر اسکی امی کا، اور پھر اکرم کو گواہ لانے کیلئے بھیجا گیا۔

سعادت نے جن جن دکانداروں کے پتے دیے تھے، اکرم تک پہنچا۔ مگر ان میں سے بعض تو وہ تھے جو نیفری کے برادری کے لوگ۔ اور بعض وہ جو ازلی ڈرپوک تھے۔ ان میں سے ایک ایک نے قسمیں کھائیں تو توبہ کے بعد دکان پر پہنچا تھا —— وہ تو سارا دن آیا نہیں تھا۔ وہ تو کچھ نہیں جانتا ہے۔ اور ایک آدھ نے تو صاف صاف کہ میاں صاحب ہم جانتے تو ہیں مگر گواہی نہیں دیں گے!

اکرم بہت افسردہ خاطر ہو کر لوٹا —— بازار میں گذرتے ہوئے محسوس ہوا کہ کچھ ہاتھ اور کچھ آنکھیں اس کی طرف برابر اشارے کرتے ہیں۔ ان اشاروں، اور سرگوشیوں کے کانٹوں میں وہ آنکھیں جھکائے گذر رہا تھا: چلتے چلتے ایک آواز اسکے کانوں میں پڑی "لڑکی کا بھی کوئی قصور تو ہوگا ہی، تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجا کرتی"

"گویا سیسے کی گرم سلاخ تھی جو اکرم کے کانوں میں گھس گئی اور تیزی سے گھر کی طرف لپکنے لگا۔ پھر ایک چائے خانے سے اسے آواز سنائی دی"

"پہلے یاری لگاتی ہیں، اور پھر کتابیں منہ پر مارتی ہیں" جیسے پیچھے سے کسی نے لٹھ کھینچ مارا ہو، جیسے نیفری نے اکرم گردن پر گھونسہ مار دیا ہو، وہ بیچارا اور تیزی سے آگے نکل گیا! دل دل میں افسوس کر رہا تھا کہ نیفری کے فقرے پر اگر سعادت چپ رہ جاتی سب ہوا ہوتا! اکرم کے دل کی بات جیسے بے تار برقی کے ذریعہ جا دوتوعہ پر کھڑے کھیمے نے سن لی، اور اس نے کہا "میاں صاحب بھی سعادت کو یہی مشورہ دیا تھا کہ وہ چپ رہے، مگر وہ نہ مانی ۔— بہتر یہ ہے کہ آپ بھی چپ رہئے!" لیکن اکرم یہ نہ سن سکا!

سعادت کو اس کی امی نے بتایا کہ [illegible] دینے کو تیار نہ سعادت یہ سن کر سکتے میں آ گئی۔ اور [illegible] ہوا غلط [illegible]

ساتھ ہی ساتھ اسے ایک اور خیال آیا، اور اسکے ذہن پر چھا گیا۔ اور وہ
ل میں امی سے کہنے لگی، امی گواہیاں دینے والوں کی کمی نہیں، دنیا کی
نت گواہی دیگی، نہ دے گی تو پھٹ پڑیگی: بدر رو کا بہتا ہوا گندہ پانی
گا، نہ بولے گا تو اپنی جگہ پر پیچ ہو کر رہ جائیگا، اس کا بہاؤ رک جائیگا
بیلے گا! امی تم نہیں جانتیں، شیخ امام علی کی دکان میں جو قرآن شریف
رے ہیں وہ اٹھ اٹھ کر گواہی دیں گے اور نہ دیں گے تو ان کے صفحوں پر
کلام اڑ جائے گا اور وہ کپڑے کے کورے رہ جائیں گے! امی شیخ
شائع کردہ اسلامی لٹریچر چیخ چیخ کر میری مظلومی کا بیان دے گا! ہا
انو پاس کی مسجدیوں اٹھے گی، اسکی چٹائیاں بولیں گی، اس کے
گے اس کا منبر بولے گا، نہیں تو پھر اسکے مینار گر جائیں گے،
جائیگی ——— ! امی وہاں ایک کھمبا میرے پاس کھڑا...
نے کو غور سے دیکھتا رہا ہے کیا وہ بھی اتنا بے غیرت ہوگا کہ چپ رہ سکے؟
لم کی مخالفت میں اس کا ذرہ ذرہ نہ چلا اٹھے؟ زمین و آسمان گواہ
ار گواہ ہے، دکان کا وہ تختہ گواہ ہے کہ جس پر مجھے لٹایا گیا تھا!
آدمی زبان اور ہونٹ پاکر اگر اتنا طوطا چشم ہو گیا ہے، اگر وہ اتنا۔
، اگر اس کا خون اتنا سفید ہو گیا ہے کہ جس زبان اور جن ہونٹوں کو
زلتر استعمال کرتا رہتا ہے۔، ان کو ٹھیک وہیں استعمال کرنے
ہے جہاں استعمال کرنا چاہئے تو ایسے گونگے آدمی سے گواہی کی بھیک
رورت نہیں ہے ——— آدمی نہ بولیگا تو وہ پوری فضا
بان اور ہونٹ نہیں رکھتی مگر چیخ چیخ سب کچھ کہہ دیتی ہے۔
ئی گواہ پیدا ہو گئے تھے۔ خود بخود چند آدمیوں نے رضاکارانہ طور پر
جاکر اپنے بیانات قلمبند کرا دیئے تھے۔
رم، اسکی بیوی اور اس کی بیٹی نے سمجھا کہ خیر! ابھی ماحول

یزی گرفتار ہو چکا تھا، تھانے میں آج اس کی پہلی رات تھی۔
اسکے سفارشی یکے بعد دیگرے تھانے پہنچ رہے تھے مد دیہی
نے دوڑ رہا تھا، برادری تگ و دو کر رہی تھی۔ مگر سب انسپکٹر کے
ے جذبات جاگ اٹھے تھے کہ اس نے ہر ایک کو صاف صاف

رات کے دس بجے ہوں گے کہ سب انسپکٹر کے نام ایک بڑے افسر کا
فون آیا کہ نیفری ہمارا آدمی ہے، اسے چھوڑ دیا جائے۔ مگر سب انسپکٹر نے اپنے
آپ کو قانون سے مجبور بتایا۔ بارہ بجے پھر کال ہوئی۔ یہ ڈی، سی، کے دفتر کا
فون تھا۔ نیفری کو رہا کر دو۔ سب انسپکٹر نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔ جب اصرار
کیا گیا تو اس نے کہا کہ اچھا ملزم کو آپ کی تحویل میں بھیجتا ہوں، آپ خود جو چاہیں
کریں۔ اور ملزم راتوں رات منتقل کر دیا گیا۔ ڈی، سی، کے دفتر میں اس کی
پیشی ہوئی اور راتوں رات رہا ہو کر گھر آ گیا۔

میاں اکرم صبح دودھ لینے نکلا تو دیکھا کہ نیفری سامنے سے چلا
جا رہا ہے! ——— بے بسی!

وہ تھانے پہنچے تو سب انسپکٹر نے ان کو سارا ماجرا سنایا۔ اس نے
پولیس کی بے بسی کا سارا حال کھول کر سامنے رکھ دیا کہ ہمارے اوپر کتنے ہی
نیفری اور نیفریوں کے سرپرست بیٹھے ہیں جو ہمارے ہاتھ باندھ دیتے ہیں۔

پھر سب انسپکٹر نے ان کو یہ بھی بتایا کہ مقدمہ کو بگاڑنے کے لئے
نیفری کے حمایتی گواہ بن بن کر آ رہے ہیں، اور اپنے اپنے بیان درج کرا رہے ہیں،
ان لوگوں نے واقعہ کی شکل یوں بنائی ہے کہ لڑکی کے رشتہ نیفری کے پہلے
سے کچھ تعلقات تھے، وہ اس کے گھر آتی جاتی تھی، اب وہ چونکہ اسکے رشتہ اغوا
ہو جانے کے لئے تقاضا کر رہی تھی اور وہ نہیں مان رہا تھا، اس لئے لڑکی
نے گالی دی اور سر بازار اس پر چیپ پڑی۔

سب انسپکٹر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اس نے کہا آپ میرے
باپ کی جگہ ہیں، اور سعادت کو میں اسی نگاہ سے دیکھتا ہوں جس سے اپنی بہن
فیروزہ کو دیکھتا ہوں، مگر اپنی ساری ہمدردی کے باوجود میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ
چپ ہو جائیں، اور صبر کر کے بیٹھ رہیں۔ جتنا آگے چلیں گے، اتنا ہی
کیچڑ میں دھنستے چلے جائیں گے اور نکلنے کی سبیل کوئی بھی نہ رہے گی

"اور اکرم نے معاملہ ختم کر دیا"

گھر آ کر اکرم نے بجھے ہوئے چہرے سے کہا "جتنا پیر سائیں کا دیا ہے میاں اس
سے دستبرداری کرلی ہے تو سعادت یہ کہے بغیر نہ رہ سکی "ابا کیا کر دیا آپ نے" اکرم نے پیار
سے سمجھایا کہ بیٹی پوچھنا جانتا نہیں، اس طرح ہم اور خراب ہو جائیں گے مگر جو کچھ ہو
چکا ہے ہم چپ ہو رہیں گے نا؟" ——— یہ کہہ کر اکرم گر پڑا اور
اس کا دل آخری بار دھڑک کر ہمیشہ کے لئے رک گیا [illegible]

مسعود یعقوب طاہر

تم تو کہتے تھے؟

تم تو کہتے تھے خزاں دیدہ گلستانوں میں نئی صبح سے بہاروں کے جلوس آئیں گے
وطن پاک مساوات کا مسکن ہوگا، شب ظلمت میں ستاروں کے جلوس آئیں گے

•

تم تو کہتے تھے حق آئے گا نئی شان سے پھر اور باطل کی جو ظلمت ہے وہ چھٹ جائیگی
بھوک اور ننگ کے یہ دن نہ پھر آئیں گے کبھی، اور زنجیر غلامی کی یہ کٹ جائیگی

•

تم نے گیت ایسے سنائے تھے کچھ آزادی کے، جھوم کر قوم نے گھر بار کیا تم پہ نثار
اے ستم پیشہ تیرے نعروں پہ ماؤں نے میری، لاکھوں بچے کئے قربان کہ آئے گی بہار

•

یہ مگر کیا کہ بہار آئی وہ یوں لوٹی گئی، سینہ زوری سے کوئی لوٹ لے جس طرح پتنگ
اور آزادی کی دولت کا جو مینہ برساتھا، کاٹ کر لے گئے یوں اس کو کہ ہر جیب ہے دنگ

•

حق کی مظلومی و محکومی و ذلت ہے وہی، اور باطل کی وہی شان ہے شوکت ہے وہی
شیطنت کا ہے وہی راج وہی رشوت کا فروغ، اور انسان کی انسان پہ حکومت ہے وہی

وہی تعلیم فرنگی ہے جہالت ہے وہی وطن پاک میں ناپاک سیاست ہے وہی
بے ضمیری ہے وہی صحافت ہے وہی بے حیائی وہی عصمت کی تجارت ہے وہی

•

صبح آئی مگر اندھیر کا عالم نہ گیا۔ شادیانے بجے ملت کا مگر غم نہ گیا!!
وہاں اغیار نے مارا تھا یہاں اپنوں نے، آہ اس قوم کی قسمت سے یہ ماتم نہ گیا

•

حق نظربند ہے انصاف پہ تعزیریں ہیں، ظلم و باطل پھریں آزاد خدا خیر کرے
قوم کی قوم یہ مغضوب ہوئی جاتی ہے اور تو پھرتا ہے دلشاد خدا خیر کرے

•

مسجد و مدرسے ویران ہوں کچھ بھی نہ ملے اور لاکھوں ہوں سامان سینما کے لئے
میرے بچوں کو تو حاصل نہ ہو دو گز بھی زمین اور سمٹ آئے زمانہ تیری مد آ کے لئے

•

خون مزدور سے زردار کے زر کو ہو فروغ اور دہقان کی محنت سے زمیندار بنیں
قوم کی قوم سسکتی پھرے پوچھے نہ کوئی، آپ آرام سے بیٹھے ہوئے سرکار بنیں

•

نونہال اپنے ہوں برباد میں کچھ بھی نہ کہوں قتل کر دیں انھیں جلاد میں کچھ بھی نہ کہوں
عصمتیں ہاں میری بہنوں کی ہوں تاراج یہاں اور ڈاکو پھریں آزاد میں کچھ بھی نہ کہوں

•

مجھ ان سا ان کا تعاقب ہے کرنا ہے یہاں بندگانِ ہوس و فسق و ضلالت کے خلاف
لیکن ان سب کی زباں پہ یہ اسلام کی بات اور قرآن نبی اپنی بغاوت کے خلاف

ایم۔ جے میکلوڈ
ترجمہ: احمد مجتبیٰ ایم اے

ناکردہ گناہ کی سزا

(یہ میکلوڈ کی ایک شاہکار کہانی کا بالکل آزاد ترجمہ ہے۔ اس کہانی کے آئینہ میں پاکستان کے "مغربی ملاؤں" کے "امریکی اماموں" کے انصاف اور رواداری کی شکل دیکھی جا سکتی ہے)

پچھلے دنوں کا واقعہ ہے کہ سارجنٹ میکلوڈ اپنے بنگلے سے نکل کر دفتر میں آ رہا تھا۔ کہ میل پالٹ نامی کا ملی پولیس اسٹیشن میں داخل ہوئی سارجنٹ اس کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ وہ دو سال پیشتر نئے روئی کے کارخانے میں کام کرنے آئی تھی۔ پھر کارخانہ بند بھی ہوا لیکن وہ دوبارہ دیہات نہ گئی اور قصبے کے ایک معقول گھرانے میں ملازمہ کی حیثیت سے کام کرنے لگی۔ سارجنٹ نے پوچھا

"خیریت تو ہے مس پالٹ، یہ پریشانی کیسی؟"

"سرکار ایک رپٹ لکھانی ہے کاغذ عنایت ہو!"

"کاغذ؟ کیوں؟ —— جرم کی نوعیت کیا ہے؟"

"عصمت دری!" نیلی آنکھوں والی نوعمر لڑکی نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آہستہ سے کہا اور کاغذ کا انتظار کرنے لگی۔

"نجاست گر تھا کون؟"

"ایک حبشی!" لڑکی نے کہا۔ "قصبے کے باہر بڑی سڑک کے کنارے درختوں کے جھرمٹ میں رہتا ہے۔"

سارجنٹ نے اس سے اور بھی باتیں کیں اور دیر تک سوال و جواب کرنے کے بعد شکایت لکھنے کے لئے کاغذ دے دیا۔ لڑکی کا خط بھی درست نہ تھا۔ اور پڑھی لکھی بھی زیادہ نہ تھی۔ وہ بار بار سر اٹھا کر الفاظ کے ہجے پوچھ لیتی۔ پھر لکھنے میں مصروف ہو جاتی۔ دیر کی کوشش اور محنت کے بعد رپورٹ تیار کر کے لڑکی نے سارجنٹ کے حوالے کر دی۔

"تم نے واقعہ کے وقت کیوں رپورٹ درج نہیں کرائی تھی؟ اتنے دنوں خاموش کیوں رہیں۔؟"

"مجھ سے کہا گیا تھا کہ کسی کو بتایا اور نوکری گئی۔ پھر آپ جانتے ہیں کہ یہاں حبشیوں کا زور ہے"

"اور اب؟"

پے در پے معقول سوالوں سے لڑکی کچھ گھبرا سی گئی دل کے چور نے آواز گھونٹ دی اسے ایسا معلوم ہوا گیا سارجنٹ کو کسی نے بتا دیا ہے کہ زانی حبشی نہیں بلکہ اس کا کوئی یار ہے بمشکل سے اپنے اوپر قابو پا کر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اب میں اس سے بڑی مصیبت میں مبتلا ہو گئی ہوں۔ اس بوجھ کو کیا کروں!"

دوسرے دن صبح سارجنٹ حبشی کو گرفتار کرنے پہنچ گیا شہر سے چار میل دور بڑی سڑک کے کنارے بکھری ہوئی جھونپڑیوں کی ایک مختصر بستی میں ایک طرف سیم کولمون کی جھونپڑی بھی تھی۔ بانس کے ٹٹے پر گارا تھوپ کر دیواریں بنائی گئی تھیں اور گھاس کی مدد سے چھپر کو دھوپ اور بارش سے بچانے کے قابل بنا لیا گیا تھا۔ جھونپڑوں کے درمیان اور قرب و جوار میں قریب کے کارخانوں کی نکالی ہوئی بیکار ٹین کی چادریں اور پرزوں کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔ گویا یہ حبشیوں کی بستی امریکیوں کا گھوارا تھا۔ آدھے درجن سیاہ فام برہنہ اور نیم برہنہ بچے جو دنیا اور دنیا داری سے بے خبر اپنے کھیلوں میں مصروف تھے۔ سارجنٹ اور ان کی پولیس کو دیکھ کر اپنے اپنے گھروں میں بھاگ کر چھپ رہے۔

سیم نے غالباً پولیس کی جیپ کو آتے دیکھ لیا تھا۔ اور ان کے استقبال کے لئے دروازے سے نکل کر باہر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ میاد "نہ"

، والا آدمی تھا جس کی پسلیاں دور سے گنی جا سکتی تھیں
ساتھ اس نے کہا۔
ف لائیے سرکار!"
دن تمہیں ہوا!" سارجنٹ نے متانت سے پوچھا
کار، میں ہی ہوں!" یہ کہتے کہتے اس کی باچھیں اور
اس کی بشاشت دیر تک قائم نہ رہ سکی۔
لو گرفتار کیا جا سکتا ہے!"
ہم سا گیا۔ "سرکار ہنسی کر رہے ہیں!"
ی! یہ دیکھو" سارجنٹ نے اور کوٹ کھسکا کر عہدے
دیا۔
رکار جرم؟"
ب بتا دوں گا، ذرا جیل پہنچنے دو!"
سپاہیوں نے اس کو لاری میں ٹھونس دیا اور وارنٹ افسوس
سے بھر غریب کہتا رہا کہ اس نے کبھی کوئی جرم کیا ہی
ٹ نے ہونٹوں کو چباتے ہوئے جھلا کر کہا۔
ر سفید فام عورتوں کی عصمت دری کرنا تم حبشیوں
ہے؟"
کیا رہے ہیں؟" معصومیت اور حیرت کے ملے جلے
نے ڈرتے ڈرتے کہا۔
بشی کی جسارت پر اپنے کو قابو میں نہ رکھ سکا اس نے

چپ بکواس بند کرو ورنہ تیری خیر نہیں!" سارجنٹ کی
کو خاموش کر دیا۔
ر سارجنٹ نے حبشی کو کاغذات دکھائے۔ جیسی کا بیان
وہ دریا پار اپنی ایک سہیلی کے پاس ملنے گئی تھی۔ اور
واپسی کے ارادہ سے گھاٹ پر آئی۔ گھاٹ پر اس کو
نے میں کافی دیر لگی اس عرصہ میں اس نے دریا کے
قدمی شروع کر دی۔ بیان کو جاری رکھتے ہوئے اس
پیچھے لگا رہا اور جب اس نے [illegible] ارادہ کیا تو

حبشی نے کچھ آہستہ سے کہا جس کا مطلب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے بعد حبشی نے غضب ناک ہو کر اس پر حملہ کیا اور وہ کچھ کر ڈالا جس کے نتیجے میں اس کو ماں بننے کی زحمت گوارا کرنی پڑی۔ جبشی کو وہ پہلے دیکھ چکی تھی اور اس کے مخصوص طرز کے بالوں سے اچھی طرح پہچانتی تھی۔

سیم نے بھینچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ بیان کا ایک ایک لفظ ٹٹول ٹٹول کر اور بیچ لگا لگا کر پڑھا اور پڑھ کر خاموش ہو گیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھتا رہا لیکن زبان سے کچھ نہیں کہا۔ وہ اس وقت ایک ایکٹر معلوم ہوتا تھا۔ جو مظلوم کا پارٹ بہترین طرز پر ادا کر رہا تھا۔ سارجنٹ کے نزدیک ہر حبشی ایکٹر ہوتا ہے۔

اس نے طنز سے کہا۔

"حضرت آپ تو کبھی تولا تشریف نہ لے گئے ہوں گے؟"

"نہیں سرکار، میں بس پارہ پارہ ماسیوں[1] کے ساتھ کام کرتا تھا۔"

مس صاحبہ ٹھیک کہتی ہیں!"

"تو تم جرم تسلیم کرتے ہو؟"

حبشی نے آنکھیں پھاڑ کر عجیب ملتجیانہ انداز سے سارجنٹ کی طرف دیکھا اور بس یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"سرکار میں نے اس لڑکی کو اپنی عمر میں کبھی نہیں دیکھا!"

مقدمے کی تیاری کے دوران میں سیم کو حبشیوں کے حوالات میں رکھا گیا۔ وہ اپنے ساتھ انجیل کا ایک چھوٹا نسخہ بھی لایا تھا۔ اور دن بھر حوالات کے ایک کونے میں بیٹھ کر بدبد پڑھا کرتا تھا۔ تھانے والے اس کی اس بھنبھناہٹ سے تنگ آ گئے تھے۔ بہتیرا چیخے چلائے کہ اپنی اس ریں ریں کو بند کرے۔ لیکن وہ اللہ کا بندہ کب ماننے والا تھا۔ اس کے نزدیک تھانے والوں کا عدم وجود سب برابر تھا۔ آخرکار جب ان کے ضبط سے باہر ہو گئی تو دو جوانوں کو بھیجا گیا کہ انجیل اس سے چھین لائیں۔ یوں اس کو تھانے والوں کے بچے پتھر بھی مارتے تو نہیں بولتا تھا۔ لیکن

---

[1] پارہ ماسی اس ڈلی کے مزدوروں کا مخصوص لقب ہے جو سڑکوں یا ریل کی پٹریوں کی مرمت کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ سال کے سال گھوما کرتی ہے۔

جب سپاہی انہیں اس سے چھڑا لے گئے تو اس نے کتاب مقدس کی حفاظت
میں اپنی ساری قوت صرف کر دی اور جب تک بس چلا اپنی قوت سے
حفاظت کرتا رہا۔ پھر جب اس کا بس نہ چلا تو انہیں کمزور بے بس ہو کر
بیٹھ رہا لیکن کتاب مقدس کا ورق پھٹا۔ پہلے دیکھ کر پڑھتا تھا۔
اب حافظے کی مدد سے ورد کرنا شروع کیا۔

تقریباً ایک ہفتہ میں مقدمہ تیار ہو گیا۔ حکومت کا پیروکار
میٹ ہیرس تھا۔ اور حبشی کی وکالت [illegible] نے اپنے ذمہ لی [illegible]
کے وکلاء نے مقدمے کی کارروائیاں پوری کر لی تھیں کہ شکاگو کی اشتراکی
جماعت کے چند افراد نے سیم کو ان کو تحریری اطلاع بھیجی کہ وہ اپنی طرف
سے بھی ایک وکیل اس کی پیروی کے لئے بھیج رہے ہیں۔ اس اطلاع نے
سفید فام باشندوں کو غصے سے پاگل بنا دیا ہے، کم بخت اشتراکی اپنے
کو خدائی فوجدار سمجھنے لگے ہر جگہ ٹانگ اڑاتے پھرتے ہیں۔ ان سے مطلب
ہو یا نہ ہو۔

سارجنٹ نے حبشی کے پاس تحریر لے جا کر کہا
"لے محو تماشے! ایک عمدہ وکیل تیری پیروی کے لئے آرہا ہے"
غریب حبشی کے لٹکے ہوئے ہونٹوں کو سارجنٹ اور اس کے قبیل
کے لوگوں نے محو تماشہ کہنا شروع کر دیا تھا۔

سیم نے تحریر پڑھی اور اپنے گھٹنوں پر جھک کر خشوع و خضوع
کے ساتھ کہنے لگا۔

"خدایا ساری زندگی تیرے ہی لئے ہے۔ خداوند مہربان ہے!"

سارجنٹ سے نہ رہا گیا۔ بول ہی پڑا۔

"خدا اور شکاگو کے اشتراکی سب ہی مہربان ہیں"

دوسرے دن شمالی امریکہ کا برطانوی نژاد وکیل قصبہ میں پہنچ
گیا۔ منگل کا دن تھا۔ مقدمہ اگلے دوشنبہ کو پیش ہونے والا تھا اس لئے
اس نے آتے ہی التوا کی درخواست کی اور بالآخر ایک دن کی مہلت مل
گئی یعنی مقدمہ منگل تک کے لئے ملتوی ہو گیا۔

یہ برطانوی نژاد وکیل بظاہر اچھے کو بہت کچھ لئے دیئے رہتا

کے لئے تیار ہو گیا۔ اور جمعہ کی رات کو واپس آیا۔ وہاں کا قیام ہوٹل
میں ہی رہا۔ اور کسی وقت حبشی سے کچھ باتیں کرتا [illegible]۔ وہ اس کے
ساتھ بیٹھ کر برابر سرگوشیاں کرتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا
کہ دونوں کوئی رازدارانہ گفتگو کر رہے ہیں۔ ایک بار تو اس نے سیم کے
ساتھ بیٹھ کر کھانا بھی کھایا۔

منگل کا دن [illegible] والوں کے لئے ایک یادگار دن تھا۔ اور
سکولوں میں بھی چھٹی دے دی گئی تھی۔ اور پورے قصبے میں دس بارہ ہی
دوکانیں کھلی رہ گئی تھیں۔ لوگ صبح پانچ بجے سے عدالت کے احاطے کے گرد
جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ جب محافظ و ترتیب نے نو بجے دروازہ کھولا تو
یہ انبوہ بھیڑوں کے گلوں کی طرح احاطے میں گھس پڑا۔ اس انبوہ میں
قصبے ہی کے لوگ نہ تھے۔ نواحی آبادی کے کثیر لوگ امڈے چلے آ رہے تھے
یہاں تک کہ ٹولانے سے بھی ایک خاص بس لوگوں کو لے کر آئی تھی۔ اس قصبے
میں اس سے بڑا مجمع اس سے قبل کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔

ٹھیک دس بجے جج وکرس عدالت کے کمرہ میں داخل ہوا۔ ہر
طرف خاموشی چھا گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا مجمع گونگا ہو گیا ہے
البتہ دور کونے میں ایک حبشی آپ ہی آپ ہنس رہا تھا۔ اس کو اپنے گرد
پیش کی کچھ بھی خبر نہ تھی۔ اس کو دیکھ کر دوسرے بھی ہنسنے لگے اور جج
اس مرتبہ حکماً اس بدتمیزی کو روکنا پڑا۔

عدالت کے اس کمرے میں اس سے پیشتر اتنا مجمع کبھی نہیں د
گیا تھا۔ مجمع ایک ہزار سے زائد تھا۔ لوگ بھینچ کر بھی نہ سما سکے تو کچھ
نے کھڑکیوں پر اڈہ جمایا۔ ہر شخص تنگے [illegible] اور خوش نظر آ رہا تھا ایسا معلوم
ہوتا تھا کہ فریقین اور ان کے خیر خواہ ہر ایک اپنی جگہ پر مطمئن تھا کہ فیصلہ
اس کے حق میں ہوگا۔ تین گھنٹیاں بجیں اور اس کے بعد مقدمے
کی کارروائی شروع ہو گئی۔

پہلے میٹ ہیرس نے بحث شروع کی۔ دن خاصا گرم تھا
کمرہ تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ گرمی کی شدت سے کپڑا جسم سے
چپک رہا تھا۔ اور لوگ پسینے سے شرابور ہو رہے تھے۔ وکیل سرکار
[illegible] اطمینان کا سا

لیجاتے تھے۔ اور کچھ اس صفائی اور چرب زبانی کے ساتھ

تھے۔ کہ سننے والوں کو گمان ہوتا تھا۔ کہ یہ سب کوئی اچھا

رہے ہیں۔

دو پہر ہو چکی تھی اور میسٹ نے حبشی سے جرح شروع کی۔

پریشان اور خوفزدہ معلوم ہو رہا تھا۔ اور بار بار دعال

سے پونچھ رہا تھا وکیل سرکار نے پہلے دو ایک سوال پوچھ

والات کے جواب وہ محض ہاں اور نہیں میں دیتا رہا۔

کسی سفید فام عورت کو جانتے ہو؟"

سرکار!" حبشی نے جواب دیا۔ مطلب یہ تھا کہ اس

فام عورت سے کوئی ربط ضبط نہیں ہے۔

یقین کے ساتھ کہہ رہے ہو!"

سرکار!"

پھر مسز طاقی کی بابت کیا کہتے ہو!"

بین کی ایک عورت تھی جس کے ہاں نسیم کبھی ملازم تھا۔

اران کو جانتا تو ہوں لیکن جاننے سے میری مراد تعلقا

ات ہے......؟

یں؟ تم آخر اس کو جانتے ہو نا؟"

جانتا تو ہوں!"

ہیرمن نے اس کے بعد بحث کا رخ بدل دیا اور ذرا

سے کے سہارے جھک کر آہستہ سے پوچھا۔

بھائی سفید عورتیں ہوتی تو خوبصورت ہیں۔ تم کو بھی پسند

وکیل صاحب!"

تو مطلب یہ ہے کہ کالی عورتوں سے یہ زیادہ خوبصورت

یں"

کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس کے وکیل ڈنوون نے آگے بڑھکر

ست کی کہ وکیل سرکار کو غیر متعلق سوالات کرنے سے

ئے۔

صاف کر کے جوری کے سامنے ایک پرجوش اور جذباتی تقریر کر ڈالی جس

کا ہر موضوع سفید فام باشندوں کی عزت، مرتبہ اور ان کے وقار پر

دیا گیا تھا۔ اس تقریر میں اس نے یہ بتایا تھا کہ یہ ایک لڑکی کی عزت کا

معاملہ نہیں بلکہ پوری گوری قوم کی عزت کا سوال ہے۔ اب ایک بج چکا تھا

اور عدالت کچھ وقفے کے لئے برخاست ہو گئی۔

لوگ اب بھی عدالت کے گرد منڈلاتے رہے۔ اور اپنا اپنا ناشتہ

اور کھانا ختم کر کے جو بیشتر افراد اپنے ساتھ ہی لائے تھے اگلی بحث سننے

کے لئے تیار ہو گئے۔ پونے تین بجے جوری پھر واپس آئے اور نسیم کے وکیل

ڈنوون نے اپنی جگہ سنبھالی۔

گواہ یکے بعد دیگرے آتے رہے۔ اور وہ ان سے خاموشی کے ساتھ

رک رک کر سوال کرتا رہا۔ اس کی بحث میں گرمی کی بجائے سنجیدگی اور

وزن تھا۔ ان گواہوں میں اس کے اپنے بھی دو حبشی گواہ اور ایک مولا

کا موجود تھا۔ جب گواہ اپنا بیان ختم کر چکے تو اس نے متانت کے ساتھ

ان کا شکریہ ادا کیا اور دوسروں کو بلایا۔ اس کی گفتگو میں میسٹ کی

طرح شوخی اور بانکپن نہ تھا۔ البتہ متانت اس کی خصوصیت تھی۔

ملی اور حبشی سے جرح ختم کرنے کے بعد اس نے ٹہل ٹہل کر

کچھ زیر لب کہنا شروع کیا۔ یہ سب کچھ وہ خود اپنے اور جیوری دونوں سے

کہہ رہا تھا۔ پہلے اس نے بتایا کہ نسیم بڑا مذہبی آدمی ہے حالانکہ مجمع کے

ہر گورے فرد کے نزدیک کسی حبشی کے مذہبی ہونے سے مراد محض یہی ہو سکتی

ہے۔ کہ اس کو چند کلمات یاد ہوں۔ جن کو ورد کرنا اور مخصوص طور

پر ناچ ناچ کر پڑھنا اس کی عبادت ہو۔ بہرحال ڈنوون نے پہلے اس

کی مختصر زندگی بیان کی۔ اس کے بعد ملی کی طرف مخاطب ہوا۔ اس

کی بحث سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کو اس واقعہ کا علم ہے۔ جب

ملی کے ایک مرد سے تعلقات ہو گئے تھے۔ جو قصبے کی ایک پرچون کی

دکان میں کام کرتا تھا۔ پچھلے ہی مہینہ وہ نیو آرلینڈ تفریح کے

لئے گیا تھا۔ اور پھر لوٹ کر نہ آیا۔ ڈنوون نے ملی سے اس کا اقرار

کرا ہی لیا۔ ملی حبشی پر الزام محض اپنی بدنامی چھپانے کے لئے لگا رہی

تھی۔ یہ کوئی عجیب بات نہ تھی۔ لیکن ڈنوون کو اس کے ذرا سے اچھے

موکل کی برات میں بڑی مدد کی۔

تقریباً پانچ بجے اندھیرا چھانے لگا۔ لوگ بھی اب اکتانے لگے تھے۔ لیکن کیا مجال کہ ڈاؤ دن کے سکون میں فرق آجائے۔ وہ اب بھی انتہائی اطمینان کے ساتھ اپنے موکل کی بیگناہی ثابت کرتا رہا اور یہ کہہ کر بات ختم کردی کہ جب تک جرم ثابت نہ ہو ہر شخص بیگناہ ہے اور کسی بیگناہ کو سزا نہیں دی جاسکتی۔

اب بحث ختم ہوچکی تھی۔ فیصلہ دو دن کے لئے ملتوی ہوگیا۔

اور عدالت برخاست!

جمعرات کے دن دو گھنٹے کے لئے جوری نے باہر جاکر آپس میں مشورہ کیا۔ اور پھر عدالت میں واپس آگئے۔ اب فیصلہ سنانے کی دیر تھی۔ مجمع ہمہ تن گوش ہوگیا۔

ایک نے کھڑے ہوکر اعلان کیا ——

"ہم مدعا علیہ کو الزام سے بری قرار دیتے ہیں....؟"

پنجشنبہ کو عدالت نے ملزم کو بری قرار دیا اور دوسرے دن جمعہ کو سارجنٹ میکلوڈ نے تسیم کو اس کے گھر پہنچا دیا۔ لیکن یہ خلش اس کے دل و دماغ میں باقی رہی کہ بجا یا بے جا اس حبشی کو سزا اور عبرت ناک سزا ملنی چاہیئے ورنہ اس طرح اور دور دور کے حبشیوں کے حوصلے بہت بڑھ جائیں گے۔ اس بستی کے گورے باشندوں کے علاوہ اس واقعہ کا بڑا اور برا اثر قصبہ کے مشہور موٹر والے مل برٹن پر بھی تھا۔ گورے باشندے ایسا محسوس کر رہے تھے کہ ان کی قومی ہتک ہوئی ہے۔ سارجنٹ کی گھر والی بھی آج چپ چپ سی تھی روزانہ دفتر سے سارجنٹ کی واپسی پر وہ اس کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کرتی تھی لیکن آج اس کی آواز پست اور گھٹی گھٹی سی تھی اور اس نے اپنی طرف سے پہل نہیں کی سارجنٹ کے چھیڑنے پر اس نے صرف اتنا کہا کہ مل برٹن اس کو پوچھنے آیا تھا اور دوبارہ آنے کے لئے کہہ گیا ہے۔

رات کو حسب معمول مل برٹن سارجنٹ کے گھر آیا اور تھوڑی دیر کی سرگوشی کے بعد چپکے سے باہر چلا گیا۔

اب مقدمہ کے فیصلہ کو کئی دن گزر چکے تھے۔ سارجنٹ نے گاڑی نکالی۔ وہ اتر کر دیوان خانے میں آیا۔ سارجنٹ اور اس کی بیوی سے کچھ گفتگو کی۔ اور اس کے بعد سارجنٹ کو ساتھ لے کر پچھلے کمرے میں چلا گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد وہ دیوان خانے میں آیا اور سارجنٹ کی بیوی سے کچھ کہہ کر باہر نکلا۔ کار پر بیٹھا اور روانہ ہوگیا۔ سارجنٹ اس سے پہلے ہی پچھلے دروازے سے آکر کار کی پچھلی نشست پر بیٹھ چکا تھا اور اپنے سامنے تھیلوں کا انبار لگا لیا تھا۔ جو کار میں اس سے پہلے سے موجود تھے۔

غیر مانوس اونچے نیچے اور گڈنڈی راستوں سے گزرتی ہوئی کار ایک درخت کے پاس جاکر رک گئی۔ جہاں پہلے سے آٹھ دس کاریں موجود تھیں۔ مل برٹن اور سارجنٹ میکلوڈ گاڑی سے باہر آئے چند دوسرے لوگوں کو لیا۔ اور سب نے نقاب اوڑھ کر ایک طرف کا رخ کیا تقریباً ایک میل تک تنگ و تاریک راستوں سے گزرنے کے بعد یہ پارٹی ایک جھونپڑے کے پاس جاکر رک گئی۔ رات کافی گزر چکی تھی لیکن کمرے کے اندر کی روشنی اس کا پتہ دے رہی تھی کہ کوئی جاگ رہا ہے۔ سارجنٹ نے کھڑکی سے جھانک کر اندر دیکھا اور اپنے ساتھیوں سے آکر کہنے لگا

"یارو! موقع اچھا ہے۔ بھتنا اکیلا ہے۔ اس کے کمرے میں کوئی نہیں ہے!"

کئی آدمیوں نے مل کر ایک پچھلا دروازہ کھولا اور ولیم ایک لوہے کی سلاخ اور ریوالور لے کر پشت کی طرف سے اندر آگیا۔ مل برٹن نے دروازے کی طرف سے آہستہ سے کھٹکھٹایا۔ دوسرے لوگ چاروں طرف مستعدی کے ساتھ پہرہ دیتے رہے۔ حبشی نے جو چراغ کی دھیمی روشنی میں بائبل پڑھ رہا تھا سر اٹھا کر دیکھا۔ اور اپنی بندوق لے کر دروازے کی طرف بڑھا۔ نا وقت مل برٹن کو اپنے جھونپڑے پر دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے بندوق کی نال مل برٹن کے سینے پر رکھ دی اور پیچھے کی طرف دھکا دے کر غصے سے کہا۔

"کمبخت یہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑتے، نکل جا ورنہ ابھی تیرا کام تمام کردوں گا"

مل برٹن کو یقین تھا کہ حبشی آسانی سے کسی کی جان لینے والا

یہ حبشی کے ٹھیک پیچھے آکر اس کے سر پر سلاخ کا ایک بھرپور
یم تیورا کر منہ کے بل گرا . اور بیہوش ہوگیا - وہ ساکت ساکت
پڑا رہا اور خون سر سے بہہ بہہ کر چہرے اور کپڑوں پر گرتا رہا۔
، سارجنٹ اور مل برٹن نے مل کر اس کے ہاتھ پیر بھاری
کی طرح موٹر کے پچھلے حصے میں لا کر ڈال دیا۔
اب گاڑیوں کا یہ مختصر قافلہ پھر اسی جگہ کے لئے روانہ ہوا جہاں
سے ہو کر چلا تھا۔ درخت کے نیچے پہنچ کر کاریں روک دی گئیں
کو چار آدمیوں نے مل کر کار سے باہر کھینچ کر ڈال دیا۔ وہ اب
ن تھا۔ سارجنٹ اور اس کے آدمیوں کے پاس ایک ٹین پٹرول
ایک نے بڑھ کر اس کے اوپر کچھ پٹرول انڈیل دیا۔ لیکن آپ یا
بو سے سیم نے کچھ حرکت کی اور تھوڑی دیر کے بعد اٹھ کر بیٹھ گیا
ایک بار پھر مل کر اس کو موٹر کی چھت پر چڑھایا۔ اور گردن میں
کر قریب کے پیڑ کی شاخ سے رسی کا دوسرا سرا باندھ دیا کچھ
سوچا کہ اب بغیر کسی توقف کے اس کا خاتمہ کر دیا جائے۔۔ لیکن
نے رائے دی کہ اس سے پوچھا جائے کہ اب کیا چاہتا ہے ۔
کئی آوازیں دینے کے بعد آنکھ پر بہتے ہوئے خون کو ہٹانے کی
کرتے ہوئے حبشی نے آہستہ سے اپنے ہونٹوں کو جنبش دی ۔ اور
حسرت سے سر اٹھا کر بولا۔
خدا وندا انہیں معاف کر دے ــــــ یہ نہیں جانتے کہ کر
ہیں ــــ"
حبشی کے ان الفاظ سے سناٹا چھا گیا۔ لوگ ایک دوسرے کا
منے لگے۔ مل برٹن بھی خاموش تھا۔ لیکن پھر اسے جانے کیا ہوا کہ
تھا۔
میں اس حبشی کو زندہ دیکھ رہا ہوں گا ؟"
اور اس نے موٹر چلا دی۔ سیم کی گردن پر موت نے ہاتھ ڈال
سد سیکنڈ میں سیم کی بجائے اس کی لاش درخت سے لٹکی ہوئی
تھی۔ مل برٹن اور اس کے ساتھیوں نے بڑھ کر اس کے کپڑوں
سلائی لگا دی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے شعلے بلند ہوئے۔ رسی
تی اور سیم کا ادھ جلا جسم نیچے آ رہا ــــــ پھر وہاں راکھ اور

ہڈیوں کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا۔

دوسرے دن سیم کی بیوی نے اس کی بچی ہوئی راکھ اور ہڈیوں کو لے کر دفن کر دیا۔ بات آئی گئی ہوئی لیکن سارجنٹ اب بھی رات کی تنہائیوں میں سوچا کرتا ہے کہ یہ سب کیسے اور کیوں ہوا ــــ لیکن وہ اپنی گوری نسل کو پھر بھی ایک حبشی کی زندگی سے کھیلنے کا حقدار سمجھتا ہے ــــ پورا پورا حقدار ــــ !!

ایک گزارش :-

مشیر کے اہل قلم اور ادب حضرات سے گزارش ہے کہ وہ اپنی نگارشات روانہ فرماتے وقت ان پر اپنا پورا نام و پتہ ضرور تحریر فرمائیں۔ بغیر نام و پتے کے کوئی نگارش قابل قبول نہ ہوگی۔ علاوہ ازیں مسودات کو صاف اور خوشخط بھی لکھنے کی کوشش فرمائیں !!

(ایڈیٹر)

عابد مگھیانوی۔ بی۔ اے

مسلمانی

ضمیرِ کن فکاں میں عشقِ حقانی کی تابانی
حریمِ تارِ ہستی میں منوّر شمع ایمانی
شہیدِ جستجو اپنی حقیقت سے شناسا ہو
خود آگاہی سے ہوتے ہیں عیاں اسرارِ پنہانی
تو بحرِ بیکنارِ لا میں کشتی ڈال دے اپنی!
لبِ ساحل تجھے معلوم ہوگی موجِ طوفانی
جوابِ لن ترانی سے نہ گھبرا اے کلیمِ دل
یہاں ہر طور پر ہوتی ہے ایسی ہی ستمرانی
متاعِ دین و ایماں تک کو غارت کر کے رہتی ہے
نظر کی بے حجابی، حسن کی بے باک عریانی
کمالِ بندگی، گر حق کی پوچھو، تو شہادت ہے
ادا ہوتا ہے خنجر کے تلے سجدۂ یزدانی
تری ملت کی آزادی کے دشمن ہیں ابھی باقی
ہراسِ مرگ، خود بینی، تساہل کی فراوانی
فقط اس دور میں اب ایک موسیٰ کی ضرورت ہے
کہ ہے فرعون بھی اور نیل کی موجیں بھی طوفانی
تو اپنے چند سجدوں پر نہ اترا اس طرح عابد
خدا کے ہاتھ بک جانے کو کہتے ہیں مسلمانی

اشہ میرزا

ڈھل چکی رات

امی! آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں۔ آپ کی بوڑھی سوکھی ہوئی زرد انگلیاں ابھی تک تسبیح کے دانوں پر کانپ رہی ہیں۔ آپ ابھی تک فقیر بابا کے بتائے ہوئے وظیفہ کا ورد کر رہی ہیں۔ آپ ——— آخ ——— نہ جانے کب سے آپ انہی چکروں میں پھنسی ہوئی ہیں۔ یہ چکر نہ جانے کب سے گھوم رہے ہیں۔ آج کل تو انکی گردش زیادہ تیز ہو گئی ہے۔ شمع جب بجھنے لگتی ہے تو ایک دم بھڑک اٹھتی ہے کائنات کی ٹھٹھری ہوئی نبضوں میں زندگی کی حرارت دم توڑ رہی ہے۔ اور آپ سمجھ رہی ہیں کہ دم توڑتی ہوئی حرارت کو فقیر بابا کا بتایا ہوا وظیفہ سنبھالا دیدے گا۔ اجڑی ہوئی بہاروں کے نوحہ خواں سوکھے پودوں کے خشک چرمراتے ہوئے پتوں کو تسبیوں میں مل کرا ور پھونکیں مار کر ——— آپ یہ آس لگائے بیٹھی ہیں۔ پودے ہرے ہو جائیں گے۔ لپسے ہوئے پتوں سے کونپلیں پھوٹیں گی اور آپ کی سب مرادیں ہاتھ پیر ہلائے بغیر پوری ہو جائیں گی ——— امی ——— جب تک کائنات کی نبضوں کے ٹھٹھرے پن کو دور نہ کیا جائے گا۔ جب تک پودوں کو پانی نہ ملے گا۔ اس وقت حرارت دم توڑتی ہی رہے گی .... سوکھے پودے اجڑی ہوئی بہاروں کے نوحہ خواں ہی بنے رہیں گے ——— لیکن ان تھک، بے غرض اور پرخلوص جدوجہد کے بغیر دھرتی کے پپڑائے ہوئے لبوں سے ہنسی کی پھواریں کیسے پھوٹ سکتی ہیں۔ کاش! آپ نے تسبیح کے دانوں کو پھیرنے کی بجائے میری زندگی کے نشیب و فراز میں پھیلی ہوئی تاریکی کو دور کرنے کی کوشش کی ہوتی۔ میری جوانی کے صحت مند ولولوں کو ابھارنے کی خاطر مجھے عمل کے سیدھے راستہ پر ڈالا ہوتا۔ اور میں اپنی قسمت پر کڑھنے کی بجائے ماحول کی رگوں میں پھیلے ہوئے گندے لہو کو دور کرنے کی خاطر چلیلے انسانوں کی جدوجہد میں شریک ہوتا۔ اور ہر قدم پر زندگی نکھرتی جاتی سنورتی جاتی اور کائنات کی ٹھٹھری ہوئی نبضوں میں زندگی کی حرارت تیز ہو جاتی۔ اور سوکھے پودوں میں نئی کونپلیں پھوٹتیں۔ شگوفے کھلتے اور معطر ہوائیں جھوم جھوم کر نئی بہاروں کے گیت گانے لگتیں ...... لیکن میں کڑھتا رہا، جلتا رہا، تردد بن کر آزمائشوں سے گھبراتا رہا اور آپ تسبیح کے دانوں سے میری قسمت کی لکیریں کھینچتی رہیں۔ تسبیح کے ایک ایک دانے سے میری نوکری، شادی اور بچوں کی ہزاروں دعائیں لپٹی سسک رہی ہیں۔ مگر نہ تو ابھی تک مجھے کہیں نوکری ہی ملی ہے۔ اور نہ ہی کہیں شادی کی بات طے ہوتی ہے۔ آپ ایک "مرشد" کو آزما کر دوسرے "مرشد" کے جال میں پھنس جاتی ہیں اب فقیر بابا نے ایک نیا وظیفہ بتایا ہے اور آپ اس کی کرامات پر پورا ایمان لے آئی ہیں۔ فقیر بابا کے متعلق میں نے بہت کچھ سن رکھا ہے۔ اور شاید آپ بھی اس حادثے سے بے خبر نہ ہوں گی کہ کس طرح ایک مرید کی نوجوان کنواری بیٹی پر عاشق "جن" فقیر بابا کے سچے ہوئے مصلے کمرے میں وجد میں آگیا تھا۔ اور مرید کی بیٹی فقیر بابا کے اشارے پر کہاں سے کہاں پہنچا دی گئی تھی۔ آپ بھی تو محلے کی عورتوں کے ساتھ باتیں کرتے وقت فقیر بابا کو برا بھلا کہا کرتی تھیں۔ اور اب آپ فقیر بابا کے گن گاتے ہوئے تھکتی نہیں ہیں۔ اب آپ کے خیال میں حاسد لوگ فقیر بابا کو ہی خواہ مخواہ بدنام کر رہے ہیں ایسے پہنچے ہوئے بزرگ کی بددعا سے ہمیشہ بچنا چاہیے۔ نہ جانے کب فقیر بابا کی زبان سے بددعا نکل جائے اور دھرتی کی طنابیں ٹوٹ جائیں ——— امی ——— دھرتی کی طنابیں تو کیا ٹوٹیں گی۔ ہاں البتہ انسانیت کے چہرے کو فقیر بابا نے اپنی "کرامات" سے ضرور مسخ کر دیا ہے۔ اور شرافت اور پاکیزگی کے سوتے خشک ہوتے جا رہے ہیں۔ اور ابلیسانہ قہقہوں میں تکبر پیدا ہو گیا ہے۔ فقیر بابا کا بڑا لڑکا جو سن کا ناجائز کاروبار کرتا ہوا پکڑا گیا ہے۔ اور آپ اس کو بھی حاسدوں کی سازش ہی سمجھے بیٹھی ہیں۔ آپ کو یقین ہے کہ فقیر بابا کا بڑا لڑکا ضرور رہا ہو جائے گا۔ کیوں نہ ہو آخر بہت سے بڑے لوگ بھی تو اس کے مرید ہیں

ں شامل ہیں۔ ان کے لئے اپنی عقیدت مندی کا ثبوت پیش کرنے کا
س سے اچھا اور کون سا موقعہ ہو سکتا ہے۔ احسان جتا کر وہ کسی بھی
" نورس غنچے " کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ امی — آپ کی سوکھی ہوئی انگلیاں
ابھی تک تسبیح کے دانوں پر کانپ رہی ہیں۔ اور ٹھیکیدار حیات کے گھر
ڈھولک بج رہی ہے۔ رات کافی گزر چکی ہے۔ نکھرے ہوئے آسمان پر
ستاروں کے قافلے کئی منزلیں طے کر چکے ہیں سفید راستوں کے رخ بدل
گئے ہیں۔ اور ڈھولک کی تھاپ سریلی آوازوں سے ہم آہنگ ہو کر ستاروں
کو چھونے کی کوشش میں لگی ہوئی ہے — کل ٹھیکیدار حیات کی بیٹی کی برات
آنے والی ہے۔ کل وہ اس گھر سے دور چلی جائے گی۔ اور ٹھیکیدار مونچھوں
کو تاؤ دے کر بڑے فخر سے اپنے داماد کے عہدے کی " برکات " کے قصے
سنایا کرے گا۔ ٹھیکیدار بن کر وہ خود کو بہت بڑا زمانہ ساز سمجھنے لگا
ہے۔ ہر بات کو وہ کاروباری ہیر پھیر کے ترازو میں تولتا ہے۔ اپنی
بیٹی سلمٰے کا رشتہ بھی اس نے اسی نقطۂ نظر سے طے کیا ہے اسے سلمٰے کی
آرزوؤں سے زیادہ اپنی ٹھیکیداری کے فروغ کا خیال ہے۔ سلمٰے کی
بے بسی سے زیادہ اسے اپنے جھوٹے وقار کی نمائش کا فکر ہے۔ اور شوکت کی
مظلوم یتیمی کے احساس کو مٹا کر وہ یوں قہقہے لگاتا ہے جیسے اسے اپنے
بڑے بھائی کی موت کا ذرا بھی افسوس نہ ہو۔ اپنے بڑے بھائی کے آخری
وقت میں اس نے شوکت کا ہاتھ پکڑ کر وعدہ کیا تھا۔ کہ وہ اپنے معصوم
بھتیجے کی خاطر اپنی زندگی کے سکھ کو قربان کر دے گا۔ اس کے جوان ہونے
پر وہ کاروبار کے علاوہ اپنی بیٹی سلمٰے بھی اس کے سپرد کر دے گا۔ امی!
آپ بھی تو شوکت کو مظلوم سمجھا کرتی تھیں۔ ٹھیکیدار اپنا وعدہ بھول گیا
تھا۔ اپنے مرحوم بھائی کے کاروبار پر قبضہ جما کر وہ انسانیت کے اصول
کو فراموش کر بیٹھا تھا۔ شوکت کو مند کرتے دیکھ کر اس کا خون کھولنے لگتا
تھا۔ وہ برداشت نہ کر سکتا تھا۔ کہ شوکت بڑا ہو کر اس کے کاروبار پر
قبضہ جما لے۔ اس کی سختیوں سے تنگ آ کر شوکت کہیں بھاگ گیا تھا۔ اور
ٹھیکیدار نے جعلی دستاویز تیار کر کے شوکت کی انتقامی کارروائیوں کا
سد باب کر لیا تھا۔ نہ جانے شوکت کہاں مارا مارا پھرتا رہا۔ بہت مدت
کے بعد وہ واپس آیا ہے۔ پہلے تو کسی نے بھی اسے نہ پہچانا تھا۔ اس کی زندگی
ایک نئے موڑ پر پہنچ گئی تھی۔ ٹھیکیدار نے اسے گھر میں داخل نہ ہونے دیا
تھا۔ محلے والوں کا خیال تھا کہ اب وہ اپنے چچا سے ضرور انتقام لے گا۔
لیکن اس نے کوئی ایسی حرکت نہ کی۔ جس سے محلے والوں کے اس
خیال کو تقویت ملتی۔ وہ محلے والوں کے مذاق کا نشانہ بن گیا تھا۔
میں بھی تو اس کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ اور اس وقت میرا مذاق اڑ رہا تھا
میں اس حقیقت سے بے خبر تھا۔ کہ سچائی کے راستے میں مکڑی فریب کی
ہر دیوار اولوالعزمی کی ٹھوکروں سے مسمار ہو جایا کرتی ہے۔ وقت کے
پھیلتے ہوئے سایوں میں رینگتی ہوئی کراہیں، اور آہیں مہکتی ہوئی بہاروں
کا سراغ لگا رہی تھیں۔ اور مجھے کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ کہ وہ کون سے اصول
ہیں۔ جنھیں اپنا کر ہم ان آہوں اور کراہوں کو زندگی بخش مسکراہٹوں میں
بدل سکتے ہیں۔ وہ روشنی کے مینار کس طرف ہیں جن کی طرف قدم اٹھانے
سے سفاک اندھیروں کا طلسم توڑا جا سکتا ہے۔ اور آج شوکت نے مجھے
اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ محلے کے کئی نوجوان اس کی باتوں پر ایمان
لے آئے ہیں۔ اس نے گھر سے بھاگ کر بہت کچھ حاصل کیا ہے وہ انسانیت
کا ایک سچا خادم بن گیا ہے۔ اسے اپنے باپ کی دولت کے کھو جانے کا
غم نہیں؛ البتہ اس بات پر ضرور دکھ ہے۔ کہ سلمٰے کے ساتھ بھی ناانصا
برتی گئی ہے۔ اور حیات اس کی پاکیزگی کو متنفق بنانے کی خاطر ایک باپ
کے پیار اور فرض کی حدیں پھاند گیا ہے۔ ٹھیکیدار شوکت کی امانت
ایک ٹھیکہ حاصل کرنے کی خاطر کسی بڑے افسر کے سپرد کر رہا ہے۔ سلمٰے
ایک معصوم اور پاکباز لڑکی ہے اور شوکت اس کے مستقبل کے تصور سے
کانپ اٹھتا ہے۔ بڑے افسر کا ماحول اسے راس نہ آ سکے گا۔ وہ
سسکتی اور سلگتی رہے گی۔ مگر شوکت زندگی سے فرار حاصل کرنے
خاطر کسی بزدلانہ جذبے کو اپنے دل و دماغ کے قریب بھی آنے نہیں
اس کا عزم جوان ہے اسے پختہ یقین ہے کہ اس کی جد و جہد ایک د
ضرور ان ظالم روایات کی سنگین کڑیوں کو توڑ دے گی۔ جن میں نہ معلوم
سلمٰے اور اس کی ہزاروں بہنیں دق کا شکار ہو رہی ہیں۔ اور — نہ
امی! آپ تو شوکت سے اب کچھ متنفر ہو گئی ہیں۔ اب تو آپ ح
کی فیاضی کے گن گانے لگی ہیں۔ اور سلمٰے کی شادی پر آپ خوشی م
کر رہی ہیں۔ ایک معمولی سی بات نے آپ کے شعور میں ابھرے ہ
برائی کے مجسمے کو اچھائی کا روپ بخش دیا ہے۔ چند دنوں تک ح

کی منت وسماجت کرنے کے بعد اس نے حامی بھری ہے۔ کہ وہ ضرور مجھے بھی کہیں نہ کہیں نوکری دلا دے گا۔ میں نوکر ہوں گا تو پھر میری شادی ہو گی بچوں کا باپ بنوں گا۔ اور آپ انہیں گود میں لے کر بڑے فخر سے ہمسائیوں سے باتیں کریں گی۔ آپ کی نظروں میں تو انسان کی یہی وقعت ہے۔ اس کے آگے آپ کچھ نہیں سوچ سکتیں ـــــ مگر یہ تسبیح پھیرنے میں آپ کو کمال حاصل ہو گیا ہے۔ یہ کھوکھلی عبادت اس خوش رنگ شہتیر کی مانند ہے جسے اندر سے دیمک چاٹ رہی ہو۔ اور ـــــ امی ـــــ ڈھولک کی آواز فضا میں بھنور بنا رہی ہے۔ اور لڑکیوں کے گیت ستاروں کی دنیا کی تسخیر کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ انور کی آواز بھی ان آوازوں میں لہرا رہی ہے اسے آج خاص طور پر مدعو کیا گیا ہے شام کو میں نے اسے ٹھیکیدار کے گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے ریشمی پھولدار قمیص اور سفید ساٹن کی شلوار پہنی ہوئی تھی۔ ہوائی ریشم کا دوپٹہ قوس قزح کی مانند اس کے سینے پر سجا ہوا تھا۔ اور مصنوعی بالوں کی چوٹیاں اس کے شانوں پر دوہری ہو گئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ جھینپ سا گیا تھا۔ ایک عجیب دلربایانہ انداز سے اس نے دروازے کے اندر قدم رکھا تھا۔ وہ بالکل عورت معلوم ہو رہا تھا۔ کوئی اجنبی اسے دیکھ کر مشکل سے ہی پہچان سکتا تھا کہ وہ عورت نہیں بلکہ ایک فریب ہے۔ نسائیت کی دیواروں میں چھید کرنے والا رہا ہے۔ انور کی زندگی ایک نئے جال میں پھنس گئی ہے۔ بری صحبت نے اسے ہیجڑوں کی ٹولی میں شامل کر دیا ہے۔ اس کی ماں اسی غم میں گھل گھل کر مر گئی ہے۔ لیکن انور کو اپنی مردانگی کی موت کا ذرا بھی احساس نہیں ہوتا۔ اسے روپیہ کمانے کا سستا نسخہ مل گیا ہے۔ یہ نسخہ انور کو اندھیروں کی اتھاہ گہرائیوں میں لئے جا رہا ہے۔ یہ نسخہ اب بہت لوگ استعمال کرنے لگے ہیں۔ برائیوں کے پھلنے پھولنے کے لئے یہ سرزمین بہت زرخیز ثابت ہو رہی ہے۔ گمراہیاں اپنے وحشی رقص سے بہاروں کے چہروں پر خراشیں پیدا کر رہی ہیں ـــــ اور لڑکیاں گیت گا رہی ہیں۔ ڈھولک کی آواز شعور کی چنگاریاں بکھیر رہی ہے۔ انسانیت کے رستے ہوئے زخموں کی ٹیسیں بھیانک خلاؤں میں گونجتے ہوئے حیوانیت کے قہقہوں سے رحم کی طالب ہیں۔ نحیف و نزار زندگیوں میں الجھی ہوئی سانسیں، مہیب تیرگیوں کے اتھاہ سمندر میں کسی ساحل کا سراغ لگا رہی ہیں۔ بھوک سے بے تاب

بچوں کی بلبلاہٹیں، اونچے ایوانوں کی جگمگاتی ہوئی چوٹیوں کے متکبر اجالے سے سہمی جا رہی ہیں۔ اور کھیتوں میں بکھرے ہوئے سونے کو سر تپ اور بچھوؤں کے روپ میں دیکھ کر کسانوں کی قسمت کا گلشن جھلس جا رہا ہے اور انور لڑکیوں کے درمیان بیٹھا بڑی آزادی سے گیت گا رہا ہے۔ انور اب عورتوں کا سا فیشن کر کے بے ضرر بن گیا ہے۔ اس کے مردانہ پن سے اب کوئی خدشہ باقی نہیں رہا ہے...... اسی لئے تو اسے مدعو کیا گیا ہے۔ اس سے کوئی پردہ نہیں کیا گیا ہوگا۔ کسی بے معنی حجاب کا اظہار بھی نہیں کیا گیا ہوگا۔ اب بہروپ بھر کر انور کی ہر دست درازی ایک مذاق بن گئی ہوگی۔ اس کا ہر معیوب فعل شوخی کے مترادف سمجھا جاتا ہوگا...... نہ جانے انور جیسے کتنے بہروپیے، ماحول کی رگوں میں زہریلے جراثیم پھیلا رہے ہیں۔ امی ـــــ یہ معاشرہ کتنا متعفن اور گھناؤنا بنتا جا رہا ہے۔ یہاں پر معصیت کے فروغ کی خاطر نئے نئے جال پھیلائے جا رہے ہیں۔ اور سچائی کی ہر کرن کو مٹانے کی خاطر قانون کی زنجیریں جھنجھنا اٹھتی ہیں۔ اور آپ ابھی تک تسبیح کے دانوں سے کھیل رہی ہیں اور ڈھولک کی تھاپ سے ہم آہنگ سریلی آوازیں پھیلتی جا رہی ہیں...... ان آوازوں میں ایک چیخ ابھر کر مٹ گئی ہے...... امی...... آپ نے بھی چیخ کی آواز سنی ہے......! شاید ہمسائی نوری بی روتے روتے اپنی لڑکیوں کی بھوک سے بے چین ہو کر چیخ پڑی ہو...... بے چاری نوری بی...... وہ ضرور جاگ رہی ہوگی۔ گانے کی آوازوں کے شور نے سب ہی کی نیندوں کو دور بھگا دیا ہے۔ کوئی بے چین ہو کر کروٹیں بدل رہا ہوگا۔ اور کوئی گیتوں کی مٹھاس میں ڈوب کر تخیلات کے رنگ محلوں میں مرمریں بتوں کی پرستش کر رہا ہوگا۔ اور نوری بی ـــــ؟ ـــــ اسے تو شدت کے ساتھ اپنی شادی کا دن یاد آ رہا ہوگا۔ اس کی شادی پر بھی تو اسی طرح ڈھولک بجی تھی۔ محلے کی بے فکر لڑکیوں نے گیت گائے تھے۔ اور اب ـــــ ڈھولک کی تھاپ ہتھوڑوں کی ضربیں بن کر اس کی روح کو زلزلا رہی ہوں گی۔ اور گیتوں کے بول اس کی ذہنی خلاؤں میں تند بگولوں کی مانند چکرا رہے ہوں گے...... اس بے رحم تضاد نے اس کی خوشیوں کو چھین لیا ہے۔ اس کی مسکراہٹوں کو آنسوؤں میں بدل دیا ہے۔ پانچ لڑکیوں کی ماں بننے کے بعد اسے طلاق مل گئی ہے۔ اس کے

خاوند کو اب لڑکیاں جننے کی مشین کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ اسے اب اس عورت سے کوئی سروکار نہیں رہا ہے جس کے شباب کی تازگی اور شگفتگی کو اس کے "پیار" کی سفاکانہ ملیغار نے وقت سے پہلے ہی بڑھاپے کے اذیت ناک کچوکوں کے سپرد کر دیا ہے۔ اس نے اپنی پانچوں لڑکیوں سے بھی ناطہ توڑ لیا ہے۔ انھیں بھی نوربی بی کے ساتھ گھر سے نکال دیا ہے۔ اب وہ بہت خوش ہے۔ وہ جس وکیل کے پاس منشی تھا پہلے اس کے جال میں شاذ و نادر ہی کوئی موکل پھنستا تھا۔ اس کے لئے اپنی ساکھ کو قائم رکھنا دوبھر ہو گیا تھا۔ اور منشی کے لئے تو زندگی عذاب بن گئی تھی۔ مگر آزادی کے بعد اس کی کایا ہی پلٹ گئی ہے پہلے تو موکلوں کی خوشامدیں کرتے ہوئے اس کی زبان سوکھ جایا کرتی تھی۔ اور اب موکل یوں اس کی خوشامدیں کرنے لگے ہیں۔ جیسے زندگی اور موت اسی کی قلم کے تابع ہوں اسی لئے اب اس نے ایک غریب بہشتی کی لڑکی کو گھر سے نکال دیا ہے۔ ناجائز آمدنی اپنے مصرف کے لئے ناجائز راستے تلاش کرنے لگی ہے۔ اب تو اسے کنواریوں کے کئی رشتے مل سکتے ہیں۔ دولت، قانون اور اخلاق پر قابض ہو گئی ہے۔ دولت نے زندگی کا رخ روشنی کی طرف سے پھیر کر اندھیروں کی طرف کر دیا ہے۔ اور انسان مسرور ہو رہا ہے کہ اس نے "کمال" حاصل کر لیا ہے ——— امی —— آپ نے ٹن ٹن کی آواز سنی ہے نا —— گلاٹے کی چبھتی ہوئی تیز آوازوں کو چیرتی کلاک کی ٹن ٹن نے رات کے ڈھلنے کا اعلان کر دیا ہے وقت کی جرأت مندانہ للکار نے اندھیروں کے وقار کو جھنجھوڑ دیا ہے۔ ستاروں کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں غنودگی کے سائے گہرے ہونے لگے ہیں۔ ..... لیکن گانے والی بے فکر لڑکیوں کو رات کے ڈھلنے کا ذرا بھی احساس نہیں ہوا ہے۔ وہ تو شاید اندھیروں کو دائمی سمجھے بیٹھی ہیں۔ وہ حقیقت کو بھی جھٹلانے کی ناکام کوشش میں لگی ہوئی ہیں ...... مگر ...... کب تک وہ یونہی ڈھولک بجاتی رہیں گی۔ ایک نیا پیغام فضاؤں کی لامحدود وسعتوں میں جد و جہد کی پھریریاں رچانے کا اذان کی آواز اندھیروں کی خوشخبری کائنات کے ہر ذرے کو سنائے گی۔ اور افق کے سب کنارے جگمگانے لگیں گے .... امی —— آپ نے تسبیح جیب میں ڈال کر ہاتھ پھیلا دیئے رہی ہیں۔ اور ٹھیکیدار حیات کے کاروبار کے فروغ کی د تو سینے میں چکرا رہی ہوں گی ...... لیکن امی ..... اب آپ کی بجائے ان جیالے انسانوں کی فتح کی دعائیں مانگنی ہوں گی اندھیروں کی ظالمانہ روایات کے طلسم کو توڑنے کی جد و جہد ہوئے ہیں۔ کائنات کی ٹھٹھری ہوئی نبضوں میں زندگی بکھر پھیلنے کے لئے بے چین ہو گئی ہے۔ سوکھے ہوئے پودوں پر پھول کھلنے کا وقت قریب آ رہا ہے۔ شوکت کے صحت مند کوئی طاقت نہیں کچل سکتی ..... میں بھی اس کا ساتھ دوں آپ کو بھی انسانیت کی بقا کی خاطر ہمارا ساتھ دینا ہوگا۔ چراغ جلتے ہیں۔

کون چڑھتے ہوئے سورج کو دبا سکتا ہے
رات اب سرحدِ انوار تک آ پہنچی ہے

عبدالقدیر اصغر

خودفریبی

روزاس راہ سے گزرتا ہوں
روز کچھ جھونپڑے شکستہ سے
داستان طویل کہتے ہیں
جن میں آدمؑ کی نسل بستی ہے
لوگ جن کو ذلیل کہتے ہیں
روز انسانیت کے چہرے پر
نقش غم لکھا سا رہتا ہے
روز حیوانیت جھلستی ہے
روز طوفاں ابلتا رہتا ہے
روز بڑھتے ہیں موت کے سائے
دامن خوف و یاس پھیلائے
روز انسانیت سسکتی ہے
روز آدمؑ کی نسل بکتی ہے
روز ڈھلتی ہے جنگ کی زنجیر
روز ہوتی ہے امن پر تقریر
روز کھلتی ہیں ظلم کی راہیں
پھیلتی ہیں گناہ کی باہیں
شمعیں روز تھرتھراتی ہیں
ظلمتیں روز مسکراتی ہیں
کس قدر حیرت و تعجب ہے
فکر و تدبیر ہے نہ تیاری
ذوق صالح نہ شر سے بیزاری
ہر طرف اک دھواں سا اٹھتا ہے
لیکن انساں یہی سمجھتا ہے
سمت منزل ہی بڑھ رہا ہوں میں
عرش اعظم پہ چڑھ رہا ہوں میں

روز اس آسمان کے نیچے
روز محلوں کی چھاؤں کے پیچھے
ایک سیلاب غم امنڈتا ہے
روز اک انقلاب پلتا ہے
مٹ گئے ہٹلر و مسولینی
چھن گیا اقتدار بے رحمی
اٹھ گیا دور ظلم چنگیزی
اب نہ تیمور ہے نہ خونریزی
مٹ گئے دارا و سکندر بھی
تاج کسریٰ بھی تخت قیصر بھی
زار و نمرود کی خدائی بھی
جبر بھی شان کبریائی بھی
ساز فرعون میں صدا نہ رہی
شاہ فاروق کی جفا نہ رہی
روز قوموں سے راج چھنتا ہے
روز شاہوں سے تاج چھنتا ہے
روز طوفاں سر اٹھاتا ہے
روز اک انقلاب آتا ہے
کس قدر حیرت و تعجب ہے
اب بھی جب اختیار ملتا ہے
اب بھی جب اقتدار ملتا ہے
اب بھی آئین ظلم بنتا ہے
اب بھی انساں یہی سمجھتا ہے
ملک میرا ہے راج میرا ہے
تخت میرا ہے تاج میرا ہے!
روزان سیگوں نظارہ دی

روز ان درخشاں ستاروں پر
روز شمس و قمر کی تابش پر
روز شام و سحر کی گردش پر
روز چشموں پر آبشاروں پر
روز دریاؤں، کوہساروں پر
چیونٹیوں، ہاتھیوں، درندوں پر
بھیڑوں، بکریوں، پرندوں پر
آب پر، خاک پر، شراروں پر
محفل عیش پر، مزاروں پر
روز تہذیب کے ستونوں پر
روز تخلیق کے نمونوں پر
ابر پر، موسم بہاروں پر
وادی طور، کوہ فاراں پر
روز زیر زمیں خزانے پر
روز قدرت کے کارخانے پر
آدمی کی نگاہ پڑتی ہے
نخوت عز و جاہ جھڑتی ہے
کس قدر حیرت و تعجب ہے
پھر بھی پندار سر اٹھاتا ہے:
جذبۂ کبر تلملاتا ہے
راہ سے راہرو بھٹکتا ہے
پھر بھی انساں یہی سمجھتا ہے
حاکم وقت ہوں الٰہ ہوں میں
مالک الملک ہوں خدا ہوں میں

(ادارہ ادب اسلامی دہلی کی ایک نشست میں پڑھی گئی)
(بشکریہ دعوت)

جیت ہماری ہوگی

"باپ عظیم باپ بھاگو، نکلو جلدی کرو، وہ دیکھو طوفان ہمارے کیمپوں کے قریب آپہنچا، ہائے وہ کوئی دم میں ہمیں نیست ونابود کرکے رکھ دینا چاہتا ہے۔"

"کون ہے یہ کون؟ جس نے نیند حرام کردی ——— اسے بیٹے تم؟ آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے .... یہ تم اتنے گھبرائے سے کیوں ہو؟"

"باپ عظیم باپ! تم کہتے ہو گھبرائے کیوں ہو؟ میں کہتا ہوں کہ کیا جب پھندہ ہماری گردنوں میں آپڑے گا تب ہم گھبرائیں گے ——— تب ہم گھبرائیں گے جب ہمارا دم لبوں پر آرہے گا ...... میں کہتا ہوں کہ تمہاری طبیعت اتنی مطمئن کیوں ہوگئی ہے!"

"ہا ہا ہا ہا ...! ہنستا ہے ——— "آخر معلوم بھی تو ہو بات کیا ہے ..... !"

"بات ——! میرے باپ بات تو بہت سنگین ہوچکی ہے یوں سمجھو کہ پانی سر سے اونچا ہوا جاتا ہے!"

"میں کہتا ہوں کہ آخر کچھ کہو بھی، یونہی اشاراتی گفتگو کیے جاؤ گے ....."

"وہ ...... وہ ...... وہ ....." وہ ہکلاتے ہوئے بولا ——— "وہ ایک ..... زبردست فوج ہے جس نے ہمارے کیمپوں کا محاصرہ کرلیا ہے ...... اتنی زبردست ..... اتنی زبردست کہ عظیم باپ ان کے آگے ہماری ایک نہ چلے ——!"

"کون سی ہے وہ فوج میرے بیٹے؟" اس نے اس کے کندھے کو سہلاتے ہوئے پوچھا۔

"باپ عظیم باپ! ہائے میرا دل ہول رہا ہے۔ وہ چند سر پھروں کی فوج ہے۔ ایسے ہی سر پھروں کی جیسی میں نے تیرہ سو سال پرانے تاریخی سر پھروں کی کہانیاں پڑھی ہیں۔"

"ہوں ..... اوں ..." تعجب خیز انداز میں تقریباً چیخ نکل گئی۔ "پھر کہاں ہے ان کی چھاؤنی میرے بیٹے؟"

"ہمارے کیمپ سے قریب ہی لیکن ہماری نظروں سے اوجھل، یوں سمجھو باپ کہ وہ ایک خاموش بارود ہے جو چونکہ ساتھ ہمارے پاؤں تلے بچھ گئی ہے۔ بارود ..... خطرناک، ایک ڈائنامیٹ جو کوئی دم میں ہمیں ہمارے پورے کیمپ سے اڑا کر رکھ دیگا۔ باپ! یوں جانو کہ وہ ہمارے حق کی تحریک ہے۔ باپ اتنی زبردست طاقت مسلط ہوگئی۔ ا خبر نہ ہوئی ...... تحریک اسلامی ..... اف ..... اس سے تو میرا کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ..... تیرہ سو سال پرانے جنو کا نام بھی تو اسلامی تھا۔"

"میرے بیٹے گھبراؤ نہیں" وہ اس کی پیٹھ تھپکتے دیتے ہوئے بولا ——— "گھبرانے سے کام نہیں چلنے کا۔ اگر سب کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ ہاں! تو ذرا مجھے صبر و سکون تمہیں کہاں ملے اور کر کیا رہے تھے؟"

"باپ میں سکون کہاں سے لاؤں۔ آج تو جا اختیار نہ رہا۔ ان کی منظم طاقت نے مجھے بوکھلا دیا ہے میں شہر کے کنارے سے ہوکر گزر رہا تھا تو وہ مجھے پکا سب ایک پکار پر جمع ہو رہے تھے۔ اپنا سامان اپنا پر اٹھائے ہوئے تھے وہ سوٹڈ بوٹڈ بھی تھے۔ اچھے ا کپڑے پہنے ہوئے، لکھے پڑھے معزز اور اونچی پوزیشن انھیں اپنا سامان اٹھا کر چلنے میں ذرا عار نہ تھا۔ ا میں کوئی شور اور کوئی ہنگامہ نہ تھا۔ نہ تو انھوں نے نعرے لگائے نہ جلوس نکالے اور نہ ہی انھوں

۔ کوئی امتیازی نشان تھا، بلکہ وہ تو ان کے ساتھ سپاہی بن کر بیٹھتے
۔ نہ اسے اونچا بٹھائے گئے۔ نہ اسے کسی اونچے مقام پر بٹھایا گیا۔ وہ
میں کا ایک فرد تھا۔ انھیں جیسا ان کے برابر بیٹھنے والا، انھیں کے
۔ انھیں جیسا کھاتا کھانے والا۔ ان کے ساتھ مل کر کام کرنے والا
۔ عام آدمی، مگر پھر بھی تھا ان کا لیڈر —— میرے باپ یہی کچھ
ہ سو سال پرانے جنونیوں کی بھی شان تھی۔ یہ بڑے سکون اور آہستگی
۔ آگے بڑھ رہے ہیں۔ آگے اور بہت آگے، ان کے مقاصد میں
۔ پر جمے ہوئے ہمارے اقتدار کی جڑوں کو اکھاڑ پھینکنا.... اور
.. اور .... اور نہ پوچھو باپ ان کے عزائم بہت بلند بہت
بلند !!"

"ہاں ہاں بیٹے کہے جاؤ تو پھر انھوں نے اور کیا کیا کیا؟"

"وہ ..... وہ ہماری جڑوں کو اکھاڑنے کی تدبیریں سوچتے
ہے۔ سر جوڑ جوڑ کر اور دماغ لڑا لڑا کر ..... اور پھر جتنی کچھ انھوں نے
بر زمیں بار رو دکھائی ہے۔ اس کی روداد سناتے ہیں ...... بڑی ہی
ناک حد تک پہنچی ہوئی ہیں ان کی کوششیں .... اف میرے عظیم باپ
ے سہارا دو۔ مجھے تو جیسے چکر سے آرہے ہیں"

"سنبھلو، سنبھلو... دیکھو...!" اس نے بڑھ کر اس کو سہارا
یتے ہوئے کہا۔ "بیٹے اتنی جلدی جی نہیں چھوڑ دیا کرتے۔ ہاں ہاں
بتاؤ پھر آگے انھوں نے اور کیا کچھ کیا؟"

"یا کچھ کیا، عظیم باپ اب اور کیا چاہیے کیا یہ سب کچھ کم ہے
کم ہے یہ سب کچھ وہ رات کے بارہ بجے تک کرتے رہے۔ کھاتے
پیتے نماز پڑھتے دو ڈھائی بج گئے"

"اور..... اور..... اور پھر جلدی بولو بیٹے!"

"پڑ کر سو رہے تاکہ صبح اٹھ کر پھر ہمارے کیمپوں کی طنابیں کاٹنے
لگ جائیں"

"ہا ہا ہا! وہ ہنسا ..... میرے بیٹے تم ابھی بہت بچے ہو
وہ .... وہ کچھ بھی ..... ہمارا ایک بال بھی بیکا نہیں کر
سکتے۔ تمہاری ..... [illegible] ..... لیکن اب میری
ہوش کی الیت ..... [illegible] ..... نہیں۔

اول تو یہ جلالہ ..... تک پہنچتے تو پائیں گے اور اگر پہنچ پائے بھی تو بھلا
کچھ بگاڑ نہ سکیں گے۔ دیکھو تو سہی اب میں انھیں ان ہی سے کیسا کچھ
ٹکرائے دیتا ہوں میرے عزیز بیٹے! ہا ہا ہا!"

"ایسا کیونکر میرے عظیم باپ؟"

"اس لیے کہ وہ تیرہ سو سال پرانے جنونیوں جیسے نہیں وہ تو
ایک آگ تھے آگ، بھڑکتی ہوئی آگ ایک امنڈتا ہوا طوفان اور
ریلتا ہوا سیلاب، اف میرے خدا، سوچتا ہوں تو اب بھی ماتھوں کو
پسینے آجاتے ہیں اور آتشیں لہریں شریانوں میں حشک ہونے لگ جاتی
ہیں .... میرے بیٹے! ان سے میرا ٹکراؤ سات مرتبہ ہوا ہے اور
بہت ہی بری ناکامی اور خوفناک پسپائی پر ختم ہوئی..... لیکن .....
لیکن —— اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک پیدا ہوگئی۔ —— تم
جانو میرے عزیز بیٹے ہمت چھوڑ بیٹھنا میری شریعت میں حرام ہے میں
تو شکست کو فتح میں تبدیل کرتے رہنے کا ہمیشہ عادی رہا ہوں یہی میرا
ازلی مسلک ہے چنانچہ میں نے بڑی مشکلوں بڑی دقتوں اور بہت مدت
کے بعد ان پر قابو حاصل کیا تھا۔ اور اب پھر ان کے احیاء کی خبر سن کر میں
تقریباً بوکھلا سا گیا تھا .... لیکن ...... اب میرے بیٹے! ہا ہا ہا!
تمہارا بھولا پن بھی کیا خوب ہے۔ بیٹے تمہیں تاریخ تو یاد رہی تھیں تم
پہچان نہ سکے وہ کون تھے اور یہ کون —— یہ تو کچھ بھی نہیں، وہ تھے
کہ سراپا ایک جنون دن بھر تلواریں چلاتے والے اور راتوں کو پلک پر پلک
نہ لگنے دینے والے .... اور یہ بیٹے ابھی "بالنہار انسان و باللیل
رہبان" تو نہیں؟"

"یہ ہم سے بازی لے جائیں گے؟ ناممکن ... ناممکن!! بیٹے مطمئن
رہو ٹکراؤ ہونے بھی تو وہ جیت ہماری ہوگی!!

(حلقہ ادب اسلامی گورکھپور کی ایک نشست میں پڑھا گیا)

ضروری التماس

خریداران سے التماس ہے کہ خط و کتابت کے وقت اپنا
خریداری نمبر لکھنا نہ بھولیں! (منیجر)

ادیب سہارنپوری

ظلمتوں کا جو بول بالا ہے — کوئی سورج نکلنے والا ہے
تو لگائے نئی سحر کے لئے — شمع گل ہی، چراغ لالہ ہے
جستجو ہے نئے چراغوں کی — رنگِ محفل بدلنے والا ہے
صورتِ اشک گر رہے ہیں نجوم — شب کا یہ آخری سنبھالا ہے
ہم نے آپ اپنی جستجو کے لئے — سوچ کر ہی قدم نکالا ہے
ہم نے اک حسرتِ تبسم کو! — کتنے آنسو پلا کے پالا ہے
ایک بھی آرزو نہ بر آئی — عشق وہم و گماں سے بالا ہے
جسکی حسرت ہو اور طلوع نہ ہو — اشک ایسی صبح کا اجالا ہے
زیست تو اک بلائے جان نکلی — ہم تو سمجھے تھے پھول مالا ہے

موت سے تو ادیب کیا مرتا
آرزوؤں نے مار ڈالا ہے

(حمایتِ اسلام)

ساغر ہوشیارپوری

دعوتِ فکر و عمل

اسلام کی عظمت پہ ہستی کو مٹاتا چل
ایثار و محبت کا پیغام سناتا چل
اے عشق کے دیوانے ـــــــ توحید کے پرو

میخواروں کی بستی ہے، ہر آنکھ میں مستی ہے
اصنام پرستی ہے، دامن کو بچاتا چل
اے عشق کے دیوانے ـــــــ توحید کے پرو

ہر سمت اندھیرا ہے، آفات نے گھیرا ہے
ظلمات کے پردے کو دنیا سے اٹھاتا چل
اے عشق کے دیوانے ـــــــ توحید کے پرو

ویران ہے ہر وادی، ہر شاخ ہے فریادی
ہر دشت و بیاباں کو گلزار بناتا چل!
اے عشق کے دیوانے ـــــــ توحید کے پرو

یاں عام ہے بیکاری، افلاس ہے ناداری
تقدیر کے ماروں کو سینے سے لگاتا چل
اے عشق کے دیوانے ـــــــ توحید کے پرو

دھندلی سی فضائیں ہیں، گھنگھور گھٹائیں ہیں
امیدوں کی کشتی کو ساحل سے لگاتا چل
اے عشق کے دیوانے ـــــــ توحید کے

اختر زید پوری

نقطہ

"اصل اور نقل میں، کھرے اور کھوٹے میں کامل اور ناقص میں بعض اوقات کتنا غیر محسوس فرق ہوتا ہے —— ہم بے خبری نظر تو نقطے تک نہیں پہونچ سکتی !!!"

قدرت کی تقسیم کاری میں کسی کا کیا اجارہ! جیسے جو جا ہے ملے لیکن انسان کو احساس اور نطق جیسی نعمتیں ملی ہیں تو ہر کمی لازمی طور محسوس ہو گی اور زبان اس احساس کی ترجمانی بھی کرے گی۔ مجھے اور میرے پڑوسی فرید کو بھی قدرت کی تقسیم کاری سے شکایت تھی۔ قدرت نے اسے ایک علان زندگی گذارنے کے لئے پیسہ دیا تھا تو اولاد جیسی نعمت سے محروم رکھا تھا مجھے دولت سے محروم کر کے اولاد جیسی نعمت اس فیاضی سے عطا کی تھی میں اس نعمت کو اپنے لئے باعثِ زحمت سمجھنے لگا۔ مہینے میں دو چار دن ہمارے لئے ایسے بھی آتے ہیں کہ ہمیں صرف پانی پر قناعت کر کے سو جانا پڑتا تھا۔ لیکن بچوں کی فطرت میں قناعت کہاں؟ نتیجے میں سونے کے بجائے ہمیں رونا آجاتا، اور کبھی کبھی تو یہ دلی تکلیف اتنی بڑھ جاتی کہ میں پاگل سا ہو جاتا، میرے اندر یہ خواہش سر ابھارنے لگتی کہ ان سارے بچوں کے گلے گھونٹ کر خود کشی کر لوں۔ ادھر فرید کو اولاد کی کمی بڑی طرح محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ دنوں سے وہ اور بھی کچھ سوچنے لگا تھا، اکثر وہ مجھ سے کہتا "شادی کو چھ سال ہو چکے ہیں۔ اب رضیہ سے اولاد ہونی مشکل ہے، میں تو دوسری شادی کر لینے کی سوچ رہا ہوں" اور تب میں سوچتا "اولاد کی تمنا نے اسے ایسا پاگل بنا دیا ہے کہ اپنی نوجوان اور خوبصورت بیوی کے سینے پر سوکن لا کر بٹھانے کی سوچ رہا ہے۔ اس عورت کو خون کے آنسو رلانا چاہتا ہے۔ کبھی جس کی ایک جھلک دیکھ لینے کی تمنا میں یہ اس کی گلی کے سینکڑوں پھیرے کر ڈالتا تھا۔ جسے اس نے جان کی بازی لگا کر پایا ہے۔ وہی اس کی نظروں سے گری جا رہی ہے صرف اس لئے کہ اب تک اس کی کوکھ سے کوئی بچہ جنم نہ لے سکا لیکن اس میں اس کا کیا قصور وہ فرید کی محبت سے کیوں محروم ہوئی جا رہی ہے —— اور میرے کانوں میں فرید کے کہے ہوئے جملے گونجنے لگتے "جس گھر میں بچے نہیں وہ گھر نہیں شمشان ہے"

اور پھر ایک دن وہ مجھ سے کہنے لگا "شاہد! نسیم کو مجھے دے دو۔ میرے سونے گھر میں رونق آجائے گی میں اسے اپنے بچے کی طرح سینے سے لگا کر رکھوں گا۔ اسے کوئی تکلیف نہ ہونے پائے گی" فرید کا یہ سوال اتنا غیر متوقع اور اچانک تھا کہ تھوڑی دیر کیلئے میں بوکھلا سا گیا۔ یہ درست تھا کہ میں اکثر اس کے سامنے اپنی کم مائگی اور کثرت اولاد کا ذکر کر چکا تھا لیکن اس کا یہ مطلب تھا کہ میں کسی فالتو چیز کی طرح اپنے بچے دوسروں کو بانٹ دینا چاہتا تھا۔ نسیم میرے بچوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ وہ فرید سے بہت زیادہ مانوس تھا۔ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ فرید کے گھر میں نسیم میرے گھر سے زیادہ خوش رہ سکے گا۔ اس لئے کہ فرید کے پاس پیسہ ہے لیکن نسیم کو اپنے سے جدا کر کے فرید کو دے دینے کی بات میں نے کبھی نہیں سوچی تھی۔ کبھی ایسا خیال بھی میرے ذہن میں نہ آسکا تھا —— اور اب میں اسی شش و پنج میں تھا کہ فرید کو کیا جواب دوں؟ کہ اچانک مجھے یاد آگیا، جیسے سہارا مل گیا میں نے کہا "لیکن تم تو دوسری شادی کرنے کی سوچ رہے تھے؟"

فرید مسکرایا کہنے لگا "دوسری شادی تو میں اولاد ہی کی تمنا میں کرنی چاہتا تھا۔ ویسے میں رضیہ سے ہر طرح سے مطمئن ہوں" —— پھر کچھ رک کر بولا "آج رضیہ ہی نے میرے سامنے یہ تجویز رکھی ہے کہ ہم نسیم کو اپنا بیٹا بنا لیں۔ اس بچے سے اسے کتنا پیار ہے، یہ تم جانتے ہی ہو۔ نسیم کو پا کر یقیناً ہماری اداسیاں ختم ہو جائیں گی اور پھر دوسری شادی کا سوال ہی نہ رہے گا —— مجھے بھی اچھا نہیں لگتا کہ رضیہ پر سوکن لاؤں لیکن تم نے میری درخواست رد کر دی تو مجھے مجبوراً ایسا کرنا پڑے گا"۔

میں سمجھ گیا کہ رضیہ کو یہ بات معلوم ہو گئی ہے کہ اولاد کی تمنا میں اس کا شوہر دوسری شادی کر لینے کے خواب دیکھ رہا ہے اور اس مصیبت سے بچنے کے لئے اس نے شوہر کو صلاح دی ہے کہ وہ نسیم کو مجھ سے مانگ لے سوکن کا بوجھ اپنے سینے پر برداشت کرنے کے بجائے وہ پرایا بچہ گود

لے لینا بہتر سمجھتی ہے۔ فرید جواب کے انتظار میں میرے چہرے کو تک رہا
تھا۔ میں نے کچھ سوچ کر کہا: "مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا مجھے اعتراض
تھا، لیکن یہ بات تمہاری بھابی سے بھی کہنی ہوگی۔ عورتوں کی بات تم
جانتے ہی ہو پھر ایک ماں . . . " فرید نے میری بات پوری نہ ہونے دی
جلدی سے بولا مجھے یقین ہے بھابی میری بات نہ ٹھکرائیں گی ——
اور پھر نسیم ہر وقت ان کی نظروں کے سامنے ہی رہے گا۔ ہمارے گھروں کے
بیچ میں ایک دیوار ہی تو ہے۔ نسیم میرے گھر آگیا تو مالک مکان سے کہہ کر میں
ایک دروازہ لگوا دوں گا۔ اس طرح دونوں گھر ایک ہو جائیں گے۔"

"اچھا، میں تمہاری بھابی سے تذکرہ کروں گا ویسے مجھے یقین ہے کہ
تم نسیم کو مجھ سے اچھی طرح رکھ سکو گے۔" میں جواب میں صرف اتنا ہی کہہ سکا
فرید کے ہونٹوں پر ایک شریر مسکراہٹ کھیلی۔ بولا —— "معاف کرنا
مجھے تمہاری سفارش کی ضرورت نہیں، اپنی بھابی سے میں خود ہی نبٹ لیتا
ہوں" اور وہ میرے گھر میں جانے کے لئے اسی وقت آمادہ ہو گیا۔
"تم سے بدگمان ہو" میں اپنی ہلکی ہنسی کے پردے میں اپنے جذبات
چھپائے اس کے ساتھ ہو گیا

جمیلہ پہلے تو فرید کی بات کو مذاق سمجھتی رہی اور ہنسی میں ٹالتی رہی
لیکن جب فرید نے پوری سنجیدگی کے ساتھ کہا "بھابی اسے مذاق نہ سمجھئے حقیقت
میں میں تمہارے پاس بھکاری بن کر آیا ہوں" تو اس کے چہرے سے ساری
مسکراہٹ یک لخت غائب ہو گئی اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے فرید کے چہرے کو
دیکھنے لگی۔ نسیم اس وقت ماں کی گود ہی میں بیٹھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ نسیم کے
گرد جمیلہ کی گرفت سخت ہو گئی۔ سخت تر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اس کا سر
ماں کے سینے سے جا لگا۔ جمیلہ کو خاموش دیکھ کر فرید نے اپنا سوال دہراتے
ہوئے کہا "بھابی نسیم میرے سونے گھر کی رونق ہو گا، میں اپنی جان سے زیادہ
اس کی حفاظت کروں گا، میں ہر ممکن طریقہ پر اسے خوش رکھنے کی کوشش کروں
گا۔ تم دیکھو گی اسے میرے گھر میں خوشی کے سوا دکھ اور تکلیف کا احساس بھی
نہ ہونے پائے گا۔" اور یک لخت جمیلہ کی آنکھوں میں ایک ایسا جواب ابھر آیا
جسے فرید تو شاید نہ سمجھ سکا، لیکن جس کا سمجھ لینا میرے لئے دشوار نہ تھا۔
وہ آنکھیں کہہ رہی تھیں —— "فرید بھیا! دنیا میں دولت ہی سب
کچھ نہیں [illegible] ہیں تم اگر ساری دنیا کی خوشیاں بھی لا کر ڈھیر

کر دو گے تب بھی اسے وہ خوشی، وہ مسرت نہ دے سکو گے جو
ماں کے سینے سے لگ کر حاصل ہوتی ہے۔"
فرید کہے جا رہا تھا —— "بھابی یہ دو گھر
گے، میں اس دیوار میں دروازہ بنوا دوں گا۔ نسیم ہر وقت
نظروں کے سامنے رہے گا۔ میں اسے تعلیم دلاؤں گا ——
مستقبل کا مالک بنے گا، اور یہ بات تمہارے لئے بھی
ہو گی" اور اس وقت میرے ذہن نے مجھے صلاح دی
بات مان لینی چاہئیے۔ ایسا نہ کرنا نسیم پر ظلم ہو گا۔ اس کے مست
ہیں اتنا مقدور کہاں کہ اسے اعلیٰ تعلیم دلا سکیں ——
کی نظریں مستقبل کے بجائے حال ہی پر ٹکتی ہیں اور جب
تقاضوں سے اس کے لئے خاموش رہنا ناممکن ہو گیا تو وہ
چھوڑتے ہوئے بولی "یہ سب کچھ ٹھیک ہے فرید
ماں ہوں —— اور ماں کی مامتا کیا
احساس نہیں کر سکتے اب میں تمہیں کیا جواب دوں"
اور فرید کا چہرہ لٹک گیا۔ اس کی آنکھیں
اٹھا اور چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے جمیلہ
نے اچھا نہیں کیا۔ فرید یہاں سے دکھی ہو کر گیا
لینے میں ہمارے لئے بھی اچھائی تھی۔ نسیم کا مستقبل
اور جمیلہ نرم ہونے کے بجائے گرم ہو گئی۔ وہ مجھ
"تم نسیم کے باپ ہو لیکن ماں نہیں ——
ہوتے تو تمہیں بھی یہی جواب دینے پر مجبور ہونا پڑتا
دیا ہے —— اور میں سر جھکا کر خاموش
بھی نہ کہہ سکا جمیلہ کے اس استدلال کا میں کیا جو
فرید کئی دنوں تک [illegible]
اس افسردگی کچھ کم ہوئی تو اس کے اندر دوسری شدید
خواہش پوری شدت سے جاگ اٹھی تھی جیسے
ساتھ تھا اس کی خود داری [illegible]
آنکھوں میں ایک مسکراہٹ [illegible]
[illegible] والوں سے [illegible]

کر رہا تھا کہ وہ اس کے لئے کوئی اچھی سیرت کی خوش سلیقہ لڑکی کھوج نکالیں۔ لیکن اسے فرید کی بدنصیبی کہیے یا رضیہ کی خوش نصیبی کہ کافی جستجو کرنے کے باوجود اب تک دوستوں کی متفقہ کوشش بھی کوئی ایسی لڑکی دریافت نہ کر سکی تھی اور فرید کی آرزو ہنوز تشنۂ تکمیل تھی۔

اور پھر ایک دن اچانک فرید کا تبادلہ ہو گیا۔ اسے یہ شہر چھوڑ کر الٰہ آباد جانا پڑا۔ جس فرم میں وہ ملازم تھا اس کی ایک شاخ الٰہ آباد میں قائم ہو رہی تھی فرم والوں نے اس کا نام اس نئی شاخ کے کارکنوں کی فہرست میں رکھ دیا تھا ——— فرید الٰہ آباد چلا گیا۔ اس کے خالی کردہ مکان میں ایک نیا خاندان آکر آباد ہو گیا۔ اس خاندان میں بچے زیادہ تھے۔ وہی گھر فرید کی موجودگی میں جس کی فضا پر سکوت اور خاموشی چھائی رہتی تھی اب ہنگاموں کا گہوارہ تھا۔ دن بھر بچوں کے شور، ہنسنے، رونے، اور جھگڑنے کی آوازیں آتی رہتیں، اور جب یہ آوازیں میرے کانوں سے ٹکراتیں تو مجھے بے اختیار فرید کے کہے ہوئے جملے یاد آجاتے ——— "جس گھر میں بچے نہیں وہ گھر نہیں شمشان ہے۔"

فرید کے خط اکثر آتے رہتے تھے۔ یہ خط خیریت نویسی اور خیریت طلبی تک محدود ہوتے۔ اور کچھ مہینوں بعد یہ سلسلہ بھی اگر بالکل بند نہیں تو بہت حد تک کم ضرور ہو گیا۔ کہیں چوتھے پانچویں مہینے اس کا کوئی خط آجاتا تو میں اسے خط لکھ دیتا۔ وہ اب تک دوسری شادی کر سکا یا نہیں؟ یہ بات نہ تو اس نے ہی کسی خط میں لکھی اور نہ میں نے ہی پوچھنی مناسب سمجھی۔ اسے الٰہ آباد گئے دو سال سے اوپر ہو چکے تھے۔ اس عرصہ میں میرے ہاں ایک بچے کا اضافہ ہوا تھا لیکن میں نے یہ بات فرید کو نہیں لکھی تھی۔ کہیں اس کا زخمی دل اس سیدھی سی بات کو طنز کا نشتر نہ محسوس کر بیٹھے۔ سات بچوں کا باپ بن کر اب میرے دل کو کچھ یقین سا ہو چلا تھا کہ قدرت یہ فیاضی ایک درجن پورا کئے بغیر نہ کرے گی اور اس مہنگائی کے زمانے میں تنگدستی کا شکار ہوتے ہوئے ایک درجن بچوں کا باپ بن کر زندگی گذارنی کتنی کٹھن ہے۔ اس کا صحیح احساس کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو زندگی کے سفر میں ان کٹھن منزلوں سے گذر رہے ہیں۔

ایک دن میرے [illegible] فرید کا خط ملا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ یہ خط میرے [illegible] فرید نے خط میں لکھا تھا ———

"بھائی اسے [illegible]

حقیقت منظور ہے۔ تمہیں یاد ہوگا آج سے دو سال پہلے ایک دن میں نے تم سے نسیم کی بھیک مانگی تھی۔ لیکن تم مجھے یہ بھیک نہ دے سکیں تھیں تم نے مجھے یہ بھیک نہ دے سکی تھیں تم نے اس وقت جو جواب دیا تھا اب غور کرتا ہوں تو وہ اپنی جگہ پر بالکل درست محسوس ہوتا ہے۔ لیکن اس وقت تمہارے اس جواب سے مجھے دکھ ہوا تھا، میرا زخمی دل تڑپ کر چیخ اٹھا تھا اے قادر مطلق مجھ پر رحم کر ——— اب اور ذلیل و رسوا نہ کر مجھے ایک بچہ عطا کر دے۔ میں تجھ سے صرف ایک بچے کی بھیک مانگتا ہوں۔"

اور خدا نے میرے دل کی یہ آواز سن لی۔ آج مجھ پر یہ حقیقت روشن ہو گئی ہے کہ دعا کبھی بے اثر نہیں ہو سکتی اگر وہ دل کی گہرائیوں سے نکلی ہو۔ اسی ہفتہ میرے گھر میں ایک پھول سے بچے نے جنم لیا ہے، اور رضیہ ہی کو اس کی ماں کہلانے کا حق حاصل ہے۔ میں نے اس بچے کا نام بھی نسیم ہی رکھا ہے تاکہ تم سبھوں کی یاد میرے لئے ہمیشہ تازہ رہے۔

میرے گھر میں مسکرانے والا یہ پھول، خدا کی عنایت، رحمت اور ایک خدا رسیدہ صاحب کمال بزرگ کی کرامت کا نتیجہ ہے ———

اگلے سال یہاں ایک بہت بڑے درویش آئے تھے۔ شہر کے باہر عیدگاہ کے پاس جو پختہ کنواں ہے وہ وہیں ٹھہرے تھے۔ ان کا اصل نام تو معلوم نہ ہو سکا، لوگ انہیں "کنواں بابا" کے نام سے جانتے تھے۔ اس نام کی وجہ غالباً یہ ہے وہ ہمیشہ ایسی جگہ قیام کرتے ہیں جہاں قریب میں کنواں ہوتا ہے کنویں کا پانی ان کی استعمال کی برکت سے ایسا پُرتاثیر ہو جاتا ہے کہ بیمار اسے پیتے ہیں تو شفا پاتے ہیں، اولاد سے محروم عورتیں اس سے نہاتی ہیں تو سونی گود آباد ہو جاتی ہے ——— کنویں پر دن بھر تانتا بندھا رہتا ہے۔ اپنے مقصد سے پھر ہر شخص کنویں میں کچھ نہ کچھ ڈال دیتا ہے اور ایک لوٹا پانی نکال لیتا ہے (ایک لوٹے سے زیادہ پانی لینے کی کسی کو بھی اجازت نہیں) یہ سب باتیں رضیہ نے وہاں سے واپس آکر مجھے بتائی تھیں میری اجازت سے وہ "کنواں بابا" کے پاس اولاد کی بھیک مانگنے گئی تھی پہلے میں نے اسے وہاں جانے کی اجازت نہیں دی تھی لیکن جب سارے شہر میں ان کے کمالات اور کرامات کی دھوم سی مچ گئی اور خود میرے محلے کے کئی بیمار اس کنویں کا پانی پی کر شفایاب ہو گئے تو میں بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور میں نے رضیہ کو وہاں جانے کی اجازت دے دی۔

رضیہ جب واپس آئی تو وہ اپنے ساتھ میں ایک لوٹا پانی، ایک تعویذ اور ایک فتیلا لائی تھی۔ جب میں نے اس تعویذ اور فتیلے کی نسبت پوچھا تو اس نے یہ کہہ کر بتانے سے انکار کر دیا کہ "کنواں بابا" کی اجازت نہیں ہے کہ ان چیزوں کی نسبت کسی کو بتائی جائے۔ ورنہ تاثیر جاتی رہے گی؛ میں نے بھی اصرار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ان فقیروں اور درویشوں کی باتیں عموماً عام فہم نہیں ہوا کرتیں۔ آم کھانے والے کو آم کھانا چاہیئے، پیڑ گننے سے کیا حاصل مجھے بھی اپنے کام سے کام تھا، اسلئے خاموش رہا ——

رات کے کھانے کے بعد رضیہ نے اصرار کیا کہ میں سکنڈ شو دیکھ آؤں میں سمجھ گیا کہ وہ میری عدم موجودگی میں تعویذ اور فتیلے کو کام میں لانا چاہتی تھی اور اسلئے میں نے بھی گھر سے چلے جانے ہی میں مصلحت سمجھی۔ دروازے سے باہر نکلتے ہوئے ایک لمحے کے لئے میرے اندر خواہش پیدا ہوئی کہ سینما جانے کے بجائے گھر کے کسی گوشہ میں چھپ کر دیکھوں، رضیہ اس تعویذ اور فتیلے کو کیا کرتی ہے —— لیکن اس خیال کے ساتھ ہی مجھے ایک جھرجھری سی آئی جیسے کوئی غیبی طاقت مجھے متنبہ کر رہی تھی "نادان! اگر تو نے ایسا کیا تو اپنے گلے میں اپنے ہاتھ سے پھانسی کا پھندا ڈالے گا، اور میں اس خواہش کو دل سے نکال کر آگے بڑھ گیا۔ —— بہرحال میں آج تک یہ نہ جان سکا کہ رضیہ نے اس تعویذ اور فتیلے کو کیا کیا تھا اور نہ اب میرے لئے اس کے جاننے کی ضرورت ہے۔ ہماری تمنا پوری ہو چکی ہے۔ مقصد پورا ہو چکا ہے۔ اب بھول گیا چاہیئے ——

آج اپنے گھر میں بچے کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ کر میں سوچتا ہوں، خدا نے اپنے اس خاص بندے کو میری ہی حاجت روائی کے لئے بھیجا تھا اگر اس وقت میں رضیہ کو ان تک جانے کی اجازت نہ دیتا تو میں آج اپنے کو دنیا کا بدنصیب ترین انسان تصور کرتا ——

بھائی خط بہت لمبا ہو گیا۔ آخر میں صرف اتنا اور ——
اگر تمہارے شہر میں کبھی "کنواں بابا" آجائیں تو شاہد بھائی کو انکے پاس ضرور بھیجنا۔ میں جانتا ہوں کہ شاہد بھائی سادھوؤں اور فقیروں پر اعتقاد نہیں رکھتے، لیکن تم انھیں مجبور کرو گی تو انھیں انکے پاس جانا ہی پڑے گا۔ اور پھر تمہاری زندگی کی ساری پریشانیاں یکسر ختم ہو جائیں گی تمہیں یا شاہد بھائی کو زندگی میں کبھی بھی تنگدستی کی شکایت نہ ہو گی اپنے ذاتی تجربے

اور تجربے کی بنا پر میں وثوق سے کہتا ہوں کہ کوئی کیسی بھی نہ رکھتا ہو "کنواں بابا" کی دعائیں لے کر وہ ہرگز ناکام نہ
خط ختم کر کے میں نے جمیلہ کی طرف دیکھا۔ وہ پر نظریں جمائے جیسے "کنواں بابا" کے تصور میں کھوئی دیکھ رہی تھی۔ میری خاموشی نے اس کے تصور کے اس اور وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ ہم دونوں کی نگاہیں دونوں ایک ساتھ مسکرا دیئے۔ وہ ایک گہری سانس لیتی ہوئی "کنواں بابا، ہمارے شہر بھی آجائیں" اپنی اس تمنا کا اظہا لہجے میں کیا تھا کہ مجھے بے اختیار ہنسی آگئی اور وہ کھسیانی چلی گئی۔ اسکے جانے کے بعد جب میں نے اپنے دل کو ٹٹولا اپنے دل میں کلبلاتی محسوس ہوئی ——
تمنا میرے تصورات پر چھا گئی۔

فرصت کے لمحات میں جب ذہن کو کوئی اور کا تصورات کی دنیا میں گل گشت کرتا ہے۔ ہوتی اور لاز ہے، یہ سوچ ہی زندگی کی دلیل ہے۔ لوگ ایسے جاگتے یہ لمحات ہر انسان کی زندگی میں روزانہ کم وبیش آتے ہیں کہ یہ خواب دیکھتا ہے کوئی کم کوئی زیادہ! یہ خواب ع اور حسین ہوتے ہیں۔ لیکن انسان کی فطرت یکساں نہیں لئے کبھی کبھی یہ خواب بھیانک اور ڈراؤنے بھی بن جا۔ میں بھی ایسے کتنے خواب نہ دیکھ چکا تھا۔ دیکھتا رہتا ان خوابوں پر "کنواں بابا" کی حکومت تھی۔ جمیلہ کا تو یہ کے بعد دولت اور صحت کی دعائیں مانگنے کے بجا۔ کنواں بابا کی تشریف آوری کی دعائیں مانگا کرتی تم کیا جائے کہ اس کی دوسری دعاؤں کی طرح یہ د قبولیت کا جامہ نہ پہن سکی تھی۔

جمیلہ کے نام زبیدہ کا خط آنے کے دوسرے کے حکیم صاحب کے مطب میں ہر روز صبح جا کر تاز اپنا معمول سا بنا لیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ اس طرح کنواں بابا کا سراغ پانے میں کامیاب ہو جاؤں گا

یو حقیقت سے زیادہ "واہ" کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ بے بنیاد خبریں ہی خبریں بعد میں چھاپتے ہیں ——— کنواں بابا جیسی عظیم ہستی ابھی توجہ اپنی طرف کھینچ سکی اور روزانہ اخبار دیکھنے کے باوجود میں خبر نہ پاسکا۔

کنواں بابا کے اشتیاق و انتظار میں ایک سال سے اوپر گذر چکا تھا امیدیں مایوسی کا کفن پہن رہی تھیں ہمیں اپنی بدنصیبی کا یقین آچلا تھا ——— صبح کا وقت تھا کہ میں حکیم صاحب کے مطب میں اخبار کا تازہ پرچہ دیکھ رہا تھا جسے ابھی ابھی ہاکر دے کر گیا تھا حکیم صاحب ابھی تشریف نہیں لائے تھے۔ انکے انتظار میں چار پانچ مریض سلیقے بنچوں پر بیٹھے تھے۔ کہ مطب کی فضا پر چھائے ہوئے جمود سے اکتا کر ان میں بڑے میاں بول اٹھے "شہر سے باہر کمال شاہ کے مزار کے پاس جو اندرا ایک سادھو آکر ٹھیرے ہیں، شہر میں ان کی بہت شہرت ہو رہی ہے" میں نے اخبار جلدی سے میز پر ڈال دیا اور بڑے میاں سے مخاطب ہو کر "ان کا نام بتا سکتے ہیں" اونگھتے ہوئے دوسرے لوگ بھی سنبھل کر بڑے میاں کی طرف دیکھنے لگے۔ ہم سبھوں کو اپنی طرف متوجہ پاکر بڑے میاں مسکرائے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے "جناب نام تو ان کا بہت ہی عجیب سا ———" وہ پھر مسکرائے ——— مجھے ان کا یہ کھلنے لگا اسلئے کہ مجھے نام جاننے کی جلدی تھی لیکن ان کی زبان پر میرا اختیار نہ تھا ورنہ ان سے فوراً نام اگلوا لیتا، مجبوراً تحمل سے کام لینا پڑا ——— تھوڑی دیر بعد ان کی مسکراہٹ ہمارے اشتیاق کی آگ پر تیل کا کام کر چکی تو بولے ——— "یعنی لوگ انھیں کنواں بابا کہتے ہیں ———"

کنواں بابا کا نام سنتے ہی میں خوشی کے مارے اچھل پڑا اور ایک لمحہ بھی بغیر وہاں سے سیدھا گھر کی طرف بھاگا۔ بڑے میاں اور مطب میں موجود دوسرے لوگوں کی پر استعجاب نگاہیں کچھ دور تک میرا تعاقب کرتی رہیں اس وقت مجھے ان نگاہوں کی پرواہ نہ تھی، میں تو جلدی سے گھر پہنچ کر کنواں بابا کی تشریف آوری کا مژدہ سنانا چاہتا تھا ——— اور میں نے جمیلہ کو یہ مژدہ سنایا تو وہ خوشی و مسرت سے کانپنے لگی۔ یہ پہلا موقع تھا میں اس پر خوشی کا اتنا گہرا اثر دیکھ رہا تھا اسکی بے پناہ مسرت ایسا لگا کہ جیسے کنواں بابا نہیں آگئے ہیں بلکہ اسے قارون کا خزانہ مل گیا ہے، جنت کا پروانہ مل گیا ہے۔ اور پھر وہ مجھ سے ضد کرنے لگی کہ میں سب کام چھوڑ اسی وقت انکے پاس جاؤں۔ میں نے اسے سمجھایا "ایسی بھی کیا جلدی ہے اب تو وہ آہی گئے ہیں ——— اس وقت میری جیب خالی ہے، ان کے سامنے نذر عقیدت بھی نہ پیش کر سکوں گا۔ امید ہے کہ شام تک کچھ نہ کچھ انتظام ہوجائے۔ کل صبح چلا جاؤں گا ———" وہ چاہتی تو یہی تھی کہ میں ابھی اسی وقت جاؤں لیکن میرے سمجھانے پر خاموش رہی۔

دوپہر کا کھانا کھا کر میں روپیوں کا انتظام کرنے گھر سے نکلا کتنے ہی دوستوں کے پاس گیا کتنے دروازے کھٹکھٹائے۔ ان سے اپنی ضرورت بیان کی۔ انکے سامنے دست سوال پھیلایا لیکن مفلس کے دوست بھی مفلس ہی ہوتے ہیں۔ شام تک کی دوڑ دھوپ کا نتیجہ صفر ہی نکلا اور مجھے اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہو سکی۔ شام کو میں ملول و افسردہ گھر واپس آرہا تھا کہ راستے میں فیروز مل گیا۔ میں نے سوچا اس سے بھی بات کر دیکھوں، اور جب میں نے اس سے اپنی ضرورت بیان کی تو وہ اداس لہجے میں بولا "یار تم نے ایسے وقت میں کہا ہے کہ جب کہ میری جیب بھی بالکل خالی ہے ——— میں تمہاری مدد کر سکتا، یہ میرے لئے خوشی کی بات تھی لیکن ——— مجھے دلی افسوس ہے" اور میرے ہونٹوں پر ایک پھیکی مسکراہٹ رینگ گئی۔ ایک تنگدست اور مفلس انسان کو آئے دن ایسے ہی مایوس کن بلکہ تلخ جوابات سننے پڑتے ہیں میں بھی ایسے جوابات سننے کا عادی بن چکا تھا۔ آج ہی دوپہر سے اس وقت تک ایسے کتنے جوابات میرے کانوں کے پردوں سے ٹکرا چکے تھے اور میں مسکرا مسکرا کر ان کا استقبال کرتا رہا تھا، پھر اب فیروز کا جواب مجھے ناگوار کیوں گذرتا۔ میں آگے بڑھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ فیروز کچھ یاد کرتے ہوئے بولا "سنو! میرے پاس یہ ایک روپیہ ہے" روپیہ جیب سے نکال کر اس نے میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "یہ روپیہ تمہارے کام آسکے تو حاضر ہے" اپنی ضرورت کے مقابلے میں یہ ایک روپیہ مجھے کم محسوس ہوا لیکن یہ سوچ کر کہ بالکل نہ ہونے سے کچھ ہونا ہی بہتر ہے میں نے روپیہ لینے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ روپیہ لینے پر مجھے آمادہ دیکھ کر وہ جلدی سے بولا "پہلے تمہیں ایک بات بتا دوں" میرا بڑھا ہوا ہاتھ رک گیا۔ فیروز کہہ رہا تھا "بظاہر اس روپیے میں کوئی نقص نہیں لیکن آج صبح دو دکاندار اسے قبول کرنے سے انکار کر چکے ہیں" میری نگاہیں اسکے

چہرے پر جم گئیں۔ ان نگاہوں میں غصہ بھی تھا اور بیزاری بھی۔ وہ مسکرایا بولا "دوست یہ مت سمجھو کہ میں تمہارا مذاق اڑا رہا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ میری جیب میں بھی ایک روپیہ ہے اور دو دکاندار اسے قبول کرنے سے انکار بھی کر چکے ہیں، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ بظاہر روپے میں کوئی نقص نہیں —— لو تم خود دیکھو۔"

میں نے روپے کو دیکھا۔ روپیہ میں بظاہر نقص نہ تھا۔ میں نے کہا "دیکھنے میں تو ٹھیک معلوم دیتا ہے" —— "بس پھر رکھ لو!" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمہارے کام آسکا تو مجھے خوشی ہوگی، کھوٹا نکل گیا تو مجھے لوٹا دینا۔" میں نے روپیہ جیب میں ڈال لیا۔ اور گھر کی طرف چل پڑا۔ جمیلہ بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی مجھے دیکھتے ہی اس نے پوچھا "کہیے! کچھ انتظام ہوا؟"

"ہاں ایک روپیہ مل سکا ہے۔" میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ایک روپیہ؟" وہ جیسے سہم گئی۔ اور میں سوچنے لگا اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ یہ ایک روپیہ بھی کھوٹا ہو سکتا ہے، تو اس پر کیا گذرے گی وہ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتی رہی، پھر بولی "ایک روپیہ تو بہت کم ہے، بھلا ایک روپیہ ان کے سامنے پیش کیجئے گا۔ یہ میرے بندے بیچ ڈالئے گا چار پانچ روپے تو ہو جائیں گے۔" اور وہ کانوں سے بندے اتارنے لگی۔

اسے بندے اتارتے ہوئے دیکھ کر مجھے ایک بات یاد آگئی۔ ایک گذری ہوئی بات! جب آج ہی کی طرح میری جیب بالکل خالی تھی۔ کھانے کے لئے گھر میں کچھ بھی نہ تھا۔ میری ساری کوششیں ناکام رہی تھیں اور تھک ہار کر میں نے جمیلہ سے کہا تھا "جمیلہ آج صرف رات ہی کی بات نہیں یہ دن بھی ہمیں یونہی گذارنا ہوگا۔ بچے تو اب اتنی بھوک برداشت نہ کر سکیں گے۔ ممکن ہو تو اب تمہیں کچھ کوشش کرو ——" اور یہ کہتے ہوئے میری نگاہیں اسکے کانوں کے چمکتے ہوئے بندوں پر جم گئیں تھیں۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ میری نگاہوں کا مفہوم سمجھ گئی ہے —— لیکن اس نے جلدی سے کہا تھا "آپ جانتے ہیں میرے پاس تو ایک پیسہ بھی نہیں۔ محلے کی عورتوں میں کسی سے کچھ قرض لیا جا سکے یہ سوچنا بھی نہ چاہیئے! آپ ہی بتائیے میں کیا کر سکتی ہوں؟" اس کا یہ جواب سن کر میرے دل کو چوٹ لگی تھی۔ میری چاہا تھا کہ اسے صاف لفظوں میں بتا دوں کہ تم کیا کر سکتی ہو۔ لیکن اس وقت نہ جانے کیسے میری سوئی ہوئی خودداری بیدار ہو گئی تھی اور میں تلملا کر خاموش ہو گیا تھا لیکن آج وہی جمیلہ اپنی مرضی سے، اپنی خوشی سے اپنے بندے میرے حوالے کر رہی تھی کہ میں انہیں فروخت کر کے کنواں بابا کی نذر کر دوں، یا اسلئے تھا کہ وہ چاندی کے عوض سونے کے بندے پہننے کا یقین رکھتی تھی وہ سمجھتی تھی کہ بندوں کی یہ فروختگی اسکے افلاس کی آخری ہچکی ثابت ہوگی

اس نے بندے اتار کر میرے سامنے رکھ دیئے۔ اور میں نے وہ بندے اٹھا کر پھر اسکے کانوں میں ڈال دیئے وہ حیرت سے میرے منہ کو دیکھنے لگی میں نے کہا "یہ بندے ہمارے اس زمانے کی یادگار ہیں۔ انہیں اپنے ہی پاس رہنے دو!"

"پھر؟" وہ مجسم سوال بن گئی۔

"پھر کیا" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "اللہ والوں کے لئے روپیہ پیسہ مٹی سے بھی کم قیمت ہے۔ وہ تو انسان کا دل دیکھتے ہیں۔ ہمیں اپنی کوششوں سے جو کچھ بھی میسر آسکا ہے سچے دل سے ان کے سامنے رکھ دینگے" یہ میری بات اسے پسند نہ آئی لیکن پھر اس نے بندوں فروختگی کے لئے اصرار بھی نہیں کیا۔

وہ رات ہم نے صبح کے انتظار میں بے چینی سے گذاری جمیلہ سوئی ہی نہیں، اس نے منہ اندھیرے ہی مجھے اٹھا دیا۔ صبح ہی صبح گہری نیند سے اٹھائے جانے پر مجھے بری طرح جھنجھلاہٹ محسوس ہوئی لیکن یہ جھنجھلاہٹ سیم و زر کے خوش آیند تصور میں دب کر رہ گئی۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا۔ جلدی جلدی ناشتہ وغیرہ سے فراغت پائی اور جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ مجھے کنواں بابا کی قیام گاہ پہنچنے کی جلدی تھی۔ میں جانتا تھا کہ دن چڑھے وہاں حاجت مندوں کی بہت بھیڑ ہو جاتی ہے اور اپنے نمبر کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اس انتظار کی اذیت سے بچنے کے لئے میں دوسروں سے پہلے وہاں پہنچنا چاہتا تھا۔

میں جب وہاں پہنچا تو سورج مشرق کے دریچے سے [illegible] تھا "کمال شاہ" کے مزار کے [illegible] کنواں میں آ پہلے بھی دیکھ چکا تھا لیکن آج [illegible] بہار تھی ساری جگت پھولوں [illegible] ہوتا تھا کنویں

ہ کا انبار ہے ——— لیکن یہ پھول تازہ تھے یہ ایک
ہوئے حاجت مندوں کی عقیدت کے یادگار تھے یہ پھول
تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ کنوئیں پر پھول بھی چڑھانے ہونگے
سامنے سے مجھے دکھ ہو رہا تھا کہ میں کنوئیں پر پھول نہ چڑھا سکو
پھاٹک بند تھا۔ پھاٹک سے کچھ آگے پانچ نوجوان گیرا لباس
ہائے نیم دائرے کی شکل میں بیٹھے تھے۔ لکے بیچ میں کچھ لکڑیا
ں بیچ میں بیٹھا ہوا نوجوان تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد
دی ہانڈی میں سے کچھ نکال کر سلگتی ہوئی لکڑیوں پر کچھ
۔ دھویں کا مرغول بلند ہوتا اور ایک کیف آگیں خوشبو سے
عطر ہو جاتی۔ میں کچھ دیر تک کھڑا انھیں دیکھتا رہا سوچتا رہا
ں بابا کون ہو سکتا ہے؟ کیا بیچ میں بیٹھا ہوا نوجوان؟ لیکن
ے پر مجھے وہ جلالت و عظمت نہ ملی جو کنواں بابا جیسی شخصیت
ہ ذہن میں میرے دل میں گھر کر چکی تھی۔ میں وہاں سے واپس
۔ بڑے سے پیپل کے نیچے ایک نوجوان عورت اور ادھیڑ عمر کا
۔ یہ دونوں بھی میری طرح صاحب حاجت تھے اور حاجت
ر انھیں مجھ سے بھی پہلے کنواں بابا کے پاس کھینچ لائی تھی مرد
کنواں بابا کی نسبت پوچھا تو اس نے بتایا کہ کنواں بابا مزار
اور مزار کے آگے بیٹھے ہوئے پانچوں نوجوان ان کے چیلے ہیں
بتایا کہ ابھی ہمیں ایک گھنٹہ انتظار کرنا ہوگا تب کہیں باری
بابا کے سائیں کی نوبت آئے گی۔
رومال بچھا کر وہیں پر بیٹھ گیا۔ دیر تک ہم دونوں باتیں کرتے
نوں اور سادھوؤں کی باتیں بیتی اور بھوتوں کی باتیں۔
منگائی کی باتیں ——— دکھ اور درد کی باتیں اسباتوں
ب اسی وقت تھا جب ہمارے قریب بیٹھی ہوئی عورت جو
ں ہماری باتیں سن رہی تھی اچانک کھڑی ہو گئی۔ میرے
لے چونک کر میرے سامنے کی طرف دیکھا اور جلدی سے اٹھتے
شہر سے پھول والے آگئے۔ چلئے پھول خرید لیں ورنہ کچھ ہی دیر
ں کا اتنا ہجوم ہو جائے گا کہ پھر پھول نہ مل سکیں گے میں
لیکن میرے قدم آگے نہ بڑھ سکے۔ پھول خریدنے کیلئے

پیسوں کی ضرورت تھی اور میری جیب میں کل ایک ہی روپیہ تھا۔ مجھے متامل دیکھ کر اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے تامل کی وجہ پوچھی تو مجھے بتانا پڑا کہ "پھول خریدنے کے لئے میرے پاس نہیں ہیں۔ میں گھر سے پیسے لے کر نہیں آیا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ کنوئیں پر پھول چڑھانے ہوں گے۔"

وہ مسکرا کر آگے بڑھ گیا مجھے محسوس ہوا کہ جیسے اس کی مسکراہٹ کہہ رہی تھی "دوست اصل بات کیوں چھپاتے ہو! لاعلمی کا بہانہ کیوں کرتے ہو۔ اقرار کیوں نہیں کر لیتے کہ تم مجھ سے بھی زیادہ مفلس ہو" اور میں ایک سرد آہ بھر کر وہیں بیٹھ گیا۔

عورت پھول خرید چکی تھی اور اب میرے پاس سے گیا ہوا مرد پھول خرید رہا تھا۔ دونوں پھول خرید چکے تو عورت مزار کی طرف بڑھ گئی اور مرد میرے پاس لوٹ آیا۔ میں سمجھا کہ وہ یہیں بیٹھ کر مجھ سے کچھ دیر باتیں کریگا۔ لیکن وہ مجھے بتانے آیا تھا کہ اب چلئے ہمیں مزار کے سامنے بیٹھنا چاہیئے کیونکہ شہر کی طرف سے کچھ عورتیں اور مرد ادھر آ رہے ہیں ہمیں اپنی جگہ پہلے سے محفوظ کر لینی چاہیئے! میں اٹھ کر اس کے ساتھ ہو لیا۔ وہ عورت ہم سے پہلے ہی اپنی جگہ بنا چکی تھی۔ اس کے ساتھ میرا ساتھی مرد بیٹھا۔ اور پھر میں نے اپنی جگہ محفوظ کر لی۔ کچھ ہی دیر میں چار پانچ عورتیں اور تین چار مرد اور آگئے۔ پھول والوں سے ان سبھوں نے پھول خریدے اور آکر ہمارے بعد قطار میں بیٹھ گئے۔

مزار کے آگے بیٹھے ہوئے پانچوں سادھوؤں میں سے اب چار کی نشستیں خالی تھیں بیچ میں بیٹھا ہوا سادھو اب بھی اپنی جگہ بیٹھا ہوا تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد سلگتی ہوئی لکڑیوں پر وہی خوشبودار چیز ڈالے جا رہا تھا جن سادھوؤں کی نشستیں خالی تھیں ان میں سے دو کنوئیں کی جگت کو باسی پھولوں سے صاف کر رہے تھے تاکہ ان کی جگہ تازہ پھول لے سکیں اور دو مزار کے اندر چلے گئے ——— یونہی کچھ دیر اور گذر گئی۔

کنوئیں کی جگت صاف ہو چکی تھی اور اب وہ دونوں سادھو مزار کے آہنی پھاٹک کے آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ آگ کے سامنے بیٹھا ہوا سادھو سلگتی ہوئی لکڑیوں پہ برابر وہی خوشبودار چیز ڈالے جا رہا تھا یکایک مزار کا آہنی پھاٹک پر کھل گیا، اندر گئے ہوئے دونوں سادھو

[illegible] کے سامنے بیٹھے ہوئے دونوں سادھوؤں [illegible] کے [illegible] طرف بیٹھ گیا اور دوسرا بائیں طرف! آگ کے قریب بیٹھے ہوئے [illegible] خوشبودار [illegible] مٹھی بھر کر ہانڈی سے نکالی اور سلگتی ہوئی لکڑیوں [illegible] پر ڈال دی۔ دھوئیں کا ایک بڑا سا مرغولا اٹھا اور ساری فضا تیز خوشبو کے [illegible] سے بوجھل ہو گئی۔

میں نے محسوس کیا کہ قطار میں بیٹھا ہوا ہر شخص اپنی جگہ پر بے چینی محسوس کر رہا ہے یہ بے چینی ویسی ہی ہے جیسی سینما کے ٹکٹ گھر کی کھڑکی کھلنے پر اس کے سامنے قطار میں کھڑے ہوئے سینما کے شائقین محسوس کرتے ہیں۔ مجھے بھی اپنے دل کی دھڑکنیں تیز محسوس ہوئیں اور میں بھی اپنی جگہ پر کچھ اور سنبھل بیٹھا۔

فضا پر چھائی ہوئی تیز خوشبو بتدریج کم ہو رہی تھی۔ سب سے آگے بیٹھی ہوئی عورت بے قراری سے پہلو بدل رہی تھی —— آگ کے قریب بیٹھا ہوا سادھو آنکھیں بند کئے کچھ پڑھ رہا تھا —— یکایک اس نے آنکھیں کھول دیں اور آگے بیٹھی ہوئی عورت کو اشارہ سے اپنے قریب بلایا وہ آہستہ سے اٹھی اور ادب و احترام سے چلتی ہوئی سادھو کے قریب پہنچ کر کھڑی ہو گئی۔ سادھو نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ اسی جگہ ہی سادھو کے قریب اکڑوں بیٹھ گئی۔ سادھو نے ایک گہری نظر اس کے سراپا پر ڈالی پھر آہستہ سے کچھ پوچھا عورت نے کچھ جواب دیا۔ لیکن آواز ہم تک نہ آ سکی سادھو نے ہانڈی میں ہاتھ ڈالا، دوسرے لمحے آگ سے دھوئیں کا ایک بڑا سا مرغولہ بلند ہو رہا تھا، اس نے ہاتھ سے ہوا دے کر دھوئیں کا رخ عورت کی طرف موڑ دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ دھوئیں میں نہا سی گئی۔ دھواں جب ہوا میں منتشر ہو گیا تو سادھو نے عورت سے کچھ کہا، وہ اٹھی اور مزار کے پھاٹک کی طرف چلی گئی۔ اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر پھاٹک کے سامنے بیٹھے ہوئے سادھوؤں میں سے ایک اٹھا اور اپنے ساتھ اسے مزار کے اندر لے گیا۔

میری منتظر نگاہیں مزار کے پھاٹک پر جمی تھیں۔ کوئی پانچ منٹ گذرے ہوں گے کہ وہ عورت اسی سادھو کے ساتھ مزار سے باہر نکلی سادھو اپنی پہلی جگہ پر بیٹھ گیا اور عورت کنوئیں کی طرف چلی گئی۔ کنوئیں کی [illegible] پر اس نے پھول چڑھائے۔ کنوئیں میں کچھ سکے ڈالے۔ ایک لوٹا پانی [illegible] شہر کی طرف روانہ ہو گئی۔ آگ کے قریب بیٹھے ہوئے سادھو نے

اب میرے آگے بیٹھے ہوئے مرد کو اشارہ کیا وہ جب اٹھ کر سادھو کے قریب پہنچا تو سادھو نے اسے بھی بیٹھنے کو کہا۔ کچھ پوچھا اور پھر اسے [illegible] کے غسل دیئے سادھو نے عورت کو دھوئیں کا ایک غسل دیا تھا لیکن اسے دھوئیں کے دو غسل دیئے اور پھر مزار کے اندر جانے کی اجازت دیدی۔ پھاٹک کے آگے بیٹھے ہوئے سادھوؤں میں سے ایک اٹھا اور اسے ساتھ لے کر مزار کے اندر چلا گیا۔

اس مرد کے نکلنے کے بعد اب میری باری تھی، اور اس احساس سے میں اپنے اندر ایک عجیب بے چینی ایک اضطراب! محسوس کر رہا تھا اشتیاق و انتظار کے ملے جلے جذبات نے مجھ پر کپکپی سی طاری کر دی تھی خوش آئند تصور اس کپکپی میں اضافہ کر رہا تھا —— میں جلدی جلدی اپنے ذہن میں الفاظ کے گلدستے بنا اور بگاڑ رہا تھا کہ صاحب کمال بزرگ کے سامنے اپنی مراد کچھ ایسے موثر الفاظ میں بیان کروں کہ وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ میرے لئے سراپا رحم و کرم بن جائیں لیکن جذبات میں سکون نہ ہونے کی وجہ سے الفاظ کے انتخاب میں مجھے اپنے ذہن پر اعتماد نہیں رہا تھا۔ ایک لمحہ پہلے جو الفاظ منتخب کرتا دوسرے لمحہ انہیں خود ہی رد کر دیتا —— گذرنے والا ہر لمحہ میرے اضطراب میں اضافہ کر رہا تھا۔ میری بے چین نگاہیں مزار کے پھاٹک پر جمی تھیں۔ اسی کیفیت میں پانچ منٹ گذر گئے۔ اندر گیا ہوا مرد اپنے ساتھی سادھو کے ساتھ مزار سے باہر نکلا اور کنوئیں کی طرف چلا گیا۔ اس کا ساتھی سادھو اپنی پہلی جگہ پر بیٹھ گیا۔

آگ کے قریب بیٹھے ہوئے سادھو نے میری طرف دیکھا، مجھے اشارہ سے اپنے قریب بلایا۔ میں پہلے ہی سے پر تول رہا تھا اشارہ پاتے ہی اسکے پاس جا پہنچا، اس نے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میں اس کے قریب ہی بیٹھ گیا وہ میرے چہرے کو گہری نظر سے دیکھتے ہوئے آہستہ سے بولا —— [illegible] کو حاضر و ناظر جان کر سچے دل سے اپنی مراد کا اظہار کر [illegible]

میں نے [illegible] کی کہ [illegible] کر کہنا شروع کیا: کم علم انسان ہوں۔ مفلسی اور تنگدستی [illegible] پریشان ہوں [illegible] چاہتا ہوں۔ [illegible] سے خدا مجھے اتنی

بس ... کی ضرورت نہیں اس سے ... [illegible]
... کیا ... مجھے خاموش ہونا پڑا۔
... چہرے پہ نظریں جماتے ہوئے بولا "اللہ کے خاص
... جانے سے پہلے اپنا من پاک کر لینا ضروری ہے۔ مگر کسے لئے
... بھی اپنا من پاک کرنا ہوگا"
... ت سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ وہ مسکرایا۔ بولا "گھبراؤ نہ
... للہ کے فضل سے یہ کٹھن کام بھی ابھی ہو جاتا ہے ——"
... کی سانس لی —— اس نے دوسری طرف رکھی
... تھ ڈال کر مٹھی بھری پھر ہاتھ ہنڈی سے نکال کر بند مٹھی
... دل دی —— اس کے ہاتھ میں کسی کتھئی رنگت
... چھوٹے ٹکڑے تھے —— میں انھیں غور
... س نے مٹھی بند کر لی۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "یہ کوئی
... بہت مقدس لکڑی ہے۔ خدا کے حکم سے جب آدم
... اس دنیا میں آئے ہیں تو انھوں نے اسی درخت کے
... ت کی چھال میں پرد کر اپنی ستر پوشی کی تھی۔ ان کے
... ن کے لمس کی برکت سے خدا نے اس درخت کی لکڑی
... کے ساتھ تھا یہ صفت بخشی ہے کہ کیسا ہی گنہگار کیوں
... سے غسل کر کے اس طرح پاک پاکیزہ ہو جاتا ہے جیسے اس
دوبارہ جنم لیا ہو" میرا دل چاہا کہ جھک کر اس متبرک لکڑی
... لگا دوں۔ لے عقیدت کا بوسہ دوں، لیکن سادھو کی
... میں انبار تعظیم میں قدرے ختم ہو کر رہ گیا۔
... ہوئے ہاتھ آگ کے قریب لے جا کر وہ ٹکڑے آگ پر ڈال
... کے دیا اس سے مجھے اپنا دماغ بوجھل ہوتا محسوس ہوا اور
... دھوئیں کا رخ میری طرف ہوا تو اس دھوئیں میں ڈوب کر مجھے
... لیے بڑی ہلکی پھلکی محسوس ہوئی۔ اور جی [illegible]
... سادھو نے [illegible] غسل دیجئے
[illegible]

جانے والے مرد کو وہ غسل دیتے، لیکن مجھے پاک کرنے کے لئے اسے ایک نہیں، تین غسل دینا پڑے! ۔ قطار میں بیٹھے ہوئے لوگ میری نسبت نہ جانے کیا کچھ سوچ رہے ہوں گے؟ اس احساس سے مجھے دکھ بھی ہوا اور ندامت بھی، لیکن پھر میں نے اپنے دل کو اس خیال سے تسلی دے لی کہ کچھ بھی ہو اب تو میں سارے گناہوں سے پاک ہوں ——
ایک نوزائیدہ بچے کی طرح!

میں جب پھاٹک کے قریب پہنچا تو وہاں بیٹھے ہوئے سادھوؤں میں سے ایک اٹھ کر میرے ساتھ ہو لیا۔ آج سے پہلے مجھے اس مزار کے اندر جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ پھاٹک سے اندر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ اصل مزار اب سامنے ہے اور جس پھاٹک سے گزر کر اب میں اندر آیا ہوں وہ مزار کا نہیں بلکہ اسکے گرد کھنچی ہوئی چار دیواری کا پھاٹک ہے مزار کا بوسیدہ قبہ اب میری نظروں کے سامنے تھا۔ اس کے اندر داخل ہونے کے لئے قبے کے پچھم رخ پر ایک دروازہ تھا۔ دروازے کے آگے ایک پختہ، اونچا لیکن شکستہ سا چبوترہ تھا، اور اسی چبوترے پر ایک بزرگ پچھم کی طرف رخ اور مزار کی طرف پشت کئے بیٹھے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک لمبی تسبیح تھی اور آنکھیں بند تھیں۔ ہونٹوں کی جنبش بتا رہی تھی کہ وہ ذکرِ خدا میں مشغول ہیں۔ ان کی عمر چالیس سال کے قریب معلوم ہوتی تھی، چہرے کی رنگت سانولی اور بدن فربہ تھا۔ سیاہ رنگ کا ایک نادوختہ کپڑا وہ اپنے گرد (عام سادھوؤں کی طرح) آدھا پہنے اور آدھا اوڑھے تھے۔ گلے میں بڑے بڑے دانوں کی ایک مالا پڑی تھی۔ کالی دراز کاکلیں ان کے دونوں شانوں پر بکھری ہوئی تھیں۔ ان کاکلوں کی چھاؤں میں ان کا چہرہ بہت پرجلال اور پرعظمت معلوم ہو رہا تھا۔ سیاہ گھنیری داڑھی چہرے کی عظمت و جلال میں اضافہ کر رہی تھی۔ روشن پیشانی سے تقدس کا نور عیاں ہو کر سامنے کے چہرے کو تابناک بنا رہا تھا ——
[illegible] میں ان کی جو خیالی تصویر قائم کی تھی دیکھنے کے بعد میں انھیں اس سے بڑھ کر پا رہا تھا۔

ہم دونوں ان کے سامنے پہنچ کر [illegible]
[illegible]
[illegible]

نے آنکھیں کھولدیں ——— انہیں اپنی طرف متوجہ پاکر میں ذرا اور تعظیم میں خم ہوگیا۔ وہ میرے چہرے پر ایک گہری نظر ڈال کر پر رعب آواز میں بولے "جا بھاگ جا، فقیروں کے پاس دولت کی بھیک مانگنے آیا ہے" میں سر سے پاؤں تک لرز گیا۔ اللہ رے رعونت، یہ روشن ضمیری میں گھبرا کر جلدی سے دونوں ہاتھ جوڑے اور گڑگڑا کر کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ میرے ساتھ آئے ہوئے سادھو نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ کوئی ایک منٹ تک میں اسی طرح ہاتھ جوڑے خاموش رہا ———

یک لخت ان کے پر جلال چہرے پر مسکراہٹ کے نقوش ابھر آئے، اور پھر یہ نقوش گہرے ہوتے گئے۔ انہیں مسکراتے دیکھ کر میرے بے طرح دھڑکتے ہوئے دل کو قدرے سکون ہوا۔ مسکراتے ہوئے انہوں نے نظریں اٹھائیں اور میری نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر پوچھا ———

"دولت پاکر تو اس دولت کو کیا کرے گا"

میں پہلے ہی سے مرعوب تھا اس اچانک سوال سے بالکل بوکھلا گیا۔ میں نے نظریں جھکالیں اور اسی طرح ہاتھ جوڑے لرزتی آواز میں کہا "میں اس دولت کو نیک کاموں میں خرچ کردوں گا ——— مسجد، کنوئیں بنواؤں گا، خدا کے نام پر خیرات کروں گا.... اس مزار کی مرمت...."

"خاموش" انہوں نے مجھے ڈانٹا اور میں سہم کر خاموش ہوگیا میرا سارا بدن کانپ رہا تھا۔ میرے ساتھ آئے ہوئے نوجوان سادھو کو شاید مجھ پر رحم آگیا۔ وہ آگے بڑھا اور ہاتھ جوڑ کر بولا ——— "گرو آپ کے رعب جلال سے اس کے حواس درست نہیں ہیں ——— یہ بہت دکھی انسان ہے اس پر رحم کیجئے گرو!"

کنواں بابا نے ایک حقارت بھری نظر مجھ پر ڈالی، اور بولے ——— "جھوٹ بولنا بہت بڑا گناہ ہے، اور پھر فقیروں کے سامنے! سچ بتا! کیا تو دولت اس لئے نہیں چاہتا کہ اپنی زندگی کو خوشگوار بنائے۔ کیا روپیہ تجھے اس لئے درکار نہیں کہ تو اس سے دنیا کا عیش و آرام خریدے؟ بول"

میرے حواس پوری طرح میرا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ اقرار میں صرف سر جھکا دیا۔ اور کنواں بابا کو مجھ پر میری حالت پر رحم آگیا۔ ان کے چہرے پر شفقت کی جھلک اور لہجے میں نرمی آگئی۔ متانت سے بولے "وعدہ کر کہ جو دولت تجھے ملے گی، اس میں کی ایک پائی بھی کسی ناجائز کام میں خرچ نہ کرے گا خدا کی خوشنودی کا ہر وقت خیال رکھے گا"

میں نے لرزتی ہوئی آواز میں اقرار کیا کہ جو دولت مجھے ملے گی اسے ناجائز کاموں پر ہرگز خرچ نہ کروں گا۔ خدا کی خوشنودی کا ہمیشہ خیال رکھوں گا۔ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر کہا ——— "جا تیری خواہش......"

یکایک باہر سے شور وغل کی آوازیں آئیں۔ میں اور میرے قریب کھڑا ہوا سادھو چونک کر پیچھے پھاٹک کی طرف دیکھنے لگے ——— پولس کے بہت سے سپاہی ہاتھوں میں بندوقیں لئے ہوئے اندر آرہے تھے۔ میرے قریب کھڑا ہوا سادھو اچھل کر چبوترے پر چڑھ گیا میں گھبرا کر ایک طرف سرک گیا۔ "کنواں بابا" بجلی کی سی سرعت سے اپنی جگہ سے اٹھے۔ اپنے نیچے بچھا ہوا بوریا الٹ کر انہوں نے کچھ کاغذات اٹھائے اور انہیں قریب ہی دہکتی ہوئی آگ میں ڈال دیا ———

دوسرے لمحہ وہ معہ اپنے نوجوان چیلے کے پولس کی گرفت میں تھے۔ میں خوف سے کانپ رہا تھا۔ خیریت گذری کہ ان سپاہیوں میں ایک میرا شناسا تھا ورنہ دو ایک دن تو مجھے بھی حوالات کی ہوا کھانی پڑتی۔

کنواں بابا اور ان کے پانچوں چیلے گرفتار ہو چکے تھے ——— باہر حاجتمندوں کی قطار ٹوٹ چکی تھی۔ صرف کچھ لوگ رہ گئے تھے باقی منتشر ہو گئے تھے جو رہ گئے تھے ان میں کچھ پولیس کے خلاف بیزاری کا اظہار کر رہے تھے، کچھ اس گرفتاری پر سنجیدگی سے غور رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ پولیس کی مداخلت بلاوجہ نہیں ہو سکتی۔ دوسرے دن صبح کے تازہ اخبار میں یہ انکشاف پڑھ کر ہر شخص حیرت زدہ ہو گیا کہ کنواں بابا اور ان کے پانچوں چیلے دراصل غیرملکی جاسوس ہیں اور انہوں نے اپنی حرکتوں پر پردہ ڈالے رکھنے کے لئے سادھوؤں کا بھیس بنایا ہوا ہے۔

اور میں سوچتا ہوں، اگر وہ صاحب کمال نہ تھے تو پھر خرید کے ہاں بچہ...... میرے عطیے اور چند بیماروں کی شفایابی میرے کچھ کہے بغیر میری دلی مراد کا خود سے اظہار، یہ روشن ضمیری یہ سب کچھ کیا تھی؟ لیکن لوگوں کا کہنا ہے کہ خرید کے ہاں ہونے والے بچے

تکا کوئی تعلق نہیں وہ بچہ بہت ہی تھا اس لئے سمجھا بیا لڑکا
سلسلے میں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ عقیدت کا ثمرہ تھا،
زین کے پانی میں کچھ ایسے اجزاء ملا دیئے گئے تھے جو یہ تمام
کا کام دیتے ہیں لیکن کامریڈ نوجوان ان کی روشن ضمیری کی
ہے۔ آگ کے قریب بیٹھا ہوا سادھو ہر حاجت مند سے اس
ر پھر اسے دھوئیں کے غسل دیتا تھا۔ مراد کے اظہار کا راز ان
میں پوشیدہ تھا۔ پھاٹک کے آگے بیٹھے ہوئے اس کے
راز کو جانتے تھے۔ ہر سادھو سے چند مرادیں منسوب
تعداد سے وہ دو سمجھ جاتے تھے کہ آنے والا شکار ان میں
ہے اور اس کی کیا مراد ہے۔ اپنے حصے کا شکار لے کر ہر
تھا آنے والے کے تئیں اپنا آدمی دیکھ کر وہ سمجھ جاتے تھے
مرادوں میں سے کوئی ایک مراد رکھتا ہے جو ان کے
منسوب ہیں۔ اور وہ چیلا اپنے فرضی گرد کے سامنے ہر مراد
ملنگ کوئی مخصوص اشارہ رکھتا ہوگا۔

ے دن دوپہر کے قریب بازار میں ایک دکاندار سے میری
تے ہوئے میں نے دکاندار کو دہی فیروز کا دیا ہوا روپیہ
لہ کر روپیہ قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ روپیہ ناقص ہے
پوچھی تو اس نے بتایا کہ اصلی روپیہ میں تصویر کے گلے کے
نا ہے اور وہ اس میں نہیں ہے میں حیرت سے اس کا
سوچ رہا تھا کہ اصل اور نقل میں، کھرے اور کھوٹے
اتقص میں بعض اوقات کتنا غیر محسوس فرق ہوتا ہے
ر نقطے تک نہیں پہونچ سکتی +

(بشکریہ شمع)

بیدل یزدانی •

خورشیدِ سحر

اپنے آقاؤں کی بے ربطی تقریر نہ پوچھ — الجھے الجھے سے بیانات کی تفسیر نہ پوچھ
وقت کے جعفر و صادق کی سیاست کو سمجھ — دستِ تخریب پسِ پردۂ تعمیر نہ پوچھ
رہنما رہزن و قزاق کی صورت ہیں یہاں — وجہ ناکامی و محرومیٔ تدبیر نہ پوچھ
کن کی جانوں کو دعا دیتی ہے دن رات ندیم — قسمتِ روز و شبِ خطۂ کشمیر نہ پوچھ
رہنماؤں نے دیا ہے مجھے ہر گام فریب — بے خبر اب سببِ شومیٔ تقدیر نہ پوچھ

غالباً باقی ہے امیدِ کرم کی ان سے !
کیوں ہے بیداریٔ احساس میں تاخیر نہ پوچھ

سرد کیوں پڑ گیا ہر حوصلۂ ذوقِ جہاد — زنگ خوردہ ہے کیوں اسلاف کی شمشیر نہ پوچھ
کس طرح اٹھتی ہے مکار کے چہرے سے نقاب — کس طرح ہوتی ہے اسرار کی تشہیر نہ پوچھ

"جھکے رہتے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے"
اختیارات کے بیروں میں ہے زنجیر نہ پوچھ

کیوں سمجھنے لگے افرادِ حکومت آخر — خطۂ پاک کو اپنے لئے جاگیر نہ پوچھ
ہم نے ہاتھوں میں "انا رامی" کے جو دیدی ہو کو — ہم سے کیوں ہو گئی دانستہ تقصیر نہ پوچھ
روح افزا تھی اگر صبح تو پر کیف تھی شام — سامنے آ گئی کس دور کی تصویر نہ پوچھ
قصرِ زریں کی اداسی کا سبب آپ سمجھ — میرے اک نالۂ خاموش کی تاثیر نہ پوچھ
آتشِ فقر سے ملتِ مجبور بھی دیکھ — خاک کس طرح سے ہو جاتی ہے اکسیر نہ پوچھ

قید میں رہ کے بھی تبلیغ سے غافل نہ رہے
ایسے دیوانۂ ہشیار کی توقیر نہ — پوچھ

مسکراتی ہے پسِ پردۂ شب صبحِ جمیل — میرے اک خواب پر الزام کی تعبیر نہ پوچھ

للہ الحمد کہ خورشیدِ سحر پیدا شد
بنگر بجلیِ ولگیرِ اثر پیدا شد

مشیر علی بحری آبادی

ایک خط

بھئی احمد کیا بتاؤں تمہارا خط آئے ہوئے کتنے دن ہو گئے کہ ... کب آیا تھا اور جب زیادہ غور کرتا ہوں تو فلسفی کی طرح اس ... جانتا ہوں کہ آیا بھی تھا یا نہیں۔ اور اگر آیا تھا تو کیوں اور اگر نہیں آیا ... —— اچھا جانے دو "کیوں" کا گورکھ دھندا کچھ ایسا ہے کہ ... فلسفی جب اللہ میاں کو گھسیٹ لاتا ہے تو مشکل ہی سے انھیں ...، پھر یہاں تو معاملہ تمہارے خط کا ہے جس کی بساط ہی کیا، ... تو پھر بساط ہی ہے۔ شطرنج کی بھی بساط ہو سکتی ہے اور دنیا —— لیکن لوگ جسے بساط عالم کہتے ہیں وہ بھی ... شطرنج کی بساط ہی ہے —— جہانگیر اور نورجہاں بیٹھ کر لونڈی غلاموں کو ۳۲ گھر اور رنگ کی سیدھ میں چلاتے تھے ... آئزن ہاور صاحب اور مسٹر —— کیا نام ہے ... پالن ہارکا —— تو وہ دونوں بڑے آمنے سامنے بیٹھ کر ہمارے تمہارے جیسے سینکڑوں بلکہ لاکھوں کروڑوں آدمیوں ... رنگ کی سیدھ میں کٹاتے ہیں جس طرف سے بھی ان پر غصہ پڑتا ہے ادھر پیادوں کو کٹا دیتے ہیں۔ اور خود اسی طرح —— کرملین ... اور ... کے ... میں رہتے ہیں معاف کرنا میں ... نکل گیا ... اپنے ملک کا ... ہے ... —— تم کو تو یہ لکھنا چاہیے تھا۔ لیکن تم جانو ہمارے ... —— ... [illegible]

اور بڑھاپے میں پنشن دے گی" —— کیا بکے جا رہا ہے کچھ نہ سمجھو ——

کیوں کہ دنیا کی سب خرابیوں کی جڑ یہ سمجھنا سمجھانا ہی تو ہے وہ کیوں، ہمارے جنرل تھیما کو کوریا میں جا کر قیدیوں کو سمجھانا پڑتا اور جب لوگ یہ سمجھتے تو کبھی کمیشن کے ممبر کو کرسی اور سمجھنے والے کو گولی کھانا پڑتی —— اور نہیں تو کیا سمجھنا سمجھانا کوئی معمولی بات ہے اور اگر تم بات ہی پکڑتے ہو تو پکڑتے رہو۔ اس سے ہوتا ہی کیا ہے ہمارے بڑے بڑے قائدین ایک دوسرے کی باتوں کو تمام عمر پکڑتے رہتے ہیں لیکن نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ کوئی بات پکڑے بیٹھا رہتا ہے اور کہنے والا کر گزرتا ہے —— تو معلوم ہوا کہ اصل چیز کر گزرنا ہے کہنا بھی کچھ نہیں۔ کہنا سننا تو اس وقت ہوتا ہے جب ہیروشیما اور ناگاساکی مٹ چکے ہوتے ہیں۔ دیکھو نا جب جرمنی اور جاپان، روس اور امریکہ کر گزرے تب جا کر یو این او صاحبہ تشریف لائیں، اور ان کی تشریف آوری کو تو کچھ کہو نہیں۔ یہ اگر کبھی آئیں تو ان کی کوئی دوسری بہن آ جاتی ہیں۔ کیوں کہ اب کراچی اور دہلی ... سے دونوں واشنگٹن سے اتنے قریب ہیں کہ اگر واشنگٹن کی سڑکوں پر کوئی بچہ کھیلتے کھیلتے کھو جاتا ہے تو اس کے والدین بوکھلا جاتے ہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے ... مارکیٹ اور چاندنی چوک تک آ جاتے ہیں اور بچہ کی تلاش میں وہ ... ایسے ہاتھ ہوتے ہیں کہ وہ انھیں گلیوں میں راستہ بھول جاتے ہیں اور پھر ان کی تلاش میں ایک کمیشن بھی آ دھمکتا ہے۔ اور پھر اس کو ڈھونڈنے کے لیے ایک دوسرا کمیشن، پھر تیسرا —— پھر —— مگر چھوڑو یہ سب کمیشن وپیشن کی بات کہ —— نہیں کمیشن ایجنٹ اور تم ... کی ... تفسیر ... تمہارے ... کمیشن کی بات [illegible]

نہیں چاہیئے ورنہ دونوں میں لڑائی ہو جاتی ہے ——— مگر یہ بات اب میں کیوں کہوں۔ یہ تو علامہ راشد الخیری کے زمانہ کی بات ہے جب وہ ان تمام نوبیاہتا جوڑوں کو جائز ثابت کرنے کے لئے ایسی توجیہات کیا کرتے تھے۔ اب تو زمانہ اس کا ہے کہ آگے لے کر مزید جاؤ ——— ورنہ پھر "خاندانی منصوبہ بندی" (Family Planning) یا برتھ کنٹرول پر عمل کرو۔ کیوں کہ "جائے تنگ است و مردماں بسیار" اتنا تو یاد ہی ہوگا کہ جائے تنگ است قسم کی بات اکثر سعدی چچا کہا کرتے تھے اس لئے ہم فرض کرتے ہیں کہ سعدی چچا ہی نے یہ کہا ہوگا۔ اور آخر فرض کرنے میں خرابی ہی کیا ہے۔ مفروضہ پر تو پوری دنیا قائم ہے، ورنہ تم ہی بتاؤ جیومیٹری کے نقطہ اور لائن کا ثبوت کس طرح دیا جا سکتا ہے، بھلا وہ نقطہ کونسا ہوگا جس میں لمبائی۔ چوڑائی۔ اونچائی۔ موٹائی سب کچھ رکھنے کے بعد بھی کچھ نہیں رکھتا ——— تو پھر ہم جب کہتے ہیں کہ اللہ میاں بھی ہیں دیکھتے۔ نہ اونچے ہیں نہ نیچے۔ نہ چوڑے ہیں نہ پتلے.....

لیکن وہ ہیں ——— ان کے نہ ہاتھ ہیں نہ پیر ———

نہ وہ کھاتے ہیں نہ پیتے ——— نہ وہ اوڑھتے ہیں نہ پہنتے ———

لیکن "وما رمیت ولکن اللہ رمیٰ" اور "کنت جاشعًا" والی حدیث کے مطابق ان کے ہاتھ بھی ہیں، اور پیر بھی ——— ان کے آنکھ نہیں لیکن وہ دیکھتے ہیں کان نہیں لیکن وہ سنتے ہیں، سمیع بھی ہیں علیم بھی ——— بصیر بھی ہیں اور خبیر بھی ——— !! تو آخر لوگ ناک بھوں کیوں چڑھاتے ہیں، اسے سترھویں صدی عیسوی کا فلسفہ کیوں بناتے ہیں؟ اسے قبل مسیح کی بات کیوں کہتے ہیں؟ تم ہی بتاؤ جیومیٹری کا نقطہ فرض کیا جا سکتا ہے لیکن اللہ میاں کو ماننے میں تکلیف ہوتی ہے ! ———

ہاں ٹھیک ہے تکلیف ہونی بھی چاہیئے ——— جیومیٹری کا نقطہ تم سے کچھ مطالبہ تھوڑے ہی کرتا ہے لیکن اللہ میاں تو مطالبہ کرتے ہیں۔ وہ صرف اس لئے تھوڑی ہی ہیں کہ انھیں مان کر ان سے ایک لائن کھینچ لی جائے ——— انکے ماننے کا مطلب تو یہ ہوا کہ خود اپنے کو سپرد کر دو۔ وہ تم سے ایک لائن جدھر چاہیں گے کھینچ دیں گے——— کتنا بڑا فرق ہو گیا ان دونوں میں ——— ایک جگہ ایک چیز ملتی ہے اور ایک جگہ دینی پڑتی ہے ——— خود اپنے کو سپرد کرنا پڑتا ہے...

اور یہی تو انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے کہ وہ اپنے کو کسی کے سپرد نہیں کر سکتا ہر شخص صرف اپنی عقل پر اعتماد کرتا ہے اور اپنے فیصلہ کو آخری فیصلہ سمجھتا ہے اور اپنے سے زیادہ جاننے والے پر اسے ٹھونسنے کی کوشش کرتا ہے پھر جانتے ہو اس کا انجام کیا ہوتا ہے ———

لاٹھی، ڈنڈے، آنسو گیس، گولی اور پھر ساٹھ گھنٹے کی قید محض ! اس سے زیادہ تفصیل کا یارا نہیں کیوں کہ ؎

اگر یک سرِ موئے برتر پرم
فروغِ تجلی بسوزد پرم

تم کہو گے تمہارے "پر" کہاں ہیں جو فروغِ تجلی سے ڈرو ——— ہو ٹھیک ہے لیکن میاں اس عالم رنگ و بو میں "پر دار" ہے کون ہے بھی ہیں۔ سب کے سب بے پر اڑنے اور اڑانے کی کوشش کرتے ہیں، پر دار اگر ہوتے تو پردہ ہی کیوں اٹھا دیتے، معاف کرنا "یہ قطع بریدی" آپڑی ہے سخن گسترانہ بات ! ——— ورنہ میں کسی متعین شخصیت کے بارے میں نہیں کہتا کہ اس نے پردہ کیوں اتارا۔ اس کی چیز تھی۔ جب تم اپنی مرضی سے عمل کر سکتے ہو تو اسے بھی اپنی رائے پر عمل کرنے کا حق ہے ——— میاں جب پوری دنیا نے انسانیت کا پردہ چاک کر ڈالا ہے جو انمول تھا شرافت کی چادر پھاڑ پھینکی ہے جس کی کوئی قیمت نہیں لگائی جا سکتی تھی تو یہ صرف "صنف نازک" کا پردہ جو شاید آٹھ یا دس گز ——— کسی درزی سے صحیح پیمائش معلوم کر لینا ——— لٹھے میں بن جاتا ہے۔ مگر یار یہ لٹھے صاحب بھی خوب جیدار دل نکلے کہاں دبائے گئے اور کہاں ابھرے ——— اچھا کیا عورتوں نے انھیں اپنے رخ زیبا سے ہٹا دیا کوئی بات تھی کہ ایک مسلمان عورت کے سر پر لٹھے صاحب سوار رہیں اور وہ بھی خاص "الجمہوریۃ الاسلامیہ" کی شاہراہوں پر ——— اگرچہ بے چاری کنیز خانہ تم شمع خانہ ہی کہہ کر اس کی تسلی کرو ——— کو اب بھی سواروں سے چھٹی نہ ملی۔ لٹھے صاحب اترنے تو ایک دوسرے صاحب آ بیٹھے....... اوہ .... اوہ صاحبہ سوار ہو گئیں اس پر غلط فہمی ہے اپنی آزادی کی ——— "ہم آزاد ہیں" تمام بیڑیاں کاٹ ڈالیں۔ تمام پابندیاں مٹا دیں" ——— [illegible]

دالی تو ... [illegible]

سنے پر ... [illegible]

... کو کاٹ ... ——— آکاڑ نے بھی ...

کہا کہ ... کی طرح گردش میں ہے ... گال ...

جائے ———

... گردش میں ہیں سات آسماں

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

ہی نہیں ہے ——— ارے بھئی سات آسماں
کا قلمی نام (Pen name) ہے۔ تمہارے ...
(Pen name) کا فیشن رائج ہو چکا ہے۔ لوگ اپنے اصلی نام سے
... میں مضمون لکھتے ہیں یا نہیں لکھتے ہوں لیکن (Pen name
سے اسلامی خیالات کی تردید میں مضمون ضرور لکھتے ہیں تاکہ مند
کی پہلی تاریخ کو "عالم بالا" سے معاوضہ وصول کرتے وقت
——— تو یہ معلوم ہوا کہ سب کام معاوضہ کے لئے
لیکن سوچو تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ Pen name
کے بعد بھی کچھ نقد معاوضہ نہیں ملا۔ ملا تو۔ سود ن کے
ہے تو ادھار کسے کہتے ہیں۔ ادھار ہی تو ہے جس میں قیمت مدت
پڑے۔ پھر اللہ میاں کے یہاں سے جو معاوضہ ملنے والا ہے
——— نو نقد نہ تیرہ ادھار ——— کیوں کہتے
ہیں کر دینے کا وعدہ کرتے ہیں ——— ... دن
... لگے ... تنقید و تبصرہ کرنے لگیں ... لوگ بھی
ے عجیب ... تھا ——— اسی دن ...
... [illegible]

ایک ... کی بات ہے کہ ... صاحب ... [illegible]
... ہیں ... انگلی کاٹنے ہی ...
ڈاکٹر کہتے تھے کہ اگر انگلی نہ کاٹی جائے گی تو پورا جسم پھوڑے سے بھر جائے گا
اور انہوں نے ڈاکٹروں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ اور ڈاکٹروں نے بہت
صفائی سے کاٹ دیا ——— سر نہیں صرف دو انگلیاں پھر تو
اتنا خون نکلا کہ تمام ندی نالے خون سے لال ہو گئے۔ لوگوں نے سمجھا لال چڑھنے
والے لگ گئے۔ بغلیں بجنے لگیں کہ اب سرخ سویرا ہونے والا ہے۔ لیکن جب تھوڑی
دیر بعد خون بہہ کر سمندر میں چلا گیا اور ندی نالے پھر اپنے اصلی رنگ پر آ گئے
تب لوگوں نے کہا ——— ارے۔ تو کیا یہ سب لال رنگ کا دھوکا تھا۔
فریب نظر۔ شاعروں نے نظمیں لکھیں، مشاعرے ہوئے۔ مصرعہ طرح تھا۔

"خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا"

ادیبوں نے کہا صبح ہونے والی ہے۔ افق سے سرخی ہٹ گئی ہے نور
پھیلنے والا ہے ——— اور وہ پھیل رہا ہے دھیرے دھیرے۔ آہستہ
آہستہ ——— آسمان ہر طرف سے روشن ہو رہا ہے ——— بس انتظار کرو
سورج نکلنے ہی والا ہے۔ زیادہ دنوں تاریکی کی قید میں نہیں رہ سکتا۔

لو بھی بات کہاں سے چلی تھی اور کہاں پہنچ گئی۔ یہ کمبخت بات
ایسی ہی ہوتی ہے۔ کہاں سے چلتی ہے اور کہیں جا پہنچتی ہے ———
تم ہی کہو چلی تو تھی تمہارے خط سے اور آ پہنچی دوجہان تک ———
لیکن معلوم اب بھی نہ ہو کہ تمہارا خط آئے کتنے دن ہوئے اور کب آیا تھا
کیوں آیا تھا ——— اور آیا بھی تھا یا نہیں ——— لکھنے بیٹھا تھا
خط کا جواب اور معلوم نہیں کیا کیا لکھ گیا۔ خیر خدا کرے کچھ نہ سمجھو! سمجھ جاؤ گے
تو میرے جنون کا ثبوت ملے یا نہ ملے تمہاری ذمہ داریاں کچھ تھوڑی بہت بڑھ
ہی جائیں گی ——

"ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد"

(دشکر ...)

خریداران حضرات سے التماس ہے کہ وہ دفتر سے خط و کتابت
کرتے وقت اپنا خریداری نمبر لکھنا ہرگز نہ بھولیں۔ (منیجر)

ابن محمود

بات کہنے سے وہ تکرار تلک آپہونچے
ہم بھی صحرا سے اٹھے دار تلک آپہونچے

راہ دشوار تھی ہر چند پہ گرتے پڑتے
کے ترے سایۂ دیوار تلک آپہونچے

شامِ غربت کی قسم بردہ فروشوں کی قسم
یوسفاں مصر کے بازار تلک آپہونچے

ہاں بجا تھے کبھی پائل کی صدا پر مائل
لیکن اب تیغ کی جھنکار تلک آپہونچے

ہم تو اک دم سے توقع ہی اٹھا بیٹھے تھے
شکریہ آپ کا بیمار تلک آپہونچے

زندگی کر دو نہ یوں تنگ زمانے والو!
ورنہ ہم بھی ہیں کسی غار تلک آپہونچے

بس ترقی تھی یہی کام کی باتیں کرتے
تم تو ذکرِ لب و رخسار تلک آپہونچے

نہ بچا شک سے تردد سے خود اپنا بھی وجود!
ہائے اس درجہ وہ انکار تلک آپہونچے

ناتواں جان پہ اپنی یہ بلاؤں کا ہجوم
ہم بھی اب ضبط سے پیکار تلک آپہونچے

اب سے ہی کاشکہ اپنا وہ ہمیں کر لیتے
کب کے ہم عشق کے معیار تلک آپہونچے

(حلقۂ ادب اسلامی گورکھپور کی ایک نشست میں پڑھی گئی)

موتصوری ●

کالا صندوق

آج ایک ماہ بعد یہ صندوق کھلا ہے ۔ تو گھر کی گھٹی گھٹی فضا کچھ پتا چل
ہے ۔ اور سبھی آہیں بلند بانگ ہچکیوں اور آنسوؤں میں تحلیل ہو گئی ہیں
ہم جی نہیں رہے تھے ۔ صرف شرما رہے تھے ۔ ہمیں ایک دوسرے کی شکل دیکھ
نا تھی ۔ اپنے آپ سے حیا محسوس ہوتی تھی ۔ اٹھتے ، بیٹھتے ، سوتے جاگتے ظر
ارے دماغوں میں گونجا رہتا تھا کہ " آخر وہ کیوں چلی گئی ۔؟ " یقیناً ہم
ب کی خطا ہے ۔ " صرف میری خطا ہے ۔ " ہم چاروں اپنی اپنی جگہ صرف
ٹھہرا چکے تھے ۔ ایک دوسرے کے سامنے آتے ہی ہماری نظریں آپ سے آپ
ے ۔

ٹ ابا جان نے ڈھائی ہزار روپے کی پگڑی دے کر حاصل کیا ہے ۔ پگڑی کا
نہائی مکروہ فعل ہے لیکن چٹائیوں کے بے پردہ مکانوں کی زندگی شاید اس
دہ گناہ ہے ۔ شروع میں ہم نے بھی زیادہ مکروہ زندگی اختیار کی تھی ۔ لیکن
ئیوں کی جھری دار دیواریں تیز رفتار نسیم بنتی اور نسیم جھری سے ٹکرا ٹکرا کر
دہ ہو گئیں اور ہماری غلیظ گلی سے گزرنے والوں میں کھنکار کھنکار کر چلنے
گنگناتی ہوئی تکلیفوں کا دن بدن اضافہ ہوتا گیا ۔ تو ابا جان مائلہ اور
یکھتے ہوئے بھی شرمانے لگے ۔ اور کسی نہ کسی طرح انھوں نے اپنے سیٹھ سے
، قرض لے کر یہ فلیٹ حاصل کر لیا لیکن ادھر تیس دن سے ان کا یہ احساس
ید ہو گیا ہے ۔ کہ پگڑی دے کر مکان حاصل کر لینا ایک بدترین گناہ ہے ۔
نیست پر بھی نہیں [illegible] پہنچے تھا ۔

جان بتاتے ہیں کہ تیس دن وہ گئی ہے اس سے دو چار دن پہلے کالی رات
بستے جھگڑا ہوتا رہا تھا ۔ اماں دونوں کے جھگڑے میں اس دن پہلی بار
یدہ کی حمایت کی تھی ۔ جھگڑا شروع اس طرح ہوا تھا کہ مائلہ سعیدہ کو
[illegible] بنانا چاہتی تھی اور اپنے [illegible] کے جواز میں [illegible]
ائن کی مثالیں دی جا رہی تھی ۔ سعیدہ ان مسلمان خواتین کی
[illegible]

کہنا تھا کہ جب تک پوری قوم کی اخلاقی حالت درست نہ ہو عورتوں کے پردے کی پابندی
کو توڑنا ہی ایک سرے سے غلط ہے ۔ وہ کہتی تھی ۔ کہ قومی کردار کے دور تنزل میں اگر
عورتوں کی آزادی کا صحیح مقصد پورا ہو سکتا تو ولید ثانی کے عہد میں عرب کی صالح
اور تعلیم یافتہ عورتوں کا سر نہیں پھر گیا تھا کہ پردہ کی ایرانی رسم کو اپنا لیں ۔ اماں جان
نے سعیدہ کے خیالات کی تائید کی تھی اور اب وہ دونوں اپنے دلوں میں چور لئے بیٹھی تھیں
انہیں خطرہ تھا ۔ کہ اس دن انھوں نے کوئی بات ضرورت سے زیادہ تو نہیں کہہ دی تھی ۔

اور میں ——— مجھے کچھ پتہ نہیں ۔ کہ میں نے کیا کیا ہے پھر بھی میں اپنے آپ
کو مجرم محسوس کر رہا ہوں ۔ اور سچ پوچھئے تو لکڑی کا یہ کالا صندوق میں نے ہی کھلوایا
ہے ۔ سعیدہ کی سلائی کی تیلیاں کوئی ایسی زیادہ قیمتی چیز نہیں تھیں ۔ بازار سے دوسری
بھی خریدی جا سکتی تھیں لیکن میں نے زور دے کر یہ صندوق کھلوا دیا کہ شاید یہ تیلیاں
اس صندوق میں رکھی ہوں ۔ مائلہ سعیدہ کی بہت سی چیزیں اپنے صندوق میں سے نکال
کر دے دیا کرتی تھی ۔

لیکن زیادہ بہتر ہے کہ میں آپ کو شروع ہی سے ہر بات بتا دوں ۔ مائلہ ہماری
سگی بہن نہیں تھی ۔ ہماری سگی بہن تو نعیمہ آپا تھیں ابا جان اور اماں جان دونوں نعیمہ آپا
سے بے انتہا محبت کرتے تھے ان دنوں میری اور سعیدہ کی گھر میں کچھ ایسی زیادہ قدر
نہیں تھی ۔ البتہ خود نعیمہ آپا ہم دونوں کو بے حد عزیز رکھتی تھیں ۔ اماں جان اور ابا جان
کی محبت بھی ہم تک نعیمہ آپا کی وساطت ہی سے پہنچتی تھی ۔ نعیمہ آپا کی ایک لمحہ کی جدائی
بھی ہم لوگوں کے لئے برداشت سے باہر تھی ۔ لیکن ان کی شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد ان
کے شوہر کا تبادلہ جالندھر ہو گیا اور نعیمہ آپا ہم سے دور چلی گئیں ۔ پھر بھی وہ مہینے میں
کم از کم ایک بار جالندھر سے انبالہ ضرور آتی تھیں یا پھر ہم لوگ خود ہی جالندھر جا کر انہیں
دیکھ آتے تھے ۔

لیکن جب پنجاب کے [illegible] فسادات شروع ہوئے تو نعیمہ آپا کسی ایسی جگہ چلی
گئیں جہاں ان سے ملاقات کرنے کے لئے ہم میں سے کوئی ان کے پاس نہیں جا سکے ۔ یہ کہ ہم
[illegible]

امّاں جان نسیمہ آپا کے لئے بیقرار تھیں ابّا جان کی حالت بھی وحشیوں جیسی ہو رہی تھی لیکن سارے شہر میں آگ لگی ہوئی تھی، انبالہ سے لاہور تک بڑی سڑک کے دونوں طرف آگ لگی ہوئی تھی۔ اور اس آگ کو صرف ہمارے آنسو ٹھنڈا نہیں کر سکتے تھے۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح ہم لوگ لاہور پہنچ گئے۔

لاہور پہنچنے کے بعد بھی ہم نسیمہ آپا کی طرف سے ناامید نہیں ہوئے تھے ہم نے لاہور کا چپہ چپہ چھان مارا۔ مشرقی پنجاب کے ہر شہر سے مہاجروں کے قافلے لاہور پہنچ رہے تھے۔ ہم نے جالندھر سے آتے ہوئے ہر مہاجر سے کسی اچھی اطلاع کی آس لگائی۔ مہاجرین کے ہر کیمپ میں ہم ایک نئی توقع لے کر گئے... بازیافتہ خواتین کے ہر دفتر کی پوری پوری فہرستیں شروع سے آخر تک کئی کئی بار پڑھ ڈالیں۔ اور آخر کار جب ایک سال کی مسلسل دوڑ دھوپ کے بعد بھی ہمیں نسیمہ آپا اور ان کے شوہر کے بارے میں کہیں سے کوئی اطلاع نہیں مل سکی تو ہم لوگ بالکل مایوس ہو گئے.......... اور تب ہمیں بازیافتہ خواتین کے ایک کیمپ میں وہ مل گئیں۔

اس کے چہرے میں نسیمہ آپا جیسی کوئی چیز بھی نہیں تھی۔ لیکن اس کی طرف ایک بار دیکھتے ہی امّاں جان کے سینہ میں دبی ہوئی مامتا کی تمام چنگاریاں ایک دم سے روشن ہو گئیں۔ ابّا جان کو ان دنوں لاہور میں کراچی کے ایک سیٹھ کے یہاں نئی نئی ملازمت ملی تھی۔ اور ہم لوگ ان کے ہمراہ کراچی آنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اپنی اسی تلاش کو ایک آخری رنگ دینے کے لئے اس دن امّاں جان مجھے ساتھ لے کر آخری بار اس کیمپ میں گئی تھیں۔ مائدہ جنگلی خاتون کے قبضے سے ابھی ابھی نئی نئی برآمد کر کے یہاں لائی گئی تھی۔ امّاں جان کی تفتیش کے نتیجہ میں کیمپ کی کتنی ہی دوسری خواتین نے اپنی داستانِ مصیبت کا کوئی نہ کوئی ایک باب انہیں سنا دیا لیکن مائدہ نے امّاں جان سے کوئی بات نہیں کی۔ پھر بھی اس کی آنکھوں کے گرد کھنچے ہوئے سیاہ حلقوں میں کچھ اتنی عمیق گہرائیاں تھیں۔ کہ امّاں جان نے اس کے بارے میں کسی تفصیل میں گئے بغیر پتہ نہیں کس طرح اسے کیمپ سے حاصل کر لیا۔ اور جب ہم لوگ لاہور سے کراچی کی طرف روانہ ہوئے ہیں تو ہمارے خاندان میں نسیمہ آپا کی کمی کسی نہ کسی حد تک پوری ہو چکی تھی۔ اب ہم لوگ کبھی کبھی نسیمہ آپا کی یاد سے غافل ہو کر مسکرا بھی لیا کرتے تھے۔

کراچی پہنچنے کے بعد وہ ہم لوگوں سے رفتہ رفتہ اور بھی زیادہ مانوس ہو گئی۔ ہم سب نے بھی امّاں جان پر ... کہ اس کے سامنے کبھی اس کے ماضی کے بجھتے ہوئے زخم

کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی معصوم اور بے گناہ آنکھوں میں ایک بار پھر لاہور جیسی وحشت پھر نہ ... ہم میں جرأت نہیں تھی تو ہی اس نے کبھی اپنی سابقہ زندگی کے بارے میں خود سے کوئی لفظ کہا۔ اس کی ہر وقت اور ہر موقع پر بشاش نظر آنے کی کوشش ہی سے ظاہر تھا کہ وہ اپنے ماضی کا ہر باب بھولا جانا چاہتی ہے۔ اور ہرچند کہ اس کی آنکھوں کے گرد کھنچے ہوئے سیاہ حلقے ان تمام حادثات کا آئینہ تھے جو اس کی زندگی نے اسے عطا کر دیئے تھے پھر بھی ہم نے ان آئینوں میں کبھی زیادہ دور تک جھانکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

خاص طور سے وہ سعیدہ سے بہت زیادہ مانوس ہو گئی شروع شروع میں ہم نے ان دونوں کے درمیان کبھی کوئی جھگڑا ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ صبح کی اذان کے وقت وہ دونوں تقریباً ساتھ ہی ساتھ اٹھتی تھیں اور نماز اور تلاوتِ قرآن کے بعد صبح کا ناشتہ تیار کرنے میں مصروف ہو جاتی تھیں۔ دوپہر کا کھانا تیار کرنے کے بعد دن کا زیادہ وقت وہ دونوں ایک دوسرے کو اخلاقی کتابیں پڑھ کر سنانے یا سینے پرونے میں گزارتی تھیں۔ ان دونوں کی ہر وقت کی چہل اور معصوم شرارتوں میں ہمارے یہاں وقت کی آمد و رفت کا پتہ ہی نہیں چل پاتا تھا۔ اس زمانہ میں کتنی ہی بار میں نے ابّا جان کو بلا کسی سبب کے بھی مسکراتے دیکھا۔ اور کتنی ہی بار امّاں جان کی زبان سے سنا کہ اب انہیں نسیمہ کی طرف سے آنا جانا رہتا ہے۔

لیکن اس فلیٹ میں کیا ہے؟ یہاں آکر ہمارے ہنسنے اور مسکرانے کی قوتیں کیوں ختم ہو گئیں؟ سعیدہ کی بشاشت پر چڑچڑاپن اور بیزاری کیوں طاری ہو گئی؟ ابّا جان کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کس نے چھین لی؟ امّاں جان نسیمہ آپا کے لئے ایک بار پھر کیوں بے چین ہو اٹھیں؟ یہ سب کیوں کر ہو گیا؟ کیسے ہو گیا؟ مائدہ کی معصوم مسکراہٹیں بے باک قہقہوں میں کیوں بدل گئیں؟؟

یقیناً میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں نے [illegible] کچھ نہیں کیا۔ میں اسے پیار کرتا تھا۔ جیسے اور سب اسے پیار کرتے تھے۔ میں اس کی صورت میں نسیمہ آپا کو بھلانے کی کوشش کر رہا تھا اور سب بھی [illegible] کر رہے تھے۔ [illegible] جب وہ ابّا جان کو [illegible] کے لئے بلاتی تو ابّا جان اسے بیٹا بیٹا کہتے نہ تھکتے۔ امّی جان اس [illegible] پیار سے [illegible] ہاتھ پھیرتیں اور کبھی کبھی بے اختیار ہو کر [illegible] سعیدہ کبھی کبھی اس [illegible] قریب بیٹھی [illegible] ہوئے تھا

...یں اس بگڑنے کا ایک خدشہ تھا لیکن آنا ... ہی

پر اس فلیٹ میں ... تک اس نے کبھی مجھے کسی قسم کے شبہ میں مبتلا
ح نہیں دیا۔ کتنی ہی بار میں اس سے اور سعیدہ کو اپنے ہمراہ لے کر
ے نکلا۔ کتنی ہی بار گھر والوں کی عدم موجودگی میں میں نے اس سے
خ ہمیشہ ہی سے میرا سب سے زیادہ محبوب موضوع رہی ہے۔
ہ نے اسے دتی کے بُسے اجڑنے کے حالات سنائے۔ کتنی ہی
، قوالی ... اور سکینہ کی کہانیاں سنا کر میں نے اسے
۔ مجھے کبھی شبہ نہیں ہوا کہ وہ داستان سے زیادہ داستان گو
ہی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ کبھی اس کا بھی مشرقی پنجاب میں ایک
ہے کہ اس کا ایک بھائی بھی ہو۔
کاش اس فلیٹ میں صرف یہ ایک کمرہ ہوتا جسے ہم نے
پگڑی دیکر حاصل کیا ہے۔ اے کاش .....
مختصر سے سامان کے ساتھ جب ہم نے اس کمرے میں قدم
ے کمرے میں ایک فلمی ریکارڈ بج رہا تھا۔
ے تجھ سے کیا ہے پیار ....."
گ سامان کو قرینے سے رکھنے میں منہمک تھے۔ اور ہم میں
، اس آواز کی طرف کوئی خاص دھیان نہیں دیا۔ لیکن
ڈ ختم ہو گیا۔ اور ایک دوسری آواز آنے لگی۔
لر ہے تو بھی مجھ سے ....."
ن اور اماں جان اب بھی سامان کو الٹ پلٹ کر رہے
لے ... کی طرف دیکھا وہ ایک حیا آلود مسکراہٹ لیے
یہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سعیدہ کا چہرہ شرم کی وجہ
ر تھا۔ ... بھی شرما گئی۔ ... نے اپنی گردن نیچی
...

مس سلطانہ نے انتہائی اخلاق کے ساتھ کہا۔

"بیٹھے رہیے! اب آپ سے غیرت کس طرح چل سکے گی آخر ایک ہی فلیٹ میں رہنا ہے۔"

اور اسی وقت میرے دماغ کے کسی گوشے میں ایک الارم سا بجا۔ اپنی طبیعت پر جبر کر کے بمشکل صرف چند منٹ میں وہاں بیٹھ سکا۔

شام کے وقت جب میں کافی دیر تک ادھر ادھر ٹہلنے کے بعد فلیٹ میں واپس آیا تو اماں جان نے ان دونوں بہنوں کے اخلاق کی بیحد تعریف کی۔ انھوں نے ان کی قومی خدمات اور اس قدر آزادی پسند ہونے کے باوجود ان کی قوم اور وطن سے بے لوث محبت کو سراہتے ہوئے مجھے بتایا کہ وہ دونوں بہنیں کسی زنانہ کلب کی رکن ہیں۔ اور غریب مسلمان عورتوں کو ان کے گھر جا جا کر بلا معاوضہ پڑھنا لکھنا اور سینا پرونا وغیرہ سکھاتی ہیں۔ ماں نے بھی ان کے وسیع اخلاق کے بارے میں کافی کچھ کہا۔ لیکن پتہ نہیں کیوں خلاف معمول سعیدہ نے اس گفتگو میں کسی قسم کا حصہ نہیں لیا۔

چند ہی دن بعد ماں اپنی ان نئی سہیلیوں میں کافی گھل مل گئی۔ اب اس کے وقت کا ایک بڑا حصہ برابر والے کمرے میں گزرتا تھا۔ ساتھ ہی اس کے کردار نے بھی اب ایک نیا رنگ اختیار کرنا شروع کر دیا۔ اب اس کے ہونٹوں پر ہمیشہ طاری رہنے والے حیا آمیز تبسم میں چند بے باک قہقہے بھی شامل ہوتے جا رہے تھے۔ رات کے وقت دیر سے سونا اور فجر کی نماز کے وقت جاگنے کے بجائے دیر تک گرمی میں پلنگ پر پڑے رہنا اب اس کی عادت بنتا جا رہا تھا۔ تاریخی یا اخلاقی کہانیاں اب اس کے نزدیک کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتی تھیں لیکن وقتاً فوقتاً اس کے ہونٹوں کی حرکت سے صاف ظاہر ہو جاتا تھا کہ وہ دل ہی دل میں کسی فلمی گیت کی کڑی یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اور ایک بار جب میں فلیٹ سے باہر جانے کیلئے برابر والے کمرے کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ تو معاً اچانک میری نگاہ اس کے نیم وا دروازے کی طرف اٹھ گئی۔ اور میں نے سلطانہ کی کمر میں ... ہاتھ ڈالے کمرے کے ... فرش پر ... ... کرتے ہوئے دیکھا۔ اور ... ... اس ...

تھیں۔

"چپ چپ کرامت دیکھو جی بھنو جی۔۔ ہم کو نجر لگ جائیگی"

لیکن انتہا یہ نہیں تھی۔ انتہا یہ تھی کہ اسی رات کے وقت وہ مجھے انور اور سلطانہ کے ساتھ ایمپریس مارکیٹ کے قریب بلا وجہ ایک جگہ فٹ پاتھ پر کھڑی ہوئی ملی۔ اماں جان یا ابا جان کی طرف سے اس پر گھومنے پھرنے کے بارے میں کبھی کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی تھی۔ پھر بھی مجھے اس وقت اس کا انور اور سلطانہ کے ساتھ بلا وجہ بازار میں ایک جگہ رک کر کھڑا ہو جانا اور برقعہ کے نقاب کی جانب سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد لاپرواہ ہو جانا انتہائی ناگوار گزرا۔ اور اس سے زیادہ ناگوار مجھے یہ گزرا کہ اس نے میری خاموشی سے اپنے راستہ پر چلے جانے کی کوشش کے باوجود دوڑ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور کسی ہوٹل تک چل کر چائے پینے کی خواہش ظاہر کی۔ مجبوراً مجھے ان تینوں کے ساتھ کافی دیر تک قریب کے ہوٹل کے فیملی روم میں بیٹھا رہنا پڑا۔ اس ہوٹل کی تنہائی میں وہ ایک قدم اور آگے بڑھ گئی۔ اور آج پہلی بار اس نے مجھے سعیدہ کے دیئے ہوئے نام یعنی بھائی جان سے مخاطب کرنے کی بجائے بار بار میرا نام لیا۔

اس دن رات بھر مجھے نیند نہیں آسکی ابھی حال ہی میں ایک بڑی مناسب جگہ سے اس کے لئے پیغام آیا تھا۔ لڑکے والے انتہائی شریف تھے خود لڑکے نے اس کی سابقہ زندگی کے بارے میں تمام حالات معلوم کر لینے کے بعد اس سے شادی کر لینے کا اشتیاق ظاہر کیا تھا۔ اور ہم لوگوں نے بھی سعیدہ کے ذریعہ خود اس کی اپنی رائے معلوم کر لینے کے بعد اس رشتہ پر رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ لیکن آج اس نے بھائی جان کی بجائے مجھے میرے نام سے مخاطب کیا تھا۔ اور مجھے آج شام کا ایک ایک لمحہ ایک ایک بات ہر ایک چیز یاد رہی تھی۔ وہ اسکی نگاہوں کی لگاوٹ آمیز جنبیت جیسے وہ کسی کو نہیں جانتی لیکن ہر ایک کو پسند کرتی ہے۔ اور وہ اس کا عیسائیوں کے نچلے طبقہ کی عورتوں جیسا برتاؤ ۔۔۔ وہ کیا بنتی جا رہی ہے؟ اسے کچھ اور بننے سے کس طرح روکا جا سکتا ہے؟ اور میں ۔۔! کیا اب وہ کسی اتنی اونچی اور ترقی پسند سوسائٹی میں شامل ہو گئی ہے جہاں سے نیچے کی طرف نظر ڈالنے پر ہر بھائی محض مرد اور ہر مرد بھائی جان نظر آنے لگتا ہے [illegible]

اور صبح جب سعیدہ نے مجھے نماز پڑھنے کے لئے اٹھایا تو پہلا خیال میرے دماغ میں یہی آیا کہ اسے عائلہ سے ذرا الگ ہی الگ رہنے کی ہدایت کر دوں ورنہ بہت ممکن ہے کہ ایک دن میری یہ بہن بھی مجھے خائف اشتراکی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ اور میں اس کے پیار سے بھی محروم رہ جاؤں لیکن میں نے اس سے کچھ کہا نہیں۔ وہ خود ہی کافی سمجھدار ہے اور پھر عائلہ خود بھی تو ان دنوں اس کی طرف کچھ زیادہ راغب نہیں تھی۔ وہ دونوں یوں بھی ایک دوسرے سے دور ہوتی جا رہی تھیں۔

اور میں نے اماں جان یا ابا جان سے بھی کچھ نہیں کہا۔ میرا خیال تھا کہ ممکن ہے بات کے زیادہ آگے بڑھنے سے پہلے ہی عائلہ کی شادی ہو جائے اور اس کا شوہر جس کی شرافت اور ذہانت کے بارے میں ہم میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی جگہ اطمینان کر لیا تھا اسے راہ راست پر لے آئے ایسی صورت میں اماں جان یا ابا جان کو جو ویسے بھی ملکی لحاظ سے ان دنوں کچھ کچھ پریشان رہنے لگے تھے۔ بلا وجہ ایک نئی فکر میں مبتلا کرنا مجھے کچھ مناسب نہیں معلوم ہوا۔

میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ لیکن ایک دن خود اس نے ہی بات چھیڑ دی۔ ابا جان صبح کے ناشتہ سے فراغت حاصل کر کے اپنی ملازمت پر جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ کہ اس نے انھیں اپنے اسی انور اور سلطانہ والے کلب میں شامل ہو جانے کی خبر سنائی اور ساتھ ہی ان سے درخواست کی کہ وہ قوم کی بیٹیوں کی اصلاح اور خدمت کرنے کے لئے سعیدہ کو بھی اس کلب میں شامل ہونے کی اجازت دیدیں۔ ابا جان نے اس کی بات سنی، کچھ دیر تک ایک ہی جگہ خاموش کھڑے رہے۔ اور پھر بغیر کوئی جواب دئے باہر چلے گئے۔

کچھ دیر بعد میں خود بھی گھر سے باہر چلا آیا۔ مجھے اس دن ایک ملازمت کے انٹرویو میں شریک ہونا تھا۔ دوپہر کے وقت اس انٹرویو کی خبر لئے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا جب میں گھر کی طرف واپس ہوا تو وہ مجھے اپنی گلی کے سرے ہی پر مل گئی۔ انور اور سلطانہ آج بھی اس کے ساتھ تھیں اور آج ان کے ساتھ ایک شخص اور بھی تھا ۔۔۔ ایک مرد ۔۔!

مجھے دیکھتے ہی ان چاروں نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ مجھے [illegible] سے میرا تعارف

بتایا کہ وہ ایک زبردست قومی کارکن ہیں۔ اور پاکستانی
لے انتہائی خلوص دل سے حامی ہیں۔ کتنی ہی زنانہ تحریکوں
پرست ہیں۔ اور پاکستانی معاشرے کی اصلاح کے لئے
ماں ہیں۔ وغیرہ وغیرہ!

چند دن بعد میں نے سلیمان صاحب کو چند دوسری
دیکھا اور انور اور سلطانہ کو چند دوسرے سلیمان صاحبوں
ند مائلہ کو چند دوسری انور اور سلطاناؤں کے ساتھ دیکھا
تنہائی میں موقع پا کر میں نے اس سے پوچھا کہ آخر وہ
ورکیا ہیں وہ ترقی پسندی ہے جس کا غازہ وہ سعیدہ
نے کی کوشش کر رہی تھی۔

مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن میری آنکھوں میں آنکھیں
اس کی نگاہوں میں کوئی ایسی چیز تھی۔ کہ ایک لمحہ کے لئے
رہ گیا۔ بھوک ..... نشہ ..... گناہ ..... لیکن جلد ہی
ببار پھر اس کی جبلی معصومی عود کر آئی اور اس نے اپنی
یں نے اس کے رخساروں پر دو ننھی ننھی بوندیں لڑھکتی

ن؟" اس نے کہا۔

سے اگلے دن صبح جب ہم لوگ سیر کر لوٹے تو وہ گھر میں
زا اور سلطانہ اپنے کمرہ میں موجود تھیں اور ان کا گراموفون
رہا تھا۔

م کرنا جو آج ..... گاؤ خوشی کے گیت ....."
ن کی نغمہ ایک بار پھر پنجاب کے حادثات کا شکار
لوں تک آنسوؤں کا سیلاب امنڈ کر آیا۔ اور پھر جیم
نہ انتہائی مایوس نظروں سے میری طرف دیکھا اور میں نے
چھت سے لٹکتے ہوئے بلب پر جما دیں۔
ایک ماہ بعد میں نے امریکہ کے کرلمی کا یہ بڑا صندوق
یں سے فلمی ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی تصویریں نکلی ہیں
وہ نشتہ انعل سے بھرے ہوئے رسالے نکلے ہیں۔ اور
ہے۔ یہ خط اس نے بہن سے ہر ایک کے نام لکھا تھا۔

میری عزیز ماں، شفیق باپ، پر محبت بہن اور عزیز از جان بھائی!

"میں آج تم سب سے رخصت ہو رہی ہوں تمہاری دنیا میں
میں نے اپنی ماضی کی کتاب کا ایک ایک باب فراموش کر دیا تھا۔ میرے
ماں باپ بھائی بہن سارا خاندان پنجاب میں میری آنکھوں کے سامنے
ہلاک کر دیا گیا تھا۔ لیکن نئے ماں باپ اور نئے بھائی بہن پا کر میں نے
اپنے خاندان کی تباہی کا غم یکسر فراموش کر دیا تھا۔ میں نے وہ بھیانک باتیں
بھی فراموش کر دی تھیں جو کبھی پنجاب میں خدا کا قہر بن کر میرے اوپر نازل ہوئی
تھیں۔ لیکن تمہاری محبت نے میری برہنگی کو معصومیت کی جو چادر عطا کی
تھی۔ اسے مہذب سوسائٹی کے ترقی پسند اصولوں نے ایک بار پھر تار تار کر
ڈالا۔ سلیمان نے میرے ساتھ وہی کچھ کیا۔ جس کی جنگلی قانون کے عہد میں میں
پنجاب کے کسی بھی خالصے سے توقع کر سکتی تھی۔ اور میں نے اپنے اس گناہ
کی سیاہی اپنے غمگسار بھائی کے چہرے پر ملنی چاہی۔ اف خدا تم لوگوں
نے میرا رشتہ جس جگہ طے کیا تھا۔ میں اس سے کس حد تک مسرور تھی۔ مجھے
اپنا منگیتر کس حد تک پسند تھا۔ پسند ہی نہیں بلکہ مجھے اس سے محبت ہو
گئی تھی۔ لیکن کیا میں اپنے محبوب کے سامنے گناہوں کی ایک سیاہ فہرست
ساتھ لے کر جا سکتی تھی! میں نے چاہا تھا کہ اپنی روسیاہی کا شہرہ عام ہونے
سے پہلے میں کسی دوسرے کا دامن بھی اس کالک سے داغدار کر دوں تاکہ
خاندانی عزت اور لاج کا سوال میرے اپنے گناہ کے لئے چادر بن جائے۔
لیکن میرے بھائی کی جبلی معصومی نے میری یہ تدبیر کارگر نہ ہونے دی اور
شاید میں خود بھی گناہ کی وادی میں ابھی اس حد تک آگے نہیں بڑھی تھی کہ
بالکل ہی بے حجاب ہو جاتی۔ بہرحال الوداع! مجھے معلوم ہے کہ خودکشی
بجائے خود ایک گناہ ہے پھر بھی مجھے اطمینان ہے کہ آج میں اپنے گناہوں
کی گٹھڑی لئے اس خالق بے نیاز کے پاس جا رہی ہوں جو ستار العیوب ہے!

لیکن سعیدہ کی سلائی کی تیلیاں اس صندوق کے اندر نہیں
ہیں۔ ممکن ہے سعیدہ خود ہی انہیں کسی اور جگہ رکھ کر بھول گئی ہو۔

فقط .....

خریداران "شیرازہ" کی خدمت میں التماس ہے کہ خط و کتابت
کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ (مدیر)

رحمٰن نشاط مرادی

فیصلہ

اک طرف مال و زر و سیم کا سیلِ درخشاں
اک طرف قلب و نظر بیچ دیئے جاتے ہیں
اک طرف بادۂ گلفام کے بہتے دریا!
اک طرف زہر بھرے جام پیئے جاتے ہیں

★

اک طرف عشرت و آرام ہے موسیقی ہے
اک طرف بھوک کے سائے میں سسکتے انساں
اک طرف چاند ستاروں کی گذرگاہِ جمیل
اک طرف ذہن و خیالات میں غم کے طوفاں

★

مسکراتا ہے شب و روز کے ویرانے میں
اک طرف کہنہ امارت کا گراں بارِ غرور!
اک طرف عزت و عصمت کا لہو بکتا ہے
اک طرف بکتا ہے مخمور نگاہوں کا سرور

★

اک طرف دار ہے اک سمت ہے آغوشِ حبیب
بس خیالات کی الجھن میں گرفتار ہوں میں
میرے اسلام میں انسان کی عظمت بھی ہے
اس لئے درد کے ماروں کا طرفدار ہوں میں

★

میں بدل ڈالوں گا فرسودہ نظامِ دنیا
میں امارت کے ستونوں کو گرا ڈالوں گا
میں سسکتی ہوئی دنیا کو تبسم دوں گا
میں تشدد کے چراغوں کو بجھا ڈالوں گا

★

میرے اخلاق میں کردار میں جاں ہے جب تک
میرے نغمے کبھی خاموش نہیں ہو سکتے
آنکھیں سل سکتی ہیں لب سی سکتے ہیں
لیکن افکار گرفتار نہیں ہو سکتے!

★

ڈائری

(مسلسل)

عنوان سے میاں انور کی منڈی میں بیٹھ کر برجستہ کہی تھی۔

اے وطن اے گلشن فردوس نزہت آفریں
تیرا ہر ذرہ ہے گویا رشک مہر مبیں
ہے مسرت کا خزینہ تیری دنیا میں نہاں
گل فشاں تیری زمیں، گوہر ریز تیرے آسماں
تیرے سبزہ زاروں میں پاتا ہوں مسرت کی بہار
کیوں نہ محروف ترنم ہوں خیال آبشار
ماشاءاللہ دہقاں کے کھیتوں کا کیف انبساط
تیری دنیا پر بہار و پر سرور و پر نشاط
نرم و نازک ننھے ننھے پیلے پودوں کی چھیا
اور یاں دیتی ہیں جن کو خود نسیم خوشگوار
ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں لگیں اور پی پی کی صدا
اور کی اور کی تیلی تیلی کالی کالی ہے گھٹا
کوک سے کوئل کی گونج اٹھتے ہیں وادی و دمن
نغمہ سنجان چمن ہیں اپنا ہر پی میں مگن

وہ دہقانی کے سیدھے سادے نقوش پر وہ ذہن پر ابھر رہے تھے میں انہی حسین خیالوں میں کھویا چلا جا رہا تھا کہ یاک کسی نے پیچھے سے آواز دی — "بابو جی قریب کرسی پر بیٹھ جاؤ۔" دہقانی کی وہ حسین یادیں جو ابھی ابھی پردہ ذہن پر ابھر رہی تھیں ان کا سلسلہ اس کڑک بھری آواز نے یک بیک توڑ دیا جیسے ایک خواب تھا جو حقیقت کی روشنی دیکھتے ہی پتہ نہیں کس گوشے میں روپوش ہو گیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو ایک نحیف بوڑھا [illegible]

ری

یم دوست میاں انور آج خلوت۔ کے دفتر میں مل گئے
راقم یہاں کیسے۔ بڑی مسرت سے بولے "کیا کروں غم
لا یا ہوں نہ گاؤں کی وہ حسین و خاموش فضا کیوں چھوڑ جاتا یہاں
بہاراں "گندا ہے" میں نے کہا" سچے کہاں ہو پتہ بتا
وں گا۔"

روز صبح دس بجے کے قریب میں ان سے ملنے کے لئے نکلا
سے ملاقات ہوئی تھی، میں نے تھوڑی سی مٹھائیاں لیں
پاک جیب تھا ان کے سامنے پیش کر دی
کیا کر سکتا ہوں، راستے بھر یہی سوچتا رہا تھا کہ آج انور
وہ تمام حکایتیں چھیڑ دوں گا جب ہم دونوں گاؤں کی
یتے تھے۔ مادہ تکلف سے ہماری زندگی
ن تھا جو ہماری زندگی کے ہر گوشے پر چھایا ہوا تھا۔۔۔
دی نہایت لطیف ہو جاتی، ہم بالعموم صبح کے وقت
سر سوں اور مٹر کے پھولوں اور گیہوں کی بالیوں کا
"ان کا حسن" ہمیں صرف دعوت نظر ہی دیتا
ی تھا کیسے آپ دلکش حسن کو دیکھ لیکن
مشاغلوں میں
کیت کی ہر
[illegible]

لیکن پھر خیال آیا کہ یہ ہدیہ ہے میاں انوار کے لئے۔ اگر اس بھکاری کو دیدیا تو پھر انھیں کیا پیش کروں گا۔ بھکاری تو بہت ہیں، میں انھیں کہاں تک دیتا پھروں گا۔ یہ کام تو حکومت کا ہے کہ ان کا انتظام کرے۔ یہ سوچتا ہوا میں آگے بڑھ گیا۔ میرے ضمیر نے مجھے ملامت کی۔ دل کی پرسکون... گہرائیوں سے یہ آواز اٹھی کہ ان مٹھائیوں اور مستیوں کا حق اس غریب بھکاری کے علاوہ کوئی نہیں۔ ایک شکستہ حال غریب نہایت بے بسی کے عالم میں تمہیں صدائیں دے رہا ہے لیکن تم اس کی جانب ملتفت نہیں ہو رہے ہو۔ تمہارے ملک کا افلاس ایک بھکاری کے روپ میں تمہیں پکار رہا ہے کہ آؤ دو آنسو مجھ غریب پر بھی بہاتے جاؤ لیکن تم اس کی پکار کا کوئی جواب نہیں دے رہے ہو۔ وہ جذبات اخلاقی جسے عقل کی حیلہ جوئیوں نے دبا دیا تھا، ابھر آیا میں نے سوچا کہ انوار کچھ بھوکے تو ہیں نہیں جو انھیں اس بھکاری پر ترجیح دی جائے۔

میں کافی دور نکل آیا تھا لیکن پھر پلٹ کر آیا اور بھکاری کو مٹھائیاں اور مستیاں دیدیں۔ میں نے دیکھا کہ مٹھائیاں لیتے ہی اس خاکماء برباد کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ پہلے تو نہایت حیرت سے مٹھائیوں اور مستیوں کو دیکھتا رہا جیسے وہ سوچ رہا ہو کہ شاید کوئی اپنے دوست کے لئے تحفہ لئے جا رہا تھا اور بے خیالی میں یہ تحفہ اس نے کسی اور کو دیدیا۔ ابھی چند منٹ پہلے وہ بھوک کی تکلیف سے کراہ رہا تھا لیکن اب اس کی کراہ بند تھی۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا جب اس نے کھا لیا تو میں نے پوچھا "بھیا! کہاں سے آئے ہو" بولا "لکھنؤ سے" میں نے کہا "کیا تمہیں کہیں کام نہیں ملا" بولا "کام جو ملتا تو رکشہ کا ہے کو کھینچتا؟ آپ سے بھیک کیوں مانگتا۔ گھر سے جو روپے لایا تھا وہ سب اس عرصے میں خرچ ہو گئے۔ اب یا تو چوری کروں یا بھیک مانگوں۔ چوری کرنا پاپ سمجھتا ہوں اس لئے بھیک مانگتا ہوں" (باقی باقی)

(حلازی •)

بغلی چھری

ں واقعہ کا جب کبھی میرے ذہن میں خیال آتا تھا دل کو
یر لیا کرتی تھی اور میں دل ہی دل میں شرمندہ سا ہو کر
یا کرتا۔ . . . . حالانکہ میں مجرم نہ تھا پھر بھی یہ الزام
میں نے دو دوستوں کے درمیان نفاق پیدا کیا۔ اور
و دور کر دیا۔

ذکر ہے . . . . . میں . . پرویز اور ثاقب شیراز ہوٹل
خص کا انتظار کر رہے تھے جو میرے لئے اجنبی لیکن پرویز
- پرویز کے دل میں اس شخص کے لئے بڑی عزت
منوں کے بعد اس شخص کی تعریف کرتے ہوئے مجھے ذہن
بل بنا رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا" الطاف بڑا ہونہار قسم
عر بھی ہے۔ اسکے شعر بڑے پیارے ہوتے ہیں۔ خود اعتمادی
نے کبھی اپنی کوئی نظم یا غزل اشاعت کے لئے نہیں
ب تک کوئی۔ رسالہ یا اخبار تقاضہ نہ کرے۔ میں
کیوں اپنے آپ کو ہلکا کروں . . . . اس
ری اور دلکش ہوتی ہے۔ میں اسکا گہرا دوست ہوں
تم سے مخاطب نہیں کیا . . . . بس معمولی
ی نجابت اور شرافت کا اندازہ لگا سکتے ہو۔

یا اور کچھ سوچتا ہوا ان پردہ نشینوں کو دیکھنے لگا" جو شاید
ے بھی نہیں۔ قسم کا پردہ کئے سکول جا رہی تھیں۔ اور
ہلیں کر رہی تھیں۔ پرویز کچھ دیر تک ان سے نظر
کرنے کے بعد پھر مجھے بتانے لگا۔ کہ الطاف کا کیریکٹر
۔ قریب سے کوئی حسین سے حسین لڑکی گزر جائے وہ
نہ دیکھیں کا وہ اسکو نہایت ذلیل حرکت سمجھتا ہے اور اس

[illegible]

میں ایک ذہین اور فرمانبردار شاگرد کی طرح پرویز کی باتیں ذہن نشین کئے جا رہا تھا۔ اور ثاقب سگرٹ کے کش لگاتا ہوا کبھی پرویز کو اور کبھی مجھے دیکھ لیتا تھا . . . . . نو بجنے میں پندرہ منٹ اور تھے . . . . اور نو بجے الطاف کو آنا تھا . . میری خواہش تھی۔ کہ جلدی سے نو بج جائیں۔ اور میں پرویز کے اس "مقدس دوست" سے ملوں جس کا پرویز کے دل میں اتنا احترام تھا۔

نو بجے میں دو منٹ رہ گئے اور میں نے ثاقب اور پرویز کی نظروں میں دوست نظر آنے کی چمک نہ دیکھی۔ تو یونہی پوچھ بیٹھا۔" وعدے کا کیسا ہے میرا مطلب ہے۔ وقت کا پابند بھی ہے یا نہیں۔ ؟

پرویز نے جیسے حیران ہو کر مجھے گھورا . . . . . پھر پُر اعتماد لہجے میں بولا" وقت کی پابندی تو کوئی اس سے سیکھے ملک الموت کو بھی چکمہ دے کر وعدے کی پابندی کر لینے والا انسان ہے۔"

اور پھر نو بجے پورے نو بجے ایک شخص نے ہمارے قریب سائیکل سے اترتے ہوئے پرویز سے پوچھا" مجھے دیر تو نہیں ہوئی ؟"

"نہیں بالکل نہیں" پرویز نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے غور سے الطاف کو دیکھا۔ مناسب شکل صورت اور مناسب سے جسم کا انسان تھا۔ آندھی کا جھونکا آئے تو کاغذ کی طرح اڑ جانے والا بدن۔ آنکھوں میں ذہانت کی چمک . . . . . بالوں میں مصنوعی گھونگر. نیلے رنگ کا کشمیرے کا کوٹ . . . . سفید قمیص اور نسواری رنگ کی کیٹر ریج کی پتلون . . . . . . کم از کم اس کو دیکھنے سے میں قطعی متاثر نہیں ہوا۔

ہمارا تعارف ہوا۔ اس نے جیسے بے دلی سے مجھ سے مصافحہ کیا۔ چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ . . . . . . رسمی فقرے ادا ہوئے۔ اور پھر وہ ... پروگرام کے مطابق دریا کی طرف چل دیئے۔

[illegible]

... سامنے راستے بھر مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ اور پرویز نے الطاف کے سامنے مجھے جیسے نظر انداز ہی کر دیا تھا۔ اس صورت حال کا مجھ پر اثر ہونا قدرتی امر تھا۔۔۔۔۔۔

حقیقت یہ ہے کہ پرویز الطاف سے محض عقیدت ہی نہیں رکھتا تھا بلکہ اس سے مرعوب بھی تھا اور میں اس مرعوبیت پر جلا رہا تھا۔ اور دل ہی دل میں الطاف کو کوس رہا تھا کہ جس کی آمد نے مجھے اجنبی سا بنا دیا تھا۔

ثاقب نے پاس دیکھا اور وہیں ایک کشتی مل گئی۔۔۔۔ ہم چاروں کشتی پر بیٹھ گئے۔۔۔۔ اور ثاقب نے کشتی کھینا شروع کر دیا کشتی دریا کے وسط کی طرف بڑھ رہی۔ اور میرا دل چاہتا تھا کہ یا تو دریا میں چھلانگ۔۔ لگا دوں اور یا پھر واپس لوٹ جاؤں۔ لیکن دونوں میں سے ایک بات بھی ممکن نہ تھی۔ کیونکہ جان پیاری تھی۔ اور دوسری صورت میں اخلاقی قدرا حائل تھیں۔

ہماری کشتی بہاؤ کے خلاف پل کی طرف چل رہی تھی۔ اور پل کے نیچے ایک گنڈیریاں والا چھابڑی لئے بیٹھا تھا۔ بڑی شدت سے میرا دل گنڈیریاں چوسنے کو چاہا۔ میں نے نسوانی آواز بناتے ہوئے ثاقب سے کہا۔ ذرا تیز چپو مارو۔

ثاقب مسکرانے لگا۔ اور پرویز نے الطاف کی نظر بچا کر مجھے اشارے سے سمجھانے کی کوشش کی کہ ایسی حرکتیں نہ کرو۔ میں جل ہی تو گیا۔

بوٹنگ پروگرام کا سارا لطف خاک میں مل رہا تھا۔ اور میری کوفت دم بدم بڑھ رہی تھی۔ یہ عجیب سی سیر تھی۔ یہ عجیب سی تفریح تھی، پرویز کو جیسے الطاف کے سوا کوئی اور آدمی کشتی پر نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ ثاقب سے کوئی بات کر لیتا۔ لیکن مجھے تو اس نے کسی بات کے قابل سمجھا ہی نہیں۔ شاید وہ مجھے ذلیل کرنے کے لئے ساتھ لایا تھا۔ میں نے جی ہی جی میں انتقام کی ٹھانی۔۔۔۔۔۔ اور سگریٹ سلگا کر بڑی بے ڈھنگی آواز سے گانے لگا۔

ماہی لونگ بھاؤ دے — تے بڑی چھاں دی مت
[illegible] کدی کدی — تے نیں ملاندے ہت

[illegible] نے چونک کر مجھے دیکھا۔ اور پرویز نے جیسے خون کے [illegible]۔۔۔۔ بار ذوق سماعت

کا بھی اندازہ کر لیا کرو؟۔

میں بھڑک اٹھا۔ واہ اتنی پیاری چیز ہے۔ الو یہ پہاڑی ہے پہاڑی اس رنگ کو تو بچے دریا ک جاتے ہیں جو اسے ناپسند کرے میں تو اسے کور ذوق اور بہرہ کہوں گا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر میں اس وقت دریا نہیں رکوانا چاہتا۔ دیگر تمہاری آواز اگر پہاڑی کوے سے زیادہ سریلی نہیں تو کم سریلی بھی نہیں۔"

یہ بھی ٹھیک ہے کہ میں تان سین نہیں۔ مگر اس وقت میرا جی چاہتا ہے کہ میں گاؤں۔۔۔۔۔ کوئی گیت۔۔۔۔ کوئی نغمہ۔۔۔۔۔۔ اور یہ تو تم جانتے ہی ہو۔ کہ میں اپنے من کو مارا نہیں کرتا" یہ کہہ کر میں پھر بے سری تان اڑانے لگا میں اس وقت بڑا خوش تھا۔ پرویز اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔ الطاف کا پتہ نہیں کیونکہ اسکا چہرہ میری طرف نہیں تھا البتہ ثاقب مطمئن سا تھا۔ اسے میری اس بیہودہ حرکت کا قطعی افسوس نہ تھا۔۔۔۔۔

کشتی پل کے قریب پہنچ چکی تھی۔

ثاقب سے میں نے چہک کر کہا "گنا لینے پر چلو۔ منہ میٹھا کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔"

"نہیں۔۔۔۔۔ نہیں" پرویز چیخا۔ "سیدھا چلے چلو" اسکی آواز میں انتہائی خنگی تھی۔ وہ مجھ سے انتہائی ناراض ہو گیا تھا۔ اور ناراضگی کی حالت میں وہ مصنوعی شخص کی ہر بات رد کرنے کی کوشش میں تھا۔ یہ اسکی عادت تھی۔ میں نے تیوروں سے اندازہ لگا لیا۔ کہ وہ ہر قیمت پر میری بات رد کرنے پر تل گیا ہے۔ چنانچہ میں بھی اکڑ گیا۔ اور بلند آواز سے بولا "کشتی کنارے پر لے چلو ورنہ کشتی الٹ دوں گا"

ثاقب شش و پنج میں پڑ گیا۔ میں [illegible] ہو گیا۔ اور تیز آواز میں چیخا۔۔۔ "سوچ کیا رہے ہو۔ گھماؤ کشتی۔ میں پرویز کی عادت کو حسب معمول شکست دینے پر تل گیا میں پھر چیخا" ثاقب کشتی کنارے پر لے چلو ورنہ میں الٹ دوں گا" اور پھر میں نے ہلاتے ہوئے کشتی الٹنے کی بڑی سی جعلی کوشش بھی کی کشتی ہچکولے کھانے لگی۔۔۔۔۔۔۔

پرویز کے بس کی بات [illegible] کشتی سے دھکا دے کر دیا میں گر ہی گیا۔ انتہائی غصے میں [illegible] سیدھا چلو ثاقب [illegible]

"بڑے منکسر ہو گئے تھے" پرویز نے جھینپ کر اصلاح کی [illegible]

کنارے پر لگا دی تھی۔

گنڈیریاں ختم ہونے کے بعد پرویز کشتی کھینے لگا۔ لیکن اب کشتی

یک ناخوشگوار سا سکوت چھا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد ثاقب نے لطیفو

ں سے کسی حد تک تلخی کے دھندلکوں کو دور کر دیا۔

ثاقب میرے قریب بیٹھا ہوا تھا اور سامنے الطاف اس کے پیچھے

ن اور پرویز کا منہ ہماری طرف تھا۔ میری غیر دلچسپی دیکھ کر الطاف نے میرا تعارف

یم کر لیا تھا۔ کچھ اور وقت گزرنے کے بعد ہمارے درمیان ادب برائے

ادب برائے زندگی کی بحث بڑے زوروں سے ہو رہی تھی۔ اور پرویز

چاپ چپو مار رہا تھا

پھر ثاقب نے الطاف سے شعر سنانے کی فرمائش کی۔ میں نے

رار کیا۔ اور پرویز متوجہ ہو گیا۔ الطاف نے کچھ دیر تکلف سے کام لیا

ے اشعار سنانے شروع کر دیئے شعر اچھے تھے داد دینے میں میں نے

ل نہ کیا۔

"ایک شعر اور سن لیجئے" الطاف نے قدرے منکسرانہ لہجے میں کہا

۔ "ارشاد" حسب عادت میں نے جواب دیا۔ عرض کیا ہے ؎

"کیا میرے حال پہ سچ مچ انہیں غم تھا قاصد"

یہ مصرعہ کہہ کر الطاف رک گیا۔ جیسے دوسرا مصرعہ یاد کر رہا ہو۔

، جیسے تڑپ کر شعر پورا کیا...... ؏

"تو نے دیکھا تھا ستارہ سر مژگاں کوئی"

الطاف ہکا بکا ہو کر مجھے تکنے لگا۔ پرویز کے ہاتھوں سے چپو چھوٹ

، ثاقب بھی حیران سا ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔ اور میں خود بھی حیران ہو گیا۔

"آپ نے یہ شعر کہاں سے سنا؟" الطاف نے پوچھا۔

"میں نے یہ شعر پڑھا تھا" یہ میرا جواب تھا۔

"لیکن یہ شعر میری بیاض سے باہر نہیں گیا پھر کیسے کہا؟"

نے مزید حیران ہو کر کہا۔

اب حقیقت [illegible]

[illegible]

"میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔ ممکن ہے کسی دوست نے آپ کی بیاض سے یہ شعر اڑا لیا ہو۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ میں یہی شعر آج سے تقریباً چھ ماہ پیشتر کسی رسالے میں پڑھ چکا ہوں شاعر کا نام یاد نہیں رہا

اور الطاف نے دو ہفتے پیشتر یہی شعر سنا کر اسی دن کی تخلیق بتایا تھا

کیوں الطاف صاحب؟" ثاقب نے مزید روشنی ڈالی۔

الطاف کی حالت قابل رحم ہو رہی تھی۔ اس کے لب بار بار کھلتے اور کچھ کہے بغیر بند ہو جاتے۔ وہ اپنے بچاؤ کی کوئی صورت نہ پا رہا تھا۔

"ممکن ہے" پرویز نے الطاف کا بچاؤ کرنا چاہا "شعر میں کیا ہو خیالات مل گئے ہوں...... شعر پر کسی ایک شاعر کا اجارہ تو نہیں نا؟"

"کیسے ممکن ہے" میں نے ترکی سے اس کا واضح الی دیا "خیالات مل سکتے ہیں۔ ردیف اور قافیہ ایک جیسے ہو سکتے ہیں مگر ایک ایک لفظ تو محال ہی نہیں ناممکن ہے...... میں الطاف صاحب پر یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ کہ چار دن سے میں لاہور میں ہوں اور اس اثنا میں پرویز یا ثاقب یا کسی اور صاحب سے میں نے ہرگز یہ شعر نہیں سنا۔ پرویز اور ثاقب دونوں حاضر ہیں۔ میری اس بات کی تصدیق یا تردید کر سکتے ہیں"

"ذرا شعر دوبارہ کہنا" پرویز نے ایک ہلکی سی امید کے تحت کہا

کیا میرے حال پہ سچ مچ انہیں غم تھا قاصد
تو نے دیکھا تھا ستارہ سر مژگاں کوئی

میں نے مسکراتے ہوئے شعر دوبارہ پڑھا۔

فضا پر دبیز سی خاموشی اور تکدر چھا گیا۔ ہم سب خاموش تھے۔

الطاف کی ظاہری بناوٹ کا آئینہ چور چور ہو چکا تھا۔ اور وہ ٹھیک ایسے مجرم کی طرح آنکھیں جھکائے بیٹھا تھا۔ جو کسی بہت بڑے اخلاقی جرم کا مرتکب ہوا ہو

واپسی پر ہم میں سے کسی نے دوسرے سے بات نہ کی......

اس دن کے بعد کئی ماہ گزر گئے۔ میں نے پرویز سے دو تین بار [illegible] کوشش کی۔ [illegible]

[illegible]

پھر بھی یہ پردہ مجھ ہی سے اٹھا تھا۔ اور اس طرح میں پرویز کو بھی کھو بیٹھا۔۔۔
اور الطاف اور پرویز کو ذہنی طور دور کر دیا۔ لیکن آج کے بعد اس واقعہ کی
یاد میرے لئے ہمیشہ مسرت کا باعث ہوا کرے گی۔ آج مجھے بڑی مدت کے
بعد پرویز کا خط ملا ہے۔

پیارے مشیرا!

سب سے پہلے میں تم سے بے اعتنائی کا اقرار کرتے ہوئے معافی کا
طلبگار ہوں۔۔۔۔ رنجش کو بھول کر مجھے معاف کرتے ہوئے میری
میری تحریر پڑھو گے تو تمہیں لطف آئے گا۔

حضرت الطاف بہت خفت نکلے۔۔۔۔۔۔۔ تمہیں معلوم ہے
تم دونوں کے تعارف سے پہلے میں اسے کتنا پیار کرتا تھا۔ اور اس کا کتنا ادب و
احترام میرے دل میں تھا۔ کمبخت کی باتیں اور اصول ہی کچھ ایسے تھے۔ کہ اگر تم اس
کا پردہ نہ اٹھا دیتے تو میں اپنی بہن کی زندگی تباہ کرنے پر آمادہ ہو چکا تھا۔ تم
جانتے ہو۔ اچھے شریف اور باروزگار لڑکوں کا کتنا کال ہے۔۔۔۔۔ میں
اپنی بہن کا ہاتھ اسکے ہاتھ میں دینے کو تیار تھا۔ لیکن بروقت اس شعر والے واقعہ
نے مجھے تحقیق و جستجو پر مجبور کر دیا۔ اور تحقیق و جستجو کے بعد چھ ماہ کی تحقیق و جستجو کے
بعد میری معلومات میں یہ اضافہ ہوا کہ الطاف انتہائی رذیل انسان ہے۔۔۔۔۔۔
اس کی ماں گجرات کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں میں بڑی تنگی ترشی سے
زندگی گذار رہی ہے۔ اس کا والد مر چکا ہے۔ اور یہ کمبخت ماں کو ایک پیسہ تک
نہیں بھیجتا۔۔۔۔۔۔

مزید یہ کہ الطاف نہایت احتیاط کیساتھ دختر انگور سے بھی شوق رکھتے
ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جوئے کی لت بھی حضرت کو ہے۔ اور مہینے کے پہلے ہفتے
میں سے کسی ایک دن شراب پیتے ہیں۔ جوا کھیلتے ہیں۔ اور پھر بازار حسن کی رونق
بھی منہ چھپائے بڑھانے چلے جاتے ہیں۔ دوستوں سے مانگے کا لباس پہنتے
ہیں۔۔۔۔ اور حتی الوسع نہایت ڈھب سے یہ کوشش کرتے ہیں کہ دوستوں کے
مال پر دانت جتنے تیز ہو سکیں۔ بہتر ہے۔ اب اس حضرت کی خوبیاں کہاں تک
بیان کروں۔

بہرحال اب میرا اس سے بالکل قطع تعلق ہے۔ اور میں اپنے دوستوں
کو بھی اس دوست نما دشمن سے بچانے کی کوشش میں ہوں۔ یہ بلی چیز
کسی بھی دوست کے لئے خطرناک ہو سکتی ہے۔

تمہاری فراخ دلی۔۔۔۔۔۔ روایتی فراخدلی سے میں بجا
توقع رکھتا ہوں کہ تم نے اپنے پرویز۔۔۔۔۔۔۔ اپنے "پاپی" کو معاف
ہو گا۔۔۔۔ اور خط کا جواب ضرور دو گے۔

تمہارا پرویز

اس واقعہ کی یاد اب کبھی مجھے شرمسار نہ ہونے دیگی۔ بلکہ
اس یاد سے میرے ذہن میں مسرت کے ننھے ننھے تارے ٹمٹمایا

(بشکریہ قاصد)

شریفانہ زندگی کا آئینہ دار بنایئے

ادب کو فحاشی ہماری معاشرت کا
فطری جزو نہیں ہے

نظر خورجوی

ساقی تری نگاہ میں کیف و اثر نہیں!
یا تیرے بادہ نوش میں ذوقِ نظر نہیں
منزل کہاں ہے یہ بھی کسی کو خبر نہیں
اور قافلہ کے ساتھ کوئی راہبر نہیں
جا اے بہار اپنی شبستانِ ناز میں
یہ میرا غمکدہ ہے تری رہگذر نہیں
اب دورِ امتیازِ بہار و خزاں کہاں
سارے چمن میں آج کوئی دیدہ ور نہیں
اب بھی زباں پہ ذکرِ دیارِ حبیب ہے
یہ اور بات ہے کہ وہ عزمِ سفر نہیں
خود دل پہ ہاتھ رکھ کے ذرا دیکھ لیجئے
گر آپ کو یقین مری بات پر نہیں
ہاں یاد تھا ہمیں کبھی منزل کا راستہ
مدت ہوئی نظرؔ کہ خود اپنی خبر نہیں

فیروز نظر

لے آئے کس مقام پہ شام و سحر مجھے
اُن کا ہی کچھ پتہ ہے نہ اپنی خبر مجھے
اب مجھ کو مل گیا ہے ترے غم کا آسرا
ڈھونڈا کرے غمِ جہاں اب عمر بھر مجھے
اب خود ہی اپنے دکھ کا مداوا کرونگا میں
اب تیری احتیاج نہیں چارہ گر مجھے
گاؤں گا سازِ دل پہ محبت کے میں بھی گیت
اے ہمنشیں جو مل گیا غم سے مفر مجھے
فرحت کدہ مرے لئے غم خانہ بن گیا
اب اور کیا ملے گا فرط کا ثمر مجھے
یوں جی رہا ہوں غم میں یہاں شاید کبھی نصیب
لے جائے پھر دیارِ وطن میں نظرؔ مجھے

غزلیں

امجد قریشی

قریب جادۂ عمر رواں سے گذریں گے
دلوں کے قافلے ہر امتحاں سے گذریں گے
کبھی تو دیکھیں گے بربادی بہار چمن
کبھی تو اہلِ جنوں گلستاں سے گذرینگے

ابل پڑیگی وہیں موجِ کوثر و تسنیم
یہ مست جام جدھر سے یہاں سے گذریں گے
مقام دار و رسن ہو کہ عالمِ زنداں ہو
گذرنے والے ہر اک امتحاں سے گذرینگے

تیری گلی سے گزرنے کے بعد دیوانے
نظر بچا کے ماہ و کہکشاں سے گذریں گے
سکونِ جادۂ عشرت کے راہرو امجد
کبھی تو منزلِ آہ و فغاں سے گذرینگے

بیتاب زیدی

زندگانی کا مقصد و مفہوم
کم لگا ہو تو ہمیں نہیں معلوم
کتنے انسان ہیں اس زمانے میں
لطفِ انسانیت سے ہیں محرو[م]
لے کے ڈوبے کہیں سفینے کو
ناخداؤں کی فطرت مذ[illegible]
آسماں محو ہے اک شر[illegible]
غم کی شدت میں کر گئے ہر نج[illegible]
اک حال [illegible]
[illegible] نالہ [illegible]
[illegible]

سعیکہ شائستہ نکہت ●

خواب

یں نے لاکھ مرتبہ سمجھایا لیکن تم پھر بھی اس روش سے باز نہیں آتیں
یں آخری بار پھر کہے دیتا ہوں اپنا ضمیر بیچ کر تمہارے لئے عیش و عشرت کا
سامان مہیا نہیں کر سکتا! اسلم نے آخر روز روز کی جھک جھک سے تنگ
کر یہ فیصلہ ناہید کو سنا ہی دیا۔

اور یہ بھی سن رکھو مجھ سے یہ روز روز کی جھک جھک بھی نہیں جاتیں،
رے ماں باپ نے جانے مجھے کس جہنم میں لا ڈالا۔ کبھی سکھ چین کی سانس بھی
نصیب نہ ہوئی۔

کاش میں پیدا ہوتے ہی مر جاتی۔ اب ناہید نے اپنا آخری ہتھیار
استعمال کیا۔ لیکن اسلم جو سویرا ہوتے ہی ناہید کے تیور پہچان چکا تھا یہ
محسوس کر کے اب یہ معمولی سی جھڑپ نازک صورت اختیار کر لے گی خاموشی
سے دفتر ہی چلے جانا مناسب۔۔۔۔ سمجھا۔

اسلم اور ناہید کی شادی کو ابھی دو ہی سال ہوئے تھے لیکن ان کے روز
روز کے جھگڑوں نے گھر کو جہنم سے بدتر بنا دیا تھا۔ ناہید کو ہمیشہ اپنی
غریبی کی شکایت رہتی تھی۔ یہ بات ہی اس کے لئے کیا کم تکلیف دہ تھی کہ اس
کی چھوٹی بہن کی زندگی عیش و آرام کا نمونہ تھی حالانکہ اسلم اور شاہد ایک ہی
محکمے میں ملازم تھے۔ لیکن خود اس کی زندگی آرام و سکون سے کوسوں دور تھی
عیش و عشرت کا سامان تو کجا ۔۔۔۔۔۔۔ ۔۔۔؟

جب کسی نہ کسی طرح مہینہ ختم ہو جاتا تو اس بات کی فکر لگ جاتی
کہ کل کیا پکے گا۔ قرض خواہ آ موجود ہوتے اور جان کھا جاتے۔ سلمٰی کل
کہ ناہید اپنی بہن کے ہاں جا کر اس کی نئی کار میں گھومنے
تو اس کے رنج [illegible]
[illegible]
سے۔ ناہید [illegible]
گھر کی آسائش [illegible]
یں رہتے [illegible]

چاہئے لیکن ناہید ان لوگوں میں سے تھی جو ہر بات میں اپنی بڑائی منوانا چاہتے
ہیں۔

یہ بات تو کوئی نئی نہ تھی وہ ہمیشہ شادی، بیاہ یا کسی تقریب کے
موقع پر کنبے، برادری کی عورتوں کے سامنے اس پر اس قسم کی چوٹ کرتی
رہتی۔ آخر تنگ آ کر اس نے ان تقریبوں میں حصہ لینا بھی ترک کر دیا لہٰذا
اپنا تمام غصہ اسلم پر نکالتی رہی۔

آج بھی اس نے صاف صاف کہہ دیا تھا میں سب کچھ برداشت
نہیں کر سکتی۔ اس کے لئے بھی آرام و آسائش کا سامان چاہئے لیکن اسلم
نے اسکی بات نہ مان کر اسکے جذبات کو ایک اور ضرب لگائی۔ آہ۔۔۔۔۔۔۔۔
وہ کتنی بدنصیب ہے اس نے سوچا۔۔۔ ناہید، ناہید یہ لو میں نے تمہارے
لئے دست واچ خریدی ہے۔ کئی دن سے تمہارا اصرار تھا نا۔۔۔ اسلم نے
ایک نازک سی رسٹ واچ ناہید کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

یہ تو بالکل زاہدہ کی رسٹ واچ جیسی ہے۔ ناہید نے مسرت کے
پھول برساتے ہوئے کہا

اسلم کتنا اچھا ہے اس نے سوچا۔ اسکو میری خوشی کا کتنا خیال
ہے۔ ابھی کل ہی تو اس نے میرے لئے ایک قیمتی ساڑھی لا کر دیا اور آج یہ خوبصورت
صورت سی رسٹ واچ۔ بے اختیار اس نے رسٹ واچ کو چوم لیا اور جب
تو اسکی خوشی و مسرت کی انتہا نہ رہی جب اسلم نے کھڑکی پر ایک خوبصورت
سا بنگلہ خریدا۔ سارا دن وہ اس بنگلہ کو سجانے کے نقشے بناتی رہی۔ اور
زیادہ خوشی کی بات تو یہ تھی اب وہ بھی زاہدہ کو اپنے ٹھاٹ سے جلانے
کی کوشش کرے گی۔ جس طرح کبھی وہ جلاتی تھی۔

ناہید ایک دن اسلم نے ناہید سے [illegible]
[illegible]
[illegible]

پڑیگی۔ اس نے سوچا اب سب سے پہلے وہ اپنی نئی کار میں زاہدہ کے گھر جائے گی۔ تاکہ اسکو طنز کرنے اور اپنی بڑائی جتانے کا موقع نہ ملے۔

اسلم ابھی تک دفتر سے نہ لوٹا تھا۔ اس کا دل رہ رہ کر ڈوبا جاتا تھا جانے آج کیوں اس نے خلاف توقع دیر کر دی۔

پہاڑ سی رات بھی گذر گئی۔ لیکن اسلم واپس نہ آیا۔ آخر آفتاب عالمتاب اپنی سنہری رتھ پر نمودار ہوا۔ اور ناہید نے بے چینی سے اخبار اپنے ہاتھ میں لیا۔

"غبن کے الزام میں گرفتار" یہ سرخی دیکھ کر جیسے اسکے جسم میں جان نہ رہی۔ اس نے آگے پڑھنے کی کوشش کی لیکن الفاظ جیسے دھندلے ہو گئے، وہ ایسا ساکت مجسمہ تھی جس کے بدن سے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لیا گیا ہو۔

اسلم آہ اسلم وہ آہستہ آہستہ کہ رہی تھی۔ اسلم تم بے گناہ ہو مجھے سب کچھ نہیں چاہیئے۔ آہ . . . . ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔

ناہید، ناہید، دور کہیں سے آواز آئی اور اس نے آنکھیں کھول دیں

اسلم شاید ابھی ابھی دفتر سے واپس آیا تھا۔ ناہید تمہیں ہو کیا گیا ہے اٹھو دیکھو میں تمہیں کب سے جگا رہا ہوں ارے یہ کیا تمہاری آنکھوں میں آنسو

اسلم . . . . . تم . . . کیا وہ سب کچھ خواب ہی تھا ناہید نے خوشی اور غم کے ملے جلے جذبات کے تحت کہا۔

لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اداس ہو گئی۔

اسلم تم صبح مجھ سے ناراض ہو کر چلے گئے تھے۔ میں اپنی اس حرکت پر شرمندہ ہوں۔ مجھے معاف کر دو اسلم۔ واقعی اب تک میں غلطی پر تھی۔

ناہید خدا کا شکر ہے کہ اس نے آج تمہاری آنکھیں کھول دیں اور تمہیں کسی غلط راہ پر چلنے سے بچا لیا۔ اٹھو ناہید آؤ آج ہم دونوں اسکی بارگاہ ایزدی میں شکرانہ کے نذرانے بھیجیں سلیم جو عرصے سے اس موقعے کے انتظار میں تھا کہا۔

اور ناہید وہ کہیں نظروں میں جانے سوچ میں گم تھی۔ شاید وہ کسی گہرے راز کو پا چکی تھی۔

سیدہ اختر

عورت

عہدِ ماضی کی عورت

گداز قلب کی آئینہ دار تھی عورت
وفا سرشت، محبت شکار تھی عورت

وجودِ زن تھا متاعِ حیاتِ صد مقصود
رہِ طلب میں حقیقت نگار تھی عورت

ملا تھا کیف و سکوں روحِ آدمیت کو
جہاں میں رحمتِ پروردگار تھی عورت

ہر ایک نقش میں تھا اسکے دم سے آیا رنگ
حجابِ زیست سے ہاں آشکار تھی عورت

حیاتِ زن سے عبارت تھی دولتِ کونین
خدا گواہ عجب مایۂ دار تھی عورت

●

عہدِ حاضرہ کی عورت

مگر زمانۂ نو میں یہ کیا ہوا اختر
کہ بارِ خاطرِ لیل و نہار ہے عورت

●

نہ پاسِ عصمتِ نسوانیت نہ شرم و حیا
رہینِ جلوۂ عریاں کار ہے عورت

وقارِ شرق کجا؟ احترامِ حسن کجا؟
گلوئے شاہدِ مغرب کا ہار ہے عورت

سمجھ رہی ہے یہ تقلیدِ مغربی میں نجات
بریدہ زلف سراپا ہگذار ہے عورت

خدا ہی رحم کرے اسکی تشنہ کامی پر
سرابِ شوق کے اوپر سوار ہے عورت

نہ راستہ کا تعین، خبر نہ منزل کی
ہلاکِ جستجوئے فتنہ کار ہے عورت

الٰہی شرق کو پھر دے وقارِ صنفِ لطیف
کہ زندگیِ وطن کا وقار ہے عورت

(جامِ نو)

تعلیم میں والدین کا حصّہ

بچوں کی تعلیم کا فرض صرف اور صرف درسگاہوں پر عاید نہیں ہوتا بلکہ اس اہم فرض کا وافر حصّہ والدین سے بھی وابستہ ہے۔ درسگاہ کے معلم اور طلباء کے والدین جب تک روش بدوش کام کرنے کے لئے اپنے اپنے فرائض کی اہمیت کا احساس نہ کریں گے۔ اس وقت تک بچوں کی تعلیم کا مقصد عملی جامہ نہیں پہن سکتا۔ اس وقت ۹۹ فیصدی والدین اپنے بچوں کی تعلیم میں کما حقہٗ دلچسپی نہیں لیتے اور بچوں کی تعلیم و تربیت کے اہم ترین فرض کی تکمیل کے لئے صرف اور صرف درسگاہوں سے ہی توقع رکھتے ہیں۔ بہت کم والدین ایسے ملیں گے جو اس بات کو محسوس کرتے ہوں گے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے معاملے میں انکی دلچسپی بھی کتنی اہم اور لازمی ہے اور ان کی توجہ کسی درسگاہ کے فرائض کو بحسن و خوبی انجام دینے میں کتنی اہمیت رکھتی ہے۔

والدین چاہے وہ جاہل ہوں یا تعلیمیافتہ، وہ اعلیٰ عہدوں پر ہوں یا کاروبار سے وابستہ اگر ان میں اس بات کا احساس نہیں ہے کہ وہ بھی اپنے بچوں کی تعلیم میں اسی توجہ اور دلچسپی کے ذمّہ دار ہیں جتنا کہ کسی درسگاہ کے معلم۔ تو پھر ان حضرات سے زیادہ بد احساس اور فرض ناشناس اور کوئی نہ ہوگا۔ بچہ کی پیدائش کے بعد سے والدین عجیب و غریب اور ایک نئی فکر کو جس طور سے محسوس کرنے لگتے ہیں وہ ان کی زندگی کا سب سے پہلا تجربہ ہوتا ہے پھر اس بچے کی پرورش اور کچھ عرصہ کے بعد اس کو کسی کام یا درسگاہ کی جانب رجوع کرنے کی فکر۔ ان احساسات سے بھی والدین کو فطری لگاؤ ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ صورت حالات میں اختلاف کی بنا پر والدین کی فکریں بھی مختلف ہوں۔ ظاہر ہے کہ مزدور اور جاہل والدین اپنے بچوں کی پرورش اور انکے مستقبل سے متعلق اس طرح نہیں سوچ سکتے جس طرح کہ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ عہدوں پر ممتاز والدین لیکن جہاں تک والدین کی فکر کا تعلق ہے اس احساس سے ہر فرد بشر کا دوچار ہونا لازمی و فطری ہے

لیکن اکثر عام طور سے یہ دیکھا جاتا ہے کہ والدین اپنے بچوں کو انکیں

بلکہ کے محض رسم کے طور پر کسی درسگاہ میں داخل کرادیتے ہیں اور
اور کاروبار کی الجھنوں میں اپنے آپ کو اس طرح اور اس قدر گم
کہ جیسے درسگاہ میں ان کے بچے کا وجود ہی نہیں ہے یا نہ ہونے
ایسے لوگوں کی تعداد کم ہوتی ہے جو خود کو بھی بچوں کی تعلیم و تربیت
درسگاہ کے اساتذہ کی طرح ہی ذمّہ دار سمجھتے ہیں۔

بچوں کی تعلیم و تربیت کا اہم فرض جس طور سے در
معلّمین پر عائد ہوتا ہے بالکل اسی طرح والدین پر بھی عائد ہو
وقت گھر اور درسگاہ کے درمیان جو خلیج حائل ہے وہ بھی معلّمین
کی بے تعلقی کی وجہ سے ہے۔ جب تک اس خلا کو پُر نہیں کیا جا
وقت تک صحیح معنی میں درسگاہ بھی تعلیم کے مقصد کو پورا کرنیکا دعو

والدین کو یہ خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ بچوں کی تعلیم کے
ذمّہ دار وہی ہیں۔ درسگاہ تو محض انکے بازو کی شکستگی میں
کے کام آسکتی ہے اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ درسگاہوں
آزاد ہیں۔ اور ان پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ ان کے
بہت اہم ہیں۔ انھیں اپنی زیادہ سے زیادہ توجہ بچوں کے وال
خوشگوار تعلقات پیدا کرنے میں صرف کرنی چاہیئے۔ اس باب

اس باب میں جو پہلا عملی قدم اٹھانے کی ضرورت ہے
کہ درسگاہ کے تمام بچوں کے والدین سے ملاقات کی صورت پ
درسگاہ کے صدر مدرس کا یہ فرض ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ
والدین سے واقف ہو۔ اور اسی طرح درسگاہ کے ہر معلم کا
ہے کہ وہ ان طلباء کے والدین سے ضرور واقفیت حاصل کرے
کے والدین سے گاہ بگاہ ملاقات سے وقت رفتہ خوشگوار
تعلقات میں تبدیل کیا جا سکتا ہے [illegible]
والدین کے لئے اور معلّمین کے [illegible]

والدین اطمینان رکھیں کہ باہمی تعاون سے والدین بچوں کو بھی
[illegible]ز طریق سے سمجھ سکتے ہیں۔ پھر بچوں سے لاپرواہی میں والدین کی لاعلمی
[illegible] شامل ہوتی ہے۔ جو انہیں بچوں کی فطرت کے بارے میں ہے۔ دو تین
[illegible]چار سال کی عمر کا بچہ جہاں والدین کے لئے ایک خوبصورت کھلونے
[illegible]ام دیتا ہے۔ وہاں اس کی بعض حرکات ان کے لئے وبال جان بھی
[illegible]جاتی ہیں۔ جیسے کہ بچے کی فطرت میں تجسس کا مادہ بالکل قدرتی ہے
[illegible]یا جائے کہ کانچ اور چینی کے برتن بھی ٹوٹنے کی اشیاء ہوتی ہیں۔ ان کو
[illegible] توڑنے میں ایک خاص قسم کی مسرت سی محسوس ہوتی ہے۔ والدین
[illegible]ن قسم کی اشیاء کو بچہ کی زد سے بچا کر کسی اونچے مقام پر رکھتے رکھتے
[illegible]ہیں دم آجاتا ہے۔ لیکن باوجود احتیاط کے بچہ خاموشی سے کسی کونے
[illegible]پہنچ کر کوئی تیل سے بھری ہوئی بوتل کے گرانے میں کامیاب ہو ہی جاتا
[illegible]۔ اور اس کی اس بھولی بھالی حرکت کے نتیجے میں سارے گھر میں ایک
[illegible]م سا بپا ہو جاتا ہے۔ بچے کی یہ فطری شرارتیں اکثر والدین کو عجیب
[illegible]ب قسم کی الجھنوں میں مبتلا ہونا پڑتا ہے۔ لیکن صحیح معلم بچہ کی ان
[illegible]ت کو اس کی اچھی تندرستی اور شوخی طبع پر مبنی سمجھ کر ان سے بہتر اور
طریقہ پر کام لینے کی کوشش کرے گا۔ اگر والدین اس سے تعاون
[illegible]کے تو ان کی بہت سی الجھنیں دور ہو سکتی ہیں۔

چند سال بعد پھر وہ زمانہ آتا ہے جبکہ بچوں کو لڑکیوں اور لڑکوں
[illegible]سے پکارا جاتا ہے یہ دور والدین کے لئے بڑی الجھن کا باعث ہوتا
اکثر بچوں کی حرکات و سکنات اور ان کی شکل و شباہت سے
[illegible]، سادہ لڑکی اور مردانگی کا اظہار ہوتا ہے [illegible]
جب والدین [illegible]
[illegible]۔ وہ نہیں [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

مرض سمجھ کر ان سے بے تیاری اختیار کر لیتے ہیں۔ حالانکہ ان کا یہ طرز
قابل اعتراض ہے۔ والدین کی ان تمام مشکلات اور الجھنوں کا واحد حل
والدین اور معلمین کے باہمی تعاون میں مضمر ہے۔ اس اشتراک عمل میں
اگر ماہر نفسیات معلم کی مدد بھی مل سکے تو بچوں کی تعلیم اور والدین کی
الجھنوں کے سارے مسائل بہت حد تک حل کئے جا سکتے ہیں۔

(بشکریہ حمایت الاسلام)

اگر آپکا نام اور خریداری نمبر بھی ذیل میں درج ہے!

تو سمجھ لیجئے کہ آپ کی خریداری مدت ماہ جون ۶۴ء سے ختم ہے
آپکے نام گشتی مراسلہ بھی جاری کیا جا رہا ہے مہربانی فرما کر اپنا سالانہ
چندہ بذریعہ منی آرڈر روانہ فرما کر شکر گزار فرمائیے یا پھر اپنی خواہش
سے مطلع کیجئے اگر آپ نے خاموشی سے کام لیا تو ماہ جولائی ۶۴ء کا
شمارہ بذریعہ وی پی ارسال خدمت کیا جائے گا۔ اور اس کا
وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔

(منتظر کرم :- مینیجر رسالہ مشیر کراچی)

خریداری نمبر	نام	خریداری نمبر	نام
۱۰۸۴	محمد شریف صاحب سکھر	۲۱۶۰	عبدالرزاق مظفر گڑھ
۱۰۹۱	طارق صاحب لاہور	۲۱۶۱	ذکریا سلطانہ لائلپور
۲۰۱۲	فریدالدین صاحب مردان	۲۱۶۳	ہمشیرہ محمد عرفان ڈھاکہ
۲۱۲۵	[illegible] لائل پور	۲۱۶۵	سلطان محمد صاحب کیمبل پور
۲۱۴۹	بشیرہ خاتون [illegible]	۲۱۶۸	ڈاکٹر غلام رسول [illegible]
۲۱۵۰	حافظ آل احمد صاحب کراچی	۲۱۶۹	خواجہ گل محمد چکوال جہلم
۲۱۵۱	شیخ محمد صاحب کراچی	۲۱۷۵	قاضی محمد اشرف چترال
[illegible]	[illegible]	۲۱۹۳	قمر الحسن صاحب بہار انڈیا
[illegible]	[illegible] لاہور	۲۲۰۳	[illegible]
[illegible]	[illegible]	۲۲۲۳	[illegible] (دکن)

طیبہ یاسمین

”ہرن مینار کی سیر“

کافی دنوں سے ہمارے کالج کی تفریحات پر بری طرح سے جمود طاری تھا اچانک یہ خاموش اور اکتا دینے والی ماحول ”ہمارے بزرگوں کے ایک جملہ“ ہرن مینار دیکھنے شیخوپورہ جائیں گے ”سے چہک اٹھا..... ہرن مینار کا نام سنتے ہی بھانت بھانت کی بولیاں بولی جانے لگیں کچھ لڑکیوں نے ہرن مینار کا جانے کا پروگرام واقعی پسند کیا اور چند ایک ایسی تھیں جو محض باہر جانے کی غرض سے نکلیں اور ان میں ہوسٹل کی طالبات زیادہ تھیں۔ بعض نے خوب ناک بھوں چڑھایا اور ہرن مینار جانا سخت قسم کی بدذوقی قرار دیا۔ ادھر ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو ناپسند کرتے ہوئے بھی محض دوستوں کے مجبور کرنے سے جا رہی تھیں۔ چنانچہ ایسے کہتے کہتے لڑکیاں کافی تعداد میں ہو گئیں۔

پھر ہم بس میں سوار ہوئے۔ بس ایک تھی اور لڑکیاں بہت جس سے ہر ایک کو الجھن ہو رہی تھی۔ ایسے موقع پر مجھے موجودہ زمانہ کے کسی ”بڑے آدمی“ کا قول یاد آ رہا تھا کہ ”گندم کی کمی ہے اس لئے کچھ لوگ مار ڈالنے چاہئیں تاکہ گندم پوری ہو جائے“

میں نے سوچا کاش میں بھی بڑا آدمی ہوتی تاکہ یہ کہہ سکتی ”جگہ کی کمی ہے اس لئے کچھ لڑکیاں مار ڈالنی چاہئیں۔ تاکہ جگہ پوری ہو جائے“ بڑے لوگ ایسی صلاحیں اس لئے دیتے ہیں کہ اپنے متعلق کوئی خطرہ نہیں ہوتا چنانچہ وہاں۔ جو ہم سے ”بڑے لوگ“ تھے ان کا اختیار صرف اتنا ہی تھا کہ وہ چند لڑکیاں بس سے اتار دیں۔ کیونکہ انہیں اپنے متعلق کوئی خطرہ نہ تھا اس لئے انہوں نے اس اختیار کا استعمال فراخی سے کیا۔

خیر پھر ہماری بس روانہ ہو گئی۔ لڑکیاں اب بھی کچھ زیادہ تھیں اس لئے اڈہ پر آ کر ایک دفعہ دھکم پیل ہوئی اور ہمارے چند ساتھیوں کو دوسری کرایہ کی بس میں زبردستی سوار کرا دیا گیا۔ جدا ہونے والے ساتھی خوب روئے گویا کہ اب ملاقات نہ ہوگی کیونکہ ہمارے ساتھی شاید بھول گئے تھے کہ... شیخوپورہ میں پھر ملاقات ہوگی۔ مجھے ایک وہم احساس ہوا کہ بالکل اسی طرح

زندگی میں چلتے چلتے ہمارے ہم سے کئی ساتھی جدا کر دئے جاتے ہیں حالانکہ سب نے ایک ہی جگہ پر پھر ملنا ہوتا ہے

پھر بس روانہ ہوئی تو سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ ٹھنڈی ہوا بس میں آنے لگی اور باہر کی چیزیں یوں دکھائی دیں جیسے وہ بھی ہماری بس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہی ہوں کہ ان کی سیر کرائی جائے مگر ہماری بس جگہ کی کمی کی وجہ سے تھی کہیں کہیں سبزہ بھی نظر آ جاتا تھا۔ خوب صورت منظر اور زندگی بالکل ملی جلی نظر آ رہی تھی۔

بس میں بیٹھ کر شاید لڑکیوں اور ہمارے بزرگوں نے ساتھ نہ دیا اور انہیں کوئی اور چیز تفریح کے لئے نظر نہ آئی تو تفریح فلمی گانے شروع ہو گئے اور بالآخر دم تک جاری رہے کہ اب کوئی اچھی سی گفتگو شروع ہوگی کیونکہ وہاں سے اجتماع تھا مگر انتظار کی بجائے راستہ ختم ہو گیا اور راہ میں ہرن مینار کے نعرے بلند کئے جس سے خوشی کی اک لہر دوڑ گئی۔

سب لڑکیاں کچھ اس رعب اور بیگانگی سے ادھر ادھر پھیل گئیں کہ مجھے گمان ہونے لگا کہ ہرن مینار اٹھ کر اور جہانگیر بے چارہ قبر میں تڑپنے لگا مگر کوئی ہمدرد نہ تھا بیچ ایک اٹھتی ہوئی نگاہ سارے ماحول پر، کھلا اور شفاف ماحول تھا۔ چاروں طرف کھیت ہی کھیت دکھائی دے رہے تھے۔ اور بقول شاعر ؎

کہیں چھپ سکے رہ سکا نہ تیرا حسن عالم ا...
جدھر اٹھ گئیں نگاہیں وہیں کر لیا نظارا
ایک طرف گنبد کا کمپنی تھا چند لڑکیاں

حیران رہ گئی کہ انہیں گنوں کی کشش کتنی دور سے آئی تھی۔

غرض اس کے بعد پھر ہم نے ہرن مینار کی سیر شروع کی تاریخ سے
ہے کہ جہانگیر جب کشمیر جایا کرتا تھا تو راستہ میں شکار کے لئے "جہانگیر
(موجودہ شیخوپورہ) میں ٹھہرا کرتا تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے اسے پانی
ورت محسوس ہوئی۔ اس لئے ۱۶۰۶ء میں اس نے تالاب بنوایا جو
گہرا اور ۸۶۹ × ۷۵۰ فٹ ہے تالاب بہت خوب صورت ہے
ن میں بارہ دری بھی ہے جس کا راستہ تالاب کے درمیان سے جاتا ہے
ن پر سیڑھیاں ڈھلوان اور سادی جگہ بھی ہے۔ ہاتھی کے اترنے کے
ڈھلوان تالاب کی تہ تک جاتی ہے۔ چنانچہ سب لوگ آسانی سے
مل کر سکتے تھے۔ تالاب کے ساتھ ساتھ کناروں کے اوپر بھی اور
چوڑے کنارے ہیں۔ اور پھر اس کے بعد عام سطح شروع ہوتی ہے
پھر ۱۶۱۷ء میں مینار بنایا گیا۔ جہانگیر نے ایک سن راج کا شکار
اس پر مینار بنوایا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ہرن بہت خوبصورت
سے بہت پسند آیا۔ کہتے ہیں کہ جہانگیر آباد کے لوگوں نے اچانک ایک
بار دیکھا تو حیران رہ گئے سب نے عقل کے گھوڑے دوڑائے مگر کچھ
پڑا۔ ایسے موقعوں کے لئے ہی تو مسٹر لال بجھکڑ ہوتے ہیں۔ چنانچہ
لوگ بھاگے بھاگے مسٹر لال بجھکڑ کے پاس گئے جو پہلے ہی سے آئے
تھے چنانچہ پوچھتے ہی جواب دیا کہ ایک ہرن کھڑا کھجلی مار رہا تھا۔
اس کی یہ ادا بہت پسند آئی چنانچہ اس وقت اس نے اس کا شکار
مینار بنا دیا اس طرح اس کی "شیخو پوری" ہو گئی۔ اس وجہ سے جگہ کا نام
(شیخو) پورہ رکھا گیا۔ یہ بات غلط ہو یا درست۔ اتنا ضرور ہے کہ وہ ہرن
ن القسمت ضرور تھا۔

یہ مینار ۱۰۳ فٹ بلند ہے۔ اس کی پہلے پانچ منزلیں تھیں
شِ زمانہ کی وجہ سے صرف چار رہ گئیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ خدا ہر کام
ہی کرتا ہے۔ اس قول کی صداقت کا ہمیں اس وقت ہوا کہ جب ہم سے
یں بھی بمشکل طے کی جاسکیں۔ اس میں بڑے سوراخ ہیں۔ جن میں
بعد ہرنوں کے سینگ بطور یادگار لگا دیئے جاتے تھے اگرچہ ......
بلند کا ہر ن کر ہم تک نہیں پہنچ سکے۔
ہرن مینار کو دیکھ کر ہی کسی شاعر کے [illegible]

گیا ہے۔ اس کو دیکھ کر ہم اس کی نقاشی
خوب صورتی کا اندازہ نہیں کر سکے۔ مگر
نقاشی بہت عمدہ ہوتی ہے اس لئے ہم ایسے
(Painted) دیکھ سکتے ہیں......

حالت میں ہے۔ ہر طرف دھول اٹھتی ہے۔ مینار کے
مرحوم کی قبر ہے۔ مینار کے کچھ فاصلہ پر ایک سرنگ بھی ہے جو اب مسدود
ہے مگر کسی زمانے میں شیخوپورہ کے قلعہ تک جا پہنچی تھی۔ اس کے بعد
ہم نے بارہ دری دیکھی تو ہرن مینار کے بالکل سامنے ہے۔ بارہ دری
ہرن مینار کی نسبت زیادہ خوب صورت۔ پر فضا اور اچھی عمارت ہے اس کی
نقاشی بھی زیادہ باقی نظر نہیں آئی۔ بارہ دری کی تین منزلیں ہیں نچلی اور
اوپر کی منزل کی آٹھ محرابیں ہیں۔ اور درمیان کی منزل میں ۲۴۔ بارہ دری
سے فضا بہت خوب صورت نظر آتی ہے۔ جو اس بات کی شہادت ہے
کہ مغل تفریح کے معاملہ میں بہت ہی خوش ذوق تھے۔ اگر عمارت کی ابھی
حفاظت کی جائے تو اب بھی اس میں ماضی کی داستان باقی ہے۔ ایسے
موقعوں پر اگر ہم سنجیدگی سے غور کریں تو زندگی کی حقیقت بے نقاب ہو جاتی
ہے۔ کسی زمانہ میں جہانگیر وہاں اس شان سے سیر کرتا تھا اور اپنے شاہانہ
جلال میں اتنا مگن تھا کہ کسی کو آنے کی عام اجازت نہ تھی اور اب گردش ایام
نے ہمیں وہاں لا پھینکا تھا۔ مجھے کچھ فاتحانہ سا احساس ہوا مگر مجھے فوراً ہی
جہانگیر کا انجام یاد آیا۔ اور میں نے سوچا کہ "بعض اوقات ماضی کی یاد سے
ہم اپنے مستقبل کا اندازہ کر سکتے ہیں" اس لئے خیالات کو پھر میں سیر کی
طرف ہی لے آئی۔

بارہ دری کے ساتھ ساتھ ہی آٹھ غسل خانے بھی ہیں اور جو
راستہ تالاب کے درمیان سے بارہ دری تک جاتا ہے اس میں بھی پانی
کے لئے آٹھ ویسے سے ہیں۔ تالاب کے چاروں طرف چار چھوٹی چھوٹی
بارہ دریاں بھی ہیں جن میں ایک آج ہمارا مسکن تھی۔ بارہ دری سے کھڑے ہو کر
اگر مینار کو دیکھیں یا مینار سے بارہ دری کو دیکھیں تو ان میں سے ہر حرکت کا
اندازہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً اگر ہم بارہ دری میں ہوں تو فوراً پتہ چل جاتا
ہے کہ اس وقت ہرن مینار پر کون ہے اور اسی طرح ہرن مینار سے بارہ
دری کی [illegible] سب کچھ صاف نظر آتے ہیں۔ [illegible]

مشیر کرچی

ہں دلا خوبی ہے۔ بارہ دری اور مینار کے درمیان خوب صورتی کو دوبالا
کرنے والا تالاب ہے۔ تالاب میں جب سورج کی شعاعیں پڑتی ہیں تو یوں
محسوس ہوتا ہے کہ سورج کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر چند شریر ستارے
تالاب میں گھس آئے ہیں اور پانی میں آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں یا کون جانے
جہانگیر اور اس کے ساتھیوں کی مضطرب روحیں ہوں جو ہماری آمد سے بے
چین ہوں۔

ہرن مینار اور بارہ دری کی سیر کرنے کے بعد کھانے کا پروگرام ہوا اور
میں نے کیا کچھ کھایا یہ میں آپ کو نہیں بتاؤں گی کیوں کہ خوامخواہ آپ کا دل
للچائے گا۔ خیر کھانے کے بعد تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی سیر کی اور پھر ہمیں
واپسی کا حکم دیا گیا۔ چنانچہ سب لوگ پھر بس میں بیٹھ گئے اور بس جلدی ہی
راستہ میں پھر وہی متفرق سی بات اور فلمی گانوں کا پروگرام جاری رہا اور میں
جل کر رہ گئی کہ میں کہیں بھی جاؤں ان فلمی گانوں سے نجات نہیں ملتی
وہی راستہ تھا وہی چیزیں جو اب تک ہمارے سامنے دکھائی دے رہی
تھیں صرف اتنا فرق پیدا ہو گیا تھا کہ پہلے دائیں طرف کی چیزیں بائیں طرف
تھیں اور یہ تبدیلی بہت ہی خوشگوار محسوس ہوئی۔ سوچا کہ ایک
طالبہ کا تو تر پاؤں چھلے میں جا پڑا جس سے بس میں قہقہوں کا
سماں ہو گیا۔ مجھے پہلے تو سمجھ میں نہ آیا کہ کس کی شلوار خراب ہوئی
ہوئی مگر اس میں قہقہے لگانے کی کیا بات ہے؟ مگر بعد میں
لڑکیوں کے قہقہے پر ایک قہقہہ لگایا۔

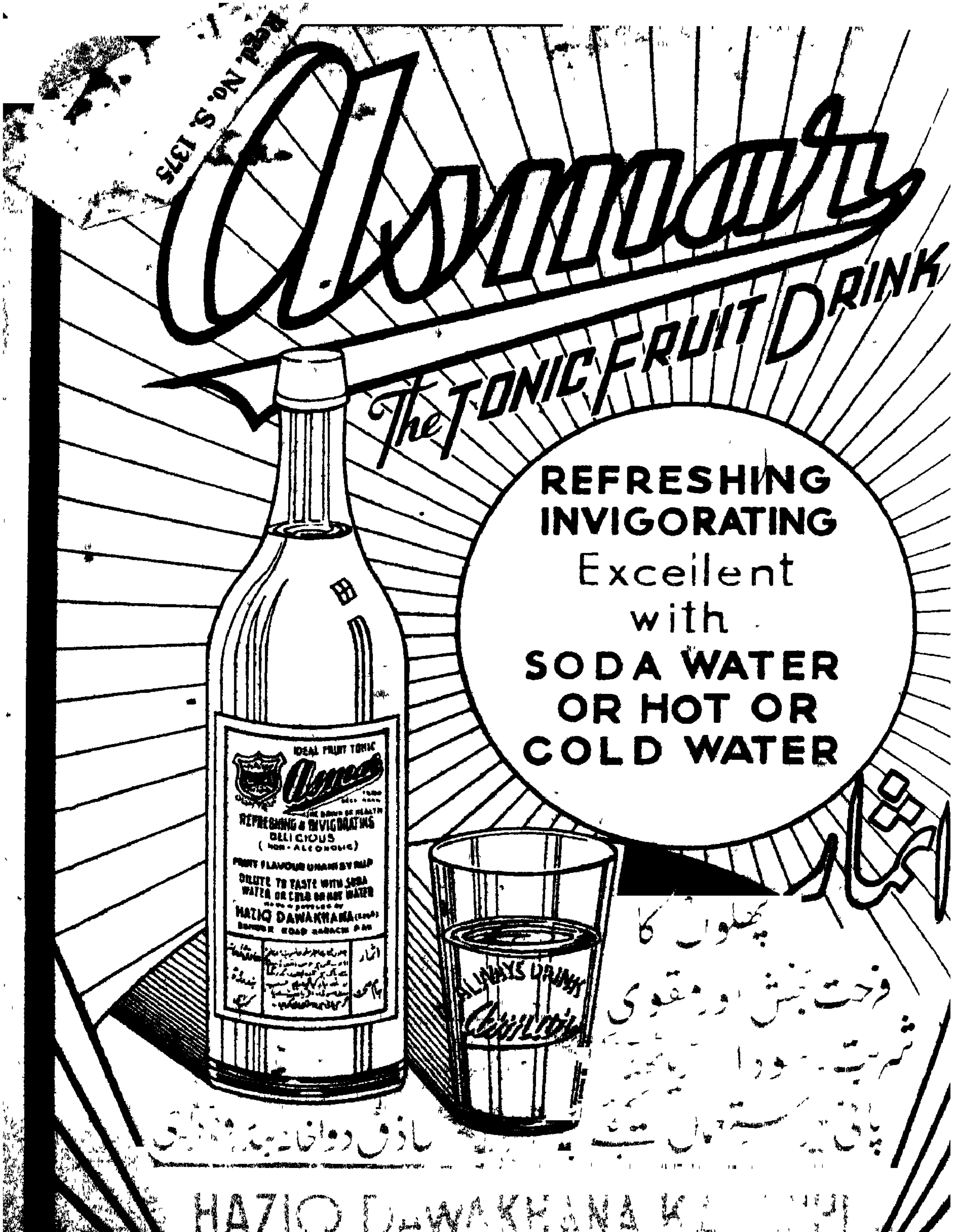
شام ہو رہی تھی سورج اپنا سفر ختم کرکے دوسری دنیا میں جا
رہا تھا اس لئے صاف میدان میں اس کے دوسری دنیا
کا منظر صاف نظر آرہا تھا جو ظاہر ہے کہ بہت ہی دلکش تھا۔
ساڑھے پانچ بجے ہم کالج پہنچ گئے تھے۔ سب لوگ اپنے
گھر چلے گئے۔ اور کالج کے قیدیوں کو پھر زنداں میں دھکیل دیا
زنداں کا گیٹ سے بند ہو گیا۔

سالنامہ جامِ نو ۷۳ء

نگراں: مظہر خیری، ادارہ تحریر: مسرت ام خیری، صابرہ انوار دہلوی ــــ صفحات ۲۴۷ قیمت

"جامِ نو" کا سالنامہ اپنے گزشتہ تمام خصوصی نمبروں سے بہتر ہے۔ جس میں ہر ذوق کے افراد کے لئے کافی مواد موجود ہے۔ جامِ نو کی سب سے بڑی ہے کہ اس میں سوقیانہ اور رکیک قسم کی تحریریں نہیں شائع ہوتیں اور اسے ہمارے گھرانوں کی بہو بیٹیاں بھی بغیر جھجک کے پڑھ سکتی ہیں۔ اس دفعہ سالنامہ ادب و شاعری نظر آتے ہیں۔ افسانوں میں آسی رام نگری کا "پگڈنڈی" اور صادق الخیری کا "گل پژمردہ" بڑی ہی لطیف پیش کش ہیں۔ محترمہ ذکیہ سلطانہ محبت کتنے فسانے" ایک دردناک رومانی افسانہ ہے۔ ان کے علاوہ رمزی کی "دیوانے" دیوان گلیاں"۔ صادق القادری کی "آرام دہ کرسی" کی تو ہین بھی اچھی چیزیں ہیں۔ غزلیات و منظومات میں اسد ملتانی کی "شراب کہنہ" ادیب سہارنپوری کی "سلگتی شام"، فراق گورکھپوری کی "تحسین" سیماب اور مظفر بلاسطوی کا "صلہ" بلند پایہ نظمیں ہیں۔ وحشت کلکتوی، سراج لکھنوی، جگن ناتھ آزاد، روشن نگینوی اور راغب مرادآبادی کی غزلیں ہیں۔ مضامین میں ملا محمد واحدی کا مضمون "عورت کی انتہا پسندی" بہت خوب ہے۔ واحدی صاحب نے بڑے نازک مسئلہ کو چھیڑا ہے لیکن افسوس مختصر ہے۔ اس کے علاوہ جاوید نہال کا "اردو ادب کے ارتقا میں کلکتہ کا حصہ"، صبیحہ ناصر کا "امانت اور مداری لال"، مختصر مضامین ہیں۔ شمیم کے خواب" اور ایم نوری کا "میرے دل کا معاملہ" طنز و مزاح کا سامان پیش کرتے ہیں۔ "بچوں کی مجلس" سالنامے کی مناسبت سے مختصر ہے لیکن فلمی سیکشن میں بھی اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ سرورق رنگین اور دلکش ہے۔ کتابت و طباعت بہت ستھری اور نفیس ہے۔ جامِ نو کی ترقی میں مسلسل ترقی اور اس سالنامے کو دیکھ کر یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ جامِ نو شاہراہ ترقی پر گامزن ہے۔ اور اس سلسلے میں ادارۂ جامِ نو اور خصوصاً مظہر خیری یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں۔

خط و کتابت کا پتہ:- "جامِ نو" پوسٹ بکس نمبر ۲۳۰ ...


Regd. No. S. 1375
Asmar
The Tonic Fruit Drink
REFRESHING
INVIGORATING
Exceilent
with
SODA WATER
OR HOT OR
COLD WATER
IDEAL FRUIT TONIC
REFRESHING & INVIGORATING
DELICIOUS
(NON-ALCOHOLIC)
HAZIQ DAWAKHANA
ALWAYS DRINK
اثمار
پھلوں کا
فرحت بخش اور مقوی
HAZIQ DAWAKHANA

Monthly MUSHIR



کراچی

ماہنامہ

لائی

۱۹۵

مرتبہ

عبدالغفور بیگ

فی پرچہ

پاکستان —۶—

بھارت —۸—

بُلند معیاری

ہی کے سبب حاذق دواخانہ کی تیار کردہ یونانی ا

مشہور اور مقبولِ عام

ہیں

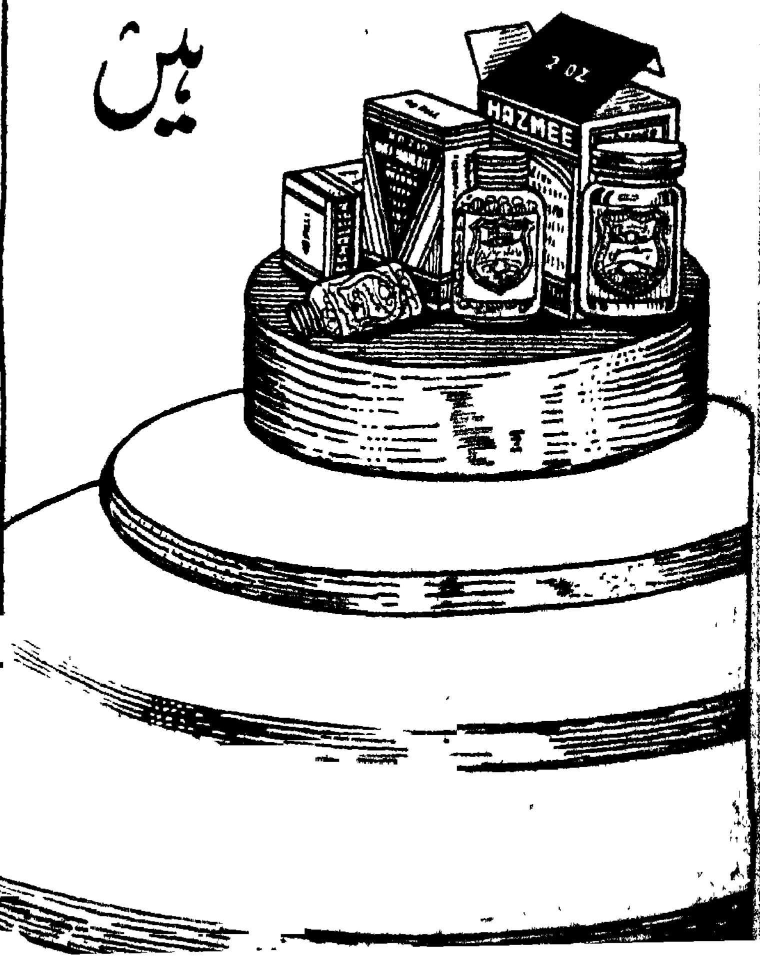
حاذق دا

مفرح فو

نیا اور تازہ خون پیدا کرتا ہے۔ وز
بڑھاتا ہے اور ہڈیوں کو مضبو
کرتا ہے۔ قوت اور طاقت بخشتا
کھانا ہضم کرکے بھوک بڑھاتا

(خوراک)

کھانیکا ایک چمچہ روزانہ دو تین
کھانا کھانے کے بعد استعمال
بچوں کے لئے نصف خوراک
حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی پاک



منیج

حاذق د

بندر روڈ

جولائی سنہ ۱۹۵۴ء
[...]ہ ...روزہ ...
[...]کراچی
[...]ش تیموری
- 6 JUL 1954

جمال فردا

[...]جہاں کی فراوانیوں سے اکتا کر
[...]اپنے عشق کے جذبوں کو کم نہ کر دینا
[...]ں نے خون دیا ہے حرم بچایا ہے
[...]ینِ شوق نصیبِ صنم نہ کر دینا

سمجھ رہا ہے زمانہ جسے فرومایہ
اسی کو دیکھنا جنس گراں بنائیں گے
ذرا یہ شورش برق و شرر گذر جائے
پھر اہتمام سے ہم آشیاں بنائیں گے

حریفِ سنگِ گراں ہیں۔ بجا سہی لیکن
ہماری راہ میں کچھ مشکلات اور بھی ہیں
اس آشیاں کی حفاظت ذرا سنبھل کے کرو
کہ بجلیوں کے سوا حادثات اور بھی ہیں

شبِ سیاہ سے یہ دل گرفتگی کیسی
طلوعِ صبحِ درخشاں کا انتظار کرو
چمن میں دورِ خزاں دائمی نہیں ہوتا
کچھ اور عہدِ بہاراں کا انتظار کرو

[...]ے دوست بظاہر بڑا نگیں گفتار
[...]ہے زہر مگر دل کے آبگینوں میں
[...]شعری دشمن کا کیا گلہ کرتا
[...]ہیں سانپ خود اپنی آستینوں میں

نظر اٹھاؤ کہ وہ وقت کے دریچے سے
جمالِ چہرۂ فردا دکھائی دیتا ہے
ہزار تند ہیں موجیں پہنچ ہی جائیں گے
ہمیں نہ ہو کہ کنارا دکھائی دیتا ہے

پاکیزہ اور صالح ادب کا علمبردار

ماہنامہ مُشیر کراچی

ٹیلی فون : ۷۹۲۳۳

جولائی ۱۹۵۴ء

بدل اشتراک :-

پاکستان : سالانہ : تین روپے

فی پرچہ : چھ آنے

بھارت : سالانہ : ساڑھے چار روپے

فی پرچہ : آٹھ آنے

مرتبہ

عبد الغفور بیگ

طابع و ناشر عبد الغفور بیگ ✕ مطبوعہ : مشہور پریس کراچی

مقام اشاعت : بلند ٹکری ، ہو کاتب : عابد سعید

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قانون کا احترام یا سیاسی انتقام

جس قدر ہمہ گیر احتجاج اسیران مارشل لا کی رہائی کے لئے عموماً اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی رہائی کے لئے خصوصاً گزشتہ سال کے دوران میں عوام کی طرف سے ہوا ہے۔ اس کا تقاضا اور اس سے توقع یہی تھی کہ ہماری جمہوریت پسند مسلم لیگی قیادت اس قضیہ کو ختم کرنے کے لئے تمام اسیران مارشل لا کو غیر مشروط طور پر رہا کر دے گی۔ تاکہ اس ضمن میں جو بےچینی، اضطراب اور بے اطمینانی عوام میں پائی جاتی ہے رفع ہو جائے۔ مگر افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہو سکا۔ جب کبھی عوام کے وفود مولانا مودودی و دیگر اسیران مارشل لا کی رہائی کا مطالبہ لیکر ہمارے ارباب اقتدار کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہیں پورے ملک اور عالم اسلام کے متحدہ اور متفقہ احتجاج کا حوالہ دے کر ان سے اس مسئلہ پر نظرثانی کرنے کی درخواست کی گئی تو انہوں نے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ —— "رائے عامہ کے دباؤ کی وجہ سے عدالتی فیصلوں میں رد و بدل قانون کے احترام کے منافی ہے۔" آج جبکہ ڈائرکٹ ایکشن کے اصل ذمہ دار ڈکٹیٹر اور اس سلسلے میں جلسے اور جلوس نکالنے اور نعرے لگانے والے بلکہ مارشل لا لگنے کے لئے اصل وجہ جواز پیدا کرنے والے تمام کے تمام رہا ہو چکے ہیں۔ تو لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ کیا "قانون کا احترام" صرف مولانا مودودی اور بقیہ دو چار افراد ہی میں سمٹ سمٹا کر رہ گیا ہے جو انہیں رہا نہیں کیا جا رہا۔ اور کیا احترام قانون کی یہ "خصوصیت" کسی سیاسی انتقام کے جذبہ کی حامل تو نہیں؟ جب عوام گزشتہ سال کے مسلسل واقعات کی روشنی میں ارباب اقتدار کی اس سلسلہ میں کی ہوئی کارروائیوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ تو ان کا یہ شبہ یقین میں تبدیل ہو جاتا ہے — مارشل لا کے نفاذ کے ۱۰، ۱۲ روز بعد جبکہ ڈائرکٹ ایکشن کے ڈکٹیٹر اور اس میں حصہ لینے والے ہزاروں کارکن گرفتار ہو چکے تھے۔ اور بظاہر امن و امان قائم ہو چکا تھا جس کا اعلان ناظم مارشل لا بھی کر چکے تھے اچانک مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے اہم کارکنوں کی گرفتاریاں جماعت کے بیت المال اور اس کے دفتر کی تلاشی۔ پھر اس سے [illegible] مارشل لا [illegible] کا اعلان کرنا کہ وہ مارشل لا کے نفاذ سے پہلے کے افعال پر بھی گرفت کے اختیارات رکھتے ہیں پھر گرفتاریوں کے بعد مولانا اور ان کے ساتھیوں اور جماعت کے بارے میں کبھی "بیرونی طاقت سے مالی امداد پانے کے الزام [illegible]" [illegible] پھر ان مقدمات [illegible] سنانے سے [illegible] مارشل لا کے نفاذ سے پہلے کے [illegible] لکھی ہوں کو [illegible] سے آل پاکستان [illegible] سفارش تھی۔ [illegible]

سارے واقعیون کو دیکھ کر صرف مولانا مودودی اور دو چار دوسرے افراد کو قید و بند میں رکھنا — اس سلسلے کی ایسی کڑیاں ہیں جن کو ملانے سے جو تاریخ مرتب ہوتی ہے اس کا سرسری جائزہ حقیقت حال کو واشگاف کر کے سامنے لے آتا ہے اور ایک معمولی فہم و فراست کے آدمی کا شبہ بھی یقین میں تبدیل ہو جاتا ہے کہ مولانا مودودی کے ساتھ جو خاص سلوک روا رکھا جا رہا ہے۔ وہ کسی قانون کے احترام کے طور پر نہیں بلکہ کسی اور وجہ سے۔ واقعات اور کارروائیوں کا یہ تسلسل ایک ایسا نمایاں اور غیر مبہم نقش سامنے لاتا ہے۔ جس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ آخر کس طرح یہ باور کرلیں کہ پنجاب میں گزشتہ سال کے فسادات اور ڈائرکٹ ایکشن کی تحریک کی ساری ذمہ داری صرف "قادیانی مسئلہ" کی تصنیف کی بنا پر مولانا مودودی ہی پر عائد ہوتی ہے۔ اس لئے انھیں ہرگز ہرگز رہا نہ کرنا چاہیے۔ عوام کی یہ قطعی رائے ہے کہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے خلاف یہ ساری کارروائیاں صرف سیاسی انتقام ہی کی مختلف صورتیں ہیں۔ اور ان میں سے کوئی بھی اپنے اندر اخلاقی یا قانونی جواز نہیں رکھتی۔ اگر ارباب اقتدار کے پاس ان کارروائیوں کے لئے کوئی وجہ جواز ہے تو وہ ان واقعات سے عائد ہونے والے الزامات اور شبہات کو صاف کر کے عوام کو مطمئن کریں۔ ان کی خاموشی سے عوام ان سارے نتائج کو اخذ کرتے ہیں بالکل حق بجانب ہیں۔ جو ان حالات و واقعات سے صریحاً برآمد ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ارباب اقتدار مولانا مودودی کو مزید قید و بند میں رکھ کر اپنے سیاسی انتقام کے جذبہ کو کچھ تسکین دے لیں۔ مگر اس سے وہ اپنے وقار اور نیک نامی میں کوئی اضافہ نہ کرسکیں گے۔

ہر کس و ناکس جانتا ہے کہ مولانا ایک اصول پسند جماعت کے قائد ہیں اور خود بھی اصول پسند ہیں۔ مفاد پرست نہیں۔ سنجیدہ مزاج کے ہیں۔ کوئی سر پھرے سیاست باز نہیں۔ ملک اور انسانیت کے حقیقی خیرخواہ ہیں۔ کوئی سازشی قسم کے لیڈر نہیں منظم کام کرنے کے عادی ہیں اور جماعت کو بھی اس طریق کار پر چلاتے رہے ہیں۔ نہ وہ خود اور نہ ہی ان کی جماعت کسی جوشیلے پن کے مرض میں مبتلا ہے۔ انھوں نے خود بھی اور جماعت نے بھی ہمیشہ دستوری اور جمہوری طریق کار پر اعتماد رکھا ہے۔ اور اس پر پورے پورے عامل رہے ہیں۔ غیر آئینی ہنگاموں کے وہ کبھی قائل نہیں ہوئے۔ پھر سارے پاکستان کے اندر اور باہر ان سے سیاسی اختلاف رکھنے والے تو ضرور موجود ہیں مگر ان کے متعلق کوئی ایسی غلط فہمی موجود نہیں نہ ہی کسی بڑے سے بڑے پروپیگنڈہ کے ذریعہ پیدا کی جاسکتی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے ساتھ اسی قسم کا جانبدارانہ رویّہ اختیار کر کے ہمارے ارباب اختیار اپنے آپ کو برحق ثابت کرسکیں۔ پھر ہمارے عوام و خواص کی اکثریت مولانا مودودی کے ساتھ، ان کے علم، ان کے کردار، ان کی ملّی خدمات کی قربانیوں اور ان کی اصول پسندی کی وجہ سے بے حد عقیدت اور جذبات محبّت و احترام رکھتے ہیں۔ اور ان کا دائرہ اثر پاکستان کی اکثریت تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ تمام مسلمان ممالک کے مشاہیر اور عوام کی نظروں میں بھی وہ بڑے مقدس احترام کے حامل ہیں۔ مسلمان ممالک کے علاوہ لندن، جرمنی، اور پیرس جیسے عالمی مراکز میں بھی ان کے پیغام کی لہروں کے ساتھ دھڑکنے والے دل موجود ہیں۔ ان دنوں حالات ہم اپنے ارباب اقتدار کو اس مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے اور مولانا مودودی کے متعلق اپنے رویّہ پر نظر ثانی کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ مولانا کو مزید قید میں رکھ کر وہ کوئی فائدہ حاصل نہ کرسکیں گے۔ ہاں انھیں رہا کر کے وہ نہ صرف عوام کے شبہات و شکوک کو مٹا سکتے ہیں۔ بلکہ اس بے چینی اور اضطراب کا سدّباب بھی کرسکتے ہیں۔ جو اس وقت اس مسئلہ کی خاطر عوام میں پایا جاتا ہے۔!!

عبدالغفور بیگ

مراد آبادی

افکار تازہ

مطرب! وہ کہاں اب بزم طرب تکلیف رہ پرخار اٹھا
ساقی! یہ زمانِ عیش نہیں، شیشہ نہ اٹھا، تلوار اٹھا

شاعر کو تھا جس کا اندیشہ وہ فتنہ بھی آخر کار اٹھا
اک طیش میں ہر مظلوم اٹھا، اک غیظ میں ہر فن کار اٹھا

زنداں میں تو مجھ کو ڈال دیا، اے حاکم زنداں تو نے مگر
پرواز جو میری روک سکے ایسی بھی کوئی دیوار اٹھا

یہ عہد خرد ہے عہد خرد، یاں عشق و جنوں کا ذکر ہی کیا
اے واعظِ ناداں ہوش میں آ تقریر نہ کر دستار اٹھا

بے کار نہیں بے وجہ نہیں یہ کشمکش تمکین و جنوں
اے گوشہ نشینِ خلوت دل کچھ لطف سر بازار اٹھا

کیا جانئے کیا ہے اس کی طلب کھلتا ہی نہیں کچھ اس کا سبب
ہر بزم سے دل خاموش اٹھا مغموم اٹھا بے زار اٹھا

یہ رزم گہ ہستی ہے جگرؔ یاں عشق کی صحت لازم ہے
کیا اس کی حیات و مرگ کہ جو بیمار جیا بیمار اٹھا

فیصلے پر غور کر

فکر سے جن کی ہو بالا آدمیت کا چلن
جنکے ہاتھوں ہو پریشاں انجمن کی انجمن
مرحمت فرمایا ان کو حسن بخشا بانکپن
اے خدائے ذوالمنن

بے نواؤں کو نوائے پادشاہی بخشدی
چھین لی فردِ گدائی کجکلاہی بخشدی
تیری اس تقسیم پر کچھ اہلِ دل ہیں خندہ زن
اے خدائے ذوالمنن

ان کے باغوں کو بہارِ بے خزاں تو نے ہی دی
بے سہاروں بے پناہوں کو اماں تو نے ہی دی
رہ گئے سر پیٹتے پھولوں کے دل سرو و سمن
اے خدائے ذوالمنن

تو نے ہی ان کو بٹھایا مسندوں پہ تخت پر
تو نے ہی ان کو سکھایا ناز کرنا بخت پہ
ورنہ یہ کیا تھے کہ ان سے پیار کرتی انجمن

ان کے ہر آرام و آسائش کی تجھ کو فکر ہے
ان کا شہرہ آسمانوں پہ زمیں پہ ذکر ہے
یہ تری بخشی ہوئی مے کے نشے میں ہیں مگن
اے خدائے ذ

ان کے ہر اک عیب کو شاید ہنر سمجھا ہے تو
کور دیدہ ہیں جنہیں بالغ نظر سمجھا ہے تو
ہو تو گستاخی مگر سچ ہے مرا اک اک سخن
اے خدائے ذ

کیا یہی وہ ہیں جنہیں بخشا ہے تو نے بانکپن
کیا یہی ہیں پیکرِ اخلاص شیدائے وطن
خام ہیں ان کے ارادے اور عزائم میں جھکر
اے خدائے ذ

اپنی عظمت کے تصدق خدا ایک ور
ہو سکے تو اپنے پہلے فیصلے پر غور
ورنہ آدم کی جبیں کو مل نہیں سکتی شک

سرشار صدیقی
معترف و معتدل [illegible]

پرانا اصول

(۱)

ساتھ کیا دے گی

...

زالگاہوں میں
ایک سینہ سے
ساز رہتے ہیں
نام ظلم سہتے ہیں!

ں ارادوں سے
ی مشعلیں لیکر
ں میں ملتے ہیں
ی آزمائش پر
ہیں۔ منہ چھپاتے ہیں
ں" ہو جاتے ہیں
ان توڑ دیتے ہیں
چھوڑ دیتے ہیں۔

شاہ [illegible]
ں خلوتوں سے بھی
لتے ہی نہیں
ار سنگا ہے
ٹ پر آکے [illegible]
مرگاہ [illegible]
ں کا گلہ [illegible]
کی زخم [illegible]

جن کا مسکن [illegible] لیکن
سرخ لشکروں کے گیت گاتے ہیں
گاتے ہیں۔ جھوم جھوم جاتے ہیں
آگ لیتے ہیں جیل خانوں میں
پھر تو ممکن ہے پھول پیدا ہوں
ظلم و تخریب کے انگاروں میں
زندگی ان کا ساتھ کیا دے گی۔

---

(۲)

زندگی انکا ساتھ دیتی ہے

....

جو حقائق کی شاہ راہوں میں
"آدمیت" کی کھوئی عظمت کو
ڈھونڈنے کے لئے نکلتے ہیں
اپنی پلکیں بچھا کے چلتے ہیں

جو [illegible] ہیں
ان حسینوں کا ایک انداز
[illegible] ہے
جو [illegible] کی کرنوں سے
[illegible] ہیں
[illegible] ہیں

جو [illegible] کی آمد پر
[illegible]

جو ظلمت کا چاک کر کے جو
تجلیوں کو نکال لیتے ہیں
لغزش مستی میں لڑکھڑا کر بھی
قدم اپنے سنبھال لیتے ہیں
جو سکون حیات کی خاطر
زیست کا ہر سکون دیتے ہیں
اپنا سر۔ اپنا خون دیتے ہیں!

جو کڑی آزمائشوں پر بھی
کارواں سے بچھڑ نہیں جاتے
جو مصائب کو ہنس کے جھیلتے ہیں
[illegible] دھارے سے جو کھیلتے ہیں
جو عزم صمیم لیکے اٹھتے ہیں
اپنی تقدیر خود بنانے کو
قسمتیں جن کے گرد گھومتی ہیں
منزلیں جن کے پاؤں چومتی ہیں

جن کا دامن زمین ہے... لیکن
آسمان کو غلام کرتے ہیں
پیار محبت کو عام کرتے ہیں
[illegible] کی آواز سنتے ہیں
زندگی کی جھلک سنتے ہیں
دل کی دھڑکن کے نغمے بنتے ہیں
زندگی ان کا ساتھ دیتی ہے

محمد عثمان تبریزی ـ ۱ ـ ہ

ادب اور تحریکیں

ادب جمالیات کا مظہر ہی نہیں، ادب صرف زندگی اور سماج کا آئینہ دار ہی نہیں، بلکہ ادب کے وسیع دائرہ میں یہ پوری کی پوری کائنات ہے انسان میں ان کی پیدائش کا مقصد ہے اور اس مقصد کی تکمیل کے تقاضوں کا پورا کرنا بھی شامل ہے۔ اگر کوئی ادیب گل گلشن میں جلا حقیقی کو نہاں اور روپوش بنا کر سبکدوش ہونا چاہتا ہے تو اب اس کا وقت نہیں اگر کوئی ادیب محض "روٹی" اور "بھوک" کے نعرے بلند کر کے ادب کا حق ادا کرنا چاہتا ہے تو اس کا بھی زمانہ جاتا رہا۔ اس لئے کہ انسانی فکر کا بہتا ہوا دھارا اب ایک ایسے موڑ سے گذر رہا ہے جہاں اسے ادب کی تنگ دامانی کا احساس شدت سے ہونے لگا ہے۔ جہاں وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ جمالیاتی تصورات "روٹی" اور "بھوک" سے بڑھ کر بھی کوئی چیز ہے۔ یہ احساس روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے مفکرین نے اس نہج پر سوچنا شروع کر دیا ہے کہ واقعی یہ دنیا بیکار یا عبث نہیں بنا دی گئی۔ اس کی ایک غرض ہے، ایک غایت ہے جس کو دوسرے انسانوں تک پہنچانے کا کام ادب سے لیا جاتا ہے۔ ادب ہی انہیں بتلائے گا کہ ان کی تخلیق کا مقصد کیا ہے اور انھیں اس آزمائش گاہ عالم سے کیا لینا اور کیا چھوڑنا ہے۔

انھیں مفکرین کا یہ خیال بھی ہے کہ تلاش حقیقت کے لئے انسانی فکر ہی کافی ہے۔ یہ خیال کرتے ہوئے وہ طرح طرح کے فلسفے پیش کرتے ہیں، انہیں فلسفوں کے اوپر ادب کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ اسی سے درس حیات لیتے اور اسی پر عمل کر کے زندگی میں حرکت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاں فلسفوں میں اختلاف رہا وہاں ادب میں بھی اختلاف پایا گیا اور جہاں کے لوگ فلسفے جس طرح کے رہے وہاں کی عملی سرگرمیاں بھی ویسی ہی رہیں۔

ادب کی بہت سی قسموں کو نظر انداز کرتے ہوئے میں یہاں [illegible] کو لیتا ہوں [illegible] De Quincey [illegible]

اس نے ادب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے وہ کہتا ہے "اول ادب علم Literature of Knowledge ہے دوئم ادب قوت Literature of Power اس میں ایک فلسفہ سے ہے اور دوسرے کا حرکت سے۔"

ادب اور فلسفہ کسی طرح بھی علیحدہ نہیں کئے جا سکتے۔ بغیر ادب ایک بے معنی نغمہ سے زیادہ نہیں اور بغیر ادب کے فلسفہ ایک ڈھانچہ کے سوا کچھ نہیں۔ ادب اور فلسفہ ساتھ ساتھ چلتے ہیں [illegible] کا جملہ ہے "ہر ادب کا ایک فلسفہ ہے" ناقد آپ [illegible] کا یہ بیان ہے کہ "ادب اور فلسفہ دو متوازی خطوط پر آگے بڑھتے ہیں [illegible] زمانے کے ادب کو اس کے فلسفہ سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور کسی دور کے فلسفہ کو اس کے ادب سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور کوئی بھی "ادب برائے علم" اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب کہ دونوں کا امتزاج [illegible]

جس طرح "ادب برائے علم" پیدا کرنے کے لئے ادب اور [فلسفہ کا] امتزاج ناگزیر ہے اسی طرح "ادب برائے قوت" کے لئے اسے [کسی] تحریک سے وابستہ ہونا لازمی ہے۔ لیکن چند لمحوں کے توقف [کے بعد] اگر ہم سوال کریں کہ "کسی تحریک کی بنیاد کس پر قائم ہوتی ہے" تو یقیناً [جواب] ملے گا "فلسفہ پر"

اس طرح فلسفہ، ادب اور حرکت سے ایک ایسی مثلث [بنتی] ہے کہ ادب سے اگر فلسفہ اور حرکت کو الگ کر دیا جائے تو وہ ادب بن کر رہ جاتا ہے۔ اگر فلسفہ سے ادب اور حرکت کو نکال لیا جائے تو تخیل کی بھول بھلیاں ہو کر رہ جاتا ہے اور اگر حرکت سے فلسفہ و ادب [علیحدہ] کر لیے جائیں تو وہ اندھی قوت Blind Force [illegible]

فلسفہ کے اس مرکزی حیثیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے [illegible]

ادب اور ان کے ساتھ ہی ساتھ ان کی حرکت و تحریک۔

دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ زمانہ کی ہر کروٹ کے ساتھ ہی ساتھ ایک تحریک پیدا ہوئی اور دوسری کروٹ کے ساتھ وہ ختم ہو گئی۔ مگر کچھ تحریکیں مٹ جانے کے بعد بھی اپنے نقوش چھوڑ گئیں۔ اور کچھ مٹ جانے کے بعد ممکن ہے کہ اپنے نقوش چھوڑ جائیں یا الفاظ دیگر یہ کہ اس طرح کی تحریکیں خواہ وہ ختم ہو گئی ہوں یا چل رہی ہوں ایک تاریخی مقام رکھتی ہیں۔ فاشزم Fascism اشتراکیت Communism اور جمہوریت Democracy اس کی تین مثالیں ہیں۔ یہ تحریکیں اپنا ایک فلسفہ اور ایک مخصوص ادب رکھتی ہیں۔ جو اسلامی فلسفہ اور اسلامی ادب سے بالکل ہی مختلف ہیں۔ میں ان مذکورہ تین تحریکوں میں سے پہلے فاشزم لیتا ہوں

اگر ہم فاشزم کا تجزیہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ڈارون کے فلسفہ بقائے اصلح Survival of the fittest، سپنسر کے فلسفہ عزم القوت will to power اور نٹشے کے فلسفہ "خونی دستور" Blood-Bond نے اس پر بڑی حد تک اپنا اثر کیا۔ بلکہ اگر ہم یہ کہیں کہ نازی تحریک Nazism "فلسفہ عزم القوت" کی پیداوار ہے اور ہٹلر فلسفہ خونی دستور کا مظہر تو شاید بے جا نہ ہوگا اسلئے کہ اسپنسر کا اثر نازی تحریک پر کتنا اور کس طرح ہوا اس کا اندازہ مشہور مورخ روزن برگ Alfred Rosenberg کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے "تاریخ اور وقت کا طبقہ وارانہ جنگ سے کوئی تعلق نہیں یا اس کا کلیسائی رجحان اور خود رائی کی کشمکش سے کوئی رشتہ نہیں بلکہ خون اور خون، نسل اور نسل، اور عوام اور عوام کی جنگ کا نام تاریخ ہے۔ اس جنگ میں جو نسل کامیاب ہوگی وہی افضل ہوگی۔"

جرمن اپنے آپ کو سب سے افضل تصور کرتے تھے ان کا یہ خیال تھا کہ وہ یورپ کی دوسری قوموں میں سب سے زیادہ قوی ہیں۔ قبل اس کے کہیں کچھ اور کہوں یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جرمنوں کے اندر یہ خیال پیدا کیوں کر ہوا۔ اس کے حسب ذیل وجوہ ہیں۔

۱۔ فلسفہ عزم القوت will to power کا غلط اثر۔

۲۔ [illegible]

ملک اس نیاری [illegible]

۳۔ آسٹریا کا جارحانہ اقدام اور جرمن جذبہ قومیت کا اس کا اثر

۴۔ اشتراکیت سے دشمنی اور اسے شکست دینے کے لئے جذبہ قومیت کا ابھار

۵۔ ہٹلر کی اپنی شخصیت۔

۶۔ ادیبوں کا فلسفہ قومیت کو اصول ادب سمجھ کر ان کی قوت کو بھڑکانا۔

اس نسلی افضلیت کے تصور نے جرمن ادب پر جو اثر ڈالا ہے ان کا تجزیہ اب ہمارے لئے آسان ہے یہ اسی نسلی افضلیت کے تصور کا نتیجہ تھا کہ نازی تحریک اور نازی ادب نے جنم لیا جیسے بیتھل Bithell، J. کے نزدیک نازی ادب کی مندرجہ ذیل خصوصیات ہیں۔

۱۔ نازی لٹریچر کا سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ وہ فرد کے جذبات کا نہیں بلکہ نسل Race کے جذبات کا اظہار کرے گا۔

۲۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ صحت نسل چونکہ سرزمین ملک سے ابھرتی ہے شہر سے نہیں اس لئے نسلوں کی سب سے عمدہ قسمیں شہر کے بجائے اسی خطہ زمین پر پائی جا سکیں گی۔

اور (۳) تیسرا اصول یہ ہے کہ جرمن نسل بہ لحاظ خون چونکہ جانباز ہے اس لئے ان کے ادب میں بھی اس جذبہ جانبازی کا ہونا ضروری ہے۔

بیتھل نے نازی ادب کے مثبت پہلو پر تو روشنی ڈالی مگر منفی کو نظر انداز کر گیا۔ حالانکہ نازی ادب ایں یہودیوں سے دشمنی، اشتراکیت کی مخالفت، جمہوریت سے بیزاری اور دوسری قوموں کی تحقیر کے جو شدید جذبات پائے جاتے ہیں وہ کسی طرح بھی اصول کی حیثیت سے کم نہیں۔ بیتھل کی مذکورہ خصوصیات میں نازی ادب کی شخصیت پرستی کا بھی کوئی ذکر نہیں حالانکہ نازی ادیب نے جہاں کہیں بھی جرمن قوم کی افضلیت کا ذکر کیا ہے وہیں اکثر وبیشتر ہٹلر کے بھی گن گائے ہیں۔

ہمارے لئے یہ حیرت کی بات بالکل نہیں ہونا چاہئے کہ ہم اس [illegible]

[illegible]

[illegible]

بلاے خون Blood and Bodenliteratur کا
نظریہ سب سے زیادہ زور دار الفاظ میں وضاحت اور تعمیر داری heimat
Marre نے پیش کیا۔ اس نے اس مضمون پر دو ضخیم کتابیں تصنیف
کیں۔ اس کے بعد نسل پرستی ہیوسٹن اسٹیورٹ چیمبرلین نے نقطۂ منتہا تک
پہنچایا۔ اس نے موئلر وان دن برکس Moeller van den
Bruck کی تحقیقات سے بہت فائدہ اٹھایا۔ مگر ان سب سے بڑھ چڑھ
کر خود ہٹلر کا دوست روزنبرگ Rosenberg تھا جس کا ذکر آچکا
ہے۔

ان میں سے ہر ایک کا کیریر Career جنگ عظیم ۱۹۱۴ سے
پہلے شروع ہوتا ہے۔ اور وہ اس کے بعد بھی اسی سرزمین میں اپنے فلسفۂ ادب
کے ساتھ ہر یا در جرمنی کے ماحول میں سانس لیتا ہے۔ مگر ہزاروں طرح کے
نقصانات اٹھانے کے باوجود اس کی آنکھیں پہلے کی طرح بند رہتی ہیں اس
کا نسلی افضلیت کا زعم ویسے ہی برقرار رہتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے
کہ ہٹلر جنگ کی بھٹی میں جھونکنے کے لئے ایک بار پھر ابھارتا ہے، وہ ایک
بار پھر جرمن کا نعرہ لگاتا ہے اور نتیجتاً ایک بار پھر خون اور ادب برائے خون
کا فلسفہ جنگل کی آگ کی طرح پھیل جاتا ہے۔ ہٹلر کے اس نعرہ کے بعد
نئی نئی جماعتیں وجود میں آگئیں جو نازی فلسفۂ ادب کی حامل تھیں۔ ان
میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

۱۔ دی لیبر اسٹیٹ سروس

۲۔ دی ہٹلر یوتھ

۳ دی آرڈر آف جرمن ویمن اور

۴۔ دی نازی جرمن اسٹوڈنس لیگ۔ ان کے سروں میں جو سودا
سما وہ یہی تھا کہ جرمن نسل دنیا کی دوسری... نسلوں میں سب سے
افضل اور برتر حیثیت انسان دنیا کے تمام انسانوں سے اعلیٰ greater
اور بہتر ہیں سے لیڈر پرنسپل Leader principle) اور
لیڈر اسٹیٹ Leader State کا تصور پیدا ہوا انہیں کو جرمن
Fuhrerprinzip فیوہرپرنسپ اور
فیوہراستات Fuhrer Staat کہتے تھے۔

جرمن پرستی اور ہٹلر پرستی کا جذبہ ان اقتباسات سے واضح ہے

"جو ہٹلر کی خدمت کرتا ہے وہ جرمنی کی خدمت کرتا ہے
جرمنی کی خدمت کرتا ہے وہ خدا کی خدمت کرتا ہے۔

"فیوہرر....! ہم کو دیکھو ہماری حفاظت کرو، ہم تمہارے
جرمن نسل کے باشندے ہیں۔

"ہم جرمنی کے سوا اور کسی کو خدا بنانا پسند نہیں کرتے"
یہ ہے نازی ادب کی روح اور یہ ہے نازی تحریک۔ اس
کے بعد اس پر کوئی تنقید کروں میں جمہوری ادب اور اشتراکی ادب
دیکھ لے پیش کرتا ہوں

تحریک جمہوریت کوئی نئی تحریک نہیں۔ اس کے ڈانڈے
جمہوریت سے ملائے جاتے ہیں اور (فلاطون) کو جمہوریت کا مبلغ
کیا جاتا ہے۔ مگر انقلاب فرانس کے بعد روز بروز اس کی صورت
سی ہو گئی۔

انقلاب فرانس کا نعرہ آزادی اخوت، اور مساوات تھا۔
جمہوریت اور جمہوری تحریک کے داعی اسی نعرہ کو فضا میں اچھالتے
کر ڈیک فرنٹ Democratic front کی بڑی بڑی
اکثر بیشتر اعلانات کے ذریعہ دنیا کو تسکین و تسلی دیتی رہتی ہیں۔
ممالک۔ امریکہ۔ انگلینڈ اور فرانس اپنے ادب، اپنی نشرگاہوں اور
صحافت سے دنیا پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ وہ کسی
لڑنا جھگڑنا یا کسی طرح کی بھی دشمنی مول لینا نہیں چاہتے۔ وہ کسی
پس ماندہ غلام دیکھنا پسند نہیں کرتے، اور وہ کسی ملک کی آزادی
کبھی نہیں کرنا چاہتے اپنی اس روش کو ثابت کرنے اور دنیا کو یقین
میں امریکہ سب سے پیش پیش ہے۔ امریکہ کی اس جمہوریت پسند
لیتے ہوئے سامان دو ممالک کا ضمناً ذکر کر دینا کافی ہوگا۔

روسو نے انقلاب فرانس سے پہلے یہ کہا تھا کہ انسان
ہوا تھا لیکن وہ ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا نظر آتا ہے" امریکہ روسو
سے پہلے ہی آزاد ہو چکا تھا۔

مگر دنیا میں اس کی کوئی آواز نہ تھی۔ آزادی پیدا کرنے
وہ اپنی خام معدنیات Raw Materials کا اچھا
استعمال کرتا رہا اور اپنے آپ کو ہر ضرورت زندگی کے سامان سے

میں کوشاں رہا تھا اس میں اسے خاطر خواہ کامیابی ہوئی یہاں تک کہ وہ بیسویں صدی میں ایک بہت بڑی قوت بن کر تاریخ کے اسٹیج پر آگیا۔

اسی جد و جہد کے دوران میں اس کے فلسفیانہ رجحانات بھی بنتے رہے۔ اس کے فلسفیانہ فکر کا پہلا مرحلہ سقراط، افلاطون اور ارسطو سے متاثر نظر آتا ہے پھر بیکن۔ ڈیکارٹ اور نیوٹن سے اس کے بعد ٹامس اکوئینس سے مگر آج کل امریکہ کا رجحان فلسفہ پرگمیٹزم pragmatism کی اشاعت کی طرف ہے۔ پرگمیٹزم pragmatism یونانی لفظ پرگیما prag[illegible] بمعنی۔ سے مشتق ہے، اصطلاح فلسفہ میں پرگمیٹزم اسے کہتے ہیں جس میں "عمل" فائدہ" اور تسلی بخش نتیجہ ظاہر ہو۔

اس کا اثر امریکن لٹریچر پر بہت زیادہ ہوا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ اہل امریکہ میکسیکو کی چاندی اور دنیا بھر کا گیہوں لے کر "عمل" "فائدہ" اور تسلی بخش نتیجہ کی روشنی میں سوچنے لگے۔

جہاں تک عملی اقدام کا تعلق ہے انھوں نے ہر ملک (بالخصوص ایشیائی ممالک) میں ڈالروں کا جال بچھانا شروع کر دیا۔ جہاں تک "فائدہ" کا تعلق ہے۔ انھوں نے اپنی کثیر دولت کا ایک حصہ قرض دینا شروع کر دیا تاکہ مقروض ممالک اقتصادی طور پر ان کے غلام رہیں اور "تسلی بخش نتیجہ"... کے حصول کا جہاں تک سوال ہے تو انھیں یقین ہے کہ روس کے علاوہ دنیا میں اور کوئی ملک ان سے ٹکر لینے کی جرأت نہیں کر سکتا اور اگر کسی نے ایسی غلطی کی تو وہ پس جائے گا۔ اس لئے وہ امریکی ادب جو ڈالروں کی جھنکار میں لکھا جاتا ہے مندرجہ ذیل خصوصیتوں کا حامل ہے۔

۱۔ امریکہ انسانیت پسند، صلح پرور اور جنگ کا مخالف ہے۔

۲۔ امریکہ اپنے پڑوسی ممالک کا ہمدرد ہے۔

۳۔ امریکہ ظلم و استبداد یا الفاظ دیگر اشتراکیت کے بڑھتے ہوئے دھارے کو روکنے کا ضامن ہے۔

۴۔ امریکہ آزادی کا محافظ اور پاسبان ہے۔

۵۔ امریکہ قوموں کو امتیاز رنگ و نسل کو مٹا کر ایک بین الاقوامی شہری تیار کرنا چاہتا ہے اس خیال کو ونڈل ویلکی نے بونسکو کا تصور فلسفہ" کے عنوان سے لکھے ہوئے مضمون میں یوں پیش کیا ہے یونسکو کی فلسفیوں کو ختم کر کے عالمگیر فلسفہ World philosophy قائم

کرنا چاہتا ہے۔

قبل اس کے کہ میں اشتراکی ادب کو پیش کروں بہتر سمجھتا ہوں کہ ان جمہوریت پسند ادیبوں کی طرف بھی اشارہ کر دوں جو انسان کو ہر طرح کے ظلم استبداد سے آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان ادیبوں کی طرف سے ایک تجویز سامنے آئی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک عالمگیر ریاست قائم ہونی چاہئے جہاں رنگ و نسل اور ملک و وطن کا امتیاز بالکل ہی نہ ہو۔ ایک ایسی ریاست ہو جس میں ہر فرد بجائے کسی خاص ملک۔ پاکستان، امریکہ، روس کے دنیا کا شہری ہو۔ اس عالمگیر ریاست کا نظم کیا ہوگا یہ بھی واضح ہے انسان کے فکر و عمل سے اس کی تشکیل ہوگی اور کرتا دھرتا انسان ہی ہوگا اس کی تربیت درسگاہوں اور دوسرے تعلیمی اداروں میں ہوگی۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ معاشرے کے تمام افراد اسی طرز پر سوچنے لگیں اس سوال کو خود ایچ جی ویلز نے پیش کیا اور پھر اس کا جواب یہ دیا کہ یقیناً عالمگیر ریاست کا یہ تصور بہ لحاظ عمل ممکن ہے اور اس سلسلے میں اس نے یہ بھی کہا کہ جب عیسائیت اور اسلام جیسی تحریکیں ایک فرد سے دنیا میں پھیل سکتی ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس معاملہ ، انسان کو ناکامی ہو مگر ایچ جی ویلز نے شاید عیسائیت (غیر مسخ شدہ) اور اسلام کی قوت پر غور نہیں کیا عیسائیت (غیر مسخ شدہ) اور اسلام نے جس عالمگیر ریاست کا تصور پیش کیا اس کا حاکم اعلیٰ خود اللہ ہے جس سے ایچ جی ویلز اور اس طرح کے دوسرے مفکرین کا خاکہ بالکل خالی ہے۔

اب میں اشتراکی ادب کی طرف آتا ہوں۔ روس میں ادبی، سیاسی انقلاب آنے سے پہلے ہم دیکھتے ہیں کہ زار کی قوت برائے نام رہ گئی تھی اس کو شکست دینا کوئی مشکل کام نہ تھا اس لئے کہ جنگ کریمیا اور جنگ جاپان نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ زار کی قوت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ للذا اس کے خاتمے کا مطلب یہ تھا کہ روس کا ادب، روس کا معاشرہ اور روس کی سیاست ایک نئے راستے پر چل پڑی ہے۔ روس میں ادیبوں اور مفکروں کی جماعتیں اسی طرح پیدا ہو چکی تھیں جس طرح انقلاب فرانس سے پہلے فرانس میں فلسفیوں اور ادیبوں کی، ٹالسٹائی ترگنیف اور دوستوں دسکی جیسا ادیبوں نے وطن کے شاعروں کو اپنے ادب پاروں سے بیدار شروع کر دیا۔ روس کے ذہین طبقوں نے مغربی خطوط پر روس کی اصلاح کا مطالبہ کیا اور یہ لوگ The Radical Intellectuals کہلاتے ہیں

مارکس Bernard اور سیکرٹری Marx کی طرز پر سوچتے ہوئے اشتراکیت Socialism اور مارکسزم (مزاج) کو لانا چاہا۔

روس کی حکومت بڑی تیزی سے بدل رہی تھی۔ ذہنی پستی، افلاس غربت اور اقتصادی ابتری کی وجہ سے اشتراکیت... کی لہر تیزی سے تیز ہوتی گئی یہاں تک کہ کیرنسکی Kerensky کو ملک بدر ہونا پڑا لینن اور ٹراٹسکی نے بالشویک حکومت کے نظم کو سنبھالنے کے لئے آگے قدم بڑھائے۔

انھیں اس انقلاب کو کامیاب بنانے کے لئے لاکھوں جانیں نذر کرنی پڑیں۔ ہزاروں بسے بسائے مکانات جلانے پڑے اور بے شمار عصمتوں کی قربانیاں دینی پڑیں۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ یہ انقلاب جس کے جبر و دباؤ سے آیا تھا ان کے ساتھی صرف فیکٹری کے مزدور کسان اور فوجی تھے۔ پادری، زمیندار اور تاجر پیشہ لوگ اس سے اول روز سے اختلاف رکھتے تھے۔ وہ اپنی زندگی کے آخری لمحے تک اس انقلاب کو اپنی موت تصور کرتے رہے۔ روس کا ادب بھی اس خونی دور سے گزرا۔ ادیبوں نے تڑپتے ہوئے لاشے، بھوک کے ڈھانچے عریاں جسم اور موت کی آغوش میں سوئی ہوئی عورتیں کو دیکھا لیکن حکومت ——— "مزدور حکومت" نے ادیبوں کے قلم توڑ دیئے، اور اکثر کو قید کر دیا۔ اختر حسین رائپوری نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے لکھا ہے بالشویکوں کے ہاتھ میں عنان حکومت آتے ہی اکثر ادیبوں نے روس کو خیرباد کہا جن میں کیرن بونن اور اوز میرشوف جیسے نامور اہل قلم تھے۔

ان روسی ادیبوں پر مذکورہ انقلاب کا اثر اتنا ہوا کہ بہت سے ادیب اپنی پرانی ڈگر سے ہٹ گئے اور بہتوں کے دل پر انقلاب کا سکہ کچھ اس طرح بیٹھا کہ اسی کے گن گانے لگے۔ اپنی پرانی ڈگر سے ہٹ جانے والوں میں بلوک اور بیلی ہیں۔ اور گن گانے والوں میں میکوفسکی اور پاسترنک ہیں۔

تقریباً چار سال تک روسی ادبا اپنے ملک کے ہولناک مناظر دیکھنے میں اس طرح گم رہے گویا اس کرۂ ارض پر ان کا وجود ہی نہیں۔

اور چار سال کے بعد جب زبان کھلی تو وہ بھی انقلاب کی حمایت میں۔ وہ بھی کسی معمولی ادیب کی نہیں بلکہ انگر میتذ رونگ کی جو پہلے ہی سے ادب میں اپنا مقام پیدا کر چکا تھا۔ انقلاب کے بعد ہی سے تمام شعرا ادیب اشتراکیت کے گیت اس طرح گاتے چلے آ رہے ہیں جیسے روس میں

کوئی انقلاب ——— خونی انقلاب آیا ہی نہیں تھا۔ انھوں نے بھلا دیا ادیب سب کچھ انہیں اس لئے بھلا دینا پڑا کہ خوفناک شبانہ کی طرح ان کے پیچھے پیچھے لگی رہتی تھی۔ ان ادیبوں ہی کی بہ باشندگان روس اور ہر طرح کے آنے جانے والے مہمانوں کی ادبی نقل و حرکت بھی اس ملک کو معلوم ہوتی ہے۔

پھر بھی ادب اس تحریک کے ساتھ ساتھ چلنے کی کو ... ہے۔ اس ادب کی فلسفیانہ بنیادیں وہی ہیں جو اس تحریک کی اشتراکی تحریک چونکہ فلسفۂ مارکس کی پیداوار ہے اس ادب میں بھی مارکس کا فلسفہ کارفرما نظر آتا ہے۔ وہ فلسفیانہ اصول ذیل ہیں۔

۱۔ مادہ کے علاوہ اور کوئی ایسی شئے نہیں جسے ہم ... یا اور کچھ کہہ سکیں۔

۲۔ دنیا میں تاریخ کی ابتدا طبقہ وارانہ جنگ سے ہوئی ... جنگ دنیا سے اسی وقت ختم ہوگی جب ساری دنیا میں مزدور حکومت قائم ہو جائے گی۔

۳۔ اخلاقی قدریں Moral values بدلتی ...

۴۔ دولت اور ملکیت حکومت کی ہے۔

پھر جو چیزیں ان اصولوں سے نتیجتاً اخذ کی جا سکتی ہیں ... خدا کا تصور اس پر ایمان اور اعتقاد بے بنیاد ہیں۔ "لافانی روح" Mythological ... کی حیثیت میں ہیں ... روح کو ضرورت نہیں۔

۲۔ مزدوروں اور کسانوں کی جنگ جیسے دولتمند ... داروں سے رہی لہٰذا موخرالذکر قابل نفرت ہیں ... کا سرمایہ ... کا فطری حق ہے۔

۳۔ اخلاقی قدریں ہر عہد ... بدلتی رہتی ہیں ... صحیح اور غلط کے معیار بھی بدلتے رہتے ہیں۔

۴۔ حکومت کی ملکیت ... کی ... محنت کیں نہ کرے وہ اس کی ... نہیں ... اشتراکی ادب ... ہے ...

ستان اور ہندوستان کے اشتراکی ادیبوں کے یہی موضوعات ہیں جن

وہ خامہ فرسائی کرتے ہیں۔

پاکستان کے اشتراکی ادیبوں کا رد یہ ظاہر ہے کہ وہ تمام
معاشی، اقتصادی اور معاشرتی مسائل کا واحد حل تصور کرتے ہیں۔ بالغرض
اشتراکیت کو زندگی - سماجی زندگی کی مشکلات کا واحد حل بتلاتے ہیں۔

سجاد ظہیر، ممتاز حسین، احمد ندیم قاسمی، چراغ حسن حسرت، ظہیر
کاشمیری، ابراہیم جلیس، اور جاں نثار اختر اس نظام کے داعی ہیں۔ ان میں
روسی ادیبوں میں بس اتنا ہی فرق ہے کہ روسی ادبا اس ماحول میں رہ
اس کے گن گا رہے ہیں۔ اور یہ حضرات کو یہ زبان کی ہر پیچ گھمائیوں۔۔ کی
بہ حسرت و یاس دیکھ رہے ہیں۔ وہ اس ماحول [illegible] کے منتظر
جس میں روسی ادیب سانس لے رہے ہیں وہ اس ماحول کی تمنا کی
پرورش کر رہے ہیں جیسے وہ "مزدور کی جنت" ترک کر سکتے ہیں مگر جو ادب
کے لئے باعث موت ہے۔ میرا اس ماحول کو "باعث موت" کہنا کوئی عصبی
و جذباتی فیصلہ نہیں اس لئے کہ ابتدائی چند سالوں میں روسی ادب کو جس
دور بند سے گزرنا پڑا اس کی طرف میں نے پہلے ہی اشارہ کر دیا مگر ۱۹۲۸ء میں
جب پنج سالہ پروگرام تیار ہوا تھا تو سرکاری انجمن نے باقاعدہ اعلان کر دیا کہ سوویت
ادب کا فرض منصبی یہ ہے کہ پنج سالہ پروگرام اور طبقاتی جنگ کا آئینہ دار ہو یعنی
دیہاتوں کی اجتماعیت، صنعتی ترقی، امیر زمینداروں کی مخالفت اور سرخ
راج کی تنظیم میں ادب کو حکومت کی حمایت کرنا چاہئے۔ ادبی تصنیف کی
قدر و قیمت کا معیار یہ قرار دیا گیا کہ وہ کس حد تک پنج سالہ پروگرام کی تکمیل میں مدد
پہنچاتی ہے۔ اس سے جو نتائج برآمد ہوئے وہ ظاہر ہیں۔ ایک طرف تو روسی ادیبوں
نے حکومت کے پنج سالہ پروگرام کی اس طرح قصیدہ خوانی شروع کی جیسے
اس سے پہلے ہندوستانی شعراء مثل بادشاہوں کی کیا کرتے تھے [illegible]
پاپائیت، ادب اگر [illegible] نظام کی اس طرح تردید کہ ان کی حیثیت
[illegible]
[illegible]

حکومت کی [illegible]
[illegible]
[illegible]

ادیبوں کا وہ طرز [illegible] جو حکومت چاہتی تھی یہ تک کہ حکومت کے خوف سے [illegible]
مجبور کر دیا کہ وہ بھی لکھیں اور پڑھیں جس میں حکومت کی رضا ہو۔

اب اس مضمون میں ہم ایسے مقام پر آگئے ہیں جہاں ان تحریکی [illegible]
ادب پر تنقید ہو سکتی ہے سب سے پہلے میں فاشزم و نازی ادب کو لیتا ہوں
اس کے خلاف اسلامی نقطہ نظر سے جو اعتراضات کئے جا سکتے ہیں وہ حسب
ذیل ہیں۔

۱۔ نازی ادب میں "خون اور ادب برائے خون" کا نظریہ انسانیت کا خون
ہے۔ اس سے نازی ادب اور جرمن قوم کی تنگ نظری اور سطحی فکر کا پتہ چلتا ہے

۲۔ نازی ادب کا غلط فلسفہ سے متاثر ہو کر اپنی قوم میں اپنی افضلیت
کی غلط فہمی پیدا کر دینا بالآخر باعث بربادی ہوا۔

۳۔ پھر یہ کہ نازی ادب کا شخصیت پرستی میں غلو سے کام لینا نہ صرف
اس شخصیت کی موت کا باعث ہوا بلکہ اپنی قوت کا بھی۔ نطشے کا یہ جرمنی دیوتا
Blond - Beast آج دنیا کی تاریخ میں وحشت عبرت کے سوا
کچھ بھی نہیں۔ ہر وہ ادب جو ڈکٹیٹر پرستی کی طرف ذرا بھی قدم بڑھائے گا تو
اس کے ڈکٹیٹر کا حال تو وہی ہو گا جو ہٹلر کا ہوا اور ادب کا حشر وہ ہو گا جو نازی
ادب کا ہوا۔

اس میں کوئی استثناء نہیں۔ خواہ یہ اشتراکی ڈکٹیٹر شپ ہو یا جمہوری
نتیجہ بہر حال وہی ہوتا ہے۔

جہاں تک جمہوری ادب کا تعلق ہے تو یہ انسان کو صرف حسن فریب
میں مبتلا رکھتا ہے۔ فرانس جمہوریت اور حریت پسند ہوتے ہوئے بھی تیونس
کی تحریک آزادی دبا رہا ہے۔ انگلینڈ کو ایران کے تیل سے اب بھی خاصی
دلچسپی ہے اور امریکہ ______ نسل و رنگ کے امتیازات کو [illegible]
حامی ______ افریقہ کی جدوجہد کو باشندوں کی حیثیت سے دیکھ رہا ہے
دنیا کے مختلف گوشوں سے جب اس طرح کے مسائل سامنے آ رہے ہیں
[illegible] جمہوریت پسندی کا محض پرچار ہو جاتا ہے۔

[illegible] اشتراکی ادب کا [illegible] کے تصور سے بالکل عاری ہے بلکہ
[illegible] حریف [illegible] اشتراکی ادب [illegible]
[illegible]
[illegible]

اشتراکی ادیبوں کا یہ ایمان و ایقان ہے کہ دنیا کا معاملہ دنیا ہی تک ہے انھیں دنیاوی زندگی کے بعد نہ تو کسی ہستی کے سامنے جواب دہ ہونا ہے اور نہ ہی انھیں اعمال کے عذاب و ثواب کی منزلوں سے گذرنا ہے ان کا فریضہ تو بس یہ ہے کہ وہ مارکس کے دیئے ہوئے اصولوں کو برتیں۔ ایسے اصولوں کو برتیں جو غریبوں، مزدوروں اور کسانوں کے لئے انقلاب لاتا ہے مگر جس میں غریبوں مزدوروں اور کسانوں ہی کا خون ہوتا ہے۔

میں پاکستان میں اشتراکی ادب کے بدلتے ہوئے نعرہ ہائے ادب ——— "ادب برائے زندگی"، "ادب برائے عوام" اور "ادب کے لئے انقلاب" پر کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہتا اس کے جنسی میلان کی طرف بھی کوئی اشارہ کرنا نہیں چاہتا بلکہ اسلامی ادب اور اس کے اس بنیادی فرق و امتیاز کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں جہاں سے زندگیوں کے راستے بدل جاتے ہیں یعنی توحید، رسالت اور معاد یہ تینوں بنیادیں فلسفیانہ گتھیاں نہیں بلکہ زندگی کی حقیقتیں ہیں۔ دنیا کا بدلتا ہوا رجحان اور مختلف نظام ہائے زندگی کی شکست (جس میں فاشزم، جمہوریت اور اشتراکیت بھی شامل ہیں) اس کے لئے ٹھوس دلائل ہو سکتے ہیں۔

اب میں اسلامی ادب کی طرف آتا ہوں ۱۹۴۷ء کی تقسیم کے بعد جب خدا کے فضل و کرم سے ایک اسلامی ریاست وجود میں آگئی تو زندگیوں کو اسلام کے دیئے ہوئے اصولوں کے مطابق تیار کرنے کی ضرورت کا شدید احساس پیدا ہونے لگا۔

اسلام پسند مفکرین نے آگے بڑھ کر ان احساسات و جذبات کو سراہنا شروع کیا بلکہ اسی کو اپنا مقصدِ زیست بنا۔ انھوں نے مختلف شعبہ ہائے حیات کے لئے اسلام کے دیئے ہوئے اصولوں کو پیش کرنا شروع کیا اسی طرح ——— اسی لگن کے ساتھ ——— بلکہ پہلے سے بڑھ کر اس لئے کہ اسلامی ریاست وجود میں آچکی تھی، انھوں نے میدان ادب عمل میں تگ و دو شروع کر دی۔

ادب اور ادیبوں کی خدمات چونکہ ایسی صورت میں ضروری اور ناگزیر تھیں اس لئے ان اسلام پسند مفکرین نے اسلامی ادب کی رفتار کو بھی تیز کر دیا مگر مختلف گوشہ ہائے ملک سے سوالیہ نشانات ابھرنے لگے کہ "اسلامی ادب کیا ہے؟" اس کا جواب ماہر القادری اور نعیم صدیقی وغیرہ ہی حضرات نے کافی وضاحت کے ساتھ دیا ہے۔ ان جوابات کے بعد کوئی یہ تو نہیں کر سکتا کہ اسلامی ادب کیا ہے۔ البتہ وہ اس کی فلسفہ اور اس کے مقاصد سے انکار کر سکتا ہے۔ یہ انکار بھی اسی وقت جب کہ کوئی شخص اپنے ضمیر کو کچل دے اور اپنے احساسات ورنہ جس طرح اسلام دین فطرت ہے اسی طرح اسلامی ادب حیات کا ایک مجموعہ ہے۔ اس کے فلسفیانہ اصولوں کو ہم مختصراً ہیں۔

۱۔ اسلامی ادب توحید کا قائل ہے وہ ایک ایسے خدا ہے جو محض اس کائنات کا خالق ہی نہیں بلکہ مالک، حاکم اور خدا کا یہ تصور صوفیوں کے تصورِ خدا سے (جو لامحدود میں محدود زندگی سمجھتے ہیں) بالکل مختلف ہے۔ خدا کا یہ تصور عیسائیوں خدا سے بھی کوئی میل نہیں رکھتا جو خدا کو محض گناہوں کا بخشنے خدا کا یہ تصور اشتراکیت اور فاشزم کے تصورِ خدا سے بھی بالکل اس لئے کہ اشتراکیت اور فاشزم کا خدا انسانوں میں سے ہی ہوتا ہے۔ یعنی ڈکٹیٹر۔ !!!

۲۔ اسلامی ادب کا دوسرا اصول یہ ہے کہ وہ خدا کی سیرت کا پورا پورا خاکہ پیش کرتا ہے جس نے خدا کے احکام سے انسانوں کی زندگیوں پر جاری و ساری کر کے دکھا دیا۔ ا یہ اصولی مطالبہ ہے کہ انسان بالعموم اور ادبا بالخصوص اپنی کے نمونے پر ڈھالیں۔ جس میں خود اس برگزیدہ بندے نے کر ایک نمونہ قائم کر دیا تھا۔

۳۔ اسلامی ادب کا تیسرا اصول یہ ہے کہ انسان سامنے اپنے یہاں کے اعمال کا حساب دینا ہے۔ اس پر ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی اخلاقی اقدارِ حیات وہی بن جا آفرینش خود خالق کائنات نے مقرر کر دیا تھا یہ قدریں تغیر و تبدل سے آزاد ہیں۔ برعکس اس کے اشتراکی فلسفہ یہ قدریں بدلتی رہتی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود ماہر افراد ہر دم پہلے بدلتے رہتے ہیں۔

ان تین بنیادی اصولوں کے [illegible]

اصولی حیثیت رکھنے والے چند نکات حسبِ ذیل ہیں۔

(ا) اسلامی ادب عالمگیر ریاست کا مبلغ ہے۔ لیکن "عالمگیر ریاست" دوسری تحریکوں اور مفکروں کی ذہنی پیداوار سے بالکل مختلف ہے۔ اشتراکیت ایک ایسی عالمگیر ریاست چاہتی ہے جس میں مزدوروں کی آمریت ہو۔ بلکہ صحیح معنوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں میں سے چند انسان دوسرے تمام انسانوں کی قسمتوں سے کھیلیں۔ ایچ جی ویلز اور اس جیسے مفکرین ایک ایسی عالمگیر ریاست چاہتے ہیں جہاں انسانوں میں سے چند انسان دوسروں پر حکمرانی کریں۔ لیکن اسلامی ادب ایک "ایسی ریاست" کا داعی ہے جس میں خود اس کائنات کے پیدا کرنے والے کے احکامات جاری و ساری ہوں۔

(ب) اسلامی ادب ایک "ایسی" عالمگیر ریاست قائم کرنے کے لئے سب سے پہلا وار جغرافیائی حدود پر کرتا ہے۔ اس کی راہ میں نہ تو پہاڑوں کی چوٹیاں آڑے آسکتی ہیں اور نہ ہی لہریں مارتے ہوئے سمندر۔

(ج) جب یہ جغرافیائی حدیں ختم ہو جاتی ہیں تو قومیت کا خود بخود خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اسلامی ادب نہ تو نازی ادب کی طرح نسلی فوقیت کا پرچار کرتا ہے اور نہ اشتراکی اور جمہوری ادبی تحریکوں کی طرح انسان اور انسانیت کو طبقوں میں منقسم کرتا ہے بلکہ وہ بلالؓ اور ابوبکرؓ، زیدؓ اور عمر فاروقؓ کو ان کے سامنے لا کر ایک ہی صف میں کھڑا کر دیتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں فرد کی خودی Ego of Nation & Individual کی شکست ہوتی ہے۔ [1]

(د) ان اصولی حیثیت رکھنے والے نکات میں نسل و رنگ کا نکتہ بھی [illegible] اسلام رنگ و نسل کے امتیازات کا خاتمہ کرتا ہے۔ اسلامی ادب بھی نفی کرتا ہے۔ یہ نفی جمہوری ادب کی سی نہیں۔ ایسی نہیں کہ ایک طرف تو رنگ کے امتیازات مٹانے کے ڈھنڈورے پیٹے جائیں اور دوسری طرف افریقہ کے باشندوں پر مظالم کے پہاڑ توڑے جائیں ان کی آزادی کو چھین لیا جائے۔ اسلام کی روح [illegible] سب کو برابر کیا۔

یہ ہے وہ اسلامی ادب جسے اسلامی تحریک پیدا کرتی ہے۔ اس ادب کا ایسی تحریک سے ملحق ہونے کے سبب ایک طرف تو اسے فکر کے لئے مواد Matter ملتا ہے اور دوسری طرف صالح معاشرہ کا نمونہ اور اس طرح کا معاشرہ پیدا کرنے کا جذبہ میسر آتا ہے۔ ادب کا تعلق چونکہ شعور و لاشعور دونوں ہی سے ہے اس لئے انسان کے شعور کے لئے اسلامی ادب ان حقائق کو پیش کرتا ہے جن کا ذکر کیا جا چکا ہے اور ان کے لاشعور کے لئے اسلامی ادب وہ ماحول تیار کرتا ہے جس میں ان کی فکر پروان چڑھ سکے۔ یہاں شعور و لاشعور میں تصادم اور ٹکراؤ نہیں ہوتا بلکہ دونوں حالتوں میں انسان ایک ہی خط پر سوچتا ہے۔!!

(بشکریہ چراغِ راہ)

---

[1] [illegible] Ego of Nation [illegible]

ماہر القادری •

محسوسات

نہ وہ خلوتوں میں لذت نہ وہ لطفِ انجمن ہے — اسی غم کا نام شاید، غمِ دوریٔ وطن ہے
نہ گلے نہ کچھ شکایت، نہ فسانہ و حکایت — ابھی عشق بے زباں ہے، ابھی حسن کم سخن ہے
تجھے اپنے غم سے مطلب مجھے غم ہے دوسروں کا
ترے سامنے نشیمن، مرے سامنے چمن ہے

نہ طولِ وقت نہ اب فاصلے ہیں منزل کے — نگاہ لوٹ رہی ہے نگاہ سے رل کے
گلوں کے چاک جگر اور یہ گریۂ شبنم — چھڑے ہوئے ہیں مگر زمزمے عنادل کے
مصیبتوں کی شکایت نہ آرزو کی طلب — بڑھا دیے ہیں ترے غم نے حوصلے دل کے
الٰہی خیر! مرے شوقِ جستجو کی خیر
قدم قدم پہ ہیں آثار قربِ منزل کے

دنیا دعائیں دے مرے ذوقِ نگاہ کو — آنکھوں میں لے چلا ہوں تری جلوہ گاہ کو
ان کی خوشی یہی ہے تو میں کامیاب ہوں — اب کوئی کچھ کہے مرے حالِ تباہ کو
مجھ کو نہیں قبول یہ توہینِ عاشقی — میرا سلام حسن کی بارگاہ کو
ماہر یہ دیکھ کر کہ جہاں کا ہے رنگ اور
دہرا رہا ہوں اشہد ان لا الٰہ کو

اکرام جمیل •

کل اور آج کا مصر

یوں تو مصر میں انقلاب کی بنیاد اسی دن پڑ گئی تھی۔ جس دن حسن البنا
ـنے مصر کے ایک قصبہ اسمٰعیلیہ میں ۱۹۲۸ء میں کتاب و سنت کی روشنی
الاخوان المسلمون کی تشکیل کی مگر فاروق کی شاہی حکومت کو اس کی تلخی کا اندازہ
ـس اس وقت ہوا جب فلسطین کی جنگ میں اخوان نوجوان نے جدید ترین اسلحہ
ـے لیس اسرائیلی فوجوں کے دانت کھٹے کئے جب جدید اسلحہ سے محروم مجاہد...
ـوں کے سروں پر شمشیر خار اشگاف کی طرح چمک کر ان میں ہلچل مچا رہے تھے
ـتب فاروق کی منظم اور مسلح فوج کے افسر انہیں دیکھ کر دانت پیس رہے تھے

۱۹۴۸ء میں بیس سال کی مسلسل کوششوں کے بعد جب انقلاب
ـہریں شاہی قلعہ کی دیواروں کو چھونے لگیں تو اس وقت برطانیہ اور امریکہ کے
ـارت خانوں نے دنیا میں ایک مرتبہ تیسری طاقت کے روشن امکانات
ـھ کر اس انقلاب کو کچلنے کا تہیہ کر لیا۔ ڈپلومیسی نے جال بنے۔ شاہ فاروق
ـاپنا تخت ڈگمگاتا محسوس ہوا اور نقراشی پاشا فرعونی دربار کی عظمت کو بچانے
ـے لئے کمر بستہ ہو گیا۔ حسن البنا کو شہید کر دیا گیا۔ الاخوان کو خلاف قانون قرار دیکر
ـردن مجاہدوں کو جیل کی کال کوٹھریوں میں بند کر کے اذیت ناک سزائیں دی
ـیں ان کی املاک کو ضبط کر لیا گیا اور ان کے دفاتر سر بمہر کر دیئے گئے۔ مگر
ـلاب کی لہریں شاہی قلعے کو چھو چکی تھیں۔ شاہی فوج کے سپاہیوں اور افسر
ـکے دلوں میں اخوان کے جذبہ اور ایمان کی تحریریں اثر کر چکی تھیں۔ حسن البنا کی...
ـنائیں اور امنگیں قاہرہ کے بازاروں، سیاسی دائروں اور آہنی دستوں کی تہ [illegible]
ـاہی فوج کے قلب میں پرورش پانے لگیں اور پھر انقلاب کی تند و تیز موجوں سے شاہی
ـمحل کی دیواریں آخر کار منہدم ہو گئیں۔ ملوکیت غائب ہو گئی۔ شاہی رخصت...
ـئی۔ حسن البنا شہید کا خون رنگ لایا۔ اخوان کی [illegible] جد و جہد کامیابی
ـبن گئی۔ قدیم مصر گیا۔ جدید مصر نے جنم لیا [illegible] مصر آج کا مصر بن
گیا۔

[illegible]

ہے مگر زرخیز علاقہ وہی ہے جس سے دریائے نیل گذرتا ہے۔ تقریباً چودہ ہزار
میل کا علاقہ بہت زرخیز ہے۔ مصر کی آبادی تقریباً دو کروڑ اسی لاکھ پر مشتمل ہے۔
قاہرہ اس کا سب سے بڑا شہر اور اس کا دار السلطنت ہے۔

سکندریہ دوسرا بڑا شہر ہے۔ اس کے علاوہ پورٹ سعید، سویز، ٹانٹا
اور منصورہ اہم مقامات ہیں۔ بڑے بڑے شہر اور بندرگاہیں ریلوے لائن سے
ملی ہوئی ہیں۔ اس کے مشرق کی طرف بحر احمر اور نہر سویز ہیں۔ مغرب کی طرف صحرا
ہے۔ جنوب کی طرف سوڈان واقع ہے اور شمال کی طرف بحر اقیانوس۔

۱۹۲۲ء میں فواد جو برطانوی سائے میں سلطان کی حیثیت سے
حکومت کرتا تھا بادشاہ تسلیم کیا گیا۔ ملک میں مغربی طرز کا قانون رائج ہے۔
۱۹۲۸ء میں فواد نے دستور کو معطل کر دیا اور اپنے وزراء کے ذریعہ حکومت کرنے
لگا۔ ملک کی سرکاری زبان عربی ہے۔

مصر یورپی تہذیب کی زد میں

مصری تہذیب حضرت مسیح سے آٹھ ہزار سال پہلے وجود میں آئی تھی
یہ مختلف ادوار سے گزرتی رہی مگر اس کی عظمت کا سکہ دنیا پر بیٹھا رہا [illegible]
میں عربوں نے اسے فتح کر کے اسلامی تہذیب کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد سے
اسلامی تمدن و معاشرت کا گہوارہ بنا رہا۔ اور پھر مغربیت نے اسلامی تہذیب کی
قدروں کے زوال کے ساتھ ساتھ ملوکیت و شاہی کی غلامی کا داغ
بھی [illegible] آخر اسلامی تہذیب کا علمبردار مصر یورپی تہذیب کا دلدادہ بن گیا
اور آج قاہرہ ـــــــ اسلامی ممالک کا دھڑکتا ہوا دل جدید و قدیم
تہذیب کے سنگم پر کھڑا ہے۔ آج اس میں دنیا کی سب سے بڑی اسلامی...
یونیورسٹی الازہر موجود ہے اور اس کے بازاروں میں امریکی اور یورپی تہذیب کے
نمایاں نشانات بھی موجود ہیں [illegible]
[illegible] ـــــــ [illegible]
[illegible]

سے میسر نہیں ہو سکتے تھے جس طرح قاہرہ میں شیفرڈ کلب [illegible] سے مغلئے
[illegible] نہایت [illegible] سیاحوں کا خیر مقدم کرنے کو ہر وقت تیار تھے۔
[illegible] ... مصر دوسرے [illegible] کے مہیا کرنے والے [illegible] سیاحوں کا
[illegible] ہو سکتے۔

"یورپ کا آزاد ترین فیشن قاہرہ کی سڑکوں پر عام طور پر نظر آتا ہے۔"

مصر کے تضادات کی دوسری صورت پر روشنی ڈالتے ہوئے یورپین سیاح موریس ہنڈس لکھتا ہے "اسکندریہ کے شیپرڈ ہوٹل سے پانچ منٹ چلئے تو آپ کو دنیا کی حقیر ترین بستیاں اور [illegible] دکھلائی پڑیں گی جہاں کی گندگی اور بدبو دماغ کو پریشان کر دے گی۔ جہاں بچوں کی اکثریت آنکھوں کی بیماری میں مبتلا نظر آئے گی۔ [illegible] ہاتھوں پر [illegible] کی طرح [illegible] جس [illegible] پڑے نظر آئیں گے۔ مصر کی [illegible] سارے دنیا سے زیادہ ہے —— مصر جسے کہ زمین کا جنستان کہا جاتا ہے اس کی زمین پر تہائی [illegible] آبادی پاؤں کی ایک [illegible] بیماری میں صرف اس لئے نظر آتی ہے کہ وہ جوتا نہیں خرید سکتے۔"

مصر میں مغربی اور مشرقی [illegible] قوتیں متوازی طور پر کام کر رہی ہیں وہاں اسلامی تہذیب کی [illegible] جا رہی ہیں۔ وہاں جامعہ الازہر میں اسلامی تعلیمات کا [illegible] وہاں [illegible] احیاء اسلام کے لئے [illegible] عمل بھی ہے اور وہاں اسلامی تعلیمات کو پامال کرنے والی قوتیں بھی پوری [illegible] رواں دواں ہیں۔ وہاں یورپین تہذیب چھائی ہوئی ہے جو مصر کے تمدن کا [illegible] انسان کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ [illegible] کے اعتبار سے [illegible] مگر تہذیب و تمدن کے اعتبار سے قدیم و جدید اثرات کا مجموعہ ہے۔ قدیم و جدید [illegible] کا میدان کارزار ہے اسلامی قدریں اور تہذیب جدید کی قدریں دست و گریباں ہیں۔

انہوں کے [illegible] کا ذکر کرتے ہوئے موریس ہنڈس لکھتا ہے "قاہرہ یونیورسٹی کے ایک طالب علم نے مجھے [illegible] مدعو کیا یہ ایک نہایت فیشن ایبل اور مشہور ریستوران ہے جہاں الازہر [illegible] کی ملاقات کے باوجود نوجوان لڑکیاں ناچتی [illegible] ہیں۔ [illegible] میں شریک ہونے سے پہلے میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ مسلمان [illegible] ایسے [illegible] کر سکتے ہیں خاص کر جس شہر میں [illegible] قائم ہے۔ میں نے [illegible] دوست سے سوال کیا کہ مسلمانوں کے [illegible] اسلامی تعلیم کی پامالی کیونکر ممکن ہے۔ تو اس نے کہا [illegible]"

فوجی انقلاب کے بعد

مصر جس طرح قرون وسطیٰ میں اسلامی تہذیب کی آماجگاہ تھا آج بھی پوری دنیائے اسلام کی نظر میں احیائے اسلام اور نشاۃ ثانیہ [illegible] مصر کے سر [illegible] نظر آتا ہے، آج اسلامی دنیا کے اس دھڑکتے دل میں زندگی کا خون دوڑ رہا ہے۔ مگر شاید ابھی قدرت کو کچھ اور ہی منظور ہے مصر کے عوام فاروق شاہی سے نجات حاصل کر لینے کے بعد بھی آزاد فضاؤں سے متمتع نہیں ہو سکے۔ مصر زرخیز ترین ملک ہونے کے باوجود [illegible] غربت کے [illegible] میں گزرتا ہے عوام [illegible] پر چند پاشاؤں کی [illegible] مصر کے کسان زمین کے سینے کو چیر کر جو [illegible] اور گندم نکالتے ہیں پاشاؤں کی عیاشی کی نذر ہو جاتی ہے۔ غریب [illegible] تن ڈھانکنے کے کپڑا [illegible] کے لئے جو [illegible] نہیں خرید سکتا۔ فوجی انقلاب کے بعد [illegible] کرنے لگے تھے کہ اب امن و سکون اور آرام و راحت کی گھڑیاں نصیب [illegible] قرآن و سنت کا قانون چلے گا اسلامی مساوات، اسلامی معاشرت، [illegible] معیشت وجود میں آکر ساری مشکلات اور مصائب [illegible] ...... قطع نظر [illegible] فوجی ملت ان کی مصیبتوں کا [illegible] کرنے میں ناکام رہا ہے۔ اور فوجی [illegible] نے انہیں انتشار و اختلال کے عمیق و مہیب گڑھے کے کنارے [illegible] کیا ہے [illegible] آنکھوں پر [illegible] کی پٹی باندھ لیتا ہے۔ اقتدار [illegible] انسانیت کو [illegible] لیتا ہے۔ ادھر شاہی ختم ہوئی ادھر [illegible] خون کا [illegible] ملک میں ایک نئے دور کا پیغام لے کر آیا۔ دراصل اس کی بنیاد کے نیچے کی [illegible] بچھائی جا چکی تھیں۔ فوجی افسروں نے انقلاب کے بعد ایک راشد [illegible] کو اپنی راہ سے ہٹانے کے لئے [illegible] بغاوت کا الزام لگا کر جیل میں ڈال دیا۔ فوجی انقلاب [illegible] اس طرح کی [illegible] [illegible] فوجی انقلاب [illegible] [illegible] مختلف خیالات اور متضاد [illegible]

نجیب و ناصر کی [illegible]
[illegible]

ہو کر اسے اپنی ناکامی چھپانے کے لئے خلاف قانون قرار دینا پڑا اور اس کے ڑدں رہنماؤں کو جیلوں میں بند کر دیا۔ فوجی طاقت کے بل بوتے پر حکومت م اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ شاید اب تک پہلی مرتبہ مصر کا یہ حال ہوا سے الگ ایک نئی پارٹی کی تشکیل کی جائے اور انتخابات کے ذریعے حکومت کے قیام پر جمہوریت مرتب ہو گیا ہے۔ مگر اخوان کی قوت اور رسوخ کے تجربہ سے ڈر گیا اور اس نے فوج پر اپنا اثر مضبوط کرنا شروع کر دیا ہے اور عجیب سے گروہ عوامی کو لانے کے لئے فوجی طاقت کا استعمال بے عجیب کر اپنے سے مشابہ اور خود ڈکٹیٹر بن بیٹھا۔

ایسے مصر کی فضا متضاد نعروں سے گونج رہی ہے۔ مصر میں قرآن و سنت ین نافذ کرو" اخوان کا نعرہ ہے۔ ہم مذہب کے ٹھیکیداروں سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں" کمیونسٹوں، سوشلسٹوں اور مغرب پرستوں کا نعرہ ہے۔ "تمام سیاسی جماعتیں ختم کی جائیں۔ فوجی آمریت کو قائم رکھا جائے" ناصر کے حامیوں کا نعرہ ہے ــــــ اور مصر ان متضاد نعروں کے چوراہے پر آ کھڑا ہوا ہے۔ مصر میں بے یقینی اور دہشت زدہ ٹکریاں ہانکی گئی ہیں۔ مصر کا فلاح کار حسرت سے اپنے ننگے جسم، پچکے ہوئے پیٹ اور سوجے ہوئے پاؤں کو دیکھنے لگا ہے

اور

...... حسن شہید کی تمنائیں مصر کی فضاؤں میں سرگرداں ہیں

اور

ــــــ اسلامی دنیا کے دھڑکتے ہوئے دل میں اضطراب سا پیدا ہونے لگا ہے

ابوالمجاہد زاہد

لا الٰہ الا اللہ

عجیب دور ہے یہ دورِ مادّیت بھی — جو سوچتا ہوں تو دل کانپ کانپ جاتا ہے
ہوس میں بھیگی ہوئی مشعلوں کا جاہ جلال — عذاب آتش و آہن کے گیت گاتا ہے

توہمات کی جادوگری — معاذ اللہ — خود اپنے حرص و ہوس کا غلام ہے انسان
وہ فلاح جو پائے تو کس طرح پائے — کہ آج مقتدی بے امام ہے انسان

یہ آدمی بنائے ہوئے اصول حیات — چراغ عصمت و انسانیت جلا نہ سکے
فضائے مشرق و مغرب ہے لرزہ براندام — خدا کو چھوڑ کے بندے فلاح پا نہ سکے

خود اپنی پستیٔ اخلاق کو نہ دیکھ سکا — جو آج اوجِ ثریا پہ ڈالتا ہے کمند
حیات سمت قدم کے بھی کچھ چل نہ سکا — جو آج برق سے آگے نکالتا ہے سمند

رموزِ کون و مکاں کو ٹٹولنے والا — مزہ تو جب ہے کہ خود بے نقاب ہو جائے
خدا کی راہ پہ آنا پڑے گا مجبوراً — ابھی کچھ اور یہ انساں خراب ہو جائے

ستور رہے ہیں نئے سرے گیسوئے اسلام
اب اپنی خیر منائے تمدن گمراہ
نکھر رہا ہے جمالِ نظامِ قرآنی
نہ رنگ ہے نہ وطن لا الٰہ الا اللہ

جنہیں بھلایا جا نہ سکے گا

مولانا مسعود عالم ندوی ؒ

محمد عبداللطیف (گوجرانوالہ)

کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ایک ایسی حقیقت
ہے جس سے کسی بڑے سے بڑے ملحد اور پکے سے پکے کافر کو بھی انکار کی
جرأت نہیں ہوئی۔ ہر کوئی اس سے نہ صرف واقف ہے بلکہ اس حقیقت کو اچھی
طرح جانتا ہے اور اسے پختہ یقین ہے کہ ایک روز اسے مرجانا ہے۔ خدا
کی وحدانیت، اسکے وجود، اور زندگی بعد موت میں کوئی شخص اختلاف
کر سکتا ہے اور کیا جاتا ہے۔ مگر کوئی شخص اس کو نہ جھٹلا سکتا ہے اور نہ اس
سے اختلاف کر سکتا ہے کہ موت آنی ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے
سب متفقہ طور پر قائل ہیں۔ کہ جس زمین پر آج بڑے طمطراق سے چل پھر
رہے ہیں اس کے اندر ایک روز ہمیں جانا ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے اور
تقریباً ہر روز اس کا مشاہدہ کرنے کے باوجود پتہ نہیں کیوں کسی کی موت
سے اس قدر غم ہوتا ہے؟ ایک مصیبت اگر ناگہانی طور پر آجائے تو اس پر
فطری طور پر غم کیا جا سکتا ہے۔ افسوس کیا جا سکتا ہے اور رنج کا اظہار
کیا جا سکتا ہے مگر ایک ایسی بات جس کے متعلق ہمیں علم ہے کہ نہ معلوم
ہے اور نہ معلوم کب آجائے ——— اس قسم کی خبر پر افسوس
ظاہر کرنا ایک الجھنے کی بات ہے مگر یہ ایک واقعہ ہے کہ جو شخصیت جس قدر بزرگ ہے
اور جس قدر محبوب ہے اس کے دنیا سے اٹھ جانے پر رنج میں اس
تناسب سے زیادتی ہو جاتی ہے۔

"بے وقت کی موت" کو میں کلمہ کفر کہتا ہوں بغیر ایمان ہے
کہ موت خدا کی طرف سے آتی ہے اور اسی وقت آتی ہے جب کہ کسی زندگی کو
ختم کرنے میں کوئی مصلحت ہوتی ہے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان
اس قسم کی بات سوچ کر اس تکلیف دہ حقیقت پر غور کرتا ہے مگر یہ
بات اس کی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہے کہ یہ موت کیوں واقع ہوئی؟ اور
اس میں کیا مصلحت تھی جب اس سوال کا جواب نہیں ملتا تو انسان
...

دنیا ہی مرنے والے سے جس قدر عقیدت ہوتی ہے اتنا ہی وہ اس پر افسوس
کرتا ہے اور پھر بھی یہ کہتا ہے کہ اس پر جس قدر افسوس کیا جائے کم ہے۔
اس حقیقت کو مولانا مسعود عالم ندوی کی وفات حسرت آیات نے پوری
طرح میرے ذہن نشین کر دیا ہے۔

۷ مارچ ۱۹۵۴ء کی صبح کو میں بڑے اطمینان سے "پاکستان ٹائمز"
پڑھ رہا تھا کہ اچانک میرے کانوں نے یہ آواز سنی کہ مولانا مسعود عالم ندوی
اس دار فانی • سے کوچ فرما گئے۔ اپنی قوت سماعت پر دھوکہ ہوا مگر جب
اس آواز نے "نوائے وقت" کا پرچہ سامنے لا کر رکھ دیا جس میں مختصر سی خبر تھی
تو یقین نہ آیا بلکہ اس اطلاع کو اپنی نظر کا فریب سمجھا اور اپنے آپ کو خواب کی دنیا
میں تصور کرنے لگا مگر آخر تا کجے! ایک حقیقت سے کب تک منہ پھیرا جا سکتا
ہے اسی لمحہ مولانا کے ایک عقیدت مند دولپنڈی کا کوہستان اٹھا لائے
جس پر نہ صرف مولانا کی وفات کا ذکر تھا بلکہ آپ کے حالات زندگی بھی مختصر
طور پر درج تھے مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ تھوڑی دیر کے لئے میرے حواس
باختہ ہو گئے مجھے اپنا ہوش نہ رہا اور کچھ عرصہ کے لئے میں بالکل بے حس و
حرکت بیٹھا رہا۔ جب ذرا حواس بحال ہوئے تو آنسو پلک تک آئے تھے۔ مگر
صبر و برداشت کی قوت ایک بند کی طرح موجود تھی جو انہیں باہر کی ہوا تک
نہ لگنے دیتی تھی۔ ایک لمحے کے اندر مولانا کی معیت میں بیتے ہوئے لمحات ایک
چلتی پھرتی تصویر بن کر نگاہوں کے سامنے آنے لگے۔ یہ ایک واقعہ ہے
کہ مولانا کے اس قدر جلد داغ مفارقت دینے کا میں نے کبھی تصور بھی
نہیں کیا تھا ——— "ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور اسی کی طرف
رجوع کرنے والے ہیں"۔

مولانا سے تعارف اور پھر تحریک کے گہرے تعلقات ... کی
کی وساطت سے پیدا ہوئے ... عربی ... سے ...
... تعلقات بڑھے اور اس قدر بڑھے ...

میں کوئی قدم مت اٹھانا تھا اتفاق کبھی ایسا ہو جاتا کہ مجھے اچانک کوئی قدم اٹھانا پڑ جاتا تو پھر ان کی رائے معلوم کرنے کے بعد جو کچھ وہ فرماتے تھے اس کے مطابق عمل کرتا بلکہ حال یہ ہو گیا تھا کہ مولانا سے مشورہ لئے بغیر میں ایک معمولی سے معمولی قدم اٹھاتے ہوئے بھی گھبراتا تھا۔

مولانا صاحب جن دنوں گوجرانوالہ میں اقامت پذیر تھے تو انہی دنوں مجھے پہلی مرتبہ ملاقات کا موقعہ ملا۔ مولانا چونکہ مریض تھے اور انہیں گوجرانوالہ کی آب و ہوا راس نہ آئی تھی اس لئے مولانا راولپنڈی جانا چاہتے تھے اور ان کے لئے تگ و دو جاری تھی۔ بالآخر وہ دن آن پہنچا جب مولانا راولپنڈی تشریف لے گئے۔ اتفاق کی بات ہے کہ مولانا جن دنوں راولپنڈی جانے کے لئے مصروف تھے انہی دنوں میرے مرض کا آغاز ہو چکا تھا اس لئے جانے سے پیشتر ان سے ملاقات بھی نہ کر سکا۔

مولانا سے اب اگرچہ خط و کتابت تھی مگر پھر بھی طبیعت کو اتنی جلدی بہت شاق گذرتی تھی۔ پھر وہی زمانہ تھا جب کہ میں جماعت اسلامی سے متعارف ہونے کے بعد اپنے آپ کو جماعت کی دعوت کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کر رہا تھا مگر مرض کی شدت بڑھتی یہاں تک بات پہنچ گئی کہ گھر چھوڑتے ہی بنی۔ سیدھا مولانا موصوف کے پاس پہنچا۔ وہ میرے اس غیر متوقع آنے پر حیران رہ گئے اور میں بیماری کے شباب میں گھر بار چھوڑنا اس پر ستم ہوتا جب میں نے حالات سنائے تو پھر مولانا نے میری بڑی حوصلہ افزائی فرمائی۔

یہاں سے میرے اور مولانا کے تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہوا جو کہ ان کی وفات تک قائم تھا۔ اب وہ میرے مربی، دوست، نگران اور محسن تھے۔ بیماری نے اگرچہ ان کے اندر غصہ بے حد پیدا کر دیا تھا مگر اس کے باوجود وہ نہایت شفیق اور نرم طبیعت کے مالک تھے۔ وہ مجھے قدم قدم پر بہترین مشورے دیا کرتے تھے اور اس بات پر تو میں جس قدر فخر کروں کم ہے کہ مولانا کو مجھ جیسے نااہل سے بے حد محبت تھی۔ ان کے قریب جب ایک سال رہنے کے بعد میں راولپنڈی سے واپس آنے لگا تو مولانا نے مجھ سے فرمایا کہ اب تمہاری محبت عشق کی سرحدوں کو چھونے لگی ہے۔ مجھ جیسا ناچیز جب کبھی سے یہ کہتا ہے کہ مولانا کے پاس میں ایک سال سے زیادہ عرصہ رہا ہوں اور یہ کہ مولانا کو مجھ سے بڑی محبت ہے تو وہ مجھے معلوم نہیں

گیا پھر شیفتہ تھا اور مجھے بڑی احترام کی نگاہوں سے دیکھتا۔ حالانکہ اپنی بدقسمتی پر پچھتاتا رہتا ہوں کہ مولانا کے قریب رہ کر بھی ہم مولانا سے بے عملی ہی رہی۔ مگر صحت کی خرابی اور اس نئی راہ کو اختیار کرنے کے حالات اور کشمکش نے اس قدر سنسنے کا کہ عربی پڑھ…

مولانا کو چونکہ میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے یہاں کے عادات و اخلاق اور صلاحیتوں کو بنظر غائر دیکھنے کا … ہے۔ مولانا کی بعض صلاحیتوں سے میں بالکل ناواقف بھی ہوں اور بعض عادات سے بے خبر بھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں مولانا سے کتراتا رہا ہوں۔ باقی یہ کہ مولانا کس طرح پڑھتے تھے۔ معاملات کی تہ … طرح کرتے تھے۔ اور کیسے لکھتے تھے اس کا نہ مجھے موقع ملا اور نہ … ہے۔ مگر اس کے باوجود مجھے کچھ نہ کچھ معلوم ضرور ہے۔ اور جو کچھ میں … متعلق لکھوں گا وہ زیادہ تر وہی ہو گا جو مولانا کو دیکھ کر میں نے خود … رائے قائم کی اور ان سے ملنے کے بعد میرے ذہن نے جو تاثر قبول …

یہ بات تو اظہر من الشمس ہے کہ مولانا عربی زبان میں مہا… رکھتے تھے اور ہندوستان میں عربی ادب میں ان کے مقابلہ کا اہل… شاید ہی کوئی آدمی ہو۔ اگر جناب ماہر القادری صاحب کے الفا… کو ہندوستان کا "امیر شکیب ارسلان" کہا جائے تو بے جا نہ … نے صرف جماعت اسلامی کی بعض کتابوں کو عربی میں منتقل کر… ممالک میں جماعت کا تعارف ہی نہیں کرایا ہے بلکہ مولانا نے … میں کچھ کتابیں لکھی ہیں جنہیں پڑھ کر مولانا کے علم اور عربی ادب کا … جا سکتا ہے۔ مولانا جو کچھ لکھتے تھے تحقیق و تفتیش کے بعد لکھتے … پورے دلائل کے ساتھ لکھتے تھے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے مولا… گہری نظر رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا ماضی و حال کی تمام … شخصیتوں کے کردار اور کارناموں سے واقف تھے بلکہ ان کے … سے واقف تھے۔ کسی شخصیت کا ذکر ان کے سامنے چھڑ جانے … سے پوچھ لیجئے وہ اس کے والد کی [illegible] کے دا… کرتے تھے۔ بلکہ میں نے تو یہاں دیکھا ہے کہ [illegible] معمولی شخصیتوں کے متعلق مولانا کی بے حد واقفیت تھی اور … کے متعلق وہ اس قدر جانتے تھے کہ [illegible]

[illegible] رہے

کسی شخص کو کبھی اپنے خیالات اور مطبوعہ مضامین کے کارناموں کا حال [illegible]
معلوم نہ ہوگا۔ اس سے مولانا کی نہ صرف یہ کہ حالات پر گہری نظر ہونا
[illegible] ہوتا ہے مولانا کے قوت حافظہ کو بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

مولانا کو سیاسیات سے بے حد دلچسپی تھی اور اس پر گہری نظر رکھتے تھے۔ مولانا غور اور بڑی دقت نظر کے ساتھ مولانا اخبار کا مطالعہ کرتے تھے۔ جب کبھی صحت اس حد تک خراب ہو جاتی کہ مطالعہ نہ کرسکتے تھے اس وقت وہ اخبارات کو جمع کرتے رہتے اور پھر صحت بحال ہونے کے ہی بعد تاریخی ترتیب سے انگریزی اور عربی اخبارات کا مطالعہ کرتے تقریباً ہر ملاقات میں مولانا سے سیاسی حالات پر گفتگو کرتا اور مولانا معلومات کی حد تک تجربوں کا تجزیہ کرتے۔ میرا خیال ہے کہ اگر مولانا کسی کے ایڈیٹر ہوتے تو وہ بہترین اداریہ لکھتے اور خبروں پر تبصرہ کرتے میں ہی کوئی ان کا ثانی ہوتا۔

مولانا جب کسی کے معاملے کے متعلق پیشگوئی کرتے کہ میرا خیال [illegible]ں ہو جائیگا تو جہاں تک میری معلومات میرا ساتھ دیتی ہیں ان میں اکثر و بیشتر درست نکلیں۔ جناب نصر اللہ خان صاحب عزیز نے جب [illegible]جیب کے متعلق بہت زیادہ حسن ظن کا اظہار کیا اور اسے اخوان ہی [illegible] آدمی ثابت کرنے کی کوشش کی تو مولانا نے ایک مضمون تسنیم میں [illegible] کروا دیا جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ جنرل نجیب گو ایک نیک آدمی ہیں اور [illegible] بناتی رہے مگر اس سے اس قدر حسن ظن رکھنا درست نہیں چنانچہ [illegible] لوگ جانتے ہیں کہ بالآخر اخوان المسلمون کو غیر قانونی قرار دیا گیا اور اس [illegible] نام لیڈروں اور سرگرم کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور پھر یہ کہ ان پر [illegible] اور برطانیہ سے سازش کا الزام لگایا گیا۔ یہ ان کی پیشگوئی کا واضح [illegible] ہے۔

مولانا انسانی نفسیات کے ماہر تھے۔ وہ کسی شخص سے تھوڑی گفتگو کرنے کے بعد اس کے متعلق رائے قائم فرما لیتے۔ اور جہاں تک مجھے [illegible] ہے کہ شاید ہی کبھی ایسا ہوا کہ مولانا نے کسی کے متعلق جو رائے قائم کی ہو [illegible] درست [illegible] [illegible] واقعہ ہی [illegible] [illegible]

زندگی کے مولانا بے حد مداح تھے۔ مولانا کو ان کی ذات سے محبت نہیں بلکہ عشق تھا۔ جب کبھی ان کا ذکر آتا مولانا بڑی محبت کے ساتھ "علی میاں" کہتے اور پھر ان کا ذکر فرماتے۔ ایک مرتبہ میں نے مولانا سے پوچھا کہ چغلی کی تعریف کیا ہے۔ مولانا نے میرے سوال کا جواب دینے کے بعد فرمایا کہ میں نے آج تک صرف ایک شخصیت دیکھی ہے جو بے حد مخلص اور متقی ہے چغلی کرنا تو درکنار کبھی اس جگہ بیٹھنا تک گوارا نہ کیا جہاں کسی کی چغلی ہو رہی ہو پہلے چغلی کرنے والے کو روکتے جب نہ رکتا تو محفل سے اٹھ کر چلے آتے۔ پھر تھوڑی دیر توقف فرمانے کے بعد کہا "یہ علی میاں" کی شخصیت ہے۔

زندگی کے روزمرہ کے معاملات میں بھی مولانا کی شخصیت بڑی نمایاں تھی۔ اپنے طے شدہ پروگرام کے بڑے پابند تھے۔ وہ دن کے اوقات کو مختلف کاموں کے لئے تقسیم کر دیتے تھے پھر کافی پابندی کے ساتھ عمل کرتے۔ ایک مرتبہ مجھے ایک ضروری کام سے صبح کو ان کے ہاں جانا پڑا تو علیک سلیک کے بعد پہلی بات جو انھوں نے کہی وہ یہ تھی کہ آدھ گھنٹہ۔۔ انتظار کرو۔ پھر انھوں نے پورے آدھ گھنٹہ کے بعد مجھے خود ہی بلا لیا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کسی سے ملتے ہی نہ تھے۔ بلکہ یہ پابندی صرف ان حضرات تک محدود تھی جو مولانا سے اکثر ملتے رہتے تھے۔ جب شروع شروع میں مولانا پنڈی تشریف لے گئے تو میں ایک مرتبہ ان سے ملنے گیا۔ اور اس وقت گیا جب کہ مولانا اپنے پروگرام کے مطابق کام میں مشغول تھے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ مجھ سے ملاقات کی اور مجھ کو یہ محسوس بھی نہ ہونے دیا کہ میرے آنے سے مولانا کے پروگرام میں خلل پڑ رہا ہے۔

مولانا بے حد کفایت شعار تھے۔ ہر ماہ کے اپنے خرچ و آمدنی کا بجٹ بناتے تھے اور ایک ایک پائی کا حساب رکھتے اور ایک پائی بھی بلا ضرورت خرچ کرنا ان کو گوارا نہ تھا۔ ان کے حساب کتاب کی ڈائریاں اب تک جناب عاصم صاحب کے پاس موجود ہوں گی۔ پھر مولانا کا آج تک یہ ریکارڈ رہا ہے کہ [illegible] بہت ہے مگر ایک پیسہ بھی کسی سے نہیں لیا۔

مولانا کی ذات بڑی ہی مخلص اور انتہائی بے غرض تھی۔ مولانا کے خواہ دوسروں پر کتنے ہی احسانات کیوں نہ ہوتے مگر وہ کسی کا احسان لینا پسند نہ کرتے تھے۔ شدید مرض میں بھی ان کو کسی سے معمولی خدمت لیتے ہوئے سخت تکلیف ہوتی [illegible]

وقت ان پر مرض کا شدید حملہ ہوا اس وقت ان کو ایک چیز کی ضرورت تھی جو بازار سے لانی تھی۔ چونکہ اس کا نام انگریزی میں تھا اس لئے صرف ملازم کو ملکہ جو شخص اس وقت موجود تھے ان کو بھی سمجھنے میں دقت ہوئی لیکن میں نے سمجھتے ہوئے درخواست کی کہ اگر مجھے اجازت ہو تو میں لا دوں۔ مگر مولانا کو گوارا نہ ہوا مگر صورت حال سے مجبور ہو کر اجازت دیدی۔ انہی دنوں میں نے مولانا کو دبانے کی درخواست کی۔ انہوں نے بڑی رد و کد کے بعد اجازت دی اور پھر بعد میں اس طرح شکریہ ادا کیا جیسے میں نے کوئی بہت بڑا احسان کیا ہو۔ مولانا کو کسی کا ایک پیسے کا بھی احسان لینا گوارا نہ تھا۔ اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ ایک مرتبہ باتوں باتوں میں مجھ سے کہا کہ "اگر مصر کی کھجوریں مل جائیں تو مکھن کے ساتھ انہیں کھانا میرے لئے بے حد مفید ہے۔ میں نے کہا مولانا مصر کی کھجوریں تو بازار میں عام بکتی ہیں۔ فرمانے لگے نہیں۔ میں نے اصرار کیا تو کہنے لگے "اچھا لا کر دکھاؤ" میں نمونۃً آدھا پاؤ لے گیا جس کی قیمت.... بمشکل پانچ چھ پیسے ہوگی۔ اتفاق ایسا کہ میں کھجوریں دیکر ہی چلا آیا اور پھر پانچ چھ روز تک حاضری کا موقع نہ ملا جب میں اتنے عرصے بعد گیا تو سب سے پہلے انہوں نے مجھے اس آدھ پاؤ کھجور کی رقم ..... دی۔ میں نے کہا "مولانا اس کی کیا ضرورت تھی" مولانا نے ہنس کر فرمایا کہ "حساب و کتاب میں کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرنی چاہیئے۔"

مجھ میں احساس کمتری بے حد پایا جاتا اور اب بھی اس کا کافی اثر ہے مگر مولانا کی صحبت کے طفیل میں "خودی" اور "عزت نفس" کے صحیح مفہوم سے میں آگاہ ہوا۔ مولانا کا ایک فقرہ جو انہوں نے تین یا چار سال ہوئے فرمایا تھا اور جس نے میرے احساس کمتری کی جڑوں پر تیشہ چلا دیا تھا وہ ابھی تک مجھے ہو بہو یاد ہے۔ مولانا نے فرمایا "میری کوئی عزت کرے یا نہ کرے میں خود اپنی عزت کرتا ہوں۔" مولانا... صبر، استقلال اور ثابت قدمی کی صفات سے بھی متصف تھے۔ ایک بار جس کام کو انجام دینے کا تہیہ کر لیتے پھر دنیا کی کوئی طاقت ان کو اس فیصلے سے نہیں ہٹا سکتی تھی جس نے بھی ان کے فیصلے کو بدلنا چاہا اسے منہ کی کھانی پڑی۔ اور اسے مایوس ہونا پڑا......

[illegible]

مولانا مسعود عالم ندوی کو رسول کریم کی ذات سے عشق تھا۔ مولانا سنت رسول پر [illegible] عقیدت کے ساتھ عمل کرتے

[illegible] اپنی پوری زندگی میں حضور کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش [illegible] کے خلاف کوئی معمولی سی معمولی بات بھی انھیں سننا گوارا نہ تھی۔ [illegible] اہتمام کرتے اور بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ نماز ادا کرتے۔ ترا[illegible] اہتمام کرتے۔ اگرچہ آپ کی صحت خراب رہتی اور صحت کی خرابی کے [illegible] حد کمزور ہو گئے تھے۔ مگر پھر بھی ان میں بلا کی ہمت تھی۔ مجھے [illegible] کی امامت میں چند روز تراویح پڑھنے کا موقع ملا ہے۔ عام حد[illegible] اہلحدیث۔ اہلحدیث حنّاف سے ویسے ہی آہستہ پڑھتے ہیں [illegible] تو یہ فرق ویسے ہی نمایاں ہو جاتا ہے۔ عالم صاحب کل ایک [illegible] مگر خوب ٹھہر ٹھہر کر اور واقعی تراویح کا لطف آ جاتا یا [illegible] آٹھ رک[illegible] وقت صرف ہوتا کہ مسجدیں بیس تراویح پڑھنے والے [illegible] پندرہ منٹ پیشتر خالی ہو جاتیں تھیں۔ ان چند روزوں میں [illegible] تھا کہ کھڑے کھڑے تھک جاتا اور بیٹھنے کے لئے بیتاب [illegible] آپ کو مجبور کر کے کھڑا رہتا مگر مولانا جو کہ دائم المرض ہونے کے با[illegible] تھے تمام رکعتوں کو کھڑے ہو کر اور بڑے خشوع و خضوع کے [illegible] جب مولانا جیل میں گئے اور وہاں ماہ رمضان آیا۔ تو تراو[illegible] رکعتیں پڑھیں اور اس ماہ دو قرآن ختم ہوئے تھے۔

مولانا مرحوم سراپا محبت تھے اور مجسم شفیق تھے۔ [illegible] انکے پاس چلے جانے کے بعد تو میرے لئے ان ہی کا دم غنیم[illegible] اور آزمائش کے ایام میں وہ میری ڈھارس بندھاتے اور تسلیاں دیتے جب میں ان سے کوئی بات پوچھتا تو بڑی [illegible] جواب دیتے۔ ایک مرتبہ مجھے مولانا نے ایک معاملے میں کچھ [illegible] نے محسوس کیا کہ مولانا معاملے کی پوری نوعیت سے واقف نہ [illegible] کچھ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ البتہ گھر آ کر ان کے نام [illegible] تحریر کافی سخت تھی۔ میں نے یہ خط کسی دوست کے ہاتھ [illegible] مجھے شام کو ملا بھیجا۔ میرا خیال تھا کہ مولانا مجھ سے [illegible] کریں گے اور تحریر کی سختی پر [illegible] مگر جیسے ہی [illegible] کمرے میں داخل ہو کر السلام علیکم کہا۔ مولانا [illegible] گلے سے لگا لیا۔ [illegible]

ی ایک واقعہ سے مولانا کی شفقت اور محبت کا اندازہ ہوتا ہو سکتا ہے

مولانا کی کس کس صفت کا ذکر کروں ۔ وقت کی کمی اور طوالت
اخوف بار بار قلم کھینچنے پر مجبور کر رہی ہیں اس لئے اس پر اکتفا کرتا ہوں مگر
ولانا کی ظرافت طبع کے چند نمونے اور ان سے آخری ملاقات کا حال نہ لکھنا
برے خیال میں اس مضمون پر ظلم ہے۔

مولانا بے حد ظریف تھے، بات بات میں لطیفہ۔ طنز اور مزاح پیدا
ردیتے۔ اس کی چند مثالیں حسب ذیل ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے مولانا کو
نی اور اپنے ایک عزیز کی مابین بحث کا "آنکھوں دیکھا حال" سنایا اور اپنا
اثر ظاہر کیا کہ "مولانا! یہ لوگ معلوم نہیں ہمیں کیا سمجھتے ہیں کہ ہماری بات تک
سننا گوارا نہیں کرتے "۔ مولانا نے گرہ لگائی "اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ ہمیں
بوقوف سمجھتے ہیں اور ہم ان کو بیوقوف سمجھتے ہیں "۔

جب مفتی اعظم فلسطین جناب سید امین الحسینی صاحب پاکستان
تشریف لائے تو ان کی خدمت میں جماعت اسلامی کراچی نے ایک سپاسنامہ
ش کیا تھا۔ سپاسنامہ کیا تھا جماعت سے تفصیلی تعارف تھا۔ مگر اس۔
بدعت" پر جناب نصر اللہ خان صاحب عزیز "کوثر" میں خوب برسے۔ جب
ولانا کراچی سے واپس آئے تو میں نے اس تنقید کا ذکر کیا۔ کہنے لگے کہ وہ
پاسنامہ "تو میرے مشورے سے لکھا گیا تھا" پھر کہنے لگے "نصر اللہ
انصاحب کیا جانیں کہ سپاسنامہ کیا ہوتا ہے"

ایک دفعہ میں اپنے دوست کی معیت میں مولانا کی بارگاہ میں
اضر تھا تو لفظ "مولوی" زیر بحث آگیا میں نے اس کا مطلب پوچھا تو
ولانا نے کہا کہ "پنجاب کی ذلیل ترین قوم" باوجود کوشش کے ہم سے ہنسی ضبط
نہ ہو سکی مولانا بھی مسکرا دیئے اور اس انداز میں فرمایا کہ "تم ہنستے ہو۔ واقعی پنجاب
یں اگر مجھے اس کا تلخ تجربہ ہوا اور اسی لئے میرے نزدیک اس مفہوم کو
مولوی" کے لفظ میں ادا کیا جاتا ہے ——— ویسے مولوی کا
طلب اللہ والے ہے "۔

گوجرانوالہ کی میونسپل کمیٹی کی کارگزاری دیکھنی ہو تو گوجرانوالہ کی
سڑکوں اور گلیوں کو صرف ایک نظر دیکھ لینا کافی ہے مولانا جہاں مقیم تھے وہ
انی صاف جگہ تھی اور دوسری گلیوں کی بہ نسبت ایسی کشادہ اور صاف
تھی میں نے ایک مرتبہ مولانا کے سامنے اس کی تعریف کی تو ہنس کر دیا

"یہ پیرس کی گلیاں ہیں "۔

یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مولانا کو مجھ سے بے حد محبت تھی میں
جب کبھی ان کے پاس سے اٹھنے لگتا تو وہ اصرار سے بٹھا لیتے اور
کہتے "بیٹھئے! بیٹھئے! کونسی آپ کی بیوی ہے جو آپ کو یاد کر رہی ہوگی"
میں جب راولپنڈی میں گیا تو بعض اوقات برادرم عاصم صاحب کی معیت
میں مولانا کے پاس جاتا میری یہ عادت تھی کہ میں عاصم صاحب کے بعد
مولانا کے کمرے میں داخل ہوتا۔ ایک مرتبہ حسب معمول ہم دونوں آئے تو
مولانا نے ہنس کر فرمایا کہ "تم تو عاصم صاحب کے ضمیمہ لاحق کرائے ہو۔"

لطائف و طنز و مزاح اور حاضر جوابی کی فہرست بے حد طویل ہے
مگر طوالت کے خوف کے باعث قلم انداز کرتا ہوں۔ مولانا کا یہ معمول تھا کہ،
جب کبھی انہیں لاہور یا کراچی جانا ہوتا تو راستے میں گوجرانوالہ ضرور قیام فرماتے
اور میرا یہ حال ہو جاتا کہ ان چند لمحات کو اپنی زندگی کا ایک قیمتی سرمایہ سمجھتا اور
اسے اپنی بڑی خوش نصیبی سمجھتا۔ اس مرتبہ جب انہوں نے کراچی جانا تھا
تو وہ حسب معمول گوجرانوالہ ٹھیرے اس وقت یہ بات خواب و خیال میں بھی نہ تھی کہ یہ
مولانا سے آخری ملاقات ہے ان کی واپسی کا مجھے انتظار تھا اور شاید اشتیاق
تھا مگر مولانا کراچی ہی کے ہو گئے اور واپسی نصیب نہ ہوئی۔

یہ شاید پہلا موقع تھا جب کہ مولانا اکیلے کراچی جا رہے تھے۔ مولانا
پچھلے دنوں بے حد علیل تھے جن لوگوں نے انہیں اس وقت دیکھا تھا وہ تو ان
کی زندگی سے اسی وقت مایوس تھے۔ مگر اب ان کی صحت بے حد اچھی تھی مگر
ان کی بیماری اس قسم کی تھی کہ اس کا اچانک حملہ ہو جاتا کوئی اچنبھے کی بات
نہ تھی۔ اس لئے مجھے بے حد فکر ہوئی۔ میں نے اس تشویش کا اظہار بھی کر دیا
تو مولانا نے کہا "اس بیماری کے باعث مجھے دوسروں کا محتاج ہونا پڑتا ہے
مگر اب میں اس حالت سے تنگ آگیا ہوں میں کوشش کر رہا ہوں کہ مجھ
کسی بھی معاملہ میں کسی دوسرے کی مدد کی ضرورت نہ رہے اس کوشش
کا پہلا تختۂ مشق یہ سفر ہے۔ اور دراصل میں اپنی زندگی کے خلاف ———
[illegible] کر رہا ہوں" مولانا کی زبان یہ الفاظ ادا کر رہی تھی اور میری
نگاہیں مجسمۂ حیرت بن کر مولانا کے چہرے پر گڑ گئیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ
دبلا پتلا انسان اپنے نحیف جسم میں کتنا بڑا دل گردہ رکھتا ہے مولانا کے الفاظ
کچھ دیر کیلئے میری زبان کے لئے تلاوت کا سامان بن گئے میں دل ہی دل

(باقی ص [illegible])

کوثر نیازی

مارشل لاء کے اسیروں کو رہا بھی کردو

خنجرِ ظلم کی اپنوں پہ روانی مت پوچھ
کیسی رُلتی رہی جیلوں میں جوانی مت پوچھ
ضبط ہونے میں نہیں آئیں گے آنسو کوثر
مارشل لاء کے اسیروں کی کہانی مت پوچھ

مکر آزاد ہوا اور قید دیانت افسوس
کذب آزاد ہوا اور بند صداقت افسوس
تختِ شاہی پہ تو ہو ظلم و ستم جلوہ فروز
سنٹرل جیل میں ہو دیں کی امانت افسوس

ایک اک کوچہ میں ماتم کا سماں ہے اب تک
زیست پر موت کا لوگوں کو گماں ہے اب تک
میرے پنجاب کی مغموم فضا پر طاری
کتنی بیواؤں کی آہوں کا دھواں ہے اب تک

عارضی عظمت و شوکت کا کبھی دم نہ بھرو
آخرت سے نہیں دنیا کی قیامت سے ڈرو
اک حسیں پھول اسے اہلِ خرد کہتے ہیں
کچے گارے کی فصیلوں پہ بھروسہ نہ کرو

غم و آلام سے ملت کو جدا بھی کر دو
حق قیادت کا جو ہے تم پہ ادا بھی کر دو
امتحاں قوم کے جذبات کا کب تک لو گے
مارشل لاء کے اسیروں کو رہا بھی کر دو

سلہ جیل

نعیمہ شہناز

اے قافلے والو!

اورجب وہ پھولوں کی بڑی نرم نرم پیاری پیاری سیج پر آخری
تڑپی۔ اچھلی اور اچھل کر لرزی۔ اور اس کے گلے کی ابھری ہوئی رگیں
ہ گئیں۔ اس کی پیشانی پر منے منے سے موتی جھلملائے اور جب اسکی
ح اس کے خشک لبوں پر کپکپا اٹھی۔ اور زندگی اس کی آنکھوں میں
ٹ کر کراہنے لگی۔ اور جب اجالوں نے اس کے چہرے پر دم دیدیا۔
راندھیرے دبے پاؤں اس کے چہرے کی سفیدی پر پھیلنے لگے — اور
دگی موت کے ساگر میں ڈوبنے لگی۔ اور اس کے سیاہ نرم بال ریشمی
وں پر بکھر بکھر سے گئے۔ تو میں نے اس پر جھک کر سرگوشی کی —
یں تمہاری کہانی لکھوں گی" اس وقت موت کے تاریک بادلوں
بجلی کی ایک باریک سی لکیر چمک اٹھی۔ یہ اس کی مسکراہٹ تھی! اور
ے حیرت ہوئی کہ موت کے ویرانے میں اتنا حسن کہاں سے بھر گیا؟ جن
ں پر ایک باغی روح تڑپ رہی ہے ان کی مسکراہٹ اتنی حسین
ے ہو سکتی ہے؟

"تو کہانی کیسے لکھے گی ری؟"

زندگی کے خزانے کو لٹا دینے والی آنکھیں میرے چہرے پر جم
یں۔ اور تاریک بادلوں میں بجلی کی لکیر دور دور تک پھیلتی چلی گئی اور
ت کے کھنڈروں سے آتی ہوئی ایک دھیمی مگر آشنا آواز نے ایک
ہوٹا سا مگر بڑا تیز نشتر میری روح کے سینے میں گھونپ دیا۔ اور میں
ے تحاشا چیخ اٹھی۔ "میں کہانی لکھوں گی..... میں لکھوں گی لالی —
ں ....!" اور پھر میری آواز میرے گلے میں جھلس کر رہ گئی اور مجھے
ں محسوس ہوا۔ جیسے کسی نے منوں مرچیں میرے پیٹ میں اتار دی ہیں
ہ میری انتڑیاں، میرا دل، میرا گلا اور میری آنکھیں جل جل کر راکھ
و رہی ہیں۔ اور پھر موت نے اپنا بڑھتا ہوا ہاتھ ایک لمحے کے لئے روک
یا۔ اور کراہتی ہوئی آنکھوں میں بھیگا بھیگا سا پیار امنڈ آیا۔ اور میرا
جی چاہا کہ ان آنکھوں پر اپنے ہونٹ رکھ کر یہ سارا پیار پی جاؤں ان
پلکوں کے ڈھانپنے سے پیشتر ان پیالوں سے یہ تمام پیار اپنی روح میں
انڈیل دوں جس میں زندگی ہے۔ انسانیت ہے۔ پھول ہیں اور سلے
ہیں۔ اور یہ پیالے تو اب ٹوٹنے والے ہیں۔ زندگی کی کراہ اب مٹ چکی
تھی۔ اور اب وہ آنکھیں موت پر ہنس رہی تھیں اور مجھ پر پیار لٹا
رہی تھیں۔ موت شرمندہ ہو کر جھجک رہی تھی۔ تاریک بادلوں میں بجلی
چمکتی رہی۔ اور موت کے ویرانوں میں حسن بھرتا رہا۔ اور مجھ سے جدا ہونے
والی میری محبوب آواز مجھ سے کہہ رہی تھی۔ "تو کہانی کیسے لکھے گی ری؟
دیکھ تیرے یہ نازک نازک سے ہاتھ کیسے لرز رہے ہیں۔ ان میں قلم تھم
سکے گا؟ اور پگلی تو کیا لکھے گی۔ تو تو کل کی لکھنے والی ہے۔ اور تیرا قلم
بہت ہی نیا ہے۔ اور نیا قلم ٹھیک طرح سے چل ہی کب سکتا ہے؟
تو میری کہانی لکھے گی؟ — میری؟؟ باؤلی!! سمندر کو اپنے چلو میں
قید کرنا ممکن نہیں۔ اور پھر زندگی کے طوفانوں اور دل کے ویرانوں
کو تو بہت بڑے بڑے فن کار اپنی تحریروں میں سمیٹتے سمیٹتے تھک ہار
چکے ہیں۔ اور تو — تو اتنی منی سی تو ہے۔ بڑی کمزور دل والی —
دیکھ میرے کندھوں پر رکھے ہوئے تیرے یہ ہاتھ کس طرح لرز رہے ہیں
اور تیری آنکھوں میں تو بات بات پر آنسو کے طوفان مچل جایا کرتے ہیں
اور تیری آنکھوں میں اگر اسی طرح پانی بھرتا اور تیرتا رہا تو تجھے اتنا بھی
معلوم نہ ہو سکے گا۔ کہ تو کیا لکھ رہی ہے۔ تیرے اور تیری تحریر کے درمیان
تیری دھندلی نگاہیں حائل ہو جائیں گی........ بھیگی نگاہیں بیکار
نظریں —!!"

اس وقت میں نے اس کے کندھوں کی ابھری ابھری ہڈیوں
پر سے اپنے لرزتے ہوئے ہاتھ کھینچ لئے اور اس کے چہرے سے اپنا چہرہ
ملا کر ایک گہرے یقین اور ایک نئے ارادے کے ساتھ کہا۔ "نہیں —

میں لکھوں گی لالی ـــــ میں ضرور لکھوں گی۔ یہ ہاتھ اب کبھی نہیں لرزیں گے۔ میں وعدہ کرتی ہوں، ان ہاتھوں میں اب کبھی لرزہ نہیں اٹھے گا۔ اب یہ ہاتھ اتنے سخت ہو جائیں گے۔ کہ زمانے کا بھاری سے بھاری ہتوڑا بھی اگر ان پر کاری ضربیں لگائے گا۔ تو ان میں ایک ہلکی سی ٹیس بھی نہیں اٹھے گی۔ ایک چھوٹی سی ہڈی بھی نہیں ٹوٹے گی ان کی ـــ اور یہ ہاتھ درد سے کبھی نہیں لرزیں گے۔ اور ان سخت ہاتھوں کی انگلیوں میں اب کے جو قلم تھمنے والا ہے نا، وہ ان انگلیوں کے گوشت میں گھستے گھستے بے شمار رگوں میں الجھ کر رہ جائے گا۔ وہ ان ہاتھوں کا ایک حصہ بن جائے گا۔ اور یہ حصہ ان ہاتھوں سے کبھی نہیں کٹے گا۔ یہ قلم ان انگلیوں سے کبھی نہیں گرے گا۔ اور لالی زمانہ تو چپکے چپکے نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہے۔ چاند کی طرف راہیں استوار کی جا رہی ہیں۔ سمندر کی گہرائیوں میں کرسیوں پر بیٹھ کر تاش کھیلا جاتا ہے۔ کوئلے سے مکھن مکھن سے خون اور خون سے پیپ بنائی جاتی ہے۔ اور بہت کچھ ہوتا ہے، لالی ـــ۔ اس زمانے میں جو کچھ بھی ہو جائے تعجب نہیں۔ پھر کیا خبر میں بھی سمندر کو اپنے چلو میں قید کر ہی لوں، ہواؤں کا رُخ بدل دوں۔ اور اپنی تحریروں میں آندھیوں اور طوفانوں کو سمو لوں۔ کون جانے لالی! اور لالی! یہ جو میری آنکھوں کے جلتے جلتے سے بے شمار آنسو گر کر تمہارے گریبان میں جذب ہو رہے ہیں نا تو یہ میرے آخری آنسو ہیں۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں۔ پھر میں کبھی نہیں روؤں گی۔ ان آنکھوں میں پانی کبھی نہیں چھلکے گا۔ میری آنکھوں نے اپنا آخری اثاثہ تم پر نثار کر دیا ہے اور اب ان آنکھوں میں ایک بوند بھی نہیں رہے گی۔ اب تو ان آنکھوں میں پانی کی جگہ آگ ہوگی، سورج ہوگا گرمی ہوگی۔ اور گرمی تو زندگی ہے۔ میں زندگی کو کبھی نہیں چھوڑوں گی۔ میں لکھوں گی اور اس گرمی کو اپنے قلم میں بھر لوں گی۔ اپنی تحریروں میں گھول دوں گی۔ میں لکھوں گی لالی!!

اور میں نے دیکھا کہ بند ہوتی ہوئی سوتی سوتی سی آنکھوں میں نمی کے اس پار کہیں سے اچانک دو انگارے ابھرے۔ دہکتے ہوئے انگارے، اور دفعتاً پانیوں میں طلسمی چراغ جل اٹھے۔ میں کچھ دیر چپ چاپ آگ اور پانی، اندھیرے اور اجالے کے اس ملاپ کو

تکتی رہی۔ پھر پلکیں جھک گئیں۔ گالوں پر گر گرسی گئیں۔ تار میں بجلی کی چمکیلی لکیر چھپ گئی اور پانی کے اجلے اجلے شفا میں انگارے بجھ بجھ سے گئے اور پیالے ٹوٹ گئے۔ اور بھی پیار سو گیا۔ موت تیزی سے آگے بڑھی۔ اور زندگی اپنا کراہٹ کھڑی ہوئی۔ اور پھر میری نظریں اس بھاری درواز اٹھیں۔ جو بہت ہی قیمتی لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ جس میں حسن تھا۔ اور جو یوں چمک رہا تھا۔ جیسے موت کے بھیانک اندھے ذرا بھی متاثر نہ ہو سکا ہو۔ ریشمی پردے سر سرا رہے تھے۔ لالی زندگی بھر ان اونچی دیواروں، بھاری دروازوں ا پردوں کے اندر کسمساتی رہی۔ تڑپتی رہی اور سسکتی رہی اونچی دیواروں کو پھاندنے، ان بھاری دروازوں کو توڑ پردوں کو چاک کرنے کے کیسے کیسے خواب دیکھے۔ مگر وہ ا کے مطابق ان دیواروں، دروازوں اور پردوں کی قید ہو سکی۔ وہ صحراؤں، میدانوں، پہاڑوں اور پگڈنڈیوں کی فا ایک سانس بھی نہ لے سکی۔ حالانکہ ان کے خواب اس کی ز ہوئے تھے۔ آخر اس کا دم گھٹ گیا۔ اور وہ مر گئی۔ اور ا وہ ان تمام قیود سے آزاد ہو چکی ہے۔ اور آزاد فضائیں ہیں۔ اور اس کا خیر مقدم کرنے کے لئے بے چین، تو کیوں نہ باغی اور آزاد لالی کو خود رخصت کر دوں۔ وہ پگلی تو خو میں دروازہ بھی بھول کر کمرے میں چاروں طرف بھٹک ر نے اٹھ کر آہستہ سے دروازہ کھولا۔ پردے سرکائے اور ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی اور پھر جانے کیسے میں لالی دبے پاؤں میرے پاس سے گزر کر دروازے سے باہر وہ چلی گئی ـــــ لالی چلی گئی ـــ اور میں نے پکار کر کہا، اب تمہاری راہ میں کوئی دیوار نہیں کوئی دروازہ نہیں۔ ا کوئی پردہ نہیں۔ جو پھانسی کا پھندا بن کر تمہاری آرزو وُں پڑ جاتا تھا۔ اب کوئی قید نہیں، کوئی رکاوٹ نہیں اور تم ہو لالی! تم سرکش ہو اور تم باغی ہو۔ جاؤ تمہارے میدان بہت اور تمہاری پگڈنڈیاں تمہاری آمد کی خوشی میں گیت

جاؤ اور ان سب پر حکومت کرو، ان پر اپنی ہنسی کے ساغر لٹا دو، اور مسکراہٹوں کے موتی بکھیر دو۔ جاؤ اور ان پگڈنڈیوں پر اپنے محبوب کے قدموں کے مٹے ہوئے نشان تلاش کرو۔ اور جب انھیں پا لو تو آسمان کے ستارے توڑ کر ان پر نچھاور کر دو۔ جاؤ کہ آسمانوں اور زمین کی تمام آزادیاں اب تمہاری ملکیت ہیں۔ جاؤ لالی جاؤ ——! اور جب زندہ لالی کے چھوڑے ہوئے مردہ جسم کے گرد پیار کرنے والے چیخ رہے تھے۔ رو رہے تھے۔ اور بین کر رہے تھے۔ تو میں بڑے اطمینان سے اپنی لکھنے کی کاپی ڈھونڈ رہی تھی۔

سرخ گالوں، سیاہ آنکھوں، چمکیلے بالوں اور گول مٹول برہنہ پنڈلیوں والی خان زادی کا بچپن تتلیاں پکڑتے، رنگین فراک پہنے، بالوں میں ریشمی ربن باندھے، پڑھنے اور ہنسنے کھیلنے میں یوں تیزی سے گزر گیا جیسے کوئی ستارہ آسمان کے ایک گوشے سے لپک کر دوسرے گوشے میں غائب ہو جائے۔ بات یہ ہے کہ گول کمروں، بائیں باغوں اور بہتی ہوئی روشنیوں میں زندگی یوں گزر جاتی ہے۔ جیسے کسی نے چٹکی بجا لی ہو۔ پتہ ہی نہیں چلتا۔ اور زندگی کا ایک طویل مرحلہ جلد ختم ہو جاتا ہے اور جب وہ جوانی کی ان حدود میں چل رہی تھی جن کا فاصلہ بچپن سے زیادہ دور نہیں ہوتا تو وہ وطن کی سب سے زیادہ حسین، سرکش اور مغرور دوشیزہ مانی جانے لگی۔ ان گنت خان زادوں کے دلوں پر صرف ایک ہی لفظ لکھا جانے لگا۔ لالی، لالی، لالی —— ہر طرف جیسے لالی پھیل گئی۔ سرخی چھا گئی۔ اور لالی تھی بھی تو ایک گہری سرخی، ایک شعلہ ایک کرن، ایک شعاع —— روشن اور سوزندہ، جو دوسروں کو جلا کر راکھ کر دیتی تھی۔ خان زادے جلنے لگے۔ گول کمروں میں شعلے بھڑک اٹھے اور پائیں باغوں میں آندھیاں چلنے لگیں اور سرخی پھیلتی رہی اور لالی چھاتی رہی۔ ہر طرف، ہر محل میں، اور مغرور خان زادی کی آنکھوں میں غرور اور زیادہ بھرتا گیا۔ اس کی سرکشی اور بڑھتی گئی، محبتوں نے اپنی جھولیاں اس کے سامنے پھیلائیں۔ اور اس نے ہر جھولی کو اپنے غرور کی قینچی سے کتر ڈالا۔ لالی مغرور تھی۔ لالی سرکش تھی۔ اس نے ہر اس سر کو ٹھوکر لگائی۔ جو اس کے قدموں میں جھکا، اور جب سونے میں لپٹے لپٹے اور ان گنت دلوں کو ٹھکراتے ٹھکراتے اس کی جوانی سنجیدگی اور وقار

کی حدود میں داخل ہو گئی تو جلے بھنے خان زادے جھنجلا کر سوچنے لگے۔ آخر لالی کس الف لیلوی شہزادے کا انتظار کر رہی ہے۔؟ وہ کون ہو گا۔؟ کس ملک کا رہنے والا؟ شاید آسمانوں ہی سے وہ اترے اور لالی کو اپنے اڑن کھٹولے پر بٹھا کر چاند اور ستاروں کی دنیا میں لے جائے۔ کون جانے بھئی " خدا کرے لالی مر جائے !" یہ بہت سے دل جلے خان زادوں کی بد دعا تھی۔ اور لالی مری تو نہیں، مگر وہ ایک اور لالی میں ضرور بدلنے لگی۔ یہ لالی کیسی ہو رہی ہے؟ بارہا اپنے زانو پر ٹھوڑی رکھ کر میں نے سوچا تھا۔ لالی کے چہرے کا غرور آہستہ آہستہ مٹنے لگا تھا۔ اور اس کے چہرے پر ایک ایسی انوکھی ملائمت، ایک ایسی اجنبی سی سنجیدگی پھیل رہی تھی جس میں غرور سے زیادہ رعب اور وقار تھا۔ کبھی کبھی وہ یوں لگتی۔ جیسے وہ ایک پختہ عمر عورت ہے۔ اور میں اس کے سامنے سہم سی جاتی۔ اپنی کم سنی مجھے اس کے سامنے بہت بری طرح محسوس ہونے لگتی۔ اور میں نظریں بچا بچا کر اس کے چہرے کو دیکھنے لگتی۔ جو مجھے بہت ہی اجنبی اور عجیب سا لگتا۔ اس وقت مجھے لالی کو پہچاننے میں بڑی دقت ہوتی۔ بعض اوقات اس کی آنکھوں میں ایسی پراسرار روشنی ابھر آتی، جیسے کسی نامعلوم جزیرے سے پریوں نے آ کر اس کی آنکھوں میں ننھے ننھے سے طلسمی چراغ روشن کر دیئے ہیں۔ ان چراغوں کی روشنی پھیلتے پھیلتے اس کے پورے چہرے پر چھا جاتی۔ اور وہ دور افق میں اپنی نظریں جمائے چپ چاپ یوں تکتی رہتی جیسے اس کی روح دبے پاؤں جا کر افق کے دامن میں اپنے کھوئے ہوئے خواب ڈھونڈ رہی ہے۔ اور اس کی پیشانی کے وسط میں عین اس جگہ جہاں خان زادیاں جھومر لٹکاتی ہیں۔ ایک ایسا نور جھلک آتا جو یوں لگتا جیسے آسمانوں کا کوئی چمکتا ستارہ اس کی پیشانی کی جلد کے اندر ٹک گیا ہے۔ وہ اجنبی اور انوکھا نور اس کی پیشانی کے وسط میں چمکتا اور مجھے یوں محسوس ہوتا۔ جیسے نئی لالی پرانی لالی سے آہستہ آہستہ دامن چھڑا کر جا رہی ہے لالی، لالی سے بچھڑ کر جا رہی ہے کس راہ؟ کس منزل کی جانب؟ یہ نہ تو میں نے لالی سے پوچھا اور نہ اسی نے بتایا۔ قہقہہ لگاتے لگاتے لالی یوں چپ ہو جاتی جیسے کسی نے کوئی دردناک خبر اس کے کانوں ہی میں انڈیل دی ہو۔ باتیں کرتے کرتے جانے لالی کہاں گم ہو جاتی اور اس

کے ہم رتبہ لوگ اس کی اس بے نیازی کو غرور سمجھ کر چڑتے اور جھنجلاتے اور لالی نے کبھی ان کی غلط فہمی کو دور نہ کیا، ان سے معذرت نہ کی۔ ان کو یہ نہ بتایا کہ میرا غرور جانے کہاں کھو گیا ہے؟ اور یہ؟ یہ تو جانے کیا ہو گیا ہے مجھے ـــــ اور اس کے ہم رتبہ لوگ سمجھے کہ لالی کا شوخ غرور سنجیدہ بن کر اور بھی کافر ہو گیا ہے۔

اور لالی کے سرخ گال پہلی بار اس وقت زرد نظر آئے۔ جب ـــــ بات یوں ہوئی کہ لالی موسم بہار میں اپنے والد شہباز خاں کے ساتھ شہر سے دور، جہاں اس کی زمینیں ہیں باغات ہیں اپنی سرخ پتھر کی کوٹھی میں مقیم تھی۔ وہ کوٹھی جس کا رنگ تازہ بہتے ہوئے خون کا سا تھا۔ نکھرا نکھرا سا، جو دامان کوہ میں ٹھنڈی اور پرسکون ندی کے کنارے ایک ذرا سے اونچے ٹیلے پر خان کی خانی کی تمام عظمت اور رعب لئے یوں نظر آتی جیسے علاقے بھر کے جاگیرداروں کا خون اس میں رچا ہوا ہے۔ گہرا گہرا سا، سرخ سرخ سا، اور اس خون نے اس میں تازگی اور زندگی گھول رکھی ہے۔ اس کے پہلو سے سنگ مرمر کی اجلی اور چمکیلی سیڑھیاں نکل کر پرسکون ندی کے سینے میں جا اتری تھیں۔ اور ان سیڑھیوں پر جب صنوبر اور دیودار کے لمبے اور گہرے سائے لرزتے تو وہ سرخ سرخ سا گھر بڑا پراسرار نظر آتا اور یوں لگتا جیسے لمحہ بھر میں بے شمار دروازوں میں سے بے شمار پریاں دبے پاؤں نکل کر ان جھولتے ہوئے سایوں میں سے ہوتی ہوئی یوں خاموشی سے ندی کے پرسکون پانی میں اتر جائیں گی جیسے ندی کے کنارے کی بکائنوں سے پھولوں کے نرم نرم گچھے چپ چاپ ندی کے ٹھنڈے پانی میں گر کر بہتے ہیں۔ لالی کے پیہم اصرار سے مجبور ہو کر میں اپنے تعطیل کے چند دن اس کے پاس گزارنے چلی گئی تھی۔ اور وہاں جا کر جب لالی پر میری پہلی نگاہ پڑی۔ تو ایک لمحے کے لئے میں لالی کو پہچان نہ سکی۔ لالی کے چہرے کی ـــــ اجنبیت اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اور مجھے اس کو پہچاننے میں بہت دقت ہوئی۔ اور میں اسے دیکھ کر اتنی گم سم ہو گئی تھی۔ کہ لالی نے بار بار جھک جھک کر جب میری پیشانی کو چوما تو میں نے اپنی روح کو جھٹکے دے دے کر اس غنودگی سے بیدار کیا۔ جو لالی کے چہرے کی اجنبیت

خوشبوؤں اور سایوں کے یہ دن اگرچہ سرخ کوٹھی میں لالی کے ساتھ بڑی دلچسپی سے گزر رہے تھے۔ مگر پھر بھی لالی کی حرکات اور اجنبیت کو دیکھ دیکھ کر کبھی کبھی میں اس قدر جھنجلا جاتی کہ بے اختیار جی چاہتا کہ لالی کے لال رخسار پر ایک زور کا تھپڑ جما کر کہہ دوں۔ لالی یہ تم کیسی ہو گئی ہو؟ میرا دم گھٹ جائے گا۔ لالی خود بھی میری اس جھنجلاہٹ کو محسوس کرتی۔ کبھی کبھی وہ میرا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر اپنی بڑی بڑی کالی کالی آنکھوں سے مجھے چپ چاپ تکتی رہتی۔ پھر سرگوشیوں میں کہنے لگتی۔ "میں تم پر بہت اعتبار کرنا چاہتی ہوں۔ اتنا ـــ اتنا ـــ کہ ....." مگر پھر وہ میرے چہرے کو بس تکتی ہی رہ جاتی۔ اس وقت اس کے چہرے کی سرخی اس قدر گہری ہو جاتی۔ جیسے دنیا کے تمام سرخ سرخ گلابوں نے اپنی زندگی اور اپنا رنگ اس کے چہرے میں گھول دیا ہے۔ اور میرا جھنجلایا ہوا دل بھڑک اٹھتا۔ خدا کی مار تم پر لالی! تم نے مجھے ستانے کا یہ کیا ڈھنگ اختیار کر رکھا ہے اللہ کرے یہ جلتی جلتی سی "لالیاں" تم کو جلا ہی ڈالیں...... اور ایک دن لالی کا جھجکتا ہوا بہت بہت سا اعتبار مجھ پر چھلک ہی پڑا۔ وہ معطر ہواؤں اور سرد جھونکوں والی ایک سنہری شام تھی۔ سورج کی آخری کرنیں سنگ مرمر کی سیڑھیوں سے اتر کر ندی کی ننھی منی لہروں کو پکڑ پکڑ کر تیر رہی تھیں۔ اور وہ نازک نازک سی لہریں بے ساختہ ان سنہرے تاروں میں الجھ الجھ سی رہی تھیں۔ اور بھاگ بھاگ سی رہی تھیں اور بہار دھومیں مچا رہی تھیں۔ ندی کے کنارے سبز گھاس پر بیٹھی ہوئی لالی اس لالی میں گم تھی۔ جسے میں قطعاً نہیں پہچانتی تھی۔ اور میں اس کے پاس ہی بیٹھی اپنے دامن میں چنبیلی کے بہت سے پھول لئے لالی سے کہہ رہی تھی۔ دیکھو تو یہ منی منی سی لہریں کئی بار کنارے کے پاس آ آ کر مجھ سے چنبیلی کے پھول مانگ چکی ہیں۔ تھوڑے سے دے دوں ان کو؟ اور لالی اپنی انجان آنکھوں سے کہہ رہی تھی۔ "جانے تم کن پھولوں کا ذکر کر رہی ہو۔ میری جو دنیا ہے نا، وہاں چنبیلی کے پھول نہیں ہوتے" اور میرا دل بیزار ہو کر چیخ پڑا۔ "تو وہاں کیا ہوتا ہے؟ کیا ہوتا ہے ـــ؟ یہ مجھے کب بتاؤ گی؟" اور عین اس وقت سنگ مرمر کی سیڑھیوں

نے پلٹ کر جو دیکھا تو بے ساختہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے
پھیلے ہوئے باغ کی دائیں جانب والی باڑھ کا
ست کے گر جلنے سے بیٹھ چکا تھا۔ اور اس گری
سے چور دروازے کا کام لے کر ایک مست اور
تھی ۔ اس کے گلے میں ایک چھوٹا رسّا لٹک رہا
لڑکا بھاگتا ہوا اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ اس کے
نکل رہی تھیں ۔ گائے خوفناک حد تک اونچے
ئے بدمست ہاتھی کی طرح جھومتی ہوئی ہماری
ہی تھی ۔ وہ کھلے ہوئے پھولوں کی کیاریوں کو
ماڑیوں کو روندتی ہوئی لمحہ بہ لمحہ ہمارے قریب
سے سیڑھیاں چڑھ کر ایک درخت کے پاس کھڑے
اس تیزی کے ساتھ سیدھی چلی جائے گی ۔ مگر یوں
اس کے کانوں میں کسی نے چپکے سے کہہ دیا ہو،
ڑھیوں والی خان کی سرخ کوٹھی ہے ۔ اور وہ
ں آنے کا عزم کر چکی ہے ۔ وہ میری جھولی سے
پھولوں کو روندتی ہوئی اور سیڑھیوں کے قریب
ں کو جھٹ سے طے کرتی ہوئی نہایت بدتمیزی
چلی گئی ۔ کسان لڑکا برابر اس کا پیچھا کر رہا تھا
ٹ نے کوٹھی کے احاطے میں جو دوڑنا شروع کیا
ے سرے تک دندناتی ہوئی گھومتی چلی گئی ۔ جیسے
لہ آج تو خان کی اس سرخ اور حسین کوٹھی میں اپنے
کال کر ہی چھوڑوں گی ۔ چاہے بعد میں خان کے
بے سے چھرے سے ذبح ہی کیوں نہ ہونا پڑے
و دیکھ کر کنیزوں اور خادماؤں کی چیخیں نکل گئیں
نے تھے اور کوٹھی کے پچھواڑے ایک بڑے سے
ن سے منشی اور کاردار بیٹھے سال بھر کا خرچ
درج کر رہے تھے اور جانے اور کیا کر رہے تھے
لے باوجود مجھ نالائق کو اب تک زمینداری کے

کرے ۔ کنیزوں اور خادماؤں کی چیخیں سن کر تمام منشی اور کاردار سب کچھ چھوڑ چھاڑ بھاگتے چلے آئے ۔ ادھر سے نوکروں کا بھی ایک گروہ پہنچ گیا ۔ اور سب چاروں طرف سے گائے کو نرغہ میں لینے کی کوشش کرنے لگے ۔ مگر تو بہ وہ کب کسی کے قابو میں آنے والی تھی ۔ وہ ایک طرف بڑھتی ۔ اور لوگوں کو اپنا استقبال کرتے پا کر پھرتی سے پینترا بدلتی ۔ اور پلٹ کر دوسری طرف رخ کرتی ۔ اس طرف اپنا راستہ بند پا کر وہ وحشت سے گھومتی ۔ اور اپنے سینگ تان کر نوکروں اور منشیوں کے دائرے کو توڑتی ہوئی اپنی کامیابی پر جھوم جھوم اٹھتی ۔ اور وہ چھوٹا سا کسان لڑکا تو موت اور زندگی کے فرق سے بے نیاز ہو کر برابر گائے کا پیچھا کر رہا تھا ۔ لالی اور میں دونوں درخت کے ساتھ ٹیک لگائے خاموش کھڑے تھے ۔ توبہ ، ہائے کون ؟ وہاں تو سارے احاطے میں مست گائے گھوم رہی تھی ۔ اور نوکروں اور کارداروں کے دائرے پھیل رہے تھے اور پھر یوں ہوا کہ ایک طرف اپنے سامنے بہت سے آدمیوں کی دیوار دیکھ کر اب کے جو گائے پلٹی تو عین اس وقت کسان لڑکا اس کے قریب پہنچ چکا تھا ۔ اور اب جو وہ مڑی تو اس کے سینگوں اور لڑکے کے درمیان بہت کم فاصلہ رہ گیا تھا ۔ لڑکے نے پھرتی سے پہلو بدلا تو تیزی سے بھاگتی ہوئی گائے کا ایک سینگ لڑکے کی پشت سے چھو ہی گیا ۔ اور دوسرے ہی لمحے لڑکا اوندھے منہ زمین پر پڑا ہوا تھا ۔ اور جیسے کوٹھی میں سیر کرتے کرتے سرکش گائے کا جی بھر گیا تھا ۔ اور اب وہ فرار کا راستہ ڈھونڈ رہی تھی ۔ اور نڈھال ہو رہی تھی ۔ اپنے گرد بے شمار لوگوں کا دائرہ تنگ ہوتے دیکھ کر اس نے ہتھیار ڈالنا منظور کر لیا ، اور جب لالی کا ایک نوکر گائے کے گلے میں لٹکتے ہوئے رسّے کو ہاتھ میں لے کر اسے جھٹکے دے رہا تھا ۔ اور لکڑی سے گائے کو مار رہا تھا ۔ تو دوسرے تمام لوگ زمین پر پڑے ہوئے لڑکے کے گرد جمع ہو کر اسے کوس رہے تھے ۔ اور گالیاں دے رہے تھے ۔ جب لالی اور میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے گئے تو سب نے ادب سے ہٹ کر ہمیں راستہ دے دیا ۔ مالکہ کو دیکھ کر نمک خواروں کی زبانیں زیادہ تیزی سے چلنے لگیں ۔ اور لڑکے پر چاروں طرف سے بددعاؤں اور گالیوں کا مینہ برسنے لگا ۔ اور ان چاروں

اور کاروا روں کی شکل میں کھڑے تھے۔ جن کو ایک سانس میں گن لینا قطعی ناممکن تھا۔ لڑکا زمین پر سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی پشت پر سے قمیص پھٹ چکی تھی۔ اور عریاں جگہ سے خون کی ایک پتلی سی دھار بہہ رہی تھی۔ اور وہ اپنے گرد اتنے سارے دشمن اور نامہربان چہرے دیکھ کر اس قدر بدحواس ہو رہا تھا۔ جیسے لمحہ بھر میں اس کی شہ رگ کٹنے والی ہے۔ اور وہ دم بھر میں مر جائے گا۔ اور اس کا جسم اس سرخ کوٹھی سے باہر پھینک دیا جائے گا۔ اور یہ لوگ اس کی گائے کو اس کے گھر تک نہیں پہنچائیں گے۔ اور اس کے سر کو جھٹکے دے دے کر اذیتیں دیں گے۔ اور پھر ایک بڑے سے چھرے سے اس موٹی تازی گائے کو ذبح کر کے اسکے گوشت سے چپلی کباب بنا کر کھائیں گے۔ اور...... بس اس سے آگے اسے سوچنے کی مہلت نہیں دی گئی۔ مجمع میں سے خان شہباز خاں کا بوڑھا کاردار دلاور خان نکل کر آگے بڑھا۔ وہ سب کارداروں کا سردار تھا۔ اس کا باپ بھی کاردار تھا اور دادا بھی اور پردادا بھی اور پشتوں کی نمک حلالی نے اس کی روح میں گھل کر اس کے دل کو پتھر اور اس کے چہرے کو مٹی کا سا بنا دیا تھا۔ گھنی اور وحشت ناک داڑھی اور مونچھوں میں چھپے چھپے سے اس کے چہرے کے باقی ماندہ حصے جو نظر آتے تو وہ یوں لگتے جیسے وہ کسی مٹی کی مورتی کے لیے حس اور جذبات سے عاری چہرے کے عریاں حصے ہیں۔ جس کے منہ میں زبان کی جگہ ہنٹر اور جس کے غصے میں کوندتی ہوئی بجلیاں پوشیدہ ہیں۔ اور ان بجلیوں نے ہمیشہ لوگوں کو جلا کر بھسم کر دیا ہے۔ خان کی خانی کو اس کی شخصیت پر فخر تھا اور اس کی نمک حلالی کے گن ٹپوں اور چار بیتوں سے زیادہ شوق اور دلچسپی سے گائے جاتے تھے۔ وہی مٹی کا پتلا دلاور خان مع اپنے ہنٹر اور بجلیوں کے آگے بڑھا۔ اس کے مضبوط ہاتھ لڑکے کے کندھوں سے چمٹ گئے۔ اور دوسرے ہی لمحے لڑکا قوی بانہوں میں جھول رہا تھا۔ اور اس کے گالوں پر تڑاتڑ تھپیڑ برس رہے تھے۔ دلاور خاں اپنے ہاتھوں میں لڑکے کو جھلا جھلا کر ایسے تال اور سُر سے اس کے گالوں پر تھپیڑ جما رہا تھا جیسے وہ کوئی ساز بجا رہا ہو۔ ان تھپیڑوں کی آوازیں اٹھ رہی تھی، جیسے پتھروں کو آپس میں ٹکرا ٹکرا کر کوئی پراسرار سُر ایجاد کر رہا ہو۔ لڑکا ایک لٹو کی طرح اس کی بانہوں میں گھوم رہا تھا۔ اور جب اسے ربڑ کی گیند کی طرح زمین پر پٹخ دیا گیا تو دلاور خاں کی موٹی اور بھدی انگلیاں لڑکے کے بالوں میں سختی سے الجھ گئیں۔ اور گوشت کا ہنٹر تڑاتڑ برسنے لگا...... خنزیر کی اولاد! کوٹھی کے پاس والی راہ پر سے تجھے گزرنے کی جرأت کیوں کر ہوئی؟ تجھے معلوم نہیں کہ خان نے آکر تمام علاقے والوں کی آمد و رفت اس راہ پر بند کر رکھی ہے؟ تیری اس نابکار ماں نے بھی تجھے نہیں سمجھایا۔؟ کہ حرام زادے اس راہ پر نہ چلا کر.......! اور لڑکا اپنے بچاؤ کے لئے پہلی بار لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کچھ کہنے کی کوشش کرنے لگا۔ "اے خان...... اے خان خدا کی قسم..... میں اس راہ پر سے نہیں گزر رہا تھا...... میں تو گل ضمیر کاکا کے کھیت سے پرے پگڈنڈی پر جا رہا تھا....... وہیں سے...... اے خان وہیں سے یہ گائے میرے ہاتھ سے رسا چھڑا کر بھاگتی ہوئی ادھر آنکلی ہے...... اے خان..... خدا کی قسم... رسول کی قسم..... پیر بابا کی قسم میں جان بوجھ کر نہیں آیا... اے خان......" اور ہنٹر برابر برسے جا رہا تھا۔ "چپ چپ، سور کی اولاد، اب قسمیں کھا کر مجھے بناتا ہے؟ لول لول.. .....تم کیوں آیا ہے ادھر؟ ..... اس راستے پر..... اب..... اگر خان زادی یا کسی اور کو کوئی نقصان یہ سالی گائے پہنچاتی تو پھر کیا ہوتا؟" حسب معمول دلاور خاں کے خون میں نمک حلالی نے بڑے زوروں کا جوش مارا تھا۔ اور جب میں نے پلٹ کر لالی کی طرف دیکھا تو اس کے گال پہلی بار مجھے اس قدر زرد نظر آئے جیسے کسی نے ہلدی لیپ دی ہو اس کے گالوں پر، اس کی آنکھیں پلکوں کے سایوں میں نیم وا تھیں۔ جیسے لمحہ بھر میں بند ہونے والی ہوں اور اس کے لب کانپ رہے تھے۔ اور وہ کچھ ایسی بے بس نظر آ رہی تھی۔ جیسے وہ کچھ بولنا چاہتی تھی۔ پر آواز اس کے لبوں پر آنے سے پیشتر ہی اس کے حلق سے چپک کر رہ جاتی ہے۔ میری نظریں دوبارہ مجمع کی طرف مڑیں اس وقت کارداروں اور منشیوں کی ٹولی سے ایک اور شخص نکل کر لڑکے کی طرف بڑھا۔ ایک اور منشی..... ایک اور کاردار..... مگر نہیں، میری نگاہوں کو حیرت ہوئی۔ اس میں تو کارداروں کی سی کوئی جھلک نہیں۔ اس کے چہرے میں تو بے حسی سختی اور مٹی کی سی

بے بسی بھی تو نہیں [illegible] تو ایک دراز قد اور سیدھے سادے سے چہرے والا نوجوان تھا۔ اس کے قدموں میں بادشاہوں کی سی تمکنت اور فقیروں کی سی بے نیازی تھی۔ اس کے چہرے پر موسم گرما کی طویل اور تپتی ہوئی دوپہر کا سکوت اور بہار کی سرسوں اور پھولوں والی صبح کی سی چمک اور تازگی تھی۔ اس کے بالوں میں تاریک راتوں کی تمام سیاہی امڈی پڑی تھی۔ اور ستاروں کی چمک گندھی ہوئی تھی۔ اسکے بال جو بہت ہی بے ڈھنگے پن سے الجھے ہوئے تھے۔ خواہ مخواہ حسین نظر آ رہے تھے۔ بے ڈھب قسم کے حسین، وہ لڑکے کے قریب آیا۔ ایک لمحے کے لئے دلاور خاں کے قدموں میں سسکتے ہوئے بچے کو دیکھتا رہا۔ بچے کا چہرہ اس کی پشت سے بہتے ہوئے خون سے زیادہ سرخ ہو رہا تھا۔ پھر جھک کر اس نے خاموشی سے لڑکے کو اٹھایا۔ بچہ خوفزدہ ہوکر اچھلا اور سہم کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے سمجھا کہ تازہ دم ہاتھ ایک اور ساز اس کے چہرے پر بجانے والے ہیں۔ اس کے جسم کو نوچنے والے ہیں۔ مگر وہ تو خاموشی کے ساتھ بچے کے کپڑے جھاڑ رہا تھا۔ اس کے دھول میں اٹے ہوئے بال پیار سے تھپتھپا رہا تھا۔ اور بچہ حیران تھا کہ اس کی ماں نے اپنا دل ایک لمحے کے لئے کیونکر اس شخص کے سینے میں رکھ دیا ہے؟؟ بچہ خلاف توقع پیار پاکر بلک بلک کر رونے لگا۔ اور وہ چپ چاپ بچے کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھامے جھکا ہوا بچے کے بھیگے بھیگے رونے والے سے چہرے کو تکتا رہا۔ اس کی خاموشی بہت پراسرار تھی۔ بہت گہری تھی۔ اور نہ جانے کیوں مجمع پر سناٹا چھا گیا اور پھر اس نے جھک کر روتے ہوئے بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ بچے کا نڈھال سر اس کے فراخ سینے سے جا لگا۔ مجھ پر جیسے موت چھا گئی۔ اور دل رک رک سے گئے۔ بچے کے سر کو اپنے سینے سے لگا کر اس نے ایک سرسری سی نگاہ مجمع پر ڈالی اور پھر اچانک کچھ دیر کے لئے اس کی نگاہیں لالی کے چہرے پر جم گئیں۔ میں نے دفعتاً دیکھا کہ طویل اور تپتی [illegible] سنسناتی ہوئی تند [illegible] بہار چل گئی [illegible] مجھے بڑی حیرت [illegible] اور بہار

کی چمک ہو۔ اس کی آنکھوں میں سکوت کو مچلنے والے یہ زلزلے کیسے؟ تند ہواؤں کے طوفان اور آگ کے شعلے کیسے؟ اور جب میری نگاہیں لالی کی طرف اٹھیں تو میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں ان زلزلوں طوفانوں اور شعلوں کی تاب نہ لاکر جھک گئی ہیں۔ اور میں نے سوچا کہ کیا لالی زندہ ہے؟ ارے وہ تو مجھے ایک ایسی بے حس و حرکت لاش نظر آئی جیسے اگر ذرا سا بھی جھٹکا لگتا تو وہ دھم سے زمین پر گر پڑتی۔ اور جب وہ بچے کو اپنے سینے سے چمٹائے اپنی اسی پراسرار خاموشی کے ساتھ مجمع کو چیرتا ہوا جا رہا تھا۔ اور دلاور خاں غصے سے اپنے ہونٹ کاٹتا ہوا اسے اپنی خونخوار آنکھوں سے دیکھ رہا تھا تو لالی کی خالہ نوشابہ مجھے بتا رہی تھی۔ کہ یہ ریحان تھا جو خان کا سب سے غریب کاردار ہے۔ اور یہ غریبی اس کی اپنی نالائقی ہی کی وجہ سے ہے کیونکہ وہ دوسرے کارداروں کی طرح کسانوں کی گردن پر چڑھ کر اپنا حق ان سے وصول نہیں کرتا اور اپنی قلیل تنخواہ میں گزارہ کرتا ہے۔ اس نے بتایا کہ ریحان بہت نالائق ہے۔ بہت ہی بے ڈھنگا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ وہ کسانوں سے اپنا حق وصول نہیں کرتا بلکہ کسانوں سے زبردستی لگان وصول کرنے کے بجائے بارہا خان کے پاس کسانوں کی سفارش لے کر آتا ہے۔ اور خان کچھ اس سے بیزار ہو چلے ہیں اور دلاور خاں جیسے عقلمند اور جنگ جلال کاردار کو تو ریحان ایک آنکھ نہیں بھاتا۔۔۔۔ اور اس رات جب آسمانوں کا پاگلا چاند صنوبر اور دیودار کی پھیلی ہوئی شاخوں پر جھکا ہوا رات کی بانہوں میں ابھی ابھی جیسے اپنے سینے کے جلتے ہوئے گہرے داغ دکھا رہا تھا۔ اور چپ چاپ سی چاندنی میں کیتکی کی ہلکی ہلکی خوشبو بسی ہوئی تھی تو ندی کے کنارے [illegible] کے پیڑوں کے قریب لالی میری گود میں سر رکھے اور میرے گال [illegible] مجھ سے کہہ رہی تھی، اور بہت کچھ کہہ رہی تھی۔ ہواؤں نے سانس روک لی تھی۔ اور ندی میں کوئی لہر نہیں تھی۔ اور لالی تو [illegible]

قالینوں اور نرم صوفوں پر میری روح تڑپ تڑپ اٹھتی۔ اور جب ابا کے محل کی دیواروں کی بلندیوں اور قیمتی دیوازوں کی عظمتوں میں میرا دم گھٹنے لگتا۔ اور جگمگاتی ہوئی دنیا کی بہتی ہوئی روشنیوں میں میرا دل تاریکیوں میں ڈوبنے لگتا۔ تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ اور میں اداس ہو کر سوچتی، یہ مجھے کیا ہوگیا ہے؟ کیا ہو رہا ہے؟ اور کیوں ہو رہا ہے! یہ میری روح کدھر جا رہی ہے؟ آخر وہ کیا چاہتی ہے؟ مجھے اپنی روح پراسرار نظر آتی۔ مجھے اس سے ڈر محسوس ہونے لگتا۔ اور میں بے چین ہو ہو کر سوچتی، آخر یہ بہکی بہکی سی روح اپنی دنیا سے بیزار ہو کر کدھر فرار ہونا چاہتی ہے؟ کس دنیا میں پناہ لینا چاہتی ہے؟ وہ دنیا کیسی ہے؟ کہاں ہے؟ اور ہے بھی یا نہیں؟؟ اور جب مجھے کچھ معلوم نہیں تو میں ایسی کیوں ہوگئی ہوں؟ اور ان سب سوالوں کا جواب میرے پاس میری وحشت کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں بھٹکنے لگی — اور چاروں طرف اندھیرا تھا۔ اور مجھے کچھ سجھائی نہ دے رہا تھا اسی لئے بہت عرصے تک مجھے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ ابا کی غیر موجودگی میں جب جائداد کا کام مجھے سنبھالنا پڑتا ہے تو مختلف رجسٹروں پر دستخط کرتے کرتے میرے ہاتھ کانپ کیوں جاتے ہیں؟ کوئی نامعلوم سا تلخ احساس میری روح پر کیوں چھانے لگتا ہے؟ اور کاغذوں کے ڈھیر ناگ بن کر مجھ پر پھنکارنے کیوں لگتے ہیں؟ نوٹوں کے بنڈلوں کو تجوری میں بند کرتے وقت میرا دل نادم نادم سا ہو کر گھبرانے کیوں لگتا ہے؟ اور جب ہر ماہ کسانوں کے گھروں سے جمع شدہ گھی، انڈے اور مرغیاں ہماری بڑی خادمہ کے حوالے کی جاتی ہیں۔ تو میری روح کو شدید جھٹکے کیوں لگتے ہیں؟ اور جب کسان عورتیں امی کے پاؤں پر ہاتھ رکھ کر اور اپنے بچوں کو ان کے قدموں میں لٹا لٹا کر کارواروں اور منشیوں کے مظالم کی فریادیں کرتی ہیں۔ تو میں نڈھال ہو کر بستر پر گر کیوں پڑتی ہوں —؟ اور جب نوکروں اور خادماؤں پر گالیوں کا مینہ برستا ہے۔ تو میری آنکھوں کے گوشے بھیگنے کیوں لگتے ہیں؟ میں اپنے ماحول سے اکتا کیوں رہی ہوں؟ دور کیوں جا رہی ہوں؟ ہمارے ماحول میں تو یہی سب کچھ تو ہوا کرتا ہے اور اسی "سب کچھ" کی برکت سے تو ہمارے ماحول کی چمک دمک قائم ہے۔ پھر یہ مجھے کیا ہوگیا ہے؟ اور یہ

اندھیرے میرے چاروں طرف پھیل کیوں رہے ہیں؟ اور ان میں میری روح بھٹک بھٹک کر کس طرف جا رہی ہے؟ کس بڑھ رہی ہے؟ — اور جب ریحان کا ردار بن کر مجھے ملا اندھیرے یکلخت مٹ گئے۔ اور نور کی کرنیں پھوٹ پڑیں۔ میری ہوئی نظروں کو اجالے مل گئے۔ اور ریحان کی شخصیت نے مجھ تمام بھیدوں کے دروازے کھول دیئے۔ اس کی خاموش حر اور عمل نے مجھے وہ سب کچھ سمجھا دیا۔ جو اس کی زبان مجھے کہہ سکے اور میں نے سوچا۔ ارے میں بھٹک کہاں رہی تھی؟ تو — میں تو اس راہ پر نکل آئی ہوں جس کے آخری موڑ پر کھڑا کہہ رہا ہے۔ "یہی تو نئی راہ ہے۔ نئی، ستھری، سیدھی ج چلنے والوں کی منزل میں روشنی ہے، اجالا ہے، انسانیت مسکراہٹ ہے..... اور ..... میں نے اپنی منزل کا سر لیا۔ اس دنیا کی حقیقت کو سمجھ لیا۔ جس میں انسانیت کے ک ہیں۔ اور ان پھولوں میں چنبیلی کے پھولوں سے زیادہ نکہت ا ہوتی ہے۔ وہ دنیا جس میں تمہارے گلاب اور تمہاری چنبیلی شاعری نہیں ہوتی۔ وہاں ٹھوس زندگی کے گیت گائے جا تلخ و شیریں گیت، وہ دنیا میری منتظر ہے۔ اور میں وہا گی۔ ریحان کے ساتھ مل کر زندگی کی گاڑی کھینچوں گی۔ میں بسیرا کروں گی جہاں انسان، انسان سے ملتا ہے۔ ہے اور مل کر ہنستا ہے۔ جہاں انسانوں کے درمیان حد ہوتیں۔ دیواریں نہیں ہوتیں۔ میں پگڈنڈیوں، پربتوں اور میدانوں کی اجلی فضاؤں میں سانس لوں گی۔ اور جو ریحان کے ساتھ کھیت میں کام کروں گی اور آزادی کے گی۔ ان گیتوں میں روشن مستقبل کی آوازیں اور روشن ہوں گے۔ اور کھیتوں میں ریحان کبھی نہیں تھکے گا۔ اور جھکوں گی۔ اور ریحان کی پیشانی کا پسینہ میں اپنے پلو کروں گی۔ اور ریحان کے بچوں کو میں رات کے اندھیروں اجالوں کی لوریاں سناؤں گی۔ میں زندہ رہ کر زندگی اور سڑنے کی سی قبر والی زندگی سے فرار اختیار کر لوں گی

مانی سے لڑوں گی۔ ریشمی پردوں کو نوچوں گی۔ دروازوں
ں۔ اونچی دیواروں کو گراؤں گی اور سونے کے اس پنجرے
نوں اور پگڈنڈیوں کی فضاؤں میں بھاگ جاؤں گی۔ اور
ی بہت عرصے سے لالی تم سے کھو گئی تھی نا......؟ آج
لی کو پکڑ کر تمہارے سامنے لے آئی ہوں۔"
ں نے بوکھلا کر لالی کا سر اپنی گود سے اٹھا کر گھاس پر رکھ دیا
.. ٹھہرو لالی مجھے ندی کے ٹھنڈے پانی پر اپنا چہرہ رکھنے
، دماغ میں آگ سلگ رہی ہے۔ اور تمہاری باتیں ایندھن
ل کو بھڑکا رہی ہیں۔ میری آنکھیں جلن کے مارے جھلسی جا
ور میرا چہرہ بری طرح تپ رہا ہے۔ اگر میں نے ٹھنڈا پانی
بھر کر اپنے چہرے پر نہ ڈالا۔ تو میری آنکھیں جھلس کر راکھ
ں۔ اور میرا چہرہ بھک سے اڑ جائے گا۔ اور جب میں ندی
ے اپنے چہرے پر سرد پانی کے چھینٹے دے رہی تھی۔ تو لالی
ر سے سر اٹھائے مجھے دیکھتی ہوئی بے ساختگی سے ہنس رہی
نے سمجھا۔ کبھی ہوئی چاندنی میں دور کہیں پگڈنڈیوں پر
ے کسی کارواں کی ننھی ننھی گھنٹیاں فضاؤں میں بج رہی
ٹھا کر دیکھا تو وہ لالی ہنس رہی تھی...... اور لالی
ی کی شان اور عورت کے غرور کو اپنے دامن سے جھٹک کر
پنی روح کی یہ ساری باتیں، اپنی زندگی کے یہ تمام خواب
ل کے ریحان سے کہہ ڈالے۔ اور جب ریحان نے یہ ساری
ام خواب سن کر اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔ تو اس کی آنکھوں
دی کا رعب اور "لالی کا پیار" بھرا پڑا تھا۔ اس کے چہرے
ں دھوپ چمک رہی تھی۔ اور اس نکھری نکھری دھوپ میں
، سائے پھیل رہے تھے۔ اس کی روح ابھر ابھر کر اس کے
ی طرح جھکولے کھا رہی تھی۔ کپکپا رہی تھی۔ اور لرز رہی تھی
ے لئے اس کی گرم گرم نگاہیں لالی کے چہرے پر چپ چاپ
۔ اور پھر یکلخت اس دھوپ اور سایوں پر... "احساس"
ندھیرے چھانے لگے۔ اندھیروں نے دھوپ کو نگل لیا۔
ل کے کناروں سے ٹکراتی ہوئی پانی کی ننھی ننھی لہروں میں

پیار کے دیئے بجھ بجھ سے گئے۔ اب اس کی آنکھیں خالی تھیں۔
اور چہرہ تاریک۔ محبت کی کوئی کرن، پیار کی کوئی شعاع نہیں
تھی۔ جو ان خالی آنکھوں اور تاریک چہرے کو پھر سے چمکا دیتی۔ اس
کی روح اس کے لرزتے لبوں پر نڈھال ہو کر بے دم ہو رہی تھی۔ اور
اس کے چہرے پر غلامی ابھر رہی تھی اور غربت سینہ کوٹ رہی تھی۔
لالی کو اس نے اپنے دل کی نگاہوں سے ہٹا دیا۔ اور خانزادی کے سامنے
ادب سے دوزانو ہو کر ریحان بول رہا تھا۔ لالی کا ریحان ——
لالی کے خوابوں کا ریحان —— لالی سن رہی تھی۔ اور ریحان کہہ رہا
تھا —— "میری مہینہ بھر کی کمائی صرف تیس روپے ہے۔ اور غلّہ
چور بازاروں میں پہنچ کر وہ نرخ مقرر کر چکا ہے۔ جس کے سامنے
تیس روپے تیس ٹکوں کی بھی حیثیت نہیں رکھتے۔ میرا چھوٹا بھائی خان
کی زمینوں کے ایک چھوٹے سے حصے میں ہل چلاتا ہے۔ اور خان کا
حق ادا کرنے کے بعد آپ کے کارداروں اور منشیوں کا حصہ نقد اور
گاؤں کے مالک کا حصہ مرغیوں، انڈوں اور گھی کی شکل میں دیتا ہے
اور ہم دونوں اپنی مشقت کے باوجود اپنے ضعیف والدین اور دائم المریض
بہن، اس کے یتیم بچوں اور خود اپنے آپ کو بھی مہینے میں چند روز کے
فاقوں سے نہیں بچا سکتے —— اور خانزادی! بھوکوں اور غلاموں سے
مالکوں نے ایسی باتیں کب کی ہیں؟ یہ سب کچھ آپ نے کیوں کہہ دیا؟
کیا میرے لئے بھوک اور بیماریوں کی یہ الجھنیں کافی نہیں ہیں؟ اور
یہ آپ مجھے کون سی راہیں بتا رہی ہیں۔؟ جن پر آپ کے ساتھ مل کر
چلنے کی امید میری نظروں میں ایک بچے کے مضحکہ خیز خواب سے زیادہ
حقیقت نہیں رکھتی۔ میرے دل میں ایسی آرزوئیں جگا کر ظلم نہ کیجئے
جن کو جلانے کے لئے میری روح اور میرے دل کو خود ہی انگارہ بن جانا
پڑے۔ یہ آپ کس دنیا سے آئی ہیں؟ کیا آپ نہیں جانتیں —— کہ
آپ غلاموں اور آقاؤں کی دنیا کی شہزادی ہیں۔ خدا کے لئے خوابوں
کی باتیں نہ کیجئے۔ اور حقیقت کی طرف آئیے۔ اور میرے لئے بھوک
ناداری اور بیماری کی الجھنوں ہی کو کافی سمجھ لیجئے۔ اگر آپ نے اپنے
لبوں کو سی نہیں لیا۔ اگر یہی باتیں، یہی خواب آپ کے لبوں پر
پھیلتے رہے۔ اور پھیل پھیل کر محلوں کی دنیا میں بکھر گئے تو آپ

یہ سمجھتیں کیوں نہیں کہ ان اونچی اونچی دیواروں والے رنگین محلوں میں رہنے والے کیا نہیں گے کہ مقتل بنا چکے ہیں گے اور ان تمام زلزلوں اور حادثوں سے صرف میری موت ہو گی...... مجھے اپنا ذرا بھی غم نہیں، ذرا بھی فکر نہیں، مگر میں نہیں چاہتا کہ میرے بھائی کی زمین اس سے چھین لی جائے میرے تیس روپے مجھ سے لے لئے جائیں۔ اور میرے گھر کے ننھے ننھے لوگوں کی لاشیاں ٹکڑے ٹکڑے کر مرجانا پڑے۔ اور ان مرتے ہوئے ننھے ننھے جسموں کو غیظ و غضب کے ہاتھ اس زمین پر سے بھی اٹھا کر کہیں دور جنگلوں میں پھینک دیں جس کی مٹی سے انہوں نے جنم لیا ہے۔ میں یہ کبھی نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے میرے گھر والوں کی یہ چھوٹی چھوٹی سی یہ ننھی ننھی سی زندگی بھی ان سے چھن جائے اور میری جوانی کا خبط اور جنون ہی ان کے مٹ جانے کا باعث بن جائے۔ میں اپنے لئے نہیں، اپنے گھر والوں کے لئے آپ سے رحم کی درخواست کرتا ہوں۔ خدا کے لئے ایسی باتیں منہ سے نہ نکالئے جو تیز و تند آندھیاں بن کر میرے گھروندے کو مٹی میں ملا دیں۔ میں آپ سے التجا کرتا ہوں۔ کہ اپنے محلوں میں رہ کر میرے جھونپڑے کے متعلق وہ ادھورے اور دھندلے خواب نہ دیکھئے جن کی تعبیر میری روح کی تضحیک اور میرے گھر والوں کی موت ہو۔"

لالی چپ تھی۔ لالی بے حس و حرکت تھی، اس کی پلکوں تک میں جنبش نہ تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ اور اس کے لبوں پر کپکپاہٹ تک نہ تھی۔ وہ پتھر کے مجسمے کی طرح ساکت کھڑی ریحان کی باتیں سنتی رہی۔ اور سنتی ہی چلی گئی۔ ریحان کے لبوں سے بیشمار کانٹے گر رہے تھے۔ اور لالی کی محبت سے پھیلی ہوئی جھولی ان کانٹوں سے تار تار ہو چکی تھی۔ لالی نے ریحان کی باتوں کو سمجھ لیا تھا۔ اور اسے کوئی شکایت نہ تھی۔ پھر خاموشی سے اس نے ان بکھرے کانٹوں کو ایک ایک کر کے چن لیا۔ اور وہ نکیلے کانٹے اپنی روح کی گہرائیوں میں چھپا لئے، بکھیر دیئے۔ اور جب وہ بکھرے بکھرے کانٹے اس کی روح میں اتر کر اسے بری طرح چبھے تو وہ درد سے نڈھال ہو کر اوندھے منہ بستر پر گر پڑی۔ پھر جب بہت دنوں کے بعد وہ بستر سے اٹھی۔ تو اس کے چہرے کی سرخی نہ سمٹ کر گھل چکی تھی۔ اور جب

دلہن کے ایک وسیع جائداد والے خاندان کے ساتھ اسکی نسبت طے ہونے لگی۔ تو اس نے حسب عادت اپنے جھگڑے کی ناراضگی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے لڑ جھگڑ کر اس رشتے کو رد نہ کیا۔ بلکہ خاموشی سے اپنی منگنی کی خبر سنی۔ اس وقت بھی اس کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے اس کے لبوں پر کپکپاہٹ نہ تھی۔ لالی نے اپنے جو ٹوٹ رہی تھی لئے تھے۔ یہی ریحان چاہتا تھا۔ اور جب لالی کو دینے والے اور لالی کو لینے والے ہزاروں کی تعداد میں اس کے گھر میں جمع ہو رہے تھے۔ اور روشنیوں کا سیلاب بہہ رہا تھا۔ اور بلند قہقہوں میں شادیانے گونج رہے تھے۔ تو ریحان دوسرے [illegible] کاروباروں اور منشیوں سے بڑھ چڑھ کر کام کر رہا تھا۔ وہ لٹو تو تا سا پھر رہا تھا۔ کئی بار وہ میرے قریب سے گزرا۔ اور ہر بار جب میں نے اسے دیکھا تو مجھے اس کی بے حد گنجان پلکیں بھیگی ہوئی دکھائی دیں، جیسے نرم نرم دھلی دھلی سی گھاس کو بہت سی شبنم بھگو کر پھر خشک کر چکی ہو، اور کہیں کہیں نم آلود گھاس کی کسی باریک اور اونچی نوک پر کوئی قطرہ اٹک کر رہ گیا ہو۔ ابھی ابھی نوکوں پر کہیں کہیں ٹکے ہوئے وہ ننھے ننھے سے موتی، جیسے اگر انہیں ذرا بھی جنبش ہوئی۔ تو یہ گر کر ٹوٹ جائیں گے۔ اور پھر مجھے ہول اٹھنے لگا۔ میرے دل میں ریحان کے لئے، لالی کے لئے، سب کے لئے، ساری دنیا کے لئے نفرت سی ابھری، یہ کیسے لوگ ہیں ؟ یہ کیسی دنیا ہے ؟ یہ کیا پاگل پن ہے ؟ مجھے ساری دنیا کے لوگ ایسے ہلکے، منتشر اور بے ترتیب سائے معلوم ہونے لگے جو ایک دوسرے کی طرف لپکتے پھرتے ہیں۔ اور کوئی کسی کو بھی نہیں پاتا یہ خواہشیں، یہ آرزوئیں، خوابوں کی یہ شیرینی اور حقیقتوں کی یہ تلخیاں ــــ یہ سب کیا مذاق ہے ؟ اور انسان خود اس مذاق کا نشانہ کیوں بنتا ہے ؟ اور خدا کی اس قدر مضحکہ خیز دنیا کیا کر کیا ہاتھ آگیا ہے ؟ ! اور میرا جی چاہا کہ ریحان کے دل میں اس قدر آگ کے برسا دوں کہ وہ دنیا کی تمام بھوک کو جلا جائے۔ لالی کو اس قدر جھنجھوڑ دوں کہ وہ اپنے اصولوں کے بتوں سے اپنا سر پھوڑ لے۔ اور دنیا پر اتنے پتھر برساؤں کہ سب کے سب [illegible] انسانوں کی چیخوں پر [illegible] خوفزدہ

ہوکر آسمانوں میں چھپ جاتی ہیں۔ اور جب لالی رخصت ہو رہی تھی تو میں اس کے قریب بھی نہ گئی۔ وہ چپ چاپ بھیدوں بھری سلیری ہوئی کار میں بیٹھ کر چلی گئی۔ لالی کا بیاہ ہو گیا۔ پھر میں نے کبھی پلٹ کر لالی کو پوچھا تک نہیں۔ میں بہت دور چلی گئی۔ میں نے لالی اور رحمان کو اپنے دماغ کی ایک تاریک کوٹھری میں بند کر دیا اور کہا کہ خبردار! اب باہر نکل کر مجھے کبھی پریشان نہ کرنا۔ میں تم سے سخت بیزار ہوں میں ساری دنیا سے بیزار ہوں۔ اور میں نے بھاگ کر کتابوں میں پناہ لی۔ مگر وہاں یہ دیکھ کر مجھے سخت مایوسی ہوئی کہ کتابوں میں بھی یہی کچھ بھرا پڑا ہے وہی دنیا اور لوگوں کی باتیں، وہی خواہشیں، وہی آرزوئیں، وہی تلخیاں، وہی رنگینیاں اور وہی موتیں، وہی خواب اور وہی حقیقتیں...... اور میں نے نہایت اطمینان سے اپنے آپ کو سمجھایا۔ محترمہ! خاطر جمع رکھو، اس دنیا میں رہ کر اس دنیا سے فرار کہیں بھی ممکن نہیں۔ پھر میں زندگی کے میدان میں گم ہو گئی۔ مجھے دنیا میں رہنا تھا۔ اور جینا تھا۔ میں آگے بڑھتی گئی۔ آگے اور آگے میری روح زندگی کو پیتی گئی۔ اور اس زندگی کی تمام تلخیاں، حقیقتیں تجربے، بلندیاں اور پستیاں میری روح کی گہرائیوں میں سمٹنے لگیں جمع ہو ہو کر بڑھنے لگیں، اور پھر اس حقیقت پر پہنچ کر میں چونک پڑی کہ لالی جلتے جلتے اپنے تمام خیالات اور اصول کوٹھری میں باندھ کر میری طرف پھینک گئی ہے۔ اور میری روح نے انہیں اپنے دامن میں چھپا کر رکھ لیا ہے۔ اس احساس کے ساتھ مجھے لالی پر سخت غصہ آیا۔ میں چپکے سے مسکرا دی اور اس مسکراہٹ میں بڑی گہری چاہت اور بہت گہری ٹھنڈک تھی۔

لالی کی شادی کے دو سال بعد مجھے اس کا پتہ ملا وہ مجھے بلا رہی تھی۔ اور جب میں گئی تو میرے دل میں لالی کی [illegible]

[illegible]

[illegible] محسوس کرتی [illegible]

لالی نہیں ہے۔ میرا دل اس حقیقت کو نہیں مانتا۔ یہ تو اس کے پلنگ کے اوپر مجسم جیتے والا سنگ مرمر کا وہ خاموش مجسمہ ہے جو لالی کے بستر پر لٹا دیا گیا ہے۔ اور جب اس کے لب ہلے، اس نے آنکھیں کھولیں اور مجھے پکارا تو میرے دل کی دھڑکنیں ڈوب ڈوب سی گئیں۔ یہ لالی ہی تو تھی۔ پلنگ پر دراز، بیمار اور نڈھال لالی۔ اور جیسے دو سال چپ رہ رہ کر یکلخت اس کا دم گھٹنے لگا اور اس کے دل اور روح کی گہرائیوں میں چھپے چھپے دکھوں اور غموں کے دریا میں طوفان آ گیا اور لہریں اچھلنے اور ابھرنے لگیں۔ اس کے سلے ہوئے ہونٹوں کے ٹانکے ٹوٹ گئے۔ اور جسم و روح میں اٹھتے ہوئے طوفان نے تمام دکھوں اور غموں کو میرے سامنے اگل دیا۔ لالی نے مجھے بتایا کہ کیسے شادی کے اولین چند مہینے اس نے اپنے چاہنے والے شوہر کی باہوں میں پیار اور ناز برداریوں میں بسر کئے۔ اور اس کے بعد پھر کیسے آدھی آدھی رات تک اپنے خاوند کا انتظار کرتے کرتے اس کی آنکھیں نیندوں اور خوابوں کو ترسنے لگیں اور ترستی رہ گئیں اور یہ کہ اس طویل مدت میں شراب کی بو سونگھتے سونگھتے اس کے نتھنے جل گئے ہیں۔ اور لڑتے ہیں دوست خاوند کے ہاتھوں شراب کی لائی ہوئی بوتلوں اور گلاسوں کو قالین پر سے سمیٹتے سمیٹتے اس کے ہاتھ زخمی ہو گئے ہیں۔ اور اس کی روح سے خون رسنے لگا ہے۔ اور اس کی خودداری کا چہرہ سیاہ پڑ چکا ہے۔ اور ٹوکروں سے بوتلوں اور گلاسوں کے وہ ٹکڑے اٹھواتے ہوئے اس کی روح شرم سے مرنے لگی۔ پھر وہ کیوں اپنے دل کے منتشر ٹکڑوں کی طرح بوتلوں اور گلاسوں کے ٹکڑوں کو بھی خود نہ سنبھالتی؟ اور بیچی کہ اپنے خاوند کی مہمان رنڈیوں کا استقبال کرتے کرتے وہ [illegible] طور پر قتل ہو چکی ہے مگر قتل ہونے کے باوجود وہ اپنے خاوند کی سب سے بڑی خدمت بجا لائی ہے۔ اس نے اسے ایک [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

روح دونوں زخموں سے بھر گئے۔ اور رنڈیوں کا استقبال کرتے کرتے وہ نڈھال ہو گئی۔ تو شہباز خاں اسے اپنے گھر لے آئے۔

اب وہ ان دکھوں سے بھاگ رہی تھی۔ بڑی تیزی سے بھاگ رہی تھی۔ اور میں نے اس کے پاس رہ کر اپنے آنسوؤں کے تمام خزانے اس پر نثار کر دیئے تھے۔ وہ اپنے دکھوں کے انگارے میرے سامنے بکھیرتی اور میری آنکھیں چپ چاپ ان انگاروں کو اپنے آنسوؤں کے چھینٹے دیتیں، پر وہ انگارے کبھی بجھے نہیں، اور میرے آنسوؤں کے سوتے خشک ہو گئے۔ اور جب میرے آخری آنسو لالی کے گریبان میں چپ چاپ جذب ہو گئے تو لالی اپنے دکھوں سے بھاگ گئی اور میری آنکھیں پھر کبھی نہیں روئیں.....

...... اور جب میں خزاں کی ایک ویران اور خاموش دوپہر کو شہری آبادی سے دور ایک سنسان راہ پر زرد زرد اور جلے جلے سے پتوں والے پیپل کی سوگوار شاخوں کے نیچے بیٹھی ہوئی لالی کی کہانی لکھ رہی تھی۔ تو میرے قریب سے ایک شخص کندھے پر الجھا سا رسّا اور ہاتھ میں درانتی لئے گزرا۔ دو چار قدم چل کر وہ رک گیا۔ اور اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا وہ میرے قریب آیا۔ اور خاموش نگاہوں سے میری کاپی اور قلم کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے تکلف کی تمام حدود کو پھاند کر ایسی آواز میں جس میں خلوص کی نرمی اور غصے کی سختی دونوں ملی جلی تھی۔ مجھ سے سوال کیا۔

"کیا تم کہانیاں لکھتی ہو؟"

میں نے اس کے چہرے کو گہری نظر سے دیکھ کر ہولے سے اقرار کیا—

"ہاں — !"

اس کے چہرے پر آسمانوں کا وقار اور اس کی نظروں میں صحرائی لو کی سی تمازت تھی۔ وہ رسّا اور درانتی زمین پر رکھ کر میرے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے نظریں اٹھا کر میرے چہرے کو غور سے دیکھا اور اسی بے تکلف اسی نرم اور سخت آواز میں پوچھا۔

"تم محلوں کی شہزادی ہو نا؟"

میری نظریں کاپی کے سیاہ مضمون پر جھک گئیں پھر اٹھا کر زمین پر رکھ دی اور قلم بھی۔ میری دھیمی آواز نکلے بغیر لیا— "ہاں!" پھر میں نے اپنے سر کو ہلکا سا جھٹکا دے کے پوچھا—

"تم کون ہو؟"

"میں؟؟" اس نے یوں سوالیہ انداز میں میرے گاڑدیں۔ جیسے کہہ رہا ہوں۔ "مجھے پوچھتی ہو؟ مجھے؟ تمہیں پہچانتیں؟" پھر اس کی نظریں پلٹ کر دور افق میں کھو گئیں۔ اور وہ ایک عجب شان اور وقار سے کہنے

"میں؟ میں تو "انسان" ہوں۔ صدیوں کا پرا دنیا کا انسان، سب سے بڑا سب سے عظیم انسان! تم کوئی مجھے نہیں جانتا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ میں سب کو جا صدیوں اور زمانوں سے جانتا ہوں۔ کیا تمہیں معلوم نہ ہوں وہ "عظیم انسان" جو تمہیں روٹی دیتا ہے۔ زندگی دنیا میں زندگی بکھیرتا ہے۔ خدا تو تمہیں پیدا ہی کرتا ہے رگوں میں زندگی کی حرارتیں میں گھولتا ہوں مگر— میں سے کیوں کر رہا ہوں؟ میں تو صرف تمہارے ہاتھ میں قلم تھا۔ اور مجھے خوشی ہے، سونے کے ہاتھوں میں قلم نہیں تمہارے ہاتھوں میں قلم ہے اور قلم کو تھامنے والے ہاتھ ہو سکتے۔ پھر مجھے حیرت کیوں نہ ہو۔ محلوں کی شہزادی اندر تمہارے گوشت پوست کے ہاتھوں پر اب تک سونا نہیں چڑھ سکا؟ اور قلم کیسے تمہاری انگلیوں میں تک معجزہ روشن مستقبل کا پیغام نہیں ہے؟ اور جب ایسے تمہارا ان محلوں میں کیا کام؟ تم ہمارے ساتھ دوا کیوں شامل نہیں ہو جاتیں؟ جو نئے اور کٹھن راستوں برداشت کرتا ہوا اس منزل کی طرف بڑھ رہا ہے جس ہے۔ قافلے کے ان تمام افراد کے ساتھ تم اپنے قدم کیوں جو حقیقت اور سچائی کی تلاش میں دنیا کی ہر سمت ہی راہ پر بڑھ رہے ہیں۔ ایک دو سے گئے ساتھ

ایک منزل کے مسافر بن چکے ہیں۔ اور ان محلوں میں اگر تم یونہی بیٹھی رہیں کہانیاں لکھتے لکھتے ایک دن آخر تم مرجاؤ گی۔ بس اس کے سوا اور کچھ نہ کرسکو گی۔ آؤ ــــ ہمارے کارواں میں شامل ہوجاؤ ــ ہمارے قافلے کی مسافر بن جاؤ!"

"کارواں؟ قافلہ؟" میرے لبوں پر زہر میں بجھی بجھی سی مسکراہٹ پھیل گئی پھر میں نے اپنے زانو پر سر رکھ دیا اور دیر تک چپکے چپکے ہنستی رہی وہ ہنسی اتنی تلخ تھی۔ اس قدر کڑوی کہ مجھے لگا۔ جیسے کسی نے میرے حلق میں کنین کی ایک پوری بوتل انڈیل دی ہے۔ پھر جب میں نے سر اٹھایا تو وہ جا چکا تھا۔ کسان ـــ اور "عظیم انسان" جا چکا تھا اور دفعتاً جیسے کسی نے میری روح میں انگارے بھر دیے میری ایک ایک رگ میں شعلے بھڑک اٹھے اور میں پہلو بدل بدل کر اس کو آوازیں دینے لگی۔ تم کہاں چلے گئے "عظیم "انسان؟ اور تم کس قافلے کا ذکر مجھ سے کر بیٹھے ہو؟ اور مجھ پر الزام کیوں دھرتے ہو؟ اور حقیقتوں سے آنکھیں کیوں چراتے ہو؟ کیا تم واقعی نہیں جانتے؟ اگر نہیں، تو میں بتاتی ہوں۔ اسے جس قافلے کا تم نے مجھ سے ذکر کیا ہے نا؟ اور جس قافلے میں شامل نہ ہونے پر مجھ سے شکایت کی ہے۔ اس قافلے کو میں بہت مدت سے جانتی ہوں، تم برا نہ ماننا، اسلئے اخلاص آگ بنکر میری روح کو جلا رہا ہے، اور محبت مجھ سے حقیقت اگلوا رہی ہے جس قافلے کا تم نے ذکر کیا ہے۔ وہ رواں دواں کہاں ہے؟ وہ تو رکا رکا سا اجڑا اجڑا سا اور سمٹا سمٹا سا ایک قافلہ ہے۔ جو رینگ بھی نہیں سکتا۔ اور اس قافلے کے تم سبھی مسافر "سویرا" کے تم سبھی تلاش کرنے والے بکھرے بکھرے سے اور ڈرے ڈرے سے، سہمے سہمے سے، مجبور اور نکمے انسان ہو۔ تم صرف خیالوں اور خوابوں کے پر لگا کر ننھی ننھی اور نیچی نیچی سی اڑان اڑتے ہو۔ اور پھر اوندھے منہ زمین پر گرکر سسکتے رہ جاتے ہو۔ اور مٹ جاتے ہو۔ تم سب محض خیالی پرواز کرکے اپنی اپنی مجبوریوں کا رونا روتے ہو۔ تم سب کے گرد مجبوریوں کی زنجیریں پھیلی ہوئی ہیں کہیں سونے کی زنجیریں تو کہیں لوہے کی، پر حقیقت دونوں قسم کی زنجیروں کی ایک سی ہے۔ کوئی غربت میں لوہے کی زنجیروں میں جکڑکر سسک رہا ہے۔ اور فریاد کررہا ہے تو کسی کو امارت نے سونے کی زنجیروں میں کس کر باندھ رکھا ہے۔ اور وہ وہیں پر تڑپ تڑپ کر گھٹ رہا ہے اور مر رہا ہے اپنی اپنی مجبوریوں کی سخت زنجیروں میں تم سب جکڑکر سسکنے کراہنے دوسروں کی مجبوریوں سے آنکھیں چرا کر ان سے شکایتیں کرنے، اور اپنی اپنی مجبوریوں کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دے کر رونے اور پیٹنے کے سوا اور کیا کرتے ہو؟! اور کیا کیا ہے؟ اور یہ کیسا کارواں ہے؟ یہ کیسا قافلہ ہے؟ جس کے مسافر آگے بڑھنے کی ہمت نہیں رکھتے اور روتے اور چیختے رہتے ہیں۔ اس کارواں کا ذکر میرے سامنے تم کیوں کر بیٹھے ہو؟ مجبور "انسانو!" تم سب بزدل ہو، کم ہمت ہو تم ذہنی اور دماغی طور پر ایک دوسرے کے "ساتھی" ایک "قافلے" کے افراد ہو تو ہو گے۔ مگر عمل کے میدان میں تم ایسے بکھرے پتے ہو جنھیں زمانے کی تند ہوائیں ادھر سے ادھر اڑا کر پھینک رہی اور مٹی میں ملا رہی ہیں۔ تم دکھی بھی ہو اور حساس بھی، تم ایک اجڑے لٹے سے قافلے کے بھٹکے مانندے، سہمے سہمے بکھرے بکھرے اور ڈرے ڈرے سے افراد ہو۔ تم سوچتے ہو دکھی ہوتے ہو اور فریادیں کرکرکے خاموش ہوجاتے ہو۔ کہیں امانت کی جگمگاہٹوں میں حساس اور دکھی ہونے کے باوجود سہم سہم کر محبت کی راہوں سے پلٹ جانے کے مشورے دیتے ہو۔ تو کہیں غربت کے دھندلکوں میں عقیدت کے شعلوں میں جینے کے باوجود ڈر ڈر کر پیار کے لبوں سے سل جانے کی التجائیں کرتے ہو۔ یہ تم کیسے ہو؟ سنو سنو اے "قافلے" والو ـــ! میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ اور جھنجھلا جھنجھلا کر نفرت بھی کرتی ہوں میں تم پر محبت کے پھول بھی برساتی ہوں اور نفرت کے تیر بھی، میں تمہاری حالت پر چپکے چپکے آنسو بھی بہاتی ہوں۔ اور تمہاری مجبور فریادوں پر بلند قہقہے بھی لگاتی ہوں۔ میں تمہارے دکھوں اور غموں کو اپنی پلکوں سے چن کر اپنے دل کے دامن میں سمیٹتی ہوں۔ اور تمہاری آہوں پر بڑی کڑوی مسکراہٹیں بکھیرتی ہوں۔ میں تم پر لعنت بھیجتی ہوں، اور میں تم پر سلامتی بھیجتی ہوں ـــــ اے قافلے والو ـــ! جانے تم کیسے ہو ـــ؟ اور جانے میں کیسی ہوں ـــ؟!

"بشکریہ الحمرا"

شہر کراچی

انور صدیقی ●

شکستِ زنداں

ہم خندۂ گل کے شیدائی انداز بہاراں دیکھیں گے
جب سازِ پہ شعلے رقصاں تھے اب اسکو غزلخواں دیکھیں گے

راہوں میں اندھیرے لاکھ سہی، منزل کے نشاں معدوم سہی
ہم اہلِ جنوں تیرے غم میں تاریکیٔ زنداں دیکھیں گے

احساس و نظر کی ظلمت پر پھر نورِ سحر غالب ہوگا
ہر زخمِ جگر کو ہم اک دن رشکِ مہ تاباں دیکھیں گے

موجوں کی ہر ایک زنجیرِ گراں کشتی کو اسیرِ دام کرے
بیدار اگر ہے ذوقِ سفر ہم شورشِ طوفاں دیکھیں گے

اشکوں کی روانی سے ہمدم کچھ بارِ غمِ دل کم ہولے
پھر ہم اسی تیرہ گلشن میں اک صبحِ بہاراں دیکھیں گے

زنداں کی گریں گی دیواریں زنجیر و سلاسل ٹوٹیں گے
پھر نورِ سحر کی آمد سے ظلمت کو گریزاں دیکھیں گے

اے جوشِ جنوں کچھ فرصت دے ہم دامنِ ہستی سی ڈالیں
کچھ اے غمِ جاناں مہلت دے ہم گردشِ دوراں دیکھیں گے

انورؔ ہے اگر اک آبلہ پا چھوڑو بھی کچھ اس کی بات نہیں
ہم صحنِ گلستاں دیکھ چکے، اب دشت بیاباں دیکھیں

کلار شیالی

پانچ کا نوٹ!

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں ایک موٹر کمپنی میں بطور ایجنٹ کام کرتا تھا۔ باہر کے آرڈر لینا اور بانٹنا میرا کام تھا۔ میرا زیادہ وقت سفر میں گزرتا تھا۔ اپنے شہر میں رہنا تو مجھے کبھی کبھی نصیب ہوتا ہے۔ اکثر دوسرے شہروں میں گھومتا رہتا ہوں کبھی یہاں کبھی وہاں اور ایسی زندگی کا اتنا عادی ہو چکا ہوں کہ گھر پر رکنا تو مجھے دشوار دکھائی دیتا ہے۔ اور سرائے کے بستر میرے لئے زیادہ آرام دہ تھے اور ان سے مجھے بڑا آنند ملتا تھا۔

کمپنی صوبہ مدراس میں اپنے دفاتر کھولنا چاہتی تھی۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کمپنی کی طرف سے مجھے حکم ملا کہ میں صوبہ مدراس کے مختلف شہروں اور گاؤں کا دورہ کروں۔ پروگرام کے مطابق میں نے مقررہ وقت پر ضروری سامان باندھا اور اسے اٹھا کر اسٹیشن پہنچ گیا اور ایکسپریس کا انتظار کرنے لگا۔

گاڑی چھک چھک کرتی اسٹیشن سے روانہ ہو گئی۔ اور اس کے ساتھ تمام شہر چلنے لگا۔ بازار دکانیں اور لوگ تمام گاڑی کے ساتھ چلنے لگے۔ جیسے انہیں گاڑی سے پریم ہو اور وہ اس کی جدائی برداشت نہ کر سکتے ہوں لیکن شہر کی حد کے آنے پر تمام لوگ اور دکانیں پیچھے رہ گئے شاید وہ شہر کے دوڑتے دوڑتے تھک گئے تھے۔ اور گاڑی انہیں پیچھے چھوڑ کر اپنے ساتھ درختوں اور کھیتوں کو لے کر بھاگنے لگی کئی میدان ناچتے راستے میں آئے لیکن [illegible] گاڑی کے ساتھ ناچتے رہے ——— [illegible] دوسرا [illegible] بعد تیسرا کوئی [illegible] گاڑی کے ساتھ [illegible]۔

میں اس [illegible] کر [illegible] تھا کہ ایک بڈھے دیہاتی نے [illegible]

"بابو جی [illegible]"

"میرے بیٹھ جانے سے آپ کو تکلیف ہو گی۔" میں نے کہا۔

"نہیں بابو جی تکلیف کیسی، دو گھڑی کا سفر ہے مل جل کر کاٹ لیں گے!"

میں اس کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اور سوچنے لگا کہ دیہاتی لوگ کتنے اچھے ہوتے ہیں۔ گاڑی میں اور بھی لوگ تھے۔ خوبصورت لباس میں ملبوس لکھے پڑھے نوجوان تہذیب یافتہ ——— لیکن سوائے اس بڈھے دیہاتی کے کسی اور کے دل میں مجھے بٹھلانے کا خیال نہ آیا شاید اس لئے کہ یہ گنوار ہے۔ اور وہ لوگ تہذیب یافتہ ہیں ...... تہذیب یافتہ ...... اور ...... میں مسکرا دیا۔

یہی باتیں سوچتے سوچتے نہ جانے مجھے کب نیند آ گئی۔ اور جب میری آنکھ کھلی تو گاڑی [illegible] پہنچنا چاہتی تھی۔ اور مسافر [illegible] میں باہر چلنے ہو گئے تھے۔ اور کچھ [illegible] دیہاتی بھی [illegible] سے سامان اکٹھا کیا۔ اور [illegible] کر دروازے کے قریب [illegible] چند منٹوں کے بعد گاڑی ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی [illegible] اپنا سامان اتارا اور میں بھی اپنے سامان کو ٹھیک ٹھاک [illegible] کہ گاڑی چل دی۔ میں نے [illegible] لیکن [illegible] اپنی طرف آتا دیکھ کر [illegible] محسوس کیا کہ اسٹیشن پر [illegible] ٹکٹ [illegible] کا انتظار کر رہا تھا۔

ٹکٹ کلکٹر نے میری طرف دیکھا اور [illegible] آواز میں [illegible] پکارا۔

[illegible] ایک نوجوان [illegible] میرے پاس [illegible] میں [illegible] کی [illegible] سامان [illegible] مجھے [illegible] سامان اٹھانا شروع کیا۔ [illegible]

"کہاں لے چلوں ؟"

"کسی ہوٹل میں!" میں نے جواب دیا۔

"بابوجی یہاں کوئی ہوٹل نہیں، یہ ایک معمولی قصبہ ہے اس میں ایک چھوٹی سی سرائے ہے۔ اگر آپ کہیں تو وہاں لے چلوں؟" اس نے بغیر میری طرف دیکھے پوچھا۔

"وہیں لے چلو!" میں نے کہا۔

اور وہ چلنے لگی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ بازار میں گزرتے ہوئے مجھے شرم محسوس ہو رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا۔ کہ ایک لڑکی بوجھ اٹھائے چل رہی ہے۔ اور میں اس کے پیچھے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالے ٹہلتا ہوا اس کے ساتھ چل رہا تھا۔

مجھے اپنے آپ سے گھِن آنے لگی۔ میں نے کیوں اس عورت سے سامان اٹھوایا۔ اسٹیشن پر مرد قلی بھی ہوتے ہوں گے۔ اور مجھے خوف سا محسوس ہونے لگا۔ کہ ابھی بازار کے تمام لوگ میرے اوپر ہنسنے لگیں گے۔ شرم نہیں آتی عورت سے سامان اٹھواتے ــــ میرے قدم رک گئے۔ اور میں نے عورت سے کہا۔

"ٹھہرو!"

وہ رک گئی ــــ

"میرا سامان اتار دو!"

"کیوں ...؟"

"میں خود لے جاؤں گا!"

لڑکی نے میری طرف حیرت سے دیکھا۔ اور پھر پوچھا۔

"کیوں ــــ؟"

"مجھے تمہارے ساتھ اس طرح چلتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے ــــ!" میں نے جواب دیا۔

میرا جواب سن کر لڑکی نے جواب دیا۔

"بابوجی گھبرائیے نہیں، یہاں بیشتر کام عورتیں ہی کرتی ہیں!"

اس کا جواب سن کر مجھے کچھ تسلی ہو گئی اور میں پھر اس کے ساتھ چلنے لگا۔ چلتے چلتے میری نظریں یونہی اس کی طرف اٹھیں۔ اور میں نے دیکھا کہ وہ درمیانی قد کی ایک صحت مند پہاڑی عورت تھی اس کے بدن پر پتلی ساڑی کئی جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ اور جسم کے کئی رنگ نمایاں ہو رہے تھے۔ اور ایسا جان پڑ رہا تھا۔ مانو اس نے بالوں میں کبھی تیل لگایا ہی نہ ہو۔

میں نے یونہی اس سے پوچھا

"تمہاری شادی ہو چکی ہے؟"

"جی!"

"تو پھر تم کیوں کام کرتی ہو؟"

"اگر نہ کروں تو کھاؤں کہاں سے!"

"تمہارا خاوند ــــ؟"

"ایک کی کمائی سے دونوں کا پیٹ کیسے بھر سکتا ہے"

"تمہارا خاوند کام کر کے کیا کما لیتا ہے؟"

"ایک سیر بھر آٹا اور آٹھ آنے ہر روز بابوجی مگر اتنی تھوڑی آمدنی سے تو گزارہ نہیں ہو سکتا ہے۔ بابوجی اگر اپنی سے بڑی مصیبت والے لوگوں کو دیکھا جائے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ سو ہم تو اپنے سے چھوٹوں کو دیکھ کر گزارہ کئے جاتے ہیں ــــ کیا کریں بابوجی ہمارے دیش میں بڑی غریبی ہے ــــ!"

"غریبی نہیں بلکہ یوں کہو ہمارے دیش میں انصاف نہیں۔ یہاں مزدور کو اس کی محنت کا پورا معاوضہ بھی نہیں ملتا کتنے افسوس کی بات ہے......!"

عورت نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"آج کل تو ہمارے لئے جینا بڑا مشکل ہو رہا ہے بابوجی ــــ وہ تو ایک خطرناک بیماری میں مبتلا ہے۔ چل پھر بھی نہیں سکتا کمائے کیسے!"

یہ سن کر مجھے اس عورت سے ہمدردی ہو گئی۔

"کتنے پیسے ہر روز بنا لیتی ہو؟"

"آٹھ چھ آنے بن جاتے ہیں۔ بابوجی اور کبھی کبھی کچھ بھی نہیں بنتا!" یہ کہتے کہتے اس کا گلا بھر آیا۔ اور میں نے سوچا۔ آٹھ چھ آنوں میں دو آدمیوں کا پیٹ کیسے بھر سکتا ہے۔ اور پھر اس کا خاوند بھی بیمار ہے۔ اس کی دوا کے لئے بھی پیسہ چاہیئے۔ مجھے اپنے دیش کی حالت پر ترس آنے لگا۔ جس کے بچوں کو دو وقت کا کھانا بھی مشکل سے ملتا ہے۔

آگئی ۔۔۔!" عورت کی آواز نے میرے خیالات کو
ائے کے صحن میں میرا سامان رکھ کر اس نے اپنا بایاں
بڑھایا۔ میں نے جیب سے بٹوہ نکالا اور اس میں سے
ل کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ نوٹ کو دیکھ کر عورت کی
ہلے ایک لمحہ کے لئے نوٹ کو دیکھا۔ اور اسے تہ کر کے
باندھ لیا، اور میری طرف دیکھتی ہوئی چلی گئی۔

ئے مالک نے میرا سامان ایک کمرے میں رکھا۔ میں نے
اُٹھایا اور باہر کو چل دیا۔

جب واپس لوٹا تو کمرے میں پہنچ کر دیکھا کہ وہ عورت
یٹی ہوئی ہے۔ میں نے پوچھا۔

ئی ہو!"

پ کا بستر بچھا آؤں!"

میں خود بچھا لوں گا"

وہاں سے گئی نہیں۔

کیوں نہیں؟" میں نے پوچھا۔

ـ گئے ہوں گے آپ کے پاؤں دبا دوں؟"

مجھے پاؤں نہیں دبوانے ہیں!"

ئی میں سوچنے لگا کیسی عورت ہے۔ میرے تھوڑی سی
دینے پر مجھے اپنا آقا سمجھنا شروع کر دیا۔ سوچتے سوچتے

—

ی رات کا وقت ہوگا۔ کوئی میرے شانے ہلا ہلا کر مجھے
ر بڑا اُٹھا۔ دیکھا تو وہی عورت میری چارپائی پر بیٹھی
ی ہوئی ساڑھی کی بجائے ایک اچھی ساڑھی باندھی ہوئی
یں کنگھی کر رکھی تھی۔ اسے وہاں دیکھ کر میں حیران رہ
ت سے پوچھا۔

وقت یہاں کیوں آئی ہو؟ آدھی رات کے وقت ایک
ے میں گھستے ہوئے تمہیں شرم نہیں آئی تمہیں یہاں
اتھا؟" میں گرجا۔

کہا تھا!" عورت نے اپنی کانپتی ہوئی آواز میں کہا

"میں نے؟ میں نے کب کہا تھا تمہیں یہاں آنے کو؟"

"تو پھر آپ نے پانچ..... پانچ کا نوٹ کیوں دیا تھا؟" عورت نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔

"پانچ کا نوٹ ۔۔۔!" مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ میں نے اس کی طرف دھیان سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں تم مجھے غلط سمجھی ہو۔ میں نے پانچ کا نوٹ کسی خاص مطلب کے لئے نہیں دیا تھا۔ وہ تو میں نے تمہیں اس لئے دیا تھا کہ تم اپنے خاوند کا علاج کرا سکو!"

عورت کی نگاہوں میں دو ستارے چھلکے۔ اور وہ میرے پاؤں میں گر پڑی ۔۔۔!!

(بشکریہ قلم و نمز)

سعود جاوید

خونِ بہاراں

[illegible] دو عالم مہرِ حیراں
[illegible] رستے لرزاں لرزاں
[illegible] سی کلیاں کلیاں
[illegible] گلشن وحشت ساماں
دھرتی کے ماتھے پہ نمایاں
خون کی افشاں ——— خونِ بہاراں

[illegible] کے جلوے مدھم مدھم
[illegible] محفل دھندلی دکھ شبستاں
[illegible] محبت سونی سونی
[illegible] غمِ جاناں نہ غمِ دوراں
منزل پنہاں راہیں ویراں
ساری دھرتی ظلمت ساماں

زلفِ ہستی الجھی الجھی
اہلِ وفا زنجیر بداماں
حسن کی پلکیں بوجھل بوجھل
جیون کا سنگیت پریشاں
ایسے میں ہو کون غزل خواں
اے دلِ ناداں اے دلِ ناداں

نسلِ آدم ڈھونڈ رہی ہے
زیست کی جنت درد کا درماں
اک حقیقت اک فسانہ
کس کو کہیے زیست کا عنواں
ایسے میں اے شمعِ فروزاں
اور فروزاں اور فروزاں

مسعود جاوید

○

زخم کھائیں گے، مسکرائیں گے
اور پھر انقلاب لائیں گے

خون آلود آنسوؤں کی قسم
جبر پا اختیار پائیں گے

کیا ہوا شب اگر اندھیری ہے
داغِ دل راستہ دکھائیں گے

اب تو سوچا یہی ہے جانِ جہاں
قبلۂ دل تجھے بنائیں گے

برق ہو یا قفس کی تنہائی
لالہ و گل کے گیت گائیں گے

کیا خبر تھی کہ آ کے ملتے ہی
تارے پلکوں [illegible] لائیں گے

[illegible] ستارۂ شام [illegible] آئینگے

جاؤ جاؤ ـــــ میرے بچے

[illegible] بھی ادھر سے گزرتا تو اسے فٹ پاتھ پر یونہی پڑا ہوا دیکھتا
[illegible] جس کے جسم میں ہاتھ تھے مگر کٹے ہوئے، پیر تھے مگر بے جان
ایک چہرہ تھا جس سے وہ انسان معلوم ہوتا تھا۔ یا پھر اس کی
[illegible] جو اسے اشرف المخلوقات کی صف میں لاکھڑا کرتی تھی۔
[illegible] نہیں ـــ وہ کھڑا تو ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ گوشت کا ایک
[illegible] دن میں لپٹا ہوا ایک لولا لنگڑا بچہ کیسے کھڑا ہو سکتا تھا۔ وہ
[illegible] کے پکے سیمنٹ کے بستر پر دراز آنے جانے والوں کو حسرت بھری
[illegible] نظر سے دیکھتا رہتا۔ اور ان سے رحم کی بھیک مانگتا رہتا۔ جو کبھی مل
[illegible] ملتی۔
[illegible] جب اس کے پاس سے گزرتا تو رک جاتا۔ اسے دیکھنے کے لئے
[illegible] سننے کے لئے ـــ ہاں مجھے اس پر بڑا ترس آتا۔ اور میں اس

[illegible] لے!" میں نے اسے یونہی کالے کہنا شروع کر دیا تھا۔ "کالے!
[illegible] لے؟"
[illegible] بابو جی؟
[illegible] پھر میں شرم سے گردن جھکا کر کہتا:
[illegible]! تمہیں کیا تکلیف ہے کس دن؟"
[illegible] اور وہ جواب میں [illegible] آتا ـــ [illegible] جانتا تھا [illegible] ہی اس کی طرح
[illegible] میں فرق ہے [illegible] وہ لولا لنگڑا ہے اور میں اچھا بھلا
[illegible] ہاتھ پیر [illegible] ہے۔ [illegible]
ـــ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

اسے چھوڑ کر چلا جاتا ـــ میری پلکیں اس وقت بھیگی ہوتیں۔ اور میرے دل
کا ناسور رستا ہوتا، بہتا ہوتا ـــ ہاں! میں چلا جاتا ـــ فٹ پاتھ
سے کہیں دور ـــ بہت دور ـــ ویرانوں میں، جہاں پتھر ہوتے
درخت ہوتے اور خاموشی۔ اور پھر جیسے میں کسی درخت کے نیچے، کسی
پتھر کے اوپر لیٹ کر یا بیٹھ کر کائنات کی پیچیدہ گتھیاں سلجھانے کی
کوشش کرتا اور کوشش کرتے کرتے نڈھال ہو جاتا۔ ـــ اور پھر اچانک جب
تیز اور گرم خیالات سے اپنا دامن چھڑا کر آبادی کی طرف لوٹ آتا۔ جہاں
فٹ پاتھ ہے...... ہائے یہ فٹ پاتھ، جس پر کالے رہتا ہے۔ اور میرا
جی چاہتا کہ میں بھی آٹھ دس برس کا ایک لولا لنگڑا بچہ بن کر کالے کی طرح
فٹ پاتھ پر پڑا رہتا اور پھر ـــ لیکن ـــ میں فٹ پاتھ پر ہی تو
رہتا تھا۔ اور اکثر وہاں سے بھی ہٹ کر کسی ویران گوشے میں جانا پڑتا ـــ
کالے ـــ ہاں کالے اس معاملے میں مجھ سے زیادہ خوش نصیب تھا۔ کہ اسے
فٹ پاتھ سے کوئی ہٹانے والا نہ تھا۔ پر کون جانتا ہے اسے فٹ پاتھ پر رہنے
کے لئے رشوت دینی پڑتی ہو۔ کون جانتا ہے اس غریب کو بھی کسی کے بوٹ
کسی کی گالیاں اور کسی کے ڈنڈے کھانے پڑتے ہوں۔
کالے کو دیکھ کر میں اپنی مصیبتیں بھول جاتا اور کالے کے بارے میں سوچتا
وہ کھاتا کیسے ہوگا! پیتا کیسے ہوگا! اور پھر اس سردی میں زندہ کیسے ہے
اس ٹھنڈے فرش پر اس کھلے آسمان کے نیچے ـــ کوئی بھی تو زندگی کا ساتھی
نہیں، کوئی بھی تو دیکھ بھال کرنے والا نہیں۔ لیکن جانے کیوں میں اس سے
یہ نہ پوچھ سکا۔ میں اس سے صرف ادھر ادھر کی باتیں کر کے اٹھ جاتا اور اپنی
[illegible] دل کڑا کر کے چلا جاتا ـــ "کالے! یہ [illegible]
[illegible] ہوگا۔ اور تمہاری زندگی ـــ [illegible] زندگی [illegible]
[illegible] ہوگی ـــ
کالے میری [illegible] خاموشی سے سنتا۔ پر اس کی سمجھ میں [illegible]

سویرا کب ہوگا اور کس قسم کا ہوگا۔ اور اس کی زندگی میں تغیر کیسے آجائے گا۔ ہاں اس کے دماغ میں اتنی موٹی بات نہیں آتی تھی۔ اور کیسے آ سکتی تھی۔ جبکہ وہ اپنی حالت اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ صرف حال ہی کو دیکھنے کی سکت رکھتا تھا مستقبل کی جانب سے فکر تھی اور نہ جبر! البتہ میں چاہتا تھا کہ اسے بھی میری طرح مستقبل کے سہانے خواب دکھائی دینے لگیں۔ جن سے ممکن ہے اس کی تکلیفوں کی شدت میں کمی آجائے۔ ہاں یہ تکلیفیں یہ مصیبتیں احساس سے شدید ہوجاتی ہیں۔ اسی لئے تو میں اسے مستقبل کے جھولے میں جھولانا چاہتا تھا۔ پر وہ سمجھتا نہ تھا — بچہ جو ٹھہرا۔

میں نے کالے کو اپنے متعلق سب کچھ بتلا دیا تھا۔ سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ لیکن اس کے متعلق مجھے بہت کچھ جاننا تھا۔ دراصل جب میں اس سے باتیں کرنے لگتا۔ تو میرے اندر کھولتا ہوا لاوا ابل پڑتا۔ اور میں جانے کیا کیا کہہ جاتا اپنے متعلق، سماج کے متعلق، قانون کے متعلق اور پھر جب میرا جوالا مکھی سرد پڑجاتا تو میں دیکھتا۔ کالے میرا منہ تک رہا ہے۔ جیسے وہ میری بکواس پر خاموش احتجاج کر رہا ہو۔ اس کی کالی کالی پیاری پیاری آنکھیں میرا جائزہ لیتی ہوتیں۔ اور ان آنکھوں میں جانے کیا ہوتا کہ میں اسے پیار سے تھپتھپا کر کہتا — "تم کتنے اچھے ہو کالے! کاش کہ تم اسے سمجھ سکتے — کاش کہ لوگ تمہیں دیکھ سکتے" — لوگ دیکھ سکتے؟ بھلا اندھے بھی کہیں دیکھتے ہیں۔ بھلا پتھر کی بے جان مورتیاں بھی دیکھ سکتی ہیں؟ ایسا کبھی نہیں ہوا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ ہاں آنکھوں والا انسان دیکھتا ہے۔ انسان جس کے دل میں خدا کا ڈر ہوتا ہے۔ انسان جس کے من میں آخرت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے۔ کالے وہ تمہیں دیکھتا ہے۔ اور اس کا دل پسیج جاتا ہے۔ اور اس کی آنکھیں بھر آتی ہیں۔ اور اس کی چیخ نکل جاتی ہے۔ اور اس کی چیخ — کالے اس کی چیخ ان پتھر کی مورتیوں کے سخت سینوں کو توڑ کر گزر جاتی ہے — پھر! پھر کالے تم کیا جانو؟ تم کیا سمجھو؟ تم ابھی بچے ہو اور لاوارث!

اور پھر مجھے خیال آجاتا۔ اسے کون کھلاتا ہوگا۔؟ کون پلاتا ہوگا؟ کون سلاتا ہوگا؟ — مگر میں جانے کیوں اس سے پوچھنے کی ہمت نہ پاتا۔ شاید میں اس کے بوجھ کو اٹھانے کی تاب نہ رکھتا تھا۔ شاید میں مزید — ذمہ داریوں سے کتراتا تھا۔ میرے لئے اپنا بھاری بوجھ ہی اتنا زیادہ تھا کہ میں کسی اور کو سہارا دینے کے قابل نہ تھا۔ بس میرے پاس ایک دل تھا ایک دماغ بھی اور دو آنکھیں۔ جنہیں تھوڑا بہت استعمال کرکے میں اپنا فرض ادا کرنے کی کوشش کرتا۔ لیکن میرا جی۔ میرا ضمیر مطمئن نہ ہوتا ایک کانٹا تھا جو مسلسل چبھتا رہتا ایک خلش تھی جو لگاتار محسوس ہوتی رہتی۔

میں جانتا تھا کہ پوچھ کر اور جان کر مجھ پر یہ لازم ہوجائے گا کہ میں اپنی پریشانیوں کے باوجود اس کا ہاتھ بٹاؤں، اس کی امداد کروں، اس کی دیکھ بھال کروں۔ لیکن کیا اسے دیکھ کر یہ سب کچھ مجھ پر فرض نہیں ہوجاتا۔ کیا اسے دیکھنے کے بعد میں اپنی ذمہ داریوں سے بچ سکتا ہوں۔ کیا میں یہ دلیل خدا کے حضور میں اپنے بچاؤ کے لئے پیش کرسکتا ہوں؟ — نہیں نہیں۔

اور میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھ ہی لیا۔ "کالے! تم کھاتے کیسے ہو —؟"

اور اس نے اس بھکارن کی طرف اشارہ کردیا جو اس سے کچھ فاصلے پر ہی بیٹھ کر بھیک مانگا کرتی تھی۔

"کون ہے یہ تمہاری؟"

"کوئی نہیں بابوجی!"

"تمہیں روٹی کھلاتی ہے؟"

"ہاں بابوجی! — اور کماتی بھی ہے میرے حصے میں سے!"

میں نے بھکارن کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھا جیسے اس نے کوئی بہت بڑا گناہ کیا ہو۔ مگر مجھے اس کی جگہ صرف میلے کچیلے پھٹے ہوئے برقعہ کے اندر عورت کی قسم سے کوئی چیز بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ جس کے سامنے ایک کاسۂ گدائی رکھا ہوا تھا۔

عورت بھیک مانگ رہی ہے۔ مجھے شرم سی آگئی۔ اس عورت کی جگہ یہ فٹ پاتھ تو نہ تھی۔ میں نے دیکھا اس کے میلے پتلے ہاتھ اٹھ کر راہگیروں کو اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔ مگر کوئی اسے پوچھتا بھی نہ تھا۔ کوئی اسے بھیک نہیں دے رہا تھا — مجھے ان اٹھتے ہوئے ہاتھوں سے شرم آنے لگی اور میں نے ندامت سے اپنی آنکھیں نیچی کرلیں۔

میں نے سوچا۔ بھکارن ٹھیک ہی کہتی ہے۔ کالے کے کھانے میں اس کا بھی حصہ ہے۔ لیکن اگر کالے نہ ہوا کسی دن تو وہ کیا کرے گی؟

ں نے کالے سے پھر پوچھا۔

م سوتے کہاں ہو؟"

س درخت کے نیچے!"

ہاں کون پہنچاتا ہے تمہیں؟"

وہ!" اس نے پھر بھکارن کی جانب اشارہ کیا۔

سردی نہیں لگتی تمہیں؟"

تی تو ہے بابو جی!"

پھر؟"

ت کٹ جاتی ہے کسی نہ کسی طرح!"

مجھے اس بچے کے صبر پر رشک آنے لگا۔ یہ شدید سردی میں کوئی ے بغیر ساری رات گزار دیتا ہے۔ اور میں — ہاں میں — اپنا مفلر گلے سے نکال کر اس کے جسم کے گرد لپیٹ دیا۔ وہ معاً ں اٹھا۔ جیسے اسے کوئی بہت قیمتی اور محبوب شے مل گئی ہو۔ اور لو ہلا ہلا کر اس نرم گرم مفلر سے کھیلنے لگا۔ کالے کھیل بھی سکتا مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا۔ اسے یوں کھیلتا دیکھ کر مجھے بے حد — کاش وہ یونہی کھیلتا رہتا۔

چھا کالے — یہ تو بتاؤ تم یہاں آئے کیسے؟"

بانے سے — ممبئی ہو کر —!"

ہیں لایا کون؟"

برا باپ!"

پ؟ کہاں ہے وہ؟"

میں لے گئی اسے بابو جی!"

لیس؟"

ں بابو جی اس نے چوری کی تھی!"

ری؟ کہاں کی؟ کب کی؟ کیوں کی؟"

لا میرے تابڑ توڑ سوالات سے گھبرا سا گیا۔ میں نے پھر دریافت

ں کیوں کی؟"

تے کے لئے — بابو جی وہ ... وہ بھوکا تھا کئی دن سے

اور میں بھی —"

"کیا کرتا تھا وہ؟"

"کچھ نہیں بابو جی!"

"کچھ نہیں؟"

"بابو جی وہ بیکار تھا۔"

اوہ — وہ بیکار تھا۔ اور میں بھی بیکار ہوں میں نے — محسوس کیا جیسے کالے کا باپ میں ہی تھا۔ جیسے میں نے ہی یہ چوری کی تھی۔ جیسے میں ہی جیل میں تھا۔ اور میرا جی چاہا کہ میں کالے کے سوکھے تانبے جیسے رخساروں کو چوم لوں۔

"اچھا — تو پھر کیا ہوا؟" میں نے کالے سے پوچھا۔

"بس بابو جی — اس دن سے میں اسی فٹ پاتھ پر بھیک مانگتا ہوں —"

کالے کی آواز بھرا گئی۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور جذبات سے مغلوب ہو کر کہا۔

"کالے آج سے میں تمہارا باپ ہوں آج سے تم میرے ساتھ رہو گے۔ آج سے میں بھی اسی فٹ پاتھ پر سوؤں گا۔ آج سے میں ہی تمہاری دیکھ بھال کروں گا آج سے"

جانے کیا کیا کہہ گیا۔ مجھے کچھ یاد نہیں البتہ جب میں وہاں سے چلا تو میرے پدرانہ جذبات کچھ مدھم پڑ چکے تھے۔ اور ان کی جگہ کچھ نئے جذبات ابھر رہے تھے۔ تیز و تند جذبات — اور میں محسوس کر رہا تھا۔ جیسے میں انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔ جیسے میں طوفانوں سے ٹکرا رہا تھا۔ جیسے میں فوجوں کو لڑا رہا تھا۔ ہاں — میں جذبات کی رو میں بہا چلا جا رہا تھا۔

میں بہا چلا جا رہا تھا۔ اور میں نے دیکھا — کالے بھی میرے ساتھ ہے ... کالے ہی نہیں بھکارن بھی — بھکارن ہی نہیں ساری دنیا مفلس اور قلاش دنیا بہہ رہی تھی — جذبات کی رو میں ندی میں بہتے ہوئے تنکوں کی طرح — ہاں زندگی کی ندی کسی دن ان تنکوں سے پٹ جائے گی۔ اور پھر ندی میں انقلاب آ جائے گا ... پھر — ہاں ... یہاں پھر تنکے راج کریں گے — اور خدا کی اس زمین پر

خدا ـــــ [illegible] ـــــ کیا وہ اس سے خوش ہوگا ـــــ؟ کیا وہ اس سے راضی ہو جائے گا؟

اور میں جیسے جیتے جی تھک گیا۔ شاید میں بہک گیا تھا۔ شاید میں پاگل ہو گیا تھا۔ شاید میں بے صبر ہو گیا تھا۔ ہاں ـــ میں اپنے آپ کو بھول گیا تھا۔ جب بھی تو میں آنکھوں سے ندی کو پاٹ دینا چاہتا تھا۔ جب بھی تو میں آنکھوں کا ماتم چاہتا تھا۔۔۔۔۔ جیسے اس کے بعد پھر کچھ نہ ہوگا۔ جیسے اس کے بعد کوئی ظلم نہ ہوگا۔ جیسے اس کے بعد ـــ کوئی بے انصافی نہ ہوگی۔ جیسے اس کے بعد کوئی گرسنہ نہ ہوگی۔ نہیں نہیں ـــــ ایسا ناممکن ہے ـــ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔۔۔۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔ مجھے تھکے ہیں، اور یہ سب مل کر بھی کچھ نہیں کر سکتے کچھ نہیں بنا سکتے۔ بنانے والا تو صرف ایک ہے۔ اور اسی کی مرضی پر چل کر زندگی کی عمارت اور بیٹی کی عمارت تعمیر ہو سکتی ہے۔۔۔۔۔ میں زندگی کی ایسی ہی عمارت بناؤں گا۔۔۔۔ ایک عالیشان عمارت جسے دیکھنے کے لئے کتنے ہی لوگ آیا کریں گے۔ کتنی ہی بہاریں آیا کریں گی۔۔۔۔۔۔ ـــــ ہاں کالے تم اسے دیکھو گے، تم اس میں رہو گے۔ تم اس میں چلو گے تم اس میں پھرو گے۔۔۔۔۔۔۔ ہاں ہاں تم اپنے ان ہی پیروں سے چلو پھرو گے تم اپنے ان ہی ہاتھوں سے کھاؤ پیو گے۔ تمہیں کوئی غم نہ ہوگا۔ تمہیں کوئی فکر نہ ہوگی۔ بالکل نہیں ـــــ تم اب بھی فکر نہ کرو ـــــ میں جا رہا ہوں تمہارے لئے اچھے اچھے کھانے، اچھے اچھے کپڑے، اچھی اچھی مٹھائیاں لینے ـــــ بس ذرا مجھے آرام تو ہو جانے دو کہیں ـــــ اور دن بھر آنسوؤں کی ٹھنڈک چلانے کے بعد رات کو جب میں کالے کے پاس آیا تو مجھے بڑی سردی لگ رہی تھی۔۔۔ شاید صدمہ دیکھنے کی وجہ سے ـــ میں نے کالے کو دیکھا۔ وہ بہت خوش اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اسے خوش دیکھ کر میرا مرجھایا ہوا دل بھی مسرت سے لبریز ہو گیا۔ لیکن میری خوشی دیرپا نہیں ثابت ہوئی اچانک سرد ہوائیں چلنے لگیں اور میرا بدن سردی سے ٹھٹھرنے لگا۔

"کالے! تمہیں سردی تو نہیں لگ رہی۔؟"

"جی بابا جی؟"

"لگ رہی ہے؟"

"ہاں بابا جی ـــ پہلے تو اتنی نہیں لگی تھی ـــــ ہوا جو چلنی شروع ہو گئی ہے۔"

"اوہ کالے ـــــ یہ ہوائیں بڑی ظالم ہیں۔"

اور میں نے اس گوشت کے لوتھڑے کو اٹھا کر اپنی گود میں لے لیا اور کچھ سوچ کر اسے ایک کیبن کے نیچے ڈال دیا جو فٹ پاتھ کے ایک حصہ میں لکڑی کے چار پایوں پر کھڑی ہوئی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح کیبن کے نیچے ہوا کا گزر نہ ہو۔ کسی طرح ہوا کے آنے کے راستے بند کر دوں لیکن یہ کیسے کروں۔؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں خود سردی سے کانپ رہا تھا۔ لیکن یہ چاہتا تھا کہ اس بچے کو کسی طرح ان ظالم ہواؤں سے محفوظ کر دوں۔ ابھی میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ قریب سے بوٹوں کی آواز آنے لگی۔ آہ یہ بوٹ جن کے تلے میں روندا ہوا ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔ میرا دل کچھ عجیب طریقے سے دھڑکنے لگا۔

بوٹ آ رہے تھے۔ قریب ـــــ اور قریب ـــــ یہاں تک کہ وہ سر پر آن پہنچے۔۔۔۔ــــ

"یہاں کیا کر رہا ہے؟" ایک کرخت آواز فضا میں گونجی اور پھر میرے سر پر ایک بوٹ پڑا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے سر پر کسی نے پہاڑ توڑ دیا ہو۔ یا ہتھوڑا مار دیا ہو۔ میں چیخ اٹھا۔

"ظالم فٹ پاتھ پر بھی جینے نہیں دیتے ـــــ فٹ پاتھ پر بھی چین۔۔۔۔۔ ـــ!"

"سالے، بدمعاش، چور کہیں کے ـــــ" گالیوں کی تڑاخ کے ساتھ مجھ پر مشٹنڈوں کی بارش سی ہونے لگی۔ جس کی تاب نہ لا کر میں بھاگ کھڑا ہوا ـــــ میں بھاگ رہا تھا۔ بھاگتا جا رہا تھا۔ اور مجھے ہر طرف بوٹ اور ڈنڈے نظر آ رہے تھے۔ مجھ پر ہر سمت سے گالیاں برس رہی تھیں۔۔۔۔ پھر اچانک میرا سر چکرانے لگا۔ میری آنکھوں کے نیچے اندھیرا سا چھانے لگا۔ اور پھر ـــــ پھر مجھے ہوش نہ رہا۔

جب آنکھ کھلی تو میں ایک تنگ سے کمرے میں پڑا ہوا تھا۔ سورج نکل چکا تھا۔ اور میں روشن [illegible] کی آبادی سے دور تھا۔ میں نے [illegible] کی کوشش کی لیکن [illegible] جیسے مجھ میں [illegible] سے کراہ [illegible]

۔میں بہت دیر تک کراہتا رہا اور پھر پڑا رہا کر کیا لگی مجھے رات
یاد آیا۔ اور ساتھ ہی کالے کا خیال —— کالے —— کالے
نے کس حال میں ہے وہ —— میں نے دفعتاً اپنے اندر ایک
نئی طاقت محسوس کی اور میں ہمت کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ ——
اٹھ کھڑا ہوا اور نالے سے نکل کر آہستہ آہستہ اس طرف چلنے لگا جہاں
کالے کو میں نے چھوڑا تھا۔

میں آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ میری ٹانگیں مجھے جواب دے رہی
تھیں۔ میرا سر بری طرح دکھ رہا تھا۔ میرے جسم کا ایک ایک جوڑ درد
کر رہا تھا۔ مگر میں اپنے کو گھسیٹتا ہوا لئے جا رہا تھا۔ اور میرے دل
کے اندر ایک طوفان اٹھ رہا تھا...... طوفان ... جو اب کسی کے
روکے، کسی کے بوٹ کے، روکے نہ رک سکتا تھا۔ ہاں میں اب بھی
ایک کرکٹن ہو گیا تھا۔ مجھے اب دنیا کی کوئی طاقت جھکنے پر مجبور
نہ کر سکتی تھی۔ ——

وہ فاصلہ —— ہاں وہ فاصلہ میرے لئے میلوں لمبا بن گیا
میں اٹھتا بیٹھتا گرتا پڑتا رینگتا ہوا جب منزل پر پہنچا۔ تو دیکھا
کہ مفلر میں لپٹا ہوا آنکھیں بند کئے فٹ پاتھ پر پڑا ہوا تھا۔ جیسے وہ
سو رہا ہو۔ اور اس کے قریب ہی بھکارن بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے کالے
کی پیشانی کو چھوا تو وہ برف بن چکی تھی۔ میرا دل دھک سے ہو گیا۔
میں نے کالے کو بہتیری آوازیں دیں مگر جواب ندارد —— کالے سو
گیا تھا —— ہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سو گیا تھا۔

کالے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سو گیا۔ کالے ابدی نیند سو رہا
ہے۔ اور میرے لرزتے ہوئے ہاتھ اس کے چہرے کو ایک بوسیدہ رومال
سے ڈھانپ رہے ہیں۔ اور میری آنکھوں سے گرم گرم آنسو ڈھلک
ڈھلک کر میرے گالوں پر بہہ رہے ہیں۔ —— اور بھکارن ——
بھکارن اب کالے کو چھوڑ کر اپنی جگہ جا کر بیٹھ گئی ہے۔ اور اس کے
چہرے سے نقاب اٹھ گئی ہے۔ اور اس کا سانولا سا چہرہ کمہلایا ہوا ہے
مگر دلکش —— اتنا دلکش کہ لوگ کھنچ کھنچ کر اس کی طرف آ رہے
ہیں۔ اور اس پر رحم کی بارشیں کر رہے ہیں —— اور اب میں
کالے کے پاس بیٹھا اپنے ارادے پر غور کر رہا ہوں ——

میں —— ہاں میں اب یہاں سے جانے کی سوچ رہا ہوں۔
کالے کے لئے ایک اجلا سا لباس لینے —— ہاں کالے میں اب
جا رہا ہوں تمہیں چھوڑ کر —— تمہیں تنہا چھوڑ کر ——
تم تنہا ہی آئے تھے۔ اور تنہا ہی جاؤ گے —— جاؤ جاؤ میرے
بچے —— میرے لال —— جاؤ ——!!

(بشکریہ معیار)

افتخار عظمی انور

نہ ہو سینے میں جب تک گرمیٔ قلب و جگر پیدا
فغانِ نیم شب میں پھر کہاں سے ہو اثر پیدا

بڑی مشکل سے ملتی ہے متاعِ دیدۂ بینا
جگر کے خون سے ہوتا ہے نورِ چشمِ تر پیدا

یہ عصرِ نو بہت تاریک ہے پھر بھی عجب کیا ہے
سپہرِ عصرِ نو پہ ہوں نئے شمس و قمر پیدا

یہ مانا وادیٔ الفت بہت پر خار ہے لیکن
صبا کی طرح کر لیں گے ہم اپنی رہگذر پیدا

نہ تنہا "راہِ حق" میں جادہ پیمائی سے گھبراؤ
بہت سے راہ میں ہونگے تمہارے ہم سفر پیدا

طلسمِ کفر ٹوٹے، سرنگوں ہو رایتِ باطل
اگر ہو مردِ مومن میں ذرا بھی جگر پیدا

شعاعِ حسن خود جھک جائے صورتِ شبنم
اگر جذبِ محبت کا مکمل ہو اثر پیدا

فسردہ لالہ و گل میں کہاں سے زندگی آئے
نہ ہو موجِ صبا میں جب نمِ اشکِ سحر پیدا

رسائی ہو مرے نالوں کی بامِ عرش تک انور
کہ آہِ نارسا نے کر لئے ہیں بال و پر پیدا

(بشکریہ نئی نسلیں)

فیروز نظر

سجی لیے ہیں نہ آ دوست مر رہے ہیں ہم
یہ کس مقامِ وفا سے گذر رہے ہیں ہم

وہ شہرِ یار نہ ہو جائے ہم سے کچھ برہم
اب اس خیال سے رہ رہ کے ڈر رہے ہیں ہم

ترے دیار میں لوگوں نے زندگی پا[ئی]
ترے دیار میں حالِ دگر رہے ہیں [ہم]

یہ کس مقام پہ پہنچا دیا ہے ہمدم
کہ اجتناب سا ہر شے سے کر رہے ہیں [ہم]

نظر بہار نے خود جس کو کر دیا تھا چا[ک]
رفو وہ دامنِ صد چاک کر رہے ہیں [ہم]

سعادت حسن منٹو

پھوجا حرام دا

ٹی ہاؤس میں حرامیوں کی باتیں شروع ہوئیں تو یہ سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا۔ ہر ایک نے کم از کم ایک حرامی کے متعلق اپنے تاثرات بیان کیے جس سے اس کو اپنی زندگی میں واسطہ پڑ چکا تھا۔ کوئی جالندھر کا تھا۔ کوئی سیالکوٹ کا، کوئی لدھیانے کا اور کوئی لاہور کا۔ مگر سب کے سب اسکول یا کالج کی زندگی سے متعلق تھے۔

مہر فیروز صاحب سب سے آخر میں بولے۔ آپ نے کہا "امرتسر میں شاید ہی کوئی ایسا آدمی ہو جو پھوجے حرام دے کے نام سے ناواقف ہو۔ یوں تو اس شہر میں اور بھی کئی حرامزادے تھے۔ مگر اس کے پائے کے نہیں تھے۔ وہ نمبر ایک حرامزادہ تھا۔ اسکول میں اس نے تمام ماسٹروں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ ہیڈ ماسٹر جس کو دیکھتے ہی بڑے بڑے شیطان لڑکوں کا پیشاب خطا ہو جاتا، پھوجے سے بہت گھبراتا تھا اس لیے کہ اس پر ان کے مشہور بید کا اثر نہ ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تنگ آکر انھوں نے اس کو مارنا چھوڑ دیا تھا۔

یہ دسویں جماعت کی بات ہے۔ ایک دن یار دوستوں نے اس سے کہا دیکھو پھوجے، اگر تم کپڑے اتار کر ننگ دھڑنگ اسکول کا ایک چکر لگاؤ تو ہم تمہیں ایک روپیہ دیں گے۔ پھوجے نے روپیہ لے کر کان میں اڑسا، کپڑے اتار کے بستے میں باندھے اور سب کے سامنے چلنا شروع کر دیا ——— جس کلاس کے پاس سے گزرتا، زعفران زار بن جاتی ——— چلتے چلتے ہیڈ ماسٹر صاحب کے دفتر کے پاس پہنچ گیا [illegible] معلوم نہیں کیا ہوا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب [illegible] اگر ان سے کہا جاتا [illegible] ——— [illegible] کہتا ہے، میں [illegible] گیا [illegible] [illegible] سے [illegible]

اسکول چلے آتے تھے۔ مولوی صاحب نے غلطی سے اس سے ایک آیت کا ترجمہ پوچھ لیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ خاموش رہتا۔ مگر پھوجا حرام دا کیسے چپ رہتا۔ جو منہ میں آیا، اول جلول بک دیا۔ مولوی صاحب کے پسینے چھوٹ گئے۔ جب باہر نکلے تو انھوں نے غصے میں تھر تھر کانپتے ہوئے اپنا عصا اٹھایا اور پھوجے کو دو چار چوٹ کی مار دی۔ کر بیلا اٹھا مگر بڑے ادب سے کہہ رہا تھا کہ مولوی جی میرا کوئی قصور نہیں، مجھے ٹھیک سے نہیں آتا تو آپ نے ایک بدنی آیت کا مطلب پوچھ لیا۔

ماسٹر سے کچھ مولوی پھوجے صاحب کا جی نہ اکتا نہ راہ۔ چنانچہ وہ پھوجے کے باپ کے پاس گئے اور اس سے شکایت کی۔ پھوجے کے باپ نے ان کی سب باتیں سنیں اور بڑے تحمل سے کہا "مولوی صاحب میں اس سے خود عاجز آگیا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کی اصلاح کیسے ہو سکتی ہے۔ کل کی بات ہے کہ میں پیشاب کرنے گیا تو اس نے باہر سے کنڈی چڑھا دی۔ میں بہت چیخا۔ بے شمار گالیاں دیں۔ مگر اس نے کہا اٹھنی دینے کا وعدہ کرتے ہو تو دروازہ کھلے گا اور دیکھو وعدہ کر کے مکر گئے تو دوسری مرتبہ لنڈی میں تالا بھی ہوگا ——— چنانچہ اٹھنی دینی پڑی۔ اب بتائیے ایسے نابکار لڑکے کا کیا کریں۔"

اللہ ہی بہتر جانتا تھا کہ اس لڑکے پھوجے کا پڑھنے میں دل تھا کہ نہیں تھا۔ مگر میٹرک کے امتحان ہوئے تو سب کو یقین تھا کہ بہت بری طرح فیل ہوگا۔ مگر نتیجہ نکلا تو کلاس میں اس کے سب سے زیادہ نمبر تھے۔ سمجھا تھا کہ کالج میں داخل ہوگا، مگر باپ کی یہ خواہش تھی کہ کوئی ہنر سیکھے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ دو برس تک آوارہ پھرتا رہا ——— اس دوران میں اس نے جو حرامزدگیاں کیں، ان کی فہرست بہت طویل ہے۔

تنگ آکر اس کے باپ نے [illegible]
[illegible] اس نے شرارت کی [illegible]
[illegible]

لڑکے جو اسکول میں پھوجے کے ساتھ پڑھ چکے تھے۔ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ کارستانی اس کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اس ایک شرارت ہی سے اس کا پورے کالج سے تعارف ہو گیا۔

اسکول میں اس کی سرگرمیوں کا میدان محدود تھا۔ مگر کالج میں یہ بہت وسیع ہو گیا۔ پڑھائی میں۔ کھیلوں میں۔ مشاعروں اور مباحثوں میں ہر جگہ پھوجے کا نام روشن تھا۔ اور تھوڑی دیر میں اتنا روشن ہوا کہ سارے شہر میں اس کے گھونسے کی دھاک بیٹھ گئی بڑے بڑے جگادری بدمعاشوں کے کان کاٹنے لگا۔

تاہم تنومند پہلوان کسرتی تھا۔ اس کی ہیڈ ٹکر بہت مشہور تھی۔ ایسے زور سے مدمقابل کے سینے یا پیٹ میں اپنے سر سے ٹکر مارتا کہ اس کے سارے وجود میں زلزلہ سا آجاتا۔

ایف اے کے دوسرے سال میں تقریباً اس نے پرنسپل کی نئی موٹر کے پٹرول ٹینک میں چار آنے کی شکر ڈال دی۔ جس نے کار ین ین کو سارے انجن کو غارت کر دیا۔ پرنسپل کو کسی نہ کسی طریقے سے معلوم ہو گیا کہ یہ خطرناک شرارت پھوجے کی ہے مگر حیرت ہے کہ انھوں نے اس کو معاف کر دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ پھوجے کو ان کے بہت سے راز معلوم تھے۔ ویسے وہ قسمیں کھاتا تھا کہ اس نے انھیں دھمکی وغیرہ بالکل نہیں دی تھی۔ کہ اگر انھوں نے سزا دی تو وہ انھیں فاش کر دیگا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزوں کے خلاف کھلم کھلا جلسے ہوتے تھے۔ حکومت کا تختہ الٹنے کی کئی ناکام سازشیں ہو چکی تھیں۔ گرفتاریوں کی بھرمار تھی۔ سب جیل باغیوں سے پٹے تھے۔ آئے دن ریل کی پٹڑیاں اکھاڑی جاتی تھیں۔ خطوں کے بکسوں میں آتشگیر مادہ ڈالا جاتا تھا۔ بم بنائے جا رہے تھے پستول برآمد ہوتے تھے۔ غرض کہ ایک ہنگامہ برپا تھا۔ اور اس میں اسکول اور کالجوں کے طالب علم بھی شامل تھے۔

پھوجا سیاسی آدمی بالکل نہیں تھا میرا خیال ہے۔ اس کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ مہاتما گاندھی کون ہے۔ لیکن جب اچانک ایک روز اسے پولس نے گرفتار کیا اور وہ بھی ایک سازش کے سلسلے میں۔ تو سب کو بڑی حیرت ہوئی۔

اس سے پہلے کئی سازشیں پکڑی جا چکی تھیں۔ سانڈرس کے قتل کے سلسلے میں بھگت سنگھ اور دت کو پھانسی بھی ہو چکی تھی۔ اس لئے معاملہ بھی کچھ سنگین ہی معلوم ہو رہا تھا۔ الزام یہ تھا کہ مختلف کالجوں کے ا ے مل کر ایک خفیہ جماعت بنائی تھی جس کا مقصد حضور ملک معظم کی کا تختہ الٹنا تھا۔

ان میں سے کچھ لڑکوں نے کالج کی لیبارٹری سے پوٹاش چرایا تھا جو بم بنانے کے کام آتا ہے۔ پھوجے کے بارے میں شبہ تھا کا سرغنہ تھا۔ اور اس کو تمام خفیہ باتوں کا علم تھا۔

اس کے ساتھ کالج کے دو اور لڑکے بھی پکڑے گئے تھے۔ ان مشہور بیرسٹر کا لڑکا تھا اور دوسرا رئیس زادہ۔ ان کا ڈاکٹری معائنہ کرا لیا اس لئے پولیس کی مار پیٹ سے بچ گئے۔ مگر شامت غریب پھوجے کی آئی ______ تھانے میں اس کو الٹا لٹکا کر پیٹا گیا۔ برف پر کھڑا کیا گیا۔ غرض کہ ہر قسم کی جسمانی اذیت اسے پہنچائی گئی کہ راز کی باتیں مگر وہ بھی ایک کتے کی ہڈی تھا۔ ٹس سے مس نہ ہوا۔ بلکہ یہاں بھی شرارتوں سے باز نہ آیا۔

ایک مرتبہ جب وہ برداشت نہ کر سکا تو اس نے تھانیدار روک لینے کی درخواست کی اور وعدہ کیا کہ وہ سب کچھ بتا دے گا۔ بیا تھا۔ اس لئے اس نے گرم گرم دودھ اور جلیبیاں مانگیں ______ قدرے بحال ہوئی تو تھانیدار نے کاغذ قلم سنبھالا اور اس سے کہا لکھو ______ پھوجے نے اپنے مار کھائے اعضا سکھائے جماہی لے کر دیا۔ اب کیا بتاؤں۔ طاقت آگئی ہے۔ پڑھا لکھ پھر مجھے اپنی نوکری پ بھی کئی قصے ہیں جو مجھے یاد نہیں رہے مگر بہت پر لطف تھے۔ ملک ہم جماعت تھا۔ اس کی زبان سے آپ سنتے تو اور بھی مزا آتا۔

ایک دن پولس کے دو سپاہی پھوجے کو عدالت میں کے لئے لے جا رہے تھے۔ ضلع کچہری میں اس کی نظر ملک حفیظ پر نہیں کس کام سے وہاں آیا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی وہ چلایا ______ ملک صاحب ______ ملک صاحب پہچانا ______ پھوجے میں ان کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ملک صاحب بہت اداس جی چاہتا ہے۔ آپ بھی یہاں آجائیں میرے پاس ______ نام لینا کافی ہے۔

ملک حنیف نے جب یہ [illegible] اس کی روح قبض ہو گئی۔ پھوجے نے
ڈھارس دی۔ "گھبراؤ نہیں ملک، میں تو مذاق کر رہا ہوں۔ خدا نے میرے
کوئی خدمت ہو تو بتاؤ" ——— اب آپ ہی بتائیے کہ وہ کس لائق،
ملک [illegible] اٹھا کر پھوجے نے کہا "بھئی
ہم [illegible] کنوئیں کی گار نکلوا دیں
ملک [illegible] ہو سکتا ہے کہ پھوجے کو اس گندگی میں سے کتنی
تھی۔ اس [illegible] ایسا لگا جیسے مر رہے ہوں۔ [illegible]
نہیں [illegible] کیوں نہیں [illegible] تھے۔

[illegible] ملک حنیف کا بیان ہے۔ وہ پانی نہانے کے
[illegible] کنوئیں کی گندگی نکالنے میں مصروف ہیں
حیران ہوا کہ ماجرا کیا ہے۔ انہیں بلایا کس نے ہے۔ پڑوسیوں کا یہ خیال تھا کہ
ملک صاحب کو بیٹھے بیٹھے خیال آ گیا ہو گا کہ چلو کنوئیں کی صفائی ہو جائے
بھی کیا یاد کریں گے۔ لیکن جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ چھوٹے ملک کو اس بات
کا علم نہیں اور بڑے تو شکار پر گئے ہوئے ہیں تو انہیں بھی حیرت ہوئی۔
[illegible] کے بیچ وردی سپاہی دیکھے تو معلوم ہوا کہ پھوجے حرامدے کی نشاندہی
[illegible] کنوئیں میں سے بم نکال رہے ہیں۔

بہت دیر تک گندگی نکلتی رہی۔ پانی صاف شفاف ہو گیا مگر بم
ایک چھوٹا سا پٹاخہ بھی برآمد نہ ہوا۔ پولیس بہت جھنجھلائی چنانچہ پھوجے سے
[illegible] ہوئی۔ اس نے مسکرا کر تھانیدار سے کہا "بھولے بادشاہو ———
[illegible] تو اپنے پیا کا کنواں صاف کرانا تھا سو کرا لیا ———"

بڑی معصوم شرارت تھی مگر پولیس نے اسے [illegible] مار کر
[illegible] کر دیا ——— اور ایک دن یہ خبر آئی کہ پھوجا سلطانی گواہ بن
گیا ہے۔ اس نے وعدہ کر لیا ہے کہ سب کچھ بک دے گا۔

کہتے ہیں [illegible] اس کے دوست ملک حنیف نے
[illegible] حکومت سے بہت خوش تھا [illegible] گالیاں دیں۔ کہ [illegible] غدار
[illegible] ہے۔ معلوم نہیں اب کس کس کو پھنسائے گا۔

بات اصل میں یہ تھی کہ [illegible] جیل میں اس کو کسی
[illegible] نہیں دیا جاتا تھا [illegible] کھانے کو دی جاتی تھیں [illegible]
[illegible] بہت پیاری تھی [illegible] اس نے [illegible]

[illegible] سے وعدہ کر لیا کہ بم بنانے کی سازش کے جملہ حالات بتا دے گا۔

یوں تو وہ جیل ہی میں تھا مگر اب اس پر کوئی سختی نہ تھی۔ کئی دن تو اس
نے آرام کیا کہ اس کے بند بند ڈھیلے ہو چکے تھے۔ اچھی خوراک ملی۔ بدن پر مالشیں
ہوئیں تو وہ بیان لکھوانے کے قابل ہو گیا۔

صبح لسی کے دو بڑے گلاس پی کر وہ اپنی داستان شروع کر دیتا تھا۔
دیر کے بعد ناشتہ آتا۔ اس سے فارغ ہو کر وہ پندرہ منٹ آرام کرتا اور کڑی سے
کڑی ملا کر اپنا بیان جاری رکھتا۔

آپ محمد حسین سٹینوگرافر سے پوچھیے جس نے اس کا بیان ٹائپ کیا تھا
اس کا کہنا ہے کہ پھوجے حرامدے نے پورا ایک مہینہ لیا۔ اور وہ سارا جال کھول کے
رکھ دیا کہ جو سازشیوں نے ملک کے اس کونے سے اس کونے تک بچھایا تھا۔
بچانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس نے سینکڑوں آدمیوں کے نام لیے۔ ایسی ہزاروں
جگہوں کا پتہ بتایا جہاں سازشی ملک چھپ کے ملتے تھے۔ اور حکومت کا تختہ
الٹنے کی ترکیبیں سوچتے تھے۔

یہ بیان۔ محمد حسین سٹینوگرافر کہتا ہے فل اسکیپ کے ڈھائی سو صفحوں
پر پھیلا ہوا تھا۔ جب یہ ختم ہوا .... تو پولیس نے اسے سامنے
رکھ کر پلان بنایا چنانچہ فوراً نئی گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ اور ایک بار پھر پھوجے کی ماں
بہن پنی جانے لگی۔

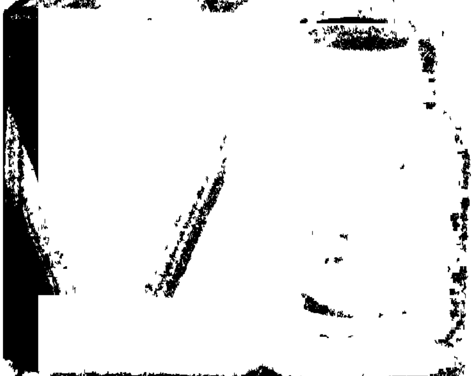
اخباروں نے بھی دبی زبان میں پھوجے کے خلاف کافی زہر اگلا۔ اکثریت
حکام کے خلاف تھی۔ اس لئے اسکی غداری کی ہر جگہ مذمت ہوتی تھی۔ وہ جیل
میں تھا جہاں اسکی خوب خاطر تواضع ہو رہی تھی۔ یہ بڑی طرے والی کلاہ لگی
پگڑی باندھے۔ دو گھوڑے کی بوسکی کی قمیض اور چالیس ہزار لٹھے کی گھیرے دار شلوار
پہنے وہ سیل میں یوں ٹہلتا تھا جیسے کوئی افسر معائنہ کر رہا ہے۔

جب ساری گرفتاریاں عمل میں آ گئیں اور پولیس نے اپنی کارروائی
مکمل کر لی تو سازش کا یہ معرکہ انگیز کیس عدالت میں پیش ہوا۔ لوگوں کی بھیڑ جمع ہو گئی
پولیس کی حفاظت میں جب پھوجا نمودار ہوا تو غصے سے بھرے ہوئے نعرے
بلند ہوئے "پھوجا حرامدہ مردہ باد ——— پھوجا غدار مردہ باد"

ہجوم بہت مشتعل تھا خطرہ تھا کہ پھوجے پر نہ ٹوٹ پڑے اس لئے
پولیس کو لاٹھی چارج کرنا پڑا جس کے باعث کئی آدمی زخمی ہوئے۔

عدالت میں مقدمہ پیش ہوا تو پھوجے نے جب [illegible] بیان

حاذق [illegible]



[illegible] ایک [illegible]

[illegible] علاج ہے [illegible]

[illegible] ہیں۔ اور جسم انسانی کی [illegible]

[illegible] کیں۔ [illegible] حاذق [illegible]

قیمت [illegible]

حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی [illegible]

[illegible] روغن [illegible]

ہے ـــ [illegible]

ہے ـــ [illegible]

ہے ـــ [illegible]

ہے ـــ [illegible]

ہے ـــ [illegible]

قیمت [illegible]

حاذق دواخانہ [illegible]

[illegible] تھا تو اس نے [illegible] بیان [illegible] لگی [illegible]

[illegible] ہو گئے [illegible]

[illegible] نیا بیان لکھا [illegible]

[illegible] قریب قریب [illegible] جاری رہا۔

[illegible] ہوئے تھے [illegible]

[illegible] بیان [illegible] پولیس والوں کی ہوئی ناقابل بیان ہے

[illegible] کی ایک ایک [illegible]

دی۔

[illegible] بیٹھے گرفتار ہوئے

[illegible] ہو گئے۔ دو تین کو تین تین برس کی اور چار پانچ کو

[illegible] کی سزا [illegible] ہوئی۔

[illegible] ان میں سے ایک نے پوچھا۔ اور پیر یہ کون؟

پیر فرتوت نے کہا [illegible] تھا ـــــ وہ تو [illegible] معاف

[illegible] گیا تھا۔

[illegible] حیرت انگیز بات کو سراہا اس نے [illegible] کس

[illegible] سمجھ لیا ـــــ ایک نے جس کے دل و دماغ کو اس کی شخصیت

نے بہت [illegible] کیا تھا۔ پیر فرتوت سے پوچھا۔ آج کل کہاں رہتا ہے۔

[illegible] کی دکان کرتا ہے۔

اتنے میں [illegible] پیر فرتوت کے سامنے رکھ دی [illegible]

[illegible] کی شخصیت [illegible] صاحب

[illegible] رک گیا [illegible]

[illegible] پیر فرتوت سے مخاطب [illegible] آپ [illegible] کبھی

[illegible] چاہیے۔

پیر فرتوت [illegible] آپ اس سے مل چکے ہیں ـــــ یہ خاکساری

[illegible] ـــــ آپ [illegible] کہنے لگے ـــــ السلام علیکم [illegible]

[illegible] گیا۔

([illegible] لطیف)

رباعیات

(۱)

[illegible] ہیں ہم لوگ
[illegible] ہیں ہم لوگ
[illegible] ہے بہت کچھ لیکن
[illegible] ہیں جو وجہ تباہی ہم لوگ

(۲)

کچھ اور بھی تخریب پرستی ہوگی
برباد ابھی اور بھی بستی ہوگی
بڑھتی ہوئی تہذیب نوی کہتی ہے
یہ جنس حیات اور بھی سستی ہوگی

(۳)

انسان کی بیداد پرستی دیکھی
دنیا نے تہذیب کی مستی دیکھی
افکار جو اٹھے ہیں تو کردار نے
یعنی کہ بلندی میں بھی پستی دیکھی

(۴)

اے ہمدم [illegible] کو ہوا نے دو
[illegible] دو
[illegible] گے جو دو
تخریب کے طوفان گزر جانے دو

(۵)

[illegible] ساحل
[illegible] منزل
[illegible]
[illegible]

عبداللہ کلیم اناوی

خوں کے آنسو بہا کے دیکھے ہیں
دل کے غم بھی سنا کے دیکھے ہیں

مسکراتی حسین راہوں پر
غم کے دیپک جلا کے دیکھے ہیں

دل کو حاصل نہ ہو سکی راحت
نغمے ہم نے بھی گا کے دیکھے ہیں

کوئی خواہش نہ ہو سکی پوری
لاکھوں مردے اٹھا کے دیکھے ہیں

[illegible] مجھ کو کبھی جو بخشے تھے
وہ خزانے لٹا کے دیکھے ہیں

بیگم کبیر شاہجہاں پوری ●

گلنار

"آپ کو تو لطف آتا ہے میری ہر خواہش رد کرنے میں!" گلنار نے خالد سے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

"سوچو تو گلنار!" خالد سمجھاتے ہوئے بولا۔ "سفید شلوار اور قمیص تم اپنی سہیلیوں کے ہاں پہن کر تو جا سکتی ہو لیکن بیاہ شادی میں نہیں اور پھر والدہ کے ساتھ تو تمہیں ریشمی ہی کپڑے پہن کر جانا پڑے گا۔"

"مجھے ریشمی کپڑے پسند نہیں!" گلنار نے جھنجھلا کر کہا۔ "آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں ہمیشہ انہی سفید کپڑوں میں کالج جایا کرتی تھی!"

"مگر وہ کالج نہیں، شادی کا گھر ہے!" خالد نے مسکراتے ہوئے بات ختم کرنا چاہی۔

"تو میں نہیں جاؤں گی" گلنار نے گویا فیصلہ سنایا۔

"تمہیں جانا پڑے گا" خالد پر بھی ضد سوار ہو گئی۔ "اور والدہ کے حسب پسند کپڑے پہن کر!"

"ہرگز نہیں —" گلنار نے تیزی سے جواب دیا۔

"ضد نہ کرو گلنار!" خالد نے ایک بار پھر سمجھایا۔ "اگر تم نہ گئیں تو عزیز اور چچا کیا کہیں گے؟ جانتی ہو بجز تمہارے سارا خاندان کس قدر قدامت پسند ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ وضعداری کے تحت خود کو ماحول کے سانچے میں ڈھال لے۔ وہی انسان انسان ہے، جو وقت کے ساتھ ساتھ چلے۔ میں نے آج تک تمہارے کسی فیشن پر اعتراض نہیں کیا!"

"آپ کو حق بھی کیا ہے اعتراض کرنے کا؟" گلنار نے برجستہ جواب دیا —

یہ سن کر خالد غور سے گلنار کو گھورنے لگا کیونکہ اس جواب کی اسے گلنار سے مطلق امید نہ تھی۔

"ایک شوہر کی حیثیت سے مجھے بہت کچھ حق ہے!" خالد نے کہا۔

"تمہیں جانا پڑے گا!"

مگر گلنار اپنی ضد پر قائم رہی اور خالد کی باتوں کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا

"مجھے کسی کی پرواہ نہیں!" گلنار نے ... کے منہ پر گویا

سا مار دیا ہو۔ "اگر آپ لوگوں کی یہی ضد ہے تو میں بھی ہرگز نہ جاؤں

خالد ایک سنجیدہ مزاج نوجوان تھا۔ وہ ہر فیصلہ بہت سو

کر کرتا۔ مگر اس وقت گلنار کی ضد اور گفتگو جس میں خالد کی توہین

تھی۔ اس نے خالد کے جذبات مشتعل کر دیئے۔ پھر بھی اس نے خود کو بہ

اور گلنار کو راضی کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس لئے گلنار سے بہ

بے پناہ محبت... پھول اور خوشبو کی محبت، چاند اور چاندنی کی م

جب اسے یقین ہو گیا کہ گلنار کسی صورت ماننے والی نہیں اور

مرد کو عورت کے مقابلے میں شکست کا احساس ہوتا ہے۔ تو فطرتاً و

ناجائز باتوں کو جائز قرار دے دیتا ہے۔ خالد کے چہرے پر ایک سنجیدہ

"نتیجہ معلوم ہے اس ضد کا؟" اس نے کہا۔

"میں ہر نتیجے کے لئے تیار ہوں" گلنار جیسے پہلے ہی سے

سوچے بیٹھی تھی۔ "میں اپنے گھر جانا چاہتی ہوں!"

"اجازت ہے!" خالد یہ کہہ کر چچی کے ہاں شادی میں چ

جب واپس آیا تو گلنار اپنے میکے جا چکی تھی۔

دو، چار، آٹھ، دس... اسی طرح ایک ماہ گزر گیا

خالد کے بغیر بے کلی سی محسوس ہونے لگی۔ آسمان پر الجھے ہوئے بادل

سیاہ بادل اس کے دل پر ایک بوجھ سا بننے لگے — چاند کی روشن

لگی۔ وہ سمجھتی تھی۔ دوسرے ہی دن خالد آئے گا۔ اور جب گنڈار

خوشامد کرے گا۔ تو وہ راضی ہو جائے گی۔ مگر معاملہ بالکل برعکس

خالد سے محبت تھی — بے پناہ محبت — مگر خالد پر اس کی بے

کے تحت گلنار غالب آ چکی تھی۔ ابتدا میں خالد نے اس کی ج

خواہشیں پیار سمجھ کر پوری کیں — دن گزرنے پر ... کی جگہ

۔ اور وہ بھی خالد کو پوری کرنا پڑتی۔

ادھر خالد بھی کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ مگر چونکہ خود اراد تجید
تھا۔ اس لئے خود جاکر گلنار کو لانا خودداری کی توہین تھی۔ ایک ہ
است تھی ...... دن گزرتے گئے۔ دونوں کی بے چینیاں بڑھنے لگیں
لنار پریشان، ادھر خالد بے چین — دونوں کے خواب بڑھتے
ںقصور کا دائرہ وسیع ہونے لگا۔ تخیل کی پرواز بلند ہونے لگی....
ں کے والدین نے سمجھانے کی کوشش کی، مگر گلنار کو وہی ضد —
ب تک خالد نہیں آئیں گے وہ نہیں جائے گی۔" ادھر خالد کا فیصلہ
نار خود آجائے ورنہ وہ نہیں جائے گا۔"

انسانی فطرت کی نشوونما تربیت اور ماحول کے سانچے میں ہوتی
۔ اس لئے وہی اس کی شکل ہوتی ہے جو سانچے کی شکل ہے.... گلنار کی
رش ہی اس کی ہر ضد پوری کرکے ہوئی تھی۔ پھر وہ کیسے اس ضد کی
ـیں ہار جاتی — لیکن وقت کے ساتھ ساتھ گلنار کو اپنی ضد پر پشیمانی
نے لگی لیکن..... وہ اس کی خاطر ہر قربانی کر سکتی تھی۔ ایک دن اسے
ل خالد کی طرف سے ایک منی آرڈر وصول ہوا۔

"میں تمہارا بار تمہارے والدین پر ڈالنا نہیں چاہتا۔"
بس اتنا ہی لکھا تھا۔ گلنار ہرے ہرے نوٹوں کو لے کر اس طرح
ہی۔ جیسے اس کے ہاتھ میں خالد کا ہاتھ ہو۔

اف کیا ہو گیا خالد کو...... کیا انھیں مجھ سے محبت نہیں رہی؟
وں نے تو آج تک میری کوئی خواہش رد نہیں کی۔ سوچتے سوچتے اس کی
ھیں ڈبڈبا آئیں۔

دوسرے دن خالد نے اپنے چھوٹے بھائی کے ہاتھ ایک سینڈل
یہ کپڑے گلنار کو بھیجے۔

"رشید! وہ کیسے ہیں؟" گلنار نے آخر پوچھ ہی لیا۔

"اچھے ہیں" رشید نے جواب دیا — "ہر وقت چپ چپ
ر رہتے ہیں۔ نہ کہیں جاتے ہیں اور نہ کسی سے بات کرتے ہیں.....
س سے [illegible]
"[illegible]" گلنار نے پوچھا
"[illegible]"

"یہ سینڈل دیتے وقت کیا کہا تھا انھوں نے؟" گلنار رشید
کے بالکل قریب بیٹھ گئی۔ جیسے کوئی ایسی بات بتائے گا جو وہ ذرا بھی
فاصلے سے نہ سن سکے گی۔

"کچھ نہیں صرف اتنا کہا تھا" رشید نے بتایا "یہ سینڈل بھی
بھابی کو دے آؤ — ان کی چپل پرانی ہو گئی تھی... پھٹ گئی ہوگی"
"بس؟ — اور کچھ نہیں کہا؟" گلنار نے جلدی سے
سوال کیا —

"اور کچھ نہیں کہا۔"

رشید یہ کہہ کر چلا گیا اور گلنار پر ایک اداسی سی طاری
ہو گئی..... اس کا تو اسے بھی اعتراف تھا کہ خالد کو اس سے محبت ہے۔ مگر
اپنی ضدی عادت کو کیا کرے...... وہ سمجھتی تھی۔ اور اسے یقین
کہ خالد ضرور آئے گا۔ اور بہت سی بہاریں اور خوشیوں اور امیدوں
کے ساتھ — اور مجھے اپنی محبت بھری آغوش میں اٹھا کر لے جائے گا۔
اسے ناامیدی سی ہونے لگی.... اس کے یقین کا چاند اس کی بدلیوں
چھپنے لگا۔ اور ایک دن جب رشید نے زیبائش کا بہت سا سا
لا کر دیا۔ تو اسے خود سے نفرت سی ہونے لگی اور پھر ایک خیال آیا، شاید
خالد کبھی نہ آئے..... اور خالد کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔
"گلنار... میری اچھی گلنار..... جب میں اپنی زندگی کا جائزہ لیتا
ہوں تو بجز تمہارے کچھ نہیں پاتا..... تم جب چند دنوں کے لئے اپنے
چلی جاتی ہو تو دن کاٹنے محال ہو جاتے ہیں؟ اور پھر وہ یونہی دل میں
پڑی... خالد آئیں گے اور ضرور آئیں گے۔

خالد کی حالت بھی عجیب تھی۔ بات چیت کرنا تو وہ جیسے
ہی نہ تھا۔ وہ اکثر بستر پر خاموش پڑے ہوئے خیالات کے دائرے
کرتا...... چھوٹے.... بڑے.... اور لامحدود دائرے —
جب اس کی نظر گلنار کے خالی پلنگ پر پڑتی تو وہ دیر تک پھٹی
نظروں سے گھورتا رہتا۔ اور پھر تکیہ میں منہ چھپا لیتا.... یہ
کچھ بھی..... لیکن وہ اپنی بات پر بدستور قائم تھا...... اس
نے کچھ سوچا، لیکن گلنار کے پاس جانے کے بارے میں کبھی خیال تک
نہیں کیا..... اس دوران میں گلنار کی والدہ سخت علیل ہو گئیں

سیرنہیں۔

خالہ کے گھر والے دیکھنے گئے۔ لیکن خالد نہ گیا۔ سب نے ہر چند کہا لیکن وہ نہ ملا ..... اور جب ساس نے خود بلا بھیجا تو وہ انتہائی پریشان سا ہو گیا اور بہت دیر تک سوچتا رہا۔ کیا کہے؟ اور آخر اس نے ایک خط لکھا۔

"میں کیوں کر کہوں کہ مجھے آپ کی علالت کا سن کر کس قدر افسوس ہے۔ میں نے آپ میں اور امی میں کبھی کوئی فرق محسوس نہیں کیا۔ لیکن آپ ہی سوچئے میں کیسے آؤں؟"

خط سن کر گلنار کے دل کو ایک نا قابل برداشت صدمہ پہنچا۔ وہ بستر میں منہ چھپائے دیر تک روتی رہی گلنار کی والدہ نے خط کا جواب دیا

"میں تمھیں صرف اپنی محبت کے تحت بلا رہی ہوں اس لئے نہیں کہ تم آؤ۔ اور گلنار کو لے جاؤ۔ میں اس سلسلہ میں تم سے بات تک نہیں کروں گی ...... !"

خط پڑھ کر خالد جھجکتے جھجکتے گلنار کے ہاں پہنچ گیا۔ اور ساس کے پلنگ کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں، نظریں خاموش تھیں۔ اور دل اداس تھا۔ ...... گلنار اپنے کمرے میں سے خالد کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک سیلاب سا جاری ہو گیا۔ جسم کی حرارت تیز ہو گئی۔ تمام بدن سے شعلے نکلنے لگے۔ ..اف .....! یہ کیا ہو گیا خالد کو؟ ان کی حالت کیا ہو گئی! اس کی ذمہ دار میں ہوں۔ اور .... صرف .... میں ..... میں انھیں نہیں جانے دوں گی، بالکل نہیں جانے دوں گی۔ میں ان کے ہمراہ جاؤں گی۔ میں ان کے ساتھ جیوں گی اور ان کے ساتھ ہی مروں گی۔ اف .... اتنے نزدیک ہوتے ہوئے بھی خالد مجھ سے اس قدر دور ہیں۔

"اچھا! خالہ جان جا رہا ہوں!" خالد نے اجازت طلب کی۔

"نہیں ــ ابھی ٹھہرو ــ بغیر کھانا کھائے نہیں جا سکتے۔"

"نہیں خالہ جان! میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔" خالد نے خوشامد سی کی ـــ

"اعتراض ہے کچھ؟"

"نہیں تو!" خالد نے کہا۔

"پھر تو تمہیں کھانا کھا کے جانا ہو گا۔"

خالد اس اصرار پر خاموش ہو گیا۔ نوکرانی نے کھانا لگایا ـــ اور

کھانا جلدی جلدی کھا کر خالد سلام کر کے چل دیا۔

گلنار نے آنسو پونچھے اور چاہا کہ بڑھ کر خالد کو چمٹ جا[ئے]

لیکن ......خالد جا چکا تھا ...... وہ بے دم سی ہو کر پلنگ پر گر[ی]

دوسرے دن گلنار کو رشید نے ایک دوائی شیشی لا کر دی۔

"یہ کیا؟" اس نے پوچھا

"بھائی جان نے دی ہے!" رشید نے بتایا۔ "اس کو ایک پانی میں چار بوندیں ڈال کر سوتے وقت پی لیا کیجئے!"

"میں بیمار تو نہیں رشید!" گلنار نے کہا۔

"بھائی جان کہہ رہے تھے جس کا دل کمزور ہو جاتا ہے پیلا پڑ جاتا ہے۔ اس کے لئے یہ بہترین ٹانک ہے!"

"آخر انھیں کیسے معلوم ہوا کہ میں بیمار ہوں؟"

"شاید کل آپ کی نوکرانی نے بتایا تھا۔"

"رشید میرا ابھی کبھی ذکر کرتے ہیں وہ؟" اس نے پوچھ[ا]

"نہیں تو!" رشید نے کہا ـــ اور گلنار کا دل رشید کا منہ نوچ لے۔

"اماں اکثر کہتی ہیں کہ آپ کو لے آؤ" رشید نے بتایا "بھائی جان کہتے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا، میں لینے نہیں جاؤں[گا]"

رشید چلا گیا۔ گلنار کو یقین ہو گیا کہ خالد کبھی بھی لے[نے] نہیں آئے گا۔ ورنہ وہ کل اس سے ضرور ملتا۔

ایک دن اسے رشید نے بتایا کہ خالد سخت علیل۔ ٹائیفائیڈ ہو گیا ہے۔ یہ سن کر وہ پریشان ہو گئی.....خالد بیم[ار] اور میں یہاں ہوں۔ یہ تو خالد کی پرانی عادت ہے۔ کہ وہ دو[ا] پیتے ـــ کیا مجال جو کوئی انھیں دوا پلا سکے۔ اس نے سوچ[ا] انھیں کون دوا پلاتا ہو گا۔ خالد ہمیشہ ماں کے بہت زیادہ [منت] خوشامد کرنے پر بمشکل تمام دوا کے دو گھونٹ پی لیتا گلنار سے وہ بالکل انکار نہ کرتا۔ جب وہ دوا کا گلاس اس[کے لبوں تک] لے جاتی تو وہ زور سے آنکھیں بند کر لیتا.... اور پھر.... دا[نتوں] سے لگا دیتی۔ اور وہ جلدی جلدی بڑے بڑے گھونٹوں سے [حلق] کے نیچے انڈیل لیتا۔ اور پینے کے بعد دیر تک گلنار پر خفا

۔ وہ زیر لب مسکراتی رہی۔

میں جاؤں گی ۔ میں ضرور جاؤں گی ۔ گلنار گھبرا کر
ی سے کھڑی ہو گئی۔

" رشید! تانگہ لے آؤ ۔" اس نے گھٹی ہوئی آواز سے کہا۔

"کیا سچ مچ ؟" جیسے رشید کو یقین نہ آ رہا ہو۔

" ہاں سچ مچ !" اس نے بھاری آواز سے کہا اور ہچکیاں لینے لگی

جب گلنار پہنچی تو خالد کو زبردستی دوا پلائی جا رہی تھی ۔ اس
ایک گھونٹ لے کر منہ اور آنکھیں بند کر لی تھیں ۔ ماں نے ہر چند کہا
ن وہ منہ بند کئے لیٹا رہا۔ سب گلنار کو دیکھ کر ایک دوسرے کو
ت سے دیکھنے لگے ۔ اس نے دوا کا گلاس اپنے ہاتھ میں لے لیا....
خالی ہو گیا۔

خالد نے دیکھا کہ گلنار کے ہاتھ میں دوا کا گلاس ہے۔ اس نے جلدی سے بچوں کی طرح آنکھیں بند کر لیں ۔ گلنار نے گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ خالد کے لب ہلے۔ اس نے عجیب سا منہ بنایا۔ اور پھر بڑے بڑے تین گھونٹوں سے ساری دوا پی گیا۔ گلنار خالد کا سر اپنی گود میں رکھ کر سہلانے لگی اور خالد سو گیا۔

صبح کو اس کا بخار اتر چکا تھا۔ کچھ دنوں میں خالد بالکل ٹھیک ہو گیا......

" اب تو آپ ٹھیک ہو گئے " گلنار نے مسکراتے ہوئے کہا ۔

" اس لئے مجھے جانا چاہیئے "

" تمہیں کس نے روکا ہے ! جاؤ ۔ اور ضرور جاؤ " خالد نے مسکرا کر گلنار کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا ۔ اور پھر سارا کمرہ نقرئی قہقہوں سے گونج گیا۔ جیسے تارے کھلکھلا کر ہنس پڑے ہوں !!

(بشکریہ جھنکار)

بنگلور سے ہفتہ وار "پیغام" کا اجرا

جنوبی ہند میں تحریک اسلامی کے پیغام کو پھیلانے کی غرض سے ابو البیان حماد کی ادارت میں ، ۲۴ مئی ۵۸ء سے ہفتہ وار "پیغام" کا اجرا
عمل میں آیا ہے ۔ تحریک اسلامی کے مقصد سے اتفاق اور دلچسپی رکھنے والے تمام حضرات سے تعاون کی درخواست ہے۔ اہل قلم حضرات
علمی اعانت اور ارباب خیر مالی معاونت فرمائیں۔ نمونہ طلب کرنے پر بھیجا جاسکتا ہے۔ ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ: منیجر ہفت روزہ "پیغام" ایجنسی روڈ بنگلور

اقتباس اعظمی •

فلمی شاعر

ڈائری۔ مسلسل

سنا تھا اکثر ترقی پسند شاعر و ادیب بمبئی میں رہتے ہیں۔ کیوں رہتے ہیں؟ اس سے مجھے بحث نہیں اور نہ تفتیش کی کوئی خاص ضرورت ہی ہے۔ سنی سنائی بات ہے اسے بلا کم و کاست بیان کئے دیتا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں جب کوئی شاعر (شاید ان کی مراد ترقی پسند شاعر سے ہو) یہ دیکھتا ہے کہ اب رزق کا کوئی دروازہ کھلا نہیں رہا۔ معاشی حل کی کوئی سبیل نہیں رہی خدا بھی ناخوش حکومت بھی ناخوش اور اتفاق سے خدائے رزق دو ہی ہوتے ہیں۔ بعضوں کے نزدیک خدا اور بعضوں کے نزدیک حکومت۔ اب ایسے عالم میں کچھ دنوں تک تو وہ "غم دوراں" کو سینے سے لگائے ادھر ادھر پریشان پھرتا [illegible] ہے جب اس پر یہ راز منکشف ہوتا ہے کہ "غم دوراں" "غم جاناں" سے کچھ بلند تر ہے۔ جب کوئی سبیل معاش باوجود انتہائی جستجو کے نہیں نکلتی تو سوچتا ہے کہ کیوں نہ فلمی دنیا میں چلیں۔ وہاں تو بہت سے خدائے رزق مل جائیں گے لیکن ابھی چونکہ اس کا ضمیر اور اس کا جذبہ خودی بیدار ہوتا ہے اس لئے پہلے تو قلب آمادہ نہیں ہوتا لیکن اسے اس طرح سمجھاتا ہے کہ اخلاقی قدریں ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں۔ نظامِ اخلاق کا انحصار تو نظامِ معیشت پر ہے۔ وہ جب بدلے گا تو اخلاقی قدریں خود بخود بدل جائیں گی۔ اس دورِ ترقی میں اور فرسودہ نظامِ اخلاق کی پابندی؟ "دل ناداں" بہر فریب دل ناداں ہے۔ دل کو باتوں میں بہلا جاتا ہے۔ یہ مرحلہ جب طے ہو جاتا ہے تو شکم پرست شاعر جو ہمیشہ عوامی شاعر کے بھیس میں سامنے آتا ہے فلمی دنیا کی حدود میں داخل ہوتا ہے۔ میں تو نہیں جانتا لیکن سنا ہے [illegible] فلم کے ایک تجربہ کار سے سنا ہے کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے یہاں سے بہت سے مقامات طے کرنے ہوتے ہیں۔ بعض مرتبہ تو مقامات آہ و فغاں سے بھی گذرنا پڑتا ہے جہاں اخلاق ماتم کرتا ہے اور ضمیر روتا ہے۔ اس راہ کے جتنے مسافر ہوتے ہیں ان میں بے انتہا منافقت ہوتی ہے۔ یہاں آکے شاعر، شاعر نہیں ایک اچھا تاجر بن جاتا ہے۔ اس کی ذہنیت خالص تاجرانہ ہو جاتی ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کا مال [illegible] بکتا رہے زیادہ بکے اور اس کی بنائی ہوئی چیز زیادہ سے زیادہ چلے۔ اس دنیا میں [illegible] کے لئے صرف اتنا ہی کافی نہیں کہ آپ اچھے شاعر ہیں اور بقول ترقی [illegible] کے مشہور شاعر ہیں بلکہ یہاں کامیابی کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ کو میو[illegible] کے حضور میں باریابی حاصل ہو۔ لیکن یہ کام کچھ آسان نہیں ہے۔ ڈائرکٹر جب فلمی شاعروں۔ یا یوں کہیے کہ بھوکے شاعروں کا خدائے ر[illegible] پھر اس کی بارگاہ الٰہی میں بھلا اتنی جلدی تقرب کیوں کر حاصل ہو سکتا [illegible] کل تو روٹی کی جنگ ہے۔ روٹی ہی ذہن پر چھائی ہوئی ہے پہلے چ[illegible] "روئے جاناں" کی یاد تازہ ہوتی تھی لیکن آج اس گول اور پیلے سے چاند [illegible] گول سی پیاری روٹی یاد آتی ہے۔ ہاں تو میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ جب ر[illegible] زندگی میں اس درجہ اہمیت حاصل کرے اور سارا نظام حیات اسی [illegible] گردش کرنے لگے تو پھر بتائیے کہ اس شخص کی اہمیت کتنی زیادہ ہوگی [illegible] کو روٹیاں دیتا ہو۔ کیا وہ "روٹیوں کا دیوتا" نہیں کہلائے گا۔ میں نے سنا [illegible] دنیا کا بڑا میوزک ڈائرکٹر بھی شکم پرست شاعروں کا خدا ہوتا ہے۔ اس [illegible] ذرا مشکل سے حاصل ہوتا ہے۔ پہلے اس کے بہت سے مصاحبین خا[illegible] پڑھانے ہوتے ہیں پھر ان مراحل کے بعد کہیں جا کر اس کی بارگاہ میں [illegible] موقع ملتا ہے اس کے بعد اگر فی الحقیقت آپ شکم پرست ہیں تو اپنی خودی اور اپنی انسانی عظمت کو اس خدائے رزق کے قدموں پر نثار کر دیجئے عجز [illegible] نذریں میں نے پیش کرتے تو دیکھا نہیں ہے لیکن دنیائے فلم کے چ[illegible] سے سنا ہے شاید آپ کہیں کہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ لیکن کبھی کبھی [illegible] باتیں بھی اتنی ہی صحیح ہوتی ہیں جتنی دیکھی ہوئی۔ بعض وقت تو [illegible] صحیح ہوتی ہیں جب انہیں ایسے لوگ بیان کرتے ہوں جو فلمی دنیا میں کام [illegible] جیسے مثلاً آج بھی باوجود فلمی دنیا میں رہتے ہوئے بہت حد تک ا[illegible] کے مالک ہیں۔ ایک دن میرے یہاں آکے بیٹھے [illegible] شکم کی جوا[illegible]

[illegible]

..ت کے لئے یہاں آئے تو پھر وہ میوزک ڈائریکٹر کا غلام ہو گیا ہے اس سے ملئے تو
..ت با نیاز بن جائے۔ میں نے کہا " ذرا تفصیل سے بتائیے دنیائے فلم کے
..عرائے کرام کس طرح عجز و نیاز کی نذریں پیش کرتے ہیں؟ کہنے لگے " غلامی کے پیدا
..س طرح برتے جاتے ہیں کہ یہ کوئی نہ کہہ سکے کہ شاعر اپنی خودی کا خون کر رہا ہے
..ج کل غلامی کی رسمیں بھی اس خوش اسلوبی سے ادا کی جاتی ہیں کہ بیک نظر یہی
..علوم ہوتا ہے کہ تہذیب و شائستگی کا یہی اقتضا ہے۔ مثلاً میوزک ڈائریکٹر کے
..با سگرٹ ختم ہو گئی ہے۔ یہ اشارہ کہ آپ جائیں اور سگرٹ لائیں یا میوزک ڈائرکٹر
..ے کہا مناسب یہی ہے کہ ہم ٹیکسی سے چلیں اور آپ یہ سنتے ہی گئے اور ٹیکسی لے کر
..ے۔ جو فلمی شاعر زندہ رہ سکتا ہے وہ اپنے آقا کے ان اشاروں کو اچھی طرح سمجھتا
..ہے۔ میوزک ڈائرکٹر کا اپنا بستہ بغل میں دبائے گھر سے نکلا۔ فوراً اس کے شاعر خاص
..ے کہا " لائیے میں بستہ لئے چلوں " یہ کہتے ہوئے ہاتھ بڑھایا اور لے لیا۔ میں نے
..یاں نثار اختر سے کہا " شعرائے زر پہلے بھی رہے ہیں اور اب بھی ہیں پہلے وہ دربار
..ے وابستہ تھے اور اب میوزک ڈائریکٹر کی بارگاہ سے۔ فرق اتنا ہے کہ قدیم شعرائے
..ری غلامی اپنے دامن میں بظاہر صد ہا عزتیں لئے ہوئے تھے لیکن میوزک ڈائریکٹر
..ی غلامی میں سر تا سر ذلتوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔

بہتر ہو گا اگر میں آخر میں ایک ترقی پسند ناقد کی رائے نقل کر دوں۔
..یح ہے کہ بعض شعرا نہایت مجبور ہو کر فلمی دنیا سے وابستہ ہوتے ہیں لیکن حصول
..دولت کے لئے پستیوں میں رہنا قبول کر لینا یقیناً شاعر کی خودی کے سراسر منافی
ہے۔ ممتاز حسین لکھتے ہیں۔

> یہاں میں ان مصنفین کا تذکرہ نہیں کر رہا ہوں جن کا مقصد
> ہی روپیہ کمانا ہے بلکہ ان لوگوں کا تذکرہ کر رہا ہوں۔ جو
> ترقی پسند مصنفین ہیں اور جنہوں نے عوامی ادب پیش کیا
> ہے۔ ہائے اس قسم کے شعرا اور مصنفین جب فلم اسٹوڈیو
> یا ریڈیو پہنچ جاتے ہیں تو اپنے تمام فرائض کو بھلا دیتے
> ہیں [illegible]
> [illegible]
> [illegible]
> [illegible]
> [illegible]
> ایسا کام کرنا چاہیے جہاں شخص اپنا قلم فروخت نہ کر پائے
> (سویرا صفحہ ۱۷ جولائی اگست ستمبر اکتوبر ۱۹۵۳ء)

اگر آپ کا نام اور خریداری نمبر بھی ذیل میں درج ہے

تو سمجھ لیجئے کہ آپ کی خریداری مدت ماہ جولائی ۱۹۵۵ء کو ختم ہے۔ آپ کے نام گشتی مراسلہ بھی جاری کیا جا رہا ہے۔ مہربانی فرما کر اپنا سالانہ چندہ بذریعہ منی آرڈر روانہ فرما کر شکر گزار فرمائیے۔ یا پھر اپنی خواہش سے مطلع کیجئے اگر آپ نے خاموشی سے کام لیا۔ تو ماہ اگست ۱۹۵۵ء کا شمارہ بذریعہ وی پی ارسال خدمت کیا جائے گا۔ اور اس کا وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہو گا!

منتظر کرم :۔ منیجر رسالہ "مشیر" کراچی

نمبر خریداری	نام	نمبر خریداری	نام
۱۰۹۳	عارف صدیقی کلکتہ	۲۱۵۹	محمد رفیق لاہور
۲۰۰۰	محمد عثمان کراچی	۲۱۶۶	حفیظ الرحمن کراچی
۲۰۰۲	عبداللطیف میمن ٹھٹھ	۲۱۶۷	عالم صاحب کراچی
۲۰۰۴	عبدالغفور گوجرانوالہ	۲۱۷۰	زاز ملک منٹگمری
۲۰۱۰	بشیر احمد گوجرانوالہ	۲۱۷۲	عبدالعزیز دھاڑی سندھ
۲۰۱۵	اکبر خان سلیمانی ہزارہ	۲۱۷۳	نظام الدین سعید پور
۲۰۲۶	سقاف آثار ٹینگلور	۲۱۷۴	وسیم خالد ڈھاکہ
۲۰۲۸	عبداللہ علی محمد ٹھٹھہ	۲۱۷۶	احمد خان چغتیاں
۲۰۳۰	جمیل الرحمن پشاور	۲۱۸۱	امان اللہ ڈیرہ اسمٰعیل خان
۲۰۳۱	محمد سلیم صاحب گوجرانوالہ	۲۱۹۴	محمد حنیف لاہور
۲۰۳۵	عبدالغفور سیالکوٹ	۲۱۹۶	مسلم دار المطالعہ [illegible]
۲۰۳۶	بشیر کریمیہ ہوٹل بھارت	۲۲۱۳	نظیر احمد سرشین

[illegible] یہ اقتباس [illegible] نقل کیا [illegible]
[illegible] ترقی پسند [illegible] (۱۰۱)

م۔ نسیم

اس کے پڑھنے سے لاکھوں کا بھلا ہوگا

صاحبو! نہ تو میں کوئی اشتہاری کتب فروش ہوں اور نہ بازاری کتابیں بیچنے والا اس لئے قسم ہے مسلمان کو قرآن کی اور ہندوؤں کو گیتا کی اور گنگا کی کہ اسے نہ پڑھیں اور اگر پڑھیں تو فائدہ اٹھائیں۔ بھائیو! میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر سچ سچ کہتا ہوں کہ میں بھی اپنے گھر کا لاڈلا اور ایک امیر گھرانے کا ہوں۔ چھوٹی سی عمر میں ہی مجھے سیدھے سادھے اور بیوقوف لڑکوں کی صحبت مل گئی اور ان ہی کی دوستی کا چسکہ پڑ گیا۔ اس طرح اپنے ہاتھوں میں نے اپنا ذہن برباد کر لیا اور جوان ہونے تک بھی بالکل احمق اور غیر مہذب ہی رہا۔ آخر ایک دن جب اپنی حالت پر غور کیا تو آنکھیں کھلیں اور پچھلی زندگی اس طرح بے کار گذارنے پر بہت پچھتایا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ اس غم نے مجھے گھن کی طرح کھانا شروع کیا اور چند ہی دنوں میں میرے بال کنپٹیوں سے لٹک گئے۔ شیو بڑھ گیا اور میں اپنے لباس سے بھی بے پرواہ ہو گیا۔ اسی غم میں شاید میرا خاتمہ ہو جاتا کہ خوش قسمتی سے میرے ایک دوست جو بہت سے دانشمندوں کی صحبت اٹھائے ہوئے تھے بمبئی سے آئے۔ ایک دن وہ اصرار کر کے مجھے شہر کے کافی ہاؤس لے گئے۔ وہاں زندگی میں پہلی بار اتنے سارے عقلمندوں کو جمع ہو کر کافی پیتے دیکھا۔ وہ دوست مجھے بھی ایک ٹیبل پر لے گئے جہاں ایک پروفیسر بزرگ کے گرد لوگ حلقہ باندھے بیٹھے تھے۔ ہم دونوں بھی جا کر اس حلقہ میں شامل ہو گئے۔ کافی آئی اور میں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے پی۔ بزرگ کچھ دیر تک مجھے دیکھتے رہے پھر مجھ سے عقلمندانہ سوال کئے۔ جیسے نقش کا کلام سنا ہے؟ مجاز کو جانتے ہو جعفری کو دیکھا ہے۔ یہ سننا تھا کہ میں تھر تھر کانپنے لگا اور سب کے سامنے اپنی بے عزتی کا خیال کر کے میرے آنسو نکل آئے۔ اس پران مقدس صورت بزرگ نے رحم کھا کر جیب سے ایک نوٹ بک نکالی اور کچھ اشعار مجھے سنائے۔ بھائیو! میں خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ان شعروں کا سننا تھا کہ مجھے اپنے دماغ کے پردے کھلتے ہوئے معلوم ہوئے۔ اور بچپن کی ذہانت جاگتی محسوس ہوئی۔ مارے عقیدت کے بڑھ کر میں نے ان بزرگ کی کافی کی پیالی چوم لی۔ اور بلا جھجک اپنی رام کہانی کہہ سنائی۔ اس پران بزرگ نے تمہاری صورت ہی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ تم بچپن سے غلط صحبت میں رہے اور علمی سوسائٹی نہیں ملی ہے۔ ورنہ تمہاری ذہانت بہت کام آتی۔ خیر کچھ نہیں گیا۔ پچھلی غلطیوں سے توبہ کر کے آئندہ کے لئے اپنی اصلاح یہاں کی اچھی صحبت اختیار کرو۔ میں نے حسب فرمانے مرشد کے ہاؤس روز جانا شروع کر دیا اور بلا ناغہ کافی کا پینا بھی جاری رہا۔ چند مہینوں میں میں نے اپنے آپ کو ایک نیا انسان پایا۔ میں اب ذہین تھا۔ پڑھی لکھی صحبتوں میں بیٹھنے اور اونچی باتیں کرنے کے قابل تھا۔ حد یہ کہ اب خود شعر کہنے لگا تھا مگر پیر و مرشد کی اجازت نہ تھی اس لئے بہت کرتا رہا۔ میری فرماں برداری سے خوش ہو کر مرشد نے کبھی کبھی کچھ کہنے کی اجازت دیدی۔ پھر بھی انتہائی روکنے پر ایک غزل یا نظم سے کم نہیں تھا اور وہ بھی ایسی کہ زیادہ تعریف کرنا اپنے منہ میاں مٹھو بننا ہے کہ دنیا کی کوئی فکر مجھے نہ رہی اور میں پورا دانشور ہو گیا۔

پوری طرح صحت پالنے پر بزرگ مرشد نے اپنی نظموں کا ایک مجموعہ دیا اور ہدایت کی کہ خبردار اسے روزی کمانے کا ذریعہ نہ بنانا بلکہ خلق خدا کے لئے بار بار چھپوا کر شائع کرتا۔ میں نے تعمیل ارشاد کا وعدہ کیا اور اب تک اس مقدس مجموعے کو سات بار چھپوا چکا ہوں۔ اور اب آٹھویں تیار ہے۔ مرشد کی ہدایت کے بموجب عام خلق خدا کے فائدے کے لئے کم سے کم قیمت پر دیتا ہوں اور لاگت سے زیادہ ایک پیسہ بھی حرام ہے۔ جو بچپن میں یہ موذی عادت پڑ چکی ہو یا جن کو اپنے دوست اور عزیز تباہ ہو جانے کا حال معلوم ہو ان کو دین دھرم کا واسطہ دے کر کہتا ہوں یہ کتاب ضرور خریدیں۔ خدا نے چاہا تو جلد ہی وہ اس کے کرشمے دیکھیں گے۔ تھوڑے عرصہ میں وہ نظمیں سنانے اور شعر کہنے لگیں گے۔

"مجموعہ کلام مرشد" ایک جلد دو روپیہ۔ چھ جلد [illegible]

نوٹ: یہ کتاب [illegible]

امۃ الوحید مبارکہ

تقدیر کے کھلونے

اپنی گلی کے نکڑ کے قریب پہنچ کر وہ تھکا ہارا رک سا گیا۔ گہری لمبی سانس لی۔ دائیں پاؤں کو زور سے ایک جھٹکا دے کر چند ہلکے لے دیئے تو جوتے سے گرد اور کنکریاں زمین پہ گر کر ادھر ادھر بکھر گئیں

"ہیریا ——— مبارک ہو ——— کل تا گھر ہیرا آگیا ہے"

طرف سے آتی ہوئی زینب کی آواز پر وہ چونک پڑا۔ تعجب حیرت جسے بایاں پاؤں زمین سے تین چار بالشت اوپر ہی معلق ہو کر رہ جو اس نے کنکریاں اور گرد گرانے کے لئے جھٹکنے کو اوپر اٹھا رکھا تھا بلا حرکت سر جھکائے وہ پتھر کے مجسمہ کی طرح وہیں نصب سا ہو گیا چمڑے کا بوجھل جوتا پاؤں کی انگلیوں کے سہارے بڑے مضحکہ خیز بغیر ہلنے جلنے کے لٹک رہا تھا۔

خبر بجلی کی مانند کوندتی ہوئی سنسنا کر اس کے ذہن میں گھسی اور وہ منجمد ہو کر رہ گئی۔ یہی بات اگر وہ اپنی ساس کی بجائے کسی بے تکلف دوست یا گاؤں کی کسی مذاقیہ عورت سے سنتا تو اس کے سچ کا کبھی تصور ہی نہ لاتا۔ متحیر و متعجب ہونا چہ معنی، سمجھتا ہلے سے چھیڑا ہے، مذاق کیا جا رہا ہے۔ بس اس لئے کہ فلاں کی بیوی اس حال ہے اور اب ——— اب تو اس انہونی بات کے جھوٹ یا مذاق ہونے ہم ایسے ہوا ہی نہیں۔

زینب کی موجودگی اور قربت کے احساس سے جلد ہی وہ سنبھلا پاؤں کو ذرا سا جھکولا دے کر گرد اور کنکریاں گرا دیں۔ اور پاؤں کو ٹھیک جوتے میں جما دیا ——— ایک دبا دبا خوف، ایک مبہم سے خطرہ تصور سے وہ پہلو میں دھیمی دھیمی دھڑکن محسوس کرنے لگا۔ "خدیجہ کس میں ہو گی ——— "ساس سے کچھ معلوم کرنے کا خیال آتے ہی شرم باعث سوچ کے ذرات جہاں کہیں تھے وہیں ذہن کے پردوں میں اٹک کر رہ گئے سوالات پوچھنے تو ہی ایک طرف وہ تو اس وقت یہ بھی نہ پوچھ سکا کہ "آپ کہاں سے آ رہی ہیں؟"

صحن میں ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالتا ہوا وہ کمرے میں داخل ہوا دروازے سے ذرا پرے بچھی ہوئی چارپائی پر خدیجہ بیٹھی ہوئی تھی۔ نوارد بچہ اس کے پاس پڑا سو رہا تھا۔ ساتھ والی چارپائی پر وہ دھیرے سے بیٹھ گیا آہستگی سے سوئے ہوئے بچے کے چہرہ پر سے کپڑا سرکایا اور پھر جوش محبت سے اسے بازوؤں پر اٹھا لیا۔ خدیجہ خشکی سے بولی "زیادہ نہ ہلاتا جلاتا جاگ پڑے گا" چند لمحے وہ ٹکٹکی لگائے بچے کو دیکھتا رہا۔ پھر دھیمی آواز میں.. خدیجہ کو مخاطب کیا "بھئے ..... چچی کی جگہ کوئی اور بتاتا تو میں مانتا ... سنتے ہی خون خشک ہو گیا میرا ..... سوچ خدیجہ پر کیا بیتی ہو گی۔ اور بچہ کس حال میں ہو گا۔ دیکھو تو تین ساڑھے تین مہینے پہلے ہی چلا آیا مشینیا ....."

اس نے دانت نکال دیئے۔ پھر کہا "مجھے کیا ہے کو خبر تھی کہ اس مشینیے کو اتنی جلدی آجانا تھا نہیں تو شہر سے بادام مکھانے وغیرہ لیتا آتا" خدیجہ پیشانی پر تیوری چڑھائے بالکل خاموش رہی۔ کل وقت پر کئی ضروری چیزیں گھر میں ... موجود نہ ہونے پر اسے بے حد الجھن محسوس ہوئی تھی پھر کئی بار بیزاری، خفگی اور الجھن کے ذہن پر یہ نقش بنتے اور مٹتے رہے تھے۔ اور اب فضل کی موجودگی نے یہ نقوش کافی نمایاں ہو گئے۔ وہ خدیجہ کی ذہنی حالت سے بے خبر ہو کر بڑے غور سے بچے کے خدوخال، ہاتھ پاؤں الٹ پلٹ کر دیکھنے میں محو تھا۔ بچہ بہت خوب صورت اور ننھا سا تھا۔ بالکل جاندار گڈا سا معلوم ہوتا۔

زینب سر پر آ کھڑی ہوئی۔ وہ اس کی موجودگی میں وہاں سے کھسک جانا چاہتا تھا۔ کہ تاجو آدھمکی۔ آتے ہی اس نے بڑی بے تکلفی سے فضل کے کندھے پر تھپڑ مارا "اور ——— تو آ گیا فضلو ——— سچ سچ اس دفعہ تو تیری مشین ہی نکلی"

تاجو بڑی بے تکلف عورت تھی۔ وہ ہر مرد کے ساتھ قہقہوں میں کی بلند کرتی ہوئی اس بے تکلفی سے گفتگو کیا کرتی۔ فضل کو اس کی یہ حرکت

ہٹ گیا کرتی تھی آج بھی تاج بیگ کے چہرے پر اس کا پہلا احساس نہ تھا تو پھر اگر
خیر ان کے ڈر سے خفا اٹھانے لگا۔ تاج نے لیک اور چہرے کے اس کے
کندھے پر سید کیا۔ فضل میں تو خدا باہر۔ گاؤں بھر میں چرچا ہے شیخنی تلخ
کا کل کوئی سی حرکت نہ تھی جو نہ آتی ہو یہاں تو وہ بے حد مسرور و محظوظ ہو رہا
تھا۔ اس کی لوسلا بھی تھیر پا پر سے بھاگی ہوئی آئی اور اس سے لپٹ گئی
"بابا ——— بھائی ———" اس کی چمکیلی آنکھوں میں بے پناہ خوشی ناچ رہی
تھی۔ فضل کو یہ پورا مسرت سے رقص کرتی ہوئی محسوس ہونے لگی ———

رات وہ جلد ہی گھر واپس لوٹ آیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی
نگاہ اٹھی تڑپ والی چیخ کے ساتھ لٹکی ہوئی لالٹین پر پڑی۔ جو سسک
سسک کر ٹمٹما رہی تھی۔ جلدی سے بڑھ کر اس نے بتی اونچی کی۔ لالٹین ہلا کر دیکھی
تو تیل ختم ہو رہا تھا۔ خدیجہ اور بچے گہری نیند سو رہے تھے۔ بوتل پکڑ کر تیل ڈالتے
ہوئے، لالٹین ہاتھ میں لئے وہ کھانا لینے کے لئے باہر چولہے کی طرف چل دیا

سوئی ہوئی خدیجہ کو تو جگانے کے لئے اس کی طبیعت میں شاید
ہی آمادگی پیدا ہوا کرتی تھی۔ بیشتر خدیجہ پر خشکی و خفگی کا جذبہ طاری رہا کرتا۔
بظاہر اس کی کوئی وجہ بھی نہ ہو سکتی تھی۔ گاؤں میں وہ ایک اچھا کھاتا پیتا۔
انسان تھا۔ سیدھا سادھا سا جان توڑ کر کمانے والا آدمی۔ برسوں اولاد نہ
ہو سکی۔ ان دنوں وہ زندگی میں خلا محسوس کیا کرتا تھا پھر بھی ہزاروں مخلوق کو اپنے
سے نچلے درجہ میں پا کر مطمئن رہا کرتا۔ خدیجہ کی حالت اس سے بالکل مختلف تھی
زندگی اس کے لئے بے معنی اور دنیا بے رنگ بن کر رہ گئی۔ کسی کا بچہ پیدا ہوتا
وہ سنا کرتی تو کڑھ کر رہ جاتی۔ کبھی کمرے میں بیٹھی آنسو بہایا کرتی۔ برسوں کے بعد
جب اس کا لڑکا لطیف پیدا ہوا تو فضل کی دنیا چمک اٹھی۔ دوسرے برس صغرا
پیدا ہوئی اور تیسرے برس صدیق۔ خدیجہ کی صحت پر کافی گہرے اثرات پڑے
ادھر بچوں کا سلسلہ پھر رک گیا۔ دنیا اس کے لئے رنگین نہ بن سکی۔ حالات
کی اس رفتار میں گوناگوں احساسات اسے پھر مطمئن رکھتے۔ فضل مطمئن و مسرور
تھا۔ اس کی زندگی کا خلا پر ہو چکا تھا۔ اسے اکثر اپنی پھوپھی کا خیال آ جایا کرتا جو
ہزاروں نوکروں اور دھرتی کے علاوہ مال کے باوجود بھی صاحب اولاد نہ بن
سکی تھی۔ آٹھ برس بعد لیکن اندھے [illegible] کی بالکل غیر متوقع پیدائش پر اسکی خوشی
کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

زینب کے بیس [illegible] کے پاس سے [illegible] بھی جاتی

لیکن دن بھر محنت کی تھکن سے وہ آنکھ جھپکی کہ گھبرا
احساس تھا کہیں کم زور ہے کبھی کسی صفت کو ابھی کیا ہیں پھوڑا ہو
فضل نے اطمینان دلایا "بچی رات کو چلی جایا کریں پھر میں جلد
گھر آ گیا کروں گا" تو اس رات وہ کام کاج نمٹا کر عشاء سے پہلے چلی گئی۔

سونے کے لئے وہ چارپائی کی طرف بڑھا ہی تھا کہ صغرا
نے کراہ کر ہچکیاں لیتے "بابا ——— بابا ——— دیکھو ——— بھیا ———"
ہاتھ سے دبائے ہوئے وہ دہرا ہونے لگا "ہائے ——— امی"
گھبرا کر اس نے خدیجہ کو جھنجھوڑ دیا۔ وہ کسمسانے لگی "ہا ——— ا ———
با ——— با ——— آ ———" ہڑبڑا کر وہ اٹھی اور کوئی چارہ کرنے یا مدد
بجائے لڑکے کو گلے سے لگا کر بچوں کی طرح بسورنے اور بلکنے لگی:
"میرے لال ——— میں تیرے واری ——— ماں کی [illegible]
بے قراری پہنچے کے ضبط کا بند ٹوٹ پڑا اور وہ بے اختیاری کا
پھلانگ گیا۔ تڑپتے۔ روتے۔ بلبلاتے۔ بلکتے اور کراہتے ہوئے
سے نکلے پڑتا تھا۔ خدیجہ بلک رہی تھی۔ شور و غل سے سب
ہو گئے۔ ننھا چیخنے لگا۔ لطیف سہما ہوا کھڑا تھا۔ اس کا دماغ
جسم شل ہو گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ صدیق۔
ایک بڑی ساری قے اگل ڈالی۔ خدیجہ بدحواس ہو گئی "ہائے
میرا لال ———" دوسرے ہی لمحے بچے کو پھر ابکائی آئی اور بے
بڑی قے" نقاہت سے اس کی آنکھیں باہر ابلی پڑتی تھیں۔
وہ بے سدھ ہو گیا۔ خدیجہ کے ہوش و حواس گم ہو گئے "ہا
لٹ چلی" چیختے چلاتے ہوئے اس نے پے در پے تڑپ [illegible]
پیٹ لیا اور مکوں۔ گھونسوں سے پیٹ پر حملہ کر دیا۔ کمزور
عزیزوں کی تاب نہ لا سکی۔ اور اس پر غشی سی طاری ہو گئی۔ بچہ
پڑا تھا۔ وہ ادھر نیم جان سی ہو گئی۔ چند لمحات میں یہ سب
ہو گیا کہ فضل کچھ نہ سمجھ سکا۔ [illegible] کی وجہ سمجھتا
تھے کو اس نے گود میں اٹھا لیا۔ اور بولا "چاچا [illegible]
اپنی نانی کو بلا لا" لطیف چپکے سے [illegible] اندھیری رات
گیا۔

[illegible]

ت پیدا ہو گیا تھی۔ اور وہ جیسے جیسے بھر رہے تھے ویسے ویسے لگتا تھا
ب کی ذہنی حالت بھی تھی کشمکش میں گرفتار ہو گئی۔ پھر جلدی سے سنبھل
ے میں اسے یاد آیا تھا کہ پچھلی سردیوں میں جب آدھی رات کو وہ بھی عاشق
ے چوہے کے کاٹنے کے درد سے چیخ اٹھا تھا تو حیات نے کیا کیا تھا۔ بستر چارپائی کا
ہی بکا کر [illegible] جلدی سے اس سے پہلے کہ ڈیپی پکڑی۔ ایک پیالی
ی پانی ڈال بستر جائے کی پتی ڈالی اور فضل کو کہا تھا ہر یا تو ذرا اسے ابال
ے وہ ننھا فضل کی گود میں سو رہا تھا اسے اس نے چارپائی پر لٹا دیا اور
ہی پکڑ لی۔ تو وہ منظر اور لطیف کی مدد سے خدیجہ کی غشی کو توڑنے کی
یر کرنے لگی۔

صبح کھیتوں سے ایک چکر لگا کر جب وہ گھر لوٹا۔ تو صحن میں رد
ی کرنوں میں بچھی ہوئی چارپائی پر صدیق لیٹا ہوا تھا خدیجہ اس کے پاس
ی ہوئی تھی۔ وہ ایک طرف پیڑھی بچھا کر بیٹھ گیا۔ "ہائے ——"
ریق نے سر پکڑ لیا۔ فضل کپکپا کر اٹھا۔ سید تو ز لطیف ——
ری حیات کو بلاؤ" صدیق نے لرزنے لگا۔ خدیجہ [illegible] گئی۔ زینب پریشان
و گئی۔ جعفر سے [illegible]۔ صدیق کو ر گھتے ہوئے ابکائی آئی۔ "ہائے
رے لال ——" غم کے بد حواس ہو کر سر پر گر پڑی۔ بجلی کی سی تیزی
ی طرح فضل کے ذہن میں رات کا تصور گھس گیا۔ ساتھ ہی سامنے اسے
یال آگیا جس سال [illegible] بھری فصل ابھی نہ ہو سکی تھی۔ لیکن اس کی
صل اچھی ہوئی۔ اس سال جب اچانک اس کا مرنا تا [illegible] میں مر گیا تو۔
یدہ پیچ دھاڑ مچادی۔ ساتھ اس دن خدیجہ کی یہ حرکت بڑی ناگوار
گذری تھی۔ اس نے کہا بھی تھا پیچھے —— یہاں نہیں کیا کرتے ——
پھر عورتیں باکٹی ہو گئیں اور اسے کہ [illegible] غصے سے کہا تھا جو وہ
بڑی سے آگے [illegible] کو دھکیل دیا۔ پھر ان سے کہے
کی طرح [illegible] بات بات پر سے
لتی ہے [illegible]
مر گئی نہیں۔

[illegible]
[illegible]
[illegible]

سب تیرا لال —— تو ملک ہم پر ہے —— حیات ابھی
لیکتا ہوا صحن والے دروازے سے داخل ہوا۔

(بقیہ مسعود عالم ندوی صفحہ ۲۵)

میں ان کے یہ الفاظ پڑھنے لگا۔ میں اپنی زندگی کے خلاف [illegible]
کر رہا ہوں" میرا ذہن مزید سوچنے کی طرف مائل ہو گیا۔ مولانا کی
ساری زندگی اس فقرہ پر گواہ ہے۔ یہاں سے گئی بلکہ مکاتب اللہ
چاہی بڑا لفظوں سے اس کی ذرہ برابر بھی نفس کے جذبات سے
نے مولانا کے دل کو پیدا کیا تھا مگر مولانا ایک ہی ان کی طرح ڈھلے رہے
میں حیران تھا کہ مولانا نے اب تک اپنی خواہشات کو کچلا تمناؤں کا گلا گھونٹا
اور زندگی کی ایک ایک دلچسپی اور رنگینی کے خلاف [illegible]
اقامت دین کی جد و جہد سے جو تقاضا کیا بغیر کسی تامل کے اس تقاضا کو
پورا کیا۔ اپنا تن من دھن تک قربان کر دیا۔

اور اب بھی اسکے دل میں یہ عزم ہے کہ میں [illegible] کروں گا
مجھے اس وقت مولانا مودودی کے وہ الفاظ یاد آ رہے تھے جو انہوں نے ایک
مضمون میں لکھے "اگر دنیا کی روانی سے لڑتے لڑتے اس کے بازو ٹوٹ جائیں
اس کے جوڑ بند ڈھیلے ہو جائیں اور پانی کی موجیں اس کو نیم جان کر کے کسی
کنارے پر پھینک دیں تب بھی اس کی روح شکست نہ کھائے" مولانا مسعود
نے جس مومن صادق کا نقشہ کھینچا ہے وہ میرے سامنے تھا۔ میں اس عظیم
شخصیت کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھ رہا تھا۔ واقعی یہ مرد مجاہد ہے جو
دوسرے روز کراچی تشریف لے گئے۔ بڑے بڑے عزائم تھے۔ عرب
ملک کا سفر۔ ہندوستان میں والدین کے نیاز حاصل کرنے کا ارادہ
پاکستان کیسے کیسے ارادے تھے۔ میں مولانا کی واپسی کا منتظر تھا ان کی وفات
کی خبر مل گئی۔ مولانا کی شخصیت ایک بار پھر ذہن میں ابھری اور ان کا یہ
فقرہ بولتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ "میں اپنی زندگی
کے خلاف [illegible] کر رہا ہوں" شاید یہ سمجھ کر یہ شخص اپنے
[illegible]
[illegible]

محشر رسول نگری •

مسلمان خاتون

دینِ فطرت میں ہی عورت کا بہت اونچا مقام ہے مسلم دیدۂ حق بیں میں اس کا احترام
اس کا منصب ہو کہ ایسی نسل اک پیدا کرے مشرق و مغرب میں حق کا بول جو بالا کرے
مغربی تہذیب لے آئی اسے بازار میں کر گئی بدنام اسکو عالمِ کردار میں
ذوقِ آزادی نے اس سے روحِ عصمت چھین لی جذبۂ تخلیقِ آدم کی حرارت چھین لی
پھر نہ "بیوی" بن سکی عورت نہ "ماں" ہی بن سکی نسل اک بھی حق پرستوں کی نہ ظالم جن سکی

اتفاقاً جو ہوئے پیدا وہ ڈاکو بن گئے
چورزانی اور چنگیز و ہلاکو بن گئے

ہاں مگر خاتونِ مسلم کی نرالی شان ہے ظلمتِ عالم میں اس کی ایک ہی پہچان ہے
مایۂ صبر و تحمل پیکرِ شرم و حیا حافظِ ناموسِ دیں آئینۂ صدق و صفا
اپنے شوہر کی رفیق و نیک خو طاعت گذار بے غرض الفت کی حامل چارہ ساز و غمگسار
اس کی غیرت پر ہے مومن کے عمل کا انحصار اس کی خودداری پہ ہے موقوف قوموں کا وقار
کفر و باطل کو زمانے سے مٹانے کے لئے آستانِ حق پہ دنیا کو جھکانے کے لئے
اپنے بچوں کو درسِ حریت دیتی ہے یہ اور نژاد نو کو ایسی تربیت دیتی ہے یہ
توڑ دیتے ہیں جواں ہو کر جو باطل کا فسوں سر جھکا دیتی ہے جن کے پاؤں پر دنیائے دوں

ماسوا اللہ کی حکومت کا نشاں رہتا نہیں
عظمتِ باطل کا کوئی آستاں رہتا نہیں

آج پھر دنیا پہ چھایا ہے نظام کافری حق سے قوت آزما ہے آدمی کی خودسری

مشرق و مغرب ہوئے ابلیس کے زیرِ نگیں — آہ باطل کو بشر باطل سمجھتا ہی نہیں
آدمیت ناچتی ہے تیغ خوں آشام پر — ظلم بھی ہوتا ہے دنیا میں تو حق کے نام پر
اک طرف سرمایہ داری کا گناہ دلفریب — اک طرف نادار کی مجبوری صبر و شکیب
اک طرف بے خانماں انسانیت کا جھونپڑا — اک طرف ایوانِ نعمت کی فضائے دلکشا
ایک جانب قوت و شوکت کے مینار بلند — اک طرف ہیں ناتوانی کے خذف نا ارجمند
خیر کو شر اور شر کو خیر سمجھا ہے جہاں — آدمیت نزع میں ہے خیر و شر کے درمیاں

کون اس مفلوج پیکر کی مسیحائی کرے
قوتِ آئینِ حق سے کارفرمائی کرے

مردِ مسلم مغربی دستور کا نخچیر ہو — یہ ابھی آزادیٔ جمہور کا نخچیر ہے
ملتِ بیضا جہاں آزاد ہے مختار ہے — اس جگہ بھی دینِ حق محکوم ہو نادار ہے

کیوں نہ ہو پھر آتشِ دوزخ کا ایندھن کائنات
تیغِ چنگیزی سے ہو کس طرح ایمن کائنات

دورِ حاضر کا مسلماں حق سے کوسوں دور ہے — جسمِ اسلامی کا اک رستا ہوا ناسور ہے
یہ سیاسی طور پر مسلم ہے وہ بھی نام کا — اصل میں باغی ہے ظالم مسلکِ اسلام کا

کافر آئیں ہے یہ باطل کو مٹا سکتا نہیں
آستانِ حق پہ دنیا کو جھکا سکتا نہیں

اے مسلماں عورت اے آئندہ نسلوں کی امیں — تجھ سے وابستہ ہے اب مستقبلِ دینِ متیں
نورِ حق سے جوہرِ انسانیت کو دے جلا — ملت ایسی تربیت گاہِ امومت سے اٹھا
ماسوا اللہ کے جو ہر اک آستاں کو توڑ دے — کفر و استبداد کے سنگِ گراں کو توڑ دے

غیر کے آگے نہ پھر انسان جبیں سائی کرے
آدمیت نورِ حق سے چہرہ آرائی کرے

[illegible]

اپنا خیال اپنی تمنا اُسے

خالدہ ادیب خانم فاروقی ●

ایک خط

بہادر محترم ۔۔۔ سلام و احترام ۔۔۔ میں نے اس افسانے میں جس خیال کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے اسے پوری طرح پیش کر سکی ہوں یا نہیں اس کا اندازہ تو دوسرے ہی لگا سکتے ہیں ۔ یہ سچ ہے کہ عشقی محبت وہی ہے جو بندہ کو اپنے معبود سے ہو مگر کسی انسان کو انسان سے روحانی محبت بھی ہو سکتی ہے ایک ایسی حقیقت ہے جس کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا میرا خیال ہے کہ ایک اسلامی معاشرہ میں ایسے جذبات کی گنجائش نکل سکتی ہے بلکہ ہونی چاہیئے کیونکہ یہ ایک فطری جذبہ ہے اور اسلام دین فطرت ہے جس نے انسان کے فطری تقاضوں کو کچلا نہیں بلکہ انہیں سیدھے راستہ پر ڈالا ہے بلکہ اسلام پسند ادیب اگر دیانت سے اس جذبہ کو اپنی تخلیق میں پیش کرے تو یقیناً اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا ۔ اسے ایک صالح معاشرہ کے لئے ضرر رساں کہا جا سکتا ہے جہاں تک میں سمجھتی ہوں آپ کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا ۔۔۔ آپ اسے انفرادی تاثر نہ سمجھیں بلکہ اس میں اجتماعیت کی روح تلاش کرنے کی کوشش کریں ۔ کیونکہ مقصدی ادب میں روح اجتماعیت کو سمونے کی کوشش کی جاتی ہے ۔۔۔ اور صرف شاعری نہیں بلکہ ادیب کی روح بیان کرتی ہے ۔۔۔ والسلام ۔۔۔ آپ کی بہن خالدہ ۔

—✕—

میں نے تمہیں خوب کہ تمہاری روح کو پا لیا ہے ۔ یہ لے خلوص اور دل کی گہرائیاں تک سمجھ کر اس روح کو میں نے ٹٹولا ہے کہ پیار کیا ۔ اپنے معبود کو پہچانا جس کی جبین نیاز میں بچپنے سے تڑپ رہے ہیں ۔ جس کا دل سوز و مستی کی ملی جلی کیفیت سے سرشار ہے جس کا جذب و کیف سے لبریز ہے اور فکر میں بلندی ہے تمہارا فکر انسان کی بلندیوں وسعتوں میں بھٹکتا ہے وہاں وسعتوں میں گم نہیں ہو جاتا بلکہ ان کو چیرتا ہوا بلند و بلند تر جاتا ہے جہاں تک کہ اس نے ایک ہستی کو پا لیا اور وہاں ہستی کو جس میں تمام حسن ہے ۔ لیکن وہ کتنی عجیب کتنی دلکش ہیں ۔ ان کو دیکھنے والا سب کچھ کھو دیتا ہے سب کچھ بھول جاتا ہے حتیٰ کہ اپنی ذات کو بھی فراموش کر دیتا ہے ۔ تم نے بے اس حسن کو محسوس کر لیا ہے ۔ مگر اس طرح کہ اس کی حرارت سے خود ایک نئی حرارت حاصل کی ۔ جو تمہارے دل کو گداز بنا رہی ہے ۔ لیکن یاد رہے جلانے کے بجائے گداز ۔ ان بلندیوں کے بعد بھی تم ایک انسان ہی ہو فرشتہ نہیں ایسا انسان جس سے فرشتے بھی پیچھے ہیں ۔ جس کا قدم بہک جاتا ہے مگر گناہ پر شرمندگی کا احساس وہ احساس جس میں بے حد ندامت کا جذبہ اُبھر آتا ہے تمہاری روح کو اپنے معبود کے سامنے سرنگوں کر دیتا ہے ۔ ایسی انسانیت کی معراج ہے یہاں تم فرشتے سے بھی بلند ہو جاتے ہو کاش بلند تمہاری شریت شاد ہوتی ہے تم نے محبت کا جواب محبت سے دیا بہت ہی مختصر میں ان لفظوں میں کتنی شعریت تھی کتنی کشش تھی اور کتنا حسن تھا اس پر کیف آواز ہوری چھا گئی ۔ اور دیں اور بہت اونچے پیلوں وسعتوں پھر ہم غیر شعوری طور پر ایک نئی فضا میں پہنچ گئے مگر اس کا سبب مقصد ہے ۔ اس مقصد نے ہمیں ایک دوسرے سے قریب کر دیا ہم آہنگت نے اس قرب کو خوشی قبول کر لیا ۔ وہ شمع بن کر تم جس کے ہو گئے ۔ جیسا پہلا انسان کی سی یہ ہم حق کی پیچ بلندی کو عبور کر ہمت والے اپنے تعاون کا یقین دلا کر تم اپنے عزائم کو عمل کے لئے قوت عطا کرنے جس کے سہارے میں محبت کی چلی ہوئی منزل پر قا تمہیں وہ سہارا مل رہا تھا میں خوشی تھی کہ محبت سے تم ایک تازہ نئی زندگی عطا کی ۔ میں تمہاری محبت و شفقت کے سہارے چلتی رہی کو دور کر سکوں گی ۔ اور پھر ہم سلوک کی منزلوں کے قریب ہو گئی تھا سمجھ رہی گئی تھا ہمیں [illegible]

ت کے تحت میری باتیں ... تمہاری منصفانہ کوشش کی بڑی ضرورت
۔ ادب تحریر دست صرف ایک ہی صورت سے پوری ہو سکتی ہے۔ یعنی مذہب
بے پناہ قوت میں ایک مضبوط رشتے میں منسلک کر دے۔ تم نے دیکھے ہوئے لاتعدا
لیکن جس طریقے سے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ بڑی خوب صورتی سے نفسیاتی
ن پر بڑی قوت فیصلہ کا اظہار۔ اس کا نتیجہ بھی یہ ہوا جو تم چاہتے تھے۔ میں نے
جان میں نسوانی وقار کو برقرار رکھتے ہوئے اور اپنی انفرادیت کو بچاتے ہوئے
لے خیال کی جائیگی۔ ساتھ ہی تم کو شریفانہ طریقہ اختیار کرنے کی رائے دی
یہی کہا کہ تمہارا کوئی طرز عمل ایسا نہیں۔ اخلاقی یا سماجی اقدار کو مجروح نہ کرے۔ یہ
خواست صرف احتیاطی نقطۂ نظر سے کی تھی۔ ویسے مجھے تم پر پورا بھروسہ تھا۔
جانتی تھی کہ تم سے انشاءاللہ کوئی قابل اعتراض فعل سرزد نہیں ہوگا۔ اور اگر
خواستہ ایسا ہوا بھی تو اپنی غلطی کا احساس تمہیں جلد ہی راہ راست پر لے آئیگا مجھے
رکی پوری پوری حفاظت اور اخلاقی و سماجی اقدار کا احترام وہ کارنامہ ہے جس سے
انیت کی گردن فخر سے ہمیشہ اونچی رہیگی۔ مگر افسوس ہمارے اس بے عملی تعلق کو بھی
ں نے بالکل غلط نظروں سے دیکھا۔ انہیں ہم گناہوں کی بستی میں سرگرداں نظر
ے۔ حالانکہ یہ انکی اپنی کم نظری بلکہ کور چشمی کا بین ثبوت ہے۔ ہمارے پاکیزہ جذبات
ہوا و ہوس سے دا فراز رکھا اور اس کا دو عملی تھا۔ انہوں نے وہ کچھ کہا جو کہنے
ے قابل نہ تھا۔ ہمارے تعلق روحانی پر اتنے غلط اور پست قسم کے خیالات کا اظ
حساس وہ ضرب تھی جس نے روح کو مجروح کر دیا۔ یہ اس کاری ضرب کی تاب نہ
کی اور بری طرح تڑپنے لگی۔ یا تو لوگ اس تڑپ سے بے خبر ہیں۔ یا اگر باخبر
ہیں تو دھوکا سمجھ کر تجاہل عارفانہ کا ثبوت دے رہے ہیں۔ آہ دنیا۔ اور کئی
ظرفی کس قدر غلط قسم کے الزامات لگائے گئے ہیں۔ ہم نے کبھی مذہبی اقدار کو
رح کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ہمیشہ انہی کی حفاظت کی سامنے [illegible] روحانیت کی
کو کبھی پس پشت نہیں [illegible] کے [illegible] اظہار کی
د نہیں [illegible] کرنا نہیں چاہا
لائے [illegible] حکم کی
لات [illegible] سے [illegible] نہیں
ں تو آزاد [illegible]
اسی [illegible] نہیں
یں سمجھ [illegible]

حالت پیدا ہوجاتی ہے لیکن کیا تم مخالفت کے اس طوفان سے ڈر کر خاموش ہوجاؤ گے۔ حالانکہ اس مخالفت سے تو الٹا تمہیں اور آگے بڑھنا چاہیئے تاکہ پھر وقار فردوس کی تجدید کریں۔ والسلام۔ تمہاری شمع

باب تبصرہ

چند خطوط

* کوثر نیازی - لاہور
* ضیاء محمد ضیاء گجرات
* طالب حجازی حافظ آباد

لاہور ۶ مئی ۵۴ء

مکرمی و محترمی مرزا صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مشیر کا تازہ شمارہ ملا! اس کی ترتیب کے بارے میں کچھ باتیں ہیں۔ جنھیں عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

حصہ نظم کے بارے میں پہلے بھی کئی دفعہ لکھ چکا ہوں۔ کہ اس کا معیار بلند کرنے کی فکر فرمایئے۔ مجھے اس معاملے میں کچھ زیادہ "وعظ" کہنے کی ضرورت نہیں آپ خود جانتے ہیں کہ اگر ہمارے تہذیب ادب پیش کرنے والے جرائد میں بھی رطب ویابس بھرا ہوا ہو۔ تو اس سے وہ مخالف حلقے جن کو آپ اپنا وجود محسوس کرانا چاہتے ہیں کیا اثر لیں گے؟ "ساقی" اور "الحمرا" کے اداریوں کے جواب میں آپ کے اداریئے نوشتہ جتنے زوردار ہوتے ہیں۔ اگر نظموں کے انتخاب میں بھی آپ اسی درجے کی احتیاط برتیں۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ کمی پوری نہ ہو۔ اور اگر بفرضِ محال وقت کی کمی اور شعر سے کچھ "زیادہ" لگاؤ نہ ہونے کی وجہ سے آپ اس طرف پوری طرح متوجہ نہیں ہو سکتے۔ تو کسی ایسے رفیق کی خدمات حاصل کیجیے کہ جنھیں براہ راست شعر گوئی اور شعر فہمی سے مس ہو ـــــ تازہ شمارے میں سے حصہ نظم کی جو چند خامیاں بیک نظر مجھے محسوس ہوئی ہیں حقیقت حال بتلانے کے لئے انھیں ذیل میں درج کرتا ہوں۔

صفحہ بیس۲۰ پر رحمٰن شاد کی نظم "رات" درج ہے۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ رحمٰن شاد میں کہہ لینے کی خاصی صلاحیتیں ہیں۔ لیکن افسوس کہ مدیر حضرات کی طرف سے رہنمائی نہ ہونے کی وجہ سے ان کی زبان و بیان میں "ترقی پسندی" بری طرح سرایت کرتی چلی جا رہی ہے۔ مثال کے طور پر پہلے بند کے پہلے ہی شعر کو ملاحظہ فرمایئے۔ ؎

ظلمت شب کی مہکتی ہوئی تاریکی میں
میں نے ہنستے ہوئے تاروں کی تمنا کی تھی

اوّل تو "ظلمت شب کی تاریکی" ہی "برائے مہربانی" کی طرح ایک عجیب و غریب لفاظی ہے۔ لیکن اس پر "مہکتی" اضافے نے تو کمال ہی کر دیا ہے۔ خدا جانے شاعر صاحب کون دیس میں بستے ہیں۔ کہ جس کے اندھیروں میں بھی مہک پائی ہے ـــــ

صفحہ تیس۳۰ پر طالب حجازی صاحب کی "عشق دیۃ" درج ہے۔ جس میں لفظوں کے بے معنی مجموعے کے علاوہ کچھ نہیں۔ جذبات کے دئے بڑے ہی مبارک ہیں۔ لیکن اس وقت جبکہ ان میں شعور کا تیل ڈالا جائے۔ لیکن افسوس کہ طالب صاحب

شہیدوں کے لہو کی تابناکی رنگ لائے گی
جو ملتانی جوانوں کا سا ہو ہم میں جگر پیدا

جیسے اشعار میں اس اہم حقیقت سے صرف نظر کر کے اسلام کی کوئی خدمت انجام نہیں دی۔

غزلیات میں صفحہ ۴۷ پر عارف سہارنی کا کلام ملاحظہ ہو۔ بحر اور تلفظ کی غلطیوں کا شمار مشکل ہے۔

ع :- جب تک لہو سے جگر کے یہ آنکھ تر نہیں!

جگر کو جگر باندھنا حیرت انگیز ہے۔

ع :- راہِ حیات و سفرِ محبت تو ایک ہے!

سفر کو سفر باندھنا زبان کا منہ چڑانا نہیں تو اور کیا ہے۔

ع :- تارے نہیں، ابر نہیں، شمس و قمر نہیں!

بز بناو پہلے سے کہیں اچھا تھا، گر قاطو صاحب شعر گوئی کا شغل ہی
رہا ہیں۔

صفحہ ۳ پر ناچ کے عنوان سے نیاز یوسف زئی کی نظم ادب
نا بھونڈا مذاق ہے۔ کہ جسے پڑھ کر غریب فن شعر کی مظلومی پر رونا
۔ یہ نظم صنعت بے بحری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اور میں حیران ہوں۔
یسے پرچے میں، آپ ایسے مرتب کی موجودگی میں یہ شائع کیسے

—

"سورد ملنج، زاغ و زغن ناچ رہے ہیں" اور "سینہ بہ سینہ
بدن ناچ رہے ہیں" کے ساتھ "ارباب حل وعقد وطن ناچ
ب" اور "بازوئے گورتر میں ہے یک زوجہ سیفر" جیسے مصرعوں
یا جوڑ ہے۔ اگر آپ برا نہ مانیں۔ تو عرض کروں کہ آپ نے یہ نظم
کے اپنے قارئین کے ادبی ذوق کو کند چھری سے ذبح کیا ہے۔

انفرادی طور پر مختلف شعراء کی تخلیقات میں سے چند مضحکہ انگیز
بھی پڑھ لیجئے۔ ع

میری آباد بہاروں پہ خزاں لانے والو! (عابد گھیانوی)

بے بحر ہے اس طرح پڑھیں تو وزن ٹھیک ہوتا ہے۔ ع
"میری آباد بہاروں پہ خزاں لانے والو!"

سہ موت کی آرزو میں زندہ ہیں
زندگی کے ٹھٹھرتے نذرانے (قاسم نوری)

نے کہ یہ شعر پڑھ کر کم از کم میرا ذوق تو ٹھٹھر کے رہ گیا۔

ع ۱۔ "انا پنجابوں کے ساقی ابھی ہے!" "ہیں" ان کا
دیا جائے تو مصرعہ تب ٹھیک ہوتا ہے۔

سہ تیرے پیام کو شاید ابھی عروج نہیں
تجھ سے جہاں میں ابھی تحریک اور ٹوٹتا ہے

لنکے مسائل بھی شاید بیان کر نے والے کر سکیں لیکن اس
رتی سے نہیں۔

دوسرا حصہ افسانوں کا ہے۔ کہ جن کے متعلق مجھے اپنی معروضات
نا ہیں۔ پچھلے چند مہینوں سے "مشیر" میں کچھ ایسا تفریحی افسانوی
ز کیا جا رہا ہے۔ کہ جن میں ذہنی تخیل کا دور دورہ عمل آزاد

کم ہے۔ مثلاً آپ اسی شمارے کے دو افسانوں "کہتا ہوں سچ" اور
"پشیمانی" ہی کو لے لیجئے ان دونوں کہانیوں میں مغربی طرز کے
گھرانوں کی اس انداز سے نقشہ کشی کی گئی ہے۔ کہ بجائے ان سے متنفر
ہونے کے طبیعتیں ایسی باتوں کی طرف التفات ہوتی ہیں۔ پہلے افسانے
میں بھابی جان سے انور کا یہ مذاق کہ لنگے خاوند نے ایک اور جگہ عشق
بازی کر کے شادی کر لی ہے۔ اور دوسرے میں فرخ کا اپنی دلہن کی
شکل دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو جانے کا پلاٹ، میری سمجھ میں نہیں آ
سکا۔ کہ آپ کے قارئین کے لئے کیا مفید پہلو اپنے اندر رکھتا ہے ـــ
اور پھر مزید حیرت اس پر ہے۔ کہ یہ افسانے آپ نے دوسرے رسائل
سے بعد شکریہ نقل فرمائے ہیں۔ حالانکہ انتخاب کے لئے صالح اور پاکیزہ
ادب کا میدان کافی وسیع تھا۔

یہ چند سطور ـــ شاید مجھے اعتذار کرنے کی ضرورت نہیں
کہ میں نے نکتہ چینی کی بجائے ہمدردی کے نکتہ نظر سے سپرد قلم کی ہیں!

خاکسار:
کوثر نیازی

گجرات ۱۳ مئی

مکرمی و محترمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ

"مشیر" کا معیار روز بروز پست ہوتا جا رہا ہے۔ حصہ نظم
علی الخصوص اس پستی معیار کی واضح دلیل ہے۔ تازہ شمارے میں بعض
نظمیں تو ایسی ہیں۔ کہ جن کو پڑھ کر ذوق سلیم کو ابکائی آتی ہے۔ اور
طبیعت ایک شدید کراہت محسوس کرتی ہے۔ نظم ہمارے ہاں سے
کند چھری سے ذبح ہو رہی ہے میں اس کا دردناک منظر ایک مدت سے
دیکھ رہا ہوں۔ مجھے ان ذبح کرنے والوں پر زیادہ غصہ نہیں کہ بچارے
معذور ہیں اور شاید لکھنے پر مجبور، افسوس! اور رنج تو اس بات
کا ہے۔ کہ مدیران کرام (نادانستگی سے) شعریت سے یکسر عاری گھٹیا درجہ
کی نظموں کو بے تامل شائع کر کے اسلامی ادب کو اہل ذوق کی نظروں
سے گرا رہے ہیں۔ یہ شکایت زیادہ تر مجھے "مشیر" سے ہے۔
حالیہ شمارے میں صفحہ ۲ پر "عشق دلیتیں" صفحہ ۱۲ پر

عارف سہانی کی غزل، "مسئلہ پڑھ ناک" تو ایسی منظومات ہیں۔ جن کو پڑھ کر کوئی بامذاق آدمی اسلامی ادب کے علمبرداروں کے بارے میں اچھی رائے قائم نہیں کر سکتا۔ بلکہ یہ پڑھنے والے کو اُلٹا بیزار کر دینے والی چیزیں ہیں۔

میں ایک گدائے گوشہ نشیں ہوں۔ رموزِ مملکتِ خسرواں میں دخل اندازی میرا حق نہیں۔ لیکن مذکورہ بالا آخری دو نظموں میں زبان اور فن کا اس بے دردی سے قتل ہوا ہے۔ کہ میں آپ کو لکھے بغیر نہ رہ سکا۔

امید ہے کہ آپ کو یہ سطور ناگوار نہ گزریں گی اور آپ آئندہ سے حصۂ نظم کا صحیح انتخاب پیش فرما کر پرچے کا معیار قائم کرنے کی کوشش کریں گے —— والسلام

مخلص :۔ ضیا احمد

حافظ آباد ۱۱ مئی ۵۲ء

محترمی! سلام مسنون

"مشیر" کے تازہ شمارے میں فضل من اللہ کا مضمون "اسلامی ادب" زیر مطالعہ آیا۔ جو فکری مغز اور بہت کم اور قدرے علمی اور زیادہ فلسفیانہ تھا۔ حالانکہ اس موضوع پر شگفتہ اور حسین پیرایۂ بیان اختیار کرنا چاہیئے اور پھر اس مضمون میں ترقی پسند ادب کی تنظیم اور ترقی پسند اُدبا کا بھی تعارف کرایا گیا ہے۔ ادب برائے ادب اور ادب برائے لذت کے علمبرداروں کا تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔ لیکن صرف اسلام پسند اُدبا ہی کو قلم انداز کیا گیا ہے۔ مودودی صاحب، صلاحی صاحب اور عزیز صاحب فکری اور علمی شخصیتیں ہیں ادبی نہیں۔ ادبی اعتبار سے نعیم صدیقی صاحب، عاصی ضیائی صاحب، ماہر صاحب، اسعد گیلانی صاحب وغیرہم کا تعارفی ذکر ہونا چاہیئے تھا۔ اور تو اور اسلام پسند اُدبا کی واحد ادبی تنظیم حلقۂ ادب اسلامی تک کو نظر انداز کر دیا گیا ہے معلوم نہیں کہ فاضل مقالہ نگار نے "ترقی پسند مصنفین" "ارباب ذوق" "ارباب علم" وغیرہ کی انجمنوں کا تعارف تو کرا دیا اور نمایاں طور پر کر بھی گیا ہے۔ مگر حلقۂ ادب اسلامی کا ذکر تک کرنا کیوں نہ مناسب تصور کیا۔ آج جبکہ ان افکار و نظریات اور باطل ادب کا مقابلہ کرنے کے لئے ناگزیر ہے کہ تحریک ادب اسلامی کو کافی حد تک ابھارا جائے۔ اور اسلام پسند اُدبا کی تخلیقات پر بہت زیادہ توجہ دی جائے۔ امید ہے کہ میری گزارشات سے فاضل مقالہ نگار ناراض نہیں ہوئے ہوں گے۔ والسلام

نیاز مند:۔ طالب ہاشمی

ناظم حلقۂ ادب اسلامی (حافظ آباد)

اعتذار

گزشتہ شمارے میں جناب فیروز نظر صاحب کی غز[ل کے ایک] مصرعہ میں کتابت کی وجہ سے غلطی ہو گئی ہے۔ قارئین کرا[م] [illegible] لیں ——

غلط —— اب اور کیا ملے گا قرطا کا ثمر مجھے

صحیح —— اب اور کیا ملے گا وفا کا ثمر مجھے

(ایڈیٹر)

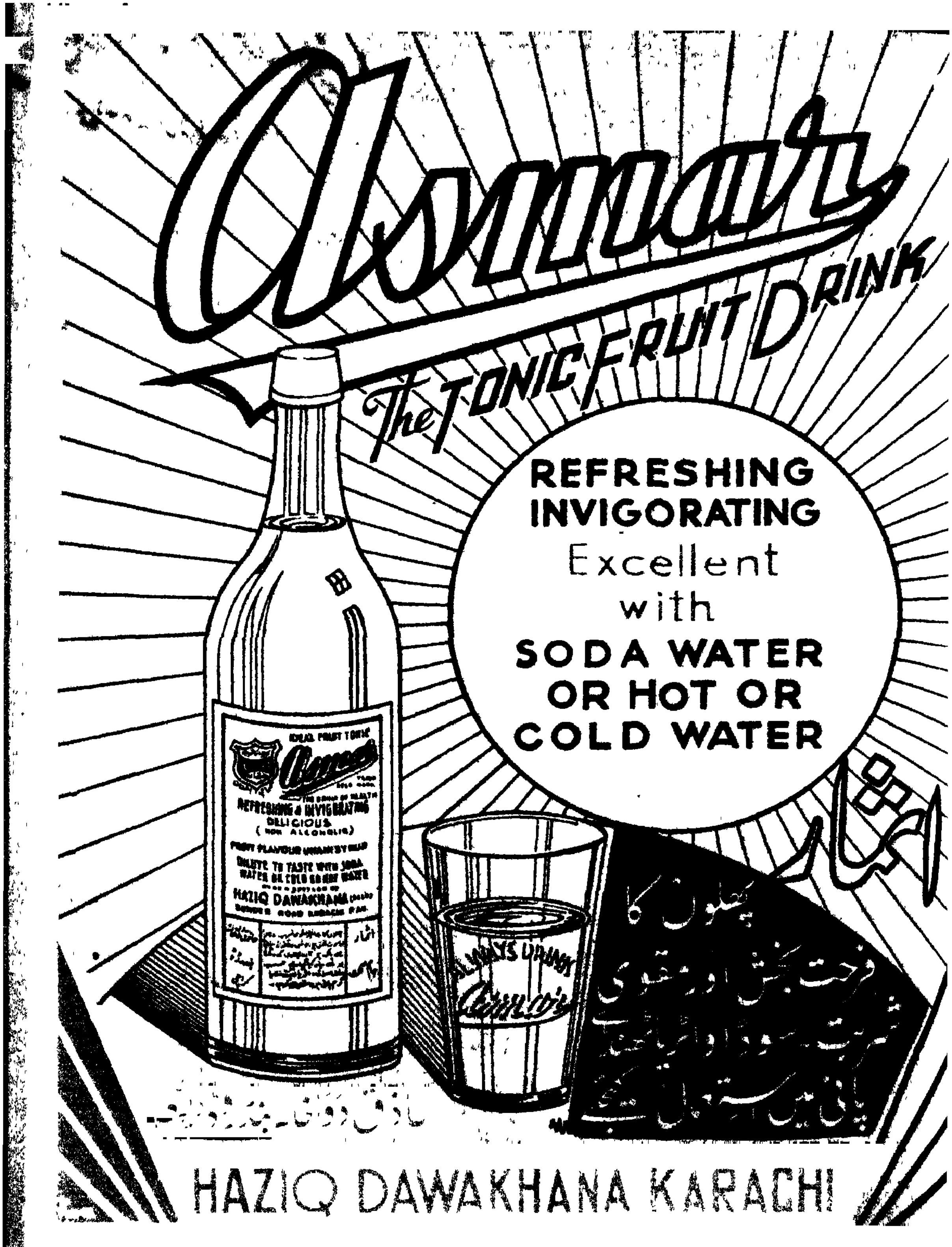
ایک گزارش

"مشیر" کے اہل قلم اور ادیب حضرات سے گزارش [ہے کہ] اپنی نگارشات روانہ فرماتے وقت ان پر اپنا نام اور پتہ [تحریر] کریں۔ بغیر نام و پتہ کے کوئی نگارش قابل قبول نہ ہوگی۔ علاوہ ازیں مسودات کو صاف اور خوشخط بھی لکھا [کریں] فرمائیں —— (ایڈیٹر)

التماس!

مشیر [illegible]

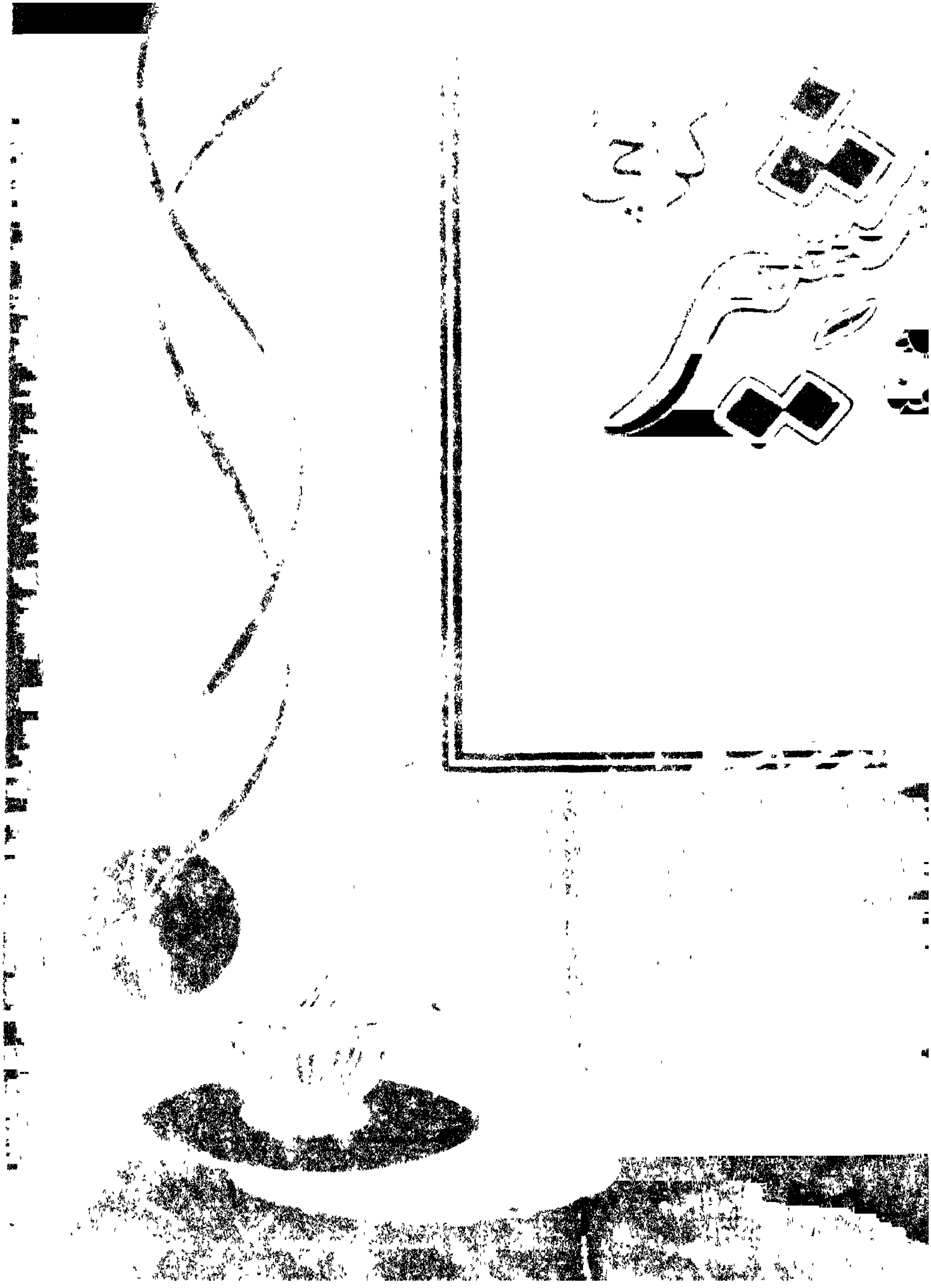
[illegible] (ایڈیٹر)


Asmar
The Tonic Fruit Drink
REFRESHING
INVIGORATING
Excellent
with
SODA WATER
OR HOT OR
COLD WATER
HAZIQ DAWAKHANA KARACHI

Monthly "MUSHIR"

قیمت فی سیشی -/۲/۱۲

Title P uted at Royal Printing Press, Karachi.




The TONIC FRUIT DRINK
REFRESHING
INVIGORATING
Excellent
with
SODA WATER
OR HOT OR
COLD WATER
ALWAYS DRINK
HAZIQ DAWAKHANA KARACHI

پاکستان کے ساتویں جشن آزادی کے موقعہ پر
قارئین مشیر کی خدمت میں ادارہ مشیر کا

هدیۂ تبریک

نیرنگیٔ فریبِ بہاراں نہ پوچھئے!
غنچے مآل کارِ گلستاں پہ رو دیئے

(ثاقب کانپوری)

پاکیزہ اور صالح ادب کا علمبردار

ماہنامہ مُشیر کراچی

ٹیلی فون : ۷۹۲۳

جلد : ۵
شمارہ : ۸
اگست ۱۹۵۴ء

بدل اشتراک :-
پاکستان : سالانہ : تین روپے
" : فی پرچہ : چھ آنے
بھارت : سالانہ : ساڑھے چار روپے
" : فی پرچہ : آٹھ آنے

مرتبہ
عبدالغفور بیگ

طابع و ناشر : عبدالغفور بیگ ۔ مطبوعہ مشہور پریس کراچی
مقام اشاعت : [illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایک غلط فہمی کا ازالہ!

ماہنامہ الحمراء لاہور نے اپنی جولائی ۵۴ء کی اشاعت میں 'مشیر' کے مارچ ۵۴ء کے شمارہ کا مقالہ افتتاحیہ جس کا عنوان ' اگر ہوتے ' تھا۔ حوالہ کے ساتھ نقل کیا ہے جس کے لئے ہم الحمراء کے فاضل مدیر کے بیحد ممنون ہیں۔ مدیر موصوف نے اس کے ساتھ مندرجہ ذیل ادارتی نوٹ بھی شائع فرمایا ہے۔

"گزشتہ مہینے یہی صفحات ہم نے پاکستان کی سرکاری زبان کے متعلق جناب رئیس احمد جعفری کے خیالات کی اشاعت کے لئے وقف کئے تھے۔ اور اس باب میں ان کا ایک مضمون معاصر "ریاض کراچی" سے نقل کیا تھا۔ ذیل کا مضمون کراچی ہی کے ایک دوسرے معاصر "مشیر" کی ایک گزشتہ اشاعت (مارچ ۵۴ء) سے نقل کیا جاتا ہے۔ اسے ہم بہت پہلے شائع کرنا چاہتے تھے۔ مگر قلت گنجائش اب تک مانع رہی۔ ایسے مضامین کی ہر شق سے "الحمراء" کا متفق ہونا لازم نہ سمجھنا چاہیئے۔ اس سے اتفاق غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اس میں قطعاً کوئی شک نہیں۔ کہ ان مضامین کے مقاصد کے جزو اعظم سے یا "الحمراء" متفق اور انہیں ان خیالات سے خاص طور سے قابل لحاظ سمجھتا ہے۔ "مشیر"، "جماعت اسلامی" کا ترجمان ہے بعض دیگر امور کے علاوہ معاصر نے حضرت قائد اعظم، لیاقت علی خاں شہید اور الحاج ناظم الدین کے متعلق صراحتاً یا بین السطور میں جن فہیمانہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ہم ان سے پوری طرح متفق ہیں لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کہ اگر اس مخلص جماعت کے غیر مآل اندیش رہنما ابتدا ہی سے ان تینوں جلیل القدر قائدین پاکستان و علمبرداران اسلام کی راہ میں مشکلات پیدا کرنے کی کوشش نہ کرتے بلکہ ان سے تعاون کرتے تو نہ قانون اسلامی کے نفاذ میں اتنی تاخیر ہوتی اور نہ خود یہ جماعت سیاسی اقتدار سے جس کے یہ رہنما بہ شدت آرزو مند ہیں۔ آج تک اس قدر محروم رہتی! "الحمراء" خواجہ ناظم الدین کے عہد کے ان خود غرض، پاکستان دشمن، شورش پسند اور ملون گرگٹوں کا ہمدرد بھی نہیں بن سکتا جنہوں نے بھولے بھالے معصوم عوام کو اپنے دجل، بداندیشی اور دسیسہ کاری کا شکار بنا کر گوناگوں مصائب میں مبتلا کر دیا۔"

ادارتی نوٹ کے مندرجہ بالا مندرجات سے "مشیر" کے متعلق ایک غلط فہمی پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے جس کا ازالہ ہم ضروری سمجھتے ہیں۔ مندرجہ ذیل چند سطور لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

الحمراء کے فاضل مدیر نے اپنے متذکرہ بالا ادارتی نوٹ میں جہاں ہمارے اس مضمون کے جزو اعظم سے اتفاق فرما کر اور اسے قابل لحاظ قرار دے کر ہمیں تشکر کا موقع عطا فرمایا ہے۔ وہاں ماہنامہ "مشیر" کو جماعت اسلامی کا ترجمان قرار دے کر ہمارے لئے وجہ شکایت بھی پیدا کر دی ہے۔ موصوف کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ان کا یہ حسن ظن کہ "مشیر" جماعت اسلامی کا ترجمان ہے ایک سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے۔ "مشیر" راقم الحروف کا اخباری پرچہ ہے۔ جس کا جماعت اسلامی سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی راقم الحروف جماعت اسلامی کا رکن ہے۔ جماعت کا رکن ہونا تو بہت بلند چیز ہے۔ بدقسمتی سے راقم الحروف کا نام جماعت اسلامی کے "حلقہ ہمدرداں" یا "حلقہ متفقین" میں

کی فہرست میں بھی درج نہیں ہے۔ اس صورت میں الحمرا کے فاضل مدیر کا بلا تحقیق یہ کہدینا کہ "مشیر" جماعت اسلامی کا "ترجمان خاص" ہے۔ ایک بے جا ستم کی جسارت ہے۔ جو ان کے شایان شان نہیں۔ ان کی یہ جسارت "مشیر" یا راقم الحروف پر تو نہیں مگر جماعت اسلامی پر ایک بہت بڑا اتہام ہے جس کے لئے اخلاقی اور صحافتی دیانت داری کے پیش نظر انہیں جماعت اسلامی سے معذرت کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اس غلط فہمی کی بنا پر "مشیر" کے بہت سے مندرجات کا جماعت اسلامی کی ترجمانی قرار پاجانے کا احتمال ہے۔ جو اس جماعت پر سراسر زیادتی ہے اور ہمیں امید ہے کہ ہماری اس تحریری تصریح کے بعد مدیر موصوف کا اخلاقی احساس انہیں اسکی تردید اور اس غلط فہمی کے پیدا ہوجانے کیلئے اس کی معذرت اپنی قریبی اشاعت میں شائع کرنے پر مجبور کر دے گا۔

یہ ہوسکتا ہے (اور بڑی حد تک یہ صحیح بھی ہے) کہ ادارہ "مشیر" کو جماعت اسلامی کے نظریات کے جزو اعظم سے اتفاق ہو۔ اور وہ انہیں قابل لحاظ بھی سمجھتا ہو۔ مثلاً پاکستان کو احیا اسلام کے لئے ایک تجربہ گاہ سمجھنا ——— دستور پاکستان کی اسلامی اقدار پر تدوین — پاکستان میں نظام اسلامی کے نفاذ کے لئے آئینی جدوجہد — یا پاکستان میں ایک امین، دیانت دار اور اہل سیاسی قیادت کو برسر اقتدار لانے کے لئے جمہوری کوششیں — علیٰ ہٰذالقیاس — مگر کسی گروہ، جماعت یا ادارہ کے نظریات کے جزو اعظم سے اتفاق کرنے والے کو اس گروہ، جماعت یا ادارے کی ترجمانی کا حق ہرگز نہیں پہنچ سکتا۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے۔ جیسے الحمرا کے فاضل مدیر کو ہمارے مضمون کے جزو اعظم سے اتفاق اور اسے قابل لحاظ گردانتے کے باوجود بھی "مشیر" کی ترجمانی کا حق حاصل نہیں ہوسکتا۔ پھر کسی جماعت کے چند افراد کیساتھ کسی واحد فرد یا ادارہ کے ذاتی تعلقات و مراسم بھی اسے اس جماعت کی ترجمانی کا حق نہیں بخش سکتے۔ مثلاً مولانا مودودی صاحب، مولانا امین احسن اصلاحی صاحب، نعیم صدیقی صاحب یا چوہدری غلام محمد صاحب مالک چراغ راہ کیساتھ راقم الحروف کے واجبی سے ذاتی تعلقات یا مراسم اسے جماعت اسلامی کی ترجمانی کا حق نہیں دے سکتے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ مدیر الحمرا کے جناب رازق الخیری صاحب مدیر عصمت کراچی کیساتھ گہرے ذاتی تعلقات اور مراسم ہوتے ہوئے بھی انہیں ادارہ عصمت کی ترجمانی کا حق نہیں مل سکتا۔

ان تصریحات کے بعد الحمرا کے فاضل مدیر سوچیں کہ "مشیر" کو غلط طور پر جماعت اسلامی کا ترجمان فرض کرکے انکا "اس مخلص جماعت کے غیر مآل اندیش رہنماؤں" پر اس غیر مآل اندیشانہ طور پر برس پڑنا کس حد تک مآل اندیشانہ ہوسکتا ہے۔ "مشیر" کا مضمون جو انھوں نے نقل فرمایا ہے اور جس پر انہیں یہ ادارتی نوٹ تحریر فرمانے کی زحمت گوارا فرمانی پڑی اس میں جماعت اسلامی کا نام اور اسکا ذکر تک موجود نہیں تھا۔ ان دیں حالات ہم مدیر موصوف کی اس ذہنی افتاد کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ کہ ایک ایسے مضمون کے ضمن میں جسمیں صرف اردو اور بنگالی کے جھگڑے کے سیاسی پس منظر پر اشارتاً گفتگو کی گئی ہو۔ وہ جماعت اسلامی کو کوسنے بیٹھ جائیں۔ اس قسم کی ذہنی افتاد کا مظاہرہ وہ اس سے پہلے بھی کوثر نیازی صاحب کی ترتیب "منتخب نظمیں" پر تنقید و تبصرہ کے سلسلہ میں فرما چکے ہیں۔ اگر جماعت اسلامی سے انکا اختلاف بغض و عناد کی اس حد تک پہنچ چکا ہوا ہے۔ تو اسکا مظاہرہ کرنیکے لئے سیدھا سادہ طریقہ یہ ہے کہ جماعت کا لٹریچر جو کثیر تعداد میں دستیاب ہے لیکر اس پر — جماعت کے نظریات پر — اسکے طریقہ کار پر — یا اسکے رہنماؤں کی عملی زندگی پر — براہ راست تنقید کریں اور اپنے اختلافات کا جسقدر بھی تند، جذباتی انداز میں اظہار فرماسکتے ہوں فرمائیں۔ انکے اس شغل میں کوئی رکاوٹ سدراہ نہیں بن سکتی ——— ! جماعت اسلامی کے نظریات سے اختلاف رائے رکھنا اور اسکی کمزوریوں اور کوتاہیوں کو سامنے لانا اس پر مخلصانہ اور معقول مخالفانہ اظہار رائے کوئی بری بات نہیں مگر تنقید اور اختلاف کا اظہار معقول اور دلائل پر مبنی ہونا چاہیئے لیکن یہ معقولیت کی کونسی سطح ہے۔ جس پر کھڑے ہوکر ایک صحافی جو ادیب بھی ہو۔ جب تنقیدی نوٹ لکھے تو صحافتی احتیاط اور ادبی ذمہ داریوں کو بالائے طاق رکھکر غیر متعلقہ مضامین اور تحریروں کی آڑ میں اپنے جذبۂ عناد کی تشنہ لبی کو سیراب کرنے کیلئے اپنے مخالفین کو بے نقط سنانی شروع کردے ×

عبدالغفور بیگ

فضا جالندھری

وشیار اے دلِ ناکام کہ ہے شام ابھی
نگ لائے گی بہت گردشِ ایام ابھی

شہ دل میں تمنائیں جو تھیں چونک اٹھیں
چپکے چپکے سے لیا کس نے مرا نام ابھی

د ہے یاد ہے وہ دلکشیِ بزمِ الست
گونجتا ہے ترا رنگین وہ پیغام ابھی

ں پردہ ہی رہے عشوۂ آغازِ شباب
یوں نہ آراستہ ہو تو سحر و شام ابھی

ومرِ تیرگیِ بخت پہ ہنسنے والے
تو نے دیکھی ہی نہیں گردشِ ایام ابھی

طف فرمادہ سہی، محوِ تغافل نہ سہی
مجھ کو ہے شکوۂ محرومیِ پیغام ابھی

رے جلووں سے ہے رنگین مری صبحِ امید
ترے گیسو سے مہکتی ہے مری شام ابھی

گو ہوں آغازِ محبت ہی سے مجروحِ الم
اپنے دل میں ہے فضا کاوشِ انجام ابھی

مظہر القادری

سوچ میں ہے نگہِ ساقیِ گلفام ابھی
اہلِ محفل نہیں شائستۂ پیغام ابھی

منزلِ دوست نہیں رہگزرِ عام ابھی
سیر کرنے کو نہ آئیں سحر و شام ابھی

اسی رستے سے گیا ہے بتِ خودکام ابھی
میں نے دیکھی تھی یہیں گردشِ ایام ابھی

لطفِ صیاد پہ اترائیں نہ اربابِ چمن
مجھ کو آتا ہے نظر سلسلۂ دام ابھی

عشق وارفتہ و بیتاب، زمانہ بے ذوق
حسن پر آ نہ سکے گا کوئی الزام ابھی

صبح کے وقت ہوا تھا کوئی مجھ سے رخصت
گونجتا ہے مرے کانوں میں وہ کہرام ابھی

زینتِ منبر و محراب نظر آتے ہیں
فکرِ انساں کے تراشے ہوئے اصنام ابھی

دل کا اصرار کہ چل کوچۂ جاناں کی طرف
ہاں اسی وقت ابھی، ماہرِ بدنام ابھی

ابوالمجاہد زاہد

○

قفس سے چھٹنے پہ شاد تھے ہم کہ لذّت زندگی ملے گی
یہ کیا خبر تھی بہارِ گلشن لہو میں ڈوبی ہوئی ملے گی

جن اہلِ ہمت کے راستوں میں بچھائے جاتے ہیں آج کانٹے
انہیں کے خون جگر سے رنگیں چمن کی ہر اک کلی ملے گی

وہ دن بھی تھے جب اندھیری راتوں میں بھی قدم راہ راست پر تھے
اور آج جب روشنی ملی ہے تو زیست بھٹکی ہوئی ملے گی

نئی سحر کے حسین سورج! تجھے غریبوں سے واسطہ کیا
جہاں اُجالا ہے سیم و زر کا وہیں تری روشنی ملے گی

کبھی تو نسل و وطن پرستی کی تیرگی کو شکست ہوگی!
کبھی تو شام الم ہٹے گی، کبھی تو صبح خوشی ملے گی

وہ ہم نہیں ہیں کہ صرف اپنے ہی گھر میں شمعیں جلا کے بیٹھیں
وہاں وہاں روشنی کریں گے جہاں جہاں تیرگی ملے گی

تلاشِ منزل کا عزم محکم دلیلِ منزل رسی ہے زاہد
قدم تو اپنے بڑھاؤ آگے کھلی ہوئی راہ بھی ملے گی!

عاصی ضیائی رامپوری

تنقید اور نقّاد کی ذمہ داریاں

ایک زندہ ادب کی سب سے بڑی ضمانت اس کے تنقیدی حصہ کا جاندار اور باوزن ہونا ہے اور تنقیدی حصہ اسی وقت جاندار اور باوزن ہو سکتا ہے جب نقادوں کا ادبی ذوق ستھرا اور نفیس ہو۔ ہمارے قدیم ادب کے مسلسل انحطاط کا سبب یقیناً معاشرے کے اخلاقی زوال کے بعد صحیح تنقیدی معیار کا نہ ہونا تھا۔ تقلید پرستی نے تنقید کے دائرے کو اسی طرح بے لچک اور محدود رکھا جس طرح اخلاف نے اپنے اسلاف کو ورثہ میں پایا تھا۔ ان کے لئے کسی غزل میں زبان کی فصاحت، لطیف لفظی کا چٹخارا، تخیل کی بلند پروازی، مضمون کی جدت یہی اور ایسی ہی دو تین چیزیں اس غزل کو معیاری اور غزل گو کو چوٹی کا استاد قرار دینے کے لئے کافی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ میر، سودا، مصحفی وغیرہ جیسے شاعروں کے بعد ان اصول نقد پر پورے اترنے والے بہت سے استاد اردو شاعری میں ملتے ہیں جنہیں سچی اور فطری شاعری سے بہت کم سروکار ہے۔

اب اگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ صالح تعمیری ادیب ان لوگوں کی طرح فن پر قانع ہو کر بیٹھ جائیں بلکہ ہماری دلی خواہش ہے کہ ادب میں ایک صالح انقلاب لائیں تو اپنا تنقیدی معیار ہمیں ضرور بلند کرنا ہوگا۔ ہمارے نقادوں کے لئے مذاق تنقید کے ساتھ ساتھ فن تنقید کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ آج کی صحبت میں میں کسی قدر تفصیل سے نقاد کے فرائض پر بحث کرنی چاہتا ہوں۔ یہ موضوع عموماً تشنہ رہتا ہے کیونکہ بیشتر لکھنے والے تنقید نگار کی جگہ تنقید کی تعریف اور اس کے حدود پر بحث کرنے لگتے ہیں جس کے معنی دوسرے الفاظ میں خود ادب کی تعریف و تحدید کے ہیں اور اس طرح نقاد کا موقف یا تو تنقید اور ادب کی بحثوں میں گم ہو جاتا ہے یا اگر کوئی اس پر براہ راست کچھ لکھتا بھی ہے [illegible] نقطۂ نظر سے بحث کر کے خود بھی غلط نظریہ قائم کرتا ہے اور پڑھنے والے کے لئے نقاد کا موقف غلط اور بعید از قیاس بنا دیتا ہے۔

تنقید کی تعریف

یہ تو ظاہر ہے کہ تنقید کا مقصد علم و فن کا جائزہ لینا ہے۔ لہٰذا علم و فن کی جو تعریف کی جائے گی وہی تعریف تنقید کی بھی قرار پائے گی۔ لیکن چونکہ فن کی جامع و مانع تعریف آج تک نہ ہو سکی۔ اس لئے تنقید کی تعریف بھی نہیں ہو سکتی۔ لیکن یوں دیکھا جائے تو تنقید بھی ویسا ہی ایک فن (یا علم) ہے جیسا انسانی تاریخ۔ تاریخ کا کام ہے انسان کے گزشتہ کارناموں کی حفاظت کرنا۔ ان کا جائزہ لے کر بعض اخلاقی اصولوں کی روشنی میں ان کے حسن و قبح کا حکم لگانا اور پچھلے تجربوں کے پیش نظر آئندہ انسانی لائحہ عمل کے لئے موٹی موٹی نشاندہی کرنا۔ اس سے زیادہ تاریخ کے بس میں نہیں۔ نہ اس سے کم کی اس سے توقع کی جاتی ہے۔ اسی طرح تنقید بھی ادبیات گزشتہ کا ریکارڈ، ان کے حسن و قبح پر تبصرہ اور جائزہ اور آئندہ کے لئے ادبی اصولوں کی تعیین کا کام ہے۔ اور جس طرح تاریخ کا مجرد علم کسی نئے انسانی معاشرے کی بنیاد ڈالنے یا بنیادی اصول پیش کرنے کے لئے ناکافی ہے اسی طرح تنقید کے دائرہ کار سے باہر ہے کہ فن میں نئے تجربات کی راہ کھولے۔ یہ کام فنکار کا ہے۔ وہی ہمیشہ سے فن میں نئے تجربات کرتا آیا ہے۔

نقّاد کا مقام

جو لوگ تنقید کو ایک خاص سائنس علم یا فن کا فیصلہ سمجھتے ہیں وہ اس موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کر پاتے۔ یہ موضوع اتنا معروضی نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں نقاد کا کام ہی جذبات انسانی کا ادب سے تعلق متعین کرنا ہے تو نقاد کے عمل کو معروضی کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایک نقاد کے لئے ضروری نہیں کہ وہ کسی فن پارے پر اپنی رائے کا اظہار کرنے میں اپنے جذبات شامل نہ کرے۔ وہ جس وقت ایک شاعر کی نظم پر کوئی حکم لگائے گا تو اس کی رائے کا ایک حصہ ضرور

یہ دوسری بات ہے کہ خواہ اس کا ذہن شعوری یا لاشعوری طور پر اس کے ماقبل کے تمام یا بیشتر تنقیدی معیاروں سے جو اس کی سوسائٹی میں مروج ہوں استفادہ کر چکا ہو۔

نقاد کی تنقید خواہ شعوری طور پر اس کی اپنی رائے ہو لیکن شعوری طور پر وہ دراصل اپنے معاشرے کے ذوق کی ترجمانی ہی کر رہا ہوتا ہے۔ اور وہ جتنا زیادہ اپنے معاشرے میں جذب ہو چکا ہوتا ہے اتنا ہی وہ اس کے ذوق کی بہتر ترجمانی کر سکتا ہے۔

لیکن نقاد کا کام صرف اپنے معاشرے کی ترجمانی کرنا ہی نہیں ایک عظیم تر نقاد معاشرے کے نفسِ حسن کے ذوقِ جمال کے ارتقاء کا سامان بھی مہیا کرتا ہے اور اس کو ہر وقت پہلے سے زیادہ سنوارنے میں گذارتا ہے وہ صرف یہی نہیں بتاتا کہ ایک شاعر کے کلام میں کیا ہے کیا نہیں بلکہ یہ بھی کہ کیا ہونا چاہیے تھا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ کیا ہو سکتا تھا لیکن یہ مقام ہے جہاں ایک زوال پذیر قوم کے نقاد بار نہیں پا سکتے۔ یہ لوگ خود اپنی قوم کے ساتھ مسلسل پستی اور جمود کی طرف جا رہے ہوتے ہیں۔ تو بھلا اس کے لئے روشنی لے کر اس کے آگے کیونکر چل سکیں گے؟ اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ نقاد کے بھی آگے چلنے والے دو ادیب، اس قوم میں کوئی انقلابی اور ٹھوس تعمیری کام کرنے کے اہل نہیں ہوتے تو پھر نقاد جس کا کام ہی ادیب کے بعد شروع ہوتا ہے کیونکر قوم کی تعمیر میں چل سکتا ہے۔۔۔۔۔

لہٰذا اگر ایک ایسے پراگندہ معاشرے میں جو اپنا مذاقِ جمال کھو چکا ہو اگر ایسے اہلِ نظر نقاد پیدا نہیں ہوتے تو کوئی تعجب نہیں لیکن مجھے ان لوگوں پر یقیناً تعجب ہے جو ایک رشتہ میں منسلک ہونے کے باوجود۔۔ ذوقِ جمال میں اپنے معاشرے کے انتشار کی نمائندگی کرتے ہیں۔ میں اس بات کا بہت کم قائل ہوں کہ ہر شخص کا ذوق جداگانہ ہوتا ہے۔ اگر یہ بات ہوتی تو انسان کے لئے اجتماعی زندگی گزارنا ناممکن ہو جاتا۔ دراصل ذوقِ جمال بھی میرے خیال میں بالکل اسی طرح اجتماعی جس طرح احساس اخلاق ایک معاشرہ جس طرح اپنا اخلاقی مزاج رکھتا ہے اسی طرح جمالیاتی شعور بھی بلکہ بقول رشید احمد صدیقی اخلاقیات اور جمالیات میں براہِ راست ربط ہے۔ یہاں تک کہ کوئی نامعقول شخص معقول شاعر نہیں ہو سکتا۔

تعمیر پسند ادیبوں اور نقادوں کو یہ بات خاص طور پر ملحوظ رکھنی ... کہ جس طرح وہ ایک بگڑی ہوئی سوسائٹی کو عملاً منظم متحد ہو کر نظم و عمل کی دعوت دینا چاہتے ہیں اسی طرح ان پر یہ فرض ہے ہے کہ وہ متحدہ شعورِ جمال کا بھی مظاہرہ کریں اور اس طرح نہ صرف ... والوں کی صحیح تربیت کریں بلکہ علم پڑھنے والوں کے ذہنوں میں مستقل جمالیاتی معیار تعمیر کریں اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ ہم پوری محنت سے مختلف قوموں اور زمانوں کے جمالیاتی پیمانوں ... کر کے اس میں سے ہر اس عنصر کو خارج کر دے جس میں جاہ ... شائبہ پایا جاتا ہو۔

تنقید کے فرائض

تنقید کے فرائض دوگونہ ہیں۔ تجزیہ ... تجزیہ میں وہ تمام عمل داخل ہیں جو نقاد ایک ادیب کے ادب پا... سے اصولِ جمالیات کے استقراء اور استخراج کی خاطر کرتا ہے۔ ... اس کی وہ نظر بھی شامل ہے جو وہ ادیب کے ذہنی پس م... ارتقاء پر ڈالتا ہے۔ تبصرہ گویا تجزیہ کا تکملہ اور یہی حصہ خود نا... تنقیدی صلاحیتوں کا امتحان ہے۔ اس میں وہ ادیب کے ... بعض مقرر شدہ اور بعض استنباط کردہ اصولوں کی روشنی ... کرتا ہے۔ اس کے وزن اور اس کی عمر کا اندازہ لگاتا ہے۔ عوا... کے اثر کی نوعیت اور بقا کا جائزہ لیتا ہے۔ اور بالآخر خود ا... کے دوسرے فن پاروں سے موازنہ کر کے اس کے ادبی ا... ہے اور دوسرے ادیبوں سے مقابلہ کر کے ادب میں اس ک... متعین کرتا ہے۔ یہ تمام گھاٹیاں نہایت دشوار گذار ہیں۔ م... ہی اس راہ سے عہدہ برآ ہونے میں معاون ہوتا ہے۔ اور ... سلیم انہی لوگوں کا حصہ ہے جن کا اجتماعی شعور زیادہ پختہ اور ...

(بشکریہ معیار)

[redacted]

الرم جیلی •

مولانا مودودی اور پاکستان

۱۹۳۰ء میں علامہ اقبال مرحوم نے ہندوستانی سیاست کا بنظر غائر مطالعہ کر کے مسلمانانِ ہند کو پاکستان کا تخیل دیا اور ۱۹۲۳ء میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ایک بہت بڑے دریدہ ذہن ہندو لیڈر کے اس خیال کے جواب میں کہ "دنیا میں جب تک قرآن کی تعلیم موجود ہے امن قائم نہیں ہو سکتا اس لئے تمام عالمِ انسانی کو اس تعلیم کے مٹانے کی کوشش کرنی چاہیئے" اور ہندو قوم کے بہت بڑے امن پسند لیڈر اور اہنسا پرمو دھرما کے پجاری مسٹر گاندھی کے اس بیان کے جواب میں کہ اسلام ایسے ماحول میں پیدا ہوا ہے جس کی فیصلہ کن طاقت پہلے بھی تلوار تھی اور آج بھی تلوار ہے" ایک معرکتہ الآرا کتاب "الجہاد فی الاسلام" لکھی

پاکستان کا تخیل اسلامیانِ ہند کے لئے دعوتِ فکر تھا کہ اس خطۂ زمین میں جہاں تمہاری ہمسایہ قوم اس قسم کے گھناؤنے عزائم رکھتی ہے اپنی تہذیب و تمدن کو برقرار اور اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کرنا ناممکن ہے۔ اس لئے ایسا ملک حاصل کرنے کی جدوجہد کرنی چاہیئے جہاں مسلمان پوری آزادی سے اعلیٰ وارفع مقام زندگی حاصل کر سکیں۔

اور مولانا مودودی کی معرکتہ الآرا تصنیف "الجہاد فی الاسلام" ہر کو جلا دینے کے لئے ایک زبردست قوت تھی۔ اور منجمد عملی قوتوں۔۔ کو تحریک دینے کے لئے ایک تازیانہ تھی۔

یہ وقت تھا جب ہندو قوم اپنے عزائم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پوری طرح متحد ہو چکی تھی۔ ہندو قوم کانگرس کا نقاب اوڑھے مسلمانوں کو اپنے اندر سمیٹنے کے لئے متحدہ قومیت کے دام ہم رنگِ زمین کو پوری ہوشیاری سے پھیلا چکی تھی۔

مسلم قوم کے بڑے بڑے ——— اور ذہین لیڈر اس دام میں پھنس چکے تھے۔ کتاب و سنّت کی عمیق گہرائیوں تک غواصی کرنے والے ناکام الٹ کے کہ تک نہ پہنچ سکے اور بدقسمتی سے جوش میں متحدہ قومیت میں چھپے ہوئے مسموم جراثیم کی طرف سے آنکھیں بند کئے ہوئے بچے کی طرح اپنے آپ کو کانگرس کی گود میں ڈال چکے تھے۔ عام قومی لیڈر گومگو حالت میں تھے۔ مسلمان جوق در جوق کانگرس میں داخل ہو رہے تھے۔ اور کچھ ایسے لوگ جو الگ جماعتی زندگی کو برقرار رکھے ہوئے تھے۔ وہ بھی کانگرس کے نصب العین پر ایمان لے آئے تھے۔ اور اس محاذ پر اس کی طرف دستِ تعاون بڑھانا باعثِ فخر سمجھتے تھے لیڈرانِ عظام اور علمائے کرام جدید ہندی قومیت کے زہرناک نتائج سے بے خبر تمام قوم کو ہلاکت کے گڑھے کی طرف بڑھنے کی تلقین کر رہے تھے دوسری طرف مسلم لیگ کولڈ سٹوریج میں پڑی حالات کی گرمی سے محفوظ عالمِ سکرات میں پڑی تھی۔ مسلم لیگی لیڈر نیازمندی سے انگریز کی چوکھٹ پر جبّہ سائی کر رہے تھے۔

یہ وہ وقت تھا جب اہلیانِ ہند اجتماعی طور پر انگریز کے خلاف جنگِ آزادی لڑ رہے تھے۔ ایک انقلاب درپیش تھا قسمتوں کے فیصلے ہو رہے تھے۔ زندگی اور موت کا مسئلہ درپیش تھا۔ اس وقت مسلمان۔۔۔ آنکھیں بند کئے چلے جا رہے تھے اور اس بات سے بے نیاز و بے پروا تھے کہ آنکھیں بند کر کے چلنے کا لازمی نتیجہ ٹھوکر کھا کر گرنا ہے۔ مسلمان قوم کے سامنے ہلاکت کے گڑھے کھلے ہوئے تھے۔ اور یہ بے خبر غلط راہ پر گامزن تھی۔ اس وقت مولانا مودودی نے جب کہ ان کی عمر ابھی بیس سال کی تھی پانچسو صفحات کی کتاب "الجہاد فی الاسلام" لکھ کر اسلام کے متعلق گھناؤنے اور خطرناک جذبات و خیالات رکھنے والی قوم میں ہجرد عمل کا آتشی بم پھینکا۔ انھوں نے اس عمل سے اس تخیلِ پاکستان کو جو قلندر کے ذہن سے نکلا تھا زندگی کی پہلی قوت بخشی مولانا مودودی نے کانگرس کے نصب العین کا عمیق مطالعہ کر کے اس میں چھپے ہوئے زہریلے ارادوں کا بھانپ لیا تھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ سب سے

پہنچے۔ مسلمانوں کو متحدہ قومیت سے بچنے کی سخت ضرورت تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنی علمی اور سیاسی بصیرت سے کام لے کر متحدہ قومیت کے اجزائے ترکیبی پر بڑے شرحِ صدر کے ساتھ روشنی ڈالی۔ اس کے زہریلے جراثیم کی چھان بین کی انہوں نے خیالاتِ باطلہ ظنونِ فاسدہ کی اس ظلمت زار میں احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی شمع روشن کرکے تاریکیوں کے پردے چاک کئے۔ آپ نے دلائل کی روشنی میں یہ ثابت کیا کہ متحدہ قومیت کی تحریک مسلم قوم کو موت کے گھاٹ اتار دینے کی ایک سیاسی مہم ہے۔ انہوں نے واضح کیا کہ مسلمان خود اپنی تہذیب اپنی جداگانہ معاشرت اور جداگانہ روایات کی وجہ سے ایک قوم ہیں۔ کانگرس میں مدغم ہو جانے کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنی تہذیب، اپنے تمدن، اپنی معاشرت اور اپنی روایات کا گلا گھونٹ رہے ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کو کانگرس میں شامل ہونے کا مشورہ دینا خودکشی کی دعوت دینا ہے۔ کانگرس ایک منظم جماعت ہے اور ہر منظم جماعت میں یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ افراد کو اپنے دائرے میں لے کر اپنی فطرت اور اپنے مخصوص نفسیات کے مطابق ڈھال لیتی ہے مسلمانوں کا منتشر افراد کی صورت میں اس میں شامل ہونا تو صرف ایک ہی نتیجہ پیدا کر سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمارے جمہور پر کانگرسی نفسیات کا غلبہ ہو جائے۔ وہ اکابرِ کانگرس کی راہنمائی تسلیم کر کے ان کے اشارات پر چلنے لگیں اور اس طرح وہ قومی وقار اور خودداری کھو بیٹھیں گے۔ مودودی صاحب نے "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ اول اور دوم لکھ کر کانگرس کے حلقوں میں ہلچل مچادی۔ براہینِ قاطع کانگرس پسند علماء کے حلقے میں صاعقہ بن کر گریں اور ان کے فکر و نظر کے خاکوں کو جلا کر خاکستر کر گئیں۔ علماء بوکھلا اٹھے اور اپنے علم کی کمانیں سنبھال کر مودودی صاحب پر فتووں کے تیر برسانے لگے۔ مگر مودودی صاحب پوری متانت سے مخالفانہ پروپیگنڈہ کا مقابلہ کرتے رہے۔ کانگرس کی جدید ہندی قومیت کے علمبردار یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ مسلمان ان کے دام میں پھنس چکے ہیں وہ ہمارے پوشیدہ عزائم اور ہندی قومیت کی ہلاکت خیزیوں سے ناواقف ہیں۔ ہم آہستہ آہستہ ان کی معاشرت، ان کی تہذیب اور ان کے تمدن اور ان کے افکار و خیالات کو اس طرح بدل کر رکھ دیں گے

ذہن و دل سے مسلمان ہونے کا احساس تک باقی نہ تھا۔ کانگرس کے سب سے بڑے لیڈر نے اسلامی تہذیب کے متعلق جس بے باکی سے اظہارِ خیال کیا تھا اس سے کانگرس کے ملعون عزائم کی ن دہی کرنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ مگر علماء مسحور تھے وہ اولاً خود سپرد ہو کے اپنے آپ کو کانگرس کی جھولی میں ڈال چکے تھے۔ ان کی عقلیں چھن چکی تھیں۔ ان کی زبانیں بند ہو چکی تھیں اس لئے پنڈت نہرو اپنی مشہور کتاب "میری کہانی" میں ایک خاص قسم کا پاجامہ پہننے ٹوپی اوڑھنا استعمال کرنے کو اسلامی تہذیب قرار دیا اور کہا کہ ا سوا ان کے پاس کچھ نہیں ہے۔ تو اس وقت ان کی زبانیں گنگ اور ان کو اس وقت سب تفسیریں بھول گئیں۔ ان کے ذہن سے کی سب آیات اتر گئیں۔ اس وقت مولانا مودودی نے پوری بے کے ساتھ پنڈت نہرو کی اس تحریر پر تنقید کی اور اسلامی تہذ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا "کہ دراصل تہذیب اس طریقِ فکر نظریۂ حیات اور اس معیارِ امتیاز و انتخاب کا نام ہے جو انسان معتد بہ جماعت کے دماغ پر حاوی ہوتا ہے اور اس کے زیرِ اثر دنیا میں زندگی بسر کرنے کے مختلف طریقوں سے کسی خاص طر اختیار کرتی ہے۔ اور تمدن اس خاص طرزِ زندگی کا نام ہے ج تہذیب کے زیرِ اثر اختیار کیا جائے۔ ہم جس چیز کو اسلامی تہذ کہتے ہیں۔ وہ لکھنؤ اور دلی کی فصیح و بلیغ اردو اور دیوبند و فرنگ کے علماء کا لباس نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس ذہنیت، اس طرزِ خیا ان اصولِ حیات پر مشتمل ہے۔ جو قرآن اور سیرتِ رسول صلعم ہیں جب کوئی تمدن اس تہذیب کے حدود کے اندر رہے وہ تمدن ہے۔"

مودودی صاحب نے جب کانگرس کے ہر تخیل اور پر چوٹ لگانی شروع کی۔ تو کانگرس کے مینار متزلزل ہو گئے مضطرب ہو گئے اور اپنے رازوں کو یوں فاش دیکھ کر بوکھلا گئے کام ایک پوری جماعت کے کرنے کا تھا وہ مولانا مودودی نے تنِ تنہا پوری دلیری، جرأت کے ساتھ سائنٹیفک اصولوں اور منزہ شیوتوں کے ساتھ سرانجام دیا۔ اور مذبرونست جماعت

، ساتھ تحریک لگے جس کے فرنٹ پر بڑے بڑے جبّوں اور قبوں والے

۔

کانگرسی لیڈروں کی بوکھلاہٹ اور جمعیتہ العلماء کے فتوے
ر نہ کرسکے اور مسلم قوم کا ذہین طبقہ مودودی صاحب کی تحریروں سے
امتاثر ہوا کہ زیادہ سے زیادہ نوجوان کانگرس کے حصار سے نکل نکل
سلم لیگ کی روشنی پر جمع ہونے لگے۔

مولانا مودودی نے متحدہ قومیت کے بت پر تیشے چلائے
، بعد کانگرس کی اس ابلہ فریب تحریک کی نشاندہی کی جو مسلمان
ں کے ذہنوں سے اسلامی فکر و تصور کو محو کرنے اور ان کے ذہنوں
ہندو تہذیب کے اثرات مرتسم کرنے کے لئے دو سکیمیں تیار کر رکھی
ر۔ مودودی صاحب نے پوری شرح و بسط کے ساتھ ان سکیموں کے
لۂ دماغیہ پر روشنی ڈالی ان کے اجزائے ترکیبی اور ان سے مطلوبہ
ئج سے مسلم قوم کو آگاہ کیا۔ یہ دو سکیمیں واردھا سکیم اور ودیا مندر سکیم
، نام سے موسوم تھیں

مودودی صاحب نے واردھا تعلیمی سکیم کے متعلق فرمایا کہ
یسری نسل جو واردھا سکیم کے مدرسوں سے تعلیم پاکر نکلے گی۔ اس
ادی نقطۂ نظر اور جدید ہندی قومیت کے تصورات کا اتنا غلبہ ہوگا
اسے اپنی اولاد کو مذہبی تعلیم دینے کی پروانہ ہوگی۔ لہٰذا یقین رکھنا
ہیے کہ تیسری تک پہنچتے پہنچتے ہندوستان ایک قوم بن جائے گا
سری ودیا مندر سکیم کا مطلب یہ تھا کہ اس کے ذریعے سے دلیات
ے منتشر و پراگندہ کو کثیر التعداد ہندو آبادی میں جذب کرنے کی ایک منظم
شش کی جائے مودودی صاحب نے ان دونوں سکیموں کے پیچھے
یدہ کران میں چھپے ہوئے زہریلے جراثیم مسلمانوں کے سامنے رکھے،
ندہ دیکھ لیں کہ جس منزل کی طرف ان کے علماء اور اکابر ان کو بلا رہے ہے
ں وہ فنا کی گھاٹ ہے۔ مولانا حسین احمد مدنی نے قومیت کی وطنیت
بنیاد پر کھڑا کر کے کانگرس کے نصب العین کی حمایت کی۔ ڈاکٹر
ال مرحوم نے اس کی تردید میں مولانا مدنی سے خط و کتابت کی۔ نہی
ں مودودی صاحب نے ایک کتاب "مسئلہ قومیت" اما طہ
ریہ میں لاکر مولانا مدنی کے دلائل کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے۔ اس

کتاب میں مودودی صاحب نے قومیت کے تمام پہلوؤں کو
سائنٹیفک اصولوں اور کتاب و سنت کی روشنی میں اس قدر واضح کر
دیا کہ قومیت کے علمبرداروں میں صف ماتم بچھ گئی۔

مودودی صاحب حیدر آباد دکن میں بیٹھے اپنے علم و بصیرت
کے ترکش سے تیر پھینک کر دشمنان اسلام عناصر کے سینے چھلنی کر رہے
تھے اور پنجاب میں ڈاکٹر اقبال اپنے رسول کی تخیل میں جان پڑتے دیکھ رہے
تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی جوہر شناس نظروں سے کب یہ حقیقت کا ابر نیلا
سے جس کی چمک دمک سے ماحول کی تیرگیوں کے پردے چاک ہو رہے
تھے کیسے پوشیدہ رہ سکتا تھا آپ نے مودودی صاحب کو پنجاب میں
آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ مودودی صاحب ڈاکٹر صاحب کے خصوصی
سے پنجاب تشریف لے آئے اور علم و عرفان کا آفتاب ایسے نئے افق
سے طلوع ہو کر پنجاب کی وادی میں ضیا باریاں کرنے لگا۔

میرے لئے اس مختصر سے مضمون میں یہ مشکل ہے کہ مودودی
صاحب کی ان تعلیمات اور کوششوں کا احاطہ کروں جن سے مسلمان
قوم اپنے مقام کو پہچان کر کانگرس سے برگشتہ ہوگئی اور مسلم لیگ کی پلیٹ فارم
پر جمع ہوگئی۔ مگر مجھے اتنا کہنے میں باک نہیں کہ مودودی صاحب نے پاکستان
کے نظریہ کو قوت دینے اور اس کو زیادہ عام کرنے میں اتنا نمایاں حصہ
لیا ہے کہ مسلمان قوم تا قیامت ان کے اس کارنامہ کو فراموش نہ کرسکے
گی ہر تحریک کے لئے ضروری ہے کہ اس کی پشت پر افکار کا لشکر ہو۔ مسلمان
قوم اور مسلم لیگ کی تحریک مولانا مودودی کی ممنون احسان ہے کہ انہی
کے افکار کے بل بوتے پر یہ انتشار فکر و عمل کے خطرناک انقلابی دور میں
اپنا خاص مقام حاصل کرسکی اور ہندو قوم کے مسلمان دشمن مفکرین اور بڑے
بڑے سرمایہ داروں کے بیتے ہوئے جال سے بچنے کے قابل ہوگئی۔

صوبہ سرحد میں ریفرینڈم کے موقع پر مودودی صاحب نے
اپنے رفقاء کو پرزور الفاظ میں تلقین کی کہ وہ پاکستان کے حق میں نہ
صرف یہ کہ خود ووٹ دیں بلکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس امر پر آمادہ
کریں وہ پاکستان کے حق میں ووٹ دیں۔

لیگ کی تحریک کے دوران میں مسلم اخبارات نے مودودی صاحب
کے مضامین کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی۔ جس سے کانگرس [illegible]

جمیعتہ العلماء کے حلقوں میں انتشار پھیلتا رہا۔ نوائے وقت، زمیندار اور احسان ان مضامین کو شائع کرتے رہے۔ مسلمان کانگرس کی صفوں سے نکل نکل کر لیگ کے پلیٹ فارم پر جمع ہونے لگے۔

مضمون طویل ہوتا جارہا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ میں مودودی صاحب کے کسی کارنامہ پر پورے طور پر روشنی نہیں ڈال سکا ہوں۔ موقع ملا تو کبھی ان کے افکار و نظریات کو پیش کرنے کی کوشش کروں گا مگر مضمون کو ختم کرنے سے پہلے ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ لوگ جو مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کو شک کی نظر سے دیکھنے کے عادی ہوگئے ہیں وہ مودودی صاحب کی درج ذیل تحریر کو پوری متانت اور سنجیدگی کے ساتھ پڑھیں اور پوری ایمانداری اور خلوص سے اس پر غور کریں۔ یہ تحریر مودودی صاحب نے قیام پاکستان سے بہت پہلے ایک اعتراض کے جواب میں قلمبند کی تھی۔

"بلاشبہ مسلمانوں کو ایک ایسی جمہوری تحریک کی ضرورت ہے جو عوام میں بیداری پیدا کرنے اور وسیع پیمانے پر منظم جدّوجہد کرکے... ہندوستان کی اجتماعی زندگی میں مسلمانوں کے لئے ان کی قوم کے شایانِ شان مرتبہ حاصل کرے جو لوگ اس کام کے لئے موزوں ہیں ان کو یہی کام کرنا چاہئے۔ لیکن اس جمہوری تحریک کی پشت پر ایک ایسی تعمیری تحریک کی ضرورت ہے جو قوم کو بنانے والی حقیقی طاقت فراہم کرے اور جمہوری حرکت کو حیاتِ اجتماعی کی اصلی غذا بہم پہنچائے صدیوں سے مسلمان اس حقیقت کو بھولے ہوئے ہیں کہ خلافتِ الہٰی کا قیام وہ واحد غرض ہے جس کے لئے ان کو ایک الگ قوم بنایا گیا ہے، اسی خود فراموشی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کی قومی تحریکیں اور ان کے کارکنوں کی طاقتیں ایسے متعدد راستوں میں بھٹکتی رہی ہیں اور اب تک بھٹک رہی ہیں جن میں کوئی راستہ بھی سیدھا ان کی منزلِ مقصود کی طرف نہیں جاتا۔ لہٰذا کوئی جماعت ایسی بھی ہونی چاہئے جو ان کے سامنے اس نصب العین کو ہر وقت نمایاں اور روشن کرتی رہے۔"

اور جماعت اسلامی کا قیام اسی لئے عمل میں لایا گیا تھا

ایک گزارش

"منیر" کے اہل قلم اور ادیب حضرات سے گذارش ہے کہ نگارشات روانہ فرماتے وقت ان پر اپنا پورا نام و پتہ ضرور تحریر فرمائیں بغیر نام و پتہ کے کوئی نگارش قابل قبول نہ ہوگی۔ علاوہ ازیں مسودہ صاف اور خوشخط بھی لکھنے کی کوشش فرمائیں۔

(ایڈیٹر)

کوثر نیازی

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

اے جانِ من و جانِ جہاں، جانِ زمانہ
دنیا نہیں بھولے گی کبھی تیرا فسانہ

برہم ہیں بہت جس پہ یہ ابنائے زمانہ
بیرونِ قفس گونج رہا ہے وہ ترانہ

تو قید میں ہے پر تیرا پیغام نہیں قید
اب کتنے ہی دل ہیں ترے تیروں کا نشانہ

ہاں تو نے سرِ دار کیا جس کا اعادہ
رنگین ہے خونِ شہداء سے وہ فسانہ

مقصود رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ کا سماں ہے
تعزیر تو ہے اس کے لئے ایک بہانہ

اے جرمِ حق آگاہی و حق گوئی کے مجرم
اس جرم کا شیدائی ہے اب ایک زمانہ

ہر بندۂ آزاد گرفتارِ بلا ہو ——!
اس مکر کی دنیا کا طریقہ ہے پرانا

اک صبر کہ عصیان و تعدی کی یہ راتیں
کوثر سے دُھلے دن میں بدل جائینگی اک دن

سینوں میں مچلتی ہوئی ہر سمت آہیں
قالب میں حسیں گیت کے ڈھل جائینگی اک دن

چمکیں گے بہر قلب اُمیدوں کے شرارے
جو حسرتیں دل میں ہیں نکل جائینگی اک دن

ہاں کہتا ہے یہ جذبۂ بیدارِ مسلمانی
اب ضربِ کلیمی سے کھلے گا درِ زنداں

جیلانی بی۔ اے

پھانسی کے تختے پر!

یہ چھوٹی سی کتاب ان تحریروں پر مشتمل ہے جو جولیس فوچک نے نازیوں کی قید میں دھا آوتا آلکیس اور ایک ہمدرد پہرہ دار کی وساطت سے باہر پہنچیں۔ جولیس فوچک چیکوسلواکیا کا ایک صحافی اور کمیونسٹ پارٹی کا سرگرم رکن تھا جب نازیوں نے چیکوسلواکیا پر قبضہ کر لیا تو کمیونسٹ جماعت نے خفیہ کام شروع کر دیا۔ نازی کمیونسٹوں کے ازلی دشمن تھے۔ انھوں نے سب سے اوّل انہیں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ چونکہ فوچک پارٹی کا لیڈر تھا اس لئے ان سب کو سب سے زیادہ اسکی تلاش تھی۔ بالآخر ۲۴ اپریل ۱۹۴۲ء کو جب کہ وہ اپنے چند رفقاء کے ساتھ جماعتی مشورہ کرنے آیا تھا کہ اسے گرفتار کر لیا گیا۔ وہ کیسے گرفتار ہوا اس کا انکشاف دس برس کے بعد ہوا جب وہ شخص گرفتار ہوا جس نے اسکی مخبری کی تھی۔ یہ گرفتار کرانے والا کمیونسٹ، جماعت کا کارکن اور فوچک کا معتمد دوست تھا۔ نازیوں کے تجربہ جبر سے گلو خلاصی کرانے کے لئے اس نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ انہیں فوچک کے پکڑنے میں مدد دے گا۔ فوچک جہاں کہیں جاتا یہ مخبر نازیوں کو اسکی اطلاع پہنچا دیتا پولیس نے تین دفعہ چھاپا مارا مگر ہر بار اسے بر وقت اطلاع مل جاتی اور وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا۔ اس غدار کمیونسٹ نے بعد میں عدالت میں اقرار کیا کہ فوچک اور دیگر کمیونسٹ رفیقوں کی موت کا در حقیقت وہی باعث تھا۔

پولس نے کمیونسٹ پارٹی کے رازوں کا پتہ لینے کے لئے فوچک کو ایک سال تک جیل میں اذیت دی۔ مگر اس نے ہر تکلیف کا بڑی جوانمردی سے مقابلہ کیا اور اپنے ساتھیوں کا پتہ بتلانے سے انکار کر دیا۔ وہ جانتا تھا کہ موت اسکے لئے مقدر ہو چکی تھی لیکن وہ اپنے ساتھ دوسروں کو نہیں پھنسانا چاہتا تھا جب اسے معلوم ہوا کہ اسے سزائے موت ملا چاہتی ہے تو اس نے کہا تھا مجھے اس کا قطعی افسوس نہیں ہے کسی کا بھی افسوس نہیں جو کچھ میں نے کیا اس نے نیکیا اور بخوشی کیا۔

عدالت کے کمرے میں اس نے ایک ساتھی کو کہا "میں اپنی موت کی جانب قدم بڑھا رہا ہوں۔ صرف معجزہ ہی اسے ہٹا سکتا ہے۔ مگر معجزے ہوا نہیں کرتے۔ یاد کرتا ہیں۔ کے متعلق نہیں سوچا"

انہی ایام میں اس نے وہ نوٹ لکھے جو اس کی بیوی حکومت قائم ہونے کے بعد کتابی صورت میں چھپوائے۔ اس اپنے نصب العین سے جس والہانہ عقیدت اور ایمان کا اظہار سبق آموز ہے۔

ایک عینی شاہد نے جس نے فوچک کو کمرہ عدالت میں بتلایا۔

چیف جج نے اس سے پوچھا "کیا تم اقرار کرتے ہو کہ تم روس کی عملاً مدد کی۔؟"

فوچک نے بغیر کسی خوف کے جواب دیا "ہاں میں روس کی مدد کی۔ اور یہ میرا سب سے بہترین کارنامہ تھا جو عمر کے چالیس سالوں میں کیا۔

فوچک نے اپنا بیان جاری رکھا "میں اس لئے تھا کہ میں سرمایہ دارانہ نظام سے مصالحت نہیں کر سکتا تھا بیر کرتا تھا تاکہ میں عوام کی تحریک آزادی کی مدد کروں۔ میرا مقصد نہ تھا بلکہ یہ بھی تھا کہ وہ لوگ پھر بر سر اقتدار نہ آجائیں جنھوں عوام کو مصائب میں ڈالا تھا۔ اگر ایسا ہو جائے تو اس کا یہ مطلب ہم نے اپنے مقصد کا پورا حق ادا نہیں کیا۔ یہ بالکل بے معنی کہ سیاسی اندھے پھر عنان حکومت سنبھال لیں۔ ہمارا مقصد میں آزادی حاصل کرنا یعنی چیکوسلواکیا کو اشتراکی ریاست بنا جج کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا ایسا معلوم ہوتا

ین پر مار کر چلانا چاہتا تھا۔ مگر فوچک نہیں رکا۔ اس نے اپنا سر
ر کہا "تمہارا فیصلہ مجھے ابھی سنا دیا جائے گا لیکن میں نے جو فیصلہ
ے متعلق کر رکھا ہے اس کا اعلان مدت ہوئی ہو چکا ہے۔ یہ فیصلہ دنیا
ہ دیانتدار لوگوں کے خون سے لکھا گیا ہے۔ فاشزم کے لئے موت
انہ غلامی کے لئے موت اور آدمی کے لئے زندگی، اور کمیونزم کے لئے
ی "

وہی شاید بیان کرتا ہے جب گارڈ فوچک کو مقتل کی جانب لے
تی تو اس نے بآواز بلند "کمیونسٹ انٹرنیشنل" گانا شروع کر دیا۔
ے نے اسے ڈانٹا مگر جب اس کی آواز دوسرے اشتراکی قیدیوں کے
پڑی تو انھوں نے بھی یہی پرولتاریہ ترانہ گانا شروع کر دیا۔
فیصلے کے چودہ دن کے بعد یعنی ۸ ستمبر سنہ ۴۳ء کو صبح ساڑھے
س پر گولیوں کی باڑ مار دی گئی۔ یہ دن اب چیکوسلواکیا کا قومی دن
ہے۔ اس روز فوچک کی یاد منائی جاتی ہے۔

ری — جب اسے نازی پولیس پکڑ لیتی ہے تو اس کا نام پوچھا جاتا
ہے۔ وہ بتانے سے انکار کرتا ہے تو اس پر گھونسوں
ا ہو جاتی ہے۔
سپاہیوں کو حکم ملتا ہے "اس کی مشکیں کس دو۔ اور اسے خوب
دو "
فوچک لکھتا ہے ——— رات کا ایک بجا ہے۔ آخری ٹیلیفون
ی۔ بازار خالی ہو چکے ہیں۔ ریڈیو اپنے وفادار سامعین کو الوداع کہ

"مرکزی کمیٹی کا کون کون ممبر ہے۔ تمہارے ٹرانسمیٹر کہاں ہیں
یں؟ بولو! بولو!"
اب میں پھر پڑنے والے گھونسوں کو گن سکتا ہوں۔ مجھے صرف
ہو رہا ہے کہ جن کو چبا رہا ہوں۔
"اس کے ہوش آنے دو"
یہ صحیح ہے میرے پاؤں ابھی اسے سن نہیں ہوئے ہیں۔ میں
ر کرتا ہوں، پانچ، چھ، سات ——— ایسا معلوم ہوتا تھا گویا

۔ چھڑی کی ضربیں میرے بھیجے پر پڑ رہی تھیں۔
صبح بجے ——— پرندہ گیت سو رہا ہے کہیں کوئی بچہ ضد سے
رو رہا ہوگا۔ کوئی خاوند اپنی بیوی کو تھپکیاں دے رہا ہوگا۔
"بولو! بولو!"
میری زبان زخمی۔ مسوڑوں کو ٹٹول رہا ہوں کتنے دانت گر
چکے ہیں۔ میں اب زیادہ دیر تک ضربیں نہیں گن سکتا۔ بارہ، پندرہ،
سترہ۔ نہیں یہ تو سپاہیوں کی تعداد ہے۔ ان میں سے بعض اب تھک
گئے ہیں لیکن موت ابھی تک نہیں آئی۔
۳ بجے ——— سحر مضافات شہر سے چلی آ رہی ہے ٹرک
منڈیوں کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ خاکروب سڑکیں صاف کر رہے ہیں۔
شاید مجھ کو ایک اور پو پھٹتی دیکھنی ہے۔
وہ میری بیوی کو لاتے ہیں۔
"تم اسے پہچانتی ہو؟"
میں نے مسوڑوں کا خون پی لیا۔ کہیں وہ دیکھ نہ لے
مگر کمبخت خون بہا چلا جا رہا ہے۔ وہ میرے چہرے کی ایک ایک نس سے
اور میری انگلیوں کی پوروں سے پھوٹ بہہ رہا ہے۔
"تم اسے پہچانتی ہو"
"نہیں"
اس نے اپنے باطنی خوف کو ظاہر کئے بغیر انکار کر دیا۔ خالص
سونا اس نے اپنا عہد پورا نبھایا۔ ہم نے عہد کر رکھا تھا کہ افتاد کے
وقت ہم ایک دوسرے کو ہرگز نہیں پہچانیں گے۔ اگرچہ اب یہ احتیاط غیر
ضروری تھی۔ کسی نے میرا نام بتا دیا۔
وہ اسے لے گئے۔ میں نے اپنا ہمت بھر سرد نگاہوں میں جمع
کر کے اسے الوداع کہی۔ مگر نگاہوں میں سرد غالباً پیدا نہ ہو سکا۔
۵ بجے ——— کیا پو پھٹ رہی ہے؟ تاریک کھڑکیوں
سے کوئی جواب نہیں مل رہا۔ موت آنے میں دیر کر رہی ہے کیا خود مجھے
بڑھ کر اس سے ملنا ہوگا؟ کیسے۔
مجھے کسی چیز سے ٹھوکر لگتی ہے اور میں فرش پر گر پڑتا ہوں۔ وہ
مجھے ٹھوکریں مارتے ہیں۔ مجھ کو بوٹوں سے دباتے ہیں۔ ہاں اب بہت

آجائے گی کالے سارجنٹ نے میری ڈاڑھی زور سے نوچی۔ اور ایک
شیطانی قہقہے کے ساتھ مجھے میری ڈاڑھی کے نچے ہوئے بال دکھائے۔ عجیب
بات ہے میں درد نہیں محسوس کرتا ہوں۔

۵، ۶، ۷، ——— حتیٰ کہ دس بجتے ہیں۔ اب دوپہر ہو گئی۔

مزدور اپنا کام کر رہے ہوں گے بچے سکول میں پڑھ رہے ہوں گے لوگ بازاروں میں خرید و فروخت کر رہے ہوں گے مگر یہاں کا کھانا تیار ہو رہا ہے۔ ماں شاید اسوقت میرے ہی متعلق سوچ رہی ہو گی۔ شاید میرے ساتھیوں کو علم ہو چکا ہے کہ ——— کہ میں گرفتار ہو چکا ہوں اور وہ اپنے بچاؤ کی تدابیر کر رہے ہونگے۔ اگر میں ان کو بتا دوں تو پھر ....
نہیں، نہیں، ہرگز نہیں۔ آپ مجھ پر اعتماد کر سکتے ہیں۔ مگر اب خاتمہ بھی تو دور نہیں۔ یہ تو ایک بھیانک خواب معلوم ہوتا ہے۔ ایک خوفناک خواب جیسے کوئی سخت بخار کی حالت میں ہو۔ مجھ پر پھر گھونسوں کی بارش ہو رہی ہے۔ اب وہ پانی ڈال رہے ہیں تاکہ میں ہوش میں آجاؤں "بولو: بولو" اسکے باوجود میرا دم نہیں نکلتا۔ اے میرے باپ! اے میری ماں! تم نے مجھے کیوں مضبوط جنا۔

شام کے پانچ بجے ——— اب تو وہ بھی تھک چکے ہیں۔ اب گھونسے کے درمیان کا درمیانی وقفہ بڑھ گیا ہے۔ اچانک دور کہیں بہت دور سے ایک سکون آگیں، اور تسلی کی طرح نرم آواز آتی ہے: "اب کافی ہو چکی ہے"

نزع

اب زہیک کو جیل خانہ میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ مگر وہ ایسی حالت میں ہے کہ اسے کچھ ہوش نہیں۔ اس کا جسم زخموں سے چور ہو چکا ہے اور وہ موت کے کنارے پر جھکا دکھائی دیتا ہے۔ جیل کی کوٹھڑی کے رفیق اسکی حالت دیکھ کر بالکل مایوس ہو جاتے ہیں۔ اور نزع کا گیت پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔

جب سورج سے گرمی اور ستاروں سے روشنی
نکل جائے گی۔ نکل جائے گی ہمارے لئے

دو آدمیوں کے دعا کے لئے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور وہ ایک دوسرے کے پیچھے ایک دائرے میں آہستہ آہستہ گھوم رہے ہیں ان کی اداس آوازیں ایک درد ناک گیت گا رہی ہیں۔

کس طرح وہ تسرور و سکون کے ساتھ۔
آسمان کی طرف بلند ہو رہی ہے۔ بلند ہو رہی ہے۔
کوئی مر گیا ہے؟ کون؟ میں میت اور کفن دیکھنے کے
سر موڑتا ہوں کہ جس پر دو موم بتیاں جل رہی ہیں۔

جہاں رات نہیں ہے۔
جہاں دن کی روشنی ابدالاباد تک ہے۔

میں اپنی آنکھیں اٹھا کر دیکھنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ کوئی میت ہے نہ کفن۔ میں اپنے اور ان دونوں کے سوا کسی کو نہ پھر یہ الٹی گیت وہ کس لئے گا رہے ہیں۔

جہاں ابدی ستارہ چمک رہا ہے
جہاں خود یسوع ہے خود یسوع ہے

یہ تو کسی کا جنازہ ہے۔ لیکن وہ کس کو دفنا رہے ہیں۔ مگر تو تو یہاں اور کون ہے یہ دونوں اور ہیں ......: پھر یہ میرا جنازہ لیکن سنو تو تمہیں غلطی ہو رہی ہے۔ میں مردہ نہیں۔ جیتا ہوں تم اور بولتے نہیں دیکھ رہے ہو۔ ٹھہرو مجھے مت دفناؤ۔

جب کوئی آہیں الوداع کہتا ہے۔
اپنا آخری الوداع!

وہ میری بات نہیں سنتے۔ کیا وہ بہرے ہیں۔ کیا میں بولتا ہوں۔ یا شاید میں واقعی مر چکا ہوں اور میری آواز نہیں سن سکتے میرے جسم کو یہیں پیوند خاک کیا جائے گا جب کہ میں اسے خود ہوتے دیکھوں گا۔ عجیب بات ہے۔

وہ اپنی بوجھل آنکھیں اوپر اٹھاتا ہے
آسمان کی جانب آسمان کی جانب

میں نے اپنی ساری طاقت کا زور لگا کر پکارا "پانی" دونوں مجھ پر جھکتے ہیں ایک نے میرا سر اٹھایا اور دوسرے نے پانی کا پیالہ لبوں کے ساتھ لگا دیا۔

تمہیں ضرور کچھ کھانا چاہئے دو دن سے صرف پانی ہی پی رہے ہو

پچھلے روز پھر چند پولیس افسر اس سے معلومات حاصل کرنے آتے ہیں

"تمہاری بازی مات ہو چکی ہے۔ اب تو بولو"

وہ مجھے سگرٹ پیش کرتے ہیں۔ لیکن میں اسے قبول نہیں کر سکتا۔

"تم باکسا ز کتنا عرصہ رہے ہو؟"

باکسا ز! تو انہیں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ انہیں کس نے بتایا؟

تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ ہمیں سب پتہ چل گیا ہے۔ بولو!

اگر تمہیں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے تو پھر میں کیوں بتاؤں۔۔؟ میں اپنی زندگی ضائع نہیں کی اب اپنا انجام بھی خراب کر بیٹھوں۔

سوالات کی بوچھاڑ ایک گھنٹہ تک ہوتی رہی۔ پوچھنے والا بڑے سکون پوچھتا رہا۔ اور جب اسے کوئی جواب نہ ملتا تو دوسرا سوال کر دیتا۔

"کیا تم سمجھتے ہو کہ بازی مات نہیں ہوئی"

"صرف میں نے ہی بازی ہاری ہے"

"کیا تم بھی کمیونزم کی فتح پر یقین رکھتے ہو؟"

"بالکل"

"کیا وہ اب بھی کمیونزم کی فتح پر یقین رکھتا ہے؟" بڑے افسر نے جرمن پوچھا۔ اور لمبے سارجنٹ نے چیک زبان میں جواب دیا۔

"وہ اب بھی روس کی فتح پر یقین رکھتا ہے"

یکم مئی کے دن فوچیک لکھتا ہے "میں زندگی سے محبت کرتا تھا۔ اس کے حسن ہی کے لئے تو میں جنگ میں شریک ہوا۔ اے عوام میں تم سے محبت کرتا تھا اور میں اس وقت خوش ہوتا تھا جب تم میری محبت کا جواب دیتے مجھے اس وقت تکلیف پہنچتی تھی جب تم مجھے غلط سمجھتے تھے۔ اگر میں نے قصور کیا ہے تو مجھے معاف کرنا میں نے تمہیں خوش رکھنے کی ہمیشہ کوشش کی اب مجھے بھلا دینا۔ میں نہیں چاہتا کہ مجھے کبھی بھی حسرت و غم کے ساتھ یاد کیا جائے اے میرے باپ، اے میری ماں اور اے میری بہنو! اے میری محبوبہ، اور اے میرے رفیقو! یہ میری آخری وصیت ہے۔ سمجھتے ہو کہ آنسو غم کی اندوہناک گرد کو دھو سکتے ہیں تو تم تھوڑے عرصے کے لئے رو لینا لیکن افسوس مت کرنا میں خوشی اور مسرت کے لئے جیا اور اسی کے لئے مر رہا ہوں۔ میرے ساتھ سخت ناانصافی ہو گی۔ اگر تم نے میری قبر پہ رنج و غم کے فرشتے کو نصب کر دیا۔

قبر

کوٹھڑی ۲۶۷ سات قدم کھڑکی سے دروازے تک اور سات قدم دروازے سے کھڑکی تک میں اس کو اچھی طرح سے جانتا ہوں۔

خدا ہی بہتر جانتا ہے میں نے اس کوٹھڑی کے چوبی فرش پر اس فاصلے کو کتنی مرتبہ طے کیا ہے۔ شاید میں اسی لئے اس کوٹھڑی میں آج بیٹھا ہوں کہ میں نے اپنی چیک قوم کو تباہی کے گڑھے کی جانب لے جانے والی پالیسیوں کو خوب اچھی طرح سے سمجھ لیا تھا۔

میری قوم آج صلیب پر لٹکائی جا رہی ہے۔ میری کوٹھڑی کے سامنے جرمن پہرے دار چکر کاٹ رہے ہیں جب کہ اس کے باہر سیاسی تعدیگی غداری کا جیتا جاگتا بن رہی ہیں۔ آدمیوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے انسانیت کو کتنی کال کوٹھڑیوں سے گذرنا پڑا۔ آہ انسان کی راہ نجات کا کوئی انجام نہیں ہے لیکن آدمی بالآخر جاگ اٹھا ہے ہاں جاگ اٹھا ہے۔

کوٹھڑی میں تبدیلی آگئی ہے۔ تین ناموں کی بجائے صرف دو ہی رہ گئے ہیں۔ وہ گنگنانا اور جواں سال جو میرے جنازے کا ماتمی گیت گاتا تھا۔ چلا گیا ہے اپنے پیچھے وہ جو کچھ چھوڑ گیا ہے وہ ہیں اک محبت بھرے دل کی یاد ہے۔ میں اسے صرف نیم خوابی حالت میں ہی دیکھ سکتا ہوں اس کے قیام کے بس آخری دو دن ہی میرے حافظے میں محفوظ رہ گئے ہیں۔ وہ اپنے مقدمے کی تفصیلات بار بار دہراتا تھا۔ اور میں سنتے سنتے سو جاتا تھا۔

ایک رات دو بجے انہوں نے کیرک کو جگایا۔ اسے صرف پانچ منٹ میں تیار ہونا تھا۔ گویا وہ اپنی زندگی کے انجام کے سفر پر روانہ نہیں ہو رہا تھا بلکہ صرف ایک لمحے ہی کے لئے باہر جا رہا تھا کسی دوسرے جیل خانے میں۔ یا پھانسی کے تختے پر ــــــ کون کہہ سکتا ہے کہاں؟ اسے میرے لیٹے ہوئے بستر کے پاس جھکنے میں وقت لگا۔ پھر اس نے میرے سر کو اپنے سینے سے لگا لیا اور مجھے چوم لیا۔ اسی وقت جرمن سپاہی کی کھردری آواز برآمدے میں چلائی۔ یہاں جذبات کے لئے گنجائش نہیں۔ کیرک جلدی سے باہر بھاگا تالا کھٹ سے لگا .... کوٹھڑی میں صرف دو رہ گئے۔

میں نہیں ہلا سکتا۔ میرے زخمی سوجے ہوئے پیلے پاؤں بھی نہیں چل سکتے۔ اور میرا سوجا ہوا حلق چھوٹا سا لقمہ بھی نیچے اتارنے سے انکار کر رہا ہے۔

ہم شوربے اور گوشت کی گفتگو بڑے مزے لے کر کرتے تھے۔ ایسے شوربے کی قدر و قیمت صرف وہی شخص جان سکتا ہے جس کو ہر روز موت کا خوف لگا ہوا ہو۔

کوٹھڑی نمبر ۲۶۷ کی زندگی بڑی پُر رونق تھی۔ بعض اوقات دروازہ کھلتا اور ہمارا معائنہ ہر ہر گھنٹے کے بعد ہونے لگتا۔ اس لئے کہ کمیونسٹ مجرموں کی خاص نگرانی کا حکم تھا۔ لیکن اس میں جوئے کے جذبات بھی شریک ہوتے تھے۔ یہاں لوگ اکثر اس وقت مر جاتے تھے۔ جب ان کی موت کا سان و گمان نہیں ہوتا تھا۔ لیکن ایسا بہت کم ہوا کہ کسی کے متعلق یہ گمان کیا گیا کہ یہ مر جائے گا۔ لیکن وہ مرا نہیں۔ پہرے دار دوسرے برآمدے سے اندر آتے بلند آواز سے گفتگو کرتے ہوئے یا خاموشی کے ساتھ۔ میرا کبل اٹھا کر میرے زخموں پر ہاتھ پھیرتے۔ پھر اپنے اپنے مزاج کے مطابق یا تو طنزیہ فقرہ کس دیتے یا ذرا نرم لہجہ اختیار کر لیتے۔ سارتی دوسروں سے اکثر زیادہ آیا کرتا تھا۔ وہ جب آتا پوچھتا "سرخ شیطان کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟" شکریہ، ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ لیکن چند روز بعد سارتی کو خود ہی معلوم ہو جاتا کہ سرخ شیطان کو کس چیز کی ضرورت ہے ——— یعنی حجامت بنوانے کی۔ اس پر وہ نائی لے آتا۔ نائی پہلا قیدی ہے جو ہماری کوٹھڑی سے باہر کی دنیا سے ہماری کوٹھڑی میں داخل ہوا۔ اس کا نام کامریڈ چیک تھا۔ سارتی کی رحمدلی بعض اوقات بڑا ستم ڈھاتی۔ میرا ساتھی میرا سر پکڑ لیتا اور نائی میرے لیٹے ہوئے بستر پر جھک جاتا اور کند استرا میرے سر پر چلانا شروع کر دیتا۔ اس کے ہاتھ کانپتے ہیں اور اس کی آنکھوں میں آنسو تھرک رہے ہیں کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ وہ ایک لاش کی حجامت بنا رہا ہے۔ مگر میں اس کی ڈھارس بندھاتا ہوں۔

"دلیر بنو۔ اگر میں پولیس کی چکی سے زندہ نکل آیا ہوں تو تمہارے استرے سے کیوں نہیں بچ سکتا۔"

بعض دن ایسے بھی آتے جب مجھے اپنی زندگی کے متعلق کوئی بھی تازہ رہتا۔ درد۔ زندگی کا جزو داں اور مجھے اکثر زندگی کی یاد دلا دیتا۔

سارے جیل خانہ کو معلوم ہو گیا کہ میں موت کے منہ سے آیا ہوں۔ اس پر مجھے مبارکبادیاں ملنے لگیں۔ موٹی دیواروں پر دستک کے ذریعہ یا کھانا لانے والوں کی نگاہوں کے توسط سے۔

مگر میری بیوی کو میرے متعلق کچھ علم نہیں تھا۔ وہ نچلی منزل کی کوٹھڑی سے چند قدم کے فاصلے ہی پڑی تھی۔ امید و بیم میں لپٹی رہی تھی۔ ایک دن ایک قیدی عورت نے اسے کسرت کے گھنٹے میں بتا دیا کہ میں زخموں سے جانبر نہیں ہو سکا ہوں۔ اس خبر سے اسے ہوا کہ وہ بے ہوشی کی حالت میں صحن کا چکر کاٹتی رہی اور اسے کچھ نہ ... کہ پہرے دارنی اس کے چہرے پر تھپڑ مار رہی ہے اور اسے اس قطار میں ہے جس میں وہ پامال صورتیں کھڑی تھیں جن کی موجودگی سے جیل کی تشکیل ہوتی ہے۔

میں بستر پر پڑا حالت کرب میں کروٹیں بدلتا رہتا ہوں جب شام کو دیوار کی جانب منہ کر کے دیوار اپنی گستاخ کو وہ گیت سناتا ہوں جو سب سے زیادہ پسند تھا۔ اس تک میری آواز کیوں نہ پہنچتی ہو گی میں گیت میں اپنا دل نکال کر رکھ دیتا ہوں۔

آج اسے معلوم ہو گیا ہے۔ وہ آج میرا گیت سن سکتی ہے وہ مجھ سے کتنی ہی دور کیوں نہ ہو۔ اب پہرے دار بھی گیت کے عادی ہیں۔ جب آواز بلند ہوتی ہے تو انہیں فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ نمبر ۲۶۷ سے آ رہی ہے اور وہ مجھے خاموش کرنے کے لئے اب دروازہ کھٹکھٹاتے۔

ہماری کوٹھڑی شمال کی جانب ہے۔ اس لئے ہم غروب آفتاب کا نظارہ کبھی کبھار ہی کر سکتے ہیں۔ اور وہ دن بڑا ہی خوش بخت ہوتا۔ ہم اس کا نظارہ کر پاتے ہیں۔ آہ! میں ایک بار طلوع آفتاب کا منظر دیکھنا چاہتا ہوں۔

بالآخر ایک روز وہ آپ کو باہر کی دنیا کی بھی سیر کراتے ہیں

۳۰ کو بغیر اسٹریچر کے سماعت کے لئے لے چلیں گے۔ عدالت تک پہنچنا ناممکن نظر آتا ہے لیکن آپ پہنچ جاتے ہیں۔ برآمدے کے ایک طرف جنگلہ لگا ہوا ہے۔ سیڑھیوں پر بھی جنگلہ لگا ہوا ہے۔ آپ چل نہیں سکتے ٹانگیں گے پیچھے کھڑے ہوئے جیل کے رفیق آپ کو

یں گئے اور جیل کی بس میں بٹھا دیں گے۔ اس اندھیری متحرک کوٹھڑی
ے کے علاوہ اور بھی دس یا بارہ قیدی بیٹھے ہوئے ہیں۔ نئے چہرے آپ
دیکھ کر مسکراتے ہیں اور آپ انکو دیکھ کر مسکرا پڑتے ہیں کوئی سرگوشی
لیکن جانتے نہیں وہ کون ہے۔ آپ کسی کا ہاتھ تھام لیتے ہیں لیکن
نہیں ہے کہ یہ کس کا ہاتھ ہے۔ بس جلدی سے موڑ مڑتی ہے۔
ڈنگ (نازی عدالت) آگئی ہے۔ آپ کے بعض رفیق آپ کو نیچے
یں۔ آپ ایک سیلے کمرے میں داخل ہوتے ہیں جس کی دیواروں پر نہ
ارٹ ہے نہ تصویر۔ اس میں بنچوں کی پانچ قطاریں لگی ہوئی ہیں
آدمی ہمہ تن گوش بنے بیٹھے ہیں۔ ان کے ہاتھ ان کے گھٹنوں پر
اور وہ ٹکٹکی باندھے خالی دیوار کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ ....
زندگی کا نیا موڑ ہے۔ اس کو سینما کہتے ہیں۔ اس کے پردہ پر آپ
ی کا فلم سینکڑوں بار چلتا دیکھ سکیں گے۔ پوری زندگی کا فلم یا زندگی
نے چھوٹے واقعات کا فلم۔ اپنی غمگین ماں کا فلم۔ اپنی بیوی بچوں
فر اور برباد زندگی کا فلم۔ اپنے دلیر رفیقوں یا غداروں کا فلم۔ جرأت
صلوں یا بھیانک فیصلوں کا فلم، نفرت و محبت اور امید و بیم کا فلم
یکجانب پشت کئے بیٹھے ہیں۔ ہم میں ہر ایک ہر روز اپنی نگاہوں
سے مرتا ہے لیکن کبھی دوبارہ زندہ نہیں ہوتے۔

لیکن سینما اتنا اول خوش کن نہیں۔ یہ دار العذاب میں داخل ہونے کا
ہے جس کے اندر سے آپ کو چیخنے اور کراہنے کی آوازیں آرہی ہیں۔ آپ کو
لوم کہ آپ کے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے۔ آپ لوگوں کو
لا اندر داخل ہوتے دیکھتے ہیں لیکن دو یا تین گھنٹے بعد جب وہ
ہر تو وہ شکستہ اور کچلے ہوئے ہوتے ہیں۔ جب کوئی شخص اندر جانے
تو وہ آپ کو مضبوط آواز میں الوداع کہے گا۔ لیکن جب وہ نکلتا ہے تو آواز
گھٹی ہوئی اور سسکتی ہوئی ہوتی ہے۔ بعض اوقات حالت اس
تر ہو جاتی ہے۔ آپ ایک شخص کو کھلی چمکتی آنکھوں کے ساتھ اندر جاتے
ب جب وہ لوٹتا ہے تو وہ آنکھ اٹھا کر بھی آپ کی جانب نہیں دیکھ سکتا
لئے اس احتسابی عدالت میں ذرا بھی کسی قسم کی کمزوری خوف یا
کا اظہار کیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص بھی فوراً منگا لئے جائیں گے

جن کی اس نے نشاندہی کی تھی۔ اور انہیں بھی اس عذاب سے شروع سے
لے کر آخر تک ویسے ہی گذرنا پڑے گا جیسا کہ یہ گذرا۔

اس شخص کا منظر کہ جس نے اپنی ہمت بھی ہار دی اور ضمیر بھی اس سے
زیادہ برا ہے کہ جس کا جسم چکی میں کچلا گیا۔ اگر آپ کی آنکھیں موت کے ہاتھ
سے بند ہو جاتیں تو یہاں کون آتا لیکن اگر آپ کے وہ اس کسی طور پھر جی
اٹھتے تو آپ دیکھ لیتے کہ کون ڈگمگایا تھا۔ کس نے دوسرے کو دھوکہ دیا تھا۔ کس
کے دل میں خیال آیا تھا کہ میں اپنے غیر اہم ساتھیوں کے نام بتا کر چھٹکارا
حاصل کر لوں۔ جو کمزوری دکھاتے ہیں وہ قابل رحم ہیں لیکن زندگی کیسی زندگی
ہوگی جو دوسرے کی زندگی دے کر حاصل کی گئی ہو۔

اچانک چار آدمی لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہال میں داخل ہوتے ہیں
اور چیک زبان میں مجھے اور دوسرے قیدیوں کو سلام کرتے ہیں وہ بیٹھ
گئے اور انھوں نے اپنے کاغذات نکال کر میز پر رکھ دیئے۔ پھر سگریٹ
سلگا کر اس طرح کش لگانے لگے گویا وہ یہاں کے افسر ہیں۔ میں ان کو
جانتا ہوں۔ ان میں سے کم از کم تین کو میں ضرور پہچانتا ہوں۔ کیا یہ ممکن
ہے کہ وہ نازی پولیس کی ملازمت میں ہیں۔ شاید یہ تین بھی؟
ایک کمیونسٹ پارٹی کا سیکرٹری تھا۔ دوسرا پارٹی کا کارکن اور تیسرا معماروں
کی یونین کا سیکرٹری۔

میں اس صدمے کو برداشت نہیں کر سکتا۔ میں اپنی موت کی خبر
سن سکتا تھا لیکن غداری کی نہیں۔

میں اس کے بعد ہر روز اس بینچ کر میں لایا جاتا تھا اور ہر روز
مجھے نئی نئی معلومات حاصل ہوتیں کتنے رنج و الم کا مقام ہے کہ ایک
شخص جو بظاہر بڑا دلیر نظر آتا ہے وہ اسپین کے محاذ پر لڑا اور گولیوں سے
نہیں ڈرا۔ وہ فرانس کے مشقتی کیمپ میں رہا لیکن جھکا نہیں۔ یہاں نازی
سپاہی کے ہاتھ میں کوڑا دیکھ کر پیلا پڑ گیا اور اپنے دانت بچانے کے لئے
ہمارا انکشاف کر دیا۔ اس کا یقین اور اس کی جرأت اتنی سطحی اور ظاہری تھی
کہ چند ضربوں سے بچنے کے لئے غدار بن گیا۔ وہ اپنے ہم خیال ساتھیوں کی
موجودگی میں مضبوط اور دلیر تھا لیکن جونہی اسے [illegible]

اپنے دشمنوں میں چند دن رکھا گیا تو اس کی ساری مضبوطی دلیری کافور ہو گئی۔ اس نے اپنا سب کچھ اپنے لئے کھو دیا کہ اس نے اپنے نفس کے متعلق سوچنا شروع کر دیا تھا۔ اپنا آپ بچانے کے لئے اس نے اپنے رفیقوں کو بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ اس نے بزدلی کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے اور بزدلی ہی سے سب راز فاش کر دیئے۔

ایک بزدل اپنی زندگی ہی نہیں اور کچھ بھی کھو دیتا ہے۔ اس شخص نے اپنی فوج کو چھوڑا اور دشمن کے ساتھ جا ملا۔ اب اگرچہ وہ بظاہر زندہ نظر آتا ہے لیکن مدت ہوئی وہ مر چکا ہے۔ اس لئے کہ وہ اپنے گروہ سے نکل چکا ہے۔ اس نے پھر رجوع کرنے کی کوشش کی لیکن اسے قبول نہیں کیا گیا۔ یہ ارتداد جیل میں تو اور بھی قابل نفرت ہے۔

لوگوں کے ذہن میں قید اور تنہائی بیک وقت ابھر آتے ہیں لیکن ایسا تصور کرنا غلطی ہے۔ قیدی تنہا نہیں ہوتا جیل خانہ ایک خاص گروہ بندی کا نام ہے۔ اور قید تنہائی کتنی ہی سخت کیوں نہ ہو قیدی پھر بھی اپنے گروہ سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک وہ خود ہی اپنے آپ کو الگ نہ کر لے۔ محکوموں کی اخوت دباؤ سے بڑھتی اور مرتکز ہوتی ہے۔ اس کا احساس اس سے تیز تر ہو جاتا ہے۔ یہ اخوت دیواروں میں بھی سرایت کر جاتی ہے۔ یہ دیواریں زندہ ہو جاتی ہیں۔ یہ بولتی اور اشارہ کرتی ہیں۔ یہ اخوت ہر برآمدے کی کوٹھڑیوں کو ایک لڑی میں پرو دیتی ہے۔ ان کے ایک سے فرائض اور ایک سی مصیبتیں ہوتی ہیں۔ وہی پہرے دار اور کھلی ہوا میں ورزش کا وہی گھنٹہ ہوتا ہے۔ جب وہ صحن میں ملتے ہیں تو ایک لفظ یا ایک اشارہ ہی خبر پہنچانے یا کسی کی زندگی بچانے کا کام کر جاتا ہے۔ اخوت ان ان قیدیوں کے دل جوڑ دیتی ہے جو سماعت کے لئے ٹولیاں بن کر جاتے ہیں، سیلوں میں بیٹھتے اور اکٹھے ہی لوٹتے ہیں۔ یہ کم الفاظ اور زیادہ خدمت کی اخوت ہے۔ یہ ہاتھ تھامنے اور سگریٹ کا تحفہ پیش کرنے کی اخوت ہے۔ اس سے نہ صرف قفس کی تیلیاں ٹوٹ جاتی ہیں بلکہ تنہائی کی وہ بیڑیاں بھی ٹوٹ جاتی ہیں جو آپ کو جکڑے ہوئی تھیں۔ کوٹھڑیوں کے ہاتھ تھے ہیں وہ آپ کو تھام لیتی ہیں جب آپ جھکتے: سے چور چور ہو کر لوٹتے ہیں وہ آپ کو اپنی قوت کھلاتی ہیں۔ جب دوسرے آپ کو فاقوں مارنا چاہتے ہیں کوٹھڑیوں کی آنکھیں ہوتی ہیں جو آپ کے پیچھے سے تکتی ہیں جب آپ

پھانسی پر لٹکنے کے لئے جاتے ہیں۔ اس لئے آپ کو اکڑ کر چلنا چاہیے کیونکہ یہ کوٹھڑیاں آپ کی بہن ہیں۔ آپ کی چال میں لڑکھڑاہٹ دیکھ کر ان میں کمزوری آ جائے گی۔ اس اخوت کے کئی زخم رس رہے ہیں لیکن ان کا کوئی علاج نہیں۔ تاہم اس کے سہارے کے بغیر آپ اس بوجھ کو کبھی بھی نہیں اٹھا سکتے تھے جو تقدیر نے آپ پر لاد دیا تھا۔ کوئی آدمی بھی اس کے سہارے بغیر نہیں جی سکتا۔

اگر آپ دو قیدی کمیونسٹوں کو یکجا کر دیں تو وہ پانچ منٹ میں اپنی تنظیم کر لیں گے جس کا مقصد آپ کی سب اسکیموں کو الٹ دینا ہوگا۔ ۱۹۴۲ء میں اس سینما کا نام کمیونسٹ سنٹرل تھا۔ اس کے بعد اس پر کئی انقلابات آئے۔ ہزارہا کامریڈ عورتیں اور مرد ان بنچوں پر باری باری بیٹھے لیکن ایک چیز میں کبھی تبدیلی نہ آئی۔ اور وہ جنگ جیتنے کی اجتماعی روح ہے

اس نخت گھر میں آپ کو انسانی حیوانوں کا گہرا مطالعہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ موت کا قرب ہر ایک کو بالکل عریاں کر دیتا ہے۔ یہاں ان کا پول کھل جاتا ہے جو سرخ پٹی باندھ کر اپنے کمیونسٹ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور ان کا بھی جن پر کمیونسٹوں کی مدد کا شبہ کیا جاتا تھا ان کا حال بھی معلوم ہو جاتا ہے جو یہاں ہماری نگرانی کرتے ہیں اور ان کا بھی جو دوسرے کمرے میں تحقیقات میں شریک ہیں۔ دوسرے کمرے میں صرف الفاظ ہی آپ کی نگہبانی کرتے ہیں عدالت میں بھی اور "چلکی" میں بھی۔ لیکن یہاں نخت گھر میں آپ الفاظ کے پردوں میں نہیں چھپ سکتے۔ یہاں آپ کے الفاظ نہیں تولے جاتے بلکہ وہ چیز تولی جاتی ہے جو آپ کے باطن میں ہے۔ جس سے آپ بنے ہوئے ہیں۔ اس وقت تک آپ میں صرف وہی چیز باقی رہ گئی ہے جو آپ کی زندگی میں سب سے زیادہ اہم اور نمایاں ہے۔ اس وقت تک آپ کی بنیادی شخصیت کا وہ سب ملمع ان طوفانوں سے اتر چکا ہے جو موت سے پہلے آتے ہیں۔ صرف مضاف اور مضاف الیہ ہی باقی رہ گئے ہیں۔ ایماندار اپنے ایمان کی حفاظت کرتا ہے جب کہ بے ایمان غداری کرتا ہے۔ جوانمرد جنگ کرتا ہے جب کہ کمزور سپر ڈال دیتا ہے۔ ہم سب میں قوت بھی ہے اور کمزوری بھی۔ جرأت بھی ہے اور خوف بھی۔ پختگی بھی ہے اور تذبذب بھی۔ پاکیزگی بھی ہے اور گندگی بھی۔ یہاں صرف ایک ہی چیز باقی رہ جاتی ہے۔ ہاں یا نہ۔ اگر کوئی چالاکی سے ان دو انتہاؤں کے

ناچاہتا ہے تو وہ اس طرح نمایاں ہو جاتا ہے جیسے کسی نے اپنی
لگالیا ہو یا جنازے کے ساتھ ساتھ کٹورا اپنے ہاتھ میں لئے
ہے۔

ایک وہ قسم بھی ہے جن میں اجتماعی روح کبھی پیدا نہیں ہوئی
ان کے نام سے پکارتا ہوں نسل انسانی کے قاتل۔ وہ
پلنے والے درندے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں چھڑیاں اور
یں اور وہ ہم کو اس طرح عذاب دیتے تھے کہ جرمن سیاحت
اشت نہ کر سکتے تھے۔ ان میں کم از کم اپنی قوم یا جرمن قوم
نیات چھپانے کی ریاکاری نہیں۔ ان کو ایذا دینے میں اک
لتی ہے وہ اپنے مزے کے لئے قتل کرتے ہیں کسی کی۔
یتے ہیں کسی کے پردہ ہائے گوش چھید دیتے ہیں کسی کی۔
بتے ہیں وہ کبھی ہمیں کمر میں ٹھوکریں مارنے لگتے ہیں کبھی مار
کال دیتے ہیں کس لئے؟ صرف اپنے باطن کی تسکین کیلئے
روز دیکھیں گے لیکن آپ کو ان کی موجودگی برداشت کرنی
سے نقصان کی بکواس اور خون سے بھر جاتی ہے۔ آپ کے
خلاف بس ایک ہی مدافعت ہے — اور وہ یقین محکم کہ
اپنے کیفر کردار کو پہنچیں گے اگرچہ ان کے ظلموں کی گواہی دینے
قتل ہو جائے۔

کے ساتھ میز پر وہ بھی بیٹھے ہوتے ہیں جن کو انسان کہنا تم
ہا ہئیے جنھوں نے جیل خانے کے قواعد کو پناہ بنا دیا۔
شکر ہے جیل خانے کی اجتماعیت قائم کرنے میں بدل جاتی
کی عظمت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ —
ہیں اس کے برعکس وہ چیک پولیس کے ایجنٹ بن کر
خلاف کام کر سکتے تھے لیکن ان کمیونسٹوں کی اہمیت کا اندازہ
ں نے ہم کو حملہ آوروں کے خلاف جدوجہد کرتے دیکھا۔
نے بہت سے سپاہی اکثر و بیشتر متزلزل ہو جاتے اگر انھیں
اکثر نازی پولیس کیا سلوک کرتی ہے۔ ان کے اندر کے دو اشخا
سامنے بھیانک کھیل ہر روز اور ہر گھنٹہ ہوتے رہتے تھے ہر
ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں وہ بھی ان قیدیوں میں شامل کر دیئے

جائیں اور ان سے ان قیدیوں سے بھی بدتر سلوک ہو۔ اس کے باوجود
وہ اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ انھوں نے ہزاروں جانیں بچا لیں
اور ان ہزاروں کی تکالیف کم کیں جن کی جانیں وہ بچا نہ سکتے تھے۔ نظل کا
لفظ صحیح معنوں میں صرف انہی کے لئے ہے۔ ان کے بغیر بہت سے وہ کچھ نہ
ہوتا جو وہ ہزاروں کمیونسٹوں کے لئے بن گیا ہے۔ تاریک عمارت میں
روشنی کا نقطہ۔ دشمن کے عقب میں خندق، جنگ آزادی کا مرکز خاص
حملہ آوروں کی چھٹ ہیں۔

پیٹیاں

پیٹیاں دوسری کوٹھڑی کے دروازے کے ساتھ لٹکی ہوئی تھیں۔ یہ عام آدمیوں کی عام پتلونوں کی پیٹیاں تھیں۔ یہ چیز مجھے کبھی بھی پسند نہ تھی لیکن اب جب کبھی دروازہ کھلتا ہے تو اک گونہ شادمانی سے ان پیٹیوں کو دیکھتا ہوں۔ کیونکہ ان کے اندر مجھے امید کا عکس نظر آتا ہے۔

جب وہ گرفتار کرتے ہیں تو مارنے سے پہلے نکٹائی اتار لیتے ہیں پھر پیٹی تاکہ ملزم اپنا گلا گھونٹ لے۔ موت کے یہ آلے اس وقت تک جیل کے دفتر میں رکھے جاتے ہیں تا آنکہ فیصلہ ہو جاتا ہے کہ ملزم کو کہاں بھیجنا ہے مشقتی کیمپ میں یا پھانسی کی کوٹھڑی میں۔ پھر آپ کو دفتر میں بلایا جائے گا اور آپ کی اشیا آپ کو لوٹا دی جائیں گی۔ لیکن آپ انہیں اپنی کوٹھڑی میں نہیں لے جا سکتے۔ آپ کو انھیں کوٹھڑی کے باہر لٹکا دینا ہوگا۔ اور وہ وہاں اس وقت تک لٹکی رہیں گی جب تک آپ کی اور کہیں تبدیلی نہیں ہو جاتی۔

سامنے لٹکی ہوئی پیٹی سے مجھے گسٹینا (فوچک کی بیوی) کا حال معلوم ہو گیا ہے۔ ہمارے مقابل کا رہنے والا دوست مشقت کے لئے باہر بھیجا جا رہا ہے۔ گسٹینا اسی کے گروپ میں جائے گی وہ پیٹی جب تک دروازے پر لٹکی ہوئی ہے گسٹینا یہیں ہے۔ اس لئے میں اس پیٹی کو بڑی محبت اور سرور سے دیکھتا رہتا ہوں۔

ہم اس طریقہ پر یہاں رہتے ہیں۔ پچھلا سال، پچھلا مہینہ، آج کل ہماری آنکھیں ہمیشہ فردا کی طرف اٹھی رہتی ہیں۔ شاید آپ کی قسمت پر مہر لگ چکی ہو۔ شاید آپ کو کل ہی گولی مار دینی ہے۔ کل تک بھی وہ شاید تغیر آ جائے۔ یہاں حالات بے قرار رہتے ہیں۔ کون جانتا ہے کل کیا ہو

والا ہے؟ کل گذر جاتا ہے۔ ہزاروں موت کے گھاٹ اتر جاتے ہیں انسان کے لئے کبھی کل نمودار نہیں ہوتا لیکن جینے والے امید کی نہ بجھنے والی لو سے آس لگائے جی رہے ہیں۔ کون جانتا ہے کہ کل کیا کچھ ہونے والا ہے۔

اسی کیفیت سے افواہیں پیدا ہوتی ہیں۔ ہر ہفتے جنگ ختم ہونے کی خوش کن خبر پھیل جاتی ہے ہر شخص اسے سن کر مسکرا اٹھتا ہے گویا اس کے دل کی کلی کھل گئی۔ ہر ہفتے جیل کے رہنے والے کوئی ایسی امید افزا سنسنی پھیلا دیتے ہیں کہ ہم یقین کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں آپ ان خبروں پر یقین کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

آپ ان جھوٹی امیدوں کو دباتے ہیں کہ اس سے سیرت میں کمزوری آتی ہے رجائیت کو یوں جھوٹوں سے پرورش کرنی ٹھیک نہیں رجائیت صرف سچائی پر پل سکتی ہے۔ جنگ صرف ایک ہی صورت میں ختم ہو سکتی ہے اور وہی اس کو ختم کرنے کا واحد طریقہ ہے۔ سچائی پر ایمان آدمی کے اندر ہوتا ہے۔ ایمان اس پر کہ ایک فیصلہ کن دن آنے والا ہے۔ یہ کہ جو ایک دن آپ نے لڑنے اور جیتنے کے لئے حاصل کر لیا ہے وہ آپ کو اس سرحد کے پار لے جائے گا۔ جو زندگی کے درمیان ہے کہ جس کو آپ چھوڑنا پسند نہیں کرتے اور اس موت کے درمیان ہے کہ جو ہر آن اس پر منڈلا رہی ہے۔

آدمی کی زندگی میں زیادہ دن نہیں ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ چاہتا ہے کہ وہ جتنی جلدی گذر سکتے ہیں گزر جائیں۔ وہ برق آسا وقت وہ نہ لوٹنے والا وقت جو اکثر آدمی کی زندگی کا خون کر تا رہتا ہے یہاں آدمی کا جگری دوست ہے کیسی عجیب بات ہے۔

فرواد یروزین چکا ہے۔ جو دن کل کے بعد آنے والا ہے وہ آج بن چکا ہے۔ پھر غائب ہو گیا ہے۔ پیٹیاں ابھی تک سامنے والی کوٹھڑی کے دروازے کے ساتھ لٹکی ہوئی ہیں۔

مارشل لا، ۱۹۴۲ء پورے ایک برس پہلے۔

ہمیں برآمدے میں جنرل ایلی ایش (سابق وزیر اعظم چیکوسلواکیا جسے بعد میں پھانسی دیدیا گیا تھا) ملتا ہے اس کی نگاہوں میں ہیجان سا ہے۔ سپاہیوں کی باڑھ میں سے وہ مجھے دیکھتا ہے میری طرف آتا ہے اور سرگوشی میں کہتا ہے "مارشل لا لگ گیا ہے"

کتنا بھیانک اور خوفناک سماں ہے۔ ہر شام آپ کو برآمدے میں نام پکارے جاتے سنائی دیتے ہیں پچاس، ایک سو، دو سو، ان کے ہاتھ چشم زدن میں باندھ دیئے جائیں گے پھر انہیں ٹرکوں میں اس طرح لاد جائے گا جیسے مویشی مذبح کی طرف لے جائے جاتے ہیں۔ وہ کوئی ایسی جائے جا رہے ہیں۔ موت کے گھاٹ اتار دینے کے لئے وہ کس جرم میں قتل کئے جا رہے ہیں۔

اس رات میں بہت دیر سے اپنی سماعت سے فارغ ہو کر آیا۔ سیڑھیوں کے پاس دیگورا چیکوسلواکیا کا مشہور ناول نگار، اپنے مختصر سامان کی گٹھڑی لئے کھڑا تھا۔ میں اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ اس کا مطلب ہے اور خود اسے بھی اس کا علم ہے۔ ہم ایک لمحے کے لئے مصافحہ کرتے ہیں اوپر کے برآمدے سے اسے اب بھی دیکھ سکتا ہوں۔ وہ سر جھکائے کھڑا ہے۔ اور اس کی نگاہیں دور، ہماری زندگیوں سے بہت دور کہیں دیکھ رہی تھیں۔ آدھ گھنٹہ بعد اس کا نام پکارا گیا۔

چند دن بعد اسی دیوار کے پاس انقلاب کا بہادر سپاہی کرلنیئ کھڑا تھا۔ نہ تو قید تنہائی اسے جھکا سکی نہ پولیس کی اذیت اسکی نخوت توڑ سکی! سے تھوڑا سا منہ موڑے وہ اپنے پیچھے کھڑے سپاہی کو کوئی چیز بتا رہا تھا وہ اچانک مجھے دیکھتا ہے اور مسکرا کر اپنا سر اٹھا کے مجھے الوداع کہتا ہے سپاہی سے باتیں کئے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے "اس سے تمہیں ہرگز کامیابی نہیں ہو گی۔ ہمارے کئی ساتھی ابھی موت سے ہم آغوش ہونے کے لئے تیار کھڑے ہیں۔ تمہیں بالآخر شکست ہو کر رہے گی"

ایک دوپہر ہم عدالت کے ہال میں اپنے کھانے کا انتظار کر رہے تھے کہ جنرل ایلی ایش اخبار بغل میں دبائے داخل ہوتا ہے۔ وہ اخبار کی طرف اشارہ کر کے مسکراتا ہے۔ اس نے ابھی ابھی پڑھا ہے کہ اس پر قتل کا الزام عائد کیا گیا ہے (وہ پچھلے آٹھ مہینے جیل میں تھا)

اس نے کھانا کھاتے ہوئے کہا "اونہہ"

ہمارے ساتھ جیل کو لوٹتے ہوئے وہ اس الزام کا مذاق اڑاتا لیکن ایک گھنٹہ بعد اسے کوٹھڑی سے نکال کر مقتل بھیج دیا جاتا ہے۔

ے دوران میں مجھے میرا سارجنٹ بر نیک لے جاتا ہے۔ فضا
شبو سے لدی ہوئی تھی۔ اتوار کا دن تھا اور بازار کاروں سے بھرا
خوش باش چلے جا رہے تھے۔ ہر جگہ رونق اور چہل پہل تھی موت
درمیان گھوم پھر رہی تھی لیکن اس کے اثرات ان کے چہروں پر نظر نہ آتے

ب مجھے جیل خانے کی بند زندگی سے اس رواں دواں زندگی
دیا گیا تو میرا پہلا تاثر شیریں قسم کی تلخی تھا۔ مجھ کو یہاں نہیں آنا
ں جو کچھ یہاں دیکھ رہا ہوں وہ بھی زندگی ہے۔ اور جہاں سے
بھی زندگی ہے۔ زندگی پر جتنا دباؤ ڈالیے وہ لافانی ہے اسے
بند کر دیا جائے تو وہ اپنے ظہور کے لئے دوسرے سینکڑوں
لے گی۔ یہ زندگی ہے، یہ موت سے ہمیشہ قوی رہے گی۔ خواہ
لخ کیوں نہ ہو۔

سنہ ۴۳ء آج رات وہ میری گسٹینا (فوچک کی بیوی) کو مشقت کے لئے پولینڈ لے گئے ہیں یا شاید موت
ں۔ اب اس کی زندگی تھوڑی ہی باقی رہ گئی ہے۔ دو یا تین مہینے
عدالت میں چل رہا ہے۔ شاید میری تحقیقات میں ابھی چار
جائیں اور انجام ہونے میں دو یا تین مہینے۔ یہ نوٹ مشکل ہی
گے۔ میں ان دنوں میں جتنا بھی لکھ سکتا ہوں لکھنے کی کوشش
ن میں آج نہیں لکھ سکتا۔ میرے دل و دماغ پر گسٹینا چھائی ہوئی ہے
کی رفیق۔
ں ہر شام اسے اس کے پسندیدہ گیت سناتا تھا۔ سٹیپ کے
نیلگوں گھاس کا گیت جو جنگوں کی عظیم کہانیاں سناتی ہے اس
سالڑکی کا گیت جو اپنے خاوند کے پہلو بہ پہلو اس کی آزادی کے لئے
لیے دن لڑتے لڑتے اس آزادی کے لئے اپنی جان تک
۔ سال ہا سال تک ہم اکٹھے کام کرتے اور ایک دوسرے کی
طرح مدد کرتے رہے۔ سالہا سال تک وہ میرے مضامین
پہ تنقید کرتی رہی۔ میرے لئے لکھنا مشکل تھا جب تک کہ
پاس موجود نہ ہوتی تھی۔ سالہا سال تک ہم باہم پا مردی سے

وہ جنگ لڑتے رہے جس نے ہماری زندگی میں اہجات پیدا کر دی تھی۔ سالہا سال تک ہم اس زمین پر ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھومتے رہے کہ جس سے ہم دونوں پیار رکھتے تھے۔

جون کے وسط میں مارشل لا کے دوران میں، آج سے ایک سال پہلے اس نے میری گرفتاری کے چھ ہفتے بعد مجھے دیکھا۔ اپنی کوٹھڑی میں وہ میری موت کے متعلق مختلف افواہیں سنتی رہی تھی۔ وہ اسے میرے پاس لائے تاکہ وہ مجھے نرم کرے۔ جب وہ میرے سامنے لا کھڑی کی گئی تو پولیس افسر نے اس سے کہا: "اسے سمجھاؤ کہ یہ عقل سے کام لے۔ اگر اگر اسے اپنا خیال نہیں ہے تو کم از کم تمہارا ہی خیال کرے۔ تمہیں ایک گھنٹہ کی مہلت دی جاتی ہے۔ اگر تم دونوں اپنی ضد پر قائم رہے تو تم دونوں کو گولی سے اڑا دیا جائے گا۔"

گسٹینا نے جواب دیا "سارجنٹ، میں اس دھونس سے مرعوب نہیں ہو سکتی۔ میری آخری اور سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ مجھے اس کے ساتھ ہی گولی مار دی جائے۔"

یہ ہے گسٹینا، کمال محبت اور عظیم طاقت کی بیوی!

---

۲۲ مئی سنہ ۱۹۴۳ء تحقیقاتی عدالت نے میرا کیس ختم کر لیا ہے۔ اس پر دستخط بھی ہو چکے ہیں اور مہر بھی لگ چکی ہے معاملہ میری توقعات کے خلاف جلدی ہی ختم ہو گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا انہیں کچھ جلدی ہے۔ انہوں نے شہادتوں کی نقلیں کر لی ہیں اور قانون کی دفعات کے حوالے بھی دے دیئے ہیں۔ مجھ پر چھ الزام عائد کئے گئے ہیں جن میں غداری۔ جرمن ایمپائر کے خلاف سازش، مسلح بغاوت کی تیاری اور خدا جانے کیا کیا ہے۔ مجھ کو سزائے موت دینے کے لئے تو صرف ایک ہی الزام کافی تھا۔

مبازرت ختم ہو چکی ہے۔ اب انتظار ہے مسلسل تیار ہونے میں ابھی دو یا تین ہفتے لگیں گے۔ پھر ریش جانا ہوگا۔ وہاں پھر سماعت ہوگی، اور فیصلہ سنایا جائے گا۔ بالآخر موت سے پہلے سو دن انتظار کرنا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ اب میرا مستقبل چار یا پانچ مہینے ہے۔ اس عرصہ میں بہت

پھر ہو سکتا ہے ہر چیز اس دوران میں بدل سکتی ہے۔ شاید میں یہیں بیٹھے
آخری الفاظ لکھ سکتا ہوں۔ باہر کی دنیا میں اگر کوئی تغیر سا جلدی آگیا تو ہمارا
خاتمہ بھی جلدی ہو جائے گا اس لئے شاید باہر کی دنیا کے انقلابات بھی ہماری
مدد نہ کر سکیں۔

اب معاملہ چند مہینوں کا ہے پھر چند دنوں کا رہ جائے گا۔ مگر وہ دن
کتنے تلخ ہوں گے۔ میں سوچتا ہوں آخری سپاہی بن کر سینے پر گولی کھانا
کتنا المناک ہے۔ لیکن کسی نہ کسی کو آخری سپاہی ضرور ہونا ہے۔

کردار اور تصویریں

اب میرے پاس بہت تھوڑا وقت رہ گیا ہے اس لئے میں ان نوٹوں کو ایسی ترتیب نہیں
دے سکتا جیسی میں دینا چاہتا ہوں۔ اس لئے میں اختصار سے کام لوں گا
اب میں آدمیوں کی طرف زیادہ توجہ دوں گا بجائے اس عہد کی تاریخ کے۔ کیونکہ
آدمی بہرحال زیادہ اہم ہیں۔

بہادروں کے خاندان کے خاندان موت کے گھاٹ اتار دیئے
گئے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کیجئے اور اس کے ساتھ اس طرح
پیار کیجئے گویا کہ آپ کا اپنا بیٹا یا اپنی بیٹی ہے۔ ان پر اس طرح فخر کیجئے جس
طرح ان آدمیوں پر فخر کیا جاتا ہے جو مستقبل کی خاطر جیئے تھے۔ جو کوئی حال
میں رہنے کی بجائے مستقبل میں رہا اور اس کو حسین بنانے کی خاطر مرا اس
قابل ہے کہ اس کا مجسمہ بنا کر رکھا جائے۔ اور وہ جنہوں نے ماضی کی راکھ سے آنے
والے انقلاب کے سیلاب کو بند لگانے کی کوشش کی گلی سڑی کٹھ
پتلیاں ہیں۔ اگرچہ ان کے شانوں پر عہدوں کے طلائی نشان چمک رہے
ہیں۔

جوزف اور میری جیلینک

جوزف بس کنڈکٹر ہے اور میری ایک خادمہ۔

گرفتاری کے وقت وہ ایک دوسرے کے قریب کھڑے تھے اور
ان کے ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے وہ زرد تھا اور اس کے چہرے پر تپ دق کی
سرخی جھلک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اس وقت خوف و ہراس پیدا
ہوا جب نازی پولیس ان کے خوبصورت گھر کی ہر چیز کو تہس نہس کر کے
رکھ دیا اس نے اپنے خاوند کی طرف سر موڑ کر دیکھا اور آہستہ سے پوچھا جوزف
— اب کیا ہوگا؟

جوزف کم گو تھا۔ اس کو بولنے کے لئے الفاظ تلاش کرنے پڑتے تھے
اس نے پورے سکون کے ساتھ بغیر کسی جذبے کے اظہار کئے۔ کہا ہم مرنے
کے جا رہے ہیں۔

وہ کانپی نہ چیخی، اس نے آہستہ سے اپنا دایاں ہاتھ جھکایا اور
اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ جب کہ پستولوں کی نالیاں ابھی طرف سیدھی تھیں۔ اس
حرکت پر انہیں ایک ایک گھونسہ سزا دی گئی۔ اس نے اپنا رخسار پونچھتے ہوئے
حملہ آوروں کی طرف دیکھا۔ اور مزاحیہ لہجہ میں کہا: "ایسے حسین چہرے والے ایسے
درندہ صفت۔ ایسے درندہ صفت"

اس کا چہرہ بچوں کا سا تھا لیکن وہ بڑی ذہین تھی۔

۱۹۴۲ء کے آغاز میں وہ مجھ سے جماعت کی رکنیت کے بارے
میں جھجکتے جھجکتے سوالات پوچھنے لگی۔ میں نے اس کے اندر اس سے پہلے کبھی اس
ایسی جھجک دیکھی تھی۔ اور نہ اس نے کسی معاملہ پر ایسی سنجیدگی سے غور کیا تھا
میں نے اس کو تولا اور اسے بدستور ہدایات دیتا رہا۔ میں ابھی اس کی آزمائش
کرنا چاہتا تھا۔

فروری ۱۹۴۳ء میں سنٹرل کمیٹی نے اسے براہ راست جماعت میں لے لیا
اس رات ہم پیدل گھر آ رہے تھے۔ دھند کی موٹی چادر چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی
وہ آج بالکل خاموش تھی حالانکہ اس کی طبیعت بڑی چلبلی تھی۔ اپنے گھر کے قریبی
کھیت کو عبور کر کے وہ اچانک رک گئی۔ چاروں جانب اتنی خاموشی چھائی ہوئی
تھی کہ برف گرنے کی آواز بھی سنی جا سکتی تھی۔ اس نے بڑے سکون سے کہا میں
جانتی ہوں یہ میری زندگی کا سب سے اہم ترین دن ہے کیونکہ اب میں اپنی ملکیت
نہیں ہوں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ خواہ کچھ ہو میں تمہیں ہرگز مایوس نہیں کروں گی

اس کا مقدمہ اب برلن میں پیش ہونے والا ہے۔

فریڈرک، نازک سپاہی۔

وہ کسی کی معصومیت قبول نہیں کرتا جو کوئی اس کے دفتر کی چوکھٹ
عبور کرتا ہے وہی مجرم ہے۔ اس کا محبوب مشغلہ عورتوں کو یہ بتلانا ہے کہ ان کے خاوند
حراستی کیمپ میں مر گئے ہیں یا قتل کر دیئے گئے ہیں۔ وہ اپنے ڈیسک کے دراز
سے انسانی راکھ کے سات برتن نکال کر اس شخص کو دکھاتا کہ جس کی وہ تحقیق
کر رہا ہوتا ہے۔

میں نے ان ساتھوں کو ہاتھ سے مار مار کر ہلاک کر دیا۔ اور تم آنسو میں ہو گئے۔"

اور اب اس کے پاس آٹھ برتن ہو گئے ہیں کیوں کہ اس نے جان تو کو مار مار کر ہلاک کر دیا۔

وہ اپنے کاغذوں پر انگلیاں پھیرتا ہوا کہتا ہے۔ "یہ کیس بھی ختم ہو گیا یہی۔ یہی۔"

"عورتوں کو اذیت دینے میں اسے خاص لطف حاصل ہوتا ہے۔"

جو ہم۔

ہم ایک دوسرے کے سامنے پوری بیچنگی کے ساتھ اور متواتر جھوٹ بولتے رہتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مجھ کو اس کے جھوٹ کا علم ہو جاتا ہے جب کہ وہ کبھی کبھی چوک جاتا ہے۔ جب کسی جھوٹ کا انکشاف ہو جاتا ہے تو ہم دونوں بڑی ہوشیاری کے ساتھ اس سے صرف نظر کر لیتے ہیں اور اس کا پھر ذکر تک نہیں کرتے۔ میرا احساس ہے وہ سچائی نہیں ڈھونڈنا چاہتا کہیں مزہ کہیں خراب نہ ہو جائے۔

کوکلار

وہ نازیوں میں اچھے معاش کے لئے شامل ہوا لیکن یہاں معاملہ اتنا سہل معلوم نہ ہوا جتنا کہ اسے دور سے نظر آتا تھا۔ تب سے اس کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی ہے۔ اس نے شرط لگائی کہ نازی جیت جائیں گے لیکن اب ایسا محسوس ہوتا ہے گویا اس نے مردہ گھوڑے پر شرط لگائی تھی۔ اس کے اعصاب روز بروز کمزور پڑ رہے ہیں۔ جب ایک رات برآمدے میں آواز پیدا کئے بغیر چکر لگا رہا تھا تو اس نے غیر شعوری طور پر اپنے بھیانک خیالات کا اظہار لیمپ شیڈ کی دھول پر کر دیا۔

"اس نے لکھا ہے۔ ہر چیز سے متنفر ہو رہا ہے۔"

رودسلر

اس نے کہا: "جنگ؟ میں جنگ نہیں چاہتا میں نہیں چاہتا کہ دوسرے لوگ ہلاک ہوں۔ میں صرف خود زندہ رہنا چاہتا ہوں۔"

رودسلر پہلے ایک کپڑے والے کے کارخانے میں کام کیا کرتا تھا۔ پھر نازی پولیس میں آ گیا۔

۹ر جون ۱۹۴۳ء میری کوٹھڑی کے سامنے میری بیٹی تک رہی تھی۔ میری بیٹی۔ یہ مستقبل قریب میں انسان کی نشانی ہے کسی روز صبح کو وہ مجھے ریش لے جائیں گے۔ وہاں میری سماعت ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ وقت میری زندگی کے آخری ٹکڑے سے تھے توڑ توڑ کر چبا رہا ہے۔ جیل کے چار سو گیارہ دن حیرت انگیز طریقہ پر گذر گئے ہیں۔ اب کتنے دن باقی ہیں؟ وہ دن کیسے ہوں گے؟ اور میں انھیں کہاں گذاروں گا؟

اب میرا کھیل انجام کے قریب پہنچ رہا ہے۔ میں انجام کے متعلق کچھ نہیں بتا سکتا اس لئے کہ خود مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیسا ہوگا۔ یہ کوئی کھیل تھوڑا ہی ہے۔ یہ زندگی ہے۔

اب پردہ آخری عمل سے اٹھتا ہے
اے میرے محبوب رفیقو، الوداع

(چراغ راہ)

ادب کو

شریفانہ زندگی کا آئینہ دار بنایئے ——

فحاشی ہماری معاشرت کا فطری جزو نہیں ہے

نعیم صدیقی

اسی قصور میں شانوں سے سر اُترتے رہے
وہ کیسے لوگ تھے جو پھر بھی عشق کرتے رہے

صفیں بندھی رہیں کانٹوں کی راہِ اُلفت میں
گزرنے والے مگر، قافلے گزرتے رہے

تمہاری آنکھوں کی دو موج خیز جھیلوں میں
سفینے ڈوب کے اُمید کے اُبھرتے رہے

نظامِ نُور ہے محکم شبِ سیہ کے خلاف
ستارے ڈُوبے تو یاں آفتاب اُبھرتے رہے

انہی کو بھُوک سے ہم نے نڈھال پایا ہے
ہوس کے بندے کہ جو کھیت کھیت چرتے رہے

قفس بھی ایک نئے طرز کا نشیمن تھا!
ہمارے باغ کے بلبل تو یونہی ڈرتے رہے

لیا تھا نام ترا اور سزائے دار ملی!
پہنچ کے دار پہ پھر تجھ کو یاد کرتے رہے

ترے بغیر یہ مانا کہ اضطراب رہا!
ترے بغیر بھی لمحاتِ غم گزرتے رہے

شکاریوں کو ہمیشہ شکار ملتا رہا
ہمیشہ مُٹھ کے دانے یہاں بکھرتے رہے

جو لوگ تُل گئے مرنے پہ جی گئے ہیں وہی
جو لوگ موت سے ڈرتے رہے وہ مرتے رہے

اِدھر کسی کا تھا شیرازۂ سکوں برہم
کسی کے گیسوئے مشکیں اُدھر سنورتے رہے

(چراغِ راہ)

ضیاء محمد ضیاءؔ

دعوت

آج ہم کس کو سنائیں اپنے غم کی داستاں
قائدانِ محترم! اے رہنمایانِ کرام

ہم نے توڑا تھا بڑی مشکل سے افرنگی کا جال
سخت تر تم نے کیا اس سے بھی محکومی کا دام

حق ادا کرتے بھی ہو آزادیٔ اظہار کا!
اختلافِ رائے کا بھی لے رہے ہو انتقام

کر کے لوگوں کے حقوقِ شہریت کو پائمال
کس زباں سے اُن کو حریت کا دیتے ہو پیام

فخر سے فرما رہے ہو "آج ہم آزاد ہیں!"
ہو مگر فکر و نظر میں اب بھی غیروں کے غلام

کہہ رہے ہو "سارے دکھوں کی دوا اسلام ہے"
ہیں خلاف اسکے تمہاری زندگی کے سارے کام

چل رہے ہو خود بہ تقلیدِ امامانِ فرنگ
منہ سے کہتے ہو "مسلماں ہی زمانے کا امام"

ہم سے کہتے ہو کہ "اب خود کو بدلنا چاہیئے"
خود ذرا سے بھی تغیر کو سمجھتے ہو حرام

غل مچاتے ہو بد اخلاقی کے طوفاں پر مگر
اپنے ہی ہاتھوں سے کرتے ہو خود اسکا انتظام

اک طرف سرمایہ داری کو غلط کہتے ہو تم!
اک طرف اُس پر معیشت کا چلاتے ہو نظام

ملک کی دولت اُڑاتے جا رہے ہو بے دریغ
قلتِ زر کا بھی رونا رہے ہے صبح و شام

سیرت و کردار کی تعمیر پر کرتے ہو وعظ!
آپ کیوں کرتے نہیں اس پر عمل کا اہتمام

ہر غلط طرزِ عمل کو تم نے اسلامی کہا
کر دیا بدنام تم نے شرعِ پیغمبرؐ کا نام!

کل تلک جو کلمہ پڑھتے تھے تمہارے نام کا
آج کچھ دل میں نہیں اُن کے تمہارا احترام

خاک میں تم نے ملائی آپ اپنی آبرو
آہ تم نے کھو دیا خود اپنی عظمت کا مقام

کس سے سیکھا ہے یہ تم نے حکمرانی کا طریق
سہمے رہتے ہیں تمہارے نام سے بیکس عوام

ہاں اگر اب بھی خدا کے دین کو قائم کرو
مشکلیں آسان ہو سکتی ہیں ملت کی تمام

سہیل واسطی

عید کی شام

آج عید کی شام ہے ———

مسرتیں جھوم رہی ہیں خوشیاں مسکرا رہی ہیں جلوے بکھر رہے ہیں۔ تماشے ابھر رہے ہیں اور میں اس پرہجوم رنگ و بو اور ہنگامۂ حسن و جمال سے بے نیاز ہوں ایک اندھیرے راستے پر چل رہا ہوں۔ چلا جا رہا ہوں بے شک میرا راستہ تاریک اور گھٹا ٹوپ بدلیوں سے بھرا ہوا ہے ہر چند کی سڑکوں پر بجلیوں کے قمقمے روشنیاں برسا رہے ہیں اور شہر کے چوراہوں پر لگے ہوئے برقی ہنڈوں سے کرنوں اور تجلیوں کی بارش ہو رہی ہے مگر میں گہری تاریکیوں گھپ اندھیروں اور اتھاہ ظلمتوں میں گھرا ہوا ہوں میں ان مسکراہٹوں کی آڑ میں آنسو خوشیوں کے پردے میں غم اور جلووں کی اوٹ میں اداسیاں دیکھ رہا ہوں۔

آج عید کی شام ہے۔

مگر کہاں۔ وہ عید کی شام، بدلو رکشا والا اپنی رکشا لئے عیدگاہ پر کھڑا ہے اور سوچ رہا ہے کہ آج عید ہے مگر اس کی عید تو اس وقت ہوتی ہے جب کوئی سواری اس سے کہتی کہ او رکشا والے شاہدرہ چلے گا؟ کتنے پیسے ہوں گے؟ شاہدرہ کے اور جب وہ آٹھ آنے دینے پر راضی ہو جاتا ہے تو بدلو کھل جاتا ہے اس کے چہرے پر مسرتوں کی شفق پھوٹنے لگتی ہے اور جب چاندی کی چمکتی ہوئی اٹھنی اس کی جیب میں آ جاتی ہے تو بدلو کی مسرت قابلِ دید ہوتی ہے اور اس کے لئے عید کی شام وہ ہوتی ہے جب وہ.. پانچ روپے کما کر مالک کے سامنے لا رکھتا ہے اور رکشا کا مالک اس میں سے ساڑھے تین روپے لے کر ایک روپیہ آٹھ آنے بدلو کے حوالے کر دیتا ہے اور بڑے اطمینان سے کہتا ہے۔

لا بیٹے اسی بات پر بیڑی پلا۔

بدلو اپنے مالک کی خدمت میں بیڑی حاضر کرتا ہے اور ایک چہرہ آٹھ آنے کے سست اور مسرور رکھو ڈالتی کی طرف سے چلا جاتا ہے۔

جہاں ایک اندھیری کوٹھڑی میں وہ اس کے پانچ ساتھی رہتے ہیں مچھروں بھری رات اگرم ملات گندی رات.........

سوچ رہا ہے یہ کیسی عید ہے کہ کل سے ایک پائی کی آمدنی نہیں کی شام ہے اور اس کی جیب میں صرف تین پیسے ہیں صرف تین ہوتی کہاں سے؟ عید کے دھوم دھڑکے کے خیال سے ٹریفک نے لارنس روڈ، بند روڈ، فیروز پور روڈ، میکلوڈ روڈ اور کچہری روڈ پر رکشا کی ممانعت کر دی ہے مبادا موٹر سواروں کو تکلیف ہو شہر کی سڑکوں اور چوراہوں پر جب رکشا ٹریفک بند رہے گا۔ تو بدلو ہوائیں تو چلانے سے رہا یہی وجہ ہے کہ کل شام سے اس کی ہوئی عیدگاہ کے قریب کھڑی ہے اور مسافر ہجوم بیتابی سے لاریوں ٹیکسی۔ کاروں اور ٹرام کی طرف دوڑ رہے ہیں

ٹریفک کنٹرولر کے صرف ایک حکم نے رکشا والوں کو بنا دیا ہے بدلو ایک برقی ہنڈے کی زد میں کھڑا سوچ رہا ہے نے کتنی جھنجلاہٹ اور کتنی ذہنی اذیت کے لمحے گزار لانا سے نصیب ہوئیں نہ جوڑا......... میں بدلو کو دیکھتا ہوں اور گر جاتا ہوں برقی ہنڈے کی سرخ روشنی مجھے ایسی لگتی ہے خونِ انسان کا جیتا جاگتا خون!

آج عید کی شام ہے۔

سینما ہال کے سامنے بے پناہ رش ہے۔ ایسا ہے کہ شہر کی ساری مخلوق اسی سینما پر ٹوٹ پڑی ہو فلم ہی ہے تمہارا دھوبالا کے رقص نے اس تصویر کو چار چاند لگا دیے

میں انسان کی ان طویل قطاروں کو دیکھ رہا ہوں جو چیونٹیوں کی طرح برابر لگے کھسک رہی ہیں اور سینما ہال کے

بگم ہو رہی تھیں ان کی قطاروں کے آس پاس بوسیدہ کپڑوں
میں لپٹی ہوئی چند بھکارنیں منڈلا رہی ہیں جس طرح مردے مویشی کی
لاش پر چیلیں۔ قانون انسدادِ گداگری کے ماتحت یہ بھکارنیں اپنی زبان
سے بھیک نہیں مانگ سکتیں مگر بھیک ان کی آنکھوں میں چیخ رہی
ہے۔ کسی کو فرصت نہیں کہ ادھر توجہ کرے۔

یہ بھکارنیں کبھی ایک طرف سے آکر اپنا چہرہ دکھاتی ہیں کبھی
دوسری طرف سے۔ ایک شخص کس غصے میں اپنے ساتھی سے کہہ رہا ہے
اگر میں چیف کمشنر ہوتا کراچی کا تو دوست! ان کمبختوں کو گولی
سے اڑا دیتا۔ آج عید کا دن ہے کیا شاندار پکچر چل رہی ہے اور یہ کمبخت
یہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑتیں یار! یہی چیزیں تو پاکستان میں بری ہیں۔
بھکارنیں ان پھبتیوں کو سنتی رہیں اور دھتکارنے سے باز نہیں آئیں لوگ
مادھوبالا کا رقص دیکھنے کے لیے بے چین ہیں اور میں ان تباہ شدہ
مادھوبالاؤں کا رقص دیکھ رہا ہوں۔ وہاں زندگی ناچ رہی ہے یہاں موت
وہاں امارت خوشحالی تھرک رہی ہے اور یہاں غربت دیا مالی

آج عید کی شام ہے۔

سنا ہے کہ آج شہر بقعۂ نور بنا ہوا ہے اونچی اونچی عمارتوں پر برقی
قمقموں کی بیلیں کس طرح تکلف سے چڑھائی گئی ہیں ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ عید نے روشنی کے سہرے کراچی کے سر باندھے ہیں لیکن مجھ
... میں بزنالائن کی ایک نیم تاریک جھونپڑی کے سامنے کھڑا ہوں اور
سوچ رہا ہوں اس چکیلی بجلی اور روشنی نے بھی کراچی کے گرد و نواح میں تباہ حال
مہاجرین کی خستہ اور فرسودہ جھونپڑیوں کا نظارہ کس قدر عجیب ہے جس
طرح اطلس کے لحاف میں پیوند لگے ہوں۔ [illegible] پیوند
یہ نیم تاریک جھونپڑی میں ایک مہاجر بیوہ رہتی ہے۔

یہ مہاجر [illegible] شام میں اپنی محدود جھونپڑی
کے اندر مقید نظر آتی ہے دو چھوٹے چھوٹے بچے جھونپڑی کے دروازے
پر خاموش بیٹھے حیرت سے تک رہے ہیں جن کا خون اور جن کی ہڈیاں
پاکستان کی بنیاد ڈالنے میں استعمال کی گئیں جس لئے ان سے وعدہ
کیا گیا تھا کہ ان عظیم الشان قربانیوں کے بدلے میں انہیں پاکستان کی
[illegible] جنت [illegible] جہاں خوشحالی ہوگی۔
انسانیت ہوگی عدل ہوگا جمہوریت ہوگی، مساوات ہوگی، آزادی ہوگی
یہ جنت موجودہ دور میں آگئی مگر کہاں ہے خوشحالی۔ کہاں ہے عدل۔
کہاں انسانیت۔ کہاں ہے جمہوریت۔ کہاں ہے مساوات۔ کہاں ہے
آزادی۔

جھونپڑی کے دروازے پر خاموش بیٹھے ہوئے بچے حیرت سے
مجھے تک رہے ہیں اور میں ان کے معصوم مگر فاقہ زدہ چہروں سے پاکستان
کی تاریخ کا وہ باب جو نئے لاکھ مہاجرین کے آنسوؤں سے لکھا گیا ہے پڑھ رہا ہوں
آج ان بچوں نے عید کس طرح منائی ہوگی۔ بچو! تم نے عید کس
طرح منائی۔

یہ سوالات میرے ذہن پر اس طرح چھا رہے ہیں جیسے کسی تاریک
حجرے میں دھواں گھٹا ہو مگر میں ہمت نہیں کر سکتا کہ ان بچوں سے یہ
سوال کروں اس وقت کراچی کی فضا طرح طرح کے نغموں، گیتوں، ہنگاموں
اور چہل پہل سے گونج رہی ہوگی مگر آہ یہاں خاموشی ہے کامل خاموشی
مگر خاموشی کیوں؟ ارے یہ ہلکی ہلکی آواز کیسی ہے۔ کان لگا کر سنتا
ہوں بے شک کوئی آواز ہے کسی کی سسکیوں کی آواز، کسی کی ہچکیوں کی آواز
کسی کی چیخوں کی آواز ایک آواز کیوں۔ آوازیں ہی آوازیں ہیں۔ سسکیاں ہچکیاں
چیخیں، کراہیں اور ماتم! بے شک عید رو رہی ہے ان لوگوں کے حال
پر جو عید نہ منا سکے۔

بچو تم بھی روؤ۔ تم بھی چیخو، تم بھی فریاد کرو۔ اتنی زور سے کہ دنیا
کے کان بہرے ہو جائیں۔ چیخو۔

آج عید کی شام ہے۔

عید کی شام ہے آج۔ ایک وسیع سبزہ زار کے وسط میں بڑا
وضع دار شامیانہ لگا ہوا ہے۔ اور اس شامیانہ کے چاروں طرف اگلو
کے برابر سرخ، سفید، نارنجی، زعفرانی، گلابی، اور طرح طرح رنگ کے برقی
قمقموں کی جھالر آویزاں کی گئی ہے۔ شامیانہ کے نیچے صوفوں اور میزوں
کو دلکش ترتیب کے ساتھ سجایا گیا ہے میزوں پر سرخ رنگ کی شراب
کی بوتلیں قرینے کے ساتھ چنی ہوئی ہیں لوگ آ رہے ہیں اور صوفوں پر
ترتیب کے ساتھ بیٹھتے جا رہے ہیں واقعی عید کا [illegible] معلوم ہوتا ہے
لوگوں کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ بلیک مارکیٹ کی کمائی سے غذا [illegible] چہرے

نفع خوری کے احساس سے چمکتی آنکھیں اور جسم پر بڑھیا ملبوس۔ غرض عجب منظر ہے یکے بعد دیگرے بیش قیمت کاریں آتی ہیں اور مہمانوں کو چھوڑ کر ایک قطار میں لگ جاتی ہیں لیجئے وہ ہنگامہ شروع ہو گیا۔ ہنگامہ عیش و عشرت! ایک بزرگوار اپنی سیٹ سے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ۔ حضرات! کراچی کے معزز نمایندوں کا یہ اجتماع عید سعید کے سلسلے میں ہے ہمیں اس قادر مطلق کا شکر و سپاس ادا کرنا چاہیے جس نے ہمیں اپنی آزاد اسلامی "مملکت" میں آج پانچویں عید منانے کی سعادت بخشی۔

برادران اسلام! روزہ تربیت نفس کا ذریعہ تھا۔ تو عید اس کا انعام۔ روزہ امتحان عزم تھا تو عید نوید کامیابی حضرات ہمیں اس موقع پر ایک مرتبہ پھر عہد کرنا چاہئیے کہ ہم پاکستان کو صحیح معنوں میں ایک مضبوط اسلامی مملکت بنائیں گے۔

(حاضرین کا شور تحسین) ہیر ہیر!

جہاں اے حضرات! امیر و غریب اور شاہ گدا کے درمیان کوئی فرق نہ ہوگا۔

جیسے دیکھکر خلافت راشدہ کی یاد تازہ ہو جائے گی۔

(ایک آواز)۔ . . . . اور وہسکی کی بوتلیں کھولو اور جہاں

اے حضرات! لوگوں کو صحیح آزادی اور حقیقی جمہوریت کا لطف نصیب ہوگا سب لوگ برابر ہوں گے۔

(ایک آواز، بوائے دوڑ کر آؤ، میزوں پر گلاس چن دو!۔

بھائیو۔ میں اس موقع پر یہ عرض کئے بغیر نہ رہوں گا۔ کہ پاکستان محض بھر لوگوں کے عیش و عشرت کے لئے نہیں حاصل کیا گیا اس کے بر کو چک کے دس لاکھ مسلمانوں نے اپنی جانیں قربان کیں ہیں۔ اس خواب کو سچا کر دکھانے کے لئے ہماری پچاس ہزار بہنوں اور بیٹیوں نے اپنی عزت کو بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ (ایک آواز) بیرا کاک ٹیل بناؤ! کاک ٹیل۔

ہاں ہمیں آج خدائے بزرگ کا شکریہ ادا کرنا چاہیے جس نے عید کی صورت میں اپنا انعام ہم پر نازل کیا ــــــ

اور یہ انعام شراب کی صورت میں بجھتہ مسادی ــــــ

حاضرین میں تقسیم ہو رہا ہے اور چشمہ کی لطیف دھیمی نغمہ آسمان سے کیف و سرور کی بارش ہو رہی ہے۔

اور عید کی دیوی بڑے ناز و انداز کیساتھ چھم چھم ناچ

آج عید کی شام ہے۔

مگر میری نگاموں کے سامنے تاریکیوں اور ظلمتوں

کچھ نہیں ان تاریکیوں اور ظلمتوں میں مختلف مناظر ابھر کی تاب نہ لا کر رفتہ رفتہ فضا میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک چہرہ ہے جس پر ان گنت ڈراؤنی پرچھائیاں کانپ رہی ہیں جیب میں صرف تین پیسہ ہیں اور آج عید کی شام ہے۔

کچھ دیر کے لئے یہ چہرہ یہ غمناک چہرہ میرے سا اور پھر بدلیوں میں چھپ جاتا ہے اور پھر سینما ہال کے سا والی فقیرنیوں کے سوکھے سہمے چہرے تاریکی سے ابھرتے پر عید کی مسرت کا کوئی نشان نہیں جیسے، چڑیلوں کی طرح آتے ہیں طرح طرح کی صورتیں بناتے ہیں چڑاتے ہیں پھر اندھیرے میں غرق ہو جاتے ہیں۔ . . . .

چہرے کن کے ہیں؟

دو بچوں کے! دو خستہ حال بچوں کے جو ایک نیم کے سامنے بیٹھے ہوئے فضا میں گھور رہے ہیں۔ نہ جانے چیز کی تلاش ہے؟ اُف خدا کی پناہ!

کیسا موثر اور دردناک نظارہ ہے یہ! مگر آہا!

لطیف سماں ہے سبزہ زار شامیانہ بجلی کی رنگا رنگ طرح طرح کے لوگ! طرح طرح کے ملبوس اور گلابی رنگ کی بوتلیں۔!!!

سبحان اللہ بے شک! آج عید کی شام ہے
(بشکریہ نظ

التماس!

مشیر سے خط و کتابت کے وقت اپنا خریدار ہو تاکہ تعمیل ارشاد میں تاخیر کا امکان ہی نہ ہو۔ (د

انور صدیقی •

جوشِ گل

ں کو عکس رُخ نوبہار کہتے ہیں
توں کو بھی مشک تتار کہتے ہیں

نگار دار جہاں جلوہ ریز ہوتی ہے
ہم اہلِ دل تو اسے کوئے یار کہتے ہیں

کی دولت بیدار کیوں عطا ہو نہیں
ںں کو بھی سیل غبار کہتے ہیں

سمٹ سکے تو بنے غازۂ رُخ خورشید
جو پھیل جائے لہو، لالہ زار کہتے ہیں،

دوں سے ڈھلے دامنِ بہار وہی
ن دل سے ہو پیدا نکھار کہتے ہیں

چلو ہم اہلِ قفس جوشِ گل بھی دیکھیں گے
کہ ٹوٹنے کو ہیں یہ طوق و دار کہتے ہیں

سنبھل سنبھل کے چلیں ہمسفر مرے انور
کٹھن ہے آگے یہی رہگذار کہتے ہیں

راغب مرادآبادی •

رباعیات

پرواز خیال ہیچ و ناکارہ ہے
نازِ پر و بال ہیچ و ناکارہ ہے
ادراک سے ماورا ہے تیری ہستی
شاعر کا کمال ہیچ و ناکارہ ہے

صہبائے انانیت کی مستی نہ گئی
حرص و ہوس و دراز دستی نہ گئی
اٹھنے کو اٹھا بہت بلندی پہ مگر
انساں کے خیالات کی پستی نہ گئی

دریائے غم عشق کا ساحل تُو ہے
رہرو کو چراغِ سرِ منزل تُو ہے
میں سرخیِ افسانہ ہوں بیشک لیکن
افسانۂ زندگی کا حاصل تُو ہے

کونین کی عظمت کا فسانہ ہم ہیں
سرچشمۂ تہذیب زمانہ ہم ہیں
گونجا تھا فضاؤں میں جو ہنگامِ الست
وہ بربطِ فطرت کا ترانہ ہم ہیں

سلیم اختر

اندھیرے اُجالے

برسات کی مرطوب ہوا چیڑ اور شہتوت کے گھنے اور سبز رنگ کے
نکھرے ہوئے درختوں پر رینگ رہی تھی۔ طلوع ہوتے ہوئے سورج
کی مدھم روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ قریب چوڑے کے بنگلے کی چھتیں سرخ
کویلوں کی بنی ہوئی تھیں اور ان پر گھنی عشق پیچاں کی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں
خاموش کھڑے تھے۔ صبح چمکیلی اور خوشگوار تھی۔ سبزہ زار پر شبنم ابھی خشک
نہیں ہوئی تھی اور سامنے دور تک سنگلاخ پر دور تک بل کھاتی چلی گئی تھی اور
اس پر دودھ کی گاڑیوں کو خچر اپنی مخصوص رفتار میں کھینچتے ہوئے جا رہے تھے
بنگلے کے پورٹیکو میں جس کو موسم نے کاہی اور سبزی کا لبادہ پہنا
دیا تھا ایک سیاہ رنگ کی چھوٹی سی آسٹن کھڑی تھی۔ اس کے شیشے
چڑھے ہوئے تھے اور شیشوں پر دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ پورٹیکو کے ایک
کونے میں دو بھورے رنگ کے بل ڈاگ (Bull Dog) زنجیروں
سے بندھے ہوئے آنکھیں بند کئے لیٹے تھے۔ ان کے گلوں میں سیاہ
رنگ کے پٹے پڑے ہوئے تھے۔ اور ان میں دو پیتل کے ٹوکن چمک رہے
تھے باورچی خانے کی چمنی میں سے۔ بنگلے کی دیواریں بارش کی وجہ سے سیل رہی
تھیں۔ اور اس پر جگہ جگہ سبز کائی جمی تھی گاڑھا گاڑھا دھواں اٹھنے لگا تھا اور
گلابوں اور رات کی رانی مہک میں چار کی ہلکی سی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ پورٹیکو
سے لگے دائیں بائیں بنے ہوئے کمروں میں دبے دبے خراٹے گونج رہے
تھے۔ لیکن کونے کے کمرے میں رات کی نیلی روشنی جل رہی تھی۔ مسہری کا
سہارا لئے عشرت چچا بیٹھے تھے۔ کمرے میں ایک بے ترتیبی سی پھیلی ہوئی
تھی۔ پیڈسٹل لیمپ کا شیڈ گر کر صوفے پر آن پڑا تھا۔ صوفہ کور قالین پر پھیلا
ہوا تھا۔ اور ایش ٹرے میں سگار کے ادھ جلے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے
کمرے میں کڑوے تمباکو کی بو بسی ہوئی تھی۔ اور فضا کثیف اور گھٹی ہوئی تھی
چھت کا پنکھا کمرہ کی پراسرار خاموشی کو اپنی مخصوص آواز میں توڑ رہا تھا مسہری
کے تکیے کے سہارے عشرت چچا کے بازو لٹکے ہوئے تھے۔ اور ان
سرہانے پڑا ان کا ڈریسنگ گاؤن کے منہ سے ترتیبی سے کھلے ہوئے
تھا اور گریبان میں سے نیلے سلیپنگ سوٹ کا سلا ہوا کالر جھانک رہا
تھا۔ بستر کی چادر پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے
ساری رات جاگتا رہا ہو ——— کروٹیں بدلتا رہا ہو ہر چیز
ہر چیز پریشان تھی۔ اس قمقمہ کی نیلی روشنی میں ان کا چہرہ بڑا اداس
ہو رہا تھا۔ ان کے چہرے پر آنسوؤں کی نمی تھی۔ اور گہرے جھکے
لٹکے گال پر پڑی ہوئی جھریوں میں مل کر ان کے چہرہ کو اور دیران کر رہا
تھا۔ ان کی آنکھیں ڈری ڈری سی تھیں اور ان میں ایک خلا جھانک رہا
ان آنکھوں سے آج رات لاتعداد آنسو ڈھلکتے ہوئے چہرے کے
نشیب و فراز پر بہتے ہوئے ان کی سلیپنگ گاؤن میں جذب
لاتعداد موتی جن کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی جو ارزاں تھے۔ آج
سے پہلے بھی انہوں نے یہ رات جاگ کر کاٹی تھی۔ ایک طویل
برسات کی مرطوب اور سیاہ رات۔ آسمان پر کوئی تارہ نہیں تھا
آنکھوں میں ستارے جھلملا رہے تھے۔ اسی رات آسمان سے کوئی
ٹوٹا۔ کوئی ستارہ نہیں چمکا۔ لیکن ان کی آنکھوں سے بے شمار ستا
ٹوٹے۔ بے شمار تارے چمکے اور اپنی انجانی منزلوں کی طرف روانہ

کمرے کی دیوار پر کیلنڈر میں سترہ جون کے ہندسے دھند
میں مٹے مٹے سے دکھائی دے رہے تھے۔ سترہ جون۔ آج ہی
انہوں نے اسی دنیا میں سورج کی نرم اور مہربان روشنی کو محسوس
آج ہی کے دن ساٹھ سال پہلے انہوں نے نرم نرم پھولوں کی خوشبو
ہوئی تازہ ہوا کو پیا تھا۔ آج ہی کے دن انہوں نے چند اجالے
اپنی کمزور آنکھوں کے سامنے محسوس کیا تھا۔ آج ہی کے د
آہ وقت کتنی جلدی گذر جاتا ہے "

انہوں نے سر اٹھا کر کہا ——— اور اپنی بے نور آ
سے بر بر خلا میں گاڑ دیں۔ انہیں ہر چیز اجنبی سی لگی۔ انہیں ایک
محسوس ہوا ہی تھی ایک اجنبی۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا گذشتہ

ہوں بن کر فضا میں تحلیل ہو گئے ہوں۔ اور یہ تاریکی جو ان کے گرد چھائی ہے ان کا دکھوں بھرا ماضی ہے۔ جیسے کہ وہ راہ سے بھٹک گئے ہوں۔ سامنے گھپ اندھیرا چھایا ہو اور انہیں راہ سجھائی نہ دیتی ہو۔ اور منزل ان سے بہت دور ہو۔ اور چھوڑی ہوئی منزل ان کی آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہو وہ منزل تک پہنچنا چاہتے ہوں مگر ان کے ہاتھ پاؤں مفلوج ہو گئے ہوں۔ انہیں ایسا لگا جیسے کہ ان کی منزل اب کبھی نہیں آئے گی۔ وہ دن کبھی نہیں لوٹیں گے جب کہ وہ جوان تھے جب کہ خزاں اور بہار کا تصور بالکل نیا تھا۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسا کہ وہ ٹیتھونس (Tithonus) ہیں جس نے لافانی محبو[illegible] سے ابدی زندگی کی خواہش کی تھی۔ اور اسے ابدی حیات مل گئی تھی۔ مگر جس پر بڑھاپا ایسا آیا کہ تا ابد نجات نہ مل سکی۔ اور موت نے اس پر کبھی اپنا دست نجات دراز نہ کیا۔ اور اس پر زندگی ایک مسلسل عذاب بن گئی۔ اور عشرت چچا پر بھی زندگی ایک عذاب تھی۔ ایک مستقل عذاب جس سے وہ رہائی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مگر وہ لاچار تھے۔ "آہ وہ دن —" انہوں نے خلا میں سے آنکھیں ہٹا کر زیر لب کہا۔

سامنے تپائی پر ان کے مصنوعی دانت رکھے تھے۔ اور مصنوعی مسوڑھوں کا قرمزی رنگ جیسے ان کو کھائے جا رہا تھا۔ انہوں نے — حقارت سے دانتوں کی طرف دیکھا انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کوئی مجرم ہوں اور احساس جرم دلانے کے لئے کوئی چیز انہیں نظر آ رہی ہو۔ انہوں نے تپائی پر سے دانتوں کو تپائی کے نیچے رکھ دیا۔

عشرت چچا نے سچ ہی کہا تھا۔ مگر انہیں دکھ نصیب ہوا ان کی زندگی ہی کیا تھی چند آنسو۔ جو ان کی آنکھوں کی انتہا گہرائیوں میں سے چھلک کر نامعلوم وسعتوں میں کھو گئے تھے۔ اپنی انجانی منزلوں میں گم ہو گئے۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی تو [illegible] گزرتے کسی آنے والے کا خواب لئے انہوں نے سیاہ راتوں میں صبح کے ستارے کو ڈوبتے دیکھا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے بے شمار شہاب ثاقب ٹوٹے۔ انہوں نے بے شمار راتیں جاگ کر کاٹ دیں۔ مگر وہ زندہ رہے بغیر کسی ارادے کے۔ وہ صرف اسی لئے زندہ رہے کہ انہیں زندگی سے پیار تھا۔ انہیں سفید چمکتے سورج سے محبت تھی [illegible] ہوئی چاندنی [illegible] ہر [illegible] خواب کو دیکھتے [illegible] کی [illegible] محسوس کرتے

اور جاگتے رہتے۔ سگار سلگتے ان کی کڑوی کسیلی بو ہوا میں پھیل جاتی اور ایک ہوا میں منتشر ہوتی رہتی۔ رات کو جب سبزہ زار میں پلنگ بچھ جاتے اور آسمان پر تاروں کی چادر پھیل جاتی تو پچھلے دور لان کے ایک کونے میں امرود کے درخت کے سائے میں ایک سائے کو حرکت کرتے دیکھتے۔ سایہ کرسی سے بے چینی سے اٹھتا کبھی ٹہلنے لگتا کبھی بیٹھ جاتا۔ سگار کی بو ان کی ناکوں میں رچ جاتی —— اور پھر ان کی آنکھیں بند ہونے لگتیں اور وہ سہانے رات کی پراسرار خاموشی ہر طرف پھیل جاتی۔ اور گرم بوجھل ہوا۔ اونگھتی اونگھتی چل رہی ہوتی۔ لیموں اور امرود کے سوکھے ہوئے پتوں کے گرنے کی مدھم صدا رات کے سکوت کو اور پراسرار بنا دیتی۔ اور اس سکوت میں عشرت چچا کے قدموں کی دھیمی چاپ کچھ عجیب سی لگتی جیسے آفاق سے کوئی روح زمین پر اتر آئی ہو اور امیدوں کے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں لئے در در بھٹکتی پھر رہی ہو۔ اور اسے کہیں ٹھکانہ نہ ملا ہو۔ دور درخت کی چوٹیوں پر سے زرد چاند اونچا ہونے لگتا اس کی زرد کفن پوش چاندنی میں بنگلے کے مینار ایسے نظر آتے —— جیسے کہ دیوتا اپنے انجانے خیالات کی رو میں کھڑے ہوں اور ان کے قدم رک گئے ہوں۔ اور عشرت چچا —— اپنے دنوں کے چمکدار سورج کی روشنی میں اپنے بچوں کی آوازوں کو سنتے رہتے۔ ان سے باتیں کرتے۔ نئے جال بنتے۔ سپنوں کے جال خیالوں کے جال۔ جن میں کوئی حقیقت نہیں ہوتی جو کبھی پورے نہیں ہوتے۔ جگنو رات کے پراسرار سکوت میں اپنی ننھی ننھی شمعیں لئے پھرتے اور عشرت چچا اپنے محتاط قدموں سے ٹہلتے رہتے۔ انہیں دور بانس کی بنی ہوئی جھونپڑی کی چھت پر سے مرغوں کی بانگیں سنائی دینے لگتیں۔ اصطبل میں گھوڑے ہنہنانے لگتے اور پھر سویرا ہونے لگتا۔ آسمانی کنارہ پر نارنجی رنگ بہنے لگتا۔ کھلتے ہوئے چمپا اور گلابوں کی خوشبو ہوا میں مل کر انہیں صبح کا احساس دلانے لگتی۔ ان کی آنکھیں اجالے میں چندھیا جاتیں وہ اپنے ہاتھوں کو مایوسی سے مسلنے لگتے۔ ایک اور دن۔ ایک اور طویل دن ان کے سامنے پہاڑ بنا کھڑا تھا جسے انہیں گزارنا تھا۔ ہنس کر یا رو کر۔ جس طرح بھی ممکن ہو سکے صبح اپنے اداس اجالے کو لیکر سارے بنگلے پر چھا جاتی۔ باورچی خانہ میں برتن ایک دوسرے سے ٹکرانے لگتے۔ برآمدے میں نوکر صفائی کرنے لگے لیکن اس کے باوجود انہیں ایک ویرانی سی گردو پیش میں محسوس ہوتی ایک ویرانی جو انہیں برسوں سے محسوس ہو رہی تھی۔ اور ان کی زندگی [illegible]

اسی دن ہوگئی تھی۔ جس دن نجمہ ——— جنھیں ان سے بے انتہا محبت تھی
راشدہ کی پیدائش پر انھیں ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ اور پھر ان کی زندگی
ویران سی ہوگئی۔ لیکن راشدہ انہیں جیسے ان کے غم کا نعم البدل مل گئی
راشدہ جس کی آنکھیں بند تھیں اور گول پھولے سے چہرے پر روئی کے گالوں
سے بال تھے پنگوڑے میں پڑی تھی۔ اور وہ پنگوڑے کو آہستہ آہستہ ہلاتے
رہتے۔ اور نرس کی نیلی آنکھوں میں تحیر کی ایک ہلکی سی لہر دوڑ جاتی ——— اور
پھر ایک دن ایسا آیا کہ اس دن وہ سب کچھ کھو بیٹھے جو انہوں نے پایا تھا۔ اور
اس دن سے وہ انتظار اور خیالوں کے تانے بانے میں گم تھے۔ انھوں نے کتنے
دن ٹہل ٹہل کر گذار دیے تھے۔ اس دن سے انہیں وہ بنگلہ ویران سا لگنے لگا
تھا۔ جیسے کہ اس بنگلے میں انسان نہیں روحیں بستی ہوں۔ وہ دن بھر آنے
والی ڈاک کا انتظار کرتے رہتے۔ آنے والے ٹیلی گرام سب سے پہلے وہ
پڑھتے۔ شاید کسی میں بھی راشدہ کا خط ہو۔ شاید ان میں کوئی ان کی راشدہ کا
تار ہو اور اس میں لکھا ہو کہ وہ آرہی ہے۔ اور اسے لینے اسٹیشن پر کوئی آجائے
لیکن ان کی راشدہ کبھی نہیں لوٹی۔ اس کا کوئی خط کوئی تار انھیں موصول
نہیں ہوا۔ ان کی راشدہ جسے انھوں نے گود میں کھلایا تھا۔ جس پر ان کی
دن رات کی نیند حرام ہوگئی تھی۔ جس سے انہیں بے انتہا محبت تھی۔ جو ان
کے بڑھاپے کا سہارا تھی۔ کھانے کی میز پر وہ اس کا انتظار کیا کرتے۔
نرس نیپکن (Napkin) لگاتی اور وہ اس کے چھوٹے سے منہ میں
چمچے سے چائے کے گھونٹ ڈالتے رہتے اور پھر وہ اسے گود میں لیکر سہلاتے
——— "سو جاؤ ——— بیٹی ——— سو جاؤ سوئٹ راشدہ ڈیل
تمہاری امی اولٹین بنا کر لا رہی ہیں۔"

اور پھر وہ اپنی بھونڈی آواز میں گنگنانے لگتے۔ "تمہاری نندیا تو آکر لوٹ
نہ جائے۔"

وہ ٹہلتے رہتے۔ نرس اپنی نیلی آنکھوں سے انہیں مسکرا کر دیکھتی
رہتی۔ اور راشدہ کی آنکھیں نیند کے بوجھ تلے جھکنے لگتیں سائے دھندلے
پڑ جاتے اور راشدہ سو جاتی۔

اور پھر صبح ہوتی ——— ایک نیا دن طلوع ہوتا۔ نوکر باورچی خانہ میں
مشغول ہوتے چمنی میں سے گاڑھا گاڑھا دھواں اٹھ رہا ہوتا۔ اور باورچی خانہ
میں سے چائے کی خوشبو آرہی ہوتی۔ اور سوئیٹ پی کے پھول شبنم اور تتلیاں
کے بوجھ تلے ہولے ملائم جھونکوں کے سہارے جھوم رہے ہوتے
میز پر خاموش بیٹھی غسل خانہ سے آنے والی عشرت چچا کی آواز سنتی
راشدہ کے سفید لب پر کڑھا ہوا خرگوش سامنے بیٹھی ہوئی گھڑی کی
طرف الجھائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہا ہوتا اور راشدہ ذرا رنگ برنگے
پرنگی ہوئی تصویروں میں۔ دیواروں کی شاخوں پر بیٹھے ہوئے پرند
رہتی۔ سامنے کارنس پر آکے اس کی آنکھیں اچانک ٹھہر سی جاتیں
کی تصویر میں ایک عورت سفید شفاف کپڑے پہنے بیٹھی تھی۔ اس کے سر
میں دودھیا پھول سجے تھے اس کی آنکھوں میں ایک سنجیدگی تھی۔ ا
چہرے پر وقار تھا اور لبوں پر ایک بڑی پیاری مسکراہٹ تھی۔ وہ
انہماک سے کسی چیز کو دیکھ رہی تھی۔ راشدہ کو وہ تصویر خدا جانے کیوں
اچھی لگتی تھی۔ جانے اس میں کیا کشش تھی۔ کہ وہ اس کی طرف دیکھ
اس کی پلکیں بے حرکت ہو جاتیں۔ اس کے لب ہل جاتے اور وہ
رہتی۔ آخر کس کی تصویر ہے اور پھر خیالوں کے طلسم سے نکل کر وہ
نیلے آسمان کے نیچے بسنے والی دنیا میں آجاتی ——— جہاں رنگ
رنگ تھے ——— دھانی رنگ بنفشی رنگ ——— اور اس کے منہ
سے بے اختیار نکل جاتا "بڑی پیاری تصویر ہے۔"

کمرہ کا دروازہ آہستگی سے کھلتا ——— اور عشرت چچا وردی
پہنے مسکراتے ہوئے کمرے میں آجاتے۔ کوکونٹ آئیل اور لیونڈر
کی ملی جلی خوشبو سے کمرہ بھر جاتا۔

"——— چائے نہیں پی ابھی تک تم نے؟"

وہ آتے ہی پوچھتے ——— اور یہ ان کا مخصوص فقرہ تھا
کرسی پر ٹیک لگا لیتے ——— ڈبہ میں سے سگار نکال کر روشن کر
آیا سفید نیپکن راشدہ کے لگاتی اور عشرت چچا کے ہاتھوں کے سہا
چائے کے گھونٹ اس کے حلق میں اترنے لگتے۔ وہ ناشتہ کرتی اور
کر کے کنڈرگارٹن کی بس میں بیٹھ جاتی۔

عشرت چچا کی زندگی ایک چرخی کی طرح گردش کر رہی تھی جس
کوئی ٹھہراؤ نہیں تھا ——— بغیر کسی رکاوٹ کے۔ ان کی زندگی
ایک سکون تھا جیسے وہ کسی صورت بھی گزرتا نہیں چاہتے تھے
جانے کہ آخر وہ کیوں زندگی کے اس سکوت سے ڈر

تا ـــــ جیسے کہ یہ خاموشی ـــــ یہ سکوت کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ جیسے کہ سمندر میں طوفان آنے سے پہلے اس کی سطح پرسکون حالت ہوتی ہے۔ ان کی زندگی کا یہ ہموار بہاؤ ـــــ کسی طوفان کا منتظر ہے ـــــ اور یہ سوچتے سوچتے وہ خیالوں سے چونک پڑتے ـــــ اور پھر وہی کمرہ ـــــ اس کی سفید دیواریں اور سامنے لگی ہوئی تصویر کی مسکراہٹ اور واضح ہو جاتی۔ انہیں ایسا لگتا جیسے کہ وہ ان کے اس رویے پر دل کھول کر مسکرا رہی ہوں۔ طنز کر رہی ہوں۔

ایک دن جب وہ کورٹ سے لوٹ رہے تھے۔ لان میں مالی کام کر رہا تھا۔ دھوپ میں سائے لانبے ہوتے جا رہے تھے اور ڈھل رہے تھے۔ سورج کی ڈوبتی زردی بنگلے کے پیلے ہوئے در و دیوار پر پڑ رہی تھی۔ اور برآمدہ میں دھندلاہٹ بکھر رہی تھی۔ کھانے کے کمرہ میں بجلی روشن تھی اور آہستہ سے کمرے میں داخل ہوئے۔ راشدہ کرسی پر اکڑوں بیٹھی تھی۔ میز پر چائے کے برتن بکھرے پڑے تھے اور ایک دائمی سکوت ـــــ جو ان کی زندگی کا ـــــ اس کمرہ کا خاصہ بن چکا تھا بکھرا ہوا تھا۔ وہ کسلمندی سے کرسی پر بیٹھ گئے۔ خاموشی کو صرف ان کی چائے بنانے کی آواز نے توڑا گرم گرم بھاپ اڑاتی ہوئی چائے پیالی میں بکھر گئی۔

"چائے پی تم نے ـــــ رشو؟" انہوں نے ایک بڑا سا چائے کا گھونٹ بھر کر پوچھا۔

"نہیں ـــــ؟" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

"کیوں نہیں پی ابھی تک ـــــ میرا کیوں انتظار کیا کرتی ہو ـــــ پی لی ہوتی چائے۔"

انہوں نے ایک پیالی اس کے لئے بنائی۔ اور اس کے آگے سرکا دی۔

"ڈیڈی ـــــ وہ میری امی ہیں نا؟" ـــــ راشدہ تصویر کی طرف اشارہ کر رہی تھی ـــــ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی پڑتی تھیں جیسے کہ اس نے آج اس تصویر کو دیکھا ہو ـــــ اس کے چھوٹے چھوٹے گلابی لبوں کے کونوں پر دل کی ایک ننھی سی لکیر بہہ نکلی تھی اور اس کی آنکھوں کی پلکوں پر نمی ابھر آئی تھی۔ عشرت چچا نے تصویر کی طرف دیکھا ـــــ ایک سسکی ان کے لبوں پر سے ٹھٹکی ہوئی گزر گئی۔ انہوں نے نڈھال ہو کر اپنا سر کرسی پر ٹیک دیا۔

"ہاں بیٹی تمہاری امی ہی تھیں۔" انہوں نے ڈرتے ڈرتے الفاظ اپنے لبوں سے ادا کئے۔

"ڈیڈی بلا دیجئے نا ـــــ کہاں ہیں ہماری امی ـــــ آیا کہہ رہی تھی۔ کہ وہ کہیں ناراض ہو کر چلی گئی تھیں۔" ـــــ راشدہ نے ایسے ٹلک کر کہا کہ عشرت چچا کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ انہیں سینہ میں ایک چبھن سی محسوس ہونے لگی اور انہیں اپنا سانس گلے میں گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

"کہاں؟" راشدہ کی اس کہاں کا جواب عشرت چچا کے پاس کہاں تھا وہ کیا بتلاتے کہ نجمہ کہاں چلی گئی۔ راشدہ انہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور وہ کہاں کا جواب سوچتے سوچتے کسی اور دنیا میں چلے گئے تھے۔ وہ تصور میں اپنے آپ کو کالی ترشہ کی شیروانی پہنے ہوئے دیکھ رہے تھے جس پر بڑے بڑے پھول بنے ہوئے تھے ان کے تصور کی انگلیاں ریشمی شیروانی کے ملائم لمس کو محسوس کر رہی تھیں ان کے خیالات کا سلسلہ طویل ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اس دنیا سے کہیں اور جا چکے تھے۔ جہاں گھنے اداس آم کے پیڑ کھڑے تھے۔ اور ان پر کوئل کوک رہی تھی۔ جہاں گنگناتی ہوئی ندیاں افق تک رواں تھیں اور درخت کے سایوں میں ندی کے کنارے (Irrigation) ڈیپارٹمنٹ کا چھوٹا سا بنگلہ تھا۔ اور کنارے پر دور تک پھول ہی پھول تھے زعفرانی نیلے گلاب بنفشی رنگا رنگ کے پھول۔ جہاں ہوائیں پھولوں اور شہد کی خوشبو سے لدی ہوئی چل رہی تھیں۔ اور پھر انہیں وہ دن بھی یاد آ جاتے جب وہ موسلا دھار بارش میں اپنی کرم خوردہ موٹر میں دورے پر نکلتے اور موٹر کی چھت اسی تیزی سے ٹپکتی جس تیزی سے بارش ہوتی۔ وہ اپنے سولا ہیٹ پر بارش سے بچنے کے لئے برساتی چڑھا لیتے۔ کپڑوں کے اوپر برساتی کوٹ (Rain Coat) اچھی طرح لپیٹ لیتے لیکن چھت کے سوراخ سے برسنے والا پانی ان کو بالکل بھگو دیتا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا کہ پانی کیچڑ کی چھت کے نشیب و فراز میں بھر جاتا۔ اور جب بارش رک جاتی تو ان کی چھت گھنٹوں بارش کی سی تیزی سے ٹپکتی رہتی۔ اور پھر راستہ میں موٹر فیل ہو جاتا تو وہ آنے والے مسافروں کی تاک میں کسی درخت کے نیچے ٹھہر جاتے۔ موٹر کو دھکا دے کر آگے بڑھا لیا جاتا ـــــ

مگر وہ کچھ دور جا کر پھر فیل ہو جاتا۔ اور اس مرتبہ پھر نئے سرے سے انہیں انتظار کرنا پڑتا۔

لیکن دفعتاً انہیں کسی نے مشورہ دیا کہ موٹر کے لئے ایک بیل گاڑی خرید لی جائے ——— تو اس پر وہ بہت خفا ہوئے۔ بیل گاڑی تو خیر کیا خریدتے مگر انہوں نے ایک لڑکا ضرور نوکر رکھ لیا تھا۔ وہ اس... منحوس موٹر کے ہاتھوں بہت نالاں تھے۔ وہ ہر طرح اسے بیچنا چاہتے تھے اگر کسی نے سودا کرنے سے پہلے موٹر دیکھ لی تو پھر وہ کبھی اس کے متعلق بات نہیں کرتا تھا۔ دو چار کباڑیوں نے اس کی قیمت ضرور لگائی تھی لیکن عشرت چچا کباڑیوں کے ہاتھوں موٹر بیچنے کو ہرگز تیار نہیں تھے۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ عود کر آتی۔ کیا موٹر تھی وہ بھی ——— آہ! ان کے ہونٹ دفعتاً بھینچ گئے۔ مسکراہٹ ایک کرب انگیز تخیل میں گم ہو گئی۔ اور انہیں اس دھندلی فضا میں غم و اندوہ میں لپٹا ہوا [illegible] ارگیشن ڈیپارٹمنٹ کا وہ بنگلہ ان کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ ایک شام تھی۔ سورج دور ندی کے پانی میں غروب ہو رہا تھا۔ اور وہ باہر لان میں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھے تھے۔ اور اندر کے کمرے میں نجمہ لیٹی تھیں۔ انہیں ایک لطیف احساس ہو رہا تھا۔ جب کہ آج ان کے کندھوں پر ایک نئی ذمہ داری پڑنے والی تھی وہ اپنے دل میں اپنے بچے کے لئے ایک شفقت محسوس کر رہے تھے۔ ایک باپ کی سی شفقت۔ اور اندر نجمہ درد و کرب سے بے چین پلنگ پہ کروٹیں بدل رہی تھیں۔ ان کو شام سے بخار تھا۔ ڈاکٹر ابھی تک نہیں آئی تھی اور عشرت چچا بہت بے چین تھے۔ آخر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ نجمہ کی نبض دیکھی۔ بہت تیز چل رہی تھی۔ ان کے چہرہ پر نقاہت برس رہی تھی رنگ پھیکا پڑتا جا رہا تھا۔ عشرت چچا ان کی نقاہت برداشت نہ کر سکے اور ڈاکٹر کو لینے چلے گئے۔ موٹر جھٹکے کھاتی چل رہی تھی۔ جگہ جگہ رکتی۔ پھر چلتی ——— پھر رک جاتی۔ ان کی طبیعت چاہ رہی تھی۔ کہ وہ اس موٹر سمیت کسی گہری سی ندی میں ڈوب کر خودکشی کر لیں۔ لیکن ان کے سامنے دو زندگیاں تھیں نجمہ اور پیدا ہونے والا بچہ جس کے وہ باپ تھے۔ اور ان کے دل میں ایک نہ مٹنے والا جذبہ ابھر آیا۔ انہوں نے رفتار تیز سے تیز تر کر دی ——— اور جب وہ لوٹ رہے تھے تو چاروں طرف اندھیرا تھا۔ نہ ختم ہونے والا اندھیرا ——— تاریکی۔ نہ ختم ہونے والی تاریکی ——— اور ان کے ہیڈ لائٹس کی کمزور روشنی بھاگتے ہوئے کھیتوں اور اونچے ٹیلوں پر پڑ رہی تھی ——— کیسی ہو گی"؟ اور اس کا جواب وہ خود نہ دے سکے اور ابھی بنگلہ دس میل دور تھے۔ اور موٹر کی رفتار کم ہوتی جا رہی تھی انہوں نے دبایا ——— اور موٹر تیز ہونے کے بجائے جھٹکے سے گنگناتا ہوا انجن خاموش ہو گیا اور رات کا سکوت بڑھ گیا ——— ان کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی ——— ہر چیز ٹھیک تھی۔ انجن کافی تھا پیٹرول کا ٹینک پورا بھرا ہوا تھا۔ وقت گذرتا جا رہا تھا۔ نجمہ ان سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ سکوت بڑھتا جا رہا تھا۔ موت آ رہی تھی اور موٹر کا انجن خاموش تھا۔ سرد پسینہ ان کی پیشانی سے ٹپک رہا تھا نیلے آسمان کی وسعت میں تارے جگمگا رہے تھے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے ہنس رہے تھے ان کا مذاق اڑا رہے تھے اور نجمہ ان سے دور ہوتی

اور جب وہ تھک ہار کے موٹر میں بیٹھ گئے تو ان کے ملازم دھکا دینا شروع کیا۔ وہ بار بار بریک لگا کر ایکسیلیٹر دباتے پیٹرول کھولتے دفعتاً ان کی موٹر کا انجن پھر جاگ اٹھا۔ ——— سناٹے میں انجن کی غرغراہٹ سے پرندے درختوں پر سے اڑنے لگے اور وہ جب گھر ہو کر صوفے پر گر پڑے۔ ڈاکٹر اندر چلی گئی ——— وقت گذر رہا تھا۔ رینگ کر چل رہا تھا۔ نجمہ بیڈ روم میں بے چین تھیں۔ گھڑی کی ٹک ٹک میں گھڑیال کی طرح گونج رہی تھی۔ انہیں اپنے دل دھڑکنے کی آواز صاف دے رہی تھی۔ اور وقت گذر رہا تھا۔ موت نزدیک آ رہی تھی ——— نجمہ ان سے بہت دور جا رہی تھی ——— بہت دور ——— اور پھر ایک کمرہ میں گونج گئی ——— ایک چیخ جو ان کے کانوں کے پردے چیرتی ہوئی گذر گئی اور پھر نجمہ ان سے بہت دور چلی گئی ——— بہت دور ——— جہاں کوئی نہیں لوٹتا۔ ——— کوئی واپس نہیں آتا۔ اور پھر راشدہ راشدہ جو نجمہ کی آنکھوں اور گالوں کا ایک مبہم سا خاکہ تھی ——— راشدہ

"کہاں چلی گئیں امی" وہ تخیلات کے تانے بانے سے چونک کر نکل آئے۔ سامنے کی میز پر راشدہ اپنی آنکھیں حیرت سے پوری کھولے مجسم سوالیہ نشان بنے بیٹھی ہوئی انہیں تک رہی تھی۔ چائے کے برتن میز سے ہٹائے جا چکے تھے اور پلیٹیں بجی ہوئی تھیں۔

اور وہ پوچھ رہی تھی "کہاں چلی گئیں امی" اور عشرت کے ہونٹ ———

راشدہ اکثر یہی سوال کرتی اور وہ خاموش ہو جاتے اور پھر کھانے کی میز پر اٹھتی ہوئی بھاپوں میں راشدہ کی کہانی تحلیل ہو جاتی اور عشرت چچا کارنس پر رکھی ہوئی تحریر سے سرگوشی کرتے۔

"کہاں چلی گئیں تھیں تم روٹھ کے بتاؤ تو نا" ہم چھپ چھپ کے ٹوں سے نکالتے رہتے جیسے کہ وہ کہہ رہے ہوں "کہاں کہاں" اور تصویر مسکراتی رہتی —— مسکراتے جاتی۔ ابدی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر رہتی۔ وہ مسکراہٹ جو اس کے ہونٹوں پر اس وقت آئی تھی جب کہ اس نے دنیا کی تازہ ہوا کو پیا تھا اور کس پیاری سی مسکراہٹ۔ اور پھر راشدہ ان کی گود میں آ بیٹھتی —— "سو جاؤ بیٹی سو جاؤ راشدہ ڈیر تمہاری امی تمہارے لئے اولین چکر لا رہی ہیں" اس کی پلکیں نیند سے بوجھل ہو جاتیں اور وہ سو جاتی۔

راشدہ بڑی ہوتی گئی اور یہ ننھا سا سہارا انہیں ایک خوشگوار مستقبل احساس دلانے لگا۔ وہ اب اتنی گود میں اگر نہیں بیٹھتی تھی اب وہ اسے گود میں لے کر نہیں سلاتے تھے۔ اس میں ایک سنجیدگی اور وقار پیدا ہو چلا تھا۔ جب عشرت نہا کر نکلتے تو وہ ان کے لئے چائے بناتی۔ ان کے بالوں میں تیل ڈالتی کپڑے استری کرتی۔ شیو کے پانی کی حرارت دیکھتی۔ اور عشرت چچا کرسی پر سر رکھے کھڑے مسکراتے رہتے ان کی نگاہیں کارنس پر رکھی ہوئی تصویر پر جمی رہتیں پھر وہ تصویر سے نظریں ہٹا کر راشدہ کی طرف دیکھنے لگتے۔ اس کے بال ریشم سے ملائم تھے۔ اس کی آنکھوں میں جھیلوں کی سی گہرائی پیدا ہو چلی تھی چہرہ کے رنگ میں گلابی گھل رہی تھی۔ اور اس کے ہونٹوں پر تازگی نکھر آئی تھی۔ وہ اسے دیکھتے رہتے۔ چائے کے آخری گھونٹوں تک وہ اپنی پرشفقت نگاہیں اس پر جمائے رہتے۔ اور پھر دور لمبے لمبے گھنے درختوں کے سائے میں کالج کی بس آ کر رک جاتی۔ بس کے ہارن کی آواز سن کر راشدہ کتابیں سنبھالتی ہلکے قدم اٹھاتی سرخ بجری پر سے گذرتی بس میں بیٹھ جاتی۔ بس چل دیتی۔ اور وہ اسے اپنے خیالوں میں دلہن بنا ہوا دیکھتے۔

"کوئی اچھا سا لڑکا مل جائے ——" ان کے لفظ امڈ آتے۔ منہ اوپر کو اٹھ جاتا۔ آنکھیں خلا میں ٹک جاتیں اور اکثر راشدہ کے متعلق سوچتے۔ پھر وہ لڑکوں کے متعلق سوچنا شروع کرتے۔ لڑکے۔ جو راشدہ کو اپنا سکیں۔ جو اس کی اداس سنسانی کو کم کر سکیں۔ وہ راشدہ کو کسی دوسرے گھر میں نہیں بھیجیں گے۔ راشدہ چلی گئی تو ان کا سب کچھ چلا جائے گا —— سب کچھ لٹ جائے گا —— وہ راشدہ کے شوہر کو اپنے گھر رکھیں گے

ان کو راتیں ویران اور دن سنسان محسوس ہونے لگتے۔ وہ حیران ہو جاتے کہ انہوں نے اس تنہائی میں اتنے بے شمار دن کیسے گزارے کیسے بسر کئے۔ ان کے کان گھر میں ایک چہل پہل۔ شور و شغب سننے لگتے جیسے کہ بچے طویل برآمدوں میں دوڑ رہے ہوں۔ آنکھ مچولی کھیل رہے ہوں۔ جیسے کہ بچے —— ان گنت بچے ان کی گردن میں لٹک رہے ہوں جھول رہے ہوں لیکن ان کی گردن بچوں کے بوجھ تلے اور بھی طاقتور اور مضبوط ہو گئی ہو۔ اور پھر وہ راشدہ کے لئے اپنے دماغ کے کونوں میں بسے ہوئے لڑکوں کو تلاش کرنے لگتے۔ اپنے جتنے دوست ان کو یاد کرتے۔ اور پھر اس زمانے میں الجھ کر رہ جاتے۔ کمرے میں نوکر آہستگی سے داخل ہوتا۔ انہیں جوتے پہنانے لگتا۔ اور پھر وہ کوٹ پہن کر دفتر چلے جاتے۔

ایک دن وہ دفتر سے لوٹے تو انہوں نے خلاف معمول ملاقاتی کمرے کی بجلی جلی ہوئی دیکھی۔ کمرے میں سے قہقہے ابل رہے تھے آج اس سنسان بنگلے میں پہلی دفعہ قہقہے گونج رہے تھے۔ ان کے بنگلے پر ہمیشہ ایک پراسرار اداسی —— ایک پراسرار خاموشی چھائی رہتی تھی انہیں ہمیشہ کمروں میں گرجا کا سا مقدس سکون محسوس ہوتا۔ مگر آج اس سکوت کو قہقہے توڑ رہے تھے۔ اور ان میں راشدہ کی آواز بے حد نمایاں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کہ وہ بہت خوش تھی۔ عشرت چچا کمرہ میں قدم رکھتے ہوئے ٹھٹکے۔ مگر پھر وہ اندر چلے گئے کمرہ تمباکو اور کافی کی ملی جلی خوشبو سے بھرا ہوا تھا۔ راشدہ کے برابر ایک لڑکا اور ایک لڑکی بیٹھے تھے۔ عشرت چچا کے لئے انجان تھے۔ عشرت چچا کے کمرہ میں داخل ہونے سے ایک خاموشی چھا گئی۔ وہ سب احتراماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ راشدہ نے تعارف کرایا۔ نزہت اس کی سہیلی تھی اور محمود اس کے بڑے بھائی تھے۔ وہ آج دلچسپی میں انہیں مدعو کر لائی تھی۔

عشرت چچا کے چہرے پر پڑے ہوئے حلقے گہرے ہو گئے۔ بھویں جم سی گئیں اور ان میں ایک گمنام سا اضطراب برسنے لگا۔ انہوں نے اپنی نظریں محمود پر گاڑ دی تھیں۔ اس نے خاکی گیبرڈین کی یونیفارم پہن رکھی تھی اور کسی غیر ملک کے سفارت خانہ میں ملازم تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ اور انگلیوں پر سگرٹ کی زیادتی سے زردی

فشاں تھے۔ انھوں نے سر سے پیر تک اس کا جائزہ لیا۔ وہ کافی پیتے رہے اور سوچتے رہے۔ کبھی راشدہ کو دیکھتے جس کے چہرے کا رنگ گلابی ہو رہا تھا۔ اور وہ محمود سے رقص کے متعلق بڑی دلچسپی سے گفتگو کر رہی تھی۔ ان کی گفتگو میں ——— [illegible]) اور ایسا کے نام بار بار آ رہے تھے اور عشرت چچا خاموش بیٹھے تھے ———"آپ نے بھی تو رقص سیکھا ہوگا؟" محمود نے آہستہ سے پوچھا۔

"رقص ——— جی نہیں مجھے اس سے کوئی خاص لگاؤ نہیں۔"

راشدہ نے جواب دیا۔ عشرت چچا نے کرسی آہستہ سے سرکائی اور ڈرائنگ روم میں آ کر صوفہ پر لیٹ گئے۔ کھانے کے کمرہ میں برتن کھنکتے رہے قہقہے ابلتے رہے اور وہ صوفہ میں سر دیئے لیٹے تھے اور ان کے ذہن میں طرح طرح کے لڑکے ابل رہے تھے جو راشدہ کو اپنا سکیں جو اس کی اس تنہائی کو دور کر سکیں۔ مگر محمود کی شبیہہ ان کے ذہن میں آتے ہی ان کے سوچنے کی قوت معدوم پڑ جاتی۔ انھیں محمود خدا جانے کیوں ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ وہ کسی ملک کے سفارت خانے میں باہر جانے والا تھا ———

"اور اگر وہ راشدہ کو محمود کو دیدیں ——— ؟ نہیں نہیں وہ اسے لے کر چلا جائے گا۔ بہت دور۔ ان کی پہنچ سے بھی دور ان نیلے پانیوں کی وسعتوں سے بھی پرے۔" اور انھوں نے اپنے اس خیال کی خود ہی شدت سے مخالفت کی۔ وہ سوچتے رہے ——— بیٹھے رہے۔ انھیں یہ بھی نہ معلوم ہوا کب سورج ڈوبا ——— کس نے ان کے کمرہ کی لائٹ روشن کی ——— اور جب وہ جاگے تو راشدہ ان پر جھکی ہوئی تھی۔

"ابا کھانا نہیں کھائیں گے کیا؟" اور وہ بے حس و حرکت پڑے رہے اور پھر وہ چونکے اور کھانے کے کمرہ میں چلے گئے۔ اور ایک دن راشدہ انھیں چھوڑ کر چلی گئی۔ ایک نازک سے تنکے کا سہارا جو انھیں زندگی کے پُرشور سمندر میں ملا تھا۔ انھیں موجوں کے آسرے پر چھوڑ کے چلا گیا۔ وہ محل جو انھوں نے نازک بنیادوں پر تعمیر کیا تھا۔ وہ ڈگمگاتا ہوا زمین پر آ رہا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا آ گیا۔ راشدہ چلی گئی تھی کبھی نہ آنے کے لئے۔ وہ اس دنیا میں تنہا رہ گئے تھے۔ صرف سوچنے کے لئے صرف سپنوں اور خیالوں کے جال بننے کے لئے صرف نمکین آنسو پینے کیلئے

ان کے ہاں محمود اکثر آنے لگا تھا۔ عشرت محمود اور راشدہ میز کے گرد بیٹھے رہتے۔ راشدہ محمود کی باتیں سنتی رہتی۔ اس کی آ... کے چہرہ پر گڑی رہتیں۔ کمرہ میں قہقہے گونجتے رہتے ——— ابلتے بے سر و پیر باتیں کرتے۔ سینما کی۔ کھیلوں کی۔ فوٹو گرافی کی۔ اور... برآمدہ میں ٹہلتے رہتے۔ وہ محمود کو تکتے رہتے۔ اور ان کے دل میں کوئی بول اٹھتا ——— "یہ راشدہ کو تمہارے پاس سے دو... گا۔ بہت دور۔ جہاں سے تمہارے تخیل کی پرواز بھی اسے تمہارے... نہیں لا سکے گی۔ یہ موقع ہے ——— یہی وقت ہے اور وقت نہیں دیتا ——— اور وہ اپنے حلقے کو ہاتھوں میں دبا لیتے اور لڑکوں کے متعلق ... سوچتے ——— پھر اپنے دوستوں کے نام د... اور ایک دن جب محمود جا چکا تھا تو انھوں نے راشدہ سے سب کچھ ک... انھیں نہیں کہنا چاہیے تھا۔ اور راشدہ چلی گئی۔ بغیر کچھ کہے۔ بغیر کچھ بتا...

اور ایک دن جب وہ دفتر سے لوٹے تو خلافِ معمول گھر پر... تھی۔ خنک ہوا دھیرے دھیرے چل رہی تھی اور کھانے کے کمرہ... بیٹھی ان کا انتظار کر رہی تھی۔

"ہنہ...... آج محمود نہیں آیا ——— کیا؟" انھ... خاموشی کو توڑنے کے لئے کہا۔

"جی نہیں" خاموشی پھر چھا گئی۔

"بیٹی ———" انھوں نے دزدیدہ نگاہوں سے... کے خیالات کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

"جی" راشدہ نے جواب دیا۔

"بیٹی۔ میں بہت دن سے سوچ رہا تھا کہ تم سے کچھ ک... زبان رک سی جاتی تھی۔ آج تمہاری والدہ ہوتیں ———" انھو... ٹھنڈا سانس بھرا۔ اور آگے کہنے کے لئے ایک لمبا سا سانس لیا۔ ... خاموش بیٹھی تھی۔ اس کی پیالی میں سے چائے کی بھاپ اٹھ رہی... مگر ایک نہ ایک دن مجھے ہی تم سے سب کچھ کہنا پڑتا۔" ا... فقرہ نا تمام چھوڑ کر کہنا شروع کیا "بیٹی! تم اب بڑی ہو گئی ہو۔ پرسوں حسین صاحب کا خط آیا تھا۔ وہ اور ان کے لڑکے چند دن گھومنے... یہاں آ رہے ہیں۔ ارشد حسین کو تو تم جانتی ہو نا؟" انھوں نے پو...

ارشد حسین صاحب بھی ———— جی ہاں " راشدہ کا سانس
ہا تھا: ایک دفعہ وہ آئے بھی تھے "

" ہاں ہاں وہی بیٹی ———— میری مدت سے ایک خواہش
ت سے ایک تمنا تھی " ان کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ سانس تیز تیز
تھا۔ دل کے دھڑکنے کی آواز ان کے کانوں میں صاف سنائی دے
۔ انھوں نے اپنے پر قابو پاکر پھر کہنا شروع کیا۔

" میری مدت سے تمنا تھی کہ تمہیں ایک دن دلہن بنا دیکھوں۔
لڑکے کو میں جانتا ہوں۔ بڑا نیک سا بچہ تھا ——"

عشرت چچا کہہ رہے تھے اور راشدہ کے چہرے پر گلابی رنگ کی
ہہ رہی تھی۔ وہ میز کے پوش کے سفید کپڑے کو اپنے ناخنوں سے
جا رہی تھی۔

اس نے پچھلے سال یونیورسٹی سے ایم اے کیا ہے۔ بڑا ہی نیک
۔ تم خود ہی دیکھ لو گی ——"

" ڈیڈی " ———— راشدہ کے منہ سے بے اختیار نکل گیا
رت چچا کا تصور ٹوٹا۔ تو راشدہ جا چکی تھی۔ کرسی خالی تھی۔ اور ان کے
ں پر مسکراہٹ تیر گئی۔ مگر وہ راشدہ سے سب کچھ نہ کہتے تو کیا کرتے
نے سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا۔ وہ اب بڑی ہو گئی ہے ایک نہ
ن انھیں یہ سب کچھ کہنا ہی تھا۔ پرسوں ارشد حسین آ رہے ہیں
ں اچھا ہوا۔ وہ تو یہ خود چاہتے ہی تھے اور انھیں محسوس ہوا کہ ان کے
دل پر سے ایک بوجھ ہلکا ہوتا جا رہا ہے۔ اس گھر میں خوشی اور
وشی رہی ہے ———— اس گھر کی سنسانی اور سکوت کا سحر
ٹنے والا ہے۔

وہ دن بہت حسین تھا۔ اس دن وہ بہت خوش تھے۔ اس دن
وہ کیوں مسکرائے جا رہے تھے۔ لیکن انھیں کیا معلوم تھا کہ اس دن
م کس قدر منحوس ہو گی۔ وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ دن بھر کی خوشی
کے آنسو بے کر آئے گی۔ راشدہ کی سالگرہ تھی۔ دن بڑا خوشگوار تھا۔ لہٰذ
یہ جس دن راشدہ کی منگنی کے متعلق بات چیت کر کے واپس
تھے۔ لان میں بنفشے کے پھول کھلے تھے اور شبنم کی آغوش میں
دوش پر جھکولے لے رہے تھے۔ شہد کی مکھیاں پھولوں پر بیٹھی

شہد پی رہی تھیں۔ اور وہ کھانے کی میز پر مسکرا مسکرا کر تصویر کو دیکھے
جا رہے تھے۔ جو سامنے کارنس پر رکھی تھی۔ کمرے میں چار کی بھینی بھینی
خوشبو بسی ہوئی تھی۔ انھوں نے جلدی جلدی چار کی پیالی ختم کی۔ پیالی
کو پیچ پر رکھا۔ اور دفتر جانے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ لیکن ان کا دل دفتر
جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ چاہ رہے تھے کہ راشدہ ان کے سامنے بیٹھی
رہے۔ اور وہ اس کی انگلیوں کو سویٹر بنتے دیکھتے رہیں۔ اپنے اس نازک
سہارے کو معصومیت سے تھامے رہیں۔ مگر وہ ذہنی جذبہ کے قائل نہیں تھے
انھوں نے خاموشی سے سگار سلگایا اور دفتر چلے گئے۔

شام کو جب وہ گھر لوٹے تو تمام کمرے سنسان پڑے ہوئے تھے
کھانے کے کمرہ میں روشنی بالکل نہیں تھی۔ میز خالی پڑی تھی اور وہاں کوئی
نہ تھا۔ انھوں نے آیا کو بلایا۔

" راشدہ ابھی تک نہیں آئی کیا؟" انھوں نے پوچھا۔

" جی ———— ابھی تک نہیں لوٹیں " آیا نے جواب دیا۔

وہ گھبرا گئے۔ پچھلے دس سال سے انھوں نے راشدہ کو اس میز
کے گرد بیٹھے دیکھا تھا اور آج وہ کرسی خالی پڑی تھی۔

" کالج کب گئی تھیں ؟" عشرت چچا نے پوچھا۔

" آپ کے جانے کے تھوڑی دیر بعد۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھی
رو رہی تھیں۔ پھر اپنی کتابیں انھوں نے الماری میں بند کیں۔ اور یہ خط
مجھے دے کر چلی گئیں —— " آیا نے رکتے رکتے جواب دیا۔ اور خط عشرت چچا
کو دے دیا۔ سکوت پھر چھا گیا۔ باہر ہوا کھڑکی کے دروازوں سے ٹکرا رہی
تھی۔ خشک پتے ہوا میں بکھر رہے تھے۔ اور ان کے گرنے کی آواز فضا
میں ایک پر اسرار خوف پیدا کر دیتی تھی۔ درخت خلا کے اندھیرے غار میں
ڈوبتے جا رہے تھے۔ اور باورچی خانہ کی چمنی سے گاڑھا گاڑھا سیاہ دھواں
تاریک آسمان پر پھیل رہا تھا۔

عشرت چچا نے خط پڑھا ———— ان کے چہرے پر رنج میں
غم میں ڈوبی مسکراہٹ تھی۔ وہ دانتوں میں ہونٹ دبائے بیٹھے تھے۔
پھر ان کی سفید آنکھوں میں آنسو بھر آئے ———— اور پھر ان کی آنکھوں
کی پتلیوں میں سے آنسو بہ نکلے۔ میز کے سفید پوش پر گر کر جذب
ہو گئے۔ ان کے ہونٹوں پر سے مسکراہٹ بکھر گئی۔ اور اس کے بعد نہیں

کسی سے مسکراتے نہیں دیکھا۔ اس خط کے بعد انہیں کوئی خط نہیں ملا راشدہ کبھی لوٹ کے نہیں آئی۔ سامنے کارنس پر ایک اور تصویر کا اضافہ ہوگیا۔ تصویر میں راشدہ کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی آنکھوں میں جھلکتی نیلی اداس جھیلوں کی سی گہرائی تھی۔ عشرت چچا میز پر بیٹھے لاکر خط کے لفافہ کو کھولتے۔ بار بار پڑھتے۔ پھر خط ان کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ——— میز پر گر جاتا۔ وہ ہاتھوں میں سر دے کر بیٹھ جاتے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو رس رس کر میز پوش میں جذب ہوتے رہتے۔ ان کی آنکھوں میں ایک پُر ہول مستقبل جھانکنے لگتا۔ جب کہ وہ بوڑھے ہوں گے جب کہ ان کے ہاتھوں میں رعشہ ہوگا۔ ٹانگیں کانپ رہی ہوں گی ان کے ہاتھ سہارا چاہیں گے اور سہارا ان سے بہت دور ہوگا۔

اور وہ خط جس کا کاغذ نیلا تھا راشدہ کا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ وہ انہیں ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر جا رہی ہے۔ اس ہندوستان سے بہت دور جہاں اس کے سانس نے حرارت پائی۔ جہاں کی مرطوب برساتوں میں اس نے پھولوں اور شہد سے لدی ہوئی ہواؤں کو پیا۔ جہاں اس نے سورج کی نرم مہربان دھوپ کا لمس اپنے چہرہ پر محسوس کیا۔ اس نے محمود سے شادی کر لی ہے وہ روم جا رہی ہے جہاں محمود سفارت خانہ میں سکریٹری کی حیثیت سے جا رہا ہے۔ وہ اس لئے یہاں سے جا رہی ہے کہ وہ باپ کی آنکھوں کی محبت ——— جس کا خون اس نے اپنے خود غرض دلی جذبے کی خاطر کر دیا ——— برداشت نہیں کر سکتی وہ ان.... آنکھوں میں دہکتی ہوئی آگ کی تپش کو نہیں سہہ سکتی تھی۔ اس نے اپنے مغرور باپ کے دلی جذبہ کی قدر نہیں کی جس نے اسے دسمبر کی ٹھٹھرتی ہوئی راتوں میں اپنے سینہ کی خوشگوار گرمی پہنچائی۔ تاکہ وہ زندہ رہے۔ اپنی ماں کے غم کو اپنی معصوم محبت سے دھو دے۔ انھوں نے اسے اپنے ہاتھوں میں پیکر راتیں جاگ کر گذار دیں۔ تاکہ وہ کچی نیند نہ اٹھ بیٹھے۔ مگر وہ چلی گئی۔ بغیر سوچے بغیر سمجھے۔ بغیر بتائے۔ ایک موہوم سے جذبہ کے سہارے جس کی بنیاد وقت پر ہے اور وقت کسی کا ساتھ نہیں دیتا وقت کے ساتھ کوئی نہیں چل سکتا۔ ان کی راشدہ انھیں چھوڑ کر چلی گئی وہ روم کے کسی کیفے میں ساحلی ہواؤں کے آغوش میں بیٹھی کافی پی رہی ہوگی ——— اور عشرت چچا اس برساتوں میں ٹہل ٹہل کر اپنے غم کے بوجھ کو ہلکا کر رہے ہیں وہ روز آنے والی ڈاک دیکھتے ہیں صبح شام تک اپنے کمزور ڈنڈے کے سہارے گھومتے ہیں اور سامنے کیلنڈر میں ۲ اپریل کے ہندسے چمک رہے ہیں اور دھوپ اب کمرے میں بھر گئی ہے۔ ایک مسلا ہوا نیلا لفافہ ان کی مسہری کے پاس پڑا ہوا ہے۔ ان کے الفاظ مٹ چکے ہیں۔ دراوزوں سے پردے ہٹ گئے ہیں۔ باہر برآمدہ میں نوکر صفائی میں مشغول ہیں۔ اور عشرت چچا آنے والی ڈاک کا انتظار بڑی بے چینی سے کر رہے ہیں ✦

(بشکریہ ہمایوں)

عرشی بھوپالی

اُلجھ رہے ہیں اندھیرے!

دیں ڈوبی سحر سے، سلگتی شاموں سے
زر رہے ہیں مسافر کٹھن مقاموں سے

الٹ نہ دیں کہیں ساقی بساطِ میخانہ
گریز چاہیئے اتنا نہ تشنہ کاموں سے

ارِ منزلِ مقصود ہو غبار آلود
ر چھپے گی کہاں تک جنوں خراموں سے

نوید موسمِ گل لے اڑی جنھیں صیاد
کہیں رُکے ہیں وہ طائر شکستہ داموں سے

جہانِ سُرخ کہاں اور کہاں مرا اسلام
الجھ رہے ہیں اندھیرے سحر مقاموں سے

رحمت شاد

یہ وہ بہار تو نہیں

بسسک رہی ہے آرزو حیات سوگوار ہے
ہر اک ملول و مضمحل ہر ایک اشکبار ہے
بپا نظامِ زندگی میں ایک انتشار ہے
ہر اک طرف ہے شور و شر ہر ایک بیقرار ہے
وہ جس کا انتظار تھا وہ یہ بہار تو نہیں
یہ وہ بہار تو نہیں، یہ وہ بہار تو نہیں

وہ دیکھ شب کی تیرگی میں کارواں کھو گئے
وہ دیکھ اس چمن میں خواہشوں کے خون ہو گئے
دل و ضمیر لٹ گئے دماغ پست ہو گئے
مجاہدوں کے ولولے بسسک بسسک کے سو گئے
وہ جس کا انتظار تھا یہ وہ بہار تو نہیں
یہ وہ بہار تو نہیں، یہ وہ بہار تو نہیں

مجاہدینِ صف شکن کی فطرتیں بدل گئیں
ہمارے رہبروں کی آج نیتیں بدل گئیں
دل و نظر بدل گئے طبیعتیں بدل گئیں
رگوں میں خون جم گیا وہ ہمتیں بدل گئیں
وہ جس کا انتظار تھا یہ وہ بہار تو نہیں
یہ وہ بہار تو نہیں، یہ وہ بہار تو نہیں

کنہیا لال کپور

گئوہتیا

"بابوجی! یہ میری سہیلی یاسمین ہے!" آشا نے اپنی سہیلی کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

میں نے اخبار سے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ ایک چھوٹی سی خوبصورت لڑکی آشا کی ہم عمر سبز رنگ کی شلوار اور قمیص پہنے میرے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

"بڑی پیاری بچی ہے!" میں نے کہا۔ "یہ کس کی لڑکی ہے آشا؟"

"وہ جو نئے مسلمان بابو ہمارے پڑوس میں آئے ہیں نا — ان کی بیٹی ہے میری جماعت میں پڑھتی ہے۔"

"شاباش!" میں نے لڑکی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"بابوجی یہ بہت اچھا گاتی ہے۔"

"واقعی!"

"اس نے مجھے ایک گانا سکھایا ہے!"

"بہت خوب!"

"بابوجی آپ میرے لئے گڑیا کب لائیں گے؟"

"کل!"

"کل نہیں آج — آج شام!"

"اچھا، اچھا لا دوں گا اب جاؤ — یاسمین اور تم کھیلو، مجھے اخبار پڑھنے دو!"

بڑی وحشت ناک خبریں آ رہی تھیں۔ کلکتہ میں ہندو مسلم فساد ہو گیا تھا۔ چھرے گھونپے جا رہے تھے، مکانوں کو آگ لگائی جا رہی تھی عورتیں اٹھائی جا رہی تھیں۔ میں یہ خبریں پڑھ کر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا، یہ کیا ہو گیا ہے ہندوؤں اور مسلمانوں کو؟ شریفوں کی طرح کیوں نہیں رہ سکتے۔ عورتوں پر حملے، عورتوں کا اغوا، خیر یہ کلکتہ ہے اپنے لاہور میں ایسی باتیں نہیں ہو سکتیں۔ پنجابی زیادہ سمجھدار واقع ہوئے ہیں۔ وہ ان باتوں کی نوبت نہیں آنے دیں گے یہاں ہندو اور مسلمان شیر و شکر رہتے ہیں۔ کلکتہ پاگل ہو گیا ہے کاش وہ لاہور سے کچھ سیکھتا۔

"بابوجی! اس اتوار کو میں اور یاسمین گڑیا کا بیاہ کر رہی ہیں۔ آپ دیکھنے آئیں گے نا —! میری گڑیا دلہن بنے گی، یاسمین کا گڈا دولہا!"

"ہاں، ہاں ضرور دیکھنے آؤں گا۔"

یہ فساد کیوں ہو رہا ہے؟ یہ فساد کون کراتا ہے؟ دراصل ہم سب مجرم ہیں۔ ہمارے دلوں میں کھوٹ ہے کہنے کو ہم ایک دوسرے کو بھائی کہتے ہیں۔ لیکن اصل میں دشمن سمجھتے ہیں۔ سینکڑوں سال اکٹھا رہنے کے باوجود ہم ایک دوسرے کو نہیں سمجھ سکے۔ صدیوں سے گنگا بہہ رہی ہے۔ لیکن اس میں کوثر کی دھار کیوں نہیں مل سکی۔ شاید کوثر اور گنگا الگ الگ بہنا چاہتی ہیں۔ شاید گنگا نے کوثر کو نزدیک نہیں آنے دیا۔ شاید یہ کبھی نہیں مل سکتے مگر کیوں نہیں مل سکتے۔ دونوں میں صاف شفاف اور پاکیزہ پانی ہے!

شاہی محلے میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ ہندوؤں کے صرف چند گھر تھے۔ اس محلے میں رہنے والے ہندو اور مسلمان بہت کم ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ ان کا اصول تھا۔ اپنے کام سے کام رکھو۔ یہی وجہ تھی کہ سید قربان علی قریشی سے جو میرے پڑوس میں تین مہینے سے رہ رہا تھا میں ایک بار بھی ملنے نہیں گیا تھا۔ مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ میری طرح ملازم ہے۔ لیکن اس کے ساتھ میری بات چیت کبھی نہیں ہوئی تھی۔ عجیب بات تھی میں اس کا پڑوسی تھا۔ وہ شریف آدمی معلوم ہوتا تھا۔ پھر میں اس سے کبھی ملنے کیوں نہیں گیا۔ لیکن وہ بھی تو مجھ سے کبھی ملنے نہیں آیا۔ شاید وہ بہت مصروف رہتا ہے۔ ممکن ہے اسے میرے ساتھ راہ و رسم پیدا کرنے میں اعتراض ہو — مگر کیوں؟

★

"بابوجی! آپ بہت برے ہیں!"

"کیوں آشا ؟"

"میری سہیلی یاسمین بیمار ہے۔ اور آپ اسے پوچھنے تک نہیں گئے!"

"یاسمین بیمار ہے؟ کب سے؟"

"پرسوں سے اسے سخت بخار ہے بچاری بری طرح تڑپ رہی ہے۔"

"چلو میں ابھی چلتا ہوں!" اور آشا مجھے سید قربان علی قریشی کے گھر لے گئی ——

"میرا نام کرشن لال کھنہ ہے!" میں نے اپنا تعارف آپ ہی کراتے ہوئے کہا۔ "میں نیشنل کالج کا پروفیسر ہوں!"

"آئیے، آئیے —— بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر —— مجھے قربان علی قریشی کہتے ہیں۔ میں سیکرٹریٹ میں ملازم ہوں، تشریف رکھیے!"

"یاسمین کا کیا حال ہے؟" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا

"بہتر ہے —— لیکن ابھی بخار گیا نہیں!"

"کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟"

"ضرور ضرور، آئیے!"

آنگن میں یاسمین ایک پلنگڑی پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی ماں اسے پنکھا کر رہی تھی۔ یاسمین نے میری طرف مسکرا کر دیکھا پھر شرم سے اپنا منہ تکیہ میں چھپا لیا۔

"انہیں سلام کرو بیٹی —— یہ تمہیں پوچھنے آئے ہیں۔ اوہاں ہاں ان کا تعارف آپ سے کرانا تو بھول ہی گیا۔ زینب! یہ پروفیسر کرشن لال کھنہ ہیں"

"آداب عرض بھائی صاحب!"

"آداب عرض!"

"میں ان کی مسز کو تو جانتی ہوں۔ دراصل ہم عورتیں آپ مردوں کی بہ نسبت زیادہ سوشل واقع ہوتی ہیں۔ آپ تو مہینوں ایک دوسرے سے سلام نہیں کرتے۔ مگر ہم پہلے دن ہی کچھ اس طرح گھل مل جاتی ہیں کہ جب تک ہر دوسرے دن ملیں چین نہیں آتا۔"

"اچھا تو آپ مسز کھنہ کو جانتی ہیں"

"بہت اچھی طرح —— ابھی کل ان سے سویٹر کا ایک نیا نمونہ سیکھ کر آئی تھی"

"اوہ۔ پھر تو گاڑھی چھنتی ہے"

"زینب بھئی" سید قربان علی نے کہا "بھائی صاحب کو پان تو پیش کرو"

"نہیں نہیں رہنے دیجئے۔ آپ تو خواہ مخواہ تکلف ....."

"ابی پان کا کیا ہے۔ لیجئے نا۔ زینب پان لگاؤ"

"نہیں رہنے دیجئے"

"شاید بھائی صاحب کو ہمارا پان کھانے میں اعتراض ہے"

زینب نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ سید قربان علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"نہیں نہیں یہ بات نہیں۔ اچھا لائیے پان"

زینب پان لگانے لگی۔ میں نے سید قربان علی سے کہا "بہت دنوں سے سوچ رہا تھا۔ کہ آپ سے شرف نیاز حاصل کیا جائے لیکن کالج کے کام نے ...."

"جی ہاں۔ دل تو میرا بھی چاہ رہا تھا۔ کہ آپ سے ملا جائے۔ لیکن آپ جانتے ہیں سیکرٹریٹ میں کتنا کام رہتا ہے"

"اچھا آپ اور مسز قریشی اس اتوار ہمارے ہاں چائے پیجئے"

"پی لیں گے صاحب لیکن اتنی کیا جلدی ہے۔ یاسمین اچھی ہو جائے تو کسی دن ضرور آئیں گے"

"یاسمین اتوار تک ضرور اچھی ہو جائے گی" "کیوں یاسمین" میں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "اچھی ہو جاؤ گی نا؟"

"جی خیال تو ہے"

"اتوار کو ضرور اچھی ہو جانا" آشا نے بہت سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا "نہیں تو گڑیا کا بیاہ کیسے ہوگا"

"ہا ہا ہا" سید قربان علی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "ہاں بھئی مہورت تو اتوار کا ہی نکلا ہے"

"پان لیجئے بھائی صاحب"

"شکریہ"

اتوار کو یاسمین واقعی اچھی ہو گئی۔ مسز اور مسز قریشی میرے ہاں

[illegible] باتیں ہوئیں۔ پتہ چلا مسز قریشی شاعرہ بھی ہیں۔ ڈھلن بجانے کا جنون ہے۔ دفتر سے آکر گھنٹوں ڈھلن کا ریاض کرتے ہیں۔ مسز قریشی افسانے لکھتی ہیں۔ یاسمین کو گھر پر قرآن مجید پڑھاتی ہیں۔ نماز کی حد سے زیادہ پابند ہیں۔ تھوڑا سا باغبانی کا بھی شوق ہے۔

اس کے بعد میں سید قربان علی قریشی سے کئی بار ملا۔ علم دوست تھے۔ اتوار کے دن ہم مل کر پروگرام بناتے۔ کبھی راوی کے کنارے مجلس منعقد کی جاتی۔ کبھی جہانگیر کے مقبرے میں۔ قریشی صاحب کو شعر کہنے کا اچھا سلیقہ آتا تھا۔ اپنے اشعار ترنم سے پڑھتے۔ کبھی کبھی جب موج میں ہوتے تو الغوزہ پر کوئی دھن چھیڑ دیتے۔ اُن کے پاس متعدد اردو کے اخبارات اور رسائل ہوتے۔ جو وہ مجھے اکثر پڑھنے کے لئے دے جاتے۔ جب کسی رسالے میں ان کی غزل چھپتی۔ اس دن خوشی سے پھولا نہ سماتے۔ رسالہ میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہتے "سب سے پہلے صفحہ تیس ملاحظہ فرمائیے۔ خاکسار کی ایک تازہ غزل چھپی ہے۔"

میں غزل پڑھنے لگا۔ وہ میرے رد عمل کا انتظار کرنے لگتے

"کیسی لگی آپ کو؟"

"خوب ہے۔ مطلع کا تو جواب نہیں۔"

"مجھے بھی مطلع ہی پسند ہے۔"

چھ مہینے کے عرصہ میں مسز کھنہ اور مسز قریشی ایک دوسرے کے بہت قریب آگئی تھیں۔ جب میں کالج اور قریشی صاحب دفتر چلے جاتے۔ وہ عموماً ایک ہی جگہ بیٹھ کر سویٹر بنتیں۔ رسائل کی ورق گردانی کرتیں۔ یا سودا سلف خریدنے کے لئے ڈبی بازار جاتیں۔ اکثر جب میں کالج سے لوٹتا۔ مسز کھنہ کوئی اردو ناول پڑھ رہی ہوتیں جو وہ زبردستی مانگ کر لائی تھیں۔ یاسمین اور آشا کا یہ حال تھا کہ سکول سے آنے کے بعد ایک منٹ علیحدہ نہ ہوتیں۔ کبھی گڑیا کا گھر بنا رہی ہیں، کبھی مٹی کر سوال نکال رہی ہیں۔ اور کبھی منٹو پارک میں کھیلنے کے لئے جا رہی ہیں۔

ایک دن یاسمین نے مجھ سے کہا: چاچاجی! کل عید ہے، کل آپ چاچی جی اور آشا ضرور ہمارے گھر آئیں۔ اور ہاں چاچاجی آشا شلوار پہن کر آئے۔ نہیں تو میں اس سے کبھی نہ بولوں گی۔"

عید کی پارٹی بہت اچھی رہی۔ آشا اس کپڑے کی شلوار پہن کر گئی جس کپڑے کی یاسمین نے پہن رکھی تھی۔ سویاں، پھل اور پان کھانے کے بعد یاسمین نے بتایا کہ اب وہ اور آشا مل کر ایک قوالی گائیں گی۔"

"اچھا بھئی سناؤ قوالی۔ دیکھیں تم کیسا گاتی ہو۔"

یاسمین فوراً اندر سے ایک چھوٹی سی ڈھولک اٹھا لائی۔ اور اپنی ماں کے ہاتھ میں اسے تھماتے ہوئے کہا: "امی! آپ بجائیے ہمیں قوالی کے ساتھ تالی بجانی ہے۔"

اور دونوں نے مل کر گانا شروع کیا ؎

زمانے میں چمکا ہے نام محمد
محمد محمد محمدؐ محمد

وہ دونوں بڑی اچھی لے میں گا رہی تھیں۔ ہم سب پورے انہماک سے سن رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا سماں بندھ گیا ہے۔ قوالی کے اختتام پر دونوں کی آنکھوں میں سرخوشی کی غیر معمولی چمک تھی۔

"کیسی رہی ہماری قوالی؟" یاسمین نے پوچھا۔

"بہت اچھی۔ واقعی بہت اچھی۔ بھئی تم دونوں تو خوب گاتی ہو۔"

ستمبر دسمبر مارچ مئی

اور پھر یکلخت ایک دن لاہور میں قیامت آگئی۔ پر اشتعال تقریریں ہونے لگیں۔ بڑے بڑے جلوس نکلنے لگے۔ "اللہ اکبر" اور "ہر ہر مہادیو" کے نعرے فضا میں، دہشت پھیلانے لگے۔ اخباروں کی سرخیاں پڑھ پڑھ کر لوگ بدحواس ہونے لگے۔

"بھاٹی گیٹ کے باہر تین آدمیوں کے چھرا گھونپ دیا گیا۔"

"کراؤن سینما میں بم پھٹا۔ پانچ مسلمان مارے گئے۔"

"ڈبی بازار میں زبردست فساد۔ پولیس نے گولی چلا دی۔"

"آج شام سے کرفیو لگا دیا گیا۔"

ہر طرف خوف و ہراس چھایا ہوا تھا۔ خون سفید ہو گیا تھا۔ ہندو مسلمان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن گئے تھے۔ خون ہی خون اندھیرا ہی اندھیرا۔ انسانیت دم توڑ رہی تھی۔

ں کی ایک دوپہر کو وہ میرے ہاں آیا۔ لمبا تڑنگا نوجوان
م تھا اس کا۔ وہ ایک ایسے گروہ سے تعلق رکھتا تھا جس
دھرم کی حفاظت کرنا تھا۔
ے حفاظت کی ضرورت نہیں" میں نے کہا" میں کافی۔
"
پ چاروں طرف سے مسلمانوں میں گھرے ہوئے ہیں"
رکیا ہوا"
لمان کا اعتبار نہیں کرنا چاہئیے۔ یہ لوگ بہت خطرناک ہوتے

لمان سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا"
، جانتا ہوں۔ قربان علی آپ کا دوست ہے لیکن وہ آپ
۔

سرے دن وہ پھر آیا" کچھ سنا آپ نے۔ وہ جو اس محلہ میں
ت ہا کرتا تھا اسے کسی مسلمان نے چھرا مار کر ہلاک کر دیا"
رے دن اس نے کہا" اگر آپ کو چھرا یا پستول کی ضرورت
سے لے سکتے ہیں"
ں لئے"
ں میرا مطلب ہے ہم .... مسلمانوں کو مارنے

ں کیوں۔ انھوں نے میرا کیا بگاڑا ہے"
ھی عجیب سادہ لوح ہیں۔ وہ آپ کے بھائی بندوں کو مار
ر آپ کہتے ہیں کہ انھوں ......"
ں کسی بے گناہ کو مارنا پاپ سمجھتا ہوں"
ہے تو میں بھی سمجھتا ہوں لیکن ....."
ں؟
کو مارنا پاپ نہیں۔ دیکھئے آپ کی طرح میں بھی" ہنسا"
نا ہوں کسی بے گناہ کو مارنا گئو ہتیا سمجھتا ہوں۔ لیکن اپنی
ا نہیں بزدلی ہے"
سب مسلمانوں کو پاپی سمجھتے ہیں"

"بے شک"
"آپ عجیب آدمی ہیں"
وہ چلا گیا۔ اس سے بات چیت کر کے مجھے کوفت ہوئی۔ شام کو حسب معمول میں قربان علی کے گھر گیا۔ وہ ابھی دفتر سے واپس نہیں آیا تھا۔ زینب کچھ پریشان نظر آتی تھی۔ وقت کاٹنے کے لئے میں ایک رسالہ اٹھا کر پڑھنے لگا۔ سات بجے کے قریب قربان علی آیا۔ وہ کچھ تھکا ہوا تھا" کیا بات ہے بھئی۔ آج بہت دیر سے آئے"
"کچھ نہ پوچھو۔ اس نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے جواب دیا" لوگ پاگل ہو گئے ہیں۔ اب اس شہر کا خدا ہی حافظ ہے"
"معاملہ کیا ہوا"
ہمارے دفتر میں ایک بابو ہزاری لال ہیں۔ وہ دفتر سے واپس گھر جا رہے تھے کہ گول باغ کے نزدیک انہیں کسی نے چھرا گھونپ دیا۔ انہیں تانگے میں بٹھا کر ہسپتال پہنچایا۔ اس کے گھر والوں کو خبر کی۔ ابھی سیدھا ہسپتال سے آ رہا ہوں۔
"کیسی حالت ہے اب اس کی" زینب نے پوچھا۔
"خیال تو ہے بچ جائے گا۔ ڈاکٹر کہتا تھا۔ اسے خون کی... ضرورت تھی۔ آٹھ اونس اپنا خون دیا۔ آٹھ اونس اور کا انتظام کر آیا ہوں"
"یا اللہ وہ بے چارہ تو بچ جائے۔ ابھی ابھی شادی ہوئی تھی"
میں قربان علی کے گھر سے واپس آ کر ضروری خطوط کا جواب لکھ رہا تھا کہ آشا کمرے میں داخل ہوئی۔
"بابو جی ایک بات کہوں۔ ناراض نہ ہونا"
"کیا بات ہے بیٹی؟"
"آپ یاسمین کے گھر نہ جایا کیجئے"
"کیوں"
"اس کا باپ آپ کو مار ڈالے گا"
"تمہیں کیسے پتہ ہے؟"
"مجھے پتہ ہے۔ اور بابو جی اگر وہ آپ کو پینے کے لئے پانی دے تو مت پیجئے گا"

"کیوں"

"یہ مسلمان پانی میں زہر ملا دیتے ہیں"

"تمہیں کس نے بتایا"

"سکول میں میری ہندو سہیلیوں نے"

"نہیں آشا۔ یہ غلط ہے۔ تمہاری سہیلیاں جھوٹ بولتی ہیں"

آشا کو یقین نہ آیا وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔ میں سوچنے لگا۔ یہ زہر جو چھوٹی چھوٹی بچیوں کے دل و دماغ میں سرایت کر رہا ہے۔ خدا جانے اس کا اثر کتنی پشتوں تک رہے گا۔

آشا اب یاسمین سے کچھ کھچی کھچی رہنے لگی۔ وہ اس کے ساتھ کھیلنے سے انکار کر دیتی۔ بڑی بے رخی سے پیش آتی۔ میں اور اس کی ماما اسے لاکھ سمجھاتے لیکن اس کی تسلی نہ ہوتی۔ ایک دن میں اسے زینب کے پاس لے گیا۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا "بہن ذرا پانی پلانا لیکن دیکھنا اس میں کہیں زہر نہ ملا دینا"

وہ حیران ہو کر میرے منہ کی طرف دیکھنے لگی "ہائے اللہ۔ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں"

"بات یہ ہے بہنی۔ کہ آشا سمجھتی ہے۔ کہ تم پانی میں زہر ملا دو گی"

زینب کھلکھلا کر ہنس پڑی اور آشا کو اپنی گود میں لیتے ہوئے کہنے لگی "میں اپنی بیٹی کو زہر ملا دوں گی؟ اس سے پہلے میں یاسمین کا گلا کیوں نہ گھونٹ دوں گی۔ جیسی یاسمین ویسی آشا!"

سولہ جولائی کی شام تھی۔ آسمان پر گہرے گہرے کالے رنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ لاہور میں اب حالات پہلے سے بہتر ہو گئے تھے۔ چھرا گھونپنے کی وارداتیں کم ہو گئی تھیں۔ کرفیو کے اوقات میں بھی کافی تبدیلی کر دی گئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا۔ کہ قربان علی کو ساتھ لے کر آج لمبی سیر کی جائے۔ کہ زینب گھبرائی ہوئی ہمارے گھر آئی۔

"بہن جی! آپ نے یاسمین کو تو نہیں دیکھا"

"نہیں"

"کہاں گئی وہ پھر۔ دو گھنٹے سے غائب ہے"

"یہیں کہیں ہو گی۔ چلو ذرا دیکھتے ہیں"

یاسمین کی سارے محلے میں تلاش کی گئی۔ لیکن وہ کہیں نہ ملی۔ زینب بہت گھبرا گئی۔ اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے اٹھ رہے تھے۔ قربان علی اسے تسلی دے رہا تھا۔ کہ یاسمین ضرور آ جائیگی۔ لیکن اسے یقین نہ آتا تھا۔ آٹھ بجے تک یاسمین کا کوئی پتہ نہیں ملا۔ میں اور قربان علی بھی گھبرا گئے۔ میں نے کہا "ابھی کرفیو میں ایک گھنٹہ ہے۔ چلو منٹو پارک میں دیکھ آئیں"

منٹو پارک میں بالکل اندھیرا تھا۔ تھوڑی تھوڑی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ اِدھر اُدھر کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں زمین پر پڑی کوئی چیز دکھائی دی۔

یہ یاسمین تھی۔ خون میں نہائی ہوئی اس کے معصوم جسم میں کسی بے درد نے چھرا گھونپ دیا تھا۔ اور پھر نکالا نہیں۔ وہ زمین پر بے حس و حرکت پڑی تھی۔ میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ قربان علی کے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی۔ اور سناٹے کو چیرتی گئی "میری بچی! ہائے میری یاسمین" ہم اسے اٹھا کر گھر لائے۔ میں نے نہیں دور سے دیکھا۔ وہ چھاتی پر دو ہتڑ مار کر بین کرنے لگی۔ قربان علی بیوی کو دیکھ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

ساری رات ہم لاش کے پاس بیٹھے رہے۔ آدھی رات کے قریب میں نے بڑی مشکل سے زینب کو چپ کرایا اور کہا کہ بہن خدا کو یہی منظور تھا۔ روؤ نہیں۔ قرآن مجید کی تلاوت کرو۔ دور کونے میں بیٹھی آشا سسکیاں بھر بھر کر رو رہی تھی۔ قرآن پڑھتی اور آنسو بہاتی رہی۔

یہ ڈی اے وی کالج کا ہوسٹل تھا۔ ہزاروں گھر لٹے ہوئے ہندو اس میں پناہ لے رہے تھے۔ اِدھر سامان بکھرا پڑا تھا۔ میزیں۔ کرسیاں۔ کپڑا سینے کی مشینیں بستر۔ ہر شخص تباہ حال نظر آتا تھا۔ ہر انسان فریادی تھا۔ میں ساون کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ زمین پر آنسوؤں کی بارش ہو رہی تھی۔ ہوسٹل کے کمرے۔ لان کاریڈور پناہ گزینوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ اور ابھی سینکڑوں کے جوان فوجی لاریوں میں شہر کے اندرونی حصوں سے

ں کر لاتے رہے تھے۔ ہر شخص ایک نئی مصیبت کی داستان کا عنوان
ا بنا تھا۔ کسی کا گھر جل گیا تھا۔ کسی کے خاوند کو چھرا گھونپ دیا گیا تھا

آشا اور اسکی ماتا کو ایک چھوٹے سے کمرے میں چھوڑ کر میں
ں میں اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہ اب
وگا۔ لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹے ہوئے طرح طرح کی۔۔
ہ آرائیاں کر رہے تھے۔ ان میں سے کافی لوگ ایسے بھی تھے،
ے تھلائے مسلمان ہمسایوں نے بھائیوں جیسا سلوک کیا تھا۔ ان
ومتے ہوئے معاً مجھے قربان علی یاد آیا۔ چلتے وقت اس نے مجھ سے
ہو کر کہا تھا: کھنہ صاحب ملک تقسیم ہو گیا لیکن محبت تو تقسیم نہیں
ی۔ خدارا ہمیں بھول نہ جایئے گا!"

مسز قریشی مسز کھنہ کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی
ت ہوتے وقت اس نے آشا کو دو ریشمی فراک دیتے ہوئے
ھا" میں نے یہ فراک یاسمین کے لئے سلوائے تھے۔ یاسمین نہ
۔ اللہ کو یہی منظور تھا۔ بیٹی یہ فراک تم پہن لینا!"

میں انہی خیالات میں گم سم ایک ٹولی کے نزدیک گذر رہا
ہ یکلخت میری نظر اس پر پڑی۔ وہ ایک مجمع کے درمیان کھڑا ایک
ے کر باتیں کر رہا تھا۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ وہ کہہ رہا تھا "صاحب
ت غلط ہے۔ کہ مسلمان ہی چھرا گھونپ سکتے ہیں۔ ہمارا داؤ چل جائے
ر ہم بھی نہیں چھوڑتے۔ میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔ جولائی
یک شام کو میں راوی روڈ سے سائیکل پر جا رہا تھا۔ دراصل میں
ے شکار کی تلاش میں نکلا تھا۔ چھرا میں نے تھیلے میں چھپا رکھا
ایک پل کے نزدیک میں نے کچھ لڑکیوں کو کھیلتے ہوئے دیکھا
کی جانب چھرا لے کر لپکا۔ ایک لڑکی کے سوا باقی سب بھاگ
ں۔ میں نے اسے پکڑ لیا اور اس زور سے اس کے پیٹ میں
و نپا۔ کہ اسکی چیخ بھی نہ نکل سکی۔"

"لیکن تمہیں یہ کیا معلوم۔ کہ وہ لڑکی مسلمان تھی؟" مجمع میں کسی
پوچھا۔

"مجھے پورا یقین ہے کہ وہ مسلمان تھی۔ اُس کے بازو پر اُس کا
ا ہوا تھا۔ یاسمین!"

مجمع میں کھڑے ہوئے لوگوں کے چہروں پر رونق آگئی۔ ایک لمحہ کے لئے وہ اپنا غم و غصہ بھول گئے۔ اور تحسین آمیز نظروں سے اسکی طرف دیکھنے لگے۔ لیکن میں وہاں زیادہ دیر ٹھہر نہ رہ سکا۔ مجھے یوں محسوس ہوا۔ کہ انہوں نے یقین رکھنے کے باوجود اُن سب نے مل کر ایک چھوٹی سی معصوم بچیا کی ہتیا کر ڈالی!

(بشکریہ نقوش)

صادقہ نسیم •

شرحِ تمنا

یوں دل میں سوچا کرتی تھی
کیا عمر یونہی ڈھل جائے گی
بن پیار کئے، بن بات کئے

اک رات بہت ہی چپکے سے
اک دل نے دل کو پا ہی لیا!
جو راز تھا پنہاں سینے میں
آنکھوں نے افشا کر ہی دیا
کہ ضبط تھا مشکل ——— ناممکن
الفاظ کے بس کی بات نہ تھی

اس پیار کی وادی میں آکر
میرے آنسو موتی بن ہی گئے
اس کیف کی دنیا میں کھو کر
جو داغ تھے دل کے پھول بنے
پھر زیست کا نقشہ اور ہی تھا

پھر اس پیار کی لمبی گھاٹی کو
یوں دل نے پل میں پار کیا
من مندر میں بس نے تم سے
پیت کا جب اقرار کیا
پھر موجِ شفق، انجم کی چمک
پھولوں کی مہک میں تو ہی تھا

اب پیار پہ تیرے ناز بھی ہے
شکوہ بھی شکایت بھی لیکن
سب دل کے مچلتے چلبلے ہیں
کہ راحت ہے تو نیاز میں ہے
اور جان نچھاور کرنے میں ———

———

فیروز نظر •

نورِ تاروں میں گلوں میں تازگی پیدا کریں
آؤ کچھ تو زندگی میں روشنی پیدا کریں
اٹھ بدل دیں آنسوؤں کو مسکراہٹ میں ذرا
آ۔ کہ سامانِ نشاطِ زندگی پیدا کریں
جا ہی پہونچیں گے یقیناً اپنی منزل پر مگر
شرط ہے خود میں شعورِ رہبری پیدا کریں
ہمنشینو! جس سے ہو جائے منور کائنات
آؤ۔ داغِ دل سے ایسی روشنی پیدا کریں
اے نظر اب چھوڑ بھی فصلِ بہاراں کا خیال
اب ضرورت ہے خزاں سے دلکشی پیدا کریں

اشم میرزا

دوسری ہجرت

شریف حجام کی دکان میں مولا بخش ٹھیکیدار کے اکلوتے لڑکے ف کے پاس بیٹھے ہوئے اس کے دوست دو سال کی جدائی ے واقعات بیان کر رہے تھے۔ رؤف دو سال اپنے دوستوں سے دور رھ میں گزار کر آیا تھا۔ اب بھی شاید وہ نہ آتا لیکن اس کی امی کا دل ت اداس ہو گیا تھا۔ وہ اپنے رشتہ داروں سے ملنے کے لئے بہت چین ہو گئی تھی۔ اس لئے مولا بخش نے دونوں کو جانے کی اجازت دے ی تھی ——— دو سال پہلے رؤف جماعت نہم کا الب علم تھا۔ طالب علم تو بس نام ہی کا تھا۔ البتہ اپنے دوستوں میں ہلوان ضرور مشہور تھا۔ اس کے پہلوانی کے شوق کو جنون کی سرحد میں فل ہوتے دیکھ کر مولا بخش طیش میں آ جاتا۔ وہ نہ چاہتا تھا کہ اکھاڑے مٹی اندھی تقدیر کے مانند رؤف کی ٹھیکیدار بننے کی صلاحیتوں کو نگل لے ——— اسے سندھ میں ایک ٹھیکہ مل گیا۔ وہ بیوی رلڑکے کو ساتھ لے کر یہاں سے چلا گیا تھا ——— دو سال کے رصے میں رؤف بالکل بدل گیا تھا۔ پہلے وہ لسر کی دھوتی باندھ کر کی کی قمیض پہن کر بازو چوڑے کر کے چلا کرتا تھا۔ اور اب قیمتی گرم سوٹ پہنے بازو ڈھیلے چھوڑے بیٹھا تھا۔ پہلے وہ پہلوانی سیکھ رہا تھا اور اب ہ ٹھیکیدار بن گیا تھا۔ مگر اس کے دوست اسی حالت میں تھے جس الت میں وہ انہیں چھوڑ کر گیا تھا۔ وہی میلی چیکٹ دھوتیاں اور قمیضیں لے میں پیتل کے تعویذ اور منڈھے ہوئے سر ——— شریف حجام ایک کے سر پر مشین پھیر رہا تھا۔ کھنکار کر بولا "رؤف بیٹا ——— اب تو ے صاحب بن گئے ہو ——— میرا خیال تھا تم پورے پہلوان بن کر آؤ گے ور آتے ہی کسی بڑے پہلوان سے دو ہاتھ دکھاؤ گے۔ لیکن تم تو پہلے سے بہت ہی کمزور نظر آ رہے ہو۔ جیسے یہاں سے جانے کے بعد بھی بھی اکھاڑے کا منہ نہ دیکھا ہو۔" رؤف نے زیر لب مسکرا کر کہا "چچا بس یوں سمجھ لو۔ یہاں سے جانے کے بعد دنیا دیکھ لی ہے۔ پہلوانی میں کیا رکھا ہے۔ اکھاڑے میں مار کھاؤ اور چاندنی راتوں میں بھی بے سدھ ہو کر سوئے رہو۔" شریف کے ہونٹوں پر معنی خیز ہنسی ابھر آئی اپنی زندگی کے تجربات اور گاہکوں کے مشاہدات اس کے سامنے عریاں ہو گئے تھے۔ "یہ بات ہے" وہ سر ہلا کر بولا "یوں کہو بیٹا ——— اب نئی پہلوانی سیکھ لی ہے۔ پیسے والے باپ کے اکلوتے بیٹے ہو۔ جو چاہو کر سکتے ہو۔ پر بیٹا جو مزہ اکھاڑے کی مٹی پر لیٹ کر حاصل ہوتا ہے۔ وہ ریشمی گدیلوں پر آنکھ مچولی کھیلنے سے نہیں مل سکتا۔" ——— "اپنا اپنا خیال ہے چچا" ——— رؤف نے گولڈ فلیک کا پیکٹ جیب سے نکالتے ہوئے کہا اور کنکھیوں سے شریف کی طرف دیکھنے لگا شریف مشین رکھ کر کپڑا اکٹھا کر کے بال جھاڑنے کی خاطر باہر نکل گیا تھا.....

رؤف نے اپنے دوستوں کو سگرٹ پیش کئے۔ لیکن ایک کے سوا کوئی بھی سگرٹ نہ پیتا تھا۔ شریف کے لئے سگرٹ نکال کر اس نے تختے پر رکھ دیا۔ اپنا سگرٹ سلگایا۔ اور منہ کو گول بنا کر دھوئیں کے دائرے بنانے لگا ——— حمید نے پہلو بدلتے ہوئے کہا ——— "رؤف یار ——— وہاں کے کسی پہلوان کا حال سناؤ۔ وہاں بھی اکھاڑے ہوں گے ——— یہاں ہی کی طرح دنگل ہوتے ہوں گے۔؟" رؤف سگرٹ کی راکھ جھاڑ کر بولا "تمہارے پاس تھا تو پہلوان بننے کا شوق بھی جوان تھا۔ جیسے تم پاس نہ رہے تھے۔ تو پہلوانی کا شوق بھی مٹنے لگا تھا۔ بدن پر تیل کی مالش کر کے بیٹھکیں نکالنا اور بات ہے اور اکھاڑے میں پنجوں میں پنجہ ڈال کر داؤ آزمانا اور بات ہے۔ شروع میں کام زیادہ تھا۔ اس لئے کسی اکھاڑے کا سراغ نہ لگا سکا۔ لیکن جب کام سمجھ میں آ گیا اور پہلے ٹھیکے میں کافی بچت ہوئی تو میں نے پہلوان بننے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ وہاں پر نہ تو میں نے کوئی دنگل دیکھا ہے۔ اور نہ ہی وہاں کے اکھاڑوں کے متعلق کچھ جانتا ہوں

حمید نے منہ لٹکا لیا۔ شفیع تاسف بھرے لہجہ میں بولا "رؤف۔ تو نے تو ہماری یاری کو بدنام کر دیا ہے۔ یہ دیکھو میرا کسرتی بدن، یہاں سے اگر تجھے دھکا دوں ـــ تو سیدھا گھر پہنچ جائے۔ اگر تو بھی کسرت کر رہا ہوتا۔ تو مجھ سے دگنا ہوتا ـــ ـــ رؤف ہنسنے لگا ـــ وہ سوچ رہا تھا۔ "یہ دوست ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے شفیع جان کر شریف نے چوٹ کی ہے۔ ان کے دماغوں میں تو پہلوانی کے شوق نے بھوسا بھر دیا ہے۔ یہ کیا جانیں حسین چاندنی راتیں ہماری جوانیوں سے کس چیز کی بھیک مانگا کرتی ہیں۔ " ـــ اس کی آنکھوں میں ایک مرمریں پیکر دلربایانہ انداز سے انگڑائیاں لینے لگا۔ اور اس کی مسکراہٹ میں نشہ بکھر گیا ـــ شریف سگرٹ سلگا کر رؤف کے پاس ہی بیٹھ گیا تھا ـــ حمید اور شفیع کو رؤف سے مل کر جو خوشی ہوئی تھی وہ اب جاتی رہی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ رؤف کے آنے پر اکھاڑے کی رونق دوبالا ہو جائے گی۔ رؤف کے لئے بادام گھوٹنے کے بعد انہیں بھی ایک ایک گلاس مل جایا کرے گا ـــ اب وہ پھر رؤف کے حساب میں سے چاندی کے ورق میں گاجر کی قاشیں لپیٹ کر کھایا کریں گے ـــ لیکن رؤف نے ان کے یقین کو مایوسیوں کی دھند میں دفنا دیا تھا۔ اب وہ حسرت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے ـــ غنی کپڑا دکان میں داخل ہوا۔ اور چپکے سے شریف کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ شفیع کے پیچھے تخت پوش پر سراج بیٹھا ہتھیلی پر سگرٹ کے تمباکو میں چرس ملا رہا تھا۔ غنی کی طرف دیکھ کر اس نے گردن اونچی کر کے پوچھا "غنی ـــ سناؤ آج بھی دیدار ہوا ہے یا نہیں ـــ" غنی کے لبوں میں جنبش پیدا ہوئی، لیکن رؤف کی طرف دیکھ کر الفاظ اس کے حلق میں ہی پھنس کر رہ گئے سراج غنی کے خدشہ کو بھانپ گیا تھا اسے تسلی دینے لگا "رؤف اپنے ٹھیکیدار صاحب کا لڑکا ہے ـــ یہ تو یاروں کا یار ہے اسے گھر ہی کا آدمی سمجھو ـــ" ـــ شریف نے تائید کر دی اپنی تعریف سن کر رؤف نے زور کا کش لگایا۔ اور منہ پھلا کر دھوئیں کا غبار اگل دیا۔ غنی مایوسانہ آواز میں بولا "اپنا حال تو دن بدن بد تر ہوتا جا رہا ہے کسی پہلو بھی چین نصیب نہیں ہوتا۔ نہ جانے اس محبت کا کیا انجام ہو گا سراج سگرٹ کے کاغذ میں تمباکو بھرتے ہوئے بولا ـــ "اگر عشق کرنا نہیں آتا تو پرانے لوہے کے کاروبار میں ہی لگے رہو ـــ یہ تمہارے کا رنگ نہیں ـــ" شریف نے آہستہ سے کہا ـــ "عشق کے معاملہ میں کنجوسی سے کام نہیں چلتا۔ پیسہ خرچ کرو۔ ایک جمیلہ تو کیا ہزار جمیلائیں اگر تمہارے قدموں پر نہ گریں ـــ تو نام بدل دینا۔" رؤف کو محسوس ہوا کہ شریف خود ہی اپنی چوٹ کی زد میں آ گیا ہے شریف اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر وہ شوخی سے بولا ـــ "چچا ـــ ہمیں کچھ نصیحت کرتے ہو اور دوسروں کو کچھ مشورہ دیتے ہو ـــ " ـــ شریف نے اپنا منہ اس کے کان کے قریب کر کے کہا ـــ "بیٹا ـــ تمہیں دیکھ کر مجھے اپنی جوانی یاد آ گئی ہے ـــ اس لئے میں اسے واغلا نہیں دیکھنا چاہتا ـــ" ـــ غنی نے رونی صورت بنائی تھی ـــ اور عشق کے بخارات اس کے دل و دماغ پر پھیلتے جا رہے تھے۔ شریف ـــ اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا "آج شام کو میرے ساتھ شاہ جی کے پاس چلنا ان کے تعویذ سے سب مرادیں پوری ہو جائیں گی ـــ" غنی کے چہرے پر رونق آ گئی رؤف کو بھی متاثر کیا تھا۔ وہ بھی دو سال کے عرصہ میں کئی عورتوں سے عشق کے پیچ لڑا چکا تھا۔ لیکن کسی موڑ پر بھی اس کی غنی جیسی حالت نہ ہوئی تھی ـــ وہ سوچنے لگا "جمیلہ بہت ہی حسین عورت ہو گی ـــ اور کسی بہت پرانے محلے میں رہتی ہو گی ـــ یہی وجہ ہے کہ غنی مجنوں بن گیا ہے ـــ" رؤف کو یہاں ایک ٹھیکہ حاصل کرنے کی خاطر ایک آدمی سے ملنا تھا اس لئے وہ پھر آنے کا وعدہ کر کے دکان سے باہر نکل آیا ـــ جمیلہ کا خیال آہستہ آہستہ اس کے جذبات کو گرما رہا تھا ـــ دن کو گھر کی طرف آتے وقت وہ پھر شریف حجام کی دکان پر ٹھہر گیا ـــ شریف اکیلا بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر رؤف نے پوچھا "چچا۔ جمیلہ کیا واقعی بہت خوب صورت ہے جو غنی اس کے پیچھے دیوانہ ہو گیا ہے ـــ؟" ـــ شریف اس کے مخفیہ میلان کو ٹٹولنے کی غرض سے بولا ـــ "تمہیں کیا لینا ہے ایسی باتوں سے ـــ غنی اور سراج دونوں ہی پاگل ہیں ـــ دونوں کی بیویاں جمیلہ سے خوبصورت ہی ہوں گی لیکن ان بے غیرتوں کو ذرا بھی شرم نہیں آتی ـــ" ـــ رؤف نادم سا ہو گیا ـــ لیکن اس کا تجسس کم نہ ہوا تھا۔

وہ بچوں کی مانند مچلنے لگا — "چچا — تم تو مجھے مٹی کا بت سمجھ رہے ہو۔ آخر تمہیں جمیلہ کا پتہ بتانے میں حرج ہی کیا ہے — " شریف سمجھ گیا کہ رؤف بھی غنی اور سراج کی طرح پاگل بننے پر تلا ہوا ہے پہلے تو وہ خاموش رہا لیکن پھر اس خیال سے کہ کہیں رؤف خفا نہ ہو جائے۔ اور ایک اچھا گاہک ہاتھوں سے نکل جائے۔ اس نے بے دلی سے کہا — "لالہ سندر داس کے مکان میں جو پناہ گیر ہدایت اللہ رہتا ہے نا۔ جمیلہ اس کی بیوی ہے۔ ابھی چار پانچ مہینے اس کی شادی کو ہوئے ہیں۔ لیکن یار لوگ اس کے گھر کو اجاڑنے پر کمربستہ ہو گئے ہیں — خدا کسی کو اس زمانے میں شریف اور بے سہارا نہ بنائے — " — رؤف کو مزید پوچھ گچھ کرنے کی ضرورت نہ رہی تھی — اور وہ یہ سوچ کر گھبرانے لگا تھا کہ کہیں شریف پھر اپنی نصیحتوں کا بوجھ اس پر نہ لاد دے — اس لئے وہ اٹھ کر چلا آیا رؤف نے جمیلہ کو حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا — کئی عورتیں جن سے وہ عشق لڑا رہا تھا اس کے شعور میں تھرکنے لگیں۔ اس نے ان سب کے نقوش کو یکجا کر کے ایک نیا پیکر تراشا۔ حسن کا ایک ایسا نمونہ جسے دیکھ کر کائنات کی نبضیں تھم جائیں۔ اور خوشی کا ایک مکروہ احساس اس کی زندگی کے ہر گوشے میں ابھر آیا — اگلے دن وہ ناشتہ سے فارغ ہو کر مٹی پر چڑھ گیا۔ اس کی امی بھی دھوپ سینکنے کی خاطر کوٹھے پر آ گئی تھی — رؤف نے دو تین چکر لگائے — جمیلہ نظر نہ آئی تھی — رؤف کو ٹھیکہ حاصل کرنے کی خاطر آج پھر چند آدمیوں سے ملنا تھا — دیوار کے ساتھ بیٹھ کر وہ اپنے تجربات کا رخ موڑنے لگا۔ اب وہ ٹھیکہ حاصل کرنے کی اسکیمیں بنا رہا تھا — کچھ دیر بعد وہ ایک دم کھڑا ہو گیا — اس کی آنکھوں میں تاریک دائرے پھیل گئے — آنکھوں کو مل کر اس نے کہنیاں دیوار پر ٹیک دیں۔ اور جمیلہ کے مکان کی طرف دیکھنے لگا۔ جمیلہ چھت پر بیٹھی بال سکھا رہی تھی۔ اس کے سامنے اس کی بوڑھی ساس اکڑوں بیٹھی ہوئی تھی۔ رؤف کو محسوس ہوا کہ جمیلہ اس کے نئے تراشے ہوئے تخیلی پیکر سے بھی زیادہ حسین ہے اس کا جی چاہا کہ وہ اسی انداز میں بیٹھی رہے۔ اور وہ یونہی کھڑا اسے دیکھتا رہے بال جھٹکتے ہوئے جمیلہ کی نظر اس پر پڑ گئی۔ اور اس نے جلدی سے دوپٹہ سر پر اوڑھ لیا۔ رؤف بے خودی کی حالت میں کھڑا تھا۔ جمیلہ نے کچھ وقفہ کے بعد چور نظروں سے اس کی طرف دیکھا اپنی ساس سے کچھ کہا اور اٹھ کر نیچے چلی گئی۔ اور رؤف دیر تک مٹی پر کھڑا اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتا رہا — امی کی آواز پر رؤف نیچے اتر آیا۔ وہ عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا جیسے سر راہ کسی نے اس کے کوٹ کے کالر کو پکڑ کر جھنجھوڑ دیا ہو۔ اور انتقام کی چبھن اس کے خون میں اچھل رہی ہو — جمیلہ کو اس نے دیکھ لیا تھا — اب وہ ٹھیکہ حاصل کرنے کی جدوجہد میں لگ گیا ابھی ٹھیکہ اس کی نظروں میں عشق سے مقدم تھا۔ اس لئے وہ کوئی سازش تیار نہ کر سکا تھا — اسے ٹھیکہ مل گیا اب جمیلہ کو حاصل کرنے کی راہ میں کوئی الجھن باقی نہ رہی تھی۔ حمید، شفیع اور دوسرے پہلوان دوستوں سے کسی قسم کی مدد کی کوئی امید نہ تھی سراج کے متعلق وہ جانتا تھا کہ وہ بھی جمیلہ پر مرتا ہے۔ اور شریف اس کی جوانی کو داغدار نہ دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے اچانک جمیلہ کی ہمسائی اللہ رکھی دائی کا خیال آ گیا اور اس کا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔ اللہ رکھی دائی بہت مدت سے اس محلے میں رہ رہی تھی۔ رؤف کو اس نے اپنی گود میں کھلایا تھا ایک شام وہ چپکے سے اللہ رکھی کے مکان میں داخل ہو گیا کوئلوں کی انگیٹھی پر ہاتھ پھیلائے وہ آگ تاپ رہی تھی۔ رؤف کو دیکھ کر وہ اس کی بلائیں لینے لگی۔ رؤف چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اور ہاتھ میں پکڑا ہوا مٹھائی کا لفافہ ایک طرف رکھ کر بولا "گلی میں سے گزر رہا تھا کہ خیال آیا چچی کا گھر دیکھ چلوں۔ بچپن میں یہاں بہت کھیلا ہوں — " اللہ رکھی خوشامدانہ لہجہ میں بولی — "یہ تمہارا اپنا گھر ہے جب چاہو آؤ بیٹا آنے سے تمہیں کون روک سکتا ہے ..." — ادھر ادھر کی باتوں کے بعد رؤف نے پوچھا — "چچی سنا ہے یہ تمہاری ہمسائی جمیلہ اپنے حسن پر بہت مغرور ہے۔ اور کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتی" اللہ رکھی کو اس کے آنے کا مقصد معلوم ہو گیا جمیلہ کو حاصل کرنے کی خاطر اس کے پاس صرف رؤف ہی نہیں آیا تھا بلکہ اس سے پہلے بھی محلے کے کئی نوجوان آ چکے تھے۔ وہ ناک چڑھا کر بولی "یہ سب محلے کے بے صبر لڑکوں کا قصور ہے۔ جو ہر وقت اس کے دروازے کے آگے چکر لگاتے رہتے ہیں — یہ چھوکری کوئی حسینوں میں حسین بھی تو نہیں۔ بس گوری چٹی سمجھ لو اس پر بھی پریوں کا سا دماغ ہے۔ بیٹا تمہیں ایسی عورت سے کیا لینا ہے؟" — رؤف کھسیانہ سا ہو کر بولا "چچی۔ ہوا جلنے چھے

جلتے ہی رہیں جس جگہ گیا ہوں جمیلہ کے حسن کے چرچے سنے ہیں۔ میرے پاس بھی دل ہے ــــ لیکن میں تو صرف اس کا غرور توڑنا چاہتا ہوں"

اللہ رکھی نے گرم ہاتھ اپنے رخساروں پر پھیر کر کہا۔ جب یہ نئی بیاہی آئی تھی اس وقت تم یہاں ہوتے تو کام بن جاتا۔ لیکن اب اسے مکر کرنے میں کمال حاصل ہو گیا ہے۔ اسے قابو میں کرنا اب دو چار دن کی بات نہیں"

رؤف بولا "چچی میں اتنا بے صبر نہیں ہوں۔ دو چار ہفتوں کے بعد بھی اگر کام بن جائے تو کوئی ہرج نہیں۔ روپے پیسے کی فکر نہ کرنا ــــ مٹھائی کا لفافہ دیں چھوڑ کر رؤف باہر آ گیا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اب جمیلہ زیادہ دنوں تک اس سے دور نہ رہ سکے گی۔ ہر شام وہ کچھ نہ کچھ لے کر اللہ رکھی کے پاس ہو آتا تھا۔ اور اللہ رکھی کی تسلیوں سے وقتی طور پر اس کے جذبات بہل جاتے تھے ــــ محلے کی بڑی بوڑھیوں کے زبان پر جمیلہ کے متعلق سازشوں کی پھیلائی ہوئی افواہیں ناچنے لگی تھیں ناکام شکاری اپنی کینگی کا بدلہ انتہائی شرمناک طریقہ سے لے رہے تھے ہدایت اللہ بھی محلے میں ابھرتی ہوئی سرگوشیوں سے بے خبر نہ تھا۔ گلی میں سے گذرتے ہوئے اپنی بیوی کا نام سن کر وہ چونک پڑتا تھا۔ اس کی ذہنی کائنات ایک زبردست جھٹکے سے لرز اٹھتی تھی ــــ لیکن اپنی شرافت کی بدولت وہ کسی کا منہ نہ بند کر سکتا تھا۔ اسے جمیلہ پر بھروسہ تھا اس کی بوڑھی ماں نے خدا اور رسول کی قسمیں کھا کر اسے جمیلہ کی پاکبازی کا یقین دلایا تھا۔ اور ماں کے یقین کو جھٹلانے کی وہ کسی حالت میں بھی جرأت نہ کر سکتا تھا ــــ مگر جمیلہ کے متعلق من گھڑت جھوٹے قصے کہانیوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ پہلے وہ جمیلہ کو دیکھ کر فخر محسوس کیا کرتا تھا۔ اور اب اس کا وہ فخر اذیت ناک الجھنوں میں پھنس کر کراہ رہا تھا ــــ ایک دو بار اس نے مکان تبدیل کرنے کا بھی ارادہ کیا لیکن اس کی ماں یہ مکان چھوڑنا نہ چاہتی تھی ــــ مگر جمیلہ کی مرضی اب یہاں رہنے کی نہ تھی ــــ دن بدن اپنی بدنامی میں اضافہ ہوتے دیکھ کر وہ تڑپ اٹھتی تھی۔ اور اب تو رؤف کے آنے پر اس نے چھت پر دھوپ میں بیٹھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ رؤف کے لئے اس کا چھت پر نہ آنا بھی کا باعث بن گیا تھا ــــ ایک مہینہ گذر گیا۔ لیکن اللہ رکھی کی کوئی سازش کامیاب نہ ہو سکی۔ رؤف اپنی شکست کے احساس سے طیش میں آ گیا تھا۔ اپنے بڑے ٹھیکیدار کے اکلوتے بیٹے کا مقابلہ محلے میں [illegible] ہی کوئی کر سکتا ہو۔ اس پر بھی وہ جمیلہ کو حاصل کر سکا تھا۔ اب [illegible] ہو گئی تھی۔ اور اس ضد کی بدولت وہ جمیلہ کو برباد کرنے کی خاطر [illegible] اٹھانے پر کمربستہ ہو گیا تھا ــــ ہدایت اللہ کے مکان کا [illegible] حصہ خالی پڑا تھا رؤف نے اللہ رکھی کے ایک رشتہ دار کو نام سے حصے کے الاٹمنٹ کے لئے درخواست دیدی ــــ اور ہدایت اللہ [illegible] وقت پتہ چلا جب درخواست منظور ہو گئی۔ اب رؤف کو اس مکان آنے جانے سے کوئی نہ روک سکتا تھا ــــ اس کی امی کو [illegible] کے اس نئے عشق کا حال معلوم ہو گیا تھا۔ اس نے رؤف کو بھی [illegible] دلائی تھی۔ اس کے ہونے والے سسر کی عزت کا احساس دلایا تھا رؤف بالکل مکر گیا تھا۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ اسے جمیلہ سے کوئی [illegible] نہیں۔ یہ تو محلے والے اس کی دولت کے حسد سے افواہیں پھیلا رہے ہیں۔ ورنہ وہ تو بالکل پاک ہے۔ اپنی امی کے شبہ کو مٹانے کی کوشش کے باوجود اس کے ذہن میں کوئی فرق نہ پڑا تھا۔ دن بدن اس کے [illegible] میں آگ پھیلتی جا رہی تھی ــــ چار ماہ اسی جدوجہد میں گذر گئے۔ لیکن امید کی کوئی جھلک نظر نہ آئی ــــ جمیلہ کے ہاں لڑکا پیدا ہوا۔ اور اللہ رکھی کو ایک نئی سازش کا بہانہ مل گیا اور رؤف کے انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ دوسرے دن محلے میں یہ پھیل گئی کہ جمیلہ کے لڑکے کا ناک نقشہ رؤف سے بالکل ملتا جلتا جس نے سنا اسی نے جمیلہ کو برا بھلا کہا۔ ہدایت اللہ کی شرافت پر [illegible] کیا ــــ ہدایت اللہ دکان بند کر کے گھر کی طرف آ رہا تھا۔ راستہ میں سراج نے اسے روک لیا۔ اور ہمدردانہ لہجہ میں بولا۔ "ہدایت تم دیکھ ہی رہے ہو۔ کہ جمیلہ کی بدولت تمہیں کتنی بدنامی کا سامنا کرنا [illegible] اسے کہیں دفع کیوں نہیں کر دیتے۔ اب سنا ہے کہ تمہارے بیٹے کی شکل [illegible] سے ملتی جلتی ہے۔ کوئی غیرت مند اس بدنامی کو کبھی برداشت نہیں کر [illegible] اگر میری بیوی ایسی بے شرم اور رسوا ہوتی۔ تو گلا گھونٹ دیتا ــــ ہدایت اللہ کا دماغ چکرا گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بغیر جواب دیئے وہ گھر کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ درندوں کا ہر وار سہہ رہا تھا [illegible] یہ وار اس کی قوتِ برداشت سے باہر تھا۔ اسے کبھی خیال بھی نہ گذرا

نسان اتنا کینہ بھی بن سکتا ہے۔ مگر اگر کھانا کھلانے بغیر وہ چارپائی پر لیٹ
۔ اس کی ماں بھی آج بہت زیادہ غمگین تھی۔ اور جمیلہ نے اسے مشورہ دیا۔
کہ ہر روز کی بدنامی سے تو بہتر ہے۔ کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا
نٹ دے ـــــ لیکن اس نے جمیلہ کے منہ پر ہاتھ رکھدیا تھا۔ بچے
پیدائش کے بعد وہ اس کے منہ سے ایسے برے کلمات سننا نہ چاہتا
۔ جمیلہ نے ہدایت اللہ کو خاموش دیکھکر کہا۔ "آپ کو میری وجہ سے بہت
بنچا ہے ـــ کاش! میں پیدا ہوتے ہی مرگئی ہوتی۔ سسکیاں
نے لگی ـــ ہدایت اللہ آنسو پونچھ کر بولا۔ "جمیلہ۔ ایسے تو ہر آدمی کے
ت میں یہی سوچتا ہے لیکن قدرت کے کارخانے کا کس کو علم ہے ـــ
ں اب یہ مکان چھوڑنا ہی ہوگا ـــ" ـــ اس کی ماں نے بھی
رضامندی کا اظہار کردیا ـــ اور رونالپنے کمرے میں لیٹا سوچ
تھا۔ کہ اب ہدایت اللہ ضرور جمیلہ کو گھر سے نکال دے گا۔ اور پھر وہ اپنی
ح سے اپنی شکست کا بدلہ لے سکے گا ـــ صبح کو وہ اللہ رکھی
ے پاس پہنچا۔ وہ کوئی خوشخبری سننے کے لئے بے چین ہو رہا تھا۔ لیکن
رکھی نے کوئی نئی خبر نہ سنائی تھی۔ وہ بھی حیران تھی کہ ہدایت اللہ نے
ح تک گھر میں اودھم کیوں نہیں مچایا۔ ابھی تک جمیلہ کو دھکے دیکر گھر سے
رکیوں نہیں نکالا۔ لیکن ہدایت اللہ تو صبح سویرے ہی نئے مکان کی
ش میں گھر سے نکل گیا تھا۔ شہر سے باہر ایک نزدیکی گاؤں میں اسے
ایہ پر مکان مل گیا۔ دوپہر کو گھر لوٹا۔ اپنے سگار پڑھے والے کو بھی لے آیا
ا ـــ اللہ رکھی نے اس کے پاس آکر سمجھایا۔ کہ جمیلہ ابھی کہیں جانے
ے قابل نہیں ہے۔ اسے ہوا لگنے کا خطرہ ہے۔ لیکن ہدایت اللہ نے
سے بری طرح جھڑک دیا تھا ـــ رونق کو جب معلوم ہوا تو اس
ے دل پر ایک گھونسہ سا لگا۔ ہدایت اللہ نے اس کے خلاف توقع قدم
ٹھایا تھا۔ وہ تو جمیلہ کی مکمل بربادی کا خواہشمند تھا۔ اسے محسوس ہوا
ہ اس نے جتنے وار جمیلہ پر کئے ہیں۔ وہ الٹے اسی پر پڑے ہیں۔ اور ایک
رت کی پاکیزگی اور ایک مرد کے عزم کے مقابلہ میں اس کی دولت کی
ی وقعت نہیں ہے ـــــــ ہدایت اللہ کی ماں نے
یدیائی آنکھوں سے مکان کو الوداع کہا۔ وہ سوچنے لگی۔ "پہلی بار گھر بار
شجیلہ پر کوئی غم نہ ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ نئی فضا میں سانس لیکر

بہاروں کی دلکشی میری جھولی میں آپڑے گی۔ کوئی دکھ زندگی کو دبوچنے
کی جرات نہ کرے گا ـــــ لیکن ابھی تک یہاں پر ایسے درندے
موجود ہیں۔ جنھوں نے پاک فضا کو اپنی سازشوں سے متعفن بنادیا ہے
یہ درندے جب تک انسانیت پر جھپٹتے رہیں گے۔ مجھ جیسی بے بسوں کی
زندگیاں ہجرتوں میں رلتی رہیں گی ـــــ" اور ہدایت اللہ دعا مانگ
رہا تھا۔ "پروردگار۔ جلد وہ صبح طلوع ہو۔ جس کے بعد کوئی کسی کو
یوں ذلیل و خوار نہ بنا سکے۔ کسی کی آبرو پر درندے حملہ آور نہ ہو سکیں۔
اور انسان اپنی صحیح منزل پر پہنچکر دنیا سے سازشوں کے وجود کو مٹا دے"

انتصار اعظمی

چشم گریاں ہے نہ جانے کس لئے
دل پریشاں ہے نہ جانے کس لئے

ضبط کرتا ہوں مگر دل میں مرے
شور طوفاں ہے نہ جانے کس لئے

دل کہ آباد تمنا تھا، کبھی
آج ویراں ہے نہ جانے کس لئے

بلبلیں جب فیضِ گل پاتی نہیں
پھر گلستاں ہے نہ جانے کس لئے

تیرگی چھائی ہے اب تک دیس پر
صبح خنداں ہے نہ جانے کس لئے

پھر حریمِ دل میں وہ جانِ بہار
جلوہ ساماں ہے نہ جانے کس لئے

فیضِ رنگیں سے ترے اے فصلِ گل
حسنِ ارماں ہے نہ جانے کس لئے

منظر کلیمی

شاید

پھر ہے پرواز کی ہوس شاید — ٹوٹنے والا ہے قفس
آشیاں اور بے پر و بالی؟ — آشیاں رنگ ہے قف
ہر نظر کا فریب کھاتا ہوں — نہ رہا اپنے دِل پہ
تتلیاں ہیں نہ باغ میں بھونرے — اب گلوں میں نہیں ہے رس
خود بخود ہٹتے جاتے ہیں پردے — نہ رہی دید کی ہوس
بن کے بجلی گرتے ہیں ڈالی پر — یہ مرے چند خار و خس
پائیلوں کی صدا سے جاگ اٹھا — میں یہ سمجھا کہ ہے جرس

رنگِ محفل بگڑ گیا منظر
آگیا کوئی بوالہوس شاید

تسلیم چودھری •

صابی ــــــ میرا دوست

صابی کی موت کی خبر اگر ایک دن پہلے ملتی تو میں کچھ زیادہ رنج و
ں نہ کرتا۔

صابی میرا صرف دوست ہی نہیں بلکہ لنگوٹیا بھی تھا ہم دونوں
ہم جماعت اور ہم خیال نہ ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے
تھے۔ اسکول کے دنوں جب صابی اپنے ان پڑھ اور لاپرواہ لیکن
باپ سے بلاٹنگ پیپر اور انک پوٹ جیسی اہم تعلیمی ضروریات
کے نام پر رقمیں بٹورا کرتا اور اس کا باپ جونہی کبھی مجھ سے پوچھ بیٹھتا
صابی کے مطالبہ کا جائز ہونے کی تصدیق کچھ ایسے انداز سے کرتا
اس کے باپ کو مطلوبہ رقم دیتے ہی بنتی تھی۔

ان دنوں ہم مڈل اسکول میں پڑھتے تھے۔ صابی مختلف
سے جتنے پیسے بھی لاتا تھا سب کے سب زبان کے چٹخارے اور
ں کے نظارے کی نذر کر دیتا تھا۔ وہ صبح سے کھانا شروع کرتا تو رات
الحمدللہ کا شیر منہ چلانے چلا جاتا۔ مٹھائی کی ہر دکان سے لیکر
ردشوں تک وہ ہر ایک کا ایک مستقل گاہک تھا جس روز وہ سینما
دیکھتا تھا اسے دن بھر کا کھایا پیا ہضم نہیں ہوتا تھا۔ گویا کہ جائز و
طریقوں سے حاصل کئے ہوئے تمام پیسے پیٹ اور سینما کی بھینٹ
چڑھ جاتے۔

صابی کی ماں مر چکی تھی۔ اور وہ علاقے کے متمول زمیندار کا اکلوتا۔
باپ نے اسے ماں بن کر پالا تھا۔ اور اسے ہمیشہ ہتھیلی کا چھالا
بنا کر رکھتا تھا۔ اولاد کسے پیاری نہیں ہوتی لیکن جب اولاد اکلوتی ہو اور
ہر طرح کی فراغت ہو تو پھر فطری طور پر پیار کچھ اتنا بڑھ جاتا ہے کہ اکثر
ہتھ کی تلوار بن کر رہ جاتا ہے۔ جو نہ جانے کب شمشیرِ زن کے گلے پر بھی
چل سکتی ہے۔ خوشحالی کے ماحول میں اولاد پیار محبت سے
بگڑ کر ایک ایسا کردار ہوتی ہے جو نیم کے درخت پر پروان چڑھا
ہو۔ کچھ یہی حالت صابی کی تھی۔ وہ لاڈ ہی لاڈ میں کچھ اتنی دور نکل گیا کہ باپ
کے خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔

مڈل اسکول میں تو صابی صرف پڑھنے ہی نکال رہا تھا ہائی۔
اسکول میں آتے ہی وہ اڑنے بھی لگا۔ اول تو صابی کی اڑان ہی کچھ زیادہ
قابل ستائش نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی جو کسر رہ گئی تھی۔ اسے ان نئے
دوستوں نے پورا کر دیا۔ جو اسے اس نئے ماحول میں مل گئے تھے۔

سینما کے ساتھ سگریٹ اور سوسائٹی کے ساتھ تاش لوازمات
میں شامل تھے۔ ہوتے ہوتے صابی اپنے نئے دوستوں کے ساتھ کئی
ایسی جگہوں پر بھی جانے لگا جن کے متعلق مجھے قطعی کوئی علم نہیں تھا...
ایک روز صابی خلاف معمول دو بجے تک گھر نہ آیا۔ اس کے باپ کو بڑی
تشویش ہوئی۔ پہلے اس نے نوکر کو میرے پاس بھیجا۔ پھر خود آیا اور جب
میں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو وہ غریب نوکروں کی پلٹن ساتھ لئے۔
جلے پاؤں کی بلی کی طرح صابی کی تلاش میں گھومتا پھرا۔ لیکن کچھ پتہ نہ چل
سکا۔

اگلے روز پتہ چلا کہ صابی نے وہ رات اپنے دوستوں سمیت
تھانے کی حوالات میں گذاری تھی۔ وہ لوگ پہلا شو دیکھنے کے بعد ریلوے
اسٹیشن پر اسپنسر کے ریفریشمنٹ روم میں ذرا موج میلہ کرنے گئے تھے کہ
نشے کی حالت میں جوا کھیلتے ہوئے عین موقع پر پکڑے گئے۔

یہ اطلاع ملنے پر صابی کے ہاں تو کہرام مچنا ہی تھا میرے گھر میں
بھی ایک ہنگامہ بپا ہو گیا چونکہ صابی کے ساتھ میرا دوستانہ تھا لہٰذا
میرا چال چلن بھی مشکوک قرار دیا گیا۔ میری نقل و حرکت پر پابندیاں عائد
کر دی گئیں۔ اور صابی کے ساتھ ساتھ مجھ کو بڑے بڑے ثقیل اور بھاری
بھرکم خطابات و انعامات سے نوازنے کے بعد والد صاحب نے حکم صادر
فرمایا

"خبردار جو آج سے اس حرامی پلے کے ساتھ کوئی واسطہ رکھا۔ اگر مجھے معلوم ہو گیا کہ تم اس کے ساتھ گھومتے ہو تو یہ سمجھ لینا میرے گھر میں تمہارے لئے کوئی جگہ نہ ہو گی۔"

اس کے بعد چالان، مقدمہ، ضمانت اور پیشیوں کا ایک چھوٹا سا چکر چلا۔ اور ایک مہینے کے اندر اندر صابی اور اس کے دوست صاف بری ہو گئے۔ مگر اسکول سے ان کے نام کٹ چکے تھے۔ گو اس کے باپ کے لئے جو اسے عدالت سے بری کروا لایا تھا اسے دوبارہ اسکول میں داخل کروانا کوئی مشکل کام نہ تھا لیکن صابی نے اسکول جانے سے صاف صاف انکار کر دیا۔ اور اس کا باپ بھی یہ کہہ کر خاموش ہو گیا کہ "اتنا ہی کافی ہے کہیں زیادہ پڑھا کر کون سی ملازمت کرانی ہے"

اس کے بعد صابی بالکل ہی رانڈ کا سانڈ بن کر رہ گیا۔

اب پڑھائی میں ہمارا ساتھ چھوٹ گیا تھا لیکن دوستی کا وہ رشتہ جو بچپن میں قائم ہوا تھا اب بھی نہ ٹوٹ سکا۔ ہم اب بھی بدستور بڑی چاہ اور الفت سے ملتے تھے اور ایک دوسرے کو دوست سمجھتے تھے۔ ہم دونوں کے راستے الگ الگ تھے۔ حالات مختلف اور خیالات و کردار میں بھی کوئی یگانگت نہ تھی لیکن دوستی پھر بھی اپنی جگہ پر قائم تھی۔

اس کے بعد میں ملازمت کے سلسلے میں لاہور چلا آیا ہم ایک دوسرے سے دور ہو گئے لیکن جب بھی میں وطن جاتا فاصلہ کی دوری کے ساتھ ساتھ دلوں کی دوری بھی سمٹ سمٹا کر چند لمحوں کے لئے معدوم ہو جاتی۔

اب صابی اپنے باپ کا ولی عہد نہیں بلکہ پوری طرح سے مختار تھا۔ باپ کی وفات کے بعد سے وسیع جائداد کا وہ واحد مالک تھا اور وہ حقوق ملکیت کو پوری طرح سے اپنے تصرف میں لا رہا تھا۔ جب بھی میں گھر جاتا صابی کے متعلق نت نئی بات میرے کانوں سے ٹکراتی

صابی شرابی ہے۔

وہ جوا کھیلتا ہے

عیاشی کرتا ہے۔

میں اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کرتا کہ لوگ اس پر بہتان لگاتے ہیں۔ دوسروں میں کیڑے ڈالنا تو دنیا کی پرانی ریت ہے لیکن جب میں نے ہر زبان سے یہی کچھ سنا تو میں بھی یہ سوچنے پر کہ آخر یہ کوئی انہونی بات تو نہیں تھی۔ اور پھر جبکہ صابی کے طور شروع سے ہی کچھ اچھے نہیں تھے۔ لیکن اتنا کچھ ہوتے ہوئے بھی میرے لئے وہی صابی تھا۔

ایک دن میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ برے کام برے نتائج سے آگاہ کیا۔ بزرگوں سے سنی سنائی اور کتابوں میں پڑھی ہوئی باتیں اس کے سامنے دہرائیں۔ وہ خاموشی سے یہ سب کچھ سنتا رہا۔ اس کی نظریں زمین پر تھیں اور چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ ندامت بھی محسوس کر رہا ہے لیکن جب میں اپنا لیکچر ختم کر چکا تو اس نے بڑے دھیمے پن سے کہا۔

"چھوڑ یار کوئی اور بات کر۔ جتنی دور میں جا چکا ہوں وہاں سے لوٹنا مشکل ہے۔"

"لیکن کوشش تو کرو۔"

"کوشش کی سرحد بہت دور رہ چکی ہے۔ شام کا بھولا صبح تک واپس گھر آ سکتا ہے لیکن جس زندگی کا آغاز ہی بھول سے ہو وہ کیسے واپس لوٹ سکتی ہے؟" اس نے جواب دیا۔ پانی سر سے گذر چکا تھا لہٰذا میں نے خاموش ہو جانا ہی بہتر سمجھا۔ وطن میں یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔

دوبارہ جب ہم پاکستان میں ملے تو صابی کی وہ تمام جائداد جو دست برد سے فی الحال محفوظ تھی۔ ہندوستان میں رہ چکی تھی۔ اور وہ بالکل مفلوک الحال اور بے سہارا تھا۔ جب وہ مجھے ملا تو اس کی صحت صورت اور رنگ و روپ میں کافی تغیر آ چکا تھا لیکن اس کے لباس کی نفاست وہ نائی کی بھڑک، قیمتی گھڑی کی چمک اور ہاتھ کی انگوٹھی کی دمک حسب سابق قائم تھی۔

ہم دونوں چائے سامنے رکھے ایک ہوٹل میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ وہاں صابی نے مجھے جو کچھ بتایا وہ میرے لئے مسرت کا باعث ہونے کے ساتھ حیرت زا بھی تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ اب شراب نہیں پیتا۔ جوا نہیں کھیلتا۔ اس نے ہر وہ کام ترک کر دیا ہے جس کی وجہ سے اسے برا کہا جاتا تھا۔ اب وہ اچھا آدمی اور شریف انسان بن گیا تھا۔ وہ اب اپنے ماحول

تو دیتا تھا۔ اس کی دکان پر بلا مقصد چلا آتا تھا اور پوری تندہی سے کام
تھا۔

یہ سب کچھ سن کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ میں نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

آخر تم سمجھ ہی گئے۔ خدا کرے تمہارے قدم اب ڈگمگانے نہ پائیں

دو مہینے تک صابی پھر کہیں نظر نہ آیا۔ میں نے سوچا دکان کام میں مصروف ہوگا۔ ایک دن مجھے فرصت ملی تو میں خود اس کے وں کی دکان پر پہنچ گیا۔ میں انہیں پہلے سے ہی جانتا تھا علیک سلیک بعد جب میں نے صابی کے متعلق دریافت کیا تو وہ ایک دم بھڑک اٹھے ہوا میں ہاتھ چلاتے ہوئے کہا۔

"کس الو کے پٹھے کا نام لیتے ہو کتے کی دم بارہ برس نلکی میں نے کے بعد نکالی تو وہ پھر ٹیڑھی ہی تھی۔ کبھی پوتڑوں کے بگڑے بھی بھلے ہیں۔ دیکھو نا بیٹا! انہوں نے مجھے مخاطب کیا۔ میں نے سوچا تھا کچھ عرصہ آدمیوں کی طرح بیٹھ کر کام سیکھ گیا تو اسے کوئی الگ کام... وا دوں گا۔ مرنے والی بہن کی نشانی سمجھ کر میں نے چھاتی سے لگایا مگر کردار اس کی ہڈیوں میں حرام اتر چکا ہے۔ آج دو مہینے ہو گئے اسے یہاں سے بھاگے ہوئے۔

"لیکن وہ بھاگ کیوں گیا؟" میں نے کہا

"بھاگ کیوں گیا؟" انہوں نے منہ بنایا۔ اس لیے کہ اسے یہاں ور کھانے کو نہیں ملتا تھا پانچ ہزار روپے دے کر مال لینے بھیجا تھا۔ تو خبر کیا آتا وہ خود بھی نہیں پہنچا اب آیا بھی تو اسے گھر میں نہیں گھسنے دوں گا

یہ خبر سن کر مجھے افسوس ہی نہیں بلکہ صدمہ بھی ہوا پتہ نہیں تھا صابی غریب کی قسمت میں ———— لعنت کے سوا کچھ ھا ہی نہیں تھا۔ اس کی حالت پر افسوس کرتا ہوا گھر پہنچا تو صابی بیٹھک بیٹھا تھا۔ مگر کس حالت میں۔ سر اور داڑھی کے بال بے تحاشا بڑھے ئے۔ آنکھیں اندر دھنسی ہوئی۔ چہرے پر پھٹکار برس رہی تھی اور ہونٹ اور زردی کی قاشیں نظر آتے تھے۔ اس وقت صابی اس نسے یا سی پھول سے مشابہ تھا جو رات کسی عشرت کدہ میں گذارنے صبح کے وقت کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا گیا ہو۔

اس نے نہا دھو کر لباس تبدیل کیا اور جب ہم کھانا کھانے بیٹھے تو میں نے پوچھا: "کہاں سے آرہے ہو؟"

"جیل سے" اس نے جواب دیا۔ "شراب پیتے ہوئے تھا کہ پکڑا گیا۔ ڈیڑھ مہینے کی سزا کاٹ کر آ رہا ہوں"

میں نے اس حالت میں اسے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے کھانا کھانے میں مصروف رہا

رات کو میں اسے سینما دکھانے لے گیا۔ ٹکٹ لے کر اندر گئے موزوں جگہ دیکھ کر بیٹھ گئے۔ فلم شروع ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی ——— صابی نے میرے کان کے پاس منہ لگا کر سرگوشی کی: "ایک روپیہ ہوگا تمہارے پاس؟"

"ہاں۔ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"دینا ذرا" صابی بولا "چاہیے"

میں نے روپیہ اسے دیا تو وہ ابھی آیا کہہ کر ہال سے باہر نکل گیا۔

اس کے بعد پانچ منٹ گذر گئے۔ ریکارڈنگ شروع ہوئی لو ختم ہوگئی۔ تمام بتیاں گل ہوگئیں۔ اور مختلف اشتہارات کی سلائیڈیں دکھائی جانے لگیں۔ لیکن صابی ابھی تک واپس نہیں لوٹا تھا اور اسے گئے بیس منٹ سے زیادہ ہو گئے تھے۔ جس وقت فلم کا ٹائیٹل شروع ہوا اس وقت میں نے دیکھا کہ وہ دروازہ کا پردہ اٹھا کر اندر داخل ہو رہا ہے۔ وہ خاموشی سے اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس کے بائیں ہاتھ کی دو انگلیوں کے درمیان سگریٹ کا ننھا سا جگنو جگمگا رہا تھا میرے پاس بیٹھ کر اس نے آخری کش لگانے کے بعد سگرٹ پاؤں تلے مسل ڈالا۔ دھوئیں کا مرغولہ جو اس نے اگلا تو اس میں تمباکو کی مخصوص بو سے الگ کچھ عجیب اور ناگوار قسم کی بدبو بھی شامل تھی مجھے شبہ سا ہوا جیسے وہ چرس پی رہا تھا میں نے نظر گھما کر صابی کی طرف گھورا۔ چونکہ ہال میں مکمل تاریکی تھی۔ لہٰذا اس کے چہرے سے تو کچھ معلوم نہ ہو سکا لیکن اس کی آنکھوں میں جو کچھ دیر پہلے بجھی بجھی تھیں اب چنگاریاں سی سلگ رہی تھیں جنہیں دیکھ کر میرے شبہات کو مزید تصدیق ہوگئی۔

چند روز بعد صابی مجھے پھر ملا۔ چھٹی کے بعد میں دفتر سے نکل رہا تھا کہ وہ مجھے گیٹ پر کھڑا نظر آیا۔ اور ہم دونوں گھر کی طرف چل پڑے

راستے میں ایک ہوٹل آیا تو وہ ٹھہرتے ہوئے بولا "چلو آؤ چائے پئیں" اور وہ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ میں سگریٹ خریدنے کے بعد ہوٹل میں اس کے پاس گیا تو اسے بیرے کو دو پلاؤ، دو مرغ اور دو فیرنی کا آرڈر دیتے ہوئے پایا اور میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ صابی نے آج پھر کہیں ہاتھ مارا ہے۔

لیکن جلد ہی معلوم ہو گیا کہ صابی نے کہیں اور ہاتھ نہیں مارا تھا بلکہ اس کا ہاتھ مجھ ہی پر پڑ رہا تھا۔ بیرا بل لایا تو صابی نے بغیر دیکھے بل میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے بل دیکھا تو پانچ روپے چودہ آنے کا تھا۔ میں نے استفہامیہ نظروں سے صابی کی طرف دیکھا تو اس نے اطمینان سے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "پیسے دے دو چلیں پھر" بیرا میز پر کھڑا تھا۔ میں نے اسے پان لانے کے بہانے بھیج کر صابی سے کہا۔

"یہ کیا مذاق ہے آخر؟" میرے لہجے میں غصہ تھا "میں کہاں سے بل ادا کروں۔ میری جیب میں تو صرف چند آنے ہیں"

"اچھا!" صابی بڑے سکون سے بولا "تو پھر بیرے سے کہو کہ پولیس کو بلا لائے"

ایک تو صابی کی حرکت ہی بہت ذلیل تھی اس پر اس کا رویہ کمینگی کی حد تک قابل نفرت تھا کم بخت خود تو بچہ گھر دا بن ہی چکا تھا لیکن ایک دوست کی عزت کا بھی کوئی پاس نہیں رہا تھا۔ میں جلتا بھنتا اور اندر ہی اندر کڑھتا اسے بٹھا کر گھر گیا۔ اور وہاں سے پیسے لا کر بل کی ادائیگی کی صورت پیدا کی۔

ہوٹل سے باہر نکلے تو صابی اتنا ہی مطمئن اور پرسکون نظر آ رہا تھا جتنا میں پریشان اور پراگندہ خیال تھا۔ میرے دل و دماغ میں غصے اور نفرت کا آتش فشاں پہاڑ کھول رہا تھا۔ اور وہ پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہونٹوں کے کونوں میں سگرٹ دبائے گیلا بانی بن اور بے فکری سے چل رہا تھا۔ میں نے ضبط کرنے کی بے انتہا کوشش کی لیکن لاوا پھوٹے بغیر نہ رہ سکا۔ میرا ہاتھ صابی پر اٹھ ہی گیا۔ تھپڑ کھاتے ہی وہ لڑکھڑا کر بجلی کے کھمبے سے جا ٹکرایا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا "رذیل کمینے تجھے یہ ذلیل مذاق کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے تھی"

جواب میں اس کی زبان بالکل گنگ رہی۔ اس نے گویا عجیب بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ اور نظریں جھکا لیں۔ اس کی آنکھ میں آنسوؤں کی شبنم لرز رہی تھی۔ اس وقت وہ ایک ایسا معصوم اور بچہ معلوم دے رہا تھا جو کسی شرارت پر پٹنے کے بعد نادم و شرمسار ہو۔ اسے اس انداز میں کھڑے دیکھ کر میرے دل کی ساری کدورت دھل گئی۔ اور میں نے بے اختیار اسے اپنے بازوؤں میں لے کر بھینچتے ہوئے کہا۔

"صابی مجھے معاف کر دو۔ میں غصہ ضبط نہ کر سکا اور میرا ہاتھ پر اٹھ گیا۔ اس کا مجھے عمر بھر افسوس رہے گا۔ خدا کے لئے معاف کر دو مجھے" صابی جواب میں خاموش رہا۔ لیکن اس کے ہونٹوں پر مغموم مسکراہٹ کی چمکیلی کرن نے وہ سب کچھ کہہ دیا جو اس کے دل میں تھا۔ اس کے بعد گھر جا کر جب میں نے اس سے اس عجیب حرکت کے متعلق بڑی نرمی سے دوبارہ استفسار کیا تو اس نے ایک بچے کی طرح رکتے رکتے جھجکتے جھجکتے اور کچھ ڈرتے ڈرتے مجھے بتایا۔

"زمانہ گذر گیا تھا مجھے اچھا کھانا کھائے ہوئے ویسے اگر تم سے کھانے کے لئے کہتا تو تم مجھے گھر لے آتے اور اس طرح میں لذت حاصل نہ کر سکتا جس کے لئے میری زبان ترس گئی تھی۔ اس لئے مجھے یہ قدم اٹھانا پڑا۔ لیکن اب میں بے حد شرمندگی محسوس کر رہا ہوں"

صابی کی زبان سے یہ سن کر میں نے سوچا کہ صابی کے باپ نے اپنے بیٹے کی صحیح تربیت کی طرف سے غفلت برت کر اور بے رخی سے کام لے کر اس کی عادات ہی خراب نہیں کی تھیں بلکہ اس کی قسمت اور مستقبل پر بھی ایک دیرپا اور مستقل اثر ڈالا تھا۔ صابی اگر آج اس حال کو پہنچا تھا تو اس میں صابی کا باپ بھی اتنا ہی مجرم تھا جتنا کہ خود صابی۔

جس روز صابی سے میری آخری ملاقات ہوئی اس روز وہ بے حد پریشان اور فکرمند تھا۔ ان دنوں میں پرائیوٹ فرم میں کام کرتا تھا۔ بارہ بجے کے قریب فرم کے مالک نے مجھے اڑھائی سو روپے دے کر بنک بھیجا کہ میں انہیں جمع کرا آؤں۔ بدقسمتی کی بات کہ وہ روپے راستے ہی میں میری غفلت اور کسی صاحب فن کی انگلیوں کی ہوشیاری کی نذر ہو گئے۔ بنک پہنچنے پر مجھے حقیقت معلوم ہوئی تو میں گھبرا گیا۔

ندفتر واپس جانا مناسب نہ سمجھا۔ مایہ کا نقصان تو ہو ہی چکا تھا۔
رجاتا تو شماتت ہمسایہ کا سامنا بھی کرنا پڑتا۔ لہٰذا میں گھر چلا آیا۔ صبح نو
سے پیشتر اٹھائی سو روپیہ کا انتظام کرنا تھا۔ گھر میں حقیقت حال
ن کئے بغیر بیوی کو باتوں ہی باتوں میں ٹٹولا تو معلوم ہوا کہ اس نیک
ت کے پاس بھی سوائے اللہ کے نام کے کچھ نہیں۔ اپنا جائزہ لیا تو گھر
پچھتر روپیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ باقی پونے دو سو کہاں سے حاصل
ہجائیں۔

یہی مسئلہ تھا جسے سلجھانے کے لئے میں بیٹھک میں متفکر بیٹھا
چ رہا تھا کہ صابی پہنچ گیا۔ اس نے مجھے روپے سامنے رکھے اس
ح مجسم پریشانی بنے بیٹھے دیکھا تو سبب معلوم کرنے کے لئے اصرار
نے لگا۔ آخر مجھے سب حال کہہ دینا پڑا۔ وہ غریب بھی پریشان ہوئے
نہ رہ سکا۔

یہ تو بہت برا ہوا۔" اس نے پریشانی سے اپنی پیشانی پر ہاتھ
رتے ہوئے کہا۔ "اب کیا کروگے؟"

"سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔" میں نے جواب دیا "آخری سہارا چند
ات ہی نظر آتے ہیں۔ یہ تو کوئی اچھی بات نہیں۔ بھابی غریب کا دل
جلے گا۔"

"ہاں، اس کا تو مجھے بھی احساس ہے۔ لیکن اور ہو بھی کیا سکتا
....."

ہم یہی باتیں کر رہے تھے کہ اندر کی طرف کھلنے والے دروازے
ستک ہوئی۔ بیوی مجھے بلا رہی تھی میں صابی کو وہیں بیٹھا چھوڑ کر
ن کی بات سننے گیا۔ اور جب واپس آیا تو صابی جا چکا تھا اور جاتے
تے میری آخری پونجی پچھتر روپے بھی لے گیا تھا
نہ پوچھئے میری کیا حالت ہوئی ایک تو پہلے ہی فکر مند تھا اوپر
صابی نے انتہا کر دی۔ جیب کٹنے کا صدمہ۔ نوکری جانے کا
شہ۔ بدنامی کا خوف اور اب صابی کی ذلالت اور کمینگی پر رنج میں
پڑ کر وہیں کرسی پر بیٹھ گیا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ بیوی نے اپنے زیورات کی قربانی دے کر
عزت اور روزگار کو بچا لیا تھا۔ اب میں بدستور دفتر جاتا تھا لیکن دل
کے نقصان کا زخم بھر تو نہیں البتہ قدرے اچھا ضرور ہو گیا تھا۔ لیکن
صابی نے جو چرکا میرے دل پر لگایا تھا اس میں سے ابھی تک خون
رس رہا تھا۔ میرے دل سے دوستوں اور ان کی رفاقت پر اعتبار
اٹھ گیا تھا۔ اب میں اس صابی سے شدید نفرت کرنے لگا۔ ہفتہ بعد
شام کی ڈاک سے مجھے ایک خط وصول ہوا۔ کھول کر دیکھا تو صابی کا
تھا۔ جی چاہا کہ بغیر پڑھے ہی پھاڑ دوں لیکن پھر میں نے سوچا کہ پڑھ ہی لینا
چاہیئے۔ اس کمینے انسان کا نام پڑھتے ہی میرا دل رنج غصہ اور نفرت
کے جذبات سے چھلکا جا رہا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

"میرے بھائی، میرے دوست! میں نے تمہاری
بھلائی کیلئے ایک خطرہ مول لیا۔ تمہاری بھلائی تو نہ ہوسکی
البتہ وہ خطرہ میری پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ بن کر چمٹ گیا
میں اپنی صفائی پیش نہیں کروں گا۔ صرف حقیقت حال
بیان کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں پونے دو سو روپے کی
ضرورت تھی۔ اور بقول تمہارے اس ضرورت کے پورا
ہونے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ میں نے بہت سوچا
لیکن کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ میں کتنا ہی برا سہی لیکن
چوری کرنا۔ یا ڈاکہ مارنا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ آخر
اس اندھیرے میں مجھے امید کی ایک کرن نظر آئی اور
میں چپکے سے تمہارے روپے لے کر ایک جوا خانہ
میں پہنچ گیا۔ میرے سامنے ایک نیک مقصد تھا۔
اس لئے میرا دل مطمئن تھا۔ لیکن ثابت ہو گیا کہ قسمت
کی برسیدہ اور پھٹی ہوئی جیب دوبارہ رفو نہ ہوسکی اور
میں پائی پائی ہار گیا۔
میں محسوس کرتا ہوں کہ اب انتہا ہو چکی ہے دنیا کے ساتھ
ساتھ اب تم مجھے بھی رذیل اور کمینہ سمجھنے لگے ہوگے۔ مجھ
میں اتنی جرأت نہیں کہ پھر میں دوبارہ تمہارے سامنے
آسکوں۔ ایک ایسا آدمی جو چور نہ ہوتے ہوئے بھی چور
ہے تم ایسے دوست کے سامنے بھلا وہ کیسے آسکے
گا۔ لہٰذا میں نے اب زندہ نہ رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے

جس وقت یہ خط تمہاری نظروں سے گذرے گا اس وقت تک ریل کا آہنی پہیہ میری گردن کو چومتا ہوا آگے بڑھ چکا ہوگا اور میں اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہونگا۔ تم سے میری آخری درخواست ہے کہ اگر تم سے ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔

شرمسار نادم — غلام صابر علی

اس کی موت کی تصدیق ہو چکی ہے اور اس کے بعد یہ بحث چھیڑنا فضول اور بے فائدہ ہے کہ صابی کے اس دردناک انجام کی... ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے ماحول پر؟ غلط تربیت پر؟ باپ کی غفلت پر؟ یا خود صابی کی فطرت پر؟

میں صابی کو معاف کر چکا ہوں۔ میرے دل میں اس کیخلاف کوئی غصہ رنج یا نفرت کا جذبہ موجود نہیں مجھے اس سے بحث نہیں کہ وہ غلط کار تھا یا گنہگار میں تو اتنا ہی جانتا ہوں کہ وہ انسان اور میرا دوست۔ میرا عقیدہ ہے کہ ہر انسان فطری طور پر نیک ہوتا۔ اور صابی نے اپنی جان گنوا کر ثابت کر دیا ہے کہ انسان کا ضمیر کبھی نہیں مرتا اور اس کے ضمیر کے کسی نہ کسی گوشہ میں نیک فطرتی اور خوش خصالی کسی زخمی رگ کی طرح ہر وقت تڑپتی رہتی ہے۔

(بشکریہ — قندیل)

مشتاق راہی

بھول جا غم کے فسانے بھول جا
بھول جا دکھ کے ترانے بھول جا
بھول جا بیتے زمانے بھول جا
چھوڑ دے آہ و فغاں اور مسکرا
آ مسلماں جشنِ پاکستاں منا

جانتا ہوں دل تیرا مغموم ہے
راحت و آرام سے محروم ہے
ظلم و استبداد سے مظلوم ہے
رشکِ جنت زندگانی کو بنا
آ مسلماں جشنِ پاکستاں منا،

گلستاں میں ہر کلی ہے سوگوار
چھا گیا چاروں طرف گرد و غبار
چھن گیا انساں سے صبر و قرار
بلبلِ رنگیں نوا نغمہ سُنا
آ مسلماں جشنِ پاکستاں منا۔

مشکلوں پر مسکرانا ہے تجھے
ظلمتوں کو جگمگانا ہے تجھے
صفحہ ہستی پہ چھانا ہے تجھے
جانبِ منزل قدم اپنا بڑھا
آ مسلماں جشنِ پاکستاں منا۔

اٹھ پیامِ نو سنا سکتا ہے تو
ذرہ ذرہ کو جگا سکتا ہے تو
قوم کی بگڑی بنا سکتا ہے تو
عزم نو سے سبز پرچم پھر اٹھا
آ مسلماں جشنِ پاکستاں منا۔

اکرام للت پھدی•

تاثرات ومشاہدات

(جشن آزادی کے ساتویں سال پر)

سال ہفتم بھی ہوا آخر بفضل ایزدی
ہے مگر مفقود دورِ شادمانی آج بھی
کل بھی تھا ہندوستاں میں تختۂ مشقِ ستم
تنگ ہے مسلم پہ دورِ زندگانی آج بھی

وہاں تو وادیٔ تیونس میں ہیں سینہ سپر غازی
یہاں ہم ہیں کہ عقل و ہوش سے بیگانہ ہیں اب بھی
وہاں ہے لاالٰہ کا شور تلواروں کی جھنکاریں!
یہاں ہم ہیں کہ محوِ ساقی و پیمانہ ہیں اب بھی

★

فلسطین و کشمیر و ہندوستاں میں
مسلماں کا ارزاں لہو دیکھتا ہوں
کراچی ہے سب کی نگاہوں کا مرکز
یہاں دورِ جام و سبو دیکھتا ہوں

★

نصیب چمن سے کب کس کو آب و دانہ ہے
وہی نظامِ حکومت وہی — زمانہ ہے
خزاں میں رہ کے فریب بہار کیوں کھائیں
قفس کو کیسے سمجھ لیں کہ آشیانہ ہے۔

★

ساقیٔ انجمن کی یاد آئی — نہ کسی گلبدن کی یاد آئی
راز رونے کا پوچھنے والو — آج مجھ کو وطن کی یاد آئی

منور سلطانہ

یوم پاکستان

صبح کی سپیدی نمودار ہو رہی تھی۔ ستارے آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے...... صبح اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر تھی....... نسیم سحر کے دماغ پر دور اور خوشگوار جھونکے عطر پاشی کر رہے تھے۔ درختوں کی ٹہنیاں متوالوں کی طرح جھوم رہی تھیں۔ دور کھیتوں پر پیارے پیارے خوب صورت پرندوں کی چہچہاہٹ کوئل کی کو کو، اور پپیہے کی پی کہاں! پی کہاں! کی پُر سوز و دلکش آوازیں آ رہی تھیں ——— آفتاب عالم تاب اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ فلک پر جلوہ گر ہو رہا تھا....... اتنے خوشگوار دن میں فوضیہ خلاف معمول بہت افسردہ تھی۔ اسے کسی پہلو چین نہ آتا۔ فجر کی نماز سے فارغ ہوتے ہی وہ اپنے کمرہ میں چلی آئی۔ اور کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہو گئی مگر وہ اسے بھی اطمینان و سکون سے نہ پڑھ سکی....... اس نے کتاب میز پر رکھدی، اور خود میز پر دونوں کہنیاں ٹیک کر فکر و سوچ کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گئی ——— اس کے دل میں باربار یہ خیال چٹکیاں لیتا۔ کہ آج چودہ اگست ہے....... وہ مبارک دن جس دن مسلمانوں کا ایک نیا ملک معرض وجود میں آیا........... پاکستان کیسا پیارا نام ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ اس کا چہرہ پژمردہ ہو گیا۔ کیوں کہ اس کی نگاہوں کے سامنے پاکستان کی گذشتہ پوری چھ برس کی زندگی کا سین گذرنے لگا۔ وہ سین دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ لیکن آہ افسوس کسی سین میں بھی تو اسے پاکستان کے مقصد کی تکمیل کی ذرہ برابر جھلک دکھائی نہ دی۔ کس قدر زریں مقصد کے لئے پاکستان حاصل کیا گیا۔ یعنی یہاں دین حق عملاً برپا کر کے دنیا پر اسلام کی خوبیاں واضح کر سکیں۔ اور خدا کی صحیح معنوں میں فرمانبرداری کر کے دین و دنیا میں عزت کا مقا[م] حاصل کر سکیں اور...... اور...... یکلخت اس کے خیال[ات] کی تیز رفتار گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی ——— کسی نے [پیچھے] سے آکر اس کی آنکھیں بند کر لیں................ کون...........

ثریا..... جمیلہ........ مسرت....... ارے چھوڑ بھئی! [اب] میں سمجھ گئی ہوں۔ تم ہو سمیرا......... ہنستی ہ[وئی] میز کے سامنے والی کرسی پر آ بیٹھی۔ بڑی بے نیازی کے ساتھ میز [پر رکھی] کتابیں الٹ پلٹ کرنے لگی۔ فوضیہ اس کی طرف بڑی گہری توجہ [کے] ساتھ دیکھنے لگی ——— وہ ایک زرق برق بیاس زیب تن کئے تھی پوڈر اور لپ اسٹک سے چہرہ جگمگا رہا تھا۔ لپ اسٹک سے ہونٹ یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے ابھی ابھی کسی جاندار کا خون پی آ رہی ہو........ مصنوعی گھنگریالے بال جو بڑی ہی دلکش وضع بنا کر کھلے چھوڑ رکھے تھے........ کٹی ہوئی بھویں...... نیل[پالش] سے رنگین لمبے لمبے ناخن........ جنہیں دیکھکر چشم تصور میں بندر[یاد آنے] لگتا...... غرضیکہ اس کی ایک ایک چیز اس کی مغربی لڑکی ہونے [کی] شہادت دے رہی تھی۔

اسلامی کتابوں کو دیکھکر سمیرا کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں: [یہ] کہاں سے لی ہیں؟

"کیوں کیا اچھی نہیں ہیں؟" فوضیہ اس کے قریب آ بیٹھی

"اچھی ہیں" وہ بے اعتنائی سے بولی لیکن ——— اس کا [چہرہ] اس بات کی تردید کی غمازی کر رہا تھا۔

"خوب" وہ مسکرائی "تمہیں کیا پسند ہے؟"

"کچھ نہیں" وہ اپنے لمبے لمبے ناخنوں کے ساتھ میز پوش کو

ہوئے بولی۔ آج ان باتوں کے لئے وقت نہیں ہے آج یوم آزادی کی
خوشی میں کہیں سیر کا پروگرام بننا چاہیئے۔"

"اوہو معاف کرنا تم یوم آزادی منا رہی ہو۔ میں نے سمجھا شاید
کہیں شادی میں جا رہی ہو۔"

"زیادہ باتیں بنانے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہاری اس طنز
کو خوب سمجھتی ہوں۔ اٹھو۔" اس نے فوضیہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھانے کی
کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "جلدی سے لباس تبدیل کرو۔"

"واہ! کہیں جانے کا ابھی پروگرام بنا نہیں۔ اور لباس پہلے
ہی تبدیل کرانے لگی ہو سمیرا ہوش میں بھی ہو یا نہیں۔"

"ہوش میں ہوں۔ اٹھتی ہو یا نہیں۔؟ یا کوئی اور طریقہ اختیار کروں"

"نہ میری بہن نہ میں ابھی اٹھتی ہوں مگر اتنا بتا دو کہ تم مجھے کہاں
لے جانا چاہتی ہو۔ اور کیوں؟"

سمیرا ہنس پڑی۔ کسی نے سچ کہا لاتوں کے بھوت باتوں
سے نہیں مانتے۔ اب آئی ہو راہ درست پر۔ کیوں کا جواب میری
جان یہ ہے کہ آج یوم آزادی ہے اس آزادی کی خوشی میں لاہور کی
بہت سی دلفریب سیرگاہیں ہمارے قدم چومنے کے لئے بیقرار ہیں۔
تم جسے چاہو اس عزت افزائی کے لئے منتخب کر لو۔

"کیا ہمارا آج پورے بناؤ سنگار کے ساتھ کھلے منہ وہاں جانا
ان کے لئے باعث عزت ہے" اور قدرت کی ان دلفریب
سیرگاہوں کے لئے واقعی ہمارے قدم اس قدر پاکیزہ بن چکے ہیں کہ وہ
انہیں چومنے کے لئے بیقرار ہیں۔"

"بالکل"

"کیا تم سنجیدگی سے کہہ رہی ہو؟"

"ہاں"

"ایک بات پوچھوں؟"

"لیکن مختصر ہو کیونکہ پھر دھوپ میں جانا مشکل ہو جائیگا۔"

"بے فکر رہو مختصر سی ہو گی۔" سمیرا کے چہرے کی طرف ایک
لمحہ دیکھنے کے بعد "کیا تم نے کبھی آزادئ پاکستان کے مقصد پر بھی
غور کیا۔"

"یہ کتنا عجیب سوال ہے" وہ قدرے حیران ہو گئی۔ "مقصد تو بچے
بچے کو معلوم ہے تو کیا تم بھول گئی ہو یا مجھے بنا رہی ہو۔"

"بھولی نہیں ہوں۔ صرف تمہاری زبان سے سننا چاہتی ہوں
کیونکہ ممکن ہے کہ وہ میری نگاہوں میں کچھ اور ہو اور تمہاری نگاہوں
میں کچھ اور۔"

"کیسی بے معنی باتیں کر رہی ہو" وہ جھنجھلا اٹھی۔

"کیا یہ بے معنی ہیں۔ لیکن میری عزیز بہن میں تو اپنے سوال کا
جواب پوچھ کر رہونگی۔"

"پہلے سیر کا پروگرام بنا لو پھر ایسی باتیں کریں گے۔"

"جب تک تم میری بات کا جواب نہ دو گی۔ اس وقت تک
پروگرام نہیں بن سکے گا۔"

"بڑی ضدی ہو فوضیہ تم۔ اچھا لو تم جیتی میں ہاری۔"

"شکریہ۔ اب میری بات کا جواب دو۔"

"کس بات کا۔؟"

"یہی قیام پاکستان کا مقصد؟"

"لو سنو میری ضدی بہن" اس نے میز پر کہنیاں ٹیکتے ہوئے
کہا۔ تم جانتی ہو متحدہ ہندوستان میں چونکہ ہماری تہذیب و تمدن
یعنی پورے اسلام کو خطرہ تھا۔ اس لئے قیام پاکستان کی ضرورت
پیش آئی۔"

"کیا اب وہ خطرہ دور ہو گیا ہے۔؟"

"اب اسلام کو کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔" اس نے ایک زور سے
قہقہہ لگایا۔ اب تو یہاں بھی مسلمان بستے ہیں میری ذہین بہن! اب
اسلام کو کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔"

فوضیہ نے اس طنز کو شدت سے محسوس کیا۔ مگر اس نے
اپنی متانت میں فرق نہ آنے دیا۔ اور بولی "معاف کرنا سمیرا میں تمہارے
اس خیال سے اتفاق نہیں کر سکتی۔ جتنا اسلام کو اپنوں سے خطرہ
ہے اتنا غیر مسلموں سے نہیں۔ یہ مسلمان ہی تو ہیں جو اپنے قول و عمل
سے خدائی احکام کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھیر رہے ہیں۔ کیا یہ
اسلام کو زبردست نقصان پہنچانے کا باعث نہیں بن رہے؟ تم

مسلمان خواتین ہی کی طرف دیکھو کہ یہ مسلمان ہو کر کس طرح اسلام کے خلاف چل رہی ہیں۔ ان کا کھلے ناز و نخرے سے بازاروں اور پارکوں میں گھومنا۔ سینما ہاؤسوں کا طواف کرنا۔ خوب صورت لباس زیب تن کر کے مردوں کو اپنی شانیں دکھلانا۔ کیا یہ اسلام کے مطابق ہیں۔ ان کی یہ بے باکیاں یا خدا کی کھلی ہوئی نافرمانیاں دیکھ دیکھ کر مجھے تو اس قدر شرم آتی ہے کہ یہ جی چاہتا ہے کہ زمین پھٹ جائے تو میں اس میں سما جاؤں .... کاش یہ اتنا سوچیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم جن کا وہ کلمہ پڑھتی ہیں۔ اور ان کی امت کہلانے پر فخر محسوس کرتی ہیں۔ انکی بیگمات کے طور طریقے کیا تھے۔ خلافت راشدہ میں مسلمان خاتون کی روشنی کیا تھی۔ پھر دورِ عباسی میں جب کہ زمانہ بہت بدل چکا تھا۔ اور مسلمانوں کے پاس مال و دولت کی بہتات تھی مسلمان خاتون کی زندگی کیسی تھی اسلام نے عورت کو آزادی بخشی۔ اس کا وقار قائم کیا۔ یہاں تک کہ ماں کے پاؤں تلے جنت بتائی مگر افسوس صد افسوس آج وہی عورت اسلام کی جبیں پر کلنک کا ٹیکہ بن رہی ہے۔ تم ہی بتاؤ کیا یہ لوگ اسلام کے لئے خطرہ نہیں ...؟"

وہ اگرچہ تیزی سے بول رہی تھی۔ لیکن اس کے لہجے میں مٹھاس تھی۔ اور اس کی باتیں پُراثر۔ جو کانوں سے گذر کر دل کی گہرائیوں میں جھانک رہی تھیں۔ سیمرا چند لمحوں کے لئے اپنے آپ کو بھول کر متحیر نگاہوں سے اس کی طرف تک رہی تھی ——— یکایک وہ سنبھلی اور کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ سامنے کا پردہ ہلا۔ اور سلمہ کمرے میں داخل ہوئی

"اسلام علیکم"

"وعلیکم سلام" وضیہ بولی۔ اور سیمرا دبی زبان میں کچھ کہتے رہ گئی۔

"کہیں میں مخل تو نہیں ہوئی" سلمہ برقعہ اتارتے ہوئے بولی

"رہنے دو ان رسمی باتوں کو میں تو صبح سے تمہاری منتظر تھی آؤ اس کرسی پر بیٹھو"

سیمرا وضیہ کی باتوں کو سنی اَن سنی کرتے ہوئے بولی "بڑی خوشی ہوئی آج تمہیں مل کر ...... بڑی مدت کے بعد نظر آئی کہاں رہیں؟"

— "کراچی میں"

اسے بغور تکتے ہوئے "تو کیا تمہاری شادی ہو گئی"

"ارے نہیں" وضیہ نے سلمہ کو ٹوکا "آج تو یومِ آزادی ہے"

"او معاف کرنا سیمرا۔ تمہارے میک اپ نے مجھے دھوکا دیا" سیمرا قدرے جھینپ سی گئی۔ اور اسی لمحہ نوشابہ پرس ہلاتی برقعہ سے بے نیاز "گڈ مارننگ" کہتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ "گڈ مارننگ" کا لفظ سن کر سبھی مسکرا پڑیں۔

آہا آہا! میری ساری عزیز فرینڈز یہیں جمع ہیں۔ کتنی خوشی کی بات ہے۔ چلئے نا آج یومِ آزادی کی خوشی میں "باغِ جناح" اور "گلستانِ فاطمہ" کی سیر کریں" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گئی۔

سلمہ ذرا تیز طبیعت کی لڑکی تھی وہ نوشابہ کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

"دیکھو نوشابہ ہم چاروں کے درمیان بچپن ہی سے بے حد محبت و بے تکلفی رہی ہے۔ اس لئے میں تم سے یہ پوچھنے کی جرأت کرتی ہوں۔ کہ کس آزادی کی خوشی میں تم "باغ جناح" جانا چاہتی ہو کیا اسلام سے آزادی کی خوشی میں؟"

"کیا بکتی ہی ہو تم۔ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھ سکی" وہ اسلام کے نام سے پریشان سی ہو گئی۔ "کیا آج کے دن ہم انگریزوں اور ہندوؤں کی غلامی سے آزاد نہیں ہوئے تھے۔ کیا آج کے دن پاکستان معرضِ وجود میں نہیں آیا۔ اسی آزادی کی خوشی میں "باغِ جناح" جانے کے لئے کہہ رہی ہوں" آخری الفاظ اس نے تیزی سے کہے۔ سیمرا کے چہرے پر بھی کچھ رونق آگئی۔

"میں پوچھتی ہوں ان سے کیوں ہم نے آزادی حاصل کی" نوشابہ بغلیں جھانکنے لگی۔ یہ دیکھ کر سلمہ پھر بولی۔

میری بہن! اپنے آپ کو دھوکا دینے کی کوشش مت کرو۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ ہم نے انگریزوں اور ہندوؤں سے آزادی حاصل کی تھی کہ ہم اپنے آپ کو پورے طور پر اللہ کی غلامی

یدیں۔ لیکن ہوا کیا؟ غیر مسلموں کی غلامی کا طوق گلے سے اترتے ہی
اور اس کے رسول سے بھی آزادی کا علانیہ اعلان کر دیا ۔۔۔۔۔۔ معاف
نا نوشابہ! تم اپنی ہی طرف دیکھو پاکستان کے قیام سے قبل تم کس قدر
دے کی پابند تھیں۔ لیکن اس کے بعد تم نے پردے کو یوں خیرباد کیا
پاکستان حاصل ہی اس لئے کیا گیا تھا کہ ہم اسلام سے بھی آزاد ہو جائیں

"نہیں نہیں سلمہ! تم غلطی پر ہو" وہ جلدی سے بولی: "میں
نے پردہ تو صرف اس لئے اتارا کیونکہ پردے میں نہ تو ہم کوئی ترقی کر سکتی
ہیں اور نہ ہی کوئی قوم کی خدمت ہو سکتی ہے۔ خدا گواہ ہے میں ایسا کر کے
ئی اسلام سے تو منحرف نہیں ہوئی"

"یہی تو ہماری زبردست بھول ہے۔ ہم سمجھتی ہیں کہ پردہ سے
بے نیاز ہو کر مردوں کے سے کام کر کے ہی ہم ترقی کر سکتی ہیں میری
ن ایسا نہیں ہے، اسلام نے عورت کو جو پاکیزہ آزادی بخشی ہے وہ کسی
مذہب نے نہیں بخشی۔ عورت کو صرف نقاب کی ضرورت ہے
ل یا کسی اور موقع پر نقاب کی بھی ضرورت نہیں۔ وہ ایسی حالت
میں مردوں کے دوش بدوش ہر کام میں حصہ لے سکتی ہے۔ لیکن عام
حالات میں وہ پردہ کے اندر رہ کر بھی سب کچھ کر سکتی ہے۔ میری بہن! جب
ستے میں خدا کے صریح احکام موجود ہوں اس میں تو بحث کی بھی گنجائش
ہیں۔ افسوس عورت چراغ خانہ تھی۔ اب اسے چراغ محفل بنا لیا گیا
ہے۔ شاید "چراغِ محفل" بنانے کے لئے ہی اسے یہ بتایا گیا ہے کہ تو
پردے کے اندر رہ کر ترقی نہیں کر سکتی"

سلمہ تم جو کچھ کہہ رہی ہو وہ ٹھیک ہے لیکن دکھیانی ہنسی ہنس
کر، زمانے کی ہوا کا رخ تو آخر دیکھنا پڑتا ہے۔ تم دیکھتی ہو ہماری لیڈران
کرام سب بے پردہ پھرتی ہیں۔ بڑے بڑے عہدیدار اپنی بیگمات کو بے پردہ
لئے پھرتے ہیں۔ اور ....

سلمہ نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا: "نوشابہ! اب یہی بات
ان پر لاگو ہوتی ہے۔ دراصل آپ لوگ تو زمانے کے رخ کو دیکھتے ہیں
جیسے لوگوں کی پیروی کرنا فخر سمجھتے ہیں۔ لیکن ہم نے تو اس غیر اسلامی
رخ کے خلاف چلنے کے لئے تو پاکستان قائم کیا تھا۔ اس لئے تو ہم جانی
اور مالی بے حد و حساب قربانیاں دیں۔ پاکستان کے قیام کا واحد مقصد

ہی یہ تھا کہ ہم مسلمان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اسلامی اصولوں
کے مطابق بسر کریں۔ اور یہاں کا نظام خالص اسلامی نظام ہو۔ کیا
یہ ٹھیک نہیں؟" یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کے لئے خاموش ہو گئی۔ سب کو خاموش
دیکھ کر پھر بولی۔

"کیا یہ ہماری لیڈران جن کی پیروی آج ہمارے لئے باعثِ فخر
بن گئی ہے۔ کیا وہ صحابیات کرامؓ سے بھی مرتبہ کی ہیں۔ کیا تم نے
کبھی تاریخ اسلام میں یہ پڑھا کہ ہماری وہ لیڈران کرامؓ جن کی زندگیاں
خالصتہً اسلامی زندگیاں تھیں۔ وہ بھی کبھی کھلے منہ کسی مجلسوں میں
شریک ہوتی تھیں۔ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر خدارا تم ہی انصاف سے
کام لے کر بتاؤ کہ بحیثیت مسلمان ہمیں زمانہ سلف کی دختران اسلام کی
پیروی کرنی چاہئے یا فرنگیوں کے نقش قدم پر چلنا چاہئے"

"سلمہ! تمہارا کہنا سو فیصدی درست ہے" نوشابہ جو ابتک
خاموش تھی بولی "مجھے اس موقعہ پر ایک تاریخی واقعہ یاد آ رہا ہے۔ ایک
دفعہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بڑی دختر بلند اختر حضرت اسمٰاؓ کہیں جا رہی
تھیں۔ راستہ میں رسول خدا انہیں چند اصحاب کے ہمراہ ملے۔ آنحضرتؐ
نے انہیں پیدل چلتے دیکھ کر اپنے پیچھے اونٹ پر سوار ہونے کو کہا۔ مگر
انہوں نے محض اس لئے انکار کر دیا کہ حضرت زبیرؓ جو ایک بڑے
غیور مسلمان تھے انہیں ناگوار نہ ہو ۔۔۔۔۔۔ آج کے حالات کو دیکھ کر کہنا
پڑتا ہے کہ مسلمان کی تقدیر ہی بگڑی ہوئی ہے۔ نہ ان کے دل
میں اللہ اور اس کے رسول کا احترام اور نہ اسلامی روایات سے
محبت ......"

نوشابہ بات پوری نہ کرنے پائی تھی کہ اس کی امی جان کمرے
میں داخل ہوئیں۔ انہیں دیکھ کر سب نے بڑے احترام سے سلام
کیا۔ انہوں نے درجہ بدرجہ سب کو پیار کرتے ہوئے کہا۔ کہ کھانے
کا وقت ہو چکا ہے اب چل کر کھانا کھاؤ۔ نوشابہ نے کلاک کی طرف دیکھا
گیارہ بج رہے تھے "ان باتوں میں اتنا وقت ہو گیا" سب لڑکیاں
اٹھ کھڑی ہوئیں۔ کھانے والی میز پر وہ چند بزرگ خواتین کے احترام کی
وجہ سے خاموش ہی رہیں۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ پھر اسی کمرے
میں آ گئیں۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ آخر میرے لئے ہوئے کوت کو توڑتے

ہوئے کہا۔

"مگر آج کہیں گئی ہیں۔ تو کچھ گانا دانا ہی ہو جائے"

ضرور ضرور نوشابہ نے قدرے جھجکتے ہوئے تائید کی۔ اُس کے انداز سے یہ ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ سلمیٰ اور وضیہ سے کافی مرعوب ہو چکی ہے"

"یہی عشقیہ گانے تو آج کل گھر گھر لیلیٰ مجنوں پیدا کر رہے ہیں ان سے تو بہت پرہیز کرنا چاہئیے۔ ہاں اصلاحی اور پاکیزہ نظمیں ضرور پڑھنی چاہئیے۔ جتنا ان میں نقصان ہے اتنا ان میں فائدہ ہے"

"اگر کہو تو میں نذیر حزیں کی ایک نظم سناؤں مجھے بڑی پسند ہے"

"ہاں ہاں ضرور" سب نے بیک زبان کہا۔

وضیہ آہستہ آہستہ گانے لگی۔ اور سب ہمہ تن گوش ہو گئیں۔

تیرے چہرے پہ لپ پوڈر بہت ہی خوب لیکن
تو اس چہرہ کو پردہ میں چھپا لیتی تو اچھا تھا
تیری صورت سے غیرت اور خودی کی موت ہے ظاہر
یہ چہرہ بے حجابی کا چھپا لیتی تو اچھا تھا
تو جس تہذیب کی شیدا ہے عصمت چھین لیتی ہے
تو اس عفریت سے دامن بچا لیتی تو اچھا تھا
بہت کچھ بن کے بھی تو پھر رہی عورت کی عورت ہے
چراغ خانہ ہی بن کے نبھا لیتی تو اچھا تھا
یہی کافی تھا بچوں کی تو کرتی تربیت اعلیٰ
انہیں کو فخر ملت کا بنا لیتی تو اچھا تھا
یہی خدمت ہے تیری یہی ایثار ہے تیرا۔
اگر تری یہ خواہش تھی کہ کرتی قوم کی خدمت
تو پہلے نفس کو اپنے دبا لیتی تو اچھا تھا

وضیہ خاموش ہو گئی۔ لیکن اس کے ترنم سے کمرہ گونج رہا تھا۔ اس کے لہجے میں بے حد درد اور سوز تھا۔ سلمیٰ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ سیمی اور نوشابہ نے ندامت سے سر جھکا لئے۔ گانا اگرچہ ختم ہو چکا تھا۔ لیکن اب بھی اس کی آواز ان کے دلوں کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔..........

مسعود جاوید •

خوں میری آنکھوں سے رواں ہے کہ جو تھا
ذوقِ تزئین چمن زار جواں ہے کہ جو تھا،
زنداں، کہیں زنجیر، کہیں دار بھی ہے
قافلہ پھر بھی محبت کا رواں ہے کہ جو تھا
اک کر کے ستاروں کے دئے بجھ بھی گئے
قلب مہجور مگر محو فغاں ہے کہ جو تھا
مینوں کی گھنی زلفوں کے سائے میں بھی
آفت جاں وہی اک سرو رواں ہے کہ جو تھا
لردار کو پارینہ سمجھنے والو ——— !
دیکھنا ہو تو ادھر آؤ، یہاں ہے کہ جو تھا
لیتے ہیں صحن گلستاں میں بہار آئی ہے
دل کی قسمت میں مگر داغ خزاں ہے کہ جو تھا

نظر خورجوی •

چشم نرگس آج اگر ہے کم نظر
کوئی تو ہوتا چمن میں دیدہ ور
ہم کو منزل پر پہنچنا ہے چلو
کارواں کیسا، کہاں کا راہبر
سعی پیہم سے بدلتا ہی نصیب
ہمدم اس حالِ زبوں کا غم نہ کر
دستِ گلچیں میں نہ آتی اے کلی
اپنی نکہت کو نہ کرتی عام اگر
خود بخود آفات سر ہو جائینگی
لیکے اٹھ نام خدا اے ہم سفر
جلوہ دکھلاتے ہیں آپ اپنا کسے
وہ نظر ہے اب نہ وہ ذوقِ نظر

چند خطوط

* ★ راغب مراد آبادی (کراچی)
* ★ رحمٰن شاد (گوجرانوالہ)
* ★ صدیق احمد صدیقی

کرم گستر بندہ بیگ صاحب دامت عنایتکم سلام مسنون۔

مشیر کا تازہ شمارہ فردوس نظر ہوا۔ ممنون احسان ہوں۔ مشیر یقیناً ایک بلند معیار مجلہ ہے لیکن اس کا حصہ نظم توجہ طلب ہے۔ مجھے بخوبی یاد ہے کہ میں نے ایک مرتبہ پہلے بھی اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔ تازہ شمارہ میں جناب کوثر نیازی کا جو مکتوب شائع ہوا ہے مجھے اس سے حرف بحرف اتفاق ہے۔ کوثر صاحب کی رائے نہایت صائب اور واجب العمل ہے مجھے تعجب ہے کہ اس شمارہ کا حصۂ نظم بھی جاندار نہیں سرشار صدیقی صاحب کی اعلیٰ صلاحیتوں سے انکار نہیں موصوف میرے دیرینہ روابط ہیں۔ مقام حیرت و استعجاب ہے کہ سرشار صاحب کی نظم بعنوان "پرانا اصول" کے چند مصرع خارج از بحر ہیں۔ یہ نظم بحر خفیف مسدس مخبون مقصور یا محذوف میں ہے جس کے ارکان ہیں فاعلاتن مفاعلن فعلان یا فعلن۔ چنانچہ شاعر موصوف کی نظم کے بعض مصرع خفیف مسدس مخبون مقصور میں اور بعض محذوف میں ہیں۔

زندگی ان کا ساتھ کیا دے گی ——— جن کا مقصد تلاش اصل حیات وقس علیٰ ہذا۔ لیکن یہ مصرع خارج از وزن ہیں :۔

۱۔ اور زیرِ زمیں ہو جاتے ہیں ——— "ہو" کی واؤ غائب ہو گئی

۲۔ پھر اس عرصہ گاہِ ہستی میں ——— اگر شروع میں لفظ "اور" بڑھا دیں تو وزن درست ہو سکتا ہے۔

۳۔ آگ بسنے ہی چمن زاروں میں ——— اس کا وزن ہے فاعلاتن فعلاتن فعلن۔

۴۔ ظلمتِ تخریب کے انگاروں میں ——— اس کا وزن بھی ——— فاعلاتن فعلاتن فعلن۔

۵۔ جو ظلمت کا چاک کر کے جو ——— اگر "جگر" کو "تحرک" کے وزن پر پڑھیں تو موزوں ہو گا ورنہ ساقط البحر۔

۶۔ تجلیوں کو نکال لیتے ہیں ——— غلط ہے۔

۷۔ نشاط مستی میں ڈوب کر بھی ——— غلط۔ اگر نشاط کی جگہ "فرط" ہوتا تو خارج از بحر نہ ہوتا۔

۸۔ پیامِ رحمت کو عام کرتے ہیں ——— پیام بروزن "انجام" نظم ہوا ہے جو غلط محض ہے۔

۹۔ روح تک کی آواز سنتے ہیں ——— ساقط الوزن مصرع آواز کو "نماز" کے وزن پر باندھا ہے جو صریحاً غلط ہے۔

صرف ایک نظم میں وزن و بحر کی اس قدر اور نہایت فاش غلطیاں ہیں۔ یہ نظم آپ نے موقر مجلہ "ادب" سے نقل کی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ مشیر کے کاتب نے تصرف فرمایا ہو۔ بہر حال حصۂ نظم مشیر کی شان کے شایان نہیں۔ میں بخوف طوالت دوسری نظموں کی معائب کو نظر انداز کرتا ہوں ورنہ یہ مکتوب اچھا خاصا مضمون ہو جائیگا۔

چند رباعیاں منسلک مکتوب ہیں۔ براہِ کرم جواب سے مطلع فرمائیگا۔ میرے لائق کوئی خدمت!

راغب مراد آبادی

پیارے بھائی۔ آداب و تسلیمات!

مشیر ملا۔ ذرہ نوازی کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ میری نظم بعنوان "رات" پر محترم کوثر نیازی صاحب کی تنقید پڑھ کر نہایت ہی فرحت ہوئی جس غلطی کی طرف انہوں نے اشارہ کیا ہے میں اسے تسلیم کرنے کے علاوہ ان کا لامحدود شکریہ بھی ادا کرتا ہوں لیکن یہ فقرہ "کہ مدیر حضرات کی طرف سے رہنمائی نہ ہونے کی وجہ سے میری زبان و بیان میں" ترقی پسندی "بری طرح سے سرایت کر رہی ہے" نہایت ہی مضحکہ خیز ہے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ "ترقی پسند

سے کوثر صاحب کا کیا مفہوم ہے۔ نامعلوم ان کے پاس کون سا آلہ ہے جس سے انہیں ترقی پسند رجحانات کا اندازہ ہو جاتا ہے اگر غربت و افلاس تنگدستی و سماجی بدحالی اور سسکتی ہوئی انسانیت کے متعلق اشعار کہنے کا نام ترقی پسندی ہے تو میرے خیال میں اس دور کے ہر حساس شاعر و ادیب کو ترقی پسند ہونا چاہیے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ میں بھی جناب کوثر صاحب کی طرح اسلام پسند شاعر ہوں۔ لیکن میں اپنی شاعری کو ایک "محدود طبقہ" کے لئے مخصوص کرنے کا خواہاں نہیں ہوں جس طرح کوثر صاحب کے دل کی فضا پر آہوں کا دھواں" طاری" رہتا ہے اسی طرح میرے حساس دل کو خدا کی سسکتی ہوئی انسانیت سے محبت ہے۔ اگر اس محبت اور زبوں حال لوگوں کے دلوں میں ترقی و بیداری کا شعور پیدا کرنے کا نام ترقی پسندی ہے تو میں سب سے بڑا ترقی پسند ہوں۔ ہاں تو بھائی جان! چند نظمیں بھیج رہا ہوں اگر صفحات اجازت دیں تو۔ شائع کر دیجئے گا۔

والسلام — رحمٰن شاد

مدیر محترم اسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

ماہ جولائی کا شمارہ دیکھا — اس میں محترم کوثر نیازی صاحب ضیا محمد صاحب اور طالب حجازی صاحب کے خطوط پڑھ کر بہت مسرت ہوئی کہ اسلام پسند ادیبوں کے ہاں اشتراکیت زدہ ترقی پسندوں کی طرح من ترا حاجی بگویم والا معاملہ نہیں ہے۔ شکر ہے کہ ہمارے ادیبوں نے اپنی نگارشات کے معیار کو بلند کرنے کی نیت سے صحت مندانہ تنقید سے غفلت نہیں برتی۔ اور گروہی عصبیت میں نہیں الجھے۔ درحقیقت — جب تک ہمارے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات دوسرے ادیبوں اور شاعروں کی نگارشات سے بلند تر بہتر اور دلچسپ تر نہ ہوں گی اس میدان میں باطل کو شکست نہیں دی جا سکتی۔ اور اسلامی نظام قائم کرنے کے سلسلے میں اس میدان کی اہمیت کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں یہ ایک خوشی کی بات ہے کہ ہمارے ادیب اس طرف توجہ دے رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ دیکھ کر افسوس بھی ہوا کہ اس شمارے میں

بھی ناقابلِ برداشت حد تک کمزور ہے — اور چند ایک خامیاں رہ گئی ہیں۔

سب سے زیادہ حیرت سعادت حسن منٹو کے افسانے "پچھوا چلا" کو شریکِ اشاعت دیکھ کر ہوتی ہے۔ مانا کہ منٹو نے کہانی کو کافی دلچسپ بنایا ہے لیکن آپ نے اس کے مجموعی تاثر کو کیوں نہیں دیکھا — پھوجا حرامزادہ ننگ دھڑنگ سارے اسکول کا چکر کاٹتا ہے۔ ہیڈ ماسٹر تک کی نظروں میں آتا ہے۔ لیکن ہیڈ ماسٹر صاحب اس کے گھر سے کپڑے منگوا لینے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرتے۔ وہ پروفیسر کی سائیکل کو درخت کی اونچی چوٹی پر لٹکا دیتا ہے۔ پرنسپل کی کار کا انجن غارت کر دیتا ہے۔ لیکن اس سے باز پرس تک نہیں ہوتی۔ اور یہ کیوں اس لئے کہ اسے پرنسپل کے کچھ راز معلوم ہیں۔ دیکھا آپ نے یہاں پرنسپل کو کیریکٹر کو بھی کتنا داغدار دکھایا گیا ہے۔ وہ اپنے والد کو بیت الخلا میں بند کر دیتا ہے۔ اور دروازہ اس وقت کھولتا ہے جب اسے اٹھنی دینے کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ آخر یہ کیا مذاق ہے کہ وہ ہر ایک کو تنگ کرے اور کوئی اسے کچھ نہ کہے۔ کوئی اس کی اصلاح کے لئے کوشاں نہ ہو — کوئی تجویز نہ کی جائے — ان تمام باتوں کے ساتھ ہی ساتھ منٹو نے اسے ایک چالاک اور ذہین نوجوان کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ وہ پولیس کو چکر دے کر ایک کنواں صاف کرا لیتا ہے ایک الٹا سیدھا طویل بیان لکھوا کر کئی آدمیوں کو گرفتار کراتا ہے۔ اور پھر عدالت میں ایک نیا بیان دے کر ان میں سے اکثر کو رہا کرا لیتا ہے۔ ان تمام واقعات کا مطالعہ پھوجے کے متعلق ایک عامی کے ذہن کو جو سب سے بڑا تاثر دیتا ہے وہ اس کی حاضر دماغی اور فطانت ہے۔

آخر آپ بھی تو سوچئے کہ سعادت حسن منٹو ایسا پرانا فن کار کس طرح اپنے نصب العین کو نظروں سے اوجھل ہونے دیگا۔ اور پھر اس بات پر بھی غور فرمائیے کہ اس نے پھوجے کے کپڑے مسجد سے گم کرائے ہیں اور دینیات کے استاد کا نام مولوی پیکٹو رکھا ہے۔ حالانکہ کپڑے کسی اور جگہ سے بھی گم ہو سکتے تھے اور کسی اور مضمون کے پروفیسر کا نام رکھ کر بھی کہانی کو آگے چلایا جا سکتا تھا — لیکن واقعات کی وہ صورت اس کے نصب العین کے مطابق نہ ہوتی۔ خدا جانے آپ نے کس مقصد کے تحت اسے مشرب میں جگہ دی ہے۔ منٹو ہی نہیں جو بھی اسلام کا اہانت کرے

اپنے قلم کو خدا کی مرضی کے مطابق اسلامی اخلاق کی ترویج کے لئے استعمال کرے ہمارے جرائد ہی نہیں بلکہ دل و دماغ بھی اس کے احترام کے لئے ہونے چاہئیں۔ اور ہیں لیکن اگر ایسا نہیں تو پھر ع

دہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں۔

جہاں تک حصہ نظم کا تعلق ہے۔ اس شمارے میں بھی کئی الفاظ کو غلط حرکات سے باندھا گیا ہے۔ مثلاً سرشار صدیقی صاحب کی نظم "پیمانہ اصول" یہ ظاہر کرتی ہے کہ الفاظ کے تلفظ کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے مثلاً اس مصرعہ میں چمن ہجر بجلیوں کے اور قدم کو صحیح تلفظ سے نظم نہیں کیا گیا ——— علاوہ ازیں نشاط۔ پیام آواز کے پہلے حروف بھی گرتے ہیں۔ علاوہ ازیں آپ بھی محسوس کریں گے کہ مندرجہ ذیل جملے ذوق کو کچھ بھلے معلوم نہیں ہوتے ———

تاریکیاں اجالنا۔ کڑی آکاشوں پکار دان سے بچھڑ جانا۔ اور دل کی دھڑکن کے نغمے بننا۔ انہیں بہتر صورت میں پیش کیا جا سکتا تھا۔

خط کچھ طویل ہو گیا ہے اور ایک غیر ادیب کی زبان سے ایسی باتیں شاید گراں بھی گذری ہوں لیکن مجھے امید ہے کہ آپ ان سے کبیدہ خاطر تو نہیں ہوں گے۔ بلکہ جس اخلاص اور دل سوزی سے میں نے یہ گذارشات پیش کی ہیں انہیں ضرور مدنظر رکھیں گے ———

اور یہ بھی امید ہے کہ محترم سرشار صدیقی صاحب ان کو اسی سپرٹ ہی میں دیکھیں گے۔ مقصد تنقیص نہیں بلکہ صرف کوتاہیوں کی نشان دہی ہے۔ تاکہ ہمارے شاعر اور ادیب حضرات مزید توجہ اور محنت سے کام کریں اور نظام اسلامی برپا کرنے کے لئے اس اہم ترین مورچہ پر بھی باطل کو شکست دی جا سکے ——— اور ہمارے احباب کو اس کی توفیق عطا فرمائے!

احقر ——— صدیق احمد صدیقی

اگر آپ کا نام اور خریداری نمبر بھی ذیل میں درج ہے

تو سمجھ لیجئے کہ آپ کی خریداری مدت ماہ اگست ۵۴ء سے ختم ہے چکے نام گشتی مراسلہ بھی جاری کیا جا رہا ہے۔ مہربانی فرما کر اپنا سالانہ چندہ بذریعہ منی آرڈر روانہ فرما کر شکر گزار فرمائیے۔ یا پھر اپنی خواہش سے مطلع کیجئے۔ اگر آپ نے خاموشی سے کام لیا تو ماہ ستمبر ۵۴ء کا شمارہ بذریعہ وی پی ارسال خدمت کیا جائیگا۔ اور اسکا وصول کرنا آپکا اخلاقی فرض ہوگا۔ منتظر کرم :۔ ایڈیٹر مشیر کراچی

خریداری نمبر	نام	خریداری نمبر	نام
۲۲۰۵	منظور احمد خان کراچی	۲۱۸۸	دفتر جماعت اسلامی سرحد
۲۲۰۱	مشیر احمد لائلپور	۲۱۸۷	فقیر محمد اکال گڑھ
۲۲۰۰	محمد اسحٰق جہلم	۲۱۸۶	خوشنودہ اختر نارووال
۲۱۹۸	ممتاز الدین رامپور	۲۱۸۵	جنرل بک ہاؤس بلوچستان
۲۱۹۵	نثار احمد پاک پتن	۲۱۸۳	شفیق احمد کوٹری سندھ
۲۱۹۲	ذبیح اللہ نارووال	۲۱۸۲	ایم اے چندریگر کراچی
۲۱۹۱	قیصر جہاں ڈھاکہ	۲۱۷۶	فیض محمد میاں چنوں
۲۱۹۰	شفیق احمد لیہ مظفر گڑھ	۲۱۷۸	غلام حیدر کراچی
۲۱۸۹	غلام محمد حسن ابدال		

تذکرے اور تبصرے

ار' کا 'تنقید نمبر'

ادبی تنقید، فن، فارم، ہیئت اور مقصد کو جانچنے کا ایک پیمانہ ہے جس کے ذریعہ ں تخلیقات کی قدر و قیمت کو متعین کرتے ہیں۔ تعمیر پسند ادیبوں کے ں ایک عرصہ سے اس بات کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ انہوں نے تک جو فکری سرمایہ جمع کیا ہے، اس پر بے لاگ نقد و جرح کی جائے۔ یں بتایا جائے کہ وہ جو کچھ کرتے رہے ہیں۔ وہ کیسا کچھ ہے ان کی ت میں فن، فارم، ہیئت اور مقصد کی وہ ہم آہنگی پائی جاتی ہے ں جو کسی بھی ادب پارے کے حسن و کمال کے لئے ضروری ہے۔ اس ادہ دوسری ضرورت ایک نئے نظریۂ تنقید کا تعارف کرانا تھا۔ جو ید ادیبوں کی تخلیقات میں نشو و نما پا رہا تھا۔ یوں تو ادب کے اسلامی تنقید کی جھلکیاں ان مختلف تنقیدی مضامین میں ظاہر ہوتی رہی تھیں پسند نقادوں نے وقتاً فوقتاً لکھے تھے۔ لیکن ان کا افادہ منتشر اور تھا۔ بھارت کے تعمیر پسند ادیبوں کے ترجمان ماہنامہ "معیار" کا یہ بڑا احسان ہے کہ اس نے تنقید نمبر شائع کر کے اسلامی ادب کی ایک بڑی کمی کو پورا کر دیا۔ معیار کا تنقید نمبر ۱۷۵ صفحات پر پھیلا ہوا سرورق انتہائی جاذب نگاہ ہے جس میں ایک ہاتھ قلم کے پر سے کو کھیدتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس خاکہ سے غالباً تنقید کے کٹھن فریضہ ا مقصود ہے۔ کہ نقاد کو کس طرح کوہ کنی کر کے آب حیات حاصل کرنا ے۔ باوجود اپنی جاذبیت اور ایمائی معنویت کے اس میں ایک پہلو بھی نکلتا ہے۔ کوتاہ بیں لوگ بڑی آسانی سے اس پر "پہاڑ چوہا نکالنے" والی پھبتی چسپاں کر سکتے ہیں۔ لیکن جب پڑھنے والا ن الٹ کر مضامین کا مطالعہ کرتا ہے۔ تو وہ اس محنت اور کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جو اس نمبر میں لکھنے والوں کی خصوصیت ہے۔ وہ اپنی گراں قدر سود تحریروں میں ایک نئے تنقید کو پورے حسن اور سلیقہ کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ان کا تحریری نقطہ نظر ٹھوس حقائق پر مبنی ہے۔ اور ان کا حسن استدلال قاری کے غور و فکر کے لئے بیشتر نتائج سامنے لے آتا ہے۔

"تنقید نمبر" دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ 'ادب اور تنقید کے نظریئے' کے عنوان کے تحت مرتب کیا گیا ہے جس میں تعمیری ادب کے اصولی موضوع پر گفتگو کی گئی ہے اور دوسرے غیر اسلامی تنقیدی رجحانات پر گرفت کی گئی ہے۔ اس حصہ میں نو مضامین شامل ہیں۔ اس نمبر کا دوسرا حصہ "جائزے اور مطالعے" کے عنوان پر سات مضامین کو پیش کرتا ہے جس میں مختلف ادبی کاوشوں پر عملی تنقید کی گئی ہے پہلا حصہ اپنے موضوع کے لحاظ سے کافی مالا مال ہے۔ خاص طور سے ..... نجم الاسلام، ابن فرید اور جمیل احمد فاروقی کے مضامین بہت ہی وقیع حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ان کا استدلال اور طرز واضح طور پر غمازی کر رہا ہے کہ تعمیر پسند صفوں میں مستقبل کے بلند پایہ نقادوں کی نشو و نما ہو رہی ہے اس حصہ مضامین میں اسلامی ادب کے تصور کائنات اور نظریۂ حیات پر سیر حاصل مباحث ہیں جن میں مضمون نگاروں کی وسعت فکر کے باوجود کافی تنوع اور دلچسپی موجود ہے۔ البتہ مسعود جاوید کا مضمون "ادب اور اسلامی ادب" قدرے مختلف نظر آتا ہے۔ مسعود جاوید اسلامی ادب کی مقصدی رو کو اپنی دانست میں معتدل و متوازن رکھنا چاہتے ہیں اس غرض کے لئے وہ فنکار کی جمالیاتی حس کی آسودگی اور اطمینان کو معیار تنقید قرار دیتے ہیں۔ اور ادب میں پاکیزہ صحت مند جمالیاتی تجربوں اور حقیقی رجحانات کی دل کھول کر پذیرائی کرنا چاہتے ہیں یہ پہلو بہر حال نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے۔ بلکہ ضرورت ہے کہ اسلامی ادیب جمالیاتی رجحانات کو مضر اور تخریبی تجربوں سے بچانے کی کوشش کریں۔ لیکن مسعود جاوید کا یہ کہنا کہ ہر وہ شعر و افسانہ اسلامی ادب ہے جو انسان کی جمالیاتی حس کو مطمئن کر دے محل نظر ہے۔ اور ضرورت ہے کہ ہمارے نقاد اس پہلو پر غور کریں۔

تنقید نمبر کا دوسرا حصہ اپنے موضوع کے لحاظ سے بہت ہی تشنہ اور مایوس کن ہے۔ اس حصہ میں ایسے مضامین کی شدید ضرورت تھی جن میں تعمیر پسند ادیبوں کی تخلیقات پر کھل کر گفتگو کی جاتی تاکہ وہ اس کی روشنی میں اپنے سرمایۂ فکر کا جائزہ لیتے۔ صرف ایک مضمون جمیل احمد فاروقی کا "ہمارے اسلام پسند شاعر" کے عنوان سے موجود ہے۔ جو بہت ہی سرسری انداز میں لکھا گیا ہے۔ تعمیری افسانوں پر کسی قسم کی عملی تنقید موجود نہیں ہے۔ ہمارے ادبی جرائد میں اس کمی کو بہت جلد پورا ہونا چاہیے تاکہ ہمارے فنکار اپنا آئندہ تخلیقی کام زیادہ ذمہ داری کے ساتھ سرانجام دے سکیں۔ اس حصہ میں حمید اللہ صدیقی، ابن فرید اور فستحار اعظمی کے مضامین اپنے اپنے موضوع کا پورا پورا حق ادا کر رہے ہیں۔ محمد عثمان ذہن نے ایک بہت ہی اچھا عنوان منتخب کیا تھا "ارسطو کی بوطیقا" ایک دلچسپ اور معلوماتی مضمون بن سکتا تھا لیکن وہ اس پر اتنی محنت نہیں کر سکے جتنی ضرورت تھی۔ علاوہ ازیں ان کی تصنیفی ترتیب بہت زیادہ الجھی ہوئی ہے۔ بوطیقا کے ہر اقتباس پر علیحدہ علیحدہ جرح کرنے کے بجائے اگر وہ پہلے بوطیقا اور ارسطو کے نظریہ تنقید کا تفصیلی تعارف کرا دیتے اور اس کے حاصل شدہ نتائج پر اصولی محاکمہ کرتے تو مضمون کا ظاہری اور معنوی حسن دوبالا ہو جاتا۔

ایک اور کمی جو اس نمبر میں محسوس ہوتی ہے۔ وہ مجرد فن تنقید اور مختلف تنقیدی رجحانات کی تاریخی اور توضیحی معلومات کا نہ ہونا ہے ان کوتاہیوں کا ذمہ دار ہم بہرحال ادارہ معیار کو نہیں ٹھیرا سکتے۔ بلکہ اس کی ذمہ داری ہمارے لکھنے والوں پر ہی عائد ہوتی ہے معیار نے اپنی گوناگوں مشکلات کے باوجود تنقید پر جو اتنا ضخیم نمبر مرتب کر دیا وہ بلاشبہ ایک یادگار کارنامہ ہے اور ہم اس کامیابی پر کارکنان معیار کو مبارکباد دیتے ہیں۔ پرچہ اپنے حسن ترتیب کے اعتبار سے مرتبین کے اعلیٰ ذوق کا شاہد ہے۔ ضرورت ہے کہ اس نمبر کو تعمیر پسند حلقے زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی کوشش کریں۔ اور اس کی معلومات سے استفادہ کریں۔

ہم بہرحال اس نمبر کو پورے اطمینان کے ساتھ غیر اسلامی نظریہ تنقید رکھنے والوں کے سامنے بطور چیلنج کے پیش کر سکتے ہیں۔

تنقید نمبر کی قیمت ۱۲ؔ معیار کا سالانہ چندہ ۵ؔ روپے ہے۔ پتہ حسب ذیل ہے:-

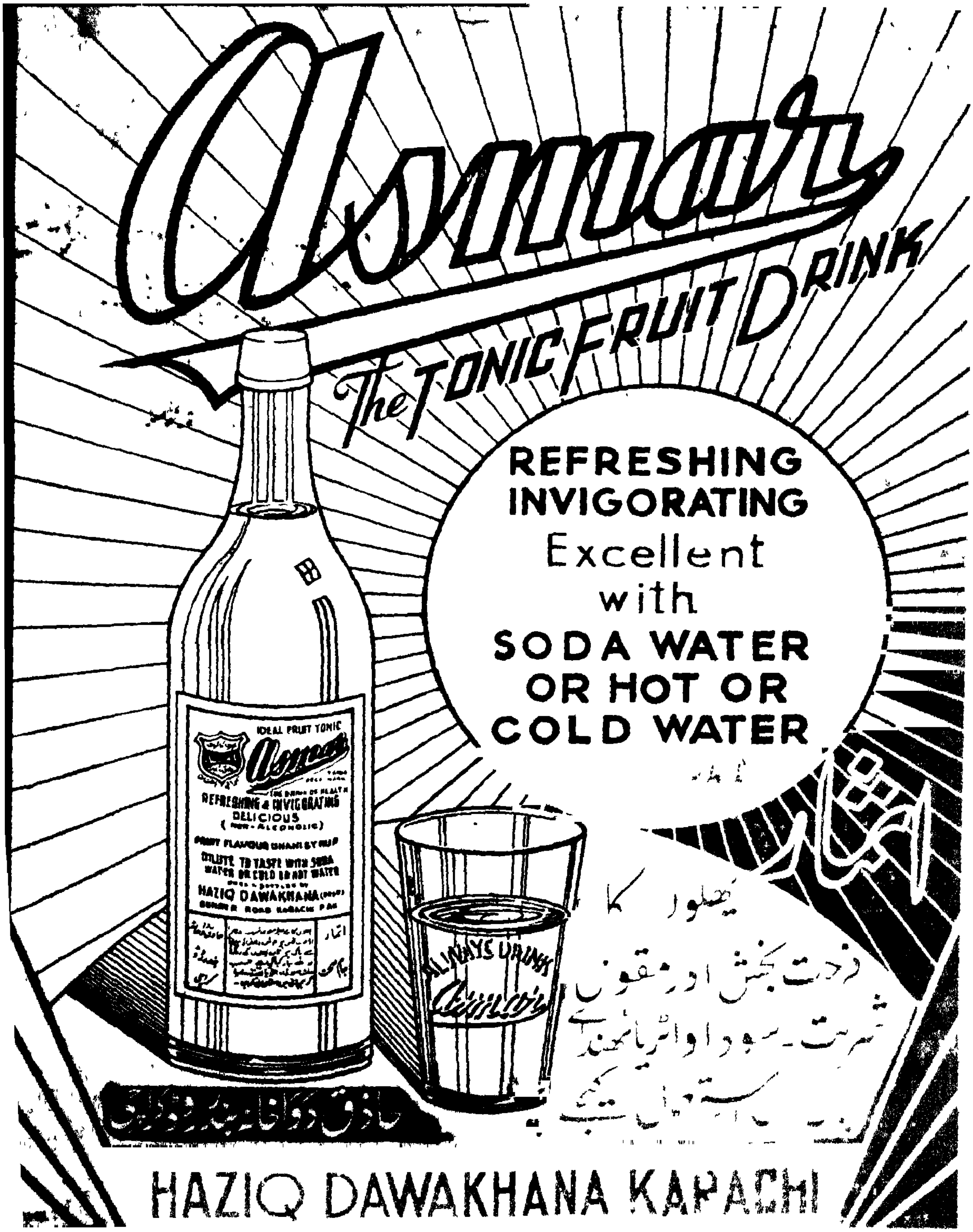
"دفتر ماہنامہ معیار خندق اسٹریٹ میرٹھ"

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:-

"احمد نور صاحب فیملی لائن جیکب آباد سندھ"

(م۔ ق)





Asmar
The TONIC FRUIT DRINK
REFRESHING
INVIGORATING
Excellent
with
SODA WATER
OR HOT OR
COLD WATER
IDEAL FRUIT TONIC
Asmar
REFRESHING & INVIGORATING
DELICIOUS
ALWAYS DRINK
Asmar
اثمار
پھلوں کا
فرحت بخش اور مقوی
HAZIQ DAWAKHANA KARACHI

پاکیزہ اور صالح ادب کا علمبردار

ماہنامہ مشیر کراچی

ٹیلی فون: ۷۹۲۳۳

جلد: ۵

شمارہ: ۹

ستمبر ۱۹۵۴ء

بدل اشتراک:-

پاکستان: سالانہ تین روپے

فی پرچہ: چھ آنے

بھارت: سالانہ ساڑھے چار روپے

فی پرچہ: آٹھ آنے

مرتبہ

عبدالغفور بیگ

پرنٹر و پبلشر عبدالغفور بیگ نے مشہور آفسٹ الیکٹرک پریس میں چھپوا کر دفتر مشیر بندر روڈ کراچی سے شائع کیا

بی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سخنے چند....

رقی پاکستان کا سیلاب

مشرقی پاکستان سے سیلاب کی جو اطلاعات موصول ہوئی ہیں وہ انتہائی تشویش ناک ہیں۔ سینکڑوں میل کا رقبہ زیر آب ہوگیا۔ بیشمار دیہات خوفناک فان کی نذر ہوگئے۔ متعدد شہروں میں پانی بھر گیا۔ ہزاروں افراد بے خانماں اور سینکڑوں جانیں تلف ہوگئیں۔

کچھ زیادہ دن نہیں گزرے کہ مشرقی پاکستان ایک بہت بڑے سیاسی بحران سے گزر چکا ہے۔ اس دور ابتلا میں جو فسادات رونما ہوئے تھے ان کی وجہ سے وہاں کی صنعتی اور زرعی پیداوار بُری طرح متاثر ہوئی تھی جس کا ملک کی عام معاشی حالت پر بہت برا اثر مرتب ہوا تھا۔ اس مادی نقصان کے علاوہ وہاں سیاسی صورت حال نے ملک کے دونوں حصوں میں بسنے والے عوام کو جس ذہنی انتشار میں مبتلا کر دیا تھا وہ ہماری قومی زندگی کے لئے بہت زیادہ مہلک ثابت ہوا تھا۔ پہلے ہی ہمارا ملک ارباب غرض کی ناعاقبت اندیشیوں کی وجہ سے بیشمار داخلی اور خارجی خطروں میں مبتلا ہوچکا ہے۔ اس پر مشرقی پاکستان کی تشویش ناک تبدیلیوں نے اس کو اور بھی زیادہ نازک حالات سے دوچار کر دیا۔ ان ہنگاموں میں جو بھی ذہنی اور مادی نقصانات ہوئے ان سب کا اثر وہاں کی عوامی زندگی پر بہت زیادہ پڑا اور ہر لحاظ سے وہاں کے عوام کو گوناگوں مشکلات میں مبتلا ہونا پڑا۔ ابھی یہ مصائب ختم نہیں ہوئے تھے کہ قدرت نے ان کو ایک اور آزمائش میں مبتلا کر دیا اور آج وہاں ہزاروں آدمی سیلاب سے پیدا ہونے والی طرح طرح کی مصیبتوں میں گرفتار ہیں۔

مشرقی بنگال میں بسنے والے پاکستانیوں کی یہ تازہ ترین مصیبت صرف ان کے لئے ہی آزمائش نہیں بلکہ وہ مغربی پاکستان کے مسلمانوں کے لئے بھی بہت بڑی آزمائش ہے۔ اس موقع پر دونوں حصوں کے باشندوں کی اس نفسیاتی کیفیت کو سامنے رکھیئے جو پچھلے ناخوشگوار حالات کی وجہ سے پیدا ہوچکی تھی۔ یہ حالات دراصل ایک بہت بڑی سیاسی کش مکش کا نتیجہ تھے۔ جو ہمارے لیڈروں اور ارباب اقتدار کی پیدا کردہ صوبائی عصبیت کی وجہ سے اندر ہی اندر نشو ونما پا رہی تھی اور جو پچھلے انتخابات میں ایک کھلی ہوئی سیاسی جنگ کی صورت اختیار کر گئی۔ اس سیاسی جنگ میں پہلے تو بنگالی عصبیت بھڑکانے والے تخریب پسند عناصر کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی اس کے بعد اس فتح کو ۹۲ الف کے خفیہ ہتھیار کے ذریعہ مرکز کے سیاست دانوں نے پوری طرح ہڑپ کر لیا۔ یہ ساری لڑائی عوام کے جذبات و احساسات سے کوئی حقیقی تعلق نہیں رکھتی تھی۔ یہ صرف اُوپر کے سیاسی جنگ بازوں کی باہمی رقابتوں اور ریشہ دوانیوں کا نتیجہ تھی۔ لیکن لکھنے پڑھنے والے پروپیگنڈہ نے اس بری طرح رائے عامہ کو مسموم کیا کہ ایک ہی ملک کے دو حصوں میں بسنے والے عوام ایک دوسرے کو دشمن کی نظر سے دیکھنے لگے۔ اور آج بھی جبکہ یہ سیاسی خلفشار ۹۲ الف کی وزنی سِل کے نیچے دبا دیا گیا ہے۔ اور حالات کی سطح نسبتاً پرسکون ہے۔ دونوں حصوں کے بسنے والے ایک دوسرے کو ٹیڑھی نظروں ہی سے دیکھ رہے ہیں اور ان کے دل آپس میں صاف نہیں ہیں۔

اس نفسیاتی پس منظر میں سیلاب کی اس مصیبت کا تصور کیجیے جو بنگالی مسلمانوں پر نازل ہوئی ہے۔ وہ اس وقت قدرتی طور پر پورے ملک کی ہمدردیوں اور اعانتوں کے حق دار ہیں۔ ان کی یہ احتیاج مغربی پاکستان کے بسنے والوں کے لئے سب سے بڑی آزمائش ہے دیکھنا یہ ہے کہ مغربی پاکستان اپنی تمام رنجشوں کو بھلا کر پچھلے سیاسی اختلافات کو نظر انداز کرکے اپنے دوسرے مصیبت زدہ بھائیوں کی کھلے دل سے مدد کرتا ہے یا نہیں؟

مشرقی پاکستان کے سیلاب زدہ بھائیوں کی امداد کے لئے مغربی پاکستان میں سب سے پہلا قدم جماعت اسلامی نے اٹھایا۔ ۱۴ اگست کو جشن استقلال

موقع پر اس کے کارکنوں نے کراچی میں "امدادی ٹکٹ" فروخت کئے۔ اور ایک ہفتہ تک مسلسل کوچہ کوچہ اور در در گھوم گھوم کر کپڑے، دوائیاں اور دوسری ضروریات، کا سامان اکٹھا کیا۔ جماعت اسلامی کی اپیل پر کراچی کی پبلک نے دل کھول کر امدادی مہم میں حصہ لیا اور مقدور بھر اپنے بنگالی بھائیوں کی مدد کر کے اسلامی اخوت کا ثبوت دیا۔ اس دل خوش کن منظر کے ساتھ ایک تلخ حقیقت بھی تھی۔ جو بار بار ریکارڈ میں آتی رہی ایسے بھی بیشمار اشخاص تھے۔ جن کا حوصلہ اور ظرف بہت تنگ تھا۔ اور ان کے دل سیاسی لیڈروں کے پھیلائے ہوئے زہر سے بُری طرح مسموم ہو چکے تھے۔ اور جو اس المناک حادثہ کو بھی صوبائی تعصب کی عینک سے ہی دیکھ رہے تھے۔ ان کے خیال میں یہ سیلاب ایک خدائی عذاب تھا جو ان کے بھائیوں کی سیاسی غلطیوں کے خمیازہ میں نازل ہوا تھا۔ آپ کو یہ معلوم کر کے بہرحال حیرت ہوگی اس قسم کے خیالات کا اظہار جاہل اور ناخواندہ اشخاص کی طرف سے نہیں بلکہ اچھے خاصے پڑھے لکھے طبقہ کی طرف سے کیا گیا۔ غریب اور ناخواندہ طبقہ نے تو بڑی صاف دلی اور کشادہ پیشانی کے ساتھ اس امدادی مہم میں حصہ لیا البتہ یہ پڑھا لکھا طبقہ ہی تھا جو اس طرح اپنی جہالت کا ثبوت دے رہا تھا۔

ملک کے پڑھے لکھے طبقہ کی اس ذہنیت کو ہم کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اسی جشن استقلال کے موقع پر حسب عادت ہمارے رہنماؤں نے یقین، تنظیم اور اتحاد کا پرانا وظیفہ دہرایا۔ لیکن وہ سنجیدگی کے ساتھ کسی ایسی تدبیر پر سوچ و بچار کرتے ہوئے نظر نہیں آئے ہیں۔ جو اس صوبائی تعصب کو ختم کرے، جو مصائب کے نزول پر بھی دلوں میں ہمدردی اور رحم کے جذبات کو پیدا ہونے نہیں دیتا۔ اور اس نے اشخاص کو اس قدر بے حس اور سنگدل بنا دیا ہے کہ وہ ایسے حادثوں میں بھی اپنے بھائیوں کی مدد کے لئے بے چین نہیں ہو جاتے۔ جن کے واقع ہونے پر دشمنوں اور غیروں تک کے لئے بھی دل پسیج جاتا ہے۔

ہمارے پڑھے لکھے طبقہ کی اس افسوسناک ذہنیت کا مقابلہ قانونی احتساب اور دفتری کارروائیوں سے نہیں ہو سکتا۔ ان کو اس نچلی سطح سے اوپر لانے کے لئے تو ضروری ہے کہ باقاعدہ ایک صحت مند فکری تحریک سے کام لیا جائے۔ جو ان کے ذہن کو اس قسم کی عصبیتوں اور کمزوریوں سے پاک کر کے ملک کے ایک باوقار مستقبل کے لئے سازگار کر سکے، اس قسم کی تحریک ظاہر ہے بجز اسلامی اقدار کے کسی اور بنیاد پر نہیں چلائی جا سکتی اگر ابھی سے ہم نے اسلامی شعور کو بیدار کرنے اور اس کے لئے ایک سنجیدہ عمل کی ٹھوس بنیاد نہ رکھی تو اندیشہ ہے کہ ملک میں نافذ ہونے والے اسلامی دستور کے تقاضے پورے نہیں ہو سکیں گے اور وہ نتائج جو ہم اسلامی دستور سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ کسی صورت ہم کو نہیں مل سکیں گے ہم اپنے ارباب اختیار سے توقع تو اسی بات کی رکھتے ہیں کہ وہ اسلامی دستور کے نفاذ کے ساتھ ساتھ ملک کی عام ذہنی سطح کو اس مطلوبہ معیار پر لانے کی جدوجہد کریں گے۔ جو اسلامی نظام سے مطابقت رکھتا ہو لیکن اس وقت تک انھوں نے جو روش اختیار کر رکھا ہے اس سے ان توقعات کے پورا ہونے کی بہت ہی کم امید ہے۔

اب اسی مشرقی بنگال کے معاملہ کو دیکھ لیجئے، وہاں کمیونزم اور صوبہ واری طرز فکر کو ختم کرنے کے لئے ہماری حکومت نے کیا کیا؟ اس کے سامنے بجز قانونی چوکیداری کے کوئی اور تدبیر ہی نہیں ہے۔ جس پر عمل کر کے وہ ان تخریبی رجحانات کا قلع قمع کر سکے جب کہ یہ رجحانات محض اتفاقی طور پر نہیں ابھر آئے ہیں۔ بلکہ ان کی پشت پر ایک بین الاقوامی جماعت کی تبلیغی مہم کام کر رہی ہے۔ کسی فکری سیلاب کا رُخ موڑنے کے لئے صرف چٹان بن کر حائل ہو جانا مفید نہیں ہو سکتا اس کے لئے تو ایک دوسرے فکری سیلاب کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو فکر و نظر کے زاویہ کو غیر محسوس طور پر دوسری طرف پھیر دے اس اصولی طریقہ کار کی بجائے محض قانونی بندشیں لگا کر یہ سمجھ لینا کہ ہم نے مرض کا علاج کر لیا کسی حال بھی مفید نہیں ہو سکتا۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ حکومت بذات خود تو ان خرابیوں کے لئے کسی صالح فکری مہم پر عمل پیرا نہیں ہے۔ اور دوسری طرف وہ ان دانشوروں اور مفکروں پر بھی طرح طرح کی قانونی بندشیں عائد کئے ہوئے جو اسلامی تصورات کے لئے پوری سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ کام کر رہے ہیں؛ اس موقع پر سعدیؒ کی ایک حکایت بے اختیار یاد آ رہی ہے۔ سعدیؒ ایک مرتبہ کسی گاؤں میں رات کے وقت پہنچے..... وہاں کتوں نے ان کا بُری طرح پیچھا کیا۔ کتوں کو بھگانے کے لئے انھوں نے پتھر ڈھونڈنا شروع کیا۔ لیکن ہر طرف برف بھی ہوئی تھی۔ اور کوئی پتھر مل نہیں رہا تھا چنانچہ جھنجھلا کر سعدیؒ

۱۔ "این عجب مردان اند که سگہا را کشادہ اند دست ما را بستہ !"

(یہ عجیب لوگ ہیں کہ کتوں کو تو چھوڑ دیا ہے اور پتھروں کو باندھ دیا ہے)

ملک کے نازک حالات کا تقاضہ ہے کہ کتوں کو چھوڑ رکھنے اور پتھروں کو باندھ رکھنے کی یہ پالیسی جلد از جلد ختم کر دی جائے !!

(پا)کستان کا قومی ترانہ

ہمارے ارباب اقتدار نے پاکستان بننے کے بعد سے یوں تو بیشمار ایسے کارنامے انجام دیئے ہیں۔ کہ جن کو دیکھ دیکھ کر بیچاری عقل سر بہ زانو ہو جائے (لیک)ن ان کا ایک تازہ ترین کارنامہ تو ایسا ہے کہ جس کی مثال اس پورے سات سال میں کسی صورت نہیں مل سکتی۔

اس کارنامہ کو سرانجام دینے کے لئے ایک نہیں، دو نہیں پورے سات سال صرف کرنے پڑے اور اس طویل مدت کے مراقبے کے بعد ہماری مرکزی (وز)ارت پر جو مقدس الہام ہوا وہ پاکستان کے قومی ترانہ کی صورت میں ہمارے سامنے آیا ہے۔ یہ ترانہ اگرچہ بذات خود ان نوادرات فکر میں سے ہے جو کسی تنقید کے محتاج نہیں ہوتے بلکہ اپنی آپ اتنی مکمل تنقید ہو گئے ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ ان کو بس "بلا تنقید و تبصرہ" کے عنوان کے تحت شائع کر دیا جائے لیکن یہاں معاملہ کسی ترقی پسند شاعر کی آزاد نظم کا نہیں بلکہ ملک کے قومی ترانہ کا ہے اسی لئے ہماری مرکزی وزارت کے اس کارنامہ پر دو چار لفظ کہے بغیر گذر جانا محال معلوم ہوتا ہے۔

پاکستان کے اس قومی ترانہ کی دھن احمد چھاگلہ نامی صاحب نے بنائی ہے اور اس دھن کو شاہنامۂ اسلام کے مشہور و معروف شاعر جناب ابوالاثر حفیظ جالندھری نے لفظی جامہ پہنایا ہے۔ جس کو مرکزی وزارت پاکستان نے سب سے اچھا قرار دیکر منظور کیا ہے۔ یہ ترانہ حسب ذیل ہے۔

پاک سرزمین شاد باد
کشورِ حسین، شاد باد
تو نشانِ عزمِ عالیشان
ارضِ پاکستان
مرکزِ یقین شاد باد

پائندہ تابندہ باد
شاد باد منزلِ مراد

پرچم ستارہ و ہلال
رہبرِ ترقی و کمال
ترجمانِ ماضی، شانِ حال

پاک سرزمین کا نظام
قوتِ اخوتِ عوام
قوم، ملک، سلطنت

جانِ استقلال
سایۂ خدائے ذوالجلال

اس ترانہ کو بار بار پڑھیئے۔ اور اس کے بعد محسوس کرنے کی کوشش کیجئے کہ اس نے آپ کے احساسات و جذبات میں ہیجان تو کجا کسی قسم کا معمولی ارتعاش بھی پیدا کیا ہے؟

ترانہ ادب کی ایک منفرد صنف ہے۔ اور اس کی ترتیب و ساخت کا تقاضہ ہی یہ ہے کہ وہ سننے والوں کے جذبات و احساسات کو اس خاص مق(صد) اور فکر کے لئے یکبارگی برانگیختہ کر دے جس مقصد اور فکر کی وہ ترجمانی کرتا ہے۔ ترانہ کا پُرجوش آہنگ ایسے الفاظ کا طالب ہوتا ہے جو اپنے صو(تی)

ارتعاش اور معنوی تاثر کا بھرپور اظہار کر سکیں۔ اور یہ اظہار بھی اتنا جذبات انگیز ہو کہ سننے والے کا صرف دل ہی نہ دھڑکے بلکہ اس کے اعضا و جوارح بھی اس کے آہنگ کے ساتھ متحرک ہو جائیں۔

ترانہ کی اس بنیادی خصوصیت کو سامنے رکھ کر اگر آپ اس ترانہ کی دھن کو سنیں تو ممکن ہے۔ وہ آپ میں مذکورہ بالا ردِ عمل پیدا کر دے لیکن اگر آپ اس کے مصرعوں کو دہرائیں۔ تو آپ کو معلوم ہو گا کہ آپ نے کچھ ایسے بے معنی یا مشکوک پڑھ دیئے ہیں جن کو پڑھتے ہوئے صرف آپ کے لبوں نے زحمت بے جا کی ہو اور کانوں کے پردے تھرتھرا کر رہ گئے ہیں۔ ترانہ کیا ہے موٹے موٹے بے جان الفاظ کا ایک مجموعہ ہے۔ جو ہم کو نہ تو کوئی تاثر دیتا ہے اور نہ ہی کسی حیات بخش مقصد کے لئے ہمارے جذبات کو متحرک کرتا ہے!

ہر متمدن اور مہذب قوم اپنا ایک قومی نشان اور قومی ترانہ رکھتی ہے۔ اور اس کا یہ نشان اور ترانہ محض اس کی تعارفی علامت ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ دراصل اس قوم اور ملک کے مرکزی رجحان اور ملی مزاج کی ترجمانی کرتا ہے۔ آپ کسی بھی ملک کے قومی ترانہ اور قومی نشان کو اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ اس ترانے کا ہر لفظ اور اس نشان کا ہر خط صحیح صحیح کر اپنے ملک اور قوم کے مرکزی خیال کو آشکارا کرتا ہوا نظر آئے گا۔ لیکن یہاں معاملہ ہی دگرگوں ہے۔ پاکستان کوئی ایسا خطۂ ارض نہیں ہے جہاں بدوی قبائل بستے ہوں۔ یہ ایک ایسی قوم کا ملک ہے جس کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ اس کا اپنا ایک تہذیبی اور سماجی پس منظر ہے۔ ایک خاص نقطۂ نظر اور زندگی کا ایک مخصوص طرزِ فکر ہے۔ اور اس کا اپنا یہ ملک بھی محض قومی وراثت کی حیثیت میں اس کے ہاتھ نہیں آیا ہے۔ بلکہ اس نے اپنے مخصوص ملی نقطۂ نظر اور مقصدِ حیات کی خاطر جان کی بازی لگا کر حاصل کیا ہے۔ اور پچھلے سات سال میں وہ مسلسل اس مقصدِ حیات کی خاطر اپنے ارباب اقتدار سے کش مکش کرتی آئی ہے اور بڑی جد و جہد کے بعد وہ اس بات میں کامیاب ہوئی ہے۔ کہ وہ اپنے اس مخصوص نصب العین کے مطابق ملک کا دستور حاصل کر سکے۔ اس پورے تاریخی عمل میں اس ملک کے ایک ایک باشندہ کا دل دھڑکتا رہا ہے۔ اس کا خون اس کی رگوں میں گرم لاوا بن کر دوڑتا رہا ہے اس کے احساسات اور جذبات آہنی عزم کی صورت میں ڈھلتے رہے ہیں لیکن کس قدر حیرت اور تعجب کی بات ہے پاکستان کا قومی ترانہ پاکستان کے سات کروڑ شہریوں کے ان احساسات و جذبات کا اظہار کرنے سے قطعاً عاری اور ان کے تصورِ ملی اور مقصدِ زندگی کی ترجمانی میں بُری طرح قاصر ہے۔ اور مزید تعجب یہ ہے کہ اس کو اس شاعر نے لکھا ہے جس نے شاہنامۂ اسلام لکھ کر پوری قوم سے داد تحسین حاصل کی تھی۔ اور جس کی ساری شاعری کا سرمایۂ افتخار ہی یہ ہے کہ اس کو "شاعرِ اسلام" کے خطاب سے نوازا گیا تھا اور اس سے زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ اس ترانہ کو ہماری مرکزی وزارت نے جو ایک اسلامی دستور کی ترتیب و تدوین میں شریک ہے سب سے اچھا قرار دے کر منظور کیا ہے۔ حیرت اندر حیرت!

ترانہ کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں جان بوجھ کر اور پوری احتیاط کے ساتھ اس بات کی کوشش کی گئی ہے۔ کہ اس میں وہ علامات [illegible] نہ آنے پائیں۔ جو زبان و ادب میں مسلمانوں کے ملی نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ "اسلام" "قرآن" اور ان کے مترادفات سے پوری ہوشیاری کے ساتھ دامن بچایا گیا ہے۔ صرف "اخیں" "سایۂ خدائے ذوالجلال" کا کچھ اس طرح تذکرہ ہے۔ جیسے ان الفاظ کی بھیک دے کر پوری قوم پر بڑا احسان کیا گیا ہو۔ ۔ ۔ اور اللہ میاں کو ان کی سایہ گستری کی اُجرت دی جا رہی ہو۔ درمیانی بندوں میں پاک سرزمین کے نظام کی تشریح کے لیے جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ وہ اپنے اندر کوئی خصوصی امتیاز نہیں رکھتے۔ قوت، اخوت، عوام، قوم، ملک، سلطنت یہ الفاظ تو دنیا کی کسی بھی سرزمین کے نظام کے لئے استعمال ہو سکتے ہیں۔ اور غالباً نازیوں کے قومی ترانے میں تقریباً یہی الفاظ شامل تھے۔ پاک سرزمین کا مقدر جب اسلام کے لئے وقف ہو چکا ہے اور ہم نے قرار داد مقاصد اور اسلامی دستور کے ذریعہ اس کا اقرار و اعتراف کر لیا ہے۔ تو پھر آخر وہ کونسی جھجک ہے جو پاک سرزمین کے نظام کا تعارف کراتے ہوئے اسلام کا لفظ استعمال کرنے سے اس قدر پہلو تہی برتی گئی ہے۔ اور چند مجہول المعنی اور غیر موثر الفاظ استعمال کر کے قومی ترانے کی اصل روح کو ختم کر دیا گیا ہے۔ جہاں تک ترانے کی زبان کا تعلق ہے۔ وہ اردو تو بہرحال نہیں ہے۔ چند بھاری بھرکم فارسی اور عربی الفاظ کا مجموعہ ہے۔ اسی لئے یہ اتنا عام فہم نہیں رہا ہے جتنا کسی قومی ترانہ کو ہونا چاہئے کہ اس کے بول بچے

زبان پر چڑھ جائیں اور جب پڑھا جائے تو ایک عام شہری بھی اس کے مفہوم کو جان سکے۔

بہرحال یہ ترانہ کسی بھی اعتبار سے اس قابل نہیں ہے کہ ہم اس کو پاکستان کے قومی ترانہ کی صورت میں قبول کرلیں۔ نہ تو یہ پاکستان کے مسلم عوام کے..... سات جذبات کا ترجمان ہے اور نہ ہی اس میں ان کے لئے کوئی مخلصانہ جذبہ کام کر رہا ہے۔ بلکہ یہ تو ان چند اشخاص کے انتشار فکر کا نادر نمونہ ہے جن کا ملک میں اسلام کے ساتھ اب تک کچھ ایسا معاملہ رہا ہے کہ جب بھی وہ عوام کے دباؤ سے دستوری زبان میں کلمۂ شہادت کے اقرار پر مجبور ہوئے تو اس انداز پہ کلمہ پڑھا کہ اگر وہ "لا" کہتے تھے تو "الا اللہ" ان کی زبان سے نہیں نکلتا تھا اور اگر "الا اللہ" کہہ لیتے تو "لا" کی نفی کر جاتے تھے۔ اور اپنے اس مخصوص ملک کے لئے انھوں نے قوت، اخوت، عوام کا کلمہ ایجاد کر رکھا تھا۔ (واضح رہے اس کلمہ کا ایک اور لفظ بھی تھا۔ "رواداری" جو بدقسمتی یا شعری مجبوری کی وجہ سے اس ترانہ میں نہیں آسکا ہے) ظاہر ہے چند اشخاص کے بروز فکر کو یہ حق نہیں مل سکتا کہ وہ پورے ملک کے حقیقی جذبات کے علی الرغم قومی ترانہ کے اس مرتبہ پر پہنچ جائے!

آخری بات اس ترانہ کی منظوری سے متعلق ہے۔ قومی ترانہ کوئی سیفٹی ایکٹ کا قانون اور اینڈ منٹی بل کی دفعہ یا مارشل لاء کا آرڈر تو نہیں تھا کہ اسکو ہماری مرکزی وزارت نے اپنے اقتدار و اختیار کے فلک چہارم سے "کالوحی من السماء" قرار دے کر اپنی رعایا پر نازل فرما دیا۔ قومی ترانہ تو عوام کے اپنے اختیار و پسند کی چیز ہے ضروری تھا کہ اس کی پسند و ناپسند قبول و عدم قبول کا فیصلہ کم از کم پارلیمینٹ کے ذریعہ کر دیا جاتا۔ اگرچہ ہم اپنی موجودہ غیر نمائندہ پارلیمینٹ سے اس مطمئن نہیں ہیں لیکن پھر بھی اس سلسلہ میں معقول طریقہ کار یہی تھا کہ ملک کے قومی ترانہ کا انتخاب پارلیمینٹ ہی کرتی نہ کہ مرکزی وزارت، اس صورت میں تاہم اس کا تو امکان تھا کہ پارلیمنٹ کے ممبر منہ دیکھی شرم کے مارے ہی عوام کے احساسات کا لحاظ کر جاتے۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ اور نہ معلوم وہ کیا مصلحت تھی کہ مرکزی وزارت نے قومی ترانہ کی منظوری و انتخاب کے سارے حقوق بحق سرکار محفوظ کر لیے!

یہ ترانہ عوام کے احساسات کا تو کسی صورت بھی آئینہ دار نہیں ہے۔ البتہ یہ اس افسوسناک ذہنیت کو پوری طرح آشکارا کر رہا ہے جس کے تحت بعض مخصوص عناصر پاکستان میں ایک ایسے لچکدار اسلام کے خواہش مند ہیں جسے وہ کھینچ تان کر اپنی اغراض اور خواہشات کے سانچوں پر ڈھال سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے امکان بھر ایسے الفاظ استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو کسی کی گرفت میں اس طرح نہ آجائیں کہ وہ ان کو اسلام کے سامنے پوری طرح جھک جانے پر مجبور کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے تمام مسائل میں ان کی پالیسی "مریز و کجدار" کی پالیسی ہے اور وہ اپنی کمزوریوں کو "مخطوط خمدار" کی نمائش کر کے چھپا لے جانا چاہتے ہیں۔ اور یہ ترانہ ان کی اس ذہنیت اور ان کے اندازِ فکر کا ایک مکمل نمونہ ہے!!

نسیم صدیقی۔

"وہ قیدی"

ترا گناہ مقدس! تری سزا محبوب!
تو اور حلقۂ یاراں میں ہو گیا محبوب
رہِ وفا میں جو آئے تو ابتلا محبوب

○

چلی تھی بات جو منبر سے، دار تک پہنچی
قلم کی نوک سے خنجر کی دھار تک پہنچی
مگر، صدا تری گردوں کے پار تک پہنچی

○

چلی ہے مکر کی گردوں نے چال تیرے لئے
بچھے ہیں سازشی مکڑوں نے جال تیرے لئے
ہیں قید و بند کے کیا چودہ [۱۴] سال تیرے لئے؟

○

فضا میں عالمِ قرآں کا گیت گایا کیوں؟
نظامِ حق کا علم تو نے یاں اٹھایا کیوں؟
جو مرتے ہیں، انھیں جینے کا گر بتایا کیوں؟

○

تو شرحِ نکتۂ دینِ نبی کا مجرم ہے!
تو حق شناسی کا، حق آگہی کا مجرم ہے!
خودی ہے جرم یہاں! تو خودی کا مجرم ہے!

○

تو قید میں ہے تو ہر بے گناہ قید میں ہے
تمام عالمِ قلب و نگاہ قید میں ہے
شعورِ فلسفۂ لا الٰہ قید میں ہے

○

تڑپ رہا ہے عقابِ خیال قیدی ہے
ابھی تو پنجۂ ماضی میں حال قیدی ہے
دیارِ شوق کا ایک ایک لال قیدی ہے

○

ہمیں نصیب نہیں اپنے ابتدائی حقوق!
علاج کیا ہو جو بھائی سے چھینے بھائی حقوق!
بتوں کے دامنِ قسمت میں ہیں "خدائی حقوق"

○

یہ حریت ہے کہ شمشیر راج کرتی ہے
اور اس کے سائے میں زنجیر راج کرتی ہے
دلوں پہ شومیٔ تقدیر راج کرتی ہے

○

تجھے یہ تیرا زمانہ بھلا نہیں سکتا!
کوئی بھی تیرا ترانہ بھلا نہیں سکتا!
ترے الم کا فسانہ بھلا نہیں سکتا!

○

عوام تیرے حسیں نام کو نہیں بھولے
ترے پیام، ترے کام کو نہیں بھولے
ترے صبوحی، ترے جام کو نہیں بھولے

○

چمن کے گل ہوں کہ لالے، تجھے نہیں بھولے
اندھیرے اور اُجالے، تجھے نہیں بھولے
ہزاروں جاننے والے تجھے نہیں بھولے

ہیں کتنے دل جو تری یاد میں دھڑکتے ہیں
ہیں کتنے جذبے جو تیرے لئے پھڑکتے ہیں
ہزار ہا سینوں میں انگارے سے دہکتے ہیں

○

کروڑوں ہونٹوں پہ تیرے لئے دعائیں ہیں
نظر نظر میں تڑپتی سی التجائیں ہیں
ہزار دھیمی سہی، دکھ بھری صدائیں ہیں

○

ترے سپاہی بدستور دار سہتے ہیں
جہانِ فکر میں محوِ جہاد رہتے ہیں
وہ کوڑے کھاتے ہیں اب بھی جو منہ سے کہتے ہیں

○

تھپیڑے کھاتے ہیں، اور آگے بڑھتے جاتے ہیں
گلے کٹاتے ہیں، اور آگے بڑھتے جاتے ہیں
وہ کام آتے ہیں اور آگے بڑھتے جاتے ہیں

○

وہ قریہ قریہ میں پیغامِ حق سنا آئے
وہ سینے سینے میں جذبے نئے جگا آئے
وہ چپے چپے پہ اپنے دیئے جلا آئے

○

تری صدا ہے جو سارے عوام میں گونجی
فقط یہیں نہیں مصر اور شام میں گونجی
نبیؐ کے شہر میں، بیت الحرام میں گونجی

○

ترے پیام کی لہریں بکھر کے بڑھتی ہیں
رکاوٹ آئے تو اونچی اُبھر کے بڑھتی ہیں
پہاڑیوں کے سروں سے گزر کے بڑھتی ہیں

○

تری سچائی کی یلغار کون روکے گا؟
خدائی امر کے یہ وار کون روکے گا؟
چلے جو صبر کی تلوار، کون روکے گا؟

○

اُدھر سے جتنی بھی تعزیر بڑھتی جاتی ہے
تری دلیل کی تاثیر بڑھتی جاتی ہے
تو چُپ ہے، لذّتِ تقریر بڑھتی جاتی ہے

○

جو گل پہ کانٹوں کے پہرے ہیں بُو تو ہے آزاد
ہے تن اسیر، مگر آرزو تو ہے آزاد
طیورِ دام! تڑپنے کی خُو تو ہے آزاد

○

شجر ہے اس کے تازہ شگوفے پھوٹیں گے
یہ ظلم و جور کے سنگیں حصار ٹوٹیں گے
نہیں ہے دیر کہ قیدی ہمارے چھوٹیں گے

○

نظر کرے گا اِدھر التفاتِ یار ابھی
پلٹ کے آئے گی روٹھی ہوئی بہار ابھی
زمانہ اور بھی بدلے گا ایک بار ابھی

○

○

○

نجم الاسلام●

ادب اور تنقید کا تعمیر پسند نظریہ

ممکن ہے تعمیر پسند ادب اور تنقید کے بنیادی اصولوں اور نظریوں کا تذکرہ کچھ لوگوں کی نظر میں خوش کلامی کے طور پر کچھ نئی اصطلاحات کا اضافہ سمجھا جائے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ تعمیر و تخریب زندگی کی ایسی اٹل حقیقتیں ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اصطلاحات کے چکر میں اردو ادب پچھلے بہت سالوں تک الجھا رہا ہے۔ مگر تجربہ نے یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ یہ اصطلاحات کی لغوی توجیہات نہیں ہیں جو ان کے حقیقی معانی کا تعین کرتی ہیں۔ بلکہ ان کے مفہومات و معانی کا تعین حقیقت میں وہ نظریہ اور وہ فلسفیانہ پس منظر کرتا ہے جس کے مختلف گوشوں کی وضاحت کے لئے اصطلاحات وضع کی جاتی ہیں۔ اس لئے تعمیر پسند ادب اور تعمیر پسند تنقید کی اصطلاح کو مبنی بر حقیقت ثابت کرنے میں وقت صرف کرنے کے بجائے اصولاً مجھے پہلے ادب اور تنقید کے ان نظریوں کا جائزہ لینا چاہیئے۔ جو آج کل رائج ہیں۔ اور پھر تعمیر پسند ادب اور تعمیر پسند تنقید کے بنیادی اصولوں اور نظریوں پر روشنی ڈالنی چاہیئے۔ لیکن چونکہ اس وقت بحث و نظر کے تمام گوشوں کو پورے طور سے سمیٹ لینا محال ہے اس لئے تمہید کے طور پر یہ کہہ کر کہ میں ادب اور تنقید کے موجودہ نظریوں سے متفق نہیں ہوں۔ اپنی بات کا آغاز زیر بحث موضوع کے ایجابی حصہ سے کرتا ہوں۔

تنقیدی نظریوں کا تعلق ادب کی ان قدروں سے ہوتا ہے جن کو کوئی نقاد اپنے ذہن میں متعین کرتا ہے۔ اس لئے ادب اور تنقید دونوں کی وضاحت کے سلسلے میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ ادب کا تعمیر پسند نظریہ کیا ہے؟ یہ نظریہ مختلف ادبی مسائل کا کیا حل پیش کرتا ہے؟ کن قدروں کا احترام اس میں پایا جاتا ہے؟ اور اس کی بنیاد پر تنقید کے کیا اصول بنتے ہیں؟ ادبی تخلیقات کو جانچنے کا کیا معیار مقرر ہوتا ہے؟ اور ادب اور ادیب کی رہنمائی کے سلسلے میں تنقید کے کیا کیا تقاضے سامنے آتے ہیں؟

ادبی قدروں کا تعین اس بات سے ہوتا ہے کہ ادب کائنات اور حیات کے بارے میں کیا نظریہ رکھتا ہے۔ اور اس نظریہ کی روشنی میں وہ زندگی اور اس کے مختلف مسائل کو، اس کے واقعات اور اسکے تجربات کو کس طرح سمجھنے کی کوشش کرتا ہے کس طرح ان کا تجزیہ کرتا ہے۔ اور کیوں کر ان سے استفادہ کرتا ہے۔

حیات اور کائنات کے بارے میں مختلف ادبی اسکول کیا نظریہ رکھتے ہیں۔ اور اس کے اثر سے ان کے ادب میں کیا کیا خوبیاں یا خرابیاں آتی ہیں۔ اس پر مجھے اس وقت روشنی ڈالنی نہیں ہے بلکہ ناگزیر اشاروں پر اکتفا کر کے صرف یہی بتانا ہے کہ ایک تعمیر پسند ادیب اور نقاد کا نظریۂ حیات و کائنات کیا ہے۔

اس مرحلہ پر زندگی اور ادب کے فلسفیانہ پس منظر کو سمجھنا ضروری ہے —

دنیا کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا معاملہ ہو یا بڑے سے بڑا مسئلہ، ایک صحیح الدماغ اور صحیح الفطرت انسان کبھی یہ تسلیم نہیں کر سکتا۔ کہ بالکل خالی الذہن ہو کر وہ اس چھوٹے سے چھوٹے معاملہ کی کوئی توجیہہ کر سکتا ہے۔ یا بغیر کسی نظریہ کے کسی مسئلہ کا حل پیش کر سکتا ہے۔ ذہن خالی رہتا ہی کب ہے۔ اگر اسے کوئی اچھا تصور، اچھا خیال، اچھا نظریہ نہیں ملے گا۔ تو لازماً وہ برے اور ناقص تصورات کو اپنے اندر بسا لے گا۔ یہی نظریہ اسے زندگی کے ہر مرحلہ اور ہر موڑ پر روشنی دکھاتا ہے۔ حتٰی کہ خود منزل کا تعین اور راہ انتخاب بھی اسی کے زیر اثر ہوتا ہے۔ اس سے اس کی صحت کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

میرے خیال میں زندگی اور کائنات اور ان کے مختلف گوشوں اور پیدا شدہ مسئلوں کو سمجھنے میں مدد دینے والا یہ مخصوص بنیادی نظر

ں کا اوپر تذکرہ کیا گیا ہے۔ کچھ مابعد الطبیعی تصورات اور فلسفۂ زندگی
،ان بنیادی نظریات کی پیداوار ہوتا ہے۔ جو کسی مکمل نظامِ فکر کی
یادہوتے ہیں۔ انہی پر ذیلی نظریات کی تعمیر کی جاتی ہے یہ تصورات
ملتے ہیں۔ کہ زندگی کی ابتدا اس کی تعمیر اور اس کی انتہا کیونکر ہوتی ہے
بنی شے ہے جو اس کی ابتدا تعمیر اور انتہا کی ذمہ دار ہے اور اختیار رکھتی
ہے۔ ان تصورات سے جنھیں آگے چل کر فلسفۂ زندگی کے بنیادی تصورات
ے تعبیر کرنا مناسب ہوگا۔ انسان اور کائنات کا تعلق واضح ہوجاتا ہے
ور زندگی کی راہ متعین ہوجاتی ہے۔ جس کی عکاسی ادب کا اولین مقصد
ہے۔ فلسفہ زندگی کے یہ بنیادی تصورات ہی درحاصل حیات اور کائنات
ے مختلف نظریوں کو جنم دیتے ہیں۔ اور زندگی کی ابتدا اس کی تعمیر، اس
ں تخریب، اتار چڑھاؤ اور لست وکشاد کے قوانین کی تعین کرتے ہیں اور
ہی اس کی رفتار ارتقا اور انداز تعمیر کو جانچنے کا پیمانہ مقرر کرتے ہیں ان
ہی کی بنیاد پر ہم زندگی کی کامیابی اور ناکامی، غم اور خوشی، ترقی وتنزل
اور تعمیر و تخریب کا اندازہ لگاتے ہیں۔

یہ زندگی کے بنیادی تصورات ہی وہ اصل بنائے اختلاف ہیں،
جن کے اختلاف سے ایک بامقصد ادیب کا نظریہ ایک ایسے ادیب سے
مختلف ہو جاتا ہے جو زندگی کی اہمیت سے غافل ہے۔ اور اس کا صحیح
مقصد متعین کرنے میں فہم وشعور کی قوتوں سے کام نہیں لیتا۔ جو لوگ
اس تصور کے قائل ہوں کہ "عالم دوبارہ نیست" ان سے "بالعیش کوش"
ہی کی توقع کی جانی چاہیئے۔ پھر اس مابعد الطبیعی تصور کے علاوہ فلسفۂ
زندگی کے جو بنیادی سوالات ہوتے ہیں ان کے جوابات نہ صرف خدا پرستی
اور مادہ پرستی کے ان تصورات کی وضاحت بھی کر دیتے ہیں۔ جن سے
ذیلی نظریات میں اختلاف پیدا ہوجاتا ہے۔ 10 A LIST
اسکول جب خیال کو تجربات زندگی کا مبدا سمجھتا ہے۔ تو اس کے سامنے
زندگی کی ابتدا اس کے ارتقا اور اس کی انتہا کا نظریہ ایک مارکسی ادیب اور
مارکسی نقاد سے مختلف ہوتا ہے۔ اور مارکسی فلسفہ جب مادہ کو خیال سے
مقدم کہتا ہے۔ اور مادہ کے قانون تغیر کی توجیہہ کرتا ہے۔ تو اس اختلافِ
فکر و نظر کا سرچشمہ زندگی کے وہ بنیادی تصورات ہی ہوتے ہیں۔ جنھیں
اس نے ادب اور زندگی کو سمجھنے کے لئے پہلے ہی قدم پر قبول کرلیا تھا۔

ایک ایسے ادیب کے لئے جو زندگی کی اہمیت سے واقف ہو زندگی کے
ان بنیادی تصورات کی اہمیت اگرچہ اپنی جگہ ہے۔ تو بہت واضح، لیکن
یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اکثر ایسے ادیب اور نقاد بھی جو اپنے آپ کو زندگی کا
علمبردار کہتے ہیں۔ اور عقلی اور منطقی بنیادوں پر ہر مسئلہ کی توجیہہ کرتے ہیں۔
زندگی کے بنیادی تصورات پر خود سوچنے کے بجائے پہلے تو ادب کے چلتے
ہوئے ذیلی نظریوں کی چمک دمک سے متاثر ہوکر انھیں اپنا لیتے ہیں اور
پھر زندگی کا جو مبہم اور غیر واضح بنیادی تصور انھیں ورثہ میں ملتا ہے اسے
عقلی اور منطقی بنیادوں پر جانچے پرکھے بغیر قبول کر لیتے ہیں۔ چونکہ زندگی کا
بنیادی تصور پوری طرح ان کے ذہنوں میں صاف نہیں ہوتا اس لئے
وہ زندگی کے بنیادی تصور اور ادبی نظریہ کی کلی ہم آہنگی کے فیض سے محروم
رہ جاتے ہیں۔ اس ہم آہنگی سے محرومی کا شکار وہ لوگ ہوتے ہیں۔ جو
زندگی کو سمجھنے کی کوشش تو کرتے ہیں۔ لیکن یا تو ان کے فلسفہ زندگی میں
نقص ہوتا ہے۔ یا وہ زندگی کے بنیادی تصورات کی اہمیت سے غافل ہو
جاتے ہیں اور جو لوگ ادب میں کسی فلسفہ زندگی کے قائل نہیں ہوتے ان
کے یہاں تو کھلا ہوا تضاد ملتا ہے۔

ممکن ہے ادب کی قدروں کو متعین کرتے وقت فلسفہ زندگی
کے بنیادی تصورات کا تذکرہ کچھ لوگوں کی نظر میں زیادہ اہم نہ ہو، لیکن
میں سمجھتا ہوں کہ اس کے بغیر ادیب اور نقاد بہت سی لغزشوں کا شکار
ہوجاتے ہیں۔ اس ہم آہنگی سے محرومی اور اس تضاد کی مثالیں ہمارے
ادب میں جا بجا بکھری ہوئی ملیں گی۔ ہر دور اور ہر زمانے میں ایسے ادیبوں
اور نقادوں کی ایک تعداد مل جائے گی۔ جس نے اپنے خلوص کے خون
سے اس تضاد کو پالا ہے۔ آج بھی ایسے ادیب ناپید نہیں ہیں جو اس
تضاد کا شکار اور ہم آہنگی سے محروم ہیں۔

تخیلیت پسند اسکول کے ادیبوں میں خاص طور سے یہ تضاد کچھ
ایسے تصورات سے جو انھیں ورثہ میں ملتے ہیں اور ان ادبی نظریات سے
پیدا ہوتا ہے۔ جو روایات کی سی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں یہ تصورات
اور نظریئے ترتیب کے ساتھ اختیار نہیں کئے جاتے بلکہ چلتا ہوا سکہ سمجھ
کر انھیں اپنا یا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں ہم آہنگی نہیں ہوگی۔ اسلئے
ایسے ادیبوں کے ادب اور ان کی زندگی میں توافق نہیں ملتا۔ انکی زندگی

توجیہی کی گوں ورثہ میں ملے ہوئے یا ماحول کے بخشے ہوئے تصورات حیات کے سہارے چلتی رہتی ہے۔ اور ان کا ادب دوسرے خیالات کی ترجمانی کرتا رہتا ہے ـــ

تنقیدی اصولوں کے سلسلے میں یہ بات اکثر دہرائی گئی ہے۔ کہ ادیب یا شاعر کے کلام کو اس کی زندگی سے یا اس کی زندگی کو اس کے کلام سے نہیں سمجھنا چاہیئے۔ زندگی کو صرف مطالعہ زندگی سے ہی سمجھنا چاہیئے اور کلام کو مطالعۂ کلام سے ـــ مگر اس تضاد پسندی کی توجیہہ اوپر کی گزارشات سے ہو جاتی ہے۔ پچھلے زمانے میں یہ تضاد پسندی اپنے عروج پر تھی۔ مگر اب اس تضاد کو ختم کرنے کا جذبہ جاگ اٹھا ہے۔

جدید ادب کے علمبرداروں میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں، ایک زمانے میں اس بات کا بڑا چرچا رہا ہے کہ مارکسی ادیب خدا اور مذہب کا حقارت آمیز تذکرہ کرتے اور مضحکہ اڑاتے ہیں، مگر اب مارکسی اسکول کی طرف سے اس کی نفی کی جاتی ہے۔ کہ وہ خدا کی تحقیر کرنے کے قائل ہیں، یا مذہب کے دشمن ہیں۔ اب یا تو یہی بات غلط ہے کہ مارکسی فلسفہ کی بنیاد مخصوص مابعدالطبیعی تصورات پر نہیں اور یہ فلسفہ فلسفے کے بنیادی سوالات کو حل کئے بغیر ہی زندگی کی مشکلات کے حل پیش کرنے لگتا ہے۔ یا پھر ہمیں ماننا پڑے گا کہ خدا اور مذہب کی نفی سے گریز کا یہ طریقہ جو مارکسی ادب اس وقت اختیار کر رہا ہے۔ بنیادی طور سے اسی تضاد پسندی کا رہین منت ہے۔ جس کو تخیلیت پسند اسکول کی بہت بڑی خامی کہا جاتا ہے۔

بہر کیف ان سب باتوں سے ہمیں زندگی کی ابتدا، تعمیر و ارتقاء اور انتہا سے تعلق رکھنے والے نظریات کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے یوں تو زندگی اور ادب کے تعلق کا چرچا اب اس قدر عام ہو گیا ہے۔ کہ کوئی بھی اس کا اقرار کئے بغیر اپنی بات شروع نہیں کرتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابھی اس کی پوری اہمیت کو سب لوگوں نے نہیں سمجھا ہے۔ اس کی اہمیت کو کچھا نہی لوگوں نے سمجھا ہے۔ جنھوں نے زندگی کو بہ حیثیت کل دیکھا ہے اور اس کا پورا فلسفہ اپنانے کی کوشش کی ہے، اس لحاظ سے اگرچہ زندگی کے جزوی شعبوں اور نظریوں کو اپنانے والے بہت سے ادیب ملتے ہیں لیکن پوری IDEOLOGY اور

پورے نظام فکر کے حامل اس وقت دو ہی ادبی حلقے ہیں۔ ایک ترقی پسند ادیبوں کا گروہ جو مارکسی فلسفہ کا علمبردار ہے۔ دوسرا تعمیر پسند ادیبوں کا گروہ ـــ!

مارکسی فلسفہ کی بنیاد پر ادب اور تنقید کے جو تصورات ملتے ہیں ان سے لوگ کسی حد تک واقف ہیں۔ اب یہ جو ایک نیا نقطہ نظر ادب میں پیش کیا جا رہا ہے اسے بھی سمجھنے اور جانچنے پرکھنے کی ضرورت ہے۔

نظریۂ حیات اور نظریۂ کائنات کی وضاحت کے سلسلے میں سب سے پہلی بات یہی ہے کہ ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ اس کی ابتداء کیا ہے؟ اسی سے زندگی اور تجربات زندگی کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے جو لوگ مادہ پرست ہیں۔ وہ مادہ کو اولین اہمیت دیتے ہیں۔ مادہ ہی ان کے نزدیک زندگی اور اس کے پھیلاؤ کا تنہا ذمہ دار ہے۔ پھر جب یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ مادہ آخر اس ذمہ داری کو کیسے پورا کر سکتا ہے۔ جبکہ بظاہر وہ جامد ہے۔ اس کے جواب میں تغیر کا فلسفہ آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ مادہ متحرک ہے جامد نہیں، اس کی سرشت میں تغیر پسندی ہے۔ انسانی زندگی اسی متحرک اور تغیر پسند مادے کی انقلابی حیثیت ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیا چیز ہے جو اس تغیر کو زندگی کی تعمیر کا سبب بناتی ہے۔ کس لئے ہر تغیر کے بعد نیا دور پہلے دور سے بہتر ہو گا۔ کیا مادہ سے اوپر شے اور کوئی ہستی نہیں-؟ اس کا جواب ان کے نزدیک یہ ہے کہ ہمیں سماجی زندگی میں ایک ایسا خارجی قانون تلاش کرنا پڑے گا جو مادہ کی حرکت اور تغیرات کو ترقی کی راہ پر لے جاسکے لیکن چونکہ وہ مادہ کو تغیر پسند مان چکے ہیں۔ اس لیے اس خارجی قانون کو بھی تغیر پسند ماننے پر مجبور ہیں۔ اس طرح جدلیاتی تضاد کے فلسفہ کی بنیاد پڑتی ہے۔ ایک دور کا نظام جب مادہ کے قانون تغیر کے تحت تبدیل ہوتا ہے۔ تو ایک نئے نظام کی بنیاد پڑتی ہے۔ جو پچھلے دور کے نظام کی تردید کرتا ہے۔ اور یہ سلسلہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اور ہر نئی تشکیل بہتر ہوتی ہے۔ جو اپنے اندر اچھے اجزاء جذب کرتی رہتی ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا صرف اس اشارے پر اکتفا کیا جا سکتا

ہے کہ سماجی زندگی میں ایک ایسا خارجی قانون چل رہا ہے جو تغیر پسند ہے۔ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ اس سماجی تغیر کو بالکل واضح کر دیا جائے، جو اس خارجی قانون کے تحت ہوتا ہے۔ آخر ہمارے پاس حقائق و شواہد کے وہ کون سے ٹھوس دلائل ہیں جن سے ایک دور کے قانون اور اس کی تغیر کو دوسرے دور سے ممیز کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ تبدیلی اگر غیر مبہم اور واضح نہ ہوئی تو پھر کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں پہنچتا کہ آج کا یا کسی بھی مخصوص زمانے کا عمل غلط ہے۔ چاہے وہ فرد کا عمل ہو یا سماجی عمل، نہ یہ کہنے کا کہ وہ درست ہے، لیکن تسلیم تو یہ کیا گیا ہے کہ ہر دور کا قانون دوسرے دور کے قانون سے مختلف ہوتا ہے۔ گویا کسی چیز کو غلط یا صحیح ٹھہرانے کے پیمانے بھی مختلف ہونگے اور جب تک تبدیلی غیر مبہم اور واضح نہ ہو۔ غلط یا صحیح کا معیار متعین نہ ہوگا۔ اور سماجی و انفرادی زندگی ایک معمہ اور نا قابلِ فہم تاریخی حادثہ بن کر رہ جائے گی، اور چونکہ ادب اس سماجی اور انفرادی زندگی کا عکاس ہوتا ہے۔ اس لئے وہ بھی غلط روی کا شکار ہو جائے گا۔ مارکسی فلسفہ حقیقت میں سماجی زندگی کے اس خارجی قانون کے تغیر کی غیر مبہم تشریح سے قاصر ہے، اس بات کی صداقت کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خود کسی مارکسی نقاد ہی کی رائے بے کم و کاست پیش کر دی جائے۔

ممتاز حسین نے اپنے مقالہ "تنقید کا مارکسی نظریہ" میں لکھا ہے۔

> "۔۔۔ اس سماجی تبدیلی کو ریاضی کی صداقت کے ساتھ
> تو نہیں بیان کیا جا سکتا ہے تاہم مختلف حالات
> کے زیر اثر ایک مبہم پیش گوئی ضرور کی جا سکتی ہے جس
> کی صداقت محتاج رہتی ہے آنے والے حالات اور
> واقعات کی ۔۔۔"

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر غلط اور صحیح کو جانچنے کا معیار کیا کوئی انصاف پسند کسی مبہم پیش گوئی کی بنیاد پر متعین کرنے کے حق میں ہو سکتا ہے، اور کیا وہ یہ نہیں چاہے گا کہ غلط اور صحیح کا معیار اتنا ہی مبنی بر حقیقت ہونا چاہیئے جتنی کہ ریاضی کی صداقتیں!

یہ اور ایسے چند سوالات ذہن میں اٹھتے ہیں۔ اور ایک انصاف پسند ذہن کو زندگی کی ابتدا کے اس بنیادی سوال کی طرف پھر لوٹنا پڑتا ہے، جس سے عمل کے نقطۂ آغاز کا تعین ہوتا ہے۔ اور کائنات اور انسان کے تعلق کے ساتھ ساتھ سماجی زندگی کے ضابطوں کی حقیقت سامنے آتی ہے ۔۔۔!

اب آئیے زندگی کے بنیادی تصورات کی مادہ پرستانہ توجیہات سے ہٹ کر یہ دیکھیں کہ تعمیر پسند نقطۂ نظر کیا ہے؟

تعمیر پسند نقطۂ نظر کی رو سے زندگی کی ابتدا اور اس کے پھیلاؤ کے بارے میں نہ تو یہ خیال صحیح ہے کہ یہ سب کچھ بلا ارادہ ہوا ہے اور اس کا تنہا ذمہ دار مادہ اور اس کا قانون تغیر ہے۔ اور نہ یہ خیال کہ انسانی کوشش کا اس میں سرے سے کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ اور انقلاباتِ عالم ایک طرح کا تاریخی جبر ہوتے ہیں۔ اور تاریخی ارتقا میں فکری قوتوں کا کوئی دخل نہیں ایک زمانے تک برنارڈ شا کے تصورات کچھ اسی قسم کے رہے ہیں جنہیں FABIANISM کے نام سے شہرت ملی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تصورات ہیں ہی کچھ اتنے کمزور کہ خود ان کو پیش کرنے والا بھی زیادہ عرصہ تک ان کا ساتھ نہ دے سکا۔ تعمیر پسند نقطۂ نظر یہ ہے کہ زندگی کا آغاز ایک ایسی فوق الفطرت ہستی کے ارادہ سے ہوتا ہے جو مدبر اور ناظم ہے اور انسان کی زندگی اور کائنات میں اس کی قوت اس کا ارادہ اور اس کا قانون ہر قوت ہر ارادہ اور ہر قانون پر حاوی ہے اس کا ایک قانون تو وہ ہے، جسے کائنات کی ہر شے نے قبول کر رکھا ہے۔ ایک وہ ہے جو حیات انسانی کی رہنمائی کرتا ہے۔ سماجی زندگی میں کسی خارجی قانون تغیر کو دخل نہیں۔ بلکہ اسی فوق الفطرت ہستی کے قوانین جاری ہیں۔

اس بنیادی تصور سے کئی اہم نظریئے ملتے ہیں۔

(۱) زندگی کا مبداء اصلی مادہ نہیں ہے بلکہ ایک بالاتر ہستی ہے۔

(۲) تاریخی ارتقا اور سماجی تغیر مادہ کے قانون تغیر کے تحت نہیں بلکہ ۔۔۔۔۔ اس بالاتر ہستی کے قانون کے مطابق ہے۔

(۳) مادہ بذاتِ خود متحرک اور تغیر پسند نہیں بلکہ اس بالاتر ہستی کے متعین کردہ اصولوں کے تحت ہے۔ اور انسان کے انفرادی و سماجی عمل کا حصہ صرف ایک خاص حد تک ہے۔ یہ حدِ اختیار اور شعور کی حد ہے۔ جو انسان کو بالاتر ہستی کی طرف سے عطا ہوا ہے۔

(۴) فکری قوتیں تاریخی ارتقا میں کام کرتی ہیں مگر ان کا دائرہ لامحدود نہیں محدود ہے۔

ان نظریات کو تسلیم کرنے کے بعد کائنات میں انسان کے مقام کا تعین ہو جاتا ہے۔ اور کسی ایسے ادبی نظریے میں جو ایک مکمل فلسفیانہ پس منظر رکھتا ہو۔ اس کا تعین جتنا ضروری ہے۔ وہ ظاہر ہے۔ ادب کا موضوع بہر حال انسان ہی تو ہے۔ اس کے بعد عمل کے نقطہ آغاز کی وضاحت آسان ہو جاتی ہے۔ اور ایک ادیب یا نقاد کو ادب اور زندگی کی تعمیری و ارتقائی ماہیت کو سمجھنے کے لئے کسی ایسے خارجی قانون کے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں پیش آتی جو اس کے مفروضات کو مبنی بر صداقت ثابت کرنے کے لئے دلیل دے سکے۔ بلکہ اسے ایک ایسا نظام فکر ملتا ہے جو نظام کائنات سے ہم آہنگی اور توافق کا دعویٰ کرتا ہے۔ ایک ایسا قانون ملتا ہے جس کی قدریں پائدار و اٹل ہیں۔ اور جن پر ہر دور اور ہر زمانے میں کسی تبدیلی یا کسی تغیر کو جانچا جا سکتا ہے۔ اور ریاضی کی صداقتوں کی طرح اس تبدیلی اور تغیر پر تعمیر اور تخریب کا حکم لگایا جا سکتا ہے۔ سماجی زندگی مجموعہ ہے۔ بہت سے افراد اور جماعتوں کے عمل کا پھر اختیار اور شعور کی اس حد میں جو انسان کو عطا کی گئی ہے۔ اس سے غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ تخریب کی راہ بھی اختیار کی جا سکتی ہے۔ اور تعمیر کی بھی، سماج کی ارتقائی ماہیت جبر کا انداز لئے ہوئے نہیں بلکہ انسانی قوتوں کے استعمال کا طریقہ اسے تعمیری بھی بنا سکتا ہے اور تخریبی بھی؛

یہاں یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے۔ کہ تعمیر کیا ہے۔ اور تخریب کیا ہے؟ تعمیر پسند نقطہ نظر اس کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ اس کا جواب دینے کے لئے مناسب ہوگا اگر میں اوپر کہے ہوئے ایک جملہ کو پھر دہرا دوں۔ اور وہ یہ کہ اس بالاتر ہستی کا ایک قانون تو وہ ہے جسے کائنات کی ہر شے نے قبول کر رکھا ہے۔ اور ایک وہ ہے جو حیات انسانی کی رہنمائی کرتا ہے اور اس کے اختیار کرنے کی آزادی انسان کو حاصل ہے۔ وہ قانون جسے کائنات کی ہر شے نے قبول کر رکھا ہے۔ حیاتیاتی اور طبیعاتی حقائق پر مبنی ہے۔ دوسرا وہ قانون ہے جو حیات انسانی کی رہنمائی کرتا ہے۔ دراصل یہی سماجی مسائل میں معیار کا حکم رکھتا ہے۔ اس پر سماجی زندگی کو ریاضی کی صداقتوں کی طرح جانچا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ اس کا حق ہے فرد یا سماج کا عمل اگر اس قانون کے خلاف ہے۔ جو اس فوق الفطرت ہستی کا عطا کردہ ہے۔ تو سماجی زندگی کو اس سے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اور وہ عمل تخریبی ہے۔ اس کے برعکس اگر اس عمل میں توافق پایا جاتا ہے تو وہ تعمیری ہے۔ گویا انسان کی قوتیں کسی مادی قانون کے تحت کسی ایک ہی رُخ پر لگنے کے لئے مجبور نہیں ہیں۔ ان سے تخریب بھی ہو سکتی ہے۔ اور تعمیر بھی!

اب اگر کسی سماج میں انسانی قوتیں تخریبی راہوں پر چلنے لگتی ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمارا سماجی قانون بدل رہا ہے۔ یا زندگی کی قدریں بدل رہی ہیں۔ اور بدلی ہوئی صورتیں پہلی صورتوں سے خود بخود اچھی ہیں۔ تخریب بہرحال تخریب ہے۔ انسان تخریب کی راہ کو چھوڑ کر تعمیر کی وہ راہ بھی اختیار کر سکتا ہے۔ جو سماج کے لئے مفید ہو۔ سماج کی تبدیلی مظہر ہے انسانی قوتوں کی کارفرمائی کی۔ اور یہ قوتیں غلط یا صحیح دونوں راہوں پر چل سکتی ہیں۔ اس لئے خیر و شر کا معیار تو اپنی جگہ ہی رہے گا۔ البتہ غلط یا صحیح راہوں کے لحاظ سے سماجی عمل کی صورتیں بدلتی رہیں گی ۔۔۔؛

ممکن ہے بعض لوگ اس موقع پر یہ سوال اٹھائیں کہ تعمیر پسند ادیبوں نے زمین پر رہ کر آسمان کی بات کرنی چاہی ہے۔ سماج کی اچھائی برائی کو جانچنے کے لئے آخر ایک ایسا قانون کیوں تسلیم کیا جائے جو اس مادی دنیا ہی سے ... تلاش نہ کیا گیا ہو۔ بلکہ اسے ایک خدائی عطیے کے طور پر قبول کر لیا گیا ہو۔

آئیے اس پر گفتگو کرنے سے پہلے ہم اپنے ذہنوں میں یہ بات تازہ کر لیں۔ کہ جب سطحی طور سے ہم اس مسئلہ کو منطقی ربط کے بغیر باتوں سے جانچنا چاہتے ہیں۔ تو زیادہ گہری نظر سے جائزہ لیتے وقت بھی اس منطقی ربط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں گے۔

سب سے پہلے تو ہمیں یہی دیکھنا ہے کہ اب تک جو ہمارے ادب میں نظریے پیش کئے جاتے رہے ہیں۔ اور فلسفہ کو سمونے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ ان کی حیثیت کیا رہی ہے۔ آیا ہم نے انکی نظری اہمیت کو زیادہ شدت سے جگہ دی ہے۔ یا عملی نتائج کے بل بوتے پر فلسفہ کو میں پیش کیا ہے؛

ایک مدت سے ہم سن رہے ہیں کہ ادب زندگی کا عکاس ہے اس کا ترجمان ہے۔ اس کا آئینہ ہے اور جانے کیا کیا ... اسی طرح کے

بیشمار الفاظ ہیں جو بولے جاتے رہے ہیں حقیقت نگاری کے چرچے بھی کم نہیں رہے ہیں۔ گویا سماجی زندگی کی تصویر کشی ہی ادب کا مقصد ہے ظاہر ہے کہ ان سب باتوں سے زندگی کی عملی تفسیر کا فرض ادب پر عائد ہوتا ہے۔ ادب سماج کو کیا دیتا ہے؟ یہ سوال پھر بھی باقی رہتا ہے۔ کیا وہ محض عکاس ہے۔ اگر ایسا ہے تو شاید ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ ادب کسی وقت بالکل خالی الذہن بھی ہو سکتا ہے۔ حالانکہ ایسا کبھی بھی نہیں ہوتا کہ انسان کا ذہن بالکل خالی رہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر وہ محض عکاس ہے تو پھر یہ حقیقت نگاری کیسی؟ کیونکہ حقیقت نگاری کا نام لیتے ہی ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ اس کی وضاحت کر دیں کہ آخر حقیقت کیا ہے؟ نہیں کریں گے تو پھر سماجی یا انفرادی عمل کو حقیقی انداز میں پیش ہی کس طرح کر سکتے ہیں جبکہ ادب کوئی میکانکی عمل نہیں، بلکہ اس میں ادیب کی نفسیات کو بھی دخل ہے۔ اور نفسیات کو ملحوظ رکھے بغیر کسی عمل کی ہی حقیقت معلوم کر لینا ناممکن ہے۔ یوں میکانکی عمل بھی کم سے کم کوئی لگا بندھا اصول تو چاہتا ہی ہے۔ اور یہ بھی بغیر نظریاتی وضاحتوں کے متعین ہونا ممکن نہیں۔ ایک اشتراکی ادیب کی حقیقت نگاری حقیقت میں "اشتراکی واقعیت" پر مبنی ہوتی ہے مگر اقبال کی حقیقت نگاری واقعیت کے اس مفہوم پر مبنی ہے جو اسلام پیش کرتا ہے۔ گویا مجرد حقیقت نگاری کوئی چیز نہیں دراصل وہ بھی انہی خیالات پر مبنی ہوتی ہے جنہیں کوئی قبول کرتا ہے۔ حقیقت نگاری سے پہلے یہ طے کرنا ضروری ہے کہ ہمارے ذہن میں حقیقت کا مفہوم کیا ہے۔ اس طرح حقیقت کی جستجو حقیقت نگاری کے بجائے پھر پھر کر ہماری گفتگو کو نظری اہمیت کی شدت کا احساس دلا دیتی ہے۔

اس لئے آیئے اب نظری حیثیت ہی سے ہم اس مسئلہ کو دیکھیں نظری حیثیت سے میری مراد عملی حیثیت کی نفی کرنا نہیں اور نہ یہ کہ --- حقیقتیں میرے نزدیک تجریدی ہیں جنھیں عملی دنیا میں تلاش نہیں کیا جا سکتا یہاں میرا مقصد صرف فکری استدلال کے انداز اور اسکی پختگی سے ہے جس کے بغیر نہ تو عملی قدم ہی صحیح اٹھایا جا سکتا ہے۔ اور نہ عملی دنیا میں حقیقتوں کی تحقیق و جستجو میں کامیابی ہو سکتی ہے

سماجی زندگی اور سماجی عمل کی اچھائی برائی، تخریب و تعمیر اور رجعت و ارتقاء کے معیار قائم کرتے وقت ہمارا فکری انداز استدلال کیا ہونا چاہیئے۔؟ اس مقام پر ہم یہ سوچنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ کہ آیا کسی سماجی قانون کو اس مادی دنیا ہی میں سے تلاش کرنا درست ہے یا اسے عطیہ کے طور پر قبول کر لینا؛

انداز استدلال کی تحقیق کے لئے ذہن کے اس عمل کو سمجھنے کی ضرورت ہے جس کا نتیجہ خیال کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ نفسیات اس سلسلے میں بتاتی ہے کہ ہر خیال کی بنیاد پچھلے کسی خیال، علم یا تجربہ پر ہوتی ہے۔ جسے عقلی قوتیں اور فہم و شعور کی صلاحتیں مرتب صورت میں اس وقت پیش کرتی ہیں جب کوئی خواہش ذہن میں تحریک پیدا کرتی ہے، گویا خیال کا ذہنی عمل تین عناصر پر مشتمل ہوتا ہے۔

(۱) خواہش، جو ذہن کے لئے محرک کا کام کرتی ہے۔

(۲) عقلی قوت

(۳) تجربات و علم۔ جس کے تحت افراد کا علم و تجربہ بھی آتا ہے جسے چاہے انھوں نے ورثہ میں حاصل کیا ہو، یا اپنے ماحول میں خود تجربات کر کے یا علم سے، اور تاریخی ریکارڈ بھی جو دنیا کا تجرباتی سرمایہ ہوتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا خواہش عقل اور تجربات کے ذریعہ متعین کردہ نظریوں میں وہ تمام خوبیاں پیدا ہو سکتی ہیں جو ایک اچھے نظام میں ہونی چاہئیں۔ یعنی یہ کہ اس میں بیک وقت تمام انسانوں کی بھلائی پیش نظر ہو۔ اس میں ہمہ گیری اور آفاقیت ہو اس کے تمام اجزا میں توازن اور توافق ہو اور ساتھ ہی قابلیت عمل بھی ہو۔ تمام انسانوں کی بھلائی بیک وقت کوئی ذہن اسی وقت سوچ سکتا ہے۔ جب کہ .... وہ انسانیت کا وسیع ترین مفہوم رکھتا ہو۔ اور بلند ترین اخلاقی اوصاف کا حامل ہو۔ ورنہ ظاہر ہے کہ خود غرضی کے عناصر سے اس کے افکار محفوظ نہیں رہیں گے اور جو نظام وہ اپنی خواہشات کے تحت بنائے گا۔ وہ ساری دنیا کے لئے یکساں مفید نہیں ہوگا بالخصوص اس دور میں جبکہ اخلاقی اوصاف کی اہمیت کو ختم کرنے کے لئے فلسفے تراشے جا رہے ہیں۔ یہ بات اور بھی ناممکن ہو جاتی ہے پھر خواہشات کی نہ کوئی حد ہوتی ہے اور نہ تمام آدمیوں کی خواہشات یکساں ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خواہشات کی بنا پر اصول بننے اور ٹوٹنے سے انسانی تعلقات کے گوشے گوشے میں

انفرادی ہی نہیں بلکہ اجتماعی بداخلاقیاں گھس گئی ہیں۔

انسان کی عقل اس کے جذبات اور اس کی خواہشات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی اور اس لئے اس کے فیصلوں میں وہ خرابی پیدا ہونی لازمی ہے۔ جو خواہشات کو کسی نظام کی ترتیب میں دخل دینے سے ہو سکتی ہے۔ عقلی قوت کو نفسیاتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو وہ کسی محرک کے بغیر کوئی بات نہیں سوچتی۔ اور غصہ، خوف، محبت، انتقام وغیرہ سے بلند ہو کر کام نہیں کرتی۔ اس کے فیصلوں میں ان تمام جذبات کا اثر غالب رہتا ہے۔ جو سوچنے والے کے ذہن پر مسلط ہوتے ہیں۔ اور جب تک کوئی مفکر اس سے بلند ہو کر سوچنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس کے افکار میں توازن اور توافق کا نہ ہونا عین ممکن ہے۔

اس کے بعد انسانی تجربات اور تاریخی سرمایہ کو لے لیجئے۔ ہر فکر کی بنیاد پچھلی معلومات اور علم پر ہوتی ہے۔ جتنا جتنا علم پختہ ہوتا جاتا ہے اتنی ہی پختگی فکر میں پیدا ہوتی جاتی ہے۔ پوری زندگی کو سامنے رکھ کر سوچنے کے لئے ضروری ہے کہ ہمارا علم اور ہماری معلومات مکمل ہوں اس کے بغیر جو بات آج سمجھی جائے گی۔ اس کا صحیح ہونا ضروری نہیں۔

اب دیکھنا یہ چاہیئے کہ کیا ہمارا تجرباتی سرمایہ اور ہمارا تاریخی ریکارڈ ہر لحاظ سے مکمل ہے! اور اس مدوّن صورت میں ہے کہ ہم اس سے قدروں کا صحیح تعین کر سکیں۔ پھر کیا زندگی کبھی کسی ایسے موڑ پر آ کر رکی ہے یا رکے گی۔ جہاں یہ کہا جا سکے کہ اب اس میں تجربات کی گنجائش نہیں رہی اور معلومات مکمل ہو گئیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ ایسا تو صرف اسی وقت ہو سکتا ہے جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اب زندگی کا ارتقا اپنی آخری منزل پر آ کر رک گیا ہے اور اسے تسلیم کرنے کے لئے کوئی بھی تیار نہیں ہوگا اس لئے یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ ہمارا تجرباتی سرمایہ نامکمل ہے۔ پھر اگر ہمارا تجرباتی سرمایہ نامکمل اور ناقص ہے۔ تو ہم کیوں کر اس کی بنیاد پر قائم کئے ہوئے نظریوں کو درست کہہ سکتے ہیں۔

یہ تجرباتی سرمایہ کے نامکمل ہونے ہی کا سبب ہے کہ جدلیاتی مادیت خیالوں کا معیار قائم کر کے زندگی کو مختلف ادوار میں بانٹنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اور ہر نئے دور کی ٹھوکر کے سہارے زندگی کے نظام آگے بڑھانے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کوشش میں اس کے ماننے والوں کو اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ وہ ایک عہد کی برائیوں کو اچھا ثابت سمجھ لیں۔ اور ان کو دور کرنے کی بجائے ان کا جواز تلاش کر لیں اور جس مفکر کی بات ہمیں ماننی ہو اسے اپنے عہد کی پیداوار کہہ کر اس کے مفروضات کو حقیقت سمجھ لیں کیوں کہ مفکر کسی بھی عہد کا ہو۔ بہرحال اسے تجرباتی سرمایہ کے خلا کو اپنے مفروضات کی مدد سے ہی پورا کرنا پڑے گا۔ اور ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کی فکری قوتیں طریقۂ فکر کے ان تمام نقائص سے پاک ہیں۔ جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اور جہاں سے ہم یہ مان لیں گے وہیں سے مفروضات کا دروازہ کھل جائے گا۔

یہ تمام گزارشات اس طریقۂ فکر کے بارے میں کہی گئی ہیں جس کے بل پر ہم اس مادی دنیا میں سماجی قوانین تلاش کرنا چاہتے ہیں سوال یہ ہے کہ اگر اس طرح بھی مفروضات ہی کا سہارا انسانی قوتِ فکر کو لینا پڑتا ہے۔ تو پھر کونسی دلیل رہ جاتی ہے جس کی رو سے ایک ایسے قانون کو تسلیم کرنا غلط ہو جو تجرباتی سرمایہ کے خلا کو دوسرے ذرائع سے پُر کرنے کا قائل ہو۔ ظاہر ہے کہ کوئی مخالف سے مخالف بھی اس کے بارے میں حتمی طور سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ سراسر غلط ہی ہوگا۔ کیونکہ ایسا کہنے کے لئے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں، اور وہ خود ہی مفروضات کا سہارا لیتا ہے۔!!

(بہ شکریہ معیار) (باقی آئندہ)

ابو مسلم صحافی •

انتظار

کیا جہاں میں دافعِ اوہام پھر بھی آئیں گے / سرمدی دولت کے وہ قسّام پھر بھی آئیں گے
ہو گئی انسانیت بھی جن کے دم سے نیک نام / خاکِ بطحا حافظِ اسلام پھر بھی آئیں گے
کیا رفیقانِ محمد ﷺ جانشینانِ خلیل / بُتکدوں سے توڑنے اصنام پھر بھی آئیں گے
روند ڈالا تھا جنہوں نے ہند کو اسپین کو / فاتحِ ترکی و مصر و شام پھر بھی آئیں گے
جو خدا سے خوش ہوئے جن سے خدا ہوتا تھا خوش / بہرِ حق وہ جھیلنے آلام پھر بھی آئیں گے
وعدۂ فردا پہ جو مولیٰ سے راضی ہو گئے / کیا کبھی وہ بندۂ بے دام پھر بھی آئیں گے
شرطِ ایماں پوری جو کرتے تھے — لینے کے لئے / اَنتُمُ الاَعلَونَ کا انعام پھر بھی آئیں گے
اِنَّ وَعدَ اللهِ حَقٌّ کی شہادت جو بنے / دیکھنے باطل کا وہ انجام پھر بھی آئیں گے

اے صحافی پھر حرم کے پاسباں درکار ہیں
یوں تو حاجی باندھ کر احرام پھر بھی آئیں گے

○

سعید اختر درانی ●

لندن کے عجائب خانے

میں پچھلے کرسمس کی تعطیلات میں کیمبرج سے لندن گیا تو اور چیزوں کے علاوہ میں نے وہاں کے متعدد شہرۂ آفاق عجائب خانوں میں سے بعض کی زیارت بھی کی۔ یہ عجائب خانے اس قدر وسیع و عریض ہیں، اور ان میں نوادر اور سامانِ معلومات کے اس قدر عظیم مجموعے رکھے ہیں، کہ ہر دیکھنے والے کو جلد ہی احساس ہو جاتا ہے۔ کہ ان میں سے کسی ایک کے بھی چند شعبوں کو کما حقہٗ دیکھنے کے لئے کئی کئی روز چاہئیں چنانچہ اگر کسی کے پاس بے اندازہ خالی وقت نہ ہو، تو وہ ان پر ایک چھلتی ہوئی نظر ڈال لینے سے زیادہ کی امید نہیں رکھ سکتا۔ آدمی کی حالت جلد ہی، "دنیائے حیرت میں ایلس" کی سی ہو جاتی ہے۔ جہاں ہر چیز تعجب خیز سے تعجب خیز تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور وہ کسی حد تک بوکھلا سا جاتا ہے اور چیزوں کی ماہیت آپس میں گڈمڈ ہونے لگتی ہے۔ چنانچہ اگر میرے بعض بیانات اس صحت اور دقتِ نظر سے عاری ہوں جیسی مثلاً ایک انسائیکلوپیڈیا کے لئے لازم ہوتی ہے۔ تو امید ہے میں معذور سمجھا جاؤں گا۔ بہرحالات اگر میرے ذاتی تاثرات کا اظہار سمجھے جائیں، تو مناسب ہے۔ کیونکہ میں نے ایک عام دیکھنے والے کے نقطۂ نظر سے جو ایک ماہر نقاد نہ ہو ان چیزوں کا حال لکھا ہے۔ جو مجھے دلچسپ معلومات افزا اور عجیب معلوم ہوئی ہیں۔ اور امید ہے کہ قارئین کے لئے بھی دلچسپی کا باعث ثابت ہوں گی۔

ان عجائب گھروں کے دیکھنے میں میں اس بات سے بہت متاثر ہوا کہ ان میں دنیا بھر کے کونے کونے سے نوادر کے ذخائر جمع کئے گئے ہیں۔ اور اس وسیع پیمانے پر کہ شاید اصلی ممالک کے عجائب خانوں میں بھی ان کی اتنی بڑی تعداد یکجا موجود نہ ہو۔ دنیا کے کسی بھی دور اور خطے میں کوئی چیز دریافت ہوتی ہو اس کی نمائندگی برطانوی عجائب خانوں میں ضرور ہوگی۔ ہمارے ہاں کے عجائب گھروں کی طرح یہ عجائبات مقامی یا ملکی حدود تک محدود نہیں ہوتے۔ بلکہ بابل و نینوا کے بت، مصر کی ممیاں، ہندوستان کے گہنے، جنوبی امریکہ کی کشتیاں، افریقہ کے پہناوے، یونان کے ظروف، آسٹریلیا کے ہتھیار ہر شے یہاں آپ کو مل جائے گی۔ انگریز قوم کی خوبیوں میں سے مجھے ان کے اس نوادر جمع کرنے کے ذوق نے اور دوسری اقوام کے تمدن اور تہذیب کا مطالعہ کرنے کے تجسس نے بہت متاثر کیا۔ کسی زمانے میں مسلمان بادشاہوں کو بھی دنیا کے نوادر جمع کرنے کا شوق تھا۔ مگر میرا خیال ہے کہ پچھلی ایک دو صدیوں میں انگریزوں کے قدم جہاں جہاں پہنچے ہیں۔ وہاں کی مخصوص اشیائے استعمال، اور آرٹ اور ہنر کے جس قدر نمونے انھوں نے جمع کئے ہیں۔ وہ شاید ہی کبھی کئے گئے ہوں کسی فاتح اور غالب قوم کے دائرہ اثر و اقتدار اور اس کی سلطنت اور رسوخ کی وسعت کا اندازہ اگر ہم اس کے عجائب گھروں کی وسعت، ہمہ گیری اور رنگا رنگی سے کر سکتے ہیں۔ تو بلاشبہ انگریزوں کے عجائب خانے انھیں بڑے قابلِ فخر رنگ میں پیش کریں گے۔

ان عجائب خانوں کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ان کی بدولت ہم گزشتہ زمانوں کے تہذیبی، تمدنی، معاشرتی اور فنی ماحول کا ایک جیتا جاگتا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ کسی خاص تاریخی عہد کے لوگوں کے رہنے سہنے پہننے اوڑھنے اور صنعت گری و ہنرمندی سے لے کر پوجنے اور تخلیق کرنے ....، موسیقی اور صورت گری، حسن آفرینی و جمال پرستی، حتیٰ کہ ان کے فن و ادب کی وساطت سے ان کے سوچنے اور محسوس کرنے، زندگی کے متعلق ان کے زاویہ نگاہ، ان کے مذہب و عقائد، غرض کہ ان کی زندگی کے ہر پہلو کی ایک واضح اور بتدریج ارتقا پذیر تصویر ہماری نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ اور ہم مختلف زمانوں اور مختلف سرزمینوں میں انسان کی تہذیبی اور فنی ترقی کا اپنی آنکھوں سے موازنہ کر سکتے ہیں۔ اور اس ترقی میں جن

مشاہیر، مفکرین اور عصر آفرین ہستیوں نے حصہ لیا ہے۔ ان کی شخصیت اور حصہ کار (CONTRIBUTION) یہاں آکر واضح تر ہو جاتا ہے ان بھاری بھرکم باتوں سے قطع نظر میرا خیال ہے کہ جو کچھ میں نے ان عجائب خانوں میں دیکھا ہے۔ اگر سادہ الفاظ میں بیان کر دوں تو آپ پسند کریں گے تو لیجیے مختصر طور سے، اور جس ترتیب سے ہم نے (”ہم“ سے مراد اس خاکسار کا ”صیغۂ شہنشاہی“ نہیں ہے۔ بلکہ مجھ سے اور میرے چند دوستوں سے مراد ہے۔ جو میرے ہمراہ تھے) یہ عجائب خانے دیکھے اسی ترتیب سے میں ان کے کچھ حالات بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں ——

برٹش میوزیم

سب سے پہلے ہم لوگ برٹش میوزیم میں گئے ایک بات جو مجھے بہت پسند آئی، وہ یہ تھی کہ اس عجائب گھر میں اور دوسرے قومی عجائب گھروں میں بھی داخلے کا کوئی ٹکٹ نہیں، اور اگرچہ ان عظیم عجائب گھروں کے انتظام و اہتمام اور عجائب اندوزی پر حکومت کا بے اندازہ روپیہ خرچ ہوتا ہوگا، تاہم ان میں مفت داخلے کا بندوبست کر کے عوام کے مادۂ تجسس اور حصول معلومات کے شوق کو بڑے قابلِ تعریف طریقے سے پورا کیا جاتا بلکہ بڑھایا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہماری حکومتوں کو بھی اپنے لہیں زیادہ بے مایہ اور بے خبر عوام کی بہبود کی خاطر اس مثال کی پیروی کرنی چاہیے۔ برٹش میوزیم میں بے شمار شعبے ہیں۔ اور اگرچہ میں وہاں دو مرتبہ گیا مگر ان سب کا اس محدود وقت میں دیکھنا ناممکن تھا، نچلی منزل میں ایک نقشہ لگا ہے۔ جس پر مختلف شعبوں کا محل وقوع دکھایا گیا ہے۔ جو شعبے اس روز کھلے تھے، ان میں روشنی کی گئی تھی اور باقی شعبے اس نقشے میں تاریک دکھلائے گئے تھے۔ ہم نے اس نقشے میں سے چند شعبے جو ہم خاص طور سے دیکھنا چاہتے تھے۔ چن لئے اور روانہ ہو گئے۔ سب سے پہلے ہم قدیم یونان اور روما کے ”بتکدے“ میں وارد ہوئے یہاں قدیم یونانی اور رومن دیومالا کے مختلف دیوی دیوتاؤں کے بے حد جاذبِ نظر مجسمے رکھے تھے۔ جن کی کہنگی اور بعض حالتوں میں شکستگی انھیں اور بھی پراسرار بنا رہی تھی، ان میں سے چاند اور سیر و شکار کی دیوی ڈائنا کا غسل کے لئے حوض میں داخل ہونے کا منظر، جس میں وہ ایک خاص انداز حیا سے ایک ہاتھ سینے کے سامنے کئے، اور دوسرے سے ستر چھپائے کھڑی ہے۔ سنگتراشی کا شاہکار ہے اس کے علاوہ مشہور یونانی اور رومن حکمرانوں اور فلسفیوں کے مجسمے بھی ہیں۔ ایک رومن مجسمہ جو ایک حسین خاتون الطونیا کا (BUST) ہے۔ (یہ شاید مارک انطنی کی بیٹی تھی) حسن و جمال کا بے مثال مرقع ہے۔ اس کا خم کھایا ہوا بالائی ہونٹ اور اس کا ہلکا خمار آلود شرمایا ہوا سا چہرہ اپنے اندر ایک عجیب دلکشی رکھتا ہے۔ اس کے بعد ہم نے بابل اور نینوا کے مجسمے اور —— (ENGRAVINGS) یا کھدائی کے کام دیکھے بعض مجسمے جو عجیب و غریب انسانی اور حیوانی اعضاء کے مرکب، فرضی جانوروں یا راکشسوں کے عظیم الجثہ پیکر تھے۔ پرانے بادشاہوں کے محلات کے صدر دروازوں، کے پہلوؤں سے اکھاڑے گئے تھے۔ اس کے علاوہ پتھروں پر کھدی ہوئی تصویروں کے ذریعے سے جنگوں کے حالات بڑی چابکدستی سے پیش کئے گئے تھے۔ مجھے یاد نہیں، اس شعبے میں یا مصریات کے شعبے میں، ایک جنگ میں فصیل کے نیچے بہنے والے دریا کو تیر کر پار کرنے والے جنگجوؤں کی تصویر ہم نے دیکھی جو انسان کے تیرنے کی قدیم ترین دستاویزوں میں سے ایک سمجھی جاتی ہے۔ اس کے بعد ہندوستان کے بت دیکھے جو کافی مانوس معلوم ہوئے دروازے میں داخل ہوتے ہی گوتم بدھ کا ایک دیوپیکر اور عظیم الشان مجسمہ نظر آتا ہے۔ جس کا سر چھت سے چھوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ سب کمرے بہت بڑے بڑے ہیں اور ان میں چیزیں بڑے قرینے سے رکھی گئی ہیں کہیں بھی چیزیں بے تحاشہ نہیں ٹھونس دی گئیں۔ بلکہ ایک دوسرے میں کافی فاصلہ دے کر رکھی گئی ہیں بعض جگہ جہاں بڑے بڑے بلند و بالا مجسمے یا روم کے عظیم ستون یا یادگاری مینار رکھے گئے ہیں۔ وہاں ان کے نیچے ابتدائی صورت حالات کو ظاہر کرنے کے لئے وسیع چبوترے بنائے گئے ہیں جن پر وہ آیونی (IONIC) ستون یا مجسمے نصب کئے گئے ہیں۔ کمروں کے وسط میں جا بجا آرام کرنے یا سستانے کے لئے صوفے رکھے گئے ہیں۔ جہاں بیٹھ کر آپ سگرٹ پی سکتے ہیں کئی آرٹسٹ ان صوفوں پر بیٹھے مجسموں یا عجائبات کی تصاویر یا خاکے تیار کرتے رہتے ہیں۔ ایک اور کمرے میں قدیم بادشاہوں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں، پرانے مصنفوں کے مسودے اور قلمی بیاضیں انجیل اور دوسری مشہور کتابوں کے اولین نسخے اور عربی، فارسی، چینی،

جاپانی، برمی، ہندوستانی، انڈونیشی انگریزی اور دوسری زبانوں اور ملکوں کی قدیم اور مرصع کتابیں رکھی ہیں جن میں سنہرے، اور صدیاں گزر جانے پر بھی مجلی اور زرق برق حروف میں لکھے ہوئے قرآن حکیم اور قدیم کتب کے نسخے شامل تھے۔ پاکستان و ہند کی کئی زبانوں کے شہکار بھی شو کیسوں میں رکھے ہیں۔ ان میں سندھی زبان کی مشہور کتاب شاہ عبداللطیف کا "شاہ جو رسالو" اور پنجابی کی بعض قلمی کتابیں بھی ہیں۔ اردو زبان کی نمائندگی علامہ اقبال کی ایک مطبوعہ کتاب کر رہی ہے۔ جو مزے کی بات یہ ہے۔ کہ فارسی کی "زبور عجم" ہے۔ اس کمرے میں دنیا بھر کے ٹکٹوں کے مجموعے بھی ہیں۔ ایک اور کمرے میں دنیا کے مختلف ممالک کے چینی اور مٹی اور دھات کے برتن اور روزمرہ کے استعمال کی اشیاء ہیں جن میں نپولین کی مرصع گلاس دانی بھی ہے۔ برازیل اور چلی کے چینی اور مٹی اور پتھر کے برتن بڑے جاذب نظر ہیں۔ ایک ہال میں شمالی اور جنوبی امریکہ کے حبشیوں کے ہتھیار، لباس، ندی نالوں کو پار کرنے والی کشتیاں (CANOES) خیمے اور برتن ہیں۔ ایک جگہ افریقہ کے حبشیوں کی بود و باش، رسموں، اعتقادات اور سر کنڈے اور بالوں کے عجیب و غریب ملبوسات کی نمائش کی گئی ہے۔ مصر کی کھدائیوں سے برآمد شدہ عجائبات بہت سے کمروں میں پھیلے پڑے ہیں۔ ایک میں قدیم مصری شہنشاہوں اور فراعنہ کے بت رکھے ہیں جن میں طوطخ آمون کا مجسمہ شامل ہے۔ یہ بت زیادہ تر ایک چکنی سطح والے سیاہ پتھر سے تراشے گئے ہیں۔ اور ہزاروں سال گزر جانے کے بعد بھی بڑے ملائم، زندہ، اور تازہ دم نظر آتے ہیں۔ بالعموم یہ مجسمے خاصے دیوہیکل ہیں۔ ان کے سروں پر مخصوص مصری شاہی وگ (WIG) اور ٹھوڑی کے نیچے ایک مخروطی (PROJECTION) سی نظر آتی ہے۔ ایک کمرے میں مصغر مجسمے (MINIATURE SCULPTURE) اور کھدی ہوئی شبیہیں رکھی ہیں۔ ایک جگہ قدیم مصری ہتھیار، پتھر اور JADE (عقیق ؟) کے سے ظروف، اور سونے چاندی اور کانسی کے زیور رکھے ہیں۔ جن میں بعض موتیوں کے ہار بڑے خوبصورت ہیں۔ اور ہزارہا سال پرانی تہذیب کے ارتقا اور بلند معیار کو خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں۔ ایک جگہ کشتیوں اور بجروں کی نقاشی کے نمونے ہیں۔ اور ایک جگہ مصری قربان گاہ کے مناظر۔ یہ معلوم کر کے ہمیں مایوسی ہوئی کہ مصری ممیوں کا شعبہ ان دنوں مرمت کے لئے بند تھا۔ قاہرہ میں بھی میں اس قدر جلدی میں تھا۔ کہ وہاں کا عجائب خانہ نہ دیکھ سکا۔ اس عجائب خانے میں مجھے معلوم ہوا کہ "نمرود" ایک بادشاہ کے علاوہ ایک مقام کا بھی نام ہے۔ جو عراق میں شام کی سرحد کے پاس واقع ہے

اگلے روز کیمبرج میں مشہور ڈرامہ اور ناول نگار خاتون آگاتھا کرسٹی کے شوہر اور نامور ماہر آثار عتیقہ پروفیسر میلووان کا لیکچر سننے کا موقع ملا۔ جو ان کی مقام نمرود کی کھدائی کے متعلق تھا۔ جہاں انہوں نے بعض بڑے خوبصورت مجسمے برآمد کئے ہیں۔ ان میں ہاتھی دانت کی کھدائی کی ایک چیز مجھے بہت پسند آئی جس میں ایک شیر ایک آدمی کی شہ رگ سے خون پی رہا ہے۔ اور اس شخص کے کرب و ایذا اور شیر کی درندگی کا اظہار بڑی چابکدستی سے کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ گھر کے محافظ دیوی دیوتا جنکے مجسمے دہلیز کے پاس ایک گڑھے میں نصب کئے جاتے تھے۔ اور وہ کشش جن کا یہ دفینہ کرتے تھے۔ بڑے عجیب و غریب اور دلچسپ ہیں۔ ان میں سے بہت سی چیزیں جن کی سلائیڈیں ہمیں دکھائی گئیں بالآخر برٹش میوزیم میں رکھی جائیں گی۔ برٹش میوزیم کا حال میرے اندازے سے زیادہ طویل ہو گیا ہے۔ اس لئے اب میں اسے یہیں چھوڑ کر ساؤتھ کینسنگٹن کے تاریخ فطرت (NATURAL HISTORY) کے عجائب گھر کی طرف آتا ہوں۔

جنوبی کینسنگٹن کا عجائب گھر

اس عجائب گھر کی عمارت بے حد دلکش ہے۔ اور سفید و سیاہ، چتکبرے گنبد اور مینارے بڑے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ اندر داخل ہونے پر معلوم ہوتا ہے کہ دنیا بھر کے جنگلوں، پہاڑوں اور سمندروں کی مخلوقات، اور کروڑوں سال پرانے حیوانات یہاں یلغار کر رہے ہیں لندن کے باغ حیوانات کے زندہ جانوروں اور پرندوں سے شاید میں اتنا محظوظ نہ ہوا تھا۔ جتنا یہاں ان کے تاریخی ارتقاء کے مظہر ڈھانچوں جیتے جاگتے ماڈلوں، فطری ماحول کی عکاسی اور متحجر باقیات (FOSSILS) سے ہوا۔ شروع میں ایک طرف دنیا بھر کے بیشمار نہایت خوبصورت پرندوں کے مصنوعی مگر ہو بہو زندہ اور اصلی رنگ و روپ کے ماڈل یا نمونے رکھے ہیں۔ جن کے نیچے ان کی عادات، انڈے دینے کے موسم، بچ بچ کے نظر

ـنے والے رنگ برنگے اور چکیلے، بھورے، سنہری چتیوں والے انڈے ن کے فطری ماحول اور گرد و نواح کی عکاسی (مثلاً چٹانوں یا جھاڑیوں کے ماڈل) گرمی اور سردی کی نقلِ مکانی کی تفصیلات اور دیگر حالات لکھے دو پیش کئے گئے ہیں۔ ایک جگہ ایک استانی صاحبہ ننھے ننھے بچوں کی ایک جماعت لئے بیٹھی تھیں۔ بچے اپنی کاپیوں میں ان پرندوں کی رنگ دار ڈرائنگ کر رہے تھے۔ اور استانی صاحبان کی عادات اور ماحول انھیں سمجھا رہی تھیں۔ اس طرح چھوٹی ہی عمر سے بچے پرندوں اور جانوروں میں فہمانہ دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ اور ان کے رہنے سہنے کے طریقوں، اور عادات سے واقف ہو جاتے ہیں۔ ایک اور شعبے میں بڑے بڑے مگرمچھ عظیم الجثہ کچھوے، عجیب و غریب سمندری جانور۔ مختلف قسم کے رنگ برنگ کے سانپ، گزوں لمبے اور منوں بوجھل اژدہے (ان سے بڑے اور خوفناک اژدہے شاید ہی کسی نے دیکھے ہوں۔ انسان تو ان کی ڈاڑھ بھی گرم نہ کرسکے۔ اور چند لمحوں میں چر مُر ہو کر رہ جائے) سمندری کیکڑے اور اسفنج رکھے ہیں۔ یہ سب جانور غالباً کیمیائی طریقے سے سُکھا کر محفوظ کئے گئے ہیں۔ اور صرف ہڈیوں کا ہار نہیں۔ ان کا اندرونی نظام اور پنجر تصویروں کے ذریعے اور بعض اوقات حقیقی ہڈیوں اور جوڑوں کے ذریعے ظاہر کیا گیا ہے۔ ایک کمرے میں وہیل مچھلیاں دکھائی گئی ہیں۔ یہ کمرہ کوئی اسی نوے فٹ لمبا اور تیس فٹ چوڑا ہوگا۔ اس کے بیچوں بیچ ایک تختہ کوہ کے برابر سیاہ فام وہیل مچھلی رکھی ہے جو کوئی ساٹھ فٹ لمبی اور دس سے پندرہ فٹ چوڑی ہوگی۔ اور جس کا وزن کئی ٹن ہوگا۔ غالباً ایسی ہی مچھلی ہوگی جس پر سندباد جہازی اور اس کے ساتھی جزیرہ سمجھ کر جہاز سے اتر گئے تھے اور کھانا پکانے کے لئے آگ جلا رہے تھے، کہ وہیل مچھلی نے کروٹ بدلی اور سب کے سب غڑاپ سے سمندر میں جا گرے معلوم ہوا ایسا دھوکا کھانے میں ان بیچاروں کا کچھ قصور نہ تھا۔ ہم نے اس مچھلی کے حجم کا تخمینہ کرنے کے بعد یہ اندازہ لگایا کہ اس کے تنورِ شکم میں بآسانی پانچ سو سے چھ سو تک عام ڈیل ڈول کے انسان بیک وقت سما سکتے ہیں (مگر سب کو ایک دوسرے کے ساتھ کافی سمٹ کر لیٹنا پڑے گا) ایسی مچھلی میں سے کئی سو ٹن روغن حاصل ہوتا ہے۔ صحیح مقدار وہاں درج ہے۔ اس کے علاوہ قبل از تاریخ کی کوہ پیکر وہیل مچھلیوں

کے جبڑوں کی نیز دوسری ہڈیاں بھی وہاں لٹکی ہیں۔ ان کا وزن کئی کئی من ہے۔ اس کے بعد ہم ماقبل تاریخ کے ہڈیوں کے ڈھانچ اور متحجر باقیات کے کمروں میں گئے۔ یہاں پلٹ ڈاؤن کے قدیم انسان ..... (PiLT DOWN MAN) کی کھوپڑی اور مابہ النزاع جبڑا رکھا ہے جس کے ساتھ اس کے متعلق تازہ ترین تحقیقات کے نتائج مفصل تحریروں کے ذریعے واضح کئے گئے ہیں۔ مثلاً ایکس رے اور فلورین کی پڑتال کے ذریعے اس کے جبڑے اور دانتوں کے مصنوعی ہونے کا ثبوت پیش کیا گیا ہے جس کے مطابق یہ انسانی کھوپڑی اب شاید پندرہ لاکھ سال قدیم ہونے کے بجائے صرف ڈیڑھ لاکھ سال پرانی سمجھی جاتی ہے۔ (ان اعداد کے صفروں کی صحت کا میں ذمہ نہیں لے سکتا) اس کے علاوہ انسان کے تدریجی ارتقا کی تصویر (FOSSILS) ہڈیوں، کھوپڑیوں ڈھانچوں اور خاکوں کے ذریعے سے پیش کی گئی ہے۔ ایک جگہ "انسان اور اس کے ہتھیار" (MAN THE TOOLMAKER) کے زیر عنوان اس کے قدیم پتھر، لکڑی، تانبے، لوہے کے بھدے اور بے وضع ہتھیاروں کا ارتقائی مرقع پیش کیا گیا ہے۔ اس کے قریب ہی ماقبل تاریخ کے ان جانوروں کے ڈھانچ اور متحجر باقیات رکھے گئے ہیں، جن کی نسلیں اب معدوم ہو چکی ہیں۔ ان میں بالوں والے ہاتھیوں، گینڈے اور ہاتھی کے آبا اور عظیم الجثہ حیوانات میمتھ (MAMMOTH.) وغیرہ کے کوہ پیکر ڈھانچ شامل ہیں۔ بعض معدوم شدہ ہاتھیوں کے خم کھائے ہوئے دانت کئی کئی گز لمبے اور منوں بھاری ہیں۔ ان ہاتھیوں گینڈوں، اونٹوں، گوریلوں اور دوسرے جانوروں کے پنجر جنکی ہڈیاں اب تقریباً پتھر ہو چکی ہیں۔ محفوظ رکھنے والے کیمیائی مرکبات لگا کر جابجا لوہے کے جوڑوں اور فریموں کے ذریعے کھڑے کئے گئے ہیں۔ یہ اس قدر اونچے قد کے ہیں۔ کہ انسان ان کے سامنے بونا معلوم ہونے لگتا ہے۔ غرض اس شعبے میں آدمی خود کو آج سے کروڑوں سال پہلے کی دنیا میں محسوس کرتا ہے۔ جہاں ہر جانب دیو ہیکل اور خوفناک حیوانی ڈھانچے احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ اور وہ ایک ذرا سی جان، بے جگر اور ناکارہ معمولی سے ہتھیار بنا کر اس جنگِ برتری میں خود کو ان کی دستبرد سے محفوظ رکھنے کی قابلِ رحم مگر ساتھ ہی ساتھ قابلِ فخر کوششیں کر

رہا تھا اور آخر لاکھوں سال کے اس عرصے میں اس کے ذہن و دماغ کی قوتیں اسے دوسرے حیوانات سے زیادہ سے زیادہ ممتاز اور ان پر زیادہ سے زیادہ غالب کرتی گئیں حتیٰ کہ بالآخر وہ نہ صرف ان حیوانات کا مسلّمہ آقا بن گیا۔ بلکہ فطرت کی مخفی اور عظیم الشان قوتوں کو مسخر کر کے خشکی، پانی، ہوا اور جوہر کی آتشی طاقتوں پر فرمانروا ہو گیا۔ اور اب اس کی نظریں چاند، تاروں اور سیاروں کی طرف، نئی دنیاؤں، اور نئی فضاؤں کی طرف بلند ہو رہی ہیں۔ اور کوئی دن جاتا ہے کہ یہ خاک کا ناتواں اور کمزور سا پتلا نئے جہانوں کو تسخیر اور نئی دنیاؤں کو تخلیق کرے گا —!!

وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ۔

(بشکریہ الحمراء)

عاصی کرنالی ●

دخترِ تہذیبِ حاضر کے نام

رات گزری، جلوہ ہائے ماہِ تاباں لُٹ گئے — بُجھ گئیں شمعیں، اور انوارِ شبستاں لُٹ گئے
تیرے عارض کے اُفق سے جب ہوئیں کرنیں طلوع — کون جانے، کتنے خورشیدِ درخشاں لُٹ گئے
اک لبِ گل رنگ کی قیمت چکانے کے لئے — بارہا تیرے تبسّم کے گلستاں لُٹ گئے
آہ وہ گل، جو متاعِ رائگاں سمجھے گئے — آہ وہ غنچے، جو ہو کر جنسِ ارزاں لُٹ گئے
جب ملی دستِ جنوں کو دعوتِ فصلِ بہار — کتنے دامن لُٹ گئے، کتنے گریباں لُٹ گئے
تُو مری نظروں میں فطرت کا صحیفہ ہے، مگر — وہ صحیفہ، جس کے اوراقِ پریشاں لُٹ گئے
راز، لیکن جو نظر پر آشکارا ہو گیا — ساز، لیکن جس کے نغماتِ گل افشاں لُٹ گئے
آدمی کے ذوق کا معیار تو کچھ بھی نہیں — تیرے جلوے جب ہوئے حد سے نمایاں، لُٹ گئے
کچھ نہ کچھ آئین رکھتا ہے مزاجِ گلستاں — وہ شگوفے جو بنے گل ہائے خنداں لُٹ گئے
تیری شامِ انجمن کی میں نے دیکھی ہے بہار — سینکڑوں دامن باندازِ گریباں لُٹ گئے
اپنے لٹنے کا سماں اُن بدنصیب آنکھوں سے پوچھ — سامنے جن کے گلستاں کے گلستاں لُٹ گئے

اے رہینِ رقص و نغمہ، اے اسیرِ رنگ و بو!
تجھ کو کچھ معلوم ہے، کس قوم کی دولت ہے تو؟

○

قدرت اللہ شہاب

ریلوے جنکشن

"کتنی چھٹی پر آئے ہو؟" نثار نے چھوٹتے ہی بغیر کسی علیک سلیک کے پوچھا۔

"پندرہ دن کی!" میں نے جواب دیا۔

"بہت خوب! چلو اس بار تمہیں لاہور کی زمین دوز مال گاڑیاں دکھائیں گے!" نثار نے فیصلہ صادر کیا۔

"میں سیر کروں گا....." وہ کچھ دیر سوچ کر مشفقانہ انداز سے کہتا ہے۔ "تم کہانیاں لکھنا!"

یہ لائحہ عمل ہم دونوں کے حسب منشا ہے۔ چنانچہ شام ہوتے ہی نثار مجھے مال روڈ پر ایک ہوٹل میں لے گیا۔ ہوٹل کے لان میں ہم کمال بے حیائی کے ساتھ ایک ایسی میز پر جا ڈٹے جہاں پہلے سے دو ایک ایڈیٹر، چند نامہ نگار، کچھ ریڈیو آرٹسٹ، کچھ ادیب اور چند گرگ باراں دیدہ صورت کے سیاسی حضرات براجمان تھے۔ چائے کا دور چل رہا ہے۔ ایک صاحب کولڈ ٹی نوش جاں فرما رہے ہیں۔ یہ کولڈ ٹی اس گرم چائے سے مختلف ہے۔ جو گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔ اور جسے معمولی ذہانت کے انسان پیا کرتے ہیں۔ یہ مشروب خاص لاہور کی ایجاد ہے اور دستور کے مطابق اس ایجاد کی ماں بھی ضرورت ہے وہ ضرورت جو پر وہیبیشن کی وجہ سے اکثر حضرات کو پوشیدہ امراض کی طرح لاحق ہو گئی ہے۔

دانشوروں کی اس محفل پر پوسٹ مارٹم کے کمرے کی فضا بڑی شدت سے چھائی ہوئی ہے۔ قوم کی لاش سامنے ٹیبل پر دھری ہے۔ اور ہر شخص اس کا کوئی نہ کوئی عضو ہاتھ میں لئے بڑی چابکدستی کے ساتھ پوسٹ مارٹم کرنے میں منہمک ہے۔ روحانی، جسمانی، ایمانی اور سیاسی امراض سے لیکر خودکشی کے نفسیاتی اسباب تک بڑی تندہی سے تشخیص ہو رہے ہیں۔ علاج تجویز ہوتے ہیں اور نسخوں پر گرما گرم بحث ہو رہی ہے۔ میز پر مکے پڑتے ہیں۔ کرسیاں الٹتے الٹتے بچتی ہیں۔ لیکن اس وقت قوم کی ساری بیماریوں کا واحد علاج صرف اس چائے دانی میں ہے۔ جس میں کولڈ ٹی بڑی احتیاط سے محفوظ ہے۔ کولڈ ٹی والے صاحب پیالی منہ سے لگائے مزے مزے کی چسکیاں لے رہے ہیں۔ اور اپنے ارد گرد کف در دہن مسیحاؤں کے طوفان بدتمیزی کے باوجود بڑی لاتعلقی سے داغ کی ایک عشقیہ غزل گنگنا رہے ہیں۔

"آج سینما کا پروگرام ہے؟" کولڈ ٹی صاحب نثار سے پوچھتے ہیں۔

"جی نہیں ـــــ آج دوسرے پروگرام ہیں!" نثار میری طرف اشارہ کر کے دوسرے کے لفظ پر خاص زور دیتا ہے۔

"ہوں!" کولڈ ٹی صاحب عینک اتار کر مجھے سر سے پاؤں تک بڑے غور سے گھورتے ہیں۔ "نثار! تم نے ابھی ان کی کیا تعریف کی تھی۔؟ کس جگہ کے میونسپل کمشنر ہیں یہ؟"

نثار قہقہہ لگا کر ان کی تصحیح کرتا ہے۔

"میونسپل کمشنر نہیں۔ بھائی یہ برخوردار ڈپٹی کمشنر ہیں ڈپٹی کمشنر ـــــ!"

کولڈ ٹی صاحب قطعی مرعوب نہیں ہوتے "ٹھیک ہے!" وہ بڑے مربیانہ انداز سے فرماتے ہیں۔ "اس نازک زمانے میں ایک آدھ ڈپٹی کمشنر کو ہاتھ میں رکھنا کوئی معیوب بات نہیں ہے" پھر وہ کمال شفقت کے ساتھ میری ڈھارس بندھاتے ہیں ـــــ

"برخوردار! تم بے فکر رہو۔ میں لاہور میں تمہاری موجودگی سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کروں گا۔ انشاء اللہ"

"یہ بچہ لاہور کی زمین دو نمال گاڑیاں بھی دیکھنا چاہتا ہے"
نثار موّدبانہ گزارش کرتا ہے۔ "یہ ان پر کہانیاں لکھے گا!"

"تم کہانیاں بھی لکھتے ہو؟" کولڈٹی صاحب اس انداز سے پوچھتے ہیں۔ جیسے کہانیاں لکھنا کوئی بہت بڑا اخلاقی جرم ہے۔ "کہاں لکھتے ہو؟"

میں خجالت سے منمنا کر نقوش، سویرا، ساقی، ہمایوں، ادبی دنیا وغیرہ کے نام لیتا ہوں۔

"یہ رسالے کہاں سے چھپتے ہیں؟"

"میں نے تو نہیں دیکھے!"

کولڈٹی صاحب کی نظروں میں میری ادبی پوزیشن گر جاتی ہے وہ اپنی عینک دوبارہ آنکھوں پر لگا لیتے ہیں اور مشفقانہ انداز میں مجھے یہ رائے دیتے ہیں کہ اگر مجھے کہانیاں لکھنے کا اتنا ہی شوق ہے تو شمع، ڈائریکٹر اور چنگاری میں لکھا کروں۔ کولڈٹی کا آخری پیالہ حلق میں انڈیل کر وہ ان رسالوں پر اپنی گراں قدر رائے کا اظہار بھی فرماتے ہیں۔

اس مختصر سی علمی، ادبی بحث کے بعد جب ہم ہوٹل سے نکل کر ایک تانگے میں سوار ہوتے ہیں تو نثار اور کولڈٹی صاحب کا تانگے والے سے تبادلۂ خیالات شروع ہو جاتا ہے۔ تانگے والا بڑی مشاقی سے اپنے فنونِ لطیفہ کا پرچار کرتا ہے۔

"زمیندار اخبار کے عقب میں رہنے والی جو انگریزی بولتی ہے ....جو برجی والی جس کا رنگ گورا اور بال سنہری ہیں....
میو گارڈن والی جو اسی سال میٹرک میں فیل ہوئی ہے........
گھوڑا ہسپتال کے پاس والی جو لتا منگیشکر کی طرح گاتی ہے......
ماڈل ٹاؤن والی جو ایک ہسپتال میں نرس ہے۔"

لیکن نثار اور کولڈٹی صاحب تانگے والے کے پروپیگنڈے سے بالکل متاثر نہیں ہوتے۔

"تم سالے باسی کڑھی کا ابال ہو" کولڈٹی صاحب خفا ہوتے ہیں۔ "تم سے تو مزنگ کے اڈے کے تانگے والے ہزار درجہ اچھے ہیں۔"

— تانگے والا مزنگ کے اڈے والوں کو فصیح و بلیغ گالیاں دے کر ڈرامائی انداز سے اپنا تازہ ترین شاہکار برآمد کرتا ہے۔

"لڑکی کیا ہے صاحب، نرا آلو بخارا ہے۔ ابھی کالج میں پڑھتی تھی۔ فقط دو مہینے سے اس لائن میں آئی ہے اب تک صرف چار مرتبہ باہر گئی ہے۔ کالے خان پٹھان نے پورے سات سو روپے دیئے تھے۔ تمہاری خاطر سے دو سو میں منا لوں گا — چلوں؟"

آلو بخارا کے نام پر نثار اور کولڈٹی صاحب کی رال بھی ٹپکنے لگتی ہے۔ لیکن دو سو روپے کا ذکر سن کر ان کے جبڑے لٹک جاتے ہیں وہ دونوں امید افزا نظروں سے مجھے گھورتے ہیں خاص طور پر کولڈٹی صاحب کے انداز بڑی شدت سے للکار رہے ہیں۔ کہ برخوردار دیکھو، میں تمہیں اپنی خدمت کا سنہری موقعہ دے رہا ہوں۔ اگر تم اس وقت کام نہ آسکے تو ڈپٹی کمشنر نہیں گھسیٹے ہو لیکن میرے انداز ہیں۔ کہ انھیں ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہیں۔ اور وہ مایوس ہو کر پھر اپنا جبڑا لٹکا کر بیٹھ جاتے ہیں۔

اس خاموش کولڈ وار کے بعد موضوعِ سخن بدل جاتا ہے تانگے والا گھوڑے کو مخاطب کر کے ہمیں بڑی سنگین اور پیچیدار گالیاں سناتا ہے۔ نثار اپنے جگری دوستوں کی تعریف کرتا ہے۔ جو ضرورت کے وقت اس پر کئی کئی ہزار روپیہ تک خرچ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے اور کولڈٹی صاحب پاکستان کے جملہ افسروں کی کمینگی نالائقی اور بددیانتی پر جی کھول کر تبصرہ فرماتے ہیں۔ یوں بھی رفتہ رفتہ کولڈٹی اپنا رنگ دکھا رہی ہے۔ اور جب تانگے والا گھوڑے کی وساطت سے ہمیں چند الوداعی گالیاں سنا کر ہیرا منڈی میں نوگزے کی قبر کے پاس اتار دیتا ہے۔ تو کولڈٹی صاحب کے پاؤں بڑی شدت سے لڑکھڑا رہے ہوتے ہیں۔ اور وہ "س" کو "ش" میں بدل کر بڑی خوش سگالی سے چوک میں کھڑے ہوئے پولیس کانسٹیبل کو مخاطب کرتے ہیں۔

"شپاہی جی، شلام — جیتے رہو"

سپاہی نتھنے پھیلا کر کولڈٹی کے منہ کو قریب سے زور لگا کر سونگھتا ہے —

"اچھا آج بھی خوب چڑھا رکھی ہے۔ صاحب! پرمٹ کہاں ہے۔ ہاں.........؟"

کولڈٹی صاحب فتح مند مرغ کی طرح چھاتی نکال کر اپنا ہاتھ میری گردن کی طرف بڑھاتے ہیں غالباً وہ مجھے پرمٹ کے طور پر سپاہی کی خدمت میں پیش کرنے والے ہیں۔ لیکن میں نظر بچا کر کھسک جاتا ہوں اور لوگڑے کی قبر کی اوٹ میں جا چھپتا ہوں۔

مجھے غیر موجود پاکر کولڈٹی صاحب کی چھاتی کا تناؤ ڈھیلا پڑ جاتا ہے اور وہ اپنی بش شرٹ کی جیبیں ٹٹول کر پانچ روپے کا نوٹ کانسٹیبل کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ کانسٹیبل اس پرمٹ سے مطمئن ہو کر چلا جاتا ہے۔ نثار اور کولڈٹی صاحب کی گرما گرم گفتار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت ان کے درمیان میری ذات کا مسئلہ زیر غور ہے۔ وہ کچھ دیر میرا انتظار کرتے ہیں اور پھر غصہ سے ایک طرف کو چل کھڑے ہوتے ہیں۔

لوگڑے کی قبر کے پاس زیادہ دیر ٹھہرنا خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ کیونکہ وہی پرمٹ والا سپاہی اب مشتبہ نگاہوں سے بار بار میرا جائزہ لے رہا ہے۔ میں واپس لوٹتے ہوئے کوئی ایسا راستہ اختیار کرنا چاہتا ہوں جہاں نثار اور کولڈٹی صاحب اور پرمٹ والے کانسٹیبل سے میرا سامنا نہ ہو۔ اس تلاش میں میں ہیرا منڈی کی بیشمار پیچ در پیچ گلیوں کے تانے بانے میں الجھ جاتا ہوں، اس حمام میں سب ننگے ہیں۔ گلیوں اور سڑکوں پر سرگشت کرتے ہوئے شائقین، قدم قدم پر چیل کی طرح جھپٹتے ہوئے دلال، دروازوں اور دریچوں میں گڑیوں کی طرح سجی ہوئی عورتیں، — اپنے رنگ برنگ ملبوسات کے باوجود یہ ساری مخلوق الف ننگی ہے۔ اور ان کے جسم اور اذہان ایک ہی لے آواز سُر پر بڑی ہم آہنگی کے ساتھ رقص کر رہے ہیں۔ فضا میں کچے گوشت کی بساند رچی ہوئی ہے۔ اور بڑی بڑی پاؤر کے قمقموں کا اجتماعی نور گلیوں اور سڑکوں پر پھوں کے داغوں کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ مجھے رہ رہ کر خیال آتا ہے۔ کہ یہ عورتیں جو دروازوں اور کھڑکیوں میں گردنیں لٹکائے بیٹھی ہیں یکایک پھُر سے اڑ جائیں گی۔ اور ابابیلوں کی طرح اپنی چونچوں میں کنکریاں اٹھا کر ساری دنیا کو اپنے نرغے میں لے لیں گی...... لیکن عملی طور پر کنکریوں کی جگہ میری گردن پر جیسا کہ سے بلغم کا ایک بڑا سا غلغلہ آگرتا ہے۔ جو ایک ادھیڑ موٹی سی عورت دریچے میں بیٹھی بڑے اطمینان سے کھنکار کھنکار کر نیچے تھوک رہی ہے۔ میں اپنی گردن کو اس غلاظت سے پاک کرنے کی فکر کرتا ہوں۔ تو خدا کی خاص رحمت میری دستگیری فرماتی ہے۔ اور ایک گلی میں مجھے مسجد نظر پڑتی ہے۔ جس کے ایک دروازے پر کالی سیاہی سے "یا اللہ" اور دوسرے دروازے پر "یا محمدؐ" لکھا ہوا ہے۔ یہ چھوٹی سی مسجد دو بلند و بالا عمارتوں کے درمیان بڑی بیکسی سے جکڑی کھڑی ہے۔ اندر پیشاب اور پاخانے کا تعفن ہے۔ ایک طرف نالی میں بیئر کی چند خالی اور شکستہ بوتلیں اوندھی پڑی ہیں۔ وضو کے لئے ایک پرانا حمام ہے۔ جس کا پانی باسی لعاب دہن کی طرح کثیف ہے۔ اور بڑے زوروں سے ہمک مارتا ہے۔ نہ جانے اس مسجد کو دیکھ کر میرے ذہن میں ریل کے انجن کا خیال کیوں آتا ہے۔ جو تیز رفتاری سے چلتے چلتے... اچانک پٹڑی سے اتر گیا ہو!

ہیرا منڈی سے بھٹکتا بھٹکتا آخر میں شاہی مسجد آ پہنچتا ہوں اور خدا کی کھلی فضا میں اطمینان سے زور زور سے سانس لینے لگتا ہوں۔ رات کے بارہ بجے بھی مسجد کے آس پاس کئی شاندار کاریں کھڑی ہیں۔ ان کے ڈرائیور ادھر ادھر بیٹھے بیدلی سے اونگھ رہے ہیں۔ یہ شرفائوں کی موٹریں ہیں۔ جو اپنی بیگمات سے اجازت لے کر شاہی مسجد میں آ و تیم یا اقبالؒ کے مزار پر ہدیۂ عقیدت پیش کرنے یہاں آیا کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مسجد کی چکنی سیڑھیوں پر اکثر ان کا پاؤں پھسل جاتا ہے اور وہ لڑھکتے لڑھکتے بے اختیار ہیرا منڈی کے نہاں خانوں میں جا گرتے ہیں۔ اگر اقبالؒ زندہ ہوتا۔ تو وہ مسئلہ جبر و قدر کی ایک نئی تفسیر منظوم کر سکتا تھا!

شاہی مسجد کے عین مقابل پرانے قلعے کی اونگھتی ہوئی عمارت ہے۔ جس کے صدر دروازے پر پاکستان کا جھنڈا کسلمندی سے لہرا رہا ہے۔ اقبالؒ کے مزار میں ایک چھوٹا سا بلب روشن ہے۔ بڑا بلب کچھ عرصہ ہوا چوری ہو گیا تھا۔ لاہور میں بجلی کے نئے بلب آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے۔ کیونکہ ان کی مانگ ہیرا منڈی میں بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ اقبالؒ کے مزار کو ایک چھوٹے سے بلب پر ہی قناعت شعار رہنا پڑتا ہے۔ مزار کے دروازے پر ایک آہنی قفل لگا ہوا ہے۔ تاکہ عقیدت م

اندر گھس کر سو پچ بورڈ نہ چرا سکیں۔ .... باہر لان میں ہیرا منڈی کے اِکّا دُکّا دلّال بھولے بھٹکے راہیوں کے لیے خضرِ راہ کا کام دینے کیلئے منتظر بیٹھے تھے۔ ایک تانگے والا "دو، دو آنے میں" تانگے در پر پہنچانے کا اعلان کرتا ہے۔ میں اچک کر اس میں سوار ہو جاتا ہوں۔ تانگے میں ضلع جہلم کے دو مقدمہ باز بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ دن بھر مقدموں اور کچہریوں کی زحمت کے بعد وہ گھڑی دو گھڑی دل بہلانے کے لئے ہیرا منڈی آگئے تھے۔ اور اب حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے آستانہ پر سلام کرنے جا رہے ہیں۔

"کرتا تو سب کچھ اللہ ہی ہے" ایک مقدمہ باز اپنے ساتھی سے کہہ رہا ہے۔ "لیکن بزرگوں کا سہارا بھی بڑی چیز ہوتی ہے؟"

دوسرا مقدمہ باز بھی اس نظریئے کی تائید کرتا ہے اور اس روحانی گفتگو کے بعد وہ دونوں سرگوشیوں میں ہیرا منڈی کے ذاتی تجربات پر تبادلۂ خیالات کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

جمعرات کی وجہ سے داتا کے دربار میں عورتوں، مردوں، اور بچوں کا بے پناہ ہجوم ہے، کھوے سے کھوا چھلتا ہے اور دربار کے صدر دروازے میں نثار اور کولڈ ٹی صاحب ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چست کھڑے ہیں۔ ہجوم کے ہر ریلے کے ساتھ وہ خس و خاشاک کی طرح بہتے ہوئے اندر چلے جاتے ہیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے واپس آکر صدر دروازے کے عین بیچ اپنی جگہ سنبھال لیتے ہیں۔ میں ہر چند کوشش کرتا ہوں کہ ان کی نظر بچا کر ادھر ادھر ہو جاؤں۔ لیکن نثار مجھے دیکھ لیتا ہے اور زبردستی کھینچ کر اپنے پاس کھڑا کر لیتا ہے۔ کولڈ ٹی صاحب بھی میری پچھلی لغزشوں کو فراموش کر کے بڑے اخلاق سے پیش آتے ہیں۔ اور داتا کے دربار کے ساتھ مسلمان عورتوں کی عقیدتمندی کے جملہ فوائد پر عارفانہ روشنی ڈالتے ہیں۔ اپنے پروگرام کے مطابق یہ لوگ اب یہاں سے مزنگ کے اڈے پر جائیں گے اور وہاں سے زمین دوز مال گاڑیوں کی دوسری منزل شروع ہوگی۔

لاہور نارتھ ویسٹرن ریلوے کا بہت بڑا جنکشن ہے۔ یہاں کی زمین دوز مال گاڑیاں ہر سڑک، ہر گلی، ہر کوچے میں چلتی ہیں۔ جگہ جگہ سرخ بتیوں کے نشان ٹمٹماتے ہیں۔ لیکن ان بتیوں کے باوجود کئی گاڑیاں کانٹا بدلتے بدلتے چوک جاتی ہیں اور اکثر تصادم کے حادثات وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی تیز رفتار انجن چلتے چلتے پٹڑی سے اتر جائے۔ تو اسے پھینک نہیں دیا جاتا۔ بلکہ اس کی پیشانی پر کالی سیاہی سے اللہ اور رسول کا نام لکھ کر اسے مسجد کے کام پر لگا لیا جاتا ہے ——!!

(بشکریہ نقوش)

عابد داناپوری

مذاقِ دورِ حاضر

نگاہِ ابنِ آدم پھر گئی جب اپنے مقصد سے
قدم جب بنتِ حوّا نے نکالے اپنی سرحد سے
تو ترتیبِ عناصر نے نظامِ این وآں بدلا
زمیں بدلی زماں بدلا مکیں بدلے مکاں بدلا
ہوئی نادارئ شام وسحر ماتم پہ آمادہ
بنی طبعِ نشاطِ سیم وزر عشرت کی دلدادہ
نئے احساس کی شرحیں نکالیں اہلِ دانش نے
نئے افکار کے گلشن کھلائے دل کی خواہش نے
قریبِ منزلِ شاداب لیکر رہنما آئے
کہ جن رستوں پہ جاکر راہزن بھی ٹھوکریں کھائے
وہ رستے کارواں در کارواں گم ہوگئے جن میں
وہ رستے خود جنابِ خضر جاکر کھوگئے جن میں
وہ رستے جن میں چلتی ہیں ہوائیں خوابِ غفلت کی
وہ رستے جن میں جاکر سوگئے ہیں عزمِ راسخ بھی
عجب رنگیں خرد آگیں ہیولیٰ آب وگل کا ہے
مگر رفتار کہتی ہے بڑا سنگین دھوکا ہے
ابھی وہم وگماں کی مستقل تصویر ہے دُنیا
گرفتارِ بلائے گردشِ تقدیر ہے دُنیا
وہی سرگرمئ حرص وہوا کی شوخیاں اب بھی
وہی غارتگرئ شیوۂ امن واماں اب بھی
وہی نوکِ سناں اب بھی وہی تلوار کی تیزی
وہی سینہ فگاری ہے وہی اندازِ خوں ریزی

کہیں دھوکے میں آکر زندگی ٹھوکر نہ کھاجائے
مذاقِ دورِ حاضر سے کہو اتنا نہ اترائے

اسعد گیلانی

لال کوٹھی!

پرانے شہر سے باہر کھلی فضا میں ایک نئی آبادی تعمیر ہو رہی تھی۔ اس نئی آبادی میں سب کوٹھیاں ہی کوٹھیاں تھیں۔ اس سرے سے اس سرے تک بنگلے ہی بنگلے شاید تمام سرمایہ داروں نے متفقہ طور پر یکجا آبادی کا منصوبہ بنایا تھا۔ اور اب اس منصوبے پر عمل ہو رہا تھا۔ (جیسے ہر سرمایہ دار اپنے منصوبے پر عمل کر سکتا ہے) ان منصوبے کے برخلاف جو ایک بے سرمایہ شخص کے دماغ میں بنا اور بگڑا کرتے ہیں

سڑک پر کاروں کی آمد و رفت اب بڑھ گئی تھی۔ شہر کے نیشن اور اونچے طبقہ کے نمونے اس سڑک پر نظر آتے جا رہے تھے ادھر سے گزرتے ہوئے ایک میلا کچیلا ادھیڑ دست آدمی بڑے سخت احساس کمتری کا شکار ہو جاتا تھا۔ اس کے سینہ میں یا غصہ ابھر آتا، یا لالچ یا پھر مرعوبیت اور ہیبت، کسی بھی شریف آدمی کے لئے پورے استغنا کے ساتھ نکل جانا مشکل ہو گیا تھا۔ رنگ برنگ کی کوٹھیاں، ہری نیلی، گلابی اور لال ——

اور ان میں نظر آنے والے غراروں اور دوپٹوں، جمپروں اور فراکوں سے بھی زیادہ شوخ و شنگ، وہ سڑک اب فتنہ بنی جا رہی تھی۔ اس لئے ادھر سے گزرتا ہوا آدمی اپنے آپ کو غیر کی خوشبو سے بچا نہ سکتا تھا۔ اس نئی آبادی کی وہ سڑک اونچی سوسائٹی کے اخلاق کی پوری پوری نمائندگی کر رہی تھی۔

اس آبادی میں ایک کوٹھی شیخ آدم علی کی بھی بن رہی تھی، یہ کوٹھی بنانے کا شوق اچانک ان کے ذہن میں آکودا تھا حالانکہ ان کے پاس اس سے پہلے کئی ایک کوٹھیاں اور بلڈنگیں بھی تھیں جو کرایہ پر چل رہی تھیں۔ سیٹھ صاحب ایک دین دار آدمی تھے۔ اور مذہب سے بغاوت کرنا ان کے نزدیک بہت بری بات تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر سال ایک شخص کو حج بدل کے لئے بھی روانہ کرتے تھے۔ ویسے ان کا یہ بھی خیال تھا کہ کمیونزم جہنت مفید چیز ہے اور پرانا اسلام اس زمانے میں کمیونزم کے ہی رنگ میں آیا ہے اس لئے وہ شہر کی کئی یونینوں کے صدر تھے اور ان کے جلسوں میں مزدوروں کے حقوق کے تحفظ اور پرامن جدوجہد کے موضوع پر کئی تقریریں کر چکے تھے ——

ان کی نئی کوٹھی کا نقشہ اور تخمینہ ان کی میز پر ان دنوں بچھا ہوا تھا اور اس کی تعمیری تفصیلات کے ساتھ اخراجات کا چارٹ بھی اسی میز پر شیشہ کے ایک بڑے سے ٹکڑے کے نیچے رکھا تھا جس پر وہ ہر وقت نظر ڈالا کرتے اور غور کرتے رہتے تھے۔

انھیں بڑی فکر نقشہ کی نہ تھی۔ بلکہ اس کی تھی کہ اس کی تعمیری تفصیلات کے سامنے جو اخراجات کا کالم انھوں نے بنا رکھا تھا۔ اس کی فراہمی کا انتظام کیسے کیا جائے۔

روپے کی فراہمی کا سوال ان کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ ان کے غور و فکر کا سب سے بڑا ہدف بنا ہوا تھا۔ اس لئے نہیں کہ ان کے پاس روپیہ نہ تھا۔ روپے کے لحاظ سے تو انھیں قارون سے بہت قریبی نسبت حاصل تھی۔ ہزاروں روپیہ سالانہ تو سود ہی آتا تھا۔ کوئی بنک ان کے کھاتے سے خالی نہ تھا۔

اصل فکر یہ تھی کہ کوٹھی کو وہ بنک کے جمع شدہ سرمایہ میں سے نہیں بلکہ اوپر کی آمدنی کی مدوں سے بنانا چاہتے تھے —— اور اسی پر ان کا سارا تدبر صرف ہو رہا تھا ——

تعمیرات لمیٹڈ نے جو تخمینۂ تعمیر انھیں دیا تھا۔ وہ کچھ اس قسم کا تھا۔

عمارتی اجزاء	تخمینہ فیصدی	رقم	ذریعہ فراہمی
کل تخمینہ	۱۲۵۰۰۰/۰/۰ روپے		
۱ ابتدائی تیاری نقشہ جات. فراہمی سامان اور داغ بیل کا کام	۱۰ فیصدی	12500—0—0	
۲ کھدائی بنیادیں	۳ فیصدی	3750—0—0	
۳ فیل پائے اور شہتیر	۷ فیصدی	8750—0—0	
۴ دیواریں اور پلستر	۲۵ فیصدی	31250—0—0	
۵ احاطہ کی دیواریں، پھاٹک	۱۵ فیصدی	18750—0—0	
۶ چھت، زینہ (مع جنگلہ) اور سائبان	۲۰ فیصدی	25000—0—0	
۷ کھڑکیاں، دروازے	۵ فیصدی	6250—0—0	
۸ فرش و جھروکہ	۷ فیصدی	8750—0—0	
۹ گیرج	۱ فیصدی	1250—0—0	
۱۰ اندرونی سفیدی، روغن کاری، صفائی کوٹھی کا بیرونی لال رنگ اور آخری ٹیپ	۷ فیصدی	8750—0—0	
		125000—0—0	
۱۱ احباب و حکام کی پُر تکلف دعوت —		2000—0—0	

اس نقشہ میں گیارھواں خرچ برائے دعوت، اور چوتھا کالم برائے ذریعۂ فراہمی انھوں نے خود اضافہ کیا تھا۔ اور اب اس اضافہ شدہ تخمینہ کا چارٹ ان کی میز کے شیشے کے نیچے پڑا انھیں دعوت غور و فکر دے رہا تھا۔ وہ بنک کے روپے سے باہر جس جس آمدنی کی مد تجویز کرتے جاتے تھے۔ نقشہ کے کالم نمبر ۴ میں لکھتے جاتے تھے۔

چند ہی دن کے غور و فکر کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے موجود اور متوقع آمدنیوں کے ذریعے چوتھا کالم تقریباً پُر کر لیا۔ ان کا ذہن بلا کا تیز تھا۔ اور اگر انھیں کہیں ملک کا وزیر خزانہ بنا دیا جاتا، تو وہ چند ہی دنوں میں ملک کا خزانہ بھر دیتے۔

خرچ نمبر (۱) برائے ابتدائی تیاری نقشہ جات وغیرہ کے لئے انھوں نے اپنے اس سال کا [...] کر دیا۔ اس سال تین مختلف بینکو[ں سے] انھیں مجموعی طور پر تقریباً ۵/۱/۱۔ [...] روپے سود ملا۔ اگرچہ غیر ملکی سرمایہ [...] میں شرح سود بہت کم تھی۔ جو ½۱ فیصدی سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ دیسی بنکوں کے مقابلے [...] ملکی بنکوں میں ان کا سرمایہ زیادہ [...] تھا۔ وہ شرح سود کے لالچ میں اپنا [...] سے کمایا ہوا سرمایہ گرہ کٹوں کے حوالے [...] چاہتے تھے۔ اسی آمدنی میں سے خر[چ نمبر ۹] (برائے گیرج) بھی پورا ہو گیا۔ انھوں [نے ...] کیا کہ اس سال وہ حج بدل کے لئے [...] آدمی نہ بھیجیں گے۔ آخر حج تو عمر بھر [میں ایک] بار فرض تھا۔ ہر سال تو نہیں، او[ر] وہ کئی دفعہ ادا کر چکے تھے۔ پھر حج بھی [...] راہ کا سفر تھا۔ اور گیرج میں رکھی جا[نے والی] گاڑی بھی سفر ہی کرنے والی تھی۔ جب[...] کر نہ معلوم کتنے نیک کام انجام د[یے جا] سکتے تھے، اور دیئے جانے والے تھے۔

خرچ نمبر (۲) کوٹھی کی بنیادوں کی کھدائی تھی۔ جس [کا تخمینہ] ۰/۱/۱-۳۷۵۰ روپے تھا۔ گزشتہ سال انھوں نے ایک [...] کے اصرار پر چھ بار ریس میں روپیہ لگایا تھا۔ جس میں چار بار ہا[رے اور] دو بار جیتے۔ لیکن دو بار کی جیت چار بار کی کمی پوری کر کے [...] ہی گئی۔ ان کے حساب کے مطابق کل رقم جو ریس میں لگائی گئ[ی] ۰/۱/۱-۱۲۵۰۰ روپے کی تھی، اور جیت میں تقریباً ۵/۱/۱-[...] روپے وصول ہوئے تھے۔ اس طرح ۰/۱/۱-۳۹۰۰ روپے کا نفع تھا۔ وہ نفع انھوں نے اپنے مستقل ڈپازٹ میں ڈال کر بجائے کوٹھی کی بنیادوں کے خرچ پر لگانے کا فیصلہ کر لیا۔

خرچ نمبر (۳) فیل پائے اور شہتیر کا تخمینہ 8750/-/-
روپے کا تھا۔ اس کے لئے انھوں نے دو تین مدات سے آمدنی جمع کر
لی۔ اپنی ایک بیوہ بہن کے زیرِ تعلیم لڑکے کو 100/-/- روپے ماہوار
دے رہے تھے۔ اسے انھوں نے روک لیا۔ اور اپنی تنگدستی اور
تجارت کی کساد بازاری کا عذر لکھ دیا۔ 1200/-/- روپے اصلاح
بچے۔ 100/-/- روپے ایک یتیم خانے کو، اور 50/-/- روپے
ایک فری شفاخانے کو دیتے تھے۔ اسی عذر کی بنا پر روک لئے۔ اس
طرح پورے 3000/-/- روپے بچ گئے۔ کچھ بلیڈ اور صابن کا اسٹاک
گودام میں پڑا تھا۔ جو کنٹرول کی وجہ سے روک رکھا تھا۔ بلیک میں نکال
دیا جس سے پولیس اور دلال وغیرہ کا خرچ نکال کر پورے 6000/-
روپے بچ گئے۔ اس طرح کوٹھی کے فیل پائے اور شہتیر کا خرچ نکل آیا۔

خرچ نمبر (۴) دیواریں اور پلستر بہت بڑا خرچ تھا۔ لیکن یہ
انھوں نے ملٹری میں سپلائی کئے جانے والے گھی کے ٹھیکے میں اپنے
مقررہ نفع کے علاوہ پیدا کر لیا، انھوں نے دو ماہ کی سپلائی میں خالص
جما ہوا تیل بنولے اور وائٹ آئل کا ملا جلا ملغوبا سپلائی کیا جس میں
انھیں 33700/-/- روپے کا زائد منافع ہوا۔ اس میں سے کمانڈنگ
کو چار ٹین خالص گھی کے 320/-/- روپے، اور پھر 1200/-/- روپے
نقد دئیے اور انسپکٹر وغیرہ کو 300/-/- روپے اور ایک 300/-/-
روپے کی بھینس وضع کر کے 31580/-/- روپے نفع بچا، یہ رقم انھوں
نے خرچ نمبر (۴) کے "ذریعۂ فراہمی" کے کالم میں لکھ دی۔

خرچ نمبر (۵) احاطے کی دیواریں اور پھاٹک تھا جس کی رقم
18750/-/- روپے تھی۔ اس کے لئے انھوں نے دو طرح کے حسابات
رکھ کر انکم ٹیکس سے جو رقم بچائی تھی۔ اس کا دسواں حصہ وقف کر دیا جو
انکم ٹیکس کے عملے اور دوسرے ضروری اخراجات وضع کرنے کے بعد
تقریباً 18500/-/- روپے آتا تھا۔ 250/-/- روپے کی کمی انھوں
نے اس طرح پوری کی کہ انکم ٹیکس کے عملے میں ایک کلرک سے اسی رقم کا
جو وعدہ کیا تھا۔ وہ دبا لیا۔ کیونکہ وہ کلرک اب اس محکمہ سے ٹرانسفر
ہو گیا تھا۔ اور اب ان کو اس سے کسی قسم کا کوئی خطرہ نہ تھا۔

خرچ نمبر (۶) چھت، زینہ، جنگلا اور سائبان کے لئے 25000
روپے کا تخمینہ تھا۔ اس کے لئے انھوں نے درآمدی لائسنس کی فروخت
کا روپیہ وقف کر دیا۔ واقفیت اور روپے کے زور سے انھوں نے پیتل
تانبے کے اسکریپ کی درآمد کے لئے ایک لائسنس لے لیا تھا۔ لیکن یہ
چونکہ ان کی لائن کا کام نہ تھا۔ اس لئے انھوں نے بھاگ دوڑ اور چائے
پانی کا خرچ نکال کر 25000/-/- روپے کے نفع پر یہ لائسنس شہر
کے ایک بڑے کباڑیے کے ہاتھ بیچ دیا۔

خرچ نمبر (۷) کھڑکیاں اور دروازوں کا تھا۔ جو 6250/-/-
روپے کی رقم تھی، اس کے لئے انھوں نے کسٹم سے بچائی ہوئی رقم وقف
کر دی۔ کل بچت 7000/-/- روپے کی تھی لیکن کسٹم کلرک، انسپکٹر اور
دوسرے اہم خرچ نکال کر اب صرف 6050/-/- روپے کی رقم رہ
گئی تھی۔ 50/-/- روپے انھوں نے ایک ماہ کے لئے گھر کے اخراجات
میں، اور 150/-/- روپے لڑکے کا جیب خرچ کاٹ لیا۔ اور یہ
پوری کر دی۔ اگرچہ لڑکے نے 150 روپے کے بدلے 500/-/- کے
چیک پر ان کے جعلی دستخط بنا کر بنک سے نکلوا لئے۔ جو ان کو بعد میں
معلوم ہوا۔

خرچ نمبر (۸) فرش اور جھروکے کا تھا۔ یہ 6750/-/- روپے
کی رقم تھی۔ سیٹھ صاحب نے لیٹھے کے بڑھتے ہوئے دام دیکھ کر مارکیٹ
میں سے کچھ مال اٹھا لیا تھا جو انھوں نے حکومت کے درآمدی لائسنس
شورسن کرا اور اپنے ایک دوست افسر سے اس کی تصدیق کر کے ا
اپنے الفاظ میں اونے پونے نکال دیا تھا۔ اس میں انھیں قیمت خ
پر دس فیصدی منافع الگ وضع کرنے کے بعد 19000/-/-
بچا۔ یہ رقم انھوں نے اس خرچ پر لگا دی۔

اس بار زکوٰۃ کا حساب انھوں نے خود ہی اپنے اجتہاد
ذریعے برابر کر لیا۔ کچھ مال کی درآمد کے سلسلے میں انھیں لیٹر آف
کھولنا پڑا جس پر زیادہ عرصہ گزرنے کی وجہ سے ۲½ فیصدی
بھی پڑ گیا۔ یہ سود چونکہ سیٹھ صاحب کے خیال میں اتنا کافی تھا
ان کی زکوٰۃ کے بہت بڑے حصے پر حاوی ہو جاتا، اس لئے انھوں
اس زکوٰۃ کو اس سود کے عوض وضع کر کے اپنا حساب برابر کر لیا
وہ رقم اپنے کھاتے میں زکوٰۃ کی مد میں لکھی۔

اسمگلنگ کا کھاتہ اس سال قابل ذکر نہ تھا۔ اس بار جتنی گندم اور جیوٹ وہ سرحد پار بھیج سکے، اور جتنا کپڑا، لہسن، پیاز اور کالی مرچ ناجائز طور پر انھوں نے درآمد کی، اس میں بورڈر پولس، متعلقہ حکام، اور ہمسایہ ملک کے تاجروں کی بے ایمانی نے سیٹھ صاحب کے اس کاروبار کو قابل ذکر حد تک نفع بخش نہ رہنے دیا۔ چنانچہ اس تعمیر میں آمدنی کی یہ مد بھی ان کی کچھ زیادہ مدد نہ کر سکی، البتہ سفیدی، روغن کاری، صفائی اور آخری ٹیپ ٹاپ کا خرچ نمبر ۱۰ کے 8750/-/- روپے میں سے 8000/-/- روپے نکل ہی آئے۔

اب خرچ نمبر (۱۱) کے لئے 2000/-/- روپے، اور نمبر ۱ کے 750/-/- روپے باقی تھے۔ اس طرح کل 2750/-/- روپے کی رقم پیدا کرنا بہت ضروری تھا۔ بہت غور و فکر کے بعد سیٹھ صاحب کی ذہانت نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔ کوٹھی کے صحن میں نماز کے لئے ایک چبوترہ زیر تجویز تھا۔ اس کی تعمیر ملتوی کر دی اس کے 500 روپے بچ گئے۔ تعمیر کے اختتام پر کوٹھی کے افتتاح پر کچھ غربا و مساکین کو کھانا کھلانا بھی زیر غور تھا۔ وہ ملتوی کر دیا، اس کے بھی 250/- روپے بچ گئے۔ اب صرف دعوت کا باقی خرچ نکالنا تھا۔ انھوں نے کوٹھی پر کام کرنے والی لیبر کا جائزہ لیا۔ اور محسوس کیا کہ ان کی اپنی مقرر کردہ لیبر پر خرچ زیادہ ہو رہا تھا۔ انھوں نے کام کی رفتار کو باقاعدہ اور حسب معمول رکھنے کی تاکید کر کے ۴ روپے روزانہ کے ۴ مزدور الگ کر دیئے اس طرح چار ماہ کی تعمیری مدت کے تخمینے کو پیش نظر رکھ کر 1020/- روپے بچائے۔ اور انھوں نے طے کر لیا کہ وہ دعوت کو اس رقم کے اندر ہی محدود رکھیں گے

اور ایک دن کوٹھی بن کر تیار ہو گئی۔ جو اس نئی کالونی میں کھڑی جھلملا رہی تھی جس کی پیشانی پر " هٰذا من فضل ربّی " کا کتبہ لگا ہوا تھا۔ جس کے سامنے سے گزرتے ہوئے بھی اب وہ مزدور ڈرتے تھے جو اس سے مسلسل کئی ماہ تک چیونٹیوں کی طرح چمٹے ہوئے اس کی تعمیر میں مصروف رہے تھے۔ ہر گزرنے والے کو اس کا سرخ رنگ اپنی طرف متوجہ کرتا تھا۔ ایسا خوشنما، دلکش، اور دل آویز سرخ رنگ جیسے انسانوں کے شفق گوں خون کی سرخی اس میں شامل کر لی گئی ہو — !!

(بشکریہ "نئی نسلیں")

التماس ہے کہ ....

(۱) اپنی نگارشات بھیجتے وقت ان پر اپنا پورا پتہ لکھنا نہ بھولئے بغیر پتہ کے نگارش قابل قبول نہ ہوگی نیز ادارہ میں ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کا دستور نہیں ہے۔ اسلئے مضامین وغیرہ بھیجنے سے پہلے ان کی نقل اپنے پاس ضرور رکھیئے۔

(۲) جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ ضرور بھیجئے۔

(۳) خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ دیجئے تاکہ تعمیل ارشاد میں تاخیر کا امکان ہی نہ ہو۔

(ایڈیٹر)

ہاشم میرزا

اذان

بہت بڑا ہے
بزرگ و برتر خدائے عالم
گلوں کے رنگوں میں، موج دریا میں اس کا پرتو
بلند و بالا پہاڑ اور بیکراں سمندر کا ہے وہ خالق
دھنک کی دلکش کمان اور کہکشاں کی زرلفبت وادیوں کا وہی محافظ
وہی ہے آدم کو جس نے بخشی تھی بحر و برکی یہ "حکمرانی"
اسی نے انسانیت کے سب سے عظیم محسن کو ہم میں بھیجا
عظیم محسن!
خدائے برتر کے نور کا بے مثال پیکر
زمیں کے سینے کی ان گنت دھڑکنوں نے خوشیوں کے گیت گائے
تپے ہوئے ریگ زار ٹھنڈی ہوا کی آسودگی سے جھومے
عظیم محسن نے آدمیت کی رہبری کی
حیات جو میکدوں کی چکّی میں پس رہی تھی
حیات جس کو ہوس کی پھنکارتی جوالا نے ڈس لیا تھا
حیات جو سربلند محلوں کے سائے میں بلبلا رہی تھی
حیات جس کو نگل رہے تھے ہیبت سفاک قید خانے
عظیم محسن کی رہبری سے نکھر گئی تھی سنور گئی تھی

حیات اب پھر سسک رہی ہے
نشان منزل سے دور ہو کر بھٹک رہی ہے

یہ زندگی جو کٹھن منازل میں کھو گئی ہے
یہ زندگی جو مہیب راہوں پہ ہانپتی ہے
یہ زندگی جو الجھ رہی ہے حقیر و بیکار فلسفوں میں
اسے سہارے کی جستجو ہے!

سنو وہ پیغام ہر خطرناک موڑ پر جس نے بلبلاتی سسکتی
انسانیت کے دکھ کا علاج ڈھونڈا
غریب محنت کشوں کے اُجڑے ہوئے چمن میں نئی بہاروں کے گل کھلائے

نجات کا راستہ کھلا ہے
نجات کے راستے پہ آؤ
جھکاؤ، پیشانیاں جھکاؤ
بہت بڑا ہے۔ بزرگ و برتر خدائے عالم!

○

آغا بابر

نیا کاروبار

کباڑیے کی دکان سے آئی ہوئی چند ہشکل بوتلیں پڑی تھیں۔ دو ایک ٹوٹے ہوئے ڈبے تھے تسلے میں کچھ کوٹی ہوئی دوائیں سوکھی تھیں کچھ چھوٹی چھوٹی بندھی ہوئی پڑیاں چنگیر میں موجود تھیں۔ اور امینہ کا خاوند بیچ میں بیٹھا ایک سفوف کپڑچھان کر رہا تھا۔ اس کے انہماک سے یہی معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ کوئی کیمیا تیار کر رہا ہے جس سے دنیا کی ساری ناانصافیاں نتھر کر نیچے بیٹھ جائیں گی، آب کوثر سے دھل کر انسانیت کی صورت چاند کی سی نکل آئے گی۔ تمام روحانی اور جسمانی ناداریاں دور ہو جائیں گی۔ اور اس ڈھال پر زندگی کی تمام نامرادیاں، تلخیاں اور ناکامیاں اپنی کاری ضربیں لگانے سے قاصر رہیں گی۔

وہ سفوف کو بڑے اعتماد سے کپڑچھان کرتا رہا۔ جیسے وہ اپنے اس خفیہ ہتھیار سے دشمن کو پچھاڑ دے گا۔ چولہے کے سامنے بیٹھی امینہ نے دو چار دفعہ آواز دے کر کہا۔

"میں جانوں دفتر کا وقت ہو گیا ہے!"

"ابھی اٹھتا ہوں!" وہ یہی جواب دیتا رہا۔

آخر امینہ نے پرات میں پڑے پانی سے ہاتھ دھوئے اور دوپٹہ سے پونچھتی گلیارے میں آ گئی۔ اپنے خاوند کو منہمک دیکھ کر مسکرائی اور بولی —

"باقی کام دفتر سے آ کر کر لینا، مجھے بتا جاؤ کچھ کام میں کر چھوڑوں گی......!"

"اوں ہوں! بس باقی کام میں خود آ کر کروں گا۔ ان چیزوں کو اسی طرح احتیاط سے پڑے رہنے دو، کوئی بچہ نہ چھیڑے"

وہ چیزوں کو سنبھال کر اٹھا۔ پھر اسے خیال آیا اس نے کہا۔

"اچھا تم اتنا کام کر چھوڑو یہ جو گتے کے پیکٹ چھپے ہوئے آئے ہیں۔ ان کی تہوں کو یوں کھول کر پیکٹ کی شکل میں تبدیل کرتی رہنا جتنے بھی ہو سکیں!"

اس نے چھپا ہوا ایک گتہ اٹھایا۔ اس کی تہوں کو سیدھا کیا پیکٹ بن گیا۔

"اس میں بوتلیں بند کریں گے، کیوں کیسا رہے گا؟"

"پیکٹ بڑا اچھا ہے!" امینہ بولی

"اب دعا کرو یہ کام چل جائے!" یہ کہہ کر وہ جلدی سے دا... کپڑے بدلنے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد امینہ گلیارے میں آ بیٹھی اور نرم... کی تہیں کھول کر جوڑ جوڑ کر پیکٹ بنانے لگی۔ پیکٹ کے ایک طرف شعر لکھا تھا ؎

حکیموں کا ہے کام کرنا دوا کا
شفا بخشنا کام ہے کبریا کا

دوسری طرف لکھا تھا کہ پیٹ اور معدے کی ہر بیماری... یہ سفوف کیمیا ہے۔ امینہ نے تیسری طرف دیکھا وہاں لکھا تھا... کے لئے اکسیر ہے۔

چند روز ہوئے اسی گلیارے میں بیٹھ کر خاوند کے دوستوں... اسے دفتری اوقات کے بعد اس نئے کاروبار کا مشورہ دیا تھا۔ پیش... مرزا صاحب تھے۔ جو دکانداروں کو ڈھیروں نقلی بوٹ پالش دے... خالی ڈبیاں کباڑیوں سے لے لیتے تھے۔ اور موم کے ساتھ کچھ اوٹ... چیزیں ملا کر انھوں نے گھر میں ڈبیاں بھرنے کی فیکٹری کھول لی تھی... ماسٹر مولا داد آیا کرتا تھا جس کے پاس سات ٹیوشنیں تھیں۔ ایک... اس سے پوچھا گیا۔ کہ وہ اتنی ٹیوشنیں کس طرح ہتھیا لیتا ہے۔ تو اس... بتایا۔ وہ چھٹی ہونے سے پہلے ہی ٹیوشن والے لڑکوں کو سکول میں... لیتا ہے۔ جب کسی نے پوچھا۔ کیا ہیڈ ماسٹر کچھ نہیں کہتا۔ تو وہ بولا

پیشانسر خود اس وقت سینما کے اشتہار لکھ رہا ہوتا ہے

گویا سب نے امینہ کے خاوند کو کچھ ہاتھ پیر ہلانے کا مشورہ دیا تھا۔ تاکہ گزر اوقات میں کوئی صورت نکل آئے۔ اور گھر کے اخراجات کچھ پورے ہوسکیں۔ چنانچہ ڈیڑھ سو روپیہ کی جو کمیٹی ملی تھی۔ اسی سے یہ کاروبار جنم لے رہا تھا۔

خاوند دفتر اور بچے سکول جا چکے تھے۔ امینہ کا لاڈلا بھائی نفاست غسل خانہ میں نہا رہا تھا۔ اور ساتھ ساتھ گا رہا تھا۔

گائے چلا جا ، گائے چلا جا
ایک دن تیرا بھی زمانہ آئے گا

امینہ بیٹھی پیکٹ جوڑتی رہی اور سوچتی رہی، کہ اس نے کس طرح ہر مہینہ بچوں کا پیٹ کاٹ کاٹ کر کمیٹی کے روپوں کی کفایت کی تھی شاید اس کاروبار میں خدا برکت ڈال دے۔

نفاست تیار ہو کر منہ میں سگرٹ دبائے کلائی پر گھڑی باندھتا باہر نکلا.....

"آپا اگر مجھے کوئی ملنے آئے تو کہنا میں ٹی ہاؤس میں مل سکتا ہوں، آج ایک بہت بڑے آدمی سے میری ملاقات ہے۔ دعا کرنا!"

امینہ کس کس کے لئے دعا کرے؟ گھر کی خوشحالی کے لئے، خاوند کی ترقی کے لئے، بچوں کی صحت کے لئے نئے کاروبار کی بہتری کے لئے، اور نفاست کے روزگار کے لئے ..... مگر وہ پیکٹ بناتی رہی۔

نفاست کو بیکار رہنے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ وہ دن بھر ملازمت کی تلاش میں بار بار ٹی ہاؤس جاتا تھا۔ شام کو جب آتا اور دن بھر کی روئیداد سناتا۔ تو امینہ اور اس کا خاوند یہی اندازہ لگا سکتے۔ کہ اس نے ٹی ہاؤس، کافی ہاؤس یا ہوٹلوں کو یوں سمجھ رکھا ہے۔ کہ روزگار اسے وہیں سے ملے گا۔ ایک روز امینہ کے خاوند نے تنگ آ کر کہا کہ میں نہیں سمجھ سکتا کہ ہوٹلوں میں دن بھر بیٹھے رہنے سے نفاست کو ملازمت کس طرح مل جائے گی؟"

امینہ نے یہی بات نفاست سے کہہ دی۔ جسے سن کر وہ بولا "آپا بھائی جان نے کبھی ہوٹل کا منہ دیکھا ہو، کبھی ٹی ہاؤس گئے ہوں تو انھیں معلوم ہو کہ ملازمت کیوں کر مل سکتی ہے۔ ٹی ہاؤس، میں مختلف لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ شام کو کسی اعلیٰ درجہ ... میں جا بیٹھو، بڑے سے بڑا آدمی وہاں موجود ہوتا ہے، ہاتھ بڑھتے ہیں۔ تعارف ہوتا ہے، بات سے بات نکلتی ہے۔ کئی بزنس والے، کئی فرموں والے وہاں ہوتے ہیں۔ بھائی جان کیا چاہتے ہیں کہ میں دفتر میں جا کر دھکے کھاتا پھروں؟"

امینہ یہ سن کر خاموش ہو گئی۔ مگر اس نے دل میں یہ ضرور محسوس کیا۔ کہ نفاست نے اس کے خاوند کے متعلق ناگوار سی بات کہہ دی تھی اگر اس کا خاوند ہوٹل بازی کرنے لگتا تو آج بچوں کے تن پر کپڑا نہ ہوتا۔ گھر میں پھٹنے ناچنے لگتے، اس زمانہ میں گزر اوقات کیسے ہوتی ہے نفاست کو کیا معلوم! وہ ان فکروں میں نہیں پڑا تھا۔

امینہ سوچنے لگی اس وقت اس کا خاوند دفتر میں کاغذوں پر جھکا ہوا ہو گا شام کو تھکا ہوا آئے گا، وہ ہوٹل میں جا کر چائے کیوں پیئے۔ وہ ٹی ہاؤس میں کیوں جائے میرے بچے اس وقت سکول میں پڑھ رہے ہیں وہ سہ پہر کو گھر آئیں گے جب وہ آ کر امی امی کرتے میرے ساتھ لپٹ جائیں گے۔ مسرت کی کیسی لہر میری رگ رگ میں دوڑ جائے گی۔ بچوں کا خیال آتے ہی اسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے انھیں چھٹی ہو گئی ہو اور وہ تیز دھوپ سے بچتے سڑک کے کنارے چھدرے چھدرے درختوں کے سائے میں گھر کی طرف چلے آ رہے ہوں۔ گرم گرم تپی ہوئی بھربھری مٹی ان کے جوتوں میں گھس رہی ہے۔ سلیمان سب سے پیچھے آہستہ آہستہ چل رہا ہے۔ کیونکہ اس کا بوٹ زیادہ پھٹا ہوا ہے۔ اس نے کل دکھایا تھا۔ اپنا بوٹ الٹا کر کے مٹی اس میں سے گرنے لگی تھی۔ اس کا پاؤں بوٹ کے اندر ہی اندر خاک آلود ہو گیا تھا۔ "امی مجھے نیا بوٹ لے دو ان سوراخوں میں سے مٹی اندر گھس جاتی ہے۔ مجھ سے چلا نہیں جاتا"

نجمی نے جب بھائی کو یہ کہتے سنا تو اس نے کہا۔ "امی سلیمان کو ضرور لے دو بوٹ! یہ سب سے پیچھے رہ جاتا ہے میں اگلے مہینے لے لوں گی۔"

امینہ نے اس کا سینڈل دیکھا وہ سلیمان کے جوتے سے بھی گیا گزرا تھا۔ امینہ نے نجمی کی آنکھوں میں محبت اور ہمدردی کی ایک چمک دیکھی۔ "میری بچی کتنی صابر اور شاکر ہے" اس نے دل

میں کہا۔ اور سلیمان کی طرف منہ کر کے بولی۔ "خواہ کچھ ہو میں اپنے لال کو کل بوٹ خرید دوں گی تم آؤ گے سکول سے تو بوٹ موجود ہوگا۔"

امینہ پیکٹ بناتے بناتے اکتا گئی، اس نے سوچا تھا۔ کہ کمیٹی کے روپے ملنے پر وہ سلیمان اور نجمی کو نئے بوٹ خرید دے گی مگر کمیٹی کا ڈیڑھ سو روپیہ یہ سب الابلا خریدنے پر صرف ہوگیا۔ اور بچے منہ دیکھتے رہ گئے۔ وہ اکتا کر اٹھ بیٹھی اس نے الماری دیکھی، پرس کھولا۔ اس وقت اس کے پاس صرف تین روپے اور کچھ ٹوٹے ہوئے پیسے تھے وہ چارپائی پر لیٹ گئی۔ اور چھت کی طرف دیکھنے لگی۔ عطار کی بیوی کو خدا نے بھیج دیا۔ کچھ دن ہوئے وہ ایک پرانی الماری امینہ سے خرید کر لے گئی تھی۔ اس نے دس روپے کا نوٹ، جسے اس نے کئی تہیں دے کر پلو میں باندھا ہوا تھا۔ کھول کر امینہ کو دیا۔

"مجھے بڑی ضرورت تھی۔ میں سوچ ہی رہی تھی کہ تمہاری طرف کسی کو بھیجوں!"

جونہی لڑکا سودا لے کر آیا۔ امینہ نے اس سے کہا "دیکھو میں سلیمان کا جوتا لینے بازار جا رہی ہوں!"

نفاست میٹرو ہوٹل کے باہر کھڑا سگرٹ پھونک رہا تھا امینہ نے بھائی کو دیکھ کر تانگہ رکوا لیا۔

"کہاں جا رہی ہو آپا؟"

"سلیمان کا جوتا خریدنے —— تم کھڑے ہو یہاں؟"

"مجھے ایک آدمی سے ملنا تھا۔ اس کا انتظار کر رہا ہوں......

آؤ چائے کی ایک پیالی پی لیں —!"

امینہ تانگے سے اتر آئی......ٹائلوں کے صاف ستھرے فرش پر شیشے کی چمکتی میزیں، گرداگرد چھوٹی چھوٹی کرسیاں، امینہ کو یوں معلوم ہوئیں جیسے کسی پُرسکون جھیل میں کنول کے پھول تیر رہے ہیں۔ سیننگ کے موٹے موٹے پردوں کے پیچھے ہال میں ایک ٹھنڈک سی پھیلی ہوئی تھی۔ جو سکون کا سانس لینے کے ساتھ ساتھ رگ و پے میں گھلتی جاتی تھی۔ اور اس جگہ پاؤں پسار نے کو خواہ مخواہ جی چاہتا ہے۔ دست بستہ بیرے یوں کھڑے تھے۔ جیسے غلام گردشوں میں حبشی شاہی آقاؤں کی راہ دیکھ رہے ہوں۔ امینہ کے مضطرب دماغ میں یادوں کے جھونکے سے چلنے لگے اور یہ نویلی سی فضا اس کے لیے جیسے انھما پر ٹھنڈک کے پھائے رکھنے لگی۔ اس نے کرسی پر بیٹھ کر ایک لمبا سانس لیا۔ اور نفاست کی طرف دیکھ کر زیرلب مسکرا دی۔

"چائے لاؤ!" نفاست نے بیرے سے کہا۔

"میں تو کچھ کھاؤں گی بھیا!" امینہ بولی۔

"ضرور، ضرور! میں کہنے ہی والا تھا۔" نفاست نے کہا "بیرا دیکھو کٹلس لاؤ، کچھ چانپ سپیشل اور چکن سینڈوچ ......"

دیواروں کی میناکاری اور سبز سبز پردے امینہ کی آنکھ میں ٹھنڈک گھولتے رہے۔ اور اس کا بوجھل دل بھائی کے ساتھ نویلی فضا میں بیٹھ کر پُرسکون جھیل میں تیرنے والے کنول کی طرح ہلکا اور سہانا سا ہوگیا۔ ارد گرد کی کچھ نقرئی آوازیں اور بھائی کا بار بار اصرار یہ کھاؤ، یہ چکھو۔ گھر جا کر کھانا تھوڑی ہی کھانا ہے تمہیں اس کی روح میں تحلیل ہونے لگا۔

بل کے ساتھ نفاست نے بیرے سے سگرٹ کی ڈبیا منگائی نفاست بل پر نظریں جمائے دیکھتا چلا گیا۔ امینہ نے پوچھا

"کیوں؟ کیا ہوا؟ کتنا ہے؟"

"کوئی نہیں .... بارہ روپے!" نفاست نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کہا۔ "آپا میرے پاس صرف ایک روپیہ آٹھ آنے ہیں۔ تم اپنے پاس سے دے دو!"

یہ سن کر امینہ کو ایک جھرجھری آئی۔ دل کا کٹورا کنول ایک جھیل میں ڈوب گیا۔

جب وہ باہر آکر تانگے میں بیٹھنے لگی تو اس کی آنکھوں کے آگے آنسوؤں کی نمی کا ایک غبار چھا گیا۔ جس میں بھربھری سی مٹی اڑ رہی تھی۔ پھٹی پھٹی خاک جیسے سلیمان کے ٹوٹے ہوئے جوتے میں سے ...... لہجے میں تانگے والے سے کہا۔

"واپس چلو!"

نفاست بولا۔ "واپس کیوں؟ سلیمان کے لیے بوٹ خریدنا ہے؟"

"نہیں! مجھے کچھ ضروری کام کرنا ہے تمہارے بھائی ......"

ے وعدہ کیا تھا۔ امینہ نے جواب دیا:

"مجھے تو یہ نیا کاروبار قطعاً پسند نہیں، بھائی جان کی عقل کو پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔" نفاست نے کہا۔ اور ساتھ ہی تانگہ پر چڑھ بیٹھا۔ اور بولا۔ "تانگے والے اس طرف سے ہو جاؤ راستے میں مجھے ٹی ہاؤس اتار دینا۔"

جب امینہ اتر کر مکان میں داخل ہوئی تو گھیٹے میں کباڑیئے کی دکان سے آئی ہوئی چند ہم شکل بوتلوں، دو، ایک ٹوٹے ہوئے ڈبوں اور تسلے میں بچے کوئی ہوئی دواؤں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ اور ان کے بیچ میں بیٹھے ہوئے اپنے خاوند کا منہمک چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ جس سے آج صبح یہی معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ کوئی ایسا کیمیا تیار کر رہا ہے۔ جس سے دنیا کی تمام ناانصافیاں نتھر کر نیچے بیٹھ جائیں گی اور اس ڈھال پر زندگی کی تمام تلخیاں ضرب کاری لگانے سے قاصر رہیں گی۔ اس کی ناگوار سوچ کو نفاست کے الفاظ بھی سنائی دیئے۔ "بھائی جان کی عقل کو پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے!"

آنسوؤں کی نمی کا ایک غبار پھر اس کی آنکھوں کے آگے چھا گیا اس کے دل پر جیسے ایک کاری ضرب لگی۔ اور وہ بے جان ہو کر چارپائی پر بیٹھ گئی — !!

(بشکریہ 'ماہ نو')

بقیہ مضمون صے ۵۲ "رہبر"

کسوٹی پر پرکھنا چاہا تو میرے دل و دماغ میں ایک کشمکش پیدا ہو گئی — لیکن میرے پاؤں بالکل غیر اختیاری طور پر اٹھنے لگے — .... اس کا تو مجھے علم نہیں کہ میں اپنے خیالات میں غلطاں و پیچاں کتنی دور چلا آیا تھا لیکن یہ ضرور محسوس کر رہا تھا کہ میرا دماغ اور میری عقل اپنی پیچ در پیچ منطقی بحثوں کے بعد بھی دل پر فتح نہ پا سکے تھے اور ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے دل کو اس بات کا یقین ہو کہ اپنی منزل گم گشتہ پر پہنچنے کی سیدھی راہ یہی ہے —

آخر اس وقت جبکہ میری عقل پسپا ہو کر میدان چھوڑنا ہی چاہتی تھی۔ میں نے سنا کوئی چلا رہا ہے "منزل۔ منزل۔ !! وہ دیکھو منزل۔ !!!"

اس چنگھاڑتی چیخ سے میں گھبرا سا گیا اور سر اٹھا کر جو ادھر ادھر دیکھا تو فرطِ حیرت سے بت بنا کھڑا رہ گیا۔ میری گم شدہ منزل جس کی تلاش میں پاؤں میں چھالے پڑ پڑ گئے تھے۔ اور ایک جگ بیت گیا تھا۔ سپیدۂ سحر کے حسین نظاروں کے درمیان کھڑی مسکرا رہی تھی۔

(بشکریہ 'معیار')

اگر آپ کا نام اور خریداری نمبر بھی ذیل میں درج ہے

تو سمجھ لیجئے کہ آپ کی خریداری مدت ماہ ستمبر ۵۴ء سے ختم ہو چکی ہے نام گشتی مراسلہ میں جاری کیا جا رہا ہے۔ مہربانی فرما کر اپنا سالانہ چندہ بذریعہ منی آرڈر روانہ فرما کر شکر گذار فرمایئے۔ یا پھر اپنی خواہش سے مطلع کیجئے اگر آپ نے خاموشی سے کام لیا تو ماہِ اکتوبر کا شمارہ بذریعہ وی، پی، ارسال خدمت کیا جائیگا۔ اور اس کا وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔ منتظر کرم :- ایڈیٹر مشیر کراچی

خریداری نمبر	نام	خریداری نمبر	نام
۸۸۳	عبدالقیوم صاحب اچھرہ	۲۰۵۹	ضیا محمد صاحب چوپال
۸۸۵	حکیم عبدالستار دسوہا	۲۰۹۴	نور محمد صاحب پاک پٹن
۸۹۰	ڈاکٹر عبدالمجید کشتیا	۲۱۸	نور محمد خان صاحب حیدرآباد سندھ
۲۰۰۵	فرخندہ صفیہ کراچی	۲۲۰۲	عبدالغنی صاحب لاہور
۲۰۳۵	عبدالغفور صاحب پسرور	۲۲۰۳	حافظ ابوالقاسم صاحب بری آباد
۲۰۳۶	چوہدری محمد اسمٰعیل کراچی	۲۲۱۳	مولوی احمد دین مکھڈ شریف
۲۰۴۲	عارف سہارنی گوجرانوالہ	۲۲۱۵	حافظ محمد جمیل صاحب حافظ آباد
۲۰۴۴	فخرالدین احمد نرائن گنج	۲۲۲۱	دارالمطالعہ جماعت اسلامی جلال پور
۲۰۴۶	فرخندہ اختر صاحبہ شیخوپورہ	۲۲۲۴	عبدالرزاق ڈھاکہ
۲۰۵۲	شاہدہ نسرین صاحبہ کراچی	۲۲۳۶	خواجہ عبدالوحید نرائن گنج

ادب کو

شریفانہ زندگی کا آئینہ دار بنایئے

فحاشی ہماری معاشرت کا فطری جزو نہیں ہے

حسن شاد •

سیفٹی ایکٹ

خطۂ پاک کے سینہ پہ ہیں رقصاں اب تک
سیفٹی ایکٹ کی سفاک نگاہوں کے شرار
ابھی زنداں کی سلگتی ہوئی تنہائی میں!
چیختی پھرتی ہے جمہور کی مظلوم پکار

ابھی جمہور کے عارض کی حسیں رعنائی
جبر و بیداد کے شعلوں میں جھلس جاتی ہے
اُن دماغوں پہ جو اسلام کے شیدائی ہیں
چھن چھناتی ہوئی زنجیر سی لہراتی ہے

ابھی قانون کی کستی ہوئی زنجیروں میں
گھٹ کے رہ جاتے ہیں کچھ لوگ غموں کے مارے
خطۂ پاک کی ڈوبی ہوئی نبضوں میں ابھی
رقص کرتے ہیں غریبوں کے لہو کے دھارے

یوں نہ مشاطۂ جمہور کے گیسو نوچو!
لب پہ تعزیر کے پہروں کو بٹھانے والو
سوزنِ ظلم سے لوگوں کے لبوں کو نہ سیو!
جیل کے آہنی بستر پہ سُلانے والو

دیوتاؤ ذرا حالات کو دیکھو بھالو!
کچھ نہ کچھ عظمتِ انسان کا احساس کرو
یہ بہاریں جو کہ جمہور نے بخشی ہیں تمہیں
ان کے دامن میں یہ آہیں یہ شرارے نہ بھرو

جب کبھی کچلے ہوئے سینوں سے فغاں نکلے گی
کانپ جائیں گے تشدد کے طلائی مینار
پھر یہ زنجیرِ گراں ٹوٹ کے رہ جائے گی
رقص کرتی ہوئی ہنستی ہوئی آئے گی بہار

افتخار اعظمی •

دل تو بہلائے بہلتا ہی نہیں — لاکھ سمجھاؤ سمجھتا ہی نہیں
لوریاں دے دے سُلاتا ہوں مگر — ہائے بے چینی یہ سوتا ہی نہیں
کون ہے وہ جس سے کہیے حالِ دل — کوئی یاں فریاد سنتا ہی نہیں
ہند کا یہ دیس بھی کیا دیس ہے! — بیکسوں کا کوئی ملجا ہی نہیں
چھوڑیئے اِس دیس کو چلئے کہیں — یاں غریبوں کا گزارا ہی نہیں
یہ جنونِ عشق اور اس کا علاج — چارہ گر! اس کا مداوا ہی نہیں

آ دکھاؤں دل کے داغوں کی بہار
یہ تماشا تو نے دیکھا ہی نہیں

سے یہ شعر کیفیتِ فرار کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ بعض مرتبہ جب کسی ملک میں حالات
نہیں ہوتے تو کسی خوشگوار ماحول کی تلاش ... انسانی فطرت ہے۔ ا۔ اعظمی

عبدالحمید جودۃ السحار
ضیاء الحسن موسوی

تختیاں

چچا امین نے آج پہلی بار سکریٹریٹ میں قدم رکھا تھا وہ گھبرائے ہوئے تھے وہ کبھی کسی وزارت میں نہیں گئے تھے وہ کاروباری آدمی تھے ساٹھ سال کی عمر دکان میں گذری تھی نہ وہ سرکار سے واقف تھے نہ سرکاران سے۔ اگر کچھ لگاؤ تھا بھی تو بس اتنا کہ سرکاران سے ٹیکس کا تکرار کرتی تو جتنا مطالبہ ہوتا وہ اتنا ہی بلا پس و پیش ادا کر دیتے اور اوپر سے اللہ کا شکر بجا لاتے کہ افسروں سے خیریت گذری۔ چچا امین بھلے مانس اور شریف آدمی تھے وہ کبھی تھانے کچہری کے راستہ نہیں چلتے تھے اگر کبھی کسی جھگڑے بکھیڑے کے سلسلے میں ان کو بلایا بھی جاتا تو وہ تیز تیز قدم اٹھاتے دعائیں پڑھتے روانہ ہوتے، الٰہی خیر ہو! جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو۔ ان کے لئے سب سے زیادہ کڑی مہم سرکاری آدمیوں سے ملاقات تھی۔ ان کا خیال تھا کہ حاکم کے سامنے جانا ایک امتحان ہے۔ اور اللہ اکثر اپنے بندوں کا امتحان لیتا ہے!

چچا امین تھوڑی ہی سی سیڑھیاں چڑھے ہوں گے کہ ان کی سانس پھول گئی۔ ان کا دل دھڑک تو رہا ہی تھا مگر جب ان کے کان میں کسی افسر کی آواز آئی جو کسی کو ڈانٹ رہا تھا۔ تو ان کا دل بیٹھنے لگا۔ اور پاؤں کانپنے لگے وہ اس روز سیاہ کو کوسنے لگے جس دن سرکار نے ان سے کچھ مال خریدا تھا اور جب کئی مہینے گذر گئے اور ان کو کچھ خیر خبر نہیں ملی تو وہ مجبوراً اس کی قیمت کا مطالبہ کرنے کے لئے آج یہاں آئے تھے۔ پہلے تو وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ اتنی بڑی حکومت بھی لین دین کے معاملے میں انہی سرکاری نوکروں کی طرح ہو گی جو ان کے گاہک تھے۔ اور مہینوں کی ٹال مٹول کے بعد حساب صاف کیا کرتے تھے ان کا خیال تھا کہ سرکار مال لیتے ہی فوراً معاوضہ ادا کر دے گی مگر دن گذرتے گئے اور رقم خزانے میں محفوظ رہی۔

اوپر چڑھ کے چچا امین لمبے برآمدے میں دبے پاؤں چلنے لگے وہ دماغ پہ زور دے کے اس سیکشن اور صیغہ کا نام یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے، جہاں کے متعلق کہا گیا تھا کہ ان کو وہاں سے اپنی مطلوبہ رقم کا حشر معلوم ہو گا جیسے ہی ان کو نام یاد آیا انہوں نے ایک چپراسی کو دیکھا جو خاکی کپڑے پہنے تھا اور اس کی وردی پر پیتل کے بڑے بڑے بٹن چمک رہے تھے وہ ڈرتے ڈرتے اس کے قریب گئے۔ اور بڑے ادب سے بولے "زحمت نہ ہو تو صیغۂ مصارف کا پتہ بتا دیجئے" چپراسی نے نہایت اکڑ کے اپنی انگلی سے برآمدے کے آخری حصے کی طرف اشارہ کیا مگر منہ سے کچھ نہ بولا جیسے وہ منہ کھول دیتا تو موتی گر جاتے۔ اس کے باوجود چچا امین نے اس کا شکریہ ادا کیا اور زیر لب بڑبڑاتے آگے بڑھ گئے۔

"بھلا صیغۂ مصارف سے ہمیں کیا مطلب! ہم اپنے گھر ہی اچھے تھے نہ حکومت سے سودا کرتے نہ ہم اس مخمصے میں پڑتے۔ مگر اب چارہ ہی کیا ہے۔ اللہ کو یہی منظور تھا بہر حال شکر ہے مالک کا برے حال میں بھی صرف اللہ ہی کا شکر ادا کیا جاتا ہے"

چپراسی نے جس کمرے کی طرف اشارہ کیا تھا وہاں پہنچ کر وہ ٹھہر گئے، اس پر پیتل کی ایک تختی لگی تھی جس پر سیاہ حرفوں میں لکھا تھا۔ "صیغۂ مصارف" وہ اندر جانا ہی چاہتے تھے کہ انہیں دروازے پر ایک اور بورڈ نظر آیا۔ "اندر آنا منع ہے حسب الحکم جناب سکرٹری صاحب بہادر وزارت مالیات" چچا امین نے مبہوت ہو کے اس تختی کو دیکھا اور اپنے آپ سے پوچھنے لگے "تو بھلا اب ہم اپنی رقم کہاں سے حاصل کریں؟ یہاں قدم رکھنا ہی منع ہوا؟ وہ کمرے کے سامنے ٹہلنے لگے۔ الجھن میں ان کا دل تو چاہا کہ الٹے پاؤں واپس ہو جائیں مگر پھر انہیں یاد آیا کہ سرکار ان کے دس ہزار روپے یا اس سے زیادہ کی مقروض ہے اور اس کو چھ مہینے سے زیادہ ہو چکے ہیں۔ اور پھر ان کے گاہکوں میں سے بعض سرکاری ملازمین نے یہ بھی بتایا تھا کہ اگر وہ اپنی رقم کے لئے دوڑ دھوپ نہیں کریں گے تو شاید برسوں کے بعد ان کے ہاتھ کچھ آ سکے۔ وہ بھی اگر خدا کو منظور ہو تو۔ وہ سوچنے لگے کہ اب کیا کیا جائے۔ ایک لڑکی کی شادی کے بعد دے سکے بھی قم تو اب ...

سوال یہ تھی یہ سنیں تو پھر کیا ان کو دکان بند کر دینے پڑے گی؟ دیکھا جائے گا جو ہوگا یہ سوچ کر ان کو غصہ آگیا۔ انہوں نے طے کر لیا کہ وہ صیغہ مصارف و ادائی کا دروازہ کھول کر گھس جائیں گے۔ دیکھا جائے گا جو کچھ بھی ہو..........
اور سرکار ان کے ساتھ جو بھی سلوک کرے............!

انہوں نے ابھی دروازے کو ہاتھ لگانے کا ارادہ کیا تھا کہ ہمت چھوٹ گئی۔ اور بے اختیار انکی زبان پر ــــــ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ــ جاری ہو گیا وہ اس شیطان کو برا بھلا کہنے لگے جس نے ان کو بہکایا تھا کہ بلا اجازت حکام کے دروازے میں داخل ہو جائیں۔ دروازے کے قریب گئے اور چپکے سے بولے "براہِ مہربانی" ان کو ڈر تھا کہ وہ بگڑ نہ جائے یا اس کی طبع نازک پر کچھ گراں نہ گذرے۔ فراش نے اپنی لال لال آنکھیں اوپر اٹھائیں اور زور سے بولا "کیا ہے جی؟" اور چچا امینؔ نے نہایت لجاجت سے کہنا شروع کیا۔

"جی بات یہ ہے کہ میری رقم یہاں باقی ہے..........میں چاہتا ہوں کہ..........

ان کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی وہ بول اٹھا۔

"اندر جاؤ جی اندر۔ وہاں جا کے دریافت کرو" اور وہ پھر آنکھیں بند کر کے اونگھنے لگا۔

چچا امین نے ایک دفعہ پھر اس بڑی تختی کی طرف دیکھا جس پر بحکم عالیجناب سکریٹری صاحب اندر جانے کو منع کیا گیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ فراش کو جگا کے اس تختی کی طرف متوجہ کریں۔ مگر وہ ہمت کر کے دروازے کے اندر داخل ہو ہی گئے۔ انہیں فی الجملہ سکون حاصل ہوا اس لئے کہ انہیں بالکل گمان نہ تھا کہ اندر جانے کا مرحلہ اتنی آسانی سے طے ہو جائے گا۔ انہوں نے غور کیا تو وہ ایک بڑے ہال میں کھڑے تھے جس کے دونوں طرف میزیں لگی ہوئی تھیں۔ اور بیچ میں ایک جیبہ آدمی بیٹھا تھا جس کے بال سفید ہو چکے تھے۔ انھوں نے پہلے نظر بھر کے اس کو دیکھا پھر ان کی نظر اس تختی پر پڑی جو اس کے سر کے اوپر دیوار میں لگی تھی۔ جس پر نہایت خوشنما الفاظ میں لکھا تھا۔

"ہمارا وقت صرف کام کے لئے ہے"

پھر انہوں نے اس آدمی کو دیکھا جو صبح کا ایک اخبار سامنے رکھے اس کے مطالعہ میں محو تھا.......چچا امینؔ نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو ایک میز پر دو آدمی کچھ لکھا رہے تھے۔ اور تیسرا چائے پی رہا تھا۔ اور سگریٹ کا کش بھی لگاتا جا رہا تھا۔ دو میزیں خالی پڑی تھیں۔ پھر ان کی نظریں اس تختی پر مرکوز ہو گئیں اور وہ اسے پڑھنے لگے۔ "ہمارا وقت صرف کام کے لئے ہے!" وہ بہت حیران ہوئے اور بڑے صاحب کی طرف بڑھے میز کے قریب پہنچ کے وہ چپ کھڑے ہو گئے ان کو انتظار تھا کہ بابو صاحب اخبار بینی ختم فرمائیں تو وہ کچھ عرض کریں۔ کافی وقت گذر گیا اور چچا امینؔ کے سینے میں گھٹن ہونے لگی مگر وہ قابو میں رہے اور انھوں نے اس ڈر سے کچھ نہیں کہا کہ شاید صاحب لوگ برا مانیں؟ آخر اس شخص نے اخبار تہہ کر دیا۔ اور کرسی پر جم کر بیٹھ گیا۔ چچا امینؔ نے اطمینان کا سانس لیا اور کچھ پوچھنا ہی چاہتے تھے کہ وہ بولا "بڑی حیرت کی بات ہے" اور چچا امین گھبرا گئے وہ سمجھے کہ اب یہ آدمی ان کے اندر آنے پر ان کو ڈانٹے گا۔ کہ انہوں نے کیسے اس مقدس اور متبرک کمرے میں گھسنے کی جرأت کی؟ انھوں نے کھسک جانے کی سوچی۔ مگر وہ بزرگ وار پھر کہنے لگے "واقعی عجیب بات ہے کہ کل رات کو نو بجے تک میرے ساتھ تھا اور آج صبح میں اس کے مرنے کی خبر دیکھ رہا ہوں"!

بیچارہ اسمٰعیل بیگ۔ ہم دونوں اسکول کے ساتھی ہیں ہم دونوں ایک ساتھ سوڈان گئے تھے! ہم ایک ساتھ ایک ہی کلاس میں تھے۔ وہ خوش قسمت تھا اونچا چڑھتا چلا گیا۔ اور میں رہ گیا۔ بیچارہ اسمٰعیل بیگ! بلکہ بیچارہ تو میں ہوا۔ مگر نہیں اب تو اسی کو بیچارہ کہنا چاہیے! وہ اپنے ساتھ کیا لے گیا۔؟ خدا کی قسم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا ہم سب کو فریب دے رہی ہے اب یہی دیکھو کہ اسمٰعیل بیگ اور میں..........!"

اور یونہی وہ قصہ بیان کرتا رہا۔ دہراتا رہا۔ اور آدھ گھنٹہ گذر گیا اور چچا امینؔ کھڑے کوفت کھاتے رہے ان کی جھنجلاہٹ کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ مجبوراً اس شخص کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ جہاں سب سر ہلاتے ان کو بھی اسی طرح سر ہلانا پڑتا۔ جہاں دوسرے مسکراتے یا افسوس کرتے وہاں ان کو بھی وہی کرنا پڑتا۔ آخرکار جب یہ داستان ختم ہوئی تو ان بزرگ نے گویا حیرت سے اپنے سامنے کھڑے ہوئے آدمی کو دیکھا جیسے اب تک وہ اس کے وجود سے لاعلم تھے اور بولے:۔

"جی فرمائیے!"

اور چچا امینؔ نے گھبراہٹ کے لہجہ میں اپنی رام کہانی سنانی شروع کی

"چھ مہینے پہلے سرکار نے مجھ سے کچھ مال خریدا تھا........"
اور بابو صاحب نے انگلی سے دور دالان کی طرف اشارہ کرکے کہا "وہاں ــــ!"
اور چچا امین اس میز کے قریب پہنچے۔ جس پر بیٹھے بزرگ فائلوں میں کھوئے ہوئے تھے اور میز پر فائلوں کے ڈھیر کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ان کے سر کے اوپر بھی ایک تختی لگی تھی۔ جس پر لکھا تھا:
"براہِ کرم مصروف کارکنوں سے استفسارات نہ کئے جائیں"
یہ دیکھ کر چچا امین حیرت سے اپنی جگہ جم گئے۔ وہ بابو صاحب بھی اپنے کام میں مصروف رہے اور انہوں نے چچا کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ٹیلیفون کی طرف بڑھے اور ڈائل گھمانے لگے اور چچا امین اس کو حیرت سے دیکھتے رہے۔ یکایک اسکی باچھیں کھل گئیں اور وہ بولنے لگے:-

"ہیلو! ہیلو! صبح بخیر لو! تم کل کہاں تھیں؟ جہنم میں تھیں۔ لال جہنم میں؟ ہا ہا ہا! اس شہر اور جہنم میں کیا فرق باقی ہے! جانِ من تم سے زیادہ دور رہنے کی تاب باقی نہیں ہے........"
اور چچا امین کی نظر ٹیلی فون کے قریب لگی ہوئی تختی پر پڑی "صرف سرکاری بات چیت کے لئے" اور جب وہ بابو صاحب نہایت طویل "سرکاری بات چیت" کے بعد پھر اپنی میز پر واپس آگئے تو چچا امین نے ایک طویل سگریٹ انکی خدمت میں پیش کی۔ مگر وہ متوجہ ہوئے بغیر فائلیں الٹ پلٹ کرنے لگے۔ یہ دیکھ کر چچا امین صبر نہ کر سکے اور بولے:-
"حضور والا سرکارِ عالی میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں"
اور سرکارِ عالی اپنی کرسی پر اکڑ کر بولے۔
"جی فرمائیے جناب"!
اور چچا امین نے ادب سے عرض کرنا شروع کیا۔
"بات یہ ہے حضور کہ چھ مہینے قبل حکومت نے مجھ سے کچھ مال خریدا تھا۔ یہ آپ کا خادم امین عبدالعالی ہے اور وہ آپ کی خدمت میں یہ پوچھنے آیا ہے کہ......"
صیغۂ محفوظات سے دریافت کیجئے"
اور چچا امین بکتے جھکتے کمرے سے باہر نکلے۔ وہ اس روزِ سیاہ پر لعنت بھیج رہے تھے جس کی بدولت...... اور بات صیغۂ محفوظات پر چھوڑ گئے۔ اور وہاں پہنچ کر پھر انہوں نے دروازے پر وہی تختی دیکھی "اندر آنا منع ہے" مگر انہوں نے اس کی کوئی پروا نہیں کی ان کو معلوم ہو چکا تھا کہ سرکاری دفتروں کی تختیاں ویسی ہی ہوتی ہیں جیسے دکانوں پر لکھی ہوئی مقررہ قیمتیں جن کا آویزاں کرنا بھی ضروری ہے اور ان کی پابندی کرنا بھی مقصود نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ دروازہ کھول کے داخل ہی ہو گئے اندر بہت سے لوگ بابوؤں کے سامنے بیٹھے فائلوں سے الجھ رہے تھے اور دیوار پر تختی لگی تھی کہ "براہ کرم سرکاری فائلوں کو ہاتھ مت لگائیے"۔ یہ دیکھ کر چچا امین کو کچھ نئی سوجھی اور انہوں نے جیب سے قلم نکال اس تختی پر یہ الفاظ بڑھا دیئے "حسب الحکم سیکرٹری صاحب بہادر" اور تختی سے ذرا دور ہٹ کے انہوں نے اس کو جی بھر کے دیکھا اور بولے: "اب ہوئی یہ تختی پوری" اس کے بعد وہ بیٹھے ہوئے بہت سی کلرکوں کی صورت دیکھتے آگے بڑھے یکایک ان کی نظر کلرک پر پڑی آگے بڑھ کر انہوں نے اس کو سلام کیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بڑی مسرت سے سلام کا جواب دیتے ہوئے بولا۔
"چچا امین آپ یہاں کیسے؟"
اور چچا نے اپنے آنے کی وجہ بتائی تو وہ یہ کہہ کے اٹھ کھڑا ہوا۔
"آپ ٹھہریئے میں ابھی آتا ہوں"
تھوڑی ہی دیر میں وہ واپس لوٹا اور بولا۔
"آپ کے کاغذات فائنس سیکرٹری کے ملاحظہ میں ہیں"
"شکریہ! مگر کیا وہاں کاغذات کو دیر لگتی ہے؟"
"صاحب معاملہ اپنی اپنی قسمت کا ہے"
"اگر معاملہ قسمت کا ہے تو پھر اطمینان ہے۔ اللہ ہم کو اور کہیں سے دیکھا جانے دیجئے"!
یہ سن کر وہ بابو ہنسنے لگا اور بولا۔
"گھبرائیے نہیں بہت جلد آپ کو چیک پہنچ جائے گا" چچا امین کو سلام کرکے رخصت ہوئے۔ واپسی میں جیسے برآمدے میں سے گزر رہے تھے تو انکی نظر ایک بورڈ پر پڑی۔ جس پر لکھا تھا: "سکرٹری مالیات"
ان کے دل میں خیال آیا کیوں نہ سکرٹری صاحب سے ملاقات کی جائے؟ چل کے کہا جائے کہ صاحب خدا کے لئے ان کاغذات کو تو دیکھئے۔ اور پھر چچا اپنے خیال پر دل میں خوش ہوتے ہوئے اس کمرے کی

بڑھے۔ دروازے پر وہی تختی لگی تھی۔ "اندر آنا منع ہے" انہوں نے مسکرا کے اسے دیکھا جیسے وہ کہہ رہے ہوں۔

"میں تمہاری وقعت سے خوب آگاہ ہوں" اور دروازے کو دھکا دے کے وہ اندر چلے گئے۔ انہوں نے باہر کھڑے ہوئے دونوں چپڑاسیوں کا بھی کچھ نوٹس نہیں لیا۔ مگر ابھی وہ کمرے میں ایک دو قدم ہی چلے ہونگے کہ باہر گھنٹی بجی اور ان کو اپنے کاندھے پر ایک ہاتھ کی گرفت محسوس ہوئی، پھر دوسرے کاندھے پر بھی اور وہ چشم زدن میں دروازے سے باہر تھے۔ برآمدے میں پہنچ کر کسی نے ان کے سینے میں ہاتھ مارا۔ کسی نے ان کا شانہ پکڑ کے جھٹکا دیا۔ کوئی چیخا۔ "پاگل ہو گیا"۔ کوئی غرایا۔

"ابے بلا اجازت اندر کیسے گھس گیا تھا"؟

چچا امین بڑے صبر سے یہ توہین برداشت کرتے رہے اور جیسے ہی موقع ملا وہاں سے بھاگ لیئے۔ جب وہ سیکرٹریٹ سے باہر قدم رکھ رہے تھے تو انہوں نے سوچا "سرکار بھی عجیب ہوتی ہے اور سرکاری تختیاں بھی اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ خدا غارت کرے اس روز سیاہ کو جس دن سرکار نے........"

(مصری افسانہ) (بشکریہ حمایت اسلام)

طالب جانی •

سالِ نو

منصب و درد و فوق کا ہنگام لایا سالِ نو
اے مسلماں عشق کا پیغام لایا سالِ نو

اک نیا دستورِ صبح و شام لایا سالِ نو
کج کلا ہو گردشِ ایام — لایا سالِ نو

اپنے دامن میں نئے عزم و یقیں کی وسعتیں
مرحبا پھر زیست کے احکام لایا سالِ نو

بادۂ وحدت کے متوالوں کو بتلا دیجئے
جام ہائے بادۂ گلفام لایا سالِ نو

سرخیٔ خونِ شہیداں کہہ رہی ہے ہم سے کیا
کربلا سے کیا ہمارے نام لایا سالِ نو

سطوتِ باطل سے مومن خوف کھا سکتا نہیں
نقش ہائے جذبۂ اسلام لایا سالِ نو

کٹ گئی گردن جھکی لیکن نہ پیشِ اقتدار
عظمتِ شبیرؓ کا پیغام لایا سالِ نو

کشتِ دیں کی تازگی اور خونِ اولادِ علیؑ
صبحِ خنداں اور گریاں شام لایا سالِ نو

آج پھر درکار طالبؔ جراتِ شبیر ہے!
خیر و شر کا پھر وہی ہنگام لایا سالِ نو!

شبنم سبحانی •

ترے قصرِ نغمہ خواں کے در و بام لوٹ لیں گے
یہ وہ تشنہ لب ہیں ساقی خم و جام لوٹ لیں گے

جو شگفتِ گل پہ پہرے سے بٹھا رہے ہیں ہم ہم!
ترا اے نسیمِ گلشن! وہ خرام لوٹ لیں گے

ہیں بہار ایسے غنچے، تجھے آنکھ پر بٹھا لیں
اے خزاں ہم ایسے گل ہیں ترے دام لوٹ لیں گے

مرے راستے کے خاروں نے یہ مشورہ کیا ہے
جو ہے دامنوں میں میرے وہ پیام لوٹ لیں گے

اے نظامِ غم کے شعلے یہ فسوں نہ اب چلے گا
تری صبح لوٹ لیں گے تری شام لوٹ لیں گے

یہ شکستہ بال طائر جو قفس بھی دیکھ آئے!
غمِ زندگی کی بڑھ کر یہی شام لوٹ لیں گے

مری چاک دامنی کی وہ ہنسی اڑا لیں شبنمؔ
مرے اشکِ غم کا کیسے وہ مقام لوٹ لیں گے

(معار)

ممتاز شیریں

آل سس ٹس

(ALCESTES)

اس نے اوپر دیکھا۔

سیڑھیاں بہت اوپر تک چلی گئی تھیں۔ کشادہ، سفید، شفاف، چمکتے ہوئے زینے۔ یہ زینے ان اُجلے کمروں تک لے جاتے تھے جو روشنی میں نہائے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ وہاں اوپر روشنی تھی۔

وہ نیچے کھڑے تھے۔ ایک مرد۔ اور ایک عورت۔ مرد نے اوپر دیکھا۔ سیڑھیاں بہت اوپر تک چلی گئی تھیں۔ .... نہیں، وہ اس حالت میں سیڑھیاں چڑھ نہیں سکے گی۔

اس نے نرمی سے کہا "میں تمہیں اٹھا لے جاؤں گا۔ تم چڑھ نہیں سکو گی۔"

وہ شرما گئی۔ "نہیں نہیں۔ تو یہ، سوچو تو، مجھے اٹھا لے جاؤ گے؟ اتنے سارے آدمی جو کھڑے ہیں۔ کیا کہیں گے؟ ——"

"مجھے پروا نہیں ...." اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنے بازوؤں پر اسے اٹھانا چاہا۔ لیکن وہ پرے ہٹ گئی۔

"اچھا خیر، میرا سہارا تو لے لو۔" اس نے شانوں کے گرد بازو کو ڈال کر اسے مضبوطی سے تھام لیا اور سہارا دے کر آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھانے لگا۔

ساتھ ساتھ وہ دونوں اوپر چڑھنے لگا۔ یہ زینے، سفید شفاف چمکتے ہوئے، ان اجلے کمروں تک لے جاتے تھے جو روشنی میں نہائے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ وہاں اوپر روشنی تھی، جہاں، زندگی جنم لے رہی تھی۔

اس کے جسم میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ وہ چند زینے طے کرتی تو درد کی شدت سے تڑپ تڑپ جاتی۔ ریڑھ کی ہڈی میں، گہرائیوں میں، پیٹ میں ناقابلِ برداشت ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اس کے سارے جسم میں تھرتھراہٹ طاری تھی۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے بہہ رہے تھے۔

اس نے بڑی نرمی سے دلاسا دیا۔ "جلدی ہی سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اپنے سارے جسم کا بوجھ مجھ پر ڈال دو۔ تمہیں چڑھنے میں آسانی ہوگی ہاں، یوں ...."

عورت نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اپنا سر مرد کے شانوں پر ڈال دیا۔

آہستہ آہستہ چڑھتے ہوئے، وہ دونوں اوپر پہنچ گئے۔ نرسیں اسے اندر لے گئیں اور اس سے کہا گیا کہ وہ باہر بیٹھ کر انتظار کرے۔

وہ باہر بنچ پر بیٹھا رہا۔ یہ سب اتنے جلدی کیسے ہو گیا۔ اسے بالکل خیال نہ آیا تھا کہ اتنی جلدی ..... ہاں یہ تو وقت سے پہلے ہی تھا۔ وہ شام تک بالکل اچھی تھی۔ وہ حسبِ معمول بے حد تھکا ہوا گھر لوٹا تھا۔ وہ دروازے پر آئی اور ایک نرم شفقت بھری تسکین دہ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا تھا۔ اسے اس قدر پژمردہ دیکھ کر وہ دکھی ہو گئی تھی۔ پھر حسبِ معمول وہ پانی کا گھڑا لے آئی اور اس کے ہاتھ پاؤں دھلانے کی خدمت گزاری تھی۔ اس کے سینے میں تشکر اور محبت کے جذبات امڈ آئے۔ اس کا جی چاہا وہ کچھ دیر اس کے پاس بیٹھی رہے۔ پیار سے اچھے دنوں کی باتیں کرے۔ لیکن وہ اصرار کرنے لگی کہ وہ پہلے کھانا کھا لے۔ وہ چوکی پر آ کر کھانے پر بیٹھا۔ ہمیشہ کی طرح وہی روکھا سوکھا کھانا۔ وہ رسوئی میں گئی شاید کچھ اور لانے کے لئے۔ اور اچانک اس نے دیکھا وہ چکرا کر وہیں بیٹھ گئی۔ وہ کھانا چھوڑ کر اس کے پاس بھاگا۔ اس نے نہایت بیقراری اور کرب سے پوچھا کہ اسے اچانک کیا ہو گیا ہے۔ وہ ٹالتی رہی اور انکار کرتی رہی کہ اسے کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ وہ ہمیشہ اسی طرح اپنی تکلیف اس سے چھپاتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کرب تھا۔ اس کے چہرے پر بار بار کرب کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ اور وہ بار بار اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیتی تھی تاکہ اس کی تکلیف دیکھ کر وہ پریشان نہ ہو۔ پھر بڑی مشکل سے اس نے بتایا کہ شاید

دستخط ہو گئے ہیں۔ وہ حیران رہ گیا۔ اور تانگہ کر کے اسے فوراً یہاں لے آیا۔ خدا کرے سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔ جب وہ سہارا دے کر اسے اوپر چڑھا رہا تھا، وہ اس کے بازوؤں میں کس طرح کانپ رہی تھی!

وہ لیبر وارڈ میں پڑی تھی۔ اب درد ناقابلِ برداشت تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور ہر دفعہ درد پہلے سے زیادہ شدید ہوتا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی پڑ رہی تھیں۔ وہ اپنا نچلا ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ چیخوں اور کراہٹوں کو روکنے کے لئے وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس کی چیخوں کو سنے۔ وہ بہت پریشان ہو گا۔ مرد ایسی حالت میں بہت پریشان ہو جایا کرتے ہیں۔

وہ بند دروازے کے قریب کھڑا تھا۔ مضطرب اور پریشان۔ اس پہ ایک دیوانگی سی طاری تھی۔ کبھی وہ بیتاب ہو کر ٹہلنے لگتا۔ پھر آ کر بنچ پر بیٹھ جاتا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے خلا میں گھورتا۔ اس کی آنکھیں کچھ دیکھ نہیں رہی تھیں۔ لیکن اس کے کان دروازے پر لگے تھے۔ اندر سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی، مکمل خاموشی۔ ایک ناقابلِ بیان درد نے اس کے دل کو جکڑ لیا۔ کتنی کمزور تھی وہ! کیا وہ اس زندگی اور موت کی کشمکش میں زندہ بچ نکلے گی؟ اس نے دل کی گہرائیوں سے دعا مانگی خدا کے حضور جو موت و حیات کا مالک ہے۔ کاش وہ اس دفعہ بچ جائے .... کاش او خدا .... اس نے پھر دروازے سے کان لگا کر سنا، کوئی آواز نہیں آ رہی تھی .... ممکن ہے وہ ٹھیک ہے۔ وہ ہمیشہ صبر سے اس زندگی اور موت کی کشمکش کو طے کر جاتی۔ یہ سوچ کر اسے تسلی ہوئی اور وہ بنچ پر جا بیٹھا۔

وہ خاموشی سے ناقابلِ برداشت تکلیف سہتی رہی ...... یہاں تک کہ اس میں تکلیف سہنے کی سکت ہی باقی نہ رہی۔ وہ بیہوش ہو گئی۔ انتظار، اذیت ناک انتظار جیسے وقت ٹھہر گیا ہو، ان چند لمحوں کی اذیت میں زندگی بھر کے درد کا نچوڑ تھا۔

اندر وہ ابھی تک بیہوش پڑی تھی۔ بچہ بہت چھوٹا تھا۔ اس کے نحیف سینے میں رمق بھر جان باقی تھی۔ نانت سے آنول کی نلی کاٹتے کاٹتے میں وہ خاموش ہو گیا۔ اسے اب کچھ ہوش آ گیا تھا۔ اس نے بچے کے متعلق پوچھا بھی نہیں۔ اس کی کسی چھپی ہوئی حس نے یہ جان لیا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ نرس نے اسے آہستہ سے بتایا۔ بچہ مر چکا ہے۔ اسے تسلی دی کہ آٹھویں مہینے میں جو بچے پیدا ہوتے ہیں وہ عموماً زندہ نہیں رہتے۔ نرس نے بچے کو اٹھا کر دکھایا۔ اس نے ایک نظر دیکھا۔ نازک نقش، زرد چہرہ، سوکھا ہوا بے جان جسم، اس نے آنکھیں پھیر لیں۔ ان آنکھوں سے دو خاموش آنسو گرے اور محبت اور ممتا کی وہ گرم گرم دھارا جو نئے سرے سے ابل کر اس کے سینے میں بہہ آئی تھی۔ سرد ہو کر منجمد ہو گئی۔

اس کی بیقرار نگاہیں دروازے کی طرف لگی تھیں۔ دروازہ کھلا اور نرس باہر آئی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور پاگلوں کی طرح نرس کو گھورنے لگا۔ اس سے کچھ پوچھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ نرس نے بتایا کہ بچہ مر چکا ہے اور تسلی دینے لگی۔ "آٹھ مہینے کے بچے ...." لیکن بچے کا اسے خیال نہیں آیا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں ایک ہی بات تھی کاش وہ بچ گئی ہو، کاش وہ بچ گئی ہو۔! اس نے پاگلوں کے سے انداز میں نرس سے پوچھا۔

"اور میری بیوی"؟ پھر جواب کا انتظار کئے بغیر اندر گھسنے لگا۔ نرس نے اسے ڈانٹ کر روکا "کہاں جا رہے ہو؟ تم ابھی اندر نہیں جا سکتے کافی لے آؤ اپنی بیوی کے لئے۔"

بیوی کے لئے کافی! تو وہ زندہ ہے۔

جب وہ کافی لے آیا۔ اسے دوسرے وارڈ میں پہنچا دیا گیا تھا وہ بستر پر خاموش نڈھال پڑی تھی۔ اس کا ٹھنڈا بھیگا سا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس نے نرمی سے پوچھا "اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" اس کے لبوں پر ایک کمزور مسکراہٹ نمودار ہوئی "اچھی ہوں پر اس دفعہ کمزوری بہت تھی۔ جوڑ جوڑ درد کر رہا ہے۔"

شفقت اور ترحم سے وہ اس کے کمزور جسم کو دیکھتا رہا۔ اس نے بچے کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ یہی بہتر تھا۔ وہ بچ گئی تھی، اور اس سے زیادہ اسے کیا چاہیئے تھا؟

دوسری صبح وہ بچوں کو بھی ساتھ لیتا آیا۔ وہ انکی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ بچے ماں کے پلنگ کو گھیر کر کھڑے ہو گئے اور وہ بھی پاس بیٹھا رہا۔

آج اس کی طبیعت کچھ بہتر معلوم ہو رہی تھی۔ اپنے ننھے بچوں کو اور اپنے محبوب شوہر کو یوں پاس دیکھ کر اس کا جی خوش تھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ اس کے لئے بہت بے چین، بہت پریشان ہے۔ اسے تسکین دینے

کے لئے وہ پلنگ سے اسکرائی اور اس کی طرف دیکھتی رہی۔ ان آنکھوں سے
جن میں ایک خاموش پرستش تھی۔

ان دونوں میں کوئی جسمانی کشش نہ تھی۔ حسن نہ تھا، نوجوانی میں جو ذرا سی کشش ان میں تھی وہ غربت نے چھین لی تھی۔ اس کا رنگ سیاہ ہو گیا تھا۔ اس کا سوکھا مارا جسم بوسیدہ، ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں چھپا رہتا تھا۔ اس کی آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں، اور گال پچکے ہوئے تھے اور وہ موٹی موٹی پھیکے رنگ کی ساریاں پہنے رہتی تاکہ چولھے کے پاس وہ میلی نہ دکھائی دیں۔ چوٹی کنگھی کئے بغیر دن بھر کام میں مصروف رہتی اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا تھا۔ آنکھوں کے گرد کالے حلقے پڑ گئے تھے اس کی عمر پچیس چھبیس سال کی ہوگی، اور ابھی سے وہ ادھیڑ دکھائی دینے لگی تھی۔ .... نہ جانے وہ کیا چیز تھی جس نے ان کو کھینچ کر ایک دوسرے کے قریب کر دیا تھا۔ یہ کشش ظاہری حسن اور جسمانی کشش سے کہیں زیادہ گہری تھی۔

ماں باپ نے اور مذہب نے ان کا سمبندھ کر دیا اور وہ ایک دوسرے کے ہو گئے، وہ جانتی تھی کہ شوہر کی پرستش کرنی چاہیے اس کی خدمت کرنی چاہیے۔ اور وہ اس کی پرستش کرنے لگی۔ خدمت کرنے لگی، اور محبت کی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ اور وہ جانتا تھا کہ ایک کمزور سی ہستی اس کے سپرد کی گئی ہے، اس کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کرے۔ اس کا ہر طرح خیال رکھے، اس کے لئے کمائے، اسے سہارا دے، اور اسے چاہے، یہ کمزور ہستی جو زندگی میں اس کا ساتھ دے گی، اس کا گھر سنبھالے گی اور اس کے بچوں کی ماں ہوگی۔ اور اسی طرح ان کے دل مل گئے تھے، وہ ایک دوسرے کو چاہنے لگے برسوں کی رفاقت نے ان کی محبت کو گہرا کر دیا تھا۔ برسوں کے ساتھ نے اور ان ننھے ننھے بچوں نے ان کے درمیان اس سمبندھ کو مضبوط کر دیا تھا۔

اس کے بچے اسے گھیرے ہوئے کھڑے تھے اور بڑی بیتابی سے سوال کر رہے تھے: "ماں تمہارا جی اچھا نہیں، ماں؟" "بخار ہے؟" ایک بچے نے اس کی پیشانی چھو کر دیکھا اور سب سے چھوٹے بچے نے پوچھا "درد کہاں ہے ماں، بتاؤ، میں چوم لوں گا تو اچھا ہو جائے گا نا؟" اور وہ اسے چومنے لگا اس کے سینے میں حسرت پھوٹ پڑی۔ کتنا پیار کرتے ہیں یہ بچے .... یہ ننھے جنہیں اس نے اپنے خون سے سینچا اپنی کوکھ سے جنم دیا ہے ....

آخر اس نے زندگی میں کیا سکھ پایا، غربت، بھوک، مصیبت اور کام، لمحہ بھر کا چین نصیب نہیں۔ بس یہ بچے تھے جو اس سے پیار کرتے تھے۔ یہ شوہر جو اس کا اتنا خیال رکھتا تھا۔ بچوں کا پیار اور شوہر محبت، یہی تو اس کی زندگی کا سرمایہ تھا!

جب وہ جانے لگے تو وہ حسرت سے انہیں دیکھتی رہی۔

دوسری صبح وہ یوں ہی نڈھال پڑی تھی، کل والی شگفتگی غائب تھی اور وہ بالکل ہی زرد اور کمزور نظر آ رہی تھی۔ اتنی زرد کہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا گیا ہے۔ چہرے پر ہلدی کی سی تھی۔ اس نے اس پر جھک کر آہستہ سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ لے لیا۔ اف کتنا سرد تھا وہ ہاتھ! اس نے آہستہ سے پکارا، اس نے اپنی تھکی ہوئی آنکھیں بمشکل کھولیں۔ ان آنکھوں میں ایک ویرانی تھی

ایک نرس اور لیڈی ڈاکٹر وارڈ میں آئیں، نرس نے اس انگوٹھے سے ایک قطرہ خون نکالا۔ اور خون میں ہیموگلوبن کا معائنہ کرنے لگی۔ پھر اس نے ڈاکٹر کو بتایا: "صرف پندرہ فیصدی"۔

"پندرہ فیصدی، صرف پندرہ فیصدی؟" لیڈی ڈاکٹر اس پر برس پڑی: "جانتے ہو تمہاری بیوی کس خطرناک حالت میں ہے حمل کے دوران میں اسے دودھ اور پھل دیئے ہوتے، ٹانک اور ایکسٹریکٹ انجکشن دلائے ہوتے تو آج اس کی یہ حالت نہ ہوتی اور خون میں پندرہ فیصدی ہیموگلوبن! .... اور تم چاہتے ہو کہ جب موت کے منہ میں پہونچ جائے تو اسے ہسپتال پہنچا دو، اور شاید اس کی موت کی ذمہ داری ہم پر ......"

ڈاکٹر کا ہر ہر لفظ ہتھوڑے کی ضرب بن کر اس کے دل پر تھا۔ وہ اس کا خیال نہیں رکھتا؟ ٹانک، انجکشن، دودھ، پھل۔ ایک کلرک اپنی بیوی کے لئے یہ سب کہاں سے مہیا کر سکتا تھا؟ اگر کے بس میں ہوتا تو وہ اس کے لئے کیا کچھ نہ کرتا؟ اور اب اس کی حالت خطرناک ہے، وہ موت کے منہ میں .... اور خدا ....

ڈاکٹر کی سخت کلامی کو نظر انداز کر کے اس نے ملتجیانہ لہجے

کہا "ڈاکٹر میں کسی طرح انجکشن کا اور دوسرا خرچ ادا کر دوں گا، میری بیوی کو بچا لو۔"

ہسپتال کا بل چکانے کے لئے اس نے قرض لیا۔ اس نے دفتر کو بس میں جانا چھوڑ دیا۔ سستے سگریٹ بھی پینے چھوڑ دیئے، ان چند پیسوں سے وہ اس کے لئے پھل خرید لاتا، علاج باقاعدہ ہوتا رہا، انجکشن دیئے جاتے رہے۔

لیکن وہ یونہی نڈھال پڑی رہی، اس کے چہرے کا رنگ سفید سے سفید تر ہوتا جا رہا تھا۔ خون کی کمی کی وجہ سے اس کے ہاتھ پاؤں اس قدر سرد ہو گئے تھے کہ ان میں گرمی قائم رکھنے کے لئے ہمیشہ ربڑ کے دستانے اور ساکس چڑھائے جاتے۔ گرم پانی کی تھیلیاں نیچے رکھی ہوتیں۔ اس کے چہرے پر موت کی سفیدی تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا کوئی ان دیکھی ان جانی شے اس کے گرد منڈلا رہی تھی۔

وہ اس کے پاس بیٹھا ہوتا، اس کی آنکھوں کا کرب اس کی اپنی آنکھوں میں منتقل ہو جاتا لیکن وہ اس کرب کو اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہتا......

"تم اچھی ہو جاؤ گی۔ ضرور، میں تمہیں پھل اور دودھ اور ٹانک لا دوں گا۔ میں روپے جمع کر رہا ہوں۔ سچ، تم بالکل تندرست ہو جاؤ گی"

بڑی اداس مسکراہٹ اس کے لبوں پر نمودار ہوتی "ہاں میں اچھی ہو جاؤں گی۔"

ایک لمحے کے لئے وہ خوش ہو جاتا۔ کہ امید کی یہ ہلکی سی آگ اس کی بجھتی ہوئی شمع زندگی کو جلائے رکھے گی۔ پھر وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھتا وہی اداس مسکراہٹ لبوں پر لئے وہ اسے تک رہی ہوتی اور یکایک اسے معلوم ہو جاتا کہ یہ مسکراہٹ اس کی تسلی کے لئے ہے ورنہ اس کی آنکھوں میں امید کی چمک کبھی کی بجھ چکی ہے۔

اور آخر وہ رات آئی جو اس کے لئے قیامت کی رات تھی۔

وہ جو ہر تکلیف کو اس خاموشی سے سہ جاتی تھی، بے بسی سے کراہنے لگی۔ وہ اس بے کسی سے، اس کرب سے کراہ رہی تھی کہ وہ جان گیا کچھ ہونے والا ہے۔

اس نے نرسوں سے منت کی کہ آج رات یہیں رہے گا لیکن انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ یہ ہسپتال کے قانون کی خلاف ورزی تھی۔ اس نے اپنی بیوی کے لئے اسپیشل وارڈ تھوڑے ہی لیا تھا کہ اسے رات بھر رہنے کی اجازت دی جاتی؟

وہ کراہتی رہی اور تڑپتی رہی۔ دوسرے وارڈ کی نرس آ کر اسے ڈانٹنے لگی: "تمہیں احساس نہیں کہ دوسرے وارڈز کے مریضوں کی نیند خراب ہو گی۔ کیوں چلائے جا رہی ہو؟"

اس وارڈ کے مریض صاف کیوں نہیں کہتی کہ اسپیشل وارڈ کے مریض "چندہ چندہ" جنکے پاس دولت ہے اور ان دونوں سے ایسا سلوک روا رکھا گیا تھا۔ کیوں کہ وہ ان "چندہ چندہ" میں سے نہ تھے، وہ مفلس تھے! اس نے بے حد تلخی سے سوچا۔

اس رات گھر جاتے ہوئے اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا تھا۔ اس کی بیوی کی کراہیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔ رات بھر وہ جاگتا رہا۔ اس کی بیوی کی آواز، اس بے بسی سے کراہنے کی آواز اسے رات بھر سنائی دیتی رہی۔

صبح وہ پھر خاموش اور پرسکون تھی۔ شاید اس میں اب کراہنے کی بھی سکت نہ تھی۔ یا ممکن ہے اب وہ خطرے سے باہر ہو۔ اس نے امید کا سہارا پکڑا۔ لیکن لیڈی ڈاکٹر نے معائنہ کر کے مایوسی سے سر ہلایا اور اسے باہر بلا کر کہا: "اب صرف ایک ہی امید ہے۔"

"وہ کیا ہے ڈاکٹر؟"

"اس کے جسم میں خون داخل کیا جائے۔"

وہ اپنا خون دینے کے لئے تیار ہو گیا۔ اس کے خون کا معائنہ کیا گیا پھر ڈاکٹر نے اسے تعجب سے دیکھا۔ یہ سوکھا سا انسان اس کے جسم میں بھی کیا خون ہو گا۔ کیا وہ اپنی بیوی کے لئے جس کی بچنے کی امید بہت کم ہے خون دے سکے گا؟ لیکن اس نے ایسی نگاہوں سے دیکھا گویا کہہ رہا ہو "میری بیوی کو اگر میرا خون بچا سکتا ہے تو میں اپنے جسم کا سارا خون دے سکتا ہوں۔"

گرم گرم خون نکالا گیا اور اس کے شوہر کا یہ خون جس کی ایک ایک بوند میں محبت کی گرمی تھی اس کے جسم میں منتقل کیا گیا۔ اس کی ساری رگوں میں اور جسم میں ہلکی سی گرمی دوڑ گئی اور چہرہ پر رونق سی

آگئی۔ وہ خوشی سے پاگل ہو گیا۔

اس کی آنکھیں کھلیں۔ آنکھوں میں بھی اب کچھ چمک سی آگئی تھی تشکر آمیز نگاہوں سے اس نے شوہر کی طرف دیکھا، وہ سب کچھ سمجھ گئی تھی۔ پھر نحیف آواز میں اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کے ہونٹ پھڑ پھڑا کر رہ گئے۔ اچانک اس کی حالت دگرگوں ہو کر رہ گئی۔ چہرہ نیلا پڑ گیا وہ اس پر جھک گیا۔ وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن آواز نہیں نکل رہی تھی۔ انتہائی یاس کے عالم میں اسے یہ بات یاد آئی۔ شاید وہ اپنے بچوں کو دیکھنا چاہتی ہے۔ اس نے اپنی ہمسائی سے کہا کہ بچوں کو لے آئے گھر پاس ہی تھا۔ بچے آگئے۔ اس نے سب بچوں کو باری باری دیکھا۔ چھوٹے بچے کو اٹھانا چاہا لیکن اس کے اٹھتے ہوئے ہاتھ بے بسی سے گر گئے پھر اس نے اپنے شوہر پر نظریں جما دیں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ اسے خدا حافظ کہہ رہی تھی۔

اور پھر سب کچھ ختم ہو گیا۔ ایک زندگی ختم ہو گئی۔

پلنگ کی پٹی پر سر ٹیک ٹیک کر وہ اس کا نام لے کر پکارنے لگا۔ اور پھر اسے خیال آیا کہ یہ ہسپتال ہے اسے ضبط سے کام لینا چاہئے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ کر وہ کرسی پر گر پڑا۔ نیچے باپ کے پاس کھڑے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی ماں کو تک رہے تھے۔ موت کا راز ان کی سمجھ سے باہر تھا۔

اس نے چہرہ پر سے ہاتھ ہٹا لئے، نرسیں اس کے ہاتھ پاؤں سیدھے کر کے اس پر سفید شیٹ اڑھا رہی تھیں۔ سفید شیٹ اور اتنا ہی سفید چہرہ۔ اس کے گرد بکھرے ہوئے کالے بال۔ وہ سکتے کے عالم میں بیٹھا گھورتا رہا اس کے تمام حواس شل ہو گئے تھے صرف اس کے کانوں میں دھیمی دھیمی سی کچھ آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ شاید لیڈی ڈاکٹر تھی جو کہہ رہی تھی "اب رات گذر گئی ہے تم نعش صبح لے جا سکتے ہو۔ اس وقت تک یہ مردوں کے کمرہ میں رکھی جائے گی۔ ویسے بھی تم بعد میں بچا سکتے ہو ہم جو کچھ کر سکتے تھے کر چکے ہیں افسوس ہے تمہاری بیوی۔۔"

نعش لے جانے والی نیچی ذات کی عورتیں چلا رہی تھیں "جب تک پیسے پہلے نہ دیئے جائیں گے ہم نعش نیچے نہیں لے جائیں گے" اور نرسیں آپس میں کھسر پھسر کر رہی تھیں "ہسپتال میں ہم اس کی عادی ہو چکی ہیں۔ مردوں کو دیکھنے سے ہمیں ڈر نہیں لگتا ہے لیکن ذرا اسے دیکھو تو تمہیں ڈر نہیں لگ رہا ہے؟"

اس کی موت میں بھی وہ اس کی توہین کر رہے تھے! وہ اچانک اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی بیوی کے مردہ جسم کو اس نے اپنے بازوؤں پر اٹھا لیا کسی نے اسٹریچر بڑھایا لیکن اپنا ہونٹ کاٹ کر اس نے تلخی سے کہا "اس کی ضرورت نہیں" اور ایک حیرت زدہ مجمع میں سے گذرتا ہوا وہ پیچھے کی سیڑھیوں کی طرف آگیا۔

صرف چند دن پہلے (ابھی کل ہی کی بات تھی) سہارا دے کر سیڑھیاں چڑھاتے ہوئے وہ اسے اوپر لے گیا تھا اور اب اس کے بے جان جسم کو اپنے بازوؤں پر لئے وہ نیچے اتر رہا تھا اس جسم میں کبھی جان تھی! کبھی کیوں؟ ابھی کچھ لمحہ پہلے اور اب موت نے اسے سخت سرد اور بھاری کر دیا تھا یہ جسم اسے محبوب تھا۔ وہ اسے محبوب تھی۔ دس سال تک وہ زندگی میں اس کے ساتھ رہی تھی اور اب ہمیشہ کے لئے اس سے کھو گئی تھی وہ چھوٹی سی تھی جب اس کی دلہن بن کر گھر آئی تھی چودہ سالہ دھان پان سی لڑکی۔ اس کی ماں اس وقت زندہ تھی اور دن بھر بہو کو کام میں جتائے رکھتی تھی۔ جب کبھی اسے فرصت ملتی وہ ماں کی نظر بچا کر دوسرے کمرے میں ملتے وہ اس کے پھول سے ہلکے جسم کو اپنے بازوؤں پر اٹھا لیتا اور گھما گھما کر پلنگ پر ڈال دیتا۔ بہت جلد یہ اچھے دن بیت گئے کام کی زیادتی اور غربت! وہ ہمیشہ بیمار بیمار اور کمزور رہنے لگی۔ وہ اسے زیادہ کام کرنے سے منع کرتے اسکے کمزور جسم کو اپنے بازوؤں پر اٹھا کر اسی پلنگ پر لٹا دیا کرتا۔ اس وقت یہ جسم ہلکا نرم اور گرم تھا۔ اور اب موت نے اسے سرد اور سخت اور بھاری کر دیا تھا۔ آخری بار وہ اس محبوب جسم کو اپنے بازوؤں پر اٹھا رہا تھا۔

وہ اس بے جان جسم کو لئے نیچے اتر رہا تھا۔ اس کے چاروں طرف اندھیرا تھا۔ رات کا اندھیرا۔ "موت کا اندھیرا" یہ تنگ اور تاریک زینے ختم ہونے میں نہ آتے تھے، راستہ بہت طویل اور تاریک تھا۔۔۔ آخری سفر۔۔۔۔۔۔ نیچے نیچے اور نیچے۔

(بشکریہ شاہراہ)

مرزا احسن اتفاق گوجرانوالہ

تحریکِ ادبِ اسلامی

آج حالات کے اُلجھے ہوئے دوراہے پر
میرے احباب نے اک شمع فروزاں کر دی
اک گم کردۂ منزل کے سہارے کیلئے
راہِ تاریک بصد شان چراغاں ــــ کر دی

زندگی آگے بڑھی موت پریشان ہوئی
آج ہر چہرے پہ اُمید کی تابش ہی عیاں
دُور سر کے ہوئے سایوں سے بچا کر دامن
ذہنِ خوددار نے پیدا کیا جنت کا سماں

حسنِ گیتی کو دوبالا کیا دیوانوں نے
جسمِ کمزور سے پھر خونِ جگر دے دے کر!
ذرّے ذرّے کو کیا باغیِ تاریکیِ شب
تابشِ جلوہ و صد نورِ سحر دے دے کر!

زندگی نوحہ بہ لب بیٹھی تھی دوراہے پر!۱
کوئی رہبر کوئی غمخوار نہیں ملتا تھا
راہزن آ کے اسے لُوٹ کے لے جاتے تھے
کوئی الفت کا سزاوار نہیں ملتا تھا

اٹھنے دیتا تھا نہ مظلوم نگاہوں کو کوئی!
ہونٹ ہلنے سے تبسم کو ترس جاتے تھے
جور و آلام کی چکی میں یہ پستے انساں
آخری بار تکلم کو ترس جاتے تھے

بزمِ ہستی میں چھیڑ کے پھر تارِ ربابِ ہستی
میرے احباب نے الفت کے ترانے گائے
روحِ خوابیدۂ انساں کے ہلا کر شانے
عدل و انصاف و حقیقت کے ترانے گائے

۱؎ ادب برائے ادب، ترقی پسند ادب

عبدالکریم شمر

نعرۂ حق

ہے انقلاب کی زد میں ترے چمن کا نظام
مگر زمانہ ہے اب تک اسیرِ دانہ و دام
نئے تقاضے، نئی انجمن، نئے احکام!
تری زباں پہ ہے لیکن حدیثِ بادہ و جام

ابھی تو بربطِ فریاد ہے خموش مرا ــ!
یہ مچ گیا تری محفل میں کس لئے کہرام
گزر رہا ہیں بہاریں، خزاں بھی فانی ہے
ترے چمن کی بقا بھی ہے اک فنا کا پیام

تُو کر تلاش کہیں سے خلوص کی دولت
کہ ہے خلوصِ عمل ہی میں زندگی کا دوام
ہو سوزِ جذب و یقیں، پاسِ آدمیت ہو
یہی ہے آدمِ خاکی کے ارتقاء کا مقام

مری متاعِ نظر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ
تری نگاہ میں چنگ و رباب و بادہ و جام
فقیہہ و زاہد و صوفی تو رہ گئے محرم!
مگر ہے رندِ بلاکش پہ بارشِ الہام

جلا رہا ہوں ابھی تک خیال کی قندیل
بہار و بُو کا فسانہ نہیں ہے میرا کلام

(حمایتِ اسلام)

مقیت الحسن رضوی

رہبر

اپنی منزل پہ تھوڑی دیر قیام کرنے کے بعد میں باہر نکل آیا اور گام بگام ٹہلتا ہوا کچھ دور جا نکلا۔

"منزل تو خیر پرانی ہے۔ لیکن مسافر نیا" میں نے سوچا اور پلٹ کر منزل کی طرف دیکھا۔

"ابھی اس کے گنبد اور مینار نظر آ رہے ہیں" میرے نفس نے مجھے دھوکا دیا اور اس حسین فضا کی سحر انگیز رعنائیوں نے جو رنگ و نور کے ساغر چھلکا چھلکا کر مستی و سرور کے چشمے بہا رہی تھیں مجھے مجبور کیا کہ چند قدم اور آگے بڑھوں۔ اور میں انھیں ہوش و خرد شکار نظاروں میں کھویا ہوا چلتا رہا چلتا رہا ——— یہاں تک کہ بہت دور نکل آیا ——— پھر یکایک خیال آیا "منزل" اور اس بار جو پلٹ کر دیکھا تو منزل حد نگاہ سے باہر ہو چکی تھی دماغ سن سے رہ گیا۔ اور میں الٹے پاؤں واپس ہوا۔ لیکن ابھی چند ہی قدم چلا تھا کہ فضا مکدر ہونی شروع ہوئی۔ ہواؤں میں تیزی و تندی پیدا ہو گئی۔ اور ساری فضا ——— سائیں سائیں کی بھیانک آواز سے ڈراؤنی بن گئی۔ آسمان پر کالے کالے دیو نما بادل چھا گئے اور دنیا تیرہ و تار ہو کر رہ گئی "میرے معبود" میں چیخ اٹھا۔ منہ زور ہواؤں کے تیز و تند جھونکوں اور ہر چہار سمت پھیلے ہوئے گرد و غبار کی یورشوں نے میرے تھکے ماندے پیروں کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ لیکن ان پاک جذبات کو نہ روک سکیں جو مجھے منزل پر پہونچ جانے کے لئے بے چین کئے دیتی تھیں ——— اور آخر میں چل پڑا ——— ——— ابھی تھوڑی ہی دور گیا ہوگا کہ یک بیک بادل گرجے اور نشیمن سوز بجلیاں کوندنے لگیں۔ بجلیوں کی چمک نے آنکھوں کو چکا چوند کر دیا۔ اور بادلوں کی گرج سے ایسا معلوم ہوا جیسے چٹانوں تک کے جگر پاش پاش ہو جائیں گے۔ یہ ساری فضا کچھ ایسی بھیانک اور ہولناک تھی کہ مجھے محسوس ہوا جیسے عذاب کا ظالم دیوتا۔ اپنی تمام قہرمانیوں کے ساتھ دنیا کو ہلاک کرنے پر آمادہ ہے "اللہ!" میں چیخ پڑا اور بجلیوں کی لحاتی چمک میں جو میں نے اوپر نگاہ اٹھائی تو ایسا معلوم ہوا جیسے اس وقت سارے جہان پر سیاہی شب اطراف رات آ گئی ہے میں نے سوچا اور اس خیال سے سارے جسم میں ایک کپکپی سی دوڑ گئی ——— ——— "رہبر رہبر" میری زبان سے بے اختیار نکلا اور اس بار بجلی بڑے زور سے کودی اور ساتھ ہی کچھ انسانی آوازیں بھی میرے کانوں میں آنے لگیں لیکن وہ اس قدر خلط ملط تھیں کہ کوئی آواز صاف سنائی نہیں دیتی تھی۔ میں نے آنکھوں پر زور ڈال کر جو ادھر ادھر دیکھا تو خود کو ایک ایسی پگڈنڈی پر پایا جس کے دونوں کناروں پر بڑے بڑے مہیب غار مجھے ہضم کر جانے کے لئے اپنے دہانے کھولے پڑے تھے۔ یہ تاریک غار خالی نہ تھے بلکہ ان میں بہت سے انسان نما جانور کیڑوں کی طرح رینگ رہے تھے۔ جن کی تعداد بے شمار تھی۔ ان میں سے بعض مجھے اپنی جانب بلا رہے تھے اور بعض بڑی نحیف آواز میں مجھ سے اپنی راہ پر سیدھا چلے جانے کا اشارہ کر رہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر میں اپنی جگہ پر حیران کھڑا رہ گیا اور سوچنے لگا کہ اتنی ساری مخلوق آخر اس بےبسی کی حالت میں کیوں پڑی ہے؟ کیا یہ بھی میری طرح بھٹک گئے ہیں اور بھٹکتے بھٹکتے پایان کار ان مہیب غاروں میں آ پڑے ہیں جہاں سے ان کے نکلنے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔ اور کیا آخر کار میرا بھی ایسا ہی انجام ہوگا۔ اس خیال سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور بھٹک کر غار میں گر پڑنے کے خیال نے پیروں کو من من بھر کا کر دیا ——— میں اپنی جگہ پر ساکت و حیران کھڑا تھا اور مایوسی و درماندگی نے میرے دماغ کو ماؤف اور دل کو افسردہ کر دیا تھا ——— میں کھڑا تھا ——— ایک بت کی طرح ساکت و خاموش، منجمد اور ویران ——— اور نہ جانے کب تک اسی طرح کھڑا رہتا اگر یہ آواز میرے کانوں میں نہ گونجتی کہ "دنیا کی تمام پریشانیوں اور مصیبتوں کا واحد علاج صرف اس بات پر منحصر ہے

کہ...... میں ابھی یہیں تک سن سکا تھا کہ یکبیک بادل گرجا اور ہواؤں کے دوش نازک پر پھیلتی ہوئی یہ ہلکی ہلکی صوت شیریں بادلوں کی گونج میں گم ہو کر رہ گئی۔ میں نے ایک ہلکی سی جھرجھری لی اور اپنی تھکی ہوئی لیکن متجسس نگاہوں کو دور خلاؤں میں گاڑ دیا۔ اب فضا میں کچھ ہلکی تبدیلی پیدا ہو رہی تھی۔ ہواؤں کی تیزی و تندی کم ہونے لگی تھی اور گرد و غبار چھٹ رہا تھا میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اور قدم قدم آگے بڑھنے لگا۔ بجلیوں کی لمحاتی چمک نے میری مدد کی اور میں ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں ایک شخص بلندی پر کھڑا کچھ کہہ رہا تھا اور اس کے نیچے ہزاروں انسانوں کا ایک ہجوم حیرت کی تصویر بنا ہوا آنکھیں پھاڑے اس کی جانب دیکھ رہا تھا میں نے اسکی آواز پر کان لگا دیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"موجودہ نسل کی بیشتر تعداد نکمی اور ناکارہ ہے۔ اس کا وجود دنیا کے لئے خار و خس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا اور اس کا بار مادر گیتی کے سینہ پر بہت بھاری ہے اگر تم چاہتے ہو کہ دنیا تمام گندگیوں اور آلائشوں سے پاک ہو جائے۔ اس کی تمام پریشانیاں اور مصیبتیں دور ہو جائیں اور یہ ایک لہلہاتے ہوئے سبزہ زار اور مسکراتے ہوئے باغ و بہار میں تبدیل ہو جائے تو ان خار و خس کے ناپاک وجود کو دنیا سے ناپید کر دو......" میں نے دیکھا کہ اس کی پر مجسموں کی طرح جامد ہجوم نے ایک جھرجھری لی اور بعضوں نے کچھ کہنا چاہا لیکن بول نہ سکے۔ ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ اور اس شخص نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا......" اور ان کی جگہ چند ایسے مضبوط اور مستحکم افراد پیدا کرو جنہیں "فوق البشر" کہتے ہیں ہاں فوق البشر ہی ایک ایسا فرد ہے۔ جو دنیا کو اس کے تمام دکھوں سے نجات دلا سکتا ہے اور اسے تاریکی کے غار سے باہر نکال کر اجالے اور روشنی کے گہوارے میں جھولا جھلا سکتا ہے۔ دنیا کو چاہئیے کہ اس عظیم تر شخصیت کو خوش آمدید کہنے کے لئے ہمیشہ تیار رہے۔ بلکہ اس طاقتور قوم کی پیدائش کے لئے ہر قسم کی قربانی دے خواہ یہ قربانی لاکھوں اور کروڑوں نکمے انسانوں کا خون ہی کیوں نہ طلب کرے"

"اف یہ جبر و تشدد" میں نے سوچا اور مجھ سے نہ رہا گیا۔ آخر آگے بڑھ کر لرزتے ہوئے پوچھا "خدا کی پیدا کردہ مخلوق کو اس بیدردی سے فنا کر دینے کا آخر آپ کو کیا حق پہنچتا ہے؟" اور اس نے جواب دیا "اگر تاریخ عالم پر تم نگاہ کرو گے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے کہ ایک طاقتور ہستی نے کمزور کو دبا کر خود مالک بن بیٹھا ہے۔ اور اس کا اس طرح مالک بن بیٹھنا کچھ غلط نہیں۔ کچھ گناہ نہیں بلکہ عین انصاف ہے اور عین حق ہے کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرے تو دنیا صرف ناکارہ و نکمے افراد کی رینگتی ہوئی مخلوق سے بھر جائے۔ اور تمام نظام عالم درہم برہم ہو کر رہ جائے"

"کیا یہ بربریت نہیں ہے۔ اور خدا کی بے گناہ مخلوق پر انتہائی ظلم ڈھانا نہیں ہے اور پھر کیا یہ ظلم اپنے رد عمل کے طور پر تباہی و بربادی نہ لائے گا۔ تعجب ہے کہ آپ بیدردی اور بیرحمی میں کیسے فلاح انسانیت پاتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"بیرحمی تو تم رحم چاہتے ہو؟" اس نے بڑے تیکھے پن سے جواب دیا "یہ رحم تو ہے جس نے دنیا میں اس قدر تباہی و بربادی پھیلا رکھی ہے جب انسان رحم کرتا ہے تو اس کا زور گھٹ جاتا ہے۔ اور جب اس کا زور گھٹ جاتا ہے تو وہ نکما اور ناکارہ ہو جاتا ہے۔ اس کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں اور وہ دنیا کا انتظام سنبھال نہیں سکتا"

"یا اس کے حوصلے بلند ہو جاتے ہیں اور جب وہ رحم کرتا ہے تو اس کی طاقت بڑھ جاتی ہے کیونکہ وہ انسانی صفتوں سے گذر کر خدا کی صفتوں کا حامل بن جاتا ہے اور اس میں وہ روحانی طاقت پیدا ہو جاتی ہے جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی مادی طاقت نہیں کر پاتی" میں نے جواب دیا..........

"میری رائے میں تو رحم کے اسباب بزدلی اور کمزوری ہیں" اس نے نرم ہوتے ہوئے کہا۔

"لیکن میرا خیال ہے کہ رحم کے اسباب قوت و جوانمردی ہیں۔ بزدل ہمیشہ سفاک اور ظالم ہوتا ہے یہ ایک ابدی حقیقت ہے" میں نے کہا اور ساتھ ہی ان مجسموں میں سے ایک بڑی گرجدار آواز میں بول اٹھا "یہ تم ان پر تنقید کرتے ہو؟"

"اور تم ان کو پوجتے ہو" میں نے بیزاری سے جواب دیا اور بھیڑیوں کے اس ہجوم سے باہر نکل آیا۔

دنیا پر ابھی تک سیاہی شب مسلط تھی۔ بادل ابھی تک گرج رہے تھے اور خرمن سوز بجلیاں ابھی تک کود رہی تھیں گویا عذاب کا ظالم بہت تفصر

ہنوز سرگرم کار تھا: فوق البشر کا تخیل تو اچھا ہے بے شک بہت لاجواب لیکن اس کی جو تشریح کی گئی ہے اس سے فوق البشر کی ایک ایسی — بھیانک تصویر سامنے آجاتی ہے جس سے دنیا دکھوں اور مصیبتوں سے نجات پانے کے بجائے اور زیادہ نئی نئی الجھنوں میں پھنس کر رہ جائیگی۔ اور گیسوئے ہستی بجائے سنورنے کے اور زیادہ الجھ جائے گی!" میں نے سوچا اور انہیں خیالات میں غلطاں و پیچاں بجلیوں کی لمحاتی چمک کے سہارے پگڈنڈی پر چلتا رہا ——— چلتا رہا اور اسی طرح میلوں دور نکل آیا۔

سائیں سائیں کرتی ہوئی تاریک رات بڑا ہی بھیانک منظر پیش کر رہی تھی۔ اور طرح طرح کے خوفناک جانور رونگٹے کھڑے کر دینے والی آوازوں سے دل و دماغ کو دہلائے دے رہے تھے۔ منزل کے گم ہو جانے کا جانکاہ احساس مجھے رہ رہ کر بہت پریشان کئے دیتا تھا۔ اور اپنے شوق تماشا اور ذوق خرام پر مجھے بہت غصہ آ رہا تھا "غفلت کا یہی نتیجہ ہوتا ہے" میرے ضمیر نے مجھ پر طنز کیا اور شدت احساس ندامت سے مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا ——— اب بادلوں کی گرج اور بجلیوں کی چمک میں کمی پیدا ہونی شروع ہو گئی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور موقع کو غنیمت جانتے ہوئے اپنی رفتار تیز کر دی۔ اب میں ایک ایسی جگہ پر چل رہا تھا جہاں سے حد نگاہ تک پھیلا ہوا ایک بڑا سا چٹیل میدان پڑا تھا میں بہت خوش ہوا اور اپنے تھکے ماندے پیروں کو گھسیٹتا ہوا جلد جلد راہ طے کرنے لگا

یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ کتنی دور چل آیا تھا پر یہ ضرور ظاہر تھا کہ اب آگے جانا محال ہے کیونکہ سامنے ایک بڑی سی کھائی منہ کھولے پڑی تھی۔ میں سہم گیا اور اس کھائی کے اس پار جانے کی تدبیریں سوچنے لگا ———

سوچتا رہا لیکن کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی اور میرا اضطراب بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ یکایک میرے کانوں میں بہت سی انسانی آوازیں آنے لگیں اور میں نے اپنی مضطرب اور متجسس نگاہیں ان آوازوں کی طرف ڈال دیں کچھ دیر بعد میری نگاہوں نے دیکھا کہ کھائی کے اس پار بہت دور سے ایک چھوٹی سی روشنی نمودار ہوئی اور آہستہ آہستہ کھائی کی جانب بڑھنے لگی۔ شب دیجور میں اس طرح ایک روشنی کے نمودار ہو جانے سے مجھے بڑی مسرت ہوئی اور میں اپنی ساری واماندگی اور پریشان حالی بھول گیا۔ مگر میں بہت متعجب تھا کہ آخر یہ روشنی یکایک کہاں سے آگئی۔ حیرت انبساط کے ملے جلے جذبات نے مجھے کچھ سوچنے سے روک دیا اور میں کھڑا اس روشنی کو دیکھنے لگا جو خراماں خراماں اسی جانب آ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس روشنی کے جلو میں ہزاروں لاکھوں انسانوں کا ایک سیلاب ٹھاٹیں مار رہا ہے۔ میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں۔ اور جی چاہا کہ ایک بار ان خوش نصیب انسانوں سے جا ملوں جن کو اس تاریک رات میں بھی روشنی میسر تھی۔ لیکن سامنے وہ لمبی چوڑی کھائی منہ کھولے پڑی تھی۔ مجھے اپنی بیکسی پر بڑا ترس آیا اور میں رو پڑا۔ یہ روشنی مسلسل آگے بڑھ رہی تھی۔ یہاں تک کہ کھائی سے کچھ دور پر آکر رک گئی۔ اب بہت سی چیزیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ یہ ٹھاٹیں مارتا ہوا سیلاب ایسے کمزور اور لاغر انسانوں پر مشتمل ہے جن کے چہرے سے بیماری اور بھوک کی کلفتیں نمایاں ہیں اور تقریباً ہر شخص کے ہاتھ میں ایک ایک مشعل ہے جن سے چنگاریاں چھٹک چھٹک کر فضا میں اڑ رہی ہیں اور مشعلوں سے نکلتا ہوا مکروہ دھواں فضا کو بھی تاریک بنائے دے رہا ہے۔ میں نے دیکھا کہ ایک شخص جو خاصا تہذیب یافتہ اور متمدن معلوم ہوتا تھا اس سیلاب کے سامنے کھڑا بڑے جذباتی انداز میں کچھ کہہ رہا ہے۔ راہنما خود کو خود بھی رنج ... کا ستایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ اس کے چہرے سے بیزاری اور رنج و غم کے آثار نمایاں اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں جن کے گرد شکنیں پڑ گئی تھیں آگ کے انگارے برساتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے یہ تو میں نہ سن سکا کہ ان کے رہنما نے انہیں کیا سمجھا دیا۔ لیکن اتنا ضرور دیکھا کہ ان مردہ چہروں پر خوشی کے آثار نمایاں ہو گئے اور بولتے ہوئے لب شکر کرنے لگے ——— ساکت مجمع میں ایک جنبش پیدا ہوئی اور اس نے ایک زوردار نعرہ لگایا۔ پھر چیختا چلاتا، گرجتا اور خوشی کے بے ہنگم قہقہے اڑاتا کھائی کے وجود سے بے خبر معصومانہ اس جانب بڑھنے لگا...... آہ میں نے ایک چیخ ماری اور دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو چھپا لیا۔ وہ اندھا دھند کھائی میں گر رہے تھے ———

"میرے معبود مجھے بچا لے" میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا اور ہاتھ کو آنکھوں پر سے ہٹاتے ہوئے تاریکی میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ادھر دیکھنے پر ایک طرف مجھے ایک سایہ سا ہلتا ہوا معلوم ہوا۔ سنسان تاریک

بات میں ایک سایہ لپکا ہوا دیکھ کر میں کچھ ڈر سا گیا لیکن آگے بڑھ کر جب حقیقت تلاش کی تو اطمینان کا سانس لیا۔ یہ سایہ ایک ایسے انسان کا تھا جس کے جیسے میں نے متعدد انسان اپنی گم شدہ منزل پر دیکھے تھے۔ وہ بڑی تیزی سے آگے کی جانب لپکا جا رہا تھا۔ میں نے بھی تیز تیز قدم اٹھائے اور لپک کر اس کا دامن پکڑتے ہوئے پوچھا "جناب کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟"

"منزل پر" بزرگ نے بڑی متانت سے جواب دیا اور پوچھا "تم کہاں جا رہے ہو؟"

"وہیں جہاں جناب کے قدم میمنت لزوم جا رہے ہیں۔ کیا آپ میری راہ نمائی کریں گے؟" میں نے بڑی لجاجت سے عرض کیا اور اس نے ایک عجیب انداز استغنا سے مجھے اپنے پیچھے پیچھے چلے آنے کو کہا۔ میں اس کے اس انداز پر کچھ ٹھٹکا۔ کیونکہ یہ انداز میں نے اپنی منزل گم گشتہ کے کسی ایک فرد میں بھی نہ دیکھا تھا۔ بہر کیف کیونکہ انھوں نے منزل تک پہنچانے کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ اور پھر صورت بھی کچھ آشنا معلوم ہوتی تھی اسی لئے میں ان کے ساتھ ہو گیا۔ یہ بزرگ بڑی تیزی سے کئی ایک پیچیدہ راستے طے کر گئے اور میں منزل پر پہونچ جانے کا نشاط انگیز خیال دل میں لئے ان کے پیچھے چلتا رہا ـــــــ یہاں تک کہ ایک ایسی جگہ جا پہنچا جہاں سے متعدد راستے متعدد اطراف کو جاتے تھے۔ یہ بزرگ اس جگہ پہنچ کر رک گئے اور بڑی دیر تک غور و فکر کرتے رہے لیکن جب اپنے خیال کی بھول بھلیوں سے نہ نکل سکے تو بڑی خجالت سے کہا ـــــ

"افسوس میں راستہ بھول گیا"

"کیا آپ اس راہ کے مسافر ہیں؟" میں نے تعجب سے پوچھا

"نہیں تو کئی بار آیا گیا ہوں" اس نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا

"پھر ــــــ؟" میں نے اور زیادہ تعجب سے پوچھا۔

"بات یہ ہے کہ جو اشارات مجھے اس راہِ مستقیم پر چلنے کے لئے دیئے گئے تھے۔ ان میں میں نے اپنی عقل سے گھٹا بڑھا کر دیا اور ان کی حرام مخولہ تاویلیں کرنی شروع کیں اور .... " اور وہ ندامت سے پانی پانی ہو گیا۔

"گستاخی معاف ــــــ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ جناب نے ایسا کیوں کیا؟" میں نے مودبانہ عرض کیا۔

"نہ پوچھو یہ نہ پوچھو میرے پیارے رفیق" اس نے کہا اور اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔

میں خاموش ہو گیا۔ میرا رہبر بھی خاموش تھا اور سارے جہاں پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ دنیا ابھی تک تاریکی کے گھوٹلے میں پڑی تھی اور انسان ابھی تک بھٹک رہا تھا۔

"کیا ہم اسی طرح تاریکی میں بھٹکتے رہیں گے اور ہمیں اجالا کبھی نصیب نہ ہوگا ــــــ منزل حق کبھی نظر نہ آئے گی" میں سوچ رہا تھا اور سوچ سوچ کر مایوس و مضطرب ہو رہا تھا کہ اچانک ایک آواز فضا میں گونجی ؎

نہ ہو نومید نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے راز دانوں میں

میں تڑپ اٹھا اور مجھے محسوس ہوا جیسے کسی نے تاریکی کا پردہ یک لخت چاک کر دیا ہو۔ نگاہیں اوپر اٹھیں تو دیکھا کالے کالے دیو نما بادل چھٹ رہے تھے اور آسمان پہ تاروں کا کارواں اپنا رخت سفر باندھ رہا تھا میں دیوانہ وار اس جاں بخش آواز کی سمت دوڑا اور آخر ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں کچھ لوگ ایک شخص کے گرد اس طرح جمع تھے جس طرح شمع کے گرد پروانے یا چاند کے گرد تارے جمع رہتے ہیں۔ اور وہ کہہ رہا تھا ــــــ نسل آدم کو چاہئے کہ وہ ایسے انسان پیدا کرے جو دنیا کو اس کی تمام پریشانیوں اور مصیبتوں سے نجات دلا سکتے ہوں۔ لیکن یہ صلاحیت اولاد آدم میں اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی۔ جب تک وہ ان فطری اصولوں پر اپنی زندگی کی تعمیر نہیں کرے گی جو اس کے خالق نے اپنے ایک مقبول بندے کے ذریعہ اس تک پہنچائے ہیں اور جو خود ان اصولوں کا زندہ نمونہ تھا" وہ خاموش ہو گیا۔ مجمع بھی خاموش تھا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ایک طرف کو چل پڑا۔ مجمع نے بھی اس کی تقلید کی اور اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ لیکن میں ابھی تک اپنی جگہ پر ساکت اور خاموش کھڑا تھا۔ راہنما کی ایک ایک بات میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ میں اس کی باتیں سمجھنا چاہتا تھا۔ ان پر غور کرنا چاہتا تھا کیونکہ مجھے یہ خوف کھائے جا رہا تھا کہ مبادا بھٹک کر کسی غار یا کھائی میں نہ گر پڑوں۔ اور اسی لئے جب میں نے اس کی باتوں کو حقیقت کی

(باقی صفحہ [illegible] پر دیکھئے)

عبدالرحمٰن محسن بھوپالی •

خیر مقدم

جن کا شہرہ تھا آج آئے ہیں   وارثِ تخت و تاج آئے ہیں
حامیو! بزمِ رقص و ترتیب   شوخ و رنگیں مزاج آئے ہیں
فاتح و کامیاب آئے ہیں   بن کے غم کا جواب آئے ہیں
منتظر تھے تو سینک لو آنکھیں   لیکے حسن و شباب آئے ہیں
پھر نئے عہد کرنے آئے ہیں   تم پہ احسان دھرنے آئے ہیں
مفلسو اب کوئی گلہ نہ رہے   پیٹ وعدوں سے بھرنے آئے ہیں
غم کے قصوں کو بھول بھی جاؤ   آج تو دکھ کے گیت مت گاؤ
خاطرِ یار اشکِ خونیں کو!   آج تو مسکرا کے پی جاؤ!
گر میسر نہیں ہیں گھی کے چراغ   خونِ قلب و جگر تو ہے ارزاں
جس طرح بھی ہو جشنِ عام کرو   آج کے دن ہمارے ہیں مہماں
کچھ تو سوچو ذرا خیال کرو   کیا کہیں گے جنابِ عالی شان
کتنے بے صبر و کس قدر بدذوق   ہو گئے ہیں یہ کج فہم انسان

قوم کے نام ان کا یہ پیغام
کوچے کوچے میں آج پہنچا دو
جو کہیں اس پہ کاربند رہو
ہو نہ شکوہ زبان کٹوا دو

○

فیروز نظر •

○

زخم پر زخم ہم نے کھائے ہیں
پھر بھی لے دوست مسکرائے ہیں
جب کبھی آپ یاد آئے ہیں
دل میں تارے سے جھلملائے ہیں
زندگی دیکھ ہم نے تیرے لئے!
ہر قدم پر فریب کھائے ہیں
جن کو اپنا سمجھ رہے تھے ہم
کیا خبر تھی کہ وہ پرائے ہیں
ہم نے ظلمت کی آندھیوں میں نظرؔ
عزمِ نو کے دیئے جلائے ہیں!

کافور کی بُو!

سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنی کہانی زندگی کے کس حصے سے شروع کروں، یوں تو میری زندگی کے ہر حصے میں کافور کی تیز بو اس بری طرح ——— رچی ہوئی ہے جیسے قصداً کافور مل کر اس میں سے پھوٹتے ہوئے تعفن کو دبانے کی کوشش کی گئی ہو ——— یہ تیز بو جیسے میرا مقدر بن گئی، میں نے جوں جوں اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی یہ تیز بو تیکھی اور نتھنوں میں ——— سوراخ کر دینے والی بنتی۔ حد تو یہ ہے کہ اس بو سے دور بھاگتے بھاگتے میں جیل کے پھاٹک سے ٹکرا تک گیا۔ زندگی کی تلخیوں کو بھول جانے کے لئے میں نے شراب پی مگر ——— اور آپ لوگ میرے متعلق کچھ اور سوچنے نہ لگیں تو میں ——— اس بات کا اعتراف کروں کہ جیل جا کر تھوڑی دیر کے لئے مجھے ایسا معلوم ہوا تھا کہ جیسے سچ مچ پناہ مل گئی ہو، قیدیوں کے کپڑے پہنتے وقت میں بڑبڑا اٹھا تھا شکر ہے ان کپڑوں سے کافور کی بو نہیں آرہی ہے مگر میرا یہ احساس تھوڑی ہی دیر کے بعد کافور ہو گیا، یہ سب کچھ بالکل یوں ہوا جیسے بھاگتی ہوئی ٹرین غلط پٹری پر پڑ جائے تو یقیناً حادثہ ہو جاتا ہے مگر عام طور سے اس غلطی کا احساس بہت دیر سے ہوتا ہے ——— مجھے بھی یہ احساس بہت دیر میں ہوا، زندگی میں تھوڑی سی قدر و منزلت حاصل کرنے کے لئے مجھے بہت بھاری قیمت ادا کرنا پڑی تھی۔ میں چوری کرنے کی کوشش میں پکڑا گیا، چالان ہوا۔ اور مجھے دو سال قید بامشقت کی سزا ملی۔"

بوڑھا ذرا دم لینے کے لئے رکا، فاروق اور لطفی نے سہمی سہمی نگاہوں سے اس کی طرف گھورنا شروع کیا۔ جیسے ان کے سامنے ہوسٹل کا پرانا بیرا یعقوب نہیں کوئی خونخوار درندہ ہو جو آنکھ جھپکتے ہی ان کا ٹینٹوا آدبوچے گا۔ سالانہ امتحان ختم ہو چکا تھا، تقریباً سارے ہی لڑکے گرمیوں کی چھٹی میں اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے، ہوسٹل بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ جو لڑکے چھٹیاں گذارنے کہیں نہ جا سکے ان کی تعداد بہت مختصر تھی، وقت گذارنے کے لئے سیر و تفریح کے علاوہ ہم نے یہ ترکیب بھی سوچی کہ سارے لڑکے "آپ بیتی" سنائیں، سبھوں نے اس تجویز کی تائید کی اور یہ سلسلہ جو چلا تو ایک ایک "آپ بیتی" کئی کئی دنوں تک جاری رہی۔ دو لڑکوں نے اپنی رام کہانی ختم کی کہ سعادت نے بڑے میاں کو پکڑ لیا۔

"اجی کیا دھرا ہے ان چھوکروں کی آپ بیتی میں سوائے بکواس کے، چچا یعقوب سے کچھ سنو ——— ہاں! تو چچا آپ شروع ہو جائیے"۔

سعادت نے اس طرح چٹ پٹ یہ سب کچھ طے کر لیا کہ ہم میں سے کوئی بھی سیلنگ کٹا کر بچھڑوں میں گھس آنے والے یعقوب پر کوئی اعتراض نہ کر سکا ——— !

"میری شادی بڑی کم عمری میں ہی کر دی گئی، اس وقت میں دسویں جماعت میں تھا......" یعقوب کی آواز کھنکی۔

"ارے!" مجھ سے نہ رہا گیا "یعقوب میاں! آپ دسویں جماعت پاس کر چکے ہیں؟"

یعقوب نے گردن کو نفی میں جنبش دیتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی ———

"بابا حافظ قرآن تھے مگر آنکھوں سے اندھے ——— وہ محلے کی مسجد میں لڑکوں کو قرآن مجید حفظ کراتے تھے۔ مجھے تو گھر کے کام کاج کی طرف دھیان دینے کی سخت مناہی تھی، گھر کے چھوٹے موٹے یا سودا سلف لانے کا کام تو بابا کے شاگرد ہی کر دیا کرتے، بابا کی سخت تاکید تھی کہ میں دل لگا کر پڑھوں، ان کا خیال تھا کہ وہ مجھے ایم اے تک تو ضرور پڑھائیں گے اور حقیقت تو یہ ہے کہ میں ہی اگر ہمت چھوڑ نہ بیٹھتا، تو بابا اپنے خیال کی تکمیل ضرور کرتے، کیوں کہ گھر کے اخراجات کے معاملہ میں بابا اپنی چادر دیکھ کر ہی پاؤں پھیلانے کے عادی تھے، لڑکوں کی طرف سے مہینے کے مہینے جو نذرانہ ملتا وہ گھر کے اخراجات کے کام آتا

اور جمعرات کے خیرات پیسے دو پیسے جو بطور "خیراتی" کے ملتے انہیں میری ماں بھلے برے وقت کے لئے جوڑ کر رکھتی جاتی۔ خدا جنت نصیب کرے میری ماں بڑی گھر گرہست تھی، کسی دن کچھ روٹیاں بھی اگر بچ جاتیں تھیں تو انہیں سکھا کر رکھ چھوڑتی تھی اور اکثر شام کو جب میں اسکول سے واپس آتا تو گڑ کے شیرے میں پکی ہوئی وہی روٹیاں مجھے کھانے کو ملتیں۔

محلے والے بھی میرے بابا کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ عید بقرعید کے موقعوں پر ان کی طرف سے کافی مدد جاتی، کسی شاگرد کا کوئی عزیز مر جاتا تو زیادہ کچھ ہو پاتا نہ ہو چہلم کے دن ایک جوڑا کپڑا بابا کے لئے ضرور آجاتا، بابا ان کپڑوں کو کم ہی استعمال کرتے زیادہ تر کپڑے پڑوس کے ننھے میاں ٹیلر ماسٹر کے یہاں بھیجکر چھوٹے کروالئے جاتے اور وہ میرے کام آجاتے خیرات زکوٰۃ اور فطرہ کی آمدنی نے مجھے دسویں جماعت تک پہنچا دیا۔ بابا پھولے نہ سماتے کہ ان کے خاندانی دلدر دور ہونے کے دن قریب آرہے ہیں، اِس میں دسویں جماعت میں کامیاب ہوا انہیں کہ دیکھتے ہی دیکھتے، بابا کے خواب کی تعبیر پوری ہو جائے گی ——— مگر مجھ میں آگے بڑھنے کی سکت نہ رہی، میرے سامنے ایک بڑی اونچی دیوار کھڑی ہو گئی، ایک تیز بو میرے نتھنوں کو چھیدنے لگی، مجھ پر کسی ہوئی پھبتیاں میرے اور اسکول کے دوسرے لڑکوں کے درمیان ایک امتیازی لکیر بن کر ابھر آئیں، جب میں نچلی جماعتوں میں تھا اسی وقت سے تقریباً سارے لڑکے میرا مذاق اڑاتے تھے۔ جب کبھی بھی میں۔ نئے یا صاف ستھرے کپڑے پہن کر اسکول جاتا تو ہر طرف سے آوازیں آتیں ———

"کل کس قسم کا چہلم تھا"؟

"کوئی بڑا آدمی مرا ہی شاید"!

"آج کل لوگ کفن میں کپڑے بہت بڑھیا دینے لگے ہیں"

اور نواب ٹھن خاں کا لے پالک جو اسکول بھر میں نواب زادہ —— لطیف احمد کے نام سے مشہور تھا وہ تو کبھی کبھی مجھے بے عزت تک کرنے سے بھی نہ چوکتا، مجھے اپنے پاس بیٹھنے نہ دیتا، "یعقوب تم ادھر جا کر بیٹھو تمہارے کپڑوں سے کافور کی بو آرہی ہے" وہ اپنے ناک پر سینٹ میں بسا ہوا رومال رکھکر پوچھتا "کسی کا کفن تو نہیں لے بھاگے"؟ نواب زادے کے اس جملے پر سارے درجہ میں قہقہوں کے بلبلے سے پھوٹنے لگتے اور میں کھسیانہ ہو کر دوسری بنچ پر جا بیٹھتا۔ تمام دن وہ نئے کپڑے میرے جسم پر کانٹوں کی طرح چبھتے رہتے۔ کانوں میں سائیں سائیں کی آواز آتی رہتی کتاب پر پھیلے ہوئے الفاظ گڈمڈ ہو کر بھوتوں کی طرح ناچتے رہتے، ماسٹر کیا پڑھا کیا سمجھاتے میرے پلے تو کچھ بھی نہ پڑتا۔ بس یہی جی چاہتا کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔ یا اسکول کی دیوار سے اپنا سر اتنی زور سے ٹکراؤں کہ میرا بھیجا نکل پڑے، احساس ذلت و ندامت سے میں پسینے میں شرابور ہو جاتا، ساری فضا میں کافور کی بو جیسے گھل جاتی میری آنکھیں ڈبڈبا آتیں اور آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے میرے لباس پر کہیں ادھر ادھر لڑھک کر ان میں جذب ہو جاتے اور مجھے افسوس ہونے لگتا کہ سچ مچ میں نے مردے کا کفن گھسیٹ کر اوڑھ لیا ہو ——— یہ واقعات میری بڑھتی ہوئی ہمت کی راہ میں روڑا بننے کو کیا کم تھے مگر بات یہیں ختم ہو جاتی تو شاید میری ہمت اپاہج نہ ہوتی۔

ان پھبتیوں سے بچنے کے لئے میں نے طے کر لیا کہ آئندہ نئے کپڑے پہن کر کبھی اسکول نہ جاؤں گا مگر میرے اور دوسرے لڑکوں کے درمیان امتیازی لکیر ہر حال میں میرے پیچھے پڑی رہی۔

"بہت دنوں سے کوئی مر نہیں رہا ہے"۔ کسی بنچ سے کوئی لڑکا آواز کستا "کھی کھی" کے بلبلے اس جماعت کی فضا میں تیرنے لگتے

"ان دنوں کفن بہت مہنگا بکنے لگا ہے شاید"؟ دوسری آواز برق کی طرح میرے کانوں کو چھید کر رکھ دیتی۔ درجہ قہقہوں سے گونجتا رہتا کہ قہقہوں کی آواز کو چیرتی ہوئی ایک آواز سنائی دیتی۔

"بات یہ ہے کہ مرنے والوں کے عزیز و اقربا کفایت شعار ہو گئے ہیں" ——

"بڑے شریر تھے وہ لڑکے، تم نے ماسٹر سے شکایت کیوں کردی"؟ محبوب نے ٹوک دیا، فاروق اور لطفی کے چہروں سے مسرت کے اثرات زائل ہو چکے تھے۔

"ہاں چچا آپ کو ان کی شکایت ضرور کر دینی تھی" سعادت کے لہجہ میں خلوص تھا ——

"میں گھر آکر بابا سے اسکول کے لڑکوں کی شکایت کرتا تو بابا کی اندھی آنکھیں میری پلکوں پر مچلتے ہوئے آنسو تو نہ دیکھ سکتیں مگر میری

بھوائی ہوئی آبِ زمزم کر بابا شاید یہ سمجھ بیٹھے کہ اسکول کے لڑکوں نے مجھ پر خوب خوب پھبتیاں کسی ہیں، اور ان کی اندھی آنکھوں سے ——— بھی آنسو چھلک پڑتے جنہیں وہ اپنا منہ پھیر کر کندھے پر پڑے ہوئے اس رومال سے پونچھ ڈالتے جسے کئی سال پہلے ان کے ایک شاگرد کے حاجی باپ نے حج سے واپسی پر بطور تحفہ انہیں دیا تھا، وہ اکثر اپنی بے نور آنکھیں اس مقدس سرزمین کے مقدس تحفہ سے اس عقیدت کو دل میں بسائے ہوئے پونچھتے رہتے، کہ کبھی تو خداوند برادران کے گھر والوں پر رحم کھا کر ان کی آنکھوں کی بینائی واپس دے گا۔ کیوں کہ وہ پیدائشی اندھے نہ تھے بلکہ بچپن میں میعادی بخار کے ایک شدید حملے کے بعد ان کی آنکھوں کی روشنی جاتی رہی تھی، اور اسی وقت سے انہوں نے اللہ کی رحمتوں سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں جب کبھی مشکلات کی یورشیں عقیدت کی چول ڈھیلی کرنے لگتیں تو وہ مجھے اپنے پاس بلا لیتے۔

"یعقوب بیٹے ادھر آؤ، میرے راجہ بیٹے" اور بڑی دیر تک مجھے سینہ سے چمٹائے بھینچتے رہتے جیسے مجھے ہی اپنی آنکھوں کی روشنی کا نعم البدل سمجھ کر دل کو تسلی دے رہے ہوں

فاروق محبوب کی طرف جھکا "بڈھے نے طنز تو بڑا اچھا کیا ہے۔"

یعقوب نے کہنا شروع کیا، محبوب صرف مسکرا کر کہانی سننے لگا۔

"عجیب بات یہ تھی کہ بابا مجھے بہت ہی بلند اقبال سمجھتے تھے کیوں کہ جس روز میں پیدا ہوا تھا، اسی دن دس نئے لڑکوں نے مکتب میں داخلہ لیا تھا۔

میں سات سال کا ہوا تو مجھے اسکول میں داخل کر دیا گیا، محلّے کے بعض لوگوں نے بابا سے پوچھا بھی کہ آپ نے اپنے بچے کو کلام مجید پڑھانے سے پیشتر ہی انگریزی اسکول میں کیوں داخل کرا دیا۔

بابا نے ان کو سمجھا دیا "بھئی کلام مجید پڑھنا پڑھانا تو گھر کی بات ہے وہ تو اسکول میں رہ کر بھی ہو سکتا ہے، کون جانے زندگی کب منہ پھیر لے ——— چاہتا ہوں چھوکرا زندگی میں کسی لائق ہو جائے تو میرے بعد اس کی ماں کچھ آرام اٹھا سکے" بابا اکثر ٹھنڈی سانس لیکر بڑبڑاتے۔ "بیچاری اندھے کے پلّے بندھ کر تو زندگی بھر ہر بات کو ترستی رہی ہے۔"

یعقوب دم لینے کو رک گیا۔ اس نے جیب سے ایک بیڑی نکال کر سلگائی اور کش پر کش لگانے لگا۔ بھئی حق تو یہ ہے کہ مجھے اس کہانی میں بڑا لطف آرہا تھا۔ ورنہ بھلا ہم کب نچلے بیٹھنے والے تھے، کہانی اگر اتنی دلچسپ نہ ہوتی تو ہم نے یعقوب میاں کو کب کا ——— "ہوٹ آؤٹ" کر دیا ہوتا۔ سعادت تو اس انہماک سے کہانی سن رہا تھا کہ اتنے انہماک سے اس نے کبھی لکچر بھی نہ سنا تھا۔ اگرچہ اس طرح "صمٌ بکمٌ" بن کر کوئی بات سننا ہماری شریعت کے قطعاً خلاف تھا، لیکن نہ جانے کہاں سے ہم میں اتنی سنجیدگی آگئی تھی۔

"امتحان سر پر تھا" یعقوب نے بیڑی پھینک کر پھر اپنی کہانی شروع کر دی "مگر میں کچھ پڑھ نہ سکتا تھا۔ پھبتیاں دیوار بن کر میرے آڑے آرہی تھیں۔ کانوں میں ہر وقت اسکول کے لڑکوں کے فقرے گونجتے رہتے، تمہارے کپڑوں سے کافور کی بو آرہی ہے ——— کافور کی بو ——— کافور کی بو ———

کافور کی بو میرے ذہن میں سوراخ سا کرنے لگتی، ذہن میں کالج کے لڑکوں کی آن دیکھی، صورتیں ناچنے لگتیں، ہر لڑکا مجھ پر آوازے کستا نظر آتا، "اس کے جسم پر مردے کا کفن ہے، اور کتاب پر پھیلے ہوئے الفاظ مجھے ڈراؤنے لگنے لگتے، جیسے سچ مچ یہ مجھ کو کاٹ کھائیں گے۔ تباہ کر دیں گے۔ امتحان کا نتیجہ نکلا تو اندھے باپ کی تمنائیں منہ کے بل گر پڑیں میں فیل ہو گیا تھا، زندگی بھر خوشیوں کو ترستی ہوئی ماں کی آخری آس بھی ٹوٹ گئی تھی۔ مارے صدمہ کے وہ تو بیمار پڑ گئی اور ایک صبح محلّے والوں نے بھی یہ خبر سنی کہ اندھے حافظ کی بیوی پر فالج گر گیا ہے، ماں زندہ تو تھی مگر مٹی کے ایک تودے کی طرح کھاٹ پر پڑی پڑی چھپر کے بانس گنا کرتی۔ گھر کے کام کاج کے لئے ایک عورت کی ضرورت تھی بابا نے اسی بہانے میری شادی کی بات چلائی اور میں ملازمت کے لئے بھاگ دوڑ کرنے لگا۔ سچ تو یہ ہے کہ سب خیرات زکوٰۃ کے توڑے مجھ سے نگلے نہ جاتے تھے، شادی کے سلسلہ میں تو تقریباً ہر جگہ ہی یہ سوال اٹھتا۔

"لڑکا کیا کرتا ہے؟ .... آمدنی کتنی ہے؟"

"ابھی تو بیکار ہے" بابا ٹھنڈی سانس بھر کر کہتے "مگر ہو جائے گا ملازم بھی انشاءاللہ، میٹرک تک پڑھا ہوا ہے۔" آخر کو ——— بابا کی کوششیں کامیاب ہو گئیں۔ مگر کافی تگ و دو کے بعد بھی مجھے کوئی

دھندا مل سکا، میں تمام تمام دن گھر سے دور رہتا، گھر میں گھستے ہی میرے جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگتیں۔ کان بجنے لگتے اور نگاہوں کے سامنے ہزاروں نواب زادے لطیف احمد گھوم جاتے جو میری غربت کا مذاق اڑاتے ہوئے مجھ پر میرے لباس پر آوازے کستے ہوتے ——— گھر کی دیواریں اور کھپریل تک میرا مذاق اڑاتی ——— نظر آتیں اور میں بے تحاشہ باہر بھاگ کھڑا ہوتا۔

بڑی جدوجہد کے بعد بھی مجھے کوئی کام نہ ملا۔ آخر کو گھر سنبھالنے کے خیال سے محلّہ والوں نے یہ رائے دی کہ شادی ہو جانا چاہئیے روزی تو کہیں نہ کہیں مل ہی جائیگی، یہ بات تو بڑی مشہور ہے کہ اہل اولاد مرد کے نصیب سے ہوتی ہے، اور روزی عورت کے ——— لڑکی نصیبے والی ہوئی تو بہتر سے بہتر بندوبست ہو جائیگا۔ یہ کہتے ہوئے یعقوب کے چہرے پر کچھ اس طرح طنزیہ مسکراہٹ چھائی ہوئی تھی کہ سعادت کے علاوہ سب ہی مسکرا رہے تھے اور یعقوب کی آپ بیتی آہستہ خرام جھیل کی طرح بہی جا رہی تھی۔

" شادی کا دن میری زندگی کا تاریخی دن تھا۔ شاید وہ پہلا دن تھا کہ میرے جسم پر جو نیا لباس تھا اس سے کافور کی بو نہ آتی تھی کیوں کہ نوشاہ کو پورا جوڑا سسرال سے ملا تھا، اور بابا نے جو تیس روپے سلامی میں دئیے تھے اس کے متعلق تو خیر میں جانتا تھا کہ وہ پیسے ماں نے ہی گھر کے اخراجات میں سے تھوڑا تھوڑا کاٹ کر جمع کئے تھے جن کی مجموعی تعداد کل پینتیس روپے سوا سات آنے تھی۔

شادی کے دن کے ساتھ ساتھ رات بھی میری زندگی کی سنہری رات تھی، اس رات پہلی بار مجھے احساس ہوا تھا کہ ستارے بھی کھلکھلاتے ہیں، چاند بھی مسکراتا ہے۔ اس رات میری نئی پوشاک کا مذاق اڑانے والا آس پاس کوئی نہ تھا، گھر زندے نما کمرے کی نیچی نیچی دیواروں کے بیچ دو دل تیزی سے دھڑک رہے تھے، اور میں اس ہم آہنگ دھک دھک کو صرف محسوس ہی نہیں کر رہا تھا بلکہ صاف سن بھی رہا تھا۔ دھک دھک دھک دھک سا۔

اسی رات محض تھوڑی سی دیر کے لئے میرے نتھنوں میں بسی ہوئی کافور کی بو میرے لباس میں بسے ہوئے عطر کی بو میں کھو گئی تھی۔ میرے ذہن کی ساری الجھنیں سلجھ گئی تھیں۔ محض تھوڑی سی دیر کے لئے، کیوں کہ نئی دلہن کی آمد کے سبب بوڑھی ماں کو برآمدے میں سونا پڑا، اور ٹھنڈ کا لبادہ اوڑھے موت کی پرچھائیاں اس کے بیمار اپاہج اور فالج زدہ جسم پر رینگنے لگی تھیں، صبح اس کا جسم اکڑا ہوا پایا گیا۔

گھر کی پائی پائی تو شادی پر خرچ ہو چکی تھی۔ ماں کو کفنانے دفنانے کے لئے محلّہ والوں کا منہ دیکھنا پڑا۔ میں تلملا کر رہ گیا۔

اب میرے لئے یہ ضروری تھا کہ جلد ہی کوئی نہ کوئی کام ڈھونڈ لوں، میں دیکھ رہا تھا کہ ماں کی موت نے بابا پر کافی اثر کیا تھا وہ دن دن بھر اداس رہتے اور میں تمام تمام دن کارخانوں میں مارا مارا پھرتا۔

" نو ویکینسی " No vacancy " ملازمت کے لئے پریشان نہ کریں " جیسی مایوس کن تحریریں اپنے سینہ پر چپکائے " پالشڈ " Polished تختیاں ہر جگہ میرا استقبال کرتیں، کئی بار میں نے مزدور یا قلی بننے کا بھی ارادہ کیا مگر ہر بار میٹرک تک کی تعلیم آڑے آجاتی، مایوسی کی سرد راکھ میں دبا ہوا دل ایک بار پھر ملازمت کی تلاش کے لئے اکساتا۔ ہر بار مجھے یقین دلاتا کہ اللہ کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں کچھ نہ کچھ بندوبست ہو ہی جائے گا، اور میں ملازمت کی تلاش میں ایک بار پھر تازہ دم ہو کر بھاگنے لگتا، میرا اٹھتا ہوا ہر قدم کافور کی بو سے دور ہٹنا چاہتا مگر تمام دن کی بھاگ دوڑ کے بعد جب شام کا سورج افق کی آغوش میں سو جاتا تو ناکامی جیسے اچانک میرے سامنے کافور کا ایک پہاڑ، خیرات زکوٰۃ کی ایک خلیج حائل کر دیتی اور ایسا محسوس ہوتا جیسے میرا تھکن سے چور جسم اسے کبھی عبور نہ کر سکے گا۔ گھر لوٹتا وہی فطرہ زکوٰۃ کے نوالے میرا دماغ ماؤف کر دیتے۔

مسلسل ناکامیوں نے مجھے وہمی بنا دیا میں اپنی ناکامیوں کا ذمہ دار اپنی بیوی رحیمہ کو ٹھہراتا۔ اور بابا کا بھی یہی خیال تھا کہ جس دن یہ گھر میں آئی اسی رات گھر کی مالکن چل بسی، سبز پری منحوس کہیں کی ———

اور رحیمہ کو منہ چھپا کر رو لینے کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔ کبھی کبھی تو وہ بڑبڑا بھی اٹھتی۔ جیسے ہمیں کوس رہی ہو " اللہ انصاف کریگا " اور اللہ انصاف کرنے پر اتر آیا تو گیہوں اور گھن دونوں پس گئے، مجھے کوئی

نمانہ ملا، اور مایوسی کے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا ہوا میں ریلوے
شن پہونچ گیا۔ اور وہاں قلی سے زیادہ کچھ نہ بن سکا۔ میٹرک فیل قلی۔
"چ چ چ" سعادت نے افسوس ظاہر کیا۔ یعقوب نے چونک کر ہماری
ت دیکھا، کہ شاید اس کی اندھیری زندگی کی داستان سن کر ہم بھی کہیں
کا مذاق تو نہیں اڑا رہے ہیں۔ مگر ہمارے چہروں پر طمانیت، خلوص
اشتیاق دیکھ کر وہ مطمئن انداز سے کہنے لگا۔ "اگرچہ خیرات زکوٰۃ کے نوالوں
سے گریز کے جذبہ نے مجھے قلی بنا دیا۔ مگر شروع شروع میں مجھے یہاں
بھی ناکامی اور مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا! اوّل تو مجھ جیسے ناتجربہ کار قلی کو بابو
لب اپنا سامان دیتے ہوئے ہچکچاتے، دوسرے میں خود چھین جھپٹ
کا عادی نہ تھا، دوسرے پرانے اور ہوشیار قلی تھوڑی سی محنت
سے کچھ کما لیتے، اور میں کھڑا منہ دیکھتا رہتا اور اگر دو ایک ٹرپ مل بھی گئے
ز پانچ چھ آنے میں گھر کا خرچ کیسے چلتا۔ گھر کی فکر اور بھی میری جان کھائے
جا رہی تھی۔ کیوں کہ ماں کی موت نے بابا پر اتنا اثر کیا تھا کہ وہ ہر وقت
داس رہتے تھے۔ بچوں کو پڑھانے تک کو نہ نکلتے۔ رفتہ رفتہ ان کی
آمدنی بھی محدود ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گئی اور نذر شاہ کی مسجد میں
جہاں صبح سویرے ایک ساتھ کئی لڑکے قرآن مجید کی تلاوت کرتے
تھے وہاں بابا اکیلے سر جھکائے بڑی دیر تک کشادگی رزق کے لئے وظیفہ
پڑھتے نظر آتے تھے۔ تو گھر کا سارا بوجھ مجھ پر آ پڑا میں اس ماحول سے
کچھ مانوس بھی ہو چلا تھا۔ پھر مجھے بڑی خوشی تو اس بات کی تھی کہ کافور
کی بو کا پیدا کردہ احساس کمتری گھٹتا جا رہا تھا اور مجھے خیرات زکوٰۃ کے
نوالے نگلنے ——— پڑتے تھے ———

"کیوں رے! بلّی کے پوت! اتنی محنت کرتا ہے، اور کھاتا پیتا کچھ
نہیں، دو ہی دن کی محنت میں آنکھیں دھنس گئیں"، جیٹھ لال اسٹیشن
کے تمام قلیوں میں سب سے زیادہ مخلص اور ملنسار تھا وہ صرف میرا ہی
نہیں ہر قلی کا گہرا دوست تھا، دکھ درد کا ساتھی، جہاں اس نے دو
ڈھائی روپے کمائے کہ میرے پاس آیا۔

"جیادا محنت کاہے کرو، کون کھائے گا۔ سب بلّی کے پوت
تو مر گئے اچھا بے بلّی کے پوت میں چلا دارو پینے" کچھ دور جاکر وہ پلٹتا
"کیوں رے بلّی کے پوت تونے کبھی دارو پی ہی نہیں؟ ہونہہ ——— ہونہہ
بس ایک بار پی لے، اگر تیرے غم نہ مر جائیں تو مجھ سے کہیو۔"

"بھیا کی بات .... میں مسکرا کر رہ جاتا۔

میں بھی اپنے کام میں ہوشیار ہو رہا تھا، جھپٹ کر مسافروں
کا سامان اٹھا لیتا مگر آوازے اور پھبتیوں نے یہاں بھی میرا پیچھا نہ
چھوڑا تھا، کبھی کبھار کوئی منہ پھٹ بابو کہہ ہی بیٹھتا "ارے باپ رے
اتنا لحیم شحیم قلی"، تو سچ مچ میں اپنے دبلے پن پر شرما جاتا۔ مگر فوراً ہی
مزدوری حاصل کرنے کا خوش کن خیال جاگ اٹھتا اور میں مسکراتے
ہوئے کہتا" بابو جی دبلا ہوں۔ تو کیا ہوا مگر یہ ہڈیاں فولاد ہیں فولاد"
یعقوب نے اپنے سوکھے ساکھے جسم کی پتلی پتلی ہڈیوں کو اس طرح سے فولاد
بتایا کہ سعادت جیسا سنجیدہ لڑکا بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا ——— اور وہ
شام زندگی میں کبھی نہ بھولوں گا، جس شام کافور کی بو اور خیرات کے نوالوں
سے دور بھاگتے بھاگتے میری پٹری بدل گئی تھی ایک حادثہ ہو گیا تھا
میری زندگی کا عظیم حادثہ۔ جب میں انسانوں کی سطح سے کچھ اور نیچے
سرک گیا تھا۔ اس دن کمائی بھی دو روپے چار آنے ہی کی ہوئی تو
میری طبیعت کچھ گری گری معلوم ہو رہی تھی۔ نہ جانے کیوں رہ رہ کر
جیٹھ لال کا جملہ میرے کانوں میں گونج رہا تھا "ایک بار پی لے اگر
تیرے غم نہ مر جائیں تو مجھ سے کہیو" میں سوچ رہا تھا۔ آج جیٹھ لال
کی بات آزما کر دیکھوں، آج اپنا غم مٹانے کے لئے کچھ پی لوں، اور اتنی
پی لوں کہ پھر کبھی ہوش میں نہ آؤں، کہ رحیمہ نے میرے دماغ کی سطح پر
سر ابھارا" چاول آج ایک دانہ نہیں ہے۔ شام کو ذرا پہلے ہی آجانا"
اور غم مٹانے کا خیال سینہ میں ہی گھٹ کر دم توڑ گیا۔

گھر میں داخل ہوا تو رحیمہ بابا کا سر داب رہی تھی اور بابا چارپائی
پر پڑے "خیں خیں" کر رہے تھے معلوم ہوا کہ صبح سے وہ کئی دفعہ خون
کی قے کر چکے تھے۔ محلّہ والے جب انہیں مسجد سے اٹھا کر گھر لے آئے
تو پتہ چلا کہ وہ کشادگی رزق کے لئے چلہ کھینچ رہے تھے کہ مسجد کے اندر
سے چیخنے کی آواز آئی۔ لوگوں نے دوڑ کر خبر لی تو وہ خون کی قے میں لت پت
ذبح کی ہوئی مرغی کی طرح لوٹ رہے تھے محلہ کے ایک بڑے حاجی
صاحب نے حالت نازک سمجھتے ہوئے ڈاکٹر بلوایا۔

"شدید صدمہ کی وجہ سے دل کا منہ کھل گیا ہے، حالت تشویشناک

ہے علاج میں کافی پیسے خرچ ہونگے" ڈاکٹر چلا گیا اور اس کے الفاظ فضا میں گونجتے رہے

بابا چارپائی پر پڑے خیں خیں کر رہے تھے۔ اور ڈاکٹر کا جملہ میرے داغ میں ہیجان برپا کئے ہوئے تھا۔ میں نے اپنی جیب میں پڑی ہوئی دو روپے چار آنے کی ریزگاری کو بڑے زور سے مٹھی میں بھینچ لیا۔ محلہ کا ابراہیم چچا مجھے سمجھا رہا تھا، "صبر کر دبیٹا، اللہ کے یہاں دیر ہے۔ اندھیر نہیں!"

میں اسکی بات ان سنی کرکے باہر بھاگ آیا۔ میری جیب میں صرف دو روپے چار آنے تھے۔ اور علاج میں کافی پیسوں کی ضرورت تھی۔ دو روپے چار آنے کی ریزگاری نے جیسے مجھے غم غلط کرنے کا پیغام دیا۔ دو روپے چار آنے غم غلط کرنے کے لئے کم نہ تھے، اور جیٹھ لال کا جملہ میرے کانوں میں گونج رہا تھا، "ایک بار پی لے اگر تیرے غم نہ مرجائیں تو مجھ سے کہیو ————" اور میں نے غم غلط کر لیا

میں رات گئے تک گھر لوٹا میں نے سچ مچ شراب پی رکھی تھی سچ مچ بابا کافور کی بو آوازوں کی کوفت خیرات کے نوالے کی گھن سب کچھ میرے ذہن سے دور جا کر گرے، سب کچھ بھول گیا تھا میں اگر یاد تھی تو صرف ایک بات "جیٹھ لال بہت اچھا آدمی ہے" اور صبح میری آنکھ کھلی تو دن کافی چڑھ آیا تھا۔

"بابا کیسے ہیں"؟ میں نے بستر سے اٹھتے ہی رحیمہ سے پوچھا

"بس ابھی آنکھ لگی ہے، رات بھر تو کراہتے رہے ہیں بیچارے، کم سے کم دوا تو لا دو" اور میں بغیر منہ ہاتھ دھوئے ڈاکٹر کی ڈسپنسری کی طرف بھاگا۔ واپسی میں مجھے دروازے پر ہی رحیمہ کے رونے کی آواز سنائی دی، میں سمجھ گیا کہ بابا دکھوں سے چھوٹ گئے" یتیم ہوجانے کے خیال نے سینہ پر ایک گھونسہ مارا اور دوا کی شیشی ہاتھ سے چھوٹ کر چور چور ہوگئی، پیلی پیلی دوا پیاسی زمین نے پی لی۔ زمین کا تھوڑا سا بھیگا ہوا حصہ اور شیشی کی کرچیاں مجھے جیسے گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں، اور میں دروازے پر سے ہی اسٹیشن کی طرف بھاگا۔

"جیٹھ لال بھیا .... بابا مر گئے اور ......" جیٹھ لال میرا مدعا سمجھ گیا۔

"تیری قسم اگر میرے پاس پھوٹی کوڑی تک نہیں، ایسا کر دو نوں مل کر محنت کریں جو بھی مل جائے سب تیرا۔"

گھنٹہ بھر کی محنت میں ہم دونوں صرف چھ روپے کچھ آنے کما سکے مگر ایک بوڑھے کو ٹھکانے لگانے کے لئے چھ روپے بھلا کب کافی تھے میرا داغ الجھنے لگا۔

گھنٹہ، سوا گھنٹہ ڈیڑھ پونے دو گھنٹے بیت گئے۔

گاڑی آنے میں دیر تھی۔

"قلی" ایک آواز نے مجھے چونکا دیا

بابو گاڑی آنے میں دیر ہے"

"ٹھیک ہے سامان ویٹنگ روم میں لے چلو" نہ جانے کیوں بابا کا حکم مجھے اسوقت بہت برا لگا۔ اچانک بابا کی لاش نہ جانے پھر کدھر سے میرے ذہن میں آگئی میں اس خیال کو ذہن سے نکال پھینکنے کے لئے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ویٹنگ روم کی طرف چلنے لگا۔ اچانک اسٹیشن کی منجمد زندگی میں حرکت پیدا ہوئی اور ہنگامہ شروع ہو گیا۔ بھاگ دوڑ مچ گئی۔ اور گاڑی پلیٹ فارم میں داخل ہوئی ــــ اس دوران میں میں نے بابا کے مردہ جسم کو ٹھکانے لگانے کی ترکیب سوچ لی اسکے سوا کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ تمام دروازے بند تھے اور جو راہ کھلی تھی خیرات زکوٰۃ کی راہ وہ مجھے منظور نہ تھی۔ تو میں نے بابا کے مردہ جسم کو ٹھکانے لگانے کی ترکیب سوچ لی۔ اور بابو کا سوٹ کیس سر پر اٹھائے سیدھا باہر کی طرف بھاگ

"پکڑو ..... مارو ... چور ... چور!" لوگ میرے پیچھے لپکے مارے گھبراہٹ میں نے فرسٹ کلاس ایگزٹ (exit) سے باہر نکلنا چاہا گذرنے کے لئے راستہ تنگ تھا۔ سر پر رکھا ہوا سوٹ کیس فلیکس ایبل گیٹ سے ٹکرا کر دو پلیٹ فارم پر میں لڑکھڑا کر منہ کے بل باہر کی طرف لڑھک گیا۔ اور دھر لیا گیا۔ چالان ہوا اور سال قید سخت کی سزا ہو گئی ــــ جیل میں داخل ہونے کے بعد قیدیوں کا پہننے کو دیئے گئے۔ سیاہ سفید چار خانوں والے میلے کپڑے جن کو مجھ سے جانے کتنوں نے پہنا ہوگا ان کپڑوں کو پہننے سے پہلے میں نے غور سے سونگھ لیا۔ شکر ہے کہ ان سے کافور کی یا خیرات زکوٰۃ کی بو نہیں آرہی تھی مجھے اعتراض ہے میری بڑی بلکی تھی میں غلط پگڈنڈی پر ہو لیا تھا زندگی میں صرف سی قدر و منزلت حاصل کرنے کیلئے مجھے بہت بھاری قیمت ادا کرنا پڑی تھی بہت بڑی

ــــ اور وہ لڑکا کمرے سے باہر نکل گیا ہم سب اسے جاتا ہوا اسوقت تک دیکھتے رہے جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا اسکی آواز ہمارے کانوں میں اب بھی گونج رہی تھی زندگی میں صرف تھوڑی سی قدر و منزلت حاصل کرنے کیلئے مجھے بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی تھی بہت بڑی۔ (دیکھ کر بہ ابگا)

گلچین کے قلم سے

خار و گل

قبل از مرگ واویلا کی ضرب المثل آپ نے متعدد بار سنی ہوگی لیکن میری منظومہ ذیل تحریر بعد از مرگ واویلا کے مصداق ہے۔ جس پر یقیناً کسی کو انگشت نمائی کا حق نہیں ہے لیکن بایں ہمہ اگر کسی صاحب کی جبین ناز پر بل آئے تو اسے لازم ہے کہ لمحہ بھر کے لئے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر غور کرے انشاءاللہ چلو بھر پانی میں ڈوب مرنے کو جی چاہے گا۔ اور پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ راقم الحروف شاعر نہیں اور نہ افکار ذیل کو شاعری سے کوئی نسبت ہے۔ اختصار کے مد نظر نظم بندی کی گئی ہے اور کنایہ کا لطف لینے کے لئے قوافی کا سہارا لیا گیا ہے اور بس! (گلچین)

راہ ایک پیر کہنہ داں! دے رہا تھا لیڈروں کو گالیاں
…کھا تو بھری اک آہ سرد پھر لگا کہنے کہ سنتے ہو میاں
…ناروں پر تو چھائی ہے بہار گلشن کشمیر ہے وقف خزاں
…ن ہیں تو میں استبداد کی اٹھ رہا ہے سینۂ دل سے دھواں
…ی ہیں عزتیں اور عصمتیں مٹ رہا ہے آدمیت کا نشاں
…لم انسان پابند و اسیر فاقہ کش، بے کار، بے بس، نیم جاں
…ہیں ظالموں کے خون سے سہہ رہے ہیں قاتلوں کی جھڑکیاں
…ہم ہیں غلاموں کے غلام اور ہم آزاد پھرتے ہیں یہاں
…کے ہیں ہم وظائف پا رہے کھا رہے خیرات کی ہیں روٹیاں

کس لئے پھٹتی نہیں ہے یہ زمیں
ٹوٹ پڑتا کیوں نہیں ہے آسماں

…ٹکڑوں پر ہیں باہم لڑ رہے نوچتے آپس میں ہیں ہم داڑھیاں
…ی کا ہر کوئی ہے مدعی ہر فدائی خوار میر کارواں
…ے ملتے "قائد کشمیر" ہیں اور یہ صاحب فلاں ابن فلاں
…سرار کی مدتق ہیں یہ جنگ آزادی کے وہ روح رواں
…نے سر ہیں سب سردار ہیں سب کے منہ میں ہاتھ بھر لمبی زباں
…مٹھو بنے پھرتے ہیں سب بولتے ہیں رنگ رنگ کی بولیاں
…ت ہیں میر پور کے چوہدری اک طرف ہیں پونچھ کے فخر جواں
…ب میر واعظ ہیں کھڑے اک طرف سردار ابراہیم خاں

قائد ملت ادھر ملت ادھر "گفتہ آید در حدیث دیگراں"
کیوں نہ ہو پھر عشق کی مٹی پلید اک "زلیخا" چار ہوں یوسف جہاں
وہ عزیز مصر دونوں خود پرست بدزباں اک دوسرا شیوہ بیاں

وقت نے بخشا ہمیں ایسا امام
سب کے سب ننگے نہاتے ہیں جہاں

عرض کی میں نے کہ حضرت ٹھیک ہے صاف ظاہر ہے عیاں راجہ بیاں
ہنس کے فرمانے لگے پھر کس لئے منہ میں ڈالے بیٹھے ہو تم گھنگنیاں
قوم تو فاقہ کشی سے ہے نڈھال لیڈروں کی گھی میں ہیں پانچوں انگلیاں
سر چھپانے کی جگہ ہم کو نہیں اور ان کے واسطے ہیں کوٹھیاں
مسکرا کر یوں کہا میں نے حضور کوٹھیاں اپنے نصیبے میں کہاں

مفت راشن پر قناعت کیجئے
اور سرور رہیئے گا زیر آسماں

ہم ہی کشمیری ہیں جن کے حال پر اٹھ رہی ہر چار سو میں انگلیاں
کوئی کہتا ہے کہ یہ ہیں مفت خور بن بلائے بن گئے ہیں میہماں
ہیں کسی کی نظر میں ہم بوالہوس مفت کی جو توڑتے ہیں روٹیاں
حال سے اپنے مگر واقف ہیں ہم جانتے ہیں اپنی ذمہ داریاں

آہ! کچھ کرنے نہیں دیتے ہمیں
بے زباں کشمیریوں کے ترجماں

(صادق)

ابوالخطیب ●

کب تک سحر نہ ہوگی؟

شیخ کرامت علی کا بنگلہ نما کوارٹر مہذب کولونی کے بیچ میں واقع تھا۔ پشت پر ایک چٹیل میدان اور سامنے اسکول اور کچھ دکانیں۔ کوارٹر کا پھیلاؤ بہت سی زمین گھیرے پڑا تھا اس لئے اس میں دو دکانیں بھی نکلوا لی تھیں تاکہ جب کولونی کی کچھ آبادی بڑھے تو ان دکانوں کو اونچے داموں میں اٹھا سکیں۔ دکانیں صدر دروازے سے ملحق تھیں۔ ۱۰ فٹ لمبی اور ۲ فٹ چوڑی ہر دکان کو دو دیواروں اور ایک چوڑی کواڑ سے مزین کر دیا گیا تھا۔ ان کے اندر کسی قسم کا طاق نہ تھا نہ ہی روشن دان۔ دونوں دکانوں کے دروازوں پر "کرائے کے لئے خالی ہے" کی دو میلی تختیاں لگی ہوئی تھیں۔ سڑک کچی تھی کوارٹر کا محل وقوع بہت اچھا تھا اس لئے بلدیہ کی زمین ہتھیانے کے لئے دو چبوترے بھی بنوا لئے تھے۔ اور چبوتروں کے اوپر یہ دکانیں ایسی معلوم ہوتیں جیسے وہاں کسی نے دو خیمے لگا لئے ہوں۔ دکانوں کو خالی پڑے ہوئے ایک عرصہ ہو گیا تھا اس لئے محلے کے آوارہ لڑکوں نے ان میں گولیاں کھیلنے کے لئے گچیاں کھود لی تھیں کبھی کبھی جب لونڈوں کی دھما چوکڑی سے یہ دکانیں خالی ہوتیں تو اس کولونی کے بن پیسے کے چوکیدار۔ کتے آکر ان میں دھونی رمائے اور خوب سوتے لیکن جب سیڑھیوں پر کچھ آہٹ سنتے تو دم دبا کر قیاؤں قیاؤں کرتے وہاں سے بھاگ جاتے۔

شیخ صاحب کو بڑی تگ و دو کے بعد سیمنٹ کا ایک پرمٹ ملا کچھ عرصہ بعد سیمنٹ کی بوریاں دی گئیں۔ شیخ صاحب کے ذہن میں دکانوں کا مصرف فوراً بجلی کی طرح چمکا۔ نہیں ایک گونا اطمینان ہوا۔ ساری بوریاں دائیں طرف کی دکان میں رکھ دی گئیں۔ لیکن اب سوال یہ درپیش تھا کہ ان کی حفاظت کیسے کی جائے اس کام کے لئے بھی ذہن پر کچھ زور ڈالنا پڑا تو انہیں ایک پٹھان کی ضرورت محسوس ہوئی جو کم سے کم معاوضے پر ان کے یہاں ملازم رہ سکے پھر اس کے ساتھ انہیں دوسرے کام بھی یاد آئے کہ وہ چوکیداری کے ساتھ صبح گھر کا کام کاج بھی کرے، بچیوں کو روز اسکول پہنچائے چھٹی کے بعد وہاں سے انہیں لائے اور رات بھر کے لئے تو اسے ملازم رکھا ہی جائے گا۔ ان ساری خدمات کا معاوضہ شیخ صاحب نے اس کے لئے چند جوڑے پہلے اترے کپڑے گھر کی بچی کھچی روٹی اور پندرہ روپے طے کئے۔

اس تجویز کو ذہن میں رکھ کر شیخ صاحب کچھ دنوں تک تو پٹھانوں کو ادھر ادھر تلاش کرتے رہے لیکن اس شہر میں آج پہلے کی طرح سستا آدمی نہیں تھا چند بوٹ پالش کرنے والے پٹھانوں سے بھی بات چیت کی لیکن وہ اس معاوضے پر اپنی جان کھپانے کے لئے تیار نہ ہوئے کیوں کہ ان غیرتمندوں کو خود کو زندہ رکھنے کے ساتھ انہیں اپنے بوڑھے ماں باپ اور ننھے منے بھائی بہن کو بھی زندہ رکھنا تھا جن سے وہ یہ کہہ کر آئے تھے کہ ہم کمائی کرنے جا رہے ہیں۔

شیخ صاحب ان کے اس جواب سے سخت ناراض ہوئے اور ان بھولے بھالے غریب پٹھانوں کی اس جرأت کو انہوں نے بدتمیزی اور شکم پری پر محمول کیا۔

شیخ صاحب پرانی وضع کے آدمی تھے باپ دادا زمینداری کرتے آئے تھے اس لئے ورثے میں وہ ساری تیزی ان میں بھی منتقل ہو گئی جو زمینداروں کی خصوصیت ہو سکتی ہے۔ اس لئے دوبارہ انہوں نے پٹھانوں کو منہ نہیں لگایا۔ مجبوراً چوکیداری کے فریضہ کو وہ خود انجام دیتے رہے۔ چارپائی باہر چبوترے پر نکال لیتے اور وہیں رات کے آخری پہر جا کر سو جاتے تکیے کے نیچے ایک کھلا چاقو اور ٹورچ رکھتے اور اس طرح انہیں دو ماہ گذر گئے۔ طبیعت اس مشقت کی عادی نہ تھی اس لئے کچھ الجھن پیدا ہوتی رہی اور دوسری طرف بیگم صاحبہ بھی بگڑ کر طرح طرح کے طعنے دیتیں۔ لیکن اس وقت شیخ صاحب عورت سے زیادہ

دولت کو اہمیت دیتے۔ اور آخرکار بیگم صاحبہ نے روز روز کے طعنوں سے تنگ آکر ایک دن کہہ دیا: "تیری آنکھوں پر تو چربی چھا چکی ہے ہر طرف ہرا ہی ہرا نظر آ رہا ہے۔ تو دنیا کو کیا سمجھے؟" یہ تو بات کی بات تھی ورنہ جب دولت کا نشہ شیخ صاحب پر سے اترنا شروع ہوا تو ان کے ذہن میں یہ خیال دھیرے دھیرے رینگنے لگا: "آخر یہ دولت کمائی کس لئے جاتی ہے۔ خود کے آرام اور نام کے لئے اور آج ان دونوں میں سے مجھے کچھ بھی نصیب نہیں۔"

دولت کی حفاظت اور عیش و عشرت کی طلب نے شیخ صاحب کا برا حال کر رکھا تھا۔ البتہ ایک کام انہوں نے اس کشمکش کے دوران میں ضرور شروع کر دیا تھا کہ روز اسٹیشن چلے جاتے مہاجرین کی گاڑیاں دیکھتے کہ کوئی دور قریب کا رشتہ دار مل جائے کیوں کہ وہی اس معاوضے پر تیار ہو سکتا تھا اور پھر اس پر ایک احسان بھی ہو سکتا تھا۔ ایک دن وہ جلدی ہی اسٹیشن پر پہونچ گئے۔ مہاجرین کی اسپیشل کھوکھراپار سے آ گئی تھی۔ وہ ڈبوں کو کھود کھود کر اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے وہ اپنے کسی عزیز کو تلاش کر رہے ہوں۔ ٹرین کے پچھلے ڈبے میں منشی عنایت علی سکڑے سمٹے بیٹھے تھے اور بھیڑ کے چھٹنے کا انتظار کر رہے تھے اور اس سوچ میں پڑے ہوئے تھے کہ یہاں کوئی عزیز رشتہ دار ملے گا یا نہیں لیکن بھیڑ کے کچھ کم ہوتے ہی جیسے ہی ان کی نظر شیخ کرامت علی پر پڑی تو خوشی سے ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ہونٹ کپکپانے لگے جیسے وہ کچھ کہنا چاہتے ہوں لیکن کچھ نہ پا سکے اور یہ سوچ کر اٹھے کہ ان کا خیال غیروں نے کر ہی لیا۔ پھر انہیں پاکستان سے گئے ہوئے ان خطوں کی بات یاد آئی کہ یہاں آکر کوئی کسی کا نہیں رہتا۔ اس خیال پر وہ اس وقت ہنسے، جیسے یہ سب کچھ غلط ہو کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ہم سب مسلمان ہیں، بھائی بھائی ہیں اور جب شیخ صاحب کی تصویر ان کے ذہن میں آئی تو وہ پھول کی طرح کھل گئے اور اپنے بےقرار دل سے کہا: "آخر خون تو ایک ہی ہے۔" اسی مسرت میں ڈوب کر وہ بھیڑ کو چیرنے لگے تاکہ ڈبے کی کھڑکی پر جلدی پہونچ کر وہ اپنے سگے بھتیجے کو آواز دیں۔ بھیڑ ابھی اتنی کم نہ ہوئی تھی کہ ضعیف و ناتواں سہارا پا کر نیچے ڈبے سے اتر سکیں اس لئے منشی جی نے لوگوں کی منت سماجت کی لیکن وہاں کون کسی کی پرواہ کرتا ہے۔ پھر منشی جی نے لوگوں کی ٹھوڑیوں میں ہاتھ ڈالنا شروع کیا پھر بھی کسی کی انسانیت نہ جاگی۔ تھک کر وہیں بیٹھ گئے اور شیخ صاحب کو دیکھتے رہے۔

"ارے بیٹا کرامت! یہ رہا میں، مجھے یہاں تلاش کر رہے ہو" منشی جی نے جب شیخ کرامت علی صاحب کو اپنی جگہ سے سرکتے ہوئے دیکھا تو لوگوں کی بھیڑ کو چیر کر ڈبے سے باہر سر نکال کر آواز دی۔ پلیٹ فارم کا ہنگامہ کم نہیں ہوا تھا۔ لوگ ڈبوں سے سامان جلدی جلدی پھینک رہے تھے جیسے ڈر رہے تھے۔ ایسی نفسا نفسی میں ناتواں آواز کہاں اٹھ سکتی تھی۔ منشی جی نے پھر ہمت کی۔ گردن کو ایک ڈبے کے باہر کیا اور ساتھ ہی ایک ہاتھ کو بھی باہر نکال لیا اور پورے زور سے چلائے۔ "بیٹا کرامت یہ رہا میں۔" جب یہ آواز منشی جی کے منہ سے نکل رہی تھی تو ان کی بوڑھی آنکھیں باہر نکلی پڑ رہی تھیں۔ چہرے کی سلوٹوں میں تناؤ آ چکا تھا۔ داڑھی کی ٹوپی آدھی چندیا پر رکھی ہوئی تھی۔ جیسے ان کی زلفوں نے اسے تھام لیا ہو۔

اس مرتبہ شیخ صاحب کے کانوں میں یہ آواز پہنچ کر ہی رہی۔ وہ چونکے۔ پیچھے مڑ کر دیکھا منشی جی کا ہاتھ جھنڈی کی طرح ہل رہا تھا جیسے ان کا بیقرار دل۔ شیخ کرامت علی مسکرائے۔ جلدی سے اس ڈبے کی طرف بڑھے۔ اپنی طرف آتا دیکھ کر منشی جی نے آسمان کی طرف نظریں اٹھائیں جو انجن کے دھوئیں سے چت کبرہ ہو گیا تھا۔ تاکہ اپنے مالک حقیقی کا شکریہ ادا کریں۔

"لے بیٹا بکس" جب شیخ صاحب ڈبے کے قریب پہنچے تو منشی جی نے کھڑکی میں سے اپنا بکس نکال کر ان کی طرف بڑھایا تاکہ وہ اسے نیچے فرش پر رکھ دیں۔ بکس کو اپنی طرف بڑھا ہوا دیکھ کر شیخ صاحب نے ایک سبکی محسوس کی کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔ بکس کو تھامنے سے پیشتر انہوں نے پھر قلی کو ادھر ادھر دیکھا، لیکن اس وقت وہاں انہیں کوئی نظر نہ آیا۔

"لے بیٹا! جلدی کر" منشی جی کے جب ہاتھ دکھنے لگے تو انہوں نے دوبارہ کہا۔ شیخ صاحب چونکے اور فوراً مصنوعی تپاک سے بکس کو جلدی سے نیچے رکھ دیا۔ منشی جی نے اپنا دوسرا عدد اٹھایا تو انہیں خیال آیا کہ بھیڑ اب چھٹ چکی ہے اس لئے وہ خود ہی اسے لے کر نیچے اترے اور کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے اسے فرش پر رکھنے لگے۔

"ہاں ہاں سب اطمینان سے نکال لو، میں یہاں کھڑا دیکھ رہا ہوں۔" شیخ صاحب نے خود کام کرنے کے جذبے کی ہمت افزائی سے